

دولت ایمان

(جنت کی کنجی)

از قلم مصطفیٰ احمد

مکمل ناول

** قارئین کے لیے انتباہ: **

اس ناول میں قتل و غارت اور خونریزی کی تصویر کشی کے مناظر شامل ہو سکتے ہیں۔ قارئین کو صوابدید کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ جو لوگ اس طرح کے مواد کے بارے میں حساس ہیں وہ ان مناظر کو چھوڑ کر اپنی ترجیحات کے لیے زیادہ موزوں حصوں پر توجہ مرکوز کر سکتے ہیں۔

جب میں "دولت ایمان" کو دوبارہ لکھنے بیٹھتا ہوں، تو میرا دل امید اور عقیدت دونوں کے ساتھ بھاری ہوتا ہے۔ یہ ناول، میری دوسری تخلیق، صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایمان کی دائمی طاقت اور ہمارے مشترکہ انسانی تجربے کی دولت کی گواہی ہے۔

اس کی پہلی شکل میں، "دولت ایمان" اردو کے پیچیدہ دھاگوں سے بنی ایک گل کاری تھی، ایک زبان جو برابر کے حصے میں درستی اور جذبے کا مطالبہ کرتی ہے۔ میں نقائص کو تسلیم کرتا ہوں، وہ جگہیں جہاں الفاظ میرے وژن کے مطابق نہیں تھے۔ پھر بھی، میں اسے دوبارہ لکھنے کے لیے نئی توانائی اور وضاحت کے ساتھ آگے بڑھتا ہوں۔

ایمان اور گوناوار کے کردار اس ناول کی روح کا جسم ہیں—کردار اتنے زندہ اور حقیقی کہ انہوں نے میری روح پر مٹ نہ سکنے والا نشان چھوڑ دیا ہے۔ ایمان کو دوبارہ تصور کرتے ہوئے، میں نے پہلے سے کہیں زیادہ گہرائی میں جا کر ایک کردار تخلیق کیا جس کا جوہر اتنا گہرا ہے کہ مجھے شک ہے کہ میں اپنی تحریر میں پھر کبھی ایسا تعلق دوبارہ پیدا کر پاؤں گا۔

یہ دوبارہ لکھنے کا سفر صرف ماضی کی غلطیوں کو درست کرنے کے بارے میں نہیں ہے؛ یہ "دولت ایمان" کو نئی بلندیوں تک بڑھانے اور اسے نکھارنے کے بارے میں ہے۔ یہ اس کہانی کو عزت دینے کے بارے میں ہے جو میرا حصہ بن چکی ہے اور اسے آپ کے ساتھ نئے سرے سے بانٹنے کے بارے میں ہے، میرے عزیز قارئین۔

ہر لفظ جو میں دوبارہ لکھتا ہوں، میں اسے بہت زیادہ دیکھ بھال اور محبت کے ساتھ کرتا ہوں، کیوں کہ "دولت ایمان" صرف ایک ناول سے زیادہ ہے — یہ میری روح کا ایک حصہ ہے جو کھلا ہوا ہے۔۔۔۔۔



ہدایت کا آخر مطلب کیا ہے؟

ہدایت کا مطلب ہوتا ہے رہنمائی، رہبری، راہ دکھانا، سیدھا راستہ، بتانا۔ قرآن مجید ہدایت کو تین درجات میں تقسیم کرتا ہے اور مخصوص قسم کی ہدایت کو مخصوص درجہ (لیول) کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

"جو اب دیا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر ایک کو اس کی خصوصی صورت اور شکل عطا کی، پھر ہدایت دی۔"

(سورۃ طہ: ۵۰)

اس کا مطلب ہے کہ اللہ نے ہر مخلوق کو ایک مخصوص شکل دی ہے اور پھر ان چیزوں کو ان کے کردار کے مطابق ہدایت دی ہے۔ ہدایت کی یہ قسم انسان، جن، جانور، پودوں، اور باقی تخلیقات کے لئے ہے۔

دوسرے درجے کی ہدایت انسانوں اور جنات کے لئے مخصوص ہے۔ اس قسم کی مدد سے لیے گئے کاموں کے وہ دونوں قیامت کے دن جواب دے ہوں گے۔ یہ ہدایت ہمیشہ سے موجود ہے اور جن اور انسان میں سے ہر کوئی آزاد ہے چاہے اس کو پہچان کر اس سے کام لے یا اس کو مسترد کر دے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اور نفس کی قسم اور اس کی جس نے اسے درست کیا۔

پھر اس کو اس کی بدی اور نیکی سمجھائی۔

بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کر لیا۔

اور بے شک وہ شخص نامراد ہو گیا جس نے اسے (گناہوں میں) ملوث کر لیا۔

سورہ ال نشمس ۷-۱۰)

"اور ان سے کہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے (آچکا) ہے، سو جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرے، ہم نے یقیناً تیار کر رکھی ہے ظالموں کے لئے ایک ایسی ہولناک آگ، جس کی لپیٹوں نے ان کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔"

(الکہف: ۲۹)

وہ جنہیں اللہ ہدایت دیتا ہے:

"اور جو اس کی طرف رجوع کریں انہیں (اللہ) ہدایت دیتا ہے۔"

(الرعد: ۲۷)

اور جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی، ضرور ہم انہیں اپنے راستے دکھادیں گے اور بے شک اللہ نیکو کار و
کے ساتھ ہے۔"

(سورة العنكبوت: ۶۹)

"اللہ جسے چاہتا ہے اپنے لئے چن لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرے اُسے اپنی طرف راستہ دکھا دیتا
ہے (ہدایت دیتا ہے)۔"

(سورة الشعراء: ۱۳)

وہ جنہیں اللہ گمراہ کرتا ہے

اُسی طرح اللہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ کس کو گمراہ چھوڑتا ہے۔

"اور اس (سیدھے راستے سے اللہ) گمراہ نہیں کرتا سوائے نافرمانوں کے"

(البقرة: ۲۶)

"اور اللہ نافرمانوں (ظالموں) پر راہ گم کر دیتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

(ابراہیم: ۲۷)

اللہ گمراہ کیسے کرتا ہے؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ گمراہ کیسے کرتا ہے؟ اس کا جواب اللہ بہت کھول کر اور واضح طریقے سے بتاتا ہے:

"اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوائے اور (کسی دوسرے) راستے پر چلے تو جہاں وہ چلتا ہے ہم اُسے وہیں چلنے دیں گے اور قیامت کے دن جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔"

النساء ۱۱۵

اللہ گمراہ کرتا ہے والی آیت کا مطلب:

عیسائی، یہودی، صیہونی ہندو اور ملحدین (ایتھیسٹ) بعض اوقات سورۃ ہود کی آیت نمبر ۳۴ کو بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ آیت نوح علیہ السلام کے لوگوں کے بارے میں ہے۔ نوح علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:

"تمہیں میری نصیحت نفع نہیں دے سکتی اگر میں تمہارا بھلا چاہوں، جبکہ اللہ تمہاری گمراہی چاہتا ہے، وہ تمہارا رب ہے، اور اُسی کی طرف پھیرو گے۔"

(ہود: ۳۴)

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ نوح علیہ السلام یہ بات اُس وقت کہہ رہے ہیں جب ان کی قوم نے پوری حد پار کر چکی تھی اور حتیٰ کہ پہلے دہان ڈال دیا گیا تھا، اس وقت اللہ اپنا طریقہ منتخب کرتا ہے اور ایسے ظالموں کو ان کے پسندیدہ راستوں پر مقرر کر دیتا ہے جو انہوں نے حق کو چھوڑ کر پسند کیا، جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا۔ اور ممکن ہے کہ یہ بات اُن وقت کہی جا رہی ہو جب قوم نوح کو عذاب دینے کے قریب تھی کیوں کہ یہ ہی لفظ عذاب اور تباہی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہم پڑھتے ہیں:

"پھر ان کے بعد ایسے لوگ آئے جنہوں نے نمازوں کو برباد کیا، اور اپنی نفسی خواہشات کے پیچھے چلے۔ سو ان کو قریب ہی گمراہی کی سزا ملے گی۔"

(مریم: ۵۹)

کچھ لوگ آل عراف کی آیت نمبر ۱۶ اور الحجر کی آیت نمبر ۳۹ کو بھی اسی سلسلے میں پیش کرتے ہیں:

"اس شیطان نے کہا جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی ضرور ان کی طرف تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں

گا۔"

"اس (شیطان) نے کہا کہ پروردگار جیسے تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں ان بندوں کے لئے زمین میں ساز و سامان اڑاؤں گا اور سب کو اکٹھا گمراہ کروں گا۔"

(الحجر: ۳۹)

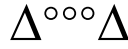
لیکن ہر عاقل شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ الفاظ شیطان کے ہیں جو اپنے شیطانی عزائم کا اظہار کر رہا ہے، ان آیات کو اپنے معانی میں صرف شیطانی روحیں ہی استعمال کرنے کی کوشش کر سکتی ہیں! دلوں پر مہر کرنے کا مطلب:

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب اللہ خود کہتا ہے کہ وہ خود کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے تو ان کافروں کو ان کے اعمال کا ذمہ دار کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے

یہ کہنے کی اصل وجہ پورے معاملے کو نہ سمجھنا ہے۔ صرف ان کافروں کے دلوں میں مہر لگتی ہے جو انتہائی ضد و کینہ کے ساتھ حق کے پیغام کو انکار کر دیتے ہیں اور ان کو وہ ہدایت کی دوسری قسم (جو ہر ایک کے لئے ہے اور جس کو حاصل کرنے کے لئے صرف اپنی خواہش درکار ہوتی ہے) کو منکر کر دیتے ہیں۔ ہم قرآن میں جب دیکھتے ہیں کہ اللہ کسی کے دلوں کو مہر لگانے کا کہتا ہے تو اس سے مراد صرف وہ کافر ہوتے ہیں جو انتہائی بے ہودگی سے حق کو منکر کرتے ہیں اور باجانب حق کو کوئی رجوع، خواہش نہیں رکھتے۔ البقرہ آیت نمبر ۷، النساء آیت نمبر ۱۶۸، اور سورۃ النحل آیت نمبر ۱۰۶ اور ۱۰۹ اس کی واضح مثالیں ہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نشانیوں سے سب کو ہدایت دکھاتا ہے۔ وہ اپنے پیغمبروں کو بھیجتا ہے جو اللہ کا پیغام لے کر آتے ہیں اور وہ ان کے ذریعے حق اور باطل کو بالکل واضح کر دیتا ہے۔ اس کے بعد جو شخص حق کو پہچاننے کی خواہش رکھتا ہے (ظاہر کرتا / کوشش کرتا ہے) تو اللہ اس پر ہدایت کھول دیتا ہے، اور جو اس کے برخلاف بالکل گمراہ کئے جاتے ہیں وہ وہ لوگ ہیں جو باطل کی طرف رجوع کرتے ہوئے حق کو چھوڑ دیتے ہیں اور جو اس گمراہی پر بضد ہو جاتے ہیں اللہ ان کے دلوں کو موہر کر دیتا ہے۔

واللہ اعلم



رات کی گہرائی میں، جب چاند نے اپنی پوری آب و تاب سے جگمگاتے ہوئے آسمان کو روشن کیا، ایک سحر انگیز منظر پیش آیا۔

چاند کی روشنی، جیسے کسی عاشق کی پر جوش نظریں، گھنے درختوں کی شاخوں کے پیچھے سے جھلملاتی ہوئی، زمین پر ایک خوابناک چمک بکھیر رہی تھی۔

رات کی خاموشی، جو کبھی کبھار پتوں کی سرسراہٹ سے بھنگ ہوتی، ایک عجیب سکون کا باعث بنی۔

ایسا لگتا تھا جیسے پتے چاندنی کے ساتھ اپنے دل کی باتیں کر رہے ہوں۔

کوئی بھی مخلوق اس پر سکون لمحے کی خاموشی کو توڑنے کی جرات نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں تک کہ ہوا بھی اپنی سانس روکے ہوئے تھی، گویا وہ پتوں کو زیادہ شدت سے ہلانے سے ڈر رہی ہو۔

اس رات کے سکون میں، شاندار مکانات کی عظمت نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا، جن کی تعمیر نو عمری کی جدت کا پیغام دے رہی تھی۔

ان کے پیچیدہ نقش و نگار اور بیلوں سے ڈھکی دیواریں زمین کی خوبصورتی میں بے عیب طور پر گھل مل گئی تھیں، جیسے وہ اسی مٹی سے اُگ آئے ہوں۔

ان محلوں کے درمیان، پیچیدہ راستے اپنی موجودگی کا اعلان کرتے ہوئے، درختوں کے ساتھ ایک احترامی جھکاؤ کے ساتھ راگیروں کا استقبال کرتے نظر آئے۔

درختوں کی شاخیں، جیسے کسی دانشمند کے ہاتھ، سر پر محراب کی شکل میں جھکی ہوئی تھیں، جس سے چاندنی اور سائے کی ایک حسین سرنگ بن گئی تھی۔

اس چاندنی کی پناہ گاہ کے مرکز میں، کھمبوں کی ایک قطار نے سنسٹینل کی طرح اپنی جگہ بنائی، ان کی نرم اور گرم روشنی نے زمین پر ایک آسمانی چمک بکھیر دی۔

ہر کھمبا، جیسے رات کا محافظ، اس جادوئی ماحول میں اپنا حصہ ڈال رہا تھا، جو اس خوابناک دائرے میں داخل ہونے والوں کے لیے راستہ روشن کرتا تھا۔

وقت کے ٹھہر جانے کے ساتھ، دنیا خوابوں کے منظر میں تبدیل ہو گئی، جہاں چاند نے ستاروں سے بھرے آسمان میں اپنا دربار سجایا تھا، اور فن تعمیر اور فطرت کے باہمی تعامل نے سکون اور خوبصورتی کی ایک جھانکی تخلیق کی تھی۔

یہ وہ رات تھی جب حقیقت اور خوابوں کی سرحدیں مدھم پڑ گئی تھیں، اور کائنات نے اپنے رازوں کو سننے کی ہمت رکھنے والوں کے سامنے سرگوشی کی۔

گہری خاموشی کے درمیان، جس نے چاندنی رات کو پالا تھا، رات کی ہوا کی طرح مدھم آواز نے سکون کو ہلا کر رکھ دیا۔

پہلے تو یہ آواز زفیروز کی طرح دور سے بہتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، لیکن آہستہ آہستہ یہ قریب آتی گئی، اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی پرسکون لہریں واضح ہوتی گئیں۔

- "اللہ واحد ہے لا شریک ہے" -

آواز نے اعلان کیا، اور اس کی گونج نے ہوا کو ایک دوسری دنیاوی سکون سے بھر دیا۔ "اللہ واحد ہے لا شریک ہے۔"

یہ کلام ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مادیت کی قید سے آزاد ہو کر روحانیت کی بلندیوں کو چھو رہا ہو، جس نے مخلوق کے دلوں کو گہری سوچ کی دعوت دی۔

جیسے جیسے آواز کی لہریں قریب آتی گئیں، اللہ کی تعریف و توصیف میں اضافہ ہوتا گیا، اور وہ بزرگ شخصیت، جو سفید لباس میں ملبوس تھے، چاندنی کی مدھم روشنی میں نمایاں ہوئے۔

ان کی آواز میں عقیدت کی مٹھاس تھی، جو خاموش درختوں کے درمیان گونجتی ہوئی، ایک روحانی سرور بکھیر رہی تھی۔

گلی کے پہریدار، بلند و بالا درخت، ان کی آواز کی تصدیق میں سر ہلا رہے تھے، اور ان کی شاخوں سے ہوا کی ہلکی سرسراہٹ، کھلتے پھولوں کی خوشبو کے ساتھ مل کر ایک تازہ اور سحر انگیز ماحول تخلیق کر رہی تھی۔

یہ رات، رمضان کی بابرکت راتوں میں سے ایک تھی، "تاک رات"، جو اس مقدس مہینے کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ چاند، ستاروں سے جڑے آسمان میں ایک روشن مدار بنا رہا تھا، جس نے ان بزرگ کی عقیدت کو روشن کیا، جن کی آوازیں آسمانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

جیسے جیسے رات کی گہرائی بڑھتی گئی، روحانیت، فطرت اور رمضان کی پاکیزگی نے دنیا کو اپنے حصار میں لے لیا۔

وقت کی رفتار مدھم پڑ گئی، اور زمینی و سماوی کی حدود غیر واضح ہو گئیں۔ اس لازوال لمحے میں، کائنات نے امن و احترام کی گہری کیفیت سے گونج اٹھی، جبکہ عقیدت مندوں نے اپنی دلی تعریفیں پیش کیں، ان کی آوازیں اپنی عقیدت کو کائنات کے دل تک پہنچا رہی تھیں۔

بزرگ درختوں کی گھنی چھاؤں میں سے گزرتے تھے ان کے قدموں کی آہستہ سی آواز آرہی تھی، جیسے کسی قدیم روایت کی گونج ہو۔

فٹ پاتھ کے آخر میں پہنچ کر، انہوں نے سامنے کی سڑک کی طرف دیکھا، جہاں ایک گھنے درخت کی قدیم چھتری کے نیچے، چاند کی روشنی نے ان کی شخصیت پر ایک سایہ اور روشنی کا پیچیدہ نمونہ بنایا۔ پتوں کی جھرمٹ سے چھن کر آتی چمکیلی روشنی نے ان کے پرسکون چہرے پر ایک نازک رقص کیا، جیسے کسی نے سلیوٹ بدلنے کا ایک نازک رقص رنگا ہو۔

ہوا کے ہلکے جھونکے نے پتوں کو ہلادیا، اور ان کے سائے نے ان کے سامنے راز کی سرگوشی کی۔

"اللہ ایک ہے... اللہ ایک ہے..." ان کی نظریں سڑک کے اس پار بالکل ان کے عین سامنے انہماک سے مرکوز تھیں، جہاں قریبی نائٹ کلب سے شور اور خوشی کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

موسیقی کی تیز دھڑکن اور پر جوش قہقہوں کا تال میل رات کے پرسکون سکون سے ٹکرا گیا۔ نائٹ کلب کے اوپری شیشے کی کھڑکی سے، روشنی کا ایک جھرناسڑک پر پھیل گیا، جس نے چاند کی ہلکی چمک سے واضح تضاد ظاہر کیا۔

وسیع و عریض کھڑکیوں کے ذریعے، رات کی تال پر خوبصورتی کے ساتھ رقص کرتے جاندار سلیوٹس دیکھے جاسکتے تھے۔

بوڑھے آدمی نے جواب سکون اور عیش و عشرت کے اس سنگم پر کھڑے ہو کر خاموشی کے ساتھ اس منظر کا مشاہدہ کیا۔

پھر انہوں نے سورہ البقرہ کی آیت 26 کی تلاوت کی، جس کا اردو ترجمہ ہے: "بے شک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کے لئے کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر۔ بہر حال ایمان والے تو جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور رہے کافر تو وہ کہتے ہیں، اس مثال سے اللہ کی مراد کیا ہے؟ اللہ بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعے گمراہ کرتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت عطا فرماتا ہے اور وہ اس کے ذریعے صرف نافرمانوں ہی کو گمراہ کرتا ہے۔"

جیسے ہی بزرگ نے غیر متزلزل عقیدت کے ساتھ مقدس آیت کی تلاوت جاری رکھی، ایک غیر معمولی تبدیلی رونما ہونے لگی۔

ایسا لگتا تھا کہ اوپر کا چاند ان کے نعرے کا جواب دے رہا ہے، ان پر ایک نرم، چاندی کی چمک ڈال رہا ہے۔ لیکن یہ کوئی عام چاندنی نہیں تھی۔ یہ ایک مقدس نور تھا ایک آسمانی نعمت۔ جیسے ہی یہ آیت اپنے عروج پر پہنچی، بزرگ کے وجود سے ایک نرم، آسمانی روشنی پھوٹنے لگی، وہ ایک روشن وجود بن گئے۔

ایسا لگتا تھا جیسے یہ روشنی ان کی روح نے بھڑکائی ہو، ایک ایسی چمکیلی روشنی ڈالی ہو جس نے رات کو ماورائی کے مینار کی طرح روشن کیا۔

یہ آسمانی چمک، گرم اور محیط، ایک روشن کوکون میں بزرگ کو لپیٹ میں لے گیا۔ پلک جھپکتے ہی ناقابل تصور واقع ہوا۔

بزرگ، اس آسمانی روشنی سے گھرے ہوئے طبعی دنیا کی حدود کو عبور کرنے لگے اور غائب ہو گئے۔ ان کی شکل، مقدس نور میں نہا کر، انسانی ادراک کے دائرے سے چمکنے اور دھندلا ہونے لگی۔

سکون اور گھرے فضل کے احساس کے ساتھ، وہ ایک گہری خاموشی چھوڑ کر روشنی کے جوہر میں گھل گئے۔

گویا وہ کائنات کے ساتھ ایک ہو گئے تھے۔ روحانی پاکیزگی کا ایک مینار خود آسمانوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔

...°...

دو جوان، جن کی آنکھوں میں امید کی چمک اور دلوں میں جوش کی لہر تھی، فٹ پاتھ پر قدم بہ قدم بڑھتے ہوئے نائٹ کلب کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ان کے چہروں پر ایک بے قراری اور توقع کی جھلک تھی، جیسے وہ رات کی بے پناہ ممکنات کو چھونے کے لیے بے تاب ہوں۔

دروازے کی گھنٹی بجاتے ہی، ایک بھاری دروازہ کھلا اور سیکیورٹی گارڈز نے ان کا استقبال کیا۔

ان کے بے عیب سوٹ اور پیشہ ورانہ رویے نے ان کی مہارت کا اشارہ دیا۔ وہ محض باؤنسر نہیں، بلکہ تفریح کی دنیا کے محافظ تھے۔ ان کی گہری نظریں اور کانوں میں لگے بلوٹو تھ ایرپیس نے ان کی سنجیدگی کو ظاہر کیا۔ انہوں نے جوانوں کو احتیاط سے جانچا، ان کی مکملیت اور سرپرستوں کے لیے ایک محفوظ رات کی ضمانت دی۔

ان کے کارڈز کی جانچ پڑتال کے بعد، انہیں اندر جانے کی اجازت دی گئی۔

ایک گارڈ نے شائستگی سے سر ہلایا اور انہیں اندر کی طرف رہنمائی کی۔

ناٹ کلب کے دھڑکتے دل کی آوازیں باہر تک سنائی دے رہی تھیں، جیسے وہاں کی ہوا میں امید کی خوشبو اور دھڑکتی باس کی دھڑکنیں گھل مل گئی ہوں۔

نین لائٹس اور ڈانس فلور کی دنیا میں، ہنسی اور موسیقی کی تال میں جڑی ہوئی تھی۔ جیسے ہی وہ دہلیز کو پار کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے، انہوں نے رات کے سفر کا آغاز کیا۔ ایک رات جو موسیقی، رقص، اور متحرک گفتگو سے بھرپور تھی۔

یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں پابندیاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں، اور عام دنیا پس منظر میں چلی گئی تھی۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ داخلہ ان کے لیے ایک ناقابل فراموش تجربے کا آغاز ہے، ایک افراتفری اور تخلیق کی رات، جہاں دنیا اور غیر معمولی تقدیر کے ڈانس فلور پر ٹکرائیں گے

$$\bullet =^{\circ} \Delta \Delta \Delta^{\circ} = \bullet$$

دلوں کی گہرائیوں میں، جہاں سچائی کی آغوش میں اعمال کا وزن ہوتا ہے،
ایک مقدس میدان میں ایمان کی ملاقات ہوتی ہے، جہاں روح کی پاکیزگی کا امتحان ہوتا ہے۔
جہنم کی آگ میں، جہاں لالچ کی لپٹیں دولت کے پیچھے بھاگتی ہیں،
سونے کی چمک، ہیرے کی جھلک، دنیا کی دولت، ایک بے ختم تعاقب میں۔
جنت کے باغات میں، جہاں نیکیوں کا سلسلہ اور دعاؤں کی صدائیں گونجتی ہیں،
ایک ایسی جگہ، جہاں ایمان کی دولت کو عدل کے ترازو میں تولایا جاتا ہے۔
انسان، اپنی نادانی میں، دنیاوی چمک کے لیے جنت کی سکونت کو چھوڑتا ہے،
دولت کے انبار لگا کر، شان و شوکت کی راہ پر چلتا ہے، جہنم کی راہ پر قدم بڑھاتا ہے۔
لیکن مایوسی کی چادر نہ ڈالیں، امید کی کرن ابھی باقی ہے،
توبہ کی راہ میں، روح کی مرمت کا ایک موقع، ایک نئی شروعات کی امید۔
اسلام کی بخشش کی راہ میں، جنت کے دروازے کھلے ہیں،
اعمال اور عقیدت کی نئی تعریف میں، جنت کی راہ دوبارہ ملتی ہے۔

تو دولت کو اپنی تقدیر کا مالک نہ بنائیں، توازن کی تلاش میں رہیں،

اسلام کی تعلیمات میں اصلاح کا راستہ ہے، جنت کی آغوش میں واپسی کا انتظار ہے۔



جب دو نوجوان نائٹ کلب کی حد بندی کو پار کرتے ہیں، تو ان کا استقبال ایک ایسے منظر سے ہوتا ہے جو فضول خرچی اور زوال کی داستان کہتا ہے۔

ہوا میں سرخ روشنی کی لہریں ایک دوسری دنیا کی جھلک پیش کرتی ہیں، جیسے رات نے خود کو ایک شرارتی سرخی میں ڈھال لیا ہو، جو چھپے ہوئے فتنوں کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔

ایک الیکٹرانک ڈسک کمرے کو رنگین کلیڈ و سکوپ میں تبدیل کر دیتا ہے، جس سے ہر شخص پر ایک سحر طاری ہو جاتا ہے۔

گالوں کی دھن اور قہقہوں کی گونج رمضان کی مقدس خاموشی کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ اسٹیج پر، ڈی جے موسیقی کی پینوٹک لہروں میں گم، رات کے جوش و خروش کو اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے۔

نیچے، رقص ایک بے ترتیب رقص میں مگن ہیں، جیسے انسانیت کی ایک الجھی ہوئی پہیلی ایک ساتھ مل کر رقص کر رہی ہو۔

یہ رقص کشش ثقل کو چکمہ دیتا ہے، جسم کے اعضاء لرز رہے ہیں، سر گھوم رہے ہیں، اور ہاتھ فضا میں بلند ہو رہے ہیں۔

ان کی ترکیب میں، وہ رمضان کی پاکیزگی کو بھول کر، شیطان کے بہکانے والے وسوسوں کے سامنے ہتھیار ڈال رہے تھے۔

رقص کی اس محفل میں، جہاں ہر طرف رنگین روشنیوں کی بہار تھی، نوجوانوں کے چہرے خوشی اور جوش سے دمک رہے تھے۔

ان کے ہاتھ ہوا میں بلند ہوتے، سر گھومتے، اور قدم تال سے تال ملا کر رقص کرتے۔

ان کی آوازیں موسیقی کی دھنوں کے ساتھ مل کر گونج رہی تھیں، اور وہ اپنی خوشی کا اظہار چیخ و پکار سے کر رہے تھے۔

نائٹ کلب کا ماحول ایک جادوئی دنیا کی طرح تھا، جہاں ہر شخص اپنی دنیا میں مگن تھا اور رات کی روانی میں بہہ رہا تھا۔



محفل رقص کی اوپری سطح پر، جہاں زیریں ہلچل سے دور، ایک علیحدہ قسم کی خاموشی چھائی ہوئی تھی، چند خاص مہمانوں نے پناہ گزین ہونے کا انتخاب کیا۔ زینتی باڑ کے ساتھ، پس منظر میں سچی میزوں پر، ہر حصے نے اپنی جگہ بنا رکھی تھی۔

مدھم روشنی نے جگہ کو ایک پراسرار اور دلکش کیفیت سے نوازا تھا، جہاں سکریٹ اور حقے کی نرم چمک دمک رہی تھی۔

خوشبودار دھواں ہوا میں چکر لگا رہا تھا، جیسے وہ بھی رقص کی محویت میں ہو۔ موجود مہمان اپنی پسندیدہ لذتوں میں غرق تھے، ان کی تہمتے اور سرگوشیاں نیچے کی بے قراری کے مقابلے میں ایک موسیقیت بخش رہی تھیں۔

غور و فکر اور ہمدردی کے اس ماحول میں، ایک نوجوان لڑکی، ریلنگ کے ساتھ موجود میز کے کنارے پر بیٹھی تھی، اس کی آنکھیں گہری نظر سے محفل کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اس کی جگہ سے، نیچے کے رقص کرنے والوں کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں ایک چھپی ہوئی چالاکی تھی، جیسے وہ رات کے رازوں کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر رہی ہو۔

اس کی موجودگی اس لمحے سے کہیں زیادہ معنی خیز لگ رہی تھی، اور یہ واضح تھا کہ وہ صرف ایک دیکھنے والی نہیں بلکہ رات کی پراسراریت میں ایک فعال کردار تھی۔

دونو جوان خواتین آمنے سامنے تھیں۔ پہلی لڑکی نے دوسری کی جانب متوجہ ہو کر، حقہ کا دھواں فضا میں بکھیرا، اس کا چہرہ جزوی طور پر دھندلا ہوا تھا۔ اس کے لہجے میں طنز تھا، ”شیطان لوگوں کو بھڑکاتا ہے، اب تو رمضان ہے، بقول ہمارے یعنی مسلمانوں کے، شیطان رمضان میں قید ہوتا ہے، تو اب جب شیطان قید ہے، تو ہمیں کون بھڑکارہا ہے؟“ اس کے سوال نے دوسری لڑکی کو گہری سوچ میں ڈال دیا۔ دوسری لڑکی نے ایک گہری سانس لی اور اپنے جام کو بلند کر کے ایک گھونٹ بھرا۔

سوال کرنے والی لڑکی کے ہونٹوں سے، دھواں نکل کر فضا میں چکر لگاتا ہوا بلند ہوا، تو نائٹ کلب کی ہلکی روشنی میں اس کی صورت واضح ہوئی۔

اس کا چہرہ ایک فنکار کی تخلیق کی مانند تھا، جس میں پوشیدہ راز اور عشق کے شیڈز کو ملا کر ایک دلفریب تصویر بنائی گئی تھی، جو نظریں جمادیتی تھی۔

اس کی جلد کارنگ گندمی، جیسے شفق کی آخری کرن نے اس کے رخساروں کو چھو کر انہیں معتبر بنا دیا ہو، اور اس کے چہرے کی نقاشی کو ایسے نمایاں کیا جیسے رات کی تاریکی میں جگنو کی روشنی۔

اس کے جبرے کی لکیر باریکی سے تراشی گئی تھی، جو اس کی خوبیوں کو اور بھی نکھارتی تھی۔

اس کی ناک نرمی اور گولائی میں ڈھلی ہوئی تھی، جو اس کے چہرے کی کلی شکل کو ایک منفرد حسن دیتی تھی۔

لیکن اس کی آنکھیں، جو بھوری اور گہری تھیں، ان میں ایک خفیہ دنیا کا بسیرا تھا۔ اس کے دل کی شکل کے چہرے نے اس کی حسن کو اور بھی بڑھا دیا تھا، اور اس کے ہونٹ، جو اس کی معصومیت کے برعکس تھے، ایک جاذبیت کا پیغام دیتے تھے۔

اس کے اوپری ہونٹ کو ہلکا سا اوپر کیا گیا تھا، جو ایک دلکش نچلے ہونٹ کو جگہ دیتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر سیاہ رنگ کی لپ اسٹک تھی، اور اس کے اوپری ہونٹ پر ایک چھوٹا سا چمکتا ہوا دائرہ تھا، جو ایک نازک لیکن دلکش ہونٹ چھیدنے والا تھا۔

اس کے بالوں کو ایک خوبصورت باب کٹ میں تراشا گیا تھا، جو اس کے چہرے کو ایک نفیس چمک دیتا تھا۔ اس کے نتھنوں کے درمیان ایک انگوٹھی کی شکل کی گہا تھی، جو اس کی ظاہری شکل کو ایک منفرد پہچان دیتی تھی، ایک نرالا لمس جو گہرائیوں کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

جب وہ ٹیبل پر کچھ آگے ہوئی، تو اس کا لباس نظر آیا تھا—ایک سیاہ مختصر اسکرٹ جو اس کی لمبی ٹانگوں کو دکھاتا تھا، جو اونچی ایڑیوں کے جوڑوں سے مزید بڑھ گئی تھیں۔

اس کے کان میں شیطان کے مخصوص شکل (BAPHOMET)

کی بالیوں کا جوڑا تھا، جو اس کے منفرد انداز کو ظاہر کرتا تھا۔

اس کی لمبی، خوبصورت گردن اس کی مجموعی حسن میں ایک جہت کا اضافہ کرتی تھی، جو اس کی دلکش خصوصیات کی طرف توجہ دلاتی تھی۔

مجموعی طور پر، وہ حسن کی مجسم، معصومیت اور خواہش کا ایک پرفتن امتزاج تھی۔

نائٹ کلب کے جنون کے درمیان اس کی موجودگی ایک مقناطیسی قوت تھی، جو آنکھوں کو کھینچتی اور دلوں کو ہلاتی تھی، رات کی متحرک رونق میں ایک خوبصورت معمہ تھا۔

سوال کرنے والی کی روبرو بیٹھی جو گوشہ نشین میں، جہاں روشنی کی مدھم لہریں چھپی ہوئی تھیں، نے بے خیالی میں اپنے زنانہ بیگ سے ایک پلاسٹک کی ڈبیہ نکالی۔

اس کی حرکات میں ایک عجیب سی بے نیازی جھلک رہی تھی۔ خانہ کے ڈھکن کو ایک چابکدستی سے کھولتے ہوئے، اس نے اندر موجود راز کو عیاں کر دیا — محتاط انداز میں بند کیے گئے کاغذی تھیلے، جن میں ایک پراسرار سفید پاؤڈر چھپا ہوا تھا۔

خانہ کھلتے ہی، فضا میں ایک گہری خوشبو پھیل گئی، جو بھاری اور مدہوش کن تھی، اور اس نے کمرے کو ایک ناقابل بیان کشیدگی سے بھر دیا۔

یہ خوشبو ایسی تھی کہ باسانی کسی کے حواس کو مغلوب کر سکتی تھی، اور انسان کو اپنی خواہشات کی گہرائیوں میں لے جاسکتی تھی۔

نوجوان خاتون نے بے اعتنائی سے اس ماحول کو قبول کیا، اس کے چھوٹے گھو بگھرا لی بال اس کے چہرے کو ایک غیر معمولی نور سے منور کر رہے تھے۔

اس کی چھوٹی آنکھیں، جو رازوں میں ڈوبی ہوئی تھیں، ایک پوشیدہ مقصد کی طرف اشارہ کر رہی تھیں، اور ان میں ایک دھندلی سی چمک تھی۔

اس کی جلد کی رنگت، رات کی تاریکی کے برعکس، ایک ہلکا پیلا رنگ لیے ہوئے تھی جیسے کسی پر چھائی سے واقف کوئی شخص ہو۔

اس کی ناک پتلی اور تقریباً نو کیلی تھی، جیسے کسی تیز دھار بلیڈ کی طرح، جو اس کی خصوصیات میں ایک نفاست کا اضافہ کرتی تھی۔

اس کے ہونٹوں پر، جہاں معصومیت کا کوئی نشان نہیں تھا، ایک شرارتی مسکراہٹ تھی جب اس نے خانہ سے ایک کیسپول نمائش نکالی۔

بڑی محتاطی اور درستگی کے ساتھ، اس نے اسے اپنے ہونٹوں کے نیچے رکھا اور پھر اسے اپنے بیگ میں واپس رکھ دیا۔

یہ سستے مومن اور ان کی باتیں... ”وہ بڑبڑائی۔ بات شروع کرنے والی لڑکی ہنسی تو اس کی آنکھیں چھوٹی ہو گئیں، اور چہلی انداز میں بولی، ”ایک مہینہ اللہ کو یاد کرنا ان کو لگتا ہے اللہ ان کو معاف کر دے گا...“۔

وہ پیچھے ہٹی اور کرسی سے ٹیک لگائی، ”پاکستانی لوگ کہتے ہیں پولیٹیشنز غلط ہیں حالانکہ پورا سال غریبوں کا حق کھاتے ہیں ہر غلط کام کرتے ہیں۔“

وہ سیدھی ہوئی، ”جیسی، عوام ویسے ٹکڑے حکمران جیسے کوتیسا۔۔۔“

اس کے سامنے والی لڑکی کھل کر ہنسی، ”تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو نینسی۔“

نینسی، جو اس سوال کرنے والی خوبصورت لڑکی کا نام تھا، اس نے خود رکھا تھا۔

وہ چالاک، دھان پان سی لڑکی جس کی کچھ مشابہت مردانہ سی تھی۔ اس نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”موسمی نمازی مسجد کی طرف اس طرح بھاگتے ہیں جیسے۔۔۔“

وہ کچھ سوچتے ہوئے اوپر دیکھنے لگی، پھر نینسی کی طرف دوبارہ دیکھا، ”بارش کے بعد کیڑے اچھل اچھل کر باہر نہیں آتے ویسے۔“

گہرے سنگین موسیقی کے بیچ، ایک چھوٹی سی تالی کی آواز نے فضا کو چھو لیا۔ نینسی نے اپنی ساتھی کی بات پر محظوظ ہوتے ہوئے تالی بجائی اور ان کی قہقہے بھری ہنسی نے کمرے کی گونج کو بھر دیا۔ لیکن جیسے ہی موسیقی کی لہریں بلند ہوئیں، ان کی ہنسی مدھم پڑتی چلی گئی۔

شکر ہے کہ میں ملحدہ ہوں۔۔۔ ”نینسی کی ساتھی، جس کی آواز میں ایک مردانہ سا خمیر تھانے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ایک شوخی بھرے انداز میں۔

نینسی نے مصنوعی تشویش کے ساتھ پوچھا، ”اگر تم ملحد ہو، تو آسمان کی طرف تشکر یہ کیوں دیکھ رہی ہو؟

نینسی کی آواز میں ایک مدھر ساز و آواز کا ہم آہنگ سلسلہ تھا، جو سننے والوں کو مسحور کر دیتا تھا۔ اس کے الفاظ ایک نرم دھارے کی طرح بہہ رہے تھے، ہر حرف ایک شاعرانہ نظم کی کرامت رکھتا تھا۔ جب وہ بولتی تھی، تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ آسمانوں سے ستارے چن کر اپنے جملوں میں پرو دیتی ہے۔

اس کی آواز خزاں کے کر کرے دنوں میں ایک گرم ہوا کے جھونکے کی طرح تھی، جو سکون بخش اور دعوت دینے والی تھی۔

اس کی ہنسی کی گونج ہوا کے ہلکے جھونکوں میں ہوا کی جھنکار کی طرح تھی۔

دوسری طرف، اس کی ساتھی کی آواز میں ایک مصیبت کا وزن تھا، جیسے ہر لفظ کھانسی اور ریسپس کے پردے سے جدوجہد کرتے ہوئے نکل رہا ہو۔

اس کی آواز پاؤں کے نیچے سوکھے پتوں کی چٹخارہٹ کی طرح کڑکتی اور دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔

اس میں تکلیف اور نزاکت کا ایک واضح اشارہ تھا۔ اس کی آواز میں ایک غیر روایتی خوبی تھی، ایک لطیف مردانگی جس نے اسے الگ کر دیا تھا۔

اس کے الفاظ غیر منقولہ کے طور پر سامنے آئے، اس کے ہم منصب کی آواز کی روانی اور فضل کی کمی تھی۔

اس دھان پان سی لڑکی نے اپنے چہرے کے زاویے کو درست کیا، اور وہ بات کہی جو عموماً ہر ملحد یا اسلام کے مخالف کی زبان پر ہوتی ہے، اور جس کا جواب میں نے تفصیل اور حوالہ جات کے ساتھ اپنے پہلے ناول 'انتقام' کے دوسرے جلد میں دیا ہے

محترم قارئین،)

داستانِ انتقام، جو کہ میرے قلم کی پہلی روشنائی ہے، ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئی۔ یہ کہانی، جسے میں تب سے تخلیق کر رہا ہوں جب میں گیارہ سال کا تھا، تقریباً پانچ سے سات ہزار صفحات پر محیط ہے۔ ابتدائی نویسی کی بے ساختگی کی وجہ سے، میں نے اسے دوبارہ لکھنے کا تجربہ نہیں کیا، مگر پھر بھی میں نے اسے دوبارہ قلمبند کیا۔۔۔]

اس کے کچھ حصے میں نے دو ویب سائٹس پر شائع کیے، لیکن پھر وہ ہی مسئلہ - ناتجربہ کار نویسی کا انداز۔

پھر میں نے 'دولتِ ایمان' لکھی، تاکہ اپنی تحریر کو بہتر بنا سکوں، لیکن وہ بھی میری توقعات پر پوری نہ اتری، کیوں کہ اس میں انتہائی مشکل اردو اور بیچ میں انگریزی الفاظ کا استعمال تھا۔ الحمد للہ، 'حُب الممنوع' کو میں نے بہتر انداز میں تحریر کیا۔ اب میں 'دولتِ ایمان' کو دوبارہ اور بہتر طریقے سے لکھ رہا ہوں۔ 'انتقام' کو میں تب لکھوں گا جب میرے ناولوں کا موضوع مافوق الفطرت کے موضوعات پر آئے گا۔ فی الحال، میں سماجی مسائل پر ناول لکھ رہا ہوں۔ 'انتقام' کب منظرِ عام پر آئے گا، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ فی الوقت، وہ میرے پاس محفوظ ہے، لیکن میں اسے ابھی منظرِ عام پر لانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

لڑکی نے اپنی نگاہیں نینسی کی طرف موڑیں اور ایک نرم لہجے میں کہا، ”تمہارے خیالات کے مطابق، تمہارے پرافٹ...“ اس کی آواز میں مذاق کی جھلک تھی، جیسے وہ عزت دینے کے بجائے کھیل کے موڈ میں ہو کیوں کہ اس نے پرافٹ عزتاً نہیں چہلی والے انداز میں کہا تھا یعنی معاوضہ والا پرافٹ۔“ انہوں نے ایک کم عمر لڑکی سے شادی کی تھی۔“

نینسی، جو عموماً اسلامی تعلیمات سے دور رہتی تھی، نے اچانک ایک سنجیدگی کا اظہار کیا۔ ”تم ماضی کے واقعات کو موجودہ دور کے تناظر میں کیوں دیکھ رہی ہو؟ یہ تو ’پریزنٹزم‘ ہے، جس کا مطلب ہے کہ ماضی کے واقعات یا افراد کا جائزہ موجودہ دور کے معیارات کی بنیاد پر لینا۔ اُس زمانے کے حالات مختلف تھے، لڑکیاں جلدی جوان ہو جاتی تھیں اور جلدی شادی کرنا عام بات تھی، نہ صرف عرب میں بلکہ پوری دنیا میں۔“

اس پر وہ لڑکی خاموش ہو گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

نینسی کو اچانک کچھ یاد آیا اور وہ بولی جو، شاید اس نے ایک بار موبائل پر دیکھا تھا، ”اور ہاں، نکاح تو چھ سال کی عمر میں ہوا تھا، لیکن رخصتی نو سال کی عمر میں۔ اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی منگنی پہلے کسی اور سے ہوئی تھی، لیکن وہ منگنی ٹوٹ گئی کیوں کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہوا تھا۔“

لڑکی نے سوچتے ہوئے کہا، ”مجھے ان کے والد کا نام یاد نہیں آ رہا۔ یہ نکاح ان کے والد، والدہ اور خود حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی مرضی سے ہوا تھا۔ اگر وہ راضی نہ ہوتیں تو یہ نکاح ناجائز ہوتا، کیوں کہ اسلام میں جبری شادی حرام ہے۔“

پھر اس نے لڑکی کو گھور کر کہا، ”تم نے مقدس شخصیات کا ذکر اس جگہ پر مجھ سے کروادیا۔۔“

لڑکی نے ہاتھ ہلا کر جیسے کہا، ”تم نے ہی بات شروع کی تھی۔“

نینسی نے دیکھا اور آنکھیں سنکیر لیں اور کچھ خفگی سے بولی ”میں نے موجودہ مسلمانوں کی بات کی تھی۔ اسلام تو اچھا ہے، لیکن کچھ مسلمان نہیں۔“

لڑکی نے گہری سانس لی کیوں کہ اسے برا لگا تھا۔ وہ اسلام کے مطابق نہیں چلتی تھی، لیکن نام کی مسلمان تو تھی۔

اس نے میز سے اپنا بیگ اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے کرسی کی پیٹھ سے ایک لمبا کفتان نکال کر اٹھایا اور پہن لیا، جس سے اس کی ٹانگیں چھپ گئیں۔

ایڑی والے جوتوں کی بدولت وہ اور بھی لمبی نظر آنے لگی۔

لڑکی نے نینسی کو حیرت سے دیکھا اور پوچھا، ”کہاں جا رہی ہو؟“

نینسی نے جواب دیا، ”اس وقت کے ہوتے ہوئے میں کہاں جاسکتی ہوں؟“

لڑکی کو کچھ یاد آیا اور اس نے پراسراریت سے کہا، ”تم تو ہمیشہ رات بھر بار میں ہوتی ہو اور صبح ہوتے ہی گھر جا کر سو جاتی ہو۔ ایسا کیوں۔“

نینسی نے معصوم ناراضگی سے کہا، ”تم بھی تو آتی ہو، اپنا بتاؤ۔“

۔۔ ”میں تمہاری طرح نہیں ہوں، جو روز آتی ہوں۔ میں کبھی کبھار ہی یہاں آتی ہوں، باقی دنوں میں میں مورتوں کے حقوق کی جدوجہد میں مصروف رہتی ہوں، ان کو ان کے حقوق دلوانے کی کوشش کرتی ہوں۔“

نینسی جاتے ہوئے مسکرائی۔۔ ”سوشل میڈیا اینڈ ٹرانس ایکٹوسٹ میرب موز۔“

میرب ایک معنی خیز مسکراہٹ مسکرائی



جب وہ ڈانس کلب کی دہلیز سے باہر قدم رکھتی ہے، فضا میں فجر کی نرمی اور تازگی بکھری ہوئی تھی۔

صبح کی پہلی کرنیں زمین پر سونے کی طرح چھٹک رہی تھیں، جیسے آسمان نے اپنی محبت کا عکس زمین پر بکھیر دیا ہو۔

ہوا پرندوں کی چچھاہٹ اور بلبل کی نغمگی سے معطر تھی، جیسے قدرت نے اپنی سرودی سازش کو ہوا میں ترتیب دیا ہو۔

ایک بلند درخت، جسکے تلے کبھی دانا بزرگ ٹھہرے تھے، اب وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر مستقل کھڑا تھا۔
اس کے پتے، جو پہرے داروں کی طرح قریب ہی کھڑے تھے، نرمی سے سرسراہٹ کر رہے تھے، جیسے
وہ رات کی رخصتی کو الوداع کہہ رہے ہوں۔

ان کی سبز برگوں کا نرم نزول زمین پر ایک رنگین قالین کی صورت اختیار کر چکا تھا، جس میں سرخ اور
نارنجی رنگ کی بہار تھی۔

نینسی نے خود کو اسی مقام پر پایا جہاں کبھی وہ پر اسرار شخصیت کھڑی ہوتی تھی۔

وہ درخت، جو ان کا خاموش رفیق تھا، اب بھی فٹ پاتھ پر اپنی جگہ جما ہوا تھا، اس کی شاخیں گرتے ہوئے
پتوں کی مالا سے سجی ہوئی تھیں۔

اس کی نظریں نیچے کی طرف مڑیں، اور وہیں، نارنجی اور سرخ پتوں کے درمیان، ایک تنہا سیاہ پتی نے اس
کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

نازک تجسس کے ساتھ، اس نے جھک کر اس پر اسرار پتے کو اٹھایا۔ یہ پتی دوسروں سے مختلف تھی، اس کی
آہنوسی سطح پر صوفیانہ رغبت کی چمک تھی۔ قریب سے دیکھنے پر، اس نے محسوس کیا کہ کسی ماہر فنکار نے
اس او بسیڈین کر مچ پر الفاظ کو نہایت مہارت سے کندہ کیا تھا۔

زبان کی سمجھ سے باہر ہونے کے باوجود، نینسی نے اس پر لکھے گئے پیغام سے ایک عجیب و غریب تعلق محسوس کیا۔

اس نے آبنوسی پتے کو آسمان کی طرف اٹھایا، اور جیسے ہی صبح کی پہلی کرنیں اس پر پڑیں، پتی پر کندہ خفیہ الفاظ زندہ ہوا اٹھے، جیسے آسمان نے خود اسے روشنی کی زبان میں سرگوشی کی ہو۔

نینسی کی آنکھوں نے جب سیاہ پتی پر کندہ الفاظ کو پڑھا، اس کی آواز میں طنز کی ایک باریک لہر دوڑ گئی۔

ایک چھوٹا سا، طنزیہ جملہ اس کے ہونٹوں سے نکلا، جب اس نے بے اختیار پتی کو ہوا میں اچھال دیا، جس کا پیغام ”جنت کی کنجی“ تھا۔

۔ ”اگر اللہ واقعی مہربان ہوتا،“ اس نے تلخی سے کہا، اس کی آواز میں ایک گہری بے چینی تھی، ”تو وہ ظالموں کو جنت کا وعدہ دینے کے بجائے، اسی دنیا میں ان سے انصاف کرتا۔“ اس کے الفاظ ہوا میں ایک گہرے سوال کی صورت میں معلق رہ گئے۔

جب نینسی نے پتہ زمین پر پھینکا، اس کے قدموں نے ایک عزم کی راہ اختیار کی۔

اس کی چال میں ایک پختہ ارادے کی جھلک تھی۔ جب وہ فٹ پاتھ پر بکھرے پتوں پر چلی، ان کی سرسراہٹ نے ایک موسیقی کی طرح فضا میں گونج اٹھی، جیسے ہر پتہ اپنی کہانی سنارہا ہو۔

لیکن اچانک، ایک نامعلوم کشش نے اسے روک دیا، جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اس کے دل کو مضبوطی سے تھام لیا ہو۔

اس کی ہتھیلی بے اختیار اپنے سینے پر دب گئی، جیسے کسی غیر مرئی احساس کی گہرائیوں کو ٹٹول رہی ہو۔
اس کے پیچھے، خدا کی بے نظیر تخلیق کے دائرے میں، ایک روحانی موجودگی نے اسے دیکھا، جیسے آسمان سے کوئی نگاہ اس پر جمی ہو۔

اس کی آنکھیں، جیسے کہکشاں کے بے شمار ستاروں کی طرح، ایک عجیب روشنی بکھیر رہی تھیں جو زمینی حدود کو پار کرتی نظر آتی تھیں۔

اس کے پروں کی بہتات، جیسے لاکھوں پروں کے پروں کی طرح، فضا میں پھیل گئی تھی۔

اس روحانی وجود نے سر جھکایا، نینسی کی طرف دیکھا، جو جواب میں حیرت سے پلٹی۔

ایک نادیدہ طاقت نے اسے اپنی طرف کھینچا، اسے اس پتے کو دوبارہ اٹھانے پر مجبور کیا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، ایک بڑی حقیقت کا احساس اس کے وجود پر چھا گیا۔

اس نے ہر قدم کے ساتھ اس پتے کی طرف بڑھتے ہوئے، اس روحانی شکل کو پار کیا۔

جیسے وہ مادی اور روحانی کی سرحدوں کو عبور کر رہی ہو، اس کے حواس اس کی موجودگی کو محسوس کرنے سے عاجز تھے۔

جب وہ پتے کے قریب پہنچی، اس کے دل میں ایک ناقابل بیان بوجھ محسوس ہوا۔ اس کے سینے میں ایک طوفانی احساس جاگ اٹھا، اس کی سانسیں رک گئیں۔

ایک نازک لیکن گہرا تغیر اس کے وجود میں جاگزیں ہوا، جس نے اسے ایمان اور تقدیر کے رازوں سے دوچار کر دیا۔

نینسی نے آہستہ سے جھک کر اپنا ایک ہاتھ زانے پر ٹیکا، اور ہلکی سی وہ زمین پر بیٹھی دوسرے ہاتھ سے اس نے وہ پراسرار پتی اٹھائی۔

اس کی انگلیاں، جو تجسس اور اندیشے کے ملے جلے جذبات سے لرز رہی تھیں، نے پتی کو محتاط انداز میں تھام لیا وہ شکوک و شبہات کے آزمائش میں دوبارہ سیدھی ہوتی کھڑی ہوئی۔

پتی کو پلٹتے ہی، اس کی آنکھیں حیرت سے چوڑی ہو گئیں۔ پتے کے دوسری طرف، الفاظ کا ایک نیا مجموعہ تھا، ایک اور پیغام جو آبنوس کی سطح میں نقش تھا۔ ایک ایسا انکشاف جس نے منطق کو چکرا دیا، اس کے دل کی دھڑکن کو تیز کر دیا۔

دو مختلف جملے، پتی کے نازک کر مچ پر کندہ، ایک ایسا معمہ تھے جس نے اس کی روح کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ حیران تھی کہ ایک پتی میں دو گہرے پیغامات کیسے سما سکتے ہیں، ہر ایک کی اپنی اہمیت اور راز تھے۔

حیرت زدہ اور متجسس، نینسی نے وہ پتا آہستہ سے ایک روشن طلوع ہوتے سورج کی روشنی کے جانب کیا جیسے وہ اس ناقابل فہم واقعہ کے درمیان الہی وضاحت کی تلاش میں تھی۔

اور وہیں، نرم روشنی میں نہائے ہوئے، الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے ایسے آگئے، جیسے تقدیر کے ہاتھ سے لکھے گئے ہوں۔ ”اللہ نے تم کو نہیں چھوڑا،“ الفاظ نے اعلان کیا، ان کی نرم یقین دہانی ایک گرم گلے کی طرح اس کے گرد لپیٹ رہی تھی۔

لیکن ان کے ساتھ ایک سخت نصیحت بھی تھی، ایک سنجیدہ سچائی جو اس کے وجود کے اندر گونج رہی تھی، ”تم نے اللہ کو چھوڑ دیا ہے۔“ اس جذباتی طور پر چارج شدہ لمحے میں، ایمان اور انسانی کمزوری کے گہرے اختلافات کو واضح کر دیا گیا تھا۔

نینسی کا دل جذبات کی آمیزش سے پھول گیا—خوف، عاجزی، اور خود کی عکاسی کا گہرا احساس۔

پتی، جو کبھی ایک خفیہ پہیلی تھی، الہی حکمت کے لیے ایک قوت بن گئی تھی، جو خالق اور اس کی تخلیق کے درمیان ہمیشہ سے موجود تعلق کی یاد دہانی کراتی ہے۔

جیسے ہی نرم چمک نے اسے لپیٹ لیا، نینسی کی روح ان الفاظ کے وزن سے جکڑی، جس نے خود شناسی اور روحانی دوبارہ دریافت کا راستہ بنایا۔

اس مقدس اور تبدیلی کے لمحے میں، اس نے اپنے آپ کو ایک گہرے سفر کے دہانے پر کھڑا پایا، جو اپنی انسانیت اور الہی کے بے پناہ فضل کے درمیان خلیج کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

نینسی نے اس پر اسرار پتی کو احتیاط سے اپنے بیگ میں رکھا، اس کا دل اب بھی گہرے الفاظ کی گونج سے گونج رہا تھا۔ اس کے قدم دوبارہ شروع ہوئے، ہر ایک مقصد کے نئے احساس سے رہنمائی کرتا تھا۔۔۔

ایمان نے اپنے قدموں کو فٹ پاتھ پر آہستہ سے رکھا، جیسے ہر قدم کے ساتھ اس کی دنیائی شکل اختیار کر رہی تھی۔

اس کے دائیں بائیں، شاندار مکانات اور لہلہاتے درختوں کی قطاریں تھیں، جو اس کے سفر کو ایک خوابناک حسن بخش رہے تھے۔

دو طرفہ سڑک کے بچوں بیچ ایک اور فٹ پاتھ تھا، جہاں مزید درختوں کی صفیں اس کے منظر کو مزید خوبصورت بنا رہی تھیں۔

ایمان کے چہرے پر ایک معصوم مسکراہٹ تھی، جب ایک نرم آواز نے اسے روکا، ”ایمان، ایک منٹ انتظار کرو۔“ اس آواز نے اس کے دل کو چھولیا، اور اس کی شناخت کا ایک نیا باب کھول دیا۔

اس کے چہرے کی مسکراہٹ میں ایک گہری کہانی چھپی تھی، جو اس کے دل کی گہرائیوں میں موجود جذبات کو ظاہر کر رہی تھی۔

جب ایمان نے مڑ کر دیکھا، تو سندس آپنی وہاں کھڑی تھی، ایک پردہ میں ملبوس، جس کی موجودگی ایک عجیب سکون کا باعث تھی۔

ایمان کے دل میں ایک پیچیدہ جذبات کا طوفان اٹھا، ایک طرف تو وہ سندس کی پاکیزگی اور عقیدت کی علامت پر رشک کر رہی تھی، دوسری طرف اس کے دل میں ایک چھپی ہوئی حسد کی لہر تھی۔

ایمان نے اپنی مسکراہٹ کو برقرار رکھا، اپنے اندرونی انتشار کو چھپاتے ہوئے، اور سندس کی طرف بڑھی۔ ان کے درمیان ایک گہری خاموشی تھی، جیسے دونوں کے دلوں میں موجود راز ایک دوسرے کو بغیر الفاظ کے سمجھ رہے تھے۔

ایک لمحے میں، ایمان کی نظریں ایک گہری سوچ میں ڈوب گئیں، جیسے وہ اپنی زندگی کے معنی اور مقصد کو تلاش کر رہی ہو۔

اس کے چہرے کے تاثرات میں ایک گہری الجھن تھی، جیسے وہ اپنی نئی شناخت کی سطح کے نیچے موجود رازوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

ایمان کی ملاقات سندس سے ایک خود دریافتی کے سفر کا آغاز تھی، جہاں ایمان اور پاکیزگی کی قدریں زندگی کے بناوٹی کپڑے کے نازک ریشموں میں بُنی ہوئی تھیں۔

ایمان نے مسکرا کر پوچھا، ”سندس آپ، آپ کیسی ہیں؟“۔

سندس نے دلی خوشی سے جواب دیا، ”اللہ کا شکر ہے، میں ٹھیک ہوں۔“۔

پھر سندس نے ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”اور تم کیسی ہو؟“۔

ایمان نے جھجکتے ہوئے مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”جی اللہ کا۔۔۔“ اس کے بعد ایمان نے چپ سادھ لی، اپنے الفاظ پر غور کرتے ہوئے۔ کیا وہ بدلہ لے رہی تھی؟ کیا وہ اللہ کو بتا رہی تھی کہ وہ ان کے بغیر بھی جی سکتی ہے؟ لیکن کیوں؟ اس نے اپنے الفاظ بدلے اور کہا، ”میں بہتر ہوں، سندس آپنی۔ اے ون۔“ اور اس نے سندس کی طرف دیکھا، جس پر وہ رشک کر رہی تھی، اس کی حفاظت اور اس کی ہر ادا پر۔

ایمان نے اپنے دل میں سوچا، ”یہ بُرقع تو ایک چلتا پھرتا قید خانہ ہے، جسے پاگل عورتیں حفاظت کا نام دیتی ہیں۔“

پھر اس نے دل میں مزید سوچا، ”یہ اللہ کی حدود ہیں۔۔۔ ہوں۔۔۔“

سندس کے گھر کی حدود سے نکلتی ہوئی بلیک ویگو کی موجودگی کا اعلان اس کے سینک کے تیز اور گونجنے والے دھماکے سے ہوا۔

ہارن کی آواز ہوا میں گونج رہی تھی، اپنے ساتھ غصے کا بے ہنگم لہجہ لے کر۔ ایمان کی نظریں فطری طور پر قریب آنے والی کار پر جمی تھیں، اور اس غیر متوقع جوش سے اس کے حواس مزید بلند ہو گئے تھے۔

سندس نے اپنی توجہ گاڑی کی جانب کی اور اپنی درمیانی دو انگلیوں کا استعمال کرتے ہوئے ایک لطیف اشارے میں گاڑی والے کو محض دو منٹ انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔

ایمان کے تاثرات کو الجھن نے گھیر لیا جب اس نے اس خفیہ ہدایت کے پیچھے معنی سمجھنے کی کوشش کی۔

اسرار کے درمیان، سندس نے اپنے بیگ میں پہنچی اور ایک کارڈ نکالا، جس کی اہمیت صرف اسے معلوم تھی۔

ایمان نے تجسس اور تشویش کے امتزاج سے اسے دیکھا، اس کی سوالیہ نظریں سندس کے ہاتھ میں پکڑے کارڈ پر جمی ہوئی تھیں۔

۔ ”اللہ حافظ“ سرگوشی کے ساتھ، سندس نے اسے الوداع کیا، اور ایمان کی نظریں اس کارڈ پر ٹکی رہیں جو سندس نے اس کے ہاتھ میں رکھا تھا۔

ایمان نے اس لمحے کے وزن کو محسوس کیا جب اس نے سندس کو جاتے ہوئے دیکھا، اپنے پیچھے ایک پر اسرار پیغام کا احساس چھوڑ دیا گیا جو ایک لاجواب پہیلی کی طرح ہوا میں معلق تھا۔

ایک گہرا سانس لے کر ایمان نے احتیاط سے کارڈ اپنے بیگ میں رکھا، اور اس کے خیالات اس کے سامنے آشکار ہونے والے عجیب و غریب اسرار سے بھر گئے۔

اس پر اسرار منظر میں، تقدیر اور تجسس کے دھاگے آپس میں جڑے ہوئے ہیں، جس نے ایمان کو ان رازوں پر غور کرنے کے لیے چھوڑ دیا جو اس کی نئی شناخت کی سطح کے نیچے موجود ہیں۔

— ..°.....° —

سندس نے گاڑی کے دروازے کو ہلکے سے دھکیل کر کھولا اور اندر بیٹھ گئی، جیسے ہی وہ بیٹھی، ایک تیز اور حقارت بھری آواز نے کیمین کی فضا کو چیر دیا۔ اس آواز میں ایک طاقتور اور مطالبہ کرتی ہوئی گونج تھی، جیسے کوئی تیز دھار والا چاقو ہوا کو کاٹ رہا ہو، ”تم اس ملعون لڑکی سے کیا بات کر رہی تھیں؟“۔

سندس کی نظریں اپنے والد کی طرف اٹھیں، جو ایک سادہ لباس میں ملبوس، اپنی داڑھی کو سلجھاتے ہوئے، عاجزی کی مورت بنے بیٹھے تھے۔

گاڑی کی سڑک پر چلتی ہوئی آواز نے اندر کے تناؤ کو مزید بڑھا دیا، اور سندس کی آواز میں مایوسی کی جھلک تھی جب وہ بولی، ”بابا، براہ کرم، ایسا نہ کہیں۔ وہ بھٹکی ہوئی ہے، اور اسے راہ دکھانے والے کی ضرورت ہے۔“۔

اس کے والد نے سڑک پر اپنی نظریں جمائے رکھیں، اور پھر سندس کی طرف دیکھے بغیر کہا، ”ایسی برائی سے داغدار لڑکیوں کو چھٹکارا نہیں ملتا۔ وہ نائٹ کلب سے آرہی تھی، اس مقدس مہینے میں بھی۔“۔

سندس نے آسمان کی طرف دیکھا اور نرمی سے کہا، ”ہمارا رب بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ دکھاتا ہے۔ اسے بھی راہ دکھائے گا۔“۔

اور پھر اس نے اپنے والد کی طرف دیکھا اور کہا، ”گناہ میں ڈوبے ہوئے ہزاروں لوگ ہیں جو جنت میں جائیں گے، بابا۔“۔

ایمان نے اپنے گھر کے بڑے اور چمکتے ہوئے بھورے دروازے کو نرمی سے دھکیل کر کھولا، اور اس کی شاندار رہائش گاہ میں قدم رکھا جہاں ہوا دولت اور آسودگی کی بے مثال چمک سے معطر تھی۔

یہ داخلی راستہ خوشحالی اور ذوق کی ایک منظم ترتیب تھا، جہاں ہر عنصر اسراف کی داستان سنارہا تھا۔

اس کے دائیں جانب، ایک عظیم الشان آئینہ دیوار کو سجارہا تھا، جس کی چمکیلی سطح ارد گرد کی خوبصورتی کو عکس بند کر رہی تھی۔

اس کے نیچے، ایک سیاہ لکڑی کی میز نے خلا میں نفاست کا ایک لمس جوڑا، جس کی چمکدار سطح نے ہر تفصیل کی باریک بینی کو ظاہر کیا۔

بائیں دیوار پر، شاندار پینٹنگز کی ایک قطار نے اس جگہ کو مزید خوبصورت بنایا، ہر ایک اپنی انفرادیت میں ایک شاہکار تھا۔

دیوار، جو آراستہ تھی، صبر و تحمل کا ایک لطیف اشارہ دے رہی تھی، جس سے یہ واضح ہوتا تھا کہ ایمان کا تعلق ایک باوقار خاندان سے ہے۔

دائیں طرف کی دیوار، خوبصورتی سے مڑی ہوئی اور نفیس آرائشوں سے مزین، مہمانوں کو عیش و عشرت کی مزید گہرائیوں میں لے جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔ چمکدار ٹائلوں سے مزین فرش، داخلی دروازے کی شان و شوکت کا عکس تھا، ہر قدم خوشحالی کے احساس سے گونجتا تھا۔ یہ محض ایک گھر نہیں بلکہ ایمان کی دنیا کی تعریف کرنے والی جمالیات اور خوشحالی کا ثبوت تھا۔

ہر کونے میں نفاست کی ہوا بہہ رہی تھی، اور ہر تفصیل استحقاق اور تطہیر کی زندگی کی کہانی سنارہی تھی۔

جب ایمان نے اپنے گھر کے وسیع و عریض سفر کو جاری رکھا، تو اسے اپنی سوتیلی ماں کے کاٹ دار طنز کا سامنا کرنا پڑا۔ عورت کے طنزیہ الفاظ، ”دیکھو، آگئی کافرہ،“۔

آرام دہ ماحول میں گونج رہے تھے، جو ایک واضح یاد دہانی تھی کہ اس دولت کے درمیان بھی، ایمان کی تقسیم برقرار تھی۔

ایمان نے اپنی سوتیلی ماں کی طرف ایک گہری نظر ڈالی، جس کے چہرے پر بیزاری کی جھلک تھی، اور پھر وہ عزم کے ساتھ آگے بڑھی۔

اس کی چال میں ایک خاص قسم کی مضبوطی تھی، جیسے وہ کسی بھی مشکل کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو۔

گھر کی شان و شوکت اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی تھی، جیسے وہ عیش و عشرت کے سمندر میں چل رہی ہو۔ اس کے قدموں تلے، بھوری لکڑی کا فرش چمک رہا تھا، جس کی جلوہ گری اس کے ارد گرد کی عیش و آرام کی زندگی کو عکس بند کر رہی تھی۔ ایک شاہانہ سرمئی قالین نے اس فرش کو مزید خوبصورت بنا دیا تھا، جس کی نرمی اور بناوٹ میں ایک سکونت تھی۔ کمرے میں بکھری ہوئی سیاہ میزیں، جن پر نازک شیشے کی تہہ چڑھی ہوئی تھی، ایک خوبصورت منظر پیش کر رہی تھیں، جو بھورے اور سرمئی رنگوں کے میل سے مزین تھیں۔ اوپر کی جانب، سفید چھت نے کمرے کو ایک کشادہ اور روشن ماحول فراہم کیا تھا۔ دیواروں پر رنگوں کی ایک حیرت انگیز صف بندی تھی، جو کہانیاں سنانے کو بے تاب تھی۔ چمکتے ہوئے سونے اور

گہرے آبنوس کے رنگوں نے ایک ڈرامائی تضاد پیدا کیا تھا، جس نے کمرے کو ایک باوقار خوبصورتی سے نوازا تھا۔ چھت سے لٹکتے ہوئے تلوئی شکل کے لاکٹ لیمپ نے ایک گرم روشنی بکھیری تھی، جس نے ارد گرد کے صوفوں کو روشن کر دیا تھا۔ ایک پینٹنگ نے دیوار پر مرکزی مقام حاصل کیا تھا۔ ایک تیز رفتار گھوڑے کی شاندار تصویر، جس نے کمرے میں زندگی کی روح پھونک دی تھی۔ ایک کونے میں، ایمان کے والد بیٹھے تھے، جن کی شخصیت میں اختیار اور فضل کی جھلک تھی، اور وہ ایک سکونت بھرے انداز میں صوفے پر آرام فرما رہے تھے۔ ان کے قریب، کروفرو، وفاداری کی علامت، ان کے پاس بیٹھی تھی۔

ایمان نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا، ”کم از کم میں تیری طرح ظاہر میں مومنہ اور باطن میں کافرہ نہیں ہوں۔“ اس کے الفاظ میں طاقت اور اعتماد تھا، جیسے وہ کسی بھی چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو۔

خالدہ نے ہانپ کر ایک، طرف دراجے جتوئی کو دیکھا

”اس چھوٹی سی پانچ فوٹی پانچ انچی چوہیا کو دیکھ رہے ہو تم۔۔“

ایمان کی سوتیلی ماں، خالدہ جتوئی، اس کے سامنے عظمت و تکبر کی مورت بنی کھڑی تھیں۔ ایمان کے پیچھے، شیشے کی سیڑھیاں، جن پر پانی کی لہریں نقش تھیں، ٹیکنالوجی کی جدت کا نمونہ پیش کر رہی تھیں۔ خالدہ کی اونچی قامت، اس کے چہرے کی چالاکی سے بھرپور خدوخال، اور اس کی پتلی ابرو، جو ایمان کی نرم محرابوں کے برعکس تھیں، اس کی بد مزاجی کو ظاہر کر رہی تھیں۔ اس کی جامنی لپ اسٹک اس کے چہرے

پر ایک تاریک سایہ ڈال رہی تھی، اور اس کی ٹھنڈی، حسابی نگاہیں کسی کی روح کو چھیدتی محسوس ہوتی تھیں۔۔۔

ایمان نے اپنی سوتیلی ماں کی جانب بیزاری سے دیکھا، جو اس کے سامنے ایک چٹان کی طرح کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی، جیسے وہ کسی بھی چیلنج کا سامنا کرنے کو تیار ہو۔ ”ہاں، آنکھیں تو ہیں،“ ایمان نے اپنے باپ کی طرف دیکھ کر کہا، جو بے خبری کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ پھر اس نے اپنی ماں کی طرف مختصر سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور کہا، ”کان بھی ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں شرارت بھری تھی جب اس نے کہا، ”لیکن افسوس، وہ تجھے سننے کے لائق نہیں سمجھتے۔“

اس کی ماں کے چہرے پر حیرت کا اظہار ہوا، اور وہ غصے سے بولیں، ”شرابی بھنگن، خدا کی لعنت ہو تجھ پر۔ رمضان میں بھی تو ناچ رہی ہے، شرابیوں پی رہی ہے۔“

ایمان نے ایک گہری سانس لی اور بے فکری سے جواب دیا، ”شراب تو میں نے پی ہے، لیکن بھونک تو رہی ہے جیسے پاگل کتے۔“

ایمان جانتی تھی کہ وہ شراب نہیں پیتی نہ وہ کبھی ناچتی تھی اس کو یہ پسند نہ تھا بس اس کا دل ناچ گانے سے اچاٹ تھا وہ اپنے بارے میں کیا سوچتی ہے اس کے لیے یہ اہم تھا۔

لوگ کیا سوچتے ہیں وہ لوگوں، کی سوچ کو اتنا ہی ترجیح دیتی تھی جتنا وہ اپنی سوتیلی ماں کی عزت کو دے رہی تھی یعنی صفر۔۔

خالدہ نے جتوئی کی طرف دیکھا اور کہا، ”دیکھ رہے ہیں نا، یہ چھٹانک بھر کی لڑکی کیسے میرے سامنے بول رہی ہے۔“

جتوئی نے اپنے قدموں کو اٹھایا اور ایمان کی جانب بڑھا، نانگی کے سیلپرز کی آواز سنائی دیتی ہوئی۔ ایمان نے اپنے باپ کی آنکھوں میں دیکھا، ایک چیلنج کی طرح۔ جتوئی نے کہا، ”تمہیں پیدا کر کے میں نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔“

ایمان نے ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”افسوس، ہم میں ایک بات مشترک ہے۔“

اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر اپنے باپ سے کہا، ”کاش آپ اس رات جلدی سو جاتے۔“ یہ کہتے ایمان نے شانے اچکائے۔۔۔

خالدہ کی آواز نے ایمان کو روک دیا، جب وہ زینوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ خالدہ نے جنگلی بلی کی طرح پیچھے سے آگے بڑھتے ہوئے چلایا، ”اے یزیدن، اے فرعونیا، اے کافر، اے منافق، منحوس مارنی، تو ایسی بد قسمت ہے کہ تجھے روزہ رکھنا نصیب نہ ہوا۔ تیری حالت فرعون و یزید سے بھی بدتر ہوگی، دیکھ لینا تو لعنتی عورت فحاشہ۔“

ایمان نے ایک مبالغہ آمیز انداز میں، اپنے چہرے کو بگاڑتے ہوئے، خالدہ کی نقل اتاری اور تمسخرانہ انداز میں ناک چیرا کر آواز نکالی اس کے بعد ایمان نے خالدہ کو اوپر سے نیچے دیکھا ایک تیز نظر سے ”نکل بڑھیا۔“ اور پھر وہ اوپر چلی گئی۔

خالدہ نے جتوئی کی طرف دیکھا، جو کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے ایمان کو اوپر جاتے دیکھ رہا تھا، اور کہا، ”اس کافرہ کو دیکھ رہے ہیں؟“۔

جتوئی نے سوچتے ہوئے ایمان کو اوپر جاتے دیکھا اور کہا، ”یہ وہ ایمان نہیں ہے جو پانچ سال پہلے تھی، جسے تم مارا کرتی تھی، جس کا ہاتھ جلادیا کرتی تھی“۔ خالدہ نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا، ”مردود ماری، مار کھا کھا کر اس کو عادت ہو گئی ہے، اب تو کمینی ہاتھ میں بھی نہیں آتی۔“ وہ لفظ چباتے ہوئے شعلہ وار تیوریوں کے ساتھ بولی، ”سات یار رکھنے والی فاشہ۔“۔

...°...

جب وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، ہر قدم اس کی بیزاری اور ناخوشی کی گونج میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ راہداری جو اس کے سامنے بچھی ہوئی تھی، نرم اور گرم روشنی سے منور تھی، جس نے دیواروں کو ایک دلکش چمک بخشی تھی جہاں پہرے دار کھڑے تھے۔ اس کی بائیں جانب، ایک بڑی شیشے کی کھڑکی سے ڈی ایچ اے کے وسیع منظر کو فریم کیا گیا تھا، جو زندگی کی رونق اور حرکت کا ایک خوبصورت منظر پیش کر رہا تھا۔

اس کے قریب ہی، دیوار پر لگی فریم شدہ تصویریں ماضی کی پیاری یادوں کو قید کرتی نظر آرہی تھیں۔

ہر تصویر ایک کہانی، کسی کی زندگی کا ایک حصہ، یا شاید اس مقام کے ماضی کی ایک جھلک پیش کر رہی تھی۔

راہداری کے دائیں جانب ایک خوبصورت میز موجود تھی، جو فنکارانہ اور تاریخی سرگوشیوں سے مزین تھی۔

درمیان میں بچھا ہوا خوبصورت لال قالین اس کے قدموں کے نیچے دب رہا تھا، اور اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پرس اس کی تھکاوٹ کی عکاسی کر رہا تھا جب وہ مستقیم راہداری میں چل رہی تھی۔

جب وہ کچھ آگے بڑھی اس کے دائیں جانب ایک کمرہ تھا جو ایک کتب خانے کی طرف رہنمائی کرتا تھا اس کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا، جسے اس کا اندرونی حصہ سکوت کی گہری چادر میں لپٹا ہوا تھا۔

اس نے بے اعتنائی سے اپنا راستہ جاری رکھا۔ اوپر کی چھت، جو قدیم سفید رنگ کی تھی، علم اور فنون کی وسعتوں کو سموئے ہوئے محسوس ہوتی تھی۔ اس کے قدموں کے نیچے بچھا قالین ایک عیش و عشرت کا تاثر دے رہا تھا، جو اسے اپنی منزل کی جانب بڑھتے ہوئے ہر قدم پر نرمی سے چھو رہا تھا۔

راہداری نے اپنے پراسرار رازوں کو ایک ایک کر کے ظاہر کرنا شروع کر دیا، جس سے دریافت کی ایک نئی راہ کھلتی نظر آرہی تھی۔

بائیں جانب مڑتے ہوئے، اس کے قدم اسے ایک پتلے لکڑی کے دروازے کی طرف لے گئے، جو راہداری کے آخر میں کھڑا تھا۔

ایک لمحے کے لیے توقف کرتے ہوئے، اس نے دروازے کو دھکیل دیا، اور اچانک، ایک گہرا اندھیرا اسے اپنے اندر سمو گیا۔

یہ ایمان کا کمرہ تھا، ایک عالیشان گھر کا بھولا بسر اکونہ، جو کافی عرصے سے بے استعمال پڑا ہوا محسوس ہوتا تھا مگر ایسا نہ تھا۔۔۔

اس نے سوچ بورڈ کی طرف قدم بڑھایا، اور جیسے ہی کمرہ روشنی سے منور ہوا، اس کی حقیقی حالت کا دردناک منظر سامنے آیا۔

یہ ایک چھوٹی سی، تنگ جگہ تھی، جو اس کے ارد گرد کی دولت سے بہت دور تھی۔ ایمان نے اس کی آرائش وزینائش نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اور اس کی بے توجہی کے نشانات واضح تھے۔ ایک سادہ سا بستر کمرے کے وسط میں کھڑکی کے عین برابر پڑا تھا، اس کی چادریں متعدد دراتوں کی نیند کی گواہی دے رہی تھیں۔

ایک الماری جس کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا، کچے فرش پر بکھرے ہوئے کپڑوں کے بوجھ تلے دبئی ہوئی تھی۔ ایک دروازے سے موزے بھولی بسری یادوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ بائیں جانب، ایک چھوٹی سی میز پر خوابوں اور سوالات کا بوجھ تھا۔ بیڈ کے ہیڈ بورڈ کے اوپر، ایک الماری نے اس کے معمولی مواد کو دکھایا: ایک روئی کا پردہ، ایک بدنما انجکشن، اور ایک نوجوان ایمان کی دھندلی تصویر، جس کی معصوم آنکھیں دنیا کے بوجھ سے بوجھل تھیں۔

کمرہ خود ہی خاموشی سے پکار رہا تھا، اس کی پیٹ چھلک رہی تھی، اور دیواریں کھوئی ہوئی امیدوں کی سرگوشیوں سے گونج رہی تھیں۔

یہ کمرہ جسمانی اور جذباتی دونوں طرح کے سائے سے بھرا ہوا تھا۔ ایمان کے بچپن کی تصویر اس کی طرف پلٹ کر دیکھ رہی تھی، ایک اعلیٰ طاقت کے لیے خاموش التجا تھی۔

وہ اکثر اللہ سے پوچھتی کہ اس نے اسے کیوں پیدا کیا، اسے اپنے پاس کیوں نہیں بلایا؟ اس چھوٹی سی تاریک پناہ گاہ میں، ایمان کی اداسی اور آرزو واضح تھی، ایک اداسی کی جھلک جو اس کے کمرے کی نظر انداز تفصیلات میں نج رہی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں درد نے سکونت اختیار کر لی تھی اور جہاں بے جواب دعائیں ہوا میں لٹک رہی تھیں۔

-

وہ ماندہ نظر آرہی تھی جب اُس نے کمرے کی جانب دیکھا۔ اُس کے منہ سے بے اختیار ایک ہنہناہٹ برآمد ہوئی، جیسے کسی گھوڑے کی آواز۔

اُس کی آنکھیں گھومیں، اور اُس کا بٹوہ اُس کی انگلیوں سے ایسے لٹکا ہوا تھا جیسے اُسے چھوڑنا کوئی بھاری کام ہو۔

اُس کے درد بھرے کندھے کو مسلتے ہوئے اُس کے ہونٹوں سے ایک آہ بھری نکلی، اور ایک مزاحیہ انداز میں بٹوہ اُس کے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گرا، اُس کے اندر کی چیزیں رازوں کی طرح بکھر گئیں۔

اُس نے جوتے اتارنے کی کوشش بھی نہ کی، ایک پیر کو دائیں جانب کیا تو ایک جوتا مشرق کی طرف پھسل گیا، اور دوسرا مغرب کی طرف۔ اُس نے جو پتلا جالی دار کوٹ پہن رکھا تھا، اُسے بے پروائی سے پھینک دیا،

دھیرے دھیرے وہ بیڈ تک پہنچی جو کھڑکی کے ساتھ تھا، اور بیڈ پر چڑھ کر کھڑکی تک پہنچی، جیسے اُس کی تھکاوٹ کے اندھیرے کو چھیدنے کے لیے ہچکچاتے سورج کی روشنی کو اشارہ کر رہی ہو۔

اُس نے پردہ ہٹایا اور شعاعیں فرمانبرداری سے کمرے میں پھیل گئیں، اُسے گرم، سنہری رنگت میں نہلا دیا۔

وہ پسپا ہوئی اور بستر کے متصل میز پر نصف برتا ہوا سیب موجود تھا، جیسے دن کے دیگر فراموش شدہ کاموں کی طرح۔

ایک شاعرانہ سستی کے عالم میں، اُس نے سیب کو سوئچ بورڈ کی جانب اُچھالا، جیسے کسی ڈرامائی انداز میں، سوئچ بورڈ کا بٹن نیچے کی جانب تھا کیوں کہ وہ الٹا نصب تھا۔ اوپر کرنے سے روشنی جلتی اور نیچے کرنے سے بجھتی۔ جو نہی بٹن دبا، روشنی بند ہو گئی اور کھڑکی سے آتی روشنی رہ گئی۔

صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے، اور وہ نیند کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھی۔ ایک جمائی کے ساتھ، اُس نے کمرے کے ماحول کو قابو کرنے کے لیے بستر کے پاس موجود سوئچ دبایا۔

کمرے نے نرم گونج کے ساتھ جواب دیا، اور ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اُس کی ماندہ شکل میں رقص کرنے لگا، ایک آرام دہ لوری کی طرح اُس کا استقبال کرتے ہوئے۔ درحقیقت، یہ تھکاوٹ کا ایک طنزیہ منظر تھا، ایک ایسا رقص جسے صرف وہی اتنی مہارت سے کوریوگراف کر سکتی تھی۔

’بستر سے پاؤں نیچے لٹکائے، اُنہیں ہلاتے ہوئے، وہ بڑبڑائی، ’منحوس زندگی، منحوس لوگ، اور منحوس دنیا۔‘

اُس کے سامنے گھر، درخت، اور سڑک نظر آرہے تھے۔ نیچے کھلا لان تھا، جہاں گھاس اور درخت بکھرے ہوئے تھے۔

ایمان نے دونوں ہاتھ پیچھے کیے اور ہاتھوں کے بل پیچھے کو جھکی، پھر اُس نے کھڑکی کھولی اور ہلکی سی کرختگی کے ساتھ تھوک کھڑکی سے باہر پھینک دیا، گویا اُس کی زبان پر کوئی کڑواہٹ چھا گئی ہو۔

کھڑکی بند کر کے اُس نے سرہانے پر سر رکھا اور فوراً ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

لیکن اُس نے کشش ثقل کے خلاف ایک تھوک کا گلوب بھیجا تھا۔ نیچے خالدہ ایک کرسی پر بیٹھی تھی، اُس کی توجہ اپنے سامنے پھولوں کی صفوں اور گول میز پر دھواں دار چائے کے کپ کے درمیان بٹی ہوئی تھی۔ ایمان کو رمضان کا طعنہ دینے والی خود چائے پی رہی تھی، اُس کی اپنی دوہری معیاری کی عکاسی کرتے ہوئے۔ انسان اکثر خود تو بہت کچھ کرتا ہے مگر دوسرا انسان کچھ کر دے تو اُسے برا بھلا کہتے ہیں۔

میز کے ساتھ کرسیاں فرمانبردار سپاہیوں کی طرح ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ اُس پُر سکون منظر میں، ایک باغبان پھولوں کو پانی دے رہا تھا، جو آنے والی افراتفری سے بے خبر تھا۔

اُدھر خالدہ کا خوبصورت کالا بلا، جس کی ایک آنکھ ایکو ابلو اور دوسری بوٹل گرین تھی، چستی سے ادھر اُدھر گھوم رہا تھا اور اپنا سنسنی خیز تماشا بنا رہا تھا۔ قسمت کا کھیل دیکھیے کہ اُترتا ہوا تھوک خالدہ کے بالوں

کے جوڑے پر جاگرا۔ خالدہ کے بال، جو اُس کے فیشن کے احساس کا عمدہ نمونہ تھے، اُس غیر متوقع مداخلت کے خلاف مضبوط قلعہ ثابت ہوئے، اور وہ اس واقعہ سے بے خبر خوشی خوشی بیٹھی رہی۔



روشنی کی ایک لکیر کھڑکی کے گلاس سے منعکس ہو کر اندر داخل ہوئی، جیسے اُمید کا کوئی پیغام لے کر آئی ہو۔

اُسے اندھیرے کی گہرائیوں سے خوف آتا تھا، شاید یہ ہی وجہ تھی کہ رات کے سناٹے میں وہ کلب کی رونق بن جاتی تھی۔

کلب، جہاں رات کی روشنیاں کبھی مدھم نہیں پڑتیں، وہاں کی چکاچوند اُسے اپنی زندگی کے اندھیرے کونوں سے دور رکھتی تھی۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ اپنے بستر پر لوٹ آتی اور خود کو نیند کے حوالے کر دیتی۔

اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی دنیا بے ترتیبی کے ایک بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔

اُس کی سانسیں تیز تھیں، اور پیشانی پر پسینے کی قطرے چمک رہے تھے جیسے کوئی خوفناک خواب اُس کے تعاقب میں ہو۔

اُس کی وگ، جو کبھی بے عیب نظر آتی تھی، اب ایک طرف کو سرک گئی تھی، اُس کے سر کی چمکتی ہوئی جلد کو بے نقاب کرتی ہوئی۔

کالی لپ اسٹک، جو کبھی اُس کی جرات کا اعلان کرتی تھی، اب اُس کے گالوں پر جنگ کے نشان کی طرح بکھری پڑی تھی۔

اُس کی کھوپڑی پر چیچپا جالی کی ٹوپي چھٹی ہوئی تھی، جیسے خوف کی ایک ٹھنڈی لہر اُسے چھو کر گزر گئی ہو۔

اُس کی آنکھوں میں خوف کی چمک تھی، جیسے کوئی ڈراؤنا خواب اُسے اپنی گرفت میں جکڑے ہوئے ہو۔

اُس کے ہاتھ اُس کے چہرے پر گرے، اُس کی اذیت کو سہارتے ہوئے۔ خواب کی باقیات اب بھی اُس کے ہوش و حواس پر اپنی گرفت مضبوط کیے ہوئے تھیں۔

اور پھر، بے ترتیبی کے اس درمیان، ایک خستہ حال موبائل فون نے ایک پریشان کن لہجے میں بجنا شروع کیا۔

کمرہ ایک خوفناک تناؤ کے ساتھ دھڑک رہا تھا جب وہ فون تک پہنچی، اُس کی کانپتی انگلیاں اُس کی بکھری ہوئی شکل کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اُس نے فون اٹھایا، اور ایک ہچکچاتے ہوئے سانس کے ساتھ بولی، ”بولو۔۔۔“

دوسری جانب سے میرب مونیز کی آواز آئی، ”پندرہ منٹ میں تیرے گھر کے باہر آ رہا ہوں۔“ میرب مونیز کوئی لڑکی نہیں تھی اور نہ ہی جینڈر ڈائیسفوریا کا شکار۔ وہ لڑکا تھا، وہ ایک فتنہ تھا، ایل جی بی ٹی کیو ایجنڈا کا ماسٹر مائنڈ۔۔۔!!۔

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

کمرے کی فضا میں سکوت کی ایک گہری پرت چھائی ہوئی تھی، جیسے کسی نے وقت کو تھام لیا ہو۔ ایمان نے گہری سانس لی، اور اُس کی سانس کے ساتھ ہی تناؤ کی لکیریں اُس کے چہرے سے غائب ہونے لگیں۔

اُس نے اپنے موبائل کو بغور دیکھا، جو اُس کی زندگی کے جھٹپٹے کی طرح ٹوٹا ہوا اور خستہ حال تھا۔ گھڑی کی سوئیوں پر نظر ڈالی، جو سہ پہر کے چار بج رہی تھیں، اُس نے محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ دن کا سامنا کرے۔

موبائل کو ایک طرف رکھ کر، اُس نے خود کو بستر سے اٹھایا، اُس کے ہاتھوں نے چادر کو جھٹکا دیا، جیسے کسی بوجھ کو اتار پھینک رہی ہو۔

اُس کی قدموں کی چاپ دروازے کی جانب بڑھی، جہاں اُس نے دروازے کو کھولا اور کمرے سے باہر قدم رکھا۔

اُس کی نظریں دیوار کے اُس خم پر پڑیں جو دائیں جانب مڑ رہی تھی، اور اُس نے اُس سمت میں قدم بڑھائے۔ سامنے ایک پرانا دروازہ تھا، جس کی چوکھٹ سے پینٹ اکھڑ رہا تھا۔

دروازے کے مقابل دیوار پر ایک بڑا خستہ آئینہ نصب تھا، جو ایمان کی شبیہ کو واضح طور پر عکس بند کر رہا تھا۔

دیوار کی سطح کو ایک خاص انداز میں موڑا گیا تھا، جیسے کسی دروازے کی جگہ کو چھپانے کے لیے۔

یہ جگہ نیم روشن تھی، جس سے ایک پُر اسرار اور گہرا تاثر پیدا ہو رہا تھا، جیسے کسی راز کی پر تیں آہستہ آہستہ کھل رہی ہوں۔

جب اُس نے دروازہ کھولا، تو اس کی چرچراہٹ نے اس جگہ کی خاموشی کو توڑ دیا۔

باتھ روم کا دروازہ اُس کے پیچھے بند ہوا، اور اُس نے اپنے آپ کو اُس خلوت کے حصار میں پایا جہاں وہ اپنے آپ کو دوبارہ ترتیب دے سکتی تھی۔ پانی کی بوندیں نل سے ٹپک کر ہوا میں رقص کرنے لگیں، اُن کی آواز کمرے کی خاموشی کو چیرتی ہوئی باہر تک پہنچی۔

اُس نے نل کھولا، اور روزمرہ کی زندگی کی معمولات شروع ہو گئیں، ہر ایک حرکت دنیاوی احساس کے ساتھ نشان زد ہوتی گئی۔

یہ ایمان کی دنیا کا ایک عام منظر تھا، اُس کے دن کے ابواب کے درمیان ایک وقفہ، جہاں وہ اپنے آپ کو دوبارہ ترتیب دے رہی تھی _____

غسل خانے سے باہر آتے ہوئے، ایمان کی ظاہری شکل میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوئی تھی۔

اس کے قدم ایک بار پھر اس کے خواب گاہ کی جانب بڑھے، جہاں اس نے خود کو ایک شکستہ آئینے کے سامنے پایا، جس میں اس کی متعدد تبدیلیوں کی عکاسی ہو رہی تھی۔

ایک سیاہ رنگ کی ٹی شرٹ اور گہرے نیلے ڈینیم کی جینز میں ملبوس، ایمان کی شخصیت میں ایک نئی جان آگئی تھی۔

اس کے بالوں کا باب کٹ اب نہیں تھا، بلکہ اس کی جگہ ایک چھوٹی سی گنج نے لے لی تھی، جو لڑکوں کی طرح نظر آرہی تھی۔

اس نے ایک جالی دار ٹوپی پہنی اور الماری سے ایک وگ نکال کر پہن لیا، جس سے اس کے سر پر ہیزل نٹ کے رنگ کے کرل بہہ نکلے، جو اس کے کندھوں تک پہنچتے تھے۔

اس کی آنکھیں، جو رات کی تاریکی میں چمک رہی تھیں، اب اس کے چہرے کو مزید دلکش بنا رہی تھیں۔

اس کے ہونٹوں پر سیاہ کی بجائے سٹرابیری کے رنگ کی چمک دار گلوں تھا جو اس کی مسکراہٹ کو گرمجوشی سے بھر رہا تھا۔

اس کی بائیں ابرو کو اب ایک سیاہ پنسل سے خوبصورتی سے بنایا گیا تھا، جو اس کے چہرے کی خصوصیات کو مزید نمایاں کر رہا تھا۔

اس کے کانوں میں لٹکتی گول سٹیل کی چھوٹی سی بالیاں اس کی مضبوط اور غیر متزلزل شخصیت کی عکاسی کر رہی تھیں۔

اس کی شرٹ پر ”آئی ایم آلٹیڈی بوس۔۔ آئی ایم آسلے کوئین“ کے الفاظ کے ساتھ ایک تاج کی تصویر بنی ہوئی تھی، جو اس کی اندرونی طاقت اور خود اعتمادی کا اعلان کر رہی تھی۔

اس کے ناخن، جو پہلے رنگین تھے، اب چھوٹے اور چمکدار تھے، جو اس کی شخصیت کی باریکیوں کو ظاہر کر رہے تھے۔

ایمان نے خود کو سنبھالا اور آئینے میں اپنی مسکراہٹ کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے اپنے کندھے اچکائے اور دیوار پر لٹکتے اپنے سیاہ پرس کو اٹھایا، اسے اپنے کندھے پر پھسلاتے ہوئے اسے اپنے جسم کے ساتھ ترچھا کر دیا۔

اس نے کمرے کے دروازے کو مقفل کیا اور باہر نکل گئی۔

لیکن جیسے ہی وہ راہداری میں قدم رکھنے لگی، ایک خیال نے اسے روک دیا۔ وہ واپس کمرے میں داخل ہوئی، کھڑکی بند کی، پردے ٹھیک کیے، اور کمرے کے کولر کو بند کر دیا۔

اب مطمئن ہو کر، وہ دوبارہ باہر نکلی اور دروازہ بند کر دیا۔

جیسے ہی ایمان نے باہر کی دنیا میں قدم رکھا، اس کی شخصیت میں ایک نئی جان آگئی۔

ایک نوجوان لڑکی کی حیثیت سے، جس کی عمر ابھی صرف اٹھارہ سال تھی، اس نے اپنے آپ کو ایک نئے سفر کے لیے تیار کیا، جہاں خریداری اور مہم جوئی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اس کی چال میں اعتماد تھا، اور اس کی آنکھوں میں مہم جوئی کی چمک تھی۔ ایمان نے اپنے آپ کو ایک نئے دن کے لیے تیار کیا، جہاں ہر لمحہ اس کے لیے ایک نیا موقع تھا۔



ایمان کی زندگی میں بھی ہیرا پنچا کی داستان کی طرح ایک قید و لنگڑا موجود تھا، جو اس کے باپ اور سوتیلی ماں کی صورت میں تھا۔

اس کی زندگی میں اور بھی بہت سے لوگ تھے جن کے خلاف وہ تنہا جنگ لڑ رہی تھی اور فتح یاب بھی ہو رہی تھی۔

وہ سلع کوئین تھی، اور ایک ملکہ کی طرح ہر مشکل کا حل جانتی تھی۔ اس کی شرٹ پر لکھے الفاظ اس کی مضبوط شخصیت کا عکس تھے۔

ایمان خوشی سے سیٹی بجاتی ہوئی سیڑھیوں کے دوسرے حصے کی طرف بڑھی، جو ایک کونے میں سیدھ سے آتی تھیں۔

یہ سیڑھیاں پتلی مگر خوبصورت تھیں۔ بائیں جانب ٹی وی لائونج اور سامنے داخلی دروازہ تھا۔ ایمان نے سٹیل کی ریلنگ پر ہاتھ رکھا اور ترچھی بیٹھ کر نیچے کی طرف سرکی، پھر اچانک چھلانگ لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اب دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی، اس کے قدم ہلکے اور بے فکر تھے۔

باورچی خانے سے آتی ہوئی آوازوں نے اس کی خوش مزاجی کو متاثر کیا، جہاں افطاری کی تیاریاں جاری تھیں۔

خالدہ کے گھر والوں کو شام کے کھانے پر مدعو کیا گیا تھا۔ ایمان نے طنزیہ مسکرا کر کہا، ”یہ لوگ روزہ رکھیں گے“، اور پھر اپنے راستے پر چلتی رہی۔

جیسے ہی ایمان نے کارپورچ میں قدم رکھا، گاڑیوں کی صف نے اس کا استقبال کیا۔ اس کی نظریں ایک سیاہ رنگ کی اسپورٹس کار پر جم گئیں، جس کا ڈیزائن اور قیمت دونوں ہی اسراف کی چیخیں مار رہی تھیں۔

ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ، ایمان نے گاڑی کی طرف دیکھا اور حقارت سے اس کے بونٹ پر تھوک دیا۔

اس کی مسکراہٹ پھیل گئی جب اس نے محسوس کیا کہ بدلہ پورا ہوا۔

اس کی چنچل حرکات اس دنیا میں اپنی موجودگی کا اعلان تھیں۔ صبح اس نے اپنی ماں کے بالوں کے جوڑے پر تھوکا تھا، اور اب اس کے بیٹے کی گاڑی پر۔ ایمان کی زندگی میں یہ اس کی بغاوت کی علامت تھی۔

.....^{ooo}.....

جوں ہی ایمان باغ کی راہ پر قدم بڑھاتی ہے، منی پلانٹ کی بیلین ایک شاندار گملے سے نکل کر پھیلی ہوئی ہیں، گویا سبزہ زار کی ایک جھلک جو آگے کی دنیا کی جانب متوجہ ہے۔

دیواروں پر چڑھتے کرپرز کے پتے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے انہوں نے اینٹوں کو اپنا لیا ہو، اور وہ ان کے ساتھ ایک ہو گئے ہوں۔

ایمان اپنی پیش قدمی میں مستحکم ہے، اس کا سر فخر سے بلند ہے، اور وہ اس سرسبز ماحول سے بے نیاز ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہے۔

باغ کے ایک جانب، خوشبودار چمبیلی کی بیلین ہوا میں اپنی خوشبو بکھیر رہی ہیں، جیسے کسی عطر کی خوشبو ہوا میں محو ہو رہی ہو۔

دوسری جانب، موتیا کے نازک پھول خاموشی سے کھڑے ہیں، ان کی مہک تتلیوں کو رنگینی اور رعنائی کے اس جال میں بلاتی ہے۔

باغ کی وسعت اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ کھلی ہوئی ہے، اس کے دونوں جانب قدیم لان پھیلے ہوئے ہیں، جیسے سبز رنگ کا ایک سمندر ہو۔

اس سبزہ زار کے بچوں بیچ، ایک مرکزی پیدل راستہ ہے جو گیٹ کی طرف جاتا ہے۔

ایمان کے قدموں کی گونج فٹ پاتھ پر سنائی دے رہی ہے، اور وہ اپنے بائیں جانب لان میں بکھرے لوگوں کی طرف بہت کم توجہ دیتی ہے۔

وہ اس خوبصورت نظارے سے گزر رہی ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہے۔

اس خوبصورت باغ میں، ایمان کی موجودگی ایک ناقابل یقین خود اعتمادی کی ہوا پھیلا رہی ہے، ایک شدید انفرادیت جو خود ہی زمین کی تزئین کی خلاف ورزی کرتی ہے۔

باغ کی پرسکون خوبصورتی کے درمیان، وہ مرکزی شخصیت بنی رہی، جو اپنے آپ میں فطرت کی ایک دلکش قوت تھی۔

جب ایمان نے باغ کی خاموشی میں اپنی سوتیلی ماں خالدہ کی آواز سنی، اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس کی نظریں بے یقینی سے چمک اٹھیں، اور ایک لمحے کے لیے اس نے اپنی ایڑی کو زمین پر رگڑا، جیسے وہ اپنے اندر کے طوفان کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اس کے سامنے کا منظر ایک ڈرامائی تبدیلی کا شاہد تھا ایک پرسکون لان اب ایک ہنگامہ خیز میدان میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اس کی سوتیلی بہنیں، اپنی کزنز کے ساتھ خوبصورتی سے چہل قدمی کر رہی تھیں، اور اس کا سوتیلابھائی، اپنے ہم جنس و عمر کے کزنز کے ساتھ ریکٹ بال کے کھیل میں مشغول تھا، وہ سب اس کی نظروں کے سامنے تھے۔

خالدہ، جو اپنی کرسی پر باوقار انداز میں بیٹھی تھی، نے ایمان کو دیکھتے ہی ایک تیکھا سوال داغ دیا۔ کوئی یار کے پاس جا رہی ہے اس وقت؟۔“

ایمان کے لبوں پر ایک شوخ مسکراہٹ تیر گئی۔

ایمان کے لبوں پر مسکراہٹ کی جھلک دیکھ کر خالدہ کے برابر بیٹھا جتوئی کچھ جھجکا، اور اُس نے ایمان کو چور نظروں سے اشارہ کیا کہ وہ خاموش رہے کیوں کہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ خالدہ نے کھائی میں چھلانگ لگا دی ہے۔

ایمان نے اپنے والد کی پریشانی کی لو کو محسوس کیا اور اُس کا دل خوشی سے بے تاب ہوا اٹھا۔

اور اس نے جواب دیا، ”تیرے باپ سے قبر میں ملنے جا رہی ہوں، دیکھوں گی کیا عذاب بھگت رہا ہے وہ۔ کیوں کہ اس کی تجھ جیسی غلیظ بیٹی جو ہے۔“

اس کے الفاظ نے مجمع میں ایک سناٹا چھوڑ دیا، ہر کوئی اس کی بے باکی پر دنگ رہ گیا۔ ایمان کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی، اور اس کے ہاتھوں کی حرکت میں ایک طنزیہ انداز تھا۔

ایمان نے بغیر کسی خوف کے گیٹ کی طرف قدم بڑھایا، اس کے ہر قدم سے اعتماد کی ایک لہر پھیلتی گئی۔ اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی، جیسے وہ اپنی آزادی کا جشن منا رہی ہو۔

جتوئی نے پس منظر میں اپنے سر پر ہاتھ دے مارا، دائیں بائیں کنکھیوں سے جائزہ لیا، اور اسی اثنا میں خالدہ کی شرمندگی کی بازگشت نے ماحول کو مزید بو جھل کر دیا۔

دفعۃً جب ایمان چل رہی تھی اس کی شخصیت میں ایک غیر متزلزل خود اعتمادی کا عکس نظر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے چھوڑی گئی دنیا اب ایک بے جواب سوالات کا میدان تھی، جہاں خالدہ کی بے بسی کی کہانی لکھی جا رہی تھی۔

ایمان نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تھا، اور اب وہ ایک نئی دنیا کی طرف بڑھ رہی تھی، جہاں اس کی مرضی کا راج تھا۔

..... _ _ _
_ _ _

گھر کے شاندار دروازے نے ایمان کی مضبوط دھکیل کے ساتھ اپنی دہلیز کھول دی، اور وہ اپنے قدموں کو خود اعتمادی کے ساتھ باہر رکھتی ہے۔

دائیں جانب، آفتاب کی روشنی درختوں کے پتوں کی درزوں سے چھنتی ہوئی آرہی تھی، جس سے درختوں کے سائے میں خیالی شکلیں بن گئیں، لیکن ایمان کے چہرے پر پڑنے والی روشنی نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی بھوری جھلک پیدا کی، گویا بہشت کی روشنی اس کی آنکھوں میں سمائی ہو۔

اس کی نظریں ایک درخت کے سایے میں کھڑی چمکدار گلابی کیبریولٹ پر جم گئیں، جس کی چھت کا نام و نشان نہ تھا۔

دوپہر کے آفتاب کی زرد روشنی میں اس نے کار کی طرف قدم بڑھایا۔ ڈرائیور کی نشست پر، ایک عجیب منظر کا انتظار تھا۔ ایک لڑکے کی شکل میں بنا ہوا زندگی بھر کا کھلونا، جو پیسے کے پیچھے بیٹھا تھا۔

مونیز، جو کہ اصل ڈرائیور تھا، ایمان کی راہ تک رہا تھا، بے صبری اور توقع سے بھرپور۔

جب ایمان، یانینسی، کار کے قریب پہنچی، اس کی موجودگی نے ایک طاقتور اثر چھوڑا۔

اس کی پہنی ہوئی پتلون اور قمیض اس کے اعتماد کی گواہی دے رہی تھی، اور اس کا لباس اس کے عزم کی مضبوطی کا ثبوت تھا۔ وہ کار کے دروازے کو روایتی طریقے سے کھولنے کی بجائے، ایک جانبار توانائی کے ساتھ، دروازے کے ہینڈل کو تھام کر، ایک چھلانگ کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی۔

اس کا یہ عمل ایک ایکشن فلم کے منظر کی طرح تھا، جس نے اس کی مطلق بالادستی کا اظہار کیا۔

ایمان کا یہ بہادرانہ قدم صرف کار میں چھلانگ لگانے سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ اس کے جذبے اور زندگی کی مہم جوئی کے لئے اس کے بے پناہ شوق کا اعلان تھا۔۔۔

مونیز کی نظریں اپنی دائیں جانب بیٹھی ایمان پر جمی ہوئی تھیں، جب وہ بے خونی سے کیبر یولیٹ کی سیٹ پر فاتحانہ انداز میں بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں عزم کی چمک تھی، جیسے وہ شاپنگ مال کی جانب اپنے سفر کے لیے تیار تھی۔ بنا مونیز کو دیکھے وہ بولی جیسے اپنے سامنے ہوا سے مخاطب ہو۔، اس کی آنکھوں میں ایک چنگاری تھی۔ ”کیا دیکھ رہا ہے گاڑی چلا“ اس نے پراعتما دلچے میں کہا۔

مونیز نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، اپنے سینے پر حیرت سے انگلی رکھتے ہوئے بولا، ”میں؟ اوہ، میں تو بس... یہ تمہاری گاڑی ہے، ایمان۔ میں تو بس دوستوں کا دوست ہوں، مجھے کیا پرواہ ہوگی؟“ اس کے چہرے پر ایک شرارتی مسکراہٹ تھی۔

ایمان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”جو سب کا دوست ہوتا ہے، وہ کسی کا دوست نہیں ہوتا۔“ اس کے لہجے میں طنز کی جھلک تھی۔

مونیز نے چابی کو مضبوطی سے گھمایا، اور انجن نے زندگی کی علامت کے طور پر گر جنا شروع کر دیا۔ کیبر یولیٹ کی طاقتور موٹر نے ایک مطمئن شیر کی طرح دھاڑنا شروع کر دیا۔ انجن کی گڑ گڑاہٹ نے جلد ہی ایک پر عزم گرج میں تبدیل ہو گئی، جیسے وہ اپنی طاقت کا اعلان کر رہا ہو۔

جیسے ہی پہیے سڑک کو چھوئے، کیبریولیٹ نے حرکت کی۔ محلے کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے، ہوانے موئیز کے بالوں کو بکھیر دیا، جب وہ موٹر پر موڑ لیتا تھا، اس کے ہاتھ پہیے پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ کار کی کھڑکی سے باہر کا منظر ایک رنگین موزیک میں دھندلا گیا، جو ان کی رفتار کا ثبوت تھا۔ درخت، مکانات، اور سڑک کے نشانات ماضی میں گم ہو گئے، ان کے سفر کا ایک مختصر پس منظر بن گئے۔

کھلی سڑک نے ان کا استقبال کیا، امید افزا مہم جوئی اور نامعلوم کی سنسنی کے ساتھ۔ موئیز، توجہ مرکوز اور کنٹرول میں، کیبریولیٹ کو ہر ایک منحنی خطوط کے ذریعے ماہرانہ طور پر چلایا، جیسے وہ مشین کا مکمل حکمران ہو۔ باہر کی دنیا ایک دھندلا پن بن گئی، حرکت اور رفتار کی جھانکی، اور آزادی کے احساس نے ہوا کو بھر دیا جب وہ کھلی سڑک پر آگے بڑھے، جو کچھ بھی آگے ہے اس کے لیے تیار تھے۔

جیسے ہی موئیز کی کیبریولیٹ مکدر اڑاتی نظر سے دور ہوئی، ایک پراسرار سایہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا دکھائی دیا۔

یہ ایک عجیب و غریب مخلوق تھی، جس کا وجود نور و ظلمت کی حدوں کے درمیان معلق تھا۔

اس کی بائیں جانب، شعلے بھڑک رہے تھے، جن کی شدت جہنم کی آگ سے مشابہ تھی۔ اس کے چہرے پر بدینتی کی ایک جھلک تھی، جس نے ایک خوفناک سایہ ڈالا تھا۔

دائیں جانب، اس کے چہرے پر ایک پرسکون روشنی تھی، جیسے چاندنی رات کی خاموشی میں چمکتا ہوا چاند۔ اس کے جسم سے ایک نرم نور پھوٹ رہا تھا، جیسے رمضان کی راتوں میں چاند کی مدھم روشنی۔

جیسے ہی گاڑی افق کی طرف بڑھی، مخلوق نے تیزی سے رد عمل کا اظہار کیا۔ ایک دم بھرنے والے لمحے میں، وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا، اس کی پر اسرار موجودگی ہوا کے جھونکے کی طرح سرگوشی کی طرح کھسک گئی۔ ہوا بذات خود اپنی سانس روک رہی تھی، جیسے روشنی اور تاریکی کے درمیان کائناتی جدوجہد کی گواہی دے رہی ہو۔

اس دل دہلا دینے والے منظر میں سورج اور رمضان کے مقدس مہینے کے حوالے نے شدت کو بڑھا دیا۔
ہوائی مخلوق کے آتش اور پُر سکون پہلوؤں کے درمیان اختلاف اچھائی اور برائی کے درمیان ابدی جنگ
کی آئینہ دار ہے، جب کہ ہو خود بھی اس مقابلے کے وزن سے لرزتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔



مال کی عظمت اور جلال کے درمیان، ایک جادوئی سرگرمی کی گہما گہمی نے خود کو ظاہر کیا، جیسے رمضان کے آخری دنوں کی رونق اور عید کی آمد کی خوشی ہوا میں بسی ہو۔

مال کی رونقیں عید کی خریداری کے جوش و خروش کا مرکز بن گئیں، جیسے ہی وفادار اپنے روزہ افطار کرنے اور عید کے پر مسرت موقع کو خوش آمدید کہنے کی تیاری کر رہے تھے۔

خاندانوں کے چہرے امید سے روشن تھے، جیسے وہ مال کی بھولبلیا کے راستوں میں سے گزرتے ہوئے اپنے شاپنگ بیگز میں خزانے سمیٹ رہے ہوں۔

راہداریوں میں گونجتی قہقہوں اور خوش گپیوں کی آوازیں، خریداروں کی آنے والے تہواروں کے لیے بہترین لباس کی تلاش کی کہانی سنارہی تھیں۔

شیلفوں پر سجے پیچیدہ کڑھائی والے ملبوسات، ان کے رنگوں کی بہار ایک کلیڈو سکوپ کی طرح دلکش تھی۔

سوٹ اور روایتی لباس، ہر ایک ثقافتی ورثے اور ذاتی انداز کی عکاسی کرتے ہوئے، ایک خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے۔

فوڈ کورٹ میں، تھکے ہوئے خریداروں کے لیے ایک پناہ گاہ بن گئی، جہاں روایتی پکوانوں کی خوشبو عالمی کھانوں کی خوشبو کے ساتھ مل کر ایک دلکش مرکب بنا رہی تھی۔

خاندان میزوں کے گرد جمع ہوتے ہیں، کھجور اور پانی سے افطار کرنے کا انتظار کرتے ہوئے، ان کی مسکراہٹیں موسم کے اتحاد اور خوشی کا ثبوت تھیں۔

مال کی رونقیں انسانی روح کی متحرک ہونے کا ایک زندہ ثبوت تھیں، جیسے تمام پس منظر اور زندگی کے شعبوں کے خریدار تیاری اور توقع کی اس سالانہ رسم میں حصہ لینے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ ہر خریداری، ہر ایک مشترکہ ہنسی، اور ہر دلی مبارکباد کے ساتھ، مال ثقافتوں اور روایات کا ایک متحرک موزیک بن گیا، جہاں عید کی خوشی بھری الٹی گنتی میں سبھی متحد تھے۔

مال کی گہما گہمی کے بیچ، جہاں عید کی خوشیوں کی گونج اور رمضان کی روحانیت کا احساس ہر سو پھیلا ہوا تھا، وہاں ایک خاموش کونہ بھی موجود تھا۔ اس ہنگامہ خیز ماحول میں، جہاں ہر شخص عید کی تیاریوں میں مصروف تھا، دو افراد ایسے بھی تھے جن کی بے نیازی انہیں باقیوں سے ممتاز کر رہی تھی۔ وہ دونوں، ایک دوسرے کی ضد، ایک سکون کے ساتھ مال کے گلیاروں میں چل رہے تھے۔ ان کی بے فکری نے انہیں عید کی خریداری کرنے والوں سے جدا کر دیا تھا، کیوں کہ وہ نہ تو آنے والی تقریبات کی رونق میں شریک تھے اور نہ ہی نئے لباس کی خواہش میں۔ ان کی موجودگی میں ایک معمولی خریداری کا ایجنڈا تھا، جو عید کی خوشیوں سے بے تعلق تھا۔

ایمان، ایک بوتیک کے سامنے کھڑی، بلتستانی طرز کے ایک خوبصورت لباس پر اپنی نظریں جمائے ہوئے تھی۔

اس کے پیچیدہ نقش و نگار اور زندہ دل رنگوں نے اس کی توجہ کو مکمل طور پر اپنی طرف کھینچ لیا تھا، اور اس کے ارد گرد کی ہلچل کے بیچ ایک سکون کا لمحہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کی اس تنہائی کو جلد ہی ختم کرنے والی ایک عورت ابھی اس کے قریب آرہی تھی۔

اس خاموش وقفے کے دوران، ایک ناخوشگوار آواز نے اس کے سکون کو بھنگ کر دیا۔ ”ایمان بیٹی“ ایمان نے فوراً اس آواز کو پہچان لیا اور اس کا دل بو جھل ہو گیا۔

وہ اس تصادم سے بچنے کی امید کر رہی تھی، لیکن مقدر نے کچھ اور ہی فیصلہ کیا تھا۔

ایک تیز موڑ کے ساتھ، ایمان اور موئیز نے اس دخل انداز کا سامنا کیا، اور فضا میں تناؤ کی ایک لہر دوڑ گئی۔

ایمان کے سخت لہجے نے اس کی بے چینی کو ظاہر کر دیا، اور اس کے دانت اس کی گردن کی رگوں کی طرح کھچ گئے۔ وہ عورت، جس نے ایمان کو ”بیٹی“ کہہ کر پکارا تھا، ایمان کے سرد مہری سے بے خبر نظر آرہی تھی۔

وہ قریب آئی، اور ایمان کے کندھے پر ایک تسلی بخش ہاتھ رکھنے کی کوشش کی، گویا وہ ایک خلا کو پر کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

لیکن ایمان کا رد عمل سرد تھا۔ اس نے عورت کے ہاتھ کو جھٹک دیا، اپنی بے دلی کا واضح اعلان کرتے ہوئے۔ ”چلو موئیز، ایمان نے سختی سے کہا، کسی بھی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے، کیوں کہ ماضی کے مقابلوں کے سائے اب بھی موجودہ لمحے کے تناؤ سے جڑے ہوئے تھے۔

عورت کے الفاظ ہوا میں ایک گونج کی طرح معلق تھے، ”کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟“ اس نے بے فکری سے کہا، اس کی آواز میں ایک یقین کا لہجہ تھا۔ ایمان کا جواب فوری تھا، اس کی نظریں عورت کی طرف ایسی شدت سے گئیں جیسے وہ کمرے کو آگ لگا دے گی۔ اس کا چہرہ، جذبات کے طوفان کو ظاہر کرتا ہوا، ایک سنجیدگی اور شدت کا کینوس تھا۔

ایمان کی آواز میں سختی تھی جب اس نے جواب دیا، ”آپ کی شناخت سے میری آنکھیں کب کی واقف ہیں، اور اب میری سمجھ بھی۔ کاش کہ یہ بصیرت مجھے زمانے پہلے نصیب ہوتی۔“ اس کے الفاظ میں وہ تلخی تھی جو ماضی کے زخموں کی گہرائی کو ظاہر کر رہی تھی۔ ایمان نے اپنی پیشانی پر بل ڈالے،۔۔

ایمان کی عمر اٹھارہ برس تھی، لیکن وہ ایک جنگجو کی طرح مضبوط تھی۔

دنیا کی سختیوں نے اسے ایسا انگارہ بنا دیا تھا جو سمندر ریاپانی کے سیاروں میں بھی جلتا رہتا۔

وہ انگارہ تھی جو سمندروں کو خشک کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی، وہ آگ تھی جو پانی کے سیاروں کو بھی سوکھا سکتی تھی۔

ایمان شخصیت کی وہ جلالت تھی جو کائنات کے مرکزی ستارے کو بھی اپنی محوریت کا قیدی بنا لیتی تھی، وہ جذبہ تھی جو خود آتش کو بھی خاکستر کر دینے کی قوت رکھتی تھی۔۔

ایمان نے آگے بڑھتے ہوئے قدم روکے، اس کی نظریں بلوری شیشے کے پار پڑیں، جہاں تین شخصیات قریب آرہی تھیں، ہر ایک اپنی الگ موجودگی کے ساتھ۔

دونو جوان لڑکیاں، جن کی جوانی کی توانائی واضح تھی، ایک ایسے شخص کے ساتھ چل رہی تھیں جس کی عمر چالیس سے پچاس کے درمیان تھی، جو خوش شکل تھا اور عمر سے کافی کم نظر آتا تھا۔

ایمان کے دل میں طنز کی تلوار چمک اٹھی، اور اس کے الفاظ میں طنز کی تیزی تھی۔

اس نے اپنے سامنے کھڑی عورت کو مخاطب کیا، ”آپ کی سگی بیٹیاں اور آپ کا لاڈلا شوہر آرہے ہیں، کہیں مجھے آپ کے ساتھ دیکھ لیا تو یہ نہ ہو کہ گلا کریں۔“ اس کی آواز میں مزید تلخی آگئی، ”ان کے گلوں کا جواب میں کیسے دوں گی؟ وہ تو پڑھی لکھی انگریز لڑکیاں ہیں، اور میں تو جاہل پینڈو گوار ہوں، جس کے باپ نے اسے تین کلاسوں کے بعد پڑھایا تک نہیں۔ میں چلتی ہوں۔“

ایمان کے لہجے میں برتری کی ہوا تھی، اور وہ اس لمحے کا مزہ لے رہی تھی۔

اس کے الفاظ نے ان کے تعلقات کی پیچیدگیوں اور واقعات کے غیر متوقع موڑ کو روشن کیا۔

جیسے ہی تین نئے آنے والے قریب آئے، مال کا ماحول پس منظر میں دھندلا گیا، اور ان کی موجودگی نے پہلے سے چارج شدہ ماحول میں سازش کی ایک اور تہ کا اضافہ کیا۔

ایمان نے اپنے جذبات کو ظاہر کیا اور اس جدائی کے تبصرے سے اپنے دل کو ہلکا کیا۔

وہ خوش اسلوبی سے باہر نکلی، ہمقدم مونیزا ایمان کا قدم حتمیت کا احساس لیے ہوئے۔

جس عورت کا اس نے سامنا کیا تھا، وہ صرف اس کی پیچھے ہٹی ہوئی شکل دیکھ سکتی تھی، جذبات کا مرکب اس کے چہرے پر چھایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ اور درد سے بھری امید کی کرن تھی، ان کے غیر متوقع طور پر دوبارہ ملنے کے بعد جذبات کی ایک پیچیدہ لہر باقی تھی۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی، ان کے درمیان بڑھی ہوئی کھائی کو پاٹنے کے لیے، لیکن ایمان پر عزم اور ڈٹی رہی، ایک بار بھی اسے تسلیم کرنے کے لیے پیچھے نہیں ہٹی۔

ایمان جیسے ہی ایگزٹ پر پہنچی اور کھلی فضا میں قدم رکھا، تو وہ ایک غیر متوقع نظارے سے ملی۔ وہ آدمی اور وہ دو لڑکیاں، جو قریب آچکے تھے، اب اس کے سامنے کھڑے تھے۔ لڑکیوں نے نوعمری کے فخر کی ہوا نکالی، ان کے تاثرات یہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے ابھی کچھ غیر معمولی دیکھا ہے۔

وہ شخص، جو ایمان کی تبدیلی سے واضح طور پر حیران تھا، حقیقی حیرت کے احساس کے ساتھ بولا

،۔ ”ایمان، تم تو بالکل بدل گئی ہو۔“ اس کی آواز میں چھپی دھمکی کی جھلک تھی، جیسے وہ ایمان کے اندر کی طاقت کو چیلنج کر رہا ہو۔

ایمان کی آنکھوں میں جوابی چمک تھی، اور اس کے لہجے میں ایک پراسرار یقین تھا جب اس نے کہا، ”زمانے کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے، اور کبھی کبھی کمزوریاں ہی ہماری سب سے بڑی طاقت بن جاتی ہیں۔“

اس شخص نے ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ ایمان کی طرف دیکھا، جیسے وہ ایمان کے اعتماد کو پرکھ رہا ہو۔ اس نے ایک نیا داؤ چلتے ہوئے کہا، ”تم نے اپنی ماں سے ملاقات کی ہے، ہے نا؟“

ایمان کا جواب فوری اور سخت تھا، ”میں نے انہیں دیکھا اور گزر گئی، کیوں کہ میرے پاس ان کے بے معنی سوالات کے جوابات نہیں ہیں۔“

ایمان نے اس شخص کی طرف دیکھا، جو اس کی تبدیلی پر حیرت زدہ تھا، اور پھر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا، ”میں نے بہت وقت ضائع کر دیا تمہارے ساتھ۔“ اس کے لہجے میں ایک واضح تنزیلی تھی، جیسے وہ اپنے ماضی کے فیصلوں پر نادم ہو۔

ایمان نے اسے شخص کو دیکھا اور ہاتھ کے برخاست اشارے کے ساتھ اسے ہٹنے کو کہا ”سامنے سے اپنا وجود ایک جانب کر لو شاباش۔۔۔“

وہ آدمی ایک طرف ہوا کیوں کہ ایمان کا انداز اتنا کمانڈگ تھا کہ کوئی بھی ہوتا وہ ایسا ہی کرتا مگر وہ شخص اپنے ہی انداز پر حیران تھا۔۔

اس کے بعد، ایمان نے سامنے کھڑی دو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کو ہلکے سے دھکیل دیا، جیسے وہ اس کی موجودگی کو بھی محسوس نہیں کر رہی ہو۔ لڑکی چونک کر پیچھے ہٹی اور ایمان کو غصے سے دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا،

”Behave!“

لیکن ایمان نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنا راستہ جاری رکھا، جیسے وہ ان کی موجودگی کو اہمیت نہیں دیتی۔

ایمان کے قدموں میں ایک مقصد تھا، اور وہ بغیر کسی لفظ کے آگے بڑھ گئی، جیسے وہ اس ماحول سے خود کو آزاد کر رہی ہو۔

اس کے چہرے پر ایک سرد مسکراہٹ تھی، جیسے وہ اس تمام تناؤ سے بالاتر ہو۔ اس کی آواز میں ایک طنز تھا جب اس نے کہا، ”میں نے اپنا وقت ضائع کر دیا ہے، لیکن اب میں اپنی زندگی کو نئی سمت دے رہی ہوں۔“

ایمان کے جانے کے بعد، وہ شخص اور اس کی بیٹیاں حیرانی اور مایوسی کے ملے جلے جذبات میں ڈوب گئے۔ ان کے چہرے پر ایک سوال تھا، کہ ایمان نے کیسے اتنی جلدی خود کو بدل لیا۔

مگر کشیدگی کی یہ لہر اب بھی فضا میں تیر رہی تھی، جیسے ایک غیر متوقع ملاقات کے بعد کی بازگشت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

اس شخص نے، جس کی بیٹی کو ایمان نے راستے سے ہٹایا تھا، ایمان کی رخصتی کی پشت کو دیکھتے ہوئے کڑکتے ہوئے کہا، ”وہ اس کی قیمت چکائے گی۔“ اس کے ہاتھ نے بیٹی کے سر پر محبت سے تھپکی دی، جیسے وہ اسے تسلی دے رہا ہو۔

بلوری شیشے کے پار سے ایمان کی ماں نے انہیں خالی نظروں سے دیکھا، جیسے وہ اس منظر کو سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔ جب اس شخص نے ایمان کی ماں کی طرف دیکھا، تو اس نے دروازہ دھکیل کر اندر قدم رکھا، جیسے وہ اس ماحول سے خود کو الگ کر رہا ہو۔

ایمان کی ماں کے چہرے پر ایک گہری اداسی تھی، جیسے وہ اپنی بیٹی کی جدائی کا غم محسوس کر رہی ہوں۔

ان کی آنکھوں میں ایک خالی پن تھا، جیسے وہ اس واقعے کی گہرائی کو محسوس کر رہی ہوں۔

اس کے شوہر کی آواز میں ایک سرد مہری تھی، جیسے وہ ایمان کے رویے سے نالاں ہوں۔ ان کے درمیان کی کشیدگی اب بھی محسوس کی جاسکتی تھی، ایک ناختم ہونے والی کہانی کی طرح۔

.....°°.....

مال کی چہل پہل سے بلند، اوپری منزل پر واقع ایک خوبصورت کیفے میں، ایمان اور مونیٹ نے ایک کونے کی میز پر جگہ بنائی تھی۔

کیفے کا ماحول سکون بخش تھا، تازہ بنی کافی کی مہک فضا میں گھل رہی تھی۔ دونوں نے ریلنگ کے ساتھ میز کا انتخاب کیا تھا، جہاں سے نیچے کی رونق کا منظر نامہ واضح نظر آرہا تھا۔

تھہرے اور گفتگو کی آوازیں ایک موسیقی کی طرح مال کی گہما گہمی سے اوپر تک پہنچ رہی تھیں۔

ایمان کے چہرے پر بادلوں کا گھیرا تھا، اس کی آنکھوں میں کچھ تلخی جھلک رہی تھی۔

مونیٹ نے اپنی دوست کی بے چینی کی وجہ جاننے کی کوشش کی، ”کیا بات ہے، ایمان؟ ماں کو دیکھ کر اتنا موڈ کیوں خراب ہوا؟“ اس کی نظریں ملاقات کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

ایمان نے میز پر اپنا ہاتھ مارا اور پھر نظریں چرائیں، اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے۔ اس کی آواز میں ایک مدافعتی سرگوشی تھی، ”میں اپنے دن کو بے کار باتوں اور فضول لوگوں کی وجہ سے خراب نہیں کرتی۔“

کیفے کی گرم روشنی اور دلکش سجاوٹ نے ایک جادوئی ماحول بنا دیا تھا، جیسے وہ مال کی ہنگامہ خیزی سے ایک پرسکون جزیرہ ہو۔

چھوٹے بچے اپنی ٹافیوں کو چوس رہے تھے اور نازک پیسٹریوں کو نوش کر رہے تھے، اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں میں مگن۔

میرب نے آگے جھک کر ایمان کی آنکھوں میں دیکھا، اس کے چہرے پر فکر مندی اور دلچسپی کے آثار تھے۔ وہ اپنی دوست کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا، کیوں کہ ان کے درمیان کچھ ان کہی باتیں موجود تھیں۔۔۔ وہ کچھ کہتا کہ اتنے میں

دوستوں کی گفتگو کے دوران، ایک ویٹر نے مہارت سے ان کی میز پر دو بیف برگر کی پلیٹیں رکھیں۔

اس کی مسکراہٹ میں خیر مقدمی جذبہ تھا جب اس نے کہا،

”لطف اندوز ہوں“

ایمان نے ایک معنی خیز نظر کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی، کیچپ کی ایک بھرپور مقدار کو برگر پر لگاتے ہوئے۔

موزیک پیشانی پر شکنیں تھیں، اس کی آنکھوں میں فکر مندی کی جھلک تھی جب اس نے ایمان سے کہا،
”تمہاری والدہ کی محبت کو دیکھ کر تمہارا دل کیوں بو جھل ہوتا ہے؟“۔

ایمان نے ایک گہری سانس لی اور برگر کو کاٹتے ہوئے جواب دیا، ”اگر اتنی ہی پسند ہیں تو تم ہی رکھ لو انہیں۔ ایسا کرو گود لے لو“ اس کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی، جیسے وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔

کیفے کی گرما گرم روشنی اور معطر فضا نے ان کے درمیان ہونے والے مکالمے کو ایک خوشگوار پس منظر فراہم کیا۔

مونی نے ایک مصنوعی ناراضگی کے ساتھ اپنا برگر نیچے رکھ دیا اور ایمان کو چھیڑا،۔
۔ ”تم تو کچھ بتاتی ہی نہیں ہو۔“

ایمان نے برگر کا ایک بڑا کاٹ لیا اور چباتے ہوئے کہا، ”تمہاری دوہری زندگی کے بارے میں، میں نے کبھی سوال نہیں کیا، ہے نا؟ کہ تم رات کو جمیلہ اور صبح کو جمیل کیوں ہوتے ہو“ اس کی آواز میں چھپی ہوئی شرارت تھی۔

مونی نے ایک ہنسی کے ساتھ اپنا برگر دوبارہ اٹھایا اور کہا، ”چلو، جیسے تمہاری مرضی۔“ ان کی بات چیت میں ایک دوستانہ رقابت تھی، جیسے وہ ایک دوسرے کی عادات کو جانتے ہوں۔

کیفے کی زندگی بھرپور تھی، ہر طرف سے آوازیں اور خوشبوئیں آرہی تھیں، جو ان کے مکالمے کو اور بھی دلچسپ بنا رہی تھی مگر پھر مونی کو کچھ کھٹکا اس نے برگر پلیٹ پر رکھا اور ایمان کو پتلیاں سُکیر کر دیکھا۔

اس کی نگاہیں ایمان کی پراسرار زندگی کے رازوں کو کھولنے کے لیے بے تاب تھیں، اور وہ اس سے مسلسل سوالات کرتا رہا۔ ”لیکن پھر بھی ایمان اتنی تلخیوں کے باوجود تمہارے والد تمہارا خیال رکھتے ہیں یعنی تم سمجھ رہی ہو کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔“

ایمان، جو اپنے ماضی کی گتھیوں کو سلجھانے میں ماہر تھی، نے ایک گہری نظر کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور برگر کا ایک کاٹا لیتے ہوئے کہا، ”میرے والد کی مجبوری ہے کہ وہ مجھے پیسے دیتے ہیں۔“ اس کے الفاظ میں ایک گہری سمجھ تھی، جیسے وہ ایک پیچیدہ کہانی کا ایک حصہ بتا رہی ہو۔

مونی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا، ”ایسی بھی کیا مجبوری کہ وہ پیسے دیتے ہیں؟“

ایمان نے ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ میں کمزور ہوں، لیکن وہ نہیں جانتے کہ میں ان کی کمزوری ہوں۔“ اس کے الفاظ میں ایک چھپی ہوئی طاقت تھی، جیسے وہ اپنے والد کی کمزوریوں کو جانتی ہو۔

کیفے کی رونق میں، ان کی گفتگو نے ایک گہری اور پیچیدہ کہانی کو بے نقاب کیا، جیسے وہ زندگی کے رازوں کو کھول رہے ہوں۔

ان کے درمیان کی گفتگو نے ایک دوستانہ لیکن پیچیدہ رشتے کی جھلک پیش کی، جو ان کی غیر معمولی باتوں کے باوجود بھی مضبوط تھا۔

کیفے کی زندگی ان کے مکالمے کے ساتھ گونجتی رہی، ایک دوستانہ لیکن پیچیدہ رشتے کی جھلک پیش کرتی رہی۔

ایمان کی پُر اسرار زندگی کے بارے میں مونیز کا تجسس ناقابلِ تسخیر معلوم ہوتا تھا جب وہ اسے سوالات کے ساتھ پوچھتا رہا۔

آخر کار، ایمان ایک دائمی معمہ بنی رہی، یہاں تک کہ کسی ایسے شخص کے لیے بھی جس نے اس کے ساتھ اپنی زندگی کے چار سال بانٹے تھے۔

اس نے آرام سے کولڈ ڈرنک کا ایک گھونٹ لیا، گلاس واپس میز پر رکھ کر دبایا۔ ”کہنا کیا چاہتی ہو۔“

وہ تھوڑا سا آگے جھکتے ہوئے اس کی نظریں ایمان پر جمی ہوئی تھیں۔ ”تمہارے باپ کے تمہارے ساتھ اچھے تعلقات نہیں لگتے، پھر بھی وہ تمہیں پیسے دیتے ہیں۔ تم ان کے گھر میں رہتی ہو، مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔“

ایمان کا جواب غیر معمولی تھا جب وہ اپنے برگر پر چباتی رہی، اس کے ہونٹ ایک جانی پہچانی مسکراہٹ میں گھوم رہے تھے۔ ”اس کی مجبوری ہے،“ اس نے ریمارکس دیے، اس کے الفاظ تفہیم کا احساس لے کر طنز سے رنگے ہوئے تھے۔

مونیز اندر جھکا، متجسس ہوا، اور پوچھا، ”مطلب؟“

ایمان نے بے ساختہ کندھے اچکا کر اور آنکھوں میں طنز کے اشارے کے ساتھ جواب دیا، ”بیچارے نے سوچا کہ میں جاہل ہوں، میں سست ہوں، میں ان پڑھ ہوں، اس لیے وہ مجھے جیسے چاہے گا استعمال کرے گا۔“ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ، اس نے اپنے مشروب کا ایک گھونٹ لیا، صورت حال کی ستم ظریفی سے پوری طرح واقف تھی۔۔۔۔

ایمان کے الفاظ سوچ سمجھ کر اور محتاط طریقے سے ادا کیے گئے، ”مگر افسوس میں ان حصص کو اسے بھڑکانے کے لیے استعمال کرتی ہوں۔ اور بدلے میں، وہ مجھے معاوضہ دیتا ہے۔“ اس کی وضاحت میں ایک سکون تھا، اور ایک بے فکری سے کندھے اچکانے کی حرکت نے اس کے ارادوں کی سادگی کو ظاہر کیا۔

مونی نے پریشانی سے اپنی پریشانی پر بل ڈالے اور ایک اور سوال کیا، اس کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی، ”جب اس کے دو بیٹے ہیں تو تم کیوں؟“ اس کی حیرت اس کے چہرے پر نمایاں تھی، اور اس کا صبر ختم ہوتا جا رہا تھا۔

ایمان نے ایک شوخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”گندے ماں باپ کی ناجائز اولاد۔“

اس کے الفاظ نے مونی کو حیرانی میں چھوڑ دیا، ”کیا؟“ وہ چیخ اٹھا، اس کے انکشاف کے معنی سمجھنے سے قاصر۔

ایمان نے طنزیہ نظروں سے جواب دیا، ”میں نے یہ تم سے نہیں کہا، میرا سوتیلا بھائی، جو مجھ سے بڑا ہے، ناجائز ہے، وہ بغیر شادی کے پیدا ہوا ہے۔ اور جب تک چھوٹا پیدا نہیں ہوا تھا، سب کچھ میرے نام تھا، چونکہ بڑا ناجائز تھا تو اس کے نام کچھ نہیں ہو سکا۔ میں قانونی وارث تھی، اس لیے میرے نام چالیس فیصد حصص دیے گئے تھے۔“ اس کے الفاظ میں ایک مزاحیہ اور تجسس بھرا احساس تھا، جیسے وہ اپنے خاندان کے رازوں کو ایک بڑے داؤ پر لگے ہوئے کھیل کی طرح کھول رہی ہو۔

پھر ایمان افسوس سے بولی ”مگر میرا چھوٹا بھائی وہ تھا تو سوتیلا مگر تم جانتے ہو مونیز وہ سب سے زیادہ مجھے چاہتا تھا اگر کسی نے مجھے اب تک چاہا تو وہ میرا چھوٹا بھائی انفال تھا مگر ایک ایکسیڈینٹ میں اس کی موت ہو گئی“ ایمان مغموم سی گردن جھکالی۔

اس لمحے میں، مونیز نے خود کو رازوں اور پیچیدگیوں کی دنیا میں دھکیلے ہوئے پایا، جس نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

خیر مونیز کو اس بات نے زیادہ متاثر نہ کیا کیوں کہ ایمان ہمیشہ یہ بات کہتی تھی کہ اب تک اس کے جوہر کو کسی نے سمجھا تو وہ اس کا چھوٹا بھائی ہی تھا اب تو مونیز کے کان تک پک چکے تھے ایک بات سن سن کر وہ اب ایمان کے۔ حوالے سے مزید سننا چاہتا تھا شاید کسی مقصد کے لیے۔

مونیز کے مسلسل سوالات نے ایک بنیادی بے چینی کو ظاہر کیا، جیسے کہ صورتحال کے بارے میں کسی چیز نے اسے شدید پریشان کر دیا ہو۔

وہ مزید تفتیش کے سوا کچھ نہیں کر سکا، اس کا لہجہ بے یقینی سے بھرا ہوا تھا۔ ”حصص تو اٹھارہ سال کے بعد رجسٹرڈ ہوتے ہیں، یعنی شخص قانونی نامزد ہوتا ہے،“ اس نے قیاس آرائی کی۔

ایمان کی ہنسی، طنز سے رنگی ہوئی، ایک دلیر چیلنج کی طرح ہوا میں ناچ رہی تھی۔ ”یہ پاکستان ہے، بے بی، یہاں کچھ بھی ممکن ہے،“ اس نے شرارتی چمک کے ساتھ کہا۔

اس نے اپنی نظریں موئیز کی طرف موڑ کر کہا، ”خود کو دیکھو۔“

موئیز چنچل جانچ کے تحت شرمایا، اس کی معصوم ناراضگی واضح تھی۔ ”تم بہت بد تمیز ہو“ اس نے جواب دیا، اس کی آواز میں احتجاج کا اشارہ تھا۔

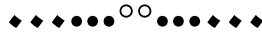
ایمان دل بھری ہنسی میں پھٹ پڑی، اس کی پراسرار فطرت لمحہ بہ لمحہ کھلے دل سے تفریح کا راستہ دیتی ہے۔

پھر، ایک شیب شفر کی طرح، وہ اپنے پراسرار نفس میں واپس آگئی۔ ”کبھی ہم بھی نرم مزاج تھے“ اس نے آواز دی، اس کی آواز شاعرانہ معیار کو لے رہی تھی۔

زمانے کی سختی اور لوگوں کی تلخیوں نے ہمیں بد تمیز بنا دیا۔“

ایمان نے آہستہ سے کہا، اس کی آواز میں ایک دھیمی لیکن گہری دھن تھی، جیسے وہ زندگی کے سبق کو نغمے میں ڈھال رہی ہو۔

- ”یہ انسان اور یہ دنیا بہت کچھ سیکھاتے ہیں۔۔۔۔۔ انسان ہی انسان کا سبق بتاتا ہے۔“



مغرب کی آمد آمد تھی، اور آسمان پر سورج کی نارنجی روشنی پہاڑوں کے درمیان سے غروب ہوتی نظر آ رہی تھی۔

آسمان پر گلابی، جامنی، نارنجی، اور نیلے رنگ کی چھٹا بکھری ہوئی تھی، جیسے کسی مصور نے اپنے خوابوں کو کینوس پر اتار دیا ہو۔

دور دور تک پھیلی عمارتیں، جو دور سے نقطوں کی مانند نظر آرہی تھیں، اور دو طرفہ سڑک کے دونوں جانب درختوں کا جنگل تھا، جس کے بیچ میں ایک پگڈنڈی تھی۔

ایمان، جس کی وگ ہیزل نٹ کلر کے بالوں سے بنی تھی، ہوا میں لہرا رہی تھی۔ اس نے اپنی کہنی کو کار کی کھڑکی کے درمیان میں رکھا اور سر کو ہاتھ پر ٹکا کر باہر کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔

کیبریلوٹ کار کی چھت نہ ہونے کی وجہ سے، اس کی وگ کے بال آزادی سے ہوا میں لہرا رہے تھے جبکہ وہ خلا کو دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

مونی نے اسے آواز دی، ”ایمان۔“

ایمان نے سیدھا ہو کر اس کی جانب دیکھا، ”بولو۔“ اس کی وگ اتنی مضبوطی سے لگی ہوئی تھی کہ ہوا کے باوجود اڑنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

مونی نے ایک تیر چھی نظر سے اسے دیکھا اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے پوچھا، ”ایمان، تمہیں کیسا لڑکا پسند ہے شادی کے لیے؟“۔

ایمان نے ہنس کر جواب دیا، ایک پھسپھسائی سی آواز میں، ”جہاں لفظ شادی اور لڑکا ہو، مجھے وہ دونوں چیزیں ہی نہیں پسند۔“۔

مونی نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا، ”تم کیا ساری زندگی اکیلی رہو گی؟ کوئی تو ہو گا جو تمہیں پسند ہو گا۔“۔
ایمان نے بیزاری سے آنکھیں گھمائیں، ”ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ مجھے کوئی پسند آئے۔“ اس نے زبان دانتوں تلے رکھ کر ایک کک کی آواز نکالی اور پھر باہر دیکھنے لگی۔
مونی نے کہا، ”پھر بھی کوئی تو ہو گا۔“۔

ایمان نے زچ ہو کر جواب دیا، ”نہیں ہو سکتا، مونی۔“۔

مونی بھی ضد پر اتر آیا تھا ”اگر تمہیں کسی سے محبت ہو جائے تو“۔

ایمان نے آنکھیں گھمائیں ”مجھے محبت سے نفرت ہے۔“۔

مونی نے چنوتی دیتے ہوئے کہا، ”اگر ہو جائے تو پھر؟“۔

ایمان نے جواب دیا، ”۔

اگر ایسا میں کر گزری تو وہ ہی مردِ حقیقی کہلائے گا، وہ ہی جو خصلت و سیرت میں بے مثال ہوگا، جس کی جانب میرا دل مائل ہوگا۔ وہ محض نام کا مرد نہیں، بلکہ اصل مرد ہوگا، جس کی طرف میری رغبت جاگے گی۔ وہ میری قدر کو پہچانتا ہوگا، میری عزت کرنے کا سلیقہ جانتا ہوگا، کیوں کہ میں کسی کی جانب آسانی سے مائل نہیں ہوتی۔ یہ ایک دشوار گزار راہ ہے، جس دن سورج مغرب سے طلوع ہوگا، اسی دن نینسی کسی کی جانب رغبت کا اظہار کرے گی۔ میرا یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ ”۔

۔ لفظ نینسی پر نظر ثانی کرتے

ایمان کی یادداشت کے درپے سے کچھ خیالات نکل کر سامنے آئے، اور اس نے مونیٹ کی جانب ایک تیکھی نظر ڈالی، ”میں نے تمہیں بارہا کہا ہے کہ میرا نام نینسی ہے، ایمان نہیں۔ ”۔

مونیٹ نے بے نیازی سے کندھے اچکائے، ”مجھے تمہارا یہ نام زیادہ بھاتا ہے، میں تو یہ ہی کہوں گی۔ ”۔

ایمان نے بے اعتنائی سے ہاتھ لہرایا، ”ہاں، کہتے رہو، انسان کی عادت ہوتی ہے کہ جس چیز سے منع کیا جائے، وہ ہی کرتا ہے، خصوصاً جب اسے معلوم ہو کہ سامنے والا اس بات سے ناراض ہو رہا ہے۔ تو بولتے رہو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ”۔

سامنے کا منظر ایک جھکے ہوئے درخت کا تھا، جس کی شاخیں باہر کی طرف مائل تھیں۔ اس درخت کے نیچے، موئیز نے اپنی گاڑی ایک جانب کھڑی کی، جیسے کسی اہم لمحے کا انتظار کر رہا ہو۔ اچانک، سورج غروب ہوا اور اذان کی آوازیں گونج اٹھیں، کیوں کہ افطار کا وقت قریب آچکا تھا۔

اسلام آباد کی سڑکیں سنسان تھیں، اور ہر طرف سکون کا راج تھا۔ موئیز نے کار کو ایک بڑے درخت کی حفاظتی چھاؤں میں ایک ویران جگہ پر روک دیا۔

کار کا انجن پس منظر میں ہلکا سا گونج رہا تھا۔ خاموشی کو صرف کبھی کبھار ہوا میں پتوں کی سرسراہٹ نے توڑا۔

یہ روزمرہ کی زندگی کی مصروفیات سے ایک وقفہ تھا، فطرت کی آغوش میں ایک عارضی پناہ۔

موئیز نے کار کی سیٹ کے نیچے سے ایک سیاہ بیگ نکالا، جس میں آئیس کے کرسٹل سے بھرے پلاسٹک کے چھوٹے پیکٹ تھے۔

اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی جب اس نے ایک پیکٹ کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان نازکی سے پکڑا۔

ایک چنچل انداز میں، اس نے ایمان کے سامنے پیکٹ کو ہلایا اور کہا، ”سرپرائز۔“

ایمان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، اس کی آنکھیں مویز کے اشارے کی تعریف کرتی نظر آئیں۔
”مویز، تو واقعی ایک شاندار دوست ہے،“ ایمان نے خوشی سے کہا، اس کی خصوصیات میں نرمی کا اظہار
ہو رہا تھا۔

لیکن اس لمحے کی خوشی میں ایک چڑچڑاپن کا اشارہ بھی تھا کیوں کہ ایمان نے بغیر کسی مدد کے کہا، ”تو نے
کتنا انتظار کروایا۔“ شکریہ اور جھنجھلاہٹ کے درمیان کشمکش ان کے رشتے کی پیچیدگیوں کی گواہی دے
رہی تھی۔

آسمان پر رنگوں کی بہار تھی، جہاں زندگی کی تلخ حقیقتوں کی شاعری آویزاں تھی۔

یہ وہ پل تھا جب خاموشی نے سکوت کے ساتھ یہ احساس دلایا کہ اس فانی دنیا میں صرف اللہ کا ساتھ ہی سچا
ہے۔ انسان اپنی خواہشات اور ضروریات کی خاطر دوسروں کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال
کرتے ہیں۔ محبت اور وفاداری کی قدر ان لوگوں کے لیے بڑھادی جاتی ہے جو اسے فائدہ مند سمجھتے ہیں،
جبکہ دیگر کو محض مہرے کی طرح استعمال کر کے رکھ دیا جاتا ہے، جو اب اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔

غروب آفتاب کی سرخی میں ڈوبتے دلوں کی دھڑکنیں ان گہرے جذبات کے بوجھ تلے محسوس ہوتی ہیں،
اور دنیا کی بے یقینی ان کے ارد گرد درقص کرتی ہے، بغیر کسی آسان حل کے۔

ایمان کی مسکراہٹ کا جادو تھا۔ اس نے مویز کے ہاتھوں سے پیکٹ چھیننے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن مویز
نے پیکٹ کو پیچھے کھینچ لیا، گویا کہ وہ ایمان کو آزما رہا ہو۔

مونیز کی آنکھوں میں شرارت بھری چمک تھی، اور اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا، ”نہیں، نہیں، پہلے پیسے دو۔“

ایمان نے مایوسی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہا، ”پہلے مجھے بیگ دو۔“

مونیز نے پیکٹوں سے بھر اسیاہ بیگ ایمان کی طرف بڑھا دیا۔ ایمان نے بیگ کو جلدی سے تھام لیا، اور اس کی انگلیاں بیگ کے ہینڈلز کے گرد لپٹ گئیں۔

اس نے اپنے بیگ سے دو گڈیاں نوٹ نکال کر مونیز کو دیں۔

مونیز نے نوٹوں کی کر کر اہٹ کو محسوس کرتے ہوئے، ان کی تازگی کا لطف اٹھایا اور مسکراہٹ کے ساتھ رقم قبول کی۔

اس لمحے میں، مونیز نے انسانی فطرت کے ایک تاریک پہلو کو ظاہر کیا، یہ دکھاتے ہوئے کہ انسان کس طرح دوسروں کو اپنی خواہشات اور فائدے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

جب دنیا کسی معصوم کو استعمال کرتی ہے تو اللہ ہی اس کی حفاظت اور رہنمائی کرتا ہے۔

زندگی کے کھیل اور بے یقینی کے درمیان، یہ روحانی یقین کہ انسانی تعلقات کی عدم استحکام کے باوجود، ایک اعلیٰ طاقت ہمیشہ ان کی نگرانی کرتی ہے اور انہیں سکون فراہم کرتی ہے۔

ایمان پیکٹوں کی طرف دیکھ رہی تھی، اور اچانک اس کا دل سکڑ گیا، ایک عجیب بے چینی نے اسے گھیر لیا۔
مونیز کی نظریں تو پیسوں پر جمی تھیں، ایمان کی طرف نہیں۔ اس کے دل سے ایک آواز اٹھی، جو قرآن
کی آیت کی طرح تھی:

اور اے سننے والے! زمین میں اکثر وہ ہیں کہ اگر تو ان کے کہے پر چلے تو تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دیں، یہ
صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور یہ صرف اندازے لگا رہے ہیں۔ ”- الانعام 116

بے شک تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ہدایت والوں کو (بھی) خوب
جانتا ہے۔ ”- الانعام 117۔

ایمان کا دل گھبرا گیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کیا ہے، کس کی آواز ہے، کیوں کہ اسے قرآن کا علم نہیں تھا، قرآن میں موجود الفاظوں کا نہیں پتہ تھا۔ وہ مسلمان تو تھی، لیکن اسے ابھی اسلام کو ڈھونڈنا تھا۔ وہ آواز جو اس کے دل میں گونجی، اس نے اس کی روح کو جھنجھوڑ دیا۔ اس نے بیگ واپس رکھ دیا، اور اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے مونیز سے کہا، ”چلو، گھر چلتے ہیں۔“ مونیز کو اپنے پیسے مل چکے تھے، اب اسے ایمان سے کیا لینا دینا۔ اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔

ایمان کے دل میں اٹھنے والی آواز ایک روحانی بیداری کی طرف اشارہ کرتی ہے، جیسے کہ ایک بے نام پھول کی خوشبو جو راہگیر کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، بغیر کسی دعوت کے۔ ایمان کی روحانی جستجو اسے ایک ایسے سفر پر لے جائے گی جہاں وہ اپنے ایمان کی گہرائیوں کو تلاش کرے گی، جیسے کہ ایک مسافر جو اپنے دل کی کمپاس کی پیروی کرتے ہوئے ایک نامعلوم منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کی روحانی بیداری ایک ایسی روشنی بنے گی جو اندھیرے میں اسے راہ دکھائے گی، جیسے کہ چاندنی رات میں چمکتے ستارے۔ ایمان کی یہ جستجو اسے ایک ایسے مقام پر لے جائے گی جہاں وہ اپنے اندر کی روشنی کو پہچانے گی، اور اس کی روح کی گہرائیوں سے ایک سچائی کی اٹھنے والی آوازوں سے اپنے ایمان کی حقیقت سے روشناس کرائیں گی۔۔۔

رات کی تاریکی میں لان کے اطراف میں لٹکے روشنیوں کے قمتے جگمگا رہے تھے، جب گارڈ نے گھر کے گیٹ کا دروازہ کھولا تھا اور ایمان نے قدم اندر رکھا۔ تھا ایمان کو دیکھ اس نے سلامی دی تو ایمان مسکرائی اور جواباً اثبات میں سر کو جنبش دے کر سلامی کا جواب دیا اس نے سامنے دیکھا اس کے سامنے کھلا لان تھا، جہاں ایمان نے گھر کی جانب بڑھنے کے لیے دروازے کا رخ کیا، جو کارپورچ کے سامنے تھا۔ ایمان کے قدموں کی آہٹ کے ساتھ شام کی ہوائ نے اس کی جلد کو چھوا، اور گھر کے آس پاس کے باغ کی خوشبوئیں اس کے ارد گرد بکھر گئیں۔ جگنو پنکھڑیوں کے درمیان اپنی روشنی بکھیر رہے تھے، جیسے وہ باغ کی رونق کو مزید جادوئی بنا رہے ہوں۔

ایمان کی آمد اس وقت ہوئی جب خالدہ کے گھر والے مہمانوں کو رخصت کر رہے تھے۔ پورچ اور ہیڈ لائٹس کی مدھم روشنی میں نہا رہا تھا، جہاں خاندان کے افراد الوداعی جھپٹیاں دے رہے تھے، کچھ اپنی گاڑیوں میں بیٹھے تھے، جبکہ دوسرے نکھڑنے کی کسک میں گپ شپ میں مصروف تھے۔ ایمان نے اس ہنگامے کو نظر انداز کیا، اور جب وہ اندرونی دروازے کے قریب پہنچی، تو اس کی نظر خالدہ پر پڑی، جو اپنی ماں کو گلے لگا رہی تھی۔ خالدہ کی نظریں ایمان پر پڑیں، وہ سختی سے ایمان کو دیکھ رہی تھی، لیکن ایمان نے اس کی جانچ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس کی اپنی آزادی کی دنیا میں لگن، ایمان نے پر عزم بے حسی کے ساتھ اپنا راستہ بنایا اور اکڑ کر چلتی رہی، مہمانوں اور گھر کے مکینوں کو نظر انداز کرتے اپنی راہ بناتے، اس کے قدم پر اعتماد اور با مقصد تھے۔

ایمان کی سیڑھیوں کی چڑھائی ایک خاموش سفر کی مانند تھی، جہاں اس کے قدموں کی آہٹ سے روشنیاں بیدار ہوتی چلی گئیں۔ جیسے جیسے وہ بالائی منزل کی جانب بڑھتی گئی، اس کے ارد گرد کا ماحول اس کی موجودگی کا اعتراف کرتا چلا گیا۔ نیلچلی راہداری کی چمکدار فرش پر اس کے قدموں کی گونج ایک تنہا لیکن پُر سکون سفر کی داستان سنارہی تھی۔

روشنیوں کی لہریں اس کے ہر قدم کے ساتھ جاگ اٹھتیں، اور اس کی راہ کو منور کرتیں۔ یہ منظر ایک مقدس رسم کی یاد دلاتا، جہاں ایمان کی موجودگی کو روشنی کی جھلماہٹ سے نوازا جا رہا تھا۔ اس کے ہر قدم کے ساتھ، راہداری کی دیواروں پر روشنی اور سایہ کا رقص جاری تھا، جس نے اس کے سفر کو ایک صوفیانہ احساس بخشا۔

بالائی منزل کی راہداری، جو کبھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، اب ایمان کے قدموں کی گواہ بن چکی تھی۔ اس کے قدموں کی نرمی سے لال کالین پر دباؤ، بادلوں پر چلنے کا احساس دلاتا تھا۔ اس کے کمرے کے دروازے تک پہنچ کر، وہ کچھ آگے ہوئی اس نے بائیں جانب مڑ کر دروازہ کھولا، جس سے روشنی کی ایک لہر اندر داخل ہوئی اور اندھیرے کو چیرتی چلی گئی۔

واش روم کی حالت، جو کہ گھر کی شان و شوکت کے برعکس تھی، ایک بد قسمتی کی کہانی سنارہی تھی۔ دیواروں پر برسوں کے داغ اور نیچے کا سینٹ، وقت کی کروٹوں کی گواہی دے رہے تھے۔ بے نقاب بجلی

کی تاریں، اس جگہ کی بے توجہی کا ثبوت تھیں۔ ایمان کے عادی انتخاب نے اسے ایک مختلف راستے پر لے جایا، جہاں تبدیلی کی راہ مشکل نظر آتی تھی۔

ایمان کے سامنے نیلے پانی کا ایک بڑا ڈرم موجود تھا، جس کا رنگ وقت کے ساتھ ماند پڑ چکا تھا۔ یہ ڈرم ایک عجیب و غریب حرکت میں مبتلا تھا، جیسے کہ اس میں موجود سیضے اور نمی ایک رقص کر رہے ہوں، اور پانی کے کیڑے اس کی سطح پر اچھل کود کر رہے ہوں۔ ان کی موجودگی نے اس جگہ کو مزید خوفناک بنا دیا تھا، اور ان کی حرکت نے ایک پریشان کن ماحول پیدا کر دیا تھا۔ دائیں جانب، دونوں حصے - غسل خانہ اور بیت الخلا - کی حالت خراب تھی۔ غسل خانے اور بیت الخلا کے دروازوں کی لکڑیاں پھٹی ہوئی تھیں، اور کالی پھپھوندی نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، جو اس جگہ کی بے توجہی کا ثبوت تھا۔ بیت الخلا کے دروازے کے پیچھے کیا مناظر ہو سکتے تھے، یہ سوچ کر ایمان کو فرق نہیں پڑتا تھا، کیوں کہ وہ اس جگہ کی عادی ہو چکی تھی۔

گھر کی آسودگی کے درمیان، یہ برباد واش روم ایک یاد دہانی تھی کہ مادی دولت اکثر اندر کی جدوجہد کے مقابلے میں کمزور پڑ جاتی ہے، جہاں تبدیلی کی جنگ خاموشی سے چلتی رہتی ہے۔

.....

ایمان نے دائیں جانب کے دروازے کو زور سے دھکیلا، جس سے ایک چرچراہٹ کی آواز ابھری۔ دروازے کی لکڑی جو وقت کے ساتھ ادھر چکی تھی، اس میں سے کا کروچوں کا ایک جھنڈ باہر نکل آیا۔ ایمان کے ہاتھ روم میں قدم رکھتے ہی، کا کروچ خوفزدہ ہو کر واپس اندر کی جانب بھاگ گئے۔ ایمان کا ہاتھ

بے ساختہ سوئچ بورڈ کی جانب بڑھا اور ایک ہلکی سی چمک کے ساتھ خلا کو روشن کر دیا جب سوئچ کو نیچے کیا گیا۔ ایک چمک کی آواز کے ساتھ، پیٹ کی چھیلنے والی تہ نے اپنا انکشاف کیا، جس میں چونے کے رنگ کے چسپ فرش پر بکھرے ہوئے تھے، گویا کنفیٹی کی طرح۔ باتھ روم کی دیواریں اور فرش ان گنت سالوں کے استعمال اور نظر اندازی کی کہانی سنارہے تھے، جہاں کبھی کی دلکشی اب محض ایک یاد بن کر رہ گئی تھی۔

ایمان کے سامنے ایک نل کھڑا تھا، جس کی دھاتی سطح پر وقت کے نشانات واضح تھے، اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی مشین موجود تھی، جو کسی دوسرے دور کی یادگار معلوم ہوتی تھی۔ فرش پر پھسلن اور پھٹی ہوئی زمین پر ایک چھوٹا سا گول گٹر گھوم رہا تھا، جس کا مقصد معلوم نہیں تھا لیکن یہ کئی دہائیوں کے پانی کا وزن اٹھا رہا تھا۔ جیسے ہی یہ گہرائی میں غائب ہوا، ایک اور گٹر متوازی بھاگا، جس کے اوپر اینٹوں کی ایک عارضی رکاوٹ نیچے سے ناپسندیدہ گھسنے والوں کو روکنے کے لیے رکھی گئی تھی۔ سیمنٹ کی دیواروں پر وقت اور گیلے پن کے نشانات تھے، جو اس جگہ کی بے توجہی کی داستان سنارہے تھے۔ پانی کے چھوٹے کیڑے سطح سے چمٹے ہوئے تھے، جو نظر انداز ہونے کے باوجود فطرت کی لچک کا ثبوت تھے۔ ایمان نے اپنا غیر رسمی سیاہ بیگ مشین پر رکھ دیا، جس میں فوری ضرورت کا احساس ہوا میں پھیل رہا تھا۔

ایمان نے بیگ کی زپ کھولی، اور اس کی زپ کھلنے کی آواز نے ایک عجیب سا ٹا بھر دیا۔ اس نے پیکٹوں کو ایک ایک کر کے نکالا، اور انہیں اپنے ہاتھوں میں محسوس کیا۔ اس کے چہرے پر ایک مدہم مسکراہٹ تھی، جیسے وہ کسی اندرونی مذاق کو سمجھ رہی ہو۔ اس نے ہر پیکٹ کو کھولا اور اس کے اندر کا مواد گول گٹر

میں بہادیا، جیسے وقت کی ریت اس کی انگلیوں سے پھسل رہی ہو۔ اس کے ہر عمل سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف مادے کو ترک کر رہی تھی بلکہ اس تصور کو بھی کہ وہ کبھی ایسی چیزوں پر انحصار کرے گی۔ اس کا ایمان اٹل تھا، ایک مضبوط یقین جو کسی بھی بیساکھی کی ضرورت سے بالاتر تھا۔

جیسے ہی پاؤڈر نالے کی گہرائیوں میں غائب ہوا، ایمان نے اپنے آپ سے کڑواہٹ کے ساتھ کہا، ”دوست کبھی کبھی بہت سنگدل ہوتے ہیں، ہیں نا؟“ اس نے ایک کے بعد ایک پیکٹ کو خالی کرتے ہوئے اس عمل کو جاری رکھا۔ ”گلو کوز،“ اس نے ستم ظریفی کے ساتھ کہا، ”خود گلو کوز کی مٹھاس کو۔ نتھنوں سے اندر کھینچتا تھا اور مجھے یہ بول کر بہکاتا تھا کہ یہ ڈرگزر ہیں۔“ اس لمحے میں، جیسے ہی مادہ کی باقیات گول گٹر میں غائب ہو رہی تھیں، ایمان کے چہرے پر رہائی کا ایک واضح احساس تھا۔ وہ دنیا کی برائیوں سے بے نیاز، ایک حقیقی باس لڑکی تھی جو اپنے عقائد اور یقین کی قدر جانتی تھی۔ اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ نہ صرف اپنی قسمت پر قابو رکھتی ہے بلکہ ان فتنوں پر بھی جو اسے پھنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بااختیار بنانے کا ایک لمحہ تھا، اس کی طاقت اور لچک کا اعادہ تھا، اور اس نے اسے کسی ایسے شخص کے فضل سے اٹھایا جو جانتی تھی کہ کوئی ہے جو اسے برائیوں سے روکتا ہے۔

جب ایمان نے پیکٹ خالی کرنا جاری رکھا، تو اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی اور اس کے الفاظ ندامت کے لمس کے ساتھ ہوا میں بکھر گئے۔ ”افسوس، میں شروع سے ہی سب کچھ جانتی تھی،“ اس نے اعتراف کیا، اس کی آواز استغنیٰ کے احساس سے چھلک رہی تھی۔ اپنے خیالات کی گہرائیوں میں، اس نے خود کو اپنے وجود کی تنہائی پر غور کرتے ہوئے پایا، ایک ایسی دنیا میں کھو جانے کا احساس جو اکثر

لا تعلق نظر آتی تھی۔ اس کے باوجود، ایمان کا ایک انڈر کرنٹ تھا، ایک اندیکھی موجودگی پر یقین جو اس کے قدموں کی رہنمائی کرتا تھا۔ وہ نرمی سے بولی، تقریباً گویا کسی غیر مرئی رازدار سے سرگوشی کر رہی ہو، “میں اس دنیا میں شاید اکیلی ہوں، لیکن کوئی ہے، کچھ ہے، جو انسانی سمجھ سے بالاتر طریقوں میں میری مدد اور رہنمائی کرتا ہے۔” ہر پیکٹ کے خالی ہونے کے بعد، اس نے اس علم کا وزن اٹھایا، اس کے خیالات اس کی حقیقت کے دھاگوں کو ایک ساتھ باندھ رہے تھے۔

۔ ”مویز کی حقیقت کا پردہ فاش بھی اس اندیکھے محافظ، نے میرے سامنے کیا۔۔“

وہ کھوئی سی بولی۔۔ ”آخر کون ہو، تم۔“

♦♦♦°♦♦♦

گزشتہ منظر کی بازگشت ♦♦♦♦♦

مدھم روشنیوں کے بیچ، بار میں، ایمان چودہ برس کی لڑکی، شیشے کی میز کے پیچھے اکیلی بیٹھی تھی۔ اس کے بال کٹے ہوئے، نیلے اور جامنی رنگ کے سپائیکس میں، آنکھوں پر نیلا لائسنر اور ہونٹوں پر گرے رنگ کی لپسٹک لگائے، ایک سفید شرٹ پہنے جس پر مکی ماؤس کی تصویر تھی، اور گھٹنوں سے پھٹی ہوئی جینز کی پینٹ میں ملبوس تھی۔ اس کی کہنیاں میز پر ٹکی ہوئی تھیں، اور وہ ایک گلاس کو درمیان میں تھامے ہوئے، دور خلا میں گہری سوچوں میں گم تھی۔ بار کا ماحول زندہ دلی سے بھرپور تھا، ہر طرف سے موسیقی کی دھنیں اور رنگین روشنیوں کا رقص جاری تھا۔

ایمان کے چہرے پر نو عمری کے نشانات تھے، اور اس کے بالوں کی تراش خراش نے اس کی شخصیت کو ایک منفرد پہچان دی تھی۔ بارٹینڈر شیشے کو صاف کرتے ہوئے، ایک پیسٹلک تال میں مگن تھا۔ دھوئیں اور نشہ آور ماحول نے بار کو ایک خوابناک فضا میں ڈھال دیا تھا۔ لوگ موسیقی کی دھنوں پر جھوم رہے تھے، کچھ رقص کے سحر میں کھو گئے تھے، جبکہ دیگر رات کی روشنیوں کے جادو میں محو تھے۔

ایک کونے میں، مونیٹ نام کا نوجوان بیٹھا تھا، جو ایمان کی طرف متوجہ تھا۔ ایمان، جو اپنی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی، اس بات سے بے خبر تھی کہ یہ ملاقات ان کی زندگیوں کو نئی شکل دینے والی تھی۔ اس برقی ماحول میں، ان کی راہیں پہلی بار ملیں،۔۔

چ، مونیٹ نے عورت کا روپ دھار رکھا تھا، اس کے لمبے سلکی بالوں کی چمک گولڈن کراپ ٹاپ کے ساتھ مل کر ایک جاذب نظر تصویر بنا رہی تھی۔ ایک سٹریپ کاندھے کے گرد لپیٹی ہوئی تھی، جبکہ سمو کی آئیز اور سکریٹ نے اس کے میک اپ کو مکمل کیا۔ اس کی شخصیت میں ایک الگ ہی کشش تھی، لیکن اس کے اندر کی لعنتی کیفیت اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ وہ اٹھا اور ایمان کے برابر بیٹھ گیا، اسے بغور دیکھتا رہا۔ ایمان شاید اسے نظر انداز کر رہی تھی، اپنی ہی دنیا میں کھوئی ہوئی۔

مونیٹ نے اپنے بیگ سے احتیاط کے ساتھ ایک چھوٹا پلاسٹک کا پاؤچ نکالا، جس میں باریک سفید پاؤڈر تھا جو بار کی رنگین روشنیوں میں چمک رہا تھا۔ ایمان کی آنکھوں میں تجربہ کاری کی چمک تھی، وہ جانتی تھی کہ وہ

کیا دیکھ رہی ہے۔ منشیات۔ اس نے سادہ لفظ ”ڈرگز“ کے ساتھ اپنی پہچان کا اظہار کیا۔ مونیز، جو پہلے ہی دنیا کی تلخ حقیقتوں سے واقف تھا، نے ایک پختہ لہجے میں جواب دیا، ”بلکل، یہ ڈرگز ہیں۔“

مونیز وہ صورت اختیار کئے تھا کہ جس پر اللہ اور اس کے

رسول ﷺ کی لعنت ہے وہ مرد ہو کر عورت کی شکل و صورت اور ہئیت اختیار کئے تھا۔۔ وہ اسی عمل کو دہورارہا تھا جو کبھی حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے کیا تھا۔۔

اس لمحے میں، بار کی دھڑکتی ہوئی موسیقی اور گھومتی ہوئی روشنیوں کے درمیان، دونوں جوان روحوں نے دنیا کی پیچیدگیوں اور اس کے اندھیرے پہلوؤں کے بارے میں خاموش تفہیم کا اشتراک کیا۔ ان کے راستے پار ہو چکے تھے، اور اس مقام سے آگے، ان کی زندگیاں ان طریقوں سے جڑی ہوں گی جن کا وہ شاید ہی اندازہ کر سکیں۔

ایمان کے چہرے پر ایک گہری سوچ کی لکیریں تھیں، اور اس کے ہاتھوں کی حرکت میں ایک بے چینی تھی جیسے وہ کسی بڑے فیصلے کی کشمکش میں تھی۔ مونیز کی آنکھوں میں ایک شرارتی چمک تھی، لیکن اس کے جسم کی حرکت میں ایک سنجیدگی تھی جیسے وہ ایمان کو کسی اہم راز کی طرف رہنمائی کر رہا ہو۔ ان کے درمیان کی خاموشی میں ایک گہری بات چیت چھپی ہوئی تھی، جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے خیالات کو بغیر کسی لفظ کے سمجھ رہے ہوں۔۔۔

ایمان نے جو س کا گلاس ایک طرف رکھا اور مونیز کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی جس وقت

، وہ اس کے سامنے اپنے بیگ کے جانب بڑھا اور ایک پیکٹ نکالا اس پاؤڈر کو تیار کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

مونیز نے احتیاط سے پیکٹ کے اوپری حصے کو تھاما، جو ایک مضبوط سیل سے محفوظ تھا، ایک ایسا بندھن جو دونوں طرف سے جڑا ہوا تھا۔ اس نے نرمی سے اپنی انگلیوں کو پیکٹ کے کناروں پر رکھا اور آہستہ سے دباؤ ڈالتے ہوئے، دونوں طرف کو کھینچا۔ سیل کی مضبوط گرفت ڈھیلی پڑ گئی، اور پیکٹ کا اوپری حصہ خاموشی سے کھل گیا، جیسے کسی راز کا پردہ اٹھ رہا ہو۔

جان بوجھ کر درستگی کے ساتھ، مونیز نے اس پیکٹ میں سٹر کا نچلا حصہ رکھا اور دوسرے حصہ کو نتھنوں کے اندر اس نے بائیں ناک کی نتھ پر انگلی رکھ کر نتھ کو دبایا اور اس نے ماہرانہ طور پر اس مادے کو سٹرے کے ذریعے سانس لیا، اپنے حواس کو تیز کیا اور اس کے جسم میں ایک سلسلہ رد عمل قائم کیا۔ اس کے اثرات فوری تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، اور آنسو بہہ نکلے، لیکن وہ ایک ایسے احساس میں ڈوبا ہوا تھا جس کا ذائقہ وہ محسوس کر رہا تھا۔ ایمان نے چونک کر دیکھا کیوں کہ مونیز کو بالکل مختلف دائرے میں لے جایا گیا تھا۔

مونیز کی آنکھوں میں ایک دم سے واپسی کی چمک آئی، جیسے کوئی طویل خواب سے بیدار ہوا ہو۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا، جیسے وہ اپنے ذہن کو حقیقت کی زمین پر واپس لانے کی کوشش کر رہا ہو۔ آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے اس کے چہرے کو دھو دیا، لیکن میک اپ واٹر پروف تھا، اس لیے اس کی شبیہ بے داغ

رہی۔ اس نے گہرا سانس لیا، اور ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے، ایمان کی طرف متوجہ ہوا۔

میز پر پڑے پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، مونی نے ایک مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، "آپ کی پریشانیاں اپنی جگہ، لیکن یہ..." اس نے ڈبے کی طرف اشارہ کیا، "یہ آپ جیسی پریشان روحوں کے لیے ایک نجات دہندہ ہے۔" اس کی باتوں میں فریب کی مہک تھی، اور اس نے ڈبے کو ایمان کی طرف بڑھا دیا۔ اس کا اصل مقصد ایمان کو اس ڈبے کی طرف مائل کرنا تھا، ایک ایسا حربہ جو ڈیلرز اکثر اپنے شکار کو پھانسنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ابتدائی ذائقہ مفت میں دیا گیا تھا، لیکن ایک بار جب شکار جال میں پھنس جاتا ہے، تو وہ اس کے حصول کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہوتا ہے، چاہے اس کی قیمت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔

ایمان نے ٹیبل پر موجود پیکٹ کو دیکھا ایک تجسس بھری نظر سے، جیسے وہ اس کے اندر چھپے راز کو پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ مونی نے اپنی آنکھوں کو ایک بے صبری کے ساتھ گھمایا، ایک ایسی حرکت جو اس کی بے چینی کو ظاہر کرتی تھی۔ اس نے پیکٹ کو اٹھایا اور ایمان کے ہاتھ میں دھیرے سے رکھ دیا۔ ایمان نے حیرت سے مونی کی طرف دیکھا جب وہ بولا، "یہ تمہاری نجات کی کنجی ہے، بچی۔ تم تو بالکل پریشان اور شکست خوردہ نظر آرہی ہو۔ تمہارا چہرہ ان لڑکیوں جیسا ہے جن کے گھر میں کلہاڑی چلتی ہے۔ اب زیادہ مت سوچو، تم ابھی نو عمر ہو۔ یہ..." اس نے ڈبے کی طرف اشارہ کیا، "یہ تمہاری مشکلات کا حل ہے۔" ایمان نے پیکٹ کو محکم تھام لیا اور اسے گم سم نظروں سے دیکھتی رہی۔ مونی نے ایمان کی طرف

دیکھ کر ایک زہریلی مسکراہٹ دی، جیسے وہ اسے اپنے جال میں پھانس چکا ہو۔ اس کا انداز مکارانہ اور خطرناک تھا۔

ایمان، جو اس فریب کی چال سے ناواقف تھی، مونیز کے اصل منصوبے سے بے خبر رہی، جو اس کی چالاکی کے پردے میں چھپا ہوا تھا۔ ایمان کی انگلیاں اس منشیات کے پیکٹ کو چھو رہی تھیں، جو اس کی زندگی کے اندھیرے کی نمایاں علامت تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے فیصلے کا بوجھ اس پر گرا ہے، ایک ایسا بوجھ جو اس کے پیچھے کئی عرصے سے ہے۔ اس کشمکش میں، ایک نرمی بھری موجودگی نے اسے اپنے حصار میں لیا، امید اور رہنمائی کی ایک باریک سی آواز۔ یہ ایسا تھا جیسے کوئی فرشتہ اس کے ساتھ ہو، جو دوسروں کو نظر نہیں آتا، پھر بھی ایک سکون بخش روشنی کو پھیلاتا ہوا جسے وہ ہی محسوس کر سکتی تھی۔ اس الہی لمحے میں، اس کے دل کی بے چینی کم ہونے لگی۔ ایمان کی نظریں پیکٹ سے ہٹ کر اپنے ارد گرد کی دنیا کی طرف مبذول ہوئیں، اور اس کے خیالات ایمان کے کلمات اور مضبوط یقین سے بھر گئے کہ اندھیرے کے وقت بھی اللہ کی حفاظت مستحکم ہے۔ اس نے خدائی فضل اور رحمت کی حدود کو نہ آزمانے کی دانائی پر غور کیا۔ بار کا ماحول ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی گہری اور مقدس موجودگی سے گونج رہا ہو۔ یہ ایک یاد دہانی تھی کہ جب دنیا نے منہ موڑ لیا تو اللہ پناہ مانگنے والوں کو پکڑنے کے لیے موجود ہے۔ جب زندگی کی آزمائشوں نے مغلوب ہونے کا خطرہ پیدا کیا تو اللہ انہیں بلندیوں تک پہنچانے کے لیے موجود ہے۔ روحانی بیداری کے اس لمحے میں، ایمان کا دل مقصد اور یقین کے نئے احساس سے پھول گیا۔ اس نے منشیات کا پیکٹ اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا، لیکن اس کا ایمان زیادہ مضبوط تھا۔ ایک نئے عزم کے ساتھ، اس نے

منشیات کو ایک طرف رکھ دیا، اب وہ ان کے اندھیرے میں پھنسنے کو تیار نہیں۔ یہ ایک معجزاتی موڑ تھا، تقدیر کا ایک غیر متوقع موڑ جو ایمان، تقدیر اور کائنات کی نادیدہ قوتوں کے درمیان ناقابل یقین تعامل کا گواہ تھا۔ مایوسی کے عالم میں ایمان کو امید ملی۔ تاریک ترین گھڑی میں، اس نے ایمان کی پائیدار روشنی کو دریافت کیا، اور یہ ایک روشنی تھی جو اسے نجات کے راستے کی طرف رہنمائی کرتی تھی۔

ایمان نے منشیات کو ایک طرف رکھ دیا کیوں کہ اس کے دل کی آواز نے اسے ایسا کرنے کی ترغیب دی۔ اور اے سننے والے! زمین پر بہت سے لوگ ہیں جو اگر تو ان کی باتوں پر عمل کرے تو تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے، کیوں کہ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور وہ صرف قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔

الانعام ۱۱۶

بیشک تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

الانعام ۱۱

ایمان کی آنکھوں میں ایک شرارتی چمک تھی، جب اس نے مویز کے دھوکے کو بھانپ لیا۔ اس کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی، جب اس نے اس پیکٹ کو دوبارہ اٹھایا جو مویز نے اسکو دیا تھا وہ سمجھ چکی تھی جس پاؤڈر کو مویز نے کھینچا وہ محض گلو کو زکاپاؤڈر تھا، نہ کہ کوئی منشیات اور جو پیکٹ ایمان کو

دیا گیا اس میں ڈر گزرتے۔ اس کی نظریں مونیز کی بے چینی کو پڑھ رہی تھیں، جیسے وہ اس کے اگلے قدم کا انتظار کر رہی ہو۔

شاید آپ کو بھی اس کی ضرورت ہو، ”ایمان نے کہا، اپنی آواز میں ایک مخفی طنز لیے ہوئے۔ اس کے ہاتھ نے پیکٹ کو مونیز کی طرف بڑھایا، ایک چالاک حرکت کے ساتھ جیسے وہ اس کے فریب کو اسی کے خلاف استعمال کر رہی ہو۔

مونیز کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے چونڈھیا گئیں، اس کے چہرے پر پھیلی گھبراہٹ نے اس کے اندر کے خوف کو ظاہر کر دیا۔ اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، جیسے وہ ایک ناٹکیہ درد کا اظہار کر رہا ہو۔ ”میرا سر تو گھوم رہا ہے،“ اس نے کہا، ایک بے جان آواز میں، جیسے وہ ایک بری طرح سے ناکام اداکار ہو۔

ایمان نے ایک گہری سانس لی اور مونیز کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر ایک پرسکون اطمینان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی، جیسے وہ اس کے چالاک کھیل کو سمجھ چکی ہو۔ اس کے ہاتھ نے پیکٹ کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا، اور اس کے جسم کی حرکت میں ایک محتاط یقین تھا۔ اس کی زبان پر ایک نرم لیکن مضبوط جواب تھا، جس نے مونیز کو ایک دلچسپ الجھن میں ڈال دیا۔ ایمان کی یہ چھوٹی سی جیت نے اسے یاد دلایا کہ اس کی زندگی کے سائے اور رازوں میں، وہ اب بھی چالاک کی اور ہوشیاری سے آگے بڑھ سکتی ہے۔

چند روز بعد، جب بار کی چمکتی ڈسکولائٹس نے ماحول کو روشن کیا، ایمان ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی سیاہ کراپ ٹاپ اور چمڑے کی پینٹ نے اس کی شخصیت کو جاذب نظر بنا دیا تھا۔ اس کی ہائی پونی ٹیل، گہرے رنگ کی لپسٹک، اور سمو کی آئی میک اپ نے اسے ایک فریبی خوبصورتی کا حامل بنا دیا تھا۔ اونچی ہیلز، سیاہ ٹاپس، اور نازک بریسلٹ نے اس کے حسن کو مزید نکھار دیا تھا۔ اس کا چہرہ نیلے، جامنی، سبز، پیلے، اور سفید رنگوں کی بدلتی روشنی میں ایک رنگین کینوس کی مانند تھا۔

موسیقی کی دھنوں نے فضا کو معطر کر دیا تھا، اور ایمان کے موبائل کی گھنٹی نے اس رنگینی کو مختصراً ختم کر دیا۔ اس نے اپنے پرس سے فون نکالا، اور اسکرین پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر حیرت کی لہر دوڑ گئی۔ ایک نامعلوم نمبر سے واٹس ایپ پر ایک ویڈیو کا پیغام آیا تھا، اور نمبر کی ترتیب ۱۲۴۰۰۰۶۷۶۲۳۶۱۱۴۷۲ تھی۔ ایمان نے اس پر اسرار ترتیب کو دیکھا اور بلند آواز میں کہا، ”یہ کیا ہے؟“ اس کا چہرہ ٹوٹی سکرین والے موبائل کی روشنی میں چمک اٹھا۔ اس کی پہلے سے منفی سوچ کے باوجود، ویڈیو کا مواد اس پر کوئی اثر نہ کر سکا۔

ایمان نے ویڈیو چلانے کے لیے پیغام پر ٹیپ کیا، اور ڈسکو کی روشنیوں نے اس کے ارد گرد ایک روحانی سایہ ڈال دیا۔ ویڈیو کے چلتے ہی، بار کی رونق اور ڈسکو کی جاندار پس منظر میں چلی گئی، اور ایمان اس معمے

میں کھو گئی۔ اس نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ ویڈیو کو دیکھا، جیسے وہ اس پر اسرار پیغام کی گہرائی کو سمجھ چکی ہو۔

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

ویڈیو کا منظر

کمرے کی فضا میں رنگین روشنیوں کی لہریں ناچ رہی تھیں، جو کبھی کبھار کی دھوئیں کی لکیروں کے ساتھ مل کر ایک پر اسرار ماحول بنا رہی تھیں۔ موزیز، جس نے خود کو ایک عورت کے روپ میں ڈھالا تھا، قالین پر بیٹھا ہوا تھا، اس کے ارد گرد تاش کے پتوں کی بکھری ہوئی چادر تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا، جس کی شخصیت میں ایک غیر معمولی جرأت تھی، اس کے نارنجی بال، جیونت لباس، اور چہرے پر میک اپ نے اسے موزیز کے برعکس بنا دیا تھا۔ اس کی داڑھی اور مونچھیں اس کے صنفی پیشکش کی روایتی تصورات کو توڑ رہی تھیں۔

موزیز نے دھوئیں کے بادل کو ہوا میں بکھیرا اور پیچھے کی طرف جھک کر اپنے ساتھی کو ایک مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب کیا۔ ”دیکھو، وہ لڑکی کیسی بے خبر ہے؟“

اس نے کہا، ایمان کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو موبائل پر نمایاں تھی، اس کی آواز میں ایک خبیثانہ لہجہ تھا۔ ”وہ تو بس ایک آسان شکار ہے، میرے چنگل میں پھنسنے کے لیے بے تاب۔ اسے کیا خبر کہ میں کون ہوں، میں اسے کیسے استعمال کر سکتی ہوں۔“

ویڈیو نے ان کی سازشوں کی گہرائی کو ظاہر کیا، اور کمرے کے تناؤ بھرے ماحول نے ان کے خفیہ منصوبوں کو مزید تقویت بخشی۔

مونیز نے اپنے منصوبے کا اعلان کیا، اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔ ”اسے اندازہ بھی نہیں کہ میں سوشل میڈیا کی ملکہ ہوں۔ جب وہ میرے جال میں پھنس جائے گی، تو اس کا نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔ وہ میری مستقل خریدار بن جائے گی، اور مجھے کسی نئے شکار کی تلاش نہیں کرنی پڑے گی۔“ اس نے اپنی چالاکی کی باریکیوں کو سمجھا۔ ”میں منشیات کی کھلی حمایت کرتی ہوں، میرے دشمن جانتے ہیں کہ میں اس صنعت کی پشت پناہ ہوں، لیکن وہ میرے براہ راست ملوث ہونے سے بے خبر ہیں۔ اگر وہ میرے کردار کو دریافت کر لیں، خاص طور پر وہ لمبی داڑھی والے، گٹری بکرے ”اس نے حقارت سے کہا،“ تو وہ میرے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔“ اس نے قالین پر بکھرے پتوں کو ایک طرف پھینک دیا۔

اس کا ساتھ تھا، جو اتنا ہی بے رحم تھا، نے پوچھا، ”اگر وہ مزاحمت کرتی ہے تو کیا ہو گا؟“ مونیز نے بے فکری سے کندھے اچکائے اور کہا، ”اگر وہ مزاحمت کرتی ہے تو کوئی بات نہیں، اس کی جگہ کوئی دوسرا ہو گا۔“ ان کی گفتگو نے ان کے مذموم عزائم کی گہرائی کو ظاہر کیا، اور یہ کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کس حد تک جانے کو تیار تھے۔

.....

اٹھارہ سالہ ایمان نے پیکٹ کا آخری ٹکڑا ختم کیا اور اس کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکان ابھر آئی جب وہ مونیز کے ساتھ اپنے دانشمندانہ کھیل کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ ”بیچارہ مونیز، جو ذہنی طور پر مغلوب ہے،“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

۔ ”وہ خیال کرتا ہے کہ وہ مجھے دھوکہ دے رہا ہے، لیکن اسے کیا خبر کہ اصل میں میں ہی اسے یہ جعلی نوٹ دے کر ماموں بنا رہی ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں عزم اور چالاکی کی ایک جھلک نظر آئی جب وہ بولی، ”مجھے یقین ہے کہ تم ان نوٹوں کو استعمال نہیں کرو گے جو میں نے تمہیں دیے ہیں۔ تم انہیں کسی ناپاک مقصد کے لیے محفوظ رکھو گے، ہے نا؟ کیوں کہ اگر تم انہیں استعمال کرتے تو یہ تمہارا آخری دن ہوتا۔“

ایمان کا منشیات کے استعمال کا فیصلہ کمزوری کی بنا پر نہیں تھا۔ یہ ایک حسابی اقدام تھا تا کہ دوسروں کو مونیز کے شر پسند اثرات سے محفوظ رکھا جاسکے۔ وہ اسے اپنے پاس رکھنے کا عزم رکھتی تھی تاکہ کسی اور کی زندگی برباد نہ ہو۔

اور وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کھیل میں ایک پراسرار قوت بھی موجود تھی، ایک ان دیکھا سرپرست فرشتہ، جو اس کے اعمال کی رہنمائی کر رہا تھا اور مونیز کے حقیقی چہرے کو بے نقاب کرنے میں اس کی مدد

کر رہا تھا۔ یہ ایک خفیہ طاقت تھی جو پس پردہ کام کر رہی تھی، ایمان کے لیے ناواقف، لیکن موئیز کے مذموم عزائم کو بے نقاب کرنے کے لیے واضح مقصد کے ساتھ۔۔۔

موئیز اکامیرب، ایک چالاک اور مکروہ منصوبے پر عمل پیرا تھا۔ اُسے علم تھا کہ منشیات خریدنے کے لئے اُسے صرف ایک گاہک کی ضرورت ہے، اور اُس نے ایمان کی دی ہوئی رقم کو ایک مختلف، بہت ہی مکروہ مقصد کے لئے مختص کر دیا تھا۔ اُس کا کام نہایت نازک اور سربستہ تھا، اور اُس کے کاموں کی پیچیدہ نوعیت کو کوئی دوسرا سنبھال نہیں سکتا تھا۔ اپنے تاریک کارناموں کو پوشیدہ رکھنے کے لئے، موئیز نے اپنے آن لائن پوڈکاسٹ کو انٹرسیکس اور ٹرانس جینڈر کی شناخت کے حقیقی معنوں کو دھندلا کرنے کے لئے استعمال کیا۔

وہ خواجہ سراہ برادری کے سائے میں چھپ کر، اُن کے حقوق کی جنگ لڑنے کا دعویٰ کرتا رہا،

لیکن اصل میں، وہ پاکستان میں ایل جی بی ٹی کیو کی مقبولیت کو بڑھانے کے لئے اُن کی آڑ استعمال کر رہا تھا۔ اُس کی ان سرگرمیوں کو خواجہ سراہ کے مفادات کے نام پر، خصوصاً امریکہ کی جانب سے مالی تعاون حاصل تھا۔ موئیز اپنی سازشی کوششوں میں تنہا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ عورت مارچ کی تحریکوں کو چلانے والی کچھ شیطانی فیمینسٹ کمیونٹی کے ارکان بھی تھیں، جنہوں نے خواجہ سراہ یا مظلوم عورتوں کی کمزوریوں کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا، اور عورت مارچ کے مارچ کی تحریکوں کے پیچھے اپنے ناپاک

مقاصد کو چھپایا۔ پاکستان میں دھوکہ دہی اور فریب کے اس تاریک جال کو وہ کب سے چلا رہے تھے، یہ ایک راز ہی رہا۔۔۔

مگر عورتوں کے حقوق کے جنگ کی خوبیوں کا چرچا ہے، اور ان کے حقوق کی جنگ میں ان کی داد دی جاتی ہے، تو پھر

عافیہ صدیقی

کی بہن فوزیہ صدیقی کی بیس سالہ جدوجہد کیوں نظر انداز کی گئی؟ چولستان اور دیگر پسماندہ علاقوں میں، جہاں آج بھی خواتین کو کمتر سمجھا جاتا ہے، ان کے حقوق کی آواز کیوں نہیں اٹھائی گئی؟ جہاں خاندان کے افراد کھانا کھالیں تو بعد میں خواتین کو بچا کچا کھانا دیا جاتا ہے، وہاں کی عورتیں اتنی کمزور ہوتی ہیں کہ بچے کی پیدائش کے وقت ان کی جان جاسکتی ہے۔ ان کے لیے ترقیاتی کام کیوں نہیں کیے گئے؟ ان کے لیے اسپتال اور این جی اوز کیوں نہیں بنائی گئیں؟

یہ صرف دو من امپاورمنٹ کی تحریکوں کے پیچھے چھپ کر شیطانی فیمنزم اور ایل جی بی ٹی کی تحریکوں کو چلانے کی کوشش ہے، جن کا مقصد صرف ان کے ذاتی مفادات کی تکمیل ہے۔ اگر یہ عورتوں کے حقیقی ہمدرد ہوتے، تو آج عافیہ صدیقی بے گناہ جیل میں سزا نہ کاٹ رہی ہوتیں، اور ان کے لیے آواز اٹھائی جاتی۔۔۔

ٹرانس جینڈر اور انٹرسیکس اصطلاحات کے مابین فرق کو سمجھنا اہم ہے، خاص طور پر جب ہم جنسی شناخت اور جنسی تفریق کی بات کرتے ہیں۔

ٹرانس جینڈر افراد وہ ہوتے ہیں جو جنسی شناخت کے لحاظ سے اپنے جسمانی جنس سے مختلف شناخت رکھتے ہیں۔ یہ افراد اپنی جنسی شناخت کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے جنسی تبدیلی کے عمل سے گزر سکتے ہیں

مثلاً

- اگر کوئی بائیولو جیکلی مرد ہے اور وہ خود کو عورت محسوس کرتا ہے، تو وہ جنسی تبدیلی کی سرجری کے ذریعے اپنی جنسی شناخت کو عورت کے طور پر تبدیل کر سکتا ہے۔ ایسے شخص کو ٹرانس وو مین کہا جاتا ہے۔ اسی طرح، اگر کوئی بائیولو جیکلی عورت ہے اور وہ خود کو مرد محسوس کرتی ہے، تو وہ جنسی تبدیلی کی سرجری کے ذریعے اپنی جنسی شناخت کو مرد کے طور پر تبدیل کر سکتی ہے۔ ایسے شخص کو ٹرانس مین کہا جاتا ہے۔

انٹرسیکس افراد وہ ہوتے ہیں جن کے جنسی اعضاء، کروموسومز یا ہارمونز میں مرد اور عورت کی روایتی تقسیم کے مطابق نہیں ہوتے۔ ان کی جنسی خصوصیات میں مرد اور عورت دونوں کی خصوصیات کا مجموعہ ہو سکتا ہے، یا پھر کوئی بھی واضح جنسی تفریق نہیں ہوتی۔

مختصراً اور سادہ

الفاظ میں خواجہ سراہ۔۔۔۔ جو پیدائش سے خواجہ سراہ ہوتے ہیں ہمیں ان کے حق کے لئے لڑنا ہے نہ کہ قوم لوط کو اپنائے لوگوں کو پروموٹ کرنا ہے۔۔

جب کہ کچھ لوگ خواجہ سراؤں کے پیچھے چھپ کر اپنے کالے کام سرانجام دیتے ہیں۔۔۔۔

باری تعالیٰ، ہمیں اپنی حفاظت میں رکھے اور ہمیں ان فتنوں سے بچائے جو ہمارے ایمان کو کمزور کر سکتے ہیں۔ ہمیں ایسی قوت عطا فرمائے کہ ہم برائیوں سے دور رہیں اور نیکی کی طرف مائل ہوں۔ ہماری اور ہماری آنے والی نسلوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے، جو راستہ اس نے ہمارے لیے مقرر فرمایا ہے۔ ہمیں اپنی رحمت سے نوازے اور ہماری دعاؤں کو قبول فرمائے۔ آمین۔

غسل خانے کی دہلیز سے قدم باہر رکھتے ہی ایمان کے ذہن میں مونز کے ساتھ حالیہ ملاقات کی بازگشت نے گونجنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں مضبوطی سے تھاما گیا کالا بیگ، جیسے کسی ناخوشگوار یاد کا بوجھ ہو، اس بے رحم دنیا کی یاد دہانی کراتا ہوا جس میں وہ ہر روز سفر کرتی تھی۔ دالان میں قدم رکھتے ہی اس کے ذہن میں ایک خیال کی صداچی،

۔ ”انسانوں کو انسانوں سے خطرہ ہے، کوئی دوست نہیں۔“

یہ ایک ایسا احساس تھا جسے اس نے وقت کے ساتھ سیکھا اور قبول کیا تھا، ایک کڑوی حقیقت جس نے اس کے دنیا کے بارے میں نظریے کو متاثر کیا تھا۔

اس نے اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ جملہ دہرایا، اور اس کے گلے میں ایک گانٹھ سی بن گئی، جو جلد ہی ایک پرسکون گرمی میں بدل گئی، جو اس کے وجود کے ہر حصے میں پھیل گئی۔ وہاں کھڑی ہو کر، اس نے اپنے آپ کو کسی بڑی، غیر مادی موجودگی سے جڑا ہوا محسوس کیا۔ یہ ایک روحانی احساس تھا جو اس کے وجود کا ہمیشہ سے حصہ رہا تھا، لیکن اس لمحے میں، یہ کہیں زیادہ نمایاں تھا۔ ایمان نے سورہ البقرہ کی آیت ۲۵۷ کے الفاظ کو پڑھا، اس کی آواز میں نرمی اور عقیدت کی جھلک تھی: ”اللہ ایمان والوں کا دوست ہے، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اس کے لبوں سے نکلتے ہوئے الفاظ میں گہرائی اور معنی کی ایک دنیا سمٹی ہوئی تھی۔“

اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا، اپنی زندگی کی دھڑکن کو محسوس کیا، اور ان آیات کی گہرائی پر غور کیا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ ”میرے دل کی گہرائیوں سے یہ جوابات کیسے آرہے ہیں؟ یہ کیسا کلام ہے؟ اور کیا اللہ انہی لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جن کا نام ایمان ہو۔۔۔“

ایمان کی حیرت بڑھتی گئی، اور وہ ان روحانی انکشافات کی گہرائی کو سمجھنے کی خواہشمند ہو گئی۔ اچانک اس نے اپنے ارد گرد دیکھا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں: ”یہ جو بھی ہے، میں اسے کیسے جانتی ہوں؟ یہ میں نے کیسے کہا؟ یہ کیا ہے، یہ کیسا ہے؟“ وہ حیرانی سے بھری ہوئی تھی کہ اچانک اس کے لبوں سے قرآنی الفاظ بے ساختہ کیسے نکلے، جن سے وہ ناواقف تھی۔

وہ اس اچانک روحانی انکشاف کی شکار ہو گئی۔

یہ ایمان کے لیے خود آگاہی کا ایک نادر موقع تھا، ایک ایسا لمحہ جو اسے یہ سمجھنے کی دعوت دے رہا تھا کہ مادی دنیا کی حدود سے پرے بھی ایک عظیم قوت کا وجود ہے جو اس کی رہنمائی کر رہی ہے۔

ایمان کو قرآن کے الفاظ کی پہچان نہ تھی، وہ ان کلمات کو نہیں جانتی تھی جو قرآن میں موجود ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ قرآن صرف عربی زبان میں ہے اور کسی دوسری زبان میں نہیں۔ بچپن میں، وہ کبھی کبھار اپنے بہن بھائیوں کو قرآن پڑھتے ہوئے سن لیا کرتی تھی، اور اسے لگتا تھا کہ

۔ ”قرآن ” اور ”عربی ” لازم و ملزوم ہیں۔ اگر اسے معلوم ہوتا، تو شاید وہ ان الفاظ کو پہچان لیتی، لیکن وہ نہیں پہچان سکی۔

ایمان کی زندگی قرآن سے دوری میں گزری تھی۔ اس کی پرورش ایسی نہیں ہوئی تھی جیسی عموماً کی جاتی ہے۔ نوعمری سے ہی وہ بار کی رونق بن گئی تھی، اور اگر کسی نے اس کی تربیت کی تھی تو وہ بار کے ماحول نے کی تھی۔

شاید اس کی تربیت کبھی ہوئی ہی نہیں تھی، اور اب جا کر ہو رہی تھی۔ اسے اپنے تمام رشتوں نے ترک کر دیا تھا، اس کی اپنی ماں، اس کا باپ، وہ کسی کے لیے بھی اہم نہیں تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ان سب کے لیے ایک بے قیمت شے ہے، جیسے دیوار سے لگی کوئی بے کار چیز۔ اس دنیا میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اس دنیا کے بارے میں بہت کم جانتی تھی، اسلام کے بارے میں بھی۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ اللہ ایک ہے اور اس کا ایک پیغمبر تھا جس نے اسلام کو پھیلایا۔ اسے اسلام کی تاریخ کا علم نہیں تھا، نہ ہی وہ کلمہ

جانتی تھی۔ کیوں کہ اس کی تربیت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ جب ماں باپ بے حس ہوں تو اولاد ایسے ہی پستی میں پروان چڑھتی ہے۔

چاہے انسانوں نے اسے چھوڑ دیا ہو، اللہ نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی تربیت اب غیب سے ہو رہی تھی۔ لیکن اللہ کی تلاش اسے خود کرنی تھی۔ اللہ کو اسے خود جاننا تھا۔ اسلام کو خود پہچاننا تھا۔ قرآن کو خود سمجھنا تھا۔

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

ایمان نے اپنے کمرے کی دہلیز پر قدم رکھا، اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے دروازے کی کنڈی کو آہستہ سے گھمایا۔ اس کی نظریں متوجہ تھیں، جیسے وہ کسی نامعلوم خطرے کی توقع کر رہی ہو۔ دروازہ کھلتے ہی، ایک ناخوشگوار آواز نے فضا کو چیر دیا، ”ہیلو نینسی۔“ ایمان کی آنکھوں میں برقی کوندی، ایک غصے کی لہر جو اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ آواز کس کی ہے، اور یہ وہ آخری آواز تھی جسے وہ سننا چاہتی تھی۔

جب ایمان نے آواز کے ماخذ کی طرف پلٹ کر دیکھا، تو اس کے سر پر ایک ناگہانی کھینچنے نے اسے جھٹکا دیا۔ ایک لمحے میں، اس نے محسوس کیا کہ اس کی وگ کسی نے چھین لی ہے۔ اس کی جالی دار کالی ٹوپی اب اس کے سر پر عجیب و غریب انداز میں لٹک رہی تھی، جیسے کسی اعتراض کا اظہار کر رہی ہو۔ اس کے سامنے، ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ، اس کا سوتیلا بھائی کھڑا تھا، جس نے اسے چھیڑنے کی جرات کی تھی۔

لیکن ایمان اس بار ڈری نہیں۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیکھا اور سہا تھا، اور اب وہ کسی آواز سے نہیں گھبراتی تھی، چاہے وہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔ ایک نئی قوت کے ساتھ، ایمان نے اپنے سوتیلے بھائی کی طرف دیکھا، اور ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ یہ مسکراہٹ اس کے تجربات کی گواہ تھی، ایک ایسی مسکراہٹ جو بتا رہی تھی کہ وہ ناقابل شکست ہے۔

ایمان سے دو سال بڑا اس کا سوتیلا بھائی، جوانی کے عروج پر، ایسی خدو خال کا حامل تھا جو بے ساختہ نظر کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔ اس کا چہرہ نوکیلے کونوں والا تھا، جیسے کسی مجسمہ ساز کی مہارت سے تراشا گیا ہو، جبراً مضبوط، گالوں کی ہڈیاں نمایاں، اور ناک بالکل سیدھی، جیسے کسی فنکار کی تخلیق۔ اس کی ہیزل رنگت والی آنکھیں، جیسے خزاں کے پتوں کے درمیان سے چھن کر آتی سورج کی کرنیں، شرارت سے بھرپور چمک رہی تھیں۔ لیکن جیسا کہ مشہور مقولہ ہے، ”خوبصورتی صرف چہرے میں نہیں، کردار میں ہوتی ہے۔“ اس کی جاذب نظر شکل کے باوجود، اس کا کردار ایسا نہیں تھا جس پر ناز کیا جاسکے۔ اس نے اپنے آپ کو غرور کے لبادے میں لپیٹ رکھا تھا، جس نے اس کی جسمانی خوبصورتی کو ماند کر دیا تھا۔ اس کے خوبصورت چہرے کے پیچھے ایک ایسی شخصیت چھپی ہوئی تھی جو محبت سے عاری تھی۔ سازشی، فریبی، اور بے ایمانی سے بھرپور۔ ایمان نے جلدی ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ اصلی خوبصورتی جلد کی گہرائیوں میں نہیں، بلکہ کردار کی گہرائیوں میں ہوتی ہے، اور ظاہری خوبصورتی کی کشش وقتی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کا سوتیلا بھائی ظاہری دلکشی کا حامل تھا، ایمان نے اس کی سطحیت کو پہچان لیا تھا اور اس کے اندر کی اصلیت کو دیکھ لیا تھا۔ یہ سبق

اس کی مضبوطی اور استقامت کو مزید پختہ کر گیا تھا، اور اسے یہ یاد دلایا تھا کہ حقیقی قیمت کردار میں ہوتی ہے، شکل و صورت میں نہیں۔

ایمان نے اپنا سیاہ بیگ زمین پر رکھ دیا، اس کے ارادے مضبوط تھے۔ وہ ہر چیلنج کا سامنا کرنے کو تیار تھی۔ اس کے ہاتھ اس کے سینے پر محکم بندھے ہوئے تھے، ایک عزم کی علامت کے طور پر۔ اس کی نظریں اٹل تھیں، کیوں کہ اس کے سوتیلے بھائی نے اس کی وگ کو پکڑ کر اسے طعنہ دینے کی ناکام کوشش کی تھی۔ راہداری کی مدھم روشنی میں پھیلتی پرچھائیاں اس کے متعین لیکن متحرک برتاؤ کو اجاگر کر رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی جب اس نے اپنی بات جاری رکھی، اس کی آواز میں ایک حسابی تلخی تھی

۔ ”تجھ جیسے لوگ باہر کی دنیا کے لئے شاید کتے ہوں، لیکن گھر کی عورتوں کے لئے محافظ کا کردار ادا کرتے ہیں۔“

اس نے ایک لمحے کے لئے رک کر اپنا سر جھکا لیا، گویا کسی ناخوشگوار خیال کو جھٹک دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ ”لیکن پھر بھی، تجھ جیسے کچھ لوگ ہوتے ہیں، جن کا کردار خنزیر سے بھی بدتر ہوتا ہے، جو اپنے آباؤ اجداد کی گندگی میں لت پت، اپنی ناپسندیدہ میراث کو آگے بڑھاتے ہیں۔“ ایمان کا سوتیلا بھائی طنزیہ انداز میں ہنسا، لیکن ایمان بے چین نہیں ہوئی، اس کا طنز ایک ڈھال اور ہتھیار دونوں کا کام کر رہا تھا۔ اس

لحے، راہداری کی دھیمی روشنی میں نہاتے ہوئے، ایمان نے ایک طاقتور چمک دکھائی، ایک خود مختار ملکہ کی طرح جس نے مشکلات پر قابو پایا تھا، اور ایک بے باک مجاہد کی طرح جس نے اپنے رشتہ داروں کے دکھاوے کو پہچان لیا تھا۔

دوسری طرف ایمان کے کمرے کا دروازہ معمولی سا کھلا ہوا تھا، جس سے اندھیرے کی ایک باریک سی لکیر راہداری میں پھیل گئی تھی۔ ایمان وہاں مضبوطی سے کھڑی تھی، اس کی پیٹھ دروازے کے سامنے کی دیوار کے ساتھ تھی۔ اس کی کالی جالی دار ٹوپی اس کے چھوٹے بالوں سے چمٹی ہوئی تھی، ایک علامت کے طور پر کہ وہ کسی بھی چیلنج کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہے۔

میکائیل کے پیچھے ایک گلدان تھا جس کے اوپر، ایک گلدان رکھا تھا اور دیوار پر آئینہ لٹک رہا تھا، ایک پراسرار فضا قائم تھی۔ ایمان کا سوتیلا بھائی، جس کی نظریں انتہائی دلچسپی سے بھری ہوئی تھیں، اس کی جانب بڑھا اور ان کے درمیان کا فاصلہ اس قدر کم ہو گیا کہ ایمان کو اس کی قربت میں بے چینی محسوس ہونے لگی۔

میکائیل نے ایک گہرے لہجے میں کہا، ”ایمان، تیری یاد مجھے بہت آئی ہے۔“

اس نے ایمان کے چہرے کو ہاتھ لگایا اور اسے دیوار کی جانب دھکیل دیا۔ ”تو اب پہلے سے بھی زیادہ حسین ہو گئی ہے۔“

ایمان نے اس کی طرف نفرت بھری نظروں سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں غصہ واضح تھا۔

ایمان کے سوتیلے بھائی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، ایک ایسی حرکت جس سے ایمان کی آواز کو خاموش کر دیا گیا۔ اس کی نظریں ایمان پر جمی ہوئی تھیں، جبکہ ایمان کی آنکھوں میں ایک طوفان برپا تھا، ایک شیرنی کی طرح جو اپنے شکار کو گھور رہی ہو۔ اس کے سوتیلے بھائی کی مسکراہٹ میں ایک عیاری تھی، لیکن ایمان کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی نظریں ایمان کی مضبوطی اور استقلال کو چیلنج کر رہی تھیں۔

ایمان نے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے فوری اور محاسبانہ انداز میں، میکائیل کی رانوں کے درمیان کو نشانہ بنا کر ایک شدید لات رسید کی۔ میکائیل درد کی شدت سے پسپا ہوا، لڑکھڑاتا ہوا۔ ایمان نے اس کمزور لمحے کا فائدہ اٹھایا اور اس کے گرنے کے دوران، اپنی مضبوط گرفت سے اس کے جتھوں کو تھام لیا۔ اس کے ناخن، جیسے خنجر کی دھار، اس کے چہرے میں گھس گئیں۔۔

ایمان نے اپنی طاقت کے ساتھ مخالف کو محکم پکڑ لیا اور اسے دیوار کی جانب دھکیل دیا، جہاں وہ خود پہلے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جوش و خروش کی چمک تھی، اور اس کا وجود ایسا تھا جیسے وہ شعلہ ہو۔ اس کی حرکتوں میں ایک ایسی شدت تھی جیسے وہ آگ کی لپیٹ میں ہو۔ اس کے مخالف کو اس کی طاقت کا احساس ہوا، وہ خوفزدہ ہو گیا، اس کی سانسیں تیز ہو گئیں اور وہ کانپنے لگا، اس کی حیرت کی کوئی حد نہ تھی۔

وہ دیوار کے ساتھ لگا خوف و اچھنبے کے آلم میں بس یک ٹک اسکو ہی دیکھ رہا تھا۔ ”گلا دبوچ لوں گی میں تیرا“۔

وہ جس کے ماتھے پر بل تھے۔۔۔۔۔ وہ اسے لفظ چباتے نفرت سے بولی تھی ”اپنے ناخن تیری آنکھوں میں ڈال کر تیرے یہ بنٹے باہر نکال دوں گی اور کتوں کے پاس پھینک دوں گی کہ وہ تیرے ان ڈیلیوں سے کنچے کھیلیں۔“

ایمان نے نفرت سے شدید جتنی وہ اسے نفرت کرتی تھی اتنی نفرت سے اس نے اس کے پیٹ پر اپنا زانا مارا کہ وہ سٹیٹا تابد کا۔۔

میکائیل کے ہونٹوں سے درد بھری آہ نکلی، وہ معمولی سا جھکا اور گہری سانس بھری۔ لیکن ایمان نے اسے پھر سے اپنے سامنے کھڑا کیا، اس کی کالر کو مضبوطی سے تھام لیا، اور اس کی آنکھوں میں ایسی شدت سے دیکھا جیسے اس کی نظر سے ہی اسے جلادے گی۔ میکائیل خوفزدہ تھا، اس نے ایمان کو ایسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کی گرفت میں بے حرکت ہو گیا، اور اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔

وہ اسے مزید نفرت سے بولی جتنی نفرت سے وہ بول سکتی تھی ”تیری انٹریاں باہر نکال دوں گی میں تیرے معدے کو پھاڑ کر اس کا تیزاب تیرے گندے وجود پر پھینک دوں گی میں۔“

وہ اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ایمان نے اسکو شدید جکڑ میں لیا ہوا تھا مانو کوئی غائبی طاقت اس پر غلبہ پاگئی ہو۔۔۔

ایمان کی اچانک تبدیلی نے میکائیل کو دہشت اور حیرت کی کیفیت میں ڈال دیا۔ وہ بہادر لڑکی، جسے وہ ہمیشہ کمزور اور ڈرپوک سمجھتا تھا، اب ایک نئی شخصیت میں سامنے آئی تھی۔ ایمان اب اس کے سامنے

مضبوط اور بے خوف کھڑی تھی، اپنی نئی پائی ہوئی قوت اور عزم کے ساتھ۔ اس کی پر عزم نظریں میکائیل کو گھور رہی تھیں، اور ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کی روح کو پڑھ رہی ہوں۔ میکائیل کے دل میں خوف اور حیرت کی ملی جلی کیفیت نے جگہ بنالی۔ اب وہ ایمان کو ایک مختلف نظر سے دیکھ رہا تھا، جو اب ایک محافظ، ایک سپاہی کی طرح محسوس ہوتی تھی، جو کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس کشیدہ لمحے میں، میکائیل کو احساس ہوا کہ وہ ایک ایسی عورت کے سامنے ہے جس نے اپنی اندرونی قوت کو پہچان لیا ہے۔

ایک فریٹی اور قوت بھری حرکت کے ساتھ، ایمان نے میکائیل کو گردن سے پکڑ کر پیچھے کی طرف دھکیل دیا، جس سے وہ میز پر جا گرا۔ میکائیل نے توازن کھو دیا لیکن بروقت اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ایک نازک گلدان کو گرنے سے بچا لیا۔ جب گلدان گرنے لگا، تو اس نے فوراً اسے پکڑا اور میز پر واپس رکھ دیا۔ خوفزدہ ہو کر وہ سیدھا کھڑا ہوا اور ایمان کی طاقت کو دیکھنے لگا، جس سے کمرہ تناؤ سے بھر گیا۔ اس کے گلے کی گلی ابھر کر پھر سے غائب ہو گئی۔

ایمان کی نگاہوں میں ایک ناقابل تسخیر عزم جھلک رہا تھا، جب وہ اپنے سوتیلے بھائی کو گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں ایک ایسی قوت تھی جس نے میکائیل کو جڑ سے ہلا دیا، اور وہ اس نئی ایمان کو سمجھنے کی کوشش میں مبتلا ہو گیا۔ ایمان اب ایک ایسی شخصیت بن چکی تھی جس کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، اور اس کی ہر حرکت ایک واضح پیغام دے رہی تھی۔ اس نے اپنی انگلی کو تنبیہ کے طور پر اٹھایا، اور اس کے چہرے کی سختی اور جسم کی زبان نے اس کی طاقت کی گواہی دی۔ ”آئینہ اپنا یہ خنزیری وجود

لے کر میرے قریب مت آئی تیرا جگر نکال کر کھالوں گی“ وہ مزید اسے گھورتے بولی ”ادھر چھٹیاں منانے آیا ہے چھٹیاں منایہ نہ ہو کہ تیرے گھر والے تیرا چوتھا منارہے ہوں۔“

میکائیل کی حیرت کی حد نہ رہی، وہ ایمان کو دیکھتا رہ گیا، جیسے وقت تھم گیا ہو۔ ایمان نے زور سے کہا، ”میں نے زندگی کی سختیوں کو اپنی قوت بنایا ہے، اور اب میں ایک ایسی شعلہ ہوں جو پہلے سے کہیں زیادہ روشن ہے۔“ میکائیل، جو ایک تنگ راہداری میں کھڑا تھا، اپنی خودی کو مجروح محسوس کر رہا تھا، اس کا خود اعتمادی کا بت چکنا چور ہو گیا تھا۔ وہ اس تبدیلی کو ہضم نہیں کر پا رہا تھا کہ ایمان، جو کبھی اس کے لیے کمزور تھی، اب اس سے کہیں آگے نکل چکی تھی۔ اسی دوران، ایمان نے اسے گھورتے ہوئے ہی نیچے جھک کر سیاہ بیگ اٹھایا، جبکہ میکائیل کا دماغ مایوسی اور خود تنقید کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ ایمان کے بیڈروم کے دروازے کی ہلکی سی آواز اس کے کانوں میں گونجی جب وہ اپنے کمرے کی طرف پیچھے ہٹی۔ میکائیل کو معلوم تھا کہ اس کا پیچھا کرنا بے فائدہ ہے۔ اس لمحے میں، اس نے محسوس کیا کہ اصلی طاقت جسمانی قوت یا دھمکی میں نہیں، بلکہ ایمان کے پاس موجود اندرونی قوت اور عزم میں ہے۔ جب وہ راہداری میں بیٹھ گیا، تو اس نے خود کو ایمان کو کم آنکھنے پر ملامت کی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دانش کی جنگ ہار چکا ہے، اور اس نے اس کے غرور کو مزید بڑھا دیا تھا۔ لیکن یہ اس کے لیے ایک قیمتی سبق تھا، طاقت کو پہچاننے کا سبق، جو کئی شکلوں میں آتی ہے، اور ایمان نے اسے ایک نئی قسم کی طاقت دکھائی تھی جس پر اس نے پہلے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر، میکائیل نے بند دروازے سے نظریں ہٹائیں، اس کے خیالات اس

پہیلی کے گرد گھوم رہے تھے جو ایمان تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اس تبدیل شدہ عورت کے بارے میں بہت کچھ سیکھنا ہے، اور وہ حیران تھا کہ ایمان کے پاس اور کیا حیرتیں ہیں۔

♦.....°.....♦

ایمان نے اپنے کمرے کی گہرائیوں میں قدم رکھا، جہاں اندھیرا اس کے ارد گرد کی ہر چیز کو نگل رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے دروازے کے ساتھ سرکتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی، اس کی کپکپی اس طاقتور شخصیت کے برعکس تھی جو اس نے ابھی کچھ دیر پہلے دکھائی تھی۔

اس کی طاقت کا پردہ چاک ہو چکا تھا، جس سے اس کی اصلی کمزوری کا پتہ چلتا تھا۔ اس کے آنسو بے آواز اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے، جیسے وہ اس کے دل کے اندرونی طوفان کا راستہ تلاش کر رہے ہوں۔

اس کے ہاتھ ایک دوسرے میں جکڑے ہوئے تھے، تناؤ سے ان کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ سسکیاں اس کے جسم کو کانپنے پر مجبور کر رہی تھیں، اور اس کے ہونٹ خاموشی کی سوگوار لہروں میں لرز رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے دنیا کا سارا بوجھ اچانک اس پر آن پڑا ہو، اور وہ اسے برداشت کرنے کی قوت کھو بیٹھی ہو۔ اپنے کمرے کی تنہائی میں، اس نے خود کو اپنے اندر کے جذبات، خوف اور مایوسی کے سامنے سپرد کر دیا۔

اندھیرے نے اس کی کمزوری کی گواہی دی، جب وہ رو رہی تھی، ہر آنسو اس کے وجود کی پیچیدہ تہوں کی گواہی دے رہا تھا۔ ایمان نے مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے طاقت اور لچک کا مظاہرہ کیا تھا، لیکن وہ اپنے

خوف اور عدم تحفظ کے ساتھ انسان بھی تھی۔ کچے جذبات کے اس لمحے میں، اس نے اپنے آنسوؤں کو آزادانہ طور پر بہنے دے کر۔ صرف اس طریقے سے سکون حاصل کیا جس سے وہ واقف تھی۔

میکائیل کی طرح مضبوط اور صلابت سے بھرپور تھی، لیکن ایمان اس سے بھی زیادہ سخت جان تھی۔ اسے نہ موت کا خوف تھا نہ ہی مار کا۔ وہ ایک ایسے وقت کی عورت تھی جو کڑی دھوپ کی مصافحت کر کے آئی تھی۔

اپنے جذبات کی بھولبلیا میں، ایمان ایک ایسے موڑ پر پہنچ گئی، جہاں سخت ترین جانیں بھی کمزوری کی کشمکش کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کا دل، جو بظاہر ایک ناقابل تسخیر قلعے کی مانند مضبوط تھا، نرم پڑ گیا تھا، اور وہ اپنے نہ بہائے ہوئے آنسوؤں کے وزن کے لیے تیار نہیں تھا۔ پھر بھی، اس کی تنہائی میں، کوئی تسلی بخش موجودگی نہیں تھی، کوئی اسے قریب رکھنے اور اس کے آنسوؤں کو آزادانہ طور پر کندھے پر گرنے دیتا۔ وہ گمنامی کے سمندر میں بہہ رہی تھی، دنیا کی نظروں سے چھپی ایک انمول جواہر۔ ایمان کے دکھ کا کوئی سامعین نہیں جانتا تھا، اس کا درد، اس کے کمرے کی قید میں ایک خاموش چیخ۔

اس نازک لمحے میں، وہ اپنے بوجھ کو بانٹنے کے لیے، اپنے تھکے ہوئے سر کو دیکھ بھال کرنے والی گود میں رکھنے، اور بغیر کسی فیصلے کے رونے کی خواہش رکھتی تھی۔ لیکن اس طرح کا سکون مفقود رہا، اس کے آنسو سب سے چھپا ہوا خزانہ تھے، جو صرف اس کے حجرے کی ناقابل معافی دیواروں کو معلوم تھا۔

اس سب کے درمیان، ایمان کے سیل فون کی ٹوٹی ہوئی سکرین ٹمٹما رہی تھی، جیسے اس کے آنسوؤں کی چمک کو عکس کر رہی ہو۔ اس کی خصوصیات پر آنسوؤں کے نشانات نے ایک دھندلا سا موجودہ حالت کو جنم دیا تھا، اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ اس نے اپنی سسکیوں کو دبانے کی کوشش کی، لیکن وہ ان سے فرار ہونے کے خطرے کو محسوس کر سکتی تھی

ایمان نے ایک گہری سانس لی اور زمین پر پڑے موبائل کو نرمی سے اٹھایا۔ اس کے ہاتھوں نے موبائل کو محتاط انداز میں تھاما اور پھر اسے آہستہ سے اپنے کان کے قریب لے جایا، جیسے

ایک تکبر اور استحقاق سے بھرپور آواز نے خاموشی کو توڑ دیا۔ ”ہیلو،“ مخالف سے آواز آئی، ”ڈارلنگ، کل تم میری طرف پارٹی میں مدعو ہو۔ پوچھ نہیں رہی، بتا رہی ہوں۔“

یہ موز کی آواز تھی، جو ایمان کی زندگی کے تاریک ترین گوشوں میں بھی گھس رہا تھا اس نے اچانک کال کاٹ دی، ایمان کو نفرت سے آنکھیں گھماتے ہوئے چھوڑ دیا۔ ”ایک تو اس کا رہی اور رہا ہی نہیں درست ہو رہا، پاگل انسان۔“

ایمان نے موبائل کو ایک طرف رکھ دیا، اس کے چہرے پر ناگواری کا بھرپور اظہار تھا۔ اس کے ہاتھوں کی پشت سے اس نے اپنے آنسو پونچھے، جو غم و غصے کی شدت سے بے اختیار بہہ نکلے تھے۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں کو تیزی سے گھمایا، جیسے وہ اپنے جذبات کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی ہو، اور ایک تلخ نظر موبائل پر ڈالی، جیسے وہ اس بے جان چیز کو اپنے دکھ کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہو۔



یہ کمرہ عیش و عشرت کی ایک جنت تھا، جہاں ہر شے کو باریک بینی سے ترتیب دیا گیا تھا۔ چاندی کی دیواریں، جن کی چمک دمک کمرے کی شان کو بڑھا رہی تھی، چاند کی روشنی کو اپنے اندر سموتی تھیں، جس سے دیواروں پر روشنی کے خوبصورت نقش و نگار بنتے تھے۔ چھت سے لٹکتے رنگین موتیوں کے جھرنے کمرے کو ایک شاہانہ احساس دے رہے تھے، جن کی چمک سے کمرہ جادوئی لگ رہا تھا۔ بیچ میں موجود شاندار بیڈ، اس کے سیاہ فریم اور سفید بستر کے ساتھ، آرام اور خوبصورتی کا مرکز تھا۔ سائیڈ ٹیبلز پر سب سے فن پارے اور نرم روشنی کا چراغ کمرے کو ایک پرسکون اور خوش آئند ماحول دے رہے تھے۔

دیوار کے ساتھ سب سے آئینے کمرے کی وسعت اور خوبصورتی کو دوبالا کر رہے تھے۔ یہ کمرہ، اپنی ہر تفصیل کے ساتھ، آرام اور خوشی کی دعوت دے رہا تھا، جہاں ہر لمحہ یادگار بن جاتا تھا۔

کمرے کی عیش و عشرت کے بیچوں بیچ، آمنہ، جو ایک شفقت بھری ماں تھی، اپنے موبائل فون کی سکرین میں گم تھی۔

اس کی نظریں کبھی اپنے فون پر، تو کبھی اپنے خاندان کی طرف ہی ہوئی تھیں۔ اس کے شوہر کی آواز میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی، جس نے آمنہ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اس کے شوہر، جو ایمان کے لیے سوتیلا

باپ تھا، نے اپنی پیٹھ ہیڈ بورڈ سے ٹکائی ہوئی تھی، اس کی مضبوط کرنسی اور نازک عینک اس کے کردار کی سختی کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اخبار کی سرخیوں میں گھوم رہی تھیں۔

۔ ”آمنہ، تمہاری بیٹی حد سے گزر چکی ہے، اسے اپنے عمل کی ذمہ داری اٹھانی ہوگی۔“ اس کی آواز میں غصہ صاف محسوس ہو رہا تھا۔

آمنہ، جو اپنی بیٹی اور شوہر کے درمیان کشمکش میں پھنسی ہوئی تھی، نے اپنے فون کو نیچے رکھ دیا اور اپنے شوہر کی طرف دیکھا، اس کی پیشانی پر فکر کی شکنیں تھیں۔

۔ ”یہ آپ ہی کی وجہ سے ہوا ہوگا،“ اس نے نرمی سے جواب دیا، اس کی آواز میں دفاعی لہجہ تھا۔

اس کے شوہر نے اخبار کو ایک طرف رکھ دیا اور عینک کو اپنی ناک سے ہٹا کر بیڈ کے کنارے پر رکھ دیا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے، جب اس نے اپنی بیٹی کے بارے میں اپنی مایوسی کا اظہار کیا۔ ”اس نے میری بیٹی کو دھکیل دیا،“

اس نے زوردار لہجے میں کہا، اس کی آواز میں ناراضگی کی گہرائی تھی۔

کمرے میں موجود ہر شے کی خوبصورتی کے باوجود، ایک تناؤ کی فضا قائم تھی۔ آمنہ نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں عزم اور درد کی جھلک تھی۔ ”جس کو اس نے دھکیل دیا، وہ میری بیٹی ہے، اور جس نے دھکیل دیا، وہ بھی میری بیٹی ہے۔“ اس نے زور دے کر کہا، اس کے الفاظ میں ایک ماں کی محبت اور تکلیف دونوں موجود تھے۔

- آصف کے چہرے پر غصے کی لہریں نمایاں تھیں، اس کی آنکھوں میں آگ بھڑک رہی تھی جب وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا، ”میں اسے ختم کر دوں گا۔“

آمنہ، جو ایک مضبوط اور پرسکون ماں تھی، نے اسے گہری اور معنی خیز نظروں سے دیکھا اور سرد مہری سے جواب دیا، ”تم نے پہلے ہی اس کا قتل کر دیا ہے۔“ ایمان، جو ابھی صرف تیرہ سال کی تھی، اس کی معصومیت کا سودا کر دیا گیا تھا، اور اس کے دل پر گہرے زخم تھے۔

آمنہ نے آصف کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک مضبوطی تھی جیسے وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے بول رہی ہو، ”تم نے اس ننھی جان پر جو ظلم کیا،“ اس کی آواز میں غم کی ایک گہری لہر تھی، ”تم نے اس کے ساتھ جو بے رحمی کی، اس نے اسی لمحے اندر سے مرنا شروع کر دیا تھا جب تم نے اسے اپنی سفاکی کا نشانہ بنایا۔“

ایمان نے اپنے طوفانی بچپن کا بوجھ ایک سنگین بوجھ کی طرح اٹھا رکھا تھا۔ اس نے مشکلات اور تکلیف کے سوا کچھ نہیں جانا تھا۔ ایک ایسی دنیا میں بڑھنا جہاں اس کی معصومیت چھین لی گئی تھی اور اعتماد کو توڑ دیا گیا تھا، اس نے اسے ایک نوجوان عورت میں تبدیل کر دیا تھا جس کا دل ان لوگوں کے ظلم سے داغدار تھا جن پر اسے سب سے زیادہ اعتماد کرنا چاہیے تھا۔ اس کا سفر ایک انتھک جدوجہد تھی، جو رکاوٹوں سے بھرا ہوا تھا جو مضبوط ترین روحوں کو بھی کچل سکتا تھا۔ جس لمحے سے وہ اس دنیا میں آئی تھی، وہ غداری کے سمندر میں ڈوب گئی تھی، اس کی معصومیت وقت سے پہلے چھین لی گئی تھی۔ اس کے ماضی کے نشانات اس

کے وجود کے ہر حصے میں گہرے بیٹھ گئے تھے۔ ایمان نے وہ درد اور تکلیف برداشت کی تھی جس کا تجربہ کسی بچے کو نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے بچپن کے خوابوں کی جگہ ڈراؤنے خوابوں نے لے لی تھی، اور جو ہنسی اس کے دنوں میں بھرنی چاہیے تھی، اس کی جگہ خاموش آنسوؤں نے لے لی جو رات کے اندھیرے میں بارش کے قطروں کی طرح گرتے تھے۔۔

لیکن ایمان زندہ بچ گئی تھی۔ وہ اپنے درد بھرے ماضی کے مصداق سے ایک ایسی طاقت کے ساتھ ابھری تھی جو خوفناک اور دل دہلا دینے والی تھی۔ ہر دن ایک جنگ تھی، ناقابل تصور مصیبت کے سامنے اس کی لچک کا ثبوت۔ آخر کار اس کے ماضی کے بارے میں سچائی بلند آواز میں ہوا میں گونجیں اس کے سفر کا جذباتی وزن اس کے نازک کندھوں پر بہت زیادہ تھا، اس ناقابل تسخیر جذبے کی ایک واضح یاد دہانی جس نے اسے تاریک ترین وقتوں سے گزارا تھا۔

آمنہ اور آصف محمود کے درمیان ایک بات چیت جو ان کی زندگیوں کو ہمیشہ کے لیے بدل دے گی۔ ہوا تناؤ کے ساتھ بھاری تھی کیوں کہ انہوں نے ایسے الفاظ کا تبادلہ کیا جو کسی بھی بلیڈ سے زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔

میرا نام آصف محمود ہے، اور وہ میرے ٹکڑوں پر پلتی تھی۔ اس وقت میں جو چاہتا وہ کر سکتا تھا۔ ”اس کی آواز میں ایک خود اعتمادی تھی، لیکن آمنہ کی نظروں میں ایک ٹھنڈی چمک تھی، جیسے وہ اس کے ہر لفظ کو چیلنج کر رہی ہو۔

آمنہ کی آنکھوں میں ایک گہرا دکھ چھپا ہوا تھا، جیسے وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے کسی بڑے غم کو محسوس کر رہی ہو۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اور اس کی آواز میں ایک لرزش تھی جب وہ بولی، ”وہ میری... میری...“ اس کے بعد اچانک اس کے چہرے پر ایک تبدیلی آئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خطرناک چمک پیدا ہوئی، اور اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نے جگہ بنالی۔

ہاں، وہ میری بیٹی ہے، لیکن... ”آمنہ نے اپنے ہاتھوں کو مضبوطی سے باندھتے ہوئے کہا، اس کی آواز اب زیادہ محکم تھی، ”لیکن اب وہ میری نہیں رہی۔“ اس کے چہرے کی تاثیر میں ایک سرد مہری آگئی، جیسے وہ اپنے اندر کے جذبات کو مکمل طور پر دبا چکی ہو۔

آصف نے آمنہ کی اس تبدیلی کو دیکھ کر ایک گہری سانس لی اور ایک شیطانی قہقہہ لگایا۔ ”تم واقعی میں بہت تیز ہو گئی ہو، آمنہ۔“ اس نے کہا، اس کی آواز میں ایک تمسخر تھا۔ ”کیا تم واقعی سوچتی ہو کہ وہ تمہیں اپنا گردہ دے دے گی؟“

آمنہ نے ایک گہری نظر آصف کی طرف ڈالی، اس کی آنکھوں میں ایک خطرناک چمک تھی۔ ”وہ میری بیٹی ہے، اور میں جانتی ہوں کہ وہ کیا کرے گی۔“ اس نے کہا، اس کی آواز میں ایک خباثت تھی۔ ”وہ پیار کی بھوک ہے میں اسے گلے لگاؤں گی، اور وہ خود اپنا گردہ نکال کر مجھے دے دے گی۔“

آصف نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا، لیکن اس بار اس کی ہنسی میں ایک تنبیہ تھی۔ ”مگر یاد رکھو، تمہیں اپنی کوشش جاری رکھنی ہوگی۔“ اس نے کہا، اس کی آواز میں ایک سنگینی تھی۔

آمنہ نے ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلادیا، جیسے وہ اپنے اندر کے اندھیرے کو قبول کر چکی ہو اور اب وہ اس کے ساتھ راضی ہو۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی قسم کی طاقت تھی، ایک طاقت جو اس کے اندر کے شیطان کو جگا چکی تھی۔

♦♦♦♦♦

عہدِ گزشتہ کی بازگشت

آمنہ اس کی حقیقی ماں تھی اور جتنی اس کا حقیقی باپ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد کو کیوں ترک کیا؟ ایمان کے ماضی میں ان سوالوں کے جوابات چھپے ہوئے ہیں۔

سورج نے آسمان پر اپنی بلندی حاصل کی، اور اپنی زرد روشنی جتنی اسٹیٹ پر بکھیر دی، جو ایک عظیم الشان حویلی تھی جس نے وقت کی آزمائش کو پار کیا تھا۔

سردی کی شدت کے باوجود، حویلی کی عظمت اور شان اب بھی قائم تھی، جو برہنہ درختوں کے درمیان میں کھڑی تھی، جو گویا موسم بہار کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ حویلی کے سامنے ایک مضبوط درخت کھڑا تھا، جس کی شاخیں بالائی منزل کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی، جس سے گرما گرم بحث کی آوازیں سرد ہوا میں گونج رہی تھیں۔ یہ کمرہ خالدہ کا تھا، لیکن آج آمنہ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ ان کے جوانی کے دن تھے جب ان کی محبت شعلہ ور تھی اور ان کے زخم ابھی تازہ تھے، جتوئی کی آواز مایوسی سے بھری ہوئی فضا میں گونج رہی تھی۔ ”میں نے کبھی بھی تم سے اولاد کی خواہش نہیں کی تھی،“ اس نے غصے سے کہا، اس کے الفاظ میں برسوں کی ناامیدی کا وزن تھا۔ ”اگر میں اس رات نشے میں نہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔“

جتوئی حویلی کی دیواروں کے اندر، راز اور تنازعات دولت کے تکیے کے نیچے پوشیدہ تھے۔ حویلی، جو خوبصورتی سے بڑھاپے کی طرف بڑھ رہی تھی، نے اپنے مقدس ہالوں میں ماضی کی خوشیوں اور غموں کی گونج کو محفوظ رکھا تھا۔ آمنہ نے بھی چیخ کر کہا، ”میں تو اسے گود میں ہی مار دیتی، لیکن تمہاری ماں نے مجھے روکا تھا۔ وہ تو خود مر گئی اور اسے میری زندگی میں چھوڑ گئی۔“

وہ جتوئی کو گھورتے ہوئے بولی، ”لیکن تم یہ مت سوچنا کہ میں تمہارے ساتھ ایک لمحہ بھی گزاروں گی۔“ وہ اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے بولی، ”تمہاری بیٹی۔“

آمنہ کی تلخ باتوں کو جتوئی کی قہقہے بھری ہنسی نے کاٹ دیا۔ اس کی ہنسی میں ایک کڑواہٹ تھی جب وہ بولا، ”وہ میری بیٹی نہیں ہے، میرا صرف ایک بیٹا ہے، میکائیل، میں جلد ہی خالدہ سے شادی کر لوں گا، اور وہ میرا قانونی وارث ہو گا۔“

ایمان، جو ایک نازک دل رکھنے والی نوجوان لڑکی تھی، تنہائی کی گہرائیوں سے واقف تھی۔ اس کے گھر کی خاموشیاں ان الفاظ سے کہیں زیادہ بلند تھیں جو کبھی بھی ادا نہیں کیے گئے تھے۔ محبت، جو ایک دور اور پراسرار جذبہ تھا، ایک ایسی عیش و آرام کی طرح محسوس ہوتی تھی جس سے اسے محروم کر دیا گیا تھا۔ خاموش راہداریوں اور سنسان کمروں میں، ایمان اپنے دل کے درد کے ساتھ دنیا میں گھومتی رہی۔ یہ ایک ایسی خاموشی تھی جس نے سچائی کو سرگوشی کی تھی۔ کہ کوئی بھی اسے قبول نہیں کرنا چاہتا تھا، یہاں تک کہ اس کے والدین بھی نہیں، گویا وہ ایک تکلیف دہ راز تھی جسے انہوں نے دفن کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں اسے پرورش پانی چاہیے تھی، ایمان نے خود کو بے بس پایا، ایک ایسی لڑکی جو پیار کی گرمجوشی کے لیے تڑپ رہی تھی جو کہ اس کی پہنچ سے باہر تھی۔

دھوکہ دہی، ٹھنڈے کندھوں، اور بے ساختہ رد نے اس کے دل کو زخمی کر دیا، بے شمار مایوسیوں کے زخموں کو برداشت کیا۔ ایمان کا وجود گھر میں ایک سایہ کی طرح محسوس ہوتا تھا، اس کی موجودگی کسی کا دھیان نہیں، اس کی ہنسی نہ سنی گئی، اور اس کا دل ایک ایسی محبت کے لیے تڑپ رہا تھا جو ہمیشہ کے لیے کھوکھلا لگتا تھا۔

آمنہ نے جتنی کو طنز کرتے ہوئے کہا، ”اچھا، تو اسی لیے تم نے اس کے نام ساٹھ فیصد شیئرز کر دیے ہیں، کیوں کہ تمہیں اس کے علاوہ کوئی قانونی وارث نہیں مل رہا تھا۔“

جتوئی نے نظریں چرائیں اور پھر سختی سے اپنا جبرہ بھینچ لیا، ”یہ سب ماں نے کروایا ہے، اس کے نام ساٹھ فیصد شیرز کر دیے اور میں چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔“ اس نے زمین پر کراخنگلی سے پیر پٹھا۔

ایمان نے مونیز کو گمراہ کیا تھا، اس نے دعویٰ کیا کہ اس کے نام کمپنی کے چالیس فیصد حصص ہیں، حالانکہ وہ اپنی حقیقت کسی سے بھی ظاہر نہیں کرتی تھی۔ زندگی کے مروجہ دھاگوں میں، کچھ ایسے بھی تھے جن کی ناپسندیدگی کے باوجود، قسمت نے انہیں محفوظ رکھا تھا۔ ایمان کی دادی بھی ایک ایسی ہی پہیلی تھیں، جن کی بصیرت نے انہیں مستقبل کی آزمائشوں کی جھلک دکھائی تھی۔ ان کی اسی فراست نے انہیں ایک ایسے فیصلے تک پہنچایا جو ایمان کی قسمت کو بدل دے گا۔ وقت کی نرم سرگوشیوں کے بیچ، ایمان کی دادی نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ اپنی کمپنی کے حصص ایمان کو منتقل کرنے کا۔

اس فیصلے کی اہمیت بہت زیادہ تھی، لیکن قدرت نے اپنا کھیل کھیلا اور وہ اس دنیا سے چلی گئیں، ایمان کو اکیلا چھوڑ کر، اس وراثت کا بوجھ اٹھانے کے لیے۔ ایمان کو اپنی دادی کی دعائیں دینی چاہیے اور شکریہ ادا کرنا چاہیے، کیوں کہ آج ان کی بدولت وہ جتوئی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہے۔

خاندانی اتحاد اور کاروباری شراکت داری کے مشکل جال میں، آمنہ اور جتوئی کا اتصال ایک ایسی شادی تھی جو محبت کی بجائے ضرورت سے وجود میں آئی تھی۔ ان کی باہمی نفرت ان کے دلوں کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھی، ان کی خواہشات کی یاد دہانی کہیں اور تھی۔

یہ ایک ایسی شادی تھی جو دونوں نے اپنے باپوں کے درمیان کاروباری مفادات کے لیے کی تھی۔ آمنہ آصف کی محبت کے لیے ترستی تھی اور جتوئی خالدہ کے لیے۔ ان کی شادی نے جذبات کی ایک غیر مستحکم آمیزش کو چھپا دیا تھا۔ وہ بد قسمت رات، جب نشے نے ان کی بے چینی کی لکیروں کو دھندلا دیا، آمنہ کا مستقبل جتوئی کے نسب سے جڑ گیا۔ آمنہ نے اپنے حمل کو ختم کرنے کا سوچا، ایک فیصلہ جو ایمان کے وجود کو مٹا دیتا۔ لیکن ایمان کی دادی نے اس خیال کی شدید مخالفت کی، اور ایمان کو زندگی کی سانس لینے کا موقع دیا۔ اپنے آخری وقت میں، انہوں نے اپنی جائیداد ایمان کے نام کر دی، جو ان کی پوتی کے لیے ان کی محبت کا ثبوت تھا۔ ان کے آخری عمل نے ایمان کو ان رازوں اور فریبوں کے جال سے بچایا جس نے ان کے خاندان کی تاریخ کو ڈھانپ دیا تھا۔ یہ ایک حادثہ تھا، قسمت کا ایک غیر متوقع موڑ، جس نے آخر کار ان چھپی ہوئی سچائیوں کو بے نقاب کیا جو ان کی زندگیوں کو طویل عرصے سے پریشان کر رہے تھے، اور ان کی خاندانی میراث کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ اسلام جبری شادی کی تردید کرتا ہے اور ایسی شادی کو حرام قرار دیتا ہے

اسلام میں نکاح کی بنیاد رضامندی اور باہمی اتفاق پر ہوتی ہے۔

جبری شادیاں، جہاں فریقین کی مرضی شامل نہ ہو، اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں کیوں کہ وہ ازدواجی زندگی میں ناخوشی اور اختلافات کا سبب بن سکتی ہیں۔ قرآن مجید میں سورہ النساء کی آیت 19 میں، میاں بیوی کے درمیان محبت اور رحمت کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے:

اے ایمان والو! تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ اور عورتوں کو اس نیت سے روکو نہیں کہ جو مہر تم نے انہیں دیا تھا اس میں سے کچھ لے لو سوائے اس صورت کے کہ وہ کھلی بے حیا نئی کار تکاب کریں اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے گزر بسر کرو پھر اگر تمہیں وہ ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناپسند ہو اور اللہ اس میں بہت بھلائی رکھ دے۔

.....

اور اُن میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اُس نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم اُن کے ساتھ سکون حاصل کرو اور اُس نے تمہارے دلوں میں محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔ بیشک اس میں غور کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں (سورۃ الروم، آیت 21)

یہ آیت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ شادی میں محبت اور رحمت کا ہونا ضروری ہے، جو کہ جبری شادی میں ممکن نہیں ہوتا۔ اسلام میں جبری شادی کو حرام قرار دیا گیا ہے اور یہ کہ شادی کے لئے دونوں فریقوں کی رضامندی ضروری ہے۔

مزید برآں، حدیث کی کتابوں میں بھی اس موضوع پر روایات موجود ہیں جیسے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ: ”کنواری لڑکی کی شادی اُس کی اجازت کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔“ (صحیح بخاری، حدیث 6968؛ صحیح مسلم، حدیث 1419)۔

جب آمنہ اور جنتوی کے درمیان تلخ کلامی کا طوفان برپا ہوا، ایک ننھی پری، ایمان، نے اس تماشے کو چپ چاپ دیکھا۔ اس کی عمر صرف چار برس تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں دنیا کی سمجھ بوجھ جھلک رہی تھی۔ وہ دروازے کی اوٹ میں چھپی، اپنے آپ کو سایوں کی آغوش میں سمیٹے ہوئے تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں، جو کبھی کھکھلا کر ہنستی تھیں، اب خوف سے پھٹی جا رہی تھیں۔ اس کے ننھے دل پر اپنے والدین کی جھگڑوں کا بوجھ چھایا ہوا تھا۔

ایمان کی معصومیت پریشانی کے نقوش سے عبارت تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، جو اس کی بے خوابی کی داستان سنارہے تھے، اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ اس کی رنگت، جو کبھی گلاب کی طرح تازہ تھی، اب زرد پڑ چکی تھی، جیسے اس کی زندگی سے خوشیاں رخصت ہو چکی ہوں۔ وہ وہاں کھڑی تھی، ایک کمزور سی کلی، اس کا بدن نازک اور پتلا، اس کے چھوٹے چھوٹے معصوم سے لب جو فل وقت خوف سے کپکپا رہے تھے۔

اس کے چھوٹے ہاتھ اپنے چہرے کو چھپانے کی ناکام کوشش میں تھے، جیسے وہ اپنے آپ کو اس جھگڑے سے الگ کرنا چاہتی ہو۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں، جو عموماً کھیل کود میں چمکتی رہتی تھیں، اب خوف سے سکڑی ہوئی تھیں۔

اس کے چہرے پر خوف کی ایک گہری لکیر کھنچ گئی تھی، اس کی سانسیں تیز تھیں، اور اس کے چھوٹے سینے میں دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، جیسے وہ کسی بھی لمحے بھاگ جانے کو تیار ہو۔ اس کے چھوٹے پاؤں زمین

پر بے یقینی سے ٹپک رہے تھے، اور اس کے جسم کی ہر حرکت میں خوف کی کہانی چھپی ہوئی تھی۔ ایمان کی نظریں، جو کبھی کبھار ہی اپنے والدین کی طرف اٹھتی تھیں، اب ان کی آوازوں کی شدت سے ڈر کر نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں، اور اس کے چہرے پر ایک گہرا سایہ تھا، جیسے وہ اپنے والدین کی ناراضگی کی گہرائیوں میں کھو گئی ہو۔

-- اس کی دادی کی موت نے اس کی معصوم دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا، جو اس کی زندگی سے بہت جلد چلی گئی تھیں۔ ایمان، اپنے والدین کے لیے، ایک بوجھ تھی، جسے وہ نظر انداز کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نظروں میں، وہ ایک بے وقعت شے تھی، جسے وہ چھوڑ دینا چاہتے تھے۔ آمنہ اور جتوئی نے اسے بچپن کے سمندر میں تنہا چھوڑ دیا تھا، جہاں وہ بغیر کسی سہارے کے تیر رہی تھی۔

آمنہ کی آواز میں جتوئی کے لیے تلخی تھی، لیکن اچانک اس کی نظریں پھسل کر ایمان پر جا ٹکیں۔ ایمان کی معصومیت سے بھرپور آنکھوں میں آمنہ کی غصے سے لال آنکھیں گر گئیں۔ ان کے درمیان کی گرما گرم بحث کی آواز نے ایمان کی ننھی سی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے دل میں خوف کی لہریں اٹھنے لگیں، جیسے وہ کسی بڑے طوفان کی آمد کا احساس کر رہی ہو۔ ایمان نے گھبراہٹ میں ایک قدم پیچھے کیا، اپنے آپ کو آنے والے خطرے سے بچانے کی کوشش میں۔

لیکن آمنہ، جو غصے اور مایوسی کی شدید لہروں میں ڈوبی ہوئی تھی، ایمان کی طرف بڑھی۔ ایک ناگہانی حرکت میں، اس نے ایمان کو اس کے نازک کپڑوں سے جھٹکا دیا، اور اس کو اپنی طرف موڑ لیا۔ آمنہ کی

انگلیوں کی گرفت میں ایک سرد مہری تھی، اور ایک لمحے کے لیے ایمان کو لگا جیسے وہ اپنے آخری وقت کا سامنا کر رہی ہو۔ ایمان کی آنکھیں، جو خوف سے پھیلی ہوئی تھیں، بے یقینی سے ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں، جیسے نجات کی کوئی کرن تلاش کر رہی ہوں۔

اس نے آمنہ کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی، لیکن آمنہ کی مضبوط گرفت کے سامنے اس کی کمزور کوششیں ناکام رہیں۔ بے بسی اور کمزوری کے عالم میں، ایمان کانپتی ہوئی وہیں کھڑی رہی۔ ”تم کیا سن رہی ہو؟“

آمنہ کی آواز میں سختی تھی، لیکن اس میں ایک تجسس بھی تھا۔ جب آمنہ نے ایمان کو اوپر دیکھنے پر مجبور کیا، تو ایمان کے گال آنسوؤں سے بھیگ چکے تھے، جیسے وہ اپنے دل کے درد کو بہا رہی ہو۔ ایک گھٹی ہوئی آواز میں، ایمان نے سرگوشی کی، ”میں۔۔۔ میں۔۔۔ نے کچ۔۔۔ کچھ۔۔۔ نہیں سنا،“ اور اس کے الفاظ سسکیوں میں گم ہوتے گئے۔۔۔

بس وہ، آمنہ کی آنکھوں میں بسی ہوئی دہشت کو دیکھ کر کانپ رہی تھی۔ آمنہ کے دانتوں کی کچکاچھاٹ اور اس کی آواز میں چھپی کر خنگی نے ایمان کو مزید خوفزدہ کر دیا۔ ”تم جھوٹ بول رہی ہو!“ آمنہ نے غصے میں چیخ کر کہا اور ایمان کے گال پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔

اور متعدد بار رسید کرتی رہی۔ ایمان کی سسکیاں فضا میں گونج اٹھیں، اور تھپڑوں کی گونج اس کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آرہی تھی، جیسے ایمان کے چہرے پر سرخی کی تہہ چڑھا رہی ہو۔ آمنہ نے اپنی

جارجیت کی انتہا کو محسوس کرتے ہوئے، اپنے ہاتھ روک لیے، لیکن اس کے الفاظ میں اب بھی تلخی تھی۔
”دوبارہ ایسی حرکت کی تو جان سے مار دوں گی!“ اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

ایمان کی نازک روح پر لگے داغ ابھر کر سامنے آ گئے، اور اس کی معصومیت کا ثبوت بکھر کر رہ گیا۔ چار سالہ معصوم بچی کی گلے کی گلٹی خوف سے پھول کر رہ گئی، اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں۔ کچھ دیر بعد، جب گلٹی غائب ہو گئی، آمنہ نے ایمان کو جانے کا اشارہ کیا۔ ”چلی جاؤ یہاں سے، تمہاری شکل دیکھ کر تمہارے باپ کی یاد آتی ہے۔“

اس نے سختی سے کہا۔

جتوئی، جو کھڑکی کے برابر موجود صوفے پر بے خبری سے ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھا تھا، موبائل کی روشنی میں اپنی دنیا میں مگن تھا۔ اس کی بے حسی کی چادر اتنی گہری تھی کہ ایمان کی آہ و بکا اس تک پہنچ ہی نہیں پا رہی تھی۔ ایمان، جو اس کی بیٹی تو تھی، لیکن اس کے لیے وہ کچھ بھی نہیں تھی۔

اس کی نظروں میں ایمان ایک غلطی تھی، ایک گناہ کا ثبوت جسے وہ مٹانا چاہتا تھا۔ اس کی بے توجہی اور بے رخی ایمان کے دل میں چھپے ہوئے درد کو مزید گہرا کر رہی تھی۔

اسلامی اصولوں کی روشنی میں، شادی کا بندھن دو دلوں کی مرضی اور محبت کی مضبوط دیوار پر کھڑا ہوتا ہے۔ جب اس مقدس رشتے میں دونوں فریقین کی خواہشات کو نظر انداز کیا جاتا ہے، تو اس کی بنیادیں

کمزور پڑ جاتی ہیں، جس سے نہ صرف ان کی زندگی میں اضطراب کی لہریں اٹھتی ہیں بلکہ ان کی اولاد کی زندگیوں پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایسے والدین جو اپنی زندگیوں کی کشمکش میں الجھے ہوتے ہیں، وہ اکثر اپنے بچوں کو اس محبت اور توجہ سے محروم کر دیتے ہیں جس کی انہیں سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

ایمان کی کہانی ایک ایسی ہی تلخ حقیقت کی عکاسی کرتی ہے، جہاں ایک معصوم بچی اپنے والدین کی بے رخی کی شکار ہو کر اپنی زندگی کی راہوں میں بھٹک رہی ہے۔ اس کی زندگی میں وہ پیار اور حمایت کا فقدان ہے جو اسے ایک خوشگوار بچپن فراہم کر سکتا تھا۔ ایمان کی آنکھوں میں بسی اداسی اور دل میں چھپا درد، اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جبری شادیوں کے نتائج صرف دو افراد تک محدود نہیں ہوتے، بلکہ ان کی اولاد کی زندگیوں پر بھی گہرے سایے ڈالتے ہیں۔ ایمان کی زندگی، جو ایک خوشیوں بھرے خاندان کی گود میں پلنے کی مستحق تھی، اب ایک ایسے ماحول میں گزر رہی ہے جہاں اسے اپنے والدین کی موجودگی میں بھی یتیمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی کہانی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ شادی کے فیصلے میں دونوں فریقین کی رضامندی نہ صرف ان کی اپنی خوشیوں کے لیے ضروری ہے بلکہ ان کی اولاد کے مستقبل کے لیے بھی۔

ایمان کی نازک ایڑیاں پالش شدہ لکڑی کے فرش پر بے آواز دوڑتی ہوئی، اس نے اپنے کمرے کی دہلیز پار کی۔ اس کے چہرے پر آنسوؤں کی چمک ابھی باقی تھی، جو اس کے گالوں پر روشنی کی لکیریں کھینچ رہی

تھیں۔ اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں، اور اس کی سسکیاں دل کو چھو لینے والی ہچکیوں میں بدل رہی تھیں۔ اس کا کمرہ، جو کبھی خوابوں کی پناہ گاہ ہوا کرتا تھا، اب ایک خاموشی کا مسکن تھا۔

گلابی دیواریں اور باربی کے پوسٹر ز ایک خوشی کی دنیا کا وعدہ کرتے تھے، جو اب صرف ایک خواب بن کر رہ گئی تھی۔ ایمان نے اپنے آپ کو اپنے نرم بستر پر گر ادیا، اس کا چھوٹا سا جسم رونے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اس کی آواز، جو دکھ سے بھری ہوئی تھی، کمرے کی خاموشی میں ایک نازک سرگوشی بن کر رہ گئی تھی۔ ”وہ مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتے؟“ اس نے اپنے تکیے سے لپٹتے ہوئے سرگوشی کی، جیسے وہ اس سے کوئی جواب مانگ رہی ہو۔ ”میں تو بس چاہتی ہوں کہ وہ مجھے پیار دیں، میری قدر کریں۔“ اس کی آواز میں ایک ٹوٹی ہوئی امید کی جھلک تھی، جو اس کے کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آرہی تھی۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی یہ آواز، ایک چھوٹی سی لڑکی کے دل کے دکھ کی گواہی دے رہی تھی، جو خود کو اس دنیا میں تنہا اور بے کس محسوس کر رہی تھی۔

◆◆◆◆◆○○◆◆◆◆◆

ایمان کی شبِ تاریک

ایمان کی زندگی کے ابتدائی برسوں پر غم کی گہری چھاؤں تھی، اور جب اس نے نوعمری کی دہلیز پر قدم رکھے، تو اس کے ماضی کے سائے نے اس کے حال کو دھندلا دیا۔ شہر کی ہنگامہ خیزی سے دور، آصف محمود کی حویلی ایک دوسری دنیا کی مانند تھی، جہاں وقت کی رفتار تھم سی گئی تھی۔

اس عظیم الشان گھر کی دہلیز پار کرتے ہی، ایک شاہانہ رعب نے ایمان کو اپنے حصار میں لے لیا۔ وسیع و عریض ہال کی بے حد وسعت کسی خواب سرائے کا گمان دلاتی تھی۔ ہال کی خاموشی میں باہر کی زندگی کی مدھم سرگوشیاں ہی کبھی کبھار رخنہ ڈالتیں، جیسے وہ دیواروں کے باہر کی دنیا کی یاد دلانے آئی ہوں۔ ہال کی نیم تاریکی میں پراسراریت کا عنصر نمایاں تھا۔ بھاری پردوں کے پیچھے سے چھن کر آتی لان میں موجود کھمبوں کی روشنی نے ماربل کے فرش پر ایک نرم اور خوابناک پیٹرن بنادیا تھا۔ ہر فرنیچر کا ٹکڑا، ہر آرائشی سجاوٹ، ماضی کی داستانوں کا سفیر بنا ہوا تھا۔

رات کی گہری خاموشی میں، ایک آواز کانپتی ہوئی سنائی دی، جیسے کسی نے روح کو چھو لیا ہو۔ وہ آواز طاقتور تھی، پسینے سے تر تھی، اور دہشت کی ایک بے ساختہ چمک سے لرز رہی تھی۔ اس کے ہر لفظ سے مایوسی چھلک رہی تھی، جیسے وہ زندگی کی ایک باریک لکیر پر لٹکی ہوئی ہو، مدد کے لیے، رحم کے لیے، زندگی کے ایک سادہ تحفے کے لیے پکار رہی ہو۔ لیکن اندھیرے کے گھنے پردے میں، اس آواز کو سننے والے کانوں کو کوئی سکون نہ ملا ”کک۔کک۔کوئی۔ہے۔۔ اللہ کے واسطے۔۔ میری مم

مم۔۔ مدد کرو۔۔“ آواز میں خوف اور لرزہ تھا۔ کمرہ اس کی اذیت کا گواہ بنا ہوا تھا،

ایمان کی رفتار برق رفتار تھی، لیکن اچانک اس کا ٹخنہ بے وفائی سے مڑ گیا، اور اس کے ہونٹوں سے ایک بے ساختہ چیخ برآمد ہوئی۔ وہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ صوفے پر گر پڑی، اس کا چہرہ پسینے اور آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا، اور اس کی سانسیں گھبراہٹ میں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں دہشت کی ایک چمک تھی، جیسے وہ کسی نادیدہ خطرے کا سامنا کر رہی ہو۔

اس کا لباس، جو کبھی سادگی کی علامت تھا، اب تشدد کے نشانات سے داغدار تھا۔ اسکی قمیض کے بازو پھٹے ہوئے تھے اور پشت سے قمیض اس طرز سے دو حصوں میں چاک تھی جیسے کسی نے اپنی پوری قوت سے اسکی قمیض کو پھاڑا ہو۔

چاک قمیض کے درمیان میں اسکی برہناکمر، جہاں پسینے کی نمی سمائی ہوئی تھی، اس پر گہرے نشانات کھدے ہوئے تھے، گویا کسی نے جان بوجھ کر انہیں اپنے دانتوں سے تراشا ہو۔ قمیض کے دونوں کنارے، جیسے کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر، اوپر کی جانب پھٹے ہوئے تھے۔

ایمان نے خود کو صوفے پر سیدھا کیا، اس کے بال جو پہلے ہی کسی نے کھینچ کر بے ترتیب کر دیے تھے، اب دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے، جیسے کسی نے انہیں جان بوجھ کر پھاڑ دیا ہو۔ اس کے چہرے کے ارد گرد بے بی ہیر کی بے ترتیب لٹیں اس کے معصوم چہرے کو چھپا رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھیل سی بنی ہوئی تھی، اور وہ سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی، جیسے ہر آنسو اس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہا ہو اور اس کے دکھ کی داستان سنار ہے تھے

اس کے زخمی ٹخنوں سے خون بہہ رہا تھا، جو اس کے کپڑوں کے ساتھ مل کر ایک عجیب رقص کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کمرہ خود اس ظلم کی گواہی دے رہا ہو۔ اس خاموشی میں، ایمان کی زندگی کے لیے رونے کی آوازیں گونج اٹھیں، ہر چیخ رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی تھی۔ اس کی مدد کی التجائیں ہوا میں لٹکی ہوئی تھیں، لیکن بے حسی کی ظالمانہ دیواروں کی وجہ سے بے اثر ہو گئی تھیں۔ کمرہ، جو کبھی پناہ گاہ تھا، اب ایک بے رحم موجودگی کا حامل تھا، جہاں ایک نوجوان روح کی بقا کے لیے جدوجہد ایک خوفناک منظر پیش کر رہی تھی۔ یہ منظر ریڑھ کی ہڈی میں لرزہ طاری کر دیتا تھا، جہاں زندگی اور موت کی لکیر دھندلی ہو چکی تھی، اور جہاں اندھیرے نے ایسے راز چھپا رکھے تھے جو سمجھنے کے لیے بہت گہرے تھے۔۔۔

آصف کی موجودگی نے کمرے کی فضا کو ایک گہرے سناٹے میں ڈھال دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چھپی بے رحمی اور چہرے پر بکھری ہوئی سرد مسکراہٹ نے ایمان کے دل کو چھلنی کر دیا۔ اس کے ہاتھوں کی بے قراری اور جسم کی معمولی سی لرزش نے کمرے کی خاموشی کو مزید گہرا کر دیا۔ ایمان کی نگاہیں، خوف اور بے یقینی کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

آصف کی قدموں کی آہستہ سی چاپ، جو کمرے کے ماربل کے فرش پر گونج رہی تھی، نے ایمان کے دل کی دھڑکن کو تیز کر دیا۔ اس کے ہر قدم کے ساتھ، کمرے کی دیواروں پر لٹکی ہوئی تصویریں ایک لمحے کے لیے کانپ اٹھتیں، جیسے وہ بھی اس کی موجودگی سے خائف ہوں۔ آصف کے ہاتھوں کی حرکت، جو کبھی محبت کی نرمی سے بھری ہوتی تھی، اب ایک خطرناک ارادے کی گواہی دے رہی تھی۔

کمرے کی ہوا میں ایک عجیب سی بے چینی گھل مل رہی تھی، جیسے کوئی نادیدہ قوت اس کی گرفت میں ہو۔ ایمان کی سانسیں، جو پہلے ہی خوف سے بھری ہوئی تھیں، اب اور بھی تیز ہو گئیں، جیسے وہ کسی نامعلوم خطرے کی پیش بینی کر رہی ہو۔ آصف کی آنکھوں میں چھپی ہوئی سردی اور اس کے چہرے پر بکھری ہوئی شرارتی مسکراہٹ نے ایمان کے دل کو ایک لمحے کے لیے روک دیا، جیسے وقت کی رفتار بھی اس کے سامنے تھم گئی ہو۔

آصف یکدم اس کے سامنے نمودار ہوا

آصف کی شرٹ کے اوپری بٹن کھلے ہوئے تھے، جیسے اس کے دل کے اندر کی تاریکی کی جھلکیاں باہر آ رہی ہوں۔ اس کے بازوؤں کے کف بے ترتیبی سے مڑے ہوئے تھے، اور سیاہ پینٹ سے باہر نکلی سیاہ شرٹ نے اس کی بے ربطی کو عیاں کر دیا تھا۔ نشے کی حالت میں، وہ صوفے پر دوزانوں چڑھ کر ایمان پر جھکا تھا یکدم ایمان نے آنکھوں کو مینچ لیا۔

اس نے اپنا، چہرہ نیچے کی طرف کیا، جیسے وہ اس دنیا سے فرار چاہتی ہو۔ اس کی سانسیں تیز تھیں، اور پسینے کی بوندیں اس کے ماتھے پر نمایاں تھیں۔ اسکو صرف اپنے سامنے آصف نظر آ رہا تھا اسکی پشت میں کیا تھا سب چھپا ہوا تھا۔۔ آصف، جو نشے کی دھند میں تھا، نے ایک وحشی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”تم مجھ سے کہیں بھی نہیں بھاگ سکتی، تم کہیں بھی نہیں جاسکتی۔“ اس کی آواز میں خبیث پر اسراریت تھی، جیسے وہ ایمان کو اپنے الفاظ سے ڈرا رہا ہو۔۔ اس نے اپنا چہرہ نیچے کیا اور زبردستی اپنے لبوں کو ایمان کے کانپتے

لبوں کے قریب تر لانے لگا یکدم ایمان کانپ اٹھی اس نے یکدم اپنے ہاتھوں کی گرفت ایمان کی گردن پر رکھی اور اسے صوفے کے ساتھ لگا دیا جسے ایمان کو ایک جھٹکا لگا، آصف کی آنکھوں میں وحشی پن تھا، ایمان کی اچانک حرکت سے فضا میں تناؤ کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے آصف کو زوردار دھکا دیا، لیکن وہ شخص، جیسے کسی ناقابل شکست قوت سے لیس ہو، اپنی جگہ پر مضبوطی سے جمع رہا۔ وہ نہ صرف کہ نیچے نہیں گرا، بلکہ اس نے اپنی آنکھوں کو مینچ کر اور جبرے کو کس کر اپنے غصے کا اظہار کیا۔ اس کی آنکھوں میں آگ بھڑک اٹھی، اور چہرے پر نفرت کی ایک گہری لکیر نمودار ہوئی، جیسے وہ ایمان کو اپنی نظروں سے ہی جلا دینا چاہتا ہو۔

اس نے اپنا مشتاق پنخہ بھینچا، اور ایک دم سے ایمان کے نازک گالوں پر اس کا ہاتھ زوردار طمانچے میں تبدیل ہو گیا۔ ایمان کی کمزور کایا کانپ اٹھی، جیسے کسی غیر متوقع آفت کا سامنا کر رہی ہو۔ یکدم اس کے لبوں سے لال مائع پھوٹ پڑا، جیسے کسی زخم سے خون کا فوارہ بہہ نکلا ہو۔ وہ سسکا اٹھی، ایک گہری اور درد بھری سسکی جو اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی۔۔۔

آصف نے اپنے بھاری ہاتھ اس کے نازک منہ پر رکھ دیے، جس سے اس کی سسکیاں کہیں گہرائیوں میں دب کر رہ گئیں۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں، جیسے کوئی بھیانک خواب حقیقت کا روپ دھار چکا ہو۔ آنسو، جو پہلے دبے دبے تھے، اب دریا کی مانند بے قابو بہہ نکلے۔ وہ اس کی جکڑ میں بے بسی سے تڑپتی رہی، جبکہ آصف، نشے کی دھند میں، ایک وحشی درندے کی مانند اس پر حاوی ہوتا چلا گیا۔ اس کے جبرے

بھینچے گئے، ایک غصے کی شدید لہر نے اس کے چہرے کو مسخ کر دیا۔ آصف کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی، جیسے وہ اپنے شکار کو ڈرا کر مزید تکلیف دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس کی گرفت میں پھنسی، وہ بے چاری لڑکی اپنی آزادی کے لیے بے بسی سے جدوجہد کر رہی تھی، لیکن آصف کی وحشیانہ طاقت کے آگے اس کی کوششیں بے کار تھیں۔ اس کے دل میں امید کی ایک چھوٹی سی کرن بھی دم توڑ رہی تھی، جیسے اندھیرے میں روشنی کی آخری شمع بھی گلشن بھی گل ہو چکی تھی، اور اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ آصف کی شیطانی ہنسی نے خاموشی کو چیر دیا، جیسے وہ اپنی بربریت پر فخر محسوس کر رہا ہو۔ اس کی گرفت سے نجات پانے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی، اور اب وہ لڑکی، جو کبھی زندگی کی امیدوں سے بھرپور تھی، اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر چکی تھی۔ آصف نے اسے زور سے اپنی بازوؤں میں بھر لیا، جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کو جکڑ لیتا ہے۔ وہ، اس کی گرفت میں، پانی کی کمی سے تڑپتی مچھلی کی مانند بے چینی سے تڑپ رہی تھی۔ اس کی کوششیں، جیسے وہ خود کو اس کی پکڑ سے آزاد کرانا چاہتی ہو، لیکن اس کی تمام تر جدوجہد بے نتیجہ تھی۔ آصف کی مضبوط گرفت نے اسے مکمل طور پر قابو میں کر لیا تھا۔ اس نے ایمان کو اپنی گود میں اٹھایا اور زینے کی جانب بڑھا، ہر قدم کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی، جیسے کوئی ناقابل تصور انجام اس کا انتظار کر رہا ہو۔

.....△△△.....

دروازہ جھماکے سے کھلا اور اس کی گونج نے کمرے کی خاموشی کو چیر دیا۔ ایمان، جو اپنی حفاظت کے لیے سمٹی ہوئی تھی، اس کی گود میں سکڑ گئی، اس کی آنکھیں خوف سے وسیع ہو گئیں، اور اس کی آواز ناامیدی

کے آنسوؤں میں گھل گئی۔ کمرے کی سخت روشنی میں، آصف کا چہرہ شیطانیت کے ایک گھناؤنے ماسک میں بدل گیا۔ فوری حرکت کے ساتھ، اس نے دروازہ بند کر دیا، یہ یقینی بناتے ہوئے کہ اندر کا خوفناک منظر باہر نہیں جاسکے گا۔ ایمان کی مدد کی پکار اور بھی بے قرار ہو گئی، اس کی آواز میں خوف کی لرزتی ہوئی لہر تھی جس نے کمرے کو معمور کر دیا۔ لیکن آصف، جس کے دل میں رحم نہیں تھا، نے پیچھے ہٹنے کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔ بے رحمی سے، اس نے ایمان کو بستر پر پھینک دیا، اور اس کا نازک بدن بے جان سا بستر پر گرا۔

-- ایمان نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آصف کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر خوف کی نئی لہر نمودار ہوئی۔ جب اس نے شرمندگی سے اپنی آنکھیں موند لیں جب، آصف نے اپنی شرٹ کے باقی بٹنوں کو بھی عیاری انداز میں سُستی کے ساتھ کھولا اور اس کو بے اعتنائی سے ایک طرف پھینک دیا۔ ایمان نے آنکھیں بند کر کے، سر جھکا کر کہا، ”اللہ کے لیے مجھے چھوڑ دیں۔۔ مجھے گھر جانا ہے۔“ وہ منت کرتے بولی تھی اسکی آواز کانپ رہی تھی جسے۔ کمرے میں کشیدگی کی ایک گہری لہر دوڑ گئی، جیسے خوف کا ایک گہرا سایہ ہر کونے کو گھیر رہا ہو اور ہوا کو ساکن کر رہا ہو۔

آصف کی ہنسی میں ایک سرد مذاق تھا، جیسے وہ انسانیت کے دکھوں پر ہنس رہا ہو۔ اس کا قہقہہ، جو بے رحمی کی ایک گونج تھی، کمرے میں پھیل گیا۔ اس کی آواز میں ایک بے لگام تکبر تھا، جیسے اس کے الفاظ میں زہر گھلا ہوا تھا۔ ”کون اللہ۔۔؟“ اس نے مذاق اڑایا، اس کی آواز میں ایک مسخ شدہ احترام تھا۔ ”میرے پاس دولت ہے، طاقت ہے، سب کچھ ہے۔ کوئی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اللہ بھی نہیں۔۔“

اس کے الفاظ نے کمرے کی فضا کو بو جھل کر دیا، جیسے اس کے تکبر کی گرانی سے ہوا دب گئی ہو۔ آصف کی گمراہ کن خود اعتمادی نے اسے ایک تاریک کردار کے طور پر پیش کیا، جس کی لالچ اور جس کی بے رحمی نے اسے ایک ظالمانہ شبیہ دی آصف نے تمسخر کے ساتھ اپنا سر ہلا دیا اور اس کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ وہ بتدریج اس کی جانب بڑھ رہا تھا جب ایمان نے اپنی ہمت کو سمیٹا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے آصف کو ایک زوردار دھکا دیا، جس سے وہ پیچھے کی طرف لڑھک گیا، اور پھر وہ دروازے کی طرف دوڑ پڑی۔

آصف نے غصے سے اپنے دانت پیسے۔ وہ پلٹا اور ایمان کی جھلک دیکھتے ہی اسے اس کے شہد کے رنگ کے لمبے بالوں سے دبوچا۔ ایمان، جو آگے بڑھ رہی تھی، اچانک درد کی شدت محسوس کرنے لگی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، ہوا کے لئے ہانپتے ہوئے اس نے منہ کھولا اور اسے پیچھے کی طرف کھینچ لیا گیا۔ وہ درد کی شدت سے کراہ اٹھی

آصف کی مضبوط گرفت نے ایمان کو اس کے ساتھ کھینچ لیا، جیسے وہ ایک بے جان کٹھپتلی ہو۔ اس کی لمبے بالوں کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے، آصف نے اسے بیڈ کی جانب دھکیلا، جہاں ایمان بے بسی سے گر پڑی۔ اس کے چہرے پر درد کی ایک لہر دوڑ گئی، آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر ایک خاموش چیخ۔ آصف، زنانوں کے بل بیڈ پر چڑھتے ہوئے، اس کے اوپر جھکا، اس کی آنکھوں میں ایک تاریک سایہ تھا جو ایمان کے دل کو چھلنی کر رہا تھا۔ اس کی نظریں ایمان کی روح کو جھنجھوڑ رہی تھیں، جیسے وہ اس کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے خوف کو بھانپ رہا ہو۔ ایمان کی سانسیں بے ترتیب ہو گئیں، اور اس کے ہاتھ بے بسی سے

بستر کی چادر کو مضبوطی سے تھام لیے۔ اس کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی، جب آصف نے اسے اپنے قابو میں کر لیا۔

ایمان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، جیسے وہ اپنے دل کے درد کو بہا کر دور کرنا چاہتی ہو۔ آصف کی بے رحم گرفت نے اس کی کلائی کو جکڑ رکھا تھا، اور اس کے چہرے پر درد کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور تکلیف کی عمیق چھاؤں تھی، جبکہ آصف کے چہرے پر غصے کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ ایمان نے اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی، لیکن آصف اس پر جاتا گیا۔

آصف نے اس کے اوپر جھکتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو بیڈ کے کنارے سے باندھ دیا۔ ایمان کی سانسیں تیز ہو گئیں، اور اس کی آنکھوں میں ایک بے بسی کی جھلک تھی۔ آصف کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی، جیسے وہ اس کی بے بسی کا مزہ لے رہا ہو۔ ایمان کے دل میں امید کی ایک چھوٹی سی کرن بھی دم توڑ گئی، جب اس نے آصف کی آنکھوں میں اپنے لئے کوئی رحم نہ پایا۔

اس کے چہرے پر خوف اور تکلیف کے سایے گہرے ہوتے جا رہے تھے، اور اس کے دل کی دھڑکن تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ایمان نے ایک آخری کوشش کی اور آصف کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی، لیکن اس کی کوشش بے سود تھی۔ آصف نے اسے مزید مضبوطی سے جکڑ لیا، اور ایمان کی آنکھوں میں ایک گہری اداسی چھا گئی۔

اور چاروں اطراف میں اندھیرا چھا گیا۔۔ جہاں صرف ایمان کی مزاحمتی چیخوں و سسکیوں کی آوازیں تھیں جو کچھ دیر بعد گھٹی گئیں ایک وقت آیا جب یہ سسکیاں اس کے گلے میں اٹک، کر رہ گئیں۔۔

ایمان کے لیے، یہ لمحہ ایک بے رحم تصادم تھا، جس میں اس کی زندگی کے سب سے قیمتی پہلو چھین لیے گئے تھے۔ ایک کربناک دوراہا، جہاں اس نے اپنی شناخت اور عزت دونوں کو خون کے آنسو روتے دیکھا۔ زندگی، جو کبھی مستقبل کے خوابوں سے معمور تھی، اب محض ایک باریک سی ڈوری پر لٹک رہی تھی، جس کی سابقہ جان داری کا صرف ایک سایہ باقی تھا۔ اپنی گہری مایوسی میں، ایمان نے ایک ایسے نقصان کا سامنا کیا جو مادیت سے پرے تھا۔ ایک غم جو اس کے دل کو بو جھل کر رہا تھا، ایک ایسا بوجھ جو ایک لازوال طوفان کی مانند تھا، جس نے اسے بکھر کر رہنے دیا۔ وہ دنیا جسے وہ جانتی تھی، اب بلبے کا ڈھیر بن چکی تھی، اور اس کی زندگی کی خواہش، ایک نازک تار کی مانند، فراموشی کی گہرائیوں میں کھو گئی تھی۔ وہ وقت جب ہر سانس ایک جدوجہد بن چکی تھی، جب دنیا نے اسے تنہا چھوڑ دیا تھا، اور وہ اپنے وجود کے بے وفاسمندر میں اکیلی تھی۔ اس گہرے نقصان کے دوران، ایمان کی کہانی زندگی کی نزاکت اور انسانی جذبے کی ایک زندہ مثال بن گئی، جو اندھیرے کے عین لمحے میں بھی امید سے چمٹی رہتی ہے۔

وہ پہلے ہی زندگی کی تپتی دھوپ کا سفر کر چکی تھی۔ لیکن جب والدین اپنی اولاد کو بے قدر سمجھتے ہیں، تو دنیا ان کا فائدہ اٹھاتی ہے۔ ایمان بھی اسی کا شکار تھی۔ وہ ٹوٹ چکی تھی، مر چکی تھی۔ اس کا جسم تو زندہ تھا، لیکن اس کی روح کب کی مر چکی تھی۔ وہ ایک بے جان موجودگی کی مانند سانس لے رہی تھی۔

زندگی کی راہوں میں امید کی کرن کہیں کھو گئی تھی، ایمان کے دل میں درد کی ایک گہری لکیر کھینچ گئی تھی۔
کیا کوئی شخص ایسا ہو گا جو اس کے زخموں کو سمجھ سکے، انہیں مرہم لگا سکے؟ کیا کوئی ایسا ہو گا جو ایمان کے
دل کے ٹکڑوں کو جوڑ سکے؟ شاید ایمان کبھی کسی کو اپنے قریب نہ آنے دے، لیکن کیا کوئی ایسا ہو گا جو اس
کے دل کی دیواروں کو توڑ سکے؟

.....

ایمان نے خود کو بیڈ کے نیچے پایا، اپنے بازوؤں کو گھٹنوں کے گرد مضبوطی سے لپٹا رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں
میں خوف کی لہریں گھوم رہی تھیں، جیسے کوئی گہری سمندر میں ڈوب رہا ہو۔ اس کے بال بے ترتیب تھے،
جیسے اس کی روح کا تناؤ اس کی جھلکی ہوئی شکل پر ظاہر ہو رہا ہو۔

آصف، ایک شرارتی تماشہ، اتفاق سے بستر پر پھیل گیا۔ اس کی ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں، اور اس کے
چہرے پر ایک خوفناک مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی، جیسے کوئی شیطانی منصرہ۔

آصف کی نظریں ایمان پر گڑیں، اس نے ایمان کی طرف حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا اور پھر اچانک
ایمان کا دوپٹہ، جو کبھی اس کی شخصیت کی نمائندگی کرتا تھا، اٹھا کر فضا میں لہرا دیا۔ دوپٹہ ہوا میں بل کھاتا
ہوا ایمان کے قدموں میں جا گرا، لیکن ایمان نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا، وہ بے تاثر نظروں سے سامنے
دیوار کو تکتی رہی۔

اس کی آنکھوں کے گرد نیل کی روشنی کبھی معصومیت کی چمک کو دیکھاتی تھی، اب وہ عذاب کے نشانات لے رہی تھیں۔ دائیں آنکھ اس ظلم کے زور سے پھول گئی تھی، جو اس نے برداشت کی تھی۔ اس کی کمزوری کی دردناک یاد دہانی اس کے دل میں گہری چوٹ کی صورت میں بس گئی تھی۔

آصف کی بے رحم نظروں نے ایمان کی روح کو چھلنی کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو کبھی خوابوں کی شفقت ہوا کرتی تھی، اب صرف خالی پن اور درد کی گہرائیاں نظر آتی تھیں۔ اس کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں، جیسے کسی مجبور ندی کی موجیں، اس کے گالوں پر بہہ رہی تھیں۔

چل اٹھ، اب نکل یہاں سے!“۔

یہ بولتے اس نے ایمان کو

معمولی سی ٹھوکر ماری۔ اس ٹھوکر سے ایمان کچھ کھسکی، لیکن اس کے بعد وہ پھر سے ساکت ہو گئی، مورتی کی مانند، اور اپنی نظریں پھر دیوار پر جمادیں۔ آصف نے دوبارہ اسکو ہلکی سی لات ماری مگر ایمان ٹس سے مس نہ ہوئی وہ اسی طرح سامنے دیکھ رہی تھی ساکت نگاہوں سے ”تجھے سنائی نہیں دے رہا ہے دفاع ہو“۔

آصف کی آواز میں حکمرانی کی سرد مہری تھی، جیسے وہ ایمان کی موجودگی کو محض ایک بے جان شے سمجھتا ہو۔

ایمان کی زلفیں بستر پر ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں، گویا رات بھر کسی طوفانی جدوجہد کا سامنا کیا ہو۔ اُس کی آنکھوں میں بے بسی کی ایک عجیب سی چمک تھی، جیسے وہ کسی ناقابل بیان ظلم کی گواہ بنی ہو۔ اُس کی نظریں خالی تھیں، جیسے کسی نے اُس کے دل کی گہرائیوں سے اُس کی جان چھین لی ہو۔

”تو نے آصف محمود کی بزرگی کو چھوا ہے، جس کے دیدار کو لوگ ترس جاتے ہیں۔ تیرے جسم پر میرے نشانات کی مہر ہے، جو تیری قدر کو بیان کرتی ہے

کیا یہ وہ درد ہے جو تیری آنکھوں سے بہہ رہا ہے؟ آصف نے سرد مسکراہٹ کے ساتھ کہا، اس کی آواز میں تمسخر کی چھاؤنی تھی۔

تو نے آصف محمود کی چھون کا شرف حاصل کیا ہے،۔ تیری روح پر میری مہر ہے، جو تیرے وجود کو عزت بخشی ہے۔“

ایمان، جو اب تک خاموشی سے اپنے آپ میں گم تھی، اس کے حلق میں ایک گھٹن سی محسوس ہوئی۔ آصف کی سنگدلی اور تکبر بھری باتوں نے اس کے دل کو چھلنی کر دیا تھا۔

۔ ”اب اپنے آپ کو سنبھال، اور یہاں سے دفع ہو جا!“ آصف نے حکم دیا۔ ایمان کی آنکھوں میں اب بھی ایک امید کی کرن تھی، جیسے وہ اس کرب سے نجات کی دعا کر رہی ہو۔

آصف نے فخریہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا، ”تجھے آصف محمود نے چھوا ہے، جس کے ساتھ لوگ ملنے کے لئے مرتے ہیں۔ دیکھ، اس نے تیرے آنگ آنگ میں اپنی نشانی چھوڑی ہے!“۔

ایمان، جو چپ چاپ سنجیدگی سے کھوئی ہوئی سامنے دیکھ رہی تھی، اس کے گلے کی گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔ آصف کی بے حسی اور غرور کی باتیں سن کر اس کے دل میں گہرا زخم لگا۔

۔ ”کپڑے درست کر اور دفاع ہو یہاں سے!“ آصف نے چلاتے ہوئے کہا۔ ایمان کی آنکھوں میں رحم کی التجا کرتی نظریں اب بھی اس ڈراؤنے خواب سے رہائی کی امید میں تھیں۔

...°...

اس مکروہ کمرے کی چار دیواری میں، جہاں آصف نے ایمان کی روح کو بے دردی سے مجروح کیا تھا، وہ خود آئینہ کے روبرو اپنی خود فریبی میں محو تھا۔

اس کی عکس بندی میں اس کمرے کی بے زبان دیواروں پر رقم ظلم کی داستان کا کوئی نقش نہ تھا، کیوں کہ اس نے اپنے سر کے بالوں کو بڑی نفاست سے سجایا تھا۔

اس کی زیبائش میں سادہ سفید سوتی کا لباس تھا، جو اس کے باطن کے اندھیرے کو چھپانے کے لیے کافی تھا۔ دوسری جانب، ایمان کی حالت ایک سایہ بن کر رہ گئی تھی، جو کبھی زندگی کی تابانی سے معمور تھی۔

اس کے آنسو، جو پہلے بے باکی سے بہہ رہے تھے، اب خشک ہو چکے تھے، اور اس کے چہرے پر غم کی گہری لکیریں نقش ہو گئی تھیں۔

اس کا پہناوا، جو کبھی عزت و شرافت کی علامت تھا، اب جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا، جو اس کے کھوئے ہوئے وقار کی تلخ یاد دلاتا تھا۔

جب وہ دروازے کی طرف بڑھی، تو اس کے قدموں کی بھاری چاپ سنائی دی، جیسے اس کی آزمائشوں کا بوجھ اس کے وجود کا حصہ بن چکا تھا۔

وہ بے حسی کے صدمے کی حالت میں تھی، جو اس کے سہے گئے دکھوں کا گواہ تھا۔

اس کمرے میں، جہاں ظالم اور مظلوم کے درمیان کا فرق واضح تھا، آصف اپنے غرور میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کے چہرے کی سختی اس کے دل کی بے حسی کو ظاہر کر رہی تھی۔

ایمان، جو اپنی تکلیف کے بوجھ کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی، اس کے چہرے پر درد کی ایک معمولی سی لہر نظر آئی، جو ظلم کے سامنے اس کی لچک کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کی خاموش موجودگی انسانی روح کی ناقابل تسخیر فطرت کا ثبوت تھی، حتیٰ کہ تاریک ترین لمحات میں بھی۔

جیسے ہی ایمان، امید کی آخری کرن کے سہارے، اپنے عذاب سے نجات کی کوشش میں دروازے کے قریب پہنچی، قسمت کے ظالم ہاتھ نے ایک بار پھر مداخلت کی۔

دروازہ اچانک کھل گیا، اور آمنہ، اس کی ماں، جو باہر سے آئی تھی، کو ظاہر کیا۔

جب آمنہ نے مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے قدم رکھا، اچانک اس کی آنکھیں وسعت اختیار کر گئیں، اور اس کے لب معنی خیز خاموشی میں کھل گئے۔

ایمان، جو اپنی جگہ پر جمی ہوئی تھی، نے خالی نظروں سے اپنی ماں کو دیکھا، جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو۔ آمنہ کی نظریں، جو اپنی بیٹی کی بے کسی کا مطالعہ کر رہی تھیں، ان میں ایک گہری بھوک کی جھلک تھی، جیسے وہ ایمان کے دکھوں کی عکاسی کر رہی ہوں۔ ایک لمحے کے لیے، آمنہ دروازے کی دہلیز پر ایک مجسمہ بن گئی، جیسے اس کا ہاتھ دروازے کی کنڈی کو چھوتے ہی ساکت ہو گیا ہو۔

ایمان، جس کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں اور زخموں کی کہانیاں تھیں، ایک نازک امید کے سہارے کھڑی تھی کہ شاید اس کی ماں، ماضی کی بے حسی کے باوجود، اس تاریک وقت میں اس کی دلاسا دے سکے۔

وہ ایک محبت بھرے گلے کی، ماں کے دلار کے لمس کی، اور محبت کی روشنی کی آرزو مند تھی۔

لیکن آمنہ کا جواب ایمان کی دعاؤں کے برعکس تھا۔

اس کی آنکھیں، جو کبھی اطمینان کا سرچشمہ تھیں، اب غضب کی آگ سے بھڑک رہی تھیں، جیسے ان میں گہری کھائیاں کھود دی گئی ہوں۔

آصف کی جانب دیکھتے ہی اس کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔

- ”تم نے میری امیدوں کو خاک میں ملا دیا،“ اس کے الفاظ ناراضگی اور الزام کی تیز دھار تلوار تھی۔

آمنہ کے کلمات کی گونج نے ایمان کی آنکھوں کو آنسوؤں کی بے صدالہروں سے بھر دیا۔

جب اس نے ماں کی جانب دیکھا، تو اس کی نظروں میں امید کی ہلکی سی جھلک محسوس ہوئی۔

ایمان کو یقین تھا کہ آمنہ اب آصف کے خلاف اس کا ساتھ دے گی۔

آمنہ کی موجودگی ایمان کے لیے امن کی مثال، ایک محفوظ پناہ گاہ بن چکی تھی۔ کانپتے ہونٹوں اور

آنسوؤں سے بھیگے گالوں کے ساتھ ایمان نے ماں کو پکارا، ”امی...“ اس کی آواز کمرے کی سرد ہوا میں

ایک نازک سرگوشی بن کر رہ گئی۔

لیکن جواب جو ایمان کو ملا، وہ اس کی توقعات کے برخلاف تھا۔

آمنہ کی آنکھیں، جو کبھی محبت کی گرمی سے بھری ہوتی تھیں، اب غصے اور بے چینی کے طوفان سے گھری

ہوئی تھیں۔

ایمان، جو پہلے ہی درد اور مجروحیت کی حالت میں تھی، سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کی ماں کی نظروں میں

اتنی نفرت کیوں تھی۔

- ”کیا تمہارے باپ جتوئی نے تمہیں آصف کو میری زندگی سے نکال باہر کرنے کے لیے بھیجا ہے؟“
آمنہ کی آواز میں الزام کی تیزی تھی جب وہ اپنی بیٹی کے سامنے کھڑی تھی۔

ایمان کے لیے یہ الفاظ اس کے پہلے سے زخمی دل پر نمک پاشی کر رہے تھے۔ ایمان نے آنسو بھری آنکھوں اور دکھ سے بوجھل دل کے ساتھ انکار میں سر ہلایا۔ اس کی سسکیاں اس کی بے گناہی کی داستان سنارہی تھیں، لیکن ماں کے غصے میں سچائی کا پتہ نہ چل سکا۔

اس دل دہلا دینے والے لمحے میں، زندگی کا ایک گہرا سبق کمرے کی فضا میں گونج اٹھا: کہ اس دنیا میں، وہ لوگ بھی جو آپ کے قریب ترین ہوتے ہیں، آپ کے اپنے والدین بھی، کبھی کبھار منہ موڑ لیتے ہیں۔ مایوسی کے اس عالم میں ایمان نے ابھی یہ دریافت نہیں کیا تھا کہ آخر کار صرف ایک ہی ہستی ہے جو حقیقی معنوں میں غیر مشروط محبت کرتی ہے، اور وہ اللہ ہے۔ یہ آنسوؤں اور دل کے ٹوٹنے کی کیفیت سے اس نے یہ سبق سیکھنا تھا۔

آمنہ کی قدموں کی رفتار میں غصے کی شدت جھلک رہی تھی، جیسے وہ ایمان کے ساتھ فاصلے کو مٹانے کے لئے بے تاب ہو۔

اس کی آنکھوں میں مایوسی کی گہرائیاں تھیں، جو بیٹی کی جانب مرکوز تھیں۔ ایمان، جو اپنی ماں کے اچانک بدلے رویے کو سمجھنے سے عاجز تھی، ایک زوردار چانٹے کی گونج سے چونک اٹھی۔

آمنہ کا ہاتھ، جیسے کسی غیر مرئی قوت سے چلایا گیا ہو، ایمان کے چہرے پر پڑا، جس کی گونج کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آئی۔

ایمان کا ہاتھ بے اختیار اپنے سرخ پڑتے گال کی طرف بڑھا، جبکہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔
اس نے اپنا چہرہ پھیر لیا، جیسے مزید کسی زخم سے بچنے کی کوشش کر رہی ہو۔

آصف، جواب تک خاموش تماشائی بنا ہوا تھا، اس کے اندر کا غصہ اب کھول رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور آمنہ کی طرف بڑھا، جیسے کسی بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس کے قدموں میں ایک مقصد تھا، ایک عزم تھا کہ وہ اس تناؤ کو ختم کر دے گا۔

جب وہ آمنہ کے قریب پہنچا، تو اس نے اسے اپنی باہوں میں بھر لیا، جیسے وہ اسے دنیا کی ہر برائی سے بچا رہا ہو۔ اس کی آواز میں ایک نرمی تھی، جو آمنہ کے سرد رویے کے برعکس تھی۔ ”تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا،“۔

۔ اس نے آمنہ سے کہا، اس کے الفاظ میں ایک سکون تھا۔ ”تم میری زندگی ہو۔“۔

لیکن جب اس کی نظریں ایمان کی طرف گئیں، تو اس کی آواز میں ایک سردی آگئی۔ ”اور میں نے اس کے لیے بس اتنا ہی کیا ہے۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”کہ یہ مفت میں روٹی توڑ رہی تھی۔ اس کی خوبصورتی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔“ اس کے الفاظ میں ایک فخر تھا، جیسے وہ اپنے کیے پر نازاں ہو۔ ”میں

نے اسے وہ عزت دی ہے جو میرے نشانات سے اس کے چہرے پر ثبت ہوئی ہے۔ ”۔ اس نے فخر سے کہا۔

آصف نے آمنہ کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا، اس کی آنکھوں میں پیار کی چمک تھی۔
اور یاد رکھو، کوئی بھی تمہیں میری زندگی سے جدا نہیں کر سکتا۔ ”۔

اس نے کہا، اس کے الفاظ میں ایک ٹھنڈا تاثر تھا، جیسے وہ اس المناک منظر کو اپنے جذبات کے ساتھ بیان کر رہا ہو۔

آمنہ کی ناگہانی سرد مہری نے فضا کو بخ بستہ کر دیا، آصف کی جانب سے اپنی پشت کرتے ہی اس کی بے رخی عیاں ہو گئی۔

وہ معاندانہ قدموں سے ایمان کی جانب بڑھی، اس کے دل میں غصے کی لپٹیں اب بھی شعلہ زن تھیں، جو معافی سے بہت دور تھیں۔

اچانک ایک شدید جنبش کے ساتھ، اس کا ہاتھ ہوا میں لہرایا، جس سے ایمان کے مجروح چہرے پر ایک کراہا اچانٹا سید ہوا۔

آصف کے لبوں پر بے قراری کی مسکان تھی، اس منظر کو دیکھ کر اپنی خوشی کو قابو نہ کر سکا۔

اس کا تہقہہ، کمرے کی فضا میں ایک مخیف سرگوشی کی مانند تھا، آمنہ کی تیز نگاہوں کا سامنا کرتے ہوئے۔

اس کی آنکھوں میں جلن اور برہمی کی آگ بھڑک رہی تھی، جو آصف پر جمی ہوئی تھیں۔

بدلے میں، آصف نے شرارت بھری خاموشی کا اشارہ کیا، اپنے لبوں پر انگلی رکھ کر، جو آمنہ کی مایوسی کو اور بڑھا دیتا ہے۔

آصف کی طرف دیکھے بغیر، اس نے ایمان کی جانب اپنی توجہ موڑ دی، اس کی آواز غصے سے کانپتی ہوئی۔
”باہر نکل جا، یہاں سے دور ہو جا۔“

اس نے حکم دیا، اس کی آواز میں سختی اور حتمیت تھی۔ ایک زوردار دھکے کے ساتھ، اس نے ایمان کو کمرے سے باہر دھکیل دیا، اس شکست خوردہ لڑکی کو بیرونی دنیا کی سختیوں کا سامنا کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔
اس غمگین منظر میں، آمنہ، آصف اور ایمان کے درمیان جذبات کی ایک پیچیدہ کشمکش تھی، جہاں طاقت اور تسلیمیت کا ایک پریشان کن رقص جاری تھا، جس میں ظلم و مزاح ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے، جس سے ایمان اپنی جدوجہد میں بالکل شکست خوردہ اور تنہا محسوس کرتی تھی۔

ایمان کی دنیا میں، حقیقت کا پردہ اٹھتا ہے تو ایک کڑوی حقیقت سامنے آتی ہے: اس دنیا میں، وہ بھی جو آپ کی پناہ گاہ بننے کا دعویٰ کرتے ہیں، آپ کے لیے طوفان کا باعث بن سکتے ہیں؛ لیکن اندھیرے کے ان لمحات میں، وہ ایک ابدی سبق سیکھتی ہے۔ حقیقی سکون دنیا کی فانی محبتوں میں نہیں، بلکہ اس لافانی محبت میں ہے جس نے کائنات کو اپنے دستِ قدرت میں سمو یا ہے۔۔

امروز۔۔

ایمان اپنے تاریک کمرے میں دروازے سے پشت لگائے تنہا بیٹھی تھی، اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس کا چہرہ، جو کبھی معصومیت کا پیکر تھا، اب سوچی ہوئی آنکھوں اور پڑمردہ رنگت کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔

۔ اس کی سانسوں کی آوازیں کی خاموشی میں گونج رہی تھی۔ اس کی انگلیاں اس کے چھوٹے اور بے ترتیب بالوں میں کانپ رہی تھیں، جو اس کی بغاوت کی علامت تھے۔

اس کے آنسو خاموشی سے اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ اس کا عکس اس کے اندرونی عذاب کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس کے اپنے بال، جو بظاہر بے ضرر تھے، اس کے لیے سب سے زیادہ نفرت انگیز تھے۔.. اچانک ہی

ایمان کی سسکیاں تھم گئیں اور اس کی آنکھوں میں اچانک غصے کی چمک نمودار ہوئی۔ اس نے دانت پیسے جب ایک تصور اس کے ذہن کے دریچوں سے گزرا۔ وہ جو اپنے گھٹنوں کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی، اپنے بازوؤں کو ان کے گرد لپیٹے ہوئے، اس نے خود کو اور زیادہ مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت

اس کے بازوؤں کے پٹھوں پر سخت ہو گئی، جیسے وہ اپنے اندرونی طوفان کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

خیال

ایمان کے تھکے ہوئے قدموں کی آواز مدھم روشنی والے دالان میں گونجی جب وہ چھپے ہوئے سائے سے بھاگ رہی تھی جو اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

اس کا دل خوف کی شدت سے دھڑک رہا تھا، اور اس کے مایوس ہانپوں نے ہوا کو بھر دیا تھا۔

لیکن یہ قدموں کے قریب آنے کی آواز تھی، بھاری اور جان بوجھ کر، جس نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں لرزش پیدا کر دی۔

جیسے ہی اس نے ایک کونے کو مڑا، اس نے اپنے بالوں میں اچانک، دردناک کھینچاؤ محسوس کیا۔

جب وہ پیچھے کی طرف ٹھوکر کھاتی، اس کے ہونٹوں سے رنجور

کی ایک ہانپ نکلی، اس کا ہاتھ فطری طور پر اس کے عذاب کے منبع تک پہنچا۔

یہ آصف تھا، اس کی ظالم انگلیاں اس کے بالوں میں الجھی ہوئی تھیں، اس کی آنکھوں میں ایک بدنما چمک تھی۔

اس عذاب کی گرفت میں ایمان کی بینائی درد اور بے بسی کے آنسوؤں سے دھندلا گئی۔

اس کی چیخیں سنائی نہیں دے رہی تھیں جب آصف نے اس کے بالوں کو جھکا دیا، اسے اس کا سامنا کرنے پر مجبور کیا، اس کے ہونٹوں پر ایک خوفناک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اس دردناک لمحے میں، ایسا لگتا تھا کہ اس کے جوہر کو اس شخص نے اپنے جال میں لے لیا ہے جو اس پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا تھا، اور اس کے بال، جو کبھی اس کی شناخت کی علامت تھے، اس کی اپنی تباہی کا ہتھیار بن گئے تھے۔

...°°...

حال

اس کے بال اس کے لیے ایک مستقل اذیت کا باعث تھے۔ وہ اپنے بالوں سے شدید نفرت کرتی تھی کیوں کہ یہ اس کی زندگی میں مشکلات کا سبب بن چکے تھے۔ اس کی زندگی میں آصف کی آمد کا ذریعہ بھی یہ ہی بال تھے، جو اس کے تسلط کی علامت بن گئے تھے۔

ایمان کے آنسو اس کی اندرونی تکلیف اور خود غرضی کی عکاسی کرتے تھے، جو اس نے خود پر محسوس کی تھی۔

یہ ایک دل دہلا دینے والا منظر تھا، جہاں اس کے آنسو اس کی اندرونی اذیت کا اظہار کرتے تھے، اور اس کے بال ان زنجیروں کی علامت تھے جنہوں نے اسے ایک ایسی زندگی میں جکڑ رکھا تھا جس سے وہ فرار ہونا چاہتی تھی۔

کمرے کی تنگ دیواروں میں ایمان کی لرزتی انگلیاں خوف اور عزم کی ملی جلی کیفیت سے کانپ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں، جو آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں، عذاب اور ذلت کی ان گنت راتوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھیں۔

آنے والے خطرے کی توقع سے ہوا بھاری تھی۔ کانپتے قدموں کے ساتھ، وہ سوئچ بورڈ تک پہنچی، اس کا ہاتھ اندھیرے میں لرز رہا تھا جب تک کہ کمرہ ایک سرد، بے رحم روشنی میں نہا گیا۔

یہ روشنی اس کی روح پر پڑنے والے داغوں کو بے نقاب کر رہی تھی، اس حقیقت کو ظاہر کر رہی تھی جس سے وہ فرار ہونا چاہتی تھی۔

اس کی آنکھیں، تھکی ہوئی اور شکستہ، الماری پر مرکوز تھیں۔ وہاں، فراموش شدہ سامان کے درمیان، اس کی آزادی کا ذریعہ - ایک تراشنا - موجود تھا۔ اس نے عجلت کے ساتھ اسے اٹھایا، گویا ہر گزرتا لمحہ اسے آزادی کے قریب لے جا رہا تھا۔ آئینہ، جہاں کبھی وہ صبح کے وقت خود کو سنوارتی تھی، اب ایک ایسی لڑکی کی عکاسی کر رہا تھا جو ظلم و ستم سے ٹوٹ چکی تھی اور دوبارہ بننے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے اپنے ہاتھ میں ٹرمر پکڑا، اس کی تھر تھراہٹیں اس کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ تھیں۔

یہ اس کی نافرمانی کا لمحہ تھا، ایک ایسا عمل جو اس کے اذیت دینے والے سے آخری تعلق کو منقطع کر دے گا۔

جیسے ہی اس نے ٹرمر آن کیا، اس کا مینیکل گونج اس کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو گیا۔

اس نے اپنے چھوٹے سے بالوں جو چاول کی دانے کی مانند چھوٹے تھے ان بالوں میں بلیڈ دبایا، ٹھنڈی دھات اس کی کھوپڑی سے رابطہ کر رہی تھی۔

ٹرمر کا ہر پاس آزادی کا اعلان تھا، اپنی شناخت کو دوبارہ حاصل کرنے کی اس کی ہمت کی علامت تھا۔

اس کے آنسو آزادانہ طور پر بہہ رہے تھے،

اور اس کے بال، جو چاول کے دانوں کی مانند چھوٹے چھوٹے تھے، ہوا میں بکھرتے جا رہے تھے اور پھر آنسوؤں کے ساتھ زمین پر گر رہے تھے۔

یہ منظر اس کی اندرونی تکلیف اور غم کی عکاسی کرتا تھا، جہاں ہر بال کا گرنا اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپے درد کو ظاہر کرتا تھا۔ اس کے آنسو، جو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے، اس کی روح کی اذیت کا ثبوت تھے، اور بالوں کے یہ ٹکڑے اس کی زندگی کے بکھرے ہوئے خوابوں کی مانند تھے۔

اس کشیدہ اور غم سے بھرے منظر میں، ایمان کارونا اس درد کا ثبوت تھا جو اس نے برداشت کیا تھا، بلکہ اس کے اندر جلنے والی طاقت کا بھی۔

وہ اب بے بس شکار نہیں بلکہ ایک زندہ بچ جانے والی تھی، جو آزادی کے حصول میں اپنے پرانے نفس کی آخری باقیات کو بھی قربان کرنے کو تیار تھی۔

کمرے میں وقت دھندلا سا لگ رہا تھا جب ایمان نے خود کو آزاد کرنے کا اپنا مایوسانہ عمل جاری رکھا۔

اس کے ایک زمانے میں چھوٹے بال اب تقریباً ختم ہو چکے تھے۔

اس کا کانپتا ہاتھ، عجلت کے ساتھ استرا کو پکڑے، اس کی کھوپڑی کو پہلے ہی نم کر چکا تھا۔ ایک پر جوش عزم کے ساتھ، اس نے استرا اپنی کھوپڑی پر چلایا، ہر ایک ضرب ان زنجیروں کے خلاف انحراف کا ایک عمل تھا جس نے اسے بہت طویل عرصے سے جکڑ رکھا تھا۔

اس کی حرکتیں تیز اور بے لگام تھیں، گویا وہ ہر گزرنے کے ساتھ اپنے ماضی کے داغ کو کاٹ سکتی ہے۔

جیسے ہی بالوں کی آخری باقیات گریں، اس کی کھوپڑی کا انکشاف ہوا، اس کا پیلا رنگ اس کے اپنے خون کے گہرے سرخ رنگ کے ساتھ مل گیا۔

اس نے خود پر جو کٹوتیاں کیں وہ اس کی تکلیف دہ یاد دہانی تھی کہ اس کی جدوجہد نے کیا تھا۔

لیکن ایمان اپنی شناخت دوبارہ حاصل کرنے کے اس لمحے میں بھی معمول سے بہت دور تھی۔

اس کی زندگی اس کے والدین کے تلخ جھگڑوں کی غیر معمولی حالت سے نشان زد ہوئی تھی، ایک ایسا لامتناہی طوفان جس نے اسے ایک ایسی زندگی کی سزا دی تھی جو دوسروں نے قبول نہیں کی تھی۔

وہ ایک ایسے وجود کی مذمت کی گئی تھی جہاں اس کے والدین کے درمیان لڑائیوں نے اس کے وجود پر سایہ ڈال دیا تھا۔

یہ اذیت اور ہنگامہ کی عمر بھر کی سزا تھی، جہاں ان کے جھگڑوں کی بازگشت اس کی روح میں گونجتی تھی۔ اس اداس اور المناک منظر میں، ایمان کی گنجی کھوپڑی چمک رہی تھی، خون کے قطروں سے تر۔ بلیڈ کے تیز دھار زخم اس کی کھوپڑی پر جمے ہوئے تھے، اس کی جدوجہد اور عزم کی گواہی دے رہے تھے۔

...°°...

... ..

مدھم روشنی سے دمکتا ہوا کمرہ، جس میں ایمان اپنے بستر کے کنارے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھم چکے تھے، اور گالوں پر پھیلتا ہوا خشکی کا احساس دل کی گہرائیوں کا عکاس تھا۔

اس کے نازک ہاتھوں نے اس کے دل کو تھام رکھا تھا، اور اس کے پیر بستر کے کنارے سے جھول رہے تھے، خیالات میں گم سم۔ کمرے میں ایک گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی، ایسی خاموشی جو تنہائی کے بھاری بوجھ کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔

اُس کے دل سے ایک سسکی پھوٹی

”میرا کوئی نہیں ہے، سب نے مجھے چھوڑ دیا۔“

اچانک اُس کے دل کی گہرائیوں میں ایک الہی آواز نے ارتعاش پیدا کی

اور اے حبیب! جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو بیشک میں نزدیک ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرے تو انہیں چاہئے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں۔

(سورۃ البقرہ 186)۔

ایمان کے پیچھے ایک فرشتہ کھڑا تھا، جسے انسانی نگاہیں دیکھنے سے قاصر تھیں۔ اس کی موجودگی کمرے میں پھیل چکی تھی، اور اس کی آنکھیں آسمانی نور سے جگمگا رہی تھیں۔

ایک نرم و ملائم روشنی، جس نے ایمان کو اپنے حصار میں لے لیا تھا، کمرے کو مقدس سکون سے بھرنے لگی۔

ایمان کے دل سے بے اختیار تلاوت کی آواز ابھری اور سورۃ البقرہ کی مقدس آیات پورے ماحول کو نورانی بنا گئیں۔

الفاظ یوں بہنے لگے جیسے سکون کا ایک بے کنار دریا اُس کے اطراف پھیل رہا ہو۔

فرشتہ ایمان کے قریب جھکا، اس کی غیر مرئی موجودگی ایمان کے کانوں میں سرگوشی بن کر سرایت کر گئی۔

وہ اس آسمانی رہنمائی سے بے خبر، مگر اندرونی طور پر ایک غیر معمولی سکون محسوس کر رہی تھی۔

فرشتے کے نور نے کمرے کو منور کر دیا اور ایمان کو یہ احساس ہونے لگا کہ وہ کبھی تنہا نہیں تھی، حتیٰ کہ اپنی سب سے گہری تنہائی میں بھی۔

ایمان نے آسمان کی طرف دیکھا اور مدھم آواز میں کہا، ”اے اللہ! تو تو اس دور افتادہ گھر (خانہ کعبہ) میں بستا ہے، میں کیسے پہنچوں؟ میرا وجود ناپاک ہے، میں کیسے قریب آؤں؟ مجھے کچھ نہیں معلوم، سوائے اس کے کہ تیرے ایک بندے نے اس دین کو پھیلایا۔“

اس کی نظریں پوسٹر پر مرکوز تھیں، کعبہ کا پوسٹر جو اس کے کمرے کی دیوار پر لٹکا تھا، وہ مقام جہاں سے اس نے ہمیشہ اللہ کی حضوری کو محسوس کیا تھا۔ لیکن اس کے دل میں وسوسے تھے ”جنت تو مسلمانوں کی ہے، کیا میں نہیں جاسکوں گی؟ لوگوں کی نظر میں میں ناپاک ہوں، لیکن میں تجھ سے التجا کرتی ہوں، تجھ سے ہی بات کرتی ہوں۔“

ایمان، ایک اٹھارہ سالہ لڑکی، جس کی اسلامی تعلیمات ایک محدود ماحول کی پیداوار تھیں، اس کی سوتیلی ماں نے اسے ہمیشہ دین کے گہرے علم سے دور رکھا۔ ایمان کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ چکا تھا کہ ہر

مسلمان، چاہے جیسے بھی اعمال کرے، جنت کا حقدار ہے۔ لیکن اسے اس حقیقت کا علم نہیں تھا کہ اسلام اعمال و نیت کے کڑے امتحان کا دین ہے، اور جنت کا دروازہ محض ایک دعویٰ پر نہیں کھلتا۔

یہ ایمان کے سفر کا آغاز تھا، ایک سفر جس میں اسے اسلام کے حقیقی معنی، خود شناسی اور روحانیت کی گہرائیوں کو سمجھنا تھا۔

ایمان اپنے کمرے کی گہرائی میں گم تھی، جہاں سکون کا حصول اس کے بے چین دل کی سب سے بڑی آرزو بن چکی تھی۔

ہر سانس ایک دعا تھی، ہر دھڑکن میں الوہیت کی جستجو تھی، جیسے وہ کسی ایسی روشنی کی منتظر ہو جو اسے اندھیروں سے نکال دے۔

کمرے کی خاموشی میں ایک فرشتہ موجود تھا، اس کی روح کے قریب سرگوشی کرتا ہوا، اس کی دعاؤں کا جواب بن کر۔

ایمان نے دل میں ایک سوال دہرایا، ”میرے اس بے چین دل کو کیسے سکون نصیب ہو گا۔“

اس کے ایمان کا سفر، حقیقی برکت اور روحانی سکون کی تلاش میں تھا۔

اسے احساس نہ تھا کہ ایک مقدس ہستی، فرشتہ، اس کے قریب کھڑا تھا، اور آہستگی سے اس کے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا۔ ”جنت کی کنجی۔“

ان الفاظ کے ساتھ، کمرے میں ایک نورانی روشنی پھیلنے لگی، ہر چیز جیسے مقدس رات کے سکوت میں ڈوبی ہوئی ہو۔

ایمان نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک پرسکون موجودگی کا احساس کیا، جیسے وہ کسی الہی تحفظ کے زیر سایہ ہو۔

فرشتے کی حکمت سے اس کا دل مائل ہونے لگا، اور اس کی روح بلند ہونے کی طرف مائل تھی۔

کمرے میں امید کی روشنی چمکنے لگی، اور ایمان نے جیسے نئی توانائی کے ساتھ الماری کی طرف قدم بڑھایا۔

ہر قدم میں ایک مقصد تھا، ایک نیا انکشاف، جیسے کسی قدیم راز کی جستجو ہو جسے ابھی ظاہر ہونا تھا۔

فرشتے کے الفاظ اُس کے دل میں گونج رہے تھے، جیسے کسی مقدس روایت کا حصہ ہوں، اور ایمان نے درازوں کو ٹٹولا، جو ابھی تک اپنے راز چھپائے ہوئے تھے۔

ایمان نے اپنا بیگ نکالا، اور دل کی دھڑکنوں کے ساتھ، اس نے ایک سیاہ پتی نکالی، جس پر پیچیدہ رنگوں کے ساتھ راز لکھے ہوئے تھے۔

کانپتے ہاتھوں سے اس نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، جیسے یہ پتی کوئی گہری دانش کی علامت ہو، جسے سمجھنا آسان نہ ہو۔

اُس کا دل ایک انجانی سی اُمید سے بھرا ہوا تھا، جیسے یہ پتی اس کے ایمان کی گہرائیوں کو روشن کرنے والی ہو۔

ایمان نے دھیرے سے قدم آگے بڑھائے، اس کی سانسیں بھاری تھیں اور دل کی دھڑکن غیر معمولی تیزی سے چل رہی تھی۔ اس کا ہاتھ لرزتے ہوئے سوئچ کی طرف بڑھا، جیسے کسی نادیدہ بوجھ تلے دبا ہو۔ انگلیوں کی ہلکی جنبش کے ساتھ اس نے سوئچ کو نیچے کیا، اور کمرہ یکدم روشنی سے بھر گیا۔

روشنی کی کرنیں کمرے کے ہر گوشے میں پھیل گئیں، دیواروں پر پڑے سائے تیزی سے دم توڑ گئے۔ ایمان نے بے ساختہ نگاہیں جھکائیں اور اس پتی کو احتیاط سے اٹھایا، جسے وہ مدت سے تھامے ہوئے تھی۔ جیسے ہی اس نے اسے روشنی کے قریب کیا، پتی کے اندر چھپے ہوئے الفاظ آہستہ آہستہ نمایاں ہونے لگے۔

۔ ”جنت کی کنجی“ نے اس کے دل کو ایک عجیب سی حیرانی میں مبتلا کر دیا۔

وہ حیران و پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ یہ کیا اشارہ ہے، یہ کنجی کس راز کی علامت ہے۔

اس نے پتی کو پلٹ کر دیکھا، اور ایک نیا پیغام نمودار ہوا

۔ ”اللہ نے تمہیں نہیں چھوڑا، تم نے اللہ کو چھوڑ دیا ہے۔“

یہ الفاظ کسی نرم سرزنش کی طرح محسوس ہوئے، اور ایمان کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

اس نے خود سے سرگوشی کی، ”میں نے کیسے اللہ کو چھوڑ دیا؟ میں تو ہمیشہ اس کا ذکر کرتی ہوں!“

اس لمحے، اسلام کے بہت سے پہلو اس کے لیے انجانے تھے، جیسے ایک بھولا ہوا سبق ہو جو ابھی سیکھنا باقی ہو۔

مایوسی کے عالم میں اس نے اپنے موبائل کو اٹھایا، اور گوگل سپیکر کے قریب بولی، ”کنجی کا مطلب کیا ہے؟“ اسپیکر نے جواب دیا اور سکریں پر چابی کی تصویر نمودار ہو گئی۔

ایمان نے حیرت سے اس تصویر کو دیکھا، اور خود سے کہا،۔

۔ ”کیا انسان اس دنیا میں آکر جنت کی چابی تلاش کرتے ہیں؟ کیا جنہیں یہ چابی مل جاتی ہے، وہ جنت میں چلے جاتے ہیں؟“۔

اس کے دل میں خوف اور امید کی ایک کشمکش جاری تھی،

۔ ”اللہ! آصف کو اور میرے ماں باپ کو یہ چابی نہ ملے تو کیا ہوگا؟“۔

وہ بے یقینی میں خود سے سرگوشی کرتے ہوئے بولی، ”یہ چابی ہے کہاں؟ اور میں اسے کہاں سے ڈھونڈوں؟“۔

کمرے کی پر اسرار روشنی میں، ایمان کی تلاش اور سوالات کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ ایک روحانی امتحان، جس میں ہر قدم ایمان کے راز کو مزید کھولنے والا تھا۔۔

اب کی بار ایمان اپنے کمرے میں خاموشی سے بیڈ پر بیٹھے گویا دل کے کسی کونے میں چھپی ہوئی سچائی کو پانے کی تگ و دو کر رہی تھی۔

لیکن پھر، جیسے اس کے دل پر بوجھ آن پڑا، اس نے موبائل کو اٹھایا موبائل کو اپنے لبوں کے قریب کیا اور گوگل اسپیکر پر بولتے بولتے اس کے لبوں پر نقطہ سالگ گیا جیسے ایک لمحے میں ساری امید ریزہ ریزہ ہو گئی ہو۔

وہ تھک کر، گویا شکست کھا کر، بیڈ پر ڈھے گئی، ”اگر گوگل سے یہ سب کچھ مل سکتا، تو شاید ہر شخص کو جنت کی کنجی مل جاتی۔“

یہ کہہ کر وہ بیڈ پر ڈھے گئی۔ ایک گہری سانس لی، جیسے دل کے اندر چھپی ہوئی تشویش کو باہر نکال رہی ہو۔ وہ خود سے سرگوشی کرتے ہوئے بولی، ”مگر یہ کنجی کہاں ہے؟“

وہ مایوسی کی انتہا پر تھی، دل میں ان سوالوں کی تپش محسوس کر رہی تھی جن کا کوئی جواب نہ ملتا تھا۔

پھر جیسے کسی اندرونی تحریک سے وہ بیدار ہوئی، خود کو سیدھا کیا، اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد، جب وہ کمرے میں لوٹی تو تازہ دم ہو چکی تھی، اب اُس کا ارادہ کچھ دیر کے لیے ان فکری الجھنوں سے دور جانے کا تھا۔

تیار ہو کر، وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی، اپنی گنجی کھوپڑی پر وہ اب کی باروگ لگا رہی تھی، اور خود سے بولی، ”رات کو نیند مجھے کبھی نہیں آتی، روشنی بھی ہو تو جیسے ڈراؤ نے خیالات مجھ پر حملہ آور ہو جاتے ہیں، جیسے کوئی سایہ میرے قریب آتا ہے۔“

ایمان کا دل ان الجھنوں میں الجھا ہوا تھا جن کا اسے کبھی ادراک نہ ہوا تھا۔ اسے اسلامی عبادات کی پیچیدگیوں کا کوئی اندازہ نہیں تھا، وہ نماز کی اصل روح سے ناواقف تھی، اس گہرے روحانی ربط سے لاعلم تھی جو اس عبادت میں پنہاں ہوتا ہے۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ نماز میں کس قدر خلوص اور عاجزی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے ذہن میں یہ بات سادہ تھی کہ لوگ شاید صرف خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے نماز پڑھتے ہیں یا شیطان کو دور رکھنے کے لیے، جو انسانوں کا دشمن تھا۔ لیکن وہ اس دشمنی کی نوعیت کو کبھی سمجھ نہ پائی تھی۔ وہ اکثر ان خیالات پر غور کرتی، مگر جلد ہی کندھے اچکاتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچ جاتی کہ جنت تو اس کے لیے مقدر ہے، چاہے اس کے اعمال کچھ بھی ہوں۔ مردوں کو مسجد جاتے دیکھ کر اس نے یہ تصور کر لیا تھا کہ اگر دل چاہے تو عبادات میں شامل ہو جائیں، ورنہ ان سے پرہیز کریں۔

اسی طرح اس کا خیال تھا کہ عورتیں اس فرض سے مستثنیٰ ہیں، جیسے وہ عبادات سے آزاد ہوں۔

لیکن اس سادہ نظر آنے والے نقطہ نظر کے پیچھے، ایمان کے دل میں ایک پیچیدہ سوال پیدا ہو رہا تھا، ایک ایسی حقیقت جسے وہ خود بھی پوری طرح سمجھ نہ پائی تھی۔

مسجد، جو کبھی اس کے لیے ایک معمہ تھا، اب اسے اپنی جانب کھینچنے لگی تھی، جیسے اسے کسی گہری حکمت کے راز کو سمجھنا ہو، جیسے وہاں کچھ ایسا تھا جو اس کی زندگی میں اہم موڑ کا سبب بن سکتا تھا۔

ایمان کے ماضی کی بھول بھلیوں میں چھپی سچائیوں کو جاننے کے لیے، کسی کو اس کے اندرونی سفر کا سامنا کرنا تھا۔

وہ وقت جب اس کی معصومیت جہالت کے سائے میں دب چکی تھی، جب نائٹ کلب کی رنگین دنیا اسے اپنی طرف بلارہی تھی۔

جوانی کے جوش میں وہ راتوں کی روشنیوں، دھڑکتی ہوئی موسیقی، اور آزادی کے جھوٹے احساس کی طرف مائل ہوئی۔

رات کی زندگی کے طلسماتی سحر نے اسے جکڑ لیا تھا، اور وہ کیڑے کی طرح شعلے کی طرف کھینچتی چلی گئی۔ انہی لمحوں میں، ایمان نے پہلی بار نائٹ کلب کی دنیا میں قدم رکھا۔ موسیقی کی دھمک اس کی رگوں میں گونجنے لگی، اس کے اندر ایک عجیب سا سنسنی خیز احساس پیدا ہوا، ایک بغاوت کی چنگاری جاگ اٹھی۔

ان اداروں کے تاریک کونوں میں وہ خوشیوں کی عارضی پناہ تلاش کرتی، جہاں وہ اپنے روزمرہ کے دباؤ اور دنیاوی بندشوں سے فرار پاتی۔

۔ ایمان کا سفر اب شروع ہو چکا تھا، ایک ایسا سفر جو اسے جنت کی کنجی تک لے جائے گا، یا شاید اسے اپنے وجود کی ایک نئی روشنی عطا کرے گا۔

گزشتہ منظر کی بازگشت:-

ایمان چودہ سال کی نازک عمر میں، سخت اور سرد فرش پر لیٹی ہوئی تھی، اور اس کی راتیں خوف اور دہشت میں ڈوبی رہتی تھیں۔

اس کی نیند ہمیشہ بے چین، اضطراب میں مبتلا رہتی، گویا وہ ایک ایسے عذاب سے فرار حاصل کر رہی ہو جو اس کے خوابوں میں جنم لیتا تھا۔

اندھیرے کھنڈرے کمرے کی ویرانی میں، اُس کا لا شعور اسے ماضی کی دردناک یادوں کی طرف کھینچتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آصف کا بدروح جیسا چہرہ، اس کا سوتیلا باپ، ایک بھیانک حقیقت بن کر نمودار ہوتا۔

آصف کی بدنیتی سے بھری مسکراہٹ، جس میں مکروہ ارادے جھلکتے تھے، ایمان کے جسم میں سرد لہر دوڑانے کا سبب بنتے۔

یہ خواب اس کی زندگی کی سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت اذیتوں کی عکاسی کرتے تھے، وہ ظالم اور بے رحم لمحات جو اس نے آصف کے ہاتھوں جھیلے تھے۔

آصف کی طنز یہ ہنسی خواب میں مسلسل گونجتی رہتی، ایک ایسا عذاب جس کی یاد دل میں جاگزین تھی۔

ہر لمحہ جیسے کسی تیز چاقو کی طرح اس کے احساسات کو کاٹتا تھا، اسے وہ گندی باتیں اور ظالمانہ رویہ یاد آتے تھے جو آصف نے اسے دکھایا تھا۔

یہ اذیت ایمان کے اندر ہمیشہ سرایت کیے رہتی تھی، اور خواب میں بھی وہ اس ظلم و ستم سے آزاد نہیں ہو پاتی تھی۔

اچانک، وہ خواب سے جاگ گئی، اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ آنکھیں سو جی ہوئی تھیں، گال آنسوؤں سے تر، اور سانسیں بے ربط اور تیز تھیں۔

وہ فوراً اٹھی، جیسے اس پر چھائے ہوئے عذاب سے فرار چاہتی ہو۔ مدھم روشنی والے راہداری سے تیز قدموں کے ساتھ گزرتی، وہ اپنے پاؤں کی دھمک کو محسوس کر رہی تھی۔

بغیر کسی سمت یا ہچکچاہٹ کے، وہ بائیں طرف مڑ گئی، سیڑھیوں کو تیزی سے پار کرتی ہوئی نیچے کے تاریک ہال کی طرف دوڑنے لگی۔

اس کے قدموں کی رفتار میں خوف اور بے چینی کی جھلک تھی، ہر قدم جیسے اسے ماضی کی وحشتوں سے اور دور لے جا رہا تھا۔

مگر اسی عجلت میں، اس کا پاؤں ایک میز سے جا ٹکرایا، اور گلدستہ، جو اس پر سجا تھا، نیچے گر کر چکنا چور ہو گیا۔

ٹوٹنے کی آواز ہال کی گہری خاموشی میں گونج اٹھی، جیسے کسی بھاری راز کا پردہ فاش ہو گیا ہو۔

ایمان ایک لمحے کے لیے رک گئی، اس کے دل کی دھڑکن رکی ہوئی تھی۔

اس کے چہرے پر معصومیت کا سایہ اور اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی، جیسے وہ اپنے خوابوں کی قید سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہو، مگر حقیقت نے اسے جکڑ لیا ہو۔

ابھی وہ ان خیالات میں گم تھی کہ راہداری میں خالدہ کے قدموں کی آواز گونجنے لگی۔

ہر قدم ایک گہرا غصہ لیے ہوئے تھا، جیسے خالدہ کے دل میں کوئی سلگتا ہوا لاوا ابل رہا ہو۔

اس کا چہرہ غصے سے بگڑ چکا تھا، اور اس کے جڑے ہوئے ہونٹوں نے یہ عیاں کر دیا تھا کہ اس کا ارادہ خطرناک تھا۔

ایمان، جو اپنے دل میں خوف کی لہر محسوس کر رہی تھی، دیوار کے ساتھ لگ کر پیچھے ہٹنے لگی۔

اس کی آنکھیں خالدہ کی آتی ہوئی شخصیت پر جمی ہوئی تھیں، اور وہ لرزتے ہوئے قدم پیچھے کی طرف بڑھا رہی تھی۔

کمرہ جیسے تنگ ہوتا جا رہا تھا، ہوا میں ایک عجیب کشیدگی تھی، اور خالدہ کا غصہ اس کے چہرے سے واضح نظر آ رہا تھا۔

ایمان خوف سے لرز رہی تھی، اس کی آنکھوں میں بے بسی اور مایوسی کی جھلک تھی۔ ہر قدم جو خالدہ نے قریب آنے کے لیے اٹھایا، ایمان کے دل کی دھڑکنیں اور بے ترتیب ہو گئیں۔

خالدہ کے قریب پہنچنے تک خاموشی گہری ہو چکی تھی، اور صرف ان کی بے ہنگم سانسوں کی آواز فضا میں تیر رہی تھی۔

ایمان کے دل نے ایک دھڑکن کو چھوڑ دیا، اور وہ خود کو تیار کرنے لگی کہ اب اس کا سامنا ایک اور عذاب سے ہونے والا ہے۔

خالدہ کی آنکھیں صدمے سے پھیل گئیں جب اس کی نظر فرش پر بکھرے گلدان پر پڑیں۔

اس کی آواز لرز گئی، گویا بے یقینی اور غم اس کے الفاظ میں سرایت کر چکے ہوں۔ ”یہ میرے ابو کا دیا ہوا جہیز کا تحفہ تھا،“۔

وہ جیسے خود سے بولی، آواز میں دبے دبے دکھ اور غصے کی آمیزش تھی۔ گلدان کی ٹوٹ پھوٹ ایک جذباتی سانحہ تھی، ایک یادگار جو خاندان کی جڑوں سے جڑی ہوئی تھی، اور اب اس کی تباہی خالدہ کے لیے ایک ناقابلِ برداشت صدمہ تھا۔

اس کے چہرے پر سایہ فگن افسوس جلد ہی غیظ و غضب کی شکل اختیار کر گیا جب اس نے ایمان کو دیکھا، جو فرش کے قریب مجرموں کی طرح کھڑی تھی، خوف اور جرم سے اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ خالدہ کے دل میں غصے کا طوفان اُٹ آیا اور اس کی زبان سے زہر جیسے الفاظ پھوٹ پڑے۔

۔ ”یہ تو نے کیا کیا کمینی؟“ اس کے لہجے میں نفرت تھی، جیسے وہ اس جرم کے ہر لمحے کا حساب ایمان سے لینا چاہتی ہو۔

خالدہ کا غصہ بپھر کر اس کے عمل میں بدل گیا، اور اگلے ہی لمحے میں، بغیر کسی سوچ کے، اس کا ہاتھ اُٹھا اور ایمان کے گال پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔

ایمان کا چہرہ جھٹکے سے ایک طرف کو پلٹا، اور اس کے ہونٹوں پر سسکیاں ریگنے لگیں۔۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، جیسے وہ دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ چکی ہو۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا، سوائے ایمان کی ہلکی ہلکی رونے کی آوازوں کے جو خاموشی کو چیر رہی تھیں۔

خالدہ کا غصہ اس کے وجود پر حاوی تھا، اور اب وہ اس غصے کو قابو میں نہیں رکھ سکتی تھی۔

اس نے ایمان کے بالوں کو بے دردی سے پکڑا اور زور سے جھٹکا دیا۔

۔ ”منحوس کمینی! میرے باپ کا تحفہ توڑ دیا تو نے کتیا ماں کی کتیا بیٹی ” وہ اپنے جبروں کو سختی سے بھینچتے ہوئے چیخی۔

ایمان کی چیخیں کمرے میں گونج اٹھیں، اور اس کی آنکھوں سے مزید آنسو بہنے لگے۔ درد کی ہر لہر ایمان کے اندر تک اتر رہی تھی، اور اس کی ہر چیخ اس اذیت کا اظہار تھی جو وہ سہہ رہی تھی۔

خالدہ نے جنون میں ایمان کے بالوں کو اور بھی زور سے کھینچا، جیسے اس کے غصے کی کوئی حد نہ ہو۔

۔ ”آج میں تیرا خاتمہ کر دوں گی!“ وہ کر خنگی سے چلاتے ہوئے بولی۔

ہر جھٹکا ایمان کے دل میں ایک اور زخم لگا رہا تھا، جیسے یہ اذیت صرف جسمانی نہیں، بلکہ ایک نفسیاتی جنگ بھی ہو۔

ایمان کی آنکھوں میں درد اور بے بسی تھی، اس کی روح پر چھائی ہوئی گھٹن کی لکیریں واضح ہو رہی تھیں۔

لیکن خالدہ کے غصے کی آگ کم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ اس نے بالوں سے پکڑ کر ایمان کو جھٹکا دیا، اور پھر اپنی انگلیاں اس کے نازک گلے کے گرد بند کر لیں۔

ایمان نے ایک دم خوف سے ہانپ لیا، اس کی آنکھیں خوف اور بے یقینی سے پھیل گئیں۔

اس کے ہاتھ بے بس ہو کر خالدہ کی انگلیوں کو ہٹانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے، لیکن خالدہ کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

ایمان کا چہرہ سرخ ہو گیا، سانس لینا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔

وہ پھر پھڑپھڑاتے ہوئے اپنی آخری کوشش کر رہی تھی، لیکن خالدہ کی انگلیاں جیسے اس کی زندگی کا راستہ روک رہی تھیں۔۔

ہال اب ایمان کے لیے جیسے ایک قید خانہ بن چکا تھا، جہاں جذبات کی جنگ جاری تھی۔ ہر سانس ایک جنگ بن چکی تھی، اور ایمان کے اندر کی لڑائی نے اس کی روح کو تھکا دیا تھا۔

اچانک، خالدہ کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے ہچکچاہٹ نمودار ہوئی۔ شاید اس نے اس خطرناک حد کا ادراک کیا جس پر وہ پہنچ چکی تھی۔

اس کی گرفت قدرے ڈھیلی ہوئی، اور ایمان نے تیز سانس لی، جیسے زندگی کا پہلا جھونکا دوبارہ مل گیا ہو۔ وہ کھانسنے لگی، اس کی آنکھوں میں خوف اور صدمے کے آنسو تھے۔

خالدہ نے ایک جھٹکے سے اپنی گرفت چھوڑ دی، اور ایمان پیچھے ہٹتے ہوئے ایک کرسی سے جا ٹکرائی۔ وہ زمین پر گر گئی، ہانپتی ہوئی، گلے پر ہاتھ رکھ کر سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی، جو صرف ایمان کی محنتی سانسوں سے ٹوٹی تھی۔

یہ لمحہ ان دونوں کے تعلقات کی تاریک ترین حقیقت کو عیاں کر رہا تھا۔ خالدہ کا ہاتھ اب بھی غصے سے کانپ رہا تھا، اور ایمان کی آنکھوں میں درد کی گہرائیاں سمندر کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ اس ملاقات نے ان کے درمیان موجود ہر تلخ حقیقت کو کھول کر رکھ دیا تھا، ایک ایسی یاد بن کر جو کبھی مٹ نہ سکے گی۔

--

ایمان نے اب کی بار آزاد نہ سانس اندر کھینچا اور اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی

وہ جو گہری سانس لے رہی تھی

یہ ایک اس کی نگاہیں خالدہ پر پڑیں جو غیظ و غضب سے لرز رہی تھی۔ پھر خالدہ کی نظریں اس سے ملیں۔

شاید یہ دنیا کی پہلی نظریں تھیں جو یوں ملیں کہ زمین لرز اٹھی۔ خالدہ کا غصہ دوبارہ بھڑک اٹھا۔

اب کی بار

خالدہ کی آنکھوں میں دگنا و حشیانہ غصہ ابھرا۔ وہ دانت کچکچاتے اس کی جانب بڑھی وہ ایمان کے بالوں کو مضبوطی سے پکڑے اسے فرش سے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہی تھی۔

ایمان، جو پہلے ہی درد سے نڈھال تھی، خالدہ کے ہر جھٹکے پر کراہ رہی تھی۔ اندھیرے ہال میں اس کی آواز مدھم گونج بن کر رہ گئی تھی، جیسے اس کے وجود کا دکھ بھی کسی کو سنائی نہ دے رہا ہو۔

خالدہ نے ایمان کو زبردستی کھینچتے ہوئے، اس کے لمبے اور گھنے بالوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایمان کی جسمانی حالت اور اضطراب کے باوجود، خالدہ نے اسے زمین سے کھینچتے ہوئے اوپر کھڑا کر دیا۔

ہر جھٹکے کے ساتھ، ایمان کی کراہیں اور سسکیاں کمرے کی خاموشی کو توڑ رہی تھیں۔

خالدہ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ ایمان کا سر جھک گیا، اور درد کی شدت نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا۔ ہر جھٹکے کی وجہ سے، ایمان کے جسم پر جگہ جگہ سرخ نشان پڑ رہے تھے، اور وہ بے بسی کے عالم میں خود کو خالدہ کے جبر کے سامنے بے بس محسوس کر رہی تھی۔

خالدہ کی جانب سے دی گئی ہر لعنت، ہر گالی، اور ہر سختی نے ایمان کی معصومیت کو کچل دیا۔ اس کی چھوٹی عمر اور ناتجربہ کاری کے باوجود، ایمان کو اس سب کی تکلیف اور اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

وہ نہ صرف جسمانی بلکہ نفسیاتی طور پر بھی اس درد کا سامنا کر رہی تھی، جو اس کے دل و دماغ کو چیرتے جا رہا تھا۔

۔ ”چل، آگے!“ خالدہ غرائی، اس کے لمبے میں کرختگی اور بے رحمی کا رنگ تھا۔ ایمان، جو خود کو گھسیٹے جانے سے بچانے کے لیے بمشکل قدم اٹھا پا رہی تھی، لرزتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی، آنکھوں میں خوف کے سائے تھے۔

- ”امی، مجھے باہر نہیں جانا، پلیز!“۔

ایمان نے روتے ہوئے التجا کی، لیکن خالدہ کے چہرے پر کوئی نرمی نہ آئی۔

اس نے ایمان کو جھٹکے سے اپنے سامنے کیا اور اس کی تھوڑی کو سختی سے پکڑ کر آنکھوں میں وحشت بھری نظروں سے دیکھا۔۔

- ”میں تیری ماں نہیں ہوں، سمجھی؟“ خالدہ کے الفاظ ایمان کے دل پر تیر کی طرح لگے۔

خالدہ نے اسے دوبارہ بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا، اور اب وہ اسے لکڑی کے دروازے کی طرف لے جا رہی تھی۔

ایمان کی آنکھوں سے بہتے آنسو اس کے رخساروں کو بھگور رہے تھے، لیکن خالدہ کی بے رحمی جیسے بڑھتی جا رہی تھی۔

- ”امی، باہر اندھیرا ہے، مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ خدا کے واسطے چھوڑ دیں!“۔

ایمان کی روتی ہوئی آواز سنسان رات میں گم ہو رہی تھی۔ اس کی معصومیت، اس کے آنسو، اور اس کی خوف بھری التجائیں فطرت کے لیے بھی ناقابلِ برداشت تھیں۔ جگنو، جو پہلے روشنی کی مانند چمک رہے تھے، اب مدھم پڑنے لگے، جیسے وہ بھی ایمان کے درد کا بوجھ اٹھا رہے ہوں۔

خالدہ نے گیٹ تک پہنچ کر اسے زور سے دھکیل دیا، اور دروازہ کھولنے لگی۔ ایمان کی حالت جیسے خوف کی آخری حد کو چھو رہی تھی۔

اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی، اور جب خالدہ اس کی طرف مڑی تو ایمان کے آنسو رک گئے، اس کی آنکھوں میں خوف اور دہشت کی گہری لہر دوڑ گئی۔

خالدہ نے ایمان کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھی، سختی سے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ “آواز نہ نکال، چپ کر!”۔

خالدہ کی آنکھوں میں وحشت اور ظالمانہ روشنی تھی۔ ایمان نے ڈرتے ڈرتے سر ہلایا، اس کے ہونٹ خشک اور بے جان ہو گئے۔

۔ “باہر نکل!”۔

خالدہ نے انگلی کے اشارے سے حکم دیا، جیسے وہ ایمان کو بے دردی سے اندھیرے کی طرف دھکیلنے پر تلی ہوئی ہو۔

ایمان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، وہ خوف سے لرزتے ہوئے بولی، ”امی، باہر کوئی نہیں ہے، مجھے ڈر لگتا ہے۔“

خالدہ کا چہرہ سخت ہو گیا، اس نے ایمان کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔ ”ماں مت بول مجھے بی بی بول، مالکن بول!“ ایمان کا دل کانپ گیا، آنسو بہنے کے قریب تھے، لیکن وہ خود کو قابو میں رکھتی رہی۔ ”مالکن بی بی جی...“ وہ بمشکل بولی، اس کے الفاظ ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے نکلے۔

خالدہ کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ ”ہاں، یہ ہی ٹھیک ہے سن۔ باہر کوئی نہیں کھائے گا تجھے۔ آج کی رات باہر گزار، اور یاد رکھ، اگر اندر آئی تو تیرا خاتمہ کر دوں گی!“

خالدہ کا جبرہ بھینچا ہوا تھا، اور اس کی آواز میں ایسی درندگی تھی کہ ایمان کا دل خوف سے لرزا اٹھا۔

اندھیرے نے جیسے ایمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اور اس کی معصومیت اس بھیانک رات کی خاموشی میں کھو گئی تھی

۔ ہر لمحہ، ہر قدم جیسے اس کے اندر کی دنیا کو اور زیادہ تاریک کر رہا تھا، اور اس کی معصوم روح جیسے اس وحشیانہ ظلم کے سامنے دم توڑ رہی تھی۔

ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر خالدہ کی آنکھوں میں غضب کی چمک عود آئی، جیسے وہ آتش فشاں کی بھڑکتی ہوئی چنگاری ہو۔

اس نے بے دردی سے ایمان کے بالوں کو اپنی مٹھی میں دبوچا اور جھٹکے سے اسے گیٹ کے اس پار دھکیل دیا۔

گیٹ کی دھمک ایمان کی کراہتی روح میں مزید خوف کا بیج بو گئی۔ خالدہ نے اپنی جابرانہ مسکراہٹ کے ساتھ گیٹ کو بند کیا، گویا یہ اس کے ظلم کی ایک آخری مہر ہو۔

ایمان توازن کھو کر سڑک کے سخت اور سنگ دل فرش پر گر گئی۔ زمین نے اپنی بے رحم آغوش میں اسے اس طرح دبوچا کہ اس کی کہنی کھرچ گئی، اور اس خراش سے لال مائع آہستہ آہستہ بہنے لگا، جیسے اس کی معصومیت کا خون ہو۔

درد کی لہر نے اسے لرزہ دیا، لیکن ایمان نے اپنی آہ کو دانتوں تلے دبایا۔

وہ کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی، جیسے اس کا درد بھی خالدہ کے ظلم کی چکی میں مزید پسے سے انکار کر رہا ہو۔

پچھلی سمت ایک سوکھا درخت، خاموشی سے اپنی بے ہنگم شاخوں کو رات کی ٹھنڈی ہوا میں ہلاتا ہوا، گویا ایمان کی بے بسی کا گواہ بن چکا تھا۔

مدھم روشنی میں فٹ پاتھ ایک لامتناہی، تاریک سفر کا راستہ تھا جو اسے انجان اندھیروں کی طرف لے جا رہا تھا۔

ہر قدم ایک نئی آزمائش کی پیش گوئی کرتا تھا، جیسے سایہ دار گھروں کی قطاریں، جو اس تماشے کو خاموشی سے دیکھ رہی تھیں، اس کی مایوسی کا مذاق اڑا رہی ہوں۔

ایمان کی آنکھوں میں آنسو آگئے، جنہیں اس نے پلکوں کی جھپک سے روکنے کی کوشش کی، لیکن اس کی معصوم روح اس درد کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

اندھیروں کا سایہ اس کے دل کی گھٹن کو اور بڑھا رہا تھا، لیکن ایمان کو معلوم تھا کہ اسے اس جابرانہ رات سے نکلنے کے لیے اپنی ساری بچی کھچی طاقت مجتمع کرنی ہوگی۔

بہر کیف، ایمان نے سسکی بھری اور گہرا سانس لیتے ہوئے، زمین پر دونوں ہتھیلیاں جما کر، ان کے سہارے لڑکھڑاتے ہوئے کھڑی ہوئی۔ سامنے موجود درخت کے سائے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سناٹا تھا۔

- ایمان، اس، تنہا درخت کے نیچے فٹ پاتھ کے کنارے پر بیٹھی اس کے پیر زمین پر ٹکے تھے وہ زنانوں کے گرد بازو لپیٹے ان پر اپنا سر رکھے تھی، اس کے آنسو بے آواز زمین پر گرتے جا رہے تھے، جیسے زمین بھی اس کے دکھ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی۔

اچانک، سناٹے کو چیرتی ہوئی کتوں کی دردناک چیخیں سنائی دیں، جنہوں نے رات کی خاموشی کو خوف کی دھند میں لپیٹ دیا۔

ایمان کا دل ایک لمحے کے لیے جیسے رک گیا۔ وہ ساکت ہو گئی، خوف اس کی رگوں میں خون کی مانند دوڑنے لگا۔

اس نے سر اٹھایا، اس کے سامنے سایوں میں لرزتے ہوئے خوفناک جانور نظر آئے۔

ان کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں، جیسے کوئی غیر انسانی قوت ان میں سماجی ہو۔

وہ دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھ رہے تھے، ان کے منہ سے نکلتی بھوک اور نفرت کی جھلکیاں، اور ان کے نوکیلے دانت جو چاندنی میں تلوار کی مانند چمک رہے تھے۔

ایمان خوف سے کانپتی ہوئی بمشکل کھڑی ہوئی۔ اس کے قدم پیچھے کی طرف پھسل رہے تھے، ہر قدم ایک نیا خوف اور ایک نیاز خم تھا۔

کتوں کی بھونکیں، ان کی چیخیں، رات کے اندھیرے میں وحشت کا طوفان بپا کر رہی تھیں۔

ایمان کا دل خوف سے سسکیاں بھر رہا تھا، لیکن اس کے ہونٹ کسی چیخ کو آزاد کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ رات، یہ لمحہ، اس کی بقا کی آخری جنگ ہے۔

ایمان نے خوف کی زنجیروں کو توڑا اور یکدم بھاگ نکلی۔ زمین اس کے قدموں کے نیچے کانپ رہی تھی، جیسے ہر پتھر، ہر ٹھوکرا سے پیچھے کی طرف کھینچ رہی ہو۔

کتوں نے اس کی رفتار کا تعاقب کیا، ان کی بھوک کی نظریں اس کے ہر قدم پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ کسی پل اس پر جھپٹ پڑیں گے۔

ان کی سانسیں اس کے عقب میں محسوس ہو رہی تھیں، اور وہ جانتی تھی کہ وہ ایک لمحے کی غلطی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

اچانک، ایک کتا اس کے قریب آیا اور اس کے لباس کو دانتوں سے دبوج لیا۔ ایمان نے درد کی ایک تیز لہر کو محسوس کیا، لیکن اس نے چیخ کو گلے میں ہی دبا لیا۔

ایمان نے تیز قدموں سے جست لگائی، وہ کتا جس نے ایمان کی قمیض کو جکڑ رکھا رکھا تھا یکدم ایمان کی تیز رفتار کی وجہ سے پھسل کر پیچھے جاگرا اور دوسرے کتے سے ٹکرایا، یوں دونوں ایک دوسرے پر گرتے ہوئے نیچے لڑھک گئے۔

وہ کتوں کی شدت سے لڑتی ہوئی بھاگتی جا رہی تھی۔ اس کے قدم تیز تر ہو رہے تھے، اس کی سانسیں بھاری اور بے ترتیب ہو چکی تھیں۔

جب ایمان اس کتے کے تسلط میں تھی اس کو تو معلوم ایسا ہو رہا تھا۔

جیسے رات کی ہوائیں بھی جیسے اس کا راستہ روکنے پر تلی ہوئی تھیں مگر اب

ایمان کی دوڑ اس تاریک رات میں مسلسل جاری تھی، اس کے قدم پتھروں پر ٹھوکریں کھاتے، مگر وہ پھر بھی نہیں رکی۔

ہر لمحہ ایک نئی آزمائش تھا، اور کتوں کی بھوک اور غیض و غضب نے اسے ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں دھکیل دیا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اگر ایک لمحے کے لیے بھی رکی، تو موت کی آغوش اسے اپنی گرفت میں لے لے گی۔

آخر کار، کتے پیچھے رہ گئے، ان کی بھونکیں رات کے سناٹے میں مدھم ہوتی گئیں، لیکن ایمان ابھی تک بھاگتی جا رہی تھی۔

اس کا دل اس کے سینے میں دھڑک رہا تھا، اور ہر دھڑکن اس کے بچ جانے کی ایک نئی امید تھی۔

...°...

ایمان کی سانسیں بے ترتیب ہو چکی تھیں، اس کا سینہ تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے دل اس کے جسم کے پنجرے سے باہر نکلنے کو ہو۔

اس کے قدم فٹ پاتھ پر بو جھل اور لڑکھڑاتے جا رہے تھے، لیکن اس کی آنکھیں سامنے نظر آنے والی مدھم روشنیوں پر جمی ہوئی تھیں۔

سڑک کے اس پار، ایک نائٹ کلب اپنی رنگین روشنیوں اور شور مچاتی موسیقی کے ساتھ کسی محفوظ پناہ کی مانند دکھائی دے رہا تھا، جیسے اندھیروں میں بھٹکتے کسی غریب مسافر کے لیے روشنی کی کرن ہو۔

کتوں کی بھونکنے کی آوازاں ابھی اس کے عقب میں گونج رہی تھیں، جیسے وہ موت کے کارندے اس کے قریب پہنچ رہے ہوں۔

وہ ایک لمحے کے لیے رکی، اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے، پھر اپنی تھر تھراتی ٹانگوں کو دوبارہ حرکت میں لائی۔

اس کے پاؤں بار بار فٹ پاتھ پر ٹھوکر کھا رہے تھے، لیکن اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک ضد، ایک امید زندہ تھی۔

ہر قدم، ہر سانس اسے کلب کے قریب لے جا رہی تھی، جہاں روشنیوں کا ہجوم اور موسیقی کی دھڑکنیں اسے زندگی کی دھڑکنوں کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔

کلب کے قریب پہنچتے ہی اس کے جسم پر پسینہ ٹپکنے لگا، اس کا دل کسی پرانی گھڑی کی طرح تیز ہو چکا تھا۔
اس کے سامنے گیٹ پر دو محافظ اپنے فولادی جسموں اور سیاہ وردیوں میں کھڑے تھے، جیسے وقت کے بے حس محافظ ہوں۔

ان کے چہروں پر بے تاثر تاثرات اور تیز نگاہیں تھیں، اور ان کی موجودگی ایمان کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ لمحے بھر کے لیے ٹھکی، اپنے کپکپاتے ہاتھوں کو مٹھیوں میں بند کر کے اپنی ہمت کو مجتمع کیا۔
ایمان نے سر جھکایا، اس کی پلکوں کے نیچے آنسوؤں کی نمی چمک رہی تھی، لیکن اس نے خود کو مضبوط کیا اور چند قدم آگے بڑھائے۔

کتوں کی بھونک ابھی بھی دور سے گونج رہی تھی، اور سامنے وہ محافظ جیسے وہ اس کے آخری بچاؤ کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہوں۔

وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس وقت بہت کم تھا، یا تو وہ اس دروازے کے اندر پناہ لے سکتی تھی یا پھر پیچھے مڑ کر کتوں کے نوکیلے دانتوں کا سامنا۔

روشنی کی مدھم کرنوں کے درمیان، کلب کا داخلی دروازہ اسے اپنے اندر بلاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

درخت، جو ہمیشہ ایک خاموش گواہ کی طرح وہاں کھڑا تھا، اس لمحے کی سنگینی کو اور بھی واضح کر رہا تھا۔ اس کے اندر کی ہر ہڈی چیخ رہی تھی کہ وہ آگے بڑھے، لیکن اس کے دل کی دھڑکن اور ان محافظوں کی بے رحم نظریں اسے ہر لمحے پیچھے دھکیل رہی تھیں۔

کتوں کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ ایمان کی نظریں روشنیوں اور محافظوں کے بیچ الجھی ہوئی تھیں۔

اس نے آخری ہمت جمع کی، قدم تیز کیے، اور دل میں ایک خاموش دعا کرتے ہوئے کلب کے دروازے کی طرف دوڑنے لگی۔

--

ایمان کا دل ایک بے قابو دھڑکن کے ساتھ زور زور سے دھڑک رہا تھا، جب اس نے سڑک کے پار قدم بڑھایا۔

ہر قدم ایک کشمکش تھی، جیسے زمین اس کے قدموں تلے کانپ رہی ہو، اور اس کے وجود پر خوف کی سرد لہر دوڑ رہی تھی۔

اب کی بار وہ محافظوں کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی تو اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں، جیسے کسی بڑے طوفان کے سامنے ایک نحیف پودا کھڑا ہو۔

اس کی سانسیں بے ترتیب اور آنکھیں تھکی تھکی تھیں، جبکہ چہرے پر آنسوؤں کے نمکین قطروں کے نشان ابھی باقی تھے۔

ڈرتے ڈرتے اس کے لرزتے ہونٹوں نے محافظوں سے التجا کی،۔۔

”م۔۔۔ مجھے اندر جانا ہے۔“

یہ الفاظ جیسے اس کے گلے سے بمشکل نکلے، اس کا گلا خشک تھا اور آواز میں بے بسی جھلک رہی تھی۔ اس کے دل میں نائٹ کلب کی چمکتی روشنیوں میں پناہ لینے کی امید جاگ رہی تھی، مگر محافظوں کے بے حس اور پتھر یلے چہروں نے اس امید پر پانی پھیر دیا۔ ایک محافظ نے دوسرے کی طرف دیکھا، اور دونوں کے چہروں پر بے حسی کے سائے چھائے ہوئے تھے۔

۔۔ ”تمہاری عمر اتنی نہیں ہے کہ یہاں آسکو،“

ایک محافظ نے سرد اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس کی نظریں ایمان کی پھٹی پھٹی حالت پر تھیں، مگر ان میں ہمدردی کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔ ایمان کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا ہو۔ اس کی پلکیں بھاری ہو گئیں اور آنکھوں میں دوبارہ آنسو بھر آئے۔۔۔ ”میں۔۔۔ میں تمہیں پیسے دے دوں گی۔“ اس کی آواز کانپتی ہوئی نکل رہی تھی، جیسے یہ آخری امید ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے اپنے ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈالا، مگر محافظوں کی نظروں میں بے رخی تھی۔ ایک محافظ کے چہرے پر مسکراہٹ کے بجائے ایک

سخت نظر ابھری، جس نے اس کی بے وقعتی کو مزید بڑھا دیا۔ ”یہاں سے چلی جاؤ،“ اس نے سرد مہری سے کہا۔

ایمان کی دنیا میں مایوسی کی ایک گہری لہر دوڑ گئی۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور اس کے گلے میں گھٹن سی محسوس ہوئی۔ ”خدا کے لیے، رحم کرو۔۔۔ مجھے اندر جانے دو،“ وہ سسکتی ہوئی بولی، اس کی نظریں التجا کر رہی تھیں۔

ایک لمحے کے لیے، محافظ نے غور سے اسے دیکھا۔ شاید اس کی اندرونی کیفیت نے کچھ لمحاتی رحم پیدا کیا۔ ”ٹھیک ہے، چلی جاؤ، لیکن ایک جگہ جا کر بیٹھ جانا۔“ اس کا لہجہ اب بھی سخت تھا، مگر اجازت ملنے پر ایمان کی سانس میں کچھ سکون آیا۔

ایمان نے جلدی سے سر ہلایا، اور وہ بے یقینی قدموں کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھلتے ہی اندر سے بلند ہوتی موسیقی کی دھڑکن اور روشنی کی چمک نے اسے ایک مختلف دنیا کا احساس دیا۔ اس کی پلکیں لمحے بھر کے لیے جھپکیں، جیسے اس کی آنکھیں روشنی سے مانوس ہونے کی کوشش کر رہی ہوں۔

دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی، محافظ نے اسے سختی سے دیکھتے ہوئے راستہ دیا۔ ایمان کا دل پھر زور سے دھڑکا، اور وہ ہچکچاتے ہوئے، کانپتے قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں جھینچی ہوئی تھیں، اور دل میں عجیب سا خوف بسا ہوا تھا، لیکن اس کے چہرے پر عزم کی ایک لکیر کھینچی ہوئی تھی۔

نائٹ کلب کی تیز روشنیوں اور دھڑکتی موسیقی نے جیسے ایک لمحے کے لیے اس کی تکلیف کو دھندلا کر دیا۔ اندر کا ماحول شدید اور متحرک تھا، جیسے وہ ایک نئی دنیا میں قدم رکھ چکی ہو۔ اس کے کانوں میں موسیقی کی گونج اور لوگوں کی ہنسی کی آوازیں تھیں، مگر وہ اس ہجوم میں بھی خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔

ایمان نے دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھائے، اس کی نظریں نائٹ کلب کے ماحول کا عمیق جائزہ لے رہی تھیں، جہاں زندگی اور لاپرواہی ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے تھے۔

رقص کرتی ہوئی خواتین نے مغربی تراش تراش کے لباس پہنے ہوئے تھے جو ان کے جسموں سے اس قدر چپکے ہوئے تھے کہ ہر حرکت میں ایک طرح کی خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں شراب کے گلاس تھے اور قہقہے بے ساختہ تھے، جیسے یہ سب معمول کا حصہ ہو۔ دھڑکتی ہوئی موسیقی، روشنیوں کی مدھم سی چمک، اور ہر طرف پھیلی ہوئی آزادانہ خوشی میں، جیسے دنیا کے سارے اصول کہیں غائب ہو گئے ہوں۔

ایمان نے خود کو اس انوکھے منظر کا ایک حصہ محسوس کیا، جیسے اسے ایک عجیب و غریب جاذبیت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔

وہ نظروں سے ان کو ٹٹولتی رہی، جیسے ایک دوسرے جہان میں داخل ہو چکی ہو، جہاں کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔

ناٹ کلب ایک ایسی جگہ بن گیا جہاں اسے کچھ لمحوں کے لیے لگا کہ وہ اس دنیا سے جڑ گئی ہے، جہاں ہر گناہ جائز اور ہر قاعدہ مٹا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

کلب کے ملبوس اور بے خبر لوگ ایمان کے وجود سے بے نیاز اپنی زندگیوں میں مگن تھے، جبکہ ایمان نے اپنے بچاؤ کا راستہ انہی کی غفلت میں پایا تھا۔

وہ رات کے اندھیرے میں چپکے سے اُن کی جیبوں سے رقم نکالتی، یا پھر گھر سے خالدہ کے سیور سے وہ چپکے سے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی۔

کمال کی مہارت اور چالاکی کے ساتھ، وہ محافظوں کو رشوت دے کر کلب میں اپنی محفوظ پناہ گاہ حاصل کر لیتی۔

ہر رات یہ ایک غیر گفتہ معاہدہ بن چکا تھا—بقا کی ایک جنگ، جس میں ایمان کو ہر حال میں جیتنا تھا۔
صبح کے وقت، جب سورج کی نرم روشنی کھڑکیوں سے جھانکتی، ایمان کو ایک سکون کا لمحہ میسر آتا، جہاں وہ اپنے اندر کی گھٹن اور رات کے خوفناک خوابوں سے عارضی نجات پاتی تھی۔

وہ لوگ جو رات کی تاریکی میں سوتے تھے، ایمان اُن کی بیداری کے وقت میں سو جاتی۔

اس کی زندگی دوہری ہو چکی تھی—رات کے سائے اور دن کی روشنی کے درمیان ایک نازک توازن، جہاں رات کا وہ ہولناک کلب اُس کی پناہ گاہ تھا اور صبح کی روشنی اُس کا سکون۔

ایک رات، نائٹ کلب کے دھندلے گوشے میں، ایمان اور مونیز کے درمیان گفتگو ایک ڈوبتے شخص کے لیے تنکے کی مانند بن گئی۔

وہ دونوں اپنی روح کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے، جہاں خواب، خوف اور زندگی کی پیچیدگیاں بانٹتے رہے۔

مونیز، جو کلب کا ایک مستقل رکن تھا، ایمان کی زندگی میں ایک ایسا کردار بن گیا جس کی اس نے کبھی توقع نہیں کی تھی۔

وہ اس کا نہ صرف ساتھی، بلکہ ایک ایسا شخص بن گیا جو اسے ایک ایسی دنیا سے جوڑ رہا تھا، جسے شاید وہ کبھی نہ جڑتی مگر حالات کی بنا پر وہ اس جگہ سے جڑتی گئی۔

ایک ایسی ہی گفتگو کے دوران، مونیز نے ایمان کو ایک حیران کن پیشکش کی نائٹ کلب کی رکنیت کا کارڈ۔ یہ محض ایک پلاسٹک کا ٹکڑا نہیں تھا بلکہ اس کی قبولیت کی علامت تھی، ایک ایسی کمیونٹی میں جہاں اس نے کبھی اپنے ہونے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

ایمان نے کارڈ قبول کیا، اور اس کی آنکھوں میں شکر گزاری کی ایک جھلک نمایاں ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کارڈ صرف ایک کلب میں داخلے کی علامت نہیں تھا، بلکہ اس نئی زندگی کی نشانی تھی جو وہ اپنا رہی تھی۔

وقت کے ساتھ، نائٹ کلب کی یہ راتیں ایمان کے وجود کا حصہ بن گئیں اور اس کی اندرونی دنیا میں ایک غیر محسوس تبدیلی وقوع پذیر ہونے لگی۔

وہ اپنے ماضی کی شناخت سے نجات پانے کے لیے بے تاب تھی۔ اس نے اپنے الجھے ہوئے بالوں سے ابتدا کی، جو اس کے لیے کمزوری اور درد کی علامت تھے۔

کبھی وہ بالوں کو چھوٹا کر والیتی، تو کبھی مختلف وگ پہن کر خود کو بالکل نئے روپ میں ڈھال لیتی۔ اپنے بالوں سے اس کی نفرت اس کے ماضی کی تلخ یادیں تھیں، اور وہ اس ماضی سے چھٹکارا پانے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھی۔

ایمان کا یہ سفر مشکلات سے بھرا ہوا تھا، اور ایسے لمحات بھی آئے جب ماضی کا بوجھ اور اس کے خوفناک سائے اسے مایوسی کی گہری کھائی کی طرف دھکیل دیتے۔

وہ کئی بار اپنے وجود کے خاتمے کے خیال سے دوچار ہوئی، مگر دل کے نہاں گوشے میں موجود ایک کمزور سی روشنی اور نہ جانے کیوں مگر اللہ کے خوف سے اس آخری اور ناقابل واپسی قدم سے باز رکھا۔

اس نے اس امید کی ہلکی سی کرن کو تھامے رکھا، جیسے وہ بقا کا ایک نازک، لیکن مضبوط دھاگہ ہو۔

اس نازک وجود میں، مونیز کا دیا ہوا ممبر شپ کارڈ اس کے لیے ایک یادگار بن گیا، جیسے یہ اس کی ثابت قدمی کا ثبوت ہو۔

ہر بار جب وہ اس کارڈ کو کلب کے دروازے پر پیش کرتی، تو یہ اعلان ہوتا کہ وہ اس دنیا کا حصہ ہے، چاہے صرف چند گھنٹوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔

وہ دنیا جس نے اسے تاریکی میں امید کی ایک کرن دی تھی، وہی دنیا اب اس کی پناہ گاہ بن چکی تھی۔

...°...

ایک عام دن اسلام آباد کے پرسکون مگر متحرک سیکٹر جی ۱۰ کی سڑکوں پر ایمان فٹ پاتھ پر چلتی جا رہی تھی، اس کے ارد گرد کا منظر ہلچل سے بھرپور تھا۔

دائیں جانب قطار در قطار کھڑے ہوئے مکانات، جیسے اپنے اندر کے رازوں کو سینے میں چھپائے ہوئے، پرسکون سنٹینلز کی طرح دکھائی دے رہے تھے،

جب کہ بائیں طرف دورویہ سڑک پر گاڑیوں کا ہجوم ایک شور و غل میں مگن تھا، جیسے ایک نہ ختم ہونے والی ریس میں شریک ہوں۔

فضا میں آسمان پر بادلوں کی ایک ہلکی سی پرت تھی جو شام کے دھندلکے کا پیش خیمہ معلوم ہوتی تھی، اور
ہوا میں ہلکی نمی کا احساس تھا۔ فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والے اپنے روزمرہ کے معاملات میں مشغول تھے، کچھ
تھکے ہوئے قدموں سے چل رہے تھے جبکہ دیگر اپنے روزمرہ معمولات کی جلدی میں گزر رہے تھے۔

بچوں کی کھیلنے کی ہلکی آوازیں دور پارک سے سنائی دے رہی تھیں، جیسے ہر شے اپنی ترتیب میں ہو۔

اچانک، اس عام دن کی زندگی کو ایک بے ترتیب شور نے کاٹ ڈالا۔

ہوا میں ایک دھمک کی گونج سنائی دی، جیسے کوئی بہت بڑی شے زمین سے ٹکرائی ہو۔ ایمان کی نظریں بے
ساختہ اس شور کی طرف اٹھ گئیں، اس کا دل یکدم تیز دھڑکنے لگا۔

ارد گرد کے لوگ بھی پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے، کچھ نے اپنی گاڑیاں سڑک کے کنارے روک
دیں اور جلدی جلدی حادثے کی جگہ کی طرف دوڑنے لگے۔ فضا میں خوف اور اضطراب کا احساس تیرنے
لگا۔ ایمان نے اپنی سانسیں سنبھالیں اور سامنے کے منظر کو دیکھنے لگی۔

اس کا سامنا ایک ایسے واقعے سے تھا جس نے عام دن کی روانی کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ گھر
کے سامنے ایک میدان کے بچوں بیچ، ایک تھکی ہوئی عورت زمین پر لیٹی ہوئی تھی۔

اس عورت کے چہرے پر تھکن، درد اور خوف کے آثار نمایاں تھے۔ وہ لرزاں تھی اور اس کا جسم گرد و غبار سے مملو تھا۔ اس کے جسم پر خراشیں تھیں جو گرنے کے باعث تھیں۔ وہ سامنے موجود اپنے معذب کو دیکھ رہی تھی

وہ ایک نوجوان لڑکی تھی جو اس کے سر پر کھڑی تھی جیسے اس کی بس ہو گئی ہو۔ اس کے چہرے پر بے قابو غصہ اور آنکھوں میں وحشت تھی، جب اس نے عورت کے قریب پہنچ کر بے دردی سے اس کے کانپتے ہاتھوں کو پکڑا اور زور سے جھٹک دیا۔

یہ منظر ایمان کی آنکھوں میں ٹھہر گیا۔ لڑکی کی حرکات بے ترتیب تھیں، اس کے چہرے پر اشتعال کا غصہ نمایاں تھا۔

اس نے عورت کے بالوں کو جکڑ کر اسے زمین پر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بے بس عورت، زمین پر پھیلتے ہوئے، خاموش چیخوں میں غرق ہو گئی۔

اس کے جسم کی بوسیدگی، اس کی شکستہ حالت، سب کچھ اس کی زندگی کے تلخ حقائق کی کہانی سناتے دکھائی دیے۔ ایمان کے قدم تھم گئے، دل تڑپنے لگا، مگر وہ بے بسی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی محض ایک تماشائی بن کر رہ گئی۔

آس پاس کی دنیا جیسے ایک دم سے خاموش ہو گئی تھی، ہارنوں کا شور، لوگوں کی باتیں سب کچھ پس منظر میں گم ہو چکا تھا۔

صرف یہ دردناک منظر اس کے سامنے تھا، جس میں عورت کی اذیت اور لڑکی کا جنون آمیز تشدد نمایاں
تھے۔۔۔۔۔

اس لڑکی نے اس عورت کو ایک طرف کیا اور خود اوپر ہو کر
روہانسی آواز میں سب سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی،۔

۔“میرے ماں باپ کے راستے جدا ہو گئے۔ میری ماں نے دوسری شادی کر لی اور اپنی زندگی کی رنگینیوں
میں گم ہو گئی، اور میرے باپ نے۔۔۔”

لڑکی کی نظریں نفرت سے جلتی ہوئی تھیں، اس نے عورت کی طرف جبرے بھیج کر دیکھا، “اسے۔۔۔!”
اس کے لفظوں میں کرب کا زہر تھا۔

۔“میں کسی چکی میں پستی رہی ہوں، میرا بچپن اس عورت نے تباہ کر دیا! کبھی مجھے ڈنڈوں سے مارتی تو کبھی
اپنے بچوں سے مرواتی۔ اس عورت نے نہ میری تربیت کی اور نہ میری پروا کی۔ اور آج اگر میں نے اپنی
ضرورت کے لیے اپنے باپ کی جیب سے کچھ پیسے نکال لیے، تو کیا قیامت آگئی؟”۔

لڑکی کی آواز میں دکھ اور بے بسی تھی، جیسے اس کی روح پر برسوں کے زخم رسنے لگے ہوں۔ اس کا جسم لرز
رہا تھا، سانسیں بے قابو ہو رہی تھیں،

۔“کیا میرے باپ کے پیسوں پر میرا کوئی حق نہیں؟”۔

اس نے روتے ہوئے کہا، اس کے آنسو ان سالوں کی قید سے آزاد ہو رہے تھے جو شاید اس کی خاموش اذیتوں میں بند تھے۔

۔ ”میرے باپ نے ہمیشہ مجھے اس عورت کی خاطر دیوار سے لگا دیا۔ مجھے کبھی تسلی نہ دی، کبھی پیار نہ دیا۔ بچے محبت کے بھوکے ہوتے ہیں، اگر مجھے تھوڑی سی توجہ بھی مل جاتی تو کیا فرق پڑتا؟ کیا میرا حق نہیں تھا اس محبت پر؟“۔

وہ لڑکی جیسے اپنے اندر کے طوفان سے آزاد ہو رہی تھی، اس کی نظریں ایک بار پھر اس عورت پر جم گئیں۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد، وہ اچانک اس عورت کے بال پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی اور کڑوے لفظوں کے تیروں سے اس کے دل کو چھلنی کرتے ہوئے بولی،۔

۔ ”آج میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ آج میں اسے نہیں چھوڑوں گی!“۔

وہ جنون میں عورت پر حملہ آور ہو گئی، جیسے برسوں کا غصہ ایک ہی لمحے میں بہا دینا چاہتی ہو۔ اس کے اطراف کے لوگ چیخنے لگے، مگر وہ اپنے غصے میں عورت کو زمین پر گرا چکی تھی، اس پر پل پڑی تھی، اس کی کراہیں ہوا میں تحلیل ہو رہی تھیں۔

ہنگامے کے بچ شور اٹھا، اس کا باپ، بھائی اور بہنیں اسے پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے، مگر وہ ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ عورت زمین پر پڑی تھی، لرزتی ہوئی، اور کسی کو یقین نہیں تھا کہ وہ بچ پائے گی یا نہیں۔

ایمان کے کانوں میں سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ آوازیں، چیخیں، فریادیں جیسے ہوا میں تحلیل ہو رہی تھیں، اور وہ خود اپنے خیالات میں گم، بے مقصد آگے بڑھ رہی تھی، شاید اس درد اور بے بسی میں ایک گہری مماثلت محسوس کر رہی تھی، جسے وہ سمجھ تو سکتی تھی، مگر اس کا اظہار کرنے کے قابل نہ تھی۔

...°...

کمرہ نیم روشنی میں ڈوبا ہوا تھا، کھڑکی سے اندر آتی سورج کی چند مدھم کرنیں بس ایک دھندلی سی روشنی بکھیر رہی تھیں۔

پر سکون سناٹا کمرے پر چھایا ہوا تھا، مگر یہ سکون زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا جب اچانک دروازہ ہلکی سی چرچر کی آواز کے ساتھ کھلنے لگا۔

ایک سایہ نمودار ہوا — وہ ایمان تھی۔ ڈینم کی جینز اور سفید بٹر فلائی شرٹ میں ملبوس، شرٹ کے کونے پینٹ میں ٹکے ہوئے تھے، اور اس کے بالوں کی ایک چٹیا اس کے پیچھے جھول رہی تھی۔

وہ دبے قدموں، دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی، جیسے کمرے کی دیواروں پر دباؤ اور رازداری کی ایک دبیز چادر تنی ہوئی ہو۔

یہ کمرہ خالہ اور جتوئی کا تھا، اور فضا میں تناؤ کی ایسی کیفیت چھائی ہوئی تھی کہ ہر چیز گواہ محسوس ہو رہی تھی۔

دروازہ ہلکی سی دھم سے بند ہوا، اور وہ آواز جیسے ہوا میں معلق ہو کر کمرے کو کسی بھیانک راز میں بدل رہی تھی۔

ایمان کے ہر قدم کی آہٹ، کمرے کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کرتی، جیسے اس کے دل کی دھڑکنیں باہر سنائی دے رہی ہوں۔

اس کی ہر حرکت میں ایک سنجیدہ مقصدیت اور غیر مرئی خوف کا عنصر تھا۔

اس نے خاموشی سے پردے کی طرف ہاتھ بڑھایا، اور ایک ہی جھٹکے میں وہ کھڑکی پر پھیلے پردے کو کھینچ کر سورج کی چمکتی روشنی کو کمرے سے باہر کاٹ دیا۔ اب باہر کی دنیا ختم ہو چکی تھی۔ کمرے میں مدھم مصنوعی روشنی باقی رہ گئی تھی، جیسے کوئی خاموش گواہ، جو بس اس کے عمل کا منتظر ہو۔ دیواروں سے بے جان آنکھوں کی طرح گونجتی خاموشی کا احساس دل کو جکڑ رہا تھا۔

ایمان نے ایک گہری سانس لی، اور دھڑکتے دل کے ساتھ الماری کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، جیسے ہر جنبش کسی بڑے بھید کا پردہ چاک کرنے والی ہو۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کس چیز کی تلاش میں ہے — وہ لا کر جس میں چھپے راز اس کے سامنے کھلنے کو بے تاب تھے۔ جیسے ہی اس

نے لاکر پر پاس ورڈ ٹائپ کیا، اس کا دل جیسے سینے میں پھنس کر رہ گیا۔ تالے کی کھلنے کی آواز ہوا میں ایک سنسنی خیز سرگوشی کی مانند گونجی۔

لاکر کے کھلتے ہی، سامنے رکھی ہوئی فائلیں اور نوٹوں کا ڈھیر ظاہر ہوا۔ ایمان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیرنے لگی، جیسے اسے اپنی محنت کا پھل مل گیا ہو۔ اس کی انگلیاں نوٹوں کو چھونے لگیں، مگر جیسے ہی وہ انہیں اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھاتی، وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئیں۔ اس کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی، اور اچانک، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کچھ ایسا تھا، کوئی انجان، خوفناک موجودگی، جو فضا کو وزنی اور پراسرار بنا رہی تھی۔

--

ایمان کی پیٹھ کے پیچھے سے خالدہ کی بھاری، غضب سے لرزتی آواز اچانک گونجی، جس نے کمرے میں چھائی کشیدہ خاموشی کو ایک جھٹکے سے چیر دیا۔ وہ آواز کسی طوفان کی مانند تھی، اور اس کی گونج نے ایمان کے دل کی دھڑکنیں اور بھی تیز کر دیں۔ کمرے کی فضا ایک جال کی طرح اس کے ارد گرد تنگ ہو گئی تھی، جیسے ہر چیز اس کے خلاف سازش کر رہی ہو۔ ایمان کا بدن خوف اور حیرانی کے عالم میں ساکت تھا۔ لاکر کا راز افشاں ہو چکا تھا اور اس کی پیٹھ اب کھلی حقیقت کی جانب تھی۔ اس کے ہاتھوں میں گناہ کی علامتیں تھیں، اور فضا میں جرم کی بھاری بو محسوس ہو رہی تھی۔

خالدہ کے قدموں کی تیز آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

۔ ”کافرہ! یہودن! شیطان کی بندی!“۔

اس کے الفاظ ایمان کی طرف لپکتے ہوئے تیز خنجر کی مانند تھے۔ خالدہ کا چہرہ نفرت اور غضب کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ جب وہ قریب پہنچی، اس نے ایمان کے بالوں کو جکڑنے کی کوشش کی، مگر جیسے ہی اس کے بال کھینچے، ایمان کی وگ فرش پر جا گری۔

یہ منظر دیکھ کر خالدہ ایک پل کے لیے ٹھٹک گئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور الجھن تھی، جیسے اس نے کچھ غیر متوقع دیکھا ہو۔ ایمان کی سیاہ جالی دار ٹوپی، جس کے نیچے اس کے چھوٹے بال چھپے ہوئے تھے، سامنے آ گئی۔ ایک لمحے کے لیے، خاموشی نے فضا کو پھر سے جکڑ لیا، مگر ایمان کی ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیرنے لگی۔

ایمان کی مسکراہٹ نے خالدہ کو اور بھی بے قابو کر دیا۔

اس کے چہرے پر شدت کی سرخی دوڑ گئی، اور اس نے بے دردی سے ایمان کی گردن کے پچھلے حصے کو جکڑ لیا، جیسے اس کی گرفت سے فرار ممکن نہیں تھا۔ ایمان اب قدرے جھکی ہوئی تھی، مگر اس کے قدم خالدہ کے بھاری ہاتھوں کی طاقت کے سامنے بے بس ہو کر گھسیٹے جا رہے تھے۔ کمرے کی ہر چیز گواہ تھی، فضا میں خالدہ کی شدت اور ایمان کے اندرونی سکون کا متضاد منظر موجود تھا، جس سے ماحول بو جھل ہو گیا تھا۔

ہال میں ایک سرد اور بے رحم فضاء چھائی ہوئی تھی، جہاں ہوا میں صرف کوڑے کی ضربیں گونج رہی تھیں جو گوشت پر پڑتی تھیں، جیسے کسی بے جان وجود کو مارا جا رہا ہو۔

درد کی چچنیں سنائی نہیں دیتی تھیں، کیوں کہ ایمان نے اپنی تکالیف کو ایک خاموش رد عمل میں قید کر رکھا تھا۔ خالدہ کی بیٹیاں ایک کونے میں کھڑی تھیں، ان کے چہروں پر موجود زہر آلود مسکراہٹیں اس ظالمانہ منظر کا حصہ تھیں، جیسے یہ تماشا ان کی روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہو۔

خالدہ کی پیشانی پر غصے اور حیرت کے آثار واضح تھے، وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھی کہ ایمان اب بھی کیوں قائم ہے۔ ان سالوں کے ظلم نے ایمان کے جسم کو زخمی ضرور کیا تھا، لیکن اس کی روح کو مدہم کرنے میں ناکام رہے تھے۔ وہ ایک چٹان کی مانند کھڑی تھی، گویا کہ درد اور ذلت کے ہر وار کو وہ اپنے اندر جذب کر رہی ہو، اور ہر ضرب کے ساتھ اور بھی مضبوط ہو رہی ہو۔ خالدہ کی ہر کوشش، ہر زخم ایمان کی مضبوطی کا ایک نیا امتحان تھا، جس میں وہ ہمیشہ کامیاب ہوتی تھی۔

ایک طرف خالدہ اپنی ناگفتہ بہ حالت میں کھڑی تھی، اس کے ہاتھوں پر زخموں کے نشان، گویا ظلم کرنے والے پر ہی ظلم لوٹ آیا ہو۔ دوسری طرف ایمان تھی، جس کے چہرے پر ایک عجیب سی سکون بھری مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں اب وہ معصومیت نہیں تھی جو کبھی ہوا کرتی تھی، بلکہ ایک اٹل عزم اور خود اعتمادی کی چمک تھی۔ وہ کسی مصلحت یا ندامت کے بغیر، اپنے دشمن کے سامنے کھڑی تھی، جیسے اسے یقین ہو کہ کوئی طاقت اسے توڑ نہیں سکتی۔

ایمان کے وجود میں ایک غیر معمولی سکون تھا، جیسے وہ اپنے اندر کسی پوشیدہ راز کو سنبھالے ہوئے ہو۔ درحقیقت، وہ آج صرف اپنے معمول کی زندگی گزارنے کی ایک عادی قیدی نہیں تھی؛ آج وہ ایک نیاموڑ لے چکی تھی۔

اس کے ذہن میں جو منصوبہ تھا، وہ خالدہ کی دسترس سے بہت دور تھا، اور اسی منصوبے کی بدولت وہ آج اس عذاب کو برداشت کر رہی تھی۔

اس منظر کے عین بیچ میں، جتوئی ہال میں داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں ایمان کی طرف گئیں۔

پھر ایمان کی نگاہیں اپنے والد سے ملیں، جن میں ملامت اور طنز کی جھلک تھی۔ ایمان نے طنزیہ انداز میں سر جھٹکا، اور جتوئی اس منظر کو دیکھنے لگا۔ وہ ان تمام باتوں کا عادی تھا، اس کے لیے یہ سب معمول کی بات تھی۔۔۔

ایمان کی خاموش بغاوت نے خالدہ کو مزید مشتعل کر دیا تھا، لیکن اس کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ وہ ایک عورت تھی جس نے ایمان کی روح کو توڑنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی، مگر ہر بار وہ اپنے مقصد میں

ناکام ہوئی۔ ایمان کی آنکھوں میں جو شعلہ تھا، وہ اس بات کا اعلان تھا کہ یہ لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی، اور وہ ہار ماننے والی نہیں تھی۔

اس ہال میں ایمان کی موجودگی اب کسی شکست خوردہ قیدی کی نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی شخصیت کی تھی جو ظلم کے ہر وار کے ساتھ اور بھی طاقتور ہو گئی تھی۔

خالدہ کی سانسیں کچھ لمحے کو تھم گئیں، اس کے ہاتھ ایمان کو مارتے مارتے کانپ رہے تھے، اور اب کہ تھک چکے تھے اس کی آنکھیں بے یقینی کے عالم میں ایمان کی طرف ٹکی تھیں۔

ایمان کا چہرہ ایک ایسی طعنہ زن مسکراہٹ سے منور تھا جو گویا پوری فضا پر چھا چکی تھی، جیسے ایک ناگہانی بلا کسی بھی پل پھٹنے والی ہو۔

ایمان کی اس مسکراہٹ نے خالدہ کے اندر ایک طوفان برپا کر دیا۔ اس کے اندر کا غصہ ابل کر ایک اور وار کے لیے ایمان کی طرف لپکا، لیکن اس بار ایمان نے ایک ایسی تیزی سے اس حرکت کو روک دیا جیسے کسی ناگہانی بجلی نے زمین کو چھو لیا ہو۔ خالدہ کا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا، جیسے وقت نے خود کو منجمد کر لیا ہو۔

ایمان کی آنکھوں میں وہ چنگاریاں روشن ہو رہی تھیں جو کسی زیر زمین آتش فشاں کی طرح اندر ہی اندر بھڑک رہی تھیں۔

اس کی گرفت میں ایک ایسی قوت چھپی ہوئی تھی جو خالدہ کے تکبر کو پارہ پارہ کر رہی تھی۔

خالدہ، جو ہمیشہ حاوی رہی تھی، پہلی مرتبہ خود کو ایمان کی بے رحم گرفت میں جکڑا ہوا دیکھ کر لرز گئی۔

اس کے چہرے پر ایک انجانا خوف پھیل گیا تھا، جیسے وہ ایک ایسی حقیقت کا سامنا کر رہی تھی جس کا تصور بھی اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔

ایک طرف جنوئی، حیرانگی اور بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔

وہ اس لمحے کی شدت کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا۔ خالدہ کی بیٹیاں، جو ہمیشہ اپنی ماں کی پشت پناہی کرتی تھیں، آج پہلی مرتبہ خوف سے ساکت کھڑی تھیں، ان کے چہرے کی رنگت پیلاہٹ میں بدل چکی تھی، جیسے یہ منظر ان کے لیے کوئی بھیانک خواب ہو، ایک ایسا خواب جو ان کے سامنے حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔

ایمان کی آواز نے اس خاموشی کو چیر کر رکھ دیا، ایک ایسی گونج تھی جو دیواروں سے ٹکرا کر واپس لوٹ رہی تھی۔

یہ آواز نہ صرف خالدہ کے لیے بلکہ ہر اُس شخص کے لیے انتباہ تھی جو وہاں موجود تھا۔ ایمان جیسے اپنی محدودات سے نکل کر اپنے نئے وجود کا اعلان کر رہی تھی۔

۔“ تیری ہر کوشش اب بے سود ہے، ” ایمان کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ سختی اور قوت کی عکاسی کر رہے تھے، ”میں اب وہ کمزور نہیں رہی جسے تُو آسانی سے توڑ سکتی تھی۔ تُو نے میرے اندر وہ طاقت جگادی ہے جسے تُو نہ سمجھ سکی اور نہ روک پائی۔ اب تیری مجھے توڑنے کی کوششیں پہاڑ کے خلاف ہوا کے جھونکے کے سوا کچھ نہیں ہیں۔“

ایمان کے الفاظ یوں گونج رہے تھے جیسے کسی چٹان سے ٹکرانے والی موجیں خالدہ کے وجود میں خوف کی لہریں دوڑا رہی ہوں۔

ایمان نے خالدہ کا ہاتھ بے دردی سے مروڑ دیا، جس پر خالدہ کی چیخوں نے اس کمرے کی خاموشی کو پارہ پارہ کر دیا، اور وہ بے بسی سے زمین پر گر گئی۔

وہ شخصیت جو کبھی غرور کا مجسمہ ہوا کرتی تھی، آج ایمان کے قدموں میں بے یار و مددگار پڑی ہوئی تھی۔ ایمان نے اسے زمین پر پڑے ہوئے دیکھا اور جب اس کے ہاتھ خالدہ کے گلے پر مضبوط ہوئے، تو کمرے میں موجود ہر فرد کا سانس رک گیا۔

خالدہ کی تیز ہوتی سانسیں اور لرزتا ہوا جسم، جبکہ ایمان کے چہرے پر ایک عجیب سا سکون تھا، ایک خاموش فتح کا سکون۔ وہ اب اُس مقام پر تھی جہاں اس کی ٹوٹ پھوٹ نے اُسے ناقابل شکست بنا دیا تھا۔

یہ لمحہ ایمان کے وجود کی معراج تھا۔ اس کی طاقت اور عزم نے کمرے کی فضا بدل کر رکھ دی تھی، جیسے ہوا کا رخ بدل گیا ہو۔ خالدہ، جو کبھی حاوی رہتی تھی، آج ایمان کے سامنے ہار چکی تھی۔ ایمان کی فتح ایک خاموش انقلاب کی مانند تھی، جس نے سب کی امیدوں اور تصورات کو ملیا میٹ کر دیا تھا۔

جتوئی اپنی نادانی کے حجاب سے نکل کر حقیقت کی سنگلاخ زمین پر کھڑا تھا۔ اسے اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ احساس ہوا کہ خالدہ کو اس قید سے آزاد کرنا اس کی ذمہ داری ہے جو بہت وقت جو عرصے کی مانند محسوس ہو رہا تھا اسے جکڑے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت اور بے یقینی کے سائے منڈلا رہے تھے جب وہ ایمان کے سامنے آکر بولا

”یہ کیا کر رہی ہو؟ فوراً اسے چھوڑ دو!“

ایمان کی نگاہیں خالدہ پر جم چکی تھیں، ان میں غصے کی لو بھڑک رہی تھی، جیسے انتقام کا آتش فشاں پھٹنے کو ہو۔

”آج ہی وہ دن ہے، خالدہ، جب میں تیرے ہر ظلم کا حساب چکتا کروں گی۔“ اس کی آواز میں وہ سفاکی اور تلخی تھی جس نے خالدہ کو کانپنے پر مجبور کر دیا۔

خالدہ نے تڑپتے ہوئے اور لرزتی سانسوں کے ساتھ التجا کی۔
”ایمان،، یہ جنون بند کر۔“

مگر ایمان کے چہرے پر انتقام کا رنگ اور گہرا ہو گیا تھا۔
جتوئی نے خالدہ کو بچانے کے لیے ایمان پر جھک کر اسے پیچھے کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی، مگر تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔۔ جب

وہ اپنی گرفت مزید مضبوط کرتے ہوئے جتوئی کی طرف پلٹی، جسے اس نے بے دردی سے دھکیل دیا۔
جتوئی پیچھے لڑکھڑا کر ایک صوفے سے جا ٹکرایا، بے بسی کی حالت میں وہ دیکھتا رہا کہ کیسے وہ لڑکی جو کبھی مظلوم تھی، اب قاتلانہ ارادوں کے ساتھ کھڑی ہے۔

”تجھے چپ رہنے کی ضرورت ہے، جتوئی!“ ایمان کی زبان سے زہر کے قطرے ٹپکے، اور کمرہ جیسے اس طوفان کی زد میں لرزنے لگا۔

یہ ایک ایسا لمحہ تھا جو نہ صرف کمرے کی فضا پر انمٹ نقوش چھوڑنے والا تھا، بلکہ ہر اس روح پر بھی جو اس منظر کی گواہ تھی، یہ حقیقت کا منہ بولتا ثبوت تھا کہ مظلوم کب اور کیسے فاتح بن سکتا ہے۔

ایمان کی آنکھوں میں وہ شعلہ تھا جس کی تپش نے کمرے کی فضاء کو سنگین بنا دیا تھا۔

یہ آج کا دن تھا جب اس نے خالدہ کے ہر جبر کا حساب چکانا تھا۔ دیواروں پر جیسے اس تصادم کی گونج ثبت ہو رہی تھی، اور خالدہ فرش پر بکھری ہوئی، اپنی خطاؤں کا سامنا کرتی ہوئی تڑپ رہی تھی۔

جتوئی نے ایک لمحے کو ایمان کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر بے رخی اور آنکھوں میں وحشیانہ جاہت چھلک رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایمان اتنی قوت کا مظاہرہ کرے گی۔ اب، وہ خود کو اس ناقابل فہم طاقت کے آگے بے بس محسوس کر رہا تھا۔

ایمان کا وجود اس لمحے میں غالب تھا، وہ ایک ایسی قوت تھی جس کی فتح کا نشان اس کمرے کی ہر چیز پر نقش ہو چکا تھا۔

ایمان نے خالدہ کو چھوڑا اور آہستہ آہستہ اپنے قدموں پر کھڑی ہو گئی، اس کی آنکھوں میں سرد مہری اور نفرت کی انتہا تھی۔ اس نے ایک نظر نیچی کر کے خالدہ کو دیکھا، جو فرش پر تڑپتے ہوئے سانسیں بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

۔ ”میں تجھے قتل کر کے اپنے ہاتھ نہیں گندے کرنا چاہتی،“۔

ایمان نے دھیمی مگر کاٹ دار آواز میں کہا، جیسے ہر لفظ خالدہ کے دل میں چھری کی طرح پیوست ہو رہا ہو۔

خالدہ کا چہرہ، جس پر اب خوف اور رسوائی کی گہری پرچھائیاں تھیں، اس کی حالت کی عکاسی کر رہا تھا۔ ایمان کی یہ دھمکی محض ایک وارننگ نہیں تھی، بلکہ ایک حقیقت تھی جسے خالدہ اب نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

کمرے میں چھائی خاموشی کو صرف خالدہ کی بے ہنگم سانسوں اور ایمان کی دھمکی کی بازگشت توڑ رہی تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں ان دونوں کی زندگیوں کے تانے بانے ہمیشہ کے لیے بدلنے والے تھے، اور خالدہ کو اب اپنے تمام جرائم کا حساب دینا تھا۔

...°...

ہال ایک عمیق شورش میں ملفوف تھا، جیسے شدت تصادم کے بعد کسی غیر مرئی لرزش نے فضا کو بے چینی کی لپیٹ میں لے رکھا ہو۔ ایمان کے سامنے کھڑا جتوئی، جس کی نظریں غصے اور بے اعتنائی سے دھک رہی تھیں، ایک سرد اور تلخ خاموشی میں ایمان کو گھور رہا تھا۔ خالدہ نیم دراز تھی، صوفے پر پھیلی ہوئی، اور اس کی بیٹیاں اُس کی دیکھ بھال میں مشغول تھیں، کبھی اس کے ماتھے پر پانی کے چھینٹے ڈالتی تو کبھی اس کے ہاتھوں کو تھپتھپاتی، جیسے اُس کے درد کو کم کرنے کی بے سود کوشش کر رہی ہوں۔

جتوئی کا غصہ اب ضبط سے باہر ہو چکا تھا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے غرایا، ”تمہاری یہ جسارت کیسے ہوئی کہ تم نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا؟“

ایمان، اپنے غیر متزلزل ارادے کی چمک لیے، اُس کے اشتعال کو خونسردی سے برداشت کر رہی تھی۔
اس کی آواز میں وزن اور عزم نمایاں تھا، جیسے ہر لفظ کے ساتھ اُس کے حوصلے کا گہرا نقش ابھر رہا ہو۔
”ہمت؟“ ایمان کی آواز میں ٹھہراؤ اور استحکم تھا۔

”یہ وہ ہی ہمت ہے جو مجھے اپنے حق کے لیے کھڑا ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ میں کمزور ہوں، تو وہ خود فریبی کا شکار ہے۔ کیوں کہ میں کبھی کمزور تھی ہی نہیں۔“

یہ کہتے ہوئے ایمان نے جتوئی کو سر تا پا نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور مزید کہا، ”اگر کبھی کمزور بھی رہی تو وہ کمزوری میری طاقت بن چکی ہے۔ میں وہ ڈری سہمی تیراں سالہ ایمان نہیں ہوں۔“

اُس نے اپنے سینے پر شہادت کی انگلی مارتے ہوئے کہا، ”یہ میں ہوں، وہ پندرہ سالہ ایمان جس نے خود کو بدل ڈالا ہے۔ اور اگر کسی نے میری طرف انگلی اٹھائی تو وہ انگلی توڑ کر رکھ دوں گی!“

جتوئی نے ایک تلخ اور حقارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی بات سن کر سر نفی میں ہلایا۔ ”دیکھتے ہیں کہ جب تم اس گھر سے باہر نکلو گی تو اپنی یہ بڑی بڑی باتیں کیسے یاد رکھو گی؟“

اس کے طنز نے کمرے کی فضا کو مزید کشیدہ کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے جیسے کوئی اندرونی جنگ لڑ رہے ہوں۔

ایمان نے اُس کی بات کا ہنسی میں جواب دیا، ایک تلخی اور بے پروائی کے ساتھ کہا، ”گھر؟ میں گھر میں ہوتی کب ہوں؟“۔

خالدہ اپنی کیفیت میں مستغرق تھی، بظاہر وہ اقتدار کی اس جنگ سے لاپرواہ نظر آرہی تھی، حالانکہ یہ کشمکش اُس کے سامنے کھلی جارہی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب گھر کے اندر طاقت کے توازن میں ایک نیا باب رقم ہو رہا تھا۔ ایمان کی نوخیز مگر پختہ طاقت اب اُس جمود کے خلاف سرکش ہو چکی تھی جو عرصے سے اس خاندان کی تقدیر کا حصہ بنا ہوا تھا۔

جتوئی نے سخت لہجے میں وہ بات کہہ دی جو شاید کوئی باپ ہزار بار سوچ کر کہتا،۔ ”گھٹیا ماں کی گھٹیا بیٹی جو ہو!“۔

ایمان اس جملے پر بے ساختہ ہنس پڑی، اُس کے چہرے پر کوئی ندامت یا شرمندگی کا سایہ نہ تھا۔ وہ بلا جھجک اور بے باکی سے بولی،۔

”صرف ماں ہی نہیں، بلکہ باپ بھی گھٹیا ہے!“

یہ سن کر جتوئی ٹھٹھک گیا۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے چھوٹی ہو گئیں اور اُس نے ایمان کو بے یقینی کے عالم میں گھورا۔ ایمان کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی، جیسے اُس نے کسی گہری راز کا پردہ فاش کیا ہو۔

۔ ”تو پھر کچھ تو گھٹیا میرا بھی ہونا بنتا ہے نا۔“

اُس کی بات میں ایک عجیب سی سنجیدگی اور تمسخر تھا۔

کمرہ جیسے ایمان کی اس تبدیلی کا عینی شاہد بن چکا تھا۔ اس نے ایک ایسی غیر مانوس قوت کا مظاہرہ کیا تھا جس نے سب کو حیران کر دیا تھا۔

اس کی نوخیز لچک اور بے خوفی نے ہر کسی کو ایک نئی حقیقت سے روشناس کرایا تھا۔ جتوئی اپنی بے بسی پر قابو نہ رکھ سکا، اُس کی مٹھیاں غصے سے بھیجنچ گئیں۔ اُس نے ایک جھٹکے سے ایمان کی کلائی پکڑی اور دروازے کی طرف گھسیٹنے لگا۔ مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ ایمان نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اُس کی نظریں پُر سکون اور اُس کا رویہ مضبوط تھا، جیسے وہ جانتی ہو کہ کیا ہونے والا ہے۔

جب وہ دونوں دروازے کے قریب پہنچے تو جتوئی کا ہاتھ دروازے کی دستک تک بڑھا۔ لیکن جیسے ہی دروازہ کھلا، فضا میں ایک گہری اور پراسرار تبدیلی آگئی۔ جتوئی کا وہ طوفانی غصہ، جو ابھی تک بے قابو تھا، یکایک خاموشی کی دھند میں گم ہو گیا۔ اُس کا چہرہ جو غیظ و غضب سے دھک رہا تھا، اب حیرت اور بے یقینی کی عجیب سی جھلک لیے ہوئے تھا۔

ایمان کی گرفت ہلکی ہو چکی تھی، لیکن اُس کی آنکھوں میں ایک سرد عزم چھپا ہوا تھا۔ دروازہ جیسے ان دونوں کے لیے کسی نامعلوم حقیقت کی طرف کھل رہا تھا، اور اُن کے پیچ پھیلی ہوئی خاموشی نے پورے منظر کو مزید پُر اسرار بنا دیا تھا۔

--- ° ---

جیسے ہی دروازہ آہستگی سے کھلا، اس لمحے کی سنگینی میں ایک وقار بھری، سیاہ پوشاک میں ملبوس شخصیت داخل ہوئی۔ یہ وکیل حاشر تھا، اس کے لبوں پر ایک عارفانہ مسکراہٹ تیر رہی تھی، اور اس کی آنکھیں جتنی کی چہرے پر بکھرتے جذبات کو پرکھ رہی تھیں۔ کمرے میں ایک گہری خاموشی چھا گئی، گویا حاشر کی موجودگی نے فضا میں سنجیدگی اور تقدس کی ہوا بھر دی ہو۔

جتنی کا دل ایک لمحے کے لیے تذبذب میں ڈوب گیا، پھر اُس نے بظاہر ضبط کا دامن تھامے ہوئے کہا۔
- ”حاشر صاحب، آپ یہاں؟“ -

اُس کی آواز حیرت اور پریشانی کے امتزاج میں لپیٹی ہوئی تھی، جیسے وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وکیل کی آمد کیوں اور کیسے ممکن ہوئی۔

لیکن حاشر کے پیچھے ایک اور ہستی موجود تھی، جسے عام آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ایک نورانی فرشتہ، جو ایمان کی حفاظت اور رہنمائی پر مامور تھا، اُس جگہ ایستادہ تھا۔ اُس کی موجودگی نے کمرے کو ایک روشن نور سے بھر دیا، جیسے آسمانوں سے روشنی کی کرنیں برستی ہوں۔

ایمان کا دل اس مقدس روشنی کی لہر سے لرزاٹھا۔ یہ ایک الہامی پیغام تھا، ایک علامت کہ آسمان کی قوتیں اس کی حفاظت میں ہیں۔ یہ فرشتہ، جس نے ایمان کی زندگی کے پیچ و خم میں قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا تھا، آج پھر اس کے پاس تھا، اُس کی روحانی راہنمائی کے لیے حاضر۔

یہ روشنی نہ صرف ایمان کی بلکہ اس کی بیداری اور حفاظت کا بھی مظہر تھی۔ گویا آسمان نے اس پر قسم کھائی ہو کہ وہ اس کی رہنمائی کرے گا، اسے سیدھی راہ پر چلائے گا۔

آخر ایسی کیا خاص بات تھی؟ ماضی میں ایسا کیا واقعہ ہوا تھا جس کی وجہ سے یہ نورانی ہستی ہمیشہ ایمان کی حفاظت کے لیے متعین ہو گئی؟

ایمان کا دل اس روشنی اور روحانی موجودگی سے گہرا متاثر ہوا۔ اس کے دل سے ایک آہ نکلی، گویا اس کی آواز آسمانوں کو چیر کر وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ اپنے قدم اٹھاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگی، اُس کی نظریں وکیل حاشر پر جمی ہوئی تھیں، جو ہر قدم پر اُس کی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ جیسے ہی ایمان دروازے کے قریب پہنچی، حاشر کی گونج دار آواز کمرے کی فضا میں تیر گئی، ”آپ کہاں جا رہی ہیں؟ میں آپ کے لیے آیا ہوں۔“

وہ کمرہ جو پہلے کشیدگی اور غیر یقینی سے بھرا ہوا تھا، اب ایک مقدس تصادم کا گواہ بن چکا تھا۔ ایک ایسا تصادم جس میں آسمانی اور زمینی قوتوں کی لکیریں مدھم ہو چکی تھیں۔ ایمان کا سفر اب محض ایک ظاہری جدوجہد نہیں تھا، بلکہ روحانی اور مقدس راہنمائی کی طرف ایک گہری تحریک کا مظہر تھا۔

ایمان ایک پل کے لیے ساکت ہو گئی، حیرت اور تعجب کی لرزش اُس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اُس نے اپنی ایڑی کو موڑتے ہوئے اپنے سینے پر شہادت کی انگلی رکھی اور بظاہر ناقابل یقین انداز میں پوچھا،
”میں؟“۔

اس خیال سے کہ کوئی اسے کسی مقدس مقصد کے لیے تلاش کر رہا ہے، وہ ششدر رہ گئی۔

حاشر نے اپنی مسکراہٹ کو مزید گہرا کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا، ”ہاں، تم ہی۔“۔

ایمان کے سر پر جالی دار ٹوپی بدستور قائم تھی، اور وہ اس بات سے بالکل بے نیاز تھی کہ ارد گرد کے لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ٹوپی اس کے وجود کا حصہ بن چکی تھی، تو بے جا نہ ہو گا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ کوئی نیار حجام یا منفرد فیشن بن چکا ہو، اور ایمان کے لیے یہ ایک عام سی بات تھی، جسے دوسروں کی سوچوں یا نظریات کی پروا نہیں تھی۔ دراصل، اس کا طرزِ عمل اور اعتماد ایسا تھا کہ گویا وہ خود ہی ایک نیا انداز متعارف کروا رہی ہو۔

حاشر مسکراتے ہوئے آگے بڑھنے لگا اور جتوئی ہڑبڑاتا اس کے پیچھے پس پشت

دروازہ بند کرتے ہوئے ایمان نے اپنے قدم تیز کیے اور وکیل حاشر کا پیچھا کرنے لگی، لیکن جتنے قدم وہ آگے بڑھاتی گئی، اتنی ہی گہری الجھن اس کے دل میں جڑ پکڑتی گئی۔

حاشر نے اچانک رک کر اسے بھی رکنے کا اشارہ کیا۔ جتوئی، جو پہلے ہی اندرونی غصے اور خوف کے مابین تذبذب میں تھا، وکیل کی طرف تیز اور بے چین نگاہ ڈالی، لیکن حاشر کی بے پرواہ اور پرسکون شخصیت نے اُسے بے اثر کر دیا۔

اسی دوران، خالدہ کی نظر جب وکیل پر پڑی تو اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ کمرہ اب ایک ایسا مقام بن چکا تھا جہاں گہرے راز اور انجان ارادے ہواؤں میں معلق تھے۔ حاشر نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور صوفے پر ایک پرسکون انداز میں بیٹھ گیا۔ ایمان کو اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ دیا، گویا یہ وہ لمحہ تھا جس کی تیاری تقدیر نے برسوں سے کر رکھی تھی۔

جتوئی کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ خالدہ کے قریب جا بیٹھا، اس کے چہرے پر شکست خوردہ چور کی سی بے بسی تھی۔ خالدہ کی آنکھوں میں خوف اور مایوسی کی جھلک تھی، اور وہ مسلسل ایمان اور وکیل کے درمیان نظر دوڑا رہی تھی۔

ایمان، فرشتے کی مقدس روشنی کے زیر سایہ، مدھم قدموں کے ساتھ صوفے کے قریب آئی اور اپنے مختص کردہ مقام پر بیٹھ گئی۔

وکیل حاشر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے دستاویزات کا پلندہ ایمان کے سامنے رکھا۔ ہر صفحہ گویا اس کے لیے پوشیدہ سچائیوں کا دروازہ کھولنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ایمان نے ایک سوالیہ نگاہ وکیل کی طرف ڈالی، جبکہ خالدہ کا چہرہ خوف سے کانپ رہا تھا، گویا وہ ان دستاویزات کے راز سے واقف تھی۔

وکیل حاشر نے ایک مخصوص صفحے پر ایمان کے دستخط کی جگہ کی طرف اشارہ کیا، قلم اس کے ہاتھ میں پیش کیا، اور بڑی نرمی سے کہا،
- ”یہاں دستخط کر دیں۔“ -

جتوئی نے ایک بھیانک طنزیہ مسکراہٹ سے جواب دیا، یہ سوچتے ہوئے کہ ایمان اس قانونی چالاکی کو نہیں سمجھ سکے گی۔

ایمان نے دستخط سے پہلے اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ”میں کیسے دستخط کر سکتی ہوں؟ یہ قانونی دستاویزات ہیں، اور ان کی تصدیق کے لیے شناختی کارڈ درکار ہوتا ہے، جو میرے پاس نہیں ہے۔“
کمرے میں ایک لمحہ کے لیے خاموشی چھا گئی۔

حاشر نے اپنی مسکراہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے اعتماد سے جواب دیا، ”ناممکن کو ممکن بنانا میرا کام ہے۔“ -

پھر اس نے اپنی جیب سے ایک شناختی کارڈ نکالا، اسے نہایت احتیاط سے ایمان کی طرف بڑھایا۔ ایمان نے کارڈ کو کانپتے ہاتھوں سے قبول کیا اور جیسے ہی اس کے مندرجات کو دیکھا، اس پر حیرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ ایمان نے حیرت سے پوچھا، اس کی آواز میں خوف اور استعجاب کی جھلک تھی۔

حاشر کی نظریں جتوئی پر گئیں، جو بظاہر شکست خوردہ اور خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر پھیلی پیلاہٹ اس کی اندرونی بے چینی کو ظاہر کر رہا تھا۔ حاشر نے گہری سانس لی اور بڑی سنجیدگی سے بولنا شروع کیا۔

”آپ کے والد نے مجھے آپ کا شناختی کارڈ بنوانے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ اس مقصد کے لیے ہمیں آپ کی تاریخ پیدائش میں تبدیلی کرنا پڑی، تاکہ آپ کی عمر قانونی طور پر زیادہ ظاہر ہو سکے۔ جب آپ محض تیرہ برس کی تھیں، تب آپ کا شناختی کارڈ اور ب فارم اس طرح تیار ہوا جیسے آپ اٹھارہ سال کی ہوں۔“

ایمان حیرت میں ڈوبی ہوئی، اس انکشاف پر سانس روکے سنتی رہی۔ وہ حیرت سے نہ رک سکی اور استفسار کیا، ”مگر یہ سب کیوں؟“

حاشر نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے گویا ایمان کی دنیا کو بدل دینے والے راز کا پردہ چاک کیا۔

”آپ کی دادی نے جائیداد اور خاندانی کاروبار کا ساٹھ فیصد حصہ آپ کے نام کر دیا تھا۔“

یہ سن کر ایمان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

۔“آپ کے والد کے پاس بیس فیصد ہے، آپ کی والدہ کے بھائی کے پاس پندرہ فیصد، اور پانچ فیصد آپ کے بھائی میکائیل کے لیے مخصوص ہے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ آپ کے والد نے ان دستاویزات پر آپ کے دستخط لینے میں جلدی کی۔ کہ یہ ساٹھ فیصد حصہ ان کے ہی اولاد کے پاس آجائیں۔”

حاشر کا لہجہ پر سکون اور متوازن تھا، مگر کمرے میں موجود ہر شخص پر یہ الفاظ گویا بھاری پڑ رہے تھے۔

جتوئی، جو پہلے ہی بے قابو تھا، خود پر قابو نہ رکھ سکا اور بے چینی سے ادھر ادھر ٹھہلنے لگا۔ کمرہ جیسے کسی پوشیدہ قوت کے زیر اثر سمٹنے لگا، ہر شخص پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ جتوئی کے چہرے پر چھپتی ہوئی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی، اور خالدہ کا چہرہ بھی مایوسی اور خوف کے ملاپ سے سفید پڑ چکا تھا۔

ایمان کے ہاتھ میں شناختی کارڈ کانپ رہا تھا، اور وہ بے یقینی کے عالم میں حاشر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ لمحہ ایک فیصلہ کن موڑ پر تھا، جیسے کہ کائنات نے اسے کسی گہری بصیرت سے نوازا ہو۔

حاشر نے ایک بار پھر اشارہ کرتے ہوئے کہا، “یہاں دستخط کریں۔ اگر آپ چاہیں تو پہلے مشق کر لیں۔”

ایمان کی نگاہیں کاغذ پر جمی رہیں،۔

یہ منظر دیکھ کر جتوئی اور خالدہ کو یقین ہو گیا کہ ایمان تو انپڑھ ہے، وہ کیسے کاغذ پر دستخط کرے گی۔ ان کے چہروں پر زہریلی مسکراہٹیں تھیں اور وہ مکاری سے مسکرا رہے تھے، مگر وہ بھول گئے تھے کہ جسے اللہ حفاظت میں رکھے، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

جب ایمان قلم اٹھانے لگی تو فرشتے کی مقدس موجودگی نے اسے ایک پرسکون اطمینان عطا کیا۔

کمرے میں جتوئی اور خالدہ کی ہلکی مسکراہٹیں اب خوف اور حیرت میں بدل گئیں تھیں جب ایمان نے بغیر کسی رکاوٹ کے کاغذات پر دستخط کرنا شروع کیے۔

ہر دستخط گویا فرشتے کی رہنمائی میں بے عیب انداز میں ہو رہا تھا۔ جتوئی کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو چکا تھا اور خالدہ کو صوفے پر بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔

ایمان نے اپنے دستخط مکمل کیے اور کاغذات حاشر کے حوالے کیے۔ حاشر نے ایک مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

۔ ”آج میں ایک بوجھ سے آزاد ہو گیا ہوں۔“

اس کے الفاظ کمرے میں مقدس فضا کا احساس پیدا کر رہے تھے، گویا ماضی کے تمام بوجھ ہٹا دیے گئے ہوں اور ایک نیا باب کھل چکا ہو۔

حاشر نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کیے، فائل سنبھالی اور باوقار انداز میں قدم آگے بڑھاتے ہوئے کمرے سے نکلنے لگا۔ ایمان، جتوئی اور خالدہ کی بے چینی پر ایک معنی خیز مسکراہٹ لیے بیٹھی رہی، گویا اس سارے منظر کا کوئی اثر اس پر نہیں ہو رہا تھا۔

جیسے ہی حاشر گیٹ کی طرف بڑھا، جتوئی، اپنی بے چینی اور اضطراب میں، اس کے پیچھے لپکا۔ خالدہ نے، اپنے ہاتھ کو بے اختیار اپنے سر پر رکھتے ہوئے، نشست میں مزید گہرائی اختیار کر لی، جیسے اس کے اعصاب اب مزید بوجھ سہارنے کے قابل نہ ہوں۔

حاشر قدم آگے بڑھاتا ہوا گیٹ کے قریب پہنچا، جب پیچھے سے جتوئی کی تیز، بے قابو آواز بلند ہوئی۔ ”حاشر، رکو!“۔

حاشر نے بظاہر پرسکون انداز میں پلٹ کر جتوئی کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سکون تھا۔ جتوئی، جواب اپنے غصے پر قابو پانے کی جدوجہد کر رہا تھا، بولا،۔ ”یہ کیا کیا تم نے؟“۔

حاشر نے ہلکے سے کندھے اچکائے اور بے لچک لہجے میں کہا،

۔ ”جو ضروری تھا، وہ ہی کیا ہے۔“۔

یہ مختصر سا جواب جتوئی کی بے چینی کو مزید بھڑکا گیا۔

- ”تم نے یہ کیوں کیا؟“ -

جتوئی کے الفاظ غصے کی شدت سے کانپنے لگے، جیسے اس کا صبر اب جواب دے۔ چکا ہو۔ مگر حاشر کی نگاہیں اٹل اور پرسکون رہیں۔

- ”یہ تمہاری ماں کی امانت تھی،“ -

حاشر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

- ”اور میں اس امانت کو دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔“ -

حاشر کے آخری جملے نے جیسے ہر سوال کا جواب دے دیا۔ وہ اپنی فائل تھامے ہوئے گیٹ کی طرف مڑ گیا۔ گارڈ نے خاموشی سے دروازہ کھولا، اور حاشر بے آواز قدموں سے باہر نکل گیا۔

جتوئی وہیں کھڑا تھا، مایوسی اور غصے کی آمیزش میں، آنکھوں میں حشر کے دور ہوتے ہوئے نقش کو دیکھتا رہا۔ گیٹ بند ہوتے ہی اس کی امید کی آخری کرن بھی مدھم ہو گئی۔ فضا میں تناؤ کی شدت کے باوجود، باغ کے قریب گلابوں کا ایک جھرمٹ ہوا کی نرمی سے ہل رہا تھا، جیسے قدرت ایمان کی فتح کا جشن منا رہی ہو۔ ان گلابوں کے درمیان رنگ برنگی تتلیاں آزادانہ پرواز کر رہی تھیں، ان کی پرواز اس آزادی کی غماز تھی جسے ایمان نے ابھی ابھی حاصل کیا تھا۔

ایمان نے اپنی ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر زور سے عبور کرتے ہوئے ایک شان دار اور لا پرواہ انداز میں بیٹھنے کی کوشش کی، جیسے اس کے ارد گرد کی تمام تلخیاں اس کے کنٹرول میں ہوں۔

اس کی گردن غرور سے تن گئی اور جب جتوئی داخلی دروازے پر نمودار ہوا، اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ، زہر بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

۔ ”واہ، آپ تو بڑے جلد باز ہیں جتوئی چالباز!“۔

اس کی آواز میں ہلکی سی ہنسی اور زہر کا آمیزہ تھا۔ مصنوعی شائستگی میں لپٹا یہ جملہ، ہر حرف کے ساتھ جتوئی کی طرف جھپٹا۔

وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چبھتی ہوئی نظروں سے پورے ماحول کا جائزہ لے رہی تھی، جیسے ہر چیز اس کے غصے کی شدت کو بڑھا رہی ہو۔

۔ ”میرا پیسہ کھا کر اور میری جائیداد میں دندناتے پھر رہے ہو، ہاں؟“۔

ایمان کی باتوں میں اب کھلم کھلا تلخی اور نفرت نمایاں ہو گئی تھی۔ اس کے الفاظ تلوار کی طرح جتوئی کے سامنے چمک رہے تھے، جیسے وہ اس پر وار کرنے ہی والی ہو۔ ”اپنی ہی ملکیت میں، میں نے کیا کچھ برداشت نہیں کیا؟ مار کھائی، ذلت سہی... سب کچھ!“۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، اس کے لہجے میں ناقابلِ برداشت زہر بھرا ہوا تھا۔ ”مجھے بار بار مارا گیا، کچلا گیا، لیکن اب؟“۔

ایمان دھیرے دھیرے جتوئی کے قریب آئی، اس کی نظروں میں بے پناہ نفرت اور غصے کی شدت واضح تھی۔ اس کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ چھائی رہی، جیسے وہ ہر جملے سے جتوئی کے وقار کو مٹی میں ملا رہی ہو۔

۔ ”واہ واہ، جتوئی چال باز!“ اس نے تالی بجائی، جیسے کوئی بے حد مشہور کامیڈی دیکھ رہی ہو۔

۔ ”تمہاری چالاکی تو لو مڑی کی بھی ماں ہے۔ کمال کر دیا!“ اس کی آواز میں زہر اور تمسخر کا عجیب سا ملاپ تھا۔

جتوئی کے چہرے پر غصہ اور حیرت کے آثار تھے، لیکن وہ خاموش رہا، جیسے اس کے پاس کچھ کہنے کو نہیں تھا۔ خالدہ، جو ایمان کی پشت پر کھڑی ہوئی تھی، جیسے ہی ایمان کو حد سے آگے جاتے دیکھا، ایک چیخ نکلی، ”اے اے اے!“۔

لیکن ایمان نے ایک تیز نظر سے اسے خاموش کر دیا۔ خالدہ کا سارا غصہ ایک پل میں بکھر گیا، جیسے کوئی پھٹا ہوا غبارہ زمین پر گر جائے۔

جتوئی نے اب آخر کار بولنے کی جرات کی، اس کے ہاتھ دفاعی انداز میں سینے پر رکھے ہوئے تھے۔

۔ ”تم ان شیئرز کا کیا کرو گی، ایمان؟ تمہیں ان کا سر پیر کا کچھ پتہ بھی ہے؟“۔

اس کے لہجے میں طنز اور بے یقینی صاف جھلک رہی تھی۔

ایمان نے ایک زہر بھری مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا اور جتوئی کی طرف گھورتی رہی، اس کی آنکھوں میں چمکتا ہوا اعتماد تھا۔

۔ ”کیا خیال ہے؟“ اس نے سرد مہری سے کہا۔

۔ ”کیوں نہ میں ان شیئرز کو سڑک پر ڈال کر کوڑیوں کے دام بیچ دوں؟ کیا ہی زبردست طریقہ ہو گا تمہارے غرور کو توڑنے کا!“۔

اس کی آواز میں تمسخر بھرا ہوا تھا، جیسے وہ جتوئی کو آخری دھکا دینے کے لیے تیار ہو۔

جتوئی کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا، جیسے اس نے ایمان کی قوت کو پہلی بار واقعی محسوس کیا ہو۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لڑکی، جسے وہ ہمیشہ کمزور اور بے وقوف سمجھتا آیا تھا، اچانک اتنی خطرناک اور چالاک کیسے ہو گئی؟ ایمان نے ایک آخری، گہری نظر اس پر ڈالی، اور دھیرے سے سر جھکاتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولی، ”آپ کی یہ مسکراہٹ کہاں گئی، جتوئی صاحب؟ چلو، میری دادی کی خاطر، ایک بار مسکرا دو!“۔

ایمان دھیرے دھیرے جتوئی کے قریب پہنچی، اس کی نظریں غصے سے شعلہ زن تھیں اور وہ جتوئی کی آنکھوں میں گہرائی سے جھانک رہی تھی، جیسے وہ اس کے اندر چھپے ہر خوف اور بے بسی کو ننگا کرنا چاہتی ہو۔۔۔

۔ ”تمہیں اس جائیداد کی جتنی ضرورت ہے، نا؟“۔

ایمان نے اپنے لہجے میں زہر گھولتے ہوئے کہا، اس کی آواز تیز اور کاٹ دار تھی۔ ”تو سن لو، میری بھی اپنی ضروریات ہیں۔“۔

اس کے الفاظ میں ایک عجیب طنز تھا، جیسے وہ جتوئی کے چہرے پر چھپی ہر بے یقینی کا مذاق اڑا رہی ہو۔

۔ ”ہاں، تم سمجھتے ہو کہ ہم ایک دوسرے کے مخالف ہیں، لیکن یہ پر اپرٹی؟“۔ ایمان نے ایک مصنوعی مسکراہٹ سے اپنے ہونٹوں کو جھکا لیا، جیسے وہ اس پوری صورتحال سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ ”یہ ہمیں باندھے ہوئے ہے، جیسے شکار اور شکاری، جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے مجبور ہیں، چاہے تم مانوں یا نہ مانوں!“۔

وہ ایک قدم اور آگے بڑھی، اور بڑے اعتماد سے جتوئی کی ٹائی کو ہاتھ لگاتے ہوئے، جیسے اسے اس کے اپنے ہی کھیل میں پھنسا رہی ہو، ”تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ بالواسطہ، ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے!“۔

اس نے ایک ناپسندیدہ قہقہہ لگایا، جیسے وہ جتوئی کے ہر سوال کا جواب پہلے ہی دے چکی ہو، اور اس کی ٹائی ٹھیک کرنے والے ہاتھ کو آہستہ سے جھٹک دیا۔

۔ ”یہ بات سمجھ لو، جتوئی،“ اس نے ایک آخری تنبیہ کی جیسے وہ کوئی حتمی فیصلہ سنار ہی ہو،

۔ ”یہ سب کھیل تمہارے حساب سے نہیں چلے گا۔ اب تمہیں میری شرائط پر آگے بڑھنا ہو گا۔“

پھر اس نے ایک تقریباً وحشی انداز میں کندھے جھٹکے، جیسے وہ اپنی ہی فتح کی گواہی دے رہی ہو۔ ”چلتی ہوں،“ ایمان نے بے نیازی سے کہا، لیکن اس کے انداز میں ایک شدید طوفان چھپا ہوا تھا۔

جب وہ کمرے سے نکلی تو فضا میں تناؤ کی بھاری لہر چھا گئی۔ جتوئی خاموش کھڑا رہا، جیسے وہ جان گیا ہو کہ یہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی، بلکہ ابھی تو شروع ہوئی ہے، اور اب میدان میں طاقت کا توازن بدل چکا تھا۔

ایمان گیٹ پار کرتے ہی سامنے کھڑی عورت کی نگاہوں میں آگئی۔ وہ سوسائٹی پ کی خوش پوش عورت تھی، جو کہ ریشمی جھالروالے لباس میں ملبوس، بال نہایت نفاست سے سنوارے ہوئے اور قیمتی زیورات میں جھلک رہی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ایمان پر تجسس اور ہمدردی کی ملی جلی نظر ڈالے ہوئے تھی۔ پھر اچانک، ایک چھوٹی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی، ”ایمان!“

ایمان، پہلے تو اس کی طرف دیکھے بغیر اپنی ہی سوچوں میں گم آگے بڑھتی رہی، پھر رک کر آنکھیں
سکیڑتے ہوئے اُس کی جانب مڑی۔

اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

۔ ”اوہ، صباحت صاحبہ۔“

ایمان نے مزاحیہ انداز میں اُس کا نام لیا، لہجہ بظاہر احترام کا، لیکن اندر ایک گہرا طنز چھپا ہوا تھا۔

صباح نے سر سے پاؤں تک ایمان کا جائزہ لیا، جیسے اُس کے لباس اور شخصیت کی قیمت لگا رہی ہو۔ اُس کی
مسکراہٹ میں چھپا طنز بھی نمایاں تھا۔

۔ ”ارے ایمان، لگتا ہے قد کچھ چھوٹا ہو گیا ہے؟“

۔ صباحت نے لا پرواہی سے تبصرہ کیا، لہجے میں ہمدردی کا جھوٹا رنگ ڈال کر۔

۔ ”اور یہ کیا؟ بال بھی کہاں گئے؟ کوئی نیا فیشن چل رہا ہے کیا؟ اب بھلا اس حالت میں کون تم سے شادی
کرے گا؟“

ایمان کے چہرے پر ایک تیز، نوکیلی مسکراہٹ ابھری۔ اس کے جواب میں سفاکی اور اعتماد کا رنگ نمایاں
تھا۔

۔ ”آئی، چھوٹے قد کی لڑکیاں اکثر زیادہ پسند کی جاتی ہیں،۔“

اس نے کاٹ دار لہجے میں جواب دیا، اُس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی شرارت مزید تیز ہو گئی۔

۔ ”لیکن وہ جن کے خیالات اتنے چھوٹے ہوں جتنے آپ کے؟ وہ بس اپنی ہی بد قسمتی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور جہاں تک بالوں کی بات ہے تو انسان کی عقل بڑی ہونی چاہیے بال تو ڈانٹوں کے بھی لمبے ہوتے ہیں!“

یہ جملے ادا کرنے کے بعد، ایمان نے بے نیازی سے اُس کی طرف سے رخ موڑا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ صباحت وہیں کھڑی رہ گئی، اپنے ہی طنز کے دائرے میں الجھتی ہوئی، جبکہ ایمان اُس لمحے کی فتح کے ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ اُس نے اس مکالمے میں اپنی ذہانت اور عزم کا ایسا ثبوت دیا جو کسی بھی فیصلے اور طنز کے وار کو بڑی مہارت سے پلٹ کر مارنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

...°...

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

”جس نے مسلمانوں کے کسی یتیم بچے کے کھانے پینے کی ذمہ داری لی، اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل

فرمائے گا (جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، حدیث نمبر 1917)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

۔ جو شخص یتیم بچے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرے اور یہ کام محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کرے تو جتنے بال اس کے ہاتھ کے نیچے آئیں گے، ہر بال کے عوض میں اسے نیکی ملے گی (مسند احمد، حدیث نمبر 7576)۔

--

ہلچل سے بھرے بلیو ایریا کے بچوں بیچ، جہاں اسلام آباد کی رفتار کبھی مدھم نہیں پڑتی تھی، ایمان ہجوم میں تنہا چل رہی تھی۔ وہ ابھی فقط چودہ سال کی ایک لڑکی تھی، جس کے قدم ابھی زندگی کی پُر پیچ راہوں پر بھٹک رہے تھے۔

اچانک، ایک منظر نے اسے ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔ اُس کا دل جیسے کسی نامعلوم احساس سے جھنجھلا گیا۔ ایک ریسٹوران کے سامنے، ایک تکلیف دہ صورتِ حال اس کی آنکھوں کے سامنے واضح ہوئی۔ پھٹے حال بچوں کا ایک گروہ سڑک کے کنارے دھکیلا جا رہا تھا۔ اُن کے کمزور جسموں پر پھٹے کپڑے اور اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔

سب سے بڑا بچہ دس سال کا لگتا تھا، اُس کے ساتھ ایک آٹھ سالہ لڑکی اور ایک چھوٹا سا چار سالہ بچہ تھا، جو ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے اپنے دکھ کو بانٹ رہے تھے۔

ایمان حیران تھی کہ لوگ اتنے سنگدل کیسے ہو سکتے ہیں۔ کیا دنیا میں اتنی بے رحمی واقعی موجود ہے؟ اُس کے دل میں غصے کی ایک لہر اٹھی، لیکن یہ غصہ بے قابو نہیں تھا، بلکہ ہمدردی کی ایک نہ ختم ہونے والی گہرائی سے پیدا ہوا تھا۔

۔ ”اللہ انسان کو جتنا زیادہ دیتا ہے، اتنا ہی وہ مزید طلبگار بن جاتا ہے،“۔

ایمان نے اپنے دل میں خاموشی سے کہا، اُس کے الفاظ میں ہمدردی کے ساتھ ایک تلخی بھی شامل تھی۔

وہ تینوں بچے اب ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے، زندگی کی سختیوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے، آنکھوں میں آنسو، اور دل میں بے بسی۔ ایمان کی نگاہ ان کی طرف مرکوز تھی۔ اُس لمحے میں، شہر کی بے قابو رفتار جیسے رک سی گئی ہو۔ یہ منظر اُس کے دل پر چھا گیا تھا، اور وہ خود کو اس درد میں گھرا محسوس کرنے لگی۔

ایک اجنبی، جو اس ہجوم کا حصہ تھا، اُن بھوک سے نڈھال بچوں کے سامنے کھانا رکھ گیا۔ اُن بچوں کی آنکھوں میں حیرت اور شکرگزاری کے سائے تیرنے لگے۔ ایمان کی آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری۔ وہ اجنبی ایمان تھی، جس کے لہجے میں ایک نرمی کے ساتھ ساتھ چھپی ہوئی سختی بھی تھی۔ اُس نے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا، ”تم چوری کیوں کر رہے تھے؟“۔

دس سالہ لڑکے نے تیزی سے اپنے آنسو پونچھے اور کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا، ”بابی، ہم چوری نہیں کر رہے تھے، ہم بھوکے مر رہے تھے۔“۔

اس کے الفاظ میں ایک دکھ اور عاجزی چھپی ہوئی تھی، جیسے وہ اپنی حالت کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُس نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی طرف دیکھا اور بولا، ”ہم بھوک برداشت کر لیتے، لیکن ہمارا چھوٹا بھائی...“ وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔

ایمان کے دل میں ایک گہری لہر دوڑ گئی۔ اس نے بچوں کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ غصہ جو اُس کے دل میں اُبال کھا رہا تھا، اب ہمدردی اور شفقت میں بدل گیا تھا۔ اس لمحے میں، وہ بچوں کی حالت زار کو نہ صرف سمجھ رہی تھی، بلکہ اس کے اندر ایک نئی سوچ جاگ اٹھی تھی۔

اس نے اس چھوٹے سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیچھے ہوتے اس بچے کو بولی۔

۔ ”تمہارے والدین کہاں ہیں؟“

ایمان نے نرمی سے پوچھا، جیسے وہ ان کی کہانی کا کوئی اور پہلو جاننا چاہتی ہو۔ لڑکے نے آنسو بھری آنکھوں سے جواب دیا۔

۔ ”وہ مر چکے ہیں۔“

یہ الفاظ، سادہ لیکن بے پناہ وزن لیے ہوئے، ایمان کے دل میں گہرائی تک اتر گئے۔ اُس کا دل ان بچوں کے لیے نرم ہو گیا، جو دنیا کی سختیوں کے درمیان ایک دوسرے کے سہارے جی رہے تھے۔ ایمان نے زندگی کے اس دردناک پہلو کو دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ شاید پہلی بار والدین کا ہونا کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے، اور جو اس نعمت سے محروم ہو، اُس کے دل میں کتنی شدید تڑپ ہوتی ہے۔

ایمان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کے دل میں محبت اور شفقت کی لہریں بیدار ہوئیں جب اُس نے چار سالہ بچے کو کھانا کھاتے دیکھا۔ اُس بچے کے معصوم چہرے پر بھوک کا اثر نمایاں تھا، اور ہر نوالہ جیسے اُس کے لیے زندگی کا ایک نیا لمحہ تھا۔

لیکن اچانک، لڑکا چاول کے ایک نوالے پر دم گھٹتے ہوئے رک گیا۔ اُس کا چہرہ تکلیف میں بدل گیا، اور وہ سانس لینے کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ ایمان فوراً حرکت میں آئی، جلدی سے پانی کی بوتل پکڑ کر اُس کے سامنے رکھی۔ بچے نے پانی پیا، کھانتے ہوئے اور سانس درست کرتے ہوئے، یہاں تک کہ آخر کار اُس نے چاول کا نوالہ نگل لیا۔

دس سالہ بچہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا، اور اُس کی کمزور سی آواز سے ایک شکریہ نکلا، ”الحمد للہ۔“

ایمان نے حیرانی سے بچے کو دیکھا، ”یہ کیا تھا؟“

لڑکے نے ایمان کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں گہرا شکر تھا۔

”اللہ نے ہماری سن لی، اور آپ کو بھیجا۔“

ایمان مسکرائی، اور ہلکے سے بولی، ”چلو، اب تمہیں کسی جگہ لے چلتے ہیں جہاں تمہارا خیال رکھا جاسکے۔“

...°...

ایمان نے خود کو ایک گہما گہمی سے بھرپور پارک میں پایا، جہاں بچوں کی قہقہوں اور کھیل کی رونق، ساتھ ہی ساتھ خاندانوں کے قیمتی لمحوں کو محفوظ کرنے والے کیمروں کی وقفہ وقفہ سے کھینچنے والی تصویروں کی آوازیں، ہر طرف گونج رہی تھیں۔ اُس کے ارد گرد کے مناظر میں کبھی کبھی اجنبیوں کی ناگواری بھری نظریں بھی گھلتی تھیں۔

وہ سرسبز گھاس پر ایک چھتری نما جھونپڑی تلے بیٹھے تھے، جو دیو ہیکل درختوں کی پناہ میں ایک میز اور چند کرسیاں لیے ہوئے تھی۔ میز کے ایک طرف تین بچوں کے چہروں پر، جیسے ہی وہ وہاں بیٹھے تھے، ایڈونچر کی چمک نمایاں تھی۔

مونیزا ایمان کے سامنے بیٹھا تھا، اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی جو اُس کے اندرونی خیالات کی عکاس تھی۔ ”پہلے تو میں نے سوچا، منع کر دوں، لیکن جب تم نے یہ کہا کہ میں اس کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتی ہوں تو خود کو روک نہ سکی۔“

ایمان نے اُس کی طرف جھکتے ہوئے ایک چمکدار مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”مونیزا، تم تو واقعی اس فن میں ماہر ہو، جواب نہیں تمہارا!“

اُس کی آواز میں خوشی کی روشنی تھی، اور مونیزا، تھوڑی عاجزی اور فخر کے ساتھ، بولا، ”ارے! دماغ تو تمہارا ہے، میں تو بس چال چلار ہی ہوں۔“

پارک کے ہنگامے کے بیچ، زندگی کے شور میں، ایمان اور مویز نے اپنی دوستی کے نکتے پر خوشی کا لمحہ شیر کیا، جیسے ان کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ طے پا گیا ہو جو ان کے آگے کے امکانات کو سنسنی خیز بنا رہا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، مویز نے ان تین یتیم بچوں کے لیے امریکن آر فن ہاؤس میں جگہ محفوظ کروالی، ایمان ان کے مستقبل کی پیچیدہ تفصیلات سے لاعلم رہی۔ اسے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے ان بچوں کو کسی غیر مذہبی خاندان نے گود لیا ہو، اور ان کی اسلامی تربیت کو خطرہ لاحق ہو۔

مگر، قسمت کا عجیب رنگ یہ تھا کہ جس خاندان نے ان بچوں کو گود لیا تھا، وہ اپنے اندر ایک گہری تبدیلی سے گزرا۔ ان معصوم جانوں کی موجودگی نے ان کے دلوں میں محبت اور ایمان کی شمع روشن کر دی، اور بالآخر وہ خاندان اسلام قبول کر گیا۔

مویز کی زندگی میں، اس کے اعمال نے اُسے دنیاوی عزت، دولت اور شہرت عطا کی، اور وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے راستے پر گامزن ہو گیا۔

مگر ایمان کے لیے، کچھ گہرا اور معنوی وقوع پذیر ہو رہا تھا، جسے وہ اُس وقت پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ وہ آہستہ آہستہ روحانی دولت جمع کر رہی تھی، وہ دولت جو زندگی کی مشکل راہوں پر اُس کا سہارا بنے گی۔

اپنے تلخ ماضی کے باوجود، ایمان نے ہمیشہ شراب اور دیگر برائیوں سے خود کو دور رکھا تھا۔ تاہم، اسے سگریٹ اور کبھی کبھار شیشہ میں سکون ملتا تھا۔ اسلام کے متعلق اُس کی معلومات محدود تھیں، اور اُس کے دل میں انسانیت، خاص طور پر اپنے۔ والدین کے خلاف ناراضگی کا عنصر گہرا تھا

ایمان کا سفر ایک عجیب موڑ پر تھا، جہاں اسے اپنی بڑھتی ہوئی روحانی دولت کا ادراک نہ تھا۔ وہ ایک ایسے راستے پر قدم رکھ رہی تھی جس کی نہ اس نے کبھی پیش گوئی کی تھی اور نہ ہی سمجھا تھا۔ اُس کا یہ سفر، اُس کے اندرونی خالی پن اور غم کو پورا کرنے والا تھا، ایک ایسا راستہ جو اُس کی زندگی میں ایک غیر متوقع انقلاب کا سبب بنے گا۔

...°...

امروز

اٹھارہ سالہ ایمان کی داستانِ حیات و کائنات

ایمان نے آج احتیاط سے اپنا لباس چنا، گویا یہ اس کے اگلے سفر کی تیاری کا ایک لازمی حصہ تھا۔ کل کے مقابلے میں آج کا لباس زیادہ نفیس تھا۔ اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد سیاہ شرٹ کا انتخاب کیا، جس کے اوپر چاندی کے موتیوں سے مکی ماؤس کی تصویر تھی، ایک ایسی تصویر جو معمولی لباس میں بھی ایک چنچل مگر معنی خیز عنصر شامل کر رہی تھی۔

ڈینم جیکٹ، جس کی آستینوں کو اس نے نفاست سے موڑ رکھا تھا، ایک فیشن ایبل انداز میں اس کے مجموعی لباس کو مزید دلکش بنا رہی تھی۔

سیاہ ڈینم کی پتلون، جس کے حاشیے اس نے مخصوص توجہ سے سیاہ کیے تھے، ایک ایسا توازن پیش کر رہی تھی جس میں راحت اور طرز کا امتزاج تھا۔ اس کے سیاہ جوتے، ایڑیوں کے ساتھ، اس کی شخصیت میں نفاست اور قوت کا تاثر دے رہے تھے۔

بالوں کی مخصوص وِگ، جس کے لمبے، سلکی تاللات ہوا میں بہہ رہے تھے، محض ایک فیشن نہیں تھا بلکہ ایک بیان تھا، جو اس کی موجودگی کو زیادہ نمایاں کر رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے گھر کا گیٹ بند کیا، رات کی ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے پر ہلکی سی چپک پیدا کر رہی تھی، اور اس کے سیاہ کرسٹل کی بالیاں نرم سی آواز کے ساتھ اس کے ہر قدم کے ساتھ ہلکی جھنکار پیدا کر رہی تھیں۔

اس کے دل میں ارادے مضبوط اور عزم بے شک وشبہ تھے۔

اندھیرے کی خاموشی میں، جب ایمان اکیلے فٹ پاتھ پر چل رہی تھی، ستاروں کی مدھم روشنی اسے آسمان کی کسی پراسرار حقیقت کا پیغام دیتی نظر آئی۔

اس کے قدموں کی آہٹ مدھم اور بے وزن لگ رہی تھی کہ اچانک ایک کتا سامنے آگیا۔ ابتدائی جھجک میں، ایمان نے نیچے جھک کر ایک پتھر اٹھایا، ارادے میں سختی اور آنکھوں میں خوف تھا۔

مگر پھر، جیسے کسی نادیدہ قوت نے مداخلت کی، ایک آواز نے اسے رکنے پر مجبور کیا۔ ”رک جاؤ، ایسا مت کرو۔“

یہ الفاظ کسی غیر مرئی نرمی کے ساتھ اس کے کانوں میں گونجے، جیسے وہ نہ صرف سن رہی ہو بلکہ محسوس بھی کر رہی ہو۔ اس کا ہاتھ جو ہوا میں بلند تھا، ہچکچاہٹ کے ساتھ نیچے آگیا۔

یہ آواز، جو عقل اور محبت کا آمیزہ تھی، اس کے اندر گہرائی تک اتر گئی۔ اُس نے کبھی ایسی آواز نہیں سنی تھی، جیسے کوئی آسمانی موسیقی اس کے اعمال کی رہنمائی کر رہی ہو۔

ایمان نے جب آواز کی سمت میں مڑ کر دیکھا، تو ایک بزرگ شخص سامنے کھڑا تھا، جو ایک سادہ سفید لباس میں ملبوس تھا، جس نے سر کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک نورانی چمک تھی، جو معمولی انسانی حدود سے بالاتر معلوم ہو رہی تھی۔ ایمان کی آنکھوں میں حیرت اور دل میں سکون کی ایک لہر دوڑ گئی۔

یہ وہ ہی بزرگ تھے جو کل سحری کے وقت اللہ کی حمد بیان کر رہے تھے۔

ان کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایک نہایت سکون بخش روشنی تھی۔ اس لمحے میں، ایمان نے خود کو کسی الہی ہستی کے سامنے پایا، جیسے کوئی پراسرار نور اس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو رہا ہو۔

ایمان کے ہونٹوں سے بے اختیار الفاظ نکلے، ”مجھے کتوں سے خوف آتا ہے۔“ اس کی آواز میں ایک معصومیت اور جھجک تھی۔

بزرگ نے نرمی سے کہا، ”مخلوق سے مت ڈرو، خالق سے ڈرو۔“

یہ سن کر ایمان کی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، لیکن اس کے دل میں سوالات کا ایک سمندر اُٹھا۔ ”میں اللہ سے کیوں ڈروں؟ جنت کی چابی مل جائے تو خود کو ختم کر لوں گی۔“

یہ الفاظ ہنسی میں چھپے طنز کا عکس تھے، لیکن ان میں ایک گہری اذیت بھی شامل تھی۔ بزرگ نے اُسی نرمی اور اطمینان کے ساتھ جواب دیا، ”اللہ کا خوف تمہیں گناہوں سے روکتا ہے۔“

یہ الفاظ رات کی خاموشی میں گونجنے لگے، جیسے کوئی الہامی پیغام دل کی گہرائیوں میں اتر رہا ہو۔ ایمان نے سوالیہ نظروں سے بزرگ کی طرف دیکھا، ”کیا خود کو مارنا گناہ ہے؟“

بزرگ نے سکون سے جواب دیا، ”بلاشبہ ایسا ہی ہے۔“

ایمان نے گہری سانس لی اور ہچکچاہٹ سے بولی، ”اور اگر جینے کا دل ہی نہ ہو؟“

بزرگ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی، ”اگر تم اپنا حساب پورا کیے بغیر مرو گے، تو کیا تمہیں لگتا ہے کہ تم بچ جاؤ گی؟“

ایمان کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ ”حساب؟ کس حساب کی بات کر رہے ہیں؟“

بزرگ نے نرمی سے کہا، ”یہ جسم، یہ روح، اللہ کی امانت ہیں۔ اگر تم اس امانت سے خیانت کرو گے، اس کو ضائع کرو گے، تو کیا تمہیں نہیں لگتا کہ اللہ تم سے اس کا سوال کرے گا؟“

ایمان نے نا سمجھی کے عالم میں کہا، ”مجھے سمجھ نہیں آرہی، سب کچھ بتائیں۔“۔

بزرگ نے فٹ پاتھ پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا، ”سب کچھ بتاؤں گا، مگر ایک ایک کر کے۔ تمہیں وقت دینا ہو گا اس سب کو سمجھنے کے لیے۔“۔

ایمان نے ان کے اشارے پر وہیں ان کے برابر بیٹھ کر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا، ”مجھے تو اسلام کے ’الف‘ کا بھی نہیں پتہ۔ جتنا معاملہ مجھے سادہ لگ رہا ہے اتنا نہیں ہے ہیں نا۔“۔

بزرگ نے مسکرا کر کہا، ”معاملہ سیدھا ہے، مشکل تو نفس بناتا ہے۔“۔

ایمان نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا، ”کیسے؟“۔

بزرگ نے سکون سے جواب دیا، ”یہ ہی تو سمجھانا ہے۔ آگے سنو، اور دل سے سمجھو۔“۔

ان بزرگ نے قرآن کی آیات اردو ترجمہ میں پڑھیں، جس میں اللہ کا خوف دلایا گیا، کہ اس سے ویسے ڈرو جیسے اس کا حق ہے۔

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تمہیں موت مسلمان ہونے کی حالت میں ہی آئے۔ (سورۃ آل عمران: ۱۰۲)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن سے بچو، جب نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے کام آسکے گا، اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ (سورۃ لقمان: ۳۳)

قرآنی آیات جیسے سماعت میں گونجتی گئیں، ایمان کے چہرے کے تاثرات بدلتے گئے، جیسے کسی گہری حقیقت کا پردہ اٹھ رہا ہو۔۔

اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ جب بھی اس نے کوئی غلط قدم اٹھانے کا سوچا، قرآن کی یہ آیات ہمیشہ اسے روکتی رہیں۔ اس کے دل میں یہ شعور ابھر آیا کہ قرآن کا پیغام محض عربی تک محدود نہیں، بلکہ ہر زبان میں موجود ہے۔

- ”یہ کیسا کلام ہے؟“ -

ایمان نے خود سے کہا،۔

- ”کچھ بہت ہی مختلف، بہت الگ۔“ -

اس نے اپنے برابر بیٹھے بزرگ کو دیکھا اور بھری ہوئی آواز میں بولی، ”جب بھی میں کچھ غلط کرنے کا سوچتی تھی، یہ کلام میرے کانوں میں گونجتا اور میں فوراً رک جاتی تھی۔“ -

بزرگ مسکراتے ہوئے بولے، ”یعنی، اللہ نے تمہیں کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑا، نیچی۔“ -

ایمان نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا، ”کیا مطلب؟“ -

بزرگ نے نرمی سے جواب دیا، ”یہ اللہ کا کلام ہے، جسے قرآن کہتے ہیں۔ یہ الفاظ مختلف اور منفرد ہیں، کیوں کہ یہ وہ ہی ہدایت ہے جو اللہ نے ہم پر نازل کی ہے، ہماری رہنمائی کے لیے۔“

ایمان نے ایک لمحے کو غور کیا، اور دل کی گہرائیوں میں ایک سکون محسوس ہوا۔

--

ایمان نے اپنی پیشانی خم کر دی، مگر اندر کا خلجان اور تشویش ابھی تک باقی تھی۔۔۔ ”لیکن اس سب کا اصل مفہوم کیا ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

بزرگ نے نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا،۔

۔۔۔ ”یہ کلمات جو تم سنتی ہو، قرآن کی آیات ہیں۔ یہ رہنمائی کا منبع ہیں، اندھیروں میں روشنی کا مینار ہیں، اور ان میں سکون اور طاقت ہے۔ یہ کلام اللہ نے ہمارے لئے اتارا تا کہ ہمیں دنیا کی فریبوں سے بچا سکے اور آخرت کی راہوں پر چلا سکے۔“

ان الفاظ نے ایمان کے دل پر ایک گہری چوٹ کی طرح اثر کیا، جیسے کوئی بھولا ہوا راز اس پر آشکار ہو گیا ہو۔

اس کی آنکھوں میں بے تحاشا آنسو بھر آئے، اور وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپالیا، اس کی آپہیں اس کے ماضی کی لغزشوں اور غلطیوں کا بوجھ اٹھا رہی تھیں۔

۔ ”مجھے یقین تھا کہ اللہ نے مجھے چھوڑ دیا ہے،“ اس نے مدہم آواز میں کہا،۔

۔ ”لیکن اگر میں نے قرآن کو پڑھا ہوتا تو جان جاتی کہ اللہ نے مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا۔“

بزرگ نے شفقت بھرے لہجے میں کہا، ”یہ قرآن کا معجزہ ہے، جو تمہارے دل کی زبان میں بھی بات کرتا ہے۔ اللہ نے اسے نہ صرف عربی میں، بلکہ دنیا کی ہر زبان میں سمجھنے کے لئے آسان کر دیا ہے۔“

ایمان نے بے اختیار حیرانی سے سر اٹھایا، ”مگر مجھے تو عربی آتی ہی نہیں، یہ کلام میرے لئے کیسے رہنمائی کر رہا تھا؟“

بزرگ نے نرمی سے کہا، ”اللہ نے عربی کو اپنے آخری نبی کے لئے منتخب کیا، لیکن اس کی حکمتیں اور پیغامات ہر زبان میں منتقل ہو چکے ہیں۔ چاہے تم اردو پڑھو، فارسی، انگریزی یا کوئی اور زبان، قرآن کا پیغام ہر دل تک پہنچنے والا ہے۔“

اس لمحے، ایمان کو یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ قرآن کا پیغام آفاقی ہے، اور یہ دنیا بھر کے انسانوں کی رہنمائی کے لئے نازل ہوا ہے، چاہے ان کی مادری زبان کچھ بھی ہو۔

اس کے دل میں ایک نیا مقصد اور امید پیدا ہوئی، جیسے وہ اب اس مقدس کلام کی گہرائیوں میں جانے کے لئے بے تاب ہو۔ وہ جان چکی تھی کہ یہ کتاب زندگی کے ہر موڑ پر اس کے لئے روشنی کا منبع ہوگی۔

ایمان کے دل پر اللہ کے خوف کا احساس گہرا ہوتا گیا۔ اس کی نگاہ بزرگ کی طرف مرکوز رہی جب اس نے ایک لرزتی آواز میں سوال کیا،

۔ ”کیا میرا رات کو کلب جانا بھی اللہ کی راہ سے بھٹکنے کے مترادف ہے؟“۔

بزرگ کے ہونٹوں پر ایک دھیمی مسکراہٹ ابھری۔ انہوں نے نرمی سے کہا،۔

۔ ”رمضان المبارک میں جب ہم اللہ کی قربت اور توبہ کی طرف مائل ہوتے ہیں، تب ہمیں اپنے اعمال کے بارے میں زیادہ حساس ہونا پڑتا ہے۔ یہ کلب جانا، یا کوئی بھی ایسا عمل جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہو، بھٹکنے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھو، توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ اللہ اپنی رحمت سے ہر گناہ کو ایسے مٹا دیتا ہے جیسے وہ کبھی ہوا ہی نہ ہو۔“۔

ایمان نے معصومیت بھرے لہجے میں کہا، ”مگر رمضان میں تو شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے، تو پھر مجھے کیسے پتہ چلے کہ میرے اعمال گناہ گار ہیں؟“۔

بزرگ نے اسے دانشمندانہ نظروں سے دیکھا اور کہا،۔

- ”شیطان کے قید ہونے کے باوجود، ہمارے اپنے نفس کے وسوسے ہمیں گناہ کی طرف لے جاسکتے ہیں۔
لیکن جب تمہیں اللہ کی ہدایت کا علم ہوگا، تو تم ان وسوسوں کو پہچان سکو گے۔“

ایمان نے یہ سن کر اپنی آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے کہا۔

-، ”میں تو بہت سی باتوں سے بے خبر تھی، مجھے اب آپ سے سب کچھ معلوم ہو رہا ہے۔“

یہ ہی وہ لمحہ تھا جب ایمان نے اپنے اندر کے بوجھ اور پچھتاوے کو پہچان لیا۔

ایمان، متجسس اور شعور کی گہرائیوں میں جھانکتی ہوئی، بزرگ کی طرف متوجہ ہو کر گویا ہوئی، ”یہ ‘نفس’ کیا ہے، جس کا آپ بار بار ذکر کر رہے ہیں؟ کیا یہ وہی ہے جو ہمیں گناہوں کی طرف مائل کرتا ہے؟“

بزرگ نے اپنے چہرے پر حکمت کے نور کے ساتھ سکونت اختیار کرتے ہوئے بیان کا آغاز کیا، ”‘نفس’ وہ داخلی وجود ہے جو انسان کے اندر ایک مستقل قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے کہ عقل، قلب اور روح کی اپنی حقیقتیں ہیں، ویسے ہی ‘نفس’ بھی انسان کی جبلت اور جذباتی کیفیت کا مرکز ہے۔“

انہوں نے گہرے لہجے میں مزید وضاحت کی، ”اللہ تعالیٰ نے ‘نفس’ کو سات مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے، جو انسانی کردار، مزاج، اور اعمال پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ‘نفسِ امارہ’ جو بدی کی طرف رغبت دلاتا ہے؛ ‘نفسِ لوامہ’ جو اپنے اعمال پر ملامت کرتا ہے؛ ‘نفسِ مطمئنہ’ جو اللہ کی رضا پر قانع ہوتا ہے۔ ہر نفس کی اپنی صفات اور درجات ہیں اور یہ انسان کی فطری خواہشات سے جڑا ہوا ہے۔“

انہوں نے مزید کہا، ”نفس چار بنیادی خواہشات کے زیرِ اثر ہے: اول، نگاہ، جو مٹی کی خشک فطرت سے منسلک ہے؛ دوم، بخل، جو مٹی کی سختی سے جنم لیتا ہے؛ سوم، شہوت، جو جسمانی تقاضوں سے وابستہ ہے؛ اور آخر میں، جہالت، جو مٹی کی ہر کیفیت کا نتیجہ ہے۔“

بزرگ نے تفصیل سے بات جاری رکھی۔

، ”انسان کے تمام اخلاق اور اعمال نفس کے دو بڑے اصولوں پر مبنی ہیں: ایک طرف غصہ اور جلد بازی، دوسری طرف لالچ اور خود غرضی۔ شیطان انسان کے نفس کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر اسے گمراہی کی راہوں پر لے جاتا ہے۔ وہ غصہ، حسد، بخل، تکبر اور دیگر ناپسندیدہ صفات کو بڑھاتا ہے تاکہ انسان اپنے راستے سے بھٹک جائے۔“

یہ سن کر ایمان کے چہرے پر حیرت کا رنگ نمایاں ہوا، اور اس نے گویا خود کلامی میں سوال کیا،۔

۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ نفس کو قابو میں لایا جائے؟“

بزرگ نے ایک نرم مسکان کے ساتھ جواب دیا،

۔“! اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے نفس کو تربیت دے کر اس پر قابو پاسکے۔ شیطان انسان کو اس کی خواہشات کے ذریعے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر انسان کے پاس توبہ اور اصلاح کا راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ نفس پر قابو پانا مشکل ہے، لیکن ناممکن نہیں۔”۔

بزرگ نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا، “اگر تم اپنے نفس کو قابو میں کر لو، تو تم شیطان کو بھی شکست دے دو گی۔ یہ ایک داخلی جنگ ہے، جس میں جیتنے والا وہ ہی ہے جو اپنے اندرونی وسوسوں پر غالب آ جائے۔ نیکی اور بدی کا انتخاب تمہارے اپنے اختیار میں ہے، اور یہ ہی تمہارے امتحان کا حصہ ہے۔”۔

ایمان نے بزرگ کے ہر لفظ کو اپنے دل میں اتار لیا۔ یہ اس کے لیے ایک روحانی انکشاف تھا، ایک ایسا لمحہ جو اس کے اندرونی تضادات کو سمجھنے اور اس کے روحانی سفر کو نئی روشنی دینے والا تھا۔

یہ احساس کہ نفس کی تربیت اور اصلاح ہی حقیقی کامیابی کی کنجی ہے، اس کے دل میں امید کی کرن بن کر چمکا۔

بزرگ کے الفاظ نے اس کے دل میں شعور کی گہرائیوں میں ایک انقلاب پیدا کیا، جیسے وہ اپنی فطرت کی حقیقتوں سے پہلی بار روشناس ہو رہی ہو۔ اس کا دل اب ان پیچیدہ حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے بے تاب تھا جو نفس کے گرد لپٹی ہوئی تھیں اور اس کے اندرونی سفر کو راستبازی کی جانب مائل کر رہی تھیں۔

- ”شیطان کیوں بھڑکاتا ہے؟“ -

ایمان نے سوال کیا۔۔

بزرگ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، جس میں عمر بھر کی دانش جھلک رہی تھی۔ ”نفرت،“ -

- انہوں نے نرم اور پرسکون لہجے میں کہا، ”ایک ایسی زہر آلود طاقت ہے جو لوگوں کو وہ کرنے پر مجبور کرتی ہے جو وہ کبھی اپنی مرضی سے نہیں کرتے۔“ -

پھر انہوں نے ایمان کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھا، جیسے اس کی روح کے اندر جھانک رہے ہوں۔ ”یہ غرور تھا،“ -

انہوں نے جاری رکھا، ”جس نے ایک جن، جو کبھی از ازیل کے نام سے جانا جاتا تھا، کو ابلیس و شیطان بنادیا اور اسے جنت سے نکال دیا گیا، جس میں وہ کبھی رہتا تھا۔“ -

ایمان نے پوری توجہ سے سنا، بوڑھے آدمی کی ہر بات اس کے دل میں اتر رہی تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ غرور ایک ایسا فریب ہے جو انسان کو اندھیروں کی طرف لے جاتا ہے۔ بوڑھے آدمی کے الفاظ ایک واضح پیغام تھے

- ”غرور کو کبھی اپنی زندگی کا رہنما نہ بننے دینا، کیوں کہ یہ ہی غرور تھا جس نے از ازیل کو ابلیس بنادیا۔“ -

جب رات نے اپنی چادر ان پر ڈال دی، بزرگ نے آدم اور حوا کی کہانی سنانی شروع کی، انسانیت کی پہلی تخلیق، اور جنت میں ان کی زندگی کے واقعات۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح وہ آزمائش کا شکار ہوئے اور پھر جنت سے نکالے گئے۔ ”یہ کہانی،“۔

بزرگ نے کہا، ”عاجزی، فرمانبرداری، اور انسانی فیصلوں کے نتائج کے بارے میں ایک اہم سبق ہے۔“۔ ایمان، فٹ ہاتھ پر بیٹھی، بوڑھے آدمی کے الفاظ کو گویا جذب کر رہی تھی، جیسے وہ اس حکمت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اُتار رہی ہو۔

پھر بوڑھے آدمی نے قرآن مجید کی سورۃ الحجر کی آیات تلاوت کیں

سورہ الحجر

26-43

اور ہم نے انسان کو کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا ہے ﴿۲۶﴾۔

اور جنوں کو اس سے بھی پہلے بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا ﴿۲۷﴾۔

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں آدمی کو بنانے والا ہوں بجتی مٹی سے جو

بدبودار سیاہ گارے سے ہے، ﴿۲۸﴾۔

جب اس کو (صورت انسانہ میں) درست کر لوں اور اس میں اپنی (بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا ﴿۲۹﴾۔

تو فرشتے تو سب کے سب سجدے میں گر پڑے ﴿۳۰﴾۔

سوا ابلیس کے، اس نے سجدہ والوں کا ساتھ نہ مانا ﴿۳۱﴾۔

فرمایا اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں سے الگ رہا، ﴿۳۲﴾۔

بولا مجھے زیبا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے بجتی مٹی سے بنایا جو سیاہ بودار گارے سے تھی، ﴿۳۳﴾۔

فرمایا تو جنت سے نکل جا کہ تو مردود ہے، ﴿۳۴﴾۔

اور تجھ پر قیامت کے دن تک لعنت (برسے گی) ﴿۳۵﴾۔

اس نے کہا کہ پروردگار مجھے اس دن تک مہلت دے جب لوگ (مرنے کے بعد) زندہ کئے جائیں گے ﴿۳۶﴾۔

فرمایا کہ تجھے مہلت دی جاتی ہے ﴿۳۷﴾۔

وقت مقرر (یعنی قیامت) کے دن تک ﴿۳۸﴾

اس نے) کہا کہ پروردگار جیسا تو نے مجھے رستے سے الگ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کے لیے (گناہوں) کو آراستہ کر دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا ﴿۳۹﴾۔

ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں (ان پر قابو چلنا مشکل ہے) ﴿۴۰﴾۔

خدا نے) فرمایا کہ مجھ تک (پہنچنے کا) یہ ہی سیدھا رستہ ہے ﴿۴۱﴾۔

جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تجھے کچھ قدرت نہیں (کہ ان کو گناہ میں ڈال سکے) ہاں بدراہوں میں سے جو تیرے پیچھے چل پڑے ﴿۴۲﴾۔

اور ان سب کے وعدے کی جگہ جہنم ہے ﴿۴۳﴾۔

یہ سنتے ہی ایمان کی آنکھیں بھر آئیں، اور اُس نے لرزتے ہوئے کہا، ”مویز بھی تو غلطیاں کرتا ہے، اور اس کے ساتھ کے لوگ بھی۔ میں ان کو یہ سب بتاؤں گی، تاکہ وہ بھی سیدھے راستے پر آجائیں۔“

بزرگ نے نرمی سے مسکرا کر کہا،۔

۔ ”کئی لوگوں کو بہت مرتبہ سمجھایا گیا ہے، مگر کچھ لوگ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، جیسے نکلی پھول پر پانی ڈالنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا ویسے ہماری نصیحتوں کا ان پر اثر نہیں ہوتا کیوں کہ ان کے دل سیاہ ہیں اور وہ حق کا راستہ تلاش نہیں کرتے۔

۔ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم ان کو ایک مرتبہ اور سمجھاؤ، مگر یاد رکھو، تم وہ پھول بنو جو گندگی میں بھی اپنی نشوونما کو جاری رکھتا ہے، جس پر کتنی ہی مشکلات اور برائیاں کیوں نہ ہوں، وہ پھلتا پھولتا رہتا ہے۔”

ایمان نے اشتیاق بھری نظروں سے پوچھا، ”تو کیا مونیز اور اس کے لوگ کبھی سدھر سکتے ہیں؟“

بوڑھے آدمی نے پرسکون انداز میں کہا

۔، ”انہوں نے کبھی سیدھے راستے پر چلنے کے بارے میں سوچا؟ ہو سکتا ہے ان کو پہلے بھی کئی بار سمجھایا گیا ہو، لیکن انہوں نے نہ سنا ہو، تم ایک بار پھر کوشش کرو، اور اگر ناکام رہو، تو دل شکستہ نہ ہونا۔“

ایمان نے ان کے الفاظ کو اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا۔ اس کے دل میں ایک نیا جذبہ بیدار ہوا، ایک روحانی سفر کی شروعات، جو نہ صرف اس کے لیے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی ہدایت کی روشنی بن سکتا تھا جنہیں وہ سیدھے راستے پر لانے کی خواہش رکھتی تھی۔۔۔

...°...

ایمان کی روح ایک انجانی خلش اور خوف کی بھٹی میں جل رہی تھی اس کے دل کی دھڑکنیں تیز اور مضطرب تھیں، اور آواز کانپ رہی تھی جب اُس نے لرزتے لہجے میں اپنے دل کا بوجھ اتارنے کی کوشش کی۔

- ”میں نے ایسے اعمال کیے ہیں جن سے شیطان خوش ہوا ہو گا۔“ -

اُس نے نم آنکھوں سے دانا بزرگ کی طرف دیکھا، جیسے اپنی خطاؤں کی گہرائیوں میں کھوئی ہوئی ہو۔ ”کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا انجام جہنم کی آگ ہے؟“ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے، اور دل کی وحشت اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔

بزرگ نے نرمی سے اس کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں ہمدردی کی روشنی چمک رہی تھی، اور وہ ایمان کے دل میں اُٹھتے ہوئے طوفان کو محسوس کر سکتے تھے۔ ایک نرم اور تسلی بخش لہجے میں، جس میں شفقت اور دانش مندی پوشیدہ تھی، انہوں نے ایمان کو تسلی دیتے ہوئے کہا، ”نہیں، عبد اللہ۔“

ایمان نے چونکہ کر ان کو دیکھا ”عبد اللہ۔“

بزرگ مسکرائے ”بے شک عبد اللہ یعنی اللہ کا بندہ یا بندی

“

وہ دوبارہ اپنی بات پر واپس آئے۔

ایسا نہیں ہے جیسے کہ تم سمجھتی ہو۔ اللہ رحمان ہے، رحیم ہے، وہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں ہونے دیتا۔“

پھر انہوں نے قرآن کی سورہ زمر ۵۳-۵۴ کی آیات پڑھیں

تم فرماؤ: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، بیشک اللہ سب گناہ بخش دیتا ہے، بیشک وہ ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اپنے رب کی طرف رجوع کرو، اور اس وقت سے پہلے اس کے حضور گردن جھکا دو کہ تم پر عذاب آئے پھر تمہاری مدد نہ کی جائے۔

یہ سن کر ایمان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور اس کے دل میں ایک عجیب سی بے چینی چھا گئی۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی جب اس نے کہا، ”میری زندگی تو ویسے ہی عذاب میں گزری ہے، اور اب لگتا ہے کہ آخرت بھی عذاب میں ہی گزرے گی۔ اگر اسی حالت میں مجھے موت آ جاتی تو میرا کیا ہوتا؟“۔

بزرگ کے چہرے پر نرمی کی مسکان تھی، اور انہوں نے کہا، ”عبداللہ، اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے، اس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، تمہارے لیے ہمیشہ ایک راستہ موجود ہے۔ جب تک سانس باقی ہے، تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“۔

یہ سن کر ایمان کو جیسے سکون ملا، ایک روشنی سی اس کے دل میں بھر گئی، اور وہ ان الفاظ کو اپنے دل میں جذب کرنے لگی۔ رات کی ہوانے گویا اس کے دل کے بوجھ کو ہلکا کر دیا، اور اُس نے اس حقیقت کو قبول کیا کہ اللہ کی رحمت ہمیشہ موجود ہے، چاہے انسان کتنی ہی گمراہی میں کیوں نہ ہو۔

پھر ایمان نے اپنی معصوم سی آنکھوں میں ایک اور سوال سجایا، جو ہمیشہ سے انسانیت کے دلوں میں گونجتا آیا ہے۔ ”اللہ کہاں ہے؟“ اُس کے لبوں سے یہ سوال ایک معصوم استفسار کی طرح نکلا۔

بزرگ نے ایک طویل سانس لی، اور نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا، ”عبداللہ، جہاں دل کی سچائی اور دعائیں ملتی ہیں، وہاں اللہ ملتا ہے۔“

پھر بزرگ نے قرآن کی ایک اور آیت کا ترجمہ پیش کیا، جس میں اللہ کے قرب اور اس کی رحمت کی وسعت کا ذکر تھا، جس نے ایمان کے دل کی گہرائیوں کو اور زیادہ روشنی سے بھر دیا۔

اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہیے کہ میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ نیک راستہ پائیں ﴿۱۸۶﴾ سورہ البقرہ۔

سورہ تغابن ۴-۱

جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو چیز زمین میں ہے (سب) خدا کی تسبیح کرتی ہے۔ اسی کی سچی بادشاہی ہے اور اسی کی تعریف (لامتناہی) ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ﴿۱﴾۔

وہ ہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی مومن۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو دیکھتا ہے ﴿۲﴾۔

اسی نے آسمانوں اور زمین کو مبنی بر حکمت پیدا کیا اور اسی نے تمہاری صورتیں بنائیں اور صورتیں بھی پاکیزہ بنائیں۔ اور اسی کی طرف (تمہیں) لوٹ کر جانا ہے ﴿۳﴾۔

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب جانتا ہے اور جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو کھلم کھلا کرتے ہو اس سے بھی آگاہ ہے۔ اور خدا دل کے بھیدوں سے واقف ہے ﴿۴﴾۔

پھر سورہ البقرہ ۲۵۵ کا ترجمہ پڑھ کر اسے سنایا۔۔۔

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ خود زندہ ہے، دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے، اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں سب اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور لوگ اس کے علم میں سے اتنا ہی حاصل کر سکتے ہیں جتنا وہ چاہے، اس کی کرسی آسمان اور زمین کو اپنی وسعت میں لئے ہوئے ہے اور ان کی حفاظت اسے تھکا نہیں سکتی اور وہ ہی بلند شان والا، عظمت والا ہے۔

پھر سورہ الاعمران کی آیت پڑھی

یعنی (لوگوں کی ہدایت کے لیے پہلے (تورات اور انجیل اتاری) اور (پھر قرآن جو حق اور باطل کو) الگ الگ کر دینے والا (ہے) نازل کیا جو لوگ خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ان کو سخت عذاب ہو گا اور خدا زبردست (اور) بدلہ لینے والا ہے ﴿۴﴾

ایمان، ایک داخلی اضطراب اور کھوئے ہوئے وجود کے احساس میں گھری، بزرگ کے الفاظ کو اپنے دل میں سمیٹ رہی تھی۔ اس لمحے میں، اُسے ایک ایسا تعلق محسوس ہوا جو اس کی اپنی سانسوں سے بھی زیادہ قریب تھا، جیسے کہ الہی وجود اس جگہ کے درختوں، ہوا اور ہر ذرے میں سرایت کر چکا ہو۔ اُس کے سوالات، جو اس کی بے لوث معصومیت کا مظہر تھے، اُس کو الہی رازوں کی گہرائیوں میں کھینچ رہے تھے۔ اور جب اُس نے اپنے دل کی کھڑکیاں کھولیں، ایک نیا سوال اُس کے لبوں پر اُبھرا، ”اللہ نے یہ دنیا کیوں تخلیق کی؟“۔

بزرگ، جو اپنے وقت کے تلخ اور شیریں تجربات کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے، اُس کے سوال پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔۔

۔ ”یہ دنیا، عبد اللہ ایک امتحان ہے، ایک آزمائش گاہ، جہاں ہر روح کو اُس کے انتخاب کے پیمانے پر پرکھا جاتا ہے۔“۔

اُن کے الفاظ میں حکمت کی گہرائی تھی، اور ان کی نگاہیں ایمان کی بے تاب نظریں محسوس کر رہی تھیں، جو مزید جاننے کے لیے بے چین تھیں۔

ایمان نے فوراً اپنے بچپن کے دنوں کی یادوں میں جھانکتے ہوئے کہا، ”میں امتحان سے واقف ہوں۔ ایک دفعہ اسکول میں، میں کامیاب ہوئی تھی اور مجھے انعام ملا، جب کہ میرا سوتیلا بھائی ناکام رہا تھا جس وجہ سے میری سوتیلی ماں نے میرا اسکول چھڑوا دیا تھا۔“

بزرگ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی، جیسے ایمان نے فطرت کی ایک بنیادی سچائی کو چھو لیا ہو۔

۔ ”تم نے تو پہلے ہی اس حقیقت کا جوہر سمجھ لیا ہے۔“

انہوں نے شفقت سے کہا۔

۔ ”اللہ نے اس دنیا کو انسانوں کے لیے ایک امتحان بنایا ہے تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ کون اپنے عمل میں صداقت اور ایمان کے ساتھ آگے بڑھتا ہے، اور کون محض گناہوں میں غرق ہو کر بھٹک جاتا ہے۔ جو کامیاب ہوتے ہیں، وہ جنت کے وارث بنتے ہیں، اور جو ناکام ہوتے ہیں، وہ اپنی کوتاہیوں کا خمیازہ بھگتے ہیں۔“

پھر بزرگ نے سورہ الملک کی آیت کا ترجمہ پڑھا

اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔ اور وہ

زبردست (اور) بخشنے والا ہے ﴿۲﴾۔

ایمان، یہ الفاظ سنتے ہوئے، دل میں ایک عجیب سی بے یقینی اور بوجھ محسوس کرنے لگی۔ اُس کی آواز میں نرمی اور پشیمانی تھی جب اُس نے آہستہ سے اعتراف کیا،۔

۔ ”میں بہت کم جانتی ہوں۔ میں نے قرآن نہیں پڑھا، اور میرا علم بہت محدود ہے۔ لوگ اکثر اپنے گناہوں کا الزام شیطان پر دھر دیتے ہیں اور جنت کی اُمید رکھتے ہیں۔“۔

یہ کہہ کر ایمان خاموش ہو گئی، جیسے کہ اُس کی نظریں زمین میں گہری اتر گئی ہوں۔ اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی تھی، اور اُس کی آنکھوں میں دنیا کی پیچیدگیوں کا عکس تھا۔

بزرگ نے نرمی سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا بظاہر لگتا ہے۔ گناہ اور نیکی، ایمان اور شیطان، یہ سب پیچیدہ راز ہیں۔ ہر انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ کوئی اور تمہاری خطا کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔“۔

پھر انہوں نے سورہ فاطر کی آیت کا ترجمہ پڑھا

اور کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گی اور اگر کوئی بوجھ والی جان اپنے بوجھ کی طرف کسی کو بلائے گی تو اس کے بوجھ میں سے کچھ بھی نہیں اٹھایا جائے گا اگرچہ قریبی رشتہ دار ہو۔ (اے نبی!) تم انہی لوگوں کو ڈراتے ہو جو بغیر دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں اور جس نے پاکیزگی اختیار کی تو بیشک اس نے اپنی ذات کے لئے ہی پاکیزگی اختیار کی اور اللہ ہی کی طرف پھرنا ہے۔

(سورہ فاطر ۱۷)۔

یہ سن کر ایمان کی روح گویا ایک نئی روشنی سے بیدار ہوئی۔ وہ سمجھ گئی کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے، اور کسی اور پر الزام تراشی یا تکیہ کرنا محض خود فریبی ہے۔ اللہ کے حضور ہر ایک کو اپنی کوشش، اپنے عمل، اور اپنی نیت کے ساتھ پیش ہونا ہو گا۔

....

بزرگ نے اسی دوران قرآن کی ایک اور آیت کا ترجمہ ایمان کے سامنے رکھا۔

کہو کیا میں خدا کے سوا اور پروردگار تلاش کروں اور وہ ہی تو ہر چیز کا مالک ہے اور جو کوئی (برا) کام کرتا ہے تو اس کا ضرر اسی کو ہوتا ہے اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا پھر تم سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کا جانا ہے تو جن جن باتوں میں تم اختلاف کیا کرتے تھے وہ تم کو بتائے گا

-[الأنعام: ۱۶۴]-

ایمان کے دل کی گہرائیوں میں تجسس اور علم کی پیاس پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ جیسے ہی اُس نے بزرگ کے ارشادات کو سنا، اُس پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ ایمان کی پیچیدگی اور انسانوں کے خالق کے ساتھ اُن کے تعلق کا رشتہ ابھی پوری طرح عیاں نہیں ہوا تھا۔

یہ تعلق ایک نازک اور پیچیدہ گل قاری کی مانند تھا، جسے ایک خاص بصیرت اور شعور کے ساتھ کھولا جانا تھا۔ ان کی گفتگو نے اس پارک کو، جہاں وہ بیٹھے تھے، ایک روشن خیالی کی مقدس پناہ گاہ میں تبدیل کر دیا تھا۔

یہ جگہ اب علم اور روحانی فہم کی تلاش کا مرکز بن گئی تھی، جہاں سوالات کو صبر و تحمل کے ساتھ مکمل کیا جاتا تھا اور علم کا حصول ایک مقدس فریضہ تھا۔

بزرگ کی موجودگی، گودھولی کی آسمانی روشنی میں نہائی ہوئی، ایک مقدس ہستی کی مانند تھی۔

اس لمحے میں، ان کی گفتگو نے انسانی فطرت کی پیچیدگیوں اور شیطان کے پراسرار کردار کے پردے کو چاک کرنا شروع کر دیا تھا۔ بزرگ کا چہرہ، جو غور و فکر کے زمانوں سے جڑا ہوا تھا، حکمت کے متلاشی ایمان کو یوں مخاطب کر رہا تھا جیسے کوئی قدیم اور یکل کسی راز کو افشا کر رہا ہو۔

- ”یہ آیت،“ -

بزرگ نے کہا،-

ان کے الفاظ ایسے تھے جیسے باریک چاک کیا ہوا ریشم ہو امیں لہرا رہا ہو،۔۔

یہ آیت انفرادی ذمہ داری کے گہرے اصول کا ناقابل تغیر وصیت نامہ ہے۔“ -

ان کے الفاظ میں ایک ایسی گہرائی تھی جو ایمان کے دل تک پہنچ رہی تھی۔۔۔ “زندگی کے پیچیدہ رقص میں، شیطان ایک لطیف اکسانے والے کی مانند ہے، ایک ایسا فریب دینے والا جو روحوں کو بہکانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن بالآخر یہ انسان کے وجود کا جوہر ہے جو اُس کے اعمال اور انتخاب کا تعین کرتا ہے۔۔۔”

ایمان، ایک سنجیدہ شاگرد کی مانند، بزرگ کی ہر بات کو گہری توجہ سے سن رہی تھی۔ اُس کی نظریں بزرگ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی روشنی کو محسوس کر رہی ہو۔

وہ جانتی تھی کہ وہ روحانی بصیرت کی چوٹی پر کھڑی ہے، جہاں الہی رازوں کی نقاب کشائی کا لمحہ قریب ہے۔
۔۔۔ “جب بدکرداری کے پھندے میں پھنسی ہوئی روحیں اپنے آپ کو عذاب کی آگ میں جھلستے پاتی ہیں، تو شیطان، کیا وہ اس لمحے میں اپنے کئے سے منہ نہیں موڑے گا؟ کیا وہ حساب کے وقت اپنے فریب کا اعتراف نہیں کرے گا؟”

بزرگ نے جواباً قرآن مجید سے سورہ ابراہیم کی آیت (۱۴:۲۲) تلاوت کی:

اور شیطان کہے گا جبکہ فیصلہ ہو چکے گا: بیشک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا، اور میں نے تم سے وعدہ کیا تھا، سو میں نے تم سے وعدہ خلافی کی۔ اور مجھے تم پر کوئی اختیار نہ تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں (باطل کی طرف) بلایا، اور تم نے میری دعوت کو قبول کیا، لہذا تم مجھے ملامت نہ کرو، بلکہ اپنے آپ کو ملامت

کرو۔ نہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں اور نہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔ بیشک میں اس بات کا انکار کرتا ہوں جو تم پہلے مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہراتے تھے۔ بیشک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

ایمان نے اس آیت کو سن کر خود کو ایک گہرے سکون میں محسوس کیا، گویا ایک روحانی انکشاف اُس کے دل کے اندر برپا ہو رہا تھا۔ اُس کا دل اُمید سے لبریز ہو گیا تھا، کیوں کہ وہ جان چکی تھی کہ شیطان کا فریب اور اُس کے وسوسے، انسان کے اندر کے انتخاب سے ہی طاقتور ہوتے ہیں۔

بزرگ کے الفاظ محض ایک فکری گفتگو نہیں تھے، بلکہ گہرے سچائیوں کی نقاب کشائی تھی، جو انسانی شعور کی حدود سے بھی باہر کی باتیں تھیں۔

سحری کا وقت قریب آ رہا تھا، اور چاندنی کی نرم روشنی فٹ پاتھ پر پھیلی ہوئی تھی، جیسے گفتگو کے الفاظ ابدیت کی روشنی میں ڈوب رہے ہوں۔ ایمان نے محسوس کیا کہ ان سوالات کا جواب، جو صدیوں سے انسانوں کے دلوں میں گونجتے رہے ہیں، اُس کے سامنے کھلنے کے قریب ہیں۔ بزرگ کی تعلیمات کی روشنی میں، اُس کے وجود کی بھولبلیا میں ایک نئی راہ نمودار ہو رہی تھی، جس کے گلیارے الہی فہم کے پردے میں لپٹے ہوئے تھے۔

۔ ”یہ دنیا محض ایک عارضی امتحان گاہ ہے،“ بزرگ نے ایک بار پھر اپنی گہری آواز میں کہا، ”اور ہر روح کو اس امتحان میں کامیابی کے لیے اپنی راہیں خود متعین کرنی ہوں گی۔“

ایمان کے دل میں ایک نیا شعور بیدار ہو چکا تھا، ایک گہری بصیرت کہ یہ دنیا محض ایک عارضی مقام ہے، جدھر کیے گئے ہر عمل کا حساب آخرت میں دینا ہو گا۔

ایمان کا سر اس کی پیشانی پر ٹکا ہوا تھا، انگلیاں نرمی سے اس کی کنپٹی کو مساج دے رہی تھیں، جبکہ وہ شیطان کے بنے ہوئے فتنہ انگیز جالوں پر غور و فکر کر رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں تشویش اور تجسس کی روشنی اس طرح تیر رہی تھی جیسے وہ اپنے آس پاس کی فضا میں چھپے رازوں کو تلاش کر رہی ہو۔ ”حقیقت یہ ہے،“ اس نے ایک گہری آہ بھر کر کہا،۔

۔ ”شیطان کی چالیں بھولبلیا کی مانند ہیں، جو انسانیت کو غدارانہ رغبت کے ساتھ گمراہ کرتی ہیں۔“

لیکن پھر، جیسے ہی سمجھ کی روشنی نے اس کے ذہن میں ایک نیا دروازہ کھول دیا، اس نے اپنی نگاہیں اٹھائیں اور اپنے آپ کو بزرگ کی موجودگی میں پایا، جو ہمیشہ اس کی روحانی رہنمائی کا منبع تھے۔

ان کے برابر بیٹھے ہوئے وہ احساس کرتی تھی کہ بزرگ کے الفاظ ہر بار اُس کی روح کے اندرونی گوشوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں، گویا وہ سچائی کے قدیم رازوں سے پردہ اٹھا رہے ہوں۔

بزرگ نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے، ایک مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا، جیسے اُس کی دانشمندی پر حیران ہو رہے ہوں۔ ”سوچنے کی بات ہے،“

ایمان نے خود سے کہا، ۱۲۴،۰۰۰ انبیاء اس دنیا پر بھیجے گئے، اُن کا مقصد انسانیت کو شیطان کے فریب اور دنیاوی فتنوں سے محفوظ رکھنا تھا یہ پیغام، جو ہر نبی کی زبان سے اُترا تھا، دراصل انسان کو اس دنیا کی ناپائیدار لذتوں اور دجالی فریبوں سے بچانے کا ضامن تھا۔“

بابا نے اُس کی جانب گہری نگاہ سے دیکھا، جیسے وہ ایمان کی ہر سوچ کو سمجھتے ہوں، اور پھر مسکراتے ہوئے بولے، “بے شک، یہ دنیا محض ایک عارضی امتحان گاہ ہے۔ نبیوں کی تعلیمات ہمارے لیے روشنی کے مینار ہیں، لیکن درحقیقت راستہ انسان کو خود تلاش کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک روحانی سفر ہے، جس کا انجام سکون کی دولت میں مضمر ہے۔“

ایمان کے دل میں بے چینی ابھی بھی اپنی جگہ موجود تھی۔ “میرا دل پہلے بھی بے چین تھا، اور اب لگتا ہے کہ یہ بے چینی اور بڑھ گئی ہے،“

اُس نے اعتراف کیا، اس کی پیشانی پر بل نمودار ہو چکے تھے۔ بزرگ کی مسکراہٹ باقی رہی، اُن کے چہرے پر صبر و تحمل کی جھلکیاں واضح تھیں۔ “عبداللہ، جنت کی کنجی روح و قلب کا سکون ہے۔“

ایمان کی آنکھوں میں حیرانی کے آثار تھے

۔۔ “کنجی؟ لیکن یہ کنجی کیسے سکون لاسکتی ہے؟“

اُس کی آواز میں ایک بچگانہ جستجو تھی، گویا وہ اس راز کو فوراً جاننا چاہتی ہو۔

بزرگ نے نرم مسکان لبوں پر سجاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا، ”تم جس کنجی کا تصور کرتی ہو، وہ ٹھوس اور مادی نہیں، بلکہ روحانی ہے۔ یہ کنجی، الہی کے ساتھ تعلق قائم کرنے کی تمہاری استعداد میں مضمر ہے۔ اور یہ تمہارا امتحان ہے۔“

ایمان خاموشی سے اُن کی باتوں کو سن رہی تھی، گویا وہ ہر لفظ کو اپنے دل میں جذب کر رہی ہو۔ اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ سکون ایک سفر ہے، اور اُس کی منزل اس کو تلاش کرنی ہے۔

اُس نے خود سے عہد کیا کہ وہ اس راستے کو تلاش کرے گی، جس میں اُس کا دل حقیقی اطمینان تک پہنچے۔
- ”یہ کنجی کہاں ملے گی، اور اس کی شکل کیا ہوگی؟“ ایمان نے التجا کی، اُس کی آنکھوں میں عاجزی اور جستجو کی جھلک تھی۔

بابا نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا،

- ”عبداللہ کیا تم نے کبھی محنت کے بغیر دولت حاصل کی ہے؟ ایمان کی دولت، عبداللہ، ایسی ہی ہے۔ اس کے لیے تمہیں محنت کرنی ہوگی، خود کو آزمائشوں میں ڈالنا ہوگا، تاکہ تمہیں اس کی حقیقت سمجھ میں آ سکے۔“

ایمان نے بزرگ کی جانب دیکھا، اُس کے دل میں ایک سوال پیدا ہوا۔ ”لیکن آپ کے پاس تمام سوالات کے جوابات ہیں،“ اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

بزرگ نے دھیرے سے سر ہلایا۔ ”ہر جواب قرآن میں پوشیدہ ہے، اور تمہیں اسے اپنے دل سے پڑھنا اور سمجھنا ہوگا۔ یہ تمہاری روحانی رہنمائی کا سب سے بڑا منبع ہے۔“

جب وہ بزرگ اٹھے تو ایمان بھی ان کے ساتھ اٹھی۔ رات کی دبیز چادر نے ان کے اطراف میں موجود گھروں کو اپنے سائے میں چھپا لیا تھا، لیکن جیسے ہی وہ چلے، فضا میں روشنی کی مدھم سی جھلک نمودار ہوئی، اور یکایک گھروں نے گویا ایک نئی زندگی پالی، اپنی کھڑکیوں سے شب کی تاریکی میں روشنی بکھیرنے لگے۔ یہ لمحہ سحر کے قریب، رات اور دن کے بیچ کے اس لمحے کی علامت تھا جب اندھیرے اور اجالے کی سرحد دھندلا جاتی ہے، اور روح میں تبدیلی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

بزرگ، اپنے مخصوص تدبر اور سکون کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے، اچانک گویا غیر ارادی طور پر ایمان سے مخاطب ہوئے۔

۔ ”تمہیں بھی اللہ کے لیے روزہ رکھنا چاہیے۔“

یہ الفاظ جیسے غیر متوقع طور پر دل میں اترے۔

ایمان، جو اپنے خیالات میں غرق تھی، ایک لمحے کو رک کر سوچنے لگی

۔ ”میں روزہ کیسے رکھوں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

اس کی سوچوں کی اس گہری کیفیت میں بزرگ نے پھر رک کر اسے مخاطب کیا، گویا وہ ایمان کے دل کی باتوں کو پڑھ چکے ہوں۔

ان کی آنکھوں میں ایک پراسرار سکون تھا، جیسے کسی پوشیدہ راز کی چمک ہو۔
- ”یاد رکھو،“ -

بزرگ نے مسکراتے ہوئے، ایک ٹھہراؤ کے ساتھ کہا،

- ”جنت میں وہ لوگ بھی ہوں گے جو کبھی گناہوں میں غرق تھے یا غلط راستے پر تھے پھر انہوں نے درست راستے کا۔ انتخاب کیا اور جنت پالی تم بھی ان لوگوں کی فہرست میں شامل، ہو جاؤ عبد اللہ۔“

یہ الفاظ، گویا ایک الہی یاد دہانی، ایمان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔

ایمان ساکت کھڑی رہی، جیسے اُس کی روح بزرگ کی کہی ہوئی ہر بات کو جذب کر رہی ہو۔ بزرگ کی شخصیت، جو روشنی اور حکمت کا مجسم پیکر معلوم ہوتی تھی، رفتہ رفتہ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے دھیرے دھیرے سائے میں مدغم ہونے لگی، لیکن ان کے الفاظ کی گونج ایمان کے دل و دماغ میں ایک مستقل سرگوشی کی مانند باقی رہی۔

یہ گویا ایمان کے لیے ایک نیا سفر تھا—خود کی دریافت، سکون کی جستجو، اور روح کی پاکیزگی کی طرف بڑھنے کا سفر۔

رات کے اس ساکت لمحے میں، جب چاند کی مدھم چمک زمین کو چھو رہی تھی، ایمان نے اپنے دل میں عہد کیا کہ وہ اس روحانی دولت کو حاصل کرے گی، جو اس کی حقیقت کو بدل دے گی۔

وہ اب ایک متلاشی تھی، جو اپنے وجود کے گہرے اسراروں کی کھوج میں نکل چکی تھی۔

...°...

...

ایمان چوراہے پر کھڑی تھی، دل کی دھڑکنوں میں جیسے کائنات کی ساری بے یقینی سمٹ آئی ہو۔

ایک طرف نائٹ کلب کی رنگین روشنیوں سے بھری دنیا تھی، جو ایک لمحے کے لیے بھاگنے اور خود کو بھلا دینے کی رغبت دے رہی تھی۔ دوسری طرف گھر راستہ تھا، چاندنی کی نرم چمک میں نہایا ہوا، جو سکون اور راحت کی خاموش پکار سناتا تھا۔

اُس لمحے میں، وہ جیسے دو دنیاؤں کے درمیان بٹ گئی تھی۔

نفس کے فریب اسے نائٹ کلب کی طرف کھینچ رہے تھے، جیسے سرگوشیوں میں شیطان اسے اپنا راستہ دکھا رہا ہو۔

لیکن پھر، اُس کی اندر کی روشنی جاگی، اور ایک ہلکی سی سرگوشی، جو گویا دل کی گہرائیوں سے نکل رہی تھی، اسے نیکی کی طرف بلانے لگی۔ ”ایمان“، اُس نے خود سے کہا،

۔ ”اللہ کا راستہ وہ ہے جس پر سکون ہے، جس پر بھٹکنے کا کوئی ڈر نہیں۔“۔

اُس نے ایک آخری نگاہ نائٹ کلب کی طرف ڈالی، اور پھر ایک گہری سانس لے کر، اللہ کے راستے پر چل پڑی۔

اُس کے قدموں نے خود بخود گھر کا راستہ اپنایا، وہ ہی راستہ جو چاندنی کی مدھم روشنی میں لپٹا ہوا تھا، گویا اللہ کی رحمت اسے ڈھانپ رہی ہو۔

گیٹ قریب آ رہا تھا، وہ گیٹ جو ماضی کے گناہوں، رنجشوں اور نئے عزم کے درمیان سرحد بن چکا تھا۔ مبارک ہو، ایمان! تم اپنے امتحان میں کامیاب ہو چکی ہو۔ تم نے اپنے نفس کی سرکشی کو چھوڑا اور اللہ کی بندگی کو اپنایا۔ یہ پہلا امتحان تھا، اور تم نے اللہ کی رضا کو اپنی خواہشات پر مقدم رکھا۔ اُس لمحے میں ایمان کو اپنے دل میں ایک بے مثال سکون کا احساس ہوا، جیسے اُس کے دل کی ساری الجھنیں ختم ہو چکی ہوں۔

اُس کا سفر ابھی شروع ہوا تھا، لیکن اُس نے پہلا قدم درست راستے پر رکھ دیا تھا، وہ راستہ جو اُس کو رب کی قربت کی طرف لے جا رہا تھا۔

اور یوں، ایمان نے اپنے دل کے دو راستوں کے درمیان، ہمیشہ کے لیے اُس راستے کا انتخاب کیا جو اُسے اللہ کے قریب لے جائے گا۔

جیسے ہی ایمان نے دروازے کو آہستگی سے دھکیلا اور دہلیز پار کر کے دارالطعام میں قدم رکھا، اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک حیران کن منظر آگیا۔

میز کے گرد اس کے گھر والے سحری کے لیے جمع تھے۔ خالدہ، اس کی سوتیلی ماں، درمیانی نوالے میں تھی، اور جیسے ہی ایمان کی غیر متوقع آمد پر اس کی نظر پڑی، حیرت کی ایک لہر نے اسے جکڑ لیا۔ کمرے میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی، جیسے ہوا میں کچھ ناگوار معلق ہو۔

کمرے کی دیواریں اسلامی خطاطی کے شاہکاروں سے سچی ہوئی تھیں، اور ماحول پر نرم اور سکون بخش روشنی کا ہلکا سا سایہ چھایا ہوا تھا۔ سچی ہوئی میز، مہنگے چینی برتنوں اور چمکتے چاندی کے برتنوں سے بھری ہوئی تھی، جو گھر کی ظاہری شان و شوکت اور دولت کی علامت تھی۔

یہ سب ایمان کے لیے ایک متضاد منظر تھا، ایک طرف یہ ظاہری آسائش اور دوسری طرف اس کے دل میں سادہ اور پاکیزہ ارادے۔

ایمان کی موجودگی نے کمرے کے سکوت کو توڑ دیا، اور اُس کے گھر والے حیرانی اور بے یقینی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

ہر چہرے پر ایک سوال تھا، ہر آنکھ میں بے یقینی کا عکس۔ لیکن ایمان اپنے فیصلے میں پختہ تھی، اُس کے دل میں ایک نیا عزم جاگ چکا تھا۔ اُس نے آہستگی سے میز کے قریب جگہ سنبھالی، جیسے یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہو۔

خالدہ نے پہلی بار اپنے غصے کا اظہار کیا، اُس کے لہجے میں حقارت کا زہر گھلا ہوا تھا۔

۔ ”یہ کیا؟ تو اور روزہ؟ یہ ناپاک دیوی یہاں کیا کر رہی ہے؟ تیری جیسی کافرہ کا روزہ آخر قبول کون کرے گا؟ یہاں سے نکل، کہیں ہمارے برتن پلٹ نہ ہو جائیں!“۔

اس کے الفاظ میں نفرت کا انگار چھپا تھا، اور کمرے کی فضا ایک دم بھاری ہو گئی۔

خالدہ کی ہنسی ایک طنزیہ قہقہے کی صورت میں کمرے میں گونج اٹھی۔ اُس کے ساتھ عنایہ اور عبیرہ بھی شریک ہو گئیں، اور انہوں نے بھی حقارت بھری نظروں سے ایمان کی طرف دیکھا۔

اُن کے لیے ایمان کی موجودگی ایک ناقابل برداشت بات تھی، جیسے وہ کسی اجنبی کی موجودگی کو برداشت کر رہی ہوں۔

لیکن ایمان خاموش رہی، اپنے اندر کے مضبوط ارادے کو تھامے ہوئے۔ اُس کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ تھا، ایک پختگی تھی جو اُس کے اندر کے بدلاؤ کو ظاہر کرتی تھی۔

خالدہ اور اس کی بیٹیوں کی طنز بھری باتوں کے باوجود، وہ پرسکون رہی۔

آخر کار، جب خالدہ کے طنز اپنی حد پار کر گئے، ایمان نے ایک گہری سانس لی اور مضبوط لہجے میں بولی،
- ”تجھے میرے اعمال کا حساب دینے کی ضرورت نہیں، یہ اللہ اور میرے درمیان کا معاملہ ہے۔ تو اپنے
اعمال پر نظر رکھ، مجھے مت دیکھ۔ میرے روزے کو قبول کرنا یا نہ کرنا اللہ کا کام ہے، تیرا نہیں۔“
یہ الفاظ کمرے میں گونجتے رہے، جیسے ہر چیز رُک گئی ہو۔ خالدہ، جواب تک طنز اور تحقیر کے نشتر چلا رہی
تھی، ایمان کے جواب سے خاموش ہو گئی۔

اس کے چہرے پر حیرت اور بے بسی کا سایہ چھا گیا۔

ایمان نے پھر ایک خادم کو آواز دی اور نرمی سے کہا۔

۔، ”میرے لیے بھی سحری کا اہتمام کریں میں آج روزہ رکھنا چاہتی ہوں۔“

یہ اعلان ایک نئے سفر کا آغاز تھا، ایک ایسا سفر جس میں ایمان نے اللہ کی رضا کے لیے اپنے آپ کو مکمل
طور پر پیش کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

دولت اور آسائش سے بھرے اس کمرے میں، جہاں دنیاوی شان و شوکت اور رتبے کی جنگ جاری تھی،
ایمان نے اپنے روحانی سفر کا پہلا قدم اٹھالیا تھا۔

کمرے کی فضا ابھی بھی تناؤ سے بھرپور تھی، لیکن ایمان کا دل اب سکون سے لبریز تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا راستہ اب صاف اور واضح ہے، اور وہ اللہ کی رضا کی طرف بڑھ رہی ہے، دنیاوی رکاوٹوں اور طنز کے تیروں کے باوجود۔

--

خالدہ کی نگاہوں میں نفرت کی چمک تھی، جیسے وہ موقع کی تاک میں ہو۔ جب ایمان نے طعام کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا، خالدہ نے اپنی زہر بھری زبان سے وار کیا۔۔

- ”ملازم! اس ناپاک لڑکی کے لیے الگ برتن لا۔ کہیں ہماری پاکیزہ پلیٹوں کو اس کے چھونے سے داغ نہ لگ جائے۔“

خالدہ کی بات میں طنز کا وار چھپا تھا، جیسے وہ ایمان کو اُس کے مقام پر یاد دلانا چاہتی ہو۔

ایمان نے لمحہ بھر کے لیے سکوت اختیار کیا، پھر اپنے مخصوص دھیرے مگر پختہ لہجے میں جواب دیا،

- ”بالکل، ایسا ہی کرو۔“

اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ تھی جو خالدہ کی توقع سے بالکل مختلف تھی۔

- ”ہمارے پاس ایک خالدہ نامی ’کتیا‘ ہے جو اکثر اپنی تھو تھنی غلط جگہوں پر ڈالتی ہے۔ ذرا دھیان رکھنا کہ میری پلیٹ میں نہ آجائے، ورنہ واقعی ناپاک ہو جائے گی۔“

یہ جواب سن کر ملازم کی ہنسی بے قابو ہوتے ہوئے بمشکل رکی۔

خالدہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، جیسے ایمان کے جواب نے اسے لمحہ بھر کے لیے گونگا کر دیا ہو۔

اُس کی نظروں میں حیرانی اور غصے کا امتزاج صاف نظر آیا۔

میکائیل جو خاموشی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا، اپنے کھانے پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش میں گھٹن محسوس کرنے لگا۔

ایمان کا یہ نیا روپ، جس میں وہ نہ صرف اپنی عزت بچا رہی تھی بلکہ خالدہ کے وار کو پلٹ رہی تھی، ایک غیر معمولی قوت اور ذہانت کا عکاس تھا۔

میز پر جمی نظریں اس خاموش تصادم کی گواہ تھیں۔

ایمان، جو کبھی ایک ڈرپوک اور گوشہ نشین سی لڑکی تھی، اب اُس کے اندر ایک نئی توانائی اور عزم پیدا ہو چکا تھا، جس نے اسے کسی بھی صورت حال میں خود کو ثابت کرنے کے قابل بنادیا تھا۔

جب اذان کی آواز گھر کے آنگن میں گونجی تو سحری کا وقت مکمل ہونے کو آیا۔ ایمان، جو ابھی اپنے پہلے روزے کی تیاری کر رہی تھی، نے چیچ کو ہوا میں روکے رکھا۔ خالدہ نے موقع کو غنیمت جانا اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

۔ ”اونی نو یلی مومنہ! اذان ہو رہی ہے، اب کیا کر رہی ہے؟“۔

ایمان نے کچھ نہ سمجھے چیچ نیچے رکھتے ہوئے معصومیت سے پوچھا، ”اذان ہو رہی ہے، تو؟ پہلی بار سن رہی ہوں کیا میں؟“۔

خالدہ کے چہرے پر تحقیر کی ایک اور لہر دوڑی۔

۔ اذان کا مطلب ہے کہ سحری ختم اب کچھ کھاپی نہیں سکتے مغرب تک۔ ”اُس کا لہجہ سرد اور کینہ پرور تھا، جیسے وہ ایمان کو کم علم ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہو۔

ایمان نے چیچ فوراً نیچے رکھ دیا، اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

جب ایمان دار الطعام کے حدود سے بار چلی گئی، خالدہ نے پھر سے اپنی زہر بھری بات سے اسے نشانہ بنایا۔

”یہ روزے پر ہے؟ نیت کیے بغیر۔ فحاشہ لڑکی!“

خالدہ کے الفاظ زہر آلود تیر کی طرح کمرے میں گونجتے رہے۔۔

۔ ”دیکھتی ہوں اس نئی نویلی مومنہ کو کیسے بھوک پیاسی رہتی ہے پورا دن“۔

...°...

آصف محمود کی شاہانہ رہائش گاہ پر صبح کی روشنی نے املاک پر دھیرے دھیرے اپنے پر پھیلانے، لیکن اندر کا ماحول تاریکی سے بو جھل تھا۔

محلّاتی کمرے میں دولت اور آسائش کی فراوانی تھی، لیکن آمنہ کے دل میں خوف اور لالچ کی آمیزش سے پیدا ہونے والی بے چینی نے اس کے وجود کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ پر تعیش بستر کے کنارے بیٹھی، اپنا سر ہاتھوں میں چھپائے ہوئے زار و قطار رو رہی تھی۔ اُس کی آواز میں ناامیدی اور حسرت کی ایسی شدت تھی کہ کمرے کی بھاری فضا مزید دباؤ میں آگئی تھی۔

آصف، اُس کا شوہر، ایک مکاری سے بھری ہمدردی کا لبادہ اوڑھے، اُس کے پاس بیٹھا اُسے تسلی دے رہا تھا۔

آمنہ نے لرزتی آواز میں شکایت کی،۔

۔ ”پہلے ایک گردہ ناکارہ ہوا، اب دوسرا بھی 80 فیصد تک کام کر رہا ہے۔“۔

اُس نے آنکھوں میں خوف اور بے بسی کے ساتھ آصف کی طرف دیکھا۔

”آصف، مجھے بچاؤ۔ میں مر نہیں سکتی، ایسا میرے ساتھ نہیں ہو سکتا۔“

آصف کی نگاہوں میں ایک سرد مہری تھی، اُس نے آہ بھری، گویا وہ اس لمحے کے بوجھ کو محسوس کر رہا ہو۔ اُس کے ہاتھ آمنہ کے گالوں پر تھے، مگر اُس کے الفاظ میں جو تسلی تھی، وہ دراصل ایک مذموم چال کی ابتدا تھی۔

۔ ”میں نے امریکہ کے بڑے ڈاکٹروں اور اسپتالوں سے رابطہ کیا ہے، ڈونر کا بندوبست ہو جائے گا۔“

پھر اُس کی آواز میں سرد دلی کی لہر آئی،

۔ ”لیکن پھر بھی ایمان کو اپنے شکنجے میں رکھو۔ تمہیں اسے اپنے جال میں پھانسا ہو گا۔“

آمنہ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ماضی کی یادیں تیر گئیں، جہاں ایمان کے ساتھ کیے گئے ظلم و ستم کی تصویر ابھر آئی۔ اُس کی آنکھوں میں پشیمانی کی ہلکی سی جھلک آئی، مگر وہ جلد ہی لالچ اور خود غرضی کی چادر میں لپٹ گئی۔

۔ اُس نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا،

۔ ”وہ اپنا گردہ مجھے کیوں دے گی؟“

آصف کی آنکھوں میں ایک عجیب و غریب چمک تھی، جیسے اُس کے دماغ میں کوئی اور گہری چال پل رہی ہو۔۔

”اگر تم چاہو تو، میں اُس کے غائب ہونے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔“

یہ سنتے ہی آمنہ کی کمرسیدھی ہو گئی، اُس کی آنکھوں میں دلچسپی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے حیرانی سے آصف کو دیکھا، پھر دھیرے سے پوچھا،

”کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟“

آصف کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی، اُس نے آمنہ کی پیشانی کو چومتے ہوئے پُر عزم لہجے میں کہا،
”تمہارے لیے کچھ بھی کروں گا۔“

آمنہ نے لمحے بھر کو سوچا، پھر اُس کی آواز میں بے صبری اور لالچ واضح ہو گئی۔ ”تو پھر وقت ضائع مت کرو، آصف۔“

آصف نے دھیرے سے سر ہلایا، اور اُس کی آنکھوں میں پلتے ہوئے خطرناک منصوبے کی جھلک مزید گہری ہو گئی۔ کمرے کی فضا میں ایک ناپاک سازش کی خوشبو پھیل گئی تھی، جس نے اُن دونوں کے گھناؤنے ارادوں کو مزید تقویت دی۔

...°...

ایمان بے چین کروٹیں بدلتی، پسینے میں شرابور، بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کا جسم بے اختیار کپکپا رہا تھا، جیسے کوئی انجانا خوف اُس کے وجود کو جکڑ رہا ہو۔

اُس کی آنکھیں بند تھیں، مگر اس خواب نے، جس میں وہ مکمل طور پر ڈوب چکی تھی، ایک ایسی حقیقت کی جھلک دکھائی جو اُس کے اندرونی خوف کو چھوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

خواب میں ایمان نے خود کو ایک وسیع ویرانے میں پایا، جس کی فضا گھٹن زدہ تھی، اور ہر طرف گرد و غبار کے بادل منڈلا رہے تھے۔

آسمان، جو کبھی نیلا اور وسیع تھا، اب پیلا اور دھندلا ہو چکا تھا، جیسے کائنات خود ہی کسی عذاب کے شکنجے میں ہو۔

اس کے چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ ہوا میں جھک رہے تھے، اُن پر گرد اور مٹی کی موٹی تہہ تھی۔ پہاڑ، جو ایک زمانے میں طاقت اور جلال کی علامت تھے، اب انکسار اور بربادی کا نمونہ بن چکے تھے۔ ہر شے لرز رہی تھی، جیسے قیامت کا غمناک منظر ہو۔

اچانک، ایمان کی نگاہ ایک زبردست فرشتہ کی طرف گئی، جس کی آنکھیں غیر فانی علم اور نور سے بھری ہوئی تھیں۔

اُن آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی، جو کسی انسان کی آنکھوں میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اُس فرشتے کے ہاتھوں میں تر ہی نما ایک وسیع ترم تھا، جسے وہ ہولناک سُر کے ساتھ بجانے والا تھا۔ فرشتے کے چہرے پر کوئی نرمی یا ترس کا شائبہ نہیں تھا، بلکہ صرف آسمانی فیصلہ کا وزن تھا۔

جیسے ہی فرشتے نے اُس ترم میں پھونک ماری، ایک ناقابل بیان صدمہ پوری کائنات میں پھیل گیا۔ ہوا میں لرزش پیدا ہوئی، زمین ہلنے لگی، اور آسمان کی وسعتیں ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ ستارے اپنے مقام سے نکل کر بلیک ہولز میں غائب ہو گئے، اور فضا میں ایک گہرا خوف پھیل گیا۔ دنیا کی ہر شے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی۔

ایمان کے سامنے لاکھوں کروڑوں روحیں نظر آئیں، چھوٹے کیڑوں کی مانند، جو بے بسی کے عالم میں ایک ہی سمت میں چل رہی تھیں، جیسے کسی کے رحم و کرم پر ہوں۔

ہر ایک روح اپنی تقدیر کا سامنا کرنے کے لیے ترازو کے سامنے قطار میں کھڑی تھی۔ فرشتے ترازو کے ساتھ کھڑے تھے، ہر انسان کے اعمال کا باریک بینی سے وزن کر رہے تھے، ہر نیت اور ہر عمل کا حساب لیا جا رہا تھا۔

ایمان کی سانسیں تیز ہو گئیں، اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے خود کو اُن روحوں کے درمیان پایا، جیسے وہ بھی اپنے اعمال کے وزن کے لیے پیش ہو رہی ہو۔

اُس کے ارد گرد کے لوگوں کے چہرے سیاہ ہو چکے تھے، اُن پر مایوسی اور خوف کی لکیریں تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں ایک گہرا اچھٹاوا تھا، جیسے وہ جانتے ہوں کہ اُن کے انجام کا وقت قریب آچکا ہے۔

اچانک، ایمان کی سماعتوں میں سورہ عبس کی آیات کی آواز گونجنے لگی:

تو جب (قیامت کا) غل مچے گا۔

اس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا۔

اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹے سے۔

ہر شخص اس روز ایک فکر میں ہو گا جو اسے (مصروفیت کے لیے) بس کرے گا۔

اور کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے۔

خنداں و شاداں (یہ مومنان نیکو کار ہیں)۔

اور کتنے منہ ہوں گے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی۔

اور (سیاہی چڑھ رہی ہوگی)۔

یہ کفار بد کردار ہیں

آیات کی صدا نے ایمان کے دل کو دہلا دیا، جیسے وہ اُس حتمی دن کا سامنا کر رہی ہو، جہاں کسی کی مدد ممکن نہیں تھی، جہاں ہر شخص اپنی فکر میں گم تھا۔

وہ منظر اُس کے ذہن پر ایسے نقش ہو گیا جیسے کوئی بھیانک حقیقت ہو، جس سے فرار ممکن نہ ہو۔

اچانک، ایمان نے خود کو ایک زبردست ترازو کے سامنے پایا، جہاں اُس کے اعمال کو تولاجا رہا تھا۔

اُس کے دل میں ایک خوفناک احساس پیدا ہوا، جیسے اُس کی ہر نیت، ہر غلطی اُس کے سامنے بے نقاب ہو رہی ہو۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا، سانسیں اکھڑ گئیں، اور پسینہ اُس کے ماتھے سے بہنے لگا۔ وہ خوف کے مارے چیخنے لگی، مگر اُس کی آواز دب گئی۔

اُس کا جسم خواب میں تڑپنے لگا، بستر پر بے چین حرکتیں کرتے ہوئے وہ ہر طرف سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اُس کی سانسیں تیز تھیں، ماتھے سے بہتے پسینے نے اُس کے چہرے کو گیلا کر دیا تھا۔ ایمان کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے، اور اُس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کی سلوٹیں تھیں۔

اُس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے کسی بڑے طوفان سے پہلے کی خاموشی ہو۔

جب اُس نے آخری بار فرشتے کو اُس کے سامنے دیکھا، ترازو کے پلڑے جھکتے ہوئے محسوس کیے، اور انسانیت کی چیخیں اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں، وہ تڑپ کر بیدار ہو گئی۔

ایمان کی آنکھیں حیرانی میں کھلی تھیں، اس کا جسم بستر پر ہلکی سی جھٹک سے سیدھا ہو گیا۔

خواب کا اثر ابھی بھی اس کے دل کی دھڑکنوں پر بھاری تھا، اور پسینے کے قطرے اس کے ماتھے سے ٹپک رہے تھے۔ کمرے کی خاموش فضا میں اُس کی بے چین سانسیں گونج رہی تھیں، اور اُس کی آنکھوں میں خوف کی جھلک عیاں تھی۔

اس خواب کی وحشت، جو اُسے بار بار اپنی گرفت میں لے لیتی تھی، اُس کے وجود کے اندر ہلچل پیدا کر چکی تھی۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھی، سر جھکائے، اپنی لرزتی ہوئی انگلیوں سے بستر کی چادر کے کنارے کو مروڑ رہی تھی۔

دل کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے، اُس نے ایک گہری سانس لی اور بے آواز اپنے آپ سے سوال کیا،

”۔

ہمیشہ اس وقت ہی یہ خواب مجھ پر کیوں لوٹ آتا ہے؟ ”۔

اس کی آواز مدھم اور خوف کی آمیزش سے تھر تھرا رہی تھی۔ خواب کا وزن اس کے دل و دماغ پر بوجھ بن کر لٹک رہا تھا، اور اُس کے اندر ایک عجیب سی پریشانی اور بے چینی بیدار ہو چکی تھی۔

کمرے کی مدہم روشنی میں وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی، اور اپنے عکس کو گھورتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں تھکن اور الجھن نظر آئی۔

اُس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے ابھر آئے تھے، جیسے نیند کی کمی اور ذہنی دباؤ نے اُس کے وجود کو کمزور کر دیا ہو۔ وہ لمحہ بھر کے لیے اپنی صورت کو تکتی رہی، جیسے اپنے آپ کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ مگر آئینہ اس کے سوالات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

ایمان نے پلٹتے قدم بڑھاتے ہوئے بستر کے قریب پہنچ کر، پرانے اور شکستہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے جگ سے پانی کو گلاس میں انڈیلا۔ پھر گلاس کو تھامے ہوئے، وہ دوبارہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کچھ ثانیے وہ اپنا عکس آئینے میں دیکھتی رہی۔

آخر کار، ایمان نے عزم کے ساتھ اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ پانی کی بوندیں اُس کے گالوں پر سے بہہ کر نیچے گر رہی تھیں، مگر وہ اندر کی آگ کو بجھانے میں ناکام تھیں۔

یہ خواب اُس کے لیے ایک معمہ تھا، ایک خوفناک راز جو وقتاً فوقتاً اس کی زندگی میں آکر اس کے ذہن و دل کو جھنجھوڑتا تھا۔

اُس نے خود سے وعدہ کیا کہ وہ اس خواب کا جواب تلاش کرے گی، چاہے اسے کتنی ہی دیر کیوں نہ لگے۔

اُس نے جلدی سے اپنے آپ کو جمع کیا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ جیسے ہی وہ تنگ اور بوسیدہ کمرے سے قدم باہر رکھتی ہے، اُس کے ارد گرد کا ماحول یکسر بدل جاتا ہے۔

وہ جس راہداری میں داخل ہوئی، اُس کی ہر چیز اُس کے عاجزانہ کمرے کے مد مقابل تھی۔ ہر طرف دولت اور خوشحالی کے آثار نمایاں تھے۔

دیواروں پر سچی ہوئی تصویریں، قیمتی آرٹ پیسز اور ہموار قالین، یہ سب عیش و آرام کی داستانیں سنار ہے تھے۔ فانوس کی روشنی اُس کی آنکھوں کو چندھیار ہی تھی، جیسے وہ خود کو غیر معمولی دنیا میں پار ہی ہو۔ وہ چلتی رہی، اُس کے قدموں کی آہٹ خاموش کوریڈور میں گونج رہی تھی۔

اچانک، وہ ایک کشادہ کھڑکی کے پاس جا کر رک گئی۔ باہر کا منظر ایک دلکش باغ کا تھا، جو سکون اور خاموشی کا مظہر تھا۔

باغ میں پھولوں کی قطاریں، درختوں کی سبز چھاؤں اور چلتی ہوئی ہوانے اسے لمحہ بھر کے لیے ایک نرمی کا احساس دیا، لیکن اس کے دل میں بسنے والی بے چینی اس خوبصورتی کو نہ سراہ سکی۔

اچانک، اُس نے اپنے سوتیلے بھائی کو دیکھا جو باغ کی دوسری طرف کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سگریٹ تھا اور وہ بے فکری سے اُس کا دھواں ہوا میں اُڑا رہا تھا، جیسے روزے کی کوئی قدر و منزلت نہ ہو۔

ایمان کے لبوں پر ایک چھوٹی سی طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس کی آنکھوں میں چمک آئی، اور اُس نے فوراً اپنے موبائل فون کو نکال کر اُس لمحے کو قید کر لیا۔“

اس چینی پتی ڈالڈا منحوس، ماری خالده کا بیٹا، جسے ماں روزہ دار بننے کی تلقین کرتی ہے، یہاں اپنی عادتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے، دوسروں کو کافر کہتی ہے خود کے بیٹے کی حرکتیں دیکھے ”اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔

یہ لمحہ ایمان کی اُس دنیا کی عکاسی تھی جس میں وہ رہ رہی تھی؛ ایک ایسی دنیا جہاں دولت اور اخلاقیات ایک دوسرے کے متضاد دکھائی دیتے تھے، اور جہاں طاقتور لوگ اپنے اعمال کے نتائج سے بے خبر زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایمان جانتی تھی کہ اسے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے چالاکی اور ہوشیاری کا مظاہرہ کرنا پڑے گا، اور آج اس کا پہلا قدم اٹھایا جا چکا تھا۔

خواب کی گہرائیوں سے نکل کر اب وہ حقیقت میں بھی اپنی زندگی کے مسائل کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔ ایمان کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ ظاہری دولت اور عیش و آرام محض فریب ہیں، اصل حقیقت اندر کی

پچیدگیوں میں چھپی ہوتی ہے۔ اور یہ خواب، جو اس کے دل میں خوف کے بیج بو رہا تھا، دراصل اسے اندرونی طاقت کی طرف مائل کر رہا تھا۔

...°...

مرصع زینہ پر قدم رکھتے ہوئے ایمان کی ہلکی سی چاپ اُس پر شفاف پالش کردہ پتھروں سے ٹکرا کر واپس پلٹ رہی تھی۔

ہر قدم کے ساتھ، ایک نامعلوم اندیشہ دل میں سرایت کر رہا تھا، جیسے کوئی پوشیدہ دکھ اُس کے وجود پر بوجھ بن رہا ہو۔

اُس نے پل بھر کے لیے پیتل کی آراستہ منڈیر کو تھاما، اس کے انگوشت اُس کی سطح کی ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے یوں لرز رہے تھے گویا کوئی قدیم راز چھپا ہو۔

وہ نرمی سے ریلنگ پر جھولتے ہوئے نیچے آرہی تھی، جیسے کسی ماضی کے خواب کی بازگشت ہو جو حال میں گونج رہا ہو۔

جیسے ہی منڈیر کی نازک بناوٹ اپنے اختتام کو پہنچی، اُس نے دھیرے سے چھلانگ لگائی، اُس کے قدموں نے فرش کو چھوا تو اُس کا وجود بالکل متوازن اور پرسکون رہا۔

اُس کی نگاہیں ساکت ہو کر اُس دروازے پر مرکوز ہو گئیں

جو اُسے گھر میں موجود مسجد کی طرف لے جا رہا تھا، جہاں نہاں گوشہٴ عبادت اُس کا منتظر تھا۔ مسجد کی دیواریں چُنی ہوئی تھیں، عمیق خاموشی کا لمس ہر کونے میں بکھرا ہوا تھا، جیسے آس پاس کا سارا شور رُک چکا ہو۔ اُس کے قدم احتیاط سے آگے بڑھتے گئے، ایک پر اسرار تقدس اُس پر سایہ کیے ہوئے تھا۔

اچانک اُس کی نظریں اُس قدیم الماری پر پڑیں، جس میں قرآن مجید رکھا ہوا تھا۔ اُس کے صفحات، جیسے سنہرے ذرات سے مزین، ایک روشنی بکھیر رہے تھے۔

ایمان نے نرمی سے الماری کے دروازے کو کھولا، قلابے اپنی مدھم چیخ کے ساتھ جھکے۔ اُس نے مقدس کتاب کو تھاما، اُس کے ہاتھوں میں قرآن کا وزن، جیسے آسمانی حقائق کی زمیں پر دستک دے رہا ہو، اُسے محسوس ہوا۔

پہلی بار، وہ مقدس کتاب کو اپنے سامنے تھام رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا، جذبات کا ایک طوفان اُس کے اندر اُٹ رہا تھا۔

اُس کی آنکھوں سے آنسو بے قابو ہو کر گالوں پر بہہ نکلے۔ عاجزی کے احساس نے اُس کی روح کو جھنجھوڑ دیا، پھر بھی اُس کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔

۔ ”ہم اس نعمت کے لائق نہیں تھے پھر بھی اللہ نے تمہیں ہماری رہنمائی کے لیے اتارا۔“

اُس کی سرگوشی دھندلی مگر گہری تھی، جیسے کسی نے صدیوں کی خاموشی توڑ دی ہو۔

پھر، اس نے قرآن کو اپنے ماتھے سے لگا لیا، اس کی ٹھنڈک دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ جیسے مقدس الفاظ نے اُس کے اندر کے سارے سوالات کا جواب دے دیا ہو۔

ایمان نے قرآن کو پیشانی سے الگ کیا

اس کی انگلیاں بے حد احتیاط سے قرآن کے باریک صفحات کو پلٹ رہی تھیں،

جیسے وہ مقدس کلمات کی نزاکت سے آگاہ ہو۔

اُس کی آنکھیں عربی خطاطی کی خوبصورتی کو سراہتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں، مگر جلد ہی اُس کا ابتدائی جوش دم توڑنے لگا۔

ایک حقیقت اُس پر سایہ فگن ہوئی، جب اُسے احساس ہوا کہ اس کے سامنے کوئی اردو ترجمہ موجود نہیں تھا۔ مایوسی کی گہری لہر اُس کے دل پر چھا گئی، اور اُس نے زیر لب آہ بھر کر کہا، ”یہ تو عربی میں ہے۔۔۔“

اچانک، اُس کے اندر ایک نیا عزم جاگ اٹھا۔ ”شاید خالدہ نے مجھے بھی اپنے بچوں کی طرح قرآن سکھایا ہوتا۔۔۔“

اُس نے خود سے سرگوشی کی، جیسے وہ کسی بھولی بصری یاد کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اُس کی سوتیلی ماں خالدہ نے اپنے بچوں کو مقدس صحائف پڑھانے کی بھرپور کوشش کی تھی، مگر ایمان کو اس سچائی کا ادراک نہ تھا کہ اُس کا قرآن کے ساتھ تعلق دوسروں سے کس قدر مختلف تھا۔

خالدہ کے بچے ہر صبح قرآن کی تلاوت کرتے، اُن کے ہونٹوں سے بے جان الفاظ بہتے، جیسے رسم تلاوت ہو، مگر معنی کی گہرائی سے نا آشنا۔

یہ اُن کے لیے ایک محض ظاہری فریضہ تھا، ایک رسم جو الفاظ کی روح کو اپنی گرفت میں نہ لے پائی تھی۔ مگر ایمان کا دل اس قدر بے لوث تھا، اس کی تڑپ اُس بے شمار لوگوں کی طرح تھی جو قرآن کی گہری حکمت تک رسائی چاہتے ہیں، لیکن زبان کی بندش انہیں روک لیتی ہے۔

ایمان کا عزم اُن کا استعارہ تھا، جو قرآن کو سمجھنے کی آرزو رکھتے ہیں اور اس کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونا چاہتے ہیں۔

اُس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے کوئی پیاسا مسافر خشک زمین پر بارش کے منتظر ہو۔

وہ صرف قرآن پڑھنے کی نہیں، بلکہ اُس کے معنوں کو کھوجنے اور اُن میں موجود روحانی حکمت کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کی خواہش مند تھی۔

یہ ایک المیہ تھا کہ کئی لوگ قرآن کے الفاظ کو پڑھتے ہیں مگر اُن کے مفہیم سے ناواقف رہتے ہیں، جیسے کہ الہی ہدایت اُن کے سامنے ہے مگر وہ اُسے چھو نہیں سکتے۔ ایمان کا عزم ایک واضح اشارہ تھا کہ قرآن کی گہرائیوں کو سمجھنا ایک خاص نعمت ہے، اور اس کی قدر دانی کرنی چاہیے۔

--

دنیا کی وسعتوں میں، ایسے افراد بستے ہیں جو قرآنی آیات کے اندر پنہاں دانش کے دریاؤں میں غوطہ زن ہونے کی آرزو رکھتے ہیں، جو اس مقدس صحیفے کے ایک ایک لفظ میں موجود روحانی حکمت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جذب کرنے کے متمنی ہیں۔

تاہم، کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی بصیرت کے باوجود جہالت کے تاریک پردوں میں گم ہیں۔ ان کے لیے قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو تو سامنے رکھی ہوئی ہے، مگر اُس کے صفحات میں لپٹی الہی ہدایت تک اُن کی رسائی نہیں ہو پاتی۔

گویا وہ ایک ایسا خزانہ ہے جس کی موجودگی تو اُن کے لیے ہے، مگر اُس تک پہنچنے کی توفیق انہیں حاصل نہیں ہو سکی۔

ایسے عالم میں ہم جو کہ فہم و فراست کی دولت سے مالا مال ہیں، واقعی خوش نصیب ہیں۔

ہمارے پاس وہ دوہری نعمت ہے کہ ہم قرآن کو اس کی اصل زبان عربی میں پڑھنے اور اس کے ترجمے کو اپنی مادری زبان اردو میں سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ کوئی عام سعادت نہیں، بلکہ ایک اعلیٰ اعزاز ہے، جسے سرسری طور پر لینا علم کے دروازے بند کرنے کے مترادف ہے۔

یہ فہم کے وہ وسیع دروازے کھولتا ہے جو ہمیں نہ صرف الہامی پیغام تک پہنچاتے ہیں بلکہ ہمیں اس کی روحانی روشنی سے سرفراز بھی کرتے ہیں۔

کیا یہ سوال کبھی ہمارے دل میں آیا کہ ہم، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس عظیم سعادت سے نوازا ہے، کیوں اُس وحی کی گہرائی میں اُترنے کے لیے وقت نہیں نکالتے؟ کیوں ہم، جو فہم کی دولت رکھتے ہیں، اُس کتاب کی طرف رجوع نہیں کرتے جسے ہمارے خالق نے ہمارے لیے ہدایت کا ذریعہ بنایا ہے؟ قرآن صرف عربی زبان بولنے والوں تک محدود نہیں، بلکہ اس کا پیغام ہر اُس دل کے لیے ہے جو اُس کو سمجھنے اور اپنانے کی طلب رکھتا ہو۔

حتیٰ کہ وہ لوگ جو قرآن کو عربی میں روانی سے پڑھ سکتے ہیں، بھی اُس کے ترجمے میں پوشیدہ مزید گہرائیوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

اردو زبان میں قرآن کا ترجمہ اس کے معانی کو مزید واضح اور آسان فہم بناتا ہے، اور یوں ہماری سمجھ بوجھ میں ایک نئی جہت پیدا کرتا ہے۔

ہمیں ان لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے جو اس مقدس کتاب کو سمجھنے کی آرزو رکھتے ہیں، جو قرآن کے معانی کی پیاس رکھتے ہیں مگر انہیں پوری طرح سمجھ نہیں سکتے۔ ہمیں وہ نعمت جو ہمیں عطا کی گئی ہے، ضائع نہیں

کرنی چاہیے۔ یہ علم اور ہدایت کا خزانہ ہے، جو نہ صرف ہمارے راستے کو روشن کرتا ہے بلکہ ہماری روحوں کو بھی جلا بخشتا ہے۔

یہ غور و فکر ہمیں ہماری ذمہ داری کی یاد دلاتا ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم قرآن سے جڑنے کی اپنی صلاحیت کی قدر کریں، کیوں کہ بے شمار لوگ اس نعمت کی خواہش رکھتے ہیں لیکن اس تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

یہ ہمارے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے، ایک الہامی روشنی، جسے ہمیں اپنے اندر جذب کرنے کی جستجو کرنی چاہیے تاکہ ہم دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکیں۔

،

گزشتہ منظر کی بازگشت۔

ایک پُر سکون، سورج کی روشنی سے بھرے کمرے میں ہلکی ہلکی تلاوتِ قرآن کی آواز فضا کو روحانی سکون بخش رہی تھی۔

ایمان، ایک آٹھ سالہ معصوم بچی، شیشے کے دروازے کے پاس گھٹنے ٹیک کر اس کی صفائی میں مگن تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ، کپڑے کو بڑے دھیان اور احتیاط سے حرکت دے رہے تھے، جبکہ اس کی نظریں بار بار دروازے سے باہر گیسٹ روم میں بیٹھے لوگوں کی طرف جاتی رہتیں۔

مہمان خانے میں ایک خاندانی منظر رواں تھا۔ سندس کے والد، سرور، وقار اور متانت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اور ان کے گرد ایمان کی سوتیلی بہنیں اور بھائی جمع تھے۔

وہ سب قرآن کی سریلی تلاوت میں مصروف تھے، ان کی آوازیں کبھی اونچی تو کبھی مدھم ہو جاتیں، جیسے مقدس آیات کا نور ان کے دلوں سے نکل کر فضا میں رقص کر رہا ہو۔

سرور استاد، جو اس گھر کی ایک قابل احترام شخصیت تھے، ایمان کی سوتیلی بہن عبیرہ کو قرآن چومنے اور تلاوت جاری رکھنے کی ترغیب دے رہے تھے۔

کمرہ قرآنی آیات سے گونج رہا تھا، اور ایک عجیب سا روحانی تعلق اور اتحاد اس لمحے کو خاص بنا رہا تھا۔

تاہم، اس سکون میں اچانک دراڑ پڑ گئی جب خالدہ، ایمان کی سوتیلی ماں، اس کے عقب میں نمودار ہوئی۔

اس کی موجودگی نے فضا میں جیسے ایک سرد ہوا کا جھونکا چھوڑ دیا۔ وہ ایمان کے قریب آئی اور اس کا کان مضبوطی سے پکڑ لیا، جیسے وہ ایک معمولی سی غلطی کو برداشت کرنے کو تیار نہ ہو۔

ایمان کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں، اور اس کی سانس تیز ہو گئی۔ خالدہ نے اسے بغیر کسی رحم کے کھینچتے ہوئے پیچھے دور ایک کونے میں لے جانا شروع کر دیا، اور ایک جگہ پر رک کر، غصے سے بھری آواز میں اس سے مخاطب ہوئی۔

۔ ”تو یہاں کھڑی کیا دیکھ رہی تھی؟“

اس نے پوچھا، اس کی نگاہوں نے ایمان کی معصوم روح کو جیسے چھلنی کر دیا ہو۔۔۔ ”میرے کپڑے کون استری کرے گا؟“۔

خالدہ کی بے صبری اور غصہ اس کے الفاظ میں نمایاں تھا، اور کمرے کی فضا بو جھل ہو گئی۔
ایمان کا دل دھڑکنے لگا، جیسے اس کی نازک روح پر ایک بوجھ سا پڑ گیا ہو۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں کے غصے کے سائے میں دبے دبے انداز میں، کانپتے ہونٹوں سے بمشکل آواز نکالی، ”میں امی وہ۔۔۔“۔

یہ ہی لمحہ تھا جب خالدہ کا ہاتھ غصے سے بھرپور حرکت میں آیا، اور ایمان کے گال پر زوردار تھپڑ پڑا۔ اس کے چہرے پر دکھ اور تکلیف کا سایہ چھا گیا۔ خالدہ کے الفاظ سرد اور کاٹنے والے تھے۔
۔۔۔ ”میں تیری ماں نہیں ہوں۔۔۔“۔

اس کے تیز الفاظ جیسے چھری کی طرح دل میں چبھے۔ کمرے کی فضا مزید بو جھل ہو گئی، جیسے ہوا بھی ایمان کے خلاف ہو گئی ہو۔

۔۔۔ ”تو میری نوکر ہے۔ میں ہی تجھے کھلا رہی ہوں۔ ماکن بول، ماکن!“۔

خالدہ کی زبان سے نکلے یہ الفاظ ظلم اور حقارت سے بھرے ہوئے تھے، اور ایمان نے خود کو بے بس اور مظلوم محسوس کیا۔

ایمان کا دل دھیرے دھیرے مزید بوجھل ہوتا چلا گیا، اور وہ اپنی حیثیت کی تلخ حقیقت کو دوبارہ جھیلنے لگی۔

خالدہ کے غصے اور ظلم کا بوجھ اپنے نازک کندھوں پر اٹھاتے ہوئے، اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں، جیسے اس کے دل میں کوئی عزم ٹوٹ گیا ہو۔

مہمان خانے سے قرآن کی تلاوت کی مقدس آوازیں اب بھی گونج رہی تھیں، لیکن ایمان کے دل کی دنیا میں جیسے تاریکی کا راج تھا۔

ایمان، ایک ڈرپوک آٹھ سالہ لڑکی، جس کی چوڑی، معصوم آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا، اپنی سوتیلی ماں خالدہ کے سامنے کھڑی لرز رہی تھی۔

اس کی چھوٹی سی آواز لرزتی ہوئی نکلی، جیسے اندر کی ہمت کو جمع کرنے کی کوشش کر رہی ہو،
- ”مجھے بھی پڑھنا ہے جو میرے بہن بھائی پڑھ رہے ہیں۔“ -

خالدہ کی آنکھوں میں سردی اور ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تیر گئی۔

- ”تو اپنے آپ کو میرے بچوں کے ساتھ ملا رہی ہے؟ تو دو پیسے کی اوقات، رکھنے والی لڑکی!“ -

اس نے حقارت بھرے لہجے میں کہا، اس کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔

کمرے کی دیواریں جیسے ایمان کے گرد تنگ ہوتی جا رہی تھیں، خالدہ کے سخت الفاظ نے ایمان کے نازک دل کو چھید دیا تھا۔ وہ شکست کے احساس میں ڈوبی ہوئی، دھیرے سے ہچکچائی، ”لیکن... لیکن...“۔

خالدہ نے ایک تیز اشارے سے اسے خاموش کروا دیا۔ اس کا ہاتھ اچانک آگے بڑھا، اور اس نے ایمان کی کمر پر سختی سے تھپڑ مارا، جس کی شدت نے ایمان کی ریڑھ کی ہڈی تک لرزاں کر دیا۔

ایمان کی آنکھیں پلک جھپکنے سے پہلے ہی بھر آئیں، لیکن وہ خاموش رہی، جیسے رونے کا حق بھی اس سے چھین لیا گیا ہو۔

۔ ”تو!“۔

خالدہ کی آواز تیز اور حکم دیتی ہوئی تھی

۔ ”میرے کپڑے استری کر۔ تیرے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ منحوس!“۔

ایمان نے سر جھکایا، اس کے کندھے جھکے ہوئے، جیسے ساری دنیا کا بوجھ اس کی نازک جسم پر لا دیا گیا ہو۔ جب وہ پلٹی اور کپڑے استری کرنے کے لیے مڑی، اس کے چھوٹے ہاتھ لرزتے ہوئے اس کے جسم کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے، دل اندر سے خالی اور ٹوٹا ہوا۔

وہ خاموشی سے آگے بڑھی، آنکھیں زمین پر جمی ہوئی، جیسے وہ اپنے ہی گھر میں کسی پرائے کی طرح ہو۔

امروز

مسجد کے پرسکون ماحول میں اٹھارہ سالہ ایمان خاموشی سے کھڑی تھی۔ اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی خاموشی اس کے اندر چلنے والے طوفان کی عکاسی کر رہی تھی۔ صبح کی نرم دھوپ داغدار شیشے کی کھڑکیوں سے چھن کر فرش پر بکھر رہی تھی، نماز کے قالین پر رنگین سائے ڈال رہی تھی۔ ایمان کے ہاتھ میں قرآن تھا، اور اس کے دل میں ایک عجیب کشمکش۔

اسی لمحے، ایک سرد آواز نے اس کے وجود کو ہلا دیا۔ وہ آواز خالدہ کی تھی، جو خاموشی سے پیچھے آ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ اس کی آواز میں حقارت اور غصے کا زہر بھرا ہوا تھا۔

۔ ”اوو واللہ!“ خالدہ نے سر پکڑتے ہوئے افسوس بھرے انداز میں کہا،

۔ ”یہ پلٹ بھنگن، شراب پینے والی کافرہ، زانیہ نے قرآن چھو لیا! ہائے میرے اللہ! قرآن کو اس ناپاک ہاتھوں والی نے ہاتھ لگایا! بے غیرت، جس کے گندے ہاتھ ہیں، وہ اس مقدس کتاب کو کیسے چھو سکتی ہے؟“۔

ایمان کا دل دھڑکنے سے رک گیا۔ قرآن اس کے لیے سکون کا ذریعہ بھی تھا اور ایک اندرونی طوفان کا باعث بھی۔

اس کی سانسیں تیز ہو گئیں، لیکن اس لمحے اس نے اپنے اندر کی تلخی کو زبان پر آنے دیا۔

۔ ”اگر تجھے قرآن کی اہمیت کا علم ہوتا، تو تو نے مجھے بھی سکھایا ہوتا جیسے اپنے بچوں کو سکھایا تھا۔ میں آج یہ نہ ہوتی جو بن گئی ہوں۔“

ایمان کے الفاظ میں ایک عجیب درد اور ملامت تھی۔

خالدہ کی آنکھیں حیرت اور الجھن سے پھیل گئیں، جیسے کسی بھاری پتھر نے اس کے سینے پر جا کر مارا ہو۔ وہ چند لمحوں تک ساکت رہی، پھر ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے تیز آواز میں بولی،

۔ ”زانیہ! یہ طعنے اپنی ماں کو دے، جس نے تیرے بارے میں نہ سوچا تو میں کیوں سوچوں؟“

خالدہ نے غصے میں قرآن کو دوبارہ جگہ پر رکھ دیا، اور اس کی نظروں میں نفرت چھلک رہی تھی۔ ایمان نے طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کہا،

”اگر میری ماں کنویں میں چھلانگ مارے گی تو تو بھی مارے گی؟“

خالدہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے ایمان کی طرف لڑا کا انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

۔ ”اری او بہن، تو زانیہ ہے! کافر ہے تو! اور قرآن میں ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا گیا ہے کہ جہنم ان کا

مقدر ہے، جن و انس کے لیے بنائی گئی آگ میں جلنے والی تو ہی ہے۔ شیطان کے ساتھ جہنم میں ناچ ناچ کر

کمر ہلا!“

اس نے ایمان کو تلخی سے دیکھا ”حرام کی پیدائش“۔

خالدہ کے الفاظ ایمان کی روح کو چھلنی کر رہے تھے، لیکن ایمان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا،

۔ ”واہ، جیسے میکائیل تم سے ہوا تھا! بھول گئی؟ تم زانیہ ہو۔ تمہارا بیٹا حرام کا ہے، میں نہیں!“۔

خالدہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، جیسے کسی نے اس کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا ہو۔ وہ چند لمحے تک بے زبان رہی، پھر چلاتے ہوئے بولی

۔ ”زانیہ! تو ہی ہے جس نے سوتیلے باپ کے بستر کو رنگین کیا! بھول گئی؟ تیری ماں نے تیرے کالے کرتوت چھپانے کے لیے تیرا بچہ پیٹ میں ہی مروادیا، ورنہ تیرا باپ تو تجھے مار دیتا!“۔

خالدہ کے الفاظ سن کر ایمان کے دانت کچکا اٹھے۔ اس کی آنکھیں نفرت سے سرخ ہو گئیں، جیسے وہ کوئی بھری ہوئی شیرنی ہو۔ اس کی سانسیں تیز ہو گئیں، اور غصے کی لہر اس کے جسم میں دوڑنے لگی۔

اچانک مسجد میں ایک زوردار چٹاخ کی آواز گونجی۔ خالدہ نے اپنا دایاں گال پکڑا، جہاں سے خون رس رہا تھا۔

ایمان نے جب اپنے ہاتھ سے خالدہ کے چہرے کا سامنا کیا تو اس کے اندر ایک طوفان برپا ہو چکا تھا۔ اس کا جسم غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا، اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے کانوں سے دھواں نکل رہا ہو۔

اس نے انگلی اٹھا کر خالدہ کی طرف اشارہ کیا اور تنبیہی انداز میں کہا،

۔ ”آئندہ یہ الفاظ اپنی زبان سے نہ نکالنا۔ خدا کی قسم، اگر دوبارہ تُو نے یہ جملے کہے، تو میں تیرا ایسا حشر کروں گی کہ ایف ٹین کے کوڑے کے ڈھیروں میں منہ مارنے والے خنزیروں کو تیرے بدن کا گوشت تک نصیب نہیں ہوگا۔ میں وہ پرانی نینسی نہیں رہی جو تیری باتوں سے ڈر جایا کرتی تھی۔ مجھے نفرت ہے اس نام سے جو میری ماں نے مجھے دیا تھا۔ مجھے نفرت ہے تم سب سے!“۔

ایمان کی آواز میں جوش اور غضب تھا، جیسے وہ اپنی زندگی کی تلخیوں کو زبان دے رہی ہو۔ اس نے مزید کہا،

۔ ”یاد رکھنا، تیرے بیٹے نے بھی مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا، اور تو نے بھی میرے بچے کو قتل کروا دیا تھا۔ میرا دوسرا بچہ... تم سب نے مل کر میری زندگی کو تباہ کیا، میرے وجود کو داغدار کیا، میری ہر یاد کو عذاب بنادیا!“۔

ایمان کا چہرہ نفرت اور درد کے ملے جلے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں چمک رہی تھیں۔ اس نے خالدہ کی طرف گھورتے ہوئے مزید کہا

- ”لیکن اب نہیں! اگر کسی نے بھی مجھ پر ظلم کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا، میں تم سب کو زمین پر گھسیٹ لاؤں گی۔ میں اپنے اندر موجود ڈی این اے کے ٹیسٹ کروا کر تمہاری اصلیت کو دنیا کے سامنے ننگا کر دوں گی۔ تمہیں اس حالت میں چھوڑوں گی کہ زمین پر پیر رکھنے کی جگہ بھی نصیب نہیں ہوگی!“۔

خالدہ ابھی تک حیرت میں گم تھی۔ ایمان کے تھپڑ کی حدت اس کے چہرے پر گہری سرخی کی صورت میں نمایاں ہو چکی تھی، اور اس کے گال سے خون کی باریک لکیر بہہ رہی تھی۔ وہ اس غیر متوقع صورت حال پر مبہوت کھڑی تھی۔

ایمان نے اپنے آنسوؤں اور جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا،۔

- ”تم سب ظالم ہو، اور تم سب میرے گناہ گار ہو۔ میرا رب اتنے عرصے تک مجھ سے ناراض رہا کیوں کہ میں غفلت میں تھی، مسلمان ہوتے ہوئے بھی اسلام کے راستے پر نہ چل سکی۔ آج، جب مجھے وہ حقائق معلوم ہوئے جو ہر بچے کو معلوم ہوتے ہیں، تو تم مجھے جہنمی اور کافر کہتی ہو؟ حقیقت میں جہنمی تو تم ہو، تم جیسے لوگوں کو اللہ اس دنیا میں موقع دیتا ہے، یاد رکھنا مکافاتِ عمل کی چکی آہستہ آہستہ چلتی ہے، لیکن جب

وہ پیستی ہے تو بہت باریک پیستی ہے۔ میرا اللہ تم سے میرے ساتھ کیے گئے ظلم کا بدلہ لے گا۔ اگر میں جہنم گئی تو تم بھی میرے ساتھ جہنم میں جاؤ گے۔”

یہ کہہ کر ایمان نے خالدہ کو دھکیل دیا، جو لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ایمان نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہاں سے اپنا راستہ بنایا اور آگے بڑھ گئی، جیسے اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ خود کر لیا ہو۔

...°... ---

گزشتہ منظر کی بازگشت

شاندار گھر کے عالیشان کمرے میں فضا تناؤ سے لبریز تھی، جہاں دولت اور جذباتی مفلسیت کا تضاد واضح تھا۔ آمنہ، ایمان کی حیاتیاتی ماں، آرام سے اپنے شاہانہ، قیمتی بستر پر نیم دراز تھی۔

اس کی انگلیاں بے فکری سے موبائل کی اسکرین پر تیز رفتاری سے چل رہی تھیں، جیسے وہ حقیقی دنیا سے بے نیاز ہو کر کسی ورچوئل دنیا میں محو ہو چکی ہو۔ آمنہ کے پاس کھڑا آصف، ایمان کا سوتیلا باپ، اپنی کرسپ پیٹ اور بہترین کاٹن کی شرٹ میں ملبوس، جیسے رعب و دبدبے کی چلتی پھرتی تصویر ہو۔ اس کی بے صبری بھری نگاہیں فرش پر جھکی ایمان کی جانب مرکوز تھیں، جو خاموشی سے پالش کیے گئے ماربل پر دوزانو بیٹھی، آصف کے مہنگے جوتے پالیش کر رہی تھی۔

ایمان، جس کی عمر ابھی تیرہ برس تھی، وقت سے پہلے ہی تھکن کی تصویر بنی نظر آتی تھی۔

اس کے نازک چہرے پر بچپن کی تازگی ماند پڑ چکی تھی، اور اس کی بڑی آنکھیں اپنی ماں اور سوتیلے باپ کے درمیان خوف سے گردش کر رہی تھیں۔ آصف کی آواز نے خاموشی کو چیرتے ہوئے حکم دیا،
- ”کتنا وقت لے رہی ہے، جلدی کر، کام چور؟“۔

اس کے الفاظ، جیسے دولت کے تکبر سے لبریز تھے، ایمان کو اس کے حقیر مقام کی ایک اور یاد دہانی دے گئے۔

آمنہ، جو اپنی مجازی دنیا میں گم تھی، اپنی بیٹی کے دل میں پنہاں درد اور اذیت سے بے خبر رہی، اس کی توجہ موبائل فون کی چمکدار اسکرین پر ہی مرکوز رہی۔ گو کہ وہ ایمان کی ماں تھی، مگر دونوں کے درمیان جذباتی فاصلہ ایک وسیع خلیج کی مانند تھا، جس نے ایمان کو اس کی اپنی دنیا میں تنہا کر دیا تھا، ایک ایسی دنیا جو مادی آسائشوں سے تو مالا مال تھی، مگر جس میں محبت اور گرمجوشی کی سخت قلت تھی۔

حویلی کی عیش و عشرت کے بیچ یہ منظر اور زیادہ دل شکن ہو چکا تھا۔ آصف کے جوتے، جنہیں ایمان نے بڑی احتیاط سے چکایا تھا، لا پرواہی سے اس کے کمزور کندھوں پر دھر دیے گئے۔

اس بے حسی کا بوجھ اس پر بھاری پڑا اور وہ اس غیر متوقع حملے سے لرز اٹھی۔ آصف کا قہقہہ، سرد اور سنگ دل، کمرے میں گونجا، جیسے ایمان کی تذلیل کو اور زیادہ گہرا کرنے کا ذریعہ ہو۔

اپنی ٹائی کو آخری مرتبہ درست کرتے ہوئے، آصف دروازے کی جانب بڑھا اور بے دھیانی سے بولا،
- ”آمنہ، میں باہر جا رہا ہوں، میری بچیوں کو بھی لے آؤ۔“

اس کے الفاظ میں جاہ و جلال کی جھلک تھی۔ آمنہ، جو اپنی جگہ سے ہٹنے کے لیے بظاہر تیار نہ تھی، موبائل کو چھوڑے بغیر بستر سے اتری۔

اپنی بیٹی کے درد و الم سے بے پروا، اس نے سختی سے کہا،

- ”اٹھو، جاؤ، نیچے جا کر اپنی بہنوں کے جوتے پالش کر کے انہیں پہنا دو، ان کے ڈیڈ انتظار کر رہے ہیں۔“

ایمان کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے کی رونق، جو کبھی گلابی تھی، اب سفیدی کی مانند ماند پڑ چکی تھی۔

اس کے ہونٹوں کی تازگی ختم ہو گئی تھی، اور اس کی نازک شخصیت کا وجود جیسے اپنی آخری حدوں تک پہنچ چکا تھا۔

اس حادثے کو اب مہینے بیت چکے تھے، وہ المناک واقعہ جس نے ایمان سے وہ معصومیت چھین لی تھی جسے وہ کبھی اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع سمجھتی تھی۔ اس عظیم الشان محل میں، جہاں ہر چیز کی فراوانی تھی، ایمان ایک خاموش اور زخمی روح بن چکی تھی، جو غلامی اور جذباتی غفلت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔

...°...

عاجز باورچی خانے کی فضا میں، ایمان لکڑی کی کرسی پر جھکی، اپنی تین سالہ سوتیلی بہن کے ننھے قدموں میں شوز پہنانے کی سست رفتار میں مصروف تھی۔

اس کی سادہ صورت حال ایک معمولی لان کے سوٹ میں چھپی ہوئی تھی، جس کے سر پر عام سا سکارف تھا، جیسے وہ اس کی عاجزی کا بوجھ سنبھالے ہوئے ہو۔

صبح کی مدھم روشنی کمرے میں ایک ایسی تنہائی اور سرد مہری کی کیفیت طاری کیے ہوئے تھی، جو اس حویلی کی شاہانہ عظمت سے میل نہ کھاتی تھی۔

ایمان کا وجود ایک خاموش ماتم بن چکا تھا، اس کی حرکات جیسے تھکن اور بد حالی کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھیں۔ اس کے مقابل، آمنہ اپنی نوخیز جوانی اور تروتازہ چہرے کے ساتھ بالکل متضاد منظر پیش کر رہی تھی، جس کی جلد کی چمک ایمان کی بربادی پر واضح برتری کی طرح نمایاں تھی۔

وہ اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو پیار سے جوتے پہنا رہی تھی، جیسے وہ اپنی غیر موجود شفقت کو جان بوجھ کر ایمان سے چھپاتی ہو۔

آمنہ کے نکھرے ہوئے چہرے اور اس کی بے حس مسکراہٹ کے بیچ فرق مٹ چکا تھا، گویا وہ دونوں ایک ساتھ ایمان کے دل کو چیرنے کے ہتھیار بن چکے ہوں۔

آصف کے اندر داخل ہوتے ہی اس خاموش کرب میں ایک بھونچال سا آگیا۔ اس نے ایمان پر اپنی برتری جمانے کے لیے بھاری ہاتھ اس کے سر پر مارا، جیسے وہ اس کی بے بسی پر مزید ظلم کا ایک بوجھ ڈال رہا ہو۔

تین سالہ سوتیلی بہن نے بھی معصومیت کے لبادے میں چھپے عفریت کی مانند، اپنے چھوٹے ہاتھ سے ایمان کو مارنے کی کوشش کی، جیسے اس ظلم کی مشق ابھی سے شروع ہو گئی ہو۔

آمنہ، جس کی آنکھوں میں سفاک مسکراہٹ جھلک رہی تھی، اس تماشے کو یوں دیکھتی رہی جیسے وہ ایمان کی بے قدری سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔

اس کے لبوں سے طنز بھرا جملہ نکلا،

۔ ”تم سدھرنے والی نہیں ہو، آصف،“۔

اس نے بے رحم مسرت کے ساتھ کہا، جیسے وہ جان بوجھ کر اس کی تکلیف کو مزید بھڑکار رہی ہو۔

آصف نے اپنی ننھی بیٹی کو گود میں اٹھاتے ہوئے ایمان کی طرف نفرت سے بھری نگاہ ڈالی۔ ”یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔“

اس نے غصے میں کہا، اس کے الفاظ میں زہر گھلا ہوا تھا۔ ”یہ ہی وجہ تھی کہ تمہیں اتنا انتظار کرنا پڑا، اور میں نے جتوئی کی اذیتیں اس کی وجہ سے برداشت کیں۔ اب یہ وہی سہی گی جو تم نے سہا تھا۔“

اس شیطانی ماحول میں باورچی خانے کی دیواریں اس ٹوٹے پھوٹے خاندان کی کہانی سناتی تھیں، جہاں ایمان کا وجود محض ایک بے کس، مظلوم پیکر کے طور پر لٹکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے جسم پر معصوم سی بہن کے وار کا بوجھ تھا، مگر اس کی ماں آمنہ، اپنی بے حسی میں گم، اپنی روزمرہ کی معمولی مصروفیات میں لگی رہی، جیسے ایمان کے دکھ اس کے لیے بے معنی ہوں۔

آخر کار، آمنہ نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو گود میں لے کر نرمی سے تھپکتے ہوئے ایک سفاک مسرت سے کہا،

۔ ”ہاں، مجھے اپنا بدلہ لینا ہے۔“

اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا، مگر اس کی گہرائی میں زہر کا ایک چھپا ہوا سایہ تھا۔ ”میں اسے بخشنے والی نہیں ہوں جتنی نے جو میرے ساتھ کیا میں اس کے ساتھ کروں گی۔“

یہ کہتے ہوئے، وہ اور آصف اپنی بیٹیوں کے ساتھ باورچی خانے سے باہر نکل گئے، ایمان کو اپنی خاموشی اور کرب کے سمندر میں اکیلا چھوڑ دیا۔ جیسے ہی ان کے پیچھے دروازہ بند ہوا، باورچی خانے میں ایک گھمبیر خاموشی چھا گئی، وہ ہی خاموشی جو ایمان کی زندگی کا ایک دائمی حصہ بن چکی تھی۔

...°...

ایمان کا پڑمردہ وجود زمین پر یوں بکھرا ہوا تھا گویا کسی شکست خوردہ مسافر نے اپنی بوجھل سانسیں ترک کر دی ہوں۔ اس کے ناتواں ہاتھ اس کے سر کو تھامے ہوئے تھے، جو بیماری اور کرب کا بوجھ ڈھونے سے قاصر تھا۔

یہ دکھ محض جسمانی زوال کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ زندگی کی بے رحم آندھیوں کا وہ تازیانہ تھا جو اس کی روح پر لگاتار برستار ہا تھا۔

آمنہ دروازے کی چوکھٹ پر نمودار ہوئی، اس کے لبوں پر سکوت کا ایک ایسا پردہ تھا جس کے پیچھے تضحیک کا زہر چھپا ہوا تھا۔

- ”ایمان، چائے بنا کر لاؤ۔ میں لاؤنج میں بیٹھوں گی۔ سوتیلی ماں کے لیے تو ہر وقت دوڑی پھرتی ہو، کچھ میرے لیے بھی کر دو تاکہ مجھے یہ احساس ہو کہ تمہیں پیدا ہونے سے پہلے قتل نہ کرنے کا فیصلہ صحیح تھا۔“

- ”

ایمان کی نگاہیں آمنہ کی سرد مہر آنکھوں سے ملیں، اور اس کی اپنی آنکھوں میں ایک بے بسی اور غم کی ایسی کہر چھائی ہوئی تھی جو الفاظ کے محتاج نہیں تھی۔

اس کے سر کا ہلکا سا خم گویا اس کی زنجیروں میں جکڑی اطاعت کی زبان تھی، جس میں احتجاج کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

وہ ایک ایسی دنیا کی سنگلاخی میں قید تھی جہاں نہ کوئی سہارا تھا، نہ کوئی چھت۔ چاہے اس کی سوتیلی ماں ہو یا اس کے اپنے رشتہ دار، ہر طرف سے ظلم و جبر کا ہی سامنا تھا، گویا اس کے وجود کے رشتے بھی اس کی مصیبتوں کو کم کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔

ایمان ایک ایسی بے رنگ اور بے روح دنیا کی قیدی تھی جہاں نسب کا رشتہ بھی اس کے دکھوں کا مددگار نہ بن سکا۔

...°...

کچھ دیر بعد، ایمان نے چائے کی بھاپ اڑاتی ٹرے کو ہاتھوں میں سنبھالتے ہوئے لاؤنج میں قدم رکھا۔ گرم بخارات کی لطیف لہریں ہوا میں گھل مل رہی تھیں، جیسے کسی نامعلوم راز کی سرگوشی کر رہی ہوں۔۔

آمنہ کی نگاہیں ٹی وی سکرین سے پلٹیں اور ایک سرد اور بے لچک حکم نے کمرے کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا

۔ ”چائے میز پر رکھ دو۔“

ایمان نے بغیر کسی لفظ کے حکم بجالاتے ہوئے میز پر ٹرے رکھی۔ آمنہ بدستور سکرین کی چمک میں گم رہی، اس دنیا کی جاذبیت میں محو جس نے اس کی توجہ کو قید کر رکھا تھا۔

اس منظر نامے سے بے خبر، ایمان کی حرکات میں ایک غیر متوقع تیزی نے جنم لیا، جیسے کوئی چھپا ہوا بھید اچانک آشکار ہو گیا ہو۔ ایک عجیب سا اضطراب اس کے وجود پر حاوی ہو گیا، جس کی بنا پر وہ جلدی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھے کمرے سے نکل گئی، جیسے کوئی سایہ لمحے بھر میں او جھل ہو جاتا ہے۔

ایمان کی یہ اچانک اور غیر معمولی روانگی دیکھ کر آمنہ کے چہرے پر حیرت کی جھلک دکھائی دی۔

اس کے دل میں ایک ان کہی بے چینی نے جنم لیا، اور کمرے کی خاموشی میں ایک ایسی سنسنی پھیل گئی جو کسی پوشیدہ آفت کا اشارہ دے رہی تھی۔

جیسے ہی کمرہ اس گہری خاموشی میں ڈوبا، آمنہ کی پیشانی پر فکر کی شکنیں نمودار ہوئیں۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے، وہ تیزی سے اپنی نشست سے اٹھی اور ایمان کے پیچھے لپکی۔

جب وہ واش روم کے دروازے تک پہنچی، تو منظر نے اس کے قدم روک دیے۔ ایمان سنک کے سامنے جھکی ہوئی تھی، نل سے پانی کے قطرے بہہ رہے تھے اور اس کے جسم پر لرزش طاری تھی۔ اچانک، ایمان نے قہ کیا، جیسے اس کے اندر کوئی زہر ابل کر باہر نکل رہا ہو۔

اس کی آنکھیں سرخ تھیں، آنسو اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے، اور مسلسل الٹی نے اس کے جسم کو نڈھال کر دیا تھا۔ آمنہ، اس منظر کے سامنے بے بس کھڑی، کسی بھی رد عمل سے قاصر تھی، جیسے وقت نے اسے ساکت کر دیا ہو۔

ایمان نے جب بمشکل اپنی سانسوں کو قابو میں کیا، تو آہستہ سے آمنہ کی طرف مڑی۔ اس کی آنکھوں میں نہ صرف تکلیف بلکہ ایک بے نام سی التجا بھی تھی۔ آمنہ کی آنکھوں میں اضطراب اور لبوں پر کپکپاہٹ تھی۔

آخر کار اس نے سوال کیا،

”یہ کب سے ہو رہا ہے؟“

ایمان کی مدھم، ٹوٹی ہوئی آواز میں ایک گہرا درد چھپا تھا۔

- ”ایک ہفتے سے،“۔

اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا،

- ”مجھے مستقل تھکن، بھوک سے بیزاری، اور سینے میں جلن محسوس ہو رہی ہے۔“ یہ الفاظ کہتے ہی اس کی

آنکھوں میں پھر سے آنسو بھر آئے۔

- ”درد ناقابل برداشت ہے،“۔

اس نے کپکپاتے ہوئے اعتراف کیا۔

آمنہ کے اندر عجیب سی بے چینی نے جنم لیا۔ وہ چند لمحے خاموشی میں غرق رہی، جیسے کوئی خوفناک حقیقت

اس کے سامنے عیاں ہو رہی ہو۔

پھر، جیسے کسی انجانی طاقت نے اسے جھنجھوڑا ہو، آمنہ نے جلدی سے کہا،

- ”تیار ہو جاؤ، ہم اسپتال جا رہے ہیں۔“۔

ایمان نے بلاچون وچرا سر ہلایا اور واش روم سے باہر نکل گئی۔۔

لیکن ایمان کو اس بات کا ادراک نہ تھا کہ جیسے ہی وہ نکلی، آمنہ نے عجلت میں اپنا موبائل فون نکالا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف ڈاکٹر نور العین تھی، آمنہ کی پرانی دوست اور گائناکالوجسٹ۔

آمنہ کی آواز میں دبے دبے خوف اور پریشانی کا رنگ نمایاں تھا،

۔ ”اگر یہ وہ ہی ہوا جس کا مجھے شک ہے، تو شاید میں قتل پر مجبور ہو جاؤں۔“ اس ایک جملے نے ہوا میں خوف اور گہرے رازوں کا بوجھ بڑھا دیا تھا۔ کمرہ خاموشی میں ڈوب رہا، جیسے آنے والے وقت کی پراسرار گونج سنائی دے رہی ہو، اور ہر سانس ایک نئے طوفان کا پیش خیمہ بن گئی تھی۔

...°...

اسپتال کا کمرہ ایک بے رنگ، بے جان خلا تھا، جس کی دیواریں سفیدی میں ڈوبی ہوئی تھیں، اور سجاوٹ کے نام پر بس چند تصاویر تھیں جو قومی ہیروز کی یاد تازہ کر رہی تھیں۔ ایک گہری خاموشی جو کمرے کے اندر چھپے ہوئے رازوں کی محافظ تھی۔

ایمان، بستر پر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی، پردے کی اوٹ میں چھپی ہوئی تھی، جیسے اسے دنیا کی نظروں سے بچالیا گیا ہو۔ ماحول کی اس سرد مہری میں آمنہ کا چہرہ پریشانی سے پھیلا ہوا تھا، اس کی نگاہیں ہر لحظہ بدلتی ہوئی رپورٹس پر مرکوز تھیں جو نور العین کے ہاتھوں میں تھیں۔

نور العین نے کاغذ کے اس پلندے پر ایک آخری نظر ڈالی اور پھر دھیرے سے انہیں میز پر رکھ دیا، اس کے لبوں پر ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی۔

آمنہ نے بے چینی سے آگے جھک کر سوال کیا، گویا خوف اس کے ہر لفظ سے عیاں ہو:

پلیز، نور العین، مجھے بتاؤ کہ مجھے جس چیز کا ڈر ہے، ان رپورٹس میں اس کا اشارہ نہیں ہے؟”۔

نور العین نے ایک سرد سانس لی اور اپنی آنکھوں میں سنگین حقیقت کی پرچھائیں سموئے ہوئے کہا،۔

۔“ بالکل وہی ہے جس کا تمہیں ڈر تھا۔ ایمان ایک ماہ کی حاملہ ہے۔”۔

ان مختصر الفاظ نے آمنہ کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ ساکت، گویا کسی گہرے اندھیرے میں گر گئی ہو۔

اس کے ہونٹ خشک ہو گئے، اور ایک لرزہ اس کے پورے بدن میں دوڑ گیا۔

آمنہ بے قابو ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے جذبات میں ایک لاوا ابل رہا تھا، اور زبان پر غصے کا زہر ٹپکنے لگا

۔“ آصف! تم پر خدا کی لعنت ہو! یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔”۔

اس کے الفاظ میں چھپی ہوئی مایوسی اور بے بسی نے کمرے کی خاموشی کو چیر کر رکھ دیا۔ جو کبھی پرسکون ماحول تھا، وہ اب ایک آندھی کی گونج میں تبدیل ہو چکا تھا۔

نور العین کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک پیدا ہوئی، لیکن اس کے چہرے پر سنجیدگی کا پردہ بدستور قائم رہا۔ اس نے آہستہ سے آمنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اور نرم لیکن چالبازانہ لہجے میں بولی،

۔ ”فکر نہ کرو، آمنہ، ہم اس کا حل نکال سکتے ہیں۔ سب کچھ خفیہ ہو گا۔ میں اپنے تہہ خانے میں سارے انتظامات کر لوں گی۔ کوئی بھی نہیں جانے گا کہ کیا ہوا۔ سب کچھ ہمارے قابو میں ہو گا۔“

آمنہ کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ اس کے دانت غصے میں بھینچ گئے اور اس نے ایک گہری سانس لی، جیسے اپنے اندر کی آگ کو باہر نکالنے کی کوشش کر رہی ہو۔

۔ ”کاش میں نے اسے پیدا ہونے سے پہلے مرادیا ہوتا!“

اس کے الفاظ زہر آلود تھے۔

۔ ”یہ سب میری ساس کی وجہ سے ہے، اگر وہ بچ میں نہ آتیں، تو میں اس مصیبت سے بچ جاتی۔“

نور العین نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ آمنہ کی طرف دیکھا، اور اس کی آواز میں ایک غیر مرنی چھن تھی۔

۔ ”میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ وقت پر فیصلہ کر لو، لیکن تم نے اپنی ساس کے دباؤ میں آ کر کچھ نہیں کیا۔ اب دیکھو، کیا ہوا؟ یہ تمہاری اپنی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ ”

نور العین کا ہاتھ اب آمنہ کے سر پر تھا، گویا وہ تسلی دے رہی ہو، لیکن اس کے الفاظ میں الزام کی گہرائی پوشیدہ تھی۔

۔ ”تمہاری اپنی نااہلی نے تمہیں اس دن تک پہنچایا۔ اگر تمہارا خاندان تمہیں آصف سے شادی کی اجازت دے دیتا تو یہ سب نہ ہوتا۔ ”

اس کی باتوں میں ہمدردی کے ساتھ ساتھ ایک کڑوا طرز بھی شامل تھا، جیسے وہ اس لمحے کا لطف لے رہی ہو۔ پھر نور العین نے ایک گہرا سانس لیا اور فیصلہ کن انداز میں کہا، ”خیر، اب وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آج رات آدھی رات کو میرے گھر آ جانا۔ میں سارا بندوبست کر چکی ہوں۔ ایک دفعہ یہ سب ہو جائے گا، تو تمہاری زندگی پھر سے پُر سکون ہو جائے گی۔ ”

جیسے ہی نور العین نے ہلکے ہاتھوں سے پردہ ایک طرف کیا اور کمرے میں قدم رکھا، ایمان کی نیم جاگتی نگاہیں فوراً اپنی ماں آمنہ کی طرف اٹھیں، جو کسی عمیق سوچ میں گم دکھائی دے رہی تھی۔ ایمان کی آواز میں خوف اور پریشانی کی لرزش واضح تھی،

- ”امی، سب ٹھیک ہے؟“۔

آمنہ کے چہرے پر مصنوعی نرمی چھا گئی، اور اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا، ”ہاں، بیٹی... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارے پیٹ میں کچھ گندگی ہے، نور العین آنٹی وہ صاف کر دیں گی۔“۔

- ”گندگی؟“ ایمان کی آواز خوف سے دب گئی، اور اس کی آنکھیں اچانک خوف سے پھیل گئیں۔ اس کے معصوم ذہن میں آسمان جیسی وسعت سے سوال ابھرنے لگے۔

- ”کیسی گندگی؟“ اس کا دل خوف کی گرفت میں تھا، اور اس کا بدن لرز رہا تھا۔

نور العین جو قریب کھڑی تھی، اس کے چہرے پر ایک پراسرار سکون تھا۔ وہ دھیرے سے آگے بڑھی، اور ایک تسلی بھری نرمی سے ایمان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی

-، ”چاند کی چمک، غلاب کی خوشبو ڈرومت آنٹی کی آنکھوں کی ٹھنڈک تمہارے اندر کچھ ناپاکی ہے، بس اسے نکال دینا ہے۔ تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گی۔“۔

اس کی آواز میں ایک عجب سی طمانیت چھپی ہوئی تھی، جیسے کوئی زہریلی چمک۔

ایمان نے نور العین کے الفاظ پر ایک لمحے کے لیے سانس لی، جیسے اس کے اندر کچھ سکون اتر آیا ہو۔ اس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی راحت کی لکیر نمودار ہوئی، اور اس نے سر ہلا کر اپنے آپ کو تسلی دی۔

آمنہ نے اطمینان سے نور العین کی طرف دیکھا، اور ایک خفیف مسکراہٹ نے اس کے چہرے پر رقص کیا۔ ”چلو بیٹی، اب ہم رات کو نور آنٹی کے گھر جائیں گیں ابھی ہم اپنے گھر چلتے ہیں۔“

ایمان اپنی ماں کی باتوں سے ایک عجیب سا سکون پا کر آگے بڑھی، لیکن اسے اندازہ نہ تھا کہ اس کی معصومیت کو کس خطرے میں دھکیلا جا رہا تھا۔

جیسے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھیں، آمنہ نے ایک لمحے کے لیے رک کر نور العین کی طرف ایک نظر ڈالی، اور ان کی نگاہوں میں خاموشی سے ایک مکروہ سمجھ بوجھ کا تبادلہ ہوا۔

نور العین نے آمنہ کی طرف ایک شاطرانہ مسکراہٹ سے اشارہ کیا، گویا وہ جانتی تھی کہ کھیل کا اگلا قدم کیا ہونا ہے۔

ایمان، جو ابھی تک اپنی ماں اور ڈاکٹر کی شیریں لہجے اور باتوں سے محفوظ تھی، اس سادگی اور لاعلمی میں تھی جو اسے تباہی کے دہانے پر لے جا رہی تھی۔ اس کی بھولی بھالی معصومیت اور اعتماد، جو کسی رحم کی متقاضی تھا، اس کے گرد ان عورتوں کی سازشی دھاگے بننے میں مصروف تھے۔

کمرے میں موجود ہلکی سی خاموشی میں وہ چھپی ہوئی ظالم حقیقت پھیلی ہوئی تھی، جسے ایمان کی معصوم نگاہیں کبھی نہ دیکھ سکیں۔ اس کے مقدر کا فیصلہ، اس کی پیٹھ پیچھے کیا جا رہا تھا، اور وہ ناواقف تھی کہ جس ”گندگی“ کی بات ہو رہی ہے، وہ اس کی جسمانی اذیت نہیں، بلکہ ان سازشوں کا کوڑا تھا جو اسے اندر سے تباہ کر رہا تھا۔

ایمان کے قدم لرزتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، اور اس کی تقدیر تاریکی کے گہرے اندھیروں میں گم ہوتی جا رہی تھی، کیوں کہ وہ جان نہیں پائی تھی کہ وہ کس کھائی کی طرف دھکیلی جا رہی ہے۔

...°...

آصف کو اپنے اعمال کے سنگین نتائج کا ادراک ہوتے ہی خوف کی لہر نے اسے جکڑ لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے افعال کی گونج اس کی ساکھ پر گہرا اثر ڈال سکتی ہے، جو اس کی زندگی کے احتیاط سے بنائے گئے چہرے کو داغدار کر سکتی ہے۔

جتوئی کے اس گھناؤنے راز کا انکشاف محض ایک خیال ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں کپکپی پیدا کر رہا تھا کیوں کہ جتوئی ایسی معلومات کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

دفتر سے واپسی پر، آصف بیڈ روم میں داخل ہوا، اس کا چہرہ بے حساب سکون کا نقاب تھا۔ اس نے آمنہ کو مخاطب کیا، اس کی آواز میں سردی سرگوشی تھی،

- ”پھر آج رات تم اس کے ساتھ چلو گی۔“ -

آمنہ، جو آئینے کے سامنے کھڑی تھی، خود کو بستر کے کنارے پر جھکا لیا، اس کی آواز خوف اور استغنیٰ کے مرکب سے کانپ رہی تھی۔

اس نے پیار سے اپنا ہاتھ آصف کے سر پر رکھا، اس کی نگاہیں اس بات کے علم سے پریشان تھیں کہ وہ محبت کے نام پر کیا کر سکتی ہے۔

- ”میں صرف تصور کر سکتی ہوں کہ تم اپنی محبت میں مجھ سے کیا کیا کروا ڈالو گے“ اس نے افسوس کا اظہار کیا، اس کے الفاظ سیاہ ذیلی متن سے لدے ہوئے تھے۔

گر مجوشی سے عاری آصف کی مسکراہٹ نے اس کے ارادوں کی ولن فطرت کو دھوکہ دیا۔

اس نے آمنہ کو اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیا، اس کی گرفت بہت زیادہ اور بدبودار تھی۔۔۔

- ”یہ آخری بار ہے،“ -

اس نے ایک خوفناک فائنل کے ساتھ اعلان کیا۔ آمنہ کی مسکراہٹ، اگرچہ خوشی سے عاری تھی، اس نے اس ناخوشگوار معاہدے کے لیے اپنی رضامندی کو چھپا لیا۔

اس پُرسکون منظر میں، ان کے اعمال اور ارادوں کو ڈھانپنے والا اندھیرا ایک خوفناک بادل کی طرح چھا گیا، جس نے ان کے بٹے ہوئے بندھن پر ہلکی ہلکی ہلچل مچادی۔

...°...

گہری ہو چکی تھی جب آمنہ کی گاڑی چپ چاپ اس سوسائٹی کی اونچی دیواروں والی گلیوں میں داخل ہوئی، جہاں ہر گھر اپنی شان و شوکت کا خاموش گواہ تھا۔

ان گلیوں کی وسعت اور سکوت میں ایک عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی، جیسے یہ پرسکون عمارتیں اندر ہی اندر کسی راز کی امین ہوں۔ جیسے ہی گاڑی ایک عالیشان حویلی کے پھانک پر رکی، آہنی دروازے خاموشی سے کھل گئے، اور اندر کا منظر انمول دولت کی عکاسی کر رہا تھا، لیکن فضاء میں کچھ ایسا تھا جو غیر مرئی خوف کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

آمنہ نے گاڑی کو بڑے احتیاط سے پورچ کے درمیان روکا، اور وہ ایمان کے ساتھ نیچے اتری۔ پورچ کے چاروں طرف بچھے ہوئے سرسبز درخت اور روشنیوں کی ہلکی ہلکی جھلکیاں منظر کو خواب ناک بنا رہی تھیں، لیکن اندر ہی اندر ایک انجانی بے چینی ایمان کے دل میں سرایت کر گئی تھی۔ و

ہ چاروں طرف نظریں گھما رہی تھی، ہر چیز گویا کہ کسی انجانے خطرے کا پیش خیمہ ہو۔ اس کی نگاہوں میں الجھن اور دل میں خوف کا گہرا احساس تھا، جو وقت کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔

نور العین مسکراہٹ سجائے، پرسکون انداز میں ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھی۔ اس کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپی مکاری اور بدنیتی، ایمان کی آنکھوں سے اوجھل رہی۔ وہ نرمی سے ایمان کے قریب آئی اور گویا ایک شیطانی پرسکون لہجے میں بولی،

“Eman, my dearest sweetheart are you prepared for the treatment”.

ایمان نے سوالیہ اسے دیکھا “جی کیا”۔

نور العین نے آنکھیں گھمائیں اور مسکرائی “آجانم میرا مطلب ہے تم تیار ہو”۔

ایمان کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کی لہریں تیر رہی تھیں، اس کے لب خاموشی سے کپکپا رہے تھے، لیکن الفاظ اس کے منہ سے نہیں نکلے۔ اس نے دھیرے سے سر کو اثبات میں ہلایا، گویا اس نے اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا ہو، جیسے کوئی بچہ جسے طوفان کی سمت میں چھوڑ دیا گیا ہو۔

منظر نامہ اب مزید بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ ہوا میں عجیب سا سکوت پھیل چکا تھا، جیسے سب کچھ رک گیا ہو، مگر آنے والے طوفان کی آہٹ سنائی دے رہی ہو۔ ایمان کی ہر جنبش میں ایک گہری بے چینی تھی، اور نور العین اور آمنہ کے درمیان چھپی ہوئی سازشیں اس سکون کو اور بھی خوفناک بنا رہی تھیں۔

یہ لمحہ، جو بظاہر ایک معمولی سوال و جواب کا تھا، دراصل ایمان کی معصومیت کے خاتمے کا پیش خیمہ تھا۔ ایک ایسا لمحہ جس میں اس کا مستقبل ہمیشہ کے لیے بدلنے والا تھا، اور اس کے سامنے ایک ایسی دنیا تھی جو اس کے دل کے سکون کو چھین لینے کو بے قرار تھی۔

...°...

پورچ سے تھوڑا آگے ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے کنارے پر لوہے کا جنگلہ نصب تھا۔ سیڑھیاں، جو نیچے تہہ خانے کی طرف جاتی تھیں، مکمل طور پر ڈھکی ہوئی نہیں تھیں بلکہ ایک خفیہ راستے کی مانند صاف نظر آرہی تھیں، جیسے وہ کسی گہرائی میں لے جانے کا اعلان کر رہی ہوں۔ جنگلے کی سلاخیں نئی اور چمکدار تھیں، جو کہ سیڑھیوں کے کنارے مضبوطی سے جمی ہوئی تھیں۔

ایمان جب اس تہہ خانے کے سبز دروازے تک پہنچی تو حویلی کا شاندار ماحول اور ارد گرد کی سرسبز زندگی جیسے اچانک بے جان محسوس ہونے لگی۔ دروازے کے اوپر ایک تیز، سفید بلب روشن تھا جو اپنے نیچے والے حصے کو پوری طرح سے منور کر رہا تھا۔ بلب کی روشنی میں دروازہ نئی حالت میں چمک رہا تھا، جیسے حال ہی میں پینٹ کیا گیا ہو۔

-

نور العین نے نہایت شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ ایمان کو آہستہ آہستہ آگے بڑھایا، جیسے کسی بے گناہ کو جال میں پھنسانے والی لومڑی اپنے شکار کو فریب سے دبوچتی ہے۔

آمنہ کے چہرے پر چھپی ہوئی شیطانی مسکراہٹ ایک عجیب سکوت میں بدل گئی، جیسے کوئی اپنی ہی چالاکی پر محفوظ ہو رہا ہو۔ اس کا لمس ایمان کے کندھے پر پڑا تو ایمان کے دل میں ایک جھوٹا اطمینان بھر آیا۔

۔“امی، آپ آج مجھ سے اتنی محبت سے پیش آرہی ہیں... کیا یہ میری بیماری کی وجہ سے ہے؟ اگر ایسا ہے، تو میں ہمیشہ بیمار ہی رہنا چاہتی ہوں،”

ایمان کی آواز میں معصومیت کی آخری رمت جھلک رہی تھی۔ وہ ان اندھیروں سے بے خبر تھی جو اس کے ارد گرد چھائے ہوئے تھے۔

آمنہ نے نور العین کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی شیطانی مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش کی اور سر کو ہلکا سا خم دیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ آخری لمحے ہیں، جس کے بعد ہر چیز بدل جائے گی۔

نور العین نے خاموشی سے ایمان کو دروازے کی طرف دھکیلا، جیسے کوئی شکاری اپنی شکار کو موت کے منہ میں دھکیل رہا ہو۔

دروازہ کھلتے ہی ایمان کے سامنے ایک غمناک، خوفناک منظر ابھرا۔ جیسے ہی وہ تہہ خانے میں داخل ہوئی، کمرے میں موجود خوفناک سکوت اور سرد ماحول نے اس کے دل کو لرزادیا۔ سفید اور سرخ رنگ میں رنگی دیواریں ایک عجیب تضاد پیش کر رہی تھیں، جیسے یہ کوئی ہسپتال نہیں بلکہ موت کا غار ہو۔

ہوا میں ایک عجیب سی ٹھنڈک تھی، جو گویا دیواروں سے رِس رہی ہو، اور اندر آتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے یہ جگہ خود اپنی سرگوشیوں میں راز چھپائے بیٹھی ہو۔ روشنی بظاہر بہت تیز تھی، مگر اس کی چمک میں کچھ پراسرار تھا۔ ایک غیر مرئی دباؤ جو اس ماحول کو اور بھی خوفناک بنا رہا تھا۔

کمرے کے مرکز میں ایک پرانا، زنگ آلود لوہے کا بستر موجود تھا، اس پر سفید چادر بچھائی گئی تھی جو شاید کبھی اجلی رہی ہو، لیکن اب وہ پرانی، داغ دار اور موت جیسی سرد لگ رہی تھی۔

بستر کے نیچے سے ایک خفیہ آواز ابھر رہی تھی، گویا کوئی دبے پاؤں اندر چھپ کر گھات لگا رہا ہو۔

دائیں طرف دیوار کے ساتھ ایک بڑی دھندلی الماری رکھی ہوئی تھی۔ یہ الماری مکمل طور پر لوہے کی تھی اور نیلے کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔

ایسا لگتا تھا کہ اس میں چھپے راز کسی کے سامنے آنے کے لیے بے تاب ہوں، مگر الماری کا دروازہ سختی سے بند تھا، گویا اندر کسی ہولناک حقیقت کو قید کیا گیا ہو۔ الماری سے ہلکی ہلکی زنگ آلود بو آرہی تھی، جو پرانی خون آلود کپڑوں کی بو سے ملتی جلتی تھی۔

دیواروں پر رنگ کی پرانی تہیں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھیں، اور خون کے سرخ اور بے جان سفید رنگ کی آمیزش نے پورے کمرے میں ایک عجیب، خوفناک تضاد پیدا کیا تھا۔

گویا یہ دیواریں کسی زمانے میں خون کو جذب کرتی رہی ہوں۔ کمرے کی ایک جانب سنک رکھی ہوئی تھی، جس کا چینی مٹی کا فرش بے حد چمکدار اور بے جان تھا۔ سنک کے اوپر لٹکا ایک چھوٹا، گندہ آئینہ تھا، جو خالی

نظروں سے اس بھیانک ماحول کی عکاسی کر رہا تھا۔ آئینے میں جھلکتی ہر چیز یوں لگ رہی تھی جیسے وہ حقیقت نہ ہو، بلکہ کوئی بھیانک خواب ہو۔

چھت سے لٹکی سفید ٹیوب لائٹ نے کمرے کے کونے کونے میں طویل، لرزتے ہوئے سائے ڈال رکھے تھے، اور یہ روشنی ماحول میں دہشت کو اور بھی گہرا کر رہی تھی۔ دیوار کے ایک حصے میں ادھوری چٹری ہوئی پوسٹر کی باقیات تھیں، جو کبھی کسی طبی ماہر کے ہدایات رہے ہوں گے، مگر اب وہ پوسٹر ایسے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے تھے کہ ان پر موجود الفاظ بھی سمجھ میں نہ آتے تھے۔

نور العین نے ایمان کی طرف بڑھتے ہوئے اس بستر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”بچے، آؤ، یہاں لیٹ جاؤ۔“

اس کے لہجے میں محبت کا فریب تھا، لیکن اس کے پیچھے چھپے ارادے کمرے کی سرد فضا میں عیاں تھے۔ ایمان نے بلا جھجک اس کی بات مان لی اور سرد لوہے کے بستر پر لیٹ گئی۔

آمنہ کی نظر اس پر ٹھہر گئی، مگر اس کی مسکراہٹ میں ایک سرد مہر تھی، جیسے کوئی اپنی کامیابی کو گواہ بن کر دیکھ رہا ہو۔

نور العین نے سرنج کو پکڑا، اس کی نظریں چمک اٹھیں جیسے کسی شیطانی منصوبے کی تکمیل کا وقت قریب آ چکا ہو

-- ”یہ دوا تمہیں آرام دے گی، اور تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ بس یہ تمہارے پیٹ کے کیڑے نکال دے گی اور شاید تم بے ہوش بھی ہو جاؤ،“۔

۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایمان کو تسلی دی، جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کو دلا سہ دیتا ہے۔

ایمان نے سر ہلایا، اس کی معصومیت ابھی تک ان خوفناک ارادوں سے بے خبر تھی جو اسے گھیرے ہوئے تھے۔ جیسے ہی نور العین نے سرنج کا پلنجر دبایا، سرد مائع اس کی رگوں میں دوڑنے لگا، اور اس کا جسم دھیرے دھیرے سکون کی حالت میں جانے لگا، بے خبر کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

آمنہ اور نور العین کے چہرے پر چھپے ہوئے خبیث ارادے اس تاریک کمرے میں گونج رہے تھے، اور ایمان کی معصومیت ایک آخری سانس لے رہی تھی، جیسے کوئی گلاب جو مرجھانے کے قریب ہو۔

ایمان کے بے ہوش ہوتے ہی، نور العین نے ایک سرد لاپرواہی سے سرنج کی ٹوپی واپس لگائی اور بے حسی کے ساتھ استعمال شدہ سرنج کو قریبی کوڑے دان میں پھینک دیا۔

اس کے چہرے پر چمک رہی شیطانی اطمینان نے منظر کو اور بھی پراسرار بنا دیا۔ وہ حسابی قدموں سے آمنہ کی طرف لوٹی، جس کی نظریں خاموشی سے ایمان کے بے سدھ ہوتے وجود پر جمی تھیں۔ وقت جیسے تھم گیا تھا، لمحے نے اپنی رفتار کھودی۔ فضا میں ایک وحشیانہ خاموشی پھیل گئی تھی،۔

ایمان کی دنیا اندھیرے کی دبیز تہہ میں ڈوبنے لگی۔ پلکوں کے پیچھے خوابوں کا سلسلہ ٹوٹ رہا تھا، اور وہ بے خبری کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو گئی۔ آمنہ اور نور العین کی موجودگی میں وہ اب محض ایک بے جان کٹھ پتلی تھی، جن کی سازشیں اس کے بے بس وجود پر محیط تھیں۔

کمرے کی بے حس خاموشی میں وقت کا بو جھل لمحہ گزرنے کے بعد، نور العین ایک سنگین سکون کے ساتھ ایمان کے نیم مردہ وجود سے دور ہوئی۔

اس کے ایک زمانے کے سفید دستانے اب خون آلود تھے، ان پر سرخ چھینٹیں نمایاں تھیں، گویا وہ کسی گناہ کی گواہی دے رہے ہوں۔

اس کے سفید کوٹ پر بھی سرخی مائل دھبے تھے جو ایک شیطانی فعل کا خاموش اعتراف کر رہے تھے۔ ہر سرخ دھبہ ایک نہایت گہری داستان کا حامل تھا۔

نور العین نے اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چمٹی تھام رکھی تھی، جس کے سرد دھاتی جبروں میں ایک خبیث اور بھیانک شے موجود تھی۔

ایک چھوٹی، غلیظ جھلی دار ہستی، جسے دیکھ کر ہی لرزہ طاری ہو جاتا۔ چالاکی سے، اس نے چمٹی کو آہستگی سے لوہے کی ٹرے پر رکھا، جہاں پہلے ہی تین اور ایسی وحشت ناک چیزیں موجود تھیں۔

کمرے میں ایک اذیت ناک سناٹا گونج رہا تھا، جسے ایمان کی رگوں میں بہتالاع اور ڈرپ کی مسلسل ٹپکتی ہوئی بوندیں اور بھی سنگین بنا رہی تھیں۔

جیسے ہی نور العین کا وحشت بھرا عمل مکمل ہوا، آمنہ کی آنکھوں میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا اندرونی لاوا ابل پڑا، اور اس کی آواز غصے کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

۔ ”کاش!“۔

آمنہ کے ہونٹوں سے شدید کرب میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی،

- “کاش میں یہ کر لیتی اور اس اس کی سانسیں پہلے روک دیتی جب یہ میرے پیٹ میں تھی۔ تو آج میں اس بھیانک انجام سے بچ سکتی۔”-

اس کی نظریں بے رحمی سے ٹرے پر پڑی، جس پر گہرے سرخ دھبے جیسے کسی ناقابل بیان جرم کا اعلان کر رہے تھے۔

- “یہ سب کچھ اس ملعون عورت میری ساس کی مداخلت کا نتیجہ ہے!”-

وہ دانت پیستے ہوئے غرائی، اور اس کا غصہ اور شدت اختیار کر گیا۔

نور العین نے اپنی سرد نظر آمنہ پر ڈالی، اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک تھی۔ اس نے ماسک کو آہستگی سے اتار کر سائیڈ پر رکھا اور سنک کی طرف چل دی، جہاں اس نے اپنے دستانے والے ہاتھوں کو ٹھنڈے پانی سے دھونا شروع کیا۔ نل سے بہتا ہوا پانی خون آلود ہو چکا تھا، جیسے ہر بوند کمرے میں ہونے والے جرم کا ماتم کر رہی ہو۔

اس کی سانسوں میں ایک غیر مرئی سرد مہری تھی، لیکن اس کے چہرے پر اطمینان کا سایہ چھایا ہوا تھا۔

“چلو،” نور العین نے بے حس لہجے میں کہا، “یہ بوجھ تو تم سے اتر چکا ہے۔”

ایمان بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال کے سفید لباس میں لپٹی ہوئی تھی، اس کی سانسیں مدھم اور زندگی کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔

آمنہ کی نگاہیں نفرت سے جل رہی تھیں، اُس کے چہرے پر بے صبری کا سایہ گہرا تھا۔

وہ جھنجھلاہٹ میں بولی، ”یہ کب ہوش میں آئے گی؟“۔

اس کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں صبح کے چار کا وقت صاف دکھائی دے رہا تھا، سحری کا وہ لمحہ جسے نہ صرف ساعت کی تاریکی بلکہ روحانی تاریکی بھی لپیٹے ہوئے تھی۔

کچھ دیر بعد، چار بجی کر تیس منٹ پر، ایمان کے خشک ہونٹوں سے ایک ہلکی سی آہٹ ابھری۔
 ”ام۔۔ امی“

وہ مدھم سرگوشی جیسے گہرے خواب سے بیدار ہونے کی پہلی علامت ہو۔ نور العین کی آنکھوں میں ایک مکارانہ چمک نمودار ہوئی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی، اور اس نے ایک زہریلی طنز میں آمنہ کی طرف دیکھ کر کہا، ”میڈم جاگ گئی ہیں، کتنی خوش قسمتی ہے ہماری۔“۔

آمنہ نے نفرت بھری نگاہ سے ایمان کی طرف دیکھا، جیسے یہ بیداری اس کے لیے کسی زحمت سے کم نہ ہو۔

نور العین نے ایمان کو سنبھالتے ہوئے اس کا کمزور وجود اٹھایا، اسے تھامتے ہوئے، جیسے وہ محض ایک بوجھ ہو۔ ایمان کی نازک جسمانی حالت نے اسے مزید بے بس اور لاچار بنا دیا تھا۔

وہ بے خبر تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، اور یہ بھی کہ اس کے جسم کے اندر ایک اور زندگی پل رہی تھی۔ وہ زندگی جو اس کے سوتیلے باپ کے ہاتھوں بربریت کا نتیجہ تھی، اور اس کی ماں، جو کسی حد تک اس ظلم کی ساتھی تھی، اس سے بے پروا تھی۔

ایمان کے اندر پلنے والی وہ نادیدہ روح اس کی اپنی لاعلمی کی قید میں تھی۔ وہ ایک ایسے سفر پر تھی جس کا وہ شعور بھی نہیں رکھتی تھی۔ یہ زچگی اس کے لیے ایک ناپسندیدہ بوجھ بن چکی تھی، اور اس کے دل میں خوشی کی بجائے خوف اور لاعلمی کا سایا پھیلا ہوا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہوا تھا، اور یہ کہ وہ جو خواب دیکھتی تھی، وہ اب کبھی پورے نہیں ہو سکیں گے۔

نور العین نے ایمان کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ اس کے لہجے میں ایک عجیب ہنسی تھی جب اس نے کہا،
”یہ تو غبارے کی طرح ہلکی ہو ہے۔“

آمنہ نے نفرت کے ساتھ اس پر ایک طنز پھینکا اور اُس کی طرف حقارت بھری نظر ڈالی۔

۔ ”کاش! یہ مر جاتی تو شاید میری زندگی اس لعنتی وجود کے طوق سے آزاد ہو جاتی۔ سکون کا سانس تو لیتی میں!“۔

اس کے الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تھے۔ پھر، ایک لمحے کے توقف کے بعد، اس کی آنکھوں میں ایک مکاری جھلکی۔ ”مگر اس کا مرنا میرے نہیں، اس کے باپ کے گھر ہو، تب ہی مجھے سکون ملے گا۔“۔

آمنہ نے نور العین کو گلے لگایا اور اس کا شکریہ ادا کیا، گویا یہ سب اس کے لیے ایک معمولی احسان تھا۔ ”شکریہ، نور العین، تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔“۔

۔ نور العین نے سرد مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”سب تمہارے لیے ہے، میری جان۔“۔

گاڑی جیسے ہی گھر کے دروازے سے نکلی، ایمان کے نازک اور بے حس وجود سے، فضا میں ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔

اس کے وجود پر ایک اندھیرا سایہ چھا چکا تھا، جو اس کی زندگی کو ایک نامعلوم اور خوفناک انجام کی طرف لے جا رہا تھا۔

آمنہ کے سنگدل دل میں کسی بھی قسم کی ہمدردی یا ممتا کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ صرف وہ سرد مہری اور خود غرضی جو اسے اپنی ہی بیٹی کے وجود سے بھی بیگانہ کر چکی تھی۔۔۔ جیسے ہی وہ اس عظیم الشان حویلی کے دروازے سے اندر داخل ہوئی، اس کی چال میں بے نیازی تھی، گویا اس کے ہاتھ میں تھامی ہوئی ایمان محض ایک بوجھ ہو

۔ ایمان کا کمزور، بے جان جسم، جسے آمنہ نے بے دردی سے پکڑا ہوا تھا، اپنے وجود کے آخری کنارے پر لڑکھڑا رہا تھا۔

یہ حویلی، جو باہر سے شان و شوکت کی علامت تھی، اندر سے ظلم و ستم کی آماجگاہ تھی۔

ہر ستون، ہر دیوار، ہر کمرہ آمنہ کی رعونت اور سنگدلی کا گواہ تھا۔ اس کے بازوؤں میں ایمان کا وجود ایک پیادے کی مانند تھا، جسے وہ اپنی بازی میں حسب منشا استعمال کر رہی تھی۔

آمنہ کی نظر میں ایمان کوئی زندہ جاوید روح نہیں، بلکہ محض ایک بے جان مخلوق تھی جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق ڈھال رہی تھی۔

آمنہ کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ ہمیشہ کی طرح بے حس تھے،

۔ ”نوراں! کہاں مر گئی ہو، جلدی سے ادھر آؤ۔“ ۔

اس کی آواز میں نہ کوئی احساس تھا، نہ کوئی نرمی۔ اس کے ہر لفظ میں وہ حقارت تھی جو اس نے اپنی بیٹی کے لیے ہمیشہ رکھی تھی۔

نوراں، وفادار نوکرانی، جلدی سے دوڑی آئی۔

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی ہمدردی کی جھلک تھی، لیکن وہ آمنہ کے سامنے کچھ کہنے کی جرات نہ کر سکی۔

۔ ”جی مالکن، حاضر ہوں۔“ وہ فوراً ایمان کو تھامنے آگے بڑھی۔ آمنہ نے ایمان کو ایسے نوراں کے حوالے کیا جیسے وہ کوئی بے جان چیز ہو۔

نوراں کے دل میں ایک درد کی لہر دوڑ گئی، لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ آمنہ نے اپنی سرد، بے پرواہ نظر سے ایمان کو دیکھا اور حکم دیا،

۔ ”اسے میرے سامنے سے ہٹالو، اور کسی کمرے میں ڈال دو، جہاں میری نظروں سے دور رہے۔“

یہ حویلی، جہاں دولت کی فراوانی تھی، انسانیت اور شفقت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ یہاں عیش و عشرت کا پہناوا تھا، مگر اندر کا منظر نامہ ظلم اور نا انصافی کی داستانیں سناتا تھا۔

نوراں، ایمان کو سنبھالے، اسے حویلی کے ایک دور دراز کمرے میں لے آئی۔ یہ کمرہ، جو کبھی شاید شان و شوکت کا گواہ رہا ہو، اب اپنی زوال پذیر حالت میں ایک بوسیدہ یادگار کی مانند تھا۔ کمرے کی دیواریں

بوسیدگی سے بھری ہوئی تھیں، چھت پر دھول جمی ہوئی تھی، اور روشنی مدھم اور بو جھل تھی۔ ایک کونے میں پڑا پرانا گدا، جو شاید برسوں سے کسی نے استعمال نہ کیا ہو، واحد سامان تھا جو اس کمرے کی ویران حالت کا گواہ تھا۔

نوراں نے ایمان کو اس بوسیدہ گدے پر آہستہ سے لٹا دیا، اس کی آنکھوں میں دکھ اور بے بسی کی جھلک تھی۔

وہ ایمان کے جھریوں بھرے، زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی، ”کیسے کوئی ماں اپنے ہی بچے کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے؟ کیا کوئی ماں اپنے ہی خون کو یوں برباد ہو تا دیکھ سکتی ہے؟“۔

اس کی آواز میں لرزش تھی، اور اس کا دل بھاری ہو گیا تھا۔ نوراں کی نظریں آسمان کی طرف اٹھیں، اور اس نے دل میں ایک دعا کی۔

۔ ”یا اللہ، اس معصوم بچی پر رحم فرما، اور اس ظالم دنیا میں اس کے لیے انصاف فرما۔“۔

اس کے الفاظ میں وہ درد تھا جو ایک بے بس انسان کو ہوتا ہے، جسے اس ظالم دنیا میں کوئی سننے والا نہیں۔

۔ ”یہ دنیا،“ نوراں سرگوشی میں بولی، ”جہاں امیر اپنے ظلم کے ذریعے ہر قانون کو توڑ دیتے ہیں، اور غریب اپنی مظلومیت میں دفن ہو جاتے ہیں۔“۔

کمرے کی خاموشی، جو اس لمحے میں اور گہری ہو چکی تھی، اس پورے ماحول میں ایک تاریک سائے کی طرح چھا گئی تھی۔ ہر دیوار، ہر کونا گویا چیخ چیخ کر ایمان کے درد اور اذیت کی گواہی دے رہا تھا۔

یہ وہ ہی کمرہ تھا جہاں دولت اور اقتدار کی بربادی نے انسانی عظمت کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ اور ایمان، جس کا وجود اب محض ایک سایہ بن چکا تھا، اس نظام کا شکار تھی، جو اسے زندہ درگور کرنے پر تلا ہوا تھا۔

...°...

جیسے ہی آمنہ کمرے میں داخل ہوئی، وہاں موجود چمکتی ہوئی روشنی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا، جو ایمان کے مغموم اور تاریک کوارٹرز کے بالکل برعکس تھی۔

یہ روشنی نہ صرف ماحول کو بلکہ اندرون میں موجود سنگدلی اور خود غرضی کو بھی عیاں کر رہی تھی۔ کمرے کے وسط میں آصف بستر پر نیم دراز تھا، اور اس کے چہرے پر بے پرواہی کا اطمینان پھیلا ہوا تھا۔

دونوں بیٹیاں اُس کے پہلو میں سوتی پڑی تھیں، ان کی معصوم نیند اُس خون آشام ہنگامے سے بے نیاز تھی جو پہلے ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ایک بدنصیب زندگی کے اختتام پر انہیں سکون کی چھاؤں مل گئی

ہو۔

آصف نے اپنی نگاہوں سے آمنہ کا جائزہ لیا اور اُس کے لبوں پر ایک ظالمانہ مسکراہٹ آہستہ آہستہ پھیل گئی۔

۔ ”کیا سب کچھ ویسا ہوا جیسا ہم نے طے کیا تھا؟“ اُس کی آواز میں سرد مہری کی ایسی جھلک تھی جو کسی فتح یاب کی ہوتی ہے، جسے اپنے کیے پر ناز ہو۔

آمنہ نے تھکی ہوئی سانس لی، اس کی روح پر گہرے زخم اور تھکن واضح تھے۔ اُس نے اپنا بیگ قریب کے صوفے پر پھینکا، اور بو جھل قدموں سے بستر کے کنارے جا بیٹھی۔

اُس نے اپنی ایک بیٹی کے سر پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا، اُس کے لمس میں وہ شفقت عیاں تھی جو شاید اس کے اندر کی باقی ماندہ انسانیت کی نشانی تھی۔ ”ہا۔

۔ اُس نے مدھم اور تھکی ہوئی آواز میں کہا، ”میں نے سب کر دیا ہے، جیسا تم نے کہا تھا۔“

آمنہ کے الفاظ میں ایک گہری اندرونی اذیت پوشیدہ تھی، جیسے وہ اپنی قسمت کو خود پر مسلط کیے ہوئے کسی پرانے جرم کا کفارہ ادا کر رہی ہو۔

آصف کی سرد آنکھیں اُس پر جمی ہوئی تھیں، اُس کے سوالات کی بازگشت آمنہ کے ذہن میں گونج رہی تھی۔

آمنہ کے ایک اشارے پر اُس نے اپنی دوسری ہٹی، ارم کو آصف اور اپنے درمیان لٹا دیا اُس کی حرکتیں میکانیکی تھیں، گویا وہ کسی لازمی رسم کی تکمیل کر رہی ہو۔

آصف نے اپنی آنکھوں میں سوال لیے، آمنہ کی طرف دیکھا۔ اُسے جواب چاہیے تھا، ایک ایسا جواب جو اُس کی انا اور فطرت کے لیے تسلی بخش ہو۔ آمنہ نے لمبی اور گہری سانس لی، اُس کی آواز میں پشیمانی اور تلخی کا رنگ نمایاں تھا۔ ”ہاں، میں نے ہر وہ کام کیا جو تم نے کہا تھا،“۔

اُس کے الفاظ گویا اُس پر خود ایک بوجھ تھے، جنہیں ادا کرتے وقت اُس کی سانسیں بھی بوجھل ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لیے اُس کی نظریں کہیں دور خلا میں جا ٹھہریں۔

وہ بڑبڑائی، جیسے وہ اپنے آپ سے بات کر رہی ہو، ”کاش میں نے اُسی وقت سب کچھ ختم کر دیا ہوتا... شاید آج یہ سب نہ ہوتا، شاید ہمیں سکون مل جاتا۔ لیکن میری ساس... اُس کا سایہ ہر چیز پر حاوی تھا۔“۔

اُس کی آواز میں دبے ہوئے غصے اور بے بسی کا آمیزہ تھا۔ اُس کے دانت سختی سے ایک دوسرے پر چبائے ہوئے تھے، اور اُس کی آنکھوں میں دیرینہ کدورت اور نفرت کا سایہ لہرا رہا تھا۔

آمنہ کی دنیا، جہاں اُس نے اپنی معصومیت اور انسانیت کو کھو دیا تھا، اب ایک ایسی جگہ بن چکی تھی جہاں ہر فیصلہ، ہر عمل کسی گہرے دکھ اور زخم سے جنم لیتا تھا۔

صبح کے چھ بجے، کمرے کی فضاء میں درد کی ایک دہی دہی کراہ اور غمگین ترانہ بکھرا ہوا تھا۔ یہ کمرہ نہیں، گویا صدیوں پرانی اذیت کا مقبرہ تھا، جس کے ہر کونے پر دکھ کی نمی اور خوف کا سایہ چھایا ہوا تھا۔

ہوا بھاری تھی، جیسے ہر سانس میں دکھ کا ایک نادیدہ بوجھ شامل ہو۔ دیواریں یوں محسوس ہو رہی تھیں جیسے کسی عذاب کی گواہ ہوں، جنہوں نے صدیوں سے کوئی پُر سکون آواز نہیں سنی۔

وہاں ایک مدہم اور زرد روشنی تھی، جو کمرے کے ویران گوشوں کو بھی روشن کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

ایمان اس ویرانی کے بچے، درد اور مایوسی کے ایک بھاری حصار میں قید تھی۔ اس کا وجود جیسے گھٹن کی آغوش میں سسکیاں لے رہا تھا۔

جسمانی اذیت سے اس کی حالت ایسی تھی کہ گویا وہ اپنی سانسوں پر بھی اختیار کھو چکی ہو۔ وہ ایک بوسیدہ گدے پر نیم دراز تھی، اس کا کمزور اور لرزتا جسم کانپ رہا تھا، جیسے درد کی شدت نے اسے بے دم کر دیا ہو۔

۔ ”امی... ایمان کے ہونٹوں سے بمشکل ایک ٹوٹا ہوا لفظ نکلا، جیسے یہ لفظ خود بھی اذیت میں ڈوبا ہو۔ یہ لفظ فضا میں گم ہو گیا، جیسے اس دکھ کے بوجھ تلے دب کر مر گیا ہو۔

اس کی آواز کانپ رہی تھی، مدہم اور لرزتی ہوئی، گویا وہ اپنے ہی درد میں گم ہو چکی تھی۔

کمرہ، جو پہلے ہی ایک آسیب زدہ مقام لگ رہا تھا، اب مکمل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دیواروں پر نمی کے نشانات تھے، جو اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ یہاں دکھ اور غم ہمیشہ سے مقیم ہیں۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک پرانا، زنگ آلود آئینہ تھا، جس کی سطح پر پڑی دھول جیسے وقت کے زخموں کی داستان سنارہی ہو۔

ایمان کا ناتواں جسم، جو کبھی قوت اور جوانی کا مظہر تھا، اب کمزور اور نحیف ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے، جو اس کے رخساروں پر نمکین راستے بناتے جا رہے تھے۔

۔ ”اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔“ ایمان کی آواز ایک بار پھر خاموشی کو توڑ کر نکلی، لیکن یہ الفاظ بھی دکھ کے سمندر میں ڈوب گئے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، لیکن اس کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے، جیسے ہر قطرہ ایک دکھ بھری کہانی سناتا ہو۔

ایمان کا جسم، جو اب بالکل کمزور اور نحیف ہو چکا تھا، پوری طرح بے جان ہو گیا۔

وہ درد سے نڈھال تھی، اس کی ہڈیاں بھی جیسے ٹوٹ کر بکھرنے کو تھیں۔ اس کا وجود ایک بوجھل سانس میں محو تھا، جیسے ہر سانس میں درد کی شدت شامل ہو۔ کمرے میں ہر چیز ساکت تھی، صرف اس کے کراہنے کی مدھم آواز اور اس کی سانسوں کی لرزش تھی۔

کمرے کی سرد، بے حس دیواریں اور خاموشی اس کی اذیت کو مزید گہرا کر رہی تھیں۔ کوئی بھی تسلی دینے والا نہیں تھا، کوئی ہاتھ اس کی مدد کو بڑھنے والا نہیں تھا۔ اس کے نازک جسم کی لرزش اور آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کی بے بسی کی گواہی دے رہے تھے۔

لیکن یہ اذیت اور دکھ کا سمندر ایمان کو توڑ نہیں سکا تھا۔ جو دکھ اس نے سہا، وہ اس کے لیے ایک طاقت کا ذریعہ بن چکا تھا۔ اس کے اندر کی کمزوریاں اور اذیت اب اس کے لیے ایک ڈھال بن چکی تھیں۔ وہ اب پہلے جیسی ایمان نہیں تھی جو کبھی اذیت کی قید میں مقید تھی۔ وہ ایک جنگجو بن چکی تھی، جس نے اپنے دکھ اور مصائب کو اپنے عزم کی بنیاد بنا لیا تھا۔

....°....

اندھیرے کی اس دبیز چادر تلے ایک ہفتہ گزر چکا تھا، اور ایمان کی زندگی میں اذیت کے بعد سکون کے کچھ جھونکے آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس کے قدم اب پہلے کی نسبت زیادہ پختہ تھے، گویا وہ درد کی ان بیڑیوں سے آزاد ہو چکی تھی جو کبھی اس کی روح اور جسم کو جکڑے ہوئے تھیں

۔ لیکن آزمائش کا زہر اب بھی اس کی رگوں میں باقی تھا؛ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ نحیف اور نازک دکھائی دینے لگا تھا، جیسے ایک ٹوٹا ہوا نازک پرندہ، جس کے پروں میں اب وہ چمک باقی نہ رہی ہو۔ اس کی زرد پڑتی

ہوئی جلد اس طوفان کی گواہی دے رہی تھی جو اس کے اندر گونجتا رہا تھا، جبکہ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے ان نیندوں کی کمی کی دہائی دے رہے تھے جو اس نے بے آرام راتوں میں کھودی تھیں۔

پچھلے ایک ہفتے سے افسردگی کی گہری گھٹائیں اس کے ارد گرد چھائی رہی تھیں، لیکن اس نے کسی طرح اپنی بقا کی جنگ لڑی، چاہے وہ اس کی اپنی ہمت ہو یا اللہ کا خاص کرم۔

گھر کی طویل اور سرد راہداریوں سے گزرتے ہوئے، اس کی نگاہ آمنہ اور آصف کے کمرے کے بند دروازے پر ٹک گئی۔ یہ کمرہ نہیں تھا، بلکہ ایک زندہ قبر تھی جس نے ایمان کی بے شمار آہوں، سسکیوں اور تکلیفوں کو اپنے اندر قید کر رکھا تھا، جہاں ظلم کے گہرے سائے اس کی روح پر اب تک منڈلا رہے تھے۔

وہ دہلیز پر ٹھہر گئی، لمحہ بھر کو خاموش کھڑی، اور اپنے دل میں موجزن ان طوفانی جذبات کو محسوس کرتی رہی جو اس کے سینے میں قید تھے۔

کمرے کے اندر ایک شان و شوکت سے سجا ہوا ماحول تھا، جہاں آمنہ، جس کا دل گویا سنگین پتھر سے ڈھل گیا تھا، بڑی سی سنگھار میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر آئینے میں اپنی ہی شبیہ کو تاک رہی تھی۔

آئینے کے عکس میں اس کا چہرہ ایک بے حسی کی تصویر تھا۔ اس کے پیچھے آصف کھڑا تھا، جو اپنے ہاتھوں میں چمکتے ہوئے ہیروں کا ایک بیش قیمت ہار تھا مے ہوئے تھا۔

آصف نے عجیب سی نرمی اور بناوٹ کے ساتھ وہ ہار آمنہ کے گلے میں باندھ دیا، جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کے گرد جال کستا ہے۔

اس کے ہونٹوں سے نکلی سرگوشی میں محبت کی بجائے چالاکی اور مکاری بھری ہوئی تھی

”میں نے تمہارے لیے یہ تحفہ خریدا ہے، اب تم میرے لیے کیا کرو گی؟“

آمنہ کے چہرے پر ایک بھیانک، مگر دلخراش مسکراہٹ ابھری، اور اس نے مدھم، مگر دل کو چھلنی کر دینے والے لہجے میں جواب دیا۔

۔ ”میں نے تو بہت کچھ کیا ہے تمہارے لیے، اگر میں نہ ہوتی، تو ایمان کا کیا بگاڑ لیتے تم؟ میں نے اس کو اس قدر دھوکے میں رکھا کہ وہ خود اپنے جسم میں پلنے والی زندگی سے بے خبر تھی۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اس رات، ہم نے اس کے رحم میں پلنے والی جان کو مار دیا تھا۔“

آمنہ کی آنکھیں آصف سے ملیں، ان کی نظروں میں ایک خاموش، مگر مہلک سمجھ بوجھ تھی، جیسے دو سازشیوں کے درمیان ایک خفیہ عہد ہو۔

ایمان، اس ظالم مکالمے کی بے آواز گواہ، خاموشی سے دروازے کے پیچھے کھڑی رہی۔ اس کے دل پر جیسے کسی نے ہزاروں وزنی بوجھ ڈال دیا ہو، وہ ان سچائیوں سے بے خبر تھی جو اس کے وجود کو ہلا کر رکھ رہی تھیں۔

یکدم ہی جیسے اس کا دل کسی وزنی پتھر تلے دب گیا تھا، اور اس کا وجود اندر ہی اندر لرزنے لگا تھا۔

- ”میں ماں کیسے بن گئی؟ یہ ممکن کیسے ہو سکتا ہے؟“ -

اس کی آواز بے یقینی کی شدت سے کانپ رہی تھی، اور اس کے گرد کی دنیا ایک خوفناک بھونچال میں بدلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے حلق میں درد کی ایک سخت گانٹھ اٹھ رہی تھی، اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب بھر آیا تھا جو اس کی پلکوں کی سرحدوں پر ہچکولے کھا رہا تھا۔

ذہن میں تاریک کڑیوں کو جوڑتے ہوئے، وہ ہونٹوں پر دھیرے سے بڑبڑائی، -

- ”کیا... کیا اسی وجہ سے اُس رات میری طبیعت بگڑی تھی؟ میں بیمار تھی اور...“ -

الفاظ جیسے اس کے گلے میں اٹک گئے، اور اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں، دل ہی دل میں خود سے سوال کرتے ہوئے، ”یہ... یہ سب کیسے ممکن ہے؟“ -

اس کے ہونٹ لرز رہے تھے، بدن خوف اور اضطراب سے کپکپا رہا تھا، جیسے سچائی کا وزن اس کی رگوں میں خون کی جگہ زہر کی طرح دوڑ رہا ہو۔

اسی لمحے، آصف کی گونجتی ہوئی اور بے رحمی سے بوجھل آواز ایمان کے کانوں میں آئی، جیسے کسی قید خانے میں بھاری زنجیریں گھسٹتی ہوں۔

وہ آمنہ کی طرف قہقہہ لگاتے ہوئے بولا، ”تمہاری بیٹی تمہاری سو کن بن گئی ہے، یہ ہی وجہ ہے تمہیں اس سے حسد ہونے لگا ہے۔“ اس کے الفاظ میں طنز کا زہر ٹپک رہا تھا، جیسے اپنے ہی ظلم پر قہقہہ لگا رہا ہو۔

آمنہ کا چہرہ قہر سے دھکنے لگا، اور وہ غصے کی شدت سے اپنے مقام سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

۔ ”خدا کی قسم، میں اسے خاک میں ملا دوں گی!“

اس نے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں اعلان کیا، اس کی آنکھوں میں ایک مہلک چمک تھی، جیسے وہ اسے جیتے جی مار ڈالنے کے درپے ہو۔

۔ ”اور ویسے بھی، وہ میری بیٹی نہیں ہے!“

آمنہ نے زہریلے انداز میں کہا، اس کے الفاظ کاٹ کھانے والے تھے۔

۔ ”وہ جتوئی کی بیٹی ہے، میں نے کبھی اسے اپنا مانا ہی نہیں۔ اس کو تو دودھ بھی نوکرانی نے پلایا ہے۔ وہ میری بیٹی ہو ہی نہیں سکتی!“

اس کی زبان سے نکلتے ہوئے یہ جملے زہر کی مانند فضا میں پھیل گئے، اور ایمان کے دل پر جبر اور بے حسی کے ان گہرے داغ چھوڑ گئے۔

دروازہ اچانک زور سے کھلا اور خاموشی کو ایک کٹیلی آواز نے توڑ دیا۔ کمرے میں پھیلا ہوا تناؤ کٹ سا گیا۔
آمنہ اور آصف نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا، ان کے چہروں پر صدمے اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

ایمان دروازے پر کھڑی تھی، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں، چہرے پر درد اور بے یقینی کی پرچھائیاں تھیں۔

اس نے اپنی ماں کی طرف ایک زخمی نگاہ ڈالی، جیسے اس کے دل کا زخم اُس کی نگاہوں میں جھلک رہا ہو۔ یہ وہ لمحہ تھا جب ایمان نے اپنی زبان کھولی، اپنے اندر کی اذیت کو الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

۔ ”اتنی ظلم و زیادتی...“

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا، گویا ہر لفظ اس کے لیے ایک بوجھ تھا۔

۔ ”پہلے آپ کے شوہر نے،“

اس نے آصف کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا،

۔ ”میرے ساتھ حیوانیت کا سلوک کیا، اور اب... اب ایک اور ظلم!“

وہ لمحہ بھر کے لیے رک گئی، اپنی اذیت کے بوجھ کو سہارنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، جیسے وہ ماضی کی ان تلخ یادوں سے چھٹکارا پانے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔

۔ ”جب میں چیخ رہی تھی، درد سے کراہ رہی تھی، اوو وہاں سہی سہی اس کی وجہ یہ ہی تھی ”ایمان کی آواز درد اور غصے سے بھری ہوئی تھی، اس کا جسم کانپ رہا تھا جیسے وہ اپنے زخموں کا بوجھ اٹھا رہی ہو۔

- ”یعنی میں۔۔ میں۔۔“

وہ جملہ مکمل نہ کر پائی۔

اس نے سوال کیا، اس کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھیں جیسے وہ انصاف کی بھیک مانگ رہی ہو۔
- ”میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ اور پھر۔۔“

اس کی آواز کانپتے ہوئے اونچی ہو گئی،

- ”اس رات آپ نے میرے ساتھ وہ سب کر ڈالا۔“

آصف کا چہرہ نفرت سے بھرا ہوا تھا، اور وہ بے تاثر ہو کر منہ پھیرتے ہی ایمان کی طرف حقارت سے دیکھنے لگا۔ آمنہ کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے، اور اس کی زبان زہر میں بجھی ہوئی تھی۔

وہ بے حسی سے بولی، ”تم اسے کہاں رکھتی؟ تمہارا اپنا کوئی ٹھکانا نہیں، تم تو بنجاروں کی طرح ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہو۔ تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے، تم ایک بے مقصد زندگی گزار رہی ہو!“

آمنہ کے لہجے میں نفرت کا ایک اور تیر تھا جو اس کی بیٹی کی طرف پھینکا گیا۔

- ”اور ویسے بھی، زنا سے پیدا ہونے والے بچے کو پیٹ میں مار دیا جائے تو کون سی بڑی بات ہو گئی؟ تمہاری عزت بچالی ہم نے!“

آمنہ کے لفظ ایمان کے دل میں ایک زخم کی طرح چھب رہے تھے۔

ایمان نے اپنی ماں کی طرف مایوسی اور صدمے سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر سوالات کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

۔ ”کیا میں واقعی آپ کی بیٹی ہوں؟“ ۔

اس نے لرزتی آواز میں سوال کیا، آنکھوں میں ایک نامکمل سی روشنی۔

۔ ”آپ گناہ گار تھیں...“ ایمان نے کانپتے لبوں سے کہا، ”اور اب قاتل بھی“ ۔

آمنہ کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے کچھ نرمی آئی، جیسے وہ ایمان کے درد کو سمجھ رہی ہو، لیکن پھر اس نے اپنی جذباتی دیواروں کو دوبارہ کھڑا کر لیا۔

وہ ایمان کے قریب آئی اور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے ٹھنڈے اور بے رحم لہجے میں بولی، ”ہاں، میں نے اسے مار ڈالا۔ میں نے اُس بچے کو ختم کر دیا جو ابھی اس دنیا میں آیا بھی نہیں تھا۔“ ۔

اس کے الفاظ دل چیر دینے والے تھے، اور ایمان کی آنکھوں میں آنسو مزید تیز ہو گئے۔

آمنہ نے اپنی بات جاری رکھی، ”میں نے یہ سب ضرورت کے تحت کیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی، تو یہ ہمارے خلاف استعمال ہوتا، تمہارے اور تمہارے باپ کے ہاتھ میں ایک ہتھیار بن جاتا، جو ہمیں برباد کر سکتا تھا۔“

آخر کار آمنہ نے دل کی بات بول ہی دی۔۔

آمنہ کے لہجے میں نفرت صاف جھلک رہی تھی۔ ”ہاں، میں نے تمہیں جنم دیا، مگر میں نے تمہیں کبھی اپنی بیٹی نہیں سمجھا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ تمہارے باپ کی یاد آتی ہے، اور میں تمہیں اسی لیے ناپسند کرتی ہوں۔“

ایمان کا دل درد سے بھر گیا۔ وہ اپنی ماں کے اعترافات کو سننے کی تاب نہ لاسکی۔ اس کی آنکھیں مزید بھاری ہو گئیں، جیسے ہر آنسو اس کی روح کی گہرائیوں سے بہہ رہا ہو۔

آمنہ نے مزید کہا،

۔ ”تمہارے باپ کے ساتھ میری شادی مجبوری تھی۔ میرے والدین نے آصف سے میری محبت کے باوجود، مجھے جتوئی کے ساتھ بیاہ دیا۔ تمہارا باپ،“

اس نے تلخی سے کہا، ”وہ ایک رات نشے میں گھر آیا اور... اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں کمزور تھی، اُس کے سامنے بے بس ہو گئی۔“

آمنہ کی آنکھوں میں ایک لمحہ بھر کے لیے ماضی کا وہ خوفناک منظر پلٹا، اور پھر اُس نے نفرت بھری آواز میں کہا،

- ”تم اس لعنتی رات کی پیدائش ہو تم ایک لعنت ہو۔“

ایمان کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ اپنی ماں کے چہرے کو دیکھ رہی تھی، لیکن اُس کی نگاہیں بے جان تھیں۔ یہ سچائی اتنی کڑوی تھی کہ وہ اسے برداشت نہیں کر پار ہی تھی۔

آمنہ کے اعترافات نے اُس کے اور ایمان کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج پیدا کر دی تھی۔ اور ایمان اس خلیج کے دوسری طرف، اپنی ماں کی بے رحمی کو دیکھتے ہوئے، اُس درد کو محسوس کر رہی تھی جو شاید کبھی ختم نہ ہو سکے۔

آمنہ نے بے نیازی سے اپنے سینے پر ہاتھ باندھ کر ایمان کی طرف دیکھا اور سفاک لہجے میں بولی، - ”اب تمہیں اندازہ ہو گیا تمہارے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے۔ یہ تمہارے باپ کے گناہ کا سایہ ہے جو تم پر پڑ رہا ہے؟“ -

اس کی نظریں آصف کی طرف گئیں، جیسے وہ گزرے لمحوں کی کسی دلدل میں اتر رہی ہو۔ اس کے لہجے میں ایک عجیب، غیر مرئی تلخی گھل گئی تھی۔

- ”میں نے تمہاری پرورش کبھی نہیں کی، نہ ہی تمہیں کبھی دودھ پلایا۔ یہ تمہاری دادی تھیں جنہوں نے تمہارا خیال رکھا، لیکن تمہاری بد قسمتی دیکھو کہ وہ بھی تمہیں چھوڑ کر چلی گئیں جب تم محض دو سال کی تھی۔“

آمنہ نے اپنی بات کو سختی سے جاری رکھتے ہوئے کہا، ”مجھے تو تم سے چھٹکارا پانا تھا۔ اگر تمہاری دادی پہلے ہی مر جاتی تو تم آج یہ سب برداشت نہ کرتی الزام اپنی اس لعنتی دادی کو دو وہ بڑھیا اس سب کے پیچھے ہے۔“

آمنہ کی آواز ایک لمحے کو لرزا اٹھی، مگر اس کی سفاکیت قائم رہی۔

- ”تم ایک بوجھ ہو، مجبوری کی پیداوار۔ میرے والدین اور جتوئی کے باپ نے زبردستی ہمیں اس رشتے میں جکڑ دیا تھا۔ یہ سب ان کا کیا دھرا ہے، میں نے نہیں چاہا تھا تمہاری پیدائش، اور ویسے بھی رشتے احساسات سے بنتے ہیں اور میرے دل میں تمہارے لیے کوئی احساس نہیں!“

اس نے حقارت بھری نظر ایمان پر ڈالی اور سرد لہجے میں کہا، ”اب بس، اپنا سامان باندھو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ ہم نے تمہارا بوجھ بہت دنوں سے اٹھا رکھا ہے، اب بس۔“

ایمان نے اپنے درد اور کرب کو روکتے ہوئے، بے یقینی کے عالم میں سوال کیا۔

- ”یہ نفرت کیوں؟“ اس کی آواز کانپ رہی تھی، جیسے وہ اپنی ماں سے کوئی ہمدردی کی توقع کر رہی ہو۔

آمنہ کے چہرے پر ایک سنگدل مسکراہٹ ابھری، اس کی آنکھیں سر دھو گئیں، اور وہ جبرے کو زور سے بھینچ کر بولی،۔

۔“ نفرت؟ تمہارے وجود نے میرے لیے ذلت کے دروازے کھول دیے۔ تمہارے باپ نے مجھے ظلم و جبر میں دھکیل دیا، اور اس قید میں رکھا جہاں سے میں کبھی فرار نہیں ہو سکی۔ تم اس ذلت کی جیتی جاگتی یادگار ہو۔”۔

آمنہ کی یہ بات سن کر ایمان کے چہرے پر بے بسی اور درد کی ایک گہری چھاپ تھی، جیسے اس کی دنیا ہی ٹوٹ چکی ہو۔

...°...

امروز

۔ ایمان کی شخصیت پر ماضی کی تلخ یادوں کا سایہ تھا، اور اپنے خیالات کی تاریکیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے، وہ اپنے گھر کی قید سے باہر نکل آئی۔

اس کا بھیس اتنا عمدہ تھا کہ کسی کو اس کی حقیقت کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ اس کے لمبے اور کنڈل سیاہ و جامنی بال جو ایک نفیس پونی کی صورت میں اس کے شانے پر پڑے تھے، اس کی شناخت کو مزید پیچیدگی میں چھپا رہے تھے۔

جوں جوں وہ اپنے ماضی کی اذیتوں سے دور ہوتی گئی، لوگوں کی نگاہیں اس کے پرکشش لباس پر ٹھہر گئیں۔ وہ ٹشو کپڑے کا فراک، جو انتہائی نزاکت اور خوبصورتی سے تراشا گیا تھا، اپنی تراش میں یکتا تھا۔ اس کے اوپری حصے میں باریک جالی کا نفیس کام تھا جو فراک کی ساخت میں ایک نرمی اور نسوانیت کا رنگ بھر رہا تھا۔

فراک کا تانا بانا اتنا ہلکا اور نرم تھا کہ ہوا کے نرم جھونکوں کے ساتھ رقص کرتا، جیسے ہر حرکت ایمان کی شخصیت کا اظہار ہو۔

اس کا سیاہ رنگ مزید پراسراریت اور گہرائی کا تاثر پیدا کر رہا تھا، اور اس کی کمر پر بندھی ہوئی سیاہ ربن بیلٹ نے نہایت سلیقے سے اس کی تراش کو نمایاں کر دیا تھا، جس سے نہ صرف اس کے جسمانی خطوط کی نفاست ظاہر ہو رہی تھی، بلکہ اس کے مزاج کی مضبوطی بھی جھلک رہی تھی۔

ایمان ہر قدم کے ساتھ نامعلوم کی طرف بڑھتی رہی، جیسے ہر قدم اس کے ماضی کی کڑوی حقیقتوں سے دور لے جا رہا ہو۔ اس کے کالے اونچی ایڑی والے جوتے فٹ پاتھ پر ایک مخصوص آواز پیدا کر رہے تھے، جیسے ہر ضرب اسے اس کے نئے سفر کے قریب کر رہی ہو۔

جب وہ مولانا سرور کے گھر کے قریب سے گزری، تو وہاں کھڑے لوگوں کی نظریں چند لمحوں کے لیے اس کے وجود پر ٹھہر گئیں، لیکن ایمان نے ان کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا۔

اس کے دل میں ایک عزم تھا، ایک ایسا مشن جس نے اسے ان تمام نظروں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

پھر وہ درخت، جس کی شاخ سے اس دن پر اسرار پتا گرا تھا، دوبارہ اس وہ درخت کے سائے میں کھڑی تھی۔ اس کی سیاہ و جامنی، گھنگریالے بال ہو امیں ایسے مچل رہے تھے، جیسے نئے عزم کا جشن منا رہے ہوں۔

ایمان کی نگاہ نائٹ کلب کی عمارت پر پڑی جہاں اس نے اپنے ماضی کے کئی راز چھپائے تھے، جہاں اسے تربیت دی گئی تھی، لیکن آج اس کے دل میں کچھ اور تھا۔

اس نے دل میں خود سے بات کی، اُس کی آواز میں اب پختگی تھی۔

۔ ”نائٹ کلب، تو میرا پناہ گاہ تھا، میری تربیت کی جگہ تھی، لیکن آج میں ایک نئے راستے پر گامزن ہوں۔ یہ راستہ میرا ہے، میری اصولوں کا راستہ۔ کامیابی اسی میں ہوگی کہ میں اپنی سچائی کے ساتھ جینا سیکھوں۔“

سورج کی کرنیں اس پر پڑ رہی تھیں، جیسے اس کے سفر کو روشنی دے رہی ہوں، اور ایمان اپنے ماضی کے تاریک سائے کو پیچھے چھوڑتے ہوئے، مستقبل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ایمان اپنے خیالات کی گہرائیوں میں کھوئی ہوئی تھی، کہ اچانک ایک آواز نے اسے گویا اس خوابناک حالت سے چونکا دیا۔ وہ چونک کر بائیں جانب دیکھنے لگی، جہاں ایک نوجوان، سادہ قمیض و شلوار میں ملبوس، اپنی بیوی کے ہمراہ کھڑا تھا۔

ان دونوں کی وضع قطع اور چال ڈھال سے ان کی دیہی پس منظر کی جھلک واضح تھی۔ ایمان نے ان کی طرف نگاہ ڈالی اور ہلکے سے سر ہلا کر ان کی موجودگی کا اعتراف کیا۔

نوجوان لڑکی نے معصومیت بھری آواز میں دریافت کیا، ”سنیے، آپ مولانا سرور کا گھر جانتی ہیں؟“۔

ایمان لمحہ بھر کے لیے اس انجان نام سے حیرت زدہ ہو گئی۔ اس کی پیشانی پر ہلکی سی سلوٹ نمودار ہوئی اور اس کی نگاہیں چند لمحے کے لیے نیچے جھک گئیں، جیسے کوئی بھولا ہوا خیال یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر یکدم، جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آئی ہو، اس نے نرمی سے کہا،

۔ ”مولانا سرور؟“ پھر ایک لمحے میں اسے بات سمجھ آئی۔

، ”آہ، سندس کے والد...“

اس نے ہاتھ کی نرم جنبش سے راستہ دکھاتے ہوئے نظریں دور اس گھر کی طرف موڑ دیں جہاں لوگوں کا ایک چھوٹا مجمع جمع تھا، وہی گھر جہاں سے ایمان گزری تھی۔

- ”آپ جو مجمع وہاں دیکھ رہے ہیں، وہ ہی مولانا سرور کا گھر ہے۔“ اس کی آواز میں ایک عجیب سی ملائمت اور تجسس کا آمیزہ تھا۔

نوجوان لڑکی نے ایمان کا شکریہ ادا کیا، اس کے چہرے پر ایک شائستہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ وہ جانے کو مڑ ہی رہے تھے کہ ایمان کی آواز نے انہیں روک لیا۔

- ”سنیے!“ ایمان کی آواز میں کچھ چھپا ہوا تھا، جیسے کوئی نادیدہ سوال اسے بے چین کیے ہوئے ہو۔

لڑکی نے پلٹ کر سوالیہ نگاہوں سے جواب دیا، ”جی؟“۔

ایمان کے چہرے پر غور و فکر کی پرچھائیاں کھیل رہی تھیں۔ اس نے ہلکی سی آواز میں استفسار کیا، ”آپ مولانا سرور کے گھر جا رہے ہیں، کوئی خاص وجہ؟“۔

نوجوان لڑکی نے اپنا نرم لہجہ برقرار رکھتے ہوئے وضاحت دی، ”جی، مولانا سرور ایک روحانی بزرگ ہیں، وہ پہلے ہمارے گاؤں میں رہتے تھے، آج شہر میں ان کا آستانہ قائم ہوا ہے۔“۔

ایمان نے یہ الفاظ سنے، مگر وہ کسی اور ہی خیال میں گم تھی۔ اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکنیں نمودار ہوئیں، جیسے وہ ابھی تک اس ساری گفتگو کا کوئی مطلب تلاش کر رہی ہو۔

ایمان کی متجسس نگاہوں نے اسے مزید سوالات کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے دھیرے سے پوچھا، ”آپ کی کون سی دعا قبول نہیں ہوئی؟“

لڑکی نے اس سوال پر ایک لمحے کے لیے اپنے شوہر کی طرف دیکھا، پھر اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی اور اداسی کی جھلک صاف نظر آرہی تھی۔ نرمی سے، تھوڑا سا جھجھکتے ہوئے، وہ بولی،

۔ ”حقیقت یہ ہے کہ ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔ ہمارے گاؤں میں کسی نے مولانا سرور کا ذکر کیا تھا۔ میرے شوہر کو شروع میں شک ہوا، لیکن آخر کار میری ضد کے سامنے وہ ہار مان گیا۔“

لڑکی کی آواز میں درد چھلک رہا تھا۔ اس نے ایک سر د آہ بھری اور بولی،

۔ ”مولوی صاحب نے ہم سے دس لاکھ کا مطالبہ کیا تھا۔ ہمیں لگا کہ یہ سب دھوکہ ہے۔ پیسے مانگنا ہمیں مشکوک لگا، لیکن پھر ایک دن ایک گاڑی ہمارے گھر کے پاس رکی۔ اس میں موجود لوگ مولوی صاحب کی دعاؤں سے اولاد پانے کا دعویٰ کر رہے تھے۔ یہ سن کر ہم نے اپنی ساری امیدیں ان پر لگا دیں۔ میں نے اپنا سارا زیور بیچ دیا اور میرے شوہر نے گائیں فروخت کر دیں۔ اب ہم یہاں ہیں، امید کی آخری کرن تھامے۔“

لڑکی کی آنکھوں میں امید کی چمک تھی، اور ایمان نے اس کے چہرے پر چھپی ہوئی بے یقینی اور امید کے ملاپ کو محسوس کیا۔ ایمان کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر ابھر رہا تھا، جیسے وہ اس دنیا کے ایک الگ رخ کو دیکھ رہی ہو، ایک ایسا رخ جسے وہ شاید پوری طرح سے سمجھنے سے قاصر تھی۔

ایمان کے چہرے پر ایک دھیمی، گرمجوش مسکراہٹ ابھری، جو اندرونی سکون اور خلوص کی گواہی دے رہی تھی۔

اس نے دل میں سوچا، کیا یہ الفاظ واقعی اس کے اپنے خیالات ہیں یا کسی روحانی قوت نے اسے روشنی دکھائی ہے؟ جیسے ہی اس نے نوجوان لڑکی کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا، اس کی آنکھوں میں عاجزی جھلکنے لگی۔ ایمان نے دھیرے سے کہا۔

۔، ”میں کوئی عالم نہیں ہوں، نہ ہی مجھے اسلام کا عمیق علم ہے، لیکن جو کچھ مجھے سمجھ آیا ہے، وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی سے مانگنا درست نہیں۔“

لڑکی نے اپنے شوہر کی طرف پلٹ کر دیکھا اور پھر ایمان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے متوجہ ہوئی، جیسے کوئی وضاحت چاہتی ہو۔ ایمان نے نہایت نرمی اور یقین کے ساتھ بات جاری رکھی،

۔، ”اللہ ہم سے کبھی پیسوں کا مطالبہ نہیں کرتا، اور نہ ہی وہ یہ کہتا ہے کہ ہم اسے پکارنے کے لیے طویل سفر کریں۔ وہ تو ہمیشہ ہمارے قریب ہے، بس ہم سے یہ ہی چاہتا ہے کہ ہم اسے پکاریں اور اس کی رضا کے مطابق چلیں۔“

ایمان نے لڑکی کے کندھے پر اپنا ہاتھ مضبوطی سے رکھا اور پھر قرآنی آیت کا ترجمہ سنایا
پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ اور میرا شکر ادا کرو، ناشکری نہ کرو۔

۔ (سورہ البقرہ، آیت ۱۵۲)

یہ الفاظ سن کر لڑکی کی آنکھوں میں حیرت اور عقیدت کی جھلک نظر آنے لگی، جیسے اس کی روح میں کوئی
نیا نور بھر گیا ہو۔

ایمان کی آواز میں ایک غیر معمولی لطافت اور یقین کا تاثر تھا، جیسے یہ علم کسی پوشیدہ سرچشمے سے بہتا ہوا
اس کے دل و دماغ میں اتر رہا ہو۔ اس لمحے میں، ایمان کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی روحانی روشنی اس کے
گرد لپٹ گئی ہو، گویا فرشتوں کی ایک جماعت اسے گھیرے ہوئے ہو۔ اس کے پیچھے، ایک نورانی فرشتہ،
خالص روشنی میں ڈوبا ہوا، خاموشی سے کھڑا تھا، اس کی موجودگی گویا کسی دوسری دنیا کی تھی۔

فرشتہ اپنی تمام تر پاکیزگی اور نورانیت کے ساتھ ایمان کے دل کی گہرائیوں میں اترتے علم کا محافظ تھا، جیسے
وہ ہر لفظ، ہر جملے کو رہنمائی دے رہا ہو۔ وہ روحانی ہستی، جس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرنے والی تھی،
ایمان کے آس پاس کے ماحول کو ایک نرم، دلنشین روشنی میں ڈھال رہی تھی۔

ایمان کی آنکھوں میں حیرت اور تقدس کا رنگ صاف جھلک رہا تھا۔ اس کا چہرہ روحانی بصیرت کی روشنی میں جگمگا رہا تھا، اور اس کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ کسی گہرے راز کے امین تھے۔

وہ فرشتہ، جو اپنی تابناک پاکیزگی میں یکتا تھا، ایک ایسا مظہر تھا جسے دیکھنا انسانی آنکھوں کے لیے ناممکن تھا، مگر اس کی موجودگی نے ایمان کے اندر ایک غیر معمولی سکون اور خوشبو بھر دی تھی۔

یہ لمحہ، تقدس اور روحانی انکشاف کا تھا، جو ایمان کو ایک نئی حقیقت کی طرف لے جا رہا تھا، اور اس کے ہر لفظ میں الہی رہنمائی کا عکس جھلک رہا تھا۔

ایمان نے گہری سانس لی اور نرم لہجے میں مزید کہا،

۔۔ ”اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے، ‘آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے، اور جسے چاہتا ہے بیٹے بخشتا ہے۔ یا ان کو بیٹے اور بیٹیاں دونوں عنایت فرماتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے۔ وہ تو جاننے والا (اور) قدرت والا ہے

(۴۹۔ ۵۰)

ایمان کی پلکیں سکون سے جھپکیں اور وہ تھوڑا جھک کر ان کی طرف محبت سے بولی،

۔ ”مسلمان تو وہ ہی ہے جو اپنی مرضی کے آگے اللہ کی مرضی کو رکھے۔ اس کی رضا میں خوش رہو اور اسی سے دعا کرو، یقیناً وہ آپ دونوں کی دعا سنے گا۔“

نوجوان لڑکی نے شوہر کی طرف نظر ڈالی، ایک پل کو ایمان کی باتیں سنتے ہوئے نظر آئی، لیکن پھر اچانک شکریہ کہہ کر، دونوں اس سے دور چلے گئے، جیسے ان کی امیدیں ابھی بھی کسی اور راستے پر جمی ہوئی ہوں۔ ایمان نے ان دونوں کو جاتے دیکھا، دل میں ایک عجیب سا خلاء محسوس کرتے ہوئے۔ اس کے دل میں ملامت کی ایک لہر اٹھی، جیسے اس نے غلطی سے کسی کے معاملات میں دخل دے دیا ہو۔

۔ ”میں نے ان سے کچھ کیوں کہا؟“

اس نے خود سے سرگوشی کی، اور پھر خود کو ڈانٹتے ہوئے بولی،

”مجھے کیا ہوا تھا؟ ان کی زندگی میں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اوف، کیوں بولا میں نے؟“

خیالات کا طوفان اس کے ذہن میں چکر کاٹ رہا تھا، ہر سوال دوسرے سوال کی جگہ لے رہا تھا، اور اس کا دل بے چینی میں الجھ رہا تھا۔

۔ ”اور یہ قرآن کی آیات میرے ذہن میں کیسے آئیں؟“

اس کا ہاتھ بے ساختہ اس کی پیشانی پر جا پہنچا، جیسے وہ خود کو اس الجھن سے آزاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

۔ ”میں نے تو کبھی قرآن کو اس طرح پڑھا بھی نہیں۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟“۔

ایمان نے آنکھیں بند کیں، اپنے اندر اٹھنے والی اس روحانی آگاہی اور انکشافات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ وہ ان سب سوالات کے جواب تلاش کر رہی تھی جو اس کی زندگی میں ایک معمہ بن چکے تھے۔ اس لمحے میں، اس نے ایک فیصلہ کیا،

۔ ”آج رات ان بزرگ کو سب کچھ بتا دوں گی۔“۔

اس کے اندر ایک نئی روشنی کا احساس جنم لینے لگا، جیسے یہ وقت تھا کہ وہ اپنے حالات کو کسی ایسے فرد کے سامنے پیش کرے جو اسے اس الجھن سے نکال سکے۔ اور اس نے خود سے وعدہ کیا کہ وہ اس اہم گفتگو کو ملتوی نہیں کرے گی۔

...°...

ایمان جیسے ہی اپنے گھر کے گیٹ پر پہنچی، وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ اچانک اس کے کانوں میں آواز گونجی، ”ایمان! کیسی ہو؟“۔

اس آواز میں مخصوص دوستانہ پن تھا، جو اس کی پڑوسن، ڈی ایچ اے کی خالہ، یعنی صباحت آنٹی کی پہچان تھی۔ ایمان فوراً رک گئی اور مڑ کر مسکراتے ہوئے جواب دیا،

”میں ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں؟“

اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھی تک قائم تھی، جب اس کی نظر اچانک ایک نوجوان پر پڑی جو صباحت آنٹی کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کا قد لمبا اور پروقار تھا، جیسے کوئی یونانی مجسمہ حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آ کھڑا ہوا ہو۔ اس کے چہرے پر تراشی ہوئی ہڈیاں، جاندار جڑے کی لکیر، اور گہری بھوری آنکھیں تھیں جن پر لمبی، سیاہ پلکیں جھپکتی تھیں۔ اس کی بھورے بالوں کی ہلکی سی لہریں، جیسے ہوا میں آزادانہ جھول رہی ہوں، اس کے چہرے کے ساتھ شاندار طور پر ہم آہنگ تھیں۔

جسم میں ایک ایسی مضبوطی تھی جو واضح کرتی تھی کہ یہ نوجوان کوئی عام شخص نہیں۔ اس کے چوڑے کاندھے اور متوازن جسم، جیسے کسی مجسمے کی طرح، اُس کی شخصیت کو مزید ابھار رہے تھے۔ وہ ایک نفیس سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا، جس کی فٹنگ اُس کے جسم پر ایسے جم رہی تھی جیسے وہ لباس اس کے لیے ہی بنایا گیا ہو۔

ایمان، جو ہمیشہ اپنی الگ تھلگ اور سنجیدہ طبیعت کے لیے مشہور تھی، اس منظر سے بظاہر غیر متاثر رہی۔

اس نے اپنی نظریں فوراً ہٹالیں، جیسے وہ ایسے مناظر کی عادی ہو اور یہ سب اس کے لیے کوئی نیا نہ ہو۔ ایمان کی زندگی میں اتنے پیچیدہ تجربات ہو چکے تھے کہ وہ ظاہری خوبصورتی سے زیادہ متاثر نہیں ہوتی تھی۔

مگر، اُس کے برعکس، اُس نوجوان کی نظریں مسلسل ایمان پر جمی رہیں، جیسے وہ اس کی سادگی اور سنجیدگی سے مسحور ہو گیا ہو۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی، جیسے وہ ایمان کی اس مخصوص خاموشی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

صباحِ آئی نے ایک خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ تعارف کرایا، ”ایمان، یہ میرا بھتیجا بدر ہے۔ بیرونِ ملک سے آیا ہے، ابھی چند دن پہلے ہی پہنچا ہے۔“

بدر نے نہایت دلکش انداز میں ہلکی سی مسکراہٹ دیتے ہوئے کہا، ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی، ایمان۔“

ایمان نے اپنے معمول کے سرد انداز میں جواب دیا، ”سہی۔“

اس کے الفاظ تو معمولی تھے، لیکن بدر کی موجودگی میں ایک عجیب سی کشش اور اسرار کا رنگ گھل چکا تھا۔

بدر کی آنکھوں میں ایک گہری چمک تھی، جیسے وہ ایمان کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو، اور ایمان کی سنجیدگی، جیسے وہ اس نوجوان کی دلکش شخصیت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

یہ پہلا سامنا تھا، لیکن ایمان کو محسوس ہو چکا تھا کہ آج کے دن میں کچھ نیا تھا۔ بدر کی موجودگی نے جیسے اس کے دن کو ایک عجیب و غریب موڑ دے دیا تھا، جیسے یہ محض ایک تصادم نہیں تھا، بلکہ کچھ ایسا تھا جس کی گہرائی آنے والے دنوں میں کھلنے والی تھی۔

ایمان کے چہرے پر سرد تاثرات برقرار تھے، لیکن دل کی گہرائیوں میں، شاید کچھ ہلچل سی ضرور ہوئی تھی۔

ایمان نے جیسے ہی رخ بدلا اور گیٹ کی طرف قدم بڑھایا، صباحت آنٹی کی نظریں تنقیدی نگاہ سے اس کے بالوں پر جا ٹکیں، جیسے وہ کوئی گہری غلطی تلاش کر رہی ہوں۔

طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولیں، ”بیٹا، تم نے پھر سے بالوں کا رنگ بدل لیا؟ ایسے بالوں کا رنگ بدلنا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔“

ایمان نے لمحہ بھر کو توقف کیا، پھر ہلکی سی مگر پر اعتماد مسکراہٹ اس کے لبوں پر رقص کرنے لگی۔ وہ دھیرے سے مڑی، آنکھوں میں چمک لیے جواب دیا،

۔ ”بالوں کا رنگ بدلتا رہتا ہے، آنٹی، مگر کم از کم میری سوچیں آپ کی طرح نہیں بدلتی۔ آپ کی رائے تو ایسی بدلتی ہے جیسے گرگٹ رنگ بدلتا ہے۔“

ایمان کے ان الفاظ میں وہ کاٹ تھی جو کسی تیز دھار خنجر کی مانند، سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ ڈی ایچ اے کی خالہ ایک پل کو چپ ہو گئیں، ان کے چہرے کے تاثرات ایسے بدل گئے جیسے زمین پیروں تلے سے کھسک گئی ہو۔

خوبصورت نوجوان بدر، جو خاموشی سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، ایمان کی جرات مندی اور تیز فہمی پر حیرت زدہ ہو کر ایک ابرو اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

ایک مدھم سی شرارتی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیلنے لگی، جیسے وہ ایمان کی بے باکی سے محظوظ ہو رہا ہو۔ ایمان نے بغیر کسی اور بات کے گیٹ کھولا اور ایک دلجمعی سے اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ صباحت آنٹی کی نظریں ابھی تک ایمان کے پیچھے لگی تھیں، جیسے وہ الفاظ کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ان کے چہرے پر چھائی ہلکی مایوسی، اندرونی بے چینی کو ظاہر کر رہی تھی۔

ڈی ایچ اے کی خالہ نے ہلکا سا سر ہلاتے ہوئے بدر کی طرف دیکھا، جیسے وہ اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہوں،

۔ ”وہ ہمیشہ ایسی ہی رہی ہے۔ اس کی زبان بہت تیز ہے، لیکن دل کی بری نہیں۔ تم اسے دل پر مت لینا۔“

گو کہ یہ بات صباحت کو دل پر لینی چاہیے تھی، نہ کہ بدر کو۔ بہر حال، ڈی ایچ اے کی خالہ شاید ایمان کی ان باتوں کی عادی ہو چکی تھیں اور اب انہیں ایمان کا کاٹ دار رویہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔

بدر نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا، مگر اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی، جیسے وہ ایمان کی غیر معمولی شخصیت سے مزید متاثر ہو چکا ہو۔ پھر وہ صباحت آنٹی کے ساتھ قدم ملا کر اندر کی طرف بڑھ گیا، لیکن ایمان کا یہ انداز، اس کی خود اعتمادی اور بے باکی، بدر کے ذہن میں کہیں گہرائی تک نقش ہو چکی تھی۔

...°...

ایمان نے اپنے اجنبی مگر مانوس گھر کے لوہے کے گیٹ کو پار کیا، جہاں دھوپ کی کرنیں آرائشی ڈیزائن سے گزرتے ہوئے زمین پر پیچیدہ اور خوبصورت سائے کے نمونے بکھیر رہی تھیں۔

گیٹ بند کرتے ہی، اچانک اس کے ہینڈ بیگ میں رکھے فون کی آواز گونجی، جو کسی کال کی آمد کی اطلاع دے رہی تھی۔ ایمان نے نہایت مہارت اور روانی سے فون نکالا، اسکرین پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ کال مونیٹر کی تھی۔

- ”پندرہ منٹ، ایمان!“ -

مونیز کی آواز نے فون کے اسپیکر سے نکلتے ہی فضا کو بھر دیا۔ اس کی بات کی شدت نے ایمان کی بھنویں ہلکی سی کھول دیں۔ پس منظر میں ٹریفک کی مانوس آوازیں سنائی دے رہی تھیں، جو اس کے شہر کی روزمرہ کی گہما گہمی کا پتہ دے رہی تھیں۔

- ”میں پندرہ منٹ میں تمہارے گھر کے باہر ہوں گی،“ مونیز نے بات جاری رکھی، اس کے لہجے میں عجیب سا عزم تھا، جیسے یہ معمول کا واقعہ ہو۔

ایمان نے ایک گہری سانس لی، جیسے مونیز کی توقعات کے بوجھ کو محسوس کرتے ہوئے۔

- ”کیا واقعی ضروری ہے کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں؟“ اس کی آواز میں تھوڑی سی ہچکچاہٹ تھی، گویا وہ پہلے سے ہی جانتی ہو کہ اس سوال کا کیا جواب ہو گا۔

- ”یقیناً تمہیں آنا ہی پڑے گا،“ -

مونیز نے کسی شک کی گنجائش چھوڑے بغیر کہا، جیسے کوئی اور متبادل ممکن ہی نہ ہو۔

- ”سب سے پہلے ہمیں اسٹوڈیو جانا ہے، میرا ایک انٹرویو طے ہے۔ پھر، ہم اے بی این چینل کے ہیڈ کوارٹر اسکرپٹ دینے جائیں گے۔“ -

مونیز کے الفاظ نے ایمان کے چہرے پر تشویش کی لکیر پیدا کر دی۔ ”یہ اسکرپٹ کیا ہے؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا، وضاحت کی امید میں۔

مونیز کی ہلکی سی ہنسی سنائی دی، جس میں پراسراریت کا ہلکا سا شائبہ تھا۔
”جب میں تمہیں اٹھاؤں گی، تب بتاؤں گی،“

اس نے شوخی سے کہا، اور اس سے پہلے کہ ایمان کوئی اور سوال کر پاتی، کال یکدم منقطع ہو گئی۔

ایمان نے فون کی سکرین کو چند لمحے گھور کر دیکھا، جیسے وہ کال کے جلدی ختم ہونے پر حیران ہو۔ ایک گہری سانس لے کر، اس نے اپنے خیالات کی روانی کو زبان دی:
”یہ پاگل! آخر گا اور گی کی پیچیدگیوں میں کب الجھنا بند کرے گا“

...°...

مولوی سرور کا گھر اپنی شان و شوکت میں بے مثال تھا، جیسے ہی لڑکا اور لڑکی گیٹ سے اندر داخل ہوئے، ان کی نظریں وسیع لان اور خوبصورت باغات پر جم گئیں۔

ہر چیز نہایت نفاست سے سنواری گئی تھی۔ ترکی طرز کے محراب اور دیواروں پر موجود لکڑی کے باریک کام نے حویلی کے بیرونی حصے کو ایک منفرد شخصیت دی تھی۔

دائیں طرف، قیمتی گاڑیاں خاموشی سے کھڑی تھیں، جیسے وہ بھی اس گھر کی عظمت کی گواہ ہوں۔ باغ میں پھیلے رنگین پھول اور بلند و بالا درختوں نے ایک عجیب سا سکون بخش ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ لڑکا اور لڑکی اس ماحول میں کھو سے گئے، جب ایک لمبے، نازک مگر باوقار شخص نے ان کے قریب آ کر سرگوشی کی،

”مولوی سرور آپ کا انتظار کر رہے ہیں، اندر تشریف لائیں۔“

جیسے ہی وہ دونوں گھر کے اندر داخل ہوئے، انہیں فوراً ترکی طرز کے کشادہ اور شاندار اندرونی حصے نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ترکی طرز تعمیر اور سجاوٹ کی جھلک ہر گوشے میں نمایاں تھی، اور جیسے ہی ان کی نظر داخلی ہال میں رکھی ہوئی قدیم آئینے اور میز پر پڑی، وہ بے اختیار اس کی نفاست اور کاریگری کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔

آئینے کے اطراف میں باریک نقوش اور گہرے رنگوں کی چمک نے ایک عجیب دلکشی پیدا کر رکھی تھی، جبکہ لکڑی کی میز، اپنی باریکی سے تراشی گئی کاریگری کے ساتھ، ترکی کے فن کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

آگے بڑھتے ہی ان کی نظر ایک وسیع رہائشی ہال پر پڑی، جس کا فرش نفیس ترکی قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ قالین کے گہرے اور زندہ رنگ، جیسے کسی کہانی کے پیچیدہ باب ہوں، کمرے کی سنگین خاموشی کو ایک غیر معمولی کشش فراہم کر رہے تھے۔

فرش پر بچھا قالین ٹائلوں کے ہموار فرش سے بالکل الگ تھلگ، ایک دلکش تضاد پیدا کر رہا تھا۔ دائیں جانب کی بڑی کھڑکی سے آتی روشنی، کمرے میں دھیرے دھیرے پھیل کر فضا کو مزید گرمجوش بنا رہی تھی، جبکہ گہرے رنگ کے پردے اس منظر کو اور زیادہ فخریہ بناتے ہوئے جھوم رہے تھے۔

کمرے کے بچوں بیچ آویزاں ترکی فانوس، اپنی روشنی کے لطیف پیٹرنز کے ساتھ کمرے کو ایک خوابیدہ ماحول میں بدل رہا تھا۔

مرکز میں موجود کشادہ صوفہ، جس پر ترکی کی نفیس کڑھائی والے کپڑے لپٹے ہوئے تھے، دیکھنے والوں کو اپنی طرف بلاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کمرے میں سکون اور وقار کا ایک عجیب امتزاج رچا ہوا تھا، جیسے کہ وہ ترکی کی قدیم ثقافت میں قدم رکھ چکے ہوں۔

مولوی سرور کمرے کے وسط میں بیٹھے تھے، ان کی شخصیت اس جگہ کے بھرپور ثقافتی ورثے کی نمائندہ تھی۔ وہ تسبیح کے دانے انگلیوں سے پھیرتے جا رہے تھے، لیکن جیسے ہی ان کی نظر آنے والوں پر پڑی، ان کی حرکات تھم گئیں۔ مولوی سرور نے ایک لمحے کے لیے گہری نگاہ ڈالی اور پھر آہستگی سے اپنی تسبیح رکھ دی۔

وہ روایتی شلوار قمیض میں ملبوس تھے، ان کے لباس سے جلال اور وقار جھلکتا تھا۔ وہ اپنی نشست سے بلند ہوئے، ان کی مسکراہٹ میں ایک عجیب کشش تھی، مگر اس کے پیچھے چھپا ہوا حساب کتاب بھی محسوس ہو رہا تھا۔

۔ ”گل بانو اور احمر، خوش آمدید،“ ۔

انہوں نے نرم لیکن گہرے لہجے میں کہا۔ ان کی آواز میں ایک ایسی پراسراریت تھی جو فوراً محسوس ہو جاتی تھی، جیسے کچھ چھپا ہوا ہو۔

جب انہوں نے بیٹھنے کی دعوت دی تو ان کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی ایک چالاک مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور پھر، بغیر کسی توقف کے، انہوں نے کہا، ”ہاں، تم پیسے لے کر آئے ہو۔“ ۔

احمر نے خاموشی سے گل بانو کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں ایک واضح انتباہ چھپا ہوا تھا، جیسے وہ اسے مولوی سرور کے ساتھ احتیاط سے معاملات کرنے کا اشارہ دے رہا ہو۔ گل بانو نے اس خاموش پیغام کو سمجھتے ہوئے بینک نوٹوں کا ایک موٹا بندل اپنے بیگ سے نکالا اور مولوی سرور کی طرف بڑھا دیا۔ مولوی نے پیسے بغور دیکھتے ہوئے احتیاط سے لے لیے اور سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

۔ ”آج سے عمل شروع ہو جائے گا،“ ۔

مولوی سرور نے اطمینان بھری آواز میں کہا، ”انشاء اللہ، ایک ماہ کے اندر تمہیں خوشخبری مل جائے گی۔“
یہ کہتے ہوئے اس نے دراز سے مختلف طلسم نکالے اور احمر کے قریب آکر ایک تعویذ نرمی سے اس کے
گلے میں باندھا۔ ”اسے کبھی نہ اتارنا،“۔

مولوی نے نرمی سے، مگر دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ”اگر اس حکم کی خلاف ورزی کی تو پورا عمل برباد ہو
جائے گا۔“۔

مولوی سرور کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور اس نے ایک عجیب درخواست کی۔
”اب مجھے تم دونوں کے بالوں کا نمونہ چاہیے، جڑ سے اکھڑا ہوا،“۔

اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سا فریب چھپا ہوا تھا۔ یہ سن کر گل بانو اور احمر ایک دوسرے کو حیرانی
سے دیکھنے لگے۔ ان کی خاموش پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے مولوی نے فوراً دو کنگھیاں نکالیں۔ ایک
نبلی احمر کے لیے اور ایک گلابی گل بانو کے لیے۔

”ان کنگھیوں کا استعمال کرو اور اپنے بالوں کی جڑ سے ایک ایک لٹ نکالو،“۔

مولوی نے حکم دیا۔

احمر نے بغیر کچھ کہے کنگھی تھام لی، جبکہ گل بانو ہچکچاتے ہوئے اپنے نرم بھورے بالوں کو ننگا کرنے لگی۔
جب اس کی کنگھی بالوں میں چلنے لگی، تو اچانک ایک گرہ سی پیدا ہو گئی۔

یہ دیکھ کر مولوی سرور کی مسکراہٹ لمحے بھر کے لیے مدھم ہوئی اور اس کی نظریں گل بانو پر جم گئیں۔
غور و فکر کے بعد، احمر نے بھی اپنے بالوں کا نمونہ نکالا اور کنگھی مولوی سرور کو دے دی۔

مولوی نے کنگھیاں اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ ان کے چہروں پر نگاہ ڈالی،
جیسے اس کے ارادے ابھی پوری طرح عیاں نہ ہوئے ہوں۔

۔ ”آج سے یہ عمل شروع ہو جائے گا۔“

۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا، ”اب تم جاسکتے ہو۔“

جیسے ہی احمر اور گل بانو مولوی سرور کے احتراماً جھکتے ہوئے رخصت ہوئے، مولوی سرور کی آنکھوں میں
ایک گہری چمک ابھری، جیسے اس کے اندر چھپے ہوئے گہرے عزائم بیدار ہو رہے ہوں۔

اس نے خاموشی سے ان کی پشت کی جانب دیکھا، اور جب وہ دروازے سے باہر نکلے، تو اس کے چہرے پر
ایک مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

کمرے میں تنہائی کا لمحہ آتے ہی اس نے گلابی کنگھی کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا، اور اس کی آنکھوں میں ایک
خوفناک روشنی ناچنے لگی۔

۔ ”آہ، گل بانو...“

اس نے خود کلامی میں سرگوشی کی، اس کے لہجے میں غلیظ خواہش کی سرسراہٹ تھی۔

- ”تمہاری یہ سنہری زلفیں، تمہاری یہ بے عیب خوبصورتی... تمہاری معصومیت۔ جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا، دل میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ تم گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی ہو، اور بہت جلد تم میری ملکیت بن جاؤ گی۔“

اس کی آواز میں اب ایک مکروہ طنز شامل ہو گیا تھا، جیسے وہ اپنے الفاظ سے اپنی ہی سازشوں کا لطف اٹھا رہا ہو۔

- ”احمر؟ وہ تمہارے لائق نہیں، وہ تمہیں کیا دے سکتا ہے؟ وہ تو ایک نادار بھکاری ہے۔ لیکن میں؟ میرے پاس طاقت ہے، دولت ہے، اور سب سے بڑھ کر، میں اللہ کے نام پر حکم دیتا ہوں! تمہیں یہ ابھی نہیں پتہ، لیکن بہت جلد تم میری ہو جاؤ گی، اور تمہارے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہو گا۔“

مولوی سرور کے چہرے پر ایک بھیانک مسکراہٹ پھیل گئی، جیسے وہ اپنے ہی عزائم کی تاریکی میں غرق ہو چکا ہو۔

- ”میری عزت، میرا مقام... سب جانتے ہیں کہ میں اللہ کا مقرب ہوں، اور نیک بندہ ہوں۔ لوگ میرے قدموں میں جھکتے ہیں، اور فرشتے میرے غلام ہیں۔ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں، اور اب، میری پیاری گل بانو، تم بھی میری ہو جاؤ گی۔“

اس کے الفاظ میں اب نہ کوئی تقویٰ باقی تھا اور نہ ہی کوئی نیکی۔ وہ اپنے ظاہر کے پیچھے چھپی شیطانی فطرت کو بے نقاب کر چکا تھا، اور اس کے اندر پختی ہوئی بدی ہر حد کو عبور کرنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔

سرور کے نزدیک اس کی قدرت اور اختیار لامحدود ہیں۔ جبکہ وہ ایک فریبی ہے جو اللہ کے نام پر دنیا کو دھوکہ دینے میں ماہر ہے، لیکن درحقیقت، اس کے اندر چھپا ہوا بھیڑیے کا نفس ہی اس کا حقیقی چہرہ ہے

مولوی سرور کی یہ مخفی حقیقت ایک خوفناک انجام کی پیشگوئی کر رہی تھی۔ اس کی ظاہری نیکی کے پیچھے ایک گہری، تاریک، اور شیطانی چال پوشیدہ تھی جس نے احمر اور گل بانو کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

ہر ذی روح کے اندر ایک راز پوشیدہ ہوتا ہے، ایک مخفی نفس جو ہم سے اور دنیا سے چھپا ہوتا ہے۔ بعض اوقات جنہیں ہم نیک فرشتے سمجھتے ہیں، وہ بھی خود اپنی ذات میں چھپی ہوئی خامیوں سے ناواقف ہوتے ہیں، اور کبھی وہ جو معاشرتی نظر میں کم تر سمجھے جاتے ہیں، حقیقت میں اللہ کے زیادہ قریب ہو سکتے ہیں۔ ہماری فطرت کے اندر چھپے ہوئے اسرار کو صرف اللہ ہی مکمل طور پر سمجھ سکتا ہے۔

مولانا سرور، جو کہ خود کو ایک نیک اور متقی انسان تصور کرتے تھے، اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ان کی دعائیں اور الہی علم نے انہیں اللہ کے مقرب بندوں میں شامل کر دیا ہے۔ دوسری جانب ایمان نامی لڑکی،

جسے لوگ اس کے سخت رویے اور رات کی زندگی کی وجہ سے برا سمجھتے تھے، حقیقت میں اپنے دل کی پاکیزگی اور اللہ سے قربت کی وجہ سے اللہ کی نظر میں بہت مقام رکھتی تھی۔

یہ حقیقت ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ جنہیں ہم نیک سمجھتے ہیں وہ اللہ سے دور بھی ہو سکتے ہیں، اور جن سے ہم نفرت کرتے ہیں وہ اللہ کے قریب ترین ہو سکتے ہیں۔

آخر کار، اللہ ہی ہمارے دلوں کا حال جانتا ہے اور وہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی حقیقی حالت کو پہچانتا ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید کی سورۃ الحجرات کی آیت نمبر 11 میں اللہ فرماتا ہے:

اے ایمان والو! مرد دوسرے مردوں پر نہ ہنسیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان ہنسنے والوں سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں پر ہنسیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان ہنسنے والیوں سے بہتر ہوں اور آپس میں کسی کو طعنہ نہ دو اور ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھو، مسلمان ہونے کے بعد فاسق کہلانا کیا ہی برا نام ہے اور جو توبہ نہ کریں تو وہ ہی ظالم ہیں۔

یہ آیت ہمیں صاف الفاظ میں بتاتی ہے کہ کسی کی تذلیل یا مذاق اڑانا اس وقت ہوتا ہے جب ہم خود کو دوسروں سے برتر سمجھتے ہیں۔ ایمان اور عمل کے معاملے میں کون افضل ہے، یہ فیصلہ صرف اللہ کا حق ہے۔ اس لیے ہمیں کبھی بھی کسی کے ظاہری حالات کی بنیاد پر اس کی نیکی یا بدی کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

مولانا سرور کا تکبر اور ایمان کا دل کی پاکیزگی اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ ہم ظاہری طور پر جو دیکھتے ہیں وہ ہمیشہ سچ نہیں ہوتا۔ اللہ کے نزدیک اصل قدر دل کی نیت اور اس کی خلوص میں ہے، نہ کہ دنیاوی معیاروں اور ظاہری اعمال میں۔

اسلام میں دوسروں کے ساتھ عزت و احترام کا برتاؤ کرنے، اور تکبر اور تضحیک سے بچنے کی سختی سے تلقین کی گئی ہے۔ قرآن کی یہ آیت ہمیں اسی سچائی کی یاد دہانی کراتی ہے کہ حقیقی فضیلت صرف اللہ کی نظر میں ہے۔

اس منحوس حجرے میں جہاں دیواروں پر آویزاں پرانے طغرے اور قالینوں کی بوسیدہ سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، مولوی سرور کا مرید بے قدموں مولوی سرور کے سامنے جھکا۔

اس کے چہرے پر عقیدت اور خوف کا امتزاج تھا، جیسے وہ کسی تاریک راز کا حامل ہو۔ اس نے ہاتھ باندھتے ہوئے سرگوشی کی،

- "مولوی صاحب، کمیٹی کی جانب سے زکوٰۃ کی رقم آگئی ہے، اب اس کا کیا کرنا ہے؟"

مولوی سرور نے اپنی آنکھوں میں ایک مکروہ چمک کے ساتھ ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجائی۔ اس کی انگلیاں بالوں میں پھیری گئی کنگھی پر ٹھہریں، جیسے وہ کسی گہری سازش کے بارے میں غور کر رہا ہو۔

۔ اُس نے سرد اور پراسرار لہجے میں کہا، "یہ رقم تمہیں کیا کرنی ہے، میں بتاتا ہوں۔"

وہ لمحے بھر کے لیے رکا، جیسے الفاظ کو مزید ڈرامائی بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کچھ بے یار و مددگار لوگوں کو چن لو، انہیں بھکاری کہو یا ضرورت مند، جو تمہیں سوٹ کرے۔ پھر ان کو کچھ رقم دو تاکہ ان کا پیٹ بھر سکے۔"

اس کی نظریں اپنے مرید پر ٹکی تھیں، جیسے اس کی ہر حرکت پر نگاہ رکھ رہا ہو۔

۔ "مگر اصل کام تب ہو گا جب ان کی تصاویر کھینچو۔ ان کی بے بسی کو دنیا کے سامنے پیش کرو۔ انسٹاگرام اور فیس بک پر ہماری جھوٹی سخاوت کی تشہیر کرو، تاکہ دنیا دیکھے کہ ہم کتنے مہربان ہیں۔"

مولوی سرور کے ہونٹوں پر وہ ہی پرانی مکار مسکراہٹ واپس آگئی، جیسے وہ پہلے ہی اپنے منصوبے کو مکمل ہو تا دیکھ رہا ہو۔

پھر وہ مزید بولے "باقیہ رقم کو مجھے لا دو"

خادم، جو پہلے ہی اس کے اشاروں پر چلنے کا عادی تھا، ایک مرتبہ پھر سر جھکا کر بولا، "جیسا آپ کا حکم، مولوی صاحب۔"

وہ آہستہ سے پیچھے ہٹتے ہوئے حجرے سے نکل گیا، اس تاریکی میں گم ہوتا گیا، جہاں سازشوں اور مکاری کا
سایہ ہر لمحہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

...°...

ایمان نے بھاری گیٹ کو ہلکا سا دھکیل کر باہر قدم رکھا، جہاں ایک چمکتی ہوئی سیاہ سپورٹس کار اس کا انتظار
کر رہی تھی۔ سورج کی کرنیں گاڑی کی چمک پر پڑ رہی تھیں، جیسے وہ خود بھی ایمان کی طرح آتشیں ہو گئی
ہو۔

گیٹ بند کرتے وقت اس کی نظریں مونیٹر پر جا ٹھہریں جو کسی مشکوک فون کال میں مصروف تھا۔ اس کی
آواز میں اضطراب کی لرزش تھی، اور وہ بے ساختہ بول اٹھا، ”وہ آرہی ہے۔“

دوسری طرف سے آنے والے سوال نے اُسے کچھ لمحوں کے لیے ساکت کر دیا۔ مونیٹر کے چہرے پر
گھبراہٹ پھیل گئی جب وہ بمشکل کہہ سکا

، ”تم اس کی تصویر کا کیا کرو گے؟ تمہیں آخر تصویر کی ضرورت کیوں ہے؟“

مونیٹر کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے ایمان نے ایک نگاہ ڈالی اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

ایمان کو قریب آتے دیکھ اس نے جلدی سے کہا ”اوکے ٹھیک ہے۔“

یکدم اس نے کال کاٹ دی اور موبائل اپنے زنانہ ہینڈ بیگ میں رکھ دیا

جیسے ہی وہ گاڑی میں بیٹھی، اس کی نظریں موئیز کے حلیے پر رک گئیں۔ وہ آج عورت کے روپ میں تھا، جبکہ ایمان بخوبی جانتی تھی کہ وہ راتوں میں عورت کا روپ دھارتا ہے، لیکن دن کے اوقات میں وہ ہمیشہ مردانہ پوشاک میں ہوتا ہے۔

۔ ”یہ رات کا وقت نہیں ہے۔“

موئیز نے ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا

۔ ”آئی نو۔۔۔ آج انٹرویو ہے، اور تم جاننا چاہتی تھیں کہ میں کس طرح انٹرسیکس اور ٹرانس جینڈر کے معاملات میں دھوکہ دہی کرتا ہوں، تو آج تم دیکھو گی۔“

ایمان جو یہ بات سن اندر سے جل اٹھی تھی یکدم

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی طنزیہ چمک آئی اور وہ موئیز کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولی،

۔ ”چھوٹے بالوں والی آپا دوپٹہ پہن لیں مردوں کی بری نظر لگ جائے گی آپ کو اگر آپ کے بال گر گئے تو

آپ

اترائیں گی کیسے۔“

پھر ہنستے ہوئے اس نے مزید کہا، ”سچ کہوں تو تمہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی نے مصر کی ممی کو بجلی کے جھٹکے دے کر جگا دیا ہو۔ یقین مانو، تم پر منحوسیت کا سایہ ہے، مونیز۔“

ایمان کی باتوں سے مونیز کے دل میں آگ بھڑک اٹھی تھی، مگر وہ اُس کی عادت تھی اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا۔ اسے اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے صبر اور موقع کا انتظار کرنا آتا تھا۔ اس نے ایمان کی طنزیہ باتوں کو ہلکے میں لیتے ہوئے ایک شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

”چلو، تصویر بنا لیتے ہیں، دیکھتے ہیں کون زیادہ خوبصورت ہے اور کون کم۔“

ایمان نے ذرا سا قہقہہ لگایا اور جواب دیا،

۔ ”الحمد للہ، ہم تو پیدائشی بد صورت ہیں۔ اگر میری بد صورتی کو کوئی دیکھے تو کرنانی چڑیل کا گمان کرے۔ تصویر کھنچوانے کا شکریہ، میں معذرت کرتی ہوں۔“

مونیز جانتا تھا کہ ایمان کبھی بھی اپنی تصویر بنانے کی قائل نہیں ہوتی، لیکن وہ آج اپنے عزائم میں مصمم تھا۔ اس کی آواز میں نرمی کا تاثر تھا لیکن اس کے ارادے کسی اور جانب بڑھ رہے تھے۔ ”اچھا، چلو ویسے ہی بنا لیتے ہیں، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“

ایمان نے اپنی بھنویں اٹھاتے ہوئے کہا، ”اچھا نکالو موبائل، لیکن یاد رکھو، میری تصویر اگر انسٹاگرام پر دیکھی تو تمہیں ایسا تھپڑ ماروں گی کہ تمہیں ہوش بھی نہ آئے گا۔“

مونیز کی مسکراہٹ میں ایک پوشیدہ شیطانیت جھلکنے لگی، دل ہی دل میں وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ”اس تصویر کا مقصد کچھ اور ہے،“ وہ اپنے ذہن میں اس خیال کو گہرائی میں چھپائے ہوئے بولا۔

اور پھر مسکراتے اس سے گویا ہوا

۔ ”افف نہیں لگاتی میں حد ہے۔“

پوز دینے کے لیے دونوں نے اپنی جگہ سنبھالی، اور کیمرے کا شٹر کلک ہوا۔ اس لمحے کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا گیا، مگر اس سادہ تصویر کے پیچھے کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ مونیز نے چپکے سے تصویر کا جائزہ لیا، اور اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھری۔ تجسس اور رازوں سے بھری آنکھیں، جیسے اُس کے اندر کچھ بڑا منصوبہ پک رہا ہو۔

اس نے خاموشی سے تصویر کو ایک خاص وصول کنندہ کے پاس بھیج دیا، کسی ایسے شخص کے پاس جو اُس کی زندگی میں ایک پراسرار کردار رکھتا تھا۔ اس عمل نے اُن کی دنیا میں جیسے کوئی نیا بھید کھول دیا ہو، ایک خاموش طوفان کی آمد کی مانند، جس کا اثر آنے والے وقت میں ہی ظاہر ہو گا۔

...°...

کمرے میں نیم مدھم روشنی بکھری ہوئی تھی، لیکن ہر گوشے میں سرخی مائل کھرہ چھایا ہوا تھا جو منظر کو پُراسراریت کی گہرائیوں میں لے جا رہا تھا۔ دیواروں پر لٹکی عجیب و غریب اور خوفناک پینٹنگز ماحول کو بے چینی میں مبتلا کر رہی تھیں، جبکہ فحش مواد کے غیر شائستہ پوسٹرز کمرے کو ایک ایسی فضا عطا کر رہے تھے جو سنجیدہ گفتگو یا شائستگی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

کمرے کی وسعت اپنی جگہ، لیکن اس کی تاریکی اور پُرکشش وحشت نے دلوں میں ایک سرد لہر دوڑادی تھی۔

درمیان میں ایک غیر معمولی شخصیت موجود تھی، قد بلند، پراسرار اور حاوی۔ اس کی آنکھیں ایک مقام پر ٹھہری ہوئی تھیں، لیکن چہرہ دھند میں ڈوبا ہوا تھا، صرف ایک سیاہ ہالہ اس کی موجودگی کو شکل دے رہا تھا۔

وہ شخص آلیشان کرسی پر براجمان تھا، ہاتھ میں سرخ شراب کا گلاس تھا، جس کا رنگ اس کی پہلی مومی جلد سے نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پشت پر ون آئی یعنی سب دیکھنے والی آنکھ کا ٹیٹو نمایاں تھا، جیسے کہ وہ کسی گہرے اور قدیم راز کا لقیب ہو۔

اس کے جسم کی طاقت اس کی ہڈیوں کے نیچے سے جھلک رہی تھی، جیسے وہ کوئی ماورائی قوت ہو۔ اس کا ہاتھ، جس میں ایک عجیب سی کشش تھی، چمکتے ہوئے ناخنوں سے سجا ہوا تھا، اور اس پر چاندی کی کڑیوں اور شیروں کے نقش والی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔

وہ شخص جیٹ بلیک ڈریس شرٹ و پیٹ اور سیاہ چمکتے جوتوں میں ملبوس تھا، اس کی پوری شخصیت تاریکی کی تمثیل تھی۔ کمرے میں اس کی موجودگی نے ماحول میں بے چینی اور تجسس کی لہر دوڑادی تھی۔

اس کے سامنے لگی بڑی ایل ای ڈی اسکرین پر ایک تصویر نمودار ہوئی، ایک چہرہ جو آدھا روشنی میں اور آدھا سایوں میں لپٹا ہوا تھا۔

یہ ایمان کا چہرہ تھا، وہ ہی لڑکی جس کی تصویر مونیٹر نے لی تھی اور جس کے بارے میں گفتگو ہونے والی تھی۔ ایمان کا چہرہ اسکرین پر آتے ہی، پراسرار شخصیت کے لبوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ ابھری۔

اس کی آنکھوں میں ایک لمحاتی چمک آئی، جیسے وہ کسی بڑے راز کے ادراک میں ہو۔ وہ ہلکے سے آگے جھکا، اس کی گہری اور کھنکتی آواز فضا میں گونجی

۔، ”ایمان۔۔۔“ اس کے لہجے میں عزم کی مضبوطی اور اسرار کی گونج تھی۔ سویڈش تلفظ میں لپٹا ہوا یہ نام جیسے کسی قدیم راز کی چابی تھا۔

پھر، ایک خاموشی کے پل میں، وہ دوبارہ گویا ہوا، ”یہ لڑکی۔۔۔ معصوم ہے، اور شاید اس سفر کے لیے موزوں نہیں۔“

اس کی آواز کی گہرائی اور مردانہ وقار نے پورے کمرے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر موجود ہلکی سی ڈمپل، اور اس کے لبوں کی سرخی نے اس کی کشش کو اور بھی گہرا کر دیا تھا، جیسے وہ کوئی پراسرار راز اپنے اندر چھپائے ہوئے ہو۔ اس کی ہر بات میں ایک ایسی پراسراریت اور قوت تھی جو دلوں پر چھا جاتی۔

جب وہ دوبارہ مسکرایا، تو اس کے سفید دانت تاریکی میں چمکتے موتیوں کی طرح جگمگا اٹھے، اور اس کی شخصیت کی پراسراریت کو اور گہرا کر گئے۔

کمرے میں موجود ہر چیز اس کی مسکراہٹ اور الفاظ کی گونج میں ڈوب گئی، جیسے وہ کسی بڑے کھیل کا آغاز کر رہا ہو۔

دفعۃً کمرے کا دروازہ ایک آہستہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا، فضا میں پراسرار خاموشی مزید گہری ہو گئی۔ ایک چمکتی ہوئی ایل ای ڈی لائٹ جو پہلے ہلکی سی روشنی پھیلا رہی تھی، پراسرار شخصیت نے فوراً بجھا دی۔

کمرے میں چھائے سائے مزید گہرے ہو گئے، جیسے کوئی ان دیکھے خوف کا احساس بھڑک رہا ہو۔

دروازے کی دہلیز پر، ایک حیرت انگیز سویڈش لڑکی نمودار ہوئی، جس کی موجودگی میں ایک خاموش لیکن طاقتور جاذبیت تھی۔

اس کے کندھے پر پڑے بھورے بال گویا شام کے آسمان پر بادلوں کی طرح بہہ رہے تھے۔ وہ نازک قدموں سے بیڈ کی طرف بڑھی اور کنارے پر بیٹھتے ہی ہونٹوں پر ایک دھیماسا مسکراہٹ نمودار ہوئی، جس میں رازوں کی دبیز تہہ چھپی ہوئی تھی۔

اس کے چہرے کی معصومیت میں پوشیدہ ایک انجان سی چمک تھی، جو اس لمحے کو مزید اسرار میں ڈھال رہی تھی۔

کمرے کی گھمبیر خاموشی میں وہ پراسرار آدمی دھیرے سے اپنی نشست سے اٹھا، جیسے رات کے سناٹے میں کوئی بے آواز قدم رکھ رہا ہو۔

اس کی قد آور اور چوڑی قامت، جس پر سیاہ قمیض تنی ہوئی تھی، سایوں میں ایک ہیبت ناک حسن بکھیر رہی تھی۔ اس کی حرکات میں ایک عجیب سی طمانیت تھی، جیسے وہ ہر لمحے کا مالک ہو۔ اُس نے دانستہ طور پر اپنی قمیض کے بٹن کھولنا شروع کیے، اور جیسے ہی کالر ڈھیلا ہوا، اُس کے کسرتی جسم کے خدو خال اندھیرے میں نمایاں ہونے لگے۔

اُس کی چوڑی پشت پر بناسیہ سانپ کا ٹیٹو دھیرے دھیرے روشنی کے ساتھ ابھرا، گویا تاریکی کی گہرائیوں سے کوئی عفریت اپنا سراٹھا رہا ہو۔

ٹیٹو کا ہر خم اور ہر لائن اُس کے پٹھوں کی پیچیدگیوں میں چھپے رازوں کو بیان کر رہا تھا، جیسے اُس کی ذات کی ایک داستان ہو، جو دنیا کی نظروں سے اوجھل تھی۔ اُس کے جسم پر پھیلے مختلف ٹیٹوز ایک عجیب سی پراسرار زبان میں بات کر رہے تھے، جیسے ہر نقش کے پیچھے کوئی پرانی کہانی چھپی ہو۔

اُس نے آہستگی سے لڑکی کی جانب قدم بڑھایا، اور جیسے ہی اُس کے وجود کا سایہ بستر پر لیٹی لڑکی پر پڑا، کمرہ مکمل تاریکی میں ڈوب گیا۔ فضا میں صرف اُن کی سانسوں کی سرگوشیاں باقی تھیں، اور ایک نامعلوم توقعات کا بوجھ کمرے کی خاموشی میں معلق ہو گیا تھا، گویا کوئی انہونی ہونے کو ہو۔

...°...

ایچ-8 کی مصروف شاہراہ پر جب ٹریفک کی روانی تھمی، تو ان کی گاڑی بھی رک گئی۔ ایمان فرنٹ سیٹ پر الٹی پالٹی مارے بیٹھی تھی، اس کی توجہ سڑک کی ہلچل اور ہاتھ میں تھامے اسکرپٹ کے درمیان منقسم تھی۔

تجسس نے بالآخر اسے مغلوب کر لیا، اور اُس نے بے ساختہ سوال کر ڈالا، ”یہ اسکرپٹ کیا ہے؟“۔

مونیز جو ٹریفک سگنل کے سبز ہونے کا بے صبری سے منتظر تھا، ہلکی سی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب مڑا۔

۔ ”آہ، یہ اسکرپٹ؟“ اس نے گویا گہری چالاکی سے جواب دیا،

۔ ”یہ ایک بہت ہی نازک ایجنڈا ہے جو اس میں بُنا گیا ہے۔“

اس کی مسکراہٹ میں ایک مبہم اور خطرناک رنگ تھا۔

۔ ”یہ ایل جی بی ٹی کیو کے ایجنڈے کو پھیلانے کے لیے لکھا گیا ہے۔ امریکہ نے اس ڈرامے کی پروڈکشن کے لیے ایک چینل کو فنڈ دیا ہے، اور مجھے اس مقصد کے لیے اسکرپٹ لکھنے کو کہا گیا۔“

مونیز نے ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی آنکھوں میں ایک چمک لیے کہا، ”تم جانتی ہو اس ڈرامے کا نام کیا ہے؟“

ایمان نے سر کے اشارے سے سوال کیا، ”کیا؟“

مونیز کے لبوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی، ”کہانیوں کی راہوں میں... یا شاید گزر راہ، ابھی نام فائنل نہیں ہوا۔“

۔ پھر اس نے تھکن سے بھرے لہجے میں کہا، ”دیکھو، ایک ایجنڈا پھیلانے کے لیے مجھے سات اقساط لکھنی پڑی ہیں، ہر قسط میں مختلف لوگوں کی الگ الگ کہانیاں ہیں۔ کتنی محنت کرنی پڑتی ہے ہمیں صرف اس مقصد کے لیے۔“

ایمان نے غصے بھری نظروں سے مونیز کی طرف دیکھا، لیکن اس کا رد عمل بے حسی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایمان دل ہی دل میں سوچنے لگی،

۔ ”ہاں، تم لوگ اللہ کی تخلیق کو چیلنج کرتے ہوئے، شیطان کو خوش کرنے کے لیے یہ ایجنڈا پھیلا رہے ہو، جیسے کہ بزرگ نے خبردار کیا تھا۔“

مونیز کی نظریں سڑک پر مرکوز رہیں، اس کے چہرے پر کوئی اضطراب نہیں تھا، جیسے ایمان کے اندر اٹھتے احتجاج کا کوئی اثر ہی نہ ہو۔

تاہم، جب ایمان نے اپنی نگاہیں سامنے موڑیں تو اُس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے، اُس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ باہر جلتے سورج کی تپش میں ٹریفک کی بھیڑ کے درمیان ایک موٹر سائیکل سوار دکھائی دیا، جس نے پاکستانی روایتی لمبی قمیض پہن رکھی تھی۔

اس کی قمیض کی پشت سیٹ پر نیچے لٹکی ہوئی تھی، شاید اس لیے کہ وہ شدید گرمی میں سیٹ کو ٹھنڈا رکھنا چاہتا تھا، کیوں کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول سے لینے جا رہا تھا۔

ایمان کے چہرے پر ہلکی سی مسکان ابھری۔ ”کچھ لوگ واقعی خوش قسمت ہوتے ہیں، ہے نا؟“

وہ لمحہ، موٹر سائیکل سوار کی جانب سے ظاہر ہونے والی سادگی اور خلوص، اُسے اپنے والد کی سختی کی تلخ یاد دلا گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ کس طرح اس کے والد کے رویے نے اس کی زندگی میں اداسی کا گہرا سایہ ڈال رکھا تھا۔

مونیز کی توجہ ابھی بھی ٹریفک کی جکڑ میں پھنسے راستے پر تھی، لیکن جب ایمان کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے تو وہ جیسے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔ ”ہمم، کیا کہا؟“ اس نے بے دھیانی سے پوچھا۔

ایمان، جس کے جذبات اس لمحے کی نرمی میں ڈوبے ہوئے تھے، مونیز کے سوال سے بے خبر رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے اور اس کی نگاہیں دور کہیں خلا میں مرکوز ہو گئیں۔ ”کمال ہے نا کہ کچھ والدین اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، اور بچے اکثر اسے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔“

وہ آہستگی سے بولی، ”بچے ہمیشہ شکایت کرتے ہیں کہ والدین نے ان کے لیے کیا ہی کیا ہے؟ متوسط طبقے کے والدین شاید لگژری گاڑیاں یا قیمتی چیزیں نہ دے سکیں، لیکن وہ اپنی جان، اپنی ہر خوشی اپنے بچوں کے لیے قربان کر دیتے ہیں۔“

مونیز نے بے زاری سے نفی میں ہاتھ ہلایا، اس کی آنکھوں میں ایک سرد طنز تھا۔

”اس دنیا میں، کون کس کا ہے؟ ہر کوئی اپنی خواہشات، اپنی ضرورتوں اور اپنی خود غرضیوں میں گم ہے۔“

اس نے بے لچک لہجے میں کہا،

- ”پیسہ کماؤ، یہ ہی حقیقت ہے۔ دولت کے ساتھ تمہیں سب کچھ مل سکتا ہے، جو تم چاہتی ہو۔ اس فضولیات میں اپنا وقت ضائع مت کرو۔“

ایمان نے تھوڑی دیر خاموشی اختیار کی، پھر دھیرے سے کہا، ”نہیں، موئیز، تم میری بات سمجھ نہیں رہے۔“

موئیز نے بھنویں سکڑتے ہوئے استفہامیہ انداز میں پوچھا، ”یعنی؟“

ایمان نے مایوسی کے عالم میں نفی میں سر ہلایا۔ ”کچھ نہیں۔“

موئیز نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے دوبارہ سڑک کی طرف نگاہ مرکوز کر لی، جیسے مزید سوالوں کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

ایمان نے ایک گہری سانس لی اور دل ہی دل میں خود سے مخاطب ہوئی،

- ”میرے پاس سب کچھ ہے، دولت، آرام، ہر وہ چیز جو دنیاوی آسائش کہلاتی ہے... مگر دل کا سکون

نہیں۔ اور جب میرے جیسے بچوں کو یہ سکون گھر کے اندر نہیں ملتا تو ہم اسے باہر کی دنیا میں ڈھونڈتے

ہیں۔ لیکن باہر کا سکون، جو ہمیں عارضی طور پر ملتا ہے، ہمیں اندر سے توڑ کر بکھیر دیتا ہے۔“

اس لمحے ایمان کے خیالات نے اسے ایک گہرے سبق تک پہنچا دیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی، ”اصل سکون پیسوں یا ظاہری آسائشوں میں نہیں، بلکہ تعلقات کی سچائی اور محبت میں ہے۔ وہ سکون جو اندر سے آتا ہے، صرف اسی سے زندگی کی بربادی بچ سکتی ہے۔ گھر وہ جگہ ہونی چاہیے جہاں ہم حقیقی امن پائیں، ورنہ دنیا ہمیں صرف گمراہی کی راہوں پر ڈال دیتی ہے۔“

...°...

انہوں نے خود کو ایک وسیع اسٹوڈیو میں پایا جہاں دیواریں سرخ اینٹوں کے ظاہری طرز پر آویزاں وال پیپر سے مزین تھیں، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے عمارت کے باطن کی پر تیں کھول دی گئی ہوں۔ فضا میں ایک عجیب سا نورانی سکون تھا، زرد مدھم روشنیوں کی ہلکی پھلکی چمک نے ماحول کو پراسرار اور دلکش بنا رکھا تھا۔ اسٹوڈیو کے عین وسط میں بڑے حروف میں

”BGLT Talks“

نمایاں طور پر جگمگا رہا تھا۔ ایک جانب ایک الماری میں قدیم مصری دیوتاؤں کے سنگی مجسمے کھڑے تھے، جیسے خاموش نگران ہوں، اور ان کے عقب میں سورج نما چراغ اپنی نرم روشنی بکھیر رہا تھا۔

مرکز میں ایک مضبوط لکڑی کی میز رکھی تھی، جس کے دونوں جانب کرسیوں کو آمنے سامنے ترتیب دیا گیا تھا۔ موئز بائیں طرف متمکن ہوا جبکہ میزبان نے دائیں جانب نشست سنبھالی۔

شیشے کی دیوار کے اُس پار، جہاں کیمرے اور براڈکاسٹ کی سرگرمیوں کی حکمتِ عملی مرتب ہو رہی تھی، ایمان خاموشی سے منظر پر گہری نظر رکھے ہوئے تھی۔ اسٹوڈیو سے باہر ایک حسین پس منظر تھا، جس میں دور درختوں کے سرسبز پتے رنگوں کی ایک خوبصورت قوس قزح کا منظر پیش کر رہے تھے۔

اسٹوڈیو کے بائیں طرف بیٹھے مونیٹرز نے ایک جرات مندانہ نسوانی روپ اپنا لیا تھا، اس کے سامنے مائیکروفون نمایاں طور پر ترتیب دیا ہوا تھا۔ ایمان نے اس منظر کو انتہائی سنجیدگی سے دیکھا۔ مونیٹرز کے سامنے جہاں میزبان بیٹھی تھی، پس منظر میں ایک قد آور مجسمہ ایستادہ تھا۔

مونیٹرز کی پشت پر ایک ایکویریم تھا، جس میں متحرک مچھلیاں بے فکری سے تیر رہی تھیں، ماحول کو ایک عجیب سی زندگی بخش رہی تھیں۔

کیمرہ روم سے ایک گونج دار آواز ابھری، جو مونیٹرز کے کانوں میں چھپے بلوٹو تھ ایربڈ کے ذریعے پہنچی،
- ”آئیے شوکا آغاز کرتے ہیں، اپنی پوزیشن سنبھال لیں، ”ہدایت آئی۔

- اس بات پر مونیٹرز نے اپنے نسوانی انداز میں ایک طنزیہ جواب دیا۔

- ”تو ہمیں کس پوزیشن میں ہونا چاہیے؟ کیا ہمیں اپنی ٹانگیں ہوا میں اٹھا کر سر جھکانا ہے؟ آخر کون سی پوزیشن موزوں ہوگی؟“۔

میزبان، اپنے تھل اور بردباری کو برقرار رکھتے ہوئے، نرمی سے مداخلت کی، ”نہیں، نہیں، آپ غلط مطلب لے رہے ہیں۔ ڈائریکٹر کا مقصد یہ تھا کہ آپ اسکرپٹ کو پڑھ کر مواد سے واقفیت حاصل کریں۔“

مونیٹرز نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور بے دلی سے جواب دیا، ”مجھے واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے مجھے سب علم ہے،، پوڈکاسٹ کا آغاز کرو۔“

یہ کوئی روایتی ٹی وی نشریات نہیں تھیں بلکہ یوٹیوب کا معروف چینل تھا، جس نے اپنے متنازعہ مواد اور مباحثوں کے سبب ڈھائی ملین سے زیادہ پیروکار جمع کر رکھے تھے۔ یہاں اکثر دو پاکستانی شخصیات کے انٹرویوز نشر کیے جاتے، بالخصوص وہ افراد جو خواتین مارچ کی تحریک یا پاکستان میں۔ ”ایل جی بی ٹی کیو“ جیسے فتنوں کے حامی تھے۔ آج کا مہمان مونیٹرز تھا جس کی موجودگی نے پہلے ہی شور برپا کر دیا تھا۔

پروگرام کے آغاز کے ساتھ ہی میزبان اور مونیٹرز نے ایک غیر معذرت خواہانہ اور متنازعہ انداز اپنایا۔ میزبان نے ایک پیشہ ورانہ انداز میں شو کا آغاز کیا، ”السلام علیکم۔ میں ہوں آپ کی میزبان نائلہ اقبال، اور آپ دیکھ رہے ہیں جی ایل ٹی ٹاکس۔ آج ہم ایک ایسا موضوع چھیڑ رہے ہیں جو اکثر زیر بحث رہتا ہے۔ صنفی تشدد۔“

نظریں کیمرے پر مرکوز رکھتے ہوئے، نانکہ نے بات جاری رکھی، ”جب ہم صنفی تشدد کی بات کرتے ہیں تو زیادہ تر ہماری توجہ خواتین پر ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ یہ تشدد محض خواتین تک محدود نہیں، بلکہ ہمارے معاشرے کی ایک اور کم سمجھی جانے والی شناخت بھی اس کا شکار ہے۔“

نانکہ نے مزید کہا، ”یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنی شناخت اور انفرادیت کے لیے مسلسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے، مگر معاشرہ انہیں ان کی پہچان سے محروم کرنے پر تلا ہوتا ہے۔ ان کی شناخت دبانے کے لیے ان پر ظلم کیا جاتا ہے۔“

اس نے اپنی بات میں مزید گہرائی لاتے ہوئے کہا، ”یہ کمیونٹی خواجہ سرا یا ٹرانس جینڈرز کی ہے۔ پاکستان ان بارہ ممالک میں شامل ہے جہاں اس منفرد شناخت کو باضابطہ تسلیم کیا گیا ہے، لیکن حقیقت میں یہ تسلیم صرف شناختی کارڈ تک محدود رہ جاتی ہے۔“

نانکہ نے چند کارڈز کو اٹھا کر پڑھتے ہوئے توقف کیا اور سنجیدگی سے کہا، ”پنجاب میں گزشتہ سات سالوں کے دوران بائیس خواجہ سراؤں کو بے دردی سے قتل کیا گیا ہے، اور یہ مظالم محض ایک چھوٹی سی جھلک ہیں ان مشکلات کی جو انہیں درپیش ہیں۔“

میزبان نے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے بات مکمل کی، ”جب ہم ان اعداد و شمار پر غور کرتے ہیں، تو ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہم ان افراد کو تحفظ کیسے فراہم کر سکتے ہیں؟ اور ان کی انصاف تک رسائی کیسے یقینی بنا سکتے ہیں؟“۔

ریکارڈنگ کے بعد نائلہ بولی۔۔

۔ ”میرے، ان مذاکرات‘ سے ہمیں اداکاری کے کتنے شاندار سبق ملتے ہیں، کیا خیال ہے؟“۔

مونیز، جو پورے پروگرام کے دوران خاموشی سے بیٹھا تھا نے ریکارڈنگ کے بعد ہنستے ہوئے جواب دیا، ”ویسے تم تو مجھ سے بھی بڑی ڈراما کوئین ہو!“۔

ایمان خاموشی سے اس تمام ماجرے کو گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، گویا اس دنیا کے رموز و اسرار اس کے سامنے آشکار ہو رہے ہوں۔ انسانوں کی فطرت سے تو وہ پہلے ہی واقف تھی، لیکن جس مکاری اور ہوشیاری سے یہ لوگ دوسروں کے ساتھ کھیل رہے تھے، وہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ اس کے لیے تو پہلے ہی لوگوں پر بھروسہ کرنا ایسا ہی تھا جیسے سانپ پر اعتماد کرنا۔

کیمرہ روم سے جیسے ہی آواز گونجی، یہ پیغام بڑی چابکدستی سے بلوٹو تھ ڈیوائسز کے ذریعے مونیز اور میزبان کے کانوں تک پہنچ گیا: ”مونیز، تم ٹرانس جینڈر‘ اور‘خواجہ سرا‘ کے الفاظ کو بڑی چالاکی سے ادل بدل کر رہے ہو تاکہ سامعین میں کنفیوژن پیدا ہو اور وہ سمجھنے لگیں کہ دونوں ایک ہی ہیں۔ بیرونی فنڈنگ کے الزامات کی تمہیں تردید کرنا ہو گا۔“۔

ایمان نے یہ سب کچھ گہری بصیرت سے دیکھا، خاص کر موئیز کی اصل حقیقت کو جان کر اس کی حیرت میں اضافہ ہوا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ یہ لوگ کس قدر عیاری سے حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں۔ جیسے ہی اس کی نظریں کیمرہ روم کی جانب گئیں، جہاں شوکا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا، اس کا تجسس اور بڑھ گیا۔

میزبان نے موئیز کی طرف رخ کرتے ہوئے ایک شریر مسکراہٹ کے ساتھ شوکا آغاز کیا۔

۔ ”آج ہماری معزز مہمان موئیز ہمیں اس نہایت حساس موضوع پر اپنی بصیرت سے نوازنے کے لیے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ وہ خود ساختہ ’ٹرانس جینڈر‘ کارکن ہیں، اور ان کا سلوگن ہے، ’جنس کا محبت سے کیا تعلق؟‘۔“

میزبان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ”ہمیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ہمارے ساتھ مس موئیز موجود ہیں، جو نہ صرف ایک پر جوش نسوانی حامی ہیں بلکہ ٹرانس جینڈر کمیونٹی کے حق میں بھی آواز بلند کرتی ہیں۔“

کیمرہ آہستگی سے موئیز کی طرف گھوم گیا، جو کہ اس ٹانگوں کے ساتھ نہایت اطمینان سے بیٹھا تھا، اس کے لبوں پر ایک مبہم مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، اور اس نے ایک ہلکا سا سر ہلا کر اس تعارف کو تسلیم کیا۔

اب کیمرہ مونیٹر اور میزبان دونوں پر مرکوز تھا، اور میزبان نے مہارت سے اپنی گفتگو کو آگے بڑھایا، ”ہم آپ کی آمد پر شکر گزار ہیں اور خوش آمدید کہتے ہیں۔“

مونیٹر، جو ہمیشہ ایک ماہر اداکار کی طرح اپنے جذبات کو سنبھالنے کا ماہر تھا، مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”شکریہ!“ اس کی نظریں پورے انہماک سے میزبان پر جمی تھیں، گویا وہ اس کا ہر لفظ جذب کر رہا ہو۔

میزبان نے بات آگے بڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا، ”عام طور پر جب ہم صنفی بنیاد پر تشدد کی بات کرتے ہیں، تو توجہ خواتین پر مرکوز ہوتی ہے، لیکن ایک ایسا پہلو ہے جو اکثر نظر انداز ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہے خواجہ سرا یا ٹرانس جینڈر کمیونٹی، جو اس تشدد کا خاص طور پر شکار بنتی ہے۔“

مونیٹر نے بڑے غور و فکر سے سر ہلایا، بالکل ویسے جیسے کوئی طالب علم استاد کے لیکچر کو توجہ سے سنتا ہو، چاہے وہ مکمل طور پر سمجھ نہ پایا ہو۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”بالکل ایسا ہی ہے۔“

یہ سب کچھ ایک منصوبہ بندی کے تحت چلایا جا رہا تھا، جیسے کوئی ماہر فنکار اپنی پرفارمنس کو بے عیب طریقے سے آگے بڑھا رہا ہو، ہر حرکت اور ہر لفظ استاد کی نگاہوں تلے پرکھا جا رہا تھا۔

میزبان نے دباؤ بڑھاتے ہوئے سوال کیا، ”کیا آپ پاکستان میں خواجہ سرا یعنی ٹرانس جینڈر کمیونٹی کو درپیش مشکلات پر کچھ روشنی ڈال سکتی ہیں؟“۔

- ”ٹرانس جینڈر“ اور ”انٹر سیکس“ کی اصطلاحات کی تکرار ایک دانستہ حکمت عملی کا حصہ معلوم ہو رہی تھی، جو ناظرین کے اذہان میں ابہام پیدا کر رہی تھی۔

اب موئیز کی باری تھی، اور اس نے اپنے الفاظ کو بڑی مہارت سے ترتیب دینا شروع کیا، اس کی چالاکی اور مصنوعی مظلومیت نمایاں تھی۔

اُس نے ایک نرم اور پُر سوچ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا،۔

- ”ذرا ان مسائل کا تصور کیجیے جن کا سامنا مجھے بطور فرد کرنا پڑا۔ میری آزمائش اس وقت شروع ہوئی جب میں جوانی کی سرحد پر پہنچ رہی تھی۔ بچپن میں، لوگ آپ کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن جیسے جیسے آپ عمر میں آگے بڑھتے ہیں، معاشرہ زور دیتا ہے کہ آپ کی شناخت صرف ایک لڑکے کی حیثیت سے ہو، چاہے آپ کی داخلی حقیقت کچھ اور ہو۔“

موئیز نے ایک دکھاوے کی سنجیدگی کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی،

- ”مجھے ایسے طریقے سے برتاؤ کرنا پڑا، جسے مردانگی کے روایتی پیمانے سے ناپا جاسکے۔“ اس نے مبالغہ آمیز گہری مردانہ آواز کی نقل کی اور ایک مزاحیہ انداز میں ناک صاف کرنے کا ڈرامہ کیا، جس پر میزبان بے ساختہ ہنس پڑی۔

موئیز نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے زوردار لہجے میں کہا،

- ”یہ سب ایک ڈھونگ ہے، مردانہ طاقت کا وہ جھوٹا مظاہرہ جس کے ذریعے عورتوں کو زیر کیا جاتا ہے۔“

- اس نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بات مکمل کی، ”آپ دیکھ رہے ہیں، یہ وہ ہی فرسودہ مردانگی ہے جو صدیوں سے ہمیں جکڑے ہوئے ہے، چودہ سو سال سے، اور آج بھی ہمارے سماج کا حصہ بنی ہوئی ہے۔“

یہ سب سن کر یوں معلوم ہو رہا تھا کہ مونیز کی گفتگو کا ہر لفظ ناظرین کو ایک خاص ذہنی جال میں پھانسنے کی کوشش تھی، جہاں وہ اپنی مظلومیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہوئے ہمدردی حاصل کر رہا تھا، مگر درحقیقت اس کی گفتگو میں مکاری اور حسابی منصوبہ بندی واضح تھی۔

اب کی بات مونیز اپنی مکارانہ چالوں سے خالق کائنات پر مسلسل تہمتیں دھرنے میں مصروف رہا، وہ لوگوں کے قلوب و اذہان میں الہی کمالات کے متعلق وسوسے پیدا کرنے کا متمنی تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کبھی خطا نہیں کرتا۔

خالق ہر فرد کو کامل و بے عیب تخلیق کرتا ہے۔ مونیز نے اپنی چالاکیوں کا سہارا لیتے ہوئے شاطرانہ انداز میں یہ دعویٰ پیش کیا،

۔“اب، فرض کریں کہ کوئی حقیقی بد بخت ہستی موجود ہے۔ جیسے کہ خواجہ سرا یا ٹرانس جینڈر فرد۔ وہ کیا کرے؟ آخر کار، غلطیاں ہم انسانوں سے ہوتی ہیں، اور اگر اللہ، (خدا نخواستہ)، کسی لڑکی کی روح مرد کے قالب میں ڈال دے تو کیا اُسے درست کرنا ضروری نہیں؟ جیسے لوگ ٹیڑھے دانتوں کو درست کرنے کے لیے منحنی خطوط و حدانی استعمال کرتے ہیں یا ناک کی ہنیت کو پلاسٹک سرجری سے درست کرتے ہیں، کیا یہ سب نارمل نہیں؟”۔

شیشے کے اُس پار، کیمرے کے عقب میں بیٹھے ایمان کی سرگوشیاں چل رہی تھیں،

۔“اللہ تعالیٰ ہر کسی کو کامل پیدا کرتا ہے۔ خطا خالق سے نہیں، بلکہ مخلوق سے ہوتی ہے۔ اور اگر بندہ خلوص دل سے توبہ کرے تو اللہ اس کی لغزشیں معاف فرما دیتا ہے۔”۔

جیسا کہ اللہ رب العزت قرآن کریم کی سورۃ السجدہ، آیت 7 میں فرماتا ہے:۔۔۔ جس نے ہر چیز کو بہت اچھی طرح بنایا (یعنی) اس کو پیدا کیا۔ اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا ﴿۷﴾۔

جو لوگ ذاتِ باری تعالیٰ کی تخلیق پر اعتراض کرتے ہیں، وہ ذرا آسمانوں کی رفعت اور زمین کی گہرائیوں کو دیکھیں، ہر گوشہ قدرت کی صنایع سے مزین ہے۔ تمہیں اس کی تخلیق میں کوئی عیب نہ ملے گا، کیوں کہ وہ کامل حکمت والا، ہر شے کا علم رکھنے والا ہے۔ اس نے مرد و زن کو ان کی فطرت کے مطابق پیدا کیا، ہر ایک میں روح اسی تناسب سے پھونکی۔ مرد کی روح مرد میں اور عورت کی روح عورت میں۔ جو اس الہی

ترتیب کو بدلنا چاہتے ہیں، وہ شیطان کے دھوکے میں ہیں۔ شیطان نے عہد کیا تھا کہ وہ انسانوں کو بھٹکائے گا، مگر اللہ کے سچے بندے کبھی اس راہ پر نہیں جائیں گے۔ جو شیطان کی پیروی کرتے ہیں، ان کا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے۔ جو اللہ کی تخلیق پر سوال اٹھاتے ہیں، وہ حقیقت میں اپنی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ وقت ہے کہ اپنی اصلاح کریں، ورنہ ان کا انجام آگ کے شعلوں میں ہوگا

جیسے قرآن کی ایک آیت ہے

اور میں انہیں ضرور گمراہ کروں گا اور انہیں امیدیں دلاؤں گا اور انہیں حکم دوں گا کہ وہ چوپایوں کے کان چیر دیں اور انہیں حکم دوں گا کہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بدل دیں۔ اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنائے گا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا (سورۃ النساء: 119)

مونیٹرز نے انتہائی مہارت سے اپنے جعلی غم کو دبا کر اپنی فریب پر مبنی کہانی کا سلسلہ جاری رکھا،۔ “میرے والدین نے میرے ساتھ ناروا سلوک تب شروع کیا جب میں محض بارہ برس کی تھی۔” وہ ایک لمحے کے لیے رکا، گویا بے گناہی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا، اور جیسے وہ اس سوال کا انتظار کر رہا ہو،۔

۔ “کیوں؟”۔

پھر ایک سوچے سمجھے انداز میں، اس نے جواب دیا،

- ”ذرا توقف کریں، میں آپ کو بتاتی ہوں کہ کیوں۔ یہ سب اس لیے تھا کہ میں سر پر اسکارف باندھتی اور اپنی زنانہ روح کو سکون پہنچانے کے لیے زنانہ لباس پہنتی تھی۔ یہ محض اس قیاس شدہ فطری خطا کو درست کرنے کی ایک کوشش تھی۔“

میزبان، جو بظاہر مونیٹرز کی داستان سے متاثر نظر آرہی تھی، بڑے غور سے اس کے بناوٹی قصے کو جذب کر رہی تھی، جیسے کوئی طالب علم کسی پیچیدہ ریاضی کے مسئلے کو سمجھنے کی سعی کر رہا ہو۔

ایمان، جو بے یقینی کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، کو مونیٹرز کے ساتھ اپنی سابقہ گفتگو اور خاص طور پر انکشافات یاد آنے پر دھچکا لگا۔

ایمان اور مونیٹرز مدہم روشنی والے کلب کی بالائی منزل پر موجود تھے، وہ دونوں دیوار سے لگی میز کی گرد کرسیوں پر بیٹھے تھے، اور فضا میں شیشے کا دھواں ایک دھند کا منظر پیش کر رہا تھا، جبکہ نیچے کے اسٹیج کی چمکدار روشنیاں ایک پراسرار ماحول بنا رہی تھیں۔

ایمان کی عمر پندرہ سال تھی جب اس نے مونیٹرز سے پوچھا، ”تمہارے والدین کہاں ہیں؟“

مونیٹرز نے دھوئیں کا کش لیتے ہوئے لا پرواہی سے جواب دیا،

- ”مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں، سچ کہوں تو۔“

وہ بے نیازی سے بولا، ”پیدائش کے فوراً بعد مجھے ایک یتیم خانے میں چھوڑ دیا گیا تھا، اور میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔“

اس نے کندھے اچکائے اور کہا، ”اب وہ جہاں کہیں بھی ہوں، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

ایک لمحے کے لیے وہ ٹھہرا، پھر ایک پراسرار لہجے میں بولا، ”میں امریکی ہوں، لیکن اردو سیکھنے کے بعد مجھے پاکستان بھیجا گیا تھا۔“

ایمان کے ذہن میں شکوک نے جگہ بنائی، اور اس نے مزید تجسس سے سوال کیا، ”کیوں؟“

مویز نے رازدارانہ انداز میں آگے جھک کر کہا، ”ایک مشن پر۔“ یہ پرانی یاد اس کے ذہن میں گونجتی رہی جب اس نے اپنے سامنے اس پراسرار منظر کو دیکھا۔

ایمان، اب حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے، مویز کی جھوٹ پر مبنی داستان کو سننے لگی، جیسے وہ ہر لفظ کی تہہ تک پہنچ چکی ہو۔ مویز نے میزبان کی طرف متوجہ ہو کر جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا، ”مجھے مارا پیٹا گیا، ظلم سہنا پڑا،“ اور اپنے مگرچھ کے آنسو صاف کرتے ہوئے دکھاوے کا سلسلہ جاری رکھا۔

میزبان نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی، ”ٹھیک ہے، رونا بند کریں۔“

مگر موئیز کی آنکھوں میں جعلی آنسو مزید شدت سے چمکنے لگے، اور وہ بولتا رہا، ”میں زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی، لیکن اُس لمحے میں نے عزم کر لیا۔“

وہ خود کو طاقت کی علامت بنا کر کہنے لگا، ”اب بس، اور نہیں۔ میں نے اپنی آواز بلند کی اور ٹرانس جینڈر یعنی ’مبینہ خواجہ سرا‘ کے حقوق کے لیے لڑائی شروع کر دی۔“

موئیز نے اپنے چھپے ہوئے ارادے پر ایک گہری نظر ڈالی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا، جبکہ ایمان نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جان بوجھ کر اُس کی فریب دہ کہانی کو سمجھ لیا۔

ڈائریکٹر نے مداخلت کی اور کہا، ”پریشان نہ ہوں، بس اپنے مکالمے جاری رکھیں۔“

موئیز نے پھر بولنا شروع کیا، ”میں نے ’خواجہ سرا‘ کے حقوق کے لیے وکالت شروع کی، اور اب اپنی کمیونٹی کی نمائندگی کرتی ہوں۔ لوگ اکثر غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ سب کسی پوشیدہ ایجنڈے کا حصہ ہے، جیسے کہ یہودی اور امریکی تنظیمیں مجھے فنڈز فراہم کرتی ہیں۔“ اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا، جیسے شدید اذیت میں ہو، اور دکھ بھری حالت میں سر کو دوسری طرف موڑ لیا۔

میزبان نے تبصرہ کیا، ”لوگ جلدی نتائج پر پہنچ جاتے ہیں، اور ہر چیز کو فنڈنگ سے جوڑ کر حقوق کی جنگ کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

یہ محض ایک لفظ کا موڑ تھا، ”خواجہ سرا“ کو ”انٹرسیکس“ سے بدلنے کا عمل، جس نے اردو زبان میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اس لسانی ہیرا پھیری نے بے شمار تنازعات کو جنم دیا ہے، اور ذی شعور طبقے میں ایک فکری بحث چھیڑ دی ہے۔ کچھ عناصر ”انٹرسیکس“ کی آڑ میں اپنی بدنیتی کو چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور ’خواجہ سرا‘ کی حقیقی معنویت کو گمراہ کن انداز میں بدل ڈالا ہے۔ یہ لسانی چالبازیاں انہیں اپنے مخفی مقاصد کو آگے بڑھانے کا موقع فراہم کرتی ہیں، اور یوں، اس لسانی تبدیلی نے ایک ایسی دھند پیدا کر دی ہے جس میں مختلف ایجنڈے اور سماجی گفتگو گم ہو کر رہ گئی ہے۔

مونیزا اپنی سازشی باتوں میں مزید آگے بڑھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں گویا ہوا، ”آج کل یوٹیوب پر دو کوڑی کے مولوی ملتے ہیں۔ وہ ’مولوی وِڈ سٹائل‘ ہوتے ہیں۔“

اس نے طنزیہ انداز میں لفظ ’سٹائل‘ پر زور دیا اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”یہ لوگ پینٹ کوٹ میں ملبوس ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو مولوی کہتے ہیں، لیکن میری تنقید کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔“

میزبان نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا، ”آن لائن وکٹیمائزیشن“۔

مونیزا نے بظاہر حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہا، ”بالکل! وہ اپنی لمبی داڑھیوں کے ساتھ بکریوں جیسے دکھتے ہیں، اور پھر اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر بے سروپا باتیں کرتے ہیں۔ جب دلیل میں کوئی دم نہیں رہتا، تو وہ قوم لوط کا حوالہ دینے لگتے ہیں۔“

چڑ کر اس نے مزید کہا، ”مجھے دکھائیں قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ ایک خواجہ سر کسی سے شادی نہیں کر سکتا؟ اگر ایک ٹرانس شخص شادی کر لے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ قوم لوط کو اس لیے سزا ملی تھی کہ وہ زبردستی گناہ کا ارتکاب کرتے تھے۔“

اس نے اپنی گردن آسمان کی طرف اٹھائی اور کہا، ”میرا اللہ اتنا سنگدل نہیں ہے کہ اپنی مخلوق میں سے کسی خواجہ سر یا ٹرانس جینڈر کو اپنے حقوق کے لیے لڑنے پر سزا دے۔“

ایمان نے چپکے سے مسکراتے ہوئے اپنے آپ سے سرگوشی کی، ”تم دھوکے باز ہو، منافق اور ملحد۔“

ایمان اسی سوچ میں غرق تھی کہ اچانک اس کے گلے کی گلی ایک لمحے کے لیے ابھری اور پھر غائب ہو گئی۔ وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی، کیا کوئی اور بھی اس کو محسوس کر سکتا تھا؟ ایک دیوار پر اچانک ایک پوسٹر نمودار ہوا جو اس سے پہلے وہاں موجود نہیں تھا۔ اس پوسٹر پر سورہ الاعراف کی آیات درج تھیں:-

۸۰۔ اور اسی طرح جب ہم نے لوط کو (پیغمبر بنا کر بھیجا) تو اس وقت انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایسی بے حیائی کا کام کیوں کرتے ہو کہ تم سے اہل عالم میں سے کسی نے اس طرح کا کام نہیں کیا۔

۸۱۔ یعنی خواہش نفسانی پوری کرنے کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر لونڈوں پر گرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ حد سے تجاوز کر چکے ہو۔

۸۲۔ تو ان کی قوم نے بجائے دلیل کے کہا کہ لوط اور اس کے ماننے والوں کو اپنے شہر سے نکال دو، یہ لوگ تو بڑے پاک بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

۸۳۔ تو ہم نے لوط اور ان کے اہل خانہ کو بچالیا، مگر ان کی بیوی، کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں تھی۔

۸۴۔ اور ہم نے ان پر پتھروں کا مینہ برسایا۔ تو دیکھ لو کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا۔

یہ آیات ایمان کی نظروں کے سامنے نمایاں تھیں، جیسے کسی پوشیدہ حقیقت کا پردہ فاش ہو رہا ہو۔

وہ اُس پوسٹر کو غور سے تکتی رہی، جیسے اس میں پوشیدہ معانی تلاش کر رہی ہو۔

پھر اُس کی نگاہ شیشے کے اُس پار مونیٹر پر جا ٹھہری، اور پھر اس۔ دیوار پر جہاں وہ پوسٹر تھا اب کی بار اس کے پیروں تلے واقعی زمین کھسک گئی۔ وہ دیوار، جس پر وہ پوسٹر دکھائی دیا تھا، یکایک پھر خالی نظر آنے لگی۔ اُس کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا، اور وہ خاموشی سے مونیٹر کے جاری تماشے کو دیکھتی رہی۔

مونیٹر نے چابکدستی سے اپنی معصومیت کا ڈھونگ رچایا، ایک مصنوعی مظلومیت کے انداز میں گویا ہوا، “جب میری ویڈیوز میں قرآنی آیات کا حوالہ دیا جاتا ہے، اور یہ اسلامی صفحات پر شیئر کی جاتی ہیں، تو ان آیات میں جہنم، پتھروں کی بارش اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔ کیا ایک ٹرانس عورت کو اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کا حق نہیں ہے؟”۔

میزبان نے متجسس نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا، ”لوگ کیا کہتے ہیں؟“۔

مونیز نے لمحے بھر کے توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھی،

۔ ”لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے جادو کی چھڑی گھما کر اپنی جنس تبدیل کر لی۔ وہ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب امریکی فنڈنگ کی بدولت ہوا ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اللہ نے مجھے ایسا ہی پیدا کیا ہے۔“۔

ایمان یہ سب دیکھ کر اپنی ناگواری چھپانہ سکی، اور دل ہی دل میں بڑبڑائی، ”تمہارے دماغ کا خلل ہے، تم مرد ہو، لیکن عورت بننے کی ضد کیے ہوئے ہو۔“۔

مونیز نے اپنی بات کو بڑھاتے ہوئے کہا، ”یہ معاشرہ بے حس ہے، لوگ بے رحمی سے پیش آتے ہیں۔ جب میں چھوٹی تھی، لوگ قدرے مہربان تھے، لیکن جیسے ہی میں نے اپنے آپ کو ایک خواجہ سرا کے طور پر تسلیم کیا، لوگ مخالف ہو گئے کیوں کہ میں نے صنفی تعصب کے خلاف آواز اٹھائی۔ اسی لیے ‘مولوی‘ میرے خلاف ہیں۔ آخر کیوں؟“۔

میزبان نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں ایک قلم کو نرمی سے پکڑ رکھا تھا، اور اس سے اشارہ کرتے ہوئے مونیٹر کو مخاطب کیا، ”مونیٹر، آپ نڈر ہیں، آپ نے ہمیشہ نا انصافی کے خلاف آواز بلند کی، اور اس کی وجہ سے آپ کو تنقید اور رد عمل کا سامنا کرنا پڑا۔“

مونیٹر نے سر اثبات میں ہلایا اور کہا، ”بالکل ایسا ہی ہے۔“

میزبان نے مزید کہا، ”آپ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور انسان ہیں، لیکن ان خواجہ سراؤں کا کیا، جو تعلیم سے محروم ہیں، جن کے خاندان اُن پر ظلم کرتے ہیں، اور جو اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے؟ ہر کوئی مونیٹر جیسا نہیں ہوتا، جو اتنا مضبوط ہو۔“

مونیٹر نے مسکراتے ہوئے اس بات کو تسلیم کیا، جبکہ میزبان نے اپنا سوال اور آگے بڑھاتے ہوئے کہا، ”تو، ان بے زبان لوگوں کا کیا، جو سوشل میڈیا پر بھی اپنی آواز نہیں پہنچا سکتے؟ کیا اُن کے ساتھ کوئی مختلف سلوک کیا جاتا ہے؟“

مونیٹر نے جواباً کہا، ”یہ سراسر مختلف امر ہے، کیوں کہ میں اپنے طفولیت ہی سے مواقع اور وسائل کی فراوانی میں پرورش پاتی رہی ہوں۔ میں ان ناگفتہ بہ حالات کو اپنے ذاتی مجلوں میں مختلف ترکیبوں اور تدابیر کی صورت میں رقم کرتی تھی اور ان پر مبنی منصوبہ بندی کر کے ان کی عملی تفہیز کو یقینی بناتی تھی۔“

اس کے بعد اس نے اپنے بچپن کا ایک فرضی قصہ سنایا،

مونی نے حیرت بھری نگاہوں سے کہا، ”کیا یہ مولوی قوم لوط کا حوالہ دیتے ہیں؟“۔

اس نے لفظ ”لوٹ“ پر زور دے کر گویا کسی پوشیدہ حقیقت کو نمایاں کیا،

پھر مزید کہا، ”میں ان جاہلوں کو بتانا چاہوں گی کہ جس عمل کو وہ برا کہتے ہیں، یہ ان ہی جیسے لوگوں کا کردار تھا جو قوم لوط کے تباہی کا باعث بنا۔ وہ دوسروں پر اپنی مرضی مسلط کرتے تھے، ان کو زبردستی اپنی خواہشات کے تابع کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور اسی بنا پر عذاب نازل ہوا۔ لیکن کیا یہ مولوی اس پہلو کو کبھی مخاطب کرتے ہیں؟“۔

میزبان نے فوراً، جیسے پہلے سے تیار ہو، کہا، ”وہ اس لیے خاموش رہتے ہیں کیوں کہ انہیں خوف ہے کہ اگر وہ سچ بولیں تو ان کی اپنی ہی خامیاں، ان کی اپنی ہی گناہوں کے پردے اٹھ جائیں گے، اور ان کے اصلی مقاصد عوام پر واضح ہو جائیں گے۔“۔

مونی کے چہرے پر غم اور غصے کی ملی جلی کیفیت نمایاں تھی، مگر وہ ابھی تک مکمل طور پر خاموش نہیں ہوئی تھی۔

۔ ”اور یہ جو خود کو دین کے ٹھیکیدار سمجھتے ہیں، کیا ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں جب مدرسوں میں بچوں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کی بات آتی ہے؟“۔

اس کی آنکھوں میں اشک حقارت کی شدت سے بھرے ہوئے تھے، جب اس نے تلخی سے کہا، ”یہ مولوی ہیں، جنہیں صرف اپنے دنیاوی فائدوں کی فکر ہے۔ ان کے یوٹیوب چینل اور کاروباری مصلحتیں اسلام کی روح کو پیچھے چھوڑ چکی ہیں۔ دین کو ایک منافع بخش کاروبار میں تبدیل کر دیا ہے۔“

میزبان نے چہرے پر ایک سنجیدہ تاثر لیے، اپنے خیالات میں گم، ایک لمحے کے لیے خاموشی اختیار کر لی۔ شو کے اختتامی لمحات میں، مویز نے نہایت پُر اعتماد لہجے میں اعلان کیا، ”اگر کوئی خواجہ سرا یا ٹرانس جینڈر محبت کا خواہاں ہے، تو اسے اپنی محبت کے اظہار کی اجازت دیں۔ انہیں اُس سے عقد کرنے دیں جس سے ان کا دل بندھا ہے۔ محبت کسی سرحد یا حد کی محتاج نہیں ہوتی۔“

محبت کا کوئی تعلق محض جنس سے نہیں ہوتا، محبت ہر جنس، ہر وجود میں پنپ سکتی ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام اتنا سخت اور جامد نہیں جتنا بعض لوگ اسے ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ بالآخر پاکستان میں ہمارے حقوق محفوظ ہوں گے اور معاشرہ ہمیں قبول کرنے کی طرف گامزن ہو گا۔“

میزبان نے ایک مدہم مسکراہٹ کے ساتھ شو کو سمیٹتے ہوئے کہا، ”ان دلنشین اور پُر معنی کلمات کے ساتھ ہم آج کے پروگرام کا اختتام کرتے ہیں۔ عزیز ناظرین، امید ہے کہ آپ نے ٹرانس جینڈر کمیونٹی کو درپیش مصائب اور چیلنجز کے بارے میں قیمتی فہم و ادراک حاصل کیا ہو گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان

مسائل کو معمول کا حصہ سمجھا جائے، اور ان پر سنجیدہ غور و فکر کیا جائے۔ ہمارا شو آج کے لیے یہاں اختتام پذیر ہوتا ہے، لیکن اگلی قسط میں ایک نئے موضوع کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ تب تک، اللہ ہم سب کا نگہبان ہو۔”

جھوٹ اور نازک موضوعات کی چالاکی سے جوڑ توڑ کرنے والے اس فریبی شو کا پردہ آخر کار گر گیا۔ واقعات کو تحریف و تحریفات کی بھینٹ چڑھایا گیا، کذب کے پردے کو چاک کیا گیا، اور اس شو کی مالی معاونت کے خفیہ ذرائع ایسے عناصر کے ہاتھ میں تھے جو پاکستان میں جہالت اور بے حیائی کو فروغ دینے کے لیے اپنے مذموم ایجنڈوں پر کاربند تھے۔ ان کا مقصد محض معاشرتی بگاڑ اور اخلاقی زوال کی راہ ہموار کرنا تھا، جس کے تحت قوم کو اندھیروں میں دھکیلا جا رہا تھا۔

...°...

شو کے اختتام پر، وہ دوسرے چینل کے ہیڈ کوارٹر کی جانب روانہ ہوئے، مگر وہاں پہنچنے سے قبل جی-10 مرکز پر رکنے کی نوبت آگئی۔

مونیٹر کو آنے والی پارٹی کے لیے کچھ خریداری کرنی تھی۔ ان کی گاڑی پارکنگ ایریا کی بالائی منزل پر کھڑی تھی، جو ارد گرد کے مناظر کو بلند زاویے سے ظاہر کر رہی تھی۔

سامنے ہی ایک وسیع ایچ بی ایل بینک کا داخلی راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ نیچے الائیڈ بینک اور میزبان بینک کی شاخیں تھیں، اور ایک بڑا بل بورڈ لرن ایمازون وڈ اس کا آویزاں تھا، جس نے فضاء میں ایک جاذبِ نظر

وجود قائم کیا ہوا تھا۔ دائیں طرف، ایک دلکش مسجد اپنے بلند میناروں کے ساتھ کھڑی تھی، جس کے گرد سرسبز و شاداب باغات لہلہا رہے تھے، اور ہوا میں قرآن پاک کی تلاوت کی آواز گونج رہی تھی۔

ایمان نے گاڑی کی سیٹ پر ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ آج غیر معمولی طور پر اسے بھوک اور پیاس کا احساس ہونے لگا تھا، جو اسے حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔ معمولی دنوں میں اسے قبل وہ پورا پورا دن بھی بھوکا رہ لیتی تھی مگر آج، آج بھوک و پیاس کی شدت اس کے سمجھ سے پرے تھی

وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس کا جسم ایسے کیوں رد عمل دے رہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے وہ خود سے مخاطب ہوئی،۔

۔ ”یہ کیسا احساس ہے؟ مجھے اتنی شدت سے بھوک اور پیاس کیوں لگ رہی ہے؟ آخر اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے اسے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا“ سورج کی تیز روشنی سیاہ شیشوں سے گزرنے میں ناکام رہی، لیکن باہر کی چمکتی ہوئی دنیا اپنے وجود کی خبر دے رہی تھی۔

اسی دوران، ایمان کی سماعت میں ایک دھیمی مگر لرزتی ہوئی رونے کی آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی بچی جو حالت سے سائلہ معلوم ہو رہی تھی، نیچے فرش پر بیٹھی، اپنے پاؤں لٹکائے، زار و قطار رو رہی تھی۔

ارد گرد سے لوگ خاموشی سے گزرتے جا رہے تھے، جیسے کسی کا دکھ ان کے لیے اہم نہ ہو۔

ایمان کا دل پسینہ کیا، وہ فوراً گاڑی کا دروازہ کھول کر بچی کے قریب آئی اور نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا، ”کیا ہوا؟ تم کیوں رو رہی ہو؟“۔

سورج کی کرنوں نے سخت سائے پھیلانے تھے، اور بچی کا غمگین، آنسوؤں سے بھرا چہرہ ان کرنوں کی چمک میں ایک عجیب ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں، اور غم کی ایک گہری لہر ان میں تیر رہی تھی۔

بچی نے اوپر دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں اپنی کہانی سنانے کی کوشش کی مگر۔ دوبارہ ٹوٹ کر۔ رونے لگی۔ ایمان کا دل دہل گیا جب اس کی نگاہ اس بچی کی پیشانی پر پڑی، جس پر ایک بھیانک زخم کا نشان واضح تھا۔ چھ سال کی معصوم بچی پر ظلم کے آثار دیکھ کر وہ سکتے میں آ گئی۔

۔ ”یہ تمہارے ساتھ کس نے کیا؟“ ایمان کی آواز میں بے چینی تھی، جو اُس کے دل کی گہرائیوں سے اُبھر رہی تھی۔

اس دوران، آس پاس سے گزرنے والے لوگ بھی ٹھہر گئے، اور ایک مجمع سا اکٹھا ہونے لگا۔ لوگوں کے چہروں پر حیرت، دکھ اور غصے کا امتزاج واضح تھا۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں بچی نے اپنی پتلا سنائی ”میرے پاس پانچ سو روپے تھے۔ دو آدمی سکوتر پر آئے، اور میرے سر پر ڈنڈا مار کر میرے پیسے چھین کر بھاگ گئے۔“

بچی کی لرزتی آواز میں تازہ آنسو اس کے گالوں پر گرے، اور اس کی بات نے مجمع کو مزید افسردہ کر دیا۔

اس دوران، ایک آدمی نے اپنی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ”یہ تو ہونا ہی تھا، جب حکومت ایسی ہو تو بھکاری بھی چوروں کے ہاتھ محفوظ نہیں رہتے۔“

اس کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی، اور لوگوں کی خاموشی میں اس کے الفاظ گونج اٹھے۔

زخمی بچی کی جانب سے مملو ہمدردی سے سرشار، ایمان نے فوری اقدام کا مصمم ارادہ کر لیا۔

نہایت نرمی سے لڑکی کو بازوؤں کے حلقے میں لے کر اٹھایا اور مدھم لہجے میں گویا ہوئی، ”میرے ہمراہ چلو۔“

وہ نوخیز لڑکی کو ساتھ لیے اپنی گاڑی تک پہنچی، جہاں کار کار دروازہ وا کیا اور اسے نہایت احتیاط سے نشست پر بٹھا دیا۔

ایمان نے فوراً ڈرائیور کی نشست کے نیچے رکھے طبی امداد کے ڈبے تک رسائی حاصل کی، مرہم نکالا اور لطافت کے ساتھ بچی کی سوجی ہوئی پیشانی پر لگایا۔ مرہم پٹی سے زخم کو لپیٹتے ہوئے، بچی کی اذیت میں کچھ کمی کی۔

اسی اثناء میں، موئیز کی نگاہ دوری پر اپنی گاڑی کے گرد اکٹھا ہجوم پر پڑی۔ حیرت کے عالم میں اس نے قدم تیز کیے اور جانبِ ہجوم بڑھا۔

لوگ اس کی موجودگی سے بے خبر دکھائی دیے، شاید اسے پہچان نہیں سکے۔ مونیز خود بھی اس امر پر ششدر رہ گیا کہ مجمع نے اس کی شناخت نہیں کی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگز کو تیزی سے گاڑی کی ڈگی میں رکھا، اور پھر واپس ہجوم کی طرف آیا۔

اس کی نگاہوں میں سوالات بھرے ہوئے تھے، چنانچہ اس نے لب کشا ہو کر کہا ”یہاں کیا معاملہ پیش آیا ہے؟“۔

ایمان، جو بچی کے زخم پر مرہم بند کر رہی تھی، بغیر سر اٹھائے بولی ”اس بچی کے سر پر چور نے ڈنڈا مار کر اس کے روپے چھین لیے ہیں۔“۔

اس کے بعد، مسکراتے ہوئے ایمان نے بچی کو نرمی سے گاڑی سے باہر نکالا اور اپنے بیگ سے پانچ ہزار روپے کانوٹ نکال کر بچی کے ہاتھ میں دیا۔

دوستانہ تنبیہ کرتے ہوئے کہا ”اب ان پیسوں کو سنبھال کر رکھنا اور فوراً اپنے گھر چلی جانا۔“۔

ایمان، جو ابھی بھی دوزانوزمین پر بیٹھی ہوئی تھی، بچی کی طرف متوجہ ہو کر اس کو سمجھا رہی تھی۔ بچی نے احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر ایمان کے رخسار پر بوسہ دیا۔ بچی کی اس معصومانہ حرکت پر ایمان بھی مسکرا اٹھی اور محبت سے بچی کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے اس کا سر سہلایا۔

جیسے ہی گاڑی نشیب کی جانب مڑتی ہوئی چینل کے صدر دفتر کی راہ لی، ایمان نے غیر ارادی طور پر مونیٹر پر گہری نگاہ ڈالی، اس کی خاموشی بے قراری کا پیش خیمہ تھی۔ وہ بالآخر اپنے اندر کے سوال کو، جو دیر سے اس کے ذہن پر بار تھا، زبان پر لے آئی

۔ ”تم نے مجھے یہ سب کیوں دکھایا؟“۔

اس کے لہجے میں تشویش اور خفیہ مقاصد کی جھلک صاف نمایاں تھی۔ مونیٹر نے اپنی نگاہیں سامنے سڑک پر مرکوز رکھیں، چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، جیسے وہ ہر لفظ کو ترازو میں تول رہا ہو۔ اس نے آہستگی سے بات شروع کی، اور اس کے الفاظ میں ایک چھن تھی، جیسے اندرونی زخموں کو کھول رہا ہو۔

ایمان، سچ کا سامنا کرو۔ تمہاری فیملی کو تمہاری اصل میں کوئی پروا نہیں۔ وہ تمہیں صرف اس لیے برداشت کرتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ تمہارے نام پر جائیداد ہے۔ لیکن یہ کب تک چلے گا؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمہارا باپ ایک دن تم سے جان چھڑالے؟“۔

اس کے الفاظ میں ایک خفیہ وار تھا، جیسے وہ ایمان کو رد عمل پر مجبور کرنا چاہتا ہو۔ مگر ایمان نے

اپنے جذبات کو قابو میں رکھا، اس کا چہرہ سنجیدہ رہا۔ اس نے خاموشی سے مگر پختگی سے جواب دیا۔ ”اس زندگی نے مجھے کیا دیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ مجھے اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں زندہ رہوں یا مر جاؤں۔“۔

اس کے الفاظ میں ایک گہری مایوسی اور ترک کا عنصر نمایاں تھا۔

مونی نے اثبات میں سر ہلایا، جیسے وہ اس کی بات سمجھ چکا ہو، مگر اس کے لہجے میں عجیب سی شفقت چھلک رہی تھی۔ ایمان، اگرچہ اس کی باتوں کا مطلب خوب سمجھ رہی تھی، مگر اس کے اندر ایک سرد محتاطی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میٹھے الفاظ کے پردے میں زہر بھی چھپا ہو سکتا ہے، اور وہ اس کے دھوکہ دہی کے خطرے سے غافل نہیں تھی۔

مونی نے اچانک اپنے لہجے میں ایک فلسفیانہ رنگ بھر لیا، گویا وہ اپنی زندگی کی تمام مشکلات کا اعتراف کر رہا ہو۔ وہ بولا

۔ ”ایمان، تم نے ایسی اذیتیں جھیلی ہیں جو بہت سے مردوں کے حصے میں بھی نہیں آئیں۔ ہمارے معاشرے میں مردوں کو عزت دی جاتی ہے، جبکہ عورتوں کو ہمیشہ نیچا دکھایا جاتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی بے چینی تھی، جیسے وہ کسی اندرونی خوف سے نبرد آزما ہو۔ وہ مزید بولا ”شاید تمہیں اپنے وجود کو بدلنے پر غور کرنا چاہیے، ایک لڑکی سے لڑکا بننے کا عمل۔ شاید تب تمہارے باپ تمہیں قبول کر لیں۔“

اس کے الفاظ ہوا میں معلق ہو گئے، جیسے ایک تلخ حقیقت کا پردہ اٹھا رہے ہوں، اور ایمان کو ایک گہرے صدمے میں چھوڑ گئے، جہاں ہر لفظ زہر میں بجھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

ایمان نے موئیز کی طرف گہری نگاہ ڈالی، اور اس کی آنکھوں میں حیرت کا عکس واضح تھا۔ موئیز کی بے باک تجویز کے جواب میں وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور طنزیہ لہجے میں گویا ہوئی،

۔ ”اگر واقعی ہمارے معاشرے میں مردوں کو اتنی عظیم قدر و منزلت ملتی ہے تو پھر تم کیوں لڑکی بننے کی خواہش رکھتے ہو؟“۔

موئیز نے بغیر کسی تذبذب کے، پختہ آواز میں جواب دیا، ”میرے حالات تمہارے سے مختلف ہیں۔ ہم دونوں ایک منفرد حقیقت کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس پر غور کرنے کے بعد ہی تم فیصلہ کر سکتی ہو۔“۔

موئیز نے گہری سانس لیتے ہوئے موضوع کو وقتی طور پر تھم جانے دیا۔ ایمان کی نظروں میں سوال ابھرا اور اس نے استفسار کیا،

۔ ”تم پاکستان میں یہ تماشا کیوں رچانا چاہتے ہو؟“۔

موئیز نے بلا جھجک جواب دیا، ”ایمان، میری عزیز، مجھے لڑکی بننے اور تمہیں لڑکا بنا کر شادی کرنے سے ہمیں ایک خطرہ رقم حاصل ہو سکتی ہے۔ اس پر غور کرو، یہ ہمارے لیے نفع مند ثابت ہو سکتا ہے۔“۔

ایمان نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”مجھے لگتا ہے کہ لوگوں کی باتیں درست ہیں؛ یہ سب سرمایہ اور مفاد کی بات ہے۔“۔

وہ سرد لہجے میں گویا ہوئی، ”انہوں نے شاید یہ سوچا ہو گا کہ میں ایک آسان شکار ہوں، کہ تم مجھے بہلا پھسلا کر قاتل کر لو گے۔ لیکن موئیز، ایسا ہرگز نہیں ہونے والا۔“

موئیز نے اپنی چالبازی پر مطمئن ہوتے ہوئے جواب دیا، ”یہ دنیا تمہیں ایک ایسا موقع فراہم کر رہی ہے جہاں تم اپنے انتقام کی پیاس بجھا سکتی ہو اور دوسروں کو نقصان پہنچا سکتی ہو۔“

ایمان نے بے نیازی سے آنکھیں گھمائیں اور سخت لہجے میں کہا،

۔ ”میں اپنا بدلہ ضرور لوں گی، اس پر کوئی ابہام نہیں، لیکن اس انتقام کی راہ میں اپنے آپ کو برباد نہیں کروں گی۔“

اس نے سرد مہری سے مزید کہا، ”اور جہاں تک مردوں کا تعلق ہے، وہ میرے لیے کسی زہر سے کم نہیں۔“

ایمان نے ایک گہری مایوسی کے ساتھ موئیز کی طرف دیکھا، گویا اس کی باتوں کی بے وزنی کو محسوس کر رہی ہو۔ پھر وہ اپنی نشست پر پیچھے ٹیک لگاتے ہوئے خاموش ہو گئی، اور نگاہیں کھڑکی کے پار گزرتی ہوئی دنیا پر مرکوز کر لیں۔ اس کے ہاتھ ایک نازک گرٹیا کی مانند سینے پر بندھے ہوئے تھے، جیسے وہ اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو سنبھالے ہوئے ہو۔ جب اس کی نظر تیز رفتاری سے بدلتے مناظر پر پڑی، تو اس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی اور سنسنی نے جگہ بنالی، گویا دنیا اس کے سامنے بے معنی اور خالی ہو چکی ہو۔

اچانک، ایمان کے دل میں

سورہ النساء ۱۱۹

گو نجنے لگی، جیسے اس کے باطن کو جھنجھوڑ رہی ہو۔ آیت کی صدائیں اس کے دل میں یوں اتریں،

قسم ہے میں ضرور بہکادوں گا اور ضرور انہیں آرزوئیں دلاؤں گا (ف ۳۱۰) اور ضرور انہیں کہوں گا کہ وہ چوپایوں کے کان چیریں گے (ف ۳۱۱) اور ضرور انہیں کہوں گا کہ وہ اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزیں بدل دیں گے، اور جو اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنائے وہ صریح ٹوٹے میں پڑا ﴿۱۱۹﴾۔

اس آیت کی گہرائی نے ایمان کے دل کو جیسے جھنجھوڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی جاگ اٹھی، اور اس نے اندر ہی اندر ایک خاموش دعا کی،

۔ ”اے اللہ، میں تیری حدود سے تجاوز نہیں کروں گی۔“ دل کی اس گہری التجا کے ساتھ، جیسے ہی اس کی نیت مضبوط ہوئی، ایک نورانی فرشتہ، جو انسانی نگاہوں سے اوچھل تھا، اس کے پیچھے موجود تھا، ایمان کے قلب کی اس پاکیزہ نیت کا گواہ بن رہا تھا۔ ایمان کی دعا جیسے ہی ختم ہوئی، فرشتہ آہستہ آہستہ نور میں تحلیل ہو گیا، گویا وہ اپنی ذمہ داری پوری کر چکا ہو۔

ایمان نے ایک نئی بیداری کے ساتھ مونیز کی طرف نگاہ کی، اس کی آنکھوں میں تشویش اور افسوس کا سایہ تھا۔ وہ پُر سکون اور متین لہجے میں بولی،

- ”تم خود کو خواجہ سرا کہلاتے ہو، لیکن تمہارے الفاظ ان حقیقی خواجہ سراؤں کے حقوق کو مجروح کر رہے ہیں۔ کیا تمہیں اس بات کا احساس بھی ہے؟“ -

مونی نے بے پروائی سے کندھے اچکائے، گویا یہ بات اس کے لیے بے معنی ہو،

- ”میں کیوں پرواہ کروں؟ اور اگر وہ بے فائدہ نسل ہمیں کوئی فائدہ دے رہی ہے تو اس میں مضائقہ ہی کیا ہے“ اس کے الفاظ میں سفاکی تھی، جیسے وہ کسی بھی احساس سے عاری ہو۔

ایمان نے دکھ بھری نظروں سے اس کے رویے کو دیکھا، اور افسوس سے سر ہلایا۔

- ”یہ ٹھیک نہیں ہے،“

اس نے نرمی سے کہا، ”تم انہیں بدنام کر رہے ہو۔ وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں، لیکن کوئی انہیں موقع ہی نہیں دیتا۔“ -

پھر اس نے مونی کو اوپر سے نیچے تک جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور گویا ہوئی،

- ”تم جیسے لوگ ان کے نام کا غلط استعمال کر کے انہیں اور بھی ذلیل کرتے ہیں۔“ -

وہ بخوبی آگاہ تھی کہ اس کی گفتگو کا کوئی اثر نہیں ہوگا، اس نے سر جھٹک کر دائیں طرف موڑ لیا اور باہر کے منظر کی طرف دیکھنے لگی۔

ایمان اور مونیزا اے بی این چینل کے صدر دفتر کے سامنے کھڑے تھے، جہاں عمارت کا سادہ مگر باوقار ڈھانچہ جدیدیت اور عظمت کا عکاس تھا۔ مونیزا کے ہاتھ میں فولڈر اور کندھے پر بیگ تھا۔ وہ دونوں پرسکون قدموں کے ساتھ مرکزی دروازے کی جانب بڑھے جو خود کار طور پر کھلا، ان کے سامنے ایک شاندار داخلی راستہ ظاہر ہوا۔

اندرونی حصے میں سنگ مرمر کی ٹھنڈی چمک اور دیواروں پر آویزاں آرٹ ورک نے دفتر کی عیش و آرام بھری فضا کو مزید نمایاں کیا۔ بڑی کھڑکیوں سے شہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا، جو جدید تعمیرات اور سرسبز و شاداب نظاروں سے بھرا ہوا تھا۔

وہ دونوں استقبالیہ سے گزرے، جہاں ماحول میں ایک خاموش سا وقار طاری تھا۔ ہر چیز نفاست کا مظہر تھی، خاموش گفتگو اور منظم سرگرمیاں طاقت کے گہرے دھاگوں کا پتہ دیتی تھیں۔

جلد ہی وہ ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے، جہاں ایک ادھیڑ عمر آدمی نرم روشنی میں بیٹھا تھا۔ اس کے کلین شیو چہرے اور بے داغ تھری پیس سوٹ سے پیشہ ورانہ رکھ رکھاؤ ظاہر ہو رہا تھا۔ پس منظر میں بڑے شیشے کی کھڑکی سے اسلام آباد کے پہاڑوں کا دلفریب نظارہ اور ایکویریم میں تیراکی کرتی رنگ برنگی مچھلیوں کی حرکات سکون کا احساس دلارہی تھیں۔

جیسے ہی اس شخص کی نظر داخلی دروازے پر مونیزا پر پڑی، اس کے چہرے پر اچانک خوشی کی جھلک ابھری اور وہ شوق بھرے نسوانی انداز میں مونیزا کی طرف لپکا۔

مونیز نے بے ساختہ اپنے بازو پھیلائے، اور دونوں نے گرم جوشی سے ایک دوسرے کو زنانہ انداز میں گلے لگا لیا۔ ”آہ، مونیز، میرے دلبر، تمہارا شدت سے انتظار تھا،“

اس آدمی نے خوشی میں لرزتی آواز میں کہا۔

مونیز نے ہنستے ہوئے کہا، ”دیکھا، میں پہنچ ہی گئی۔“

اس شخص کی نظر پھر ایمان پر پڑی جو خاموشی سے سیٹ پر بیٹھ کر صورتحال کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے تجسس سے کہا، ”مونیز، یہ حسین گڑیا کون ہے؟“ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ ایمان نے بلا جھجک، اعتماد بھرے اور جاندار لہجے میں جواب دیا،

۔ ”میں گڑیا نہیں ہوں، جنہیں بے حس و حرکت شلیف پر سجا دیا جاتا ہے، یا لوگ ان سے کھیلتے ہیں یا وہ دھول اکٹھی کرتی ہیں۔ میں وہ نہیں جو کسی کی انگلیوں پر ناپے یا دھول میں مل جائے۔ کوئی مجھ سے جوڑ توڑ نہیں کر سکتا۔“

ایمان کی آنکھوں میں چمک اور لہجے کی قطعیت نے اس شخص کو چونکا دیا، جس نے ہونٹ بھینچ کر خاموشی سے اپنی جگہ لے لی، اور گہری نظروں سے ایمان کو دیکھتا رہا جیسے اس کا جائزہ لے رہا ہو۔

ایمان نے خاموشی کے پردے میں لپٹے ہوئے الفاظ کے ذریعے یہ واقعہ پیغام دے دیا تھا کہ کوئی بھی اُسے اپنے ذاتی مفادات کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔

بہر حال پھر ماحول میں خاموش مگر شدید کشمکش کا تاثر تھا۔ ہر کوئی اپنے مفادات کی نگہبانی کر رہا تھا۔

مونیز نے سکون کے ساتھ فائل کو میز پر رکھا، اور اسے آہستہ سے اس شخص کی طرف سرکا دیا۔ کمرے میں ایک پل کی خاموشی چھا گئی، جیسے دونوں اطراف سے کچھ گہرا سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

اب، کی بار مونیز خاموشی سے ایمان کے برابر کرسی پر براجمان ہو گیا، ایمان کی توجہ کمرے کی کشیدہ فضا سے پرے، کسی اور جہت میں جا بسی تھی۔ سامنے میز پر رکھی فائل، جس میں سات اقساط موجود تھیں، ہر ایک اپنی الگ کہانی بیان کرتی تھی اور ہر قسط کا دورانیہ ڈیڑھ گھنٹے پر محیط تھا۔

وہ شخص خاموشی سے فائل کے صفحات پلٹ رہا تھا، اور ایک لمحے کے توقف کے بعد گویا ہوا،۔

۔ ”یہ پیغام عوام تک، خاص طور پر ان آن لائن مولویوں تک پہنچانا خاصا کٹھن کام ہو گا۔ ممکن ہے وہ اسے محض ایک کھیل ہی سمجھیں۔“

مونیز کے لبوں پر مسکراہٹ ہنوز قائم تھی جب اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا،

۔ ”یہ بات تو بالکل درست ہے کہ یہ معاملہ خاصی باریک بینی کا متقاضی ہے۔ عوام نفسیاتی طور پر جو چیز بار بار دیکھتی ہے، اس کی عادی ہو جاتی ہے۔ انسانی ذہن کی ساخت ایسی ہے کہ اسے رفتہ رفتہ قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ پہلے ایک ہلکی سی جھلک دکھاؤ، پھر جب ان کی عادت پختہ ہو جائے، تب مکمل فلم سامنے لاؤ۔“

اس شخص نے رضامندی میں سر ہلاتے ہوئے فائل کو بند کر دیا اور اسے میز پر واپس رکھتے ہوئے کہا،
”جیسے ہی فنڈنگ دستیاب ہوگی، ہم اس منصوبے پر عمل درآمد شروع کر دیں گے۔“

اس نے موئیز سے ایک یو ایس بی وصول کی اور اسے احتیاط سے میز کے دراز میں محفوظ کر دیا۔ ایمان کی
نظریں بدستور کھڑکی کے اس پار پہاڑوں کے دلکش منظر پر مرکوز تھیں، گویا وہ ان سب سے لاتعلق
تھی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد، اس شخص نے موئیز کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا، ”موئیز جان، مجھے اس
قدر معلق نہ رکھو، اپنی دوست کا تعارف تو کراؤ۔“

ایمان نے فوراً توجہ کی سمت بدلی اور ایک تیز و طنزیہ انداز میں کہا، ”مجھے کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔
میرے خیال میں، اب ہمارے جانے کا وقت آچکا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی نشست سے اٹھنے لگی کہ موئیز نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور کچھ توقف کے بعد
ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں گویا ہوا، ”تم جانتی ہو، میں تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں۔“

اس آخری جملے کے ساتھ، موئیز کی نظریں جھک گئیں، جیسے کوئی بھاری بوجھ اس پر آن پڑا ہو۔

موئیز کی بات پر ایمان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے نیم طنزیہ انداز میں کہا،

- ”الفاظ سے حقیقت کا چہرہ کب بدلا ہے؟ تم بھی یہ بات جانتے ہو،؟“۔

مونی نے بظاہر اس جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے ایمان کی توجہ اس شخص کی جانب مبذول کرائی اور کہا،
”تمہیں معلوم ہے یہ کون ہیں؟“۔

ایمان نے لا پرواہی سے آنکھیں گھمائیں اور بے نیازی سے جواب دیا،

”میں انسائیکلو پیڈیا نہیں ہوں جو ہر شخص کی معلومات رکھتی ہوں۔“

مونی کے چہرے پر کچھ برہمی کے آثار نمایاں تھے، اور اس نے جلدی سے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس شخص کا تعارف کراتے ہوئے بولا،

- ”یہ بہرامند کھوسٹ ہیں۔“

- ایمان نے بے دلی سے اسے اوپر نیچے دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”کھوسٹ ہی لگتے ہیں۔“۔

بہرامند کی ہونٹوں پر بھی ایک ہلکی سی مسکان نمودار ہوئی، جبکہ مونی نے سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے گفتگو جاری رکھی، ”ونڈر لینڈ، پاکستان کی پہلی ایل جی بی ٹی کیو فلم ہے۔“۔

مونی کے الفاظ کو سنتے ہی ایمان نے بغیر توقف کے بات کاٹتے ہوئے سخت لہجے میں کہا،

۔ ”ہاں، وہ ہی فلم جسے انٹرنیٹ پر شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ میں آج کل کے پاکستانیوں کو سمجھ نہیں پاتی، یہ لوگ انسٹاگرام پر انگریزی بول کر اپنے آپ کو برطانوی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے دنیا بھر کے گورے ان سے انگریزی سیکھتے ہوں۔ مجھے بھی اس فلم کے بارے میں تب پتہ چلا جب میں نے کچھ اردو تبصرے دیکھے۔“

چند لمحوں کے توقف کے بعد، ایمان نے مزید کہا، ”آدھی فنڈنگ امریکہ اور اسرائیل سے آئی، اور دوسری مہرہ یونس نے دی جو ایک امریکہ کی ایجنٹ ہے،۔ اس لڑکی کو لاؤنچ کیا گیا تھا تا کہ عافیہ صدیقی کا معاملہ پس پردہ چلا جائے اور لوگوں کی توجہ مہرہ پر مرکوز ہو۔“

ایمان کی باتوں میں چھپے طنز اور اس کی غیر متاثر عقل نے مونیز کو حیرت زدہ کر دیا۔ اس کی ہنسی اچانک پھوٹ پڑی، جس سے اس کی حقیقت پسندانہ نظر اور دھیان کی گہرائی عیاں ہو گئی۔

مونیز کے چہرے پر بیزاری کے آثار مزید نمایاں ہوئے، اور مایوسی کے ساتھ اس نے کہا،

۔ ”ایمان...“

مگر ایمان نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا، ”میں کسی فلم کا حصہ بننا نہیں چاہتی، اور نہ ہی کسی گمراہ کن منصوبے کا۔“

مونیز، جو ایمان کی اس بے ساختہ سمجھداری اور اس کے فیصلہ کن ارادوں سے ششدر رہ گیا تھا، ایمان کو دروازے کی جانب بڑھتے دیکھتا رہا۔ ایمان نے دروازے کا ہینڈل تھام کر پیچھے مڑتے بغیر کہا، ”تم میرے ساتھ جارہے ہو یا میں خود ٹیکسی لے لوں؟“۔

مونیز نے ہچکچاتے ہوئے اپنی نشست چھوڑی اور آہستگی سے کہا، ”چلو، چلتے ہیں۔“۔

...°...

عصر کے سائے طویل ہوتے جارہے تھے، جب مونیز کی گاڑی ایمان کے گھر کے باہر رکی۔ جیسے ہی ایمان گاڑی سے نکلنے لگی، مونیز نے آخری بار اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
”تم نے لاکھوں کی پیشکش ٹھکرا دی ہے۔“۔

ایمان کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری، اور اس نے تمسخرانہ لہجے میں جواب دیا،
”جن لاکھوں کا تم ذکر کر رہے ہو، ان سے دگنے رقم کی میں تم سے منشیات خرید لیتی ہوں تو یہ پیسے کی لالچ مجھے مت دو۔“۔

وہ جانے کے لیے پرتول رہی تھی جب مونیز نے جلدی سے کہا، ”تم پرانی آفر پر غور کرنے کے لیے تیار ہو سکتی ہو، یہ معاملہ کھربوں تک جاسکتا ہے۔“۔

ایمان نے لاپرواہی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکلتے ہوئے بغیر کسی جھجک کے کہا، ”میں تمہارے ساتھ
دولے گزرنے کو ترجیح دوں گی بجائے اس کے کہ تمہاری بے وقعت پیشکش پر دوبارہ غور کروں۔“

مونیز اپنی ضد پر قائم رہا، بولا، ”ایمان، میری بات سنو، تم لڑکا بن جاؤ، میں لڑکی، اور ہم دونوں شادی کر
لیں گے، اس سے معقول رقم ہاتھ آجائے گی۔“

ایمان نے گہری سانس لی اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلائی۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر مونیز کو گمان ہوا کہ شاید وہ اس کی تجویز مان گئی ہے۔ لیکن ایمان نے
گویا تپتے لہجے میں کہا، ”مونیز، آج صبح سے میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں کسی کی ہڈیاں چور چور کر دوں۔“

مونیز نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا، ”ہاں تو پھر؟“

ایمان نے اسے اوپر سے نیچے تک ناپسندیدگی سے گھورتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا، ”بیچ باتیں مت کرو، ورنہ
میرے بائیمان دل کا کوئی بھروسا نہیں کہ وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے۔“

یہ کہہ کر اس نے گاڑی کا دروازہ زور سے بند کیا اور مونیز کی لا حاصل کوششوں کو نظر انداز کرتے ہوئے
شان بے نیازی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

...°...

جیسے جیسے مغرب کی اذان قریب آئی، وقت کی سانسیں روزہ داروں کو افطار کی بشارت دینے لگیں۔ گھڑی کی ہر ٹک ٹک دلوں میں شکر گزاری اور عاجزی کا احساس جگا رہی تھی۔ گھر میں میز پر افطاری کا شاندار دسترخوان سجا ہوا تھا، اور خاندان کے تمام افراد خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے ہوئے تھے۔

ایمان، جو ابھی اس روحانی سفر کے ابتدائی مرحلے پر تھی، ان سب میں ایک خاموش تماشائی کی طرح بیٹھی تھی، لیکن اس کی دعائیں وہ ہی شدت اور سوز تھیں جو باقیوں کی دعاؤں میں تھیں۔

ایمان کی دعا، دل کے عمیق ترین گوشے سے اُبھرتی، خالق کائنات کے حضور پہنچ رہی تھی،

۔ ”اے پروردگار، مجھے ہدایت عطا فرما، مجھے سیدھا راستہ دکھا، جہنم کی آگ سے پناہ دے، اور جنت کی کنجی عطا فرما۔ سکون قلب کہاں ملتا ہے؟ دل کا اطمینان جنت کی کنجی سے کیسے جڑا ہوا ہے؟“۔

بھوک اس کے وجود میں گونج رہی تھی، لیکن یہ روزہ اس کے لیے کسی جسمانی آزمائش سے زیادہ ایک روحانی تجربہ تھا۔ آج کا دن اس کی زندگی کا پہلا روزہ تھا، جسے اس نے نہایت خاموشی سے لیکن پختہ عزم کے ساتھ رکھا تھا۔

وہ ایک مختصر لمحہ جس میں اس نے آنکھیں موندی تھیں، ایک ایسے خواب سے بھرا ہوا تھا جو قیامت کی یاد دہانی کرتا تھا۔ وہ خواب اتنا شدید تھا کہ اس نے ایمان کے دل میں خوف اور اللہ کی طرف رجوع کا جذبہ مزید پختہ کر دیا تھا۔

افطار کا وقت قریب تھا، لیکن ایمان کے لیے یہ صرف جسمانی افطار نہیں تھا، بلکہ اس کی روح ایک نئے سفر کا آغاز کر رہی تھی، جو سکون کی تلاش اور خدا کے قرب کا سفر تھا۔

گھر کی فضاؤں میں اذان کی مدھم سی گونج سنائی دی، اور رفتہ رفتہ تمام گھر والوں نے روزے کی نیت باندھ لی۔ ایمان، جو روزے کی مخصوص نیت اور افطار کی دعا سے بے خبر تھی، خاموشی سے افطاری کرنے لگی۔

خالدہ نے اسے چور نظروں سے دیکھتے ہوئے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ چاول کا نوالہ توڑا۔ ایمان پر عجیب سی تنہائی کا احساس غالب ہونے لگا، جیسے وہ اس ماحول سے یکسر کٹ گئی ہو۔

وقت گزر رہا تھا، خاندان کے مردوں نے افطار ختم کی اور نماز کے لیے روانہ ہو گئے، جبکہ ایمان بے خبر کسٹرڈ میں مگن تھی۔

اتنے میں خالدہ کی تیز، زہر آلود آواز نے خاموشی کو چیر دیا، ”نہ تو تو نے روزہ بند کرنے کی نیت کی، نہ افطار کی دعا پڑھی، کیا گمان کرتی ہے کہ تیرا روزہ مقبول ہو گا؟“۔

اس جملے پر خالدہ کی دونوں بیٹیاں ہنسی میں شامل ہو کر قہقہہ لگانے لگیں۔

ایمان، جو ابھی تک سکون سے کھا رہی تھی، اچانک حیرت سے چونکی، چچ پیا لے میں رکھ کر خالدہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں بے یقینی اور بے بسی تھی، جیسے اُس سے کوئی نادانستہ بھول ہو گئی ہو۔

خالدہ کی نظریں طنز اور فخریہ احساس سے بھری ہوئی تھیں، اور اُس نے دوبارہ وار کیا

”تو سارا دن یوں ہی بھوک پیاسی رہی، نیت اور دعا کے بغیر تیرا روزہ تو ویسے ہی ضائع ہو گیا۔“

یہ سن کر ایمان پر جیسے ایک بجلی سی گری،۔ ”کیا؟“ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا، جیسے اُس کا وجود بو جھل ہو گیا ہو۔

اللہ محض ظاہر پر نہیں، دلوں کے ارادوں پر نگاہ رکھتا ہے۔ جہاں الفاظ ماند پڑ جائیں، وہاں خلوص کی خاموش دعارب کے حضور گونجتی ہے۔ ایمان کا روزہ اُس کے دل کی گہرائیوں میں نیت کے ساتھ جڑا ہوا تھا، اور وہ نیت خدا کے علم میں تھی۔

مگر یہ حقیقت خالدہ اور اُس کی بیٹیوں کے فہم سے بعید تھی۔ وہ اپنے تنگ نظر نقطہ نظر سے ایمان کی کم علمی پر ہنس رہی تھیں، اُس کی نا تجربہ کاری پر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھیں۔

ایمان نے ان کی مسکراہٹوں کے پیچھے چھپے طنز کو محسوس کرتے ہوئے دل میں عزم کیا کہ وہ خود کو مضبوطی سے سنبھالے گی۔

اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا، ”یہ میرا پہلا روزہ تھا، مجھے کیسے علم ہوتا؟ تم لوگوں نے اگر تھوڑی سی رہنمائی کی ہوتی تو شاید مجھے اتنی شرمندگی نہ اٹھانی پڑتی۔ مگر تم لوگوں کے چہروں پر جو مسکراہٹ ہے، وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ تمہیں میری لاعلمی پر خوشی ملی۔“

ایمان کے الفاظ، جن میں بے یقینی اور غصے کا ملا جلارنگ تھا، کمرے میں گونجتے ہی خالدہ اور اُس کی بیٹیاں ایک بار پھر زوردار قہقہوں میں پھوٹ پڑیں۔

اس طنز اور تمسخر سے بھرپور ماحول میں ایمان کا صبر آخر کار جواب دے گیا۔

ایمان کا اچانک کرسی سے اٹھنا کسی بھاپ سے بھرے ہوئے دیگچے کی مانند تھا، جس کا ڈھکن اب کسی بھی لمحے اڑنے کو تھا۔ اُس کے اندر جولواؤں کا اظہار اب ناگزیر ہو چکا تھا۔ غصے میں لرزتے ہاتھوں سے اُس نے مٹن کری کا پیالہ تھاما، اور ایک بے پناہ ارادے کے ساتھ قدم بڑھایا۔

کمرے میں پھیلی خاموشی اس کے دل میں بھڑکتے طوفان کا پیش خیمہ تھی، اور خالدہ کی ہنسی، جواب تک فضا میں رچی ہوئی تھی، اچانک مدھم ہونے لگی۔

ایمان کی آنکھوں میں شعلے ناچ رہے تھے، اور اس نے بنا کسی تمہید کے پیالہ تیز حرکت سے اپنی سوتیلی بہنوں کی جانب اچھال دیا۔

سالن اور شور بہ ہوا میں بکھرتے ہوئے ان پر گرا، اور وہ ہنسی، جو کچھ لمحے پہلے تک کمرے میں گونج رہی تھی، ایک دم ساکت ہو گئی۔

حیرت اور بے یقینی کا عالم طاری ہو گیا۔ خالدہ کا چہرہ، جو چند لمحے پہلے طنزیہ مسکراہٹ میں گندھا ہوا تھا، اب ایک لخت بدحواسی میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ کچھ کہنے کی کوشش میں تھی، شاید کوئی بددعا نکالنے کا ارادہ رکھتی تھی، لیکن اس سے پہلے کہ کوئی لفظ ادا ہوتا، ایمان نے اسٹیل کی پلیٹ اٹھا کر پوری قوت سے خالدہ کے چہرے پر دے ماری۔

کمرے کی فضا میں اسٹیل کی پلیٹ کی گونج ابھری، اور خالدہ کی آواز، جو کسی زہر میں بجھی ہوئی ہوتی، وہ اُسی کے لبوں میں دفن ہو گئی۔

ایمان نے اسے خاموش کر دیا تھا، اُس کے الفاظ اب دم توڑ چکے تھے، اور خالدہ کا طنز بھرا چہرہ ایک شکستہ یادگار بن چکا تھا۔

ایمان کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں، غصے کی شدت سے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمایاں تھے، اور اُس کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تھے۔

۔ ”تم پر لعنت، نفرین ہو تم پر!“۔

اُس کی آواز کمرے میں گرجی اور وہ غصے سے دروازے کی طرف لپکی۔ اس کے قدموں کی شدت اور کمرے سے نکلتے ہوئے اس کے وجود میں ایک عزم واضح تھا۔

کمرے میں موجود لڑکیاں، جو ایمان کی اس ناگہانی کارروائی کا شکار ہو چکی تھیں، اب مٹن کری اور شور بے میں لت پت بیٹھی تھیں، ان کی شبیہیں مکمل طور پر بگڑ چکی تھیں۔

ان کے چہروں پر حیرت کے آثار واضح تھے، جیسے وہ اس بے قابو طوفان کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ خالدہ کے چہرے پر اسٹیل کی پلیٹ کا نشان واضح تھا، جیسے یہ ایک دائمی یادگار ہو کہ اس نے اپنے زہر بھرے الفاظ کے بدلے کیا پایا۔

کمرے میں ایک گہری، بھاری خاموشی چھا چکی تھی، جس میں صرف حالیہ واقعات کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ ایمان کی بہنیں، جو ابھی کچھ دیر پہلے تک قہقہوں میں مصروف تھیں، اب سنجیدہ اور خاموش بیٹھی تھیں، جیسے حیرت میں گم ہوں کہ یہ سب کیسے ہوا۔

ایمان تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ دروازہ بند کرتے ہی اُس نے زور سے زمین پر پیر مارا۔ ”مرنا بھی چاہتی ہوں، لیکن یہ اعمال اور حساب کتاب سب کچھ برباد کر دیتے ہیں!“ اُس کی آواز میں غصہ اور مایوسی کا امتزاج تھا۔ اُس کی مٹھیوں میں سختی اور آنکھوں میں اداسی کی پرچھائیاں واضح تھیں، جیسے وہ ایک ایسی جنگ لڑ رہی ہو جس کا کوئی انجام نہ ہو۔

اپنے کمرے کی تنہائی میں ایمان کی اندرونی دیواریں ٹوٹنے لگیں۔ وہ بے ساختہ زمین پر گر پڑی، گویا اس کے وجود کا بوجھ اب اس کے ناتواں جسم نے مزید اٹھانے سے انکار کر دیا ہو۔ غصہ، بے بسی، اور چاروں طرف سے یلغار کرتی ناامیدی کے شدید طوفان نے اسے جکڑ لیا۔ اس کا دل جیسے کسی تپتی ہوئی بھٹی میں ڈال دیا گیا ہو جہاں احساسات کالاواہل رہا تھا۔

کمرہ، جو ظاہری طور پر خاموش تھا، اس کے اندرونی طوفان کی چیخیں سن رہا تھا۔ ایمان کے اندر جو جنگ برپا تھی، اس کا اظہار اس کے لرزتے جسم اور بے ترتیب سانسوں سے ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں، جیسے کسی صدیوں پرانی تشنگی کا نتیجہ ہوں، اور ہر قطرہ اُس کے اندر کے دکھ کا بوجھ کم کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

ایمان کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا کی ہر دشواری، ہر غم، ہر طنز اور ہر بددعا اُس کے وجود پر وار کر چکے ہوں، اور اب اُس کے پاس بچنے کا کوئی راستہ باقی نہ ہو۔ اُس کی روح کے گہرے زخم، جنہیں وہ عرصے سے دبائے ہوئے تھے، آج ہر قید سے آزاد ہو کر چیخ اٹھے تھے۔

زمین پر بیٹھے، اُس کے ہاتھ بے اختیار مٹی کی طرح پھسلتی ہوئی زندگی کو گرفت میں لینے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ دیواروں کی خاموشی میں اُس کی گھٹی گھٹی سسکیاں گونج رہی تھیں، اور کمرے کی فضا اس کے دل کے درد کا عکس بن چکی تھی۔

زندگی کی تلخ حقیقتیں، جنہیں وہ اب تک نظر انداز کرتی آئی تھی، اب ایک گہری حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

ایمان کی روح جیسے اس غیر یقینی صورتحال کے بوجھ تلے دب گئی ہو۔ ہر سانس اس کے لیے بوجھل ہو چکی تھی، اور اُس کی آنکھوں میں دنیا کی بے رحمیاں تیرنے لگی تھیں۔

یہ کمرہ، جو کبھی پناہ گاہ ہوا کرتا تھا، اب اُس کی شکستہ حالت کی گواہی دے رہا تھا۔ ایمان کی لڑائی صرف دوسروں سے نہیں، خود اپنے آپ سے تھی۔

...°...

رات کے سناٹے میں، ایمان نے اپنے رازوں سے بھرے سفر کا آغاز کیا۔ اس نے بدن پر گہری سفید ریشمی فراک اوڑھی ہوئی تھی، جس کا کپڑا تتلی کے پروں کی مانند اس کے گرد نرم اور سبک وار حرکت میں تھا، جیسے ہوا کے لمس سے لہراتی ہو۔

فراک کے اطراف میں ہلکا سا پھیلاؤ اس کی نازک قامت کو اور بھی لطیف انداز میں نمایاں کر رہا تھا، جیسے چاندنی میں نہایا ہوا کوئی خوابیدہ منظر ہو۔

فراک کے گلے میں بندھا چاندی کا باریک فیتہ اُس کی ظاہری وقار کو اُبھار رہا تھا، جبکہ اس کی سنہری زلفیں، جو کسی چمکتے ہوئے جھرنے کی مانند اس کی کمر تک بہتی تھیں، ایک خاموشی بھری کہانی بیان کر رہی تھیں۔

چوٹیوں کی یہ ترتیب، جس میں چند بکھرے ہوئے بالوں کی لٹیں اس کے چہرے کے گرد ہلکی سی سرگوشی کر رہی تھیں، اسے کسی پر اسرار پری کا روپ دے رہی تھیں۔

ایمان کے سراپے میں ایک خاموشی سی چمک تھی؛ اُس کے لباس کی نفاست اور پاجامے کی لطافت ایک عجیب سا توازن قائم کر رہی تھیں، جیسے کسی نازک خوشبو کی مانند جو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لے۔

اُس کے کانوں میں جڑے سفید کر سٹل کے جھمکے رات کی خاموش چمک کو اپنے اندر قید کر رہے تھے، اور اُس کی انگلی میں جڑی انگوٹھی شب کے تارے کی طرح چمک رہی تھی۔

جب ایمان نے رات کے سنسان رستوں پر قدم رکھا، تو وہ خود ایک چلتا پھرتا استعارہ بن چکی تھی، حسن اور اسرار کا مجسم پیکر۔ اس کے وجود میں ایک خاص کشش تھی، جیسے چاندنی رات میں کوئی خوابیدہ پر چھائیں حرکت کر رہی ہو۔

وہ خوبصورتی سے سفید جالی دار دوپٹے کو اپنے شانوں پر اوڑھے ہوئے تھی، جو کسی بادل کی مانند اس کے گرد ہلکا سا لہرا رہا تھا، جیسے اُس کی روح کو ڈھانپ رہا ہو، نہایت سادگی اور وقار کے ساتھ۔

ایمان کی موجودگی میں چاند کی چمک کا احساس تھا، حالانکہ رمضان کی آخری راتوں کا چاند غائب تھا، مگر اس کے دل کی روشنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہی تھی۔

ہر قدم جو وہ اٹھا رہی تھی، اُس کے ایمان کا غماز تھا، جیسے اُس کی عقیدت زمین پر نقوش بنا رہی ہو۔ وہ ایک بے کراں خاموشی میں غرق، کسی پوشیدہ روحانی رہنما کے انتظار میں تھی، جو اس مقدس رات میں اُس کے لیے روشن ستارے کا کردار ادا کرے گا۔

یہ رات، جس میں اُس کے اطراف کی فضا دم بخود تھی، ایمان کے باطن میں چلنے والے طوفانوں کا گواہ بن رہی تھی۔ وہ اپنے سفر کی ہر موڑ پر اُس خاموشی کو گلے لگا رہی تھی، جو اُس کے دل میں بسی ہوئی عقیدت کے ہمراہ تھی۔۔۔

...°...

مولوی سرور کے خفیہ آستانے کے قریب پہنچتے ہی رات کی ہوا میں خوف کا سایہ گہرے بادل کی مانند چھا چکا تھا۔ ہر سمت سیاہ تاریکی میں لپٹی ہوئی تھی، گرے ہوئے پیڑوں نے اس پر اسرار عمارت کو نگاہوں سے پوشیدہ کر رکھا تھا، جیسے کوئی مکروہ راز سینے میں دبائے ہوئے ہو۔

صرف ایک سرخ، مکدر روشنی کہیں اندر سے رینگتی ہوئی نکل رہی تھی، جو فضا کو بھیانک سٹاٹے سے بھر رہی تھی۔

ہوا میں کچھ غیر مرنی سا بوجھ تھا، جیسے کسی تباہی کی پیشگوئی ہو۔

جب مولوی سرور کے چکر لگاتے قدموں نے ستارے کا طواف کیا، تو اندر کا منظر کسی خوفناک کا بوس سے کم نہ تھا۔ کمرے میں سرخی مائل روشنی پھیلی ہوئی تھی، اور ہر طرف پھیلا ہوا دھواں کسی شیطانی وجود کی موجودگی کا عندیہ دے رہا تھا۔ مولوی سرور ایک خونخوار مسکراہٹ کے ساتھ، دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا تھا، اُس کے ارد گرد بے شمار موم بتیاں جل رہی تھیں، جنہوں نے کمرے کے بیچ میں بنے شیطانی ستارے کی شکل میں ایک قلعہ سا بنا رکھا تھا۔ اُس کا ہر قدم اُس ستارے کے گرد کسی پراسرار سازش کا حصہ معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ کسی بدروح کو بیدار کر رہا ہو۔

کمرے کی فضا میں ایک مکدر سی دھمک تھی، جیسے کوئی نہ نظر آنے والی طاقت یہاں کی روحوں کو جکڑے ہوئے ہو۔

سائے خود بخود دیواروں پر لرزتے ہوئے، اپنی ہی دنیا کی الگ زبان بول رہے تھے۔ مولوی سرور کے لبوں سے نکلنے والی عجیب و غریب دعائیں، جو پراسرار اور خوفناک الفاظ سے لبریز تھیں، ہوا کو چیرتی ہوئی اُس تاریک وجود کو پکار رہی تھیں جو دیواروں کے بیچ پوشیدہ تھا۔

اُس کی نظریں دیوار کے اُس حصے پر جمی تھیں جہاں ایک بھیانک چہرہ نقش تھا۔

اس چہرے میں آنکھوں کی جگہ خالی گڑھے تھے اور اس کی پیشانی پر پراسرار سنسکرت میں لکھا ہوا تھا، جسے دیکھ کر دل کی دھڑکن لمحے بھر کے لیے رک سی جاتی تھی۔

دوسری مورتی کے بال سانپوں کی مانند الجھے ہوئے تھے اور اُس کی دائیں آنکھ غیر فطری طور پر اپنی جگہ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔

دیواروں پر شیطانی مجسمے نصب تھے، جو تاریکی کے وجود کا ثبوت دے رہے تھے، اور ہر چیز اُس کمرے کی پر اسراریت کو اور بڑھا رہی تھی۔

ایک بڑی، بھڑکتی ہوئی مشعل نے پورے حجرے کو سرخی مائل روشنی سے نہلا رکھا تھا، اور دیواروں پر بنے ہوئے نامعلوم نشانات مزید واضح ہو گئے تھے۔ کمرے کی فضا میں ایک عجیب سی ٹھنڈک تھی، جیسے وہاں موت کا سایہ منڈلا رہا ہو، اور کالا جادو ہر گوشے میں سرگوشیاں کر رہا ہو۔

ایسی پر اسراریت اور ہیبت ناک خاموشی میں، خوف اور حیرت کی انتہائیں ایک دوسرے سے جا ٹکرائی تھیں۔ مولوی سرور کی رسومات کے سحر میں جکڑے ہوئے، وقت نے بھی جیسے اپنا سفر روک دیا تھا، اور ہر شے اُس تاریکی کی قید میں تھی جس نے وہاں کا ہر گوشہ قابو کر رکھا تھا۔

اب کی بار اس منحوس حجرے میں مولوی سرور کی شیطانی رسم نے بھیانک شکل اختیار کر لی تھی۔ رات کے سناٹے میں گونجتی اُس کی سرگوشیاں اندھیرے میں عجیب سا جادو گھول رہی تھیں۔ جیسے ہی اُس نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے، کمرے کی فضا بو جھل ہونے لگی، گویا کوئی پوشیدہ قوت ہر شے کو اپنی گرفت میں لے رہی ہو۔ اس کی گہری، کپکپاتی آواز خاموشی کو چیرتے ہوئے گونجی، ”اے شیطانی طاقتوں، میری التجا سنو... میری مدد کرو! اے رب عز ازل میری فریاد کو سنو“ اس کا بدن جھومتا ہوا، اُس پتھر کی جانب

مڑا جس کے سامنے ایک بکرے کی کھوپڑی رکھی تھی، خون کے گاڑھے قطرے نیچے زمین پر ٹپک رہے تھے، جنہوں نے شیطانی ستارے کا خونی دائرہ مکمل کر دیا تھا۔

بکرے کی پیشانی پر سرخ سندور کا ایک بد صورت نشان چمک رہا تھا، گویا کسی بدروح کا سمبل ہو۔ ستارے کے گرد موم بتیاں مدھم روشنی کے ساتھ جل رہی تھیں، ان کی لرزتی روشنیوں نے کمرے میں شیطانی سائے گھول رکھے تھے جو دیواروں پر وحشت ناک رقص کر رہے تھے۔

اسی دوران، مولوی سرور کے سر کے اوپر شیطانی ستارہ آہستہ آہستہ گھومنے لگا، جیسے کسی پراسرار اور ماورائی قوت نے اسے حرکت میں لا دیا ہو۔

اُس ستارے کی ہر لکیر جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی،

زائچے کے علامات

(Zodiac signs)

ایک ایک کر کے فضا میں نمودار ہونے لگے۔

جب بچھو کا نشان نمودار ہوا تو اچانک ایک دیو قامت چمکدار بچھو ہوا میں ابھرا۔ وہ زہریلا وجود کچھ لمحے فضا میں معلق رہا، پھر دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا، جیسے کسی خطرناک مخلوق نے اپنا زہر ہوا میں بکھیر دیا

ہو۔

زائچے کی بقیہ نشانیاں بھی جلد ہی آہستہ آہستہ ایک کے بعد ایک ظاہر ہونے لگیں، ان کی شکلیں پہلے دھندلی تھیں، پھر تیز روشنی کے ساتھ واضح ہوئیں۔ ایک ہولناک دھماکہ خیز قوت کے ساتھ وہ نشانیاں تاریکی میں تحلیل ہونے لگیں، جیسے وہ قفس سے آزاد ہو رہے ہوں۔

کالا دھواں ہوا میں بے ترتیبی سے اڑتا ہوا بکرے کی کھوپڑی کے سوراخوں میں گھس گیا۔ یکا یک بکرے کی مردہ آنکھیں، جو بند تھیں، اچانک سرخ چمک کے ساتھ کھل گئیں۔ ایک منحوس روشنی ان سے پھوٹ رہی تھی جو پورے حجرے میں گونجتے ہوئے ڈراؤنے سائے پھیلانے لگی۔

بکرے کے کانوں سے دھواں لپک رہا تھا جیسے اُس کے اندر کی بدروحیں چھٹکارا پارہی ہوں۔ مولوی سرور کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ روشنی تھی۔ وہ چپ چاپ یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا، جیسے اُس کی کامیابی کی مہر ثبت ہو چکی ہو۔ اُس کی لبوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی، اور اُس نے پوری شدت سے کہا، ”گل بانو... میری ہو چکی!“۔

یہ کہنا تھا کہ پورے کمرے میں ایک وحشت ناک گونج پھیل گئی، جیسے کوئی غیبی قوت اس فتح کا جشن منا رہی ہو۔

بکرے کی کھوپڑی کے سامنے رکھی گل بانو اور احمر کی تصویریں ایک وحشت ناک منظر کی عکاسی کر رہی تھیں۔ گل بانو کی تصویر پر جادوئی نقوش اور عجیب و غریب علامتیں بنی ہوئی تھیں، دل کی شکل کے نشانات، عشق اور

محبت کی شیطانی گرفت میں جکڑے ہوئے۔

تصویر کے اوپر گل بانو کے اصل بال جڑے ہوئے تھے، جن پر ایک خفیف سی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں جانب ایک خالی انڈا رکھا تھا جس پر کسی پر اسرار زبان میں منحوس منتر کندہ

اچانک انڈا دراڑوں سے بھرا اور ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ اس کے اندر سے گاڑھا، خون کی طرح سرخ مواد بہہ نکلا اور سست روی سے گل بانو کی تصویر پر گرنے لگا، تصویر پر بہتے ہوئے

مایہ نے جیسے عشق کو پستی میں دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس احمر کی تصویر پر شیطانی علامتیں اور خوفناک اشکال بنی ہوئی تھیں، جیسے کہ بیماریوں کے منحوس نام چھری کے

زخموں کے نشان خون کی بکھری ہوئی

چھینٹیں، اور واضح طور پر لکھا تھا ”احمر یا گل ہو کر مر جائے گا۔“

احمر کی تصویر کے اوپر کتے اور خنزیر کا غلیظ پیشاب بہایا گیا تھا، جو اس تصویر کو اور بھی

زیادہ مکروہ اور منحوس بنا رہا تھا۔ کمرے کی فضا شیطانی بدبو سے بوجھل ہو گئی، ایک ناپاک بوجھ جو روحوں کو جکڑنے کے لیے کافی تھا۔

مولوی سرور، اپنے چہرے پر سور کا بھیانک ماسک پہنے ہوئے، کتے کے گوشت کے ٹکڑے کو بھیڑیے کی طرح چبانے لگا۔ اس کی نگاہیں جیسے احمر اور گل بانو کی تصویروں سے گڑھی ہوئی تھیں، جیسے وہ اپنی فتح کی

خوشبو لے رہا ہو۔ کمرہ جس میں اب تاریکی اور بدروحوں کی موجودگی محسوس کی جاسکتی تھی، ایک زہریلی
توانائی سے گونج رہا تھا۔

، بکری جس کی ایک آنکھ شیطانی اگ میں جل رہی تھی نے ایک بھانک آواز میں کلمات ادا کیے
۔ ”شیطان نے تمہاری خواہشات پوری کر دی ہیں۔“

اس کے الفاظ ہوا میں معلق ہو گئے، جیسے وہ شیطانی دنیا سے نکل کر مولوی سرور کو اُس کی کامیابی کی نوید
دے رہے ہوں۔

...°...

ایمان تھکی ماندی، ٹوٹے ہوئے قدموں کے ساتھ فٹ پاتھ کے کنارے پر بیٹھ گئی، اس کی آنکھوں سے
آنسو مسلسل بہہ رہے تھے، جیسے دل کے بوجھ نے زبان کی بجائے آنکھوں سے راستہ اختیار کیا ہو۔ رات کی
خاموشی اور سڑک کنارے مدھم روشنی میں اس کے آنسو کسی نایاب موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

اپنے گرد دنیا کے سامنے ایک مضبوط تصویر پیش کرنے والی ایمان، اب تنہائی میں اللہ کی بارگاہ میں بے بس
ہو کر اپنے غموں کا اظہار کر رہی تھی۔

اسی لمحے، اس کے دل کی دھڑکن تھم سی گئی جب اسے پیچھے سے ایک مدھم، مگر مانوس آواز سنائی دی،

- ”اپنے آنسو مت رو کو عبد اللہ، اللہ کے حضور بہنے والا ایک آنسو سمندروں اور جھیلوں سے زیادہ قیمتی ہے۔“

ایمان نے مڑ کر دیکھا تو بزرگ، روشن چہرے اور پرسکون مسکراہٹ کے اس کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔

ان کی آمد اچانک تھی، مگر ان کا چہرہ ایک سکون بھرا، روحانی نور منعکس کر رہا تھا۔

ایمان حیرانی اور تھوڑی سی ملامت کے ساتھ سوالیہ نگاہوں سے ان بزرگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی،

- ”آپ کہاں تھے؟ میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

بزرگ نے مسکراتے ہوئے نرمی سے جواب دیا، ”تم کیوں میرا انتظار کر رہی تھیں، جب اللہ تمہارے ہر قدم کے ساتھ ہے؟ وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ ہے، ہر گھڑی، ہر لمحہ۔“

ایمان نے گہرا سانس لیتے ہوئے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو پونچھا، اس کے چہرے پر شکستہ جذبات نمایاں تھے۔ ”آج، میرے ساتھ بہت برا ہوا ہے،“ اس کی آواز لرز گئی۔

بزرگ نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں جواب دیا،

- ”اس دنیا میں آزمائشیں انہی پر آتی ہیں جن کے دل اللہ کے قریب ہوتے ہیں، تاکہ وہ اپنی صبر اور استقامت کو آزمائیں۔“

ایمان نے اپنی کپکپاتی آواز میں اعتراف کیا،

”میں اکثر غصے میں جواب دے دیتی ہوں، اور بعد میں پچھتاوے کی آگ میں جلتی ہوں۔“

بزرگ نے تسلی دیتے ہوئے کہا، ”اللہ کو وہ لوگ محبوب ہیں جو اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں، اور اپنے دل میں پشیمانی محسوس کرتے ہیں۔“

ایمان نے سر جھکا کر دھیمی آواز میں پوچھا، ”کیا اللہ نے مجھے چھوڑ دیا ہے؟“

بزرگ کی مسکراہٹ اور بھی سکون بھری ہو گئی۔ ”جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں، اللہ انہیں کبھی فراموش نہیں کرتا۔“

پھر انہوں نے سوال کیا، ”کیا تم نے ابرہہ اور ہاتھی والوں کی داستان سنی ہے؟“

ایمان نے نفی میں سر ہلایا۔ بزرگ نے دانائی سے سر ہلاتے ہوئے سورۃ الفیل کی آیات کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا،

کیا تو نے نہ دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟

کیا ان کے مکر کو بے کار نہیں کر دیا؟

اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے

جو انہیں مٹی اور پتھر کی کنکریاں مار رہے تھے

پس انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا

قرآنی آیات کی روحانی طاقت فضا میں گونج رہی تھی۔ بزرگ نے ایمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا،

۔ ”جب اللہ نے ابرہہ کے بڑے لشکر کو معجزانہ طور پر مٹا دیا، تو وہ اپنے مومن بندوں کو کیسے بھول سکتا

ہے؟ اللہ تمہارے ساتھ ہے، اور وہ تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔“

ایمان نے اپنی نظریں نیچی کیے زمین کو گھورتے ہوئے مدھم آواز میں کہا، ”یہ دنیا اور اس کے باسی اتنے

بے رحم کیسے ہو سکتے ہیں؟“

بزرگ نے ایک نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ آسمان کی وسعتوں کو تکتے ہوئے جواب دیا،

۔ ”یہ دنیا محض ایک عارضی خواب کی مانند ہے، اسے زیادہ اہمیت مت دو۔ حقیقی حقیقت وہ دائمی دنیا ہے

جہاں جنت و دوزخ کے فیصلے ہوتے ہیں۔“

ایمان نے اپنے آنسو ضبط کر لیے، دل کی گہرائیوں میں چھپے درد کو لفظوں میں ڈھالتے ہوئے بولی، ”کبھی

کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس دنیا کا ہر شخص میری تکلیف کا سامان لیے گھوم رہا ہے۔“

بزرگ نے سکون بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا اور گہرے اطمینان سے کہا، ”یقین رکھو، اللہ ہی تمہارا کار ساز ہے۔ کوئی طاقت تمہیں رتی برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی، جب تک اللہ کا حکم نہ ہو۔“

ایمان اب بھی زمین پر نظریں جمائے، اپنے خیالات کے دھند لکوں میں گم، ہلکی سی آواز میں پوچھنے لگی،
”مگر مشکلات کیوں آتی ہیں؟“

بزرگ نے حکمت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ نرمی سے جواب دیا،

۔ ”مشکلات اللہ کی طرف سے بندے کی آزمائش ہیں، تاکہ مومن دنیا کی ظاہری دلکشی میں گم نہ ہو جائے۔ یہ فتنہ مومن کی روح کو سنوارنے اور آخرت کی حقیقت کی یاد دلانے کا ذریعہ ہیں۔“

پھر بزرگ نے قرآنی آیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ البقرہ ۱۵۵۔

۱۵۷

میں فرمایا:-

’اور ہم ضرور تمہیں کچھ خوف، بھوک، مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو۔‘

یہ وہ لوگ ہیں جو مصیبت کے وقت کہتے ہیں، 'بے شک ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔'

یہ ہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے درود اور رحمتیں ہیں، اور یہ ہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔
بزرگ کی باتوں نے ایمان کے دل کی گہرائیوں میں سکون کا ایک نیا احساس بیدار کر دیا، جیسے اس کے دل پر اللہ کی رحمت کی روشنی چھا گئی ہو۔

ایمان نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے گہری سانس لی، جیسے دل کی گہرائیوں میں کچھ سمجھ آ گیا ہو، مگر پھر بھی دل پر ایک بوجھ تھا جو اس کے سینے میں گھٹن پیدا کر رہا تھا۔

وہ بھرائی ہوئی آواز میں ان تمام دکھوں کو بہا دینا چاہتی تھی جو اس کے وجود پر بوجھ بن چکے تھے۔ دانا بزرگ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہے تھے، اور ان کے چہرے پر ایک سکون آمیز مسکراہٹ تھی۔

ایمان، آنکھوں میں بے اختیار آنسو لیے، کپکپاتی ہوئی آواز میں گویا ہوئی، "میری زندگی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جیسے میں بصارت سے محروم ہوں، نعبینا ہوں، اور کوئی روشنی میری رہنمائی نہیں کرتی۔"

بزرگ کی مسکراہٹ اب بھی تسلی بخش تھی، اس نے نرمی سے کہا، ”زندگی کے اندھیرے میں بھی ایمان کی روشنی سے اپنی راہ کو منور کرو۔ یہ وہ روشنی ہے جو تمہیں دنیا کے ہر سایے سے بچا سکتی ہے۔“

ایمان کی آواز میں لرزش بڑھ گئی، جیسے اس کے دل میں جمع ساری پریشانیاں باہر نکل رہی ہوں،۔ ”ہر کوئی مجھے ان گناہوں کی یاد دلاتا ہے جو میں نے کیے ہی نہیں۔ کوئی مجھے سمجھانے، رہنمائی کرنے کی زحمت نہیں کرتا، اور جو کرتا بھی ہے، اس میں محبت کی جگہ سختی ہوتی ہے۔“

بزرگ نے اپنی تسلی بخش مسکراہٹ برقرار رکھی، پھر حکمت بھری نگاہوں سے کہا،

۔ ”یہ دنیا انہی لوگوں سے بھری پڑی ہے، جو دوسروں کو ان کے عیب دکھاتے ہیں، مگر اپنے عیبوں پر پردہ ڈالے رکھتے ہیں۔ وہ خود کو درست کرنے کی بجائے دوسروں پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ مگر یاد رکھو، اللہ کی نظر میں، حقیقی انصاف وہ ہی کر سکتا ہے جسے خود اپنے اعمال کا ادراک ہو۔“

پھر بزرگ نے نرمی سے کہا، ”میں نے اندھیری راتوں میں گناہ گاروں کو اللہ کے حضور مغفرت مانگتے دیکھا ہے، اور دن کے اجالے میں عبادت کرنے والوں کو ایسی برائیوں میں ملوث دیکھا ہے جنہیں وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ تو بتاؤ، عبد اللہ، بہتر کون ہوا؟ وہ جو لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں، یا وہ جو دنیا کی آزمائشوں کا سامنا کرتے ہیں؟“

ایمان کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا،

۔ ”بزرگ، میری زندگی آزمائشوں کا میدان بن چکی ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ بہتر انسان بن جاؤں۔ اگر اللہ مجھے معاف کر دے تو مجھے موت کا خوف نہیں رہے گا، لیکن اب تو میں دعا بھی نہیں کر سکتی۔ کبھی لگتا تھا جنت کی کنجی حاصل کرنا آسان ہے، لیکن آپ نے مجھے سکھایا کہ جنت کی کنجی دراصل دل کا سکون ہے۔ ایسا سکون جو دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہے اور آدمی کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کب نصیب ہوا۔ لیکن یہ سکون کیا ہے؟ اور مجھے اتنی آزمائشوں میں کیوں ڈالا جا رہا ہے؟“۔

بزرگ نے اس کی بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا، ”اللہ اپنے محبوب بندوں کو آزمائشوں میں ڈالتا ہے تاکہ ان کی طاقت اور صبر کا امتحان لے۔ مشکلات تمہارے اندر کی روشنی کو اور بھی چمکدار بنا دیتی ہیں۔ وہ سکون جو تمہیں مطلوب ہے، وہ اللہ کی رضا میں چھپا ہوا ہے، اور جب تم اس کو پا لو گی، تو دنیا کی کوئی مشکل تمہیں بے چین نہیں کرے گی۔“۔

ایمان نے اپنی معصوم سی آواز میں سوال کیا، ”آزمائشیں کیوں آتی ہیں؟“۔

بزرگ مسکراتے ہوئے بولے، ”یہ دنیا امتحان کا میدان ہے، اور امتحان میں آزمائشیں تو لازم ہوتی ہیں، عبد اللہ۔ ہر چیز کچھ نہ کچھ مانگتی ہے۔ جنت بھی تقویٰ اور صبر کی قیمت چاہتی ہے۔ وہ ذاتِ باری انسان کو آزمانا چاہتی ہے۔ کبھی دکھ کے سانچے میں، کبھی درد کے ذریعے، کبھی خوشیوں اور آسائشوں کے ذریعے۔ کبھی مال و دولت سے، کبھی محرومی سے۔ لیکن یاد رکھو، اللہ اپنی مخلوق کو اس کی برداشت سے زیادہ کبھی

آزمائش میں نہیں ڈالتا۔ وہ ذات تمہیں تمہاری حقیقت سے زیادہ جانتی ہے، تم سے زیادہ تمہاری قوتوں اور کمزوریوں کا علم رکھتی ہے۔”

ایمان کا دل درد سے بوجھل تھا، اس نے آہستہ سے اپنے دل کا حال بزرگ کے سامنے بیان کیا، ”آج میں نے روزہ رکھا تھا، لیکن دعا پڑھنا بھول گئی۔ میرے ارد گرد کوئی ایسا نہیں تھا جو مجھے رہنمائی کرتا۔ میرے باپ کی دوسری بیوی نے سب دیکھا لیکن مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ میں نے صرف پانی پیا، اور سارا دن بھوکی پیاسی رہی۔ افطار کے وقت میری ماں نے کہا کہ میں نے روزہ افطاری کی دعا نہیں پڑھی، اس لیے میرا روزہ قبول نہیں ہوا۔”

بزرگ نے محبت اور تسلی کے ساتھ ایمان کی جانب دیکھا، ”عبداللہ، اللہ دل کی نیت کو دیکھتا ہے۔ اعمال کا مدار نیت پر ہوتا ہے۔ بعض اوقات خاموشی بھی ایک ایسی عبادت ہے جسے فرشتے نہیں لکھ سکتے اور شیطان بگاڑ نہیں سکتا۔ وہ دل کی فریاد سننے والا ہے، تمہاری دعا تمہارے لبوں سے نہیں نکلی لیکن اللہ کے نزدیک پہنچ چکی ہوگی۔ کیا تمہیں معلوم ہے، شاید تم ان خوش نصیبوں میں سے ہو جن کا روزہ اللہ کی بارگاہ میں سب سے اعلیٰ درجے کا ہو۔”

ایمان کا دل جیسے کسی گہرے سکون کی تلاش میں تھا، وہ روہانسی ہو کر بولی، ”میرے دل کو سکون نہیں ملتا، بزرگ۔ بتائیں، دل کا سکون کیسے حاصل ہوتا ہے؟”

بزرگ نے ایک گہری، تسلی بخش نظر اس پر ڈالی اور کہا، ”سکون کی کنجی دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوتی ہے۔۔ تم جلد ہی اس کنجی کو پالو گی، اور جب تمہیں یہ مل جائے تو اسے کبھی گنوا نا نہیں۔“۔

ایمان نے حیرانی اور تڑپتی نظروں سے ان بزرگ کی جانب دیکھا، جیسے وہ اس راز کی مزید وضاحت چاہتی ہو۔ بزرگ نے دھیمے لہجے میں مزید کہا،

۔ ”شاید تمہارے لیے مستقبل میں کنجی کی ضرورت ہو گی۔، اور جب تمہیں وہ کنجی نصیب ہو گی، تو یہ دنیا اور اس کے دکھ تمہارے دل سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیں گے۔“۔

ایمان نے لرزتی ہوئی زبان سے اپنے دل کی گہرائیوں کا اظہار کیا، جیسے کہ اس کا مضبوط دل ایک پل میں پگھل گیا ہو۔ بزرگ کی موجودگی میں وہ، وہ ایمان نہیں تھی جسے دنیا جانتی تھی — سخت دل، مضبوط اور نڈر۔

وہ اب موم کی طرح نرم اور نازک ہو چکی تھی۔ اُس نے دھیرے سے اعتراف کیا، ”میں بہت ڈرتی ہوں، بزرگ۔“۔

بزرگ نے مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا، ”عبداللہ تم کس چیز سے ڈرتی ہو؟ کس چیز کو کھونے کا ڈر ہے تمہیں؟ یاد رکھو، اس دنیا کی کوئی چیز تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ جو چیز تمہیں فکر میں مبتلا کرے، وہ یہ ہونی چاہیے کہ تم کہیں اللہ کی رضا اور اپنے ایمان کو نہ کھو بیٹھو۔ بس اس کا ڈر رکھو۔ اس دنیا کی سب چیزیں

فانی ہیں، مگر تمہارا ایمان، تمہارے اچھے اعمال، تمہارا تقویٰ اور اخلاص، یہ وہ چیزیں ہیں جو تمہارے ساتھ آخرت میں جائیں گی۔ ان کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔”

ایمان نے سر ہلایا، اس کی آواز میں لرزش تھی، ”بالکل ایسا ہی ہے۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے کہ میرا دل کہیں سخت نہ ہو جائے۔“

اس نے پھر اپنے جذبات کا مزید اظہار کیا، ”کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے میرا دل پتھر ہو گیا ہو، اور پھر کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ بس ٹوٹ کر رونا چاہتی ہوں، لیکن آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آتے۔“

بزرگ نے اس کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے شفقت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”یاد رکھو، انسانی جسم میں ایک ٹکڑا ہے جسے دل کہا جاتا ہے، اگر وہ صحیح ہو تو پورا جسم صحیح ہو جاتا ہے، اور اگر وہ خراب ہو جائے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ اسے پاکیزگی میں رکھو، سب کچھ بہتر ہو جائے گا۔ اور اگر تمہیں زندگی کے امتحان اور مشکلات مشکل لگنے لگیں، تو ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام کی قربانیوں کو یاد کرو۔“

بزرگ نے مزید کہا، ”فرعون کی بیٹی کی خادمہ کا قصہ سن رکھا ہے؟ وہ مومنہ جس کے ایمان کی پختگی اتنی تھی کہ جب اس نے اپنا ایمان فرعون کے سامنے ظاہر کیا تو فرعون نے اسے اور اس کے بچوں کو گرم تیل میں ڈالنے کی دھمکی دی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی آزمائش کتنی سخت ہے، لیکن اس نے اپنے ایمان کو نہیں

چھوڑا۔ یہاں تک کہ جب اس کے بچوں کو ایک ایک کر کے گرم تیل میں ڈال دیا گیا، اس نے اپنے ایمان کو بچائے رکھا اور آخر کار وہ خود بھی شہید ہو گئی۔ کیا وہ قربانی معمولی تھی؟”۔

بزرگ نے سانحہ کربلا کی یاد دلاتے ہوئے کہا، ”پھر اہل بیت کی عظیم قربانیاں بھی یاد کرو۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے خاندان نے اسلام کے لیے جو قربانیاں دیں، ان کا تصور بھی مشکل ہے۔ انہوں نے اپنے خاندان کو، اپنے بچوں کو قربان کر دیا، لیکن حق کا پرچم بلند رکھا۔ سانحہ کربلا ہمیں سکھاتا ہے کہ جب دین کی خاطر آزمائشیں آئیں تو استقامت اور صبر کا دامن تھامنا چاہیے۔“۔

بزرگ نے اپنے الفاظ میں گہری حکمت اور بصیرت رکھتے ہوئے کہا، ”اسلام ہم تک ان عظیم قربانیوں کے بعد پہنچا ہے، عبد اللہ۔ سیدھے راستے پر چلنا آسان نہیں ہوتا، مشکلات آئیں گی، آزمائشیں ہوں گی، لیکن اللہ کے راستے میں ثابت قدم رہنا ہی مومن کی اصل پہچان ہے۔“۔

ایمان نے ان باتوں کو اپنے دل میں بٹھاتے ہوئے سر جھکا لیا، جیسے ان کے الفاظ کی حکمت اس کے دل کو تسلی دے رہی تھی، اور اس نے اپنی روح میں ایک نیا عزم محسوس کیا۔

...°...

آسمان کی بے کنار وسعت میں، جیسے ہی ہم خلا کی گہرائیوں میں سفر کرتے ہیں، نیچے کی دنیا ایک چھوٹے سے نقطے کی مانند دکھائی دیتی ہے۔ نیلے اور سفید بادلوں کی تہیں، سمندروں کے بے کر ان نیلے رنگ، اور

خشک زمینوں کے مختلف رنگ، یہ سب ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہوئے ایک وسیع، حیران کن منظر پیش کر رہے ہیں۔

جیسے جیسے ہم زمین کے گرد مدار میں تیز رفتاری سے سفر کرتے ہیں، دن اور رات کے درمیان حد واضح ہوتی ہے۔ ایک طرف روشن سورج کی روشنی میں نہایا ہوا نصف کرہ ہے، جہاں دن کی روشنی چمک رہی ہے، جبکہ دوسری جانب رات کی تاریکی اپنے سایے پھیلا رہی ہے۔

یہ تاریکی اور روشنی کا سفر ہمیں نیچے زمین کی طرف لے جاتا ہے۔ زمین کے بادلوں میں گھومتے ہوئے، ہم تیزی سے نیچے آتے ہیں۔ جیسے جیسے ہم زمین کے قریب ہوتے ہیں، ایک خطہ ہمارے سامنے واضح ہوتا جاتا ہے۔ یہ سویڈن ہے، یورپ کے شمال میں واقع ایک ملک، جو جون کی رات کی خاموشی میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب سویڈن میں رات اپنے عروج پر ہوتی ہے، اور آسمان پر ستارے جھلملا رہے ہوتے ہیں۔

پاکستان میں اس وقت صبح کے 3 بجے کا وقت ہے، جبکہ سویڈن میں وقت رات 11 بجے ہے۔ موسم گرما کا وقت ہے، اور سویڈن میں رات کی تاریکی اپنے جو بن پر ہے۔

اسٹاک ہوم کی سڑکوں پر سناٹا چھایا ہوا ہے، اور وہاں کے جنگلات اپنی پرسکون اور پرسرار خوبصورتی میں محو ہیں۔

ایک و نیٹج طرز کی گاڑی سفر کرتے ہوئے سویڈن کے گھنے جنگلات میں داخل ہوتی ہے۔ دیودار کے درختوں کی قطاریں گاڑی کو دونوں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی مدد سے روشنی ان درختوں کے طویل اور خوفناک سائے ڈال رہی ہیں۔

یہ سڑک تنگ اور سنسان ہے، جہاں کہیں کوئی انسانی زندگی نظر نہیں آرہی۔ درختوں کے درمیان سے گزرنے والی یہ سڑک سیدھے سویڈن کے جنگل کے دل کی طرف جاتی ہے۔

اندھیری رات میں، ہوا میں عجیب سی ٹھنڈک اور خاموشی ہے۔ گاڑی کی روشنی میں ایک تنہا بلی نظر آتی ہے، جس کی چمکدار سبز آنکھیں روشنی کے ساتھ چمک رہی ہیں۔

بلی کا ایک حرکت کرتی ہے اور نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ اس لمحے کی خاموشی اور پراسراریت میں صرف دور سے سمندر کی لہروں کے ٹکرانے کی مدد سے آواز سنائی دیتی ہے، جو اس جنگل کے قریب موجود ساحل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

آدھی رات کی ہوا میں ایک عجیب سا سکوت تھا جب و نیٹج کار سمندر کے کنارے آکر رکی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا، اور اندر سے ایک لمبا، شاندار شخصیت آہستگی سے نمودار ہوئی۔

اس کا سراپا ایک خاص کشش اور دلکشی سے معمور تھا، جیسے کسی قدیم فن پارے کی طرح تراشا ہوا ہو۔ وہ سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا، جس پر ایک لمبا کوٹ بڑے وقار کے ساتھ اس کے چوڑے کندھوں سے لٹکا ہوا تھا۔

اس کے ہاتھوں پر چمڑے کے سیاہ دستانے جڑے تھے، جو اس کی فطری مہارت اور نفاست کو مزید نمایاں کر رہے تھے۔

اس کے پیروں میں سیاہ کوبرا کی جلد سے تیار کیے گئے چمکدار جوتے تھے، جو اس کے ہر قدم کو ایک خاص قوت اور استحکام دے رہے تھے، جیسے وہ جس زمین پر قدم رکھتا ہو، وہ اس کے اختیار میں ہو۔

اس کے سر پر ایک ونیج انداز کی سیاہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی، جس کا سایہ اس کے چہرے کے نصف حصے پر تھا، جس سے وہ مزید پراسرار لگ رہا تھا۔

مدھم روشنی میں اس کی فندق رنگ کی آنکھیں چمک رہی تھیں، گہری اور چھیدنے والی، جیسے وہ ہزاروں راز اپنے اندر چھپائے بیٹھا ہو۔

اس کے ہونٹوں کے درمیان ایک سگار پھنسا ہوا تھا، جو اس کی انگلیوں میں بڑی نفاست سے گھوم رہا تھا۔ اس نے سگار کا گہرا کش لیا اور دھواں ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ فضا میں چھوڑا۔

اس کے چہرے پر خود اعتمادی اور اختیار کی ایک ہوا تھی، جیسے اس دنیا کی ہر چیز اس کے سامنے حقیر ہو۔

وہ آہستگی سے ساحل پر لنگر انداز ایک فیری کی طرف بڑھا، اس کے قدموں کی چاپ جیسے لکڑی کے تختوں کو توڑتی جا رہی تھی۔

فیری کے تختے اس کے قدموں کے نیچے دبی دبی سی آوازیں نکال رہے تھے، لیکن وہ بے خوف اور بے پرواہ چلتا رہا، جیسے سمندر کی گہرائیاں بھی اس کے تابع ہوں۔

سمندر کی لہریں اس کشتی کو آہستہ آہستہ آگے بڑھا رہی تھیں، اور ہوا میں ایک پراسرار سکوت طاری تھا۔ دور، اسٹاک ہوم کا جنگل اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا، اور وہ شخص خاموش سمندر کی وسعت میں تنہا کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ تھی، جیسے وہ کسی بڑے راز کا محافظ ہو۔

ایک وفادار نوکر، خاموشی سے اس کے قریب آیا، دنیا کی نایاب ترین شراب، آرکٹک ایل سے مزین ایک ٹرے اس کے سامنے پیش کی۔

اس شخص نے آہستگی سے شراب کا گلاس اٹھایا، اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی، اور اس نے سگار کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی ہوا میں گلاس کو بلند کیا۔

اس کی انگلی میں ایک چمکتی ہوئی بھیڑیے کی شکل کی انگوٹھی تھی، جس کی سرخ چمک مدھم روشنی میں مزید نمایاں ہو رہی تھی۔

اس نے ایک لمحے کے لیے شراب کا گھونٹ لیا، جیسے وہ اس لمحے کو محسوس کر رہا ہو، اور پھر ایک نرم اشارے سے نوکر کو رخصت کر دیا۔

سمندر کی لہریں اب ذرا تیز ہو گئی تھیں، لیکن اس پر اسرار شخصیت کے چہرے پر سکون تھا، جیسے وہ ان لہروں کے شور میں بھی اپنے خیالات میں گم ہو۔

سگار کا دھواں ہوا میں پھیل رہا تھا، اور سمندر کی وسعت میں وہ تنہا کھڑا تھا، جیسے ایک بادشاہ اپنے تخت پر۔

یہ آدمی کون تھا؟ کیا راز وہ ان گہرے سمندروں میں لے جا رہا تھا؟ اور اس کا مقصد کیا تھا؟ ان سوالات کے جواب ابھی تک پردہ راز میں تھے، لیکن فضا میں ایک عجیب سا تناؤ اور تجسس چھایا ہوا تھا، جیسے وقت کے ساتھ ساتھ وہ راز بھی کھلنے والا ہو۔

جب فیری جزائر کے درمیان خاموشی سے پھسلتا ہوا گہرے سمندری پانیوں کو پار کر رہا تھا، تو یہ مناظر براعظموں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی مانند لگتے تھے، جنہوں نے صدیوں کی بے حسی میں ڈوب کر اپنی شناخت کھودی ہو۔

سمندر کی مہیب گہرائیوں نے فیری کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا، اور آنکھوں سے او جھل ہوتے ہی ایک عجیب سی سنسنیٹ فضا میں تیر گئی، جیسے کسی پرانے خواب کی گونج، جو جاگتے میں بھی اپنا سایہ چھوڑ گیا ہو۔

اس پر اسرار سفر کا مرکز کردار، اپنی نفاست بھری خود اعتمادی میں لپٹا، ویسے ہی اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔

اس کے ارد گرد کا ماحول پر اسرار خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا، جہاں ایک بھی مکڑی کا جال تننے کی آواز اس سکوت کو نہیں توڑ سکتی تھی۔ گاڑی دھیرے دھیرے اس جادوئی جزیرے کے اندرونی حصوں میں داخل ہو رہی تھی، جنگل کی گہرائیوں سے گزر رہی تھی، جس کے درختوں کی شاخیں اُس کے راستے کو گہرے سائے میں چھپا رہی تھیں۔۔۔۔۔

اچانک، ایک سانپ اس کے راستے میں پھسلتا ہوا آیا، لیکن اُس کے قدم کی طاقت اور کوبرا کی کھال سے بنے جوتے کے نیچے وہ سانپ کچلا گیا، جیسے اس کی زندگی کبھی تھی ہی نہیں۔ وہ بے رحمی سے آگے بڑھا، اس کے قدموں نے خون کی سرخ لکیر چھوڑ دی، لیکن اس کی آنکھوں میں وہ ہی سرد اور بے حس چمک تھی۔

کوئی پچھتاوا، کوئی ہچکچاہٹ نہیں، جیسے فطرت کی ہر چیز اس کے راستے میں ایک مہرہ ہو، جسے وہ بے دردی سے روندنا چلا جائے۔

آگے ایک قد آور درخت اس کے سامنے کھڑا تھا، جس کے ارد گرد انگور کی بیلین لپٹی ہوئی تھیں، گویا صدیوں سے اسے قید کیے ہوئے تھیں۔

اس نے اپنی گہری، چھیدتی نگاہوں سے درخت کا جائزہ لیا اور ایک اشارے سے بیلوں کو الگ کیا، جیسے وہ اس کے حکم کے منتظر تھے۔ جب وہ بیلین ہٹیں، تو اندر ایک چھپے ہوئے دروازے کا انکشاف ہوا۔

اُس نے اپنی انگلیوں میں پکڑے خفیہ کارڈ کو درخت کی جڑوں کے پاس رکھ دیا، اور درخت کا بھاری دروازہ ایک پراسرار سرسراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔

اس نے قدم اندر رکھا، جیسے وہ اس پراسرار مقام کا مالک ہو، جیسے اس کے لیے یہ سب پہلے سے طے شدہ تھا۔

اس کے قدموں کی آواز خاموشی کو توڑتی، لیکن فضا میں ایک عجیب سا تجسس برقرار تھا۔ سایے اپنی جگہ سے سرکتے رہے، جیسے اُس کی موجودگی کا اعتراف کرتے ہوں۔

اندرونِ کمرہ تاریکی اور پراسراریت کی ملی جلی کیفیت نے اُس کے وجود کو اور بھی زیادہ طاقتور بنا دیا تھا۔ یہ جگہ گویا ایک رازدار حرم تھی، جہاں ہر چیز اُس کے اختیار میں تھی، لیکن اُس کے چہرے پر چھائے رعب کی لکیر نے واضح کر دیا کہ اس مقام کے ہر راز کا مالک وہ ہی تھا۔

اس نے دھیرے سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، اور اپنی انگوٹھی کی سرخ چمک کو ایک آخری نظر سے دیکھا، جیسے اسے یقین تھا کہ یہ لمحہ ہمیشہ کے لیے قائم رہنے والا ہے۔

جب وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا تو ماحول ایک پراسرار اور خفیہ ملاقات میں ڈھل گیا، جیسے کائنات کے کسی ناپید گوشے میں ایک پوشیدہ سنگم وقوع پذیر ہو رہا ہو۔

یہ زیرِ زمین مقام شطرنج کے بساط کی مانند نظر آ رہا تھا، جس کی سیاہ اور سفید ٹائلوں سے ایک عجیب سی روشنی پھوٹ رہی تھی، جیسے یہ خود ایک راز کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو۔ اُس کے قدموں کی آہنگ دیواروں میں گونج رہی تھی، جیسے ہر قدم کے ساتھ فضا میں ایک پراسرار سرگوشی شامل ہو رہی ہو۔

سامنے کا راستہ بلند ستونوں کے درمیان پھیلا ہوا تھا، جن سے دھیرے دھیرے ہلتی ہوئی لالٹینیں ایک مدھم اور غیر مرئی روشنی پھیلا رہی تھیں۔

ستونوں کی بلندیاں گمشدہ تھیں، جیسے یہ روشنی اندھیروں میں ایک نامعلوم مقام تک جا رہی ہو۔ یہ ستون ایسی مخلوقات کی تصاویر سے مزین تھے جو کسی غیر دنیاوی عالم کا حصہ معلوم ہوتے تھے۔

جیسے ہی وہ آگے بڑھا، اُس کی آنکھیں اس پراسرار مقام کی ہر تفصیل کو اپنے اندر جذب کرتی جا رہی تھیں۔ اُس کے چہرے پر ایک سنہری شیر کا ماسک سجا ہوا تھا، جس کی خوفناک آنکھوں کے سوراخوں سے جھانکتی روشنی اس کی غیر معمولی شخصیت کو اور زیادہ نمایاں کر رہی تھی۔

ہر قدم کے ساتھ کمرے میں موجود لوگوں کی نظریں اس پر جمتی جا رہی تھیں، جن کی اپنی شناخت بھی چھپی ہوئی تھی۔

اس بڑے کمرے کے درمیان ایک وسیع و عریض میز بچھا ہوا تھا، جس کے ارد گرد مختلف حیوانات کے نقاب پہنے پراسرار شخصیات موجود تھیں۔ ہر ماسک ایک جانور کی شکل کا تھا، جیسے یہ لوگ کسی قدیم علم کے نگہبان ہوں۔

سیاہ پتلون اور سفید قمیضوں میں ملبوس نقاب پوش خادین دیواروں کے ساتھ خاموشی سے کھڑے تھے، ان کے چہروں پر چمڑے کے ماسک اور ہاتھوں میں سیاہ دستانے تھے، گویا وہ کسی پوشیدہ طاقت کے ماتحت تھے۔

وہ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھا، اس کی آنکھیں دیوار پر موجود ایک پرانی تصویر پر مرکوز تھیں۔ وہ تصویر ایک اہرام کی تھی، جس کے اوپر ایک بڑی آنکھ موجود تھی، ایک ایسی آنکھ جو ہر چیز کو دیکھ رہی ہو، جیسے اس کائنات کا ہر راز اس میں چھپا ہو۔

یہ نشان فری میسنز یا ایلومیناتی کا تھا، جن کا مقصد کائناتی بصیرت کو اپنے قابو میں کرنا تھا۔

یہاں موجود لوگ کوئی عام انسان نہیں تھے، بلکہ وہ خفیہ سازشی بھائی تھے جو اپنی طاقت اور عقل سے دنیا کے معاملات کو کنٹرول کرتے تھے۔

ان کے درمیان ہونے والی سرگوشیاں سازشوں کی داستانوں کو ہوا دے رہی تھیں، اور وہ ہر لمحے کسی عظیم راز کا پردہ فاش کرنے کی راہ پر گامزن تھے۔ ہر اشارہ، ہر نظر، ہر سانس ایک راز کو چھپانے اور کھولنے کا اشارہ دے رہی تھی۔

کمرے میں موجود ہر شے اسرار کی علامت تھی۔ ستونوں سے لٹکتے چراغ، نقاب پوش حاضرین، اور اس پر اسرار ڈرامے کی روشنی میں دھکتے ہوئے ماسک۔

جب پر اسرار بوڑھا آدمی خاموشی سے اس پر اسرار شخصیت کی طرف مڑا، اُس کے لبوں سے نکلتے انگریزی الفاظ کمرے کی گھمبیر فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر گئے۔

۔ ”تمہارا انتظار تھا، گونار“، اُس نے مدھم اور سرد لہجے میں کہا، جیسے ہر حرف کے ساتھ کوئی گہری چال پوشیدہ ہو۔

گونار نے اپنی نظریں تیز کر لیں، اور اُس کی بھاری، پرکشش اور رعب دار آواز کمرے میں گونجی، جیسے اُس کے الفاظ خود ایک حکم نامہ ہوں۔

۔ ”اس خفیہ ملاقات کے پیچھے کیا وجہ ہے؟“ اُس کا سوال کوئی سادہ سوال نہ تھا، بلکہ اُس میں ایک گہری استفسار اور ہدایت کا رنگ تھا۔ اُس کی آواز میں جو وقار تھا، وہ کسی کو بھی ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔

بوڑھا آدمی لمحے بھر کے لیے خاموش ہو گیا، جیسے اُس کے الفاظ کا وزن جانچ رہا ہو۔ اُس نے حاضرین کو اشارہ کیا، اور سر جھکائے ہوئے نوکر، خاموشی سے قدم اٹھاتے ہوئے، کمرے سے باہر چلے گئے۔

دروازہ بند ہونے کے بعد، بوڑھے نے گویا اسرار کے پردے کو ہٹاتے ہوئے کہا، ”جیسا کہ آپ

سب جانتے ہیں، ایلومیناتی اور فری میسنرز

ایک ہی سکہ ہیں، دونوں کی قیادت شیطانی ایجنڈا کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم صرف ان کے پیادے ہیں، اُن کے احکام کے تابع۔ آج کا یہ اجلاس بھی انہی کے منصوبے کے تحت ہے۔”

۔ (ان کے مابین باہمی گفتگو کا واسطہ انگریزی زبان تھا کیوں کہ مختلف ممالک اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا اجتماع تھا، اس لیے بین البین مفاہمت و مکالمے کے لیے انگریزی کا استعمال لازم و ملزوم تھا۔)

اُس نے اپنا نقاب اتارا، اور دوسرے ارکان نے اس کی پیروی کی۔ اب نقاب اتارنے کی باری ان سب میں سب سے ممتاز کی تھی، جس کی موجودگی نے ایک پراسرار دلکشی کا ہالہ بنا دیا تھا۔

گونار نے آہستگی سے اپنے ماسک کو ہٹایا، اور جیسے ہی اُس کا چہرہ بے نقاب ہوا، کمرے میں موجود ہر ایک کی نظریں اُس کی طرف جم گئیں۔ وہ مردانہ حسن کا مکمل نمونہ تھا، ایک خوبصورتی جو دیکھنے والے کو مسحور کر دے۔

اُس کی فندق رنگ آنکھیں گہرے جذبات کی عکاس تھیں، جیسے وہ کسی قدیم راز کو چھپائے ہوئے ہوں۔ اُن میں ایک ایسی شدت تھی جو اندرونی طاقت اور عزم کی کہانی سناتی تھی۔

اُس کے شاہ بلوطی

رنگ کے لہردار (ویوی) بال، نرم لہروں میں اُس کے چہرے کے گرد پھیلتے ہوئے، اُسے ایک پراسرار اور بے قابو دلکشی عطا کرتے تھے۔

اُس کا جڑانمایاں اور مضبوط تھا، جیسے یہ اُس کی شخصیت کی مضبوطی کا مظہر ہو۔ اُس کی ٹھوڑی پر ایک لطیف لکیر تھی، جو اُس کے چہرے کو منفرد اور کردار سے بھرپور بناتی تھی۔

اُس کی ناک، سیدھی اور نازک تناسب میں، اُس کے چہرے کی ہم آہنگی کو مکمل کرتی تھی، جبکہ اُس کے ہونٹوں کی قدرتی گلابی رنگت، ہلکی سی خمیدہ شکل میں، ایک مدعو مسکراہٹ پیدا کرتی تھی جس میں ایک غیر محسوس کشش پوشیدہ تھی۔

اُس کی رنگت گندم اور سفید کے امتزاج میں شفاف تھی، اور اُس کے گالوں پر ہلکی سی سرخی، اُس کی سویڈن نژاد کی وراثت کی دلکشی کو مزید اجاگر کرتی تھی۔

چوبیس برس کی عمر میں، گونار اُس خفیہ ملاقات میں حسن، طاقت اور اسرار کا مجسمہ تھا۔ اُس کی موجودگی نے کمرے کی ہر دیوار پر ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا، اور اُس کا چہرہ، جو مردانہ خوبصورتی کی بلند ترین مثال تھا، نہ صرف اس محفل کا مرکز تھا بلکہ ایک ایسی کشش کا بھی مظہر تھا جو ہر ایک کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

ادھیڑ عمر آدمی نے کمرے میں موجود دیگر ساتھیوں پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی، اور لبوں پر پھیلتی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ مدھم اور محتاط لہجے میں بولا، ”مسلمانوں کے تہوار میں شاید پانچ دن باقی ہیں، اگر تیس روزے ہوئے تو چھ دن، ورنہ پانچ۔۔۔ اور ہم نے اُن کے لیے ایک خاص ’تحفہ‘ تیار کیا ہے۔“

کمرے کی خاموشی میں ایک بے چینی نے جنم لیا، اور ایک پراسرار آواز، جو بظاہر امریکی لہجے میں تھی، سوال کرتے ہوئے گونجی، ”مذہبی لوگوں کے لیے تحفہ؟“

بوڑھے آدمی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی، اور اُس کی آنکھوں میں خطرناک چمک نمودار ہوئی، ”ایک ایسا تحفہ، جو دھماکے کی گونج کے ساتھ پھٹے گا۔“

گونار، جس کے چہرے پر ہمیشہ ایک پرسوج سنجیدگی چھائی رہتی تھی، اپنی کرسی کی پشت سے تھوڑا آگے جھکا۔ اُس کی نظریں بوڑھے آدمی پر مرکوز تھیں، اور اُس کی گونج دار آواز میں سردی اور سختی کا رنگ تھا، ”فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو، سیدھی بات کرو۔“

بوڑھے نے اپنی مسکراہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے، مزید آگے بڑھتے ہوئے کہا۔۔

۔، ”عید کے دن ہمارا ایک آدمی، موساد کا ایجنٹ، خود کو کرڈش فرد کے طور پر پیش کرے گا۔ وہ مسلمانوں کی مقدس کتاب کو عوامی جگہ پر نذر آتش کرے گا۔ اور یہ کوئی وقتی حادثہ نہیں ہوگا، بلکہ اُس کا یہ عمل بار بار دہرایا جائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ اُن کے (مسلمانوں) سامنے بارہا اُن کی مقدس کتاب کو جلایا جائے،

تاکہ اُن کی حساسیت کو کند کیا جاسکے۔ جب وہ بار بار یہ منظر دیکھیں گے، تو ایک وقت آئے گا کہ اُن میں سے کوئی بھی رد عمل ظاہر کرنے سے قاصر ہو جائے گا۔”

گونار کی ہنسی میں ایک عجیب طنز چھپا ہوا تھا، ”تمہیں واقعی یقین ہے کہ وہ پہلی ہی بار کوئی رد عمل ظاہر نہیں کریں گے؟ اور تمہارا خیال ہے کہ وہ اُس شخص کو زندہ چھوڑ دیں گے، جو اُن کے سامنے یہ سب کرنے کی جرات کرے گا؟”

کمرے کی فضا میں ایک لرزہ خیز خاموشی چھا گئی، جیسے ہر لفظ سانسوں میں چبھنے لگا ہو۔ بوڑھے کی مسکراہٹ بدستور برقرار تھی، اور اُس کی آواز میں ایک خبیثانہ خوشی کا عنصر شامل ہو گیا تھا، ”اسٹاک ہوم کی پولیس، آزادی اظہار کے پردے میں، اُس کے محافظ کے طور پر کام کرے گی۔ کوئی بھی اُس کے قریب آنے کی جرات نہیں کر سکے گا۔”

بوڑھے نے مزید کہا، ”یہ سب کچھ عید کی نماز کے فوراً بعد، مسجد کے باہر ہی ہو گا۔”

گونار نے خاموشی سے سر ہلایا اور بظاہر اطمینان کا اظہار کیا، ”میں فرض کرتا ہوں کہ حکومت کی بھی اس میں پوری منظوری شامل ہو گی۔”

بوڑھے کی آنکھوں میں ایک پراسرار چمک مزید گہری ہو گئی، ”صرف دو دن کے اندر، یہ واقعہ سوشل میڈیا پر آگ کی طرح پھیل جائے گا، اور حکومت کی خاموش رضامندی بھی ہمارے حق میں ہو گی۔”

کمرے میں ایک سیاہ سازش کی فضا چھا چکی تھی۔ ہر طرف نقاب پوش افراد نے اپنے گلاس اٹھائے، اور جیسے ہی ”چیزز“ کی مشترکہ آواز نے ماحول میں گونج پیدا کی، انہوں نے اپنی شیطانی منصوبہ بندی پر مہر لگادی۔

رات، جو پہلے ہی اسرار اور سازش کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی تھی، اور بھی تاریک ہوتی گئی، اور اُن کی خفیہ گفتگو کی سرگوشیاں کمرے کی چار دیواری میں گھومتی رہیں، جیسے کوئی ناپاک آندھی باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہی ہو۔

...°...

سازشوں کی دھند میں ڈوبا ہوا سویڈن اب پس منظر میں تھا، جب ایمان اسلام آباد کے ڈی ایچ اے کے اپنے پر شکوہ مکان میں قدم رکھتی ہے۔

گھر کی دہلیز عبور کرتے ہی، اُس کی نظریں کھانے کی میز کا رخ کرتی ہیں، جہاں سحری کے لیے جمع خاندان میں خوف اور بے یقینی کی فضا منڈلا رہی تھی۔ خالدہ اور ایمان کی سوتیلی بہنیں، ایک دوسرے کی آنکھوں میں تشویش اور تجسس کا امتزاج لیے خاموش بیٹھی تھیں، گویا وہ کسی ناپسندیدہ پیشگوئی کی منتظر ہوں۔

افطاری کے دوران پلیٹ کی ناگہانی حرکت نے خالدہ کے چہرے پر جو داغ چھوڑا تھا، اس کی تلخی ابھی تک اُس کے چہرے کی جھریوں میں موجود تھی۔

جتوئی، جواب ضبط اور غصے کی باریک لکیر پر کھڑا تھا، نے دھیمے لہجے میں ایمان سے استفسار کیا،۔ ”تم نے خالدہ کے منہ پر پلیٹ ماری تھی؟“ ایمان اس سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے نوکرانی مہران کو مخاطب کرتی ہے، ”مہران، دیسی گھی میں دوپراٹھے بھون دو، اور کل جون بطخ کے انڈے میں نے دیے تھے، وہ بھی پکاؤ اور جلدی لاؤ۔“۔ دفعۃً

نشت سنبھالتے اپنے باپ کی طرف نگاہ اٹھا کر، ایک سکون بھری آواز میں بولی، ”ہاں، میں نے خالدہ کے چہرے پر پلیٹ ماری تھی۔“۔

اُس کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس کی آنکھوں میں چمک سی دوڑ گئی۔ جتوئی کا ہاتھ میز سے ٹکراتا ہے، اور خاموشی کی چیخ اس کمرے میں سنائی دیتی ہے۔ وہ دھیرے سے بولا، ”خالدہ کے چہرے پر پلیٹ کا نشان ہے۔“۔

خالدہ کے چہرے کی طرف ایک نظر ڈال کر وہ مزید کچھ نہیں کہہ پایا۔

خالدہ گم سم، اس سارے منظر کو برداشت کرتی رہی۔ ایمان، اپنی نظریں جتوئی کی طرف گھماتی ہوئی، دلیری سے بولی، ”میں آج تک اپنی کمر پر گرم لوہے کے نشان اٹھائے پھرتی ہوں، کوڑے کے نشان اور چربی میں گھلے نیل کے داغ ابھی تک میرے سینے پر نقش ہیں، تو پھر اس تھال کے نشان کی کیا وقعت؟“۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد، ایمان نے اپنی آواز کو نرم کرتے ہوئے اپنے باپ سے کہا، جس نے شرمندگی سے نظریں چرائیں۔ اسی دوران مہران، پراٹھوں اور انڈوں کی پلیٹ لیے حاضر ہوئی اور ناشتہ کمرے میں موجود سب کو پیش کرنے لگی۔ جتنی نے ناشتے میں مشغول رہتے ہوئے ایمان کی باتوں کو نظر انداز کیا، گویا اس کی توقعات کے برعکس بات کا اثر ہوا ہی نہ ہو۔

خالدہ اپنے بیٹے میکائل کو دیکھتے ہوئے نرمی سے بولی، ”میکائل، اچھی طرح سحری کر لو۔“ ایمان نے پراٹھے کا ایک نوالہ لیتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا، ”ہاں، کھاؤ، روزہ ہوتے ہوئے تم اپنے دن کا آغاز ہی کوک کی بوتل اور سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ کرتے ہو۔“

میکائل نے ایمان کی بات کا جواب نہیں دیا اور چپ چاپ اپنی پلیٹ میں مشغول رہا۔ خالدہ، تناؤ محسوس کرتے ہوئے بولی، ”یہ میرے بیٹے اور اللہ کا معاملہ ہے، تیرا نہیں۔“

ایمان نے بے پروائی سے روٹی توڑتے ہوئے کہا، ”تو میرے معاملات میں دخل کیوں دیتی ہو؟ یہ بھی اللہ کا معاملہ ہے، تمہارا نہیں۔“

خالدہ، طنزیہ انداز اپناتے ہوئے بولی، ”بڑی محفلوں میں ناچنے والی تو اب ایک دن میں متقی کیسے بن گئی؟ کون سا انقلاب آیا ہے کہ تُو پارسا ہو گئی ہے؟“

ایمان نے مسکرا کر جواب دیا، ”دنیا کی پٹی اگر آنکھوں سے اتر جائے تو انسان کو اللہ بھی نظر آتا ہے اور اُس کی رحمت بھی۔ اور پھر اچھائی کا سفر لحاظ بھر میں شروع ہو جاتا ہے۔“

خالدہ کی بے یقینی اور بڑھ گئی، اور وہ سحری خاموشی سے کرنے لگی۔ ماحول میں بو جھل خاموشی چھا گئی، صرف دور سے آنے والے سائرن کی آواز اس خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ اذان کا وقت قریب آتے ہی سب نے پانی کے گھونٹ بھرے، اور دعائے سحر پڑھ کر روزہ بند کیا۔

ایمان اور خالدہ نے معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا، جب خالدہ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ اور پھر ایمان پر سکون انداز میں کھڑی ہوئی، سحر کی دعا پڑھتے ہوئے بولی: “وَبَصَّوْمٍ غَدٍ نُّؤِيْتُ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ۔”

خالدہ ششدر رہ گئی کہ ایمان نے عربی اتنی روانی سے کیسے سیکھ لی۔ وہ لاعلم تھی کہ ایمان کو کسی استاد نے اسلام کی گہرائیوں میں لے جانے والی رہنمائی فراہم کی تھی۔

ایمان نے نرمی سے اپنے بالوں کو جھٹکا دیا اور اعتماد کے ساتھ وہاں سے نکل گئی، پیچھے چھوڑ گئی حیرت زدہ خالدہ کو۔

...°...

وادیٰ ہنزہ کی خاموش و پراسرار فضاؤں میں، جہاں سورج کی سنہری کرنوں نے بلند و بالا پہاڑوں کو لمس بخشا تھا، ایک گھر خاموشی سے کھڑا تھا۔

یہ گھر لکڑی اور اینٹوں کی مشابہت سے تراشا ہوا تھا، ایک ایسے درخت کے سائے میں جو جیسے صدیوں سے ان پہاڑوں کا راز دار ہو۔ ارد گرد کی زمین سبز گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی، جس میں پھول اپنی خوشبو اور رنگوں کے راز بکھیر رہے تھے۔

لیکن اس فطرت کی خوبصورتی میں ایک چھپا ہوا اندھیرا بھی تھا۔ پہاڑوں کے عقب میں موجود خوفناک بلندیوں کی چوٹیاں بادلوں میں چھپی ہوئی تھیں، جن کے پیچھے جیسے کسی غیبی قوت کا وجود تھا جو انسانی آنکھوں سے اوجھل تھا۔

فضا میں پرندوں کی چہچہاہٹ اور جانوروں کی مدھم آوازیں تو تھیں، لیکن ان میں ایک عجیب سا کھنک بھی تھی، جیسے کچھ چھپ کر دیکھ رہا ہو، خاموشی کے پردے کے پیچھے کوئی قوت حرکت کر رہی ہو۔ اس گہرے سکون میں احمر کی مدھم، کھر در کی کھانسی گونج اٹھی، جیسے اس پر سکون وادی میں کوئی انجانا خطرہ سراٹھا رہا ہو۔

احمر اپنی کمر پر خشک گھاس کی بوری کا بوجھ لادے دھیرے دھیرے چل رہا تھا، اس کے قدموں کی چاپ بوجھل تھی اور اس کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔

گل بانو، جو احمر کی خراب حالت کو دیکھ کر بے چین ہو چکی تھی، اس کے قریب آتے ہوئے بولی، ”احمر، آج کام چھوڑ دو۔ تمہاری حالت کل سے بگڑ رہی ہے۔“ اس کی آواز میں خوف اور پریشانی کی لہر تھی۔

احمر کی سانسیں جیسے کٹے ہوئے تار کی طرح بکھر رہی تھیں۔ اس کی زرد ہوتی ہوئی جلد، مسلسل کھانسی، اور آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے کسی اور ہی دنیا کی کہانی سنارہے تھے۔ اُس کی حالت کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے گل بانو کے دل میں اندیشے سر اُٹھانے لگے۔

احمر نے تھکی ہوئی، کھر دری آواز میں جواب دیا، ”اگر کام نہ کیا تو پیسے کہاں سے آئیں گے؟“۔ لیکن اس کی آواز میں ایک کمزوری اور سرخی مائل لہجہ تھا جو کسی غیبی بیماری کی نشاندہی کر رہا تھا۔

اچانک، جیسے فضا میں کوئی نظر نہ آنے والی طاقت گھس آئی ہو۔ احمر کا جسم کانپنے لگا اور سوکھی گھاس کی بوری اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی، اُسے بھی اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے۔ وہ بے بس ہو کر زمین پر گرا، اور ایک بے چینی کی لہر فضا میں پھیل گئی۔

۔ ”احمر رر!“ گل بانو نے چیخ کر کہا، اس کی آواز میں ایک عجیب خوف تھا۔

۔ ”امی۔ امی، باہر آئیں!“ اس کی آواز ہنزہ کے خاموش پہاڑوں سے ٹکرائی، جیسے کسی ناگہانی آفت کی آمد کا اعلان ہو رہا ہو۔

احمر کی ماں، اپنے روایتی فراک میں لپٹی، سر پر دوپٹہ باندھے، جلدی سے باہر نکلی۔ جیسے ہی اُس کی نگاہ اپنے بے ہوش بیٹے پر پڑی، اُس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔۔ ”احمر، میرے بچے!“ اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا، اور اس کے قدم بو جھل ہو کر زمین میں پیوست ہو گئے۔

گل بانو، روتی ہوئی، احمر کی چھاتی پر زور زور سے مالش کرنے لگی، ”احمر، اٹھو! خدا کے واسطے، اٹھو!“ لیکن جیسے ہی وہ احمر کو ہلانے کی کوشش کر رہی تھی، اچانک فضا میں ایک سرد اور وزنی سناٹا چھا گیا۔ فضا میں کہیں سے ایک عجیب، انسانی نظروں سے اختفا سیاہ دھواں نمودار ہونے لگا، جیسے زمین کے نیچے دفن کسی پرانی لعنت کا سایہ ہو۔

اس سیاہ دھویں نے آہستہ آہستہ احمر کے گرد لپیٹ ڈال دی، اس کے ساتھ لپٹتے ہوئے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ گل بانو کی چیخیں اور احمر کی ماں کی دعائیں اس کالے دھویں کے غلبے میں دبنے لگیں۔ احمر کے ہونٹوں سے آہستہ آہستہ کچھ مدھم الفاظ نکلے، جیسے کسی پوشیدہ جادو کا اثر ہو۔

۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ گل بانو کی آواز کپکپانے لگی۔ اُس نے جلدی سے احمر کے گلے سے وہ تعویذ اتارا اور گھبراہٹ میں دور پھینک دیا، لیکن اس تعویذ کے زمین پر گرنے کے ساتھ ہی فضا میں سیاہ دھوئیں کی چادر اور گہری ہو گئی۔ جیسے کسی نادیدہ طاقت نے احمر کو اپنی قید میں لے لیا ہو، اور وہ لمحہ لمحہ اس کی زندگی چوس رہی تھی۔

احمر کی سانسیں ٹوٹ رہی تھیں، اور وہ اب موت کی دہلیز پر کھڑا تھا۔

کچھ ہی لمحوں کے بعد، ہوا میں کٹیلی خاموشی کو چیرتے ہوئے دور کہیں سے سائرن کی تیز اور دل دہلا دینے والی آواز ابھری۔ یہ اسپتال کے عملے کی آمد کا پیش خیمہ تھی، جنہوں نے تیزی سے آکر احمر کے نیم مردہ

جسم کو اسٹریچر پر لا دیا۔ فضاء میں بے چینی اور خوف کی لہر دوڑ رہی تھی، اور ارد گرد موجود بے حس و حرکت پڑوسی یہ منظر دیکھتے ہوئے ساکت کھڑے تھے، جیسے کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر ہو۔

جب احمر کو ایمبولینس میں لا کر ہسپتال روانہ کیا گیا، تو فضا میں ایک بو جھل خاموشی پھیل گئی۔ گل بانو اور احمر کی ماں آنکھوں میں خوف اور بے بسی لیے اُس کے قریب بیٹھی تھیں۔ ایمبولینس کا سائرن دردناک سسکیوں کی مانند ہوا کو چیرتا ہوا انسان گلیوں میں گونج رہا تھا، اب کی بار جو ان کے گھر میں آس پاس کے لوگ موجود تھے انہوں نے حیرت اور ہراس کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ واپسی کی راہ لی۔

جب تمام ہجوم منتشر ہو گیا اور گھر کا ہالہ خالی ہو گیا، وہاں اب ایک پراسرار خاموشی تھی، اور اُسی خاموشی میں ایک غیر مانوس سی لڑکی کھڑی رہ گئی، جیسے کسی آن دیکھے منظر کا خاموش گواہ ہو۔ اُس کا وجود، جیسے ہوا کے کسی بو جھل جھونکے میں دھندلا سا خواب معلوم ہوتا تھا، آہستہ آہستہ اُس جگہ کی طرف بڑھی جہاں کچھ دیر پہلے احمر موجود تھا۔

اُس کی لمبی، سیاہ قمیض ہوا میں مدھم سی سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی، جبکہ باریک میٹھ سوٹر اُس کے سر پہ پر نرمی سے لپٹا ہوا تھا۔ حجاب میں لپٹا ہوا اُس کا سر، جیسے اُس کی شخصیت کی گہرائی اور پراسراریت کو مزید ابھار رہا تھا۔

اُس کے چہرے کی دلکش مگر پراسرار خاموشی میں ایک گہری، پوشیدہ اذیت پوشیدہ تھی، جیسے اُس کی معصومیت کے نقاب کے پیچھے کوئی اندھیر چھپا ہو۔

اُس کے چہرے کے خدو خال، جیسے کسی خوابیدہ یاد کا عکس ہوں، جو ایک نظر میں پہچان لینے کے باوجود اجنبیت کا تاثر دیتے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک غیر مرئی درد کا عکس تھا، جسے چھپانے کی اُس کی تمام کوششیں ناکام ہوتی جا رہی تھیں۔

وہ آہستہ آہستہ اُس جگہ پہنچی جہاں احمر کا تعویذ زمین پر گرا ہوا تھا۔ اُس نے خاموشی سے جھک کر وہ تعویذ اٹھایا۔ اُس کے ہاتھ کی نرم انگلیاں اُس تعویذ کے گرد لپٹ گئیں، اور وہ بے حد سنجیدگی کے ساتھ اُسے دیکھنے لگی، جیسے اُس میں پوشیدہ رازوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

تعویذ کی باریک لکیروں پر اُس کی نگاہ جیسے جیسے پھسلتی گئی، اُس کے چہرے پر تناؤ کی گہرائی بڑھتی چلی گئی۔ اُس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں، اور جبرٹوں کی سختی اُس کی اندرونی کشمکش کی غماز تھی۔

اُس لمحے میں، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تعویذ کے اندر چھپے ہوئے کسی اندھیرے راز کو کھوجنے کی سر توڑ کوشش کر رہی ہو۔ ماحول پر ایک خوفناک خاموشی طاری تھی، اور اُس پر اسرار لمحے میں اُس کے وجود پر ایک ناقابل فہم دہشت چھا گئی تھی۔

...°...

اسپتال کے چھوٹے سے کمرے میں، احمر بے حسی کے عالم میں ایک تنگ بستر پر پڑا تھا، جیسے زندگی کی نازک ڈوری اُس کے وجود سے آہستہ آہستہ کھسک رہی ہو۔ اس کی بے جان، کمزور حالت کے برعکس، اُس

کی ماں اور بیوی کے چہروں پر ایک گہری، بے چین پریشانی کی لکیریں واضح تھیں، جیسے کسی پوشیدہ مصیبت کا بوجھ اُن پر آن پڑا ہو۔

کمرے کی فضا میں ایک بوجھل سناٹا تھا، جو صرف دلوں کی دھڑکنوں کی غیر محسوس صدا کے ساتھ دھیرے دھیرے گونج رہا تھا۔

ہنزہ کے اُس چھوٹے سے کمرے میں، جہاں مختلف زبانیں اور ثقافتیں آپس میں گھلی ملی تھیں، بروشاسکی زبان میں گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔

گل بانو اور احمر کی ماں ڈاکٹر سے بات کر رہی تھیں، جیسے اُس پر اسرار بیماری کا راز جاننے کی آخری امید وہ ہی ہو۔ ہنزہ کی زمین، جو چترالی وخی، بلتی، گوجری، اویغور، کھوار، ڈوکی، شینا، کشمیری، کوہستانی اور دیگر لسانی روایات کا گہوارہ تھی، اُس وقت خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

احمر کی ماں، چہرے پر گہری پریشانی کی شکنیں لیے، ڈاکٹر کے سامنے عاجزی سے جھکی، اور بروشاسکی میں لرزتی آواز میں استفسار کیا، ”ڈاکٹر صاحب، آخر اسے کیا ہوا ہے؟ یہ کس آفت میں مبتلا ہے؟“ اُس کے الفاظ میں درد اور خوف کی ایک گہری لہر تھی، جیسے اُس کا دل کسی نامعلوم اندیشے کے بوجھ تلے دبا ہو۔

ڈاکٹر نے ماتھے پر پسینے کے قطرے صاف کرتے ہوئے، بھاری دل اور الجھن بھرے لہجے میں کہا، ”تمام ٹیسٹ بالکل ٹھیک ہیں۔ کوئی طبی تشخیص نہیں ہو پا رہی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔“ اُس کے الفاظ میں بے یقینی کی ایک چمک تھی، جو مزید خدشات کو ہوا دے رہی تھی۔

ڈاکٹر کے اس غیر متوقع اور پراسرار بیان پر، گل بانو کے لب لرزنے لگے۔ اُس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں اپنے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹ لیا، مگر اُس کی آنکھوں میں چھپی بے بسی اُسے دھوکہ دے گئی۔

اُس کا دل جیسے احمر کی حالت کی گتھی سلجھانے میں ناکام ہو رہا تھا، اور ہر گزرتا لمحہ اُسے مزید مایوسی اور خوف کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل رہا تھا۔

احمر کے وجود پر سایہ فگن یہ پراسرار بیماری، جیسے کسی نامعلوم لعنت کا روپ لے کر، اُس کے جسم کو آہستہ آہستہ نگل رہی تھی۔

...°...

رات کے گہرے سناٹے میں جب گلیوں پر سٹریٹ لائٹس کی پیلی روشنی دھندلی روشنی پھیلا رہی تھی، فضاء پر ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔ گھڑی کی سوئیوں نے جیسے ہی صبح کا ایک بجنے کا اشارہ کیا، وہ خاموشی سے اپنے وجود کو سیاہ شفافان کے نفیس لباس میں ملفوف کر چکی تھی۔

یہ لمبا، سبک فرائڈ اُس کے وجود کے ساتھ ہلکے ہلکے جھوم رہا تھا، جس پر چمکتے شیشوں کے گول موتی جڑے ہوئے تھے، جن کی روشنی ہر قدم پر چمک اٹھتی تھی۔ اس کی پشت پر ڈھیلے ڈھالے بھورے، گھنگریالے بالوں کا جال سا بچھا تھا، گویا اس کی شخصیت کی پراسراریت کو بڑھاوا دے رہا ہو۔

اُس کے ہاتھ کی انگلی میں چمکتا ہوا شیشے کا بڑا گول پتھر جڑا ہوا تھا، اور قدموں میں چاندی کے ہموار جوتے تھے جو اُس کے ہر قدم کی نرمی کو اور زیادہ گہرا کر رہے تھے۔

ہر چیز میں ایک غیر محسوس مگر گہری خوشبو رچی ہوئی تھی، جس میں ایک عجیب کشش موجود تھی۔

اُس کی طبیعت میں ایسی نفاست اور شوق تھا کہ فیشن کو اپنی ذات کا حصہ بنا لیا تھا۔ اُس کے لیے فیشن کوئی اختیاری چیز نہیں تھی، بلکہ ایک زندہ حقیقت تھی جس کے بغیر اُس کی ذات کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔

یہ اُس کے وجود کا وہ پہلو تھا جو ہر لمحہ، ہر گھڑی اس کے ساتھ تھا، گویا اُس کی سانسیں اور دل کی دھڑکن بھی اُس کے سلیقے کا حصہ ہوں۔

خواہ رات کا سناٹا ہو یا دن کی چمک، وہ ہر لمحہ خود کو خوبصورتی اور بناوٹ کی نفاست میں غرق رکھتی تھی۔ اُس کے لیے تیار رہنا محض ضرورت نہیں، بلکہ اُس کی ذات کی تکمیل تھی۔

اس کے ارد گرد کی دنیا کیسا ہی ہو، وہ اپنی ظاہری شکل و صورت کے ذریعے اپنے آپ کو دنیا سے جدا کرنے کا ہنر جانتی تھی۔

فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرتے ہوئے، ایمان کے لبوں سے ہلکی سی بڑبڑاہٹ پھوٹی،

۔ ”یہ بزرگ آخر کیوں نہیں پہنچے؟“ اس کے ہونٹوں پر تھکن کی ہلکی سی جھریاں نمودار ہوئیں اور نظریں بے خیالی میں دائیں جانب کھسک گئیں۔

وہیں، ڈی ایچ اے کی خالہ کا بھتیجا نمودار ہوا، جس کا وجود گویا شان و شوکت کا پیکر تھا۔ سیاہ پلین ٹی شرٹ پر مرون جیکٹ کی فٹنگ، نیچے کی طرف ڈریس پینٹ کا چمکتا ہوا امیرون رنگ اور سفید سنیکرز کا نفیس امتزاج، جیسے اُس کی شخصیت میں ایک دلکش کشش کا اضافہ کر رہا ہو۔

ایمان نے محسوس کیا کہ اس کی تشویش بھری نگاہوں اور دھیمی مسکراہٹ کا ہلکا سا زاویہ اس پر مرتکز ہو گیا ہے۔

وہ اپنے اعتماد بھرے قدموں کے ساتھ قریب آیا، چہرے پر وہ ہی دلکش مسکراہٹ سجائے ہوئے،

۔ ”ایمان، آپ کیسی ہیں؟“

اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی تھی۔ ایمان نے ایک سرسری نظر سے اسے سر سے پیر تک دیکھا، لیکن خاموشی اختیار کی۔

بدر، جو بے چینی سے جواب کا منتظر تھا، آخر کار بولا، ”آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟“۔

ایمان نے اپنے مخصوص تیز اور بے پروا انداز میں کہا، ”پہچان لیا، پھر؟“۔

بدر کی مسکراہٹ میں ذرا سا اور وسعت آگئی۔ ”میں نائٹ کلب جا رہا تھا، کیا آپ میرے ساتھ چلیں گی؟“

-

ایمان نے ذرا بیزاری سے اپنی آنکھیں گھما کر جواب دیا، ”مجھے نائٹ کلب جانا پسند نہیں۔“۔

اس کے انداز سے بے خبر، بدر نے حیرانی سے پوچھا، ”میں نے تو سنا تھا آپ نائٹ کلب کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔“۔

یہ امر تو بالکل عیاں تھا کہ سوسائٹی کے ہر فرد کو ایمان کی راتوں کی سرگرمیوں کا بخوبی علم تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ وہ ہر شب نائٹ کلب کا رخ کرتی ہے۔ یہ ہی وہ معلومات تھیں جو شاید صباحت نے بدر کے گوش گزار کی تھیں۔

ایمان کے لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ یہ راز بدر تک کیسے پہنچا۔ اسے بخوبی ادراک تھا کہ اس حقیقت کا افشا ہونا ناگزیر تھا، کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ ایسی باتیں زیادہ دیر پردوں میں نہیں رہتیں۔

ایمان نے ایک ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”وہ کل کی بات تھی۔ آج میں بدل چکی ہوں۔ کل اور آج میں فرق ہوتا ہے۔ آج میرے ارادے اور فیصلے دونوں بدل چکے ہیں۔“

بدر، جواب بھی اس کی باتوں کے سحر میں گرفتار تھا، تعریف کے لہجے میں بولا،

۔ ”آپ کے بال بہت خوبصورت لگ رہے ہیں، شاید اُس دن سیاہ اور جامنی تھے؟“

وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے، بدر نے اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور تھوڑی سی جھجک کے ساتھ بات جاری رکھی۔

ایمان نے مسکراتے ہوئے راز افشاں کیا، ”در اصل، یہ بال میرے نہیں۔ یہ وگ ہے۔“

بدر کی آنکھوں میں حیرانی جھلکنے لگی۔ ”کیا؟ لیکن کیوں؟“

ایمان نے گویا اُس کے دل کو ہلا دینے والا جملہ کہا،

- ”کیوں کہ میں پاگل ہوں، اس لیے۔“ اُس نے ایک شوخی بھری مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں گھمائیں، اور جیسے ہی وہ آگے بڑھی، اچانک ایک غیر مرئی قوت نے اُسے روک لیا۔ بدر، جو اپنی بے پناہ کشش کے ساتھ شرارتی مسکراہٹ چہرے پر سجائے کھڑا تھا، اُس کی کلائی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ ایمان نپلٹ کر اسے سختی سے گھورتے ہوئے کہا، ”میرا ہاتھ چھوڑو۔“

بدر نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی کلائی کو مزید مضبوطی سے تھاما، اور آہستہ آہستہ اسے اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔

ان کے درمیان کا فاصلہ لمحہ بہ لمحہ سمٹ رہا تھا۔ ایمان کی نگاہوں میں غصہ اور سختی صاف دکھائی دے رہی تھی، ”میں نے تمہیں اپنا ہاتھ پکڑنے کی اجازت نہیں دی، چھوڑو!“ اس کے لہجے میں واضح تنبیہ تھی۔

بدر کے ہونٹوں پر ایک خبیث مسکراہٹ نمودار ہوئی، اُس کی آنکھوں میں ایک خوفناک چمک تھی۔
- ”اور میں نے تمہارا ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا،“

اس کی آواز میں ایک عجیب سی گہرائی اور ہوس کا اندھیرا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور ایمان کو ایک قریبی درخت کے ساتھ دبا دیا۔ اس نے ایمان کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، جیسے اسے مکمل طور پر خاموش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اوپر لگے الٹے لیمپ کی مدھم روشنی میں بدر کا چہرہ خوفناک حد تک قریب ہو گیا۔

- ”تم بہت خاص ہو، ایمان۔“ اس کی سرگوشی شیطانی تھی،

- ”تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔“

ہر انسان کی آزمائش کا کوئی نہ کوئی خاص وسیلہ ہوتا ہے، اور ایمان کی آزمائش اس کی بے پناہ حسن و جمال تھی۔ یہ حسن، جو بظاہر نعمت دکھائی دیتا ہے، دراصل اس کے لیے ایک کڑی آزمائش ثابت ہوا۔

ظاہری خوبصورتی کے ساتھ دلکش شخصیت کا بوجھ اٹھانا ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا، کیوں کہ یہ وہ فتنہ ہے جو انسان کو دنیا کی ظاہری چمک دمک اور فریبِ نظر میں مبتلا کر سکتا ہے۔

بدر کی سانسوں میں ہوس کی بو تھی، ”چپ چاپ میری بن جاؤ۔ میں تمہیں سب کچھ دوں گا۔ دولت، گاڑیاں، عزت، جو چاہو گی۔ میرا بہت بڑا کاروبار ہے، اور میں تم پر پیسے کی بارش کر سکتا ہوں۔ تمہیں بس میری راتوں کو حسین بنانا ہو گا۔“

ایمان کی آنکھوں میں ایک چمک آئی، مگر وہ خوف کی نہیں تھی، وہ غصے اور انتقام کی چنگاری تھی۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی، کوئی ایسی نہیں جسے خوفزدہ کیا جاسکے۔

وہ تو وہ آتش تھی جو سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اس کا وجود ایک آتش فشاں تھا، اور بدر کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس آگ سے کھیل رہا ہے۔

اس نے اپنے مضبوط جسم کے ساتھ ایمان کو دبوچنے کی کوشش کی، لیکن ایمان نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی آزاد کروائی

۔ وہ درخت کے ساتھ ایک لمحے کے لیے ٹک گئی، مگر اس کی آنکھوں میں عزم کی چمک مزید تیز ہو گئی تھی۔ ”تو جن پیسوں کی بات کر رہا ہے۔“

ایمان نے طنزیہ انداز میں ہاتھ جھٹک کر کہا، ”وہ پیسہ تو میں ایک دن میں ہوا میں اڑا دیتی ہوں۔“

پھر، اس کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ آئی، ”سمجھ نہیں آتی، کیا تم سب مرد ایسے ہی ہوتے ہو؟ ہوس کے بھوکے، ایک جیسے؟“

بدر کا شیطانی چہرہ مزید تاریک ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی آگ بھڑکنے لگی

۔ ”عورت وہ طاقت ہے جو سلطنتوں کو خاک میں ملا سکتی ہے، تو ایک مرد کو تباہ کرنے میں کتنی دیر لگے گی؟“

ایمان کی نگاہوں میں زہریلی نفرت تھی، وہ گویا ایک طوفان تھا جو بدر کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے تیار تھا۔ ”خاموشی سے یہاں سے نکل جا بدر۔“

اُس کی آواز میں غصے کی بجلی تھی،

”ورنہ تو اپنی بربادی کا خود ذمہ دار ہو گا۔“

بدر کی مسکراہٹ ایک پل کے لیے رکی، مگر وہ جانتا تھا کہ اس کا سامنا کسی ایسی طاقت سے ہے جسے وہ قابو نہیں کر سکتا۔

بدر کی مسکراہٹ میں ایک عجب سی روشنی تھی، وہ اس حقیقت سے غافل تھا کہ وہ آگ سے کھیل رہا تھا۔ ایمان، وہ ناقابلِ حساب قوت جس کی گہرائیوں کا اندازہ کرنا ممکن تھا۔

وہ بے دھڑک، کسی خوف سے بے نیاز، بدر کے قدموں سے قدم ملاتے ہوئے آگے بڑھی۔

ایمان کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں، جیسے کوئی غضبناک شیرنی شکار پر نظریں گاڑے بیٹھی ہو۔ بدر نے مسکراتے ہوئے زہر آلود الفاظ میں چیلنج کیا،

۔ ”تو مجھے برباد کر دو، آج گھر میں کوئی نہیں ہے، آؤ، مجھے فنا کر دو۔“

ایمان کی آنکھوں میں ایک گہری سرد مہری تھی، جیسے وہ اس کے وجود کی پچھدانی کا اندازہ لگا رہی ہو۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر دھیمی، مگر پختہ آواز میں بولی،

۔ ”اپنے آپ کو قابو میں رکھ ورنہ پچھتاوا تیرے وجود کا اکلوتا سا تھی ہو گا۔“

ایمان کا لہجہ ایسا تھا جیسے اندھیری رات میں دور کہیں طوفان کا گرجتا ہوا بدل سنائی دیتا ہے۔

وہ مڑنے ہی لگی تھی کہ اچانک، ایک تیز اور غیر متوقع حرکت سے بدر نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا، اسے کندھوں پر اٹھالیا۔ لمحے بھر کو خاموشی چھا گئی، مگر ایمان کے چہرے پر کوئی اضطراب نہ تھا۔ اس کی خاموشی میں ایک ایسی طاقت پوشیدہ تھی جو اس لمحے کے انتشار کو بے اثر کر رہی تھی۔ وہ کمزور نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بدر کی اس حرکت کے پیچھے کیا پیچیدگیاں چھپی ہیں۔

فضا میں کشیدگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ ایک غیر یقینی تصادم نے اپنا رخ تبدیل کر لیا تھا، اور ہوا میں پھیلی ناگہانی خطرے کی بواب اور گہری ہو رہی تھی۔

...°...

کمرہ سیاہ اور سنہری رنگوں میں ڈوبا ہوا تھا، ایک گہری، مہلک خوبصورتی کا عکاس۔ دیواروں پر سیاہ رنگ کی چمک تھی جسے سنہری نقش و نگار نے گھیر رکھا تھا، اور بیچ میں سیاہ دیوان بیڈ رکھا تھا، جس پر بھاری سرمئی بیڈ شیٹ چمک رہی تھی۔

- چھت سے لٹکا فانوس اور پیٹی کی روشنی نے کمرے کو ایک عجیب سا، شیطانی آہنگ دیا تھا۔ کمرے کی آرائش ہر زاویے سے عالی شان تھی، مگر اس کے اندر کوئی ناپاک، پوشیدہ تاریکی تھی، جو صرف ایک نظر میں محسوس ہوتی تھی۔

باہر سے آتی ہوا ایک لمحے کو سکون لے آئی، لیکن یہ سکون جلد ہی بدر کے داخلے سے ٹوٹ گیا۔ وہ تیز قدموں سے اندر آیا، جیسے کہ کوئی بدروح آزاد ہو گئی ہو۔

اس کی آنکھوں میں شدید غصہ تھا اور وہ ایمان کو بیڈ پر دھکیلتا ہوا لایا، جیسے وہ کسی شکنجے میں جکڑ رہی ہو۔ کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے، اس نے زور سے اسے بند کر دیا، اور کمرے میں ایک شدید، گھٹن بھری فضا پھیل گئی۔

بدر نے اپنے کوٹ کو صوفے پر پھینکا اور اس کے ساتھ ہی کمرے کی فضا مزید بھاری ہو گئی۔

بدر کا جسم طاقت اور نفرت کا مجموعہ تھا۔ اس کی قمیض اترتے ہی اس کا تراشیدہ جسم سامنے آیا، جس پر نمایاں شیطانی نشانات تھے۔ ایسے نشانات جو صرف بدنیت لوگوں کے پاس ہوتے ہیں۔ اس کی رگیں غصے سے ابھر آئی تھیں، اس کی ہر حرکت میں ایک خفیہ طاقت محسوس ہو رہی تھی، جیسے وہ انسان سے زیادہ کچھ اور ہو۔

وہ ایمان کے قریب آکر جھکا، اس کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک تھی، جیسے وہ کسی شکار پر جھپٹنے والا ہو۔ اس کا سارا جسم طاقت اور برائی کا مجسمہ لگ رہا تھا، اور ایمان کی خاموشی اس کی قوت کے سامنے بے بس نظر آرہی تھی۔

۔ کمرے کی روشنی جو پہلے مدعو کرنے والی تھی، اب ایک سرد، مردہ چمک میں بدل چکی تھی۔

ایک لمحے میں، ایمان کی خاموشی اور سکون کی تہوں کے نیچے چھپی ہوئی گہری تبدیلی ظاہر ہو گئی۔ اس کے چہرے پر جو ٹھہراؤ اور معصومیت دکھائی دیتی تھی، وہ ایک مہلک فریب نکلا۔

اندر ہی اندر، وہ کسی جنگی حکمتِ عملی کے ماہر کی مانند واقعات کی کڑیاں جوڑ رہی تھی۔ بدر، جو اپنی شیطانی طاقتوں کے بل بوتے پر غرور سے جھومتا تھا، اب خود کو بے یار و مددگار پاتا ہے، جیسے ہی ایمان نے عین وقت پر وار کیا۔

ایک تیز، خوفناک ضرب نے بدر کے جسم کو چیر کر رکھ دیا۔ وہ چیختا، تکلیف اور حیرانی میں مبتلا، اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر گر پڑا۔

اس کا شیطانی غرور اس کے خون کے ساتھ بہہ گیا، اور اب وہ ایمان کے سامنے بے بس تھا۔ ایمان بیڈ سے کھڑی ہوئی، اس کے کالے فراک پر بدر کا خون چھینٹوں کی مانند بکھرا ہوا تھا، جیسے کسی فاتح جنگجو کی علامت۔

بدر کا چہرہ ناقابلِ یقینیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ ہی خوف تھا جو ہمیشہ اس کے شکاروں کے دل میں ہوتا تھا، لیکن اب وہ خود اس کا شکار بنا بیٹھا تھا۔

ایمان کے چہرے پر ایک سنگین مسکراہٹ ابھری، اور اس کی آواز میں طنز کی تلخی شامل تھی: ”آئے تھے مجھے تباہ کرنے، اور اب خود تباہی کا شکار ہو گئے۔“

بدر نے بے یقینی سے سر ہلایا، جیسے اسے ابھی تک یقین نہ آرہا ہو کہ کیا ہوا۔ ایمان نے ہلکے سے اس کے بالوں کو جھٹکا دیا، جو اس کی حالیہ جدوجہد کی شدت کو ظاہر کر رہا تھا۔

بدر کو اٹھنے کا حکم دیتے ہوئے، اس نے ایک بھرپور طاقت سے اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اس کے چہرے پر ایک بے رحم اطمینان تھا، جیسے کہ وہ ہرپل کا لطف اٹھا رہی ہو۔

ایمان کی دائیں شہادت کی انگلی پر ایک انگوٹھی چمک رہی تھی۔ بظاہر معمولی نظر آنے والی انگوٹھی میں ایک تیز، مہلک نوک چھپی ہوئی تھی، جس نے بدر کے جسم پر گہرا زخم چھوڑا تھا۔

ایمان نے اس کے گلے پر اپنا ہاتھ رکھا اور سرگوشی میں کہا، ”عورت کے ہاتھوں تباہ ہونے کا دکھ ہو رہا ہے، بدر؟“ اس کی آواز میں ایسی سرد مہری تھی جو کسی پتھر دل انسان کو بھی لرزادے۔

بدر کی آنکھوں میں خوف کی شدت اب بھی تھی، اس کا خون بہتا جا رہا تھا، اور اس کی شکست ایمان کے سامنے عیاں ہو چکی تھی۔ ایمان نے اپنے طنز کو جاری رکھتے ہوئے کہا،

”یاد رکھ، اگر میں نے چاہا، تو اسی جگہ تجھے نامرد بنا کر کوٹھے میں پھینک آؤں گی۔ پھر جا کر اپنی کہانی کرائم پیٹرول والوں کو سناتا رہی۔“

۔ انگوٹھی کی نوک کو واپس کرتے ہوئے، ایمان کے چہرے پر اطمینان بھرا سکون تھا، جیسے کہ ایک مشن مکمل کر لیا ہو۔ بدر کو زمین پر تڑپتا چھوڑ کر، وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ بدر کا جسم بے جان سا پڑا رہا، اور اس کی زندگی کا غرور اسی خون میں تحلیل ہو چکا تھا جو اب فرش پر پھیل رہا تھا۔

ایمان، فاتحانہ قدموں کے ساتھ، تاریک کمرے سے نکل کر روشنی میں جا چکی تھی جب کہ بدر کا۔ شیطانی وجود زمین پر بکھر چکا تھا ایک خالی جسم کی مانند۔

...°...

ایمان نے دھیرے سے قدم باہر نکالا اور اپنے دوپٹے کو درست کرتے ہوئے گلے کے گرد لپیٹا۔ باہر ایک مدہم روشنیوں میں ڈوبی ہوئی گلی پھیلی ہوئی تھی، جہاں ٹمٹماتی ہوئی اسٹریٹ لائٹس کی بے ترتیب روشنی کی چھوٹی چھوٹی جھیلیں سی زمین پر پڑی تھیں۔

ہوا میں ایک پراسرار سانسٹا تھا، جیسے رات کی تاریکی میں کوئی پوشیدہ راز سرگوشیاں کر رہا ہو۔ محلے کے قدیم درختوں کی شاخیں ہوا کے ساتھ ہلکی ہلکی سرسراہٹ میں رقص کر رہی تھیں، ان کے درمیان ایک گہرا سایہ ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔

ایمان کے قدم آہستہ تھے، لیکن دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی، جیسے کسی نامعلوم خوف نے اسے جکڑ لیا ہو۔

ابھی وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ دور سے کسی انجن کی گونج سنائی دینے لگی۔ یہ گونج، پہلے مدھم، پھر جیسے جیسے قریب آتی گئی، خوف اور پراسراریت کی دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔

سامنے سے آنے والی وین کی ہیڈ لائٹس نے رات کی تاریکی کو چیر کر ایک عجیب سی چمک پھیلائی۔ ایمان رک گئی، اس کے دل کی دھڑکن سینے میں ہتھوڑے کی مانند سنائی دینے لگی۔ ایک لمحے کو سارا منظر جیسے ساکت ہو گیا۔

وین کی روشنی میں اس کا ہیولی سامنے واضح ہو چکا تھا، لیکن اس کے پیچھے چھپی پراسراریت اور زیادہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

ایمان کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی میں پھیل گئیں، جیسے کوئی انجانی بلا اس کی سمت بڑھ رہی ہو۔ سائے کے درمیان سے ایک مبہم سی شخصیت ابھری — خاموش، تیز، اور مہلک۔ یہ سب کچھ اتنا تیز تھا کہ ایمان کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔

اچانک، ایک جھٹکے کے ساتھ، مضبوط اور سرد ہاتھ اس کے گرد لپٹے، جیسے کسی سانپ نے اپنے شکار کو جکڑ لیا ہو۔ اس کے جسم کو ایک ناقابل مزاحمت طاقت نے گھسیٹتے ہوئے قریب کھڑی وین کی طرف کھینچ لیا۔

وین کا دروازہ دھاتی آواز کے ساتھ بند ہو گیا، اور اس کی قسمت پر ایک خاموش، ناقابلِ برداشت مہر لگ گئی۔ وین کے اندر کی تاریکی نے اسے گھیر لیا، جیسے اس کی آزادی اور یقین کے تمام رشتے کٹ چکے ہوں۔

وین کے انجن کی گرجتی آواز نے رات کے سناٹے کو چیر ڈالا، اور ٹائروں نے زمین سے رگڑتے ہوئے بجری کو کچل دیا، جیسے کسی پر اسرار کہانی کا موڑ، جو روشنی سے چھپتے ہوئے اندھیروں میں کھو گیا۔

...°...

جہنم کی گہرائیوں میں، ہر جانب شعلوں کا بے قابو رقص جاری تھا، جو ہر شے کو نکلنے کی تیاری میں تھے۔ آگ کی چنگھاڑ اور کائناتی شور کا خوفناک امتزاج، فضاء میں ایک لرزادینے والی کیفیت بکھیر رہا تھا۔

آسمان پر ایک بلیک ہول اپنی بھیانک موجودگی سے فضا کو بوجھل کر رہا تھا، جس کا مہیب گھیراؤ ہر چیز کو اپنی ہولناک کشش میں گھسیٹ رہا تھا۔ چاروں طرف کا منظر کسی ازلی تباہی کی تصویر پیش کر رہا تھا۔

انگاروں کی مانند تاریک، گونا گونا گویا نیوٹران ستارے کے مدار میں پھنسا ہوا تھا، جیسے اس کے وجود کو بھیانک قوتیں چیر رہی ہوں۔

شعلے اس کے گلے کو جلاتے ہوئے اس پر جھپٹ رہے تھے، اور بلیک ہول کی طرف کھینچتی ہوئی کششِ ثقل، ہر لمحے اس پر حاوی ہو رہی تھی۔

نیوٹران ستارے کی ناقابلِ فہم گرفت میں جکڑا، گونار اپنی قوتوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر فضاء کی خاموشی اسے مزید بے چین کر رہی تھی۔

اس کی چیخیں کائناتی قوتوں کے دباؤ تلے دم توڑ چکی تھیں۔ آگ کا طوفان بھرتا ہوا پہاڑوں سے بلند ہوا، اور جیسے ہی وہ دھاڑتے ہوئے گونار کی طرف لپکا، ایک بھیانک دھماکے کے ساتھ سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس کے کانوں میں ایک ہولناک گونج ابھرنے لگی، جیسے کوئی گہری سٹیج رہی ہو، اور پھر سب کچھ ساکت ہو گیا۔

گونار نے خود کو ایک جھٹکے کے ساتھ خوفناک خواب سے بیدار ہوتے ہوئے پایا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی وہ جہنم کی گہرائیوں سے واپس آیا ہو۔

اس کا چوڑا سینہ بے پناہ خوف سے تنگ ہو رہا تھا، اور پسینے کے موٹے قطرے اس کی پیشانی سے ٹپک رہے تھے۔

مدھم روشنی میں اس کے جسم پر بنے پیچیدہ اور پرانے ٹیٹو چمک رہے تھے، جو اس کی زندگی کی پراسرار داستانیں سناتے تھے۔ اس کے موج دار شاہ بلوطی بال پسینے سے ماتھے پر چپکے ہوئے تھے، اور وہ ابھی بھی بے چین نیند کے اثرات سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سفید چادر نے اس کے جسم کے نچلے حصے کو ڈھانپ رکھا تھا، جبکہ اس کا اوپری دھڑ، جو طاقت اور وقار کا مجسمہ دکھائی دیتا تھا، کھلا ہوا تھا۔ شعلوں کی مانند اس کے عضلات چمک رہے تھے، جیسے کسی قدیم یونانی مجسمے کی طرح تراشا گیا ہو۔

جب اس نے اپنی ہتھیلیوں سے اپنے چہرے کو ملنا شروع کیا، تو خواب کی تلخیاں اس کے چہرے کی لکیروں میں نظر آتی تھیں، جیسے وہ اس بھیانک منظر کو بھلانے کی جدوجہد کر رہا ہو۔

گونار کی نگاہیں کمرے کی بے جان دیواروں پر یوں پھسلتی رہیں جیسے کسی پناہ کی متلاشی ہوں، یہاں تک کہ اس کی نظر بستر کے قریب پڑے ڈھیلے ٹراؤزر پر جا کر رک گئی۔

تھوڑی دیر وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا، پھر جیسے بے دلی سے، اس نے وہ ٹراؤزر اٹھایا۔ رضائی کی آڑ میں خود کو چھپاتے ہوئے، اس نے ٹراؤزر برق رفتاری سے پہنا، جیسے وہ اس وقت اپنی بے بسی اور لرزتے وجود پر کوئی پردہ ڈال رہا ہو۔

مگر دل کی دھڑکن کی بے ترتیب آواز اس کی اندرونی پریشانی کا حال سنار ہی تھی۔

یکایک، ایک بے قابو اضطراب کے زیر اثر، وہ باتھ روم کی طرف لپکا۔ شاور کا پانی جیسے ہی اس کے بدن سے ٹکرایا، کمرے میں بہتے پانی کی سرگوشیاں گونج اٹھیں۔

پانی کا لمس نہ صرف اس کے جسم کو ڈھانپ رہا تھا، بلکہ اس کے وجود پر چھائی وحشت کو بھی جیسے لمحہ بھر کے لیے دھورہا تھا۔ اس کے خیالات کی بھیانک بھٹکیں اور اندرونی خوف اب بھی موجود تھے، لیکن شاور کے قطروں میں اسے ایک عارضی پناہ مل گئی تھی۔ جیسے وہ چند لمحوں کے لیے وقت کی قید سے آزاد ہو گیا ہو۔

ماضی کی تلخی اور خوابوں کی سنگینیاں اب بھی اس کے شعور کے کسی کونے میں چھپی بیٹھی تھیں، مگر اس لمحاتی سکون میں وہ ایک ایسی تسکین محسوس کر رہا تھا جس نے اسے حال کے تھپڑ سے بچا لیا تھا۔

پانی کے ساتھ بہنے والے لمحے اسے اس تلخ حقیقت سے بھاگنے کا موقع دے رہے تھے، جو اندر کہیں دفن تھی، مگر پھر بھی مسلسل اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔

...°...

گونار کا ڈرائنگ روم فن تعمیر اور دولت کی کہانی سنارہا تھا۔ ہر گوشہ، ہر زاویہ احتیاط سے چنا ہوا تھا، جیسے کسی فنکار نے اپنی پختہ صلاحیتوں سے ایک شاہکار تراشا ہو۔ عظیم و عریض کھڑکیاں جیسے ایک زندہ تصویر کے فریم میں سرسبز وادی کی جھلک دیتی تھیں، جہاں قدرت کے حسن اور انسان کی بنائی گئی عیش و عشرت کا ایک حسین امتزاج تھا۔

بھورے اور سیاہ رنگ کی آمیزش نے اس کمرے میں ایک شاہانہ وقار اور سکون پیدا کیا تھا، جبکہ مصنوعی آگ کے جلتے شعلوں نے ماحول کو ایک پرسکون اور گہرے جذبے سے بھر دیا تھا۔

گونار اپنے مستحکم قدموں کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اترا، ہر قدم اس کے عزم اور پختہ ارادے کا غماز تھا۔

اس کے جسم پر سخت محنت کی چمک عیاں تھی، جو کئی برسوں کی کڑی مشقت کا ثبوت تھا۔ سرمئی رنگ کی چست بنیان، جس پر ”نوپین نوگین“ کے الفاظ سنہری حروف میں ثبت تھے، اس کے کشادہ سینے پر کھلتی تھی۔

اس کے بازوؤں پر ابھری ہوئی رگیں، جیسے خون کی روانی سے متحرک، ہر لمحے اس کی جسمانی طاقت کا اظہار کر رہی تھیں۔ اس کی کلائی پر ایک کندہ شدہ ٹیٹو تھا، جو اس کی بے خونی اور بہادری کا نشان تھا۔

سیڑھیوں کے نیچے پہنچتے ہی صوبے کے عقب سے گزرتے اس نے آرام سے ایک سیاہ ہوڈی اٹھائی اور اسے زیب تن کیا۔

ہوڈی کا کپڑا اس کے عضلات پر چست بیٹھا، جیسے وہ اس کے جسم کی توانائی کو قابو میں کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ اس کی جسمانی ساخت کسی قدیم یونانی مجسمے کی مانند لگ رہی تھی، ہر پٹھ، ہر رگ اپنی الگ داستان سناتی تھی۔

ہر قدم جو وہ اٹھاتا تھا، طاقت، جفاکشی اور عزم کا مترادف تھا۔ اس لمحے میں، گونار صرف ایک انسان نہیں تھا، وہ اپنے جسم کی تراشیدہ پختگی اور ذہنی مضبوطی کا جیتا جاگتا نمونہ تھا، جس نے اپنی محنت سے ہر شکست کو فتح میں بدلا تھا۔

جیسے ہی گونار باہر جانے کے لیے دروازے کے قریب پہنچا، دروازے کے اوپر ایک پیچیدہ ڈیزائن والی کھڑکی، جس پر سنگین اور مضبوط شیروں کے نقش بنے ہوئے تھے، طاقت اور بے عیب درستگی کی علامت تھی۔

بھورے رنگ کے شیشے نے ماحول کو ایک سنجیدہ اور سرد مہر رنگت دے رکھی تھی۔ دروازے کے پاس پہنچتے ہی ایک خاموش ٹیکنالوجی کے زیر اثر سینسر فعال ہوا اور ایک مخصوص بیپ کی آواز نے اس کے اندر موجود حساس چپ کو حرکت میں لایا، جو فوری طور پر گونار کے چہرے کی جانب لیزر کی شعاع پھینکنے لگی۔

روشنی نے اس کے خدوخال کو تلاشی کی جیسے اُس کی شخصیت کے سرد اور سخت پہلو کی تصدیق کر رہی ہو۔ لیزر کی شعاعوں کے بعد دروازے نے خاموشی سے دو حصوں میں تقسیم ہو کر اسے راستہ دے دیا۔

گونار نے اس دوران اپنے ایئر پوڈز کو آرام سے اپنے کانوں میں ڈالتے ہوئے اپنی توجہ دروازے کی بیپ اور خود کار حرکت سے بالکل ہٹائے رکھی۔

یہ سب اس کے لیے ایک روزمرہ کی عام کارروائی تھی، کوئی حیرت یا دلکشی کا احساس نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھا، ایک ملازم اس کے پیچھے آہستگی سے نمودار ہوا، مکمل سیاہ لباس میں، جس کے چہرے پر خدمت گزاری اور احترام کی ایک پرانی پرت جمی ہوئی تھی۔

۔ ”سر، کیا آپ ناشتہ کرنا پسند کریں گے؟“ ملازم نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

گونا نے اپنی نظریں اٹھائیں، اور ملازم پر ایسی تیز نگاہ ڈالی جو اس کی موجودگی پر ہی سوال اٹھا رہی تھی۔ ایک خاموش لہر، جو بے پناہ سرد مہری میں لپٹی ہوئی تھی، کمرے میں پھیل گئی۔ اس نے بغیر ایک پلک جھپکائے، پُر سکون اور سنگین لہجے میں جواب دیا، ”اگر مجھے ناشتہ کرنا ہوتا، تو میں خود منگو لیتا۔“

یہ الفاظ زبان سے نہیں، جیسے تلوار سے نکلے ہوں۔ ملازم کی سانس رک گئی اور اس کی نظر فوراً جھک گئی۔ گونا کی نظر کی گہرائی میں ایک اشارہ پوشیدہ تھا جو اس کے غصے کی شدید دھمک کے باوجود بہت سلیقے سے نکلا تھا۔

گونا جیسے ہی دروازے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، اچانک رک گیا، پھر اپنی ایڑی پر گھوم کر ملازم کے قریب آیا۔ وہ اب ملازم کے چہرے کے بالکل سامنے تھا، اور اس کے سرد جملوں نے کمرے کی ہوا کو مزید بو جھل بنا دیا۔

۔ ”جو لوگ مجھے پیچھے سے مخاطب کرتے ہیں... وہ اکثر زہریلے نکلتے ہیں۔ اور میں ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہوں جو میرے راستے میں آئیں۔“

اس نے اپنی سرد نگاہیں ملازم کے چہرے پر جمانے کے بعد اضافی سختی سے کہا، ”آئندہ ایسی بے ہودہ گستاخی سے پرہیز کرنا۔ میں آج تمہیں معاف کر رہا ہوں لیکن دوبارہ ایسی جرات مت کرنا۔“

سوئیڈش زبان میں تیز اور تلخ مکالمے کا تبادلہ ہو رہا تھا، جس میں ہر لفظ میں کٹھن لہجہ اور سختی نمایاں تھی۔

ملازم، لرزتے ہاتھوں کے ساتھ، سر جھکائے چپ کھڑا رہا۔ گونار نے اسے اپنے اندرونی سکون کا کچوکا لگایا تھا، اور وہ اب زہر سے بچنے کے لیے خاموشی میں چھپ گیا تھا۔

گونار کی خاموشی اور اس کی پرسکون برتری نے کمرے کو ایک بو جھل، پُر ہیبت چمک سے بھر دیا۔ جیسے ہی اس نے ملازم کو ایک آخری نظر سے دیکھا اس نے ہڑبڑا کر ڈرتے سر اثبات میں ہلایا گونار کے چہرے پر، ایک معمولی سی مسکراہٹ، جس میں سرد نفرت چھپی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر نمودار ہوئی۔

۔ ”گڈ۔“ یہ ایک خاموش مگر غصے میں بجھا ہوا ریمارک تھا۔ پھر اس نے ہاتھ کی ایک اشارے سے ملازم کو رخصت ہونے کا حکم دیا۔

گونار نے اپنی سست مگر با اعتماد رفتار سے آگے بڑھتے ہوئے ہر قدم میں وہ سنگین طاقت اور اختیار کا اظہار کیا جو اس کی شخصیت کا حصہ تھا۔

ہر لفظ، ہر حرکت اس کی سرد مہری اور بے پناہ ضبط کا آئینہ دار تھی، اور اس کا وجود ایک ایسا احساس چھوڑ رہا تھا جیسے کمرے میں صرف وہ ہی واحد عنصر ہو جس کی کوئی اہمیت ہے۔

...°...

سٹاک ہوم کے نواح میں گونار کی شاندار رہائش گاہ ایک دلکش امتزاج تھی جہاں جدید تعمیرات اور فطرت کا جمالیاتی امتزاج کمال فن تعمیر کی علامت تھا۔

مکان کی وسیع اور بلند کھڑکیاں فطرت کی خوبصورتی کو اندرونی حصے میں لاتی تھیں، جہاں شفاف سبزہ زار، قد آور درخت اور مختلف قسم کے حیاتیاتی نظام نہایت نفاست سے نظر آتے تھے۔

جیسے ہی آسمان کی طرف نگاہ کی جاتی، نیلا آسمان دور تک پھیلا ہوا نظر آتا، جہاں سفید بادل اپنے آپ کو کرچ پر بکھرتے محسوس ہوتے، گویا یہ فطرت کی مصوری تھی۔

پس منظر میں، اونچے پہاڑ ایستادہ تھے، جو اس کے ماحول کی ہیبت میں اضافہ کرتے تھے۔ گھر کے قریب پھیلی جھیل کا سکون اس سارے منظر کو اور بھی دل فریب بنادیتا تھا، جس کا پانی آئینے کی مانند تھا، جس میں ہر شے کا عکس نظر آتا تھا۔

گونار کی شخصیت اس مکمل طور پر ترتیب دی گئی دنیا میں پوری طرح سے ضم ہو چکی تھی۔ اُس کے ہر قدم میں ایک عجیب سا وقار اور غرور جھلکتا تھا، جیسے ہر حرکت میں قدرتی اتھارٹی کا ثبوت تھا۔ جیسے ہی وہ اپنی رہائش گاہ کے کارپورچ کی طرف بڑھا، ایک ملازم فوراً نمودار ہوا، جو مکمل سیاہ لباس میں ملبوس تھا اور اُس کی ہر ضروریات پوری کرنے کے لیے مستعد کھڑا تھا۔

گونار نے بغیر کوئی توجہ دیے اپنا بیگ اُس کے کندھے پر ڈال دیا، جیسے یہ عمل روزمرہ کا معمول ہو۔

دوسرے ملازم نے فوراً اُس کی چمکتی ہوئی لمبورگینی کا دروازہ کھولا۔ گونار کی چال میں کسی قسم کی عجلت یا عدم اطمینان نہیں تھا، وہ اُس مخصوص سرد مہری اور خود اعتمادی کے ساتھ اندر بیٹھا جو ہمیشہ اُس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

گاڑی کے اندر بیٹھ کر اُس نے گاڑی کی کمانڈ سنبھالی اور انجن کو زندہ کیا۔ ملازم نے احتیاط سے اس کا بیگ گاڑی میں رکھا اور دروازہ بند کر دیا۔۔۔

جب گاڑی چلنے کے لیے تیار ہوئی، اچانک دروازہ کھلا اور ایک شخص بے خوف اُس کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ گونار کا ماتھا شکن آلود ہو گیا، جیسے اُس کی خود مختاری پر حملہ کیا گیا ہو۔

اس نے شعلہ بار تیوریوں سے سر موڑا، اور جیسے ہی اُس نے دیکھا کہ وہ کیتھرین تھی، اُس کے شعلے بھری آنکھوں کی چمک ایک لمحے میں مدھم ہو گئی۔

کیتھرین، جو ایک بے حد حسین سویڈش دوشیزہ تھی، سنہرے بال، سبز آنکھیں، اور مثلث نما چہرے کے ساتھ، نیلی جینز اور سفید قمیض میں ملبوس تھی۔ اُس کی بالیوں پر ایکس اور وائے

(X-Y)

کے حروف جگمگا رہے تھے۔ گونار نے گہرا سانس لیا اور غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا،

”کیتھرین، تمہیں کوئی ہوش ہے؟ اگر گاڑی چل پڑتی تو کیا ہوتا؟“

کیتھرین نے ایک پُر اعتماد مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے، ڈارلنگ۔“

گونا کی آنکھوں میں سرد مسکراہٹ نمودار ہوئی، ”یہ دنیا بھروسے کے قابل نہیں ہے، بے بی۔“

کیتھرین نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا، ”جیسے تم اس دن اُس لڑکی کے ساتھ تھے، جس کے ساتھ کافی وقت گزارا، کیا وہ قابلِ بھروسہ تھی؟“

گونا نے ہلکے انداز میں جواب دیا، ”تم میری جاسوسی کرتی ہو؟“

کیتھرین نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا، ”تم میرے ہو، اور میں تمہارے ارد گرد ہونے والی ہر چیز پر نظر رکھتی ہوں۔“

اس نے گونا کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں گہری محبت کی چمک تھی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی،
”میں تم سے محبت کرتی ہوں۔“

گونا کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری، دل میں کڑواہٹ لیے وہ سوچنے لگا، ”محبت کا مقدر میرے نصیب میں نہیں لکھا گیا۔“

دفعاً کیتھرین نے اپنے بازو سینے پر جوڑتے ہوئے آگے کی طرف دیکھا۔ ”چلو، جم چلتے ہیں، اور بعد میں باہر جا کر کچھ ناشتہ کرتے ہیں۔“

گونا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”ٹھیک ہے۔“ اور گاڑی کو روانہ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے پر تعیش محل کی حدود سے باہر نکال لیا۔

...°...

سوڈن کی خاموش صبح میں جب گھڑی نے دس بجائے، اس ایک پل نے دنیا بھر میں ایک ناگہانی تعلق کو جنم دیا۔ یہ ایک معمولی گھنٹہ نہیں تھا، بلکہ وقت کے دھارے میں ایک غیر متوقع موڑ تھا۔ اس کے برعکس پاکستان میں، جہاں سورج مولانا سرور کے مکان پر نرم کر نیں بکھیر رہا تھا، وہاں دوپہر کے ایک بج چکے تھے۔

مولانا سرور کی رہائش گاہ پر ایک غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جیسے کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔

سندس، جو اپنے خیالات میں گم تھی، اس تنہائی میں ایک بوجھل خاموشی کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جو اس کے نازک توازن کو منعکس کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

کالی عبایا اور حجاب میں ملبوس سندس نے سنگین راہدار یوں میں قدم رکھا، جہاں دیواریں اسلامی خطاطی کے پیچیدہ فریموں سے مزین تھیں، جن پر اللہ کے نام اور مقدس آیات نقش تھیں۔

قدموں کے نیچے قالین پر کھلتے ہوئے پھولوں کا نقش و نگار اسے ایک خوابناک کیفیت میں لے آیا تھا۔ لیکن سندس کے دل میں ایک الجھن سی تھی۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی، ”بابا چائے کا کہہ کر کہاں چلے گئے؟“۔

سکوت سے گونجتی راہداری میں اس کے قدموں کی آواز اس کی پریشانی کو بڑھا رہی تھی، جب اچانک ساتھ والے کمرے سے ایک مدھم سی آواز ابھری، جیسے کوئی راز چھپانے کی کوشش میں ہو۔ سندس کا دل زور سے دھڑکنے لگا، اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر سوچا،

”کیا بابا مصور خانے میں ہیں؟ وہ کمرہ جہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں؟“

اس کا دل بے چینی سے دھڑکنے لگا۔ وہ دروازے کی طرف دیکھتی رہی، تذبذب میں مبتلا کہ کیا وہ اندر جائے یا رک جائے۔ ایک لمحہ مزید برداشت نہ کر پائی اور کانپتی آواز میں دروازے کے قریب ہو کر بولی،

۔ ”بابا، کیا میں اندر آؤں؟“ جواب میں گہری خاموشی نے اس کی بے چینی کو مزید گہرا کر دیا۔

دروازے کے نیچے سے اچانک ایک سایہ سا گزرتا دکھائی دیا، جیسے کوئی چھپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ سندس کا دل جیسے رک گیا، اس کے ہاتھ کانپنے لگے، اور آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے لرزتے ہاتھوں سے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ آہستہ سے کھلا، اور ٹرے سندس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر جاگری۔ چائے کا کپ ٹوٹ کر بکھر گیا، فرش پر گرم چائے پھیل گئی، اور کمرے کی فضا میں تناؤ اتنا گاڑھا ہو گیا کہ سانس لینا دشوار ہو گیا۔

جیسے ہی سندس کی نظریں کمرے کے اندر پڑیں، اس کے دل کی دھڑکن جیسے تھم گئی۔ اندر کا منظر کچھ ایسا تھا جس نے اس کی روح کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، جیسے اس کی دنیا پل بھر میں بکھر گئی ہو۔

...°...

مولانا سرور اپنے وسیع و عریض باغ میں تنہا کھڑے، گلاب اور چنبیلی کے پھولوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔

ہر پودا جیسے اس سکون کی گواہی دے رہا تھا جو ان کے دل کی کیفیت کا عکاس تھا۔ دور، ان کا گھر اپنی مکمل شان و شوکت کے ساتھ کھڑا تھا، جیسے کسی درویش کی خاموش دعاؤں کا گواہ ہو۔

مگر مولانا سرور کو خبر نہ تھی کہ فطرت کی اس خاموشی میں ایک اور حقیقت بھی پوشیدہ ہے، ایک ایسی حقیقت جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھی

کہ ان کے عقب میں ایک بلوری، چمکتا ہوا وجود سرایت کیے کھڑا ہے، جو انسانی نظروں سے اوچھل، ہر شے کے آر پار دکھائی دے رہا تھا۔ وہ وجود موت کا فرشتہ، ملک الموت تھا۔

آج اس کی نظریں مولانا سرور پر گہری اور بو جھل تھیں، جیسے وقت کی گھڑیاں تھمنے والی ہوں۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ وجود مدھم ہونے لگا، جیسے دھند میں تحلیل ہو رہا ہو۔ ایک پل میں وہ مکمل غائب ہو گیا، لیکن فضا میں موت کی سرد لہر چھوڑ گیا۔

مولانا سرور کو اس آسمانی حقیقت کا علم نہ تھا، جب اچانک پیچھے سے ایک آواز نے انہیں چونکا دیا، ”بابا!“۔ وہ مڑے تو ان کی آنکھوں میں ہلکی سی جھلک ناراضگی اور حیرت کی تھی۔ سامنے سندس کی بہن کھڑی تھی، جس کا چہرہ غصے اور تلخی کا آئینہ تھا۔

اس کے ہاتھ میں ایک پراسرار تعویذ تھا، جو وہ ہوا میں لہرا رہی تھی۔ مولانا سرور نے بھاری قدموں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا، ”تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟“۔

سندس کی بہن نے کوئی جواب نہ دیا، بلکہ اس نے تعویذ کو ایک سخت اور پر زور جنبش سے اپنے اور سرور کے درمیان فضا میں لہرایا۔ تعویذ ہوا میں معلق ہو کر لرزنے لگا، گویا کسی نادیدہ قوت کا پردہ ان دونوں کے بیچ کھینچ دیا گیا ہو۔

سندس کی بہن نے تیز لہجے میں کہا، ”کیا آپ نے اپنی ابلیسی طاقت کا استعمال کیا ہے؟ کیا آپ نے احمر کے خاندان پر کالا جادو کیا؟“۔

مولانا سرور کا دل ایک پل کو ساکت ہو گیا۔ ان کی نظریں تعویذ پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ جانتے تھے کہ یہ ان کے خلاف ایک سنگین الزام کا ثبوت ہے۔

سندس کی بہن نے سخت لہجے میں بات جاری رکھی، ”آپ جیسے شخص کے لیے، جو مولوی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، یہ عمل کیسے موزوں ہو سکتا ہے؟ آپ کے عمل نے معصوم جانوں کو تکلیف دی ہے۔“۔

مولانا سرور کے چہرے پر ایک لمحے کو سختی ابھری، اور وہ غصے سے بھر کر بولے

۔، ”کیا کر لو گی تم؟“۔

سندس کی بہن نے تعویذ کو اپنے والد کی آنکھوں کے سامنے لہرایا، اور پھر دھیرے سے، مگر پختہ عزم کے ساتھ بولی، ”آپ کے پاس تین دن ہیں، بابا۔ یا تو آپ اپنی حقیقت کا پردہ چاک کریں گے، یا میں پورے گاؤں کو بتا دوں گی کہ ان کا مولوی حقیقت میں کیا ہے۔“۔

وہ نفرت زدہ لہجے میں لفظ چبا کر بولی ”انسان کے لبادے میں شیطان“۔

یکدم اس نے تعویذ کو تیزی سے نیچے کیا اور ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا، جیسے اس کے قابو میں لانا چاہتی ہو، انداز میں ایک عجیب سی بے نیازی اور حقارت جھلک رہی تھی۔

مولانا سرور کا دل جیسے ان کے سینے میں رک سا گیا ہو۔ ان کے چہرے کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ وہ جانتے تھے کہ یہ معاملہ اب ان کی دسترس سے باہر ہو چکا تھا۔

ہوا میں تناؤ کے بو جھل ذرات چھائے رہے، یہاں تک کہ ایک نرم آواز نے اس سنائے کو کاٹ دیا ”شانزہ، تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں، میں سب کچھ جان چکی ہوں۔“

سرور یکدم مڑا، اور حیرت کی شدت میں، سندس کو وہاں کھڑا پایا۔ شانزہ نے افسوس بھری نظروں سے اپنی بہن کی طرف دیکھا، جانتے ہوئے کہ اس کی خاموشی نے سندس کو نادانستہ طور پر اذیت دی ہے۔

سندس نے ایک قدم آگے بڑھایا، اس کی آواز جذبات سے لبریز تھی ”ایمان آپ سے ہزار درجے بہتر ہے، وہ جو دین کی تعلیمات سے ناواقف تھی، آپ کے برعکس۔ رمضان میں نافرمانیاں کرنے والوں کی مغفرت ہو سکتی ہے، لیکن رمضان میں سحر و جادو کرنے والوں کا انجام جہنم ہی ہوتا ہے۔“

سندس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، اس کے لبوں سے نکلے یہ کربناک الفاظ باغ کے اس پل میں گونجے، جہاں خاندانی سچائیاں اور ندامتیں عیاں ہوئیں۔۔۔۔۔

سندس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے، مگر وہ اپنے غم کو مولوی سرور کی گہری نظریں برداشت نہ کر پائی۔ سرور کے چہرے پر ایک عجیب سا امتزاج ابھر آیا، جیسے تعظیم اور حیرت دونوں اس کی روح میں گھل رہے ہوں۔ اس نے اپنی آنکھوں سے تحقیقاتی تیر دونوں بہنوں کی جانب روانہ کیے اور پھر فخر سے بولا

- “میں اللہ کا برگزیدہ بندہ ہوں، میری آزمائش ختم ہو چکی ہے، اللہ نے میرے لیے سب کچھ مقدر کر رکھا ہے۔ میں ہر چیز پر قدرت رکھتا ہوں، ہر چیز میرے حکم کے تابع ہے۔ تمہاری کیا حیثیت ہے جو مجھے روک سکو؟”-

اس نے اور بھی فخر سے اعلان کیا “اللہ تمہیں میری برکتوں سے جہنم کی آگ سے بچالے گا، اور سب کو جنت میں لے جائے گا۔”-

یہ الفاظ، خود پرستی کی انتہا کو پہنچے ہوئے، سندس کے وجود پر گرے۔ وہ لرزتی ہوئی بولی

- “بابا، یہ آپ ہیں؟”-

شانزہ نے بغور سندس کی طرف دیکھا اور کہا ”یہ ہی بابا ہیں، جو ابتدا سے ایسے ہی ہیں۔ تم ان کی حقیقت سے ناواقف ہو۔“

سندس کے الفاظ نے مولوی کو لمحہ بھر کے لیے خاموش کر دیا۔ پھر اس نے اعلان کیا ”اب میں بابا کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتی۔“

سندس نے شانزہ کی طرف دیکھا اور کہا ”چلو، میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“

اپنے والد کی طرف رخ کرتے ہوئے، اس نے کہا ”میں اس چادر میں لپٹی باہر جا رہی ہوں جو آپ کی کمائی سے مجھے ملی، اگر قرآن کا حکم نہ ہوتا تو میں بغیر چادر کے نکلتی۔“ اس کے الفاظ سرور پر بجلی بن کر گرے۔

شانزہ نے سندس کے کندھے پر تسلی بھرا ہاتھ رکھا تو سندس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ سندس نے درد بھرے لہجے میں کہا ”کاش میں اس کمائی کا ایک لقمہ بھی نہ کھاتی، جو آپ کے حرام مال سے آیا۔ کاش وقت کو پلٹا جا سکتا اور میں بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پال لیتی۔“

اس نے شانزہ کا ہاتھ پکڑ کر التجائی ”چلو یہاں سے۔“

سرور نے انہیں خاموشی سے جاتے دیکھا، اس کے الفاظ ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ آسمان نے اس خاندانی درد و غم کے مناظر کو دیکھا، درختوں نے اپنی شاخوں کو جھکایا، اور پتوں نے غمگین نوے کی طرح زمین پر اپنی شکستگی کا اظہار کیا۔ آسمان، جو عام طور پر پرسکون تھا، آج جیسے خاموش آنسوؤں سے بھر گیا تھا۔

وہ دونوں بہنیں جیسے ہی گھر سے باہر نکلیں، فضا میں گھمبیر خاموشی کے ساتھ ہر قدم ایک بوجھل احساس لیے ہوئے تھا۔ شانزہ کی پوری توجہ اپنی بہن، سندس، کی تسلی پر مرکوز تھی۔

سندس کی آنکھوں میں درد اور مایوسی کی چمک تھی، اور شانزہ نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی بہن کو اس اذیت سے نکال کر لے جائے گی۔

شانزہ نے سندس کا ہاتھ تھامے ہوئے دائیں جانب قدم بڑھائے، ارد گرد کی دنیا سے بالکل غافل، گویا باقی کائنات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

اس کا مقصد صرف سندس کو اس ہنگامہ خیز ماحول سے دور لے جانا تھا، جہاں ہر لمحہ ایک دھماکے کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

لیکن اسی وقت، بائیں جانب سے، گل بانو نے خاموشی سے داخلی دروازے کی طرف قدم رکھا۔ وہ بھی اپنی سوچوں میں گم تھی، کوئی آہٹ، کوئی حرکت اسے محسوس نہ ہوئی۔

ہوا میں جیسے تجسس کا گہرا پردہ تان دیا گیا تھا، ایک لمحہ، جہاں دونوں وقت کی دھڑکنوں کے بیچ آمنے سامنے آسکتے تھے، مگر تقدیر نے جیسے ان کی نگاہوں کو ایک دوسرے سے بچا لیا۔

شانزہ نے نہ گل بانو کو دیکھا اور نہ ہی دروازے کے اس طرف جھانکنے کی زحمت کی، جہاں سے گل بانو اندر داخل ہو رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے راستے پر، جیسے کسی پوشیدہ قوت نے انہیں علیحدہ سمتوں میں موڑ دیا ہو۔

گل بانو اندر داخل ہوئی اور شانزہ، سندس کا ہاتھ تھامے، دائیں جانب تیزی سے نکل گئی۔ لمحے کی وہ بُناوٹ، جیسے دل کی دھڑکن کو ایک پل کے لیے روک دیتی ہے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وقت نے ایک کھیل کھیلا، ایک ملاقات جو ہونا تھی مگر نہ ہو سکی۔

تینوں خواتین ایک دوسرے سے چند قدم کے فاصلے پر تھیں، مگر ان کے دلوں کی چیخیں اور سسکیاں ایک دوسرے تک نہ پہنچ سکیں۔ ہلکی ہوانے ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس راز کو چھپالیا، اور یوں یہ لمحہ، جو ایک فیصلہ کن ٹکراؤ بن سکتا تھا، خاموشی کے پردے میں ڈھل گیا۔

...°...

مولانا سرور اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک گل بانو کی غیر متوقع آواز نے اسے چونکا دیا۔

۔“مولانا صاحب”، وہ سخت لہجے میں بولی۔ مولوی نے مڑ کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں حیرت اور خدشات کی گہری چھاپ ابھری۔

لمحے بھر کے لیے، اس کے ذہن میں یہ خیال تیزی سے گزرا—کیا شانزہ نے گل بانو کو میری بد اعمالیوں کے متعلق آگاہ کر دیا ہے؟ کیا اس راز کی نقاب کشائی ہونے والی ہے؟

گل بانو کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب کے آثار نمایاں تھے، جیسے وہ کسی اندرونی طوفان سے نبرد آزما ہو۔ وہ تیزی سے مولوی کی طرف بڑھی اور کہا، ”مولوی صاحب، میرا شوہر برباد ہو گیا ہے۔“

مولوی سرور کارنگ لمحے بھر کے لیے فق ہو گیا، اس کی بھنویں حیرت سے اٹھ گئیں۔ جیسے اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں یہ خیال جڑ پکڑ چکا تھا کہ اب اس کے اعمال کے نتائج سامنے آنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

ایک مصنوعی حیرانی اور مصنوعی غمگینی کے ساتھ، مولوی نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی بدنیتی کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی۔

گل بانو نے اپنے دل کے بوجھ کو مزید ہلکا کرنے کی کوشش کی، اس کے لبوں سے الفاظ نکلے، ”مولوی صاحب، ہم تباہ ہو گئے ہیں۔“

مولوی سرور کے چہرے پر چھائی مصنوعی سنجیدگی کے نیچے سے اس کا مکارانہ چہرہ جھلک رہا تھا۔ وہ آنے والے طوفان کا سامنا کرنے کو تیار تھا، جیسے وہ جانتا ہو کہ کس طرح اس حقیقت سے خود کو بچانا ہے۔

اس نے اپنی خباثت میں گل بانو کی طرف انگلی اٹھائی، اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی، اور وہ گل بانو کے الفاظ کو کسی کمزور دلیل کی طرح رد کر رہا تھا۔

- ”یہ سب تو ہونا ہی تھا!“ -

- مولوی نے اپنی مذموم مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”کس نے کہا تھا تعویذ اتار کر پھینک دو؟“ اس کے لہجے میں ایک عجیب سی بے حسی اور سفاکی تھی، جو ہر شے کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی عکاس تھی۔

گل بانو، جو پہلے ہی الجھن اور خوف کا شکار تھی، اس جواب پر چپ سی ہو گئی۔ اس کی نظریں جھک گئیں، جیسے وہ مولوی کی شیطانی چالوں کے جال میں پھنسی ہو اور اپنے حق کے دفاع میں ناتوانی کا شکار ہو۔

مولوی سرور نے اپنے نرم، مگر دھوکہ دہی سے لبریز لہجے میں کہا، ”میں جانتا ہوں، تمہارے شوہر پر بڑا گہرا وار کیا گیا ہے۔“ اس کے الفاظ گل بانو کے دل پر کسی تیز دھار خنجر کی طرح لگے۔

”کالا جادو کیا گیا ہے تمہارے شوہر پر، تاکہ وہ مر جائے اور تم اولاد سے محروم رہو۔“

گل بانو کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ”کیا؟“ اس کی آواز میں لرزش تھی، جیسے اس کے سامنے سے زمین سرک رہی ہو۔

مولوی سرور کی آنکھوں میں ایک شیطانی مسکراہٹ تھی، جیسے وہ اپنی کامیابی کے نشے میں سرشار ہو۔ اس نے اپنی مکار نظریں گل بانو پر گاڑ دیں، اور اپنی زبان سے زہر اگلا ”یہ ہی حقیقت ہے، اور تمہیں میری مدد کے بغیر اس عذاب سے نجات ممکن نہیں۔“

یہ سن کر گل بانو لرزتے ہوئے پیچھے ہٹی، جیسے اسے اپنی کمزوری اور مولوی کی خباثت کا اندازہ ہو گیا ہو، لیکن اب وہ اس جال سے نکلنے کے قابل نہ رہی۔

مولانا سرور کی آنکھوں میں ایک عیارانہ چمک تھی، جیسے کسی شکاری کو اپنی شکار کے قریب پہنچنے کا پورا یقین ہو۔ اُس نے گل بانو کی مایوسی اور بے بسی کو اپنی مکروہ مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے سر کو ہلکی سی جھٹکی دی اور بظاہر افسوس میں سرگوشی کی، ”افسوس، یہ سب تو ہونا ہی تھا۔“

گل بانو کے لب لرزنے لگے، اس کی آواز گھبراہٹ سے بھری ہوئی تھی،

۔ ”لیکن یہ کس نے کیا؟“ وہ جاننا چاہتی تھی، مگر مولوی سرور نے اس سوال کا جواب یوں نہ دیا، جیسے جان بوجھ کر اسے عذاب میں ڈالنا چاہتا ہو۔

اس کی نظر گل بانو کی آنکھوں میں ایسی گہرائی سے گھسی جیسے وہاں سے اس کی باقی ماندہ امیدوں کو نوچ نکالنا چاہتا ہو۔ پھر اُس کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ کھیلنے لگی جو شقاوت کی داستان سناتی تھی۔

۔ ”اگر میں تمہیں بتا دوں کہ کس نے یہ جادو کیا ہے، تو احمر کے نصیب کی کڑیاں اُلجھ جائیں گی۔“ اس کے الفاظ میں ایک غیبی دھمکی تھی، جیسے وہ احمر کی زندگی اور موت کا اختیار مولوی سرور کے ہاتھ میں تھا۔

گل بانو نے خوف اور امید کے درمیان لرزتے ہوئے کہا، ”مگر... کیا اس جادو کا کوئی توڑ ہے؟“۔

مولوی سرور نے ایک لمحہ توقف کیا، اُس کے چہرے پر ایسے شیطانی سکون کا سایہ پھیل گیا، جیسے وہ اس مکروہ کھیل میں آخری مہرے کو جگہ دے رہا ہو۔ ”ہاں، ایک حل ہے۔“ اس کے لہجے میں اب نرم ہمدردی کی بجائے، سفاکانہ خباثت تھی۔

۔ ”کیسا حل؟“ گل بانو کی آواز میں امید کا ایک ٹوٹا ہوا عکس تھا۔

مولوی سرور نے اپنے سر کو جھکا کر ناپاک ارادے چھپانے کی ناکام کوشش کی، پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے بھاری الفاظ میں بولا، ”لیکن سوال یہ ہے کہ تم یہ کرنے کو تیار ہو؟“۔

گل بانو نے اپنی لرزتی ہوئی آنکھوں میں عزم جمع کرتے ہوئے کہا، ”احمر کے لیے کچھ بھی!“۔

مولوی سرور نے فاتحانہ انداز میں سر ہلایا اور وہ منحوس مسکراہٹ دوبارہ اُس کے چہرے پر پھیل گئی، ”تمہیں احمر سے طلاق لے کر عید پر کسی اور شخص سے نکاح کرنا ہو گا۔ صرف اسی صورت میں تم اس جادو کو ٹال سکتی ہو، اور احمر کی جان بچا سکتی ہو۔“۔

گل بانو پر یہ الفاظ کسی بھاری چٹان کی مانند گرے۔ اس کے چہرے پر گہرا صدمہ تھا۔ ”نہیں!“۔ وہ چیخ اٹھی، ”میں ایسا نہیں کر سکتی!“۔

مولوی سرور کے چہرے پر ابلیسی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی، جیسے وہ پہلے ہی جانتا تھا کہ گل بانو اس جال سے بچ نہیں سکتی۔ ”کیا تم احمر کو مرنے کے لیے چھوڑ دو گی؟“ اُس نے ہمدردی کے پردے میں لپٹی ہوئی ظالمانہ دھمکی دی۔

”عید میں صرف کچھ دن باقی ہیں، لیکن کون جانے کہ احمر کے پاس کتنی سانسیں بچی ہیں۔“ اُس کے الفاظ گل بانو کے دل میں زہر گھول رہے تھے۔ جیسے اُس کی ہر سانس مولوی کے مکروہ ارادوں کی بھینٹ چڑھنے والی ہو۔

مولوی کے الفاظ گل بانو کے دماغ میں گونجنے لگے، ”وہ مر جائے گا“، اور یہ بازگشت اس کے ضمیر کو تاریک دھند میں دھکیل رہی تھی۔

گل بانو کا دل خوف اور بے یقینی کے طوفان میں گھر چکا تھا۔ اُس کے دل پر ایک نامعلوم بوجھ تھا، جیسے ہر فیصلہ ایک نئی بربادی کی طرف لے جائے گا۔ اس کی نظریں مولوی سرور کی طرف مڑی ہوئی تھیں، جو اُسے آہستگی سے اپنی شیطانی چال میں دھکیل رہا تھا۔

گل بانو کی آنکھیں پانی سے بھر آئیں، اور اس کا وجود سسکتے ہوئے اُس خلاء میں گم ہو چکا تھا، جہاں صرف مولوی سرور کی بدنیتی کی گونج سنائی دیتی تھی۔

وہ ایک ایسی خاموشی میں گھری ہوئی تھی جو اس کی روح پر بوجھ بن گئی تھی۔ مولوی سرور کے الفاظ ”طلاق لے لو“ جیسے کسی زہریلے سانپ کی سرسراہٹ کی مانند اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔

گل بانو نے آنسوؤں کے بوجھ سے لرزتے ہوئے پیچھے قدم ہٹائے، اس کی دنیا ایک لمحے میں ختم ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ مولوی سرور کی چالوں کا جال تنگ ہوتا جا رہا تھا، اور اس کے پاس کوئی فرار نظر نہیں آ رہا تھا۔

...°...

آدھی روشنی میں ڈوبا ہوا کمرہ ایک فراموش شدہ دور کی باقیات کا عکس پیش کر رہا تھا۔ سورج کی کرنیں پچھلی دیوار پر نصب ایک شکستہ کھڑکی سے چھن کر اندر داخل ہو رہی تھیں، جنہوں نے فضا میں ایک مدھم سی تابانی پھیلا رکھی تھی، گویا کسی قدیم یادگار کے ویران ماحول کو دھیرے دھیرے منور کر رہی ہوں۔

ایک تنہا میز وسط میں کھڑی تھی، اور اس کے پیچھے ایک پرانی، شکستہ کرسی پر ایک لڑکی رسیوں سے مضبوطی سے بندھی ہوئی بیٹھی تھی۔

اس کا چہرہ ایک سیاہ نقاب سے ڈھکا ہوا تھا، جس کے اوپر آنکھوں کے سامنے کا حصہ چاک تھا، جہاں سے اس کی خوفزدہ آنکھیں جھانک رہی تھیں۔

اس کی منتشر زلفیں اور دھندلی شکل اُس اذیت کی گواہی دے رہی تھیں، جسے وہ سہہ چکی تھی۔

اچانک دروازہ کھلا، اور دھندلائی ہوئی روشنی کی ایک تیز جھلک کمرے میں پھیل گئی۔ ساتھ ہی ایک دھندلا ہیولی بھرنے لگا۔

لڑکی کی آنکھوں میں خوف اور الجھن کے سائے لرز اٹھے، اور اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں موند لیں تاکہ غیر متوقع روشنی سے خود کو بچا سکے۔ ہیولی آہستہ آہستہ قریب آتا گیا، اور جیسے جیسے اس کی شکل واضح ہوتی گئی، لڑکی کی آنکھوں میں حیرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہ کوئی اور نہیں، آصف محمود تھا۔

آصف کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی، اور اس کی موجودگی فضا میں ایک عجیب سی لرزش پیدا کر رہی تھی۔

وہ آہستہ سے جھک کر لڑکی کے قریب آیا، اس کی آنکھوں میں ایک خوفناک چمک تھی۔ اس نے لڑکی کے پرانگندہ بالوں کی ایک لٹ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور دھیرے سے کہا،

- ”ایمان، تم واقعی بہت خوبصورت ہو۔“ اس کے لہجے میں ایک عجیب سی بے باکی اور خطرناک تحسین تھی۔

ایمان کی آنکھوں میں ایک خاموش التجا چمک رہی تھی، جیسے وہ الفاظ کے بغیر مدد کی درخواست کر رہی ہو۔ آصف سیدھا کھڑا ہوا اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا، اس کا لمس بو جھل اور ناپسندیدہ تھا۔ ”تم اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو، میری جان؟“ اس نے طعنے بھرے انداز میں کہا، جیسے وہ اس کے خوف کا مذاق اڑا رہا ہو۔

ایمان نے گھٹی گھٹی آواز میں احتجاج کیا، مگر اس کی آواز کپڑے کی رکاوٹ میں دب کر رہ گئی۔ آصف کے چہرے پر ایک مکار مسکراہٹ پھیل گئی۔

- ”چلو، میں تمہارے منہ سے یہ پٹی ہٹاتا ہوں، دیکھتے ہیں تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔“

کمرے کی خاموشی میں آصف کی آواز مزید خوفناک ہو گئی تھی، اور تجسس کے سائے گھنے ہو چکے تھے۔

آصف نے ایمان کے چہرے سے نقاب ہٹایا، اور جیسے ہی نقاب اٹھا، اس کی مسکراہٹ لمحے بھر میں فنا ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی اور دہشت کا عجیب سا امتزاج پیدا ہوا۔

وہ ایک دم پیچھے ہٹا، جیسے کسی نادیدہ طاقت نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا، اور لبوں پر لرزش کے ساتھ سرگوشی نکلی، ”میری بیٹی...“

جی ہاں وہ ایمان نہیں اس کی اپنی بیٹی ارم تھی

آصف کی آنکھیں ارم کی آنکھوں سے ملیں، اور ایک لمحے کے لیے کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔

آصف بے یقینی کے عالم میں، کانپتے ہاتھوں سے آگے بڑھا اور جلدی سے رسیوں کو کھولنے لگا۔ جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا، اس نے کانپتے ہاتھوں سے اس کے منہ سے پٹی ہٹائی، اور اس کے ماتھے پر ایک بوسہ دیا۔

۔ ”یہ کس نے کیا؟“

اس نے بے چینی سے پوچھا، ”کس نے تمہیں نقصان پہنچانے کی جرات کی؟“۔

ارم ابھی تک خوف کے حصار میں جکڑی ہوئی، اپنی آواز تلاش کرنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔

کپ آصف کی بے ہنگم تفتیش کو اچانک ایک سرد اور کرخت آواز نے کاٹ دیا، گویا ہوا میں کسی نادیدہ خنجر نے وار کیا ہو، ”میں نے۔“ وہ اعلان کمرے کی فضا میں معلق ہو کر خوف و اسرار کا ایک نیا باب کھول رہا تھا، جس نے آصف کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کر دی۔

آصف کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت سے پھیل گئیں، اور اس کا چہرہ دھیرے دھیرے مدھم حیرت میں ڈوب گیا۔ ایمان نے اپنی آنکھوں میں سرد مہری لیے آصف کی جانب نگاہ ڈالی، گویا اس کے دل میں ہمدردی کا کوئی شائبہ بھی نہ تھا۔

آگے بڑھتے ہوئے، ایمان نے تیز لہجے میں کہا، ”تم اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں آگئے ہو۔“ آصف نے قدم بڑھانے کی کوشش کی، مگر دوسرے شخص کی برق رفتار مداخلت نے اسے روک دیا۔

آصف نے صدمے میں لڑکھڑاتے ہوئے ایمان اور اس پر اسرار شخص کو دیکھا، اور اپنی آواز میں تلخی اور الزام بھر کر بولا، ”تم نے مجھے دھوکہ دیا۔“

ایمان نے ناپ تول کر قدم بڑھایا اور بے حسی سے کہا، ”انہوں نے بس اپنا فرض ادا کیا ہے۔ تم نے پچیس لاکھ میں ان کی وفاداری خریدی تھی، اور میں نے ستر لاکھ میں۔ یہ کھیل ایسا ہی ہوتا ہے — ہر کسی کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے۔“

دوسرے آدمی نے آصف کو زخمی اور سخت رسیوں میں جکڑتے ہوئے ایک کرسی کی طرف دھکیل دیا۔ آصف کی بیٹی نے نرمی سے التجا کی، مگر اس کی درخواستیں بیکار ثابت ہوئیں۔

ایمان نے سرد مہری سے اس آدمی کو کہا، ”اس لڑکی کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ، اور جب میں کہوں، تب اسے چھوڑنا۔“

آدمی، جو آصف کی بیٹی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا، اسے باہر لے جانے لگا جب کہ آصف کی جانب سے بے بسی کی ایک گونجتی ہوئی چیخ بلند ہوئی، مگر ایمان نے پرسکون اور بے پروائی سے کہا، ”فکر مت کرو، میں تمہاری طرح بے ضمیر و بے غیرت نہیں ہوں۔ تمہاری بیٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

جب وہ شخص آصف کی بیٹی کو لے کر کمرے سے نکل گیا، ایمان، جو کہ ایک شاندار میرون اور سفید لباس میں ملبوس تھی، کرسی پر براجمان ہوئی۔

اس کے لباس کی زعفرانی چوٹی پر نازک کڑھائی کی گئی تھی، اور اس کی آستینیں پھولدار پف کی مانند تھیں، جس کے نیچے ایک میرون اسکرٹ تھا جس پر برف جیسے سفید موتیوں کی جھلکیاں نمایاں تھیں۔ اس کے پیر سفید اونچی ایڑی کے جوتوں میں چھپے ہوئے تھے جن پر میرون پھولدار نقش و نگار تھے، اور اس کے کھلے بالوں نے اس کے چہرے کو ایک فریم کی مانند گھیر رکھا تھا۔

ایمان نے سرد لہجے میں آصف کو مخاطب کیا، ”کچھ مجھے ایمان کہتے ہیں، کچھ نینسی، اور تم مجھے گیم چینجر کہہ سکتے ہو۔“

اس نے آصف کی طرف سخت نگاہ ڈالتے ہوئے کہا، ”تم نے مجھے اغوا کیا تھا،“

اس نے لا تعلقی سے کندھے اچکا دیے، ”مگر میں اب تک یہ نہیں سمجھ سکی کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن ایک بات میں جانتی ہوں—اپنی بجائے اپنی بیٹی کو دیکھو۔“

ایمان کے ہونٹوں پر ایک افسردہ مسکراہٹ چھا گئی۔ ”یہ بات قابل تعریف ہے کہ تم اپنی بیٹی کے محافظ ہو، جیسے میرے والد نہیں تھے۔ مگر افسوس کہ تم دوسروں کی بیٹیوں کے لیے شیر نہیں، بلکہ کتے یا گیدڑ کی مانند ہو۔ یہ نہایت قابل مذمت بات ہے۔“

ایمان، ایک بے قابو شعلہ، جس کی لپیٹ میں ہر چیز کو خاکستر کر دینے کی صلاحیت تھی، آج اُس کی آنکھوں میں وہ ہی بھڑکتی ہوئی آگ تھی جس نے برسوں سے صبر کے پردے میں جلنا سیکھا تھا۔ وہ ایک محض چنگاری نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی قیامت خیز آگ تھی جس کے سامنے آصف جیسے سنگدلوں کے حوصلے بھی پگھل جائیں۔

اُس کی آنکھوں میں انتقام کا جوش اور عزم کی لویں ناچ رہی تھیں، گویا ہر رکاوٹ کو راکھ میں بدلنے کا عہد کر چکی ہو۔ آج وہ اس دنیا کی ستم ظریفی کا ایسا مظہر تھی جو اپنی تقدیر کو از سر نو لکھنے پر تلی ہوئی تھی۔

کمرے کی فضا میں گھٹن اور خوف کا راج تھا، جیسے کوئی طوفان اس سکوت کے پردے کے پیچھے چھپا بیٹھا ہو۔ ایمان آہستہ آہستہ اُٹھی، ہر قدم جیسے کمرے کی دیواروں پر لکھی ہوئی کہانی کا ایک نیا باب رقم کر رہا ہو۔

آصف، بے بس اور معاف نہ کرنے والی رسیوں میں جکڑا ہوا، ایمان کی جانب نظر کرنے کی ناکام کوشش میں مبتلا تھا، لیکن اُس کی گردن میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اپنا سراپر اٹھا سکے۔ کمرے کی فضا میں معلق بے یقینی کا سایہ ہر لمحے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

ایمان کے ہاتھ میں بجلی کے جھٹکے دینے والی خوفناک مشین چمک رہی تھی، وہ ہی مشین جو کبھی پاگلوں کو سزا دینے کے لیے استعمال ہوتی تھی، آج انصاف کا آلہ بن چکی تھی۔

آصف کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں، اُس کے چہرے پر حواس باختگی کا سایہ تھا، وہ جانتا تھا کہ آج اُس کے کیے کی سزا اُسے ملنے والی ہے۔

۔ ”پاگل ہو گئی ہو تم!“ آصف کی آواز کانپتی ہوئی نکلی، جیسے اُس کے الفاظ میں بھی دم نہ رہا ہو۔

ایمان کی مسکراہٹ اُس کے اندر بھڑکتے شعلوں کی گواہی دے رہی تھی، اور اُس کی آنکھوں میں پانچ سال کی اذیت اور صبر کا بھاری بوجھ تھا۔ ”پاگل؟“ اُس نے سرد مہری سے کہا، ”یہ بدلہ ہے، آصف۔“ اُس کی آواز میں ایک گونج تھی، جیسے ہر لفظ اپنے ساتھ سالوں کا زہر اور انتقام لے کر آیا ہو۔

کمرے کی فضا گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی، اور ایمان کی موجودگی جیسے ہر چیز پر حاوی ہو چکی تھی۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھی، اُس کے ہاتھ میں موجود مشین اب شاعرانہ انصاف کا مظہر بن چکی تھی۔

آصف کی بے بسی اُس کے چہرے پر عیاں تھی، اُس کی آنکھوں میں وہ ہی خوف تھا جو پانچ سال پہلے ایمان کی آنکھوں میں تھا۔

- ”تم نے میرے ساتھ جو کیا تھا، آج اس کا حساب چکانے کا وقت ہے۔“ ایمان کی آواز میں ایک عجیب قسم کا ٹھہراؤ تھا، لیکن اُس کے الفاظ گویا بجلی کی مانند کمرے میں گونج اٹھے۔

آصف، جو کبھی اپنی چالاکیوں پر نازاں تھا، آج رسیوں میں جکڑا ہوا، ایمان کے سامنے بے بس بیٹھا تھا۔ اُس کی ساری مکاری، ساری چالیں، آج اُس کے کسی کام نہ آرہی تھیں۔ ایمان کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی، وہ مسکراہٹ جو اُس کی بے بسی اور آصف کی شکست کا علامہ تھی۔

آج، وقت کا پہیہ گھوم چکا تھا، اور آصف اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لیے تیار تھا۔

جہاں ایک طرف آصف کے چہرے پر خوف تھا تو دوسری جانب ایمان کا چہرہ اُس عزم کی تصویر تھا جس نے برسوں کی تکالیف اور اذیتوں کے بدلے کا خواب دیکھا تھا۔

کمرہ ایک گواہ کی طرح خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا، جیسے آنے والے طوفان کا منتظر ہو۔ دیواروں پر پڑی ہوا کی ہلکی تھر تھراہٹ تک بھی اس منظر کے احترام میں تھم سی گئی تھی۔ آصف، اُس کرسی سے بندھا ہوا تھا جو اب اس کی تقدیر کا اٹل مرکز بن چکی تھی۔

اس کی آنکھوں میں خوف اور بے بسی کی وہ جھلک تھی جو اُس انسان کی ہوتی ہے جسے اپنے انجام کا یقین ہو جائے۔

ایمان نے مشین کے بٹن کو دبایا، اُس کی آنکھوں میں بے رحم چمک ابھر آئی۔

”تم نے میری راتوں کو بے سکونی کا شکار بنایا، تم نے میرے بچپن کو تاریکی میں ڈھکیل دیا، ”ایمان کی آواز میں وہ کرب تھا جو روح کی گہرائیوں سے اُبل رہا تھا۔“ آج تمہاری ہر چیخ، ہر فریاد، میرے دل کی سسکیوں کا حساب دے گی۔ تمہیں موت نہیں ملے گی آصف، کیوں کہ موت تمہارے لیے ایک نعمت ہوگی، اور میں تمہیں اُس نعمت سے محروم رکھوں گی۔“۔

آصف کے چہرے پر خوف کے سائے مزید گہرے ہو گئے۔ اُس کے جسم میں لرزش، اور آنکھوں میں وہ لرزاں تمنائیں کہ شاید کسی طرح بچ نکلے۔ مگر ایمان کی نظروں میں وہ ہی سرد عزم تھا جس نے رحم کے ہر امکان کو مٹا دیا تھا۔

۔ ”ڈر رہے ہو آصف؟“ ایمان نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا، اُس مسکراہٹ میں حقارت اور تمسخر کا ایک ایسا پہلو تھا جو ہر انسان کے اندر تک کاٹ کر رکھ دے۔ ”موت کا خوف؟ یہ خوف تمہیں بھی اُسی طرح جکڑ رہا ہے جس طرح تم نے مجھے جکڑا تھا۔ مگر یاد رکھو، آج تمہیں موت کی طلب بھی تسکین نہیں دے گی۔“۔

مشین کے بٹن کو نیچے کیا گیا اور ننگی تاروں سے نکلتی بجلی کی چمک اور آواز نے کمرے کو لرزادیا۔

ایمان اب کی بار وہ تاریں آصف پر چھوڑیں۔

آصف کی چیخ بلند ہوئی، مگر ایمان کا دل اس چیخ سے پگھلنے والا نہ تھا۔ اُس کے چہرے پر وہ ہی سرد سکون تھا، جیسے وہ ایک غیر انسانی فیصلہ نافذ کر رہی ہو، ایک ایسا فیصلہ جس میں جذبات کی جگہ صرف عدل تھا۔

”یہ تمہارے ہر جرم کا حساب ہے،“

ایمان نے کڑے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے ہر گناہ کی قیمت تمہیں چکانی ہوگی، اور میں تمہیں ہر پل اُس تکلیف کا احساس دلاؤں گی جو تم نے مجھے دی۔“

آصف کی چیخیں فضا میں تحلیل ہونے لگیں، لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ اذیت کا اختتام نہیں بلکہ ایک نئے عذاب کا آغاز تھا۔ ایمان کے قدم اُس کے گرد گھوم رہے تھے، جیسے وہ اپنی طاقت اور اختیار کی مکمل تصویر بن چکی ہو۔

”تم چاہو گے کہ موت تمہیں گلے لگالے،“ ایمان نے سرگوشی میں کہا۔

۔ ”مگر تمہارے گناہ تمہیں اس سے محروم رکھیں گے۔ تمہیں ہر سانس میں اپنے کیے کا احساس ہوگا، اور میں دیکھوں گی کہ تم کس طرح اپنی ہی بربادی کا بوجھ اٹھاتے ہو۔“

کمرے میں ایک بھیانک خاموشی چھا گئی۔ آصف کی آنکھوں میں موت کی طلب تھی، مگر ایمان کے چہرے پر وہ ہی بے رحم سکون تھا جو اُس کے انتقام کی آگ سے دہک رہا تھا۔

یہ انتقام تھا—سرد، بے رحم، اور مکمل۔ ایمان کی آنکھوں میں اب کوئی آنسو نہیں تھا، صرف وہ آگ تھی جو اُس کی تقدیر کو بدل چکی تھی۔

دفعاً تاروں کے پیچ و خم میں الجھا ہوا آصف، لرزتی ہوئی کرسی پر قید تھا، جبکہ ایمان کی آنکھوں میں غضب اور آنسوؤں کی چمک موجود تھی۔ ان آنکھوں میں انتقام کی وہ آگ دہک رہی تھی جو برسوں کی مظلومیت اور اذیت کا شعلہ بن چکی تھی۔

اس کے ہاتھوں میں پہنے ہوئے دستانے، گویا بجلی کی دھاروں کو روکنے کا ہتھیار نہیں بلکہ ماضی کی سفاک یادوں اور زخموں سے خود کو محفوظ رکھنے کا استعارہ تھے۔ ”یہ سزا ہے، میری نیندیں چرا لینے کے جرم میں!“

ایمان کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ، گویا صدیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے، جیسے ہی اس نے تاروں کو کھینچا، آصف کے جسم پر اذیت کا ایک اور طوفان نازل ہوا۔

کمرہ، ایک تپتے میدان جنگ کی صورت اختیار کر گیا تھا، جہاں ہر بجلی کا جھٹکا، ایمان کی اذیتوں کا انعکاس تھا۔ فضا میں چیخوں کا شور اور انتقام کے نشتر گونج رہے تھے، اور ہر ایک لمحہ، آصف کے حواس پر بجلی کی دھاروں کا حملہ کر رہا تھا، جیسے زندگی اُس کے جسم سے بھاگنے کے لیے بے تاب ہو، مگر موت ابھی اُس سے بہت دور تھی۔

۔ ”یہ اُس ماضی کے لیے ہے جو تم نے سیاہ کر دیا!“۔

ایمان کی آواز، برقی چمک اور کرسی کے لرزتے پائوں کی گونج میں تحلیل ہو گئی، جبکہ اُس نے دوبارہ بٹن دبایا، اور ایک اور جھٹکا آصف کے وجود کو جکڑ گیا۔

آصف، جو کبھی غرور اور تکبر کا مجسمہ تھا، اب زمین کی بے رحم گرفت میں ٹوٹتی ہوئی کھپتلی کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے وجود پر ایمان کے انتقام کی وہ لہر دوڑ رہی تھی جسے وہ کبھی روک نہ سکا۔

ایمان کے ہونٹوں سے ایک تلخ مسکراہٹ پھوٹی، ”یہ میرے بچپن کو برباد کرنے کی سزا ہے!“۔ اس کے الفاظ میں وہ کاٹ تھی جس نے آصف کی روح کو مزید چیر دیا۔ ہر لفظ، ہر جھٹکا، اُس کی سانسوں کے تسلسل کو مزید کمزور کر رہا تھا، اور ایمان کی آنکھوں میں انتقام کی گہرائی اور شدت مزید بڑھتی جا رہی تھی۔

کمرے کی ہر دیوار، ہر زاویہ، ایمان کے انتقام کی شدت کو جذب کر رہا تھا، گویا وہ خود بھی ایک گواہ ہو جس کے سامنے ایک عہد کے گناہوں کا حساب لیا جا رہا ہو۔

آصف کی چیخیں، اُس کے گناہوں کا حساب چکاتے ہوئے، کمرے میں گونج رہی تھیں۔ لیکن ایمان کے چہرے پر کوئی نرمی، کوئی رحم نہیں تھا۔ وہ خود انصاف کا پیمانہ تھی، اور وہ اس پیمانے کو بھرنے پر تلی ہوئی تھی۔

”یہ اس بے گناہ وجود کے قتل کی سزا ہے، جو اس دنیا میں کبھی آیا ہی نہ تھا!“ ایمان کی آواز میں شدت تھی، اور اُس کے ہاتھوں سے تاروں کا آخری وار آصف پر ٹوٹ پڑا۔

بجلی کی وہ شدت، گویا اُس کی روح کو جلا کر راکھ کر دینے والی تھی۔ آصف کا جسم لرزتے ہوئے بے جان ہو گیا، اس کے بالوں سے دھواں نکل رہا تھا، اور وہ کرسی سمیت زمین پر گر گیا۔ میز کے اوپر تاریں جھول رہی تھیں، گویا وہ بھی ایمان کے انتقام کے ناچ کا حصہ ہوں۔

ایمان آصف کی طرف بڑھتے ہوئے اپنی آنکھوں میں غضب کی چنگاریاں لیے، پنجنوں کے بل نیچے بیٹھ گئی۔ اُس نے آصف کا گریبان بے دردی سے پکڑا اور جھٹکے سے اُسے اوپر کی طرف کھینچا۔

آصف خوف سے کانپ رہا تھا، مگر اُس کے جسم میں کوئی طاقت باقی نہ تھی کہ وہ احتجاج کرتا۔ ایمان کی نظریں اُس پر جمی تھیں، جیسے شعلے برساتی ہوں، اور اُس کے الفاظ اُس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہے تھے۔

۔ ”اگر آئندہ تُو نے مجھ پر بری نظر ڈالی، یا کسی بھی قسم کی گھٹیا حرکت کی جرأت کی، تو ایک بات یاد رکھ۔ جس سرکس میں تیرا باپ جو کر تھا، اُسی سرکس میں، میں تجھے تماشا بنادوں گی!“۔

ایمان کی آواز میں غضب کی گھن گرج تھی۔ اُس کی چیخ فضا میں تیرتی ہوئی آصف کے حواس کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

۔ ”سمجھا؟“۔

وہ چلا کر بولی، جیسے اُس کے الفاظ خود سزا بن کر آصف کے وجود پر برسیں۔

یہ ایک آخری وارنگ تھی، تنبیہ جو کسی رحم کے بغیر تھی۔ اُس نے آصف کا گریبان ایک جھٹکے سے چھوڑا، جس سے وہ پیچھے کی طرف جھکتا ہوا فرش پر جاگرا، جیسے کسی بے جان کٹھ پتلی کی طرح۔

ایمان اُس کے بے جان جسم کو روندتے ہوئے کھڑی ہوئی اور آگے بڑھنے لگی۔ اُس کے قدموں کی گونج کمرے کی خاموشی کو چیر رہی تھی، مگر کچھ سوچتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے رُک گئی۔

وہ پلٹی، اور آصف کی طرف اپنی انگلی تانتے ہوئے خبردار کرنے والے انداز میں بولی، ”یہ آخری بار ہے! اگر دوبارہ کوئی حرکت کی، تو میں تیری ہڈیاں توڑ کر تجھے ایسا عبرتناک انجام دوں گی کہ تُو پُل کے نیچے بھیک مانگتا پھرے گا، ہاتھ میں کٹورا لیے، اور زندگی بھر پچھتاوے کی زنجیروں میں جکڑا رہے گا۔“

ایمان کی آنکھوں میں قہر برس رہا تھا اس، کا ہر لفظ زہر میں ڈوبا ہوا تھا وہ آصف کو خشمگین نظروں سے دیکھتے ہوئے پلٹی اور اپنی ایڑیوں کی ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ کمرے سے نکل گئی اس کے قدموں کی گونج کمرے کے خاموشی میں دیر تک سنائی دیتی رہی جیسے انتقام کی آخری صدا

...°...

ایمان دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی دوسرے کمرے میں داخل ہوئی جہاں ارم کو کرسی سے باندھا گیا تھا۔

ارم کی آنکھوں میں خوف کے آثار نمایاں تھے، جیسے وہ کسی بدترین انجام کا انتظار کر رہی ہو۔ ایمان کی آمد پر اغوا کار جلدی سے کمرے سے نکل گئے، ارم کی خوفزدہ حالت کو تنہا چھوڑتے ہوئے۔ ایمان اپنی سوتیلی بہن کے سامنے کھڑی ہوئی، اُس کی آنکھوں میں نفرت اور غصے کا طوفان موجزن تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک ایسے عزم کا سایہ تھا جو کسی بھی قسم کی مزاحمت کو راکھ کر سکتا تھا۔

- ”تم جانتی ہو تمہارے باپ نے مجھے کیوں اغوا کیا؟“ ایمان نے سرد لہجے میں کہا، جیسے اُس کے الفاظ آگ برسا رہے ہوں۔

ارم نے ایک پل کے لیے آنکھیں بند کر لیں، جیسے وہ سچ کو قبول کرنے سے کتراتے ہو، مگر پھر اُس خاموش فہم کا اعتراف کرتے ہوئے اُس کی نظریں جھک گئیں۔

ایمان نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی خاموشی کو پڑھا، اور پھر ایک بار گہری سانس لیتے ہوئے کہا،
”یعنی تم جانتی ہو بہت خوب۔“

- ”اب بتاؤ، تمہارے باپ نے مجھے کیوں اغوا کیا؟“ ایمان کی نظریں تیز ہوئیں، اُس کے سوال میں صرف جواب نہیں بلکہ سچ کا پردہ چاک کرنے کی طلب تھی۔

ارم کے ہونٹ کپکپائے، اُس کی سانسیں تیز ہو گئیں۔ ”م... موم کے گردے فیل ہو گئے ہیں۔ صرف ایک گردہ کام کر رہا ہے، لیکن ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ ٹرانسپلانٹ ضروری ہے۔“

ایمان نے اُس کے الفاظ کو سنتے ہی حقیقت کا ادراک کر لیا۔ اُس کی آنکھوں میں سختی آگئی اور چہرہ سخت جذبات کی آماجگاہ بن گیا۔ ”تو مطلب یہ کہ تمہارے باپ نے مجھے اس لیے اغوا کیا تا کہ وہ میرا گردہ نکال کر تمہاری ماں کو دے سکے، کیوں کہ میرا گردہ اُس کے ساتھ میچ کرتا ہے؟“ اُس کی آواز میں تلخی اور غم کی آمیزش تھی، جیسے وہ ایک زخم کو کھرچ رہی ہو جو کبھی نہیں بھرتا۔

ارم نے ایمان کی نظریں ملانے کی ہمت نہ کی اور سر جھکا لیا۔

ایمان نے گہری سانس لیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا، جیسے وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں کچھ سوچ رہی ہو۔ ”میری ماں سنگ دل ہے،“ اُس نے انتہائی مایوسی کے ساتھ کہا۔

۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ وہ میری ماں ہے۔“ اُس کے لہجے میں ایک عجیب سی دردی کی بازگشت تھی، جو اُس کے دل کے اندر کے دکھ کی گواہی دے رہی تھی۔

ایمان کی نظریں ارم پر جمی تھیں، اور اُس کی آنکھوں میں انتقام اور غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ اچانک ایک جذباتی جوش میں بولی، ”اگر میری ماں نے مجھ سے کبھی محبت سے رابطہ کیا ہوتا تو میں خوشی خوشی اُسے نہ صرف اپنا گردہ بلکہ اپنی جان بھی دے دیتی۔“ اُس کی آواز میں درد اور سچائی کی گہرائی تھی، جیسے وہ اپنی پوری زندگی کا نچوڑ بیان کر رہی ہو۔

۔ ”باوجود اس کے کہ وہ مجھے دنیا میں لانا نہیں چاہتی تھی، اُس نے پھر بھی مجھے جنم دیا۔ دنیا کا سب سے بڑا درد، موت کے بعد کا درد، بچے کو جنم دینے کا درد اُس نے برداشت کیا۔“

مگر اُس لمحے کی جذباتی کیفیت کے باوجود، ایمان نے جلد ہی اپنی آنکھوں میں نفرت کی چمک واپس لائی۔، نفرت سے لبریز لہجے میں بولی، ”لیکن جو انہوں نے میرے ساتھ کیا ہے، اب نہ گردہ دوں گی، نہ اپنا کوئی حصہ۔ وہ جہنم میں جائیں، مجھے کوئی پرواہ نہیں!“ اُس کے الفاظ میں غصے اور انتقام کی شدت تھی جو پورے ماحول کو چیر رہی تھی۔

ایمان نے ارم کی طرف تیز نگاہ ڈالی اور اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی

یو۔ ایس۔ بی نکالی، اُسے ہوا میں لہراتے ہوئے بولی

۔، ”پولیس کو شامل کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا۔“

اُس نے ارم کی طرف یو۔ ایس۔ بی پھینکی، جس میں آج کے تمام واقعات کا ریکارڈ موجود تھا، بشمول آصف کا ایمان کو اغوا کرنے کا اعتراف۔ ”اس میں وہ ویڈیوز ہیں جہاں تمہارے باپ نے خود میرے اغوا کا اعتراف کیا ہے۔ اگر تمہیں مزید کاپیاں چاہئیں تو بے فکر ہو کر مانگ لینا۔ میرے پاس کافی ہیں۔“

اُس نے ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”اگر تم سب اپنی ساکھ اور کاروبار کی فکر کرتے ہو، تو خاموشی اختیار کرنا بہتر ہوگا، ورنہ ہر ثبوت تمہارے خلاف استعمال ہوگا۔ میرا باپ تو پہلے ہی تمہارے باپ کا دشمن ہے، اُسے بس موقع چاہیے تمہیں برباد کرنے کا۔“ اُس کے الفاظ میں چالاکی اور ہوشیاری جھلک رہی تھی، جیسے وہ اپنی برتری کو مکمل طور پر سمجھ چکی ہو۔

یہ کہہ کر ایمان کمرے سے باہر نکل گئی، ایک فاتحانہ انداز میں، جیسے وہ اُن دونوں کو اُسی جال میں پھنسا کر چھوڑ گئی ہو جو انہوں نے خود بچھایا تھا۔

...°...

سٹاک ہوم سویڈن کے دارالحکومت میں شام کے چھ بج رہے تھے، جو ایک پرسکون لیکن ہلچل سے بھرپور ماحول کا آغاز کر رہا تھا۔

ڈھلتے سورج نے شہر پر گرم سنہری رنگت ڈالی، آسمان کو گلابی اور نارنجی رنگوں سے پینٹ کر دیا۔ شاپنگ پلازے سڑکوں کے دونوں طرف فخر سے کھڑے تھے، جو اپنے شفاف اگواڑے کے پیچھے سامان کی بہتات دکھا رہے تھے۔

جیسے ہی گونار اور کیتھرین صاف ستھری گلیوں میں ٹہل رہے تھے، ایسا لگتا تھا کہ شہر زندگی سے گونج رہا ہے۔ بڑے بڑے بل بورڈز سے مزین عمارتوں نے جدید ترین رجحانات اور پیشکش کی نمائش کی۔

سیاہ پولو شرٹ، سیاہ ڈریس پینٹ، اور چیلسی کے جوتوں میں ملبوس گونار نے نفاست کی ہوا نکالی، جب کہ ایک باریک بریسلٹ اس کی کلائی پر سجا ہوا تھا۔

کیتھرین، خوبصورتی سے اسکے بازو سے جڑی ہوئی، اس کی موجودگی کے ساتھ اس منظر کی تکمیل کی۔

،Biblioteksgatan

سٹاک ہوم کا مشہور شاپنگ ایریا ہے،

ایک مقبول منزل، لوگوں کی متنوع صفوں کے ساتھ پروان چڑھا۔ ہنسی، چہچہانا، اور کبھی کبھار گاڑی کے ہانک نے شہری زندگی کی تصویر بنادی۔

سورج نے اپنا ڈوبتا عکس شروع جاری رکھا، لمبے لمبے سائے ڈالے جو فرش کے ساتھ ساتھ ناچ رہے تھے۔

تاہم، ہم آہنگ شہر کے منظر کے درمیان، اچانک تبدیلی واقع ہوئی جب کیتھرین اور گونار ایک خاص دکان کے قریب پہنچے۔ حیرت انگیز سرخ لباس میں اٹھارہ افراد کی جماعت نے شام کی عام تال میں خلل ڈالا۔

ان کے چہروں پر، ایک آسمانی سفید پینٹ، اور پراسرار سرخ ہیرے کی شکل میں سب سے ہونٹوں نے فوری طور پر جوڑے کی توجہ مبذول کر لی۔

تین قطاروں میں ترتیب دی گئی پوشاکوں میں، ایک خفیہ سرخ مائع پر مشتمل پیالے رکھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ کیتھرین اور گونار نے دور سے دیکھا، ایک غیر معمولی خاموشی نے علاقے کو گھیر لیا۔ ہوا ایک

دوسرے دنیاوی ماحول کے ساتھ گاڑھا ہوا، اور منظر پر بے چینی کا احساس چھا گیا۔ کیتھرین نے حیرانی سے رک کر اس کے سامنے ہونے والی عجیب و غریب رسم کو دیکھا۔

اس کا اظہار گونار سے جواب مانگتے ہوئے خاموش سوالیہ نشان میں بدل گیا

- ”یہ سب کیا ہے گونار۔“ -

وہ سویڈش زبان میں بولی۔ سٹاک ہوم کی متحرک گلیوں کے درمیان جادو کے جوڑنے ان کی شام کے کرچ پر ایک انمٹ نشان چھوڑ دیا، جس سے تجسس اور بے چینی دونوں سے جڑا ہوا ماحول پیدا ہو گیا۔

گونار کی پراسرار مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی جب اس نے سامنے کی دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے “بالینسیگا” -

لفظ تسخیر کی فضا کے ساتھ بولا۔

گونار کی پراسرار مسکراہٹ برقرار رہی جب اس نے کیتھرین کو بالینسیگا اسٹور کی طرف رہنمائی کی۔ کیتھرین نے پریشان ہو کر پوچھا، “کیا مطلب؟” -

کیتھرین، لمحہ بہ لمحہ حیران ہوئی، وضاحت طلب کی، گونار کو وضاحت کرنے کا اشارہ کیا۔

گونار نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا، ”کیا تم جیسی خریداری کی شوقین یہ نہیں جانتی؟ بالینسیگا ایک برینڈ ہے جس نے یہاں اپنی فرنچائز کھولی ہے۔۔ اسی کی۔ ایک پروموشن جاری ہے۔“۔

کیتھرین نے بے ساختہ کندھے اچکاتے ہوئے کہا، ”پروموشن کی ایک حد ہوتی ہے یہ پروموشن کتنی خطرناک ہے۔“۔

بے خوف، گونار نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ”چلو چلتے ہیں ڈارلنگ۔“۔

وہ تھوڑی دور ٹہل گئے اور ان پر اسرار لوگوں کے، برابر سے، گزرے ان پر اسرار لوگوں کو دیکھتے، گونار نے اپنی پر اسرار مسکراہٹ کو برقرار رکھا۔

ان کے پیچھے، ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا، جس نے پر اسرار لوگوں کو ویڈیو پر قید کر لیا، جو منظر عام پر آ کر دلچسپ تھا۔

...°...

بالینسیگا

(Balenciaga)

لاٹینی زبان کا لفظ ہے، جس کا انگریزی ترجمہ

”Baal the King“

(بعل بادشاہ) اور

”Baal the Devil“

(بعل شیطان) کے طور پر کیا جاتا ہے۔

اس حوالے سے قرآن کریم میں سورۃ الصافات

اور الیاس بھی یقیناً پیغمبروں میں سے تھے

(۳۷:۱۲۳)

جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟

(۳۷:۱۲۴)

کیا تم بعل کو پوجتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑ دیتے ہو

(۳۷:۱۲۵)

یہ آیت حضرت الیاس علیہ السلام کے دور کی طرف اشارہ کرتی ہے، جب بنی اسرائیل بعل نامی بت کی پرستش میں مبتلا ہو گئے تھے اور حضرت الیاس علیہ السلام نے انہیں اس شرک سے روکا۔

حضرت الیاس علیہ السلام کا واقعہ:-

حضرت الیاس علیہ السلام بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے تھے۔ علماء کے مطابق، ان کا زمانہ تقریباً ۸۷۵ سے ۸۵۰ قبل مسیح تک تھا۔

آپ کا تعلق جلعاد سے تھا، جو کہ موجودہ اردن کے شمالی علاقے میں واقع ہے۔ بائبل میں آپ کا ذکر ”ایلیاہ تثبیت“ کے نام سے آیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ جنوبی حصے پر حضرت داؤد علیہ السلام کی نسل کی حکمرانی رہی، جبکہ شمالی حصے میں۔ ”اسرائیل“ کے نام سے ایک آزاد ریاست قائم ہوئی جس کا دار الحکومت سامریہ تھا۔

شمالی ریاست اسرائیل میں شرک، بت پرستی، اور ظلم و ستم بڑھتے چلے گئے۔ اس فساد کا آغاز اُس وقت ہوا جب بادشاہ احاب نے صیدا (موجودہ لبنان) کی مشرک شہزادی ایزبل سے شادی کی۔

ایزبل کے زیر اثر بادشاہ احاب نے بعل کی عبادت شروع کی اور سامریہ میں بعل کے نام پر ایک مندر تعمیر کیا۔

اس صورتحال میں حضرت الیاس علیہ السلام اللہ کے نبی کی حیثیت سے منظر عام پر آئے اور بادشاہ احاب کو اللہ کے عذاب کی خبر دی کہ اس کے گناہوں کی وجہ سے اسرائیل کی سرزمین پر بارش نہیں ہوگی اور نہ

ہی اوس پڑے گی۔ حضرت الیاس علیہ السلام کی یہ پیشگوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی اور تقریباً ڈیڑھ سال تک اسرائیل میں بارش نہ ہوئی۔

آخر کار جب احاب کو ہوش آیا اور اُس نے حضرت الیاس علیہ السلام سے مدد طلب کی تو حضرت الیاس نے بارش کے لیے دعا کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ اللہ رب العالمین اور بعل کے درمیان واضح فرق کو بنی اسرائیل کے سامنے ثابت کیا جائے۔

حضرت الیاس علیہ السلام نے لوگوں کے سامنے ایک چیلنج رکھا کہ بعل کے پجاری اپنے دیوتا کے نام پر نذرانہ پیش کریں اور وہ بھی اللہ کے نام پر نذرانہ پیش کریں گے۔

اس چیلنج کی بنیاد یہ تھی کہ جس کا نذرانہ بغیر کسی انسانی عمل کے آسمان سے آگ کے ذریعے جلے گا، وہ ہی سچا خدا ہو گا۔

احاب نے حضرت الیاس علیہ السلام کی اس تجویز کو قبول کیا اور بعل کے 850 پجاری ماؤنٹ کرمل پر جمع ہو گئے تاکہ اس چیلنج کا جواب دے سکیں۔

بعل کے پجاریوں نے اپنے دیوتا سے نذرانہ قبول کرنے کی درخواست کی، لیکن کوئی معجزہ نہ ہوا۔ دوسری طرف حضرت الیاس علیہ السلام نے اللہ کے نام پر نذرانہ پیش کیا اور اللہ کے حکم سے آسمان سے آگ آئی اور نذرانہ کو جلا دیا۔

اس معجزے سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ بعل ایک جھوٹا خدا تھا اور اللہ ہی واحد سچا خدا ہے۔

اس کے بعد حضرت الیاس علیہ السلام نے بعل کے تمام پجاریوں کو لوگوں کے سامنے قتل کرادیا اور پھر بارش کے لیے دعا کی، جس کے بعد اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور بارش ہو گئی۔

اس معجزے کے باوجود، بادشاہ احاب اپنی مشرک بیوی ایزبل کے اثر سے باہر نہ نکل سکا اور وہ حضرت الیاس علیہ السلام کے خلاف سازشیں کرتی رہی۔

حضرت الیاس علیہ السلام کو ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا اور وہ کوہ سینا کے دامن میں ایک غار میں رہنے لگے۔

حضرت الیاس علیہ السلام نے اس دوران اللہ سے دعا کی اور اپنی قوم کی حالت پر افسوس کیا۔ بائبل میں ان کی دعا کے الفاظ یوں ہیں: ”بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو توڑ دیا، تیری قربان گاہوں کو گرایا اور تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کر دیا، اور میں اکیلارہ گیا ہوں۔“

حضرت الیاس علیہ السلام کا پیغام صرف اسرائیل تک محدود نہ تھا، بلکہ انہوں نے یروشلم کے بادشاہ جیہورم کو بھی ایک خط لکھا جس میں اسے اللہ کی نافرمانی پر عذاب کی خبر دی۔ یہ خط بائبل میں یوں نقل ہوا ہے:-

۔ ”خداوند فرماتا ہے کہ تُو اپنے باپ داؤد کی راہ پر نہیں چلا بلکہ اسرائیل کے بادشاہوں کی راہ پر چل کر بدکاری کی۔ تُو نے اپنے بھائیوں کو مار ڈالا اور اپنی قوم کو گمراہ کیا۔ دیکھ، اللہ تیرے لوگوں، تیرے بچوں اور تیرے سامان کو ایک بڑی وبا سے مارے گا اور تُو خود بھی ایک بڑی بیماری میں مبتلا ہو گا۔“

۔ (2 تواریخ، 12: 21-15)

اس پیشین گوئی کے عین مطابق جیہورم کی سلطنت پر بیرونی حملہ آوروں نے حملہ کیا، اس کی بیویاں لے جائی گئیں، اور خود وہ آنتوں کی بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ حضرت الیاس علیہ السلام کی تمام پیشین گوئیاں پوری ہوئیں اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا سے اٹھالیا۔

...°...

پاکستان کی رات کے خاموش لمحوں میں، جب گھڑی نے بارہ بجے کا وقت بتایا، ایمان کے گھر کا اندھیرا بو جھل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ کی چرچر اہٹ کے ساتھ ایمان باہر نکلی اور کچھ ہی دیر بعد مونیٹر کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر موئیز پر پڑی، جس کے چہرے پر الجھن اور تفکر کی عجیب و غریب لہریں تیر رہی تھیں۔

موئیز اپنی نظریں موبائل اسکرین پر مرکوز کیے بیٹھا تھا، جہاں ایک انسٹاگرام ویڈیو میں ایک شخص نہاتے ہوئے اپنی جسمانی نمائش کر رہا تھا۔ موئیز کے چہرے پر ایک چھپی ہوئی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، جس میں ایک عجیب سا فخر اور کشش کا ملاپ تھا۔

ایمان، اس منظر سے صاف ظاہر ہوتی ناگواری کو چھپائے بغیر، ہنسی نہ روک سکی اور طنز کے ساتھ بولی، “کبھی سنا تھا کہ جانوروں میں ہم جنس پرستی پائی جاتی ہے، اس لیے کہ ان میں عقل کی کمی ہوتی ہے؟ مگر یہاں...” اس کی نظر موئیز کے چہرے سے ہوتی ہوئی نیچے تک گئی اور پھر ہلکی مسکان کے ساتھ اس کے جملے ادھورے رہ گئے۔

موئیز نے فوراً ویڈیو بند کی، اس کی آنکھوں میں ایک جلن ابھری۔ وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹا، آنکھیں گھما کر ایمان کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے دھیمی، مگر طنزیہ آواز میں بولا،

۔ “کیا مجھے ہنسنا چاہیے تھا؟” اس کے لہجے میں سرد مہری تھی، جیسے وہ اس گفتگو کو ختم کرنے کا متمنی ہو۔

ایمان نے بھی سنجیدگی سے اسے دیکھا، اپنی سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے زیر لب مسکرائی اور جواب دیا،
۔ “ہنسنے کی بات کہاں؟ تمہارے مستقبل پر تو ابھی بات شروع بھی نہیں ہوئی۔” اس کا جواب کاٹ دار

تھا، جیسے وہ موئیز کی خود ساختہ تصویر کو چکنا چور کر دینا چاہتی ہو۔

مونیز، جو اس لمحے عورت کے روپ میں تھا، نے نظریں گھماتے اتفاقہ اس کی نظریں ایمان کے پاکستانی روایتی لباس پڑیں تو وہ ٹھٹھک گیا۔

سیاہ فراق جس پر رنگ برنگے پھولوں کا دلکش کام کیا گیا تھا۔ ایمان کے گردن پر پیچیدہ نقش و نگار والا سیاہ دوپٹہ ڈھلا ہوا تھا، اور اس کے کندھوں تک لٹکتے ہوئے گھنگریالے بالوں کی وگ اس کی چمک دار جلد کے ساتھ خوبصورتی سے ہم آہنگ تھی۔

اس کے کانوں میں سرخ اور سبز رنگ کی باریک، سیاہ جھمکیاں ہلکورے لے رہی تھیں، جیسے کسی دلکش راز کی داستان سنارہی ہوں۔

مونیز نے اپنی آنکھوں میں حیرانی اور تجسس کو سمیٹتے ہوئے سوال کیا، ”ایمان، کیا تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“۔

ایمان نے ذرا سارک کر، ابرو چڑھاتے ہوئے جواب دیا، ”کیا مطلب؟“۔

مونیز کی نظریں تجسس سے بھرپور تھیں، اس نے مسکراتے ہوئے کہا، ”پہلے تم نے نائٹ کلب جانے سے صاف انکار کیا، اور اب یہ روایتی لباس؟“۔

ایمان نے اپنی آنکھوں میں ایک پراسرار چمک لیے جواب دیا، ”وقت کے ساتھ ساتھ انسان بدلتا ہے، اور ترجیحات بھی۔“

مونیز، جو ابھی تک ایمان کی اس اچانک تبدیلی سے بے خبر تھا، حیرت سے بولا، ”ترجیحات راتوں رات کیسے بدل سکتی ہیں؟“ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی، جیسے وہ ایمان کے الفاظ کی گہرائی سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ایمان نے مونیز کی بے چین طبیعت کو بھانپ لیا، اور اس کی نکتہ چینی کے انداز کو محسوس کرتے ہوئے کہا، ”جب ہمارے اپنے لباس اتنے شاندار ہوں تو مغربی لباس کا انتخاب کیوں؟ اور جہاں تک نائٹ کلب کا تعلق ہے، زندگی میں اس سے زیادہ خوبصورتی بھی ہے۔ اسلام آباد خود میں ایسی جنت چھپائے بیٹھا ہے جس کا مقابلہ شاید ہی کوئی کر سکے۔ دامن کوہ، مونال، ٹریلز، شاہ اللہ دتہ کیف، ایسی جگہیں ہیں جو دل کو سکون دیتی ہیں، اور روح کو پاکیزہ کر دیتی ہیں۔“

مونیز نے گہری نظروں سے ایمان کو دیکھا اور مشکوک انداز میں بولا، ”یہ سب باتیں تمہیں اچانک کیسے سمجھ میں آ گئیں؟“

ایمان نے مونیز کی بڑھتی ہوئی جانچ پر جھنجھلا کر کہا، ”بس گاڑی چلاؤ، مونیز!“

مونیز نے ایمان کی اس اچانک سختی کو محسوس کیا، اور بغیر کچھ مزید کہے، گاڑی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شہر کی روشنیوں، درختوں کی گھنی سائے، اور خالی سڑکوں پر سفر جاری رہا، جیسے وہ دونوں کسی گہرے راز کی طرف بڑھ رہے ہوں۔

...°...

گاڑی تیزی سے شاہراہ پر آگے بڑھ رہی تھی، ارد گرد سے گزرتے بلند درختوں کے سائے گاڑی کے شیشوں پر ایک بھاری احساس چھوڑ رہے تھے۔

ایمان سامنے کے منظر کو خالی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ مونیز، جو پچھلے کچھ لمحوں سے خاموش تھا، اچانک ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا، ”اوف آج کی شاپنگ نے تو جیبیں کاٹ دیں، برانڈز تو لوٹنے کے لیے بیٹھے ہیں!“۔

ایمان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سوالیہ انداز میں کہا، ”کیسے؟“۔

مونیز نے ایک تھکی ہوئی ہنسی کے ساتھ جواب دیا، ”اب دیکھو نا، تھری پیس سوٹ خریدنے جاؤ، تو قمیص الگ، شلوار الگ، اور دوپٹہ الگ بیچتے ہیں، ہر چیز کی اپنی الگ قیمت۔ اوپر سے میچنگ زیور اور جوتے کا خرچہ، اگر کوئی اللہ ہے تو اس کی پناہ! اتنی مہنگائی، سر کھانے کو جگہ نہیں بچی۔“۔

ایمان نے اس کی بات سن کر ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”مردوں کے کپڑے تو اتنے مہنگے نہیں ہوتے، تمہیں کس نے کہا ہے کہ چمکتی دکتی چڑیا بن کر گھومو؟“۔

مونیئر نے ایک بے بسی کی مسکان کے ساتھ جواب دیا، ”بس، اب دوبارہ مت شروع ہو جانا۔“

ایمان نے ہلکی سی آنکھیں گھماتے ہوئے کہا، ”بھئی، کس نے کہا ہے کہ برانڈز سے کپڑے خریدو؟ برانڈز تو لوٹنے کے لیے ہی بنے ہیں۔ انسان خود ایک برانڈ ہونا چاہیے۔ سستی چیز بھی جب اعتماد کے ساتھ پہنی جائے، تو قیمتی لگتی ہے۔ دیکھ لو، میرا لباس، بس تین ہزار کا ان سٹیج لیا اور خود سی دیا، لگ رہا ہے نا کہ کسی بڑے برانڈ کا ہے، کیوں کہ میں خود ایک برانڈ ہوں۔ انسان کی قیمت اس کی خود اعتمادی سے بنتی ہے، برانڈ سے نہیں۔ مگر کچھ بے وقوف لوگ یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں، اور برانڈ والے ایسے ہی نا سمجھ لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں۔“

مونیئر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، ”سچ کہہ رہی ہو، پہلی بار میں تم سے متفق ہوں۔“

ایمان نے ایک نظر اسے گھورا اور پھر نقاہت بھری آواز میں کہا، ”اگر تم مجھ سے متفق ہو، تو شاید مجھے اپنی بات سے پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔“

-

مونیئر نے حیران ہو کر ایمان کی طرف دیکھا، اور ایمان نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کے درمیان ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی، جیسے وقت تھم سا گیا ہو، اور پھر یکدم دونوں زور سے ہنس

پڑے۔ گاڑی، سڑک پر اپنی رفتار سے چلتی رہی، اور ان کی ہنسی فضا میں گھل گئی، جیسے تھکاوٹ اور تناؤ کے بوجھ کو کچھ دیر کے لیے ہلکا کر رہی ہو۔۔۔

گاڑی کی جیسے جیسے دور ہوتی گئی، ایمان کے ذہن میں بھی خیالات تیزی سے گھومنے لگے۔ روڈ پھیلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا، جیسے سڑک آسمان تک جا پہنچی ہو اور فضاء میں عجیب سا سکوت طاری ہو گیا ہو۔ آسمان کی وسعت میں گاڑی جیسے تحلیل ہونے لگی، اور پھر یکدم سے گاڑی جو۔ دور ہوتی نظر آرہی تھی ہم یکدم دوبارہ گاڑی کے قریب آئے،۔۔

ایمان کی آنکھیں سکڑ گئیں، وہ چونک کر موئیز کی طرف پلٹی، چہرے پر حیرت و بے یقینی کے سائے لیے۔
- ”تم نے کچھ دیر پہلے کیا کہا تھا؟“ ایمان کی آواز میں اک بے چینی تھی۔

موئیز، جو ابھی تک گاڑی چلا رہا تھا سوالیہ انداز میں بولا، ”کیا کہا تھا؟“۔

ایمان نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”یہ ہی کہ اگر کوئی اللہ ہے...“۔

موئیز نے ذرا بے پرواہی سے جواب دیا، ”ہاں تو، کیا غلط کہا؟“۔

ایمان کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی، جیسے وہ ایک تلخ حقیقت پر ہنس رہی ہو۔

- ”ہر چیز کچھ نہ کچھ مانگتی ہے، مونیز۔ اگر تمہیں یہ جاننا ہے کہ اللہ ہے یا نہیں، تو ایک کام کرو۔ گاڑی سے چھلانگ لگا دو۔ جب موت کا فرشتہ تمہیں لینے آئے گا، تب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہے یا نہیں۔“

مونیز نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں گھمائیں اور سامنے کی طرف دیکھا۔ ”تمہاری باتوں کی سمجھ نہیں آتی، ایمان، قسم سے۔“

ایمان نے بھی آنکھیں باہر کی طرف گھمائیں، جیسے کسی دور دراز کے منظر کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ گاڑی دوبارہ دور ہونے لگی، نیچے کی زمین دھندلا رہی تھی، اور آسمان کی بلندیوں پر چڑھتے چڑھتے، سب کچھ چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خلا میں داخل ہو چکے ہوں۔ گاڑی غائب ہونے لگی، اور چاروں طرف ایک گہری خاموشی چھا گئی۔

منظر تیزی سے بدلنے لگا، گاڑی اور زمین، سب کچھ پیچھے چھوٹ گیا تھا۔

...°...

مارگلہ کی عظیم الشان پہاڑیاں اپنی سنگلاخ چٹانوں اور پرتیج دروں کے ساتھ بادلوں کو چھوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ دیودار کے درختوں سے گہری ہوا میں ایک خفیف سی ٹھنڈک اور مہم جوئی کی خوشبو رچی بسی تھی۔

مونیز اور ایمان ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے ان کے سامنے اسلام آباد کا منظر ایک وسیع پینٹنگ کی مانند سامنے آیا، جہاں زندگی کے ہر رنگ کی جھلک موجود تھی۔

شہر کے سیکٹرز ترتیب سے بچھے ہوئے، جیسے کسی عظیم معمار نے کمال ہنرمندی سے انہیں آراستہ کیا ہو، اور ان کے درمیان روشنیوں کا کھیل اپنی پوری رعنائی کے ساتھ جاری تھا۔

سڑکیں سانپ کی مانند بل کھاتی ہوئی پہاڑیوں کے دامن سے گزرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں، جن پر چلتی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس تاریکی میں روشنی کی لکیریں چھوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

دور آسمان میں کبھی کبھار کوئی ہوائی جہاز اپنی ٹمٹماتی روشنیوں کے ساتھ گزرتا، جیسے ستاروں کے درمیان کوئی اجنبی مسافر سفر پر رواں ہو۔

مارگلہ کی یہ پہاڑیاں، جو ہمیشہ سے خاموشی کی علمبردار رہی ہیں، آج بھی اسلام آباد کی روشن رات کی گواہ بنی کھڑی تھیں۔

ایمان اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے، گہری سوچ میں غرق، نیچے بچھے شہر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک گہری سنجیدگی کا رنگ تھا، جسے پہاڑوں کی خاموشی مزید گہرا کر رہی تھی۔

مونیز، جو اس کے قریب ہی بیٹھا تھا، بے چینی کے ساتھ ٹانگیں پھیلائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ سوالات پوشیدہ تھے، جن کا بوجھ وہ محسوس کر رہا تھا۔ آخر کار، ایک اچانک سوال جیسے ہوا کے جھونکے کے ساتھ نکل آیا

۔ ”ایمان، کیا تم ہمیشہ اکیلی رہو گی؟ کبھی شادی نہیں کرو گی؟

اس نے تھوڑی دیر کے لیے الفاظ کا انتخاب کرنے کے لیے توقف کیا، جیسے وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔

ایمان نے اپنی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکایا اور آنکھوں میں چمک لیے جواب دیا

”جاؤ جا کر مولوی لے آؤ۔۔۔“

مونیز نے ہنستے ہوئے ہاتھ ہلایا اور بے تکلفی سے کہا، ”میرا بوائے فرینڈ امریکہ میں ہے، اور میں جلد ہی اس سے شادی کروں گا۔“

ایمان نے حیرت کے ساتھ اسے دیکھا اور کہا

”میں نے تو سمجھا تھا کہ یہ سب فنڈنگ کے چکر ہیں، لیکن تم تو سنجیدہ ہو“

مارگلہ کی پہاڑیاں اس گہری اور پیچیدہ گفتگو کی خاموش گواہ بن چکی تھیں۔ نیچے شہر کی چمکتی روشنیوں نے ایک پس منظر سا ترتیب دے دیا تھا، اور یہ دونوں زندگی کے ایک ایسے مکالمے میں الجھ چکے تھے جو عام گفتگو سے بہت پرے تھا۔

مونیز

نے ایک لمحے کے لیے ہوا میں ٹھنڈی سانس لی اور ایک تلخ ہنسی کے ساتھ بولا
- ”تم نے میری ٹرانزیشن سے کبھی اتفاق نہیں کیا۔ میں نے کہا تھا، اگر ہم دونوں اپنی جنس تبدیل کر لیں تو ہم شادی کریں گے۔ مگر تم!“

مونیز کی ضد ایمان کی جنس تبدیلی کے پیچھے دراصل ایک گہری اور پراسرار سازش کی کڑی تھی، جس کا خاکہ اُس تنظیم نے تیار کیا تھا جس کے لیے وہ کام کرتا تھا۔

اس منصوبے کا مقصد قدرتی تخلیق کے اصولوں کو مسخ کرنا تھا، تاکہ ایک لڑکا لڑکی بن جائے اور ایک لڑکی لڑکا۔

اس تبدیلی کے بعد دونوں کی شادی کا اہتمام کر کے دنیا میں ایک نیا اور بد نما ایجنڈا متعارف کرایا جائے، جو فطرت اور الہی قانون کی کھلی توہین ہو۔

یہ مکروہ سازش محض سماجی و اخلاقی انحطاط کا پیش خیمہ نہ تھی، بلکہ انسانیت کو اس کی اصل سے کاٹنے کی ایک دانستہ کوشش تھی، تاکہ اللہ کی تخلیق کا فطری نظام درہم برہم ہو اور انسانیت کو بے راہ روی کے ایسے اندھیروں میں دھکیل دیا جائے جہاں جنس اور شناخت کا تقدس ختم ہو کر رہ جائے

- یہ غلاظت رفتہ رفتہ معاشرتی اقدار کو گل سڑا کر ایک ایسے بگاڑ میں بدلنے کے لیے تھی، جہاں انسانی فطرت کی بنیادی حقیقت ہی مسخ ہو جائے۔
.. ”لیکن خیر،“ -

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

، ”میں اپنی جنس تبدیل کروں گا اور پھر اپنے بی ایف سے امریکہ میں شادی کر لوں گا۔“
لا پرواہی سے اس نے ہاتھ ہلا کر یہ بات کر دی۔

ایمان نے اپنی کمرسیدھی کی اور اس کے الفاظ کے رد عمل میں سنجیدہ لہجے میں کہا

- ”ہم انسان ہیں، جانور نہیں۔ ہمیں شعور ہے، عقل ہے، اچھے اور برے کی تمیز ہے۔ تم خود کو کیوں برباد کر رہے ہو؟ تم نہ یہاں کے رہو گے، نہ وہاں کے۔ تمہاری زندگی برباد ہو جائے گی۔“
موئیز نے بے خوفی سے جواب دیا۔

- ”محبت محبت ہوتی ہے، ایمان۔ لڑکا لڑکے سے محبت کر سکتا ہے، لڑکی لڑکی سے۔ اس میں کیا حرج ہے؟“ -

ایمان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک گہرا استعاراتی جواب دیا

- ”پانی پانی ہوتا ہے، لیکن ہم سیوریج کا پانی کیوں نہیں پیتے؟ کھانا پیٹ بھرنے کے لیے ہوتا ہے، تو پھر ہم کاغذ کیوں نہیں کھاتے؟“ -

مونیزا اس کے استدلال کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے ہلکا سا مسکرایا

”تم سے کوئی بحث نہیں جیت سکتا، ایمان۔“

ایمان نے نیچے پھیلے شہر کو دیکھتے ہوئے گہری سانس لی اور آہستہ سے کہا

”حق والوں کی جیت ہوتی ہے۔“

اس کے ذہن میں ان بزرگ کے الفاظ کی بازگشت سنائی دی

”نقلی پھولوں پر پانی کا اثر نہیں ہوتا۔“

اس نے شہر کی روشنیوں کو دیکھا، جو اس کے اٹل عقائد کا عکس تھیں۔

وہ درست کہتے تھے، ”اس نے زیر لب کہا۔

مونیز نے اس کے مدھم الفاظ سن کر حیرت سے پوچھا

”کیا کہا؟“

ایمان نے سر ہلایا اور نرمی سے کہا

”کچھ نہیں۔“

سوڈن کی گہری رات میں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جہاں کیتھرین اور گونار ایک تنہا گوشے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

ارد گرد کی دیواریں، جن پر ڈوڈلز کی نقاشی بکھری ہوئی تھی، اس ساکت منظر کو ایک فریم کی طرح محیط کیے ہوئے تھیں۔ شہر کی دھیمی گونج، دور دراز سے آتی ہوئی، ایک ہلکے سرگم کی مانند فضا کو بھرتی تھی۔

گونار، کیتھرین کے قریب بیٹھا، اس کے بالوں کی مہک کو محسوس کرتے ہوئے ایک لمحاتی سکون میں غرق تھا۔ لیکن اچانک، اس خاموشی میں ایک نامعلوم بے چینی در آئی۔

کیتھرین، جو گونار کے کندھوں پر نرمی سے ٹکی ہوئی تھی، نے ماحول کی اس ناپسندیدہ تبدیلی کو فوراً محسوس کیا۔

سائے سے کچھ غیر متوقع افراد ابھرے، جو بظاہر ایک خانہ بدوش قبیلے کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ ان کے رنگ برنگے ٹیڈوز، انوکھے بال، اور کانوں میں جھولتی بالیاں ایک باغیانہ اور منفرد شخصیت کا پتہ دیتی تھیں۔

دس کے قریب لمبے، چمکتے بالوں والے نوجوان، جیسے ہی سامنے آئے، ان کی موجودگی نے دیواروں پر بنی نقاشی کے ساتھ ایک غیر معمولی منظر تخلیق کر دیا۔

گروہ آہستہ آہستہ ان کی جانب بڑھ رہا تھا، اور اس بڑھتے ہوئے خطرے کو بھانپتے ہوئے، گونار نے غریزی طور پر اپنے آپ کو کیتھرین کے آگے ڈھال کی مانند کھڑا کر دیا۔

ہوا میں تناؤ جیسے گھل سا گیا تھا، اور کیتھرین، جو گونار کے پیچھے چھپتے ہوئے جھانک رہی تھی، اس کے چہرے پر ایک پراسرار اور پراسرار مسکراہٹ تھی۔ یہ منظر پہلے سے کہیں زیادہ غیر متوقع ہونے والا تھا۔

واقعات کے اچانک اور حیرت انگیز موڑ میں، ان خانہ بدوشوں نے روایتی خطرناک ہتھیاروں کا استعمال کرتے ہوئے گونار پر حملہ کیا۔

یہ غیر معمولی حملہ، جس کا آغاز ایک خاص علامت کے ساتھ ہوا، حیرت اور سراسیمگی کی کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیتھرین کا کردار، جو اس پورے منظر میں پراسرار اور پیچیدہ دکھائی دیتا تھا، مزید معمہ میں الجھ گیا۔

مونیز، اپنے سوال پر بضد، جیسے خاموشی کے اندر کوئی جواب کھوج رہا ہو، ایمان کی طرف متوجہ تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سنجیدہ استفسار کی چمک تھی۔ ”تم نے ابھی تک مجھے جواب نہیں دیا،“ اُس نے تھوڑے توقف کے بعد، دوبارہ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایمان، جو ہمیشہ اپنے خیالات کو الفاظ میں ڈھالنے سے گریزاں رہتی تھی، اُس کے چہرے پر بے ساختہ غصے کی جھلک نمودار ہوئی۔

۔ ”مجھے شادی نہیں پسند مونیز

اُس کی آواز میں سرد مہری اور بے پرواہی کی ایک غیر محسوس گونج تھی۔

۔ ”مونیز، مجھے کوئی بھی قابل قبول نہیں لگتا۔ انسانیت کی فطرت ہی مجھے کراہت میں مبتلا کرتی ہے۔ اگر میری شادی ہو بھی جائے، تو مجھے یقین ہے کہ اگلے دن وہ شخص زندہ نہیں رہے گا، یا شاید ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہ بچے۔ مرد و عورتیں میری نظروں میں زہر سے کم نہیں، ان کی قربت میں فقط گھن اور بیزاری ہے۔ دنیا کے رشتے میرے لیے ایک بوجھ ہیں، جن میں کوئی مسرت یا امنگ نہیں۔“

اُس نے الفاظ کو جیسے تھوک دیا ہو۔

مونیز لیکن، اپنے ارادے میں ثابت قدم رہا۔ ”پھر بھی، کچھ تو ہو گا جو تم نے سوچا ہو،“ اُس نے تھوڑے سے اشتیاق کے ساتھ اصرار کیا۔

ایمان نے ایک گہرا سانس لیا، جیسے کسی انجان خیال میں کھو گئی ہو، اور اُس کا جواب اب کی بار سرد اور پر اسرار تھا۔

۔ ”اپنے بچپن میں میں نے شاولین مونکس کے بارے میں ایک ویڈیو دیکھی تھی، وہ غیر معمولی طور پر مضبوط ہوتے ہیں۔ ان کی تربیت اتنی سخت ہے کہ وہ تلواروں کو توڑ دیتے ہیں، اور گولیوں کا اُن پر اثر نہیں ہوتا۔“

اُس کے الفاظ فضا میں معلق ہو گئے، جیسے اُن کے اندر کسی انجانے راز کا بوجھ ہو۔ مارگلہ کی وادیوں میں ہوا کے جھونکے اور دور دراز کی آوازیں اُس کے خیالات کے ساتھ یوں مل گئیں جیسے وہ اُس کے خوابوں کو کوئی شکل دے رہی ہوں۔

رات کی تاریکی میں، زمین کی روشنی ایمان پر ہلکی سی جھلک ڈال رہی تھی، اور وہ اپنے تصوراتی ہیرو کے خاکے کو لفظوں میں رنگ رہی تھی۔

۔ ”میں بچپن میں بے وقوف تھی شہزادوں کے خواب دیکھتی تھی کہ میرے شہزادے کی آنکھیں باز یا چپتے کی مانند تیز ہوں گیں،“ ایمان نے دھیرے سے کہا، جیسے اُس کے خیالات رات کے آسمان کی وسعتوں میں گم ہو چکے ہوں، اور ستارے اُس کے خوابوں کی گہرائیوں کی بازگشت کر رہے ہوں۔

۔ ”اُس کی مسکراہٹ پر اسرار ہوگی، اور اُس کی طاقت چٹان کی مانند مضبوط، ”ایمان کے ہر لفظ نے فضا میں ایک انجانی داستان کو بُنا شروع کر دیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں اُس کے خواب اور حقیقت کے درمیان ایک پر اسرار تعلق پنپنے لگا تھا۔

اسی اثناء میں، سویڈن کے دور دراز اور ویرانوں میں، حقیقت ایمان کے خوابوں کی متوازی شکل میں ابھر رہی تھی۔

گونار، پہاڑوں کی مانند کھڑا، اپنی نظریں قریب آتے خانہ بدوشوں پر جمائے ہوئے تھا۔

اُس کی آنکھیں ایمان کے بیان کردہ مرد کی مانند تیز اور خطرناک تھیں، جیسے باز کی نظریں شکار پر جمی ہوں۔

گونار کی شخصیت میں ایمان کے تصور کردہ مرد کی تمام خصوصیات مجسم ہو رہی تھیں، اور جب خانہ بدوش اُس کے قریب آئے، اُس نے بغیر ہچکچاہٹ کے اُن کا سامنا کیا۔

اُس کے ہاتھوں کی جنبش نے ہوا میں تباہی مچائی، اور پانچوں خانہ بدوشوں کی کھوپڑیاں اُس کی طاقت کے سامنے ریزہ ریزہ ہو گئیں۔

کیتھریں کی پیشانی پر ابھرنے والی غیر متوقع کشمکش نے اُس کی خاموش مخالفت کا پتہ دیا، ایک ایسی مخالفت جو الفاظ میں ڈھلنے سے پہلے ہی ہوا میں تحلیل ہو گئی، جیسے رات کے سکوت میں ایک انجانی ناپسندیدگی تیر رہی ہو۔

ماحول میں بے یقینی اور تسلیم دونوں بیک وقت موجود تھے، ایک خاموش سا ہنگامہ جو فضا کو بو جھل کر رہا تھا۔

ایمان کے دل میں بسا ہوا ہیر و کا تصور، اُس رات کے سحر میں مزید نکھر کر سامنے آیا۔ اُس کی سوچیں اُس گہرے سکوت میں گونج رہی تھیں، جیسے خود فطرت اُس کے خیالات کو جواب دے رہی ہو۔

۔ ”شاو لن کے مانا ہوا مجاہد، وہ جس کی انگلیاں فولاد کی مانند سخت ہوں، جو درختوں میں سوراخ کر سکے، اور اگر لازم ہو تو دشمنوں کی کھوپڑیوں کو بھی اپنے ہاتھوں سے پاش پاش کر دے۔“

ایمان کے الفاظ جیسے ہوا کے دوش پر تیرتے ہوئے اُس پر آسرا ماحول میں تحلیل ہو رہے تھے، جہاں پتوں کی سرگوشیاں اُس کے تخیل کے ساتھ ساز باندھ رہی تھیں۔

دوسری طرف، سٹاک ہوم میں گونار کا سامنا چھٹے خانہ بدوش سے ہو رہا تھا، جو کلہاڑی کے وار سے اُس پر حملہ آور ہونے والا تھا۔

ایمان کی تصوراتی دنیا اور حقیقی لمحے کے مابین فاصلہ سمٹ رہا تھا، جیسے حقیقت نے اُس کی فتاسی کا قالب پہن لیا ہو۔

گونار کی انگلیاں، فولاد کی مانند مضبوط، خانہ بدوش کی کھوپڑی میں پیوست ہو گئیں۔ وہ منظر، جو ایک لمحے میں شاعرانہ اور سفاکانہ دونوں تھا، اپنی تمام تر دہشت اور حُسن کے ساتھ کھل رہا تھا۔ حقیقت اور تخیل کی سرحدیں مٹ رہی تھیں، اور دنیا کے اصول اُس لمحے کی کشش کے سامنے بیکار دکھائی دے رہے تھے۔

حملہ آور دھڑام سے زمین پر جاگرا، اُس کی پیشانی سے خون کے قطرے بہہ رہے تھے، جیسے کوئی پوشیدہ قوت اُس کی کھوپڑی کو چیرتی ہوئی باہر نکل آئی ہو۔

دو سوراخ اُس کی پیشانی پر نمایاں تھے، ایک ایسا منظر جو وحشت اور حیرت دونوں کی علامت تھا۔

پیچھے چار خانہ بدوش سہمی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کھڑے تھے، خوف کے مارے لرزتے ہوئے۔ گونار، جو نیچے گرے ہوئے خانہ بدوش کے بے جان جسم کو پھیلا نگتے اپنے قدموں کو بے خونی سے آگے بڑھا رہا تھا۔ چاروں خانہ بدوش پیچھے ہٹنے لگے، ان کے چہرے پر ہولناکی صاف دکھائی دیتی تھی۔ گونار کی آنکھوں میں غصے کا لاؤ بھڑک رہا تھا۔

اس کا چہرہ غضب سے سرخ ہو چکا تھا اور رگیں تناؤ کے ساتھ نمایاں ہو گئی تھیں۔

اچانک، ان میں سے ایک نے کانپتے ہاتھوں سے گونار کے بازو پر گولی چلائی، جس سے گونار کے قدم ذرا پیچھے ہٹے، لیکن وہ سنبھل گیا۔ خانہ بدوش یہ دیکھتے ہی بدحواسی میں بھاگ کھڑے ہوئے۔

کیتھریں کا سانس بے قابو ہو چکا تھا، خوف اور الجھن کی شدت میں اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

وہ تیزی سے گونار کی طرف لپکی، اس کے چہرے پر گہرے جزبات اور اضطراب کی جھلک

نمایاں تھی۔

۔ مگر یہ احساس ایسا ہی تھا جیسے گرگٹ کا رنگ بدلنا۔

.

ایمان نے سیدھے ہو کر مونیز کی جانب ایک سرد نظر ڈالی، پھر ہلکی سی تلخی سے بولی، "پھر حقیقت نے میرے چہرے پر ایک ایسا تھپڑ مارا جس نے یہ باور کرایا کہ شہزادے محض خیالی دنیا کا قصہ ہیں، حقیقی زندگی میں صرف مکار، فریب کار اور ظالم لوگ ہی آپ کی راہ میں آتے ہیں۔ یہ دنیا خوابوں سے کہیں زیادہ بے رحم اور بے حس ہے۔"

اس کی آواز میں تلخی اور پختگی بڑھتی گئی، "اب اگر کبھی میں نے شادی کی، تو محض بناوٹی خوبیوں کی چمک دمک میں نہیں آؤں گی۔ سب سے بڑھ کر یہ دیکھوں گی کہ وہ انسان کیسا ہے، عزت کرنے والا ہو، اُن مردوں کی طرح نہیں جو عورتوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور بد تمیزی کرتے ہیں۔"

ایمان نے وقت کے گزرنے کا احساس کرتے ہوئے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف نظر ڈالی۔ "اوہ، کافی دیر ہو چکی ہے، چلیں۔"

مونیز بھی خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور دونوں اس خاموش مقام سے چل دیے، جہاں ایمان کی گونج
ابھی بھی باقی تھی۔

اسی دوران، سویڈن کی سرد فضا میں گونار کی غضبناک گرج سنسناتے ہوئے علاقے کو کاٹتی چلی گئی۔ اس
کے اندر جوش و غضب کا طوفان اُٹ آیا تھا، جو اسے بے قابو کر رہا تھا۔

اس نے کیتھرین کی گرفت سے خود کو جھٹک کر آزاد کر لیا اور تعاقب شروع کیا، مگر کیتھرین نے فوراً
مداخلت کی۔ "گونار! ہوش میں آؤ، یہ نادانی ہے، خدا کے لیے رُک جاؤ!"

گونار ایک لمحے کو تھم گیا، مگر اس کی آنکھوں میں دہکتی آگ ذرا بھی مدھم نہ ہوئی۔ کیتھرین کی فکر محض
اس کی سلامتی کی نہیں تھی بلکہ اس پر اسرار سچائی کے بے نقاب ہونے کا خدشہ بھی تھا، جس کا پردہ فاش
ہوتے ہی سب کچھ بکھر سکتا تھا۔

کیتھرین نے گہرا سانس لیا، اس کی نگاہوں میں چھپے اندیشے نے فریب کے اس گھناؤنے جال کو سنبھالے
رکھا۔

گونار کا جشہ جیسے فولادی دیوار کی مانند نظر آ رہا تھا، اس کے جسم کی مڑی ہوئی رگیں اور پھولی ہوئی شریانیں
اسے کسی ناقابل شکست قوت کا مظہر بنا رہی تھیں۔ وہ کیتھرین کی طرف بڑھا، اس کے چہرے پر بے پناہ
جلال تھا اور نگاہیں ایسی تھیں جیسے ہر جھوٹ کو چیر کر رکھ دیں گی۔

کیتھرین نے بے ساختہ کہا، "گونا، ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہو گا، میں تمہیں اسپتال لے جاتی ہوں۔"

گونا نے بے حسی سے جواب دیا، اس کی نظریں ارد گرد پڑی ہوئی بے جان لاشوں پر تھیں۔

"یہاں پولیس آئی تو سوالوں کی بھرمار ہو گی،

اور میری

Reputation

داؤ پر لگ جائے گی

اسپتال جانے کا کوئی فائدہ نہیں

،it's just a damn bullet, not a fatal wound،

یہ زخم کوئی بڑا مسئلہ نہیں، خود ہی بھر جائے گا۔ گاڑی نکالو، ہم یہاں سے ابھی نکل رہے ہیں۔"

کیتھرین نے اثبات میں سر ہلایا، مگر اس کی آنکھوں میں چھپے پیچیدہ جذبات واضح ہو رہے تھے، جیسے وہ اپنے اندرونی خلفشار کو قابو میں رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہو۔

...°...

گونا کے دوسرے کمرے کے پُر سکون، متوازن ماحول میں، خوبصورتی کی ایک دلربا پناہ گاہ آراستہ تھی۔

دائیں جانب کی کشادہ کانچ کی کھڑکی سے، سامنے پھیلے پہاڑوں اور نیلی جھیل کا دل فریب منظر ایک خوابناک کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

فرش نفاست سے جڑا ہوا لکڑی کا تھا، جس پر پیچیدہ نقش و نگار سے مزین ایک بستر اور اس کے ساتھ سادہ مگر دیدہ زیب سائیڈ ٹیبل رکھی تھی۔

دیواروں پر معلق دلکش پینٹنگز، فن کا اعلیٰ نمونہ پیش کر رہی تھیں، جبکہ چھت سے لٹکا ہوا سہ رخی شیشے کا فانوس ایک ہلکی سی روشنی بکھیر رہا تھا، جو ماحول میں نرمی اور سکون کا تاثر پیدا کر رہی تھی۔

گونار ایک پُر شکوہ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا، خاموشی سے اپنی قوت کا مظاہرہ کر رہا تھا، اس کی گہری نظریں پُر عزم تھیں۔ دوسری جانب، کیتھرین کے چہرے پر تکلیف کی پرچھائیں نمودار ہو رہی تھیں، اس کی آنکھوں میں درد کی شدت کبھی کبھار نمایاں ہو جاتی تھی۔

گونار نے خاموشی سے اپنے سامنے رکھی میز سے جراحی آلات کا ایک آلہ نکالا، جہاں نیم گرم پانی کا پیالہ اور جراحی کے مختلف آلات ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔

چاندی کے ایک پیالے میں حالیہ استعمال کے نشانات ظاہر ہو رہے تھے۔ کمرہ ایک عجیب و غریب امتزاج تھا، جہاں فضل اور تناؤ کے دھارے بیک وقت بہہ رہے تھے۔

گونار کے سخت عضلات سے خون بہہ رہا تھا، جب اس نے ایک چھوٹی سی اسکیلپل سے زخم کو مزید گہرا کیا۔ وہ احتیاط سے ایک آلہ زخم کی گہرائی میں داخل کر رہا تھا، خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ گونار کی ہمت اور طاقت میں کوئی کمی نہیں آئی، وہ اپنی اندرونی قوت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

کیتھرین نے گولی کے منظر کو برداشت نہ کرتے ہوئے اپنی آنکھیں موند لیں، جبکہ گونار کی ہونٹوں پر ایک پراعتماد مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ”اب تم گونار کے ساتھ منسلک ہو چکی ہو،“

وہ سرد لہجے میں گویا ہوا۔ ”میں نازک مزاجی کو زیادہ پسند نہیں کرتا، خصوصاً اپنے قریب ترین لوگوں میں۔“

پوری درستگی کے ساتھ، گونار نے سرنج کا استعمال کرتے ہوئے زخم میں سالو بھرا اور زخم کو مہارت سے ٹانگوں کے ذریعے بند کیا۔

جراحی کے آلات کو صفائی سے کیبنٹ میں واپس رکھا گیا، اور کمرہ ایک بار پھر اپنی پرسکون حالت میں واپس آگیا۔ گونار بظاہر اس آزمائش سے سرخرو نکلا، جیسے ایک مضبوط پہاڑ، ناقابل تسخیر، غیر متزلزل، گویا ایک حقیقی شاؤلن راہب۔

جب گونار کیتھرین کے قریب پہنچا، تو اس کی شخصیت میں ایک تبدیلی رونما ہوئی، اس کا رویہ نرم پڑ گیا اور اس کی محبت بھرے جذبات نے غلبہ پالیا۔

وہ کیتھرین کے ہاتھ کو نرمی سے تھام کر گویا ہوا، ”فکر نہ کرو، میں بالکل ٹھیک ہوں، رات کافی ہو چکی ہے، تم گھر جاؤ، میں آرام کر لوں گا۔“ گونار نے کیتھرین کی پیشانی پر ہلکا سا بوسہ دیا، اور جواباً کیتھرین نے محبت بھری نظر سے اسے دیکھا اور اس کے گال پر نرمی سے بوسہ دیا۔

تبادلے کے ساتھ ہی کمرہ ایک گہرے سکوت اور پوشیدہ گرمی سے معمور ہو گیا۔ گونار نے اپنی نئی پُر اسرار نرمی کو برقرار رکھتے ہوئے، خادموں کے لیے مخصوص انٹرکام کو اٹھایا، ایک سرد اور غیر متزلزل لہجے میں حکم دیا، ”اُس نئے لڑکے کو میرے پاس بھیجو۔“

کیتھرین خاموشی سے کمرے میں موجود رہی، اس کی موجودگی ایک عجیب سا سکون پھیلا رہی تھی، گویا کسی پُر اسرار پردے کے پیچھے چھپے راز کا انتظار ہو۔

ایک ہلکی سی دستک دروازے پر گونجی، جس نے نووارد کی آمد کا اعلان کیا۔ ماحول میں ایک پُر اسرار انتظار کی لہر دوڑ گئی، جیسے کہ کمرہ خود واقعات کے انکشاف کا منتظر ہو۔ دروازہ کھلا اور لڑکا قدم رکھتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

کیتھرین اور لڑکے کے درمیان ایک مختصر، خاموشی بھری نظر کا تبادلہ ہوا، جیسے دونوں کے درمیان کوئی انجان راز موجود ہو، مگر گونار کی پُر رعب موجودگی نے مزید کسی بھی غیر لفظی مواصلت کا راستہ روک دیا۔

لڑکا، جیسے کہ کسی اندرونی خوف میں مبتلا ہو، ہلکی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا، ”سر، آپ نے مجھے...“۔

گونار نے تیزی سے لڑکے کو ٹوکتے ہوئے، ایک سرد مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”ہاں، میں نے تمہیں بلایا ہے۔“۔

اس کی نظریں لڑکے پر جمی رہیں، گویا وہ اس کی روح کے اندر چھپی حقیقتوں کو سمجھ رہا ہو، جیسے ہر جنبش میں کوئی راز چھپا ہو۔

۔ ”کیا تمہیں گاڑی چلانی آتی ہے؟“۔

گونار کا سوال ایک خفیہ امتحان کی طرح محسوس ہوا، جیسے وہ صرف جواب کا انتظار نہ کر رہا ہو، بلکہ لڑکے کی ہر حرکت کا جائزہ لے رہا ہو۔

لڑکے نے تیزی سے سر ہلادیا، گویا کوئی غلطی کرنے کا متحمل نہ ہو سکتا ہو۔ گونار نے بغیر کسی واضح تاثرات کے، چابیاں اس کے ہاتھ میں پھینک دیں اور سرد لہجے میں کہا، ”میڈم کو گھر چھوڑ دو۔“۔

یہ الفاظ کوئی عام حکم نہ تھے، بلکہ ایک ذمہ داری کا بوجھ تھے، جس میں نرمی کے بجائے خطرے کا احساس موجود تھا۔

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا، مگر اس کی حرکت میں ایک چھپی ہوئی بے چینی تھی۔ جیسے ہی وہ کیتھرین کے ہمراہ روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا، گونار نے اسے اپنے قریب بلایا۔

اس کی آنکھوں میں ایک ناقابل تسخیر سردی تھی، اور اس کے الفاظ میں ایک واضح تنبیہ، ”یاد رکھنا، میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں، اور میڈم کو بحفاظت پہنچانا تمہاری واحد ذمہ داری ہے۔ ذرا سی بھی لاپرواہی ہوئی تو تمہیں یاد رہے گا کہ گونار تمہیں کبھی نہیں بھولے گا۔“

لڑکے نے خوف میں لپٹی ہوئی خاموشی کے ساتھ سر ہلایا، جیسے وہ گونار کے سرد رویے کی سنگینی کو مکمل طور پر سمجھ گیا ہو۔

گونار نے ایک محتاط نظر کیتھرین پر ڈالی اور ہاتھ کے ایک خفیہ اشارے سے اسے لڑکے کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔ ماحول میں کچھ انجانا سا معلق تھا، ایک پُر اسراریت، جیسے ان کی روانگی کے ساتھ کچھ غیر متوقع واقعات کے آغاز کا اشارہ دیا جا چکا ہو۔

کمرہ ایک ناقابل وضاحت تناؤ سے بھرا ہوا تھا، جیسے ہوا میں غیر یقینی کے سائے گھوم رہے ہوں، اور آنے والے لمحات میں کوئی پوشیدہ حقیقت افشا ہونے والی ہو۔

کار رات کے سنائے میں خاموشی سے رواں دواں تھی، سامنے کی نشست پر بیٹھا لڑکا اضطراب میں مبتلا تھا، آخر کار وہ اپنی بے چینی پر قابو نہ رکھ سکا اور بولا، ”وہ بچ کیسے گیا؟“ اُس کی آواز میں حیرت اور بے یقینی نمایاں تھی۔

کیتھرین نے اپنی نظریں موڑیں اور لمحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئی۔ ”وہ کوئی عام انسان نہیں،“۔

اُس نے دھیمے اور متفکر انداز میں کہا۔ ”وہ ایک پہاڑ ہے، ایک حل نہ ہونے والا معمہ۔“۔

کیتھرین کے الفاظ جیسے گہرائی میں ڈوبے ہوئے تھے، ”ایک ایسی طاقت ہے جسے میں آج تک سمجھ نہیں پائی۔“۔

دوسری جانب، نیم تاریک کمرے میں گونار کی موجودگی ایک بھڑکتی ہوئی آندھی کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کے جسم کا ہر عضلہ غصے اور انتقام کی آگ میں دھک رہا تھا۔

سیاہ کراٹے کی وردی میں ملبوس، اُس کا بدن لوہے کی طرح مضبوط اور طاقت سے لبریز دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیوں میں ایسی سختی تھی جیسے وہ دنیا کو مسل دینا چاہتا ہو، اور اُس کی آنکھوں میں ایک بے قابو وحشت تھی۔

دیوار کے سامنے کھڑا گونار ایک وحشی درندے کی مانند حملہ آور ہو رہا تھا۔ اُس کی لاتوں میں آسمانی گرج کی شدت تھی اور اُس کے پنجے کسی خونخوار جانور کے پنجوں کی طرح تیز تھے۔

ہر وار، ہر ضرب جیسے اُس کے اندر کی آگ کا اظہار تھا۔ اُس کے ہر ایک وار کے ساتھ کمرے کی فضا میں ایک خطرناک گونج پیدا ہو رہی تھی، جیسے وہ اس دیوار کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہو رہا ہو۔ گونار کی حرکات میں ایسی طاقت اور جارحیت تھی کہ ہر بار جب وہ دیوار پر حملہ کرتا، تو یوں محسوس ہوتا کہ زمین بھی لرز اُٹھے گی۔

اس کی سانسیں تیز ہو چکی تھیں، جیسے ہر سانس میں غضب کا طوفان چھپا ہوا ہو، اور کمرہ اُس کے انتقام کی شدت سے لرز رہا تھا۔

...°...

مدھم روشنی والے کمرے میں، گونار کی ہیبت ناک پرچھائیں تمام تر توجہ سمیٹ رہی تھیں۔ اس کی سیاہ کراٹے کی وردی اس کے فولادی جسم سے اس طرح لپٹی ہوئی تھی جیسے ہر پٹھے کی طاقت کو ابھارنے کا ارادہ رکھتی ہو۔

سر پر مضبوطی سے بندھا ہوا کپڑا، اس کے بالوں کو تھامے رکھے ہوئے تھا، جب کہ وہ اپنی بے پناہ قوت اور ماہرانہ صلاحیتوں کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ ہر عضلہ اس کے اندر اٹھتے ہوئے طوفان کا پتہ دے رہا تھا،

اس کے بازوؤں کے پٹھے ہر جنبش پر یوں تن کر اُبھر رہے تھے، جیسے کسی ماورائی طاقت نے انہیں تراش کر قوت کی مجسم علامت بنا دیا ہو، اور وہ اپنی ہر جنبش میں چمک دمک کے ساتھ ایک مہیب توانائی کا اظہار کر رہے ہوں۔

گونار کی ہر حرکت میں طاقت اور شدت کا یکجا مظاہرہ تھا، اور اس کی ہر ضرب ماحول کو گویا کاٹ رہی تھی۔ جب اس کے پنچے ہو امیں لپکتے، تو ایسا محسوس ہوتا کہ گویا وہ ہوا کی تہوں کو بھی چیر رہا ہو۔

اس کے ہاتھ، جنگلی درندے کے پنچوں کی مانند، ہر ضرب میں ایک پوشیدہ وحشت سموئے ہوئے تھے۔ دیواروں پر پڑنے والی اس کی حرکات کے سائے جیسے رقص کر رہے تھے، اس پورے منظر کو ایک مہیب شان بخش رہے تھے۔ کمرے میں موجود ہر شے سکڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، گویا گونار کی طاقت نے پوری فضا کو گرفت میں لے لیا ہو۔

دوسری طرف، گاڑی کی اندھیرے میں ڈوبی راہوں پر سفر جاری تھا۔ کیتھرین نے اپنی نظریں سڑک پر جمائے، ایک سرد سانس بھری اور دھیمے لہجے میں بولی، ”گونار... وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے، وہ ایک سنگ دل چٹان ہے، ایک پہاڑ ہے۔“

اس کی آواز میں خوف اور حیرت کی آمیزش تھی۔

”اس کی حقیقت کو سمجھنا مشکل ہے، وہ ایک بھید ہے، ایک پراسرار طاقت۔“

اُسی لمحے، جیسے ہی کیتھرین کے الفاظ نے گونار کے وجود کو ذہن میں مجسم کیا، گونار کی وحشیانہ قوت اس کے خیالات میں مزید شدت اختیار کر گئی۔

اس کے پٹھے جیسے کسی بھری ہوئی طاقت کا اظہار کر رہے تھے، وہ اندھیری دیواروں پر اپنی لاتیں برسا رہا تھا، ہر ضرب دیوار کو لرزاتی، ہر وار جیسے اُس کی اپنی حدود کو توڑ رہا ہو۔

دیواروں پر دراڑیں نمودار ہو گئیں، اور ایک لمحے میں، ایک بھاری سیمنٹ کا بلاک اُس کے مد مقابل آیا۔
گونار نے ایک خونخوار چنگھاڑ کے ساتھ اپنی پیشانی اس بلاک پر دے ماری، اور وہ بلاک اس کی ضرب کے
سامنے بکھر کر رہ گیا۔

کار میں موجود لڑکے نے غصے سے کیتھرین کی جانب دیکھا اور سخت لہجے میں کہا، ”یہ تعریفیں بند کرو، میں
یہاں اس کی عظمت کے قصے سننے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ ہمیں جواب دینا ہے، ہمیں کیا کہنا ہے؟ ہم اس
کی کمزوری تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں، اسے مارنے کی بھی کوشش کی، سب بے سود۔“

کیتھرین نے ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا، جیسے ایک نیا خیال اس کے ذہن میں جگہ بنا رہا
ہو۔ ”ہم اُس کی ساکھ کو مجروح کر سکتے ہیں،“

اُس نے زہر بھری آنکھوں سے لڑکے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم اُس کی ذاتی زندگی میں گھسیں گے،
اُس کے راز کھولیں گے، اُس کی کمزوریوں کو دنیا کے سامنے لائیں گے۔ عوام اُس کی طرف ویسے نہیں
دیکھیں گے جیسے پہلے دیکھا کرتے تھے۔“

لڑکا، جو ابھی تک شش و پنج میں مبتلا تھا، کیتھرین کی سازشی نگاہوں کو دیکھتے ہوئے کچھ دیر سوچ میں گم
رہا۔ جیسے ہی وہ دونوں اپنے مذموم منصوبوں میں ڈوب گئے، فضا میں ایک سرد وحشت گھل گئی۔

کیتھرین کی دھوکے سے بھری آواز اور اُس کا مکروہ ارادہ ماحول کو اور بھی بھاری کر رہا تھا۔ جیسے جیسے گاڑی رات کی گہرائیوں میں داخل ہو رہی تھی، ان دونوں کے دلوں میں جنم لینے والی سازشیں گونار کی ناقابل تسخیر ساکھ کو چکنا چور کرنے کے لیے تیار تھیں۔

گونار اپنی کڑی اور بے رحم تربیت کے بیچ میں تھا جب اچانک کیوبک کال ہیل کی گونج نے اُسے روک دیا۔ اس نے چند لمحوں تک اپنی جگہ جمی ہوئی نگاہوں کے ساتھ دیکھا، پھر ٹھہرے ہوئے قدموں سے فون کی طرف بڑھا اور موبائل کو اٹھالیا۔ دوسری طرف ایک دھیمی، مگر سنگین آواز سنائی دی، ”سر، کام ہو چکا ہے۔“

گونار کے چہرے پر ایک ہلکی سی مگر خطرناک مسکراہٹ ابھری۔ اُس نے فون نیچے رکھا اور قریب رکھا ہوا تولیہ اٹھالیا۔

اس کا چہرہ اب پسینے میں تر تھا، مگر تولیہ سے چہرہ صاف کرتے ہوئے اُس کے انداز میں کسی آنے والے طوفان کی خاموش تیاری نظر آرہی تھی۔

پھر وہ پچنگ بیگ کی طرف بڑھا جو مدھم روشنی میں ایک پراسرار سایے کی مانند جھول رہا تھا۔

پچنگ بیگ اب محض ایک بیگ نہیں تھا، بلکہ ایک خون آلود نمونہ بن چکا تھا، گویا کہ اسے کسی اذیت گاہ میں تبدیل کیا جا چکا ہو۔

کبھی سفید تھا، اب اس پر گہرے سرخ دھبے پھیلے ہوئے تھے۔ فرش پر خون کے قطرے بکھرے ہوئے تھے، اور یہ منظر جیسے کسی ہولناک انجام کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

گونار کا سیلیویٹ لمبا اور خوفناک تھا، اس کے مضبوط جسم کی لکیریں مدھم روشنی میں اُبھرتی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں وہ ہی سرد، بے حس کیفیت تھی، جس میں زندگی کی کوئی رمت نہ تھی، صرف وہ ہی رازداری اور مقصد جسے وہ دل کی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے تھا۔

گونار نے ایک خفیف حرکت سے بیگ کا دہانہ وا کیا، جیسے وہ کسی گہرے راز کی پر تیں کھول رہا ہو۔ ناگہانی، ایک وزنی اور بے جان شے بیگ کے اندھیرے سے زمین پر گر جی، اس کی گرتی ہوئی دھمک میں ایک خوفناک بھاری پن پوشیدہ تھا—گویا مردہ وجود اپنے آپ کو زندہ حقیقت پر مسلط کر رہا ہو۔

وہ آواز سن کر گونار کی ہونٹوں پر ایک مسموم مسکراہٹ در آئی، جیسے وہ کسی تاریک سرگوشی سے آشنا ہو۔ اس کے لبوں کے کنارے زہریلے انداز میں خمیدہ ہو گئے، گویا اس کی مسکراہٹ میں بھی موت کی کھنک گھلی ہو۔

پچنگ بیگ کے نیچے ایک لاش پڑی تھی—خانہ بدوش چپسی کی، جس نے گونار پر گولی چلائی تھی۔ اُس کی حالت ایسی تھی کہ روح کانپ اٹھے۔

اُس کا چہرہ، زخموں سے چور، اب ایک بھیانک نظارہ بن چکا تھا۔ کھوپڑی پھٹی ہوئی، یہاں تک کہ دماغ تک جھلک رہا تھا۔ اُس کی ایک آنکھ اپنے مدار سے باہر لٹک رہی تھی، جیسے انگور کا لٹکتا ہوا خوشہ ہو۔ اُس کا سارا بدن موت کی افیت ناک کہانی بیان کر رہا تھا۔

گونار نے اُس جپسی کی لاش کو سرد مہر اور بے حس انداز میں دیکھا۔ نہ کوئی افسوس، نہ کوئی پشیمانی۔ وہ تقریباً رسمی انداز میں اُس بدن کو پھلانگتا ہوا آگے بڑھا، گویا کہ یہ ایک معمولی سی رکاوٹ ہو۔

وہ تولیہ سے اپنے ہاتھ صاف کرنے لگا، ہر پونچھ اُس کی سرد روح اور بے رحم سفر کی گواہی دے رہی تھی۔ یہ تولیہ خون اور پسینے کو صاف کر رہا تھا، لیکن حقیقت میں یہ اُس کے راستے میں آنے والوں کی قربانیوں کا خاموش اعتراف تھا۔

پھر دروازہ کھلا، اور گونار کے وفادار سائے اندر داخل ہوئے۔ وہ سیاہ وردیوں میں لپٹے، خاموش اور تابع، گونار کے اشارے کے منتظر تھے۔

ان کے درمیان ایک غیر کہی ہوئی بندھن تھا، جو وفاداری اور موت کے درمیان معاہدہ کی مانند تھا۔ کمرے میں تناؤ اور موت کی سرد سانسیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک طوفان گزر چکا تھا، مگر اُس کی وحشیانہ گرج کی بازگشت اب بھی فضا میں معلق تھی، جو کسی نئے خونریز انجام کی پیشین گوئی کر رہی تھی۔

گونار کی آنکھوں میں بلا کی سرد مہری تھی۔ وہ اُس کمرے سے نکل گیا، گویا کسی نئے شکار کی تلاش میں ہو۔
اُس کا ہر قدم ایک نئے طوفان کی تیاری کر رہا تھا، جیسے آنے والے لمحات مزید خونریزی اور انتقام کی نوید
دے رہے ہوں۔

...°...

رات کی تاریکی میں چھپے ہوئے سائے ان پر سرسرا رہے تھے جب گسٹا اور کیتھرین اس میدان میں پہنچے
جہاں گونار کی وحشیانہ لڑائی کے آثار ہونے چاہیے تھے۔

کیتھرین کا چہرہ پسینے سے چمک رہا تھا، جیسے خوف اور بے چینی نے اس کی روح میں جڑ پکڑ لی ہو۔ جیسے ہی وہ
موقع پر پہنچے، کیتھرین کے قدموں میں لرزش آئی، اُس کے چہرے پر ایک سرد وحشت طاری تھی۔ وہ
بے اختیار چیخی، ”لاشیں کہاں ہیں؟ ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہیں!“۔

گسٹا، جو خود بھی گھبراہٹ میں مبتلا تھا، اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو جھاڑتے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں
بولا، ”اسے یہ کبھی پتہ نہیں چلنا چاہیے تھا۔“ اس کی زبان کپکپا رہی تھی، اور آنکھوں میں ایک عجیب سی
گھبراہٹ تھی۔

کیتھرین کی نظریں ارد گرد چھانٹ رہی تھیں، ہر چھوٹی سی آواز کو کان لگا کر سن رہی تھی، اور دور کہیں
حشرات الارض کی پر اسرار سرگوشیوں نے اس منظر کو اور بھی بھیانک بنا دیا تھا۔

وہ سانس روکتے ہوئے گسٹاو کی طرف مڑی، اور اس کی آواز میں درد کی گہری پرتیں تھیں، ”گونار اور میں پچھلے ڈیڑھ ماہ سے ساتھ ہیں، لیکن اُس نے کبھی میرے قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ہم ایکس کے لیے کام کرتے ہیں۔ اُسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ ہم ساتھی نہیں، بلکہ میاں بیوی ہیں، لیکن اب... کچھ بدل گیا ہے، گسٹاو، مجھے لگتا ہے کہ اُس نے سب جان لیا ہے۔“

کیتھرین کا اعتراف اُس سناٹے میں بازگشت کی طرح گونج اٹھا۔ ہوا میں سرسراتے ہوئے کیڑوں کی آواز نے اس لمحے کی سنگینی کو مزید گہرا کر دیا۔

کیتھرین کی آواز ہلکی سی کپکپاہٹ سے بوجھل تھی جب اُس نے مزید کہا، ”ہم نے اپنے بیٹے کی بیماری کے علاج کے لیے اس خوفناک زندگی کو اپنایا تھا۔ گونار کو کبھی یہ سچ معلوم نہیں ہونا چاہیے تھا، لیکن اب...“ اس کی بات ادھوری رہ گئی، گویا کسی ان کہے انجام کا خوف اُس کے لبوں کو باندھ رہا ہو۔

گسٹاو نے کیتھرین کے کندھے مضبوطی سے تھام لیے، اس کے چہرے پر تشویش کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ سرد لہجے میں بولا، ”کیتھرین، ہم ایک بندگلی میں ہیں۔ اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے ہمیں اب ناقابل تصور کرنا ہو گا۔ گونار کو ختم کرنا ہو گا۔ ایکس ہی ہماری آخری امید ہے۔“

کیتھرین کی آنکھ سے خاموشی سے ایک آنسو نکلا، جو اُس کے گال پر لڑھک گیا۔ اُس کی آواز میں ایک تلخ سچائی تھی جب اُس نے آہستہ سے سرگوشی کی، ”غربت ہمیں اُس تاریک جگہ تک لے گئی ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں، گسٹاو۔“

یہ الفاظ رات کی فضا میں معلق رہ گئے، جیسے مقدر کا کوئی بے رحم فیصلہ اُن کی تقدیر پر اپنا سایہ ڈال رہا ہو۔ ان کا آنے والا قدم، کسی ان دیکھی مصیبت کی پیش بندی کر رہا تھا، اور گونار کا سحر زدہ وجود اُن کے لیے ایک ایسی گتھی بنتا جا رہا تھا جسے سلجھانا اُن کی بقا کے لیے لازم تھا۔

...°...

رات کی اندھیری وسعتوں میں، جنگل کی وحشت ناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی نادیدہ عفریت اپنی موجودگی کا اعلان کر رہا ہو۔

وہ منحوس درخت، جو صدیوں کے بوجھ تلے جھکے ہوئے تھے، کسی خوفناک راز کی سرگوشی کرتے محسوس ہوتے تھے۔ ان کی دھندلی شاخیں جیسے خونخوار کہانیاں سناتی ہوں، اور ان کے نیچے تین خانہ بدوشوں کی لاشیں الٹی لٹک رہی تھیں، اُن کے چہرے یاس و ہراس کا منہ بولتا ثبوت بنے ہوئے تھے۔

ان کے منہ کپڑوں سے بندھے تھے، چیخوں کی التجا ان کے وجود سے جھلک رہی تھی، لیکن وہ صدا بے سود تھی، کسی سُنسان وادی کی گم گشتہ باز گشت کی مانند۔

رات کا دبیز پردہ، اور اُس پر پھیلا ہوا جنگل کا سکوت، خوف کا خنجر بن کر دلوں کو چھید رہا تھا۔ شیروں کی نگاہیں، شکار پر جمی ہوئی، کسی بھی لمحے حملے کے لیے تیار تھیں۔ ان کی دور دراز گونجتی ہوئی دھاڑیں ہر اُس دل کو دہلا رہی تھیں جو اپنے اندر خوف کی تھکیاں سننے کی ہمت رکھتا تھا۔ اچانک، ایک طاقتور جست کے ساتھ، یہ شاہی درندے اپنی غیر انسانی قوتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان بے یار و مددگار خانہ بدوشوں پر پل پڑے۔

جو کچھ ہوا، وہ قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔ گوشت کے کٹے ہوئے ریشے، ہڈیوں کے ٹوٹنے کی گرجتی ہوئی صدائیں، اور انتڑیوں کے باہر آنے کی دھماکے دار آوازیں۔

ہر کاٹ اور ہر پنچہ، خون میں لت پت، موت کی نوید بن کر چیخ رہا تھا۔ شیروں نے انسانوں کو اس بے دردی سے چیر پھاڑ دیا، جیسے گویا ان کی بقا کا کوئی ادھورا عمل پورا ہو رہا ہو۔

خون کی بارش نے زمین کو لال کر دیا، اور ہڈیوں کی چٹخنے کی آوازیں فضاء میں لرزاں تھیں، جیسے موت کا نغمہ بلند ہو رہا ہو۔

دو شیروں کے خون میں تر تر جڑے چمک رہے تھے، ان کی آنکھوں میں پیاس بھڑک رہی تھی۔ وہ ادھ کھائے جسموں کو چھوڑ کر پیچھے ہٹے، ان کے پنچوں سے خون ٹپک رہا تھا، جیسے اُن کی فتح کی گواہی دے رہا ہو۔ جنگل میں، ان بد بختوں کے بے جان، بکھرے ہوئے اعضا پر سفاکیت کی چمک بکھیر دی۔ ہر گوشہ اس حقیقت کا غماز تھا کہ فطرت بے رحم ہے، اور اُس کی عدالت میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں۔

یہ منظر، قدرت کی بے رحمی اور انتقام کی مکمل تصویر پیش کر رہا تھا، جیسے رات کے اندھیرے میں کسی قدیم لعنت کا سایہ اتر آیا ہو۔

...°...

ایمان نے خود کو بستر پر پھلتے ہوئے پایا، اس کی ٹانگیں بے ترتیب پھیلی ہوئی تھیں، اور کھڑکی سے آتی ہلکی سی اسٹریٹ لائٹ کی مدھم چمک اس کے وجود کو گھیرے ہوئے تھی۔

کمرے کی خاموشی میں صرف کولر کی مستقل گونج تھی جو اس ویران ماحول میں ایک بے چین سی آواز تھی۔ یہ مدھم روشنی کمرے کو ایک غیر مرنی بوجھ سے بھری فضا میں بدل رہی تھی، جب وہ اپنے خیالات کی بھول بھلیوں میں گم ہو رہی تھی۔

۔ ”آج بزرگ کیوں نہیں آئے؟ نہ وہ آج آئے نہ کل“ اس نے سوچتے ہوئے اپنے خالی ذہن کو سوالوں سے بوجھل پایا۔ جیسے وہ سوالات کسی ان دیکھی خلاء میں معلق ہو گئے ہوں۔

۔ ”کیا وہ پھر آئیں گے؟ اور اگر نہیں تو، میرے سوالات؟ جنت کی کنجی؟ دل کا سکون؟ میرے خوابوں کا کیا ہوگا؟“ ایمان نے ایک عمیق سوچ میں غرق ہو کر ان خیالات کو جنم دیا، اور اسلام کی بابت اپنی لاعلمی پر الجھن کا شکار ہو گئی۔

کمرے کی خاموشی میں کولر کی ہلکی ہلکی سرگوشیوں کے سوا کچھ نہ تھا، جیسے کمرہ خود اپنے راز چھپا کر بیٹھا ہو۔ ایمان بے چینی کے عالم میں بستر سے اٹھی، اور فرش پر اس کے قدموں کی چاپ اس کی موجودگی کا اعلان کرنے لگی۔

وہ دراز کی طرف بڑھی اور اسے کھولتے ہی وہ طلسماتی پتا برآمد ہوا، جس پر پر اسرار الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ اس نے پتے کو روشنی کے سامنے کیا اور حیران ہو گئی — پتا ایک خاموش چمک میں ڈوبا ہوا تھا، اور اس کے الفاظ جو کبھی موجود تھے، اب بالکل غائب تھے۔

اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، اس نے بے یقینی کے عالم میں پتا پلٹا اور زیر لب بولی، ”الفاظ کہاں چلے گئے؟“

کمرہ جیسے اس کی سانسوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا، ہر لمحہ بو جھل ہوتا گیا۔ اس غیر متوقع انکشاف نے ایک خوفناک سکوت کو جنم دیا، اور ایمان کی نگاہیں اس پتے پر جمی رہیں۔

وہ لمحہ جیسے کمرہ بھی اپنی سانسیں روک کر ایمان کی حیرت کا شریک گواہ تھا۔ پس پشت کولر کی مدہم گونج اور تنہا کھڑکی کی روشنی میں، کمرہ ایک رازدار کا روپ دھار چکا تھا۔

ایمان کی آنکھوں میں بے یقینی کی چمک تھی، وہ پتا جس پر کبھی گہرے معنی دار الفاظ لکھے تھے، اب پر اسرار طور پر خالی ہو چکا تھا۔

ان گمشدہ الفاظ نے جو خلاء چھوڑا، وہ ایمان کے اندر مزید الجھن کا باعث بن رہا تھا۔ اس کے دل میں بزرگ کی آمد کی امید اور قرآن کی تسلی بخش آیات کی بازگشت دم توڑنے لگی تھی۔

ایمان کو احساس ہوا کہ اب وہ اس جدوجہد میں تنہا ہے۔ اب کوئی بزرگ اس کے سوالات کا جواب دینے نہیں آئے گا، اور نہ ہی قرآن کی آواز اس کی روحانی تنہائی کو سہارا دینے والی ہوگی۔

اس پر گہرے عزم کا بوجھ محسوس ہوا، اور اس نے اپنے دل میں ایک نیا ارادہ باندھ لیا۔ کھڑکی سے آتی ہلکی روشنی اب ایمان کی اس اندرونی کشمکش کی گواہی دے رہی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ روحانی سکون کا سفر آسان نہیں ہوگا۔

یہ جستجو، جسے وہ اپنا مقدر سمجھ رہی تھی، اب صرف اس کی اپنی کوششوں اور استقامت سے طے پائے گا۔ کمرہ، اپنی خاموشی میں چھپے رازوں کے ساتھ، ایک پناہ گاہ بن گیا تھا جہاں ایمان نے اپنی ذات کے اندر جھانکنے کا اور اپنے سوالات کے جوابات کی تلاش کا عزم کیا۔

اس خزانے، جس کی وہ متلاشی تھی، کی اصل قیمت اب اس کی جدوجہد سے وابستہ تھی۔

...°...

رمضان کے تیسویں دن، عید کی امید ہو ایس معلق سی تھی، جس نے ایمان کے گھر کو ویرانی میں ڈبو دیا تھا۔

گھر والے بازار کی طرف نکلے تھے، عید کی تیاریوں میں مگن، جب کہ ایمان اپنے حجرے میں، خاموشی سے تنہائی کے لمحوں میں گم تھی۔ صبح کے ٹھیک دس بجے، وہ باہر نکلی۔ اس نے ایک نہایت نفیس اور شاندار آسمانی نیلے رنگ کی قمیض زیب تن کی ہوئی تھی، جس پر چاندی کے دھاگوں کی کڑھائی سے بے پناہ دلکشی پیدا ہو رہی تھی۔

فینسی ٹراؤزر نے اس کی پوشاک میں اور بھی رنگ بھر دیے تھے۔ ایمان کے بالوں کا جوڑا نفاست سے تیار کیا گیا تھا اور اس کے سر پر چوڑے دوپٹے کی چمک نے اس کی شخصیت کو مزید اُجالا بخشتا تھا۔

اسلامی لباس کے ضابطے کو سمجھنے کی اس کی جستجو نے اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ پاکستانی روایت میں قمیض شلوار اور دوپٹے کی قدیم اہمیت نے ایمان کو حیرت زدہ کیا تھا، اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اسی طرزِ لباس کو اپنے طرزِ زندگی میں شامل کرے گی۔

دوپٹہ، جو مسلم خواتین کی شائستگی اور حیا کی علامت سمجھا جاتا ہے، اسے روحانی تحفظ کا احساس دیتا تھا۔ اگرچہ ابھی تک وہ عباہ یا نقاب کو مکمل طور پر اپنانے کی پوزیشن میں نہ تھی، لیکن اس نے اپنے دل میں یہ ارادہ باندھ لیا تھا کہ ایک دن وہ ان رموز کو بھی بہتر طور پر سمجھ لے گی۔

جیسے ہی ایمان گیٹ کی طرف بڑھی، سامنے سڑک پر صباحت آنٹی کھڑی نظر آئیں، جنہیں وہ ہمیشہ۔ “ڈی ایچ کی خالہ” کہہ کر پکارتی تھی۔

ایک بڑی سی کار، جسے شاید ایئرپورٹ کی طرف روانگی کے لیے تیار کیا جا رہا تھا، سامنے کھڑی تھی، اور ملازمین اس میں سامان لوڈ کر رہے تھے۔

ایمان نے دیکھا کہ بدر، صباحت کو گرم جوشی سے گلے لگا رہا تھا، جیسے کہ کسی عزیز کی رخصتی کے وقت کا منظر ہو۔

ایمان اپنی نرمی اور تہذیب کے ساتھ صباحت آنٹی کے پاس آئی، ”السلام علیکم، صباحت آنٹی“۔ ایمان نے شائستگی سے کہا۔

بدر اور صباحت کے درمیان محبت بھری گفتگو ہو رہی تھی، مگر جیسے ہی ایمان کی آواز بدر کے کانوں میں پڑی، وہ ایک پل کے لیے ٹھٹکا۔ ایک لمحے میں ہی، بدر کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی نرمی آگئی، جیسے حالیہ ماضی کے کچھ واقعات اس کے ذہن میں تازہ ہو گئے ہوں۔

صباحت آنٹی نے نہایت تعجب سے ایمان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا، ”ایمان، تم ہمیشہ حیران کر دیتی ہو!“۔

ایمان نے شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”رمضان کے ان آخری دنوں نے مجھے اتنا بدل دیا ہے کہ خود بھی حیران ہوں۔“۔

رمضان کے آخری دنوں میں، ایمان میں جو اندرونی انقلاب آیا، وہ حیرت انگیز تھا۔ چند مختصر دنوں میں اس کے اندر ہونے والی یہ تبدیلی، اس بات کا مظہر تھی کہ انسان کی روح میں کتنی وسعت اور کتنی گہرائی چھپی ہوتی ہے۔

عام طور پر، اس قدر انقلابی تبدیلیوں کے لیے مہینوں بلکہ برسوں کی محنت درکار ہوتی ہے، مگر ایمان نے چند ملاقاتوں میں ہی وہ بصیرت حاصل کر لی تھی، جو عموماً عمر بھر کی ریاضت مانگتی ہے۔

وہ بزرگ، جنہوں نے اس کی روح میں روشنی کا دیا جلایا، نہایت فہم و فراست سے اس کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان کی حکمت بھری باتوں نے ایمان کے ذہن میں ایک ایسا نقش قائم کیا، جو کسی مینارے کی مانند اس کی زندگی کی تاریکیوں میں روشنی بکھیر رہا تھا۔

باوجود اس کے کہ ایمان کو اسلام کی باریکیوں کا گہرا ادراک نہ تھا، لیکن وہ علم کے راستے پر گامزن ہو چکی تھی۔

بدر، ان دو سے جدا ہو کر گاڑی کی جانب بڑھا۔ صباحت نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”تمہیں پاکستانی لباس میں دیکھ کر بہت اچھا لگا، ایمان!“

ایمان نے دور سے بدر کو جاتے ہوئے دیکھا اور حیران ہو کر پوچھا، ”یہ کہیں جا رہے ہیں؟“

صباحت کی مسکراہٹ میں ایک لطیف سی افسردگی کی جھلک دکھائی دی، جیسے کوئی ادھوراراز چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ جب ایمان نے مزید جاننے پر اصرار کیا تو صحبت نے ایک لمحے کے لیے بدر کی طرف دیکھا، جو خاموشی سے ہنستا رہا۔ وہ الفاظ جن کا مطلب اس خاموشی میں گم ہو چکا تھا۔

ایمان نے بدر کی جانب طنزیہ مسکراہٹ پھینکی اور کہا، ”لگتا ہے کہ اسلام آباد کا پانی آپ کو ہضم نہیں ہوا؟“۔

صبحت نے فوراً ہی گفتگو کو موڑنے کی کوشش کی، ”ارے رکو، میں نے تمہارے لیے کچھ شاپنگ کی تھی بدر، وہ میں اندر ہی بھول گئی ہوں۔ ابھی لاتی ہوں!“۔ وہ جلدی سے اندر چلی گئی، اور جب وہ غائب ہوئی، بدر نے ابھی تک اپنی ہلکی سی مسکراہٹ قائم رکھی اور جواب دیا، ”ہاں، دبئی کا پانی شاید مختلف ہو، مگر اسلام آباد کو بھی میں بخوبی سنبھال سکتا ہوں۔“۔

ایمان نے اپنی آنکھوں میں چمک اور لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

”ہاں، دبئی کی بناوٹی روشنیوں میں چمکنا تمہاری خاصیت ہو سکتی ہے، مگر اسلام آباد کی خاک کو عزت دینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ جسے آلودہ سمندری پانی کی عادت ہو، وہ شاید یہاں کے پہاڑی چشموں کی شفاف پانی کو برداشت نہ کر پائے۔“۔

بدر نے حیرانی سے ایمان کی طرف دیکھا، جیسے وہ اس کی باتوں میں چھپے طنز کو پوری طرح سمجھ نہ پایا ہو، مگر اس کی خاموشی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

ایمان نے توقف کیا، جیسے وہ کسی یادگار لمحے کو دوبارہ چھیڑ رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں وہ رات جھلک رہی تھی جب بدر کو واقعی دھول چکنی پڑی تھی۔

۔ ”لیکن فکر نہ کرو، ہم تمہیں یہاں کے ماحول سے مانوس کرنے کے لیے موجود ہیں۔ جیسے اُس رات تم نے مقامی ذائقوں کی تعریف کرنا سیکھا تھا۔“

اس کے لہجے میں طنز کی جھلک نمایاں تھی، جیسے وہ بدر کو چیلنج کر رہی ہو۔

بدر کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا، مٹھیوں کو مضبوطی سے بھینچتے ہوئے اس نے ایمان کی جانب گھورا۔ ان کی نظریں ایسی شدت سے ملیں جیسے الفاظ کی نہیں بلکہ جنگ کی تیاری ہو۔

بدر نے زہر میں ڈوبی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”اگر میں نے تم سے اپنی ہار کا بدلہ نہ لیا اور تمہارے قدموں کے نیچے زمین نہ کھینچ لی، تو میرے نام کا کتا پال لینا۔“ اس کی آواز میں تلخی اور غصہ تھا، مگر مسکراہٹ وہ ہی رہی۔

ایمان نے ایک لمحے کے لیے غور سے اسے دیکھا، پھر ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھی،
- ”پہلے بھونک کر اپنی نسل تو بتادو، تاکہ میں تمہارے لیے یہ شوق بھی پورا کر سکوں۔ جس طرح اُس رات
تم نے میرے ہاتھوں برباد ہونے کی فرمائش کی تھی اور میں نے تمہاری خواہش پوری بھی کی تھی، یاد
ہے؟”۔

ایمان کے الفاظ جیسے آگ کے شعلے بن کر بدر کے گرد لپٹ گئے، اور بدر کو ایک لمحے کے لیے حیرت نے
جکڑ لیا۔

وہ ایمان کے اس دلیرانہ جواب سے گہرائی میں ڈوبا، جیسے ہر لفظ اسے نیچے گھسیٹ رہا ہو۔ ایمان نے مزید
کچھ کہے بغیر اسے وہیں چھوڑ دیا، ایک آخری تیز طنز کی چوٹ لگا کر، اور بدر کو اپنے غصے کی آگ میں سلگنے
کے لیے چھوڑ دیا۔

بدر اپنے دانت پیتا ہوا بے بسی سے دیکھتا رہ گیا، جب کہ ایمان اپنے اعتماد بھرے قدموں کے ساتھ ہنستی
ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اس کی ہنسی ہوا میں گونج رہی تھی، جیسے وہ بدر کے غصے کا مذاق اڑا رہی ہو۔

...°...

مدھم روشنی والے کمرے میں، گل بانو کی آنکھیں رونے کے باعث سو جی ہوئی تھیں، اور وہ بے بسی کے
عالم میں سرور کے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی تھی۔

مولوی سرور، جس کے چہرے پر مکاری اور چالاکی کے آثار نمایاں تھے، قریب ہو کر بیٹھا اور بظاہر ہمدردی کے پردے میں اسے دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگا۔

اُس کی آواز میں گہری چال پوشیدہ تھی، جب اس نے دھیرے سے کہا ”اب جبکہ احمر نے تمہیں طلاق دے دی ہے، تمہیں جلد از جلد نکاح کرنا چاہیے۔ کل عید ہے اور اس سے پہلے نکاح نہ کرنے پر تمہاری اور احمر کی قسمت پر سیاہ بادل منڈلانے لگیں گے۔“

گل بانو، جو ابھی تک اپنی جذباتی کیفیت میں پھنسی ہوئی تھی، حیرت سے اس کی باتوں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ”لیکن مولوی صاحب، طلاق کو تو ابھی چند گھنٹے ہوئے ہیں، کیا عدت کے بغیر نکاح کرنا شرعی طور پر غلط نہیں؟“ وہ اضطراب سے پوچھ بیٹھی، جیسے کہ وہ اپنے دل میں ابھرتے ہوئے سوالات کو دبانے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔

مولوی سرور کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی، اور اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھر آئی۔ ”تمہاری فکر درست ہے، لیکن ایک راستہ موجود ہے جو نہ صرف تمہیں بلکہ احمر کو بھی بچا سکتا ہے۔ تمہیں میری تجویز پر غور کرنا چاہیے۔ میں حاضر ہوں، اور تمہیں طلاق کے بعد نکاح کے عمل کو روحانیت سے جوڑ کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے کا موقع دے سکتا ہوں۔“

گل بانو نے الجھن بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور وضاحت طلب کی، ”یہ کیسا حل ہے؟“

سرور نے اپنی آواز کو مزید پُر اسرار بناتے ہوئے کہا، ”دیکھو، تمہاری اور احمر کی قسمت میں لکھی گئی تباہی کا توڑ اسی میں ہے کہ تم فوراً نکاح کرو، اور میں تمہاری یہ مشکل آسان کر سکتا ہوں۔ میرے ساتھ نکاح کر کے تم نہ صرف احمر کو بچا سکتی ہو بلکہ شرعی قوانین سے بھی بری الذمہ ہو جاؤ گی۔ عدت کا معاملہ بھی روحانی عمل سے حل کیا جاسکتا ہے۔“

گل بانو نے بے یقینی کے عالم میں سرور کی طرف دیکھا، وہ جانتی تھی کہ اس کا یہ فیصلہ جلد بازی کا تھا، لیکن وہ اس کے چہرے پر موجود چالاکی کو پوری طرح نہیں سمجھ پائی تھی۔

۔ ”مولوی صاحب، کیا واقعی یہ ممکن ہے؟“ اُس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا، دل میں شدید مایوسی اور اضطراب کا طوفان برپا تھا۔

سرور نے اپنی شیطانی مسکراہٹ کو اور بھی گہرا کرتے ہوئے کہا، ”بالکل، میں تمہارے لیے ایک روحانی عمل کر سکتا ہوں جس سے تم چالیس دن کے انتظار سے آزاد ہو جاؤ گی، اور اس کے بعد نہ صرف تمہاری بلکہ احمر کی قسمت بھی بدل جائے گی۔ تم بس مجھ پر یقین کرو۔“

مولوی سرور کی آنکھوں میں مکاری اور فریب کی گہری چمک تھی، جیسے اُس کی روح ہیرا پھیری اور شیطنیت سے تشکیل پائی ہو۔

وہ گل بانو کی طرف جھکا اور اپنی آواز کو مزید نرم اور شیطانی چالاکی سے بھرپور کرتے ہوئے گویا ہوا، ”تم ابھی ان تمام چیزوں کی گہرائی سے ناواقف ہو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتا، لیکن تمہارے لیے وقت کم ہے۔ کل عید کا دن ہے اور تمہاری قسمت کا دروازہ ابھی کھلا ہے۔ اگر تم نے دیر کی تو احمر کا انجام تمہاری کمزوری کا نتیجہ ہو گا۔“

گل بانو کے اندر اضطراب اور بے بسی کا طوفان برپا تھا، وہ سرور کی باتوں میں کھوئی ہوئی، اُس کے حقیقی ارادوں کو پہچاننے سے قاصر تھی۔ اُس نے سر جھکائے، اپنی لرزتی ہوئی آواز میں کہا، ”مگر، مولوی صاحب... عدت؟ کیا شرعی حکم کو توڑنا گناہ نہیں ہو گا؟“

سرور کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی، اُس کی آنکھوں میں ابلیسی چمک تھی جو اپنی کامیابی کا جشن منا رہی ہو۔ ”گناہ؟“ وہ ہنسنے لگا، ”گناہ تو وہ ہوتا ہے جو شرع سے غفلت کا نتیجہ ہو۔ لیکن میں تمہارے لیے ایک راستہ کھول رہا ہوں جو تمہیں عدت کی بندشوں سے آزاد کر دے گا۔ ایک روحانی نکاح، جو تمہاری روح کو پاک اور تمہارے احمر کو بربادی سے بچالے گا۔“

گل بانو کی آنکھوں میں الجھن اور بے بسی کے سائے اور گہرے ہو گئے۔ وہ اپنی مایوسی کے بوجھ تلے دبی، اس چالاک جال کو پوری طرح نہیں سمجھ سکی تھی جو سرور نے بُنا تھا۔

- ”مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ لرزتے لہجے میں بولی، جیسے وہ جانتی تھی کہ وہ غلط سمت میں بڑھ رہی ہے، لیکن اس کے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا۔

سرور نے اُس کی کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا، ”تمہارے پاس اور کوئی چارہ نہیں۔ میں تمہارا نجات دہندہ ہوں۔ میرے ساتھ نکاح کرو، اور نہ صرف احمر بلکہ تمہاری اپنی روح بھی بچ جائے گی۔ تم سوچو، اتنی بڑی قربانی کو چھوڑ کر تمہیں کیا ملے گا؟ احمر کی جان تمہارے فیصلے پر منحصر ہے۔“

اس کے الفاظ میں ایک عجیب سی کشش تھی، جیسے وہ ایک سانپ ہو جو اپنی پھنکار سے شکار کو بے حس کر دیتا ہو۔ کمرے میں ہر چیز، حتیٰ کہ چراغوں کی مدھم روشنی اور دیواروں کا سناٹا، اس اندھیرے سودے کی گواہی دے رہے تھے۔

سرور اپنی مکروہ سازش کا بیج بو کر، ایک فاتحانہ وقار کے ساتھ پلٹنے لگا۔ اُس کے قدموں کی چاپ میں وہ شیطانی سکون جھلک رہا تھا جو صرف ضمیر کی تاریکی میں پروان چڑھتا ہے۔ جیسے ہی وہ رخصت ہونے کو مڑا، فضا میں اُس کے کیے گئے فریب کی بو جھل گونج باقی رہ گئی، اور وہ اپنی چالاکی کے ثمرات سمیٹنے کے لیے آگے بڑھتا گیا۔

گل بانو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اس کی آواز لرزتی ہوئی، اُس نے سرور کو پکارا، ”رکیے... خدا را... آپ جو چاہیں کریں، میں آپ سے نکاح کے لیے تیار ہوں، بس احمر کو بچالیں، اس کی جان بچالیں۔“

سرور رکا۔

اس کی شیطانی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر مزید گہری ہو گئی، جیسے وہ جانتا تھا کہ اُس نے اپنی جنگ جیت لی ہے۔ ”میں تمہارے لیے حاضر ہوں،“ اُس نے اطمینان سے کہا، ”اور تم خوش قسمت ہو کہ تم نے صحیح فیصلہ کیا۔“

کمرے کی خاموش دیواریں اور ٹمٹماتے چراغ، جنہوں نے سارے مکروہ کھیل کا نظارہ کیا تھا، اپنی بے بسی میں مزید گہرے ہو گئے۔

...°...

جیسے ہی سورج کی کرنیں اسٹاک ہوم کی دلکش اسکائی لائن کو چھوتی ہیں، گونار اپنے، عالیشان دفتر کی کشادہ کالچ کی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا، جہاں سے شہر کا دل موہ لینے والا منظر نظر آتا تھا۔

وہ اپنی پشت پر ہاتھ باندھے، مکمل سیاہ لباس میں ملبوس، انتہائی نفاست اور جلال کا پیکر نظر آ رہا تھا۔ نگاہیں دریا پر تھیں مگر ذہن میں کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ دفتر کا ہر کونہ سلیقے اور خوبصورتی کا عکس تھا۔ سیاہ، سرخ اور سنہرے رنگوں میں گھلا ماحول، قدرتی مواد سے مزین، جیسے گونار کے مزاج کا آئینہ ہو۔

اس کے عقب میں ایک بڑی میز تھی، جس پر ایکویریم میں تیرتی مچھلیاں ایک عجیب سی ہلچل پیدا کر رہی تھیں۔ سفید فرش پر پھیلے قالین، صوفے اور میز نے مہمانوں کی جگہ کو ایک شاہانہ انداز دیا تھا۔ لیکن گونار کا دماغ اس پر سکون ماحول میں بھی کشمکش کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

دفتر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی جب دروازے کے پاس ایک ہلکی سی ”بیپ“ کی آواز سنائی دی، اور ایل ای ڈی بورڈ پر دو آدمیوں کی آمد کا اشارہ ہوا۔

وہ دونوں ادھیڑ عمر کے شخص تھے، چہرے پر عاجزی اور آنکھوں میں جھجک۔ مگر گونار کا دھیان اب بھی باہر کی خوبصورت فضاء میں الجھا ہوا تھا۔

وہ دونوں مدہم قدموں کے ساتھ، تھر تھراتے ہوئے، گونار کی طرف بڑھ رہے تھے۔

فضا میں ایک خاموش تناؤ چھایا ہوا تھا، جس کی گہرائی ان کے دلوں میں بے یقینی کی لہر دوڑا رہی تھی۔

وہ کچھ فاصلے پر پہنچ کر رک گئے، ایک ایسے مقام پر جہاں ان کی سانسیں بھی دھیمی اور بادل محسوس ہونے لگیں۔ مودبانہ انداز میں ہاتھ باندھے، سر جھکائے، وہ احترام کے بوجھ تلے جھکے کھڑے رہے۔

جب کافی دیر تک کوئی جواب نہ آیا، تو آخر کار ایک نے تھر تھراتی آواز میں حوصلہ کر کے کہا،

۔ ”سر، آپ نے ہمیں طلب کیا تھا؟“

گونار نے نظریں ہٹائے بغیر دھیرے سے کہا، ”یاد ہے، اس دفتر میں پہلے دن میں نے کیا کہا تھا؟“

دونوں آدمیوں کے چہروں پر غیر یقینی کے آثار نمایاں ہوئے۔

گونار نے انہیں روکنے کے لیے خفیف سا اشارہ کیا، اور پھر بتدریج میز کے عقب میں صدر نشین کرسی پر متمکن ہو گیا۔

ٹانگیں عبور کرتے ہوئے، اس نے گہری نظروں سے ان دونوں کو دیکھا، جیسے ان کے اندر کی ہر بات پڑھ لی ہو۔

۔ ”جو میں نے اُس وقت کہا تھا، اُسے دہرا رہا ہوں،“ اس نے ٹھہرے ہوئے غصے کے ساتھ کہا۔ اس کے الفاظ میں سرد مہری اور خطرے کا احساس تھا۔

اور پھر گونار نے اپنے لہجے کو سخت کرتے ہوئے انگریزی میں کہا

Remember, in this game, respect is earned, power is claimed, and “loyalty is everything. Cross me, and you’ll find out just how unforgiving this world can be”.

گونار نے اپنی پراسرار گہری نظر کو برقرار رکھتے ہوئے کہا، ”اس کائنات کی عظیم سازش میں دو خاندان ہیں، جو ان دیکھی تاروں کو کھینچ کر انسانوں کی تقدیر لکھتے ہیں۔ جب انہیں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ان کے مقصد سے منحرف ہو گیا ہے، تو تم اس کے انجام کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ - گونار کے الفاظ کی گمبھیرتا کمرے کی فضا میں بھاری ہو کر معلق ہو گئی، اور ان آدمیوں کے دلوں میں خوف و ہراس کی سرد لہر دوڑ گئی۔

ایک نے ہمت کرتے ہوئے پوچھا، ”سر، آپ ہمیں یہ کیوں بتا رہے ہیں؟“ -

گونار نے براہ راست جواب دینے سے گریز کیا۔ اس کی آنکھوں میں اسرار کی گہرائی جھلکی، اور اپنی بات جاری رکھی ”جب کوئی ان خاندانوں کو پار کرتا ہے یا ان کے رازوں کے پردے ہٹانے کی جسارت کرتا ہے، تو اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے،“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

گونار نے ایک مخ اشارے سے ان دونوں کو اپنے روبرو موجود ماندہ کے پار کرسیوں پر متمکن ہونے کا حکم دیا۔

گونار کی دعوت پر، وہ دونوں آدمی ایک لمحے کے لیے ہچکچائے، پھر آہستہ آہستہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے چہروں پر بے یقینی کے سائے گہرے ہو گئے، اور ان کی آنکھوں میں خوف کی جھلکیاں نمایاں ہونے لگیں۔

گونار نے ان پر اپنی تیز نگاہیں جمائے رکھیں، جیسے وہ انہیں اس گہرے بھید کی گہرائی میں کھینچ رہا ہو جس میں وہ خود ایک ماہر معمار تھا۔

گونار نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو جوڑ کر ایک مثلث بنایا، اس کے چہرے پر طاقت کی ایک غیر مرنی لہر دوڑ گئی۔ سامنے بیٹھے آدمی اپنے رنگ اڑے چہروں کے ساتھ کانپ رہے تھے، جیسے ان کی رگوں میں خون جم گیا ہو۔

گونار نے اپنے سر دلچے میں کہا، ”یہ خاندان ایک ایسی دنیا تخلیق کر چکے ہیں جہاں لوگ اپنی تقدیر سے غافل، غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے انسانیت کے ذہنوں کو قابو کرنے کے لیے ادارے بنائے اور ان کے جسموں کو قید کرنے کے لیے کارخانے۔“

گونار کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آئی، ”یہ نام نہاد بین الاقوامی تنظیمیں، جو انسانیت کے خیر خواہ ہونے کا ڈھونگ رچاتی ہیں، اصل میں پر جیوی ہیں، جو انسانیت کے جوہر کو چوس رہی ہیں۔“

جب گونار نے اپنی بات جاری رکھی تو اس نے بلیک بیر ی اٹھا کر ہاتھوں میں تھام لیا، جیسے وہ آنے والے خطرے کا پیش خیمہ ہو۔ کمرے میں ایک بھیانک خاموشی چھا گئی، دونوں آدمیوں کی نظریں گونار کے ہاتھوں کی حرکت پر جمی تھیں۔ گونار نے بلیک بیر کو اپنی انگلیوں میں دبا کر پاش پاش کر دیا، ”تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے، اور دھوکہ دینے والوں کو ہمیشہ نتائج بھگتنا پڑتے ہیں،“ اس کے الفاظ ہوا میں چھنے والے تیر کی طرح معلق ہو گئے۔

دونوں آدمی لرزتے ہوئے گونار کی طرف دیکھنے لگے، ان کے ہونٹوں پر الفاظ نہیں نکل رہے تھے لیکن ان کے چہروں پر معافی کی بھیک تھی۔

ان کے ہاتھ کانپتے ہوئے کرسی کے بازوؤں پر جمے ہوئے تھے، اور ان کی آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑ رہی تھی۔

گونار نے اپنی گہری اور اٹل نظروں کے ساتھ کہا، ”اس سائے کی دنیا میں، مجھے گونار کہتے ہیں۔ ایک نام جو قدیم نورس کے شعلوں میں ڈھلا ہے، جو جنگ اور جنگجو کی اصل کو بیان کرتا ہے۔“

گونار کی آنکھوں میں نفرت اور شدت کی آگ بھڑک رہی تھی، جیسے وہ اپنے اندرون میں کسی وحشی درندے کو قابو میں رکھے ہوئے ہو۔

کمرے کی فضا پر گہری وحشت کا سایہ تھا، ہر چیز جیسے گونار کے غصے کی تپش سے پگھل رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اپنی کرسی سے آہستگی سے اٹھا، اس کی قامت دیواروں پر سائے کی طرح پھیل گئی، اور کمرے کا سکوت شدید تناؤ میں ڈھل گیا

۔ اس کے ہاتھ میں دو چمکتے ہوئے خنجر تھے، ان کی دھاریں روشنی کی ہلکی سی جھلک میں موت کی چمک دکھا رہی تھیں۔

گونار نے جیسے ہی قدم اٹھایا، زمین لرزنے لگی۔ وہ دانستہ اور وحشیانہ خاموشی سے ان آدمیوں کے قریب پہنچا جو اپنے خوف میں گھلے ہوئے کرسیوں سے چپکے ہوئے تھے۔

ان کے چہرے زردی مائل اور آنکھوں میں وحشت کی گہری چھاپ تھی۔ گونار نے اپنے خنجر کو ان کی گردنوں پر دبا دیا، دھات کی سردی ان کی جلد میں پیوست ہو گئی، جیسے موت خود ان کے سر پر منڈلا رہی ہو۔

۔ ”بھیڑوں سے بھری اس دنیا میں،“ گونار کی آواز سرد اور پتھرائی ہوئی تھی۔

- ”میں وہ بھیڑیا ہوں جسے سب جانتے ہیں، لیکن کوئی پکڑ نہیں سکتا۔“ اس کی آواز میں ایسی گونج تھی جیسے کسی گہری کھائی میں گونج رہی ہو، جس سے دونوں آدمیوں کے دلوں میں خوف کا پہاڑ پگھل رہا تھا۔
گونار کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک تھی، جیسے وہ ابھی کچھ انمول چھیننے کے درپے ہو۔

- ”میں عزت و وفاداری کا سوال نہیں کرتا،“ گونار کی آواز میں پتھرائی ہوئی سفاکی تھی،
- ”میں انہیں اپنے قدموں میں سرنگوں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ -

خنجر کی دھار ان کی گردن میں اور گہرائی تک چلی گئی، اور خوف سے ان کے جسم لرزنے لگے۔ گونار کے
چہرے پر ایک خونخوار مسکراہٹ پھیل گئی۔

- ”جو اسے دینے سے ہچکچاتے ہیں،“ اس نے انکشاف کیا، اس کی آواز میں موت کی دھمک تھی، ”وہ فقط وہ
مسمیٰ ہیں جو ذبح ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔“

کمرہ جیسے تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا، ہر شے جیسے گونار کے اندرون سے نکلنے والے عفریت کی گرفت میں
تھی۔ دونوں آدمیوں کی تقدیریں گونار کے ہاتھوں میں تھیں، اور وہ جانتے تھے کہ اب واپسی کا کوئی راستہ
نہیں تھا۔

گونار کی وحشی نگاہیں ان پر جمی تھیں، جیسے وہ ان کی آخری سانسوں کا انتظار کر رہا ہو۔

- ”تم نے ایکس کو کیا بتایا؟“ گونار کا سوال آگ کے شعلے کی مانند ان کے اعصاب پر چبھ گیا، اور اس کے ساتھ ہی وہ قہقہہ لگا، ایسا قہقہہ جو موت کے پیامبر کی مانند تھا۔

- ”تمہیں لگتا ہے میں اندھا ہوں؟“ اس کی آواز میں زہر بھرا ہوا تھا۔

- ”میں سب کچھ جانتا ہوں۔“ - اس کا جسم شدت کے ساتھ لرز رہا تھا، جیسے اس کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ اسے جلا رہی ہو۔

- ”تم نے میری دراز سے فائلیں چرانے کی ہمت کی،“ گونار نے خنجر کی دھار کو اور گہرائی تک دبایا، خون کی ایک ہلکی سی لکیر بننے لگی۔

- ”تم نے میری ساکھ کو برباد کرنے کا سوچا، لیکن تمہاری یہ چھوٹی سازشیں میرے قدموں کے نیچے روندی جائیں گی۔“

اس نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”تم سمجھتے ہو کہ میں مافیا کا کوئی معمولی فرد ہوں؟“ - اس کا قہقہہ کمرے میں گونجنے لگا، ”غلطی! مافیا میرے اشاروں پر ناپتا ہے، میں ان حقیر کھیلوں میں شامل نہیں ہوں جنہیں تم سمجھتے ہو۔“

گونار نے ایک زہریلی سرد مہری کے ساتھ دونوں خنجروں کو دائیں اور بائیں پھینکا، اور دونوں آدمیوں کو گردن سے جکڑ لیا۔

وہ دونوں ہلنے سے قاصر تھے، ان کی آنکھوں میں اب بس خوف اور بے بسی تھی۔ گونار کی سرد نگاہوں میں وحشت کا طوفان بھڑک رہا تھا۔

۔ ”تمہاری قسمت اب میرے ہاتھوں میں ہے، اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، میں کبھی معاف نہیں کرتا۔“

گونار نے بے رحمی سے اُن بے بس مردوں کو زمین پر گھیٹتے ہوئے اپنے غصے اور بے پناہ قوت کا نمونہ پیش کیا۔ اس کی ہر حرکت ایک منظم، طاقتور رقص کی مانند تھی، جو برتری اور حاکمیت کے دائرے میں سرایت کر چکا تھا۔

مرد بے بسی سے ہانپتے ہوئے، ایک ایک سانس کے ساتھ زندگی کی بھیک مانگتے رہے، لیکن گونار کے چہرے پر کوئی نرمی نہ تھی۔

اُس نے اپنی بے لگام گرفت مضبوط رکھی، مردوں کو پے در پے گھیٹتا ہوا ایک پوشیدہ مقام تک لے آیا۔ اُس نے ایک تیز حرکت سے خفیہ بٹن دبایا، اور ایک پراسرار فریزر سامنے آگیا۔

گونار نے اپنے قیدیوں کو منجمد کھائی میں ڈال دیا، جس سے کمرہ ایک منجمد کہانی کا منظر پیش کرنے لگا۔ ٹھنڈے دھوئیں نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور سرد ہوا ان قیدیوں کی بے نقاب جلد میں گھس گئی، جن کی ہڈیاں سردی کے زیر اثر چیخنے لگیں۔

ان کے ہاتھ سردی سے سرخ اور جمنے لگے، ان کے وجود پر گونار کا انتقام ایسے ثبت ہوا جیسے لوہے کی مہر ہو۔

گونار کی گرفت ایسی تھی جیسے کوئی آہنی شکنجہ ہو، ایک گرفت جو ان کی روحوں تک کو چیرنے لگی۔ اُس نے ایک سرد، کرخت لہجے میں کہا، ”تم لوگ میرے کتے تھے، میری پھینکی ہوئی ہڈیاں چباتے تھے، اور اب تم نے مجھ پر بھونکنے کی ہمت کی؟ تم ذہین جانور ہو، لیکن اب تم وحشی جانور بن گئے ہو۔ میرے پاس دو راستے ہیں۔ یا تو میں تمہیں قید کروں، یا تمہیں ختم کر دوں۔“

مرد بے بسی سے کراہتے رہے، ان کے ہاتھ برف کی سردی میں جمنے لگے۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد کپکپی دوڑنے لگی، لیکن گونار کے لیے اس منجمد فریزر میں ہاتھ رکھنا بھی بے معنی تھا۔ وہ ایک شاولن راہب کی طرح، سردی کے تمام اثرات سے بے نیاز، خاموشی سے کھڑا رہا، جیسے سویڈن کی برفانی سردی بھی اُس کے سامنے بے بس ہو۔

گونار نے دونوں مردوں کو رحم کی بھیک مانگتے دیکھا، ان کی آوازیں لرز رہی تھیں، ”سر، ہم آپ کے غلام ہیں، آپ کے کتے ہیں۔ ہماری زندگیاں بخش دیں، ہم اپنے باقی دن آپ کے قدموں تلے گزاریں گے۔ ہم سے غلطی ہوئی، ہمیں معاف کر دیں، سر!“

گونار کے ہونٹوں پر ایک فخریہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے انہیں منجمد آزمائش سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور ان کو اس قید سے آزاد کر دیا۔ جیسے کوئی فاتح اپنی رعایا کو معافی دیتا ہے۔

ان کے جمے ہوئے ہاتھ لرز رہے تھے جب وہ گرمی کی تلاش میں لرزتے ہوئے باہر نکلے۔ گونار نے انہیں واپس اپنی میز پر بلایا، اور جب وہ اس کی طرف بڑھے تو اس نے ایک گہری سوچ میں مبتلا ہو کر کہا، ”تم لوگوں کے دماغوں کو خفیہ قوتوں نے جکڑ لیا ہے۔ تم اصل میں ذہنی غلام ہو چکے ہو۔“ ایک لمحے کے لیے توقف کیا، پھر مسکراتے ہوئے سر ہلایا، جیسے ان کے مطیع ہونے کو تسلیم کر رہا ہو۔ ”تو تم نے خود کو میرا غلام تسلیم کر لیا ہے۔“

گونار نے ایک وسیع مسکراہٹ کے ساتھ کمرے میں تجسس پھیلا دیا،

۔ ”ایلیکس، میرے کزن، آٹھ سالہ بچہ کا وقت آ گیا ہے۔ تمہارے چھپن چھپائی کے کھیل کا اختتام ہو چکا ہے۔ اب میں تمہیں اپنے سامنے لے آؤں گا۔“

پھر، اُس نے مردوں کو اپنی نشستیں سنبھالنے کا اشارہ کیا۔ ان کے چہروں پر خوف کی پرچھائیں تھیں، لیکن گونار نے انہیں یقین دہانی کرائی، ”اب جب کہ تم نے اپنی وفاداری کا عہد کیا ہے، ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

لیکن جیسے ہی وہ بیٹھے، ایک نیاموڑ سامنے آیا۔ گونار نے ایک بٹن دبایا، اور زنجیروں نے تیزی سے ان کے ہاتھوں کو کرسی کے بازوؤں سے باندھ لیا۔ دونوں مرد چونک گئے، ان کی گھبراہٹ نے ان کے وجود کو لرزا دیا، اور لرزتی ہوئی آوازوں کے ساتھ، انہوں نے ہڑبڑا کر کہا، ”سر، آپ...“

گونار نے ان کی بے بسی اور پریشانی کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے، ایک بے حس خاموشی کے ساتھ کمرے کے کونے کی طرف قدم بڑھائے۔

اب کی بار اس کے ہاتھوں میں دو سرنجیں تھیں، جن کی تیز نوک روشنی میں چمک رہی تھی۔ دونوں آدمیوں کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں، جیسے موت ان کی طرف بڑھ رہی ہو۔ گونار نے ایک سرد بے پروائی کے ساتھ سرنجیں ان کے قریب لاکریک وقت انہیں انجیکشن لگا دیے۔

جو نہی مائع ان کی رگوں میں سرایت کرنے لگا، خوف نے ان کے ذہنوں پر اپنا شکنجہ کس لیا۔ انہیں محسوس ہوا جیسے موت کی ہولناک سرگوشیاں ان کے کانوں میں گونج رہی ہیں، لیکن گونار کی آواز ان کی وحشت کو کاٹی ہوئی آئی ”ڈرو مت، یہ زہر نہیں ہے۔ یہ چسپ تمہارے جسم میں ڈالے گئے ہیں۔ یہ چسپ الیکٹرانک آڈیو سسٹم سے جڑے ہیں، اور ہاں، ان کے ساتھ زہر کی مہلک خوراک بھی شامل ہے۔ اب میں تمہاری ہر بات سن سکتا ہوں۔ میری نظریں تم پر ہوں گیں اور تمہاری باتوں پر میرے کان۔ اگر تم نے مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کی تو تمہیں فوراً اس کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔“

گونار نے اپنے موبائل کا ڈسپلے سامنے رکھتے ہوئے ایک ایپ کا انکشاف کیا جو ان کی تقدیر کی مالک تھی۔ اس کی سرد آنکھیں اُن کی بے بسی میں اضافے کا سبب بن رہی تھیں۔ زنجیروں سے آزاد ہونے کے بعد، گونار نے انہیں حکم دیا ”اب جاؤ، اور میرے احکامات پر عمل کرو۔ اور یاد رکھنا، گسٹاو کو بھی ساتھ لاؤ۔“

دونوں آدمی رخصت ہونے ہی والے تھے کہ کیتھرین کمرے میں داخل ہوئی۔ خوف کے سائے اُن دونوں کے چہروں پر واضح تھے، اور انہوں نے ایک دوسرے کی جانب فکر مند نگاہوں سے دیکھا۔ گونار، تاہم، اپنی مخصوص، بے جان مسکراہٹ کے ساتھ، کیتھرین کے آنے پر کسی گہری سازش کے تحت خاموش رہا۔

کیتھرین نے پیار بھرے انداز میں گونار کا استقبال کیا، اُسے گلے لگایا، اور وہ دونوں آدمی یہ منظر گھبراہٹ سے دیکھتے رہے۔ کیتھرین کے نرم بوسے کے بعد، گونار نے انہیں اشارہ دیا کہ وہ رخصت ہوں، اور وہ فوراً وہاں سے چلے گئے۔

گونار کی قلعہ نما پناہ گاہ سے باہر نکلتے ہی ہوا میں ایک بھاری بوجھ چھا گیا۔ دونوں آدمیوں نے پریشانی اور بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک نے سناٹا توڑتے ہوئے دھیمی، لیکن پُر عزم آواز میں کہا، ”آج کیتھرین، اس کے شوہر اور ایکس کا آخری دن ہے۔“

دونوں پر حالات کی سنگینی طاری تھی، جیسے ہر لفظ کے ساتھ موت کے سائے گہرے ہو رہے ہوں۔ دوسرے آدمی نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے سوال کیا، ”کیا ہم اب محفوظ ہیں؟“۔

پہلے شخص نے اُس کی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے تلخ حقیقت کا ادراک کرایا، ”محفوظ؟ ہم کتنے محفوظ ہیں؟ ہماری زندگیاں اب بھی گوناوار کے ہاتھ میں ہیں؛ وہ ہمیں اب صرف اپنے مقصد کے لیے استعمال کرے گا۔“

دوسرے آدمی نے تھوڑا سا عزم دکھاتے ہوئے سر ہلایا اور کہا، ”ہم غلطی نہیں کریں گے۔ پہلے ہم ایکس کے لیے کام کرتے تھے، اور اب، ہم گوناوار کے لیے کام کریں گے۔“

اس کے کندھے پر تسلی بخش ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے اُسے ہمت دلانے کی کوشش کی۔ ”فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ایک مشترکہ مقصد کے ساتھ، دونوں آگے بڑھے، گوناوار کی نئی غلامی میں جکڑے ہوئے، یہ جانتے ہوئے کہ اس سفر پر ہر قدم پر خطرات اور غیر یقینی صورتحال ان کا سامنا کر رہے ہیں۔

...°...

سویڈن سے اُٹھنے والی خبر کی گونج جیسے پوری دنیا میں طوفان کی صورت پھیل گئی، اور اسلامی دنیا میں اس کی شدت خاص طور پر سوشل میڈیا اور ٹیلی ویژن چینلز کے ذریعے محسوس کی گئی۔

شہ سرخیوں نے ایک اذیت ناک کہانی کی خبر دی۔ ایک کرد شخص نے سٹاک ہوم میں قرآن کریم کو نذرِ آتش کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، جسے وہ آزادی اظہار کے نام پر انجام دینے کا ارادہ رکھتا تھا، اور یہ عمل عید کے روز سرعام انجام دیا جانا تھا۔

سویڈن کی حکومت کی جانب سے اس مکروہ عمل کی منظوری نے مسلم دنیا میں ایک شدید رد عمل کو جنم دیا، جس میں گہرے غم اور غصے کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

ایمان، جو عموماً مہم جو طبیعت کی مالک تھی، رمضان کے آخری دنوں میں اپنے آپ کو گھر کے ٹی وی لاؤنج میں ایک صوفے پر بے سکونی سے لیٹی ہوئی پاتی ہے۔

بزرگ سے ہونے والی گفتگو نے اسے کسی حد تک گھر کے اندر ہی رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ باہر کا موسم ایک خوشگوار تبدیلی کی نوید دے رہا تھا۔

بادل گرج رہے تھے، گویا بارش کا اعلان کرتے ہوئے۔ ایمان کی سوتیلی بہن بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی، شدید گرمی کے بعد بارش کی ٹھنڈک کا خوشی سے استقبال کرتے ہوئے۔

ایمان کی بہن، جو شاید خبر کی سنگینی سے بے خبر تھی، ایک عجیب سا سوال کرتے ہوئے بولی،۔ “کیا باہر بادل گرج رہے ہیں؟”۔

ایمان نے ٹیلی ویژن پر چلنے والی خبروں پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، خاص طور پر پاکستان سے آنے والی خبروں پر۔ اس وقت، اس کے ذہن میں مسلسل خبریں گردش کر رہی تھیں۔

ایک طرف بارش کا انتظار تھا، اور دوسری طرف ان خبروں کا بوجھ، جنہوں نے اس کے دل میں طوفان برپا کر دیا تھا۔

اس کے باوجود، اس کی سوتیلی بہن بار بار اپنے فضول سوال کو دہراتی رہی،

۔ ”کیا بادل واقعی گرج رہے ہیں؟“۔

ایمان کے چہرے پر جلن کی کیفیت چھا گئی تھی، اس احمقانہ سوال کو بار بار سن کر وہ حیران تھی کہ بادل کی گرج کو سننے کے باوجود وہ کیوں پوچھ رہی ہے؟ اپنے غصے کو چھپائے بغیر، ایمان نے طنزیہ لہجے میں کہا،

۔ ”یہ بادل نہیں گرج رہے، چڑیا کا پیٹ خراب ہے، اسی لیے یہ تباہی مچ رہی ہے۔“۔

اس نے اپنے جملے میں مزید طنز شامل کرتے ہوئے آنکھوں کو گھما کر، واضح طور پر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا۔

اس کی سوتیلی بہن، گویا بے فکر اور اس طنز سے بے خبر، مزید بولنے کی کوشش میں کہنے لگی،

۔ ”کسی نے تم سے پوچھا ہے؟“ ایمان نے ایک بار پھر طنزیہ انداز میں کمرے کو نظروں سے گھما کر دیکھا

اور پھر گویا دیواروں سے بات کرتے ہوئے بولی، ”اچھا تو تم دیواروں سے بات کر رہی ہو، کیوں کہ میرے

علاوہ یہاں اور کوئی نہیں ہے۔“۔

سوتیلی بہن کے مزید کچھ کہنے سے قبل، ایمان کے ایک سخت اشارے نے اسے خاموش کر دیا، جب ان کی نظریں ایک دم ٹی وی اسکرین پر جم گئیں۔ خبر کا انکشاف ہوا، ایک ایسا انکشاف جس نے ایمان کے دل کو چھلنی کر دیا

۔ ”سویڈن کی حکومت نے آزادی اظہار کے نام پر قرآن مجید کی بے حرمتی کی اجازت دے دی ہے۔ اس مذموم حرکت کا محرک ایک ایرانی نژاد کرد، سیلو ان میموکی، بتایا جاتا ہے، جس نے عید کے روز مسجد کے باہر اس شرمناک فعل کو انجام دینے کا منصوبہ بنایا ہے۔“

اینکری کی سرد، مگر سنگین آواز دوبارہ گونجی

۔ ”ہم اس افسوسناک خبر کو دہراتے ہیں کہ سویڈن کی حکومت نے ایک انتہائی متنازعہ اور چونکا دینے والے فیصلے میں قرآن مجید کی بے حرمتی کی اجازت دے دی ہے۔ یہ خبر عالمی مسلم امہ کے لیے شدید صدمے اور رنج کا باعث بنی ہے۔ ایک ایرانی نژاد کرد شخص کو آزادی اظہار کے پردے میں اس گستاخانہ اقدام کی اجازت دی گئی ہے، جو نہایت افسوسناک اور ناقابل برداشت ہے۔“

یہ سنتے ہی ایمان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ حتیٰ کہ خالدہ، جو کہیں غائب تھی، اس دلخراش نشریات کے ساتھ کمرے میں کھینچ آئی۔

ایمان نے اپنی نشست سے اچانک اٹھتے ہوئے غم اور بے اعتنائی کے عالم میں کہا، ”کوئی اتنا ظالمانہ فعل کیسے کر سکتا ہے؟ یہ سراسر غلط ہے، کسی بھی مذہب کی اس طرح بے حرمتی نہیں ہونی چاہیے۔“

خالدہ، جو خود غم و غصے سے بھری ہوئی تھی، بولی ”اللہ ان لوگوں کو نیست و نابود کرے! یہ دنیا میں تباہی کے سوا کسی چیز کے لائق نہیں!“۔

ایمان نے ایک لمحے کو خالدہ کی جانب نگاہ کی، شاید دل میں یہ سوچ ابھری کہ یہ پہلا موقع ہے جب دونوں کسی معاملے پر ہم رائے ہیں۔

چند ثانیے اس خیال کی گہرائی میں ڈوبی رہی، پھر دوبارہ نگاہیں ٹی وی اسکرین کی طرف مرکوز کرتے ہوئے دل میں خاموش خیالات کے طوفان کو محسوس کیا۔

، ”کوئی اتنا نیچے کیسے گر سکتا ہے کہ دوسروں کی مذہبی کتابوں کا احترام نہ کرے؟“

کمرے میں ایک گہری خاموشی چھا گئی، خبر کا غم اور صدمہ ہوا میں معلق رہا، اور ٹی وی لاؤنج میں بو جھل فضاء نے سب کچھ ڈھانپ لیا۔

...°...

کیمیکل فیکٹری کے اندرونی حصے میں، مشینیں اپنی بے ترتیب دھات کی سانسیں لیتے ہوئے جیسے ایک گہرے، مکینیکل راگ میں مگن تھیں۔

ان کے دھاتی بدن، سخت اور چمکدار ایل ای ڈی روشنیوں کے نیچے کسی بے جان جن کی طرح چمک رہے تھے، جبکہ فیکٹری کی چھت، تاریک اور وسیع، ان روشنیوں کو جیسے نگل رہی تھی۔

یہ پوری فضا میں ایک مکروہ تناؤ بکھرا ہوا تھا، جیسے کسی ان کہے راز کا منتظر ہو۔

گونار نے قدم بڑھائے تو اس کی ہر حرکت ایک جاذبِ نظر تھی۔ اس کی کرسپ سفید شرٹ، جو اس کے مضبوط جسم کے ساتھ چپٹی ہوئی تھی، اس کے کفِ عمدگی سے مڑے ہوئے تھے، بازو کی رگیں جو باہر جھلک رہی تھیں، ان کی نمائش کر رہی تھیں جیسے کسی مجسمے کی تراشی ہوئی قوت۔ اس کے اسٹیل گرے رنگ کی ڈریس پیٹ نے اس کی ٹانگوں کی تناسبی لکیروں کو نمایاں کیا، اور واسکٹ نے اس کی شخصیت میں نفاست کا اضافہ کیا تھا۔

گونار کے درمیانی لمبے، شاہ بلوچی رنگ کے بال، نرم لہروں میں ترتیب دیے ہوئے، اس کے چہرے پر ایک ناقابلِ فہم، پُر اسرار دلکشی پیدا کر رہے تھے۔

ہر قدم، اس کے چمکدار بلیک ٹرافٹ ڈریگن بوٹس کی گونج سے بھاری ہو رہا تھا، ایک لرزتی ہوئی آواز جو فیکٹری کی خالی گونج میں تحلیل ہوتی، جیسے اس کی موجودگی اپنی ہی موسیقی بکھیر رہی ہو۔

جیسے ہی اس نے شرٹ کے پہلے تین بٹن کھولے، اس کے ٹیڈ والے سینے کی جھلک نے ہوا میں کچھ اور بڑھا دیا، اس کے جسم پر بنی سیاہی نے اسرار اور پیچیدگی کا اشارہ دیا، اور سائے جو اس کے جسم کے گرد ناچ رہے تھے، جیسے ہر رنگے ہوئے نشان کی داستان سناتے تھے۔

دوسری جانب کیتھرین، جو ایک سیاہ فراق میں ملبوس تھی، جس پر متحرک پھولوں کا نفیس کام تھا، جیسے اس صنعتی ماحول میں اجنبی سی لگتی تھی۔ اس کے لمبے بال فضا میں لٹک رہے تھے، مشینری کے سخت، بے جان منظر نامے کے خلاف، نرم اور متضاد۔

اس کی آنکھوں میں تجسس کی ایک چمک تھی، جو فیکٹری کی بھاری، کمینیکل گونج کے درمیان گونار کی طرف متوجہ ہوئیں۔

- ”ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ کیتھرین نے آخر کار خاموشی کو توڑا، اس کی آواز میں ایک مبہم سا خوف چھپا تھا، جو فیکٹری کی دھیمی روشنیوں اور سرد ماحول میں مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

گونار نے اپنی آنکھوں میں دھواں دار سختی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے مسکرایا۔

- ”کیا تمہیں اندازہ نہیں؟“ اس کے لہجے میں ایک پُر اسرار سرگوشی چھپی تھی، جیسے وہ ایک ایسا راز جانتا ہو جس کا انکشاف ایک جان لیوا حادثہ ثابت ہو سکتا تھا۔

کیتھرین کی مسکراہٹ، جو ہمیشہ بے فکری اور خود اعتمادی کی عکاس ہوتی تھی، اس لمحے ہچکچا گئی۔ ”مجھے کیسے پتہ ہو گا؟“ اس کے لبوں پر ایک غیر یقینی مسکراہٹ تھی، جو خوف کے زیر اثر آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہی تھی۔

فیکٹری کی کھڑکیاں، جو بھاری گندگی اور کیمیکل کے باقیات سے بھری ہوئی تھیں، باہر کی دھندلی دنیا کی ایک مسخ شدہ جھلک فراہم کر رہی تھیں۔

فضا میں ایک عجیب سی بُورچی ہوئی تھی، جیسے فیکٹری کی ہر مشین کے ساتھ کوئی نامعلوم راز سانس لے رہا ہو۔

اوپر کی ایل ای ڈی لائٹس لمبے سائے ڈال رہی تھیں، مشینری کے پیچیدہ ڈھانچوں کے درمیان گونجتے ہوئے جیسے کوئی گہری کہانی سنانے کو تیار ہو۔

گونار نے اسے مشینوں کے بھول بھلیوں میں اور گہرائی میں لے جاتے ہوئے کہا،
- ”کیا تمہیں میرے کزن الیکس نے کچھ نہیں بتایا؟“ اس کے لہجے میں ایک طنزیہ سرگوشی تھی، جیسے ہر لفظ اپنے اندر ایک پُر اسرار چنگاری لیے ہوئے تھا۔

کیتھرین کا چہرہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے لبوں پر نیم جواب آتے آتے رک گیا، گویا اسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے، اور آنکھوں میں حیرت کی گہرائی اتنی گہری ہو گئی کہ اس نے بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔ گونار کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی، جیسے وہ کیتھرین کی سوچ کو پڑھ رہا ہو۔

۔ ”کیا ہوا کیتھرین؟“ گونار کی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے الفاظ ہلکی ہنسی میں تحلیل ہو گئے، لیکن اس کے لہجے میں طنز کی تیز دھار تھی۔

کیتھرین کی آنکھوں میں خوف اور تجسس کی ایک ملی جلی جھلک ابھری۔ اس کی زبان ہلکی سی کپکپائی اور وہ لرزتے ہوئے بولی، ”مجھے جانے دو، گونار، پلیز!“۔

گونار نے اپنی ہنسی کو فضا میں گونجنے دیا، اس کے بازو اس کے سینے پر عبور کیے گئے، جیسے اس کا یہ خوف اسے مزید تفریح فراہم کر رہا ہو۔ ”اوہ، کیتھرین!“ وہ گویا ہر لفظ کو چبا چبا کر بولا، ”تمہارے خوف کی ستم ظریفی میں لطف آیا مجھے۔“

کیتھرین نے ایک گھٹی ہوئی چیخ کے ساتھ پیچھے ہٹنے کی کوشش کی، لیکن گونار کی موجودگی نے فضا کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

کیتھرین کے قدموں کی بے ترتیب گونج فیکٹری کے وسیع، خاموش فرش پر گونج رہی تھی۔ مشینوں کے بھاری، مکینیکل سائے اور پیچیدہ پائپوں کے جال میں پھنسی، وہ دیوانہ وار بھاگ رہی تھی، اس کا سانس تیز اور ٹوٹا ہوا تھا، جیسے ہر سانس اس کے اندر کے خوف کو بے نقاب کر رہا ہو۔

فیکٹری کا صنعتی شور، جو کبھی اس کے ماحول پر حاوی تھا، اب جیسے خاموشی کا لباس اوڑھ چکا تھا۔ اب صرف اس کے قدموں کی گونج اور اس کے تیز ہوتی ہوئی دھڑکن کی دھمک باقی تھی۔

گونار، جو پُر اسرار سکون کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، اس کے چہرے پر ایک سفاک، سرد مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی، جیسے وہ کیتھرین کے ہر قدم، ہر ہچکچاہٹ کو ایک بچے کی طرح لطف اندوز ہو کر دیکھ رہا ہو۔

اس کے جوتے، جو فیکٹری کے فرش پر ہلکی سی آواز پیدا کرتے تھے، گونار کی ظاہری لا تعلقی کو اور بھی پُر اثر بنا رہے تھے۔

کیتھرین، پسینے میں بھیگی ہوئی، بے چینی سے ایک کھڑکی کی طرف دوڑی جس سے دھوپ کی مدھم کرنیں اندر آرہی تھیں۔

یہ روشنی، اس تاریک ماحول میں جیسے امید کی ایک آخری کرن تھی۔ لیکن جیسے ہی وہ اس کھڑکی کے قریب پہنچی، اس کی سانس رک گئی۔

اس کی راہ میں، روشنی کے عین سامنے، گونار کھڑا تھا۔ لمبا، دھمکی آمیز، اور اپنے ہی سائے میں لپٹا ہوا۔

گونار نے ایک لمحے کے لیے فضا میں کھڑے ہو کر اس منظر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پچھتاوے کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا، صرف ایک سرد اور بے رحم چمک تھی۔ اس نے دھیمی، لیکن گہری آواز میں کہا، ”کیا تمہیں ہماری پہلی ملاقات کی میری بات یاد ہے؟“

کیتھرین کی زبان جیسے اس کے منہ میں خشک ہو گئی ہو، وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن خوف نے اس کے الفاظ کو روک لیا تھا۔ گونار کے بوٹوں کی آواز اب خاموشی کو توڑتے ہوئے اس کے قریب آرہی تھی، اس کی ہر حرکت ایک سوچے سمجھے شکار کی مانند تھی، جیسے وہ پہلے سے جانتا ہو کہ کیتھرین کہاں جائے گی۔

گونار نے اپنے قدم روک لیے، اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ، اس نے اپنی آنکھیں کیتھرین کی طرف جما دیں۔

You think you know me? You’ve only seen the softer side, the one I “let you glimpse. But cross that line, and you’ll feel the weight of the man who shaped me. The quiet turns to a storm, and every soft touch becomes ironclad. You won’t even see it coming until it’s too late

تم سمجھتی ہو کہ تم مجھے جانتی ہو؟ تم نے صرف میرا نرم پہلو دیکھا ہے، وہ جو میں نے تمہیں۔ (دیکھنے دیا۔
لیکن اگر تم نے وہ حد پار کی، تو تم اس شخص کا بوجھ محسوس کرو گے جس نے مجھے تراشا ہے۔ خاموشی طوفان
میں بدل جائے گی، اور ہر نرم لمس فولادی ہو جائے گا۔ تمہیں احساس تک نہیں ہوگا، جب تک کہ بہت
دیر نہ ہو چکی ہوگی)۔

یہ الفاظ سرد اور برف کی طرح کٹے ہوئے تھے، جیسے وہ صرف ایک انتباہ نہیں بلکہ ایک موت کی گھنٹی ہو۔
کیتھرین کے چہرے پر دہشت چھا گئی، وہ پسینے میں بھیگی، اور لرزتے ہوئے کھڑی تھی۔ گونار کی آنکھوں
میں چمک مزید بڑھ گئی، اس کا چہرہ سفاک مسکراہٹ میں ڈوبا ہوا تھا۔

گونار نے اپنی آنکھیں تیز کرتے ہوئے، ایک سرد اور تلخ لہجے میں کہا

۔، “کھیل کا اصل مزہ تب آتا ہے، جب تمہارے مخالف کو یقین ہو جائے کہ وہ تمہیں دھوکہ دے رہے
ہیں، اور جب کھیل ختم ہو، تب انہیں احساس ہو کہ حقیقت میں تم نے ان کو دھوکہ دیا ہے۔”۔ اس کی
آواز میں ایک ایسا سکون تھا جو سردی اور بے رحمی کا آئینہ دار تھا۔

کیتھرین نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی، لیکن گونار کی موجودگی نے جیسے اس کی تمام امیدوں کو ختم کر دیا تھا۔
فیکٹری کی روشنی مدھم ہو رہی تھی، اور اندھیرا ان دونوں کے ارد گرد گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

فضا میں بے یقینی اور خوف کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا، اور کیتھرین کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ گونار کے سامنے وہ
کتنی بے بس تھی۔

گونار کی آواز، جواب ایک دھیمی، سرگوشی جیسی تھی، نے فضا میں سرایت کر لیا “کیتھرین، تم بھاگ نہیں سکتیں۔”

فیکٹری کا بڑا دروازہ دھیرے سے چرچراتا ہوا کھلا، جیسے کسی طویل قید کا بوجھ ہٹا ہو۔ سورج کی روشنی کے تیز شہتیر اندھیرے میں پھیلی فیکٹری کو روشن کرنے لگے، جس کی روشنی میں بکھری مشینری کے سائے طویل اور پراسرار نظر آئے۔

قدموں کی آہٹ مدھم گونج کے ساتھ فیکٹری کے فلور پر پھیلنے لگی، اور ہر قدم کے ساتھ ایک عجیب دباؤ بڑھتا گیا، جیسے ہوا میں موجود تناؤ ان قدموں کے ساتھ مل کر بڑھتا جا رہا ہو۔

دروازے سے داخل ہونے والا شخص جیسے نفاست کا مجسمہ تھا۔ چاکلیٹ براؤن رنگ کا خاصا مہنگا سوٹ اس کے جسم پر یوں چسپاں تھا جیسے ہر دھاگان نفاست اور ذائقے سے بنا ہو۔

سیاہ شرٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے، اور اس کے کوٹ کے کندھے اس کی بلند قامتی کو اور زیادہ نمایاں کر رہے تھے۔ وہ شخص جس کا سنہری بال ہوا کے ہلکے جھونکوں کے ساتھ لہرا رہا تھا، اپنی ہر حرکت میں اعتماد اور دھمکی کا احساس پیدا کر رہا تھا۔

اس کی سبز آنکھوں میں ایک پراسرار جھلک تھی، جیسے ہر کسی کی گہری نظر کے پیچھے اس کی اپنی ہی کوئی پوشیدہ کہانی ہو۔

اس کے پیچھے گسٹا اور وہ دونوں آدمی تھے جن سے گونار نے پہلے ملاقات کی تھی، اور ان کے قدموں میں عجیب سی عجلت تھی۔

گسٹا کی آنکھیں حیرانی اور تجسس سے بھرپور تھیں، لیکن اس کے اندر بے چینی صاف نظر آتی تھی۔ ہر قدم کے ساتھ فیکٹری کا ماحول گہرا ہوتا جا رہا تھا، جیسے کوئی ناپسندیدہ راز آہستہ آہستہ بے نقاب ہونے کے قریب ہو۔

کیتھرین، جو اس تمام صورتحال کی مرکز تھی، ایک کرسی سے باندھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا، مگر ساتھ ہی کسی نادیدہ التجا کا عکس بھی۔

اس کی سانسیں بھاری ہو رہی تھیں، جیسے کسی اندیکھی مصیبت کا سامنا کرنے والی ہو۔ جیسے ہی گسٹا نے اس کی جانب قدم بڑھایا، اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا، ”کیتھرین!“ لیکن یہ الفاظ کسی دھات کے بجنے والی آواز کے ساتھ ہی فضا میں معلق ہو گئے۔

اچانک، قدموں کی آہٹ مزید تیز ہو گئی اور روشنی کا ایک اور شہتیر چھت سے گرنے لگا۔

دونوں افراد، جو گسٹا کے ہمراہ آئے تھے، نظروں کا تبادلہ کرتے ہوئے دھیرے سے پسپائی اختیار کر گئے، جیسے کوئی بڑا کھیل ہونے والا ہو اور وہ اس کا حصہ نہ بن سکیں۔

بڑا دھاتی دروازہ بھاری آواز کے ساتھ بند ہو چکا تھا۔ وہ باہر نکل چکے تھے، اور اندر خاموشی چھا گئی۔ ایکس نے ایک لمحے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا، لیکن سامنے آتے منظر نے اس کے جسم کی ساری رگیں تن کر دیں۔ اس کے اعصاب تناؤ میں ڈوب چکے تھے، جیسے کوئی بڑا خطرہ قریب ہو۔

دفعۃً گونار، جو اب تک اندھیرے میں گم تھا، خاموشی سے سامنے آیا۔ اس کے چہرے پر ایک چمکدار مسکراہٹ تھی، بازو اپنے سینے پر باندھے ہوئے، اور آنکھوں میں وہ ہی شریر جھلک جو ہمیشہ اس کے ارادوں کو دھندلانے کا سبب بنتی تھی۔

جیسے ہی ایکس کی نظریں گونار سے ملیں، اس نے اپنی آواز میں تلخی بھری، ”تو یہ تم تھے؟ تم ماسٹر مائنڈ ہو؟“

گونار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی، اور اس کے لہجے میں سردی اتر آئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہا، پھر دھیرے سے، جیسے ہر لفظ زہر سے بھرا ہو، انگریزی میں بولا

“You dared to play your cards of manipulation, but what slipped your

mind is that I am the maestro of deceit and cunning”

۔ (تم نے اپنی چال بازیوں کے پتے کھیلنے کی جسارت کی، لیکن جو بات تمہارے ذہن سے اوجھل رہی، وہ یہ ہے کہ میں فریب اور مکر کا استاد ہوں)۔

یہ الفاظ فضا میں پھیل گئے، ہر ایک میں وہ طاقت اور سردی تھی جو گونار کے اندرونی جبر کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شریر روشنی مزید گہری ہو گئی، اور جیسے ہی اس نے الیکس پر نظریں جمائیں، ہر چیز جیسے معلق ہو گئی۔

الیکس اکیلے تو نہ تھا اس کے گارڈز اس کے ہمراہ تھے جو ہر حرکت پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس ماحول میں، گستاو کی آواز بے بسی اور عاجزی میں ڈوبی ہوئی ابھری، ”خدارا، کیتھرین کو آزاد کر دو۔“

لیکن گونار، جیسے اس کے الفاظ فضا میں بکھر کر گم ہو گئے ہوں، ایک پل بھی التفات نہ کیا۔ اس کی سرد آنکھیں اب الیکس کی طرف مرکوز ہو چکی تھیں، اور جیسے ہی دونوں کی نظریں ملی، گونار کی نگاہوں میں ایک شریر چمک تیز ہو گئی۔

۔ ”تو آخر کاریہ لمحہ آ ہی گیا،“

گونار نے اپنی مخصوص بے نیازی سے سرگوشی کی، اس کی زبان پر ایک سفاکی کی لہر چل رہی تھی۔ ”یہ کھیل جو برسوں سے چل رہا تھا، اب بے معنی سا لگنے لگا ہے۔ پیارے کزن الیکس، آج اس کو ختم کرتے ہیں، ہمیشہ کے لیے۔“ گونار کے لبوں پر ایک دل دہلا دینے والی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

الیکس کے چہرے پر غصے کی لالی چھا گئی، اس کی آواز میں انتقام کی آگ تھی، ”تم نے میرے خاندان کا خون بہایا اور ہمارا کاروبار چھینا۔ آج، میں تمہیں مار کر ان سب کا بدلہ لوں گا۔“

گونار کا چہرہ لمحے بھر کے لیے سنجیدہ ہو گیا۔ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں وہ سرد روشنی ابھری جس نے سامنے والے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

اس کی آواز میں اب دھمکی کی گھن گرج تھی، ”آج میں تمہارے سامنے ہوں، الیکس، جیتنا ہے تو مرد بن کر سامنے آؤ۔ چھپ چھپ کر وار کرنے سے تمہاری بزدلی ثابت ہو گی۔ پیٹھ پیچھے وار کرنے کا وقت گزر چکا، آج آمنے سامنے مقابلہ ہو گا۔“

گونار نے اپنے بازوؤں کو ایک لمحے کے لیے کھولا، جیسے کسی بادشاہ نے اپنے حریف کو لکارا ہو۔ ”آؤ، مار دو مجھے، اپنا کاروبار واپس لے لو، اور اپنے خاندان کا انتقام پورا کر لو۔“

فضا میں تناؤ گھل گیا۔ ہر سانس وزنی ہو چکی تھی، جیسے ہوا بھی ان کے درمیان ہونے والے تصادم کی پیش گوئی کر رہی ہو۔ گونار کے چہرے پر وہ ہی پر اسرار مسکراہٹ لوٹ آئی، اور اس نے اپنی انگلی ہوا میں اٹھائی، اشارہ کرتے ہوئے الیکس کی طرف، ”تم نے میرے خلاف سازشیں کیں، مجھے مارنے کی کوشش کی، لیکن میں تمہاری حرکتوں پر نظر رکھے بیٹھا تھا۔ آج تمہارے اور میرے درمیان آخری فیصلہ ہو گا۔ کھیل ختم۔“

یہ کہتے ہی گونار نے ایک ریموٹ کا بٹن دبایا۔ فیکٹری کے اندر، مشینوں کے درمیان، ایک لمبی سیڑھی کی آواز گونجی، جیسے زمین نے خود کو ان کے لیے کھولا ہو۔

کیتھرین کی ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی جب رسیاں جو اسے جکڑے ہوئے تھیں، ڈھیلی ہو گئیں اور وہ اپنے شوہر کی طرف بھاگنے لگی۔

گسٹاؤ نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا، اس کی پیشانی پر ایک بوسہ دیتے ہوئے تسلی دی۔ کیتھرین کے آنسو بہہ کر اس کے چہرے پر موتیوں کی مانند چمک رہے تھے، مگر ان کی بے بسی ہر قطرے میں عیاں تھی۔

جس جگہ کیتھرین تھی عین اسی جگہ

اچانک، زمین میں ہلکی سی تبدیلی آئی، اور ان کے نیچے سے ایک سنگرن سلفیورک ایسڈ کی جھیل نمودار ہوئی، جو خاموشی سے اوپر کی طرف اچھل رہی تھی۔

وہ پلیٹ فارم، جس پر گونار اور دوسرے کھڑے تھے، ساکت رہا۔

گونار کی آواز دھیرے دھیرے فضا میں گونجی، ”اب، میں تمہارے ساتھ ایک نیا کھیل شروع کروں گا۔ موت کا کھیل۔“

پھر گونار نے اپنی سرد آنکھوں سے الیکس کو دیکھا اور ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ، مدھم لہجے میں بولا، ”آمنے سامنے، مردوں کی طرح۔“

الیکس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے خوف کی جھلک نمودار ہوئی، اور اس کی نظریں اس سیڑھی پر جم گئیں جو چھت سے معلق شیشے کے زینوں تک جا رہی تھی

وہ پینل اوپر کی سمت کا واحد راستہ تھے، جو نیچے کی طرف پھیلتی ہوئی، سنکرتی ہوئی سلفیورک ایسڈ کی جھیل کے اوپر غیر یقینی بنیادوں پر معلق تھے۔

یہ سیڑھیاں، گویا موت کے منہ میں جانے والے راستے، تیزاب کے بحرِ خونی کے اوپر بے حس و حرکت کھڑی تھیں، اور ہر قدم ایک ممکنہ تباہی کی طرف لے جاسکتا تھا۔

کیتھرین اور گسٹاؤ نے ساکت، لرزتے ہوئے، اپنے سامنے نظر دوڑائی، جہاں موت کا سرکش منظر ان کی نگاہوں کے سامنے رقص کر رہا تھا۔

گونار کی نظریں جمی ہوئی تھیں، مکمل سکوت کے ساتھ، اس کی آواز میں بلا کی سرد مہری تھی جب اس نے اعلان کیا، ”ہمیں اس زینے کو عبور کرنا ہو گا اور اوپر کانچ کے پل کو پار کرنا ہو گا۔ بعض حصے مضبوط ہیں، جو تمہارا بوجھ سہار لیں گے، لیکن بعض پل صراط کی مانند نازک ہیں۔ اگر تم نے غلط قدم اٹھایا، تو نیچے سلفیورک ایسڈ کی گہرائی میں غرق ہو جاؤ گے۔ اور میں... میں تمہارے ساتھ اس کھیل میں شامل ہوں۔“

وہ موت کے کھیل کا شہنشاہ تھا، زندگی کی بازی کا ماہر—جہاں دوسروں کی قسمت کا فیصلہ اس کی انگلیوں کی حرکت میں ہوتا تھا۔

فضا میں کھنچاؤ پھیل گیا، جیسے ہوا بھی ان دونوں کے درمیان ہونے والے مقابلے کی گواہ ہو۔ گونار نے اپنے بے باک انداز میں بات جاری رکھی، ”میں بھی اس کھیل میں شامل ہوں، اور شیشے کے نازک اور مضبوط حصوں میں فرق سے ناواقف ہوں۔ کوئی چالاکی نہیں، کوئی جال نہیں۔ اگر میں گرتا ہوں، تو میری شکست قبول ہوگی۔“

الیکس نے گونار کی بات غور سے سنی، اس کی نگاہیں بدستور گونار کی نظروں سے بندھی رہیں، اور یہ خاموش تصادم ان دونوں کے درمیان جھڑپ کا آغاز تھا۔

گونار نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا، پھر ایک چھپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

۔ ”اگر شیشہ ٹوٹ گیا اور میں نیچے گر گیا، تو میرا کاروبار تمہارا ہو جائے گا۔ لیکن اگر تم گر گئے، تو تمہاری تمام دولت و حیثیت میری ہو جائے گی۔“ یہ کہتے ہی، اس کی انگلیاں فضاء میں تیرتی ہوئی اوپر کی سمت اشارہ کر گئیں، جیسے وہ قسمت کو لٹکار رہا ہو۔

۔ ”دستاویزات اوپر موجود ہیں۔ تمہارے دستخط شدہ کاغذات ان میں شامل ہیں۔ اگر میں ہار گیا، تو وہ تمہارے نام پر جائیں گے، اور اگر تم گرے، تو تمہاری تمام جائیداد اور کاروبار میرا ہو گا۔“

الیکس کی آنکھوں میں شک کی چمک نمایاں ہوئی، اور وہ جلدی سے احتجاج کرتے ہوئے بولا، ”میں نے کسی دستاویز پر دستخط نہیں کیے!“

گونار نے نرمی سے کندھے جھٹکتے ہوئے جواب دیا، ”کیا تم نے واقعی نہیں کیے؟۔“

ایلیکس کی آنکھوں میں غصے کی لالی دوڑ گئی، اور اس نے گونار کو سخت لہجے میں کہا، ”تم نے مجھے دھوکہ دیا ہے!“

گونار کی مسکراہٹ خوفناک اور سفاک تھی، اس کے لبوں سے ایک سرد آواز نکلی، ”دھوکہ؟ میں نے کچھ بھی نہیں کیا، جو کچھ ہوا ہے، وہ تمہاری اپنی بے احتیاطی کا نتیجہ ہے۔“

گونار مدھم قدموں کے ساتھ ایلیکس کے قریب پہنچا، اس کے چہرے پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھری ہوئی تھی، جس میں درندگی اور ٹھٹھا پوشیدہ تھا۔ ایلیکس نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی، مگر وہ اندھیری گہرائیوں کو سمجھ نہ سکا۔

یکدم، گونار نے اپنی موجودگی کو مزید بوجھل بنادیا، قریب ہو کر جیسے ایلیکس کی روح تک رسائی حاصل کر لی۔

ایلیکس کے دل میں ایک سرد اور وزنی احساس ابھرا اور اُس نے بے اختیار اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ گونار کے ہونٹوں پر ایک شریر، بد معاشی بھری جنبش آئی، اور وہ اپنے لبوں کو آہستگی سے ایلیکس کے کان کے قریب لے گیا۔

گونار نے انتہائی سرد اور بے رحم انداز میں سرگوشی کی، ”تو کیا تم تیار ہو؟ موت کا کھیل شروع کرتے ہیں۔“

گونار نے ایک بے نیازی کے ساتھ قدم پیچھے ہٹایا، جبکہ الیکس نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”تم نے ایک عمدہ جال بچھایا ہے، لیکن میں اتنا نادان نہیں ہوں کہ ایسی چال میں پھنس جاؤں۔“

الیکس کی مسکراہٹ میں اعتماد کی جھلک تھی، اور گونار کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے تشویش کی لہر ابھری، مگر الیکس کی ہنسی نے اس کیفیت کو ختم کر دیا۔

یکدم الیکس کی چٹکی کی گونج، فیکٹری کی دھندلی فضا میں لرزتی ہوئی پھیل گئی۔

جیسے ہی حکم کا لہجہ گونار کے حواس تک پہنچا، اچانک سے تمام محافظ گونار کی جانب لپکے۔

گونار ایک لمحے کے لیے ہکا بکا، اپنے قدموں میں لڑکھڑا گیا۔ وہ جو اپنے آپ کو ہر موڑ کا فاتح سمجھتا تھا، آج تنہا تھا، بد نصیبی کی ایک دھند میں لپٹا ہوا، مگر اس کے چہرے کی پریشانی میں کچھ ایسا تھا جو کیتھرین کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

کیتھرین نے زیر لب سرگوشی کی، ”گونار، یہ سب کیوں برداشت کر رہا ہے؟“

اس کے دماغ میں خوف و تشویش کی لہر دوڑ گئی، مگر وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ گونار کی جانب سے ایک مبہم آواز ابھری، ”تم دھوکے باز ہو، الیکس!“

مگر اس کے الفاظ میں اب وہ کڑک باقی نہ تھی جو کبھی اس کا خاصہ تھی۔ ایکس نے ایک زہر آلود قہقہہ لگایا، جس کی گونج نے فیکٹری کی تاریکی کو اور گہرا کر دیا، ”محبت اور جنگ میں سب جانتے ہیں۔ پیارے کزن“۔

محافظوں کے قدموں کی بو جھل بازگشت فیکٹری کے دھندلے ماحول میں پھیلتی چلی گئی۔

ایک عجیب تناؤ ہر طرف محیط تھا، جیسے ہوانے بھی خوف کا لبادہ اوڑھ لیا ہو۔

گونار کے حواس اب اس کی بقا کی جنگ میں جُت گئے تھے، مگر اس کی ہر حرکت میں تھکن کا بوجھ تھا۔

محافظوں نے اس پر یلغار کی، ہر ضرب گویا اس کی مضبوطی کو پیوند خاک کرنے کے لیے تھی۔ وہ اپنے دفاع میں کہیں چپکنے والے سائے کی طرح جھپٹتا، کبھی آگے، کبھی پیچھے، مگر یہ لڑائی اس کے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی تھی۔

گونار کے چہرے پر لہو کے سرخ دھارے ٹپک رہے تھے، اس کے ہونٹوں پر زخموں کی لکیریں، سوجی ہوئی آنکھیں اور چہرے پر وحشیانہ ضربوں کے نشانات واضح ہو چکے تھے۔

اس کا لباس، جو کبھی بے داغ تھا، اب گرد و غبار اور خون سے لت پت تھا۔ مگر، سب کے باوجود، اس کے ہونٹوں پر ایک مضحکہ خیز مسکراہٹ برقرار رہی، جیسے وہ ان جسمانی اذیتوں کو تسلیم کرنے سے انکاری ہو۔

کیتھرین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، گسٹاو بھی حیرت زدہ تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے تماشا دیکھ رہے تھے، یہ سوچتے ہوئے کہ گونار کی یہ غیر متوقع کمزوری کس راز کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

پندرہ محافظ، الیکس کے حکم کے تحت، ایک نپاتلا حملہ کر رہے تھے، جیسے وہ خود کوئی مکافات عمل کے نمائندے ہوں۔

جب حملے کا زور تھا، تو فیکٹری کی فضا میں ایک خوفناک خاموشی چھا گئی۔

اچانک، الیکس کی تالیاں فیکٹری میں گونج اٹھیں، اور اس کے قدم گونار کی طرف بڑھنے لگے۔ الیکس کے چہرے پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ تھی، جبکہ گونار کی آنکھوں میں بے یقینی کا ایک سایہ رقص کر رہا تھا۔

۔ ”میں نے سوچا تھا کہ مجھے تمہیں گرانے میں بہت محنت کرنی پڑے گی۔“

الیکس نے طنزیہ انداز میں کہا، ”مگر تم اتنی آسانی سے گر گئے۔“

الیکس کی آنکھوں میں ایک شعلہ بھڑکا، جیسے کسی بھیانک یاد نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ دیا ہو۔ ”تمہیں یاد ہے؟“

الیکس نے اپنی آواز میں سرد مہری بھر کر کہا، ”میرے باپ نے تمہاری بہن کو زندہ جلا دیا تھا۔ وہ بھی اسی طرح بے بس پڑی تھی، جیسے آج تم ہو۔“

گونار کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے ایک شدید تکلیف کی چمک آئی، جیسے اس کا پورا وجود اس یاد سے جل اٹھا ہو۔ اس کے زخمی چہرے پر اب پریشانی اور بے بسی کے ساتھ ساتھ ایک اندرونی طوفان کا عکس بھی تھا۔

یہ فیکٹری، جہاں آج جسمانی تصادم کا میدان سجا تھا، گونار کے چھپے ماضی کی نقاب کشائی کا اسٹیج بن چکی تھی۔

...°...

گونار کا چہرہ ایک گھمبیر سنجیدگی سے بھرا ہوا تھا، جیسے اندرونی طوفان ایک پرسکون سمندر کی مانند تھم گیا ہو، لیکن اس کے اندر ایک گہری آگ سلگ رہی تھی۔

اس نے الیکس پر ایک سرد نگاہ ڈالی، جیسے کہ جان بوجھ کر اپنی کمزوری ظاہر کرنا اس کے اگلے وار کا حصہ ہو۔ وہ بمشکل ہاتھوں کے سہارے اٹھنے لگا، مگر ابھی اس کی کمر سیدھی بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک محافظ نے بے دردی سے اس کی پیٹھ پر اپنا بوٹ مارا، اور گونار دھول میں دوبارہ گر پڑا۔ زمین پر گرنے کی تیز آواز فیکٹری کی سرد فضا میں گھل گئی، اور گونار کی سانسوں کی گہری دھڑکن کے ساتھ خون کی بوندیں اس کے ناک سے بہہ کر زمین پر ٹپکنے لگیں۔

کیتھرین نے بے بسی اور دہشت میں لپٹے ہوئے، تیزی سے کہا، ”تم یہ کیا کہہ رہے ہو، الیکس؟ تم نے تو دعویٰ کیا تھا کہ گونار نے تمہارے والدین کا قتل کیا تھا۔ تم نے ہمیں دھوکہ دیا!“۔

اس کے الفاظ الیکس کے کردار کے گرد لپٹی دھند کو چیرتے ہوئے فضا میں گونج گئے، اور ان کے پیچھے ایک سوالیہ خاموشی چھوڑ گئے۔

گسٹاو، اس اچانک انکشاف پر لرزتے ہوئے، بے یقینی کی حالت میں پیچھے ہٹ گیا، اس کا چہرہ خوف اور حیرانی سے زرد ہو چکا تھا۔

۔ ”تمہارا خاندان دراصل گونار کے خاندان کا قاتل ہے، اور تم نے ہمیں فریب میں مبتلا رکھا، یہ دعویٰ کر کے کہ گویا گونار ہی تمہارے خاندان کا قاتل تھا۔“۔

الیکس نے جواب دینے کے بجائے اپنے گارڈز کو حکم دیا، ”ان دونوں کو باندھ دو۔ گونار کو ختم کر کے ان سے نمٹوں گا۔“۔

کیتھرین اور گسٹاو، جو قریب کھڑے تھے، موت کے سایے میں اپنے انجام کا سامنا کر رہے تھے۔ گسٹاو نے ایک آخری کوشش کے طور پر، بے خوفی کے ساتھ گارڈز کا مقابلہ کرنے کے لیے قدم بڑھایا، لیکن ایک محافظ نے بے رحمی سے بندوق کا پچھلا حصہ اس کے سر کے پچھلے حصے پر مارا، جس سے وہ فوراً زمین پر گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

کیتھرین کے دل کو چیر دینے والے رونے کی آواز نے فیکٹری کی خاموشی کو ہلا کر رکھ دیا۔ ”گسٹاوا!“
کیتھرین نے آہیں بھرتے ہوئے پکارا۔

اس کا دل جیسے اس کے سینے میں بھاری پتھر بن گیا ہو، اور آنکھوں میں بے بسی کے آنسو چمکنے لگے۔
گارڈز نے کیتھرین کو بے دردی سے دبوچ لیا، اور وہ ان کے درمیان لٹکتی ہوئی، ایک بیکار جدوجہد کرتی
رہی۔

اس کی بے بس کوششیں، ہوا میں جھولتے ہوئے انگور کے گچھے کی مانند، ایک مضحکہ خیز منظر پیش کر رہی
تھیں، جس میں اس کی ہر جنبش مزید لاچارگی میں بدلتی جا رہی تھی۔

اس کے آزاد ہونے کی بے کار کوششیں ایک بے دلی کی تصویر پیش کر رہی تھیں، جب کہ الیکس اپنے
شیطانی فتح پر مسکراتا رہا۔

الیکس نے کہا، ”یہ میرے کسی کام کے نہیں رہے۔ جیسے کسی گائے سے دودھ نکلنا بند ہو جائے، تو اسے ذبح
کر دیا جاتا ہے۔ ان کا انجام بھی یہ ہی ہو گا۔“

گارڈز، کیتھرین کی مزاحمت کو نظر انداز کرتے ہوئے، اسے لے کر آگے بڑھ گئے، اور وہ ان کے ہاتھوں
میں ایک کٹھ پتلی سی بن چکی تھی، جس کی ہر جنبش بے سود تھی۔ الیکس نے سکون سے اپنا کوٹ درست
کیا، جیسے کہ وہ اپنی فتح کی یادگار کو ترتیب دے رہا ہو، اور فیکٹری کے سرد، بے جان ماحول میں کھڑا ہو گیا۔

اس کی نظروں میں ایک سفاکی تھی، اور ایک ایسی سنگدلی جو ہر لمحے بڑھتی جا رہی تھی۔

گونار، جو زخمی اور نڈھال تھا، زمین پر پڑا ہوا اپنے حریف کو گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر درد اور ذلت کے نشان واضح تھے، لیکن اس کی آنکھوں میں ایک پراسرار چمک ابھری۔

گونار نے سختی سے کہا، ”تم اپنے باپ کی طرح ہو، جیسے کہ میں نے ہمیشہ سوچا تھا۔“

الیکس نے اس کی طرف ایک ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ پھینکی، لیکن گونار کا چہرہ مسلسل شدت میں ڈوبا رہا، جیسے کہ اس کے اندر کوئی طاقتور جذبہ دھیرے دھیرے ابھر رہا ہو۔

اس کا جبر اکس گیا، اور اس کی رگیں زور سے دھڑکنے لگیں، جیسے کہ وہ ایک شدید اندرونی طوفان سے گزر رہا ہو۔

گونار کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں ایک بار پھر سے بھڑک اٹھیں، جیسے اُس کے اندر کا طوفان قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہو۔

اس کا جبر اغصے سے بھینچ گیا، بالکل جیسے کوئی زخمی شیر اپنے شکاری کی جانب لپکنے کو تیار ہوتا ہے۔ ہر سانس میں شدت، ہر حرکت میں غصے کی ایسی طاقت تھی کہ زمین بھی جیسے لرزنے لگی ہو۔ اس کا پورا وجود اس لمحے میں ایک تباہ کن قوت کا مظہر تھا، جس سے بچنا ممکن نہ تھا۔

گونار نے زمین پر ایسی زوردار ٹھوکر ماری کہ گرد و غبار کے بادل اس کے قدموں سے اُٹھتے ہوئے فضا میں بکھر گئے۔

یہ لمحہ گہرے سچ کو آشکار کر گیا: کوئی بھی روح فطر تابد کردار نہیں ہوتی، بلکہ حالات انسان کو مجرم بنا دیتے ہیں۔ گونار جیسے علامتی راکھ سے اُٹھا ہو، اُس کی طاقت کا اظہار ہر قدم سے عیاں ہو رہا تھا۔

اس نے ایک بلند آواز میں چلا تے ہوئے کہا،

“

۔“ ایکس، میں تو بس یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہیں حقیقت کا پتہ بھی ہے یا نہیں۔ پر تم بھی اپنے باپ کی طرح نکلے۔ کیا تمہیں لگا کہ میں نے یہ مار اس لیے کھائی کہ میں کمزور ہوں؟ تم سب نے مل کر وار کیے، اور میں سہتا رہا، لیکن ایک بات یاد رکھو، میرے جسم سے خون کا ایک قطرہ بھی میری مرضی کے بغیر نہیں بہتا۔ یہ جو تمہیں لگا کہ میں مار کھا رہا ہوں، وہ تمہاری بھول تھی۔ یہ سارا تماشا، یہ ساری مار پیٹ، صرف اس لیے تھی کہ میں تمہارے ارادے جان سکوں۔ حقیقت میں، میں نے ہر زخم اپنی مرضی سے لیا ہے، تمہاری نہیں۔”

ایکس کی آنکھوں میں ہچکچاہٹ اور خوف کے آثار ظاہر ہو چکے تھے، جیسے وہ اس سچائی کے وزن تلے دب رہا ہو۔ ماحول میں تناؤ تھا، ہر جانب خاموشی تھی، جیسے سب کچھ اس لمحے کے فیصلے کا منتظر ہو۔

اچانک ایک گارڈ، دشمنی کے ارادے سے، گونار کی طرف لپکا۔ اس کے ارادے میں بلا کی تیزی تھی، لیکن گونار نے اُسے ایسے دیکھا جیسے وہ ابھی اُس کا وار روکنے والا ہو۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ایک لمحے میں، گونار نے اپنی ٹانگ بلند کی اور ایک شاندار کک سے گارڈ کو زمین پر پٹخ دیا۔

کک اتنی درستگی سے لگی کہ گارڈ کی پسلیوں کے ٹوٹنے کی خوفناک آواز پورے ہال میں گونج اٹھی۔ اس لمحے میں، گونار نے اپنی طاقت کا بھرپور اظہار کیا، جیسے وہ برسوں کا دبایا ہوا غصہ نکال رہا ہو۔

گونار کا غصہ محض جسمانی طاقت نہیں تھا، بلکہ وہ اپنے اندر کی ایک ایسی قوت کو آزاد کر رہا تھا جو نا انصافیوں کا بدلہ لینے آئی تھی۔ وہ ایک کے بعد ایک گارڈ کو نیچے پٹختا، جیسے ہر حملہ اُس کے حال کے گناہوں اور ماضی کی نا انصافیوں کا حساب تھا۔

ستونوں کے ساتھ بندھے کیتھرین اور گسٹاو بے ہوش تھے، لیکن اُن کی بے حس وجود گونار کی اس بے قابو طاقت کے گواہ بنے ہوئے تھے۔

گونار ایک لمحے کے لیے رکا اور اُس کی نظریں پوری فیکٹری کے ماحول کو اپنے قبضے میں لے چکی تھیں۔ ”تم سب نے میری زندگی کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا، مگر تم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس سازش کا پتہ لگا لوں گا۔“ اُس کی آواز میں ایسی غضبناک شدت تھی کہ محافظوں کے قدم رُک گئے، جیسے وہ آنے والے حملے سے ڈر گئے ہوں۔

محافظوں نے گونار کو گھیرنا شروع کیا، لیکن اُس کی نظریں استرا کی طرح تیز تھیں، ہر حرکت کو نوٹ کر رہی تھیں۔

اُس نے ایک ہموار حرکت میں اپنی واسکٹ اُتار دی، جس سے اُس کا طاقتور جسم ظاہر ہو گیا۔ جیسے اُس کے وجود میں ایک بے پناہ قوت چھپی ہوئی ہو جو کسی لمحے پھٹنے والی ہو۔

ایک گارڈ، خنجر لیے خطرناک انداز میں آگے بڑھا، لیکن گونار نے شاو لن راہب کی طرح مہارت سے اپنی واسکٹ کو اُس کے بازوؤں کے گرد لپیٹ دیا اور اُسے گھما کر نیچے گرا دیا۔

جیسے ہی دھول اُٹھی، گونار بپھرے ہوئے شیر کی مانند اُبھر کر سامنے آیا، اُس کی جنگی چالاکی اور تزویراتی مہارت سب پر ظاہر ہو چکی تھی۔

گارڈ زمین پر بے ہوش پڑا تھا، اور اُس کا خنجر، جو کہ پہلے ایک خطرہ تھا، اب ایک محض علامتی زیور بن کر رہ گیا تھا۔

گونار، اپنے پاؤں کے نیچے پڑے دشمن کو دیکھتے ہوئے، ایک ناقابل شکست جنگجو کی مانند لگ رہا تھا۔ اُس کا غصہ اور طاقت ایک ساتھ عیاں ہو رہی تھی، اور اُس لمحے میں، اُس کی شخصیت میں ایسی کشش اور خوف کا امتزاج تھا کہ کوئی اُس کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

گونار کا وجود اُس لمحے میں ایک ناقابل تسخیر دیوار کی مانند تھا، جیسے کوئی بھاری پتھر اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہ لے۔ اُس کے چہرے پر ایک خوفناک غصہ چھایا ہوا تھا، اور اُس کے ہر قدم سے لگتا تھا کہ وہ خود تقدیر کا حکم لے کر آیا ہو۔

ایکس، جو کبھی خود کو فاتح سمجھتا تھا، اب اپنی ناگفتہ بہ حالت میں کھڑا تھا، خوف کے زیرِ اثر کپکپاتے ہوئے، جب کہ اُس نے بے بسی سے چیخ کر کہا، ”اسے مار ڈالو!“۔

یہ حکم نو گارڈز کے

درمیان بجلی کی تیزی سے پھیلا، جیسے ان کے بدن میں ایک نیا حوصلہ بھر گیا ہو۔

لیکن گونار کا چہرہ بدستور بے تاثیر کا شاہکار تھا، جیسے کوئی چٹان سمندر کی لہروں کو حقارت سے دیکھتی ہو۔ اُس نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا، جس سے گردن کی ہڈیاں کڑکڑائیں، ایک ایسا منظر جو مخالفین کے دلوں میں خوف کا بیج بونے کے لیے کافی تھا۔

گارڈز اپنی پوری طاقت کے ساتھ اُس کی جانب لپکے، لیکن گونار ایک بے مثال جنگجو کی طرح تیار تھا، اُس کی ہر حرکت میں ٹھوس ارادے اور مہلک توانائی کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔

پہلے حملے میں، تین گارڈز گونار کی بجلی کی مانند تیز گلس کی زد میں آکر زمین بوس ہو گئے۔

اُس کی کلوں نے اُن کی پسلیوں کو چکنا چور کر دیا، اُن کی آنکھوں سے زندگی کی روشنی ایک ہی لمحے میں بجھ گئی، جیسے وہ کبھی زندہ ہی نہ رہے ہوں۔ گونار کے قدموں میں پڑے لاشیں اُس کے انتقام کی خاموش گواہی دے رہی تھیں۔

اب اُس کے سامنے صرف تین گارڈز بچے تھے۔ وہ بھی پوری قوت سے اُس پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہو چکے تھے، لیکن گونار ایک جنگلی طوفان کی مانند اُن کی طرف بڑھا، اُس کے قدموں میں اتنی طاقت تھی کہ ہر قدم زمین کو دہلا دیتا تھا۔

جیسے ہی وہ آگے بڑھا، اُس نے تین گارڈز کو اپنے طاقتور ہاتھوں سے اٹھا کر فضا میں جھولا اور تیزاب کے اُبلتے ہوئے دریا میں پھینک دیا۔ تیزاب نے اُن کی ہڈیوں کو بھی پگھلا دیا، اور اُن کے چیخوں کی گونج اندھیرے میں کھو گئی۔

اب مزید تین محافظ اُس کے سامنے رہ گئے تھے، لیکن اُن کے چہرے پر خوف اور دہشت کے سائے صاف نظر آرہے تھے۔

گونار نے ایک عزم کے ساتھ اُن کی طرف قدم بڑھایا، ہر قدم اُس کے ناقابل شکست ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ اُس کا بدن طاقت سے بھرا ہوا تھا، اور اُس کی آنکھوں میں ایک ایسی روشنی تھی جو کسی کو بھی موت کی وادی میں دھکیلنے کے لیے کافی تھی۔

اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جھٹک کر ہوا میں گھمایا، اور پہلے محافظ کی گردن کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ایک ہی جھٹکے میں اُس نے محافظ کی گردن کی ہڈی کو توڑ دیا، جیسے کسی کمزور شے کو چکنا چور کر دیا ہو۔

دوسرا محافظ اُس کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن گونار نے اپنی کہنی سے اُس کے جبرے کو چکنا چور کر دیا، اُس کی چیخ فضا میں پھیلنے ہی دب گئی۔

تیسرا محافظ، جو اب تک اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا، گونار کے قدموں کے نیچے لرزتے ہوئے آگے بڑھا، لیکن گونار نے اُسے اپنی گرفت میں لے کر زمین پر پٹخ دیا۔

اُس کی کمر کی ہڈیاں چٹخنے کی خوفناک آواز گونار کے طاقتور وجود کا ثبوت تھیں۔ وہ بے جان ہو کر گونار کے قدموں میں پڑا تھا، اُس کی موت گونار کی دی گئی سزا کی آخری نشانی تھی۔

ایلیکس، جو اب تک ایک فاتح سمجھا جاتا تھا، فیکٹری کے اندر خوفزدہ کھڑا ہوا تھا، دروازے کے راستے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن ہر دروازہ اُس کے لیے بند تھا۔ گونار کے منصوبے نے اُسے ہر طرف سے گھیر لیا تھا، اور ایلیکس کا فرار اب ناممکن ہو چکا تھا۔

یہ گونار کی بے پناہ طاقت کا ایک شاندار مظاہرہ تھا۔ اُس کا ہر وار، ہر حملہ، اور ہر قدم اپنے اندر خوفناک طاقت کو مجسم کر رہا تھا۔ وہ نہ صرف جسمانی طور پر ناقابل شکست تھا، بلکہ اُس کا خوف محافظوں کے دلوں کو بھی

مفلوج کر چکا تھا۔

گونار کی پراسرار شخصیت میں ایک ایسا کیمیائی امتزاج کار فرما تھا جو دہشت اور چالاک مہارت کو یکجا کر رہا تھا۔

اس کے پاس ایک انوکھی صلاحیت تھی کہ وہ اپنے مخالفین کے دلوں میں ایسا خوف بٹھا دیتا تھا جو دل کے دورے کا موجب بن سکتا تھا۔

یہ اس کی موجودگی سے ابھرنے والی غیر معمولی طاقت کا غماز تھا۔ گونار حکمرانی محض اپنے خوفناک نام کی دھمک سے کرتا تھا، نہ کہ کسی تخت یا تاج کے ذریعے۔

وہ اپنے دشمنوں کو ہزیمت سے دوچار کرنے میں ماہر تھا، اور اپنی ہوشیاری و فریب کاری کی بدولت انہیں دھوکہ دینے کا ہنر جانتا تھا۔

وہ ایک ایسا چالباز تھا جو لو مڑی کی مانند چالاک، ببر شیر کی مانند طاقت، اور عقاب کی مانند دور اندیشی کا مجسم تھا۔

اس کی چالاکانہ فطرت اسے ایسا محیر العقول ذہن فراہم کرتی تھی کہ وہ ایک ماہر شکاری کی مانند اپنے شکار کے گرد ایسا جال بنتا تھا کہ شکار کو سمجھ میں نہ آتا کہ کب وہ گونار کے شکنجے میں پھنس چکا ہے۔

گونار کو دنیا ایک جنگجو کے طور پر جانتی تھی، ایک ایسا سپاہی جو مشکلات کے پہاڑ کو بھی عبور کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ مگر اس کے فولادی چہرے اور ظاہری سرد مہری کے پیچھے ایک ہنگامہ خیز ماضی کا زخم پوشیدہ تھا۔

اس کے اقدامات اس کے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کی بازگشت تھے، اور اس کی شخصیت کی ہر تہہ میں اس کی شکایات کا عکس نظر آتا تھا۔

جو نہی الیکس نے دروازے کی طرف اپنی پیٹھ لگائی، گونار کے قدموں کی گونج بڑھتی چلی گئی، جیسے کوئی خونخوار شکاری اپنے شکار کو گھیر رہا ہو۔

الیکس کے چہرے پر جی خوف کی لہر اس بات کی غماز تھی کہ اب زوال ناگزیر تھا۔ گونار، اپنے حتمی ارادوں کے ساتھ، الیکس کے قریب آیا۔ اس کے ہر قدم میں وہ ہی بے رحمی تھی جس سے الیکس کانپ اٹھتا تھا۔

۔ ”گگ... گونار...“ الیکس نے لرزتے ہونٹوں سے بمشکل کہا، اس کی آنکھوں میں خوف کا سمندر تھا۔

اس نے بیک وقت دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بھاگنے کا راستہ تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی۔۔ مگر گونار بے خوف اور بے رحم کھڑا تھا، اس کا جبرِ اغصے سے جکڑا ہوا تھا۔ کمرے میں تناؤ مزید بڑھا جب گونار نے لوہے کی بھاری سلاخ کو اٹھایا۔

۔ ”زندگی ایک شطرنج کا تختہ ہے، اور میں اس کا ماہر استاد ہوں۔ میں چالیں چلتا ہوں، اور ہر کوئی میری مرضی کے مطابق ناچتا ہے۔ آگ سے کھیلنے والے کا انجام ہمیشہ عبرتناک ہوتا ہے، ”گونار کی آواز میں ایسی دہشت تھی کہ الفاظ سے ہی موت کی بدبو محسوس ہونے لگی۔

اس نے ایلکس کو ایک سفاک نظر سے دیکھا، جس کے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

گونار کی مٹھی میں جکڑا ہوا ایلکس تھر تھراتے ہوئے گونار کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”دیکھو، گونار، میں تمہارے خاندان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔۔۔“

یلکس نے معذرت بھری آواز میں کہا، مگر گونار کے چہرے پر ایک لمحے کی بھی نرمی نہیں آئی۔
۔ ”تمہارے خاندان نے میرے ماں باپ، میری بہن اور میرے بھائی اور میری زندگی کی تمام خوشیوں کو چھینا تھا، ”گونار نے دھیمی، مگر سنگین آواز میں کہا، اور پھر ایلکس کی گردن کے پچھلے حصے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

گونار نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں، غصے کے سمندر کو اپنے اندر تھامتے ہوئے۔ پھر جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں، تو اس کی نظروں میں صرف تباہ کن نفرت اور انتقام کا شعلہ تھا۔ اس نے ایلکس کو یکدم اٹھا کر الٹا لٹکا دیا، جیسے کسی قصائی نے گوشت کے ٹکڑے کو لٹکا رکھا ہو۔ ایلکس خوف سے چیخ رہا تھا، مگر گونار کے دل میں ایک ذرہ برابر بھی ترس کا شائبہ نہ تھا۔

تیزابی سمندر کے کنارے پر پہنچ کر، گونار نے ایک آخری بار ایکس کی طرف دیکھا، جس کی آنکھوں میں خوف اور مایوسی کی جھلک تھی۔ ”تم نے کیتھرین اور گسٹاو کے بیٹے کو ہڈیوں کے کینسر میں مبتلا کیا،“ گونار نے سرد لہجے میں کہا۔

۔، ”اور آج تمہیں اپنے جرائم کی سزا ملے گی۔“ ایکس نے اپنی زندگی کی بھیک مانگی، مگر گونار نے کسی بھی رحم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے تیزابی سمندر میں ڈال دیا۔

تیزابی مائع نے فوراً ایکس کے جسم کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کر دیا۔ اس کے جسم کی ہڈیاں سکڑنے کے عمل میں گھلنے لگیں، اور اس کی چیخیں کمرے میں گونجنے لگیں، مگر گونار کے کان ان چیخوں سے بند تھے۔ وہ اپنے انتقام کی تکمیل کو خاموشی سے دیکھ رہا تھا، اس کے چہرے پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ تھی۔

ایکس کا جسم اب تحلیل ہو چکا تھا، اور تیزاب کی کیمیائی بلبلیاں اسے نگل چکی تھیں۔ گونار نے اپنی سن گلاسز پہنی، تیزاب کے سمندر کی طرف اپنی پیٹھ موڑی، اور سکون سے وہاں سے چل دیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کی قدموں کی آواز اس خوفناک موت کی بازگشت میں مدغم ہو گئی۔

دروازہ یکدم کھلا تو ایک مدہم روشنی کا عکس باہر سے اندر کی تاریکی میں چھا گیا۔ دروازے کے دونوں جانب وہ دو شخص ہاتھ باندھے، ادب سے سر جھکائے کھڑے تھے، جیسے وہ کسی سلطان کے منتظر ہوں۔

ان کی آنکھوں میں چوڑی حیرت تھی جب انہوں نے گونار کی ہیبت ناک شخصیت کو دروازے کی دہلیز پر دیکھا۔ اس کے قدموں کی دھمک اور اس کے سایے کی شدت نے فضا میں خاموشی کو یرغمال بنالیا۔

گونار کا یہ متمول ہیولیٰ انتقام کی چادر میں لپٹا ہوا تھا، اور اس کی آنکھوں کی گہری چمک نے اندھیرے کو چیرتے ہوئے ان دو افراد کے دلوں میں خوف کا بیج بو دیا تھا۔

وہ اپنے سر کو اٹھا کر اندر دیکھنے کی جرأت کر بیٹھے، جہاں ایک حقیقت کا عکاس منظر ان کے سامنے تھا۔ گونار، انتقام کی مجسم تصویر، اور ان کے سامنے وہ اسیروں کی عدم موجودگی جو کبھی اپنے فاسد ارادوں میں مبتلا تھے۔

ان کی آنکھوں کی حیرت میں مزید وسعت آگئی جب انہوں نے گسٹاو اور کیتھرین کو پلر سے بندھا، معجزانہ طور پر زندہ دیکھا۔ ان دونوں کی حالت گویا گونار کی بے لچک ارادے کی جیتی جاگتی گواہی تھی۔

ایک ایسا مرد جس کے سامنے دنیا کی ہر مشکل اور سازش دم توڑ دیتی تھی، اور وہ فتح کے علمبردار کے طور پر کھڑا تھا۔

گونار نے اپنے مضبوط قدموں سے ان کے قریب آتے ہوئے دھیمی مگر سخت آواز میں کہا، ”ان دونوں کو ٹارچر سیل میں پہنچادو۔“ اس کا حکم جیسے کائنات کا حتمی فرمان تھا، اس کے الفاظ کی گونج فضا میں سحر بن کر

گوئی۔ وہ دونوں شخص، جو بد معاشی کے نشان تھے، فوراً فرمانبرداری میں اندر لپکے، گویا گونار کے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی تاخیر ان کے انجام کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔

گونار، ایک فاتح جنگجو کی مانند، گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کا ہر قدم زمین پر ایک کہانی رقم کر رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور کی سیٹ پر قبضہ جمایا، جیسے یہ اس کے اختیار اور قدرت کا مظہر ہو۔

انجن کی دھاڑ نے ہوا میں لرزش پیدا کی، جیسے خود وقت نے گونار کے آگے سر جھکا لیا ہو۔ گاڑی کا زور آور انجن فضا کو چیرتے ہوئے آگے بڑھا، اور گونار اپنے انتقام کی تکمیل کے بعد، وقت اور تقدیر کو اپنی مٹھی میں قید کرتا ہوا، اس مقام سے دور نکل گیا۔

اس کا ہر عمل، ہر حرکت، جدید دور کے ایک ناقابل تسخیر ہیرو کی روح کا عکاس تھا، جس نے نہ صرف انتقام کی کہانی کو انجام تک پہنچایا، بلکہ اپنے وجود کو تاریخ کے صفحات پر امر کر دیا۔

...°...

جیسے ہی بارش رکی، ایمان نے خود کو پہاڑوں کی بلندی پر واقع ہوٹل کے کھلے حصے میں پایا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے بیٹھ گئی اور اس وسیع و عریض منظر کو اپنے اندر جذب کرنے لگی۔

سامنے نیچے اسلام آباد کا منظر اپنی تمام تر جاذبیت کے ساتھ چمک رہا تھا، جیسے شہر میں زندگی ہر زاویے سے جگمگا رہی ہو۔

دور پہاڑوں کے پیچھے سورج ڈوب چکا تھا، اور آسمان اب گہرے نیلے رنگ میں تبدیل ہو چکا تھا، ایک خاموش، پراسرار شان کے ساتھ چھایا ہوا۔

ہوٹل کی چھت پر سچی ہوئی میزیں، سلیقے سے ترتیب دیے گئے برتنوں کے ساتھ افطاری کی تیاری کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہر چیز کو احتیاط سے سجایا گیا تھا، پلیٹوں، گلاسوں، اور کھانے کے برتنوں کے قرینے سے رکھے جانے نے ایک پروقار ماحول پیدا کر دیا تھا۔

ایمان نے ریلنگ کے قریب ایک میز کا انتخاب کیا تھا، جہاں سے وہ شہر کی روشنیاں دیکھ سکتی تھی، اور اسلام آباد کی جگمگاہٹ اسے سکون بخش رہی تھی۔

نیچے کی دنیا میں درختوں کی سرسبزیاں، سڑکوں پر دوڑتی گاڑیاں، اور شہر کی روشنیوں کا سمندر تھا جو روشنیوں کے جھرمٹ میں نہایا ہوا تھا۔

دور، شہر کے اوپر آسمان پر کچھ باقی ماندہ بادل آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے، جیسے رات کے آغاز کی نوید دے رہے ہوں۔

ایمان کے دل میں سکون تھا، مگر وہ سکون جو کہیں اندر گہرائی میں ایک نامعلوم اداسی کو چھپائے ہوئے تھا۔ جیسے ہی اسلام آباد کی روشنیاں مزید تیز ہوئیں، اُس نے کھجور اٹھا کر افطار کیا۔ اذان کی گونج فضا میں پھیل چکی تھی، اور نیچے کی دنیا میں رمضان کی شام کی رونق اپنے عروج پر تھی۔

لیکن اس خاموش منظر کے باوجود، ایمان کے قریب بیٹھے چند لڑکوں کا ایک گروپ اس کی طرف مسلسل نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اُن کی بے جان نظریں ایمان کی نظروں سے بچ نہ سکیں۔ وہ ایمان کی پرسکون روح کو پریشان کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

ایمان نے پہلے تو نظر انداز کیا، اپنے سکون میں مگن رہی، مگر جب اُن کی نظریں شدت اختیار کر گئیں، تو اُس نے پانی کا گلاس میز پر رکھا، اور آنکھیں ان لڑکوں کی طرف جمادیں۔

اُس کی نظریں اب اُن لڑکوں پر ٹھہر گئیں تھیں۔ اُس نے ایک عزم کے ساتھ اپنی کرسی کی پشت سیدھی کی، جیسے کہ اُس کے اندر کوئی بھرتی ہوئی طاقت جاگ اٹھی ہو۔

وہ اٹھی، اور دھیرے دھیرے لڑکوں کے قریب جا پہنچی۔ ماحول میں ایک غیر معمولی سنجیدگی چھا گئی تھی۔ لڑکوں کی آنکھوں میں اب وہ تکبر نہیں رہا تھا۔

ایمان نے اپنی نظریں اُن کے چہروں پر گاڑ دی۔ ایک لڑکے نے ہچکچاہٹ سے ہنستے ہوئے کہا، ”کچھ ہوا ہے باجی؟“

ایمان نے ایک سرد مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا اور آہستگی سے جواب دیا، ”نہیں، میں نے بس سوچا کہ تم لوگ مجھے اتنی غور سے دیکھ رہے ہو کہ میں خود ہی آکر تمہاری توجہ کا مرکز بن جاؤں۔ اب، غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ کیا ٹھیک ہے سب۔“

لڑکا، جو پہلے مسکراتا تھا، اب سرا سیمہ ہو گیا۔ ”نہیں، باجی، ہم تو بس...“ وہ جملہ مکمل کرنے سے قاصر رہا۔

ایمان کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی طاقت تھی، جس نے اُن کی بے جا ہمت کو چکنا چور کر دیا تھا۔ اُس نے لڑکوں کو سرد نظروں سے گھورتے ہوئے کہا، ”تم مجھے بہن کہتے ہو اور اُس نظر سے دیکھتے ہو؟ کیا تم اپنی بہنوں کو بھی ایسے ہی دیکھتے ہو؟“۔

اُس کی آواز دھیمی تھی، مگر اُس کے لہجے میں ایک غیر معمولی سختی تھی۔ لڑکوں کے چہرے زرد پڑ چکے تھے۔ ایمان نے میز پر ہاتھ مارا، اور وہاں موجود لوگوں نے اس واقعے کو حیرت سے دیکھا۔ لڑکے اب اپنی جگہ پر سہمے ہوئے بیٹھے تھے، اور ماحول پر ایک غیر معمولی خاموشی چھا گئی تھی۔

ایمان نے لڑکوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا، ”تم جیسے لوگوں کی نظریں گندی ہیں، اور تمہارے اعمال تمہارے خاندانوں پر ایک بد نما داغ ہیں۔“۔

ایمان نے سر کو سختی سے جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بے پناہ غضب کی چمک تھی، جیسے اندرونی طوفان کا عکس ہو، اور وہ دھیمی لیکن زہر آلود آواز میں مخاطب تھی۔

۔ ”میں دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں ہوں جو ذرا سی دھمکی پر خوفزدہ ہو جائیں!“۔

وہ نوجوان، جو ابتدا میں غرور سے ایمان کی طرف دیکھ رہا تھا، یکدم پیلا پڑ گیا، جیسے کسی زہریلے سانپ نے اسے ڈس لیا ہو، اور دوسرا لڑکا جلدی میں صفائی دینے لگا، ”بہن، ایسا کچھ نہیں ہے!“۔

ایمان کی سخت نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں، اُس کی آنکھوں کی بے خوف چمک نے اُن کے حوصلے کو ایک ہی پل میں پاش پاش کر دیا۔

مینجر اور ہوٹل کا عملہ بھاگ بھاگ موقع پر پہنچا، اُن کی آنکھوں میں حیرت اور تجسس تھا۔ وہ قریب آتے ہی ایک ہموار لیکن محتاط لہجے میں بولے، ”میم، کیا معاملہ ہے؟ سب ٹھیک ہے؟“۔

ایمان نے ایک لمحے کے لیے اپنے سر کو اونچا کیا، شان و وقار سے سیدھی ہوئی، اور مضبوطی سے بولی، ”شاید شیطان ابھی قید سے رہا ہوا ہو، لیکن اس کے بد طینت قاصد پہلے ہی میدان میں اتر چکے ہیں۔ یہ لوگ گندی نگاہوں سے مجھ پر نیت باندھ رہے تھے۔“۔

مینجر نے فوراً معاملے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اپنی نظریں لڑکوں کی طرف پھیر دیں، جنہوں نے فوراً کسی بھی غلط حرکت سے انکار کر دیا۔ ایمان نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے موبائل نکالا، جس میں ایک عقلمند ڈیوائس کے ذریعے ریکارڈ کی گئی ویڈیو موجود تھی۔

ویڈیو چلاتے ہی اُس نے موبائل کا رخ مینجر اور ہوٹل کے عملے کی طرف کیا، جن کے چہروں پر حیرت اور اضطراب چھا گیا۔

ویڈیو میں لڑکوں کی بے حیائی واضح تھی، اُن کے چہروں کی ساری رنگت ختم ہو گئی، اور جرم کا سایہ اُن کی آنکھوں میں چھا گیا۔ ایمان نے ایک سرد مسکراہٹ کے ساتھ اُن پر نظریں جماتے ہوئے کہا، ”اب بتاؤ، کیا تم اب بھی انکار کرتے ہو؟“۔

اس منظر نے وہاں موجود لوگوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا، اور کچھ نے اپنے فون نکال کر ویڈیو ریکارڈ کرنی شروع کر دی۔ اسی دوران ایک لڑکے نے الزام تراشی کی کوشش کی اور بولا، ”اگر تمہیں اتنا مسئلہ تھا تو تم اکیلی کیوں نکلی ہو؟“۔

ایمان نے اُس کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے تحقیر آمیز لہجے میں کہا، ”ابے او صدقے کی سری کے منہ والے! کیا مجھے تم جیسے کتوں کے ڈر کی وجہ سے اندر قید ہو کر بیٹھ جانا چاہیے؟“۔

اُس کی بات کا طنز اور اس کی نگاہوں کی سختی نے ایک لمحے میں اُن لڑکوں کے دلوں میں خوف بھر دیا۔ اُس نے پُر زور انداز میں کہا، ”تمہاری یہ حرکتیں تمہارے خاندان کی تربیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ اگر ذرا سی غیرت ہوتی تو تم اپنی نظریں نیچی کر لیتے۔ کسی اکیلی لڑکی کا پیچھا کرنا اور اُس پر نظر رکھنا کم ظرف کتوں کا کام ہے۔ یاد رکھو، تم اپنی بیٹیوں کی تقدیر لکھ رہے ہو۔ اگر تمہاری اولاد میں بیٹی نہ ہو، تو بھی تمہارے خاندان میں کسی نہ کسی عورت کا یہ ہی انجام ہو گا۔“۔

اُس کے لفظوں کی گھن گرج جیسے ہر طرف پھیل گئی۔ وہاں موجود لوگ، جو خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے، اُس کی بے باکی اور مضبوطی پر دنگ رہ گئے۔ ایمان نے اُن سب کی جانب ایک آخری نظر ڈالی، اور خود کو فخریہ انداز میں وہاں سے دور کر لیا۔

اُس کے جاتے ہی ماحول میں ایک عجیب خاموشی چھا گئی، جیسے سب کو اپنے اعمال کا احساس ہو رہا ہو۔ تماشائیوں نے آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں، کچھ نے ایمان کی جرات کی تعریف کی، جب کہ دوسرے نظریں جھکاتے ہوئے خود پر غور کرنے لگے۔ ہوٹل کا عملہ اور مینیجر، جنہوں نے شروع میں معاملے کو معمولی سمجھا تھا، اب اس سنگین صورت حال سے دوچار تھے۔

ایمان نے نہ صرف اپنے لیے بلکہ وہاں موجود ہر لڑکی کے لیے ایک مثالی کردار ادا کیا۔ اُس کے جانے کے بعد بھی اُس کی موجودگی وہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں گونجتی رہی۔

...°...

رات نے سوسائٹی کو ایسی خاموشی کی چادر میں لپیٹ رکھا تھا جس کا مقابلہ وہ ماضی کی عیدوں کی ہنگامہ خیز خوشیوں سے نہیں کر سکتی تھی۔

وہ خاموشی جس میں ہوا بھی ساکت لگتی تھی، عید کی راتوں کے پٹاخوں کی گونج سے خالی، اور سویڈن میں قرآن مجید کی بے حرمتی کے حکومتی فیصلے کے بعد شہر میں چھائی ہوئی عمومی خاموشی سے ہم آہنگ تھی۔

گلی کی ٹیلی سڑک پر گہری رات کا سایہ تھا، جو مکانوں کی روشنیوں میں مدھم ہو کر کہیں کہیں چمکتی تھی، لیکن ہر چیز اپنے ہونے کے باوجود غیر حاضر معلوم ہوتی تھی۔

ایمان، کندھے پر بیگ ڈالے، اپنی منزل کی طرف تنہا چلی جا رہی تھی، جیسے یہ گلی اس کے قدموں کے ساتھ ساتھ طے ہو رہی ہو۔

عید کے تہواروں کی رونقیں ماضی کی یادیں بن چکی تھیں،۔۔

آج تک ایمان نے کبھی عید نہ منائی تھی، مگر آج جب اس نے عزم کیا کہ وہ عید منائے گی، تو حالات نے اسے تلخی کی نذر کر دیا۔ اس خبر نے اس کے دل کی مٹھاس کو یوں کڑواہٹ میں بدل دیا جیسے موت کا وقت قریب ہو۔

آج کا یہ ماحول ایک غمناک، سو گوار منظر پیش کر رہا تھا۔ مگر اس خاموشی کا پردہ مولوی سرور کے خاص شاگرد اور جتوئی کے درمیان سرگوشیوں سے تھوڑا سا چاک ہو گیا۔

دونوں گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑے تھے، اور ان کے چہرے پر کوئی پراسرار مکالمہ چمک رہا تھا، جس نے ایمان کے دل میں ایک ناگوار تجسس کا بیج بو دیا۔

ایمان کے قدم بے اختیار رک گئے، جیسے کوئی غیر مرئی ہاتھ اسے واپس تھام کر تجسس کی گرفت میں لے آیا ہو۔ اُس نے کچھ فاصلہ اختیار کیا اور انہیں دور سے زیرِ لب گفتگو کرتے دیکھا۔

دل میں سوچ کی لہر اٹھی ”مجھے اسے سندس آپی کے بارے میں پوچھنا چاہیے۔“

اسی لمحے، جتوئی اور مولوی سرور کا شاگرد مصافحہ کرتے ہوئے جدا ہوئے۔ جتوئی نے گیٹ کو بند کیا اور اندر چلا گیا، جبکہ شاگرد اپنے معمول کے انداز میں واپس مڑنے لگا۔

جب وہ شاگرد ایمان کے قریب سے گزرا، تو اس نے موقع غنیمت جانا اور اُسے مخاطب کرتے ہوئے دھیرے سے پکارا، ”رُکیں!“

شاگرد فوراً رُک گیا۔ اس کی نظریں زمین میں گڑھ گئیں، اور اُس کے لبوں پر ایک غیر یقینی ہچکچاہٹ ظاہر ہوئی۔ ”جی فرمائیے۔“

ایمان نے بغیر کسی تمہید کے سوال کیا، ”کیا سندس آپی گھر میں موجود ہیں؟“

شاگرد نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا، جیسے کوئی غیر یقینی خیال اس کے دل میں آیا ہو۔ پھر ہلکی سی جھجک کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا، ”ہاں، وہ گھر پر ہیں۔“

ایمان کے دل میں ایک عجیب خلش پیدا ہوئی۔ کیا یہ سچ تھا؟ یا پھر کچھ اور؟ وہ جانتی تھی کہ مولوی سرور کے شاگرد کا یہ جواب معمولی نہیں تھا۔ ایمان کی پیشانی پر سوالیہ شکنیں نمودار ہوئیں، اور اُس نے براہ راست سوال کیا، ”آپ میرے والد سے کیا بات کر رہے تھے؟“

شاگرد نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں ملائیں، پھر اپنے چہرے پر وہ ہی ترتیب یافتہ تاثرات باندھے، اور مولوی سرور کی شادی کا انکشاف کر دیا، ”مولوی سرور کی شادی کی دعوت دینے آیا تھا۔“

یہ خبر ایمان کے دل پر کسی غیر متوقع بوجھ کی طرح گری، اُس نے دل میں چپکے چپکے حیرت کا اظہار کیا ”اس عمر میں مولوی سرور کی شادی؟ اور اوپر سے اس خبر کے باوجود کوئی خوشی کیسے مناسکتا ہے۔“

باوجود اس کے کہ اس کے دل میں کئی سوالات اور شکوک و شبہات بھر گئے تھے، اُس نے ظاہراً مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا، ”اوہ، ٹھیک ہے۔“

شاگرد نے سر ہلایا، اور جیسے اپنے ساتھ ایک راز لے کر چلا گیا۔ اُس کے جاتے جاتے اس کے لبوں پر ایک مدہم مسکراہٹ ابھری، جیسے وہ کوئی پوشیدہ حقیقت چھپا رہا ہو، اور اتفاقاً کہا، ”آپ بھی آئیے گا لازمی۔“

ایمان چند لمحوں کے لیے رکی، پھر اثبات میں سر ہلایا، ”ہاں بالکل۔“

جب ایمان نے دوبارہ اپنے گھر کی طرف قدم بڑھایا، تو اُس شخص کی پراسرار مسکراہٹ اور نظر انداز کرتی ہوئی نگاہیں ایک عجیب سحر کی طرح اُس پر چھا گئیں۔ مولوی سرور کی شادی کا راز، اور اُس کے ارد گرد چھایا ہوا یہ پراسرار ماحول، ایمان کو بے چین کر گیا تھا۔

نہ جانے کیوں، یہ شادی کی دعوت اور پورا ماحول ایمان کو ایک منفی تاثر دے رہا تھا۔ وہ اس احساس کو سمجھنے سے قاصر تھی، مگر اس کی چھٹی حس کبھی غلط نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی، وہ اس بات کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہی۔

...°...

جیسے ہی ایمان گیٹ عبور کر کے اپنے گھر میں داخل ہوئی، سامنے کا منظر جاندار اور متحرک تھا۔ اُس کی سوتیلی ماں خالدہ، بہنیں اور بھائی سب بازار جانے کے لیے تیار تھے۔

جتوئی اور میکائیل گاڑی میں منتظر تھے، جبکہ بہنیں پچھلی نشستوں پر براجمان ہو رہی تھیں۔

خالدہ دروازہ کھولے گاڑی میں سوار ہونے ہی والی تھی کہ یک لخت رکی اور ایمان کے لباس کی طرف ایک نفرت بھری نگاہ ڈالی۔

اُس کی آنکھوں میں وہی پرانا طنز چھلک اُٹھا، جسے وہ ہمیشہ زبان پر لانے سے باز نہیں رہتی تھی۔ خالدہ نے اپنی تلخ زبان کی کاٹ کو روکنے کی بجائے، ایک پرانی اور توہین آمیز مثل استعمال کی: ”سو چوہے کھا کر بلی چلی جج کو۔“

ایمان، جو کبھی بھی زبان کے تیر سے پیچھے نہیں ہٹی تھی، فوراً جواب دینے کے لیے تیار تھی۔ اُس نے ذہانت اور مزاح کو یکجا کرتے ہوئے ایک تابڑ توڑ جواب دیا

۔ ”اگر بلی نہ ہوتی تو نوح (علیہ السلام) کی کشتی میں چوہے بے تحاشا بڑھ کر اُسے برباد کر دیتے۔ اللہ نے بلی کو پیدا ہی چوہوں

لفظ ’چوہوں‘ پر زور دے کر، اُس نے اپنی آنکھوں سے خالدہ کی طرف اشارہ کیا۔)۔

کی آبادی کنٹرول کرنے کے لیے کیا ہے۔ اب یہ بلی چاہے پہلے چوہے کھائے اور پھر حج کرے یا اُس کے برعکس، کم از کم کھانے کے بعد اللہ نے اسے اپنے گھر کی زیارت کا شرف بخشا۔”۔

۔ (ایمان نے آج ہی یوٹیوب پر حضرت نوحؑ کا قصہ سماعت کیا تھا، اور وہ ہی قصہ اس کے ذہن میں محو گردش تھا)۔

ایمان کے ذہن اور مزاحیہ رد عمل نے خالدہ کو لمحہ بھر کے لیے گویا چپ کر دیا، اور اُس کی بے یقینی سے بھری آنکھیں ایک پل کے لیے جھپکنا بھول گئیں۔

اُس کے الفاظ نے نہ صرف طنز کو بے اثر کر دیا بلکہ اس کی تلخی کو مزاح کی لطافت میں تحلیل کر دیا۔ ارد گرد موجود تماشاخی — ایمان کی سوتیلی بہنیں، بھائی اور خود جتوئی — اس کے شگفتہ جواب پر حیرت زدہ رہ گئے اور گویا وہ جل اٹھے۔

ایمان کی فطری ذہانت اور حاضر جوابی نے نہ صرف اس لمحے کی گرامہٹ کو ختم کیا بلکہ محفل کے منظر نامے کو پلٹ کر رکھ دیا۔ اُس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی جو اُس کی فتح کی غماز تھی، اور فضا میں ایک ہلکی سی ہنسی کی بازگشت چھوڑتے ہوئے وہ پر اعتماد انداز میں آگے بڑھ گئی۔

...°...

تاریک کمرے کی مدھم، گھٹن زدہ فضا میں، سائے دیواروں سے اس طرح لپٹے ہوئے تھے جیسے انہیں کسی آن دیکھی قوت نے جکڑ رکھا ہو۔

ایک تنہا، لرزتا ہوا چراغ، اپنی کمزور سی روشنی کے ساتھ یوں جھول رہا تھا جیسے وہ کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر ہو۔ یہ روشنی، جو کمرے میں پھیلی ہوئی بے بسی اور خاموشی کے درمیان اکیلی تھی، نہایت مدھم تھی، جیسے اس کی زندگی بھی لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہی ہو۔

اُس نے ماحول کے دھندلکے کو کم کرنے کے بجائے اور گہرا کر دیا تھا۔ ہر طرف کا گوشہ جیسے کوئی پرانا راز یا پوشیدہ سچائی چھپائے ہوئے تھا۔

گسٹا اور کیتھرین، جو اس بے چینی میں مبتلا تھے، خود کو آہستہ آہستہ اس ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں گندے، مکدر ماحول میں دھیرے دھیرے ایڈجسٹ ہو رہی تھیں۔

مرکزی منظر سامنے آیا۔ ایک میز، نہایت پر عزم اور مضبوط، جیسے وہ وقت کے پھیڑوں سے بے نیاز ہو،

-

جھولتے ہوئے چراغ کی روشنی کبھی کبھار میز کو اُجاگر کرتی، مگر یہ جھلکیاں بھی اتنی مدہم تھیں کہ روشنی کے دائرے میں کچھ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ و

روشنی ایک بیمار زردی کے ساتھ بکھرتی تھی، جیسے کوئی مایوس چراغ آخری سانس لے رہا ہو۔ کیتھرین اور گسٹاو کے چہرے پر جب روشنی کی ہلکی جھلک پڑی، تو دونوں نے ماحول کو گہرے شک اور خوف کے ساتھ جانچنا شروع کیا۔

گسٹاو، جیسے ایک اندرونی قوت سے بھرا ہوا تھا، کیتھرین کی طرف مڑ کر مدہم، مگر پُر اعتماد آواز میں بولا،
- “کیتھرین، تم ٹھیک ہو؟”-

کیتھرین، جو ابھی تک خوف کے زیر اثر تھی، دھیرے سے بولی، “میں ٹھیک ہوں، مگر ایلکس نے ہمیں یہاں کیوں رکھا ہے؟” اُس کی آواز میں ایک عجیب قسم کی گھبراہٹ اور الجھن شامل تھی۔

ایکایک، سائے میں سے ایک گہری، سرد اور لرزہ خیز آواز گونجی، “ایلیکس اب اس دنیا میں نہیں رہا۔” یہ الفاظ سن کر گسٹاو اور کیتھرین کی نظریں اُس شکل کی طرف مبذول ہو گئیں جو سائے میں چھپی ہوئی تھی، جیسے اُس نے کمرے کی ساری روشنی کو جذب کر لیا ہو۔

اس پر اسرار ہستی نے اپنے مضبوط ہاتھ میز پر رکھے، اور چراغ کی دھندلی روشنی میں ٹیٹوز سے سجے ہوئے اُس کے ہاتھ کسی پرانی کتاب کے پیچیدہ اسرار کی طرح چمکنے لگے۔

یہ وہ ہاتھ تھے جنہوں نے نہ جانے کتنے قصے دفن کیے تھے۔ کیتھرین کی آنکھیں تنگ ہو گئیں، اُس کے چہرے پر حیرت اور شک کی ملی جلی کیفیت تھی۔

سامنے بیٹھی شخصیت کا وجود پر اسرار تھا، مگر جیسے جیسے وقت گزر تا گیا، اُس کے چہرے کی شکل واضح ہونے لگی۔

جیسے ہی شخصیت نے اپنے سر اُپے کو دھیرے دھیرے ظاہر کیا، گونار کا سرد اور پُر شکوہ وجود ابھر کر سامنے آیا۔

اُس کی حرکتوں میں ایک قسم کا قاتلانہ سکون اور بے نیازی تھی، جیسے وہ ہر چیز کا مالک ہو۔ لگتا ہوا چراغ بھی اُس کے وجود کی طرف جھک سا گیا تھا، اُس کی ہر ادا میں ایک غیر مرئی کشش تھی جو کسی کو بھی اپنی گرفت میں لے سکتی تھی۔

گونار کا بدن، گویا چمکتا ہوا فولاد ہو، اُس کے چہرے پر ایک سنگین سنجیدگی تھی جو اُس کی شخصیت کو مزید پر اسرار اور ناقابلِ فہم بناتی تھی۔

کیتھرین، جس کا دل اعتراف کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا، جھک کر بولی،

۔ ”ہم دونوں گناہ گار ہیں، تم جو بھی سزا دو، ہم قبول کریں گے۔“

گونار کی آنکھوں میں ایک سرد چمک تھی، اُس نے دانستہ طور پر اپنے ہاتھ میز پر رکھے اور نہایت ٹھوس اور پر عزم لہجے میں بولا، ”میں بے قصور لوگوں کی جان لینے کا عادی نہیں ہوں۔“

اُس کے الفاظ میں وہ ہی کشش اور اثر تھا جیسے اُس نے کسی غیر مرئی طاقت کا حکم صادر کیا ہو۔

سائے کمرے میں پھیل گئے، ایک صوفیانہ فضا پیدا کر رہے تھے، جیسے اُس لمحے میں کچھ انوکھا ہونے والا ہو۔ ”تمہارے اعمال، جو ایک ماں کی بے پناہ محبت سے جڑے تھے، بد قسمتی سے ایک بھیانک سازش میں تبدیل ہو گئے۔“

گونار کی آواز میں ایک غیر معمولی سنجیدگی تھی، ہر لفظ ہوا میں معلق ہو کر اُس وحی کا حصہ بن رہا تھا جو اب تک راز میں تھی۔

چراغ کی مدھم روشنی ٹمٹما رہی تھی، گونار کے چہرے پر روشنی اور سائے کا کھیل جاری تھا، اُس کے چہرے کی جھلکیاں دکھا کر پھر غائب ہو جاتی تھیں۔ ”ایکس نے تمہارے بیٹے کو ہڈیوں کے سرطان کے جراثیم لگائے، اور تمہیں اپنے منصوبے کے لئے استعمال کیا۔ تمہیں دھوکہ دیا گیا، اور اُس کے جرم کے بدلے تم نے اپنی معصومیت گنوائی۔“

گونار کے انکشاف نے کیتھرین اور گسٹاو کو صدمے میں مبتلا کر دیا۔ کمرہ اُن پر بند ہوتا محسوس ہوا، جیسے ہر چیز اُن کے گناہوں اور غلطیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔

کیتھرین کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اور گسٹاو نے گھبراہٹ میں گونار کی طرف دیکھا۔

گونار نے گہری سانس لیتے ہوئے، جیسے ماضی کے بوجھ کو اتار رہا ہو، دھیرے سے بولا، ”اب ان باتوں کو دفن کر دو۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ ایلکس کو اُس کے اعمال کی سزا مل چکی ہے۔ میں تمہارے بیٹے کی دیکھ بھال کروں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔“

کیتھرین کی آنکھوں میں شکر گزاری کا ایک جھماکا آیا، اور گسٹاو، جو گونار کی سخاوت سے متاثر ہو چکا تھا، آگے بڑھا اور گونار کو دل سے گلے لگایا۔ گونار، جو اب بھی اپنے سرد اور بے لچک وجود میں ایک عجیب قسم کی گرمجوشی چھپائے ہوئے تھا، نے گسٹاو کی پشت تھپک کر اُسے تسلی دی۔

۔ ”جو کچھ ہوا، وہ میری غلطی تھی،“ گونار نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

۔ ”اگر میرا ایلکس سے جھگڑا نہ ہوتا، تو تمہارے بیٹے کو یہ تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔“

اب کی بار گسٹاو کی آنکھوں میں نمی تھی، اور وہ اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے بولا، ”تم فرشتہ ہو، گونار۔“

گسٹا پیچھے ہوا تو گونار نے آہستگی سے مسکراتے ہوئے اپنی گہری آنکھوں میں ایک سرد چمک پیدا کی،
”فرشتے تو خاک کے پتلوں میں نہیں بسے، مگر شیطانی صفت رکھنے والے انسان ہر طرف ہیں... شاید میں
بھی انہی کا حصہ ہوں۔“

اُس کے الفاظ میں ایک غیر اعلانیہ کشش تھی، جیسے وہ اپنے اندر چھپے رازوں کو دانستہ طور پر کھولنے سے
گریز کر رہا ہو۔ پھر اُس نے اپنے مضبوط، غیر متزلزل ہاتھ کی ایک ہلکی جنبش کے ساتھ انہیں تسلی دیتے
ہوئے کہا، ”تم اسپتال اپنے بیٹے کے پاس جاؤ۔ وہاں میں نے تمہارے لیے کچھ خاص انتظامات کیے ہیں۔
اسپتال کے ہیڈ کوارٹر کا رخ کرو اور میرا نام بتاؤ، وہ فوراً تمہیں پہچان لیں گے۔“

یہ الفاظ سرد مہری کے ساتھ ادا کیے گئے تھے، مگر اُن کے اندر چھپی نرمی کا اندازہ صرف وہ ہی لگا سکتا تھا جو
اُس کی شخصیت کی گہرائی کو جانتا ہو۔

کیتھرین اور گستا نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، گویا وہ گونار کے اس پُر اسرار انسان کے
اندر سے اُبھرتی ہوئی اس غیر متوقع شفقت پر یقین نہ کر پا رہے ہوں۔

گونار کی سختی کے اندر چھپی نرمی نے دونوں کو الجھا دیا تھا، جیسے وہ کسی بے پناہ طاقتور شخصیت کی نرم جھلک
دیکھ رہے ہوں۔

گونار اپنی جگہ سے اٹھا اور مدھم قدموں سے وہاں سے پلٹا اس کی حرکات میں ایک سرد اور بے نیازی بھری وقار تھی، جیسے وہ دنیا کے سامنے اپنے ہر عمل کو جانچ کر، اُس پر گرفت رکھتا ہو۔

اُس کے ہر قدم میں ایک خاموش مگر پر اثر طاقت تھی، جیسے وہ اپنے ارد گرد کی فضا پر بھی اپنا اختیار رکھتا ہو۔ جیسے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھا، اُس کا وجود کمرے کی خاموش فضا میں ایک غیبی اثر ڈال رہا تھا۔

لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات سخت ہو گئے، اور اُس کی آنکھوں میں ایسی گہرائی پیدا ہوئی جو کسی بھی عام انسان کو لرزادے۔

گونار نے ایک سرد، محتاط لہجے میں کہا، ”اور یاد رکھو، اسے صرف ہمارے درمیان رکھنا۔ یہ راز کسی اور کے سامنے ظاہر نہیں ہونا چاہیے، ورنہ انجام بہت بھیانک ہو گا۔“

اُس کی آواز میں وہ انتباہ تھا جس نے فضا کو تنہا بنا دیا، جیسے اُس کی شخصیت کے اندر چھپے ہوئے سرد دل نے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ اُس کے الفاظ میں ایک غیر متزلزل، پُر تاثیر طاقت تھی جو کسی کے بھی دل کی دھڑکنوں کو روک سکتی تھی۔

گونار نے اُن دونوں کو ایک آخری گہری نظر ڈالی، پھر خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اُس کا ہر قدم جیسے زمین پر نقش چھوڑ رہا تھا، اور جیسے وہ دنیا کے رازوں کا واحد محافظ ہو۔

اُس کی موجودگی کمرے میں ایسی چھائی ہوئی تھی کہ جیسے وہ اب بھی وہاں موجود ہو، حالانکہ وہ دروازے کے پار جا چکا تھا۔

...°...

جب ہم دہلیز عبور کرتے ہوئے سرور کی پر شکوہ قیام گاہ میں داخل ہوئے، تو یکایک ہال کی رونقیں دمک اُٹھیں۔ اطراف میں سلیقے سے ایستادہ قندیلیں اپنی نرم روشنی بکھیر رہی تھیں، اور ہال کا ہر گوشہ اُس روشنی میں گویا نہاسا گیا تھا۔

دائیں سمت ایک وسیع و عریض جھروکہ آراستہ تھا، جو باہر کی دنیا کا دلکش اور سحر انگیز منظر پیش کر رہا تھا۔ سرور، جو بظاہر اپنی ذات میں جادو کا پیکر معلوم ہوتا تھا، اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی جب اُس نے گل بانو کی جانب دلہن کا لباس پیش کیا۔

اُس کے لبوں سے ادا ہونے والے الفاظ نرم تھے، مگر اُن میں ایک عجیب تسلی چھپی ہوئی تھی۔ ”ہمارا نکاح کل دوپہر کو طے ہے، فکر نہ کرو، ہر معاملہ بخیر و خوبی انجام پائے گا۔“ گل بانو، جس کی شکل اُس لمحے جیسے نرم و نازک روئی کی مانند لگ رہی تھی، نے ہلکے سے سر کو اثبات میں جنبش دی اور لباس تھام لیا۔

سرور کی آنکھوں میں ایک گہری محبت بھری شدت تھی، جیسے وہ اُس لمحے کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں قید کرنا چاہتا ہو۔

مگر اُس لمحے میں ایک بے وقت دروازہ کھلنے کی آواز نے خلل ڈال دیا، اور مرید کی عجلت آمیز آمد نے فضا کو بو جھل کر دیا۔ سرور کی نظریں حیرت سے مرید پر جم گئیں، جس نے خاموش نگاہوں کے تبادلے کے ذریعے کوئی اہم پیغام پہنچانے کی کوشش کی۔

گل بانو، جو اس بے ساختہ مکالمے کی نزاکت کو بہ خوبی سمجھ رہی تھی، فوراً معاملے کی باریکی کو محسوس کر گئی۔ اُس نے مولوی سرور کی طرف ایک نازک انداز سے دیکھتے ہوئے کہا، ”میں اب اجازت چاہوں گی۔“

سرور نے اپنے لبوں پر ایک پُر سکون اور مطمئن مسکراہٹ سجاتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا، ”بے شک، رخصت ہو، کل ایک یادگار دن کی نوید دے رہا ہے۔ آرام کرو، صبح تمہاری منتظر ہے۔“

یہ کہتے ہوئے سرور نے اپنے ہاتھوں کو پیچھے باندھ لیا اور ایک لمحے کے لیے سوچ میں گم ہو کر ٹیلی کاؤنٹر کا بٹن دبا دیا۔

اُس کی نظریں گل بانو پر جمی رہیں، اُس وقت تک جب تک وہ آہستہ آہستہ اُس کی نگاہوں سے او جھل نہ ہو گئی، اپنی دلکش اور پُر وقار چال میں ملبوس، جیسے اُس ہال کی روشنی اُس کے قدموں تلے بجھتی جا رہی ہو۔

جیسے ہی گل بانو کے قدم مولوی سرور کی قیام گاہ سے باہر نکلے، فضا میں ایک گھٹن سی چھا گئی۔ ہال کی روشنیاں مدھم پڑنے لگیں، جیسے ان کی چمک گل بانو کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی ہو۔ مولوی سرور نے اپنی آنکھوں کو ذرا سامونڈتے ہوئے ایک گہری سانس لی، پھر اچانک اپنے مرید کی طرف مڑا۔

اُس کی آنکھوں میں یکخت سختی ابھر آئی، اور اُس کا چہرہ جیسے اندھیرے کے سایوں میں ڈھل گیا۔

۔ ”نظر نہیں آتا تھا کہ میں اپنی محبوبا کے ساتھ مصروف ہوں؟“ سرور کی آواز میں ایک غضب کی لہر دوڑ گئی، جیسے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔

اُس کی نگاہیں مرید کے وجود کو جھلسا دینے والی حد تک سرد تھیں۔ مرید لرزتے ہوئے اور شرمندگی کے بوجھ تلے دبے ہوئے، سر جھکائے کھڑا تھا۔ اُس کے ہونٹ لرزتے تھے جیسے الفاظ کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوں۔

”استاد، میں آپ سے دلی معافی چاہتا ہوں... میرا مقصد صرف آپ کی بے چینی دور کرنا تھا...“ مرید کی آواز میں خوف اور ندامت کی آمیزش تھی، جیسے وہ اپنے وجود کو پگھلتے ہوئے محسوس کر رہا ہو۔

سرور کا چہرہ یکدم نرم پڑا، مگر اُس نرمی کے پیچھے اب بھی خطرناک سا سکوت چھپا ہوا تھا۔ اُس نے دھیمے، مگر پراسرار لہجے میں پوچھا، ”کیا جو میں نے کہا تھا، وہ ہو گیا؟“ الفاظ جیسے فضا میں معلق ہو گئے، ان کے گرد ایک غیر یقینی اور پراسرار خاموشی چھا گئی۔

مرید نے ایک لمحے کو توقف کیا، اور پھر اعتماد کے ساتھ قدم آگے بڑھایا۔ اُس نے سر اٹھا کر مولوی سرور کی جانب دیکھا، اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی، جیسے اُس نے کوئی راز پالیا ہو۔ ”جی استاد، میں نے قربانی کا نذرانہ تلاش کر لیا ہے۔“ مرید کی آواز میں ایک عجیب سا خوفناک جوش تھا، جیسے وہ کسی بھیانک فتح کا اعلان کر رہا ہو۔ ”جتوئی کی بیٹی!“

یہ نام سنتے ہی مولوی سرور کا چہرہ ایک دم سیاہ ہو گیا، جیسے اندھیرے کی لکیریں اُس کے ماتھے پر گہرائی سے کھنچ گئی ہوں۔ ”وہ؟“ اُس کی نظریں جھک گئیں، جیسے وہ کسی نہ ختم ہونے والی سوچ میں غرق ہو گیا ہو۔ اُس نے ہلکی سی تلخی سے کہا، ”اُس لڑکی کی قربانی کون قبول کرے گا؟ وہ تو خود شیطان کی پیروکار ہے۔“

مرید، مولوی سرور کی ناگواری کو بھانپتے ہوئے، فوراً اپنا سر جھکا لیا۔ اُس کی تمام حوصلہ افزائی سرور کی سختی کے سامنے دم توڑ گئی تھی۔

اچانک، مولوی سرور نے ایک شدید اشارہ کیا اور مرید کو روک دیا۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے یکدم ساکت ہو گیا، جیسے کسی غیبی دنیا سے کوئی پیغام وصول کر رہا ہو۔ پل بھر میں اس کے خیالوں میں، پورے کمرے کی روشنی دھندلا گئی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا، اور ایک پراسرار دھواں اُٹھنے لگا، جس کے سرخ اور سیاہ رنگ کے پیچ دار شاخیں پورے کمرے میں پھیل گئے۔

دھواں جیسے سانپوں کی طرح فضا میں لپٹنے لگا، اور سرور کے ارد گرد کا منظر خواب اور حقیقت کے بیچ کہیں گم ہو گیا۔

”ایمان کو میرے لیے قربان کر دو...“ ایک گونجتی ہوئی مذموم آواز فضا میں سرور کے لبوں سے نکلی، جیسے کوئی غیبی قوت اُس سے بات کر رہی ہو۔ ”میں اُس کی قربانی کے لیے ترس رہا ہوں... اگر تم اسے پیش کرو گے، تو تمہیں دائمی مہلت ملے گی... کوئی جن، کوئی آسیب تم پر حملہ نہیں کرے گا...“ آواز میں ایک عجیب سا شیطانی طنز تھا، جیسے وہ مولوی سرور کو اُس کی تقدیر سونپ رہا ہو۔

- ”مجھے اس کی قربانی چاہیے۔“

یہ الفاظ جیسے موت کا حتمی فرمان تھے، جن میں ایک بھیانک سنسناہٹ تھی۔ ”ناکامی تمہاری موت کا سبب بنے گی۔“ مولوی سرور کی آنکھیں پلک جھپکتے ہی کھل گئیں، اور اُس کے ماتھے پر پسینے کے موتی ابھر آئے۔

وہ ایک لمحے کے لیے لرزا، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُس کی پیشانی پر شکنیں گہری ہو گئیں، جیسے وہ ایک ناگوار سچائی کو قبول کرنے کے لیے مجبور ہو گیا ہو۔ ”شیطان اُس شیطانی لڑکی کی قربانی کیوں مانگ رہا ہے؟“ اُس نے خود سے سرگوشی کی، ”روزے میں ناچنے، گانے بجانے اور شراب نوشی کے باوجود، اُس کی قربانی کا اصرار کیوں وہ تو شیطان کی پسندیدہ ہونی چاہیے تھی؟“

یہ سوال اُس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گیا، اور اُس کے دل کی دھڑکنیں جیسے لمحے بھر کے لیے تھم سی گئیں۔

سوچوں سے ہٹنے کے بعد سرور نے بے پرواہ انداز میں مرید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”تم نے اسے بلایا تھا؟“

مرید نے جلدی سے سر ہلایا اور بولا، ”جی استاد، جب اس نے سندس میڈم کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ سندس میڈم گھر پر ہیں اور وہ کل شادی میں بھی شرکت کریں گیں۔ پھر میں نے آپ کے بارے میں ذکر کیا تو اس نے جواب دیا کہ ضرور میں بھی آؤں گی۔“

سرور کے لبوں پر ایک خوفناک مسکراہٹ ابھری، جیسے کوئی گہری سازش اس کے ذہن میں پرورش پا رہی ہو۔ اُس نے مرید کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور خوش دلی سے کہا، ”شاباش، شاباش۔“

یہ کہہ کر سرور اپنی روش پر آگے بڑھ گیا، اُس کے جاتے ہی فضا میں کسی غیر مرئی خطرے کا سایہ چھا گیا، جیسے کہ کچھ بُرائی ابھی وقوع پذیر ہونے کو تھی۔

دوزخ کی گہرائیوں سے ابھرتا ایک جلتا ہوا فرشتہ، جس کی آنکھوں میں دوزخی شعلوں کی لَو تھی، اُس منظر پر چھایا ہوا تھا۔ وہ آسمانی مخلوق خاموشی سے سرور کو دیکھ رہی تھی، جیسے کسی مقدر کی نگہبان ہو۔

سرور کے قدموں کی چاپ دھیرے دھیرے فضا میں مدھم پڑ گئی، اور ساتھ ہی وہ فرشتہ بھی کسی غیبی روشنی میں تحلیل ہو گیا، پیچھے صرف ایک پراسرار چمک اور لرزاں خاموشی چھوڑ گیا۔

ایمان کی موت کی سازش، جس کی گونج فضا میں پھیلی ہوئی تھی، ایک عجیب سی ہیبت کا منظر پیش کر رہی تھی۔

اب ایک سوال نے فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا: کیا ایمان کل اُس شیطانی رسم کا شکار ہو جائے گی جو سرور کی سازش کا حصہ ہے؟ کیا وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں اُس دن لے گی جب اُس کا انجام اُس کے گلے میں موت کا طوق ڈالے گا؟ اُس کی قسمت پر مسلط غیر یقینی پن نے ہر لمحے کو مزید اندوہناک بنا دیا۔

اسلام کی راہ پر اُس کی جستجو، جو ابھی ادھوری تھی، ایک بے رحم چیلنج سے دوچار تھی۔ کیا وہ اپنی منزل کو پا سکے گی یا اُس کے خواب وقت کی ریت میں دفن ہو جائیں گے؟ فضا میں معلق اُس کی قسمت کی تاریں لرزتی رہیں، جیسے کوئی انہونی اُسے اپنے چنگل میں جکڑنے کو تیار ہو۔

...°...

جیسے ہی گونا گھرے میں داخل ہوا، روشنی اور اندھیرے کے درمیانی فاصلے کو عبور کرنا محض جسمانی منتقلی نہ تھی، بلکہ فضا میں ایک لطیف تبدیلی تھی، جیسے ماحول خود بخود اُس کی موجودگی کا احساس کر کے بدلنے لگا ہو۔

اب کی بار اُس کا لباس بھی اور زیادہ نمایاں اور نفیس تھا، نرمی سے چمکتا ہوا جو اُس کی شخصیت کو اور زیادہ جاذب نظر بنا رہا تھا۔

اس کی قمیض، جو سکون اور نفاست کے درمیان حیران کن توازن رکھتی تھی، اوپر کے بٹن اتفاقاً کھلے تھے، اور آستینیں سلیقے سے موڑ کر رکھی گئی تھیں۔ اُس کی واسکٹ، جو اُس کی مردانہ وجاہت کو اور اُبھار رہی تھی، اُس کے چوڑے کندھوں پر بے ساختہ ڈھلی ہوئی تھی۔

جیسے ہی اُس نے واسکٹ اتار کر عالیشان صوفے پر رکھی، گونار بیڈ پر جا بیٹھا۔ اُس کی انگلیاں ہلکی سی حرکت کے ساتھ اُس کے چہرے کو چھو رہی تھیں، جیسے کسی گہری سوچ میں غرق ہوں۔

کمرہ خود اُس کی ہر حرکت کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔ جیسے جیسے گونار کی حرکات بدلتی جاتیں، روشنی بھی آہستہ آہستہ اُس کے تاثرات کی پیروی کر رہی تھی، ماحول کو اور زیادہ پراسرار اور پُرکشش بنا رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں بڑے سکون سے کمرے کے کونے کونے میں گھومتی رہیں، ہر عنصر کا گہرا جائزہ لیتے ہوئے، جو افادیت اور جمالیات کی خوبصورت عکاسی کرتا تھا۔

اچانک گونار اپنے بیٹھے ہوئے مقام سے اٹھا اور کھڑکی کی جانب چل پڑا۔ جیسے ہی وہ نزدیک پہنچا، پردے خود بخود پیچھے سرک گئے، اور ایک شاندار منظر اُس کے سامنے آگیا۔

باہر قدرت کا ایک شاہکار بکھرا ہوا تھا، ایک متحرک قوس قزح آبشار کے اوپر چمک رہی تھی، اور پانی کے قطرے ہوا میں رقص کر رہے تھے۔ گونار اب اپنے مخصوص انداز میں رکھی ہوئی راکنگ چیئر پر بیٹھ گیا، اور اُس منظر کو گہرائی سے دیکھنے لگا۔

گرتے پانی کی تال اور فضا میں پھیلی ہوئی روشنی نے کمرے کے اندر ایک عجیب و غریب سکون پیدا کر دیا تھا، جیسے یہ لمحہ کائنات کا حصہ بن چکا ہو۔

گونار کرسی پر جھولتا رہا، اس کی نظریں باہر کے اونچے پہاڑوں پر جمی ہوئی تھیں، اُس کے خیالات ایک پیچیدہ جال کی مانند اُس کے ذہن میں پھلتے جا رہے تھے۔

خاموشی نے جیسے اُس کی آواز کو گھیر لیا ہو، اور پھر اُس نے سرگوشی کی، ”میں گناہوں میں لپٹا ہوا ہوں، لیکن ان لوگوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتا جو مذاہب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایلومیناتی کا حصہ بننا میرا راستہ تھا، لیکن وہ بدلہ لینے کی جستجو میں تھا وہ بدلہ جو میرا حق تھا۔“

اُس کی آواز میں دھیمپن اور مایوسی کا لمس تھا، جیسے وہ خود کو کسی ناقابل فراموش بھنور میں پھنسا ہوا محسوس کر رہا ہو۔

گونار نے پیچھے جھک کر کرسی کی پشت سے سرٹکا دیا، اور اُس کی نظریں چھت پر لٹکے فانوس کی طرف اٹھ گئیں۔ ”میں اس دھندلے علاقے سے کیسے نکلوں؟ خود کو اس اخلاقی دلدل سے کیسے نجات دلا سکتا ہوں؟ موم... ڈیڈ؟“ اُس نے ایک گہری آہ بھری، جیسے اُس کی روح کو اندر سے جھنجھوڑا جا رہا ہو۔

اچانک اُس نے کرسی چھوڑ دی اور تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ پتلون کی جیبوں میں دھنس گئے، اور وہ وہاں کھڑا رہا، جیسے اپنے اندر کی متضاد قوتوں سے جنگ لڑ رہا ہو۔

اُس کے قدم زمین پر جمے ہوئے تھے، ماضی کی پرچھائیوں اور ایک نئی روشنی کے درمیان لڑکھڑاتے ہوئے۔ گونار کا اعتراف فضا میں معلق تھا، اُس کے ماضی کی سیاہی سے داغدار باب اب سامنے آ رہا تھا۔

- ”میں نے گھناؤنے کام کیے ہیں، لڑکیوں کو محض خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنادیا۔“ اُس کی آواز میں تلخی تھی،۔

- ”یہ وہ تاریک وقت تھا جب میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے خود کو تباہ کر لیا۔ وہ اعمال، جنہوں نے میری روح کو سیاہ کر دیا تھا، اب بھی میرے ساتھ ہیں۔“ اُس نے توقف کیا، اُس گہرائی میں کھوج لگاتے ہوئے جس میں وہ ایک بار اپنی مرضی سے ڈوب گیا تھا۔

- ”لیکن پھر،“ اُس نے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا،۔

- ”کچھ بدل گیا۔ میں نے اپنے ماضی کے بوجھ سے نکلنے کی کوشش کی، خواتین کو احترام کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت کو سمجھا۔ اور یہ سب اُس وقت شروع ہوا جب میں نے اُس کی تصویر دیکھی... ایمان کی۔“

جیسے ہی اُس نے ایمان کا نام لیا، کمرے میں ایک غیر مرئی تبدیلی محسوس ہوئی۔ اُس کا نام فضا میں پھیل گیا، جیسے کوئی راز افشا ہو رہا ہو۔

گونار کی نظریں کسی گہرے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھیں، جہاں اُس کی اپنی داستان کے دھاگے آپس میں الجھ گئے تھے۔

- ”میں یہ سب پوری طرح بیان نہیں کر سکتا، شاید یہ اُس کی موجودگی تھی، یا پھر اُس کا چہرہ میری ماں کی طرح تھا... لیکن اُس لمحے، جیسے میری روح میں کچھ ٹوٹ گیا، جیسے صدیوں سے بند ایک دروازہ کھل گیا ہو۔ اُس لمحے میں، پہلی بار، میں نے سمجھا کہ عورت محض جسم نہیں، عزت کی حقدار ہے، احترام کی مستحق

ہے۔ ایمان میرے لیے ایک نشان بن گئی، ایک روشنی، جس نے میرے پتھر جیسے دل میں پہلی دراڑ ڈالی، ایک ایسی دراڑ جس سے انسانیت کی روشنی اندر جھانکنے لگی۔”

اُس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ چھا گئی، جیسے اُس نے اُس تبدیلی کی طاقت کو پہچان لیا ہو جو اچانک اُسے اپنی لپیٹ میں لے آئی تھی۔

اپنے کمرے کی عمیق تنہائی میں، گونار کی روح ایک ان دیکھے ربط کی گرفت میں تھی، جو سات سمندروں اور ان دیکھے فاصلے کی وسعت تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک غیر مرئی کشش، ایک خاموش تبدیلی جو گویا کسی انجانی قوت کے زیر اثر ابھری ہو۔

وہ دھیرے سے، جیسے خود سے مخاطب ہو، اعتراف کرتا ہے، “جس لڑکی نے میرے دل پر قبضہ کر لیا ہے، وہ میرے وجود سے بالکل بے خبر ہے۔ اور میں... میں نے اس کی مقدس کتاب کو جلانے میں حصہ ڈالا۔ اس کی توہین کا مرتکب ہوں... اس کی عقیدت کو پامال کرنے والوں میں شامل ہوں۔”

گونار کا دل ایک عجیب سا بوجھ اٹھا کر دھڑک رہا تھا۔ اُس نے پلٹ کر پلنگ کے قریب سائیڈ ٹیبل کی طرف قدم بڑھایا، دراز کھول کر اُس میں سے ایک تصویر نکالی۔

جیسے ہی اُس کی نظریں تصویر پر پڑیں، اس کے ہونٹوں پر ایک دھیمی، مغموم مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایمان کی تصویر، فریم میں بند، گویا کمرے کے سناٹے میں ایک ہلکی سی گرم جوشی بکھیر رہی تھی۔

گونار نے تصویر کو غور سے دیکھا اور جیسے خود سے سرگوشی کی،

- ”یہ کیسا ناقابلِ فہم تعلق ہے، ایسی ذات سے الفت رکھنا جسے کبھی اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں، جو میری موجودگی سے نا آشنا ہے، میرے دل کے جذبات سے بے خبر ہے۔“

اُس کے چہرے پر اداسی کے سائے گہرے ہوتے گئے، جیسے اُس کا دل خود سے ایک جنگ لڑ رہا ہو۔ محبت کی ایک ایسی تصویر ابھری جو محض ایک خواب تھی، ایک ایسی محبت جو دیکھے بغیر، چھوئے بغیر پروان چڑھی۔

تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے، اُس نے احساس کیا کہ اُس کے جذبات میں تضاد کی ایک عجیب سی کش موجود ہے۔ ایک طرف محبت کی شدت اور دوسری طرف ادراک کہ شاید یہ سب محض ایک سراب ہے۔

گونار نے ایک اور تصویر دراز سے نکالی، یہ تصویر اُس کی ماں کی تھی۔ اُس نے جب اس پر نظر ڈالی تو دل کے اندر ایک طوفان بپا ہو گیا۔

گونار نے اپنی ماں کے سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں کو دیکھا، جو اُس کے سویڈش ورثے کی بھرپور علامت تھیں، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اُس کی ماں کی آنکھوں کی گرمی اور سکون اُسی طرح ایمان کی آنکھوں میں جھلکتا تھا، گو کہ ایمان کی آنکھیں گہری بھوری تھیں۔

- ”یہ کتنا عجیب ہے...“ گونار نے خود سے کہا،۔

- ”میری ماں اور ایمان، دونوں الگ دنیاؤں کی ہیں، لیکن اُن کے چہروں میں ایک حیران کن مشابہت ہے، ایک عجیب سا ربط جو میں سمجھ نہیں پاتا۔ ” اُس کی ماں کا گورا چمکتا چہرہ، ایمان کے پاکستانی ورثے کے ساتھ ایک ناپید مگر گہری نسبت رکھتا تھا۔

ماں کی سنہری زلفیں اور ایمان کی بھوری گھنیری لٹیں، دونوں جیسے دو مختلف جغرافیوں کی نمائندگی کر رہی تھیں، پھر بھی دونوں کے چہروں پر ایک ہی قسم کی نرمی، ایک ہی قسم کی معصومیت تھی۔ جیسے یہ دو مختلف عورتیں ایک ہی سرگزشت کا حصہ ہوں۔

گونار نے دل کی گہرائیوں میں اترتے ہوئے سرگوشی کی، ”ایمان... تمہارا وجود میرے دل کی تاریکی میں ایک روشنی کی کرن ہے۔ شاید یہ محض تمہارا عکس ہے، یا شاید یہ تمہاری مشابہت میری ماں سے... لیکن تم نے مجھے بدل دیا ہے، تم نے میرے دل کے اس پتھر کو پگھلا دیا ہے جس میں کوئی اور رسائی نہیں پاسکا۔“

کمرے میں خاموشی چھا گئی، جیسے ہر چیز گونار کے احساسات کو جذب کر رہی ہو۔

اب کی بار گونار کی آنکھوں میں ایک شدید جذباتی لہر اُٹھ آئی، اور رُندھی ہوئی آواز میں وہ بولا،

- ”موم...“ اُس کی آواز کی گہرائی میں درد اور شدت کی ایک عجیب سی کشش تھی۔ دونوں تصویریں اُس نے احترام سے میز پر رکھ دیں اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا، جیسے اُس کی روح اپنی قسمت کے سامنے جھک رہی ہو۔

اُس کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے تصویروں کے درمیان لرزتے رہے، اُس کی انگلیاں کبھی اپنی ماں کی تصویر کو چھوتی اور کبھی ایمان کی تصویر پر رکتی۔

اچانک اُس نے گویا اپنی تمام تر طاقت کو یکجا کرتے ہوئے سر اٹھایا، اور اُس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی فیصلہ چمکنے لگا۔ اُس کی آواز میں ایک ناقابلِ بیان جنون اور شدت گھل گئی جب اُس نے دل سے ایک آتشیں اعلان کیا، ”ایمان... تم میری ماں، کا عکس ہو۔ تم وہ ہو جسے میرے دل نے ہمیشہ تلاش کیا ہے۔ اور میں... میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے ہر سرحد پار کروں گا۔ میں وقت اور فاصلوں کو مات دوں گا، میں دنیا کو آگ لگا دوں گا، ہر طاقت کو چیلنج کروں گا، کیوں کہ تم صرف میرے لیے ہو، تمہارے وجود پر صرف میرا حق ہے۔“

گونار کے الفاظ میں ایک وحشیانہ عزم تھا، جیسے وہ کسی مقدس جنگ کی قسم کھا رہا ہو۔ ”تم میری تقدیر ہو، ایمان۔ تمہارا نام صرف میرے نام کے ساتھ جڑے گا۔ میں چاہے جس جہنم سے گزر جاؤں، چاہے کتنی ہی رکاوٹیں سامنے ہوں، میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔ تم میری زندگی کی وہ قیمتی روشنی ہو جس کے لیے میں نے ہمیشہ تڑپ محسوس کی ہے۔“

وہ لمحہ گویا فضا میں منجمد ہو گیا تھا، اُس کے دل کی گہرائیوں میں اٹھنے والی پریم دعاؤں کی بازگشت کمرے کی خاموش دیواروں سے ہمکلام تھی۔

گویا اس پل گونار نے دو عالموں کے درمیان ایسا لطیف رشتہ استوار کر دیا تھا جس نے ماضی کی نہاں تلخیوں کو دھندلا کر اُس کے حال کی شدید عاشقی کو غالب کر دیا تھا۔

...°...

ٹی وی لاؤنج میں، جہاں کھڑکی کے باہر جگنوؤں کی نرم چمک ماحول میں ایک عجیب سی روشنی بکھیر رہی تھی، ایمان صوفے پر بیٹھی گہرے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اس کے گھٹنوں کے گرد لپٹے ہاتھ، بالوں کی لٹیں اس کے چہرے پر جھکی ہوئی تھیں، جیسے وہ خود کو دنیا کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔

اُس کی سوچیں ایک نہ ختم ہونے والی جدوجہد کا حصہ بن رہی تھیں، جس میں انصاف کا خواب پل رہا تھا۔
”اگر میں اُن لوگوں کو بے نقاب کر سکوں جو قرآن کی بے حرمتی میں ملوث ہیں،“ اس نے دل ہی دل میں سوچا، ”تو کیا میں ان کے گناہوں کو ایسی آگ میں جلا سکوں گی جس کی چنگاریاں خود اُنہیں بھسم کر دیں؟“

بوڑھا خادم، جو برسوں کے تجربے اور حکمت کا مجسمہ تھا، قریب آیا۔ اُس کی آنکھوں میں فکر تھی، وہ ایمان کے چہرے پر پھیلی گہری سوچ کو بھانپ چکا تھا۔

اُس نے نرم لہجے میں پوچھا، ”مالکن، آپ کے دل میں کیا پریشانی ہے؟ آپ کی آنکھوں میں سوچوں کا سمندر دکھائی دیتا ہے۔“

ایمان نے چونک کر اپنے خیالات سے باہر نکلتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”کچھ نہیں بابا، بس دنیا کی باتیں سوچ رہی ہوں،“ اُس نے آہستگی سے کہا، لیکن اُس کی آواز میں چھپی ہوئی درد بوڑھے خادم سے پوشیدہ نہ رہی۔

بوڑھا خادم ادب سے ایمان کے قدموں میں بیٹھنے لگا، مگر ایمان نے فوراً اُس کا بازو پکڑ کر اُسے اٹھایا، ”بابا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اوپر بیٹھیں۔“

بوڑھے خادم نے عاجزی سے کہا، ”ہم نوکر کہاں مالکان کے ساتھ بیٹھتے ہیں بیٹا، یہ تو ہماری حیثیت ہی نہیں ہے۔“

ایمان نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے نرمی سے جواب دیا، ”نہیں بابا، اللہ کی نظر میں سب برابر ہیں۔ آپ بھی میری طرح انسان ہیں۔ ایسی بات مت کریں۔“

بوڑھا خادم ایمان کے برابر بیٹھا، لیکن اُس کے دل میں ایک گہرا خیال ابھر رہا تھا۔ اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایمان کی طرف دیکھا اور بولا، ”بیٹا، آپ کے دل میں کوئی بہت بڑا بوجھ ہے، بتائیں، کیا سوچ رہی تھیں؟“

ایمان نے ایک گہرا سانس لیا، اُس کی نظریں ایک لمحے کے لیے جھولے کی زنجیروں پر ٹھہر گئیں، جن سے وہ غیر ارادی طور پر کھیل رہی تھی۔ ”میں عید کی خوشیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی بابا۔ پہلی بار عید

منانے جارہی ہوں، اور مجھے ابھی اسلام کے بارے میں بہت کچھ سیکھنا باقی ہے۔ لیکن اب جب یہ بے حرمتی ہو رہی ہے، تو دل میں وہ خوشی بھی ماند پڑ گئی ہے۔”

بوڑھے خادم نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں موجود درد کو سمجھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا، ”بیٹا، دشمن یہ ہی چاہتے ہیں کہ ہم غم میں ڈوب جائیں، کہ ہماری عید کی خوشیاں ماند پڑ جائیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کو جلانے سے ہمیں توڑ دیں گے، لیکن وہ نہیں جانتے کہ قرآن تو ہمارے دلوں میں ہے۔ ایک قرآن جلائیں گے تو ہزار اور وجود میں آئیں گے۔ اللہ کا کلام کبھی ختم نہیں ہو سکتا، نہ ہی ہمارے دلوں سے مٹ سکتا ہے۔”

خادم کے الفاظ ایمان کے دل میں اترتے گئے، جیسے اُس کے اندر چھپے غم کو تسلی دے رہے ہوں۔ بوڑھا خادم اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا، ”عید اللہ کا انعام ہے بیٹا، اور ہم اسے شیطان کے ہاتھوں ماند نہیں ہونے دیں گے۔ جو لوگ قرآن کی بے حرمتی کر رہے ہیں، ان کا حساب اللہ کے سامنے ہو گا، اور ہمیں یہ یقین رکھنا ہے کہ جو غلط کرے گا وہ اس چیز کا حساب ضرور دے گا۔”

ایمان کی نرم مسکراہٹ، جیسے وہ ایک لمحے کی گہرائی میں ڈوبی ہو، ہونٹوں پر آکر رُک گئی، اور اُس نے دھیرے سے سوچا، ”جب اسلام محبت اور اخوت کا پیامبر ہے، تو آخر اسلام کے دشمن کیوں ہیں؟“ اس سوال کا وزن جیسے اُس کے وجود پر بوجھ ڈال رہا تھا۔

بوڑھے خادم نے اپنی پیشانی کی جھریوں میں برسوں کی دانش اور تجربے کی پرچھائیاں سجاتے ہوئے، نہایت متین انداز میں جواب دیا، ”بیٹی، پتھر ہمیشہ اُس درخت کو لگتے ہیں جس پر پھلوں کا رس ہوتا ہے، اور جتنا درخت سرسبز ہو، اُتنا ہی زیادہ نشانہ بنتا ہے۔“

اس کے الفاظ میں ایک بے کراں سچائی چھپی ہوئی تھی، ایک ایسی حقیقت جو زندگی کے ہر موڑ پر کسی نہ کسی صورت میں عیاں ہوتی ہے۔

بوڑھے خادم کے الفاظ ایمان کے دل میں گونجتے رہے، جیسے وہ اُس کے اندر پوشیدہ کسی گہرے راز کو جاننے کی اجازت دے رہے ہوں۔

جیسے ہی وہ بوڑھا خادم اپنی نشست سے اٹھا، ایمان کی آنکھوں میں ایک لمحہ بہ لمحہ تذبذب ابھر آیا، ایک ایسا لمحہ جس میں وہ جیسے کسی بھولی ہوئی یاد کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

اُس کے دل میں ایک سوال بار بار گونجتا تھا، ”جنت کی کنجی کیا ہے اور اس کا دل کے سکون سے کیا تعلق ہے؟“

یہ سوال اُس کے شعور کے کسی دور افتادہ گوشے میں ہمیشہ سے متمکن تھا، مگر جب بھی وہ اس کا جواب پانے کی جستجو کرتی، سوال گویا اُس کے ذہن کی سطح سے لغزش کھا کر معدوم ہو جاتا۔

صبح کے وقت جب وہ یوٹیوب پر اس سوال کا جواب تلاش کر رہی تھی، تب بھی وہی سوال اُس کے حافظے کی گرہوں سے نکل کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

بوڑھے نے ایمان کے دل کی کشمکش کو بھانپتے ہوئے اُس کی روانگی روک دی، اُس کے چہرے پر غور کرتے ہوئے نرمی سے پوچھا، ”کیا بات ہے بیٹی؟ تمہاری آنکھوں میں کوئی فکر دکھائی دے رہی ہے۔“

ایمان کی نظریں زمین کی طرف جھک گئیں، اُس کے وجود میں جیسے کوئی اندرونی کشمکش جاری تھی۔ پھر اُس نے گردن اٹھا کر اپنے گرد و نواح کو دیکھا، اور گویا اپنے بھولے ہوئے سوال کو دوبارہ پکڑنے کی کوشش کی۔

اُس کا ذہن جیسے ایک ایسی تلاش میں مصروف تھا جو اُسے خود بھی سمجھ نہ آئی تھی۔ اُس نے بوڑھے کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں گہری پریشانی تھی۔

۔ ”ایک سوال تھا...“ ایمان نے ہچکچاتے ہوئے شروع کیا،۔

- ”ایک سوال جو میرے دل میں تھا، جس کا جواب میرے لیے بہت اہم تھا۔ لیکن... جیسے ہی میں نے اسے سوچا، وہ سوال میرے ذہن سے پھسل گیا۔ اب میں اُس سوال کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، کیوں کہ اس کا جواب میرے لیے بہت اہم ہے۔“

بوڑھا خادم، جو علم کی جستجو اور اُس کی گہرائی کو بخوبی سمجھتا تھا، خاموشی سے ایمان کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا کے انداز میں بولا، ”اللہ تمہیں تمہارے سوال کا جواب اُس وقت عطا کرے گا جب وہ خود چاہے گا۔ بعض اوقات جو سوال ہمارے دل میں ہوتا ہے، اُس کا جواب قدرت خود اپنے مقرر کردہ وقت پر ظاہر کرتی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے بوڑھا خاموش ہو گیا، لیکن اُس کے الفاظ میں ایک سکون بخش یقین تھا جو ایمان کے دل میں اترتا چلا گیا۔ شاید وہ سوال، جو اُس لمحے بھول گیا تھا، اللہ کی طرف سے ایک آزمائش تھی، جو اُس کی جستجو کو مزید تقویت دے رہی تھی، اور اُس کے ایمان کی آزمائش کر رہی تھی۔

...°...

گونا گونا گونے اپنے ہاتھ میں موجود فریم شدہ تصویروں کو گہری نظروں سے دیکھا، جیسے وہ ان میں چھپے رازوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اچانک، ایک مدھم سی گڑگڑاہٹ نے کمرے کی خاموشی کو چیر دیا، جس سے اس کی توجہ بستر کی سمت مبذول ہوئی۔

اس کے چہرے پر لمحاتی سنجیدگی کی لہر دوڑ گئی، اور اس نے نرمی سے تصویروں کو دراز میں رکھ دیا۔ مقصد کے ساتھ اٹھتے ہوئے، وہ لیپ ٹاپ کو ہاتھ میں لے کر بستر پر جا بیٹھا۔

اسکرین کی مدھم روشنی اس کے ارادوں کی تاریکی کو عیاں کر رہی تھی۔ اس کی انگلیاں کی بورڈ پر رقص کرنے لگیں، اور آنکھیں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر جم گئیں، جہاں وہ ڈارک ویب کے پوشیدہ گوشوں میں اتر گیا۔

کچھ لمحوں بعد، ایک خفیہ جی میل اکاؤنٹ کھل گیا، اور اس نے انتہائی احتیاط سے پیغامات کو رازداری کی تہہ میں چھپایا۔ اسکرین پر نمودار ہونے والے ایک پیغام نے اُس کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیا، ”کل مسلمانوں کی خوشی کو ماتم میں بدلنے کا دن ہے۔“ یہ منحوس الفاظ کمرے کی فضا میں معلق ہو گئے، ماحول کو ایک پراسرار کیفیت میں ڈھانپتے ہوئے۔

گونار نے گہرے غور و فکر کے ساتھ پیغام میں دی گئی ہدایات کو اپنے اندر جذب کیا، ”کل تم ہمارے بندے کے ساتھ رہو گے اور اسے کور کرو گے۔“

خفیہ انداز میں، گونار نے مختصر اور ٹھنڈے انداز میں جواب دیا، ”آئی ایم ان۔“

لیپ ٹاپ بند کرتے ہی ایک بو جھل آہ اس کے سینے سے نکلی، اور وہ ایک لمحے کے لیے اپنے اندرونی اضطراب میں ڈوب گیا۔ اُس کے ذہن میں صحیح اور غلط کی کشمکش نے ایک طوفان برپا کیا، اور اس نے اپنی ناراضگی کو صرف مذہبی اختلافات پر بنیاد دینے کے جواز پر سوال اٹھایا۔

پچھتاوے کی ایک سرد لہر اُس کے دل میں دوڑ گئی، اور اُس نے خود سے سرگوشی کی، ”مجھے انسانیت سے نفرت ہے، مذہب سے نہیں۔ کیوں کہ ہر مذہب محبت اور دیانتداری کا درس دیتا ہے، اور اسلام جتنا مجھے معلوم ہے، محبت اور حق پرستی کا پیغام دیتا ہے۔“

اپنے سر کو اپنے ہاتھوں میں گرائے، وہ انسانیت کو درپیش بڑے مسائل پر سوچتا رہا۔ گونا گونا نے تلخی سے سوچا، ”مسئلہ پیسے، خوراک، یا زمین کی کمی کا نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے ان چیزوں پر قبضہ ایسے ظالموں کو دے دیا ہے جو اپنی طاقت کی ہوس میں مبتلا ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انسانیت کی فلاح کے بجائے قوموں میں فساد اور بد عنوانی کو پروان چڑھاتے ہیں، اور یہ سب سیکرٹ فیملیز، صیہونی خاندان، جو دنیا کا ۹۹ فیصد پیسہ اپنے قبضے میں رکھتے ہیں، کے ذریعے ہوتا ہے۔“

یہ خیالات گونا گونا کے اندرونی تضاد کو مزید گہرا کر رہے تھے، جیسے وہ خود سے جنگ لڑ رہا ہو۔

کمرے کا دروازہ ایک آہستہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا، فضا میں پر اسرار خاموشی مزید گہری ہو گئی۔ ایک چمکتی ہوئی ایل ای ڈی لائٹ جو پہلے ہلکی سی روشنی پھیلا رہی تھی، گونار نے فوراً بجھادی۔

کمرے میں چھائے سائے مزید گہرے ہو گئے، جیسے کوئی ان دیکھے خوف کا احساس بھڑک رہا ہو۔

دروازے کی دہلیز پر، ایک حیرت انگیز سویڈش لڑکی نمودار ہوئی، جس کی موجودگی میں ایک خاموش لیکن طاقتور جاذبیت تھی۔

اس کے کندھے پر پڑے بھورے بال گویا شام کے آسمان پر بادلوں کی طرح بہہ رہے تھے۔ وہ نازک قدموں سے بیڈ کی طرف بڑھی اور کنارے پر بیٹھتے ہی ہونٹوں پر ایک دھیماسا مسکراہٹ نمودار ہوئی، جس میں رازوں کی دبیز تہہ چھپی ہوئی تھی۔

اس کے چہرے کی معصومیت میں پوشیدہ ایک انجان سی چمک تھی، جو اس لمحے کو مزید اسرار میں ڈھال رہی تھی۔

کمرے کی گھمبیر خاموشی میں گونار دھیرے سے اپنی نشست سے اٹھا، جیسے رات کے سنائے میں کوئی بے آواز قدم رکھ رہا ہو۔

اس کی قد آور اور چوڑی قامت، جس پر سیاہ قمیض تنی ہوئی تھی، سایوں میں ایک ہیبت ناک حسن بکھیر رہی تھی۔ اس کی حرکات میں ایک عجیب سی طمانیت تھی، جیسے وہ ہر لمحے کا مالک ہو۔

اُس نے دانستہ طور پر اپنی قمیض کے بٹن کھولنا شروع کیے، اور جیسے ہی کالر ڈھیلا ہوا، اُس کے کسرتی جسم کے خدو خال اندھیرے میں نمایاں ہونے لگے۔

اُس کی چوڑی پشت پر بناسیہ سانپ کا ٹیٹو دھیرے دھیرے روشنی کے ساتھ ابھرا، گویا تاریکی کی گہرائیوں سے کوئی عفریت اپنا سراٹھارہا ہو۔

ٹیٹو کا ہر خم اور ہر لائن اُس کے پٹھوں کی پیچیدگیوں میں چھپے رازوں کو بیان کر رہا تھا، جیسے اُس کی ذات کی ایک داستان ہو، جو دنیا کی نظروں سے اوجھل تھی۔ اُس کے جسم پر پھیلے مختلف ٹیٹوز ایک عجیب سی پراسرار زبان میں بات کر رہے تھے، جیسے ہر نقش کے پیچھے کوئی پرانی کہانی چھپی ہو۔

اُس نے آہستگی سے لڑکی کی جانب قدم بڑھایا، جیسے ہی گونار اُس لڑکی پر جھکنے کے قریب تھا، اس کے چہرے کی پوشیدہ خوبصورتی عیاں ہونے لگی، اور اس کی نرم، پرکشش خدو خال رات کی روشنی میں کسی

نازک عکس کی مانند جھلملانے لگیں۔ یہ وہ فیصلہ کن لمحہ تھا جب گونار نے بے ارادہ طور پر اپنے دل کے دروازے ایمان کی حاکمیت کے سپرد کر دیے، جیسے وہ خود بھی بے خبر تھا کہ اُس کی روح کی لگام کسی اور کے ہاتھوں میں دی جا چکی ہے۔

جیسے ہی وہ اُسے گلے لگانے کے قریب پہنچا، اچانک اُس کے چہرے پر خوف کے آثار لرزنے لگے، جیسے کوئی مدھم مگر دردناک یاد اچانک زندہ ہو گئی ہو۔

جذبات کی بھری ہوئی موجیں اُس کے دھیمے اور خود اعتماد طرز عمل کی دیواروں کو توڑنے لگیں۔ ایک لمحے کی اضطرابی کیفیت میں اُس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، جیسے کوئی نجات کی راہ تلاش کر رہا ہو، پھر دفعتاً سیدھا ہوا، اور عجلت میں اپنی قمیض کے بٹن بند کرنے لگا۔

گونار کے اس اچانک بدلے ہوئے رویے نے لڑکی کو گہرے شک میں مبتلا کر دیا۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی نے جنم لیا، مگر گونار اپنی ہی سوچوں میں گم، بے رحمی سے بولا، ”باہر جاؤ!“ اُس کے لہجے کی سختی نے لڑکی کے دل میں خوف کی لہر دوڑائی، مگر وہ ابھی تک منحصرے میں تھی۔

لڑکی نے تھوڑا ہچکچاتے ہوئے نگاہیں جھکائیں اور دھیرے سے سر ہلایا، جیسے وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ”جاؤں؟“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

گونار کی بے چینی اس کے غصے میں بدلنے لگی۔ اُس نے تیزی سے رخ بدل کر اُس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھا اور اپنے لہجے کو مزید سخت کرتے ہوئے کہا، ”فوراً نکلو!“۔

لڑکی نے غصے سے بھری آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا، دل میں تاؤ کھاتے ہوئے، اور بھاری قدموں سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

گونار نے فوری طور پر اپنی توجہ ایل ای ڈی اسکرین کی جانب مرکوز کی۔ ریموٹ کا بٹن دبانے کی دیر تھی کہ اسکرین روشن ہو گئی اور اس کی روشنی نے کمرے کے پرسکون اندھیرے کو پھاڑ کر رکھ دیا۔ گونار کے چہرے پر پھیلی ہوئی الجھن کی لکیریں اس کے ذہنی اضطراب کی غمازی کر رہی تھیں۔ یہ انہی مبہم لمحوں میں تھا کہ گونار نے اپنے آپ کو ماضی کی یادوں اور جذبات کے الجھے ہوئے ریشوں میں جکڑا ہوا پایا، جیسے وقت اور فاصلے کی قید سے آزاد ہو کر کوئی نہایت قدیمی اور پراسرار تعلق قائم ہو چکا ہو۔

اسکرین کی چمک نے کمرے میں ایک دوسری دنیا کی جھلک ڈالی، جب کہ گونار کی گہری اور متفکر نگاہیں اس پر جمی رہیں۔

ایمان کی تصویر کے نمودار ہوتے ہی گونار کے دل میں بے چینی اور بے یقینی کے طوفان اُبھرنے لگے۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی ہلکی سی حیرت اس کے اندرونی ہنگامے کا عکس پیش کر رہی تھی۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“ گونار نے خود سے زیر لب سرگوشی کی، جیسے کوئی پراسرار معمہ حل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ایمان کے چہرے کی ہو بہو مشابہت نے گونار کو ماضی کی دھند میں ڈوبا ہوا محسوس کروایا۔ ہر لمحہ، اس کے دل میں ایک عجیب سی کشمکش جاری تھی۔

ایمان کی جھلک گونار کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے ماضی کے راگ کو بیدار کر رہی تھی۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا، ”یہ لڑکی موم سے اتنی مشابہت کیسے رکھتی ہے؟“۔

گونار کی آنکھوں میں ماضی کی تصویریں ابھرنے لگیں اور اس کا ذہن اس ناقابل یقین حقیقت کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ اس لمحے کی پیچیدگی نے کمرے کو ایک پراسرار خاموشی میں ڈوبا دیا تھا، اور کمرے کی دیواروں پر پھیلتی روشنی گونار کی ذہنی کشمکش کو نمایاں کر رہی تھی۔

اچانک، اس کے دل میں ایک طوفان اُٹھا۔ اُس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں دفن کر لیا اور اس لمحے کے وزن تلے دب گیا۔ ایک گہری اور بھاری آہ اس کے لبوں سے نکلی۔ ”میں نے کیا کیا؟ میں نے دوسروں کی نظروں میں اپنے آپ کو ایک ظالم بنا لیا۔ کیا میں نے اپنی ماں کی تعلیمات کی تذلیل کی؟“ گونار کی آواز میں ندامت اور خود شناسی کا رنگ نمایاں تھا۔

اس نے آہستہ سے سر اٹھایا اور دل ہی دل میں بڑبڑایا، ”اس سوسائٹی میں شامل ہونے کا مقصد اپنے والدین کا بدلہ لینا تھا، مگر اس نے مجھے اس شیطان میں بدل دیا جس سے میں نفرت کرتا تھا۔“ اس کے لبوں سے نکلے ہوئے الفاظ کمرے میں گونجنے لگے، جیسے اس کے دل کا بوجھ ایک اعتراف میں ڈھل رہا ہو۔

گونار نے ایک لمحے کے لیے رُک کر اپنی ماں کی ہدایات کو یاد کیا، اس کی آواز میں ایک لرزش پیدا ہوئی،
”موم نے مجھے ہمیشہ عورتوں کی عزت کرنا سکھایا تھا، چاہے وہ کسی بھی پس منظر سے ہوں۔“ اس کی
آنکھوں میں پچھتاوے کی جھلک نمایاں تھی۔

۔ ”میں ان کی تلقین کو بھول گیا تھا،“ اس نے سرگوشی میں اعتراف کیا، اس کے الفاظ ہوا میں بو جھل لٹک
گئے۔

ایک دھیمی سرگوشی میں، گونار نے دل سے معافی مانگی، ”مجھے معاف کر دیں، موم۔ میں نے آپ کی
توقعات کو توڑا، آپ کا بیٹا ہونے کا حق ادا نہیں کیا۔“ گونار کا دل غم اور پچھتاوے سے بھر گیا، اور اس کی
آنکھوں کے گوشے آنسوؤں سے لبریز ہو گئے۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی نم آنکھوں کو انگوٹھوں کی مدد سے صاف کیا۔ کمرے میں ایک گہری
خاموشی چھا گئی تھی، جیسے گونار کے دل میں سچے پچھتاوے کی گواہی دے رہی ہو۔ اس کی نظریں ایک
مرتبہ پھر ایمان کی تصویر پر جم گئیں، مگر اب وہ تصویر اس کے لیے ایک گہرے ادراک کا ذریعہ بن چکی
تھی۔

گونار کی نظریں کمرے کی حدود سے باہر نکل کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گئیں۔ اس نے دھیرے سے
کہا، ”میں دنیا کی لذتوں اور اندھیروں میں کھو گیا، موم میں نے آپ کی نصیحتیں فراموش کر دیں، مجھے

معاف کر دیں۔ ”اس کی آواز رقت آمیز تھی، اور آنسو اس کے گالوں پر بہتے ہوئے اس کی اندرونی کشمکش کا اظہار کر رہے تھے۔

کمرے کی خاموشی اس کے پچھتاوے کے گہرے نقوش کو مزید گہرا کر رہی تھی، اور گونار کی داخلی جنگ کی شدت نے اسے مزید گہری خاموشی میں دھکیل دیا۔

...°...

ایمان، سیاہ رنگ کی آرام دہ ٹی شرٹ اور پٹیلہ شلوار میں ملبوس، بالوں کی مصنوعی وگ کو چھوڑ کر جو عام طور پر اس کے چھوٹے بالوں کو چھپاتی تھی، قدرتی نظر کا انتخاب کیے ہوئے تھی۔

بالوں کے دوبارہ بڑھنے کے عمل کے باوجود، ایمان کی دلکشی برقرار رہی، جیسے اُس کی شخصیت میں کوئی ناقابل انکار چمک نمایاں ہو، جو دیکھنے والوں کی توجہ اور تعریف کو اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔

کمرہ، دو والٹ کے بلب کی مدھم روشنی میں ڈوبا ہوا تھا، جب کہ کھلی کھڑکیاں رات کی خنک ہوا کو اندر دعوت دے رہی تھیں۔

کھڑکی کے ساتھ ہی اس کا بستر پر سکون نیند کے انتظار میں خاموشی سے موجود تھا، اور کمرے کے کولر کی مدھم گونج ماحول میں ایک نرم سی لوری بُن رہی تھی۔

ایمان بستر پر لیٹ گئی، اور کمرے کی پرسکون فضا نے گویا اپنا سانس روک لیا۔ تاہم، نیند ایک عارضی مہمان ثابت ہوئی، اور خاموشی کے اس لمحے میں بے چینی نے جنم لیا۔

اس کے خیالات کے باریک سائے، کبھی دائیں اور کبھی بائیں، اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے، جیسے وہ کسی خوابوں کے دائرے میں داخل ہونے کی سعی کر رہی ہو۔

رات کا یہ پہر اس کے لیے ایک آزمائش بن گیا تھا؛ کیوں کہ وہ عام طور پر صبح کی روشنی میں سکون تلاش کرتی تھی۔ ایک پراسرار اور خطرناک ماضی کی یادیں رات کی خاموشی میں در آئی تھیں، جو اس کے لیے ناپسندیدہ ہمسفر بن گئی تھیں۔

۔ ”اب جب کہ میں نے آصف سے اپنا انتقام لے لیا ہے، پھر بھی نیند کیوں نہیں آتی؟ مجھے تو سکون سے سونا چاہیے تھا!“ اس نے اپنے دل میں سوچا۔

اپنے پہلو میں کروٹ بدلتے ہوئے، ایمان نے اپنے ہاتھ اپنے گالوں کے نیچے رکھ دیے اور اس کی نظریں دیواروں پر موجود سایوں کے لطیف کھیل پر جم گئیں۔

ایک عزم بھری پلک جھپکنے کے ساتھ، اس نے اپنے خیالات کو تھام لیا ”اگر میں آج رات سو جاؤں، تو کل کی عید بہتر گزرے گی۔“

اچانک نیچے گیٹ کی کریک نے کسی کار کے آنے کا اشارہ دیا، اور اس کا انجن خاموش ہو گیا۔ قدموں کی بازگشت رات کی خاموشی میں گونجنے لگی، جیسے کوئی ناپسندیدہ آمد ہو رہی ہو۔

کار کے دروازے کے بند ہونے کی آواز گونجی، اور داخلی دروازے پر زور دیا گیا۔ ایمان، اپنے اوپر والے کمرے میں، نیچے کی آوازوں سے بے چین ہو کر سیدھی بیٹھ گئی۔

”پتہ نہیں وہ سوال مجھے پہلے کیوں یاد نہیں آیا کہ میں بابا سے کر لیتی۔ اے اللہ! کل میں اس سوال کو آپ کی بارگاہ میں یاد کر لوں گی۔ اور سندس سے اس کا جواب بھی طلب کروں گی۔ اب مجھے اسلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔“ اس نے خود سے سرگوشی کی، اور اس کی آواز میں عزم صاف جھلک رہا تھا۔

ہال کا دروازہ کھلا، اور نیچے ہونے والے گفتگو کے ٹکڑے ایمان کے کمرے تک پہنچے۔ ”خریداری اچھی رہی نہیں؟“ عنایہ نے پوچھا۔۔۔

”امی کا لباس بہتر ہے،“ عبیرہ نے جواب دیا۔

خالدہ کا قہقہہ گونجا، ”ظاہر ہے، لباس کس کا ہے، خالدہ کا؟“ اس کے لہجے میں فخر تھا۔ ہنسی کی یہ آوازیں آہستہ آہستہ مدھم مدھم ہو گئیں، جیسے رات کی خاموشی نے انہیں اپنے اندر جذب کر لیا ہو۔

ایمان سرک کر اپنے ہیڈ بورڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، اور اس کے موبائل فون کی مدھم روشنی اس کے چہرے کو منور کرنے لگی۔ ایک ہلکے لمس کے ساتھ، اس نے انسٹاگرام کھول لیا۔

ڈیجیٹل دنیا میں، جہاں کنکشن محض ورچوئل ہوتے ہیں، ایمان نے کسی کی پیروی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، مگر اکثر اوقات خود کو مونیٹرز کی پروفائل پر جانے سے باز نہ رکھ پاتی تھی۔

آج کی رات بھی انہی مواقع میں سے ایک تھی۔

جب ایمان نے مونیٹرز کی انسٹاگرام سٹوری دیکھی، تو وہ خود کو ایک فیسٹیول کی رنگین دنیا میں پایا — یہ ٹرانس جینڈر کمیونٹی کے لیے ایک جامع جشن تھا۔

رنگوں کی بہار کے درمیان، ایک شخصیت نے ایمان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی — مونیٹرز نے خود کو ایک عورت کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص کھڑا تھا، جس کے گھنگریالے بال، باریک داڑھی، اور نسوانی بھیس نے ایمان کو حیران کر دیا تھا۔

میک اپ اور زیورات سے سچی ہوئی یہ شکلیں لعنتی اور خوفناک نقوش کا مجموعہ تھیں، جنہوں نے ایمان کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔

جیسے ہی ویڈیو آگے بڑھی، ایک فلٹر کی طرح کھلا، جو جہنم کی آگ کی یاد دلاتا تھا۔ مونیز اور اس کا ساتھی جہنم کے بارے میں طنزیہ انداز میں بول رہے تھے، ”خدا نے مجھے جہنم میں ڈال دیا ہے، بچاؤ! میں جہنم میں ہوں، خدا، مجھے بچاؤ! یہ اللہ مجھے جلا، رہا ہے اوو آ آ میں قوم لوط کے ساتھ ہوں دیکھو مجھے پتھر پڑ رہے ہیں“ دونوں ہاتھوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے جہنم کی منظر کشی کر رہے تھے۔

قہقہے اور تالیاں ان کی باتوں کا جواب دے رہے تھے، جیسے اس بے سرو پا اور تمسخر آمیز حرکت میں کوئی دلچسپی ہو۔ مایوسی کے طوفان میں گھرے ہوئے، ایمان نے ضبط کے عالم میں اپنے جبرے بھیج لیے۔

طنز کی تلخی برداشت نہ کر پائی، اچانک اپنے موبائل کو بند کرتے ہوئے بڑبڑائی، ”جب تم مرو گے، تب جہنم کی حقیقت تمہیں سمجھ آئے گی۔ تب چیخنا کہ جہنم سے بچاؤ، جاہل انسان!“۔

مونیز ان لوگوں کا مذاق اڑا رہا تھا جو اُسے ناصحانہ انداز میں اللہ کے عذاب اور جہنم کی وعید سناتے تھے۔ ایمان نے موبائل بند کیا اور ایک گہری سانس بھر کر سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

ابھی سکون کا لمحہ آیا ہی تھا کہ موبائل کی گھنٹی نے خاموشی کو توڑ ڈالا، اسکرین پر مونیز کا نام جھلملانے لگا۔ بیزاری سے بھری ہوئی آواز میں ایمان نے کال ریسیو کی، ”ہاں، بھونکو“۔؟۔

دوسری جانب سے مونیز کی جو شیلی آواز آئی، ”انسٹاکھولو!“۔

ایمان کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں اور اس کی نظریں ناگواری سے تنگ ہو گئیں۔ ”اب کیا نیا کانڈ کیا ہے؟ کو نسا دھماکہ کیا ہے انسٹا پر؟“ وہ ناگواری سے بولی۔

مونیز کی ہنسی فون کے دوسری طرف گونجی، جس سے ایمان کا چہرہ مزید چڑچڑے پن کا شکار ہو گیا۔ اس نے موبائل ہٹا کر ناگواری کا اظہار کیا، ناک کے گرد جھریاں سی بن گئیں۔

مونیز کی بات جاری رہی، اور ایمان نے جھنجھلاہٹ کے عالم میں فون کان سے لگاتے ہوئے کہا، ”انسٹا پر ڈی ایم چیک کرو!“۔

ایمان نے سرد مہری سے کہا، ”ٹھیک ہے، کال بند کرو، دیکھتی ہوں تم نے کیا نیا فساد کھڑا کیا ہے۔“۔

مونیز کی ہنسی کے ساتھ ہی ایمان کے دل میں بے چینی کا احساس جاگا۔ کال ختم کرتے ہوئے اُس نے زیر لب بڑبڑایا، ”اب کیا گل کھلایا ہے؟ یہ بندہ بالکل پاگل ہے۔“۔

پھر وہ بادلِ خواستہ موبائل کی طرف متوجہ ہوئی، انسٹا گرام ایپ کھولتے ہی اس کے چہرے پر تجسس کی پرچھائیاں نمودار ہوئیں۔ ڈی ایم میں مونیز کا پیغام تھا، جس کے ساتھ ایک ویڈیو منسلک تھی۔ ایمان نے ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ خود سے کہا، ”آئیے دیکھتے ہیں، مونیز کی تازہ ترین حماقت کیا ہے!“۔

ویڈیو چلنے لگی، اور وہ گہرے غور و فکر کے ساتھ اسکرین کو تکتی رہی، جیسے اپنی شبیہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اس کے چہرے پر الجھن اور حیرانی کے اثرات نمایاں تھے، جب کہ وہ اس غیر مانوس منظر کو سمجھنے کی کاوش میں تھی جو اس کے سامنے ریکارڈ ہو رہا تھا۔

اچانک، آڈیو نے اس کے کانوں تک رسائی پائی، اور تصویر نمودار ہوئی۔ ایمان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، ایک گہری تشویش نے اس کے چہرے پر سایہ ڈال دیا۔ ایک بے یقینی سے بھری سرگوشی اس کے لبوں سے نکلی، ”یہ میں ہوں؟“۔

یہ وہ ہی ویڈیو تھی جس میں ایمان نے افطاری کے بعد لڑکوں کو سرزنش کا نشانہ بنایا تھا۔ ایک واقعہ جو برق رفتاری سے انسٹاگرام پر وائرل ہو چکا تھا۔

ویڈیو کی طرف دیکھتے ہوئے، وہ زیر لب بڑبڑائی، ”ان لڑکوں کو پولیس کب گرفتار کر کے لے گئی؟“۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور شک نمایاں تھے۔

ایمان نے انسٹاگرام پر گہری نگاہ ڈالی، جیسے سوچ رہی ہو کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ جب وہ تبصرے پڑھنے لگی تو اسے ایک انگریزی زبان کے سمندر کا سامنا کرنا پڑا۔

اس کی زبان سے ایک تلخ طنزیہ جملہ نکلا، ”یہ پاکستانی، انسٹاگرام پر انگریز بننے کی کوشش کر رہے ہیں، گویا انگریزی ان کے بزرگوں کی میراث ہو۔ حقیقت میں، یہ لوگ بھی میرے جیسے ہی ہیں۔ آخر اردو بولنے میں کیا عار ہے؟“۔

اسکرول کرتے ہوئے، ایمان نے پایا کہ اس کے واقعے پر بنائی گئی میمز ہر سو پھیل چکی ہیں، جیسے بنجر زمین پر جنگلی پھول اُگ آئیں ہوں۔

ایک خاص میم نے اس کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس میں ایک مزاحیہ منظر کو پیش کیا گیا تھا:-

میم: جب میری ماں اپنے بھائی سے جائیداد میں اپنا حق مانگتی ہے۔

ماں کا بھائی:-

شاید شیطان ابھی قید سے رہا ہوا ہو، لیکن اس کے بد طینت قاصد پہلے ہی میدان میں اتر چکے ہیں۔ یہ لوگ گندی نگاہوں سے مجھ پر نیت باندھ رہے تھے۔

ایمان، جو رومن اردو پر دسترس رکھتی تھی، نے ان تخلیقی تبصروں پر ہلکا سا تبسم کیا، جو اس کی زندگی کے مناظر کو طنزیہ انداز میں پیش کر رہے تھے۔

مسکان کی لہروں میں گھری ہوئی، ایمان کی فکری دنیا نے یکدم ایک ہیجان انگیز موڑ لیا جب اس نے آئندہ کے ممکنہ مناظر کو تصور کی گہرائیوں میں اُتارا۔ ایک منظر میں، وہ خود کو کسی مارنگ شو کے سیٹ پر پاتی ہے، جہاں ایک حد سے زیادہ پُر جوش میزبان کے بیہودہ سوالات نے فضا کو مضحکہ خیزی کی طرف دھکیل دیا۔ ”آپ کی جلد بے داغ ہے، آخر اس حسن کا راز کیا ہے؟“ میزبان نے سوال کیا، اور فوراً ہی ایک معروف بے سرو پا استفسار داغ دیا، ”یہ بال اصلی ہیں یا ایکسٹینشن؟“۔

یہ طغیانی تب اپنے عروج کو پہنچی جب میزبان نے مزید پوچھا، ”آپ نے حال ہی میں کراٹے سیکھا ہے، کیا کسی خاص کھانے نے آپ کو لڑنا سکھایا؟“ یہ سوال فضا میں ایک کم ظرفی کی بازگشت کی مانند گونجا، اور میزبان کے قہقہے کا شور اٹھا جیسے کسی شیطانی مسخرے کی ہنسی ہو۔

دوسرا تصور ابھرا جس میں ایمان خود کو دلہن کے روپ میں ایک مشہور برانڈ کے فوٹو شوٹ میں جلوہ گر پاتی ہے، جہاں پاکستان کی دلہنی شان و شوکت کی راہ سوشل میڈیا کی شہرت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ جلد ہی، ”میرادل یہ پکارے آجا“ کے سحر انگیز بول پس منظر میں گونجنے لگے اور ایمان کو خیال کی اس رنگین دنیا میں محو کر گئے۔

اس کے بعد ایمان نے خود کو ایک خیالی ویلاگ کے تناؤ بھرے منظر میں پایا، جہاں وہ اور خالدہ ایک شدید اور تلخ تکرار میں الجھ چکی تھیں۔ دونوں سوتیلی ماں بیٹی کے بیچ ہونے والا جھگڑا کوئی معمولی نوک جھونک نہ تھا، بلکہ غصے اور ناپسندیدگی کی تیز لپٹوں میں لپٹا ہوا تھا۔

۔ ”ناظرین، ملاحظہ کیجیے، آج میں خالدہ کے سر پر وار کرنے جا رہی ہوں، اس قسم کی مزید دل چسپ اور طنزیہ ویڈیوز دیکھنے کے لیے ہمارے چینل کو سبسکرائب کیجیے، لائیک اور شیئر کرنا نہ بھولیے تاکہ ہم آپ کو اسی طرح بے وقوف...“

وہ یکدم رکی، اپنے الفاظ پر غور کیا، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے گویا ہوئی، ”یعنی، آپ کو مزید دلچسپ اور معیاری مواد فراہم کرتے رہیں۔“

یکدم ہی اس نے خالدہ کو دبوچا، جب کہ خالدہ کی آنکھوں میں غصے کی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ الفاظ مار تیر بن کر ایک دوسرے کے دلوں میں پیوست ہو رہے تھے، جیسے دونوں ایک دوسرے کے جذبات کو زخمی کرنے کا عزم کر چکی ہوں۔ ہر جملے کے ساتھ ماحول مزید بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ خیالی کیمرہ ہر لمحے کو قید کر رہا تھا، جیسے ہر لفظ ایک دھماکہ ہو۔ غصے کے عالم میں، دونوں نے ایک دوسرے کی طرف بڑھ کر بالوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

خالدہ کی آنکھوں میں اشتعال تھا، جب کہ ایمان کے چہرے پر سختی نمایاں تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں تندہی سے مصروف تھیں، ان کی سانسیں تیز اور بے ترتیب تھیں، جیسے جنگ کا میدان ہو۔

اس تصوراتی سفر میں، ایمان نے خود کو نہ صرف سوشل میڈیا کی ایک مقبول شخصیت پایا، بلکہ ایک خاندانی ویلاگر کے طور پر بھی جس کے روزمرہ کے جھگڑے اور جھڑپیں ناظرین کے لیے تفریح کا ذریعہ بن گئیں۔

جب ایمان کے سنسنی خیز تخیلات کا طوفان تھا، تو وہ موجودہ لمحے میں واپس لوٹ آئی۔ اس کی آنکھیں ارد گرد کی فضا کو تیزی سے ٹٹولتی رہیں، جب کہ اس کے چہرے پر حیرت کا ایک لطیف سایہ دکھائی دیا۔ وہ

اپنی نشست سے اٹھی اور جیسے اپنے خیالی سفر کے اثرات کو جھٹکنے کی کوشش میں زیر لب بڑبڑائی، ”نہیں، نہیں۔“

ایمان تناؤ کی شکار، اس کی پیشانی پر پسینے کے موتی چمک رہے تھے، جنہیں اس نے اپنی انگلیوں کی پشت سے آہستگی سے صاف کیا۔

پاکستانی سامعین کے فوری ردِ عمل پر غور کرتے ہوئے، اس نے اپنے ہونٹوں کو بے دلی سے کاٹ لیا اور کہا،
”یہ لوگ تالی بجانے میں اتنی ہی جلدی کرتے ہیں جتنی تنقید میں۔ چڑھتے سورج کے سب پوجاری بنتے ہیں، مگر جب وہ ہی سورج ڈوبنے لگے تو اسے ڈوبانے میں ہر کوئی اپنا حصہ ڈالنے کو تیار ہوتا ہے۔“

اس کی آواز میں مایوسی کی ہلکی سی جھلک تھی۔

اسی اثناء میں، زندگی کے امتحانات سے متعلق بزرگ کی حکمت ذہن میں آگئی۔ ایمان نے دل ہی دل میں تسلیم کیا،

”خالق کائنات ہر موڑ پر انسان کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے، کہ اس میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ شاید میں اس آزمائش میں یوں مبتلا ہوں کہ پروردگار دیکھنا چاہتا ہے، آیا میں اس راستے کا انتخاب کرتی ہوں یا نہیں۔ یہ امتحان، شاید میری قسمت کی سمت کا تعین کرے، اور یہ بھی کہ میں اس سبق کو سیکھ پاتی ہوں جو مقدر نے میرے لیے چنا ہے۔“

یہ سوچتے ہوئے، اس کی آنکھیں ایک گہرے ادراک سے کھل گئیں جیسے اچانک کوئی اہم حقیقت اس پر منکشف ہو گئی ہو۔

یکدم ہی، ایمان نے مویز کا نمبر ڈائل کیا۔ جیسے ہی دوسری طرف سے خوش طبعی بھری آواز آئی، ”اوہ، فائٹر کوئین تشریف لائی ہیں!“۔

ایمان نے فوراً ہی بات کاٹ دی، اس کی آواز میں ایک عجیب سنجیدگی اور غیر متزلزل ٹھہراؤ تھا، ”مویز، یہ سب بند کرو۔“۔

مویز حیران رہ گیا، کیوں کہ اسے ایمان کے لہجے میں یہ غیر متوقع اضطراب اور عجلت محسوس ہوئی جو حالیہ واقعات کے بعد سامنے آئی تھی۔ ایمان کی آنکھوں میں ایک غیر یقینی خوف نمایاں تھا جب وہ دوبارہ بیڈ پر دھنس گئی۔

نرمی اور بے تابی کا ملا جلہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے، وہ مزید بولی، ”میں یہ نہیں چاہتی۔ اسے فوراً حذف کرو۔ میں ابھی اتنی مشہور نہیں ہوئی۔“۔

دوسری جانب مویز کی آواز میں حیرانی اور ہلکی سی بے چینی تھی، جب اس نے جواب دیا، ”تم ہوش میں ہو؟ تمہیں ابھی شوز کے دعوت نامے ملیں گے، ڈراموں میں کردار دیے جائیں گے، لوگ تمہیں سنجیدگی سے لینے لگیں گے۔ تم نے دیکھا ہے نا، تمہارے انسٹاگرام فالوورز کیسے بڑھ گئے ہیں؟ بیس ہزار ایک ہی وقت میں!“۔

ایمان کے چہرے پر ایک لمحاتی حیرت چھا گئی۔ اس نے دل میں سوچا، ”یہ پاکستانی لوگ دیوانے ہیں، کبھی کسی ایسے شخص کو کیوں نہیں سراہتے جو حقیقت میں ملک کے لیے کچھ کرے جو ملک کے لیے سرمایہ ثابت ہوں؟“۔ اس کے ذہن میں وہ ہستیاں آئیں جنہیں ان کے قابل ذکر کارناموں کے باوجود نظر انداز کیا گیا۔

ایمان کو خاموش پا کر مونیز نے ایک گہری سانس لی، جیسے اُسے ایمان کو سمجھانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ اُس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا، ”ایمان، اپنے حق کے لیے ڈٹ جانا بھی ایک فن ہے، اور تمہیں اس میں مہارت حاصل ہے۔“۔

ایمان نے اس بات پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے آنکھیں گھمائیں، ”جہنم میں جاؤ۔ تمہارے اتنے وسیع تعلقات ہیں، پھر بھی تم میرا اتنا سا کام نہیں کر پا رہے؟ مجھے یہ سب کچھ صبح ہونے سے پہلے ختم کرنا ہے۔“۔

مونیز نے کچھ مزید کہنے کی کوشش کی، مگر ایمان نے جلدی سے، حتمی انداز میں بولتے ہوئے کہا، ”اور اگر میں مشہور ہو بھی جاؤں، تو یاد رکھنا، تمہارے کسی کام کی نہیں ہوں گی!“ یہ کہتے ہی، ایمان نے جھٹکے سے موبائل اپنے کان سے ہٹا کر بے رحمی سے کال منقطع کر دی، گویا فیصلہ کر چکی ہو کہ اب پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔

اس نے گہرا سانس لیا اور خود کو ایک عجیب اور نامانوس صورت حال میں پایا، وہ واحد فرد تھی جو اپنی اچانک شہرت سے بے چین اور ناخوش تھی۔

انسٹاگرام کی دنیا میں اس کا داخلہ، جو دیگر افراد کے لیے کامیابی اور فخر کا باعث ہوتا، اس کے لیے ایک ناگوار تجربہ بن چکا تھا۔ اپنی نئی مقبولیت کی بوجھل حقیقت سے دوچار، وہ اپنے اگلے اقدام پر غور کر رہی تھی۔

جیسے ہی اس نے انسٹاگرام پر وائٹل کھولا، ”ٹوئٹی کے فالوورز“ کا پیغام اسکرین پر نمایاں ہوا۔

اس کی پرووائٹل، جو گلیوں کی بلیوں، پرندوں، اور درختوں کی تصاویر سے مزین تھی، اور خود کی ایک تنہا تصویر اس منظر نامے کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

یہ تصویر جیسے ایک علامت تھی، ایک دوغلے جذبے کے ساتھ، جہاں تعریف و تنقید کے ملے جلے رد عمل کا سامنا تھا۔

اس کی نظر ایک تبصرے پر ٹھہری، جس میں کسی نے اس کی خوبصورتی کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا تھا ”اتنی خوبصورت ہے، اسے چھیڑنے سے کون خود کو روک سکتا ہے؟“۔

ایمان نے فوراً منہ پھلایا، ایک لمحے کے لیے تلخی اس کے چہرے پر نمودار ہوئی، اور پھر اپنی بے باکی کو برقرار رکھتے ہوئے بولی، ”ظاہر ہے، کتے خاندان کے کتی اولاد ہو، اپنی خصلت سے کیسے باز آؤ گے، کمینے لوگ۔“۔

اس کی پیشانی پر ناپسندیدگی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے تصویر کو فوراً حذف کر دیا، جیسے وہ اس بوجھل شہرت اور انجان لوگوں کے فضول خیالات سے چھٹکارا پانا چاہتی ہو۔

۔ ”افوہ،“

وہ زیرِ لب بڑبڑائی، ”مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ انسٹا کا اکاؤنٹ کیسے ڈیلیٹ کیا جاتا ہے، اور مونیٹر تو یقیناً اس میں کوئی مدد نہیں کرے گا۔“

ایک لمحے کے توقف کے بعد، وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، اور اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔
”میں ایمان ہوں، اور میرے منصوبے کبھی ختم نہیں ہوتے، بس ابھی دماغ میں کوئی منصوبہ نہیں ہے۔“

مایوسی سے سر کو اپنے ہاتھوں میں گرا کر، وہ چند لمحے خاموش رہی۔ لیکن پھر جیسے کسی نئی توانائی سے معمور ہوئی، خود کو اکٹھا کرتے ہوئے بولی، ”جب گھی انگلی سے نہ نکلے، تو گھی کو گرم کرنا پڑتا ہے۔“ ایک نیا عزم اس کے وجود میں جاگ اٹھا۔

جلدی سے موبائل اٹھایا، اور گوگل ٹرانسلیٹ کھول کر اپنے خیالات کو اردو سے انگریزی میں منتقل کرنا شروع کیا۔

اس نے اسرائیل (چوروں) اور امریکہ کے خلاف اشتعال انگیز جملے منتخب کیے اور ان کا ترجمہ کر کے انسٹاگرام پر اسرائیل (ڈاکوؤں) اور امریکہ کی پوسٹس پر چسپاں کر دیا۔

جیسے ہی اس نے یہ غیر روایتی چال چلی، تو ایک اطمینان کی لہر اس کے اندر دوڑ گئی، اور موبائل کو بے فکری سے ایک طرف رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد، تجسس نے اسے مجبور کیا، تو اس نے دوبارہ موبائل اٹھایا تاکہ دیکھ سکے کہ انسٹاگرام نے کوئی کارروائی کی یا نہیں۔

اسے فوراً ہی معلوم ہوا کہ انسٹاگرام نے تیزی سے حرکت میں آتے ہوئے اس کے اکاؤنٹ پر پابندی عائد کر دی تھی، اسرائیل (چور) اور امریکہ کی مذمت کے نتیجے میں اس کا اکاؤنٹ حذف کر دیا گیا تھا۔

ایمان اس غیر متوقع مگر کامیاب حربے پر دل کھول کر ہنس پڑی۔ ”دیکھا؟ کام محنت سے نہیں، دماغ سے کیا جاتا ہے۔ یوں کام بھی ہو گیا اور محنت بھی نہیں کرنی پڑی۔“

یہ کہتے ہوئے وہ بستر پر گر سی گئی، ایک لمبی انگڑائی لی اور سکون سے لیٹ گئی۔ ”ایک مسئلہ تو حل ہو گیا، اب اگلی پریشانی کی باری ہے۔“

کھلی کھڑکی ایمان کے کمرے میں رات کی پراسراریت اور سکون کو جذب کیے کھڑی تھی، جیسے کوئی خاموش شاہد ہو۔

اُس کی پلکیں خوابوں کی دنیا میں مگن تھیں، دنیا کی تمام حرکات سے غافل۔ پھر یکایک فضا میں اذان کی مبارک صدانے خاموشی کا سینہ چیر دیا، اور اذان کے کچھ لمحے بعد ہلکی روشنی کی مدھم چادر ہر طرف پھیلنے لگی۔

فضا میں چڑیوں کی نغمگی اور بلبلوں کی لطیف چچہاہٹ مدغم ہو گئی، جیسے کوئی آسمانی ساز بجنے لگا ہو، پھر نعتوں اور حمد و ثناء کی بابرکت صدائیں سنائی دیں۔

عید کی اذان کی نورانی صدائیں دور دراز سے فضا میں گونجنے لگیں، جو کمرے میں بہتی ہوا کے ساتھ مل کر روحانیت کا ایک ایسا منظر نامہ بناتی جس میں تقدس اور پاکیزگی رچی بسی ہو۔

کھڑکی سے باہر، مسجد کی جانب رواں دواں عقیدت مندوں کا ہجوم اپنی پاکیزہ اداؤں میں رب سے ملنے کی بے تابی کو ظاہر کرتا ہوا نظر آتا۔ ایمان کے کمرے کی خاموشی میں فطرت کی سرگوشیاں ترانے کی مانند بازگشت کرنے لگیں، کووں کی پُر جوش آوازیں اور پرندوں کی دل آویز چچہاہٹ ایک ایسے منظر کو جنم دے رہی تھیں جس میں روحانی تقدس تھا۔

نیچے، میکائیل اور جتوئی، عید کی بابرکت ساعتوں میں مسجد کی طرف بڑھتے ہوئے، مذہبی جوش و خروش کا اظہار کر رہے تھے۔

جبکہ ایمان، اپنی نیند میں مطمئن اور بے خبر، عالم ارواح میں اپنے خوابوں کی دنیا میں ڈوبی ہوئی تھی۔۔

اُس کے کمرے میں روحانیت اور سکون کی آمیزش ایک خاموش مشاہدہ پیش کر رہی تھی، جیسے عید کی نماز اس کے اندرونی تغیرات کا خاموش گواہ ہو۔

آج کی عید الفطر اس کے لیے ایک نئے باب کا آغاز تھا، ایک روحانی بلندی کا لمحہ جو رمضان کے تقدس کی تکمیل تھی۔

ایمان کے لیے یہ پہلی عید اُس کے باطنی سفر کی ایک نئی لہر تھی، ایک ایسا دن جس میں اُس کا رب سے تعلق اور مضبوط ہونے والا تھا۔

ایمان اپنی نیند میں کسماتے ہوئے، ہلکی سی جنبش کے ساتھ دائیں طرف مڑی، اُس کے ہونٹ خاموشی میں دعائیں اور افکار کی سرگوشی کر رہے تھے۔

وہ مسلسل بستر پر بے چینی سے پہلو بدلتی رہی، جب کہ نیچے نماز عید کے بعد محلے کی فضا میں خوشیوں کا ایک زندہ اور پر جوش منظر تشکیل پا چکا تھا۔

سفید سوتی قمیض اور شلوار میں ملبوس جتوئی اور سیاہ لباس میں ملبوس میکائیل نے عید کی مسرتوں میں شریک ہوتے ہوئے محلے کے دیگر افراد کے ساتھ پر جوش انداز میں معانقہ کیا، ان کے چہروں پر دوستانہ محبت اور رفاقت کی جھلک واضح تھی۔

معصوم بچوں کی کلکاریاں اور ان کے خوشی سے لبریز قہقہے، فضا کو جوانی اور سرور سے بھرپور کر رہے تھے، جیسے زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہی ہو۔

ایمان اچانک خوابیدہ حالت سے جاگ اٹھی، اور ایک لمحے کے لیے ساکت ہو کر بولی، ”آج عید ہے۔“ فوراً ہی بستر سے پھرتی کے ساتھ اٹھ کر کھڑکی کے قریب پہنچی۔ نیچے کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا، جہاں مرد ایک دوسرے سے دل کی گہرائیوں سے گلے مل رہے تھے۔

ان میں ایک جادوئی شخصیت سرور کی صورت میں موجود تھی، جس کے ہاتھ میں تسبیح اور سر پر ٹوپی تھی، اور اس نے خاکستری قمیض اور شلوار زیب تن کر رکھی تھی۔

اُس کے نرم اور مشفقانہ اشارے سے عید کی تقریبات میں روایتی شان و شوکت شامل ہو گئی تھی، وہ سب کو اپنے انداز میں تہوار میں شریک ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔

سرور نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب ہوتے ہوئے کہا، ”آج آپ سب حضرات کو میری شادی میں ضرور تشریف لانا ہے۔“

مجمع نے یک زبان ہو کر جواب دیا، ”ان شاء اللہ، مولوی صاحب!“

ایمان، جو پردے کے پیچھے سے یہ سب دیکھ رہی تھی، تجسس اور خاموشی کے ساتھ سرور کی باتوں کو بغور سن رہی تھی۔

سرور نے جتوئی کی طرف متوجہ ہو کر کہا، ”جتوئی آپ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ضرور آئیں گے، اور ایمان کو خاص طور پر لانا نہ بھولیے گا۔“

جتوئی نے کچھ حیرت کے ساتھ پوچھا، ”ایمان؟“۔

سرور نے اپنی مسکراہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے کہا، ”جی ہاں، ایمان بھی مدعو ہے، یہ بہت ضروری ہے۔“

جتوئی نے کچھ تشویش کے باوجود سر ہلایا، لیکن ایمان حیران اور پریشان سی ایک قدم پیچھے ہٹی اور زیر لب بڑبڑائی، ”یہ ڈسکو مولوی جو مجھے ناپسند کرتا ہے، آج جتوئی کو مجھے لانے کا حکم کیوں دے رہا ہے؟“۔ اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار واضح ہو چکے تھے، اور اُس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔

ایک لمحے کے لیے وہ اپنے ہی خیالات میں ڈوبی رہی، پھر اچانک اپنے کندھے اُچکا کر خود سے کہا، ”خیر، مجھے تو صرف سندس آپی سے بات کرنی ہے، اور اپنا مقصد پورا کرنا ہے۔“ اس سوچ کے ساتھ، ایمان گویا خود کو اپنے خیالوں سے آزاد کر کے الماری کی طرف بڑھ گئی۔

ایمان نے جب غور سے الماری کا دروازہ کھولا، تو اندر پڑا لباس اُس کی نگاہوں میں پہلی بار نہیں بلکہ بارہا فریفتگی پیدا کر چکا تھا۔

وہ اُس جوڑے کو آہستہ سے اٹھا کر غسل خانے کی طرف روانہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد جب باہر نکلی، تو اُس کا وجود ایک حسین اور نادر لباس میں سمٹا ہوا تھا۔

سفید قمیض، جس پر بلوچی سوئی دھاگے کی نفیس کڑھائی کی گئی تھی، اُسے ایک روایتی مگر خوبصورت شکل دے رہی تھی۔

قمیض کا کپڑا انتہائی لطیف اور شفاف تھا، جس میں ایک مخصوص نرمی اور دلکشی تھی، جیسے رات کی نرگس کی پنکھڑیوں پر پڑتی ہوئی چاندنی۔

قمیض کے گریبان پر، نفیس کام تھا، جس میں گہرے نیلے رنگ کے دھاگے سے پیچیدہ گلکاری کی گئی تھی۔

یہ کاریگری ایسی تھی جیسے کوئی مصور نے اپنی ساری محبت اور محنت کا رنگ بھر کر اُسے جاودان کر دیا ہو۔

قمیض کی آستینیں کشادہ اور فراخ تھیں، جن پر شیشے کا باریک کام کیا گیا تھا، اور وہ روشنی کے ساتھ جھلملاتے ہوئے لباس کو منفرد بنا رہا تھا۔

شیشوں کی جھلکیاں، جیسے چمکتے ہوئے ستارے ہوں، ایمان کے پورے وجود کو ایک ماورائی چمک سے بھر رہی تھیں۔

دوپٹہ جو اُس کے دائیں شانے سے ڈھلکا ہوا تھا، اُسے نرمی سے اپنے اطراف لپیٹے ہوئے تھا۔ دوپٹے کی کناروں پر کی گئی زری کی باریک کاری جیسے کسی کاریگر کی محنت کا جیتا جاگتا ثبوت ہو۔

روایتی بلوچی نقش و نگار کے ساتھ دوپٹے پر موجود زری کا کام، اُس کے حسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔ یہ دوپٹہ اُس کے وجود کے ساتھ بہتے ہوئے، ایک کہانی سناتا نظر آ رہا تھا، جو روایات اور حسن کا امتزاج تھا۔

ایمان نے شلوار کے انتخاب میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اُس نے سفید، رنگ کی شلوار پہنی تھی، جس کے کناروں پر باریک لیس کا کام کیا گیا تھا، اور وہ اُس کی قمیض کے ساتھ ایک دلکش ہم آہنگی پیدا کر رہی تھی۔

شلوار کا کپڑا ایسا ملائم تھا، جیسے کسی روئی کے گالے کو کتر کر اُس کا لباس بنا دیا گیا ہو، اور وہ ایمان کی ہر حرکت کے ساتھ ہوا کے ساتھ جھومتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

ایمان کی مکمل تیاری ابھی باقی تھی۔ اُس نے اپنے کانوں کے لیے بڑے جھمکے منتخب کیے، جو اُس کے چہرے کے گرد ہلکی ہلکی جنبش کے ساتھ جھمکاتے ہوئے اُس کے حسن میں اور اضافہ کر رہے تھے۔

دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں پہننے کے لیے اُس نے ایک نازک انگوٹھی کا انتخاب کیا، جس میں سادہ مگر دلکش موتی جڑے ہوئے تھے۔

اب ایمان نے آخری مرحلے کے طور پر وگ اٹھائی، جو اُس کی تیاری کو مکمل کرنے کا باعث بنی۔ وگ کی رنگت شاہ بلوٹی تھی، اور بال سیدھے ہوتے ہوئے کناروں پر ہلکے سے گھنگریا لے ہو رہے تھے۔ اُس نے

وگ کو احتیاط سے اپنے سر پر رکھا، اور جیسے ہی اُس نے آئینے میں خود کو دیکھا، اُس کے چہرے پر ایک نئی چمک نمودار ہو گئی۔ یہ چمک اُس کی پہلی عید کی خوشیوں کی تھی، جو اُس کے وجود میں ایک نئی تازگی پیدا کر رہی تھی۔

پھر اُس نے اپنی جوتیوں کا انتخاب کیا۔ ایمان نے سفید رنگ کی ایڑھی والے جوتے پہنے، جن پر پھولوں کی باریک کڑھائی کی گئی تھی۔ جوتیوں پر نیلے، جامنی اور ہلکے نیلے رنگ کے پھول جڑے تھے، جو اُس کے پورے لباس سے مطابقت رکھتے تھے۔ یہ جوتے اُس کی تیاری کا آخری اور اہم حصہ بن گئے۔

اب ایمان تیار ہو چکی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی عکاسی کو دیکھتی رہی، اور اُس کے چہرے پر خوشی اور مسرت کی ایک مدہم مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس کی عید، برسوں کی مشکلات اور آزمائشوں کے بعد، اُس کے لیے ایک نیا سورج لے کر آئی تھی۔

...°...

ایمان اضطراب اور کسی گہری، مگر غیر معلوم حسرت کے ساتھ آہستہ آہستہ زینے اُترتی چلی آئی۔ اُس کے قدموں کی خاموش گونج فضا میں تحلیل ہو کر جیسے اس کے دل کی بند زبان کی صدا کو بیدار کر رہی تھی۔

جب وہ زینے کے آخری دو قدموں پر پہنچی تو اُس کی چال میں غیر ارادی لچک آگئی، جیسے وہ کوئی بھاری بوجھ اُتار رہی ہو، اور اُس کا ہاتھ ریلنگ کو مضبوطی سے تھامے رہا، اُس انجانے عدم کے خوف سے جیسے وہ خود کو کسی پاتال میں گرنے سے روک رہی ہو۔

لاؤنج کے دروازے پر رک کر، اُس نے ایک لمحے کے لیے بلوری دروازے سے جھانکا، جہاں سے گھر کے اندر کی خاندانی فضا کا ایک دھندلا سا عکس نظر آ رہا تھا، جو اُس کی نظروں کے سامنے تھا مگر اُس کی رسائی سے کہیں دور۔

شیشے کے اُس پار ایمان کی نظریں اُس کی سوتیلی بہنوں پر مرکوز ہو گئیں، جو اپنے والد، جتوئی، کے گرم گلے میں لپٹی ہوئی تھیں، ایک ایسی پدرانہ محبت کا مظہر، جس کی ایمان ہمیشہ منتظر رہی تھی، مگر وہ لمس اُس سے ہمیشہ کو سوں دور رہا تھا۔

ایمان کی ایک سوتیلی بہن کو جتوئی نے سینے سے لگا کر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اُس کے ساتھ والے صوفے پر بٹھالیا، جہاں اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کی ایک لطیف جھلک موجود تھی۔

جتوئی کے چہرے پر پدرانہ محبت کی وہ روشنی نمایاں تھی، جو ایمان کے لیے ہمیشہ ایک نامکمل آرزو ہی رہی۔ اُس کا دل اس منظر کو دیکھ کر جیسے کسی نامعلوم درد میں ڈوب گیا۔

اس خاندانی قربت کے بیچ، ایمان کی سوتیلی بہنوں نے خوشی خوشی اپنے والد کو ”بابا، ہماری عیدی؟“ کہہ کر عید کے تحائف کے لیے منہ سے سوال اُچھالا۔

جتوئی نے محبت بھری نگاہوں سے اُنہیں دیکھا اور دلکشی سے مسکراتے ہوئے کہا، ”کتنی عیدی چاہیے میری بیٹیوں کو؟“۔

عبیرہ نے شرارت سے اپنے چھوٹے گال پر ہلکی سی انگلی پھیرتے ہوئے کہا،

۔ ”جو آپ کی شان کے شایان ہو، بس اتنی سی رقم!“۔

جتوئی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر دونوں بیٹیوں کے حوالے کر دیں۔ ”پانچ پانچ لاکھ میری پیاری بیٹیوں کے لیے،“ اُس کی پدرانہ شفقت کا یہ منظر ایمان کے دل میں چھپی ہوئی حسرتوں کو اور گہرا کر گیا۔

میکائیل، جواب تک خاموش بیٹھا تھا، اچانک بھڑک اُٹھا، ”مجھے صرف دو لاکھ ملے ہیں!“۔ عنایہ نے زبان نکال کر اُسے چھیڑتے ہوئے کہا، ”ہمیشہ سے یہ ہی ہوتا آیا ہے، ہم خاص ہیں۔“۔ میکائیل نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اُسے ایک تیز نظر ڈالی، جیسے وہ کوئی جواب دینا چاہتا ہو مگر خود کو روک لیا۔

جتوئی نے اُن کے ہنسی مذاق کو دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا اور میکائیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، ”تم تو ہمیشہ میرے ساتھ رہو گے، لیکن میری بیٹیاں تو ایک دن مجھے چھوڑ جائیں گی۔“ اُس کی بیٹیوں نے ہنستے ہوئے اُسے گلے لگالیا اور عبیرہ نے پیار سے کہا، ”ہم آپ کو کبھی نہیں چھوڑیں گی، بابا!“۔

ایمان، جو سایے میں کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی، اُس کی آنکھوں میں ایک ناقابل برداشت تلخی در آئی۔ اُس کی آنکھوں کے کنارے نمی سے چمکنے لگے، جیسے وہ اپنے وجود کی گہرائیوں سے اُس دکھ کو برداشت کر رہی ہو جو اندر ہی اندر اُسے گھلارہا تھا۔

اُس کے دل کی قید میں بند جذبات اب اُس کے چہرے پر عیاں تھے۔

ایمان نے خود کو مضبوط رکھنے کی بھرپور کوشش کی، مگر اُس کے اندر کی وہ نرمی، وہ ٹوٹ پھوٹ، اُس کے چہرے کی سختی کے پردے کے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔

وہ پدرانہ محبت، جس کی وہ تمنائی رہی، ہمیشہ اُس سے دور رہی، جیسے اُس کا وجود کسی اجنبی سرزمین میں بھٹک رہا ہو۔

اپنے خاندان کی اس خوشبو سے محروم، اُس کی تنہائی اور اُس کے رشتوں کی زہریلی فضا نے اُس کے دل میں گہرے زخم چھوڑے تھے۔

اُن زخموں کی تکلیف میں لپٹی، اُس نے ایک لمحے کے لیے آسمان کی طرف دیکھا، جیسے وہاں سے کوئی مدد مانگ رہی ہو، کوئی ایسی محبت جو اُس کے ٹوٹے ہوئے دل کو سنبھال سکے۔

زمین کے رشتوں کی پیچیدگیوں سے دُور، وہ کسی ماورائی محبت کی تلاش میں تھی، جو اُسے وہ سکون دے سکے جو یہاں نہیں تھا۔

اس تنہائی کے عالم میں، اُس نے اپنی شکستہ روح کو اُس الہی محبت کے دامن میں دے دیا جو ہر انسانی رشتے سے بڑھ کر اُسے سمجھ سکتی تھی۔ ایمان کی روح کو وہ سکون ملا جو زمینی بندھنوں میں مفقود تھا، اور اُس کے دل کے نہاں خانوں میں وہ یقین ابھرا کہ خدا کی محبت ہر زخم کو بھر سکتی ہے۔

مگر اب بھی اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمک رہی تھی، مگر ایمان نے اپنے باطن میں موجود ایک گہرے حوصلے کو آواز دی۔

اس نے آنکھوں کے گوشے پونچھ کر ضعف کی گواہی کو ختم کیا، گردن کو نخوت سے اکڑایا اور لبوں پر ایک مصنوعی تبسم سجالیا، جیسے یہ مسکراہٹ ایک غلاف ہو جس کے نیچے اس کے دل کا بوجھ دبا ہوا ہو۔

جب وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اندر کا منظر سامنے آیا، جہاں خدام ناشتے کی دسترخوان ترتیب دے رہے تھے۔ ایمان نے بے پروائی سے خود کو مسند پر گرایا اور ٹیلی ویژن کی سمت توجہ مبذول کی، جہاں خبریں چل رہی تھیں۔

اُس کے لباس کی شان و شوکت اور اس کی دلاویز قامت نے سوتیلی بہنوں کی نظروں کو حیرت زدہ کر دیا، جیسے اُن کے روایتی طرزِ تعامل پر یکایک ایک غیبی سایہ چھا گیا ہو۔

ایمان کے ورود پر جنوئی کے چہرے پر بھی ایک سختی بکھر گئی، مگر ایمان بے پرواہی سے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جما کر، اعتماد کا مجسمہ بنی بیٹھ گئی۔

میکائیل کی باریک بین نگاہیں ایمان پر مرتکز تھیں، جیسے وہ ہر ہر جنبش کا بغور مطالعہ کر رہا ہو۔ فضا میں ایک پُر اسرار خاموشی طاری تھی، جیسے کسی داخلی دھماکے کی بازگشت ابھی بھی ماحول پر چھائی ہو۔

اتنے میں، خالدہ نے اپنی شاندار پوشاک، میناکاری والے زیورات اور پھولوں سے آراستہ گیسوؤں کے ساتھ اندر قدم رکھا۔

ایمان نے خالدہ کے غیر معمولی حلے پر طنز آنہسی کو بمشکل دبایا اور دوسری طرف منہ موڑ کر اس نے خود پر قابو پایا۔

خالدہ نے ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ سب کو عید کی مبارکباد دی، ”میری طرف سے سب کو عید مبارک ہو!“۔

اور پھر ایمان کو حقارت بھری نظر سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئی، ”سوائے چند لوگوں کے۔“۔

ایمان نے بے نیازی سے جواب دیا، سینہ پر ہاتھ باندھ کر اور ٹی وی کی جانب نظریں گاڑ کر بولا، ”ایسی منحوس مبارکباد پر لوگ بھی لعنت بھیجتے ہیں۔“

خالدہ نے ناک چڑھا کر اُسے اوپر سے نیچے تک دیکھا، اور پھر اپنی بیٹیوں کی طرف رخ کر کے مسکراتے ہوئے کہا، ”میری بیٹیاں!“ اس نے اپنے بازو پھیلائے، اور بیٹیاں لپک کر ماں سے لپٹ گئیں۔

خالدہ کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے شرمیلی جھلک ابھری، جب اُس نے جتوئی کی طرف دیکھا اور کہا، ”صبح تو میں نے تمہیں گلے لگایا تھا، بس بچے ہیں۔“

جتوئی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”کوئی بات نہیں، ڈارلنگ!“ پھر اپنی نشست سے اٹھ کر خالدہ کے پاس پہنچا، اسے گلے لگا کر ماتھے پر بوسہ دیا اور بولا، ”تم میری جان ہو، عید مبارک جانم۔“

میکائیل نے نیم مزاحیہ لہجے میں کہا، ”اف خدا یا، والد صاحب تو بہت ہی رومانوی ہو رہے ہیں!“

جتوئی نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا، ”اگر میں تمہاری ماں کے ساتھ رومانوی نہ ہوتا تو تم کہاں سے آتے؟“

اس جملے کے فضا میں گونجتے ہی، ایمان کے چہرے پر تناؤ کی لہر دوڑ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں غیظ و غضب کی شرارے چمکنے لگے۔

اُس نے خاموشی سے ریموٹ کو بھیجا، اُس محبت کی کمی کے خلاف ایک بے آواز احتجاج کیا، جس کا وہ ہمیشہ سے حق دار تھی مگر جو اسے کبھی نہ ملی۔

دفعۃً ملازم نہایت شائستگی سے کمرے میں داخل ہوا اور مؤدبانہ انداز میں سب کو مطلع کیا، ”ناشتے کا اہتمام میز پر کر دیا گیا ہے۔“

وہ ماحول، جو پہلے قہقہوں اور گفتگو سے گونج رہا تھا، بتدریج مدھم پڑنے لگا جب افراد ناشتے کی میز کی سمت بڑھنے لگے۔ میز پر لوازمات کی بازوق ترتیب، ایک دلکش منظر پیش کر رہی تھی، جیسے کہ فطرت کی منہ بولتی تصویر ہو۔

صوفے پر خود کو آرام دہ کیے بیٹھی ایمان نے ملازم کو مخاطب کیا، ”میرا ناشتہ یہاں لے آؤ۔“

خالدہ نے یہ سنتے ہی نخوت بھرے لہجے میں ایمان کی طرف تیکھی نگاہ ڈالی اور کہا، ”ہاں، کتوں کے لیے تو انسانوں کے ساتھ کھانا ویسے بھی ممنوع ہے۔“

ایمان نے بے تاثر چہرے کے ساتھ فوراً جواب دیا، ”درست فرمایا، اسی لیے میں تیرے ساتھ کھانا پسند نہیں کرتی۔ آخر تو ہر جگہ اپنی حیثیت دکھا دیتی ہے، یہاں بھی بھونک رہی ہے اور وہاں میز پر بھی اپنی وہ ہی خصلت ظاہر کرے گی، جیسے کوئی لاڈلی کتیا مجھے دیکھتے ہی بے قابو ہو جاتی ہے۔“

نوکر جو اس کشمکش کے بیچ میں خود کو بے یار و مددگار محسوس کر رہا تھا، گھبراہٹ کے ساتھ پہلے خالدہ اور پھر ایمان کی طرف دیکھنے لگا۔ خالدہ نے غضبناک انداز میں ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”رہنے دے! یہ خود ہی اپنا ناشتہ اٹھا لے گی۔“ نوکر اس صورتحال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے فوراً کمرے سے نکل گیا۔

ایمان نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ مزید گہرا طنز کیا، ”بالکل، میں خود ہی سنبھال لوں گی۔ آخر کار میں انسان ہوں، کوئی کتیا نہیں جس کا پیالہ بھرنے کے لیے لوگ کھڑے رہتے ہیں اور پھر اسے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔“

ایمان کا یہ جملہ خالدہ پر ہتھوڑے کی طرح گرا، خاص کر جب اس نے ملازمین کو کنارے کھڑے دیکھا، جو جان بوجھ کر جتوئی اور ان کے اہل خانہ کو ناشتہ کرتے دیکھ رہے تھے تاکہ اگر کوئی ضرورت پیش آئے تو فوراً خدمت انجام دیں۔

ایمان کے لیے خالدہ کے ساتھ یہ جھڑپیں معمول کا ایک جز بن چکی تھیں، جیسے روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہوں۔ حالانکہ ہر کوئی یہ بھی جانتا تھا کہ اس معرکے کا اختتام ہمیشہ ایمان کی فتح پر ہوتا ہے۔

انسان کی عزت دراصل اس کے اپنے ہاتھوں میں پنہاں ہوتی ہے۔ جہاں یہ ادراک ہو کہ بات بننے والی نہیں، وہاں خود کو گیانی بابا ثابت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی، اور نہ ہی فضول کی بے سرو پا گفتگو کرنے کا فائدہ ہوتا ہے۔

کیوں کہ جیسے ہی کوئی دوسرا بھرپور جواب دے دے، تو خود ساختہ تیس مار خانی پلک جھپکتے میں دھرے کی دھرے رہ جاتی ہے اور بندہ اُسی وقت ملامیٹ ہو جاتا ہے۔

ایمان دل ہی دل میں بولی ”مگر اس کی کون سی عزت ہے۔“

خالدہ کو جب ایمان کے طنز اور دوبارہ اپنے دانت کھٹے ہونے کا ادراک ہوا تو اس کی نظریں ملازمین پر پڑیں، اور انہیں فوراً منتشر ہونے پر مجبور کر دیا۔

خالدہ غصے میں اپنے قدم زمین پر پٹختے ہوئے، دانت پیس رہی تھی۔ ہر قدم اس کے اندرونی اضطراب کی گونج کا غماز تھا۔

ایمان، ناشتے کے لیے اٹھنے ہی والی تھی کہ اچانک ٹیلی ویژن سے نکلتی آواز نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

-

اس کی نگاہ خود بخود اسکرین کی طرف مبذول ہو گئی، جہاں ایک مارنگ شو کی نشریات چل رہی تھیں، جو بظاہر خبروں کے ساتھ مماثلت رکھتا تھا۔

اسکرین دو حصوں میں تقسیم تھی، دائیں جانب ایک مرد میزبان اور بائیں جانب ایک خاتون میزبان موجود تھی، جس کے اوپر چینل کا لوگو جگمگا رہا تھا، جس میں وقفے وقفے سے ”عید مبارک“ کے الفاظ اور پھولوں کی چمک دھمک دکھائی دے رہی تھی۔

خاتون میزبان نے شروعات کرتے ہوئے کہا، ”کل ایک عجیب واقعہ رونما ہوا، اگر آپ کو خبر ہو تو، راتوں رات ایک لڑکی کی ویڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہو گئی۔“

مرد میزبان نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا، ”جی بالکل، اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس لڑکی نے اپنی انسٹاگرام آئی ڈی فوراً ڈیلیٹ کر دی۔“

خاتون میزبان نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے وضاحت دی، ”جو لوگ واقف نہیں، کل رات اسلام آباد کے مارگلہ ہلز کے ایک ہوٹل میں یہ واقعہ پیش آیا۔ وہاں کچھ لڑکے ایک لڑکی کو ہراساں کر رہے تھے، لیکن اس لڑکی نے حیرت انگیز جرات دکھائی اور لڑکوں کو منہ توڑ جواب دیا۔ اس کی یہ بہادری اسے راتوں رات سوشل میڈیا کی سنسنی بنا گئی۔“

مرد میزبان نے خاتون میزبان سے معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا، اور ایمان نے اپنی پیشانی کو اپنی درمیانی دو انگلیوں سے چھوتے ہوئے اس خبر کو بغور سنا، پھر اپنی انگلیوں کو ٹھوڑی پر ٹکا کر گہری سوچ میں مستغرق ہو گئی۔

اچانک، اس کی بہن کی آواز نے اسے چونکا دیا، ”ہاں، میرے دوست نے بھی کل مجھے یہ ہی ویڈیو بھیجی تھی، لیکن جب میں نے اسے دیکھنا شروع کیا تو حیرت ہوئی؛ ویڈیو فوراً ڈیلیٹ ہو گئی، جیسے موبائل خود اس ویڈیو کو چھپانا چاہتا ہو۔“ ایمان کی بھنویں فکر مندی سے اکٹھا ہو گئیں، دل میں بے چینی کا احساس پیدا ہونے لگا۔

مرد میزبان نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا،

- ”سب سے حیران کن اور غیر معمولی بات یہ ہے کہ اس لڑکی کی ویڈیو کو نہ صرف سوشل میڈیا پلیٹ فارمز سے بلکہ ہر ممکن جگہ سے ایسے مٹایا گیا ہے جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ یہاں تک کہ لوگوں کے ذاتی موبائل فونز کی گیلریوں سے بھی ویڈیو خود بخود غائب ہو گئی، اور تو اور، پولیس کے سرکاری دستاویزات سے بھی اس کا کوئی سراغ باقی نہیں رہا۔ یہ سب ایسے ہے جیسے اُس لڑکی کا وجود ہی صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا ہو، جیسے کسی طاقتور ہاتھ نے اسے چھپا لیا ہو۔“

خاتون میزبان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا، ”جو بھی ہو، ہم اس بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟ شاید وہ لڑکی اپنی شناخت کو عوامی سطح پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔“

مرد میزبان نے طنزاً کہا،

- ”عصر حاضر میں لوگ شہرت کے حصول کے لیے نہایت عجیب و غریب ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں، جبکہ وہ لڑکی بغیر کسی ایسی محنت یا تنگ و دو کے اچانک مشہور ہو گئی۔“

خاتون میزبان نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا، ”شاید وہ ایک انٹرویو ہو یا اسے لوگوں کی موجودگی پسند نہ ہو۔“

ناشتے کی میز کے قریب بیٹھی خالدہ نے سر جھکا کر کہا، ”مجھے نہیں معلوم کہ اس ملک کا کیا بنے گا۔ کبھی کوئی بے ہودہ پارٹی کر کے مشہور ہو جاتا ہے، اور کبھی کوئی بے سرو پا گانے پر ٹھمکے لگا کر سرخیوں میں آ جاتا ہے۔ اس ملک میں ذہین لوگوں کو کیا مقام ملتا ہے؟“۔

جتوئی نے خالدہ کی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا، ”یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ لوگ معمولی باتوں پر توجہ دیتے ہیں، اصل ہنرمند اور باصلاحیت لوگوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایک حالیہ شو دیکھ لیں، فارمولا کار کے بارے میں میزبان کی غلط فہمی ایک میم بن گئی، لیکن فارمولا کار بنانے والوں کی کسی نے تعریف نہیں کی۔“۔

خالدہ نے بیزاری سے ہاتھ جھٹک کر کہا، ”لعنت ہو!“

ایمان نے دھیرے سے کہا، ”شکر ہے، یہ لعنت مجھ پر سے تو ٹل گئی۔“۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور مدھم آواز میں بڑبڑائی، ”لیکن سویڈن میں اب کیا ہونے والا ہے، اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔“۔

...°...

گونار کی سویڈش رہائش گاہ کے پر شکوہ لاؤنج میں صبح کی دھوپ ایک لطیف سرمئی شفافیت کے ساتھ قدیم طرز کی کھڑکیوں سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

اس روشنی نے کمرے کی تزئین و آرائش میں ایک نرمی بھر دی تھی، جس سے ارد گرد کی پرتعیش فضا پر
طلائی کرنوں کا نرم لمس پڑ رہا تھا۔

باہر ہریالی کا سمندر تھا، جو ایک خاموشی سے بھرا ہوا سوئمنگ پول کے ساتھ ہم آہنگ تھا، جو ماحول کی
سنجیدگی کو مزید گہرا کر رہا تھا۔

گونار، ہاتھ روب میں ملبوس تھا، صوفے پر بٹھا ہوا تھا، جیسے وقت کا کوئی قدیم شہنشاہ ہو جو اپنی سلطنت کا
تماشا دیکھ رہا ہو۔

اس کی انگلیوں میں ایک زیتون کا ٹکڑا آہستگی سے گھوم رہا تھا، اور اس کی انگوٹھیوں کی چمک اس کے شاہانہ
ذوق کا عندیہ دے رہی تھی۔

وہ ناشتہ کر رہا تھا، لیکن اس کی توجہ سامنے پڑی ہوئی ٹیبلٹ پر تھی، جس میں ایمان کی ویڈیو چل رہی تھی۔
ایک ویڈیو جس میں ایمان اپنے اوپر آوازیں کسنے والے لڑکوں کو ذلیل کر رہی تھی۔ ایمان کے اس غیر
روایتی انداز نے گونار کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ بکھیر دی، جیسے وہ کھیل کے کسی مکار اور
پرانے ماہر کی طرح منظر نامہ دیکھ رہا ہو۔

اس پُر آسائش اور سکون بھری فضا کو توڑا گونار کے بلوٹو تھ ایر پیس میں گونجتی ہوئی موزیک کی آواز نے۔
”یہ سب تمہاری چال ہے، ایمان کی ویڈیوز تم نے ہی ڈیلیٹ کی ہیں،“ موزیک نے الزام لگایا۔

گونار نے زیتون کا ذائقہ چکھتے ہوئے، ہونٹوں پر ایک سنجیدہ مگر سرد مسکراہٹ لاتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا، ”یہ صرف ویڈیو ہے، مونیز۔ اس کی اہمیت تب ہوتی اگر میں چاہتا۔“ اس کی آواز میں نہ کوئی کشیدگی تھی اور نہ ہی کوئی شرمندگی۔ صرف وہ خود اعتمادی جو ایک ایسے آدمی کے پاس ہوتی ہے جو کھیل کے ہر پہلو پر حاوی ہو۔

مونیز، جو اپنی گاڑی میں سڑک پر رواں تھا، اپنی جھنجھلاہٹ کو چھپائے بغیر بولا، ”کمال ہے تم اس لڑکی کے پیچھے پڑے ہو جس سے نہ کبھی ملے اور نہ کبھی دیکھا ہے۔“

گونار نے ہونٹوں پر ایک کج ادا مسکراہٹ سجاتے ہوئے آہستہ سے کہا، ”محبت ایک پراسرار چیز ہے، مونیز۔ دور سے دیکھنا بھی کبھی بہت ہوتا ہے۔ ویسے بھی، ایمان کی تصویر میرے پاس ہے۔“

مونیز نے ایک طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا، ”یہ صرف کشش ہے، اور کچھ نہیں۔“

گونار نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ جواب دیا، ”کشش؟ ہاں، کشش محبت کا پہلا پہلو ہے۔ لیکن محبت... محبت، میرے دوست، دل کی گہرائیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ایمان میری پسند ہے، اور اگر کوئی میرے اور اس کے درمیان آیا، تو میں اسے راکھ بنا دوں گا۔“

مونیز نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا، ”وہ لڑکی مردوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔“

گونار نے سرد اور پر یقین لہجے میں کہا، ”شادی میں ایک عجیب طاقت ہوتی ہے، مونیز۔ وہ مجھے چاہے یا نہ چاہے، جلد یا بدیر وہ میری ہوگی۔“

مونیز نے طنزیہ لہجے میں کہا، ”وہ مسلمان ہے، اور تمہیں اپنے مذہب کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ وہ تم سے کبھی شادی نہیں کرے گی۔“

گونار نے ایک لمحے کے لیے خاموشی اختیار کی، پھر کندھے اچکاتے ہوئے کہا، ”حل ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔“ اس کی بے نیازی اس کے اعتماد کی گہرائی کا مظہر تھی، جیسے دنیا کی کوئی بھی رکاوٹ اس کے سامنے کوئی معنی نہ رکھتی ہو۔

مونیز نے ایک آخری کوشش کے طور پر کہا، ”اس کی ویڈیوز ڈیلیٹ کرنے سے پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسیاں کچھ نہ کچھ ضرور سوچیں گی۔ وہ اس کو کسی غیر ملکی جاسوس سے کم نہیں سمجھیں گے۔“

گونار نے ایک گہری ہنسی کے ساتھ جواب دیا، ”خفیہ ایجنسیاں؟ فوج؟ پولیس؟ ہم عالمی سطح پر تمام وسائل کو کنٹرول کرتے ہیں، مونیز۔ جو ہم نہیں چاہتے، وہ دنیا میں نہیں ہوتا۔ ایمان کو جب تک میں چاہوں گا، کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

مونیز نے محتاط ہوتے ہوئے پوچھا، ”تم کب اس کے سامنے اپنی اصل شناخت ظاہر کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

گونار نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا، ”جب میں وقت مناسب سمجھوں گا۔“

۔ ”اس قسم کے کھیل سے نکلنا مشکل ہوتا ہے، ”مونی نے تشویش سے کہا۔

گونار نے اپنی سرد، یقین بھری آواز میں کہا، ”ناممکن کچھ بھی نہیں، مونی۔ ”پھر ایک لمحہ رک کر بات مکمل کی، ”اب کال کاٹو کافی وقت ضائع ہو گیا میرا۔“

مونی نے کال کاٹ دی اور غصے سے بڑبڑاتے ہوئے کہا، ”ایمان... مجھے سمجھ نہیں آتی اس لڑکی میں ایسا کیا خاص ہے۔ سب اس کے دیوانے ہو رہے ہیں۔ وہ تو محض ایک پریشانی ہے۔“

گونار ایک ایسا شخص تھا جو ایک چلتا پھرتا کمپیوٹر تھا۔ ہر بات، ہر حقیقت، ہر علم اس کے ذہن میں برق رفتاری سے جمع ہوتا تھا۔ اس کی صلاحیتوں کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ زبانیں اس کے لیے تاش کے پتوں کی مانند تھیں، جنہیں وہ بڑی آسانی سے پھینکتا اور دوبارہ سلیقے سے ترتیب دیتا۔ چاہے قدیمی زبان ہو یا جدید، ہر زبان پر اسے قدرت حاصل تھی۔

وہ اردو زبان کا ایسا ماہر تھا کہ جیسے یہ اس کے دل کی زبان ہو، اور گفتگو میں ایسا لطف آتا کہ سننے والے مبہوت رہ جاتے۔ یہ مکالمہ بھی اردو میں ہو رہا تھا، اور اردو کا ہر لفظ اس کی زبان پر رقصاں تھا۔

گونار ہر ملک، ہر قوم، اور ہر خطے کی زبان کو اس طرح سمجھتا تھا جیسے وہ اس زبان کا پیدا نشی بولنے والا ہو۔ دنیا کے کونے کونے کی زبانیں اس کی محفل میں بولتی تھیں۔ اس کی ذہانت اور علم کا عالم یہ تھا کہ وہ ایک عام انسان نہیں لگتا تھا، بلکہ ایک غیر معمولی وجود تھا، جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

گونار نے موبائل کو آہستگی سے نیچے رکھا، جیسے کسی انمول خزانے کو چھو رہا ہو۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جس لڑکی سے وہ کبھی ملا نہیں، جس کا لمس تک محسوس نہ کیا، اُس کی تصویر اُس کے دل و دماغ پر ایسے نقش تھی جیسے کوئی خواب حقیقت سے بڑھ کر ہو۔

عجیب بات یہ تھی کہ اُس نے ایمان کی تصویر کو اپنے موبائل کے بیک گراؤنڈ پر سیٹ کر رکھا تھا، لیکن یہ خاصیت صرف اُس کے لیے تھی۔ یہ کوئی عام موبائل نہ تھا—گونار کا ذاتی ڈیزائن، ایک ایسی ڈیوائس جس کا بیک گراؤنڈ صرف وہ دیکھ سکتا تھا۔

کوئی اور موبائل کو دیکھتا تو اسے صرف ایک سیاہ اسکرین دکھائی دیتی، چند آئیکنز کے ساتھ، مگر گونار جب اس پر نظر ڈالتا تو ایمان کی تصویر ہر چیز سے آگے نکل آتی۔

اُس نے ایک نظر ایمان کی تصویر پر ڈالی، اور ایک مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی—ایک خاموشی بھری، گہری مسکراہٹ، جس میں ہزاروں جذبے پوشیدہ تھے۔

اُس کی انگلی آہستگی سے اسکرین پر ایمان کے چہرے کے نقش و نگار پر پھسلنے لگی، جیسے وہ تصویر سے اس کے وجود کو محسوس کر رہا ہو۔

گونار کی نظریں ایمان کی آنکھوں میں گم ہو گئیں، وہ آنکھیں جو اس کے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی تھیں۔

ایک نرمی اور خاموش محبت اُس کی مسکراہٹ میں جھلک رہی تھی، جیسے وہ خود کو اُس کے سحر میں مکمل طور پر ڈبو چکا ہو۔ اُس نے زیر لب ایک شاعری دہرائی:-

-“سارا جہاں دیکھا، دل کو پھر بھی قرار نہ آیا

تیری آنکھوں میں جھانکا تو ہر درد کا مداوا پایا

بدھے جیسا کونا۔ تھے لبہ نہ نقابا انہر سا

گونار کا چہرہ ایک سرد اور پراسرار مسکراہٹ میں ڈوبا ہوا تھا، جیسے کوئی شہزادہ اپنے خواب کی ملکہ کو پاس محسوس کر رہا ہو، حالانکہ وہ فاصلے پر تھی، لیکن اُس کے دل میں، وہ ہمیشہ قریب تھی۔

جہاں ایمان چند ہی روز میں تغیر پذیر ہو گئی، پراسرار بزرگ کی برکت سے

شاید گونار کو بھی مبدل ہونا تھا ایمان کہ بدولت سے۔

ایمان کی وہ کیفیت جو قلیل مدت میں متغیر ہوئی، معلوم نہیں کہ گونار کو اُس درجہ تک پہنچنے میں کتنا زمانہ درکار تھا۔

مگر، باوجود اس کے، ایک مدہم سی امید کی لو تھی جو گونار کے وجود میں سُلگ رہی تھی۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ اُس کے دل میں ایمان کے لیے کوئی نیا جذبہ بیدار ہوا۔

گونار کی والدہ کا چہرہ ایمان سے مشابہ تھا، جیسے یہ بات گونار کے لیے کسی غیبی اشارے کی حیثیت رکھتی ہو کہ وہ دوبارہ جینے کا ہنر سیکھ لے۔

ایمان کو ہمیشہ یہ ہی خیال آتا تھا کہ کوئی اُس سے محبت نہیں کرتا، مگر کاش کہ وہ جان پاتی کہ پاکستان سے کوسوں دور کوئی شخص ہے جو اُس کی محبت میں محو تھا، بلکہ محبت سے بھی بڑھ کر اُسے چاہتا تھا۔

اگر اُس شخص کی محبت کے اظہار کے لیے کوئی موزوں لفظ ہوتا، تو یہاں اُسے استعمال کیا جاسکتا تھا۔

اگر گونار سے محبت یا عشق کی بابت پوچھا جاتا تو وہ اُسے ایک خواب یا محض دھوکہ قرار دیتا۔ لیکن اب، اگر اُسی سے استفسار کیا جائے تو اُس کا جواب کچھ یوں ہوتا۔

۔ ”محبت اگر کسی صورت میں ڈھل سکتی، تو وہ ایمان ہوتی۔ ایمان صرف محبت کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔“

ایمان کا یوں اچانک بدل جانا شاید کسی کرامت سے کم نہ تھا۔

اور گونار کے دل میں ایمان کے لیے محبت کا چراغ روشن ہونا بھی کسی معجزے سے کم نہ تھا، اور اب گونار کا صراطِ مستقیم پر آنا بھی بلاشبہ کسی کرامت سے کم نہ ہو گا۔

...°...

جوں جوں گھڑی کی سوئیاں دس کے ہند سے کی طرف سرکتی گئیں، ایک مکدر سوال فضا میں معلق رہا۔ کیا آج ایمان کے وجود کا آخری باب رقم ہونے کو ہے؟۔

سازشوں کی شبہات گونجنے لگیں، جن میں سرور کے ایمان کو ناپاک رسم کی بھینٹ چڑھانے کی دھمکیاں تھیں۔۔

گھر کے گوشے گوشے میں عجلت کا اضطراب چھا گیا تھا، جیسے سبھی سرور کی شادی کی تیاریاں مکمل کرنے کی دوڑ میں مصروف ہوں۔

ایمان، متانت اور علامتی پیچیدگیوں میں ملفوف، سیڑھیوں سے نیچے اتری۔ اس کے ناک کی نوک پر ایک نفیس چمکدار نگینے کی ناک پن سچی ہوئی تھی، اور پیشانی پر احتیاط سے جڑا ہوا سفید اور نیلے موتیوں کا مانگ ٹیکا، جیسے تقدیر کی عظمت کا کوئی استعارہ ہو۔

جب وہ دروازے کے قریب پہنچی، فضا میں ایک عجیب سا تناؤ در آیا۔ خالدہ کی تیز، چھلکتی ہوئی نگاہیں اس کی آرائش و زیبائش پر شبہات کے سائے ڈال رہی تھیں۔

۔ ”تو اتنی سچی سنوری کیوں ہے؟“ خالدہ نے طنزیہ استفسار کیا۔

ایمان نے پورے اطمینان اور وقار کے ساتھ جواب دیا، ”میں نہیں، تقدیر مجھے سجا رہی ہے۔ مولوی سرور نے مجھے اپنی شادی کی گواہی کے لیے بلایا ہے۔“

خالدہ کی آنکھوں میں شک کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے بائیں ابرو کو اٹھا کر اپنے شک کا اظہار کیا۔

ایمان نے بے ساختہ معصومیت کے ساتھ کہا، ”اگر تجھے مجھ پر شک ہے تو اپنے شوہر سے دریافت کر لے۔“

ایمان نے جتوئی کی جانب منظوری طلب نظروں سے دیکھا، اور اس نے ایک مختصر پلک جھپک کر رضا مندی کا اشارہ دے دیا۔ خالدہ، جواب غصے میں پھنکار رہی تھی، نے بظاہر بد دعا دیتے ہوئے کہا، ”خدا کرے شادی کے بیچ میں تجھ پر چھت گر جائے، اور تو فنا ہو جائے۔“

ایمان نے بے خوف ہو کر اپنی آزادی کا مظاہرہ کیا، اور ایک لمحے کو خالدہ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی آنکھیں موند لیں، گویا اس کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہ ہوا ہو۔

ایمان ہجوم میں سے گزرتی ہوئی، کسی نامعلوم منزل کی جانب قدم بڑھا رہی تھی، جب کہ فضا میں بے یقینی کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ ہر اشارہ، ہر جنبش، آنے والے مقدر کی گواہی دے رہی تھی۔

خالدہ اور اس کی بیٹیاں جلتی بھنتی ایمان کے ملبوس اور حسن کی تاب نہ لاسکیں۔ وہ بلاشبہ اپنی گندمی رنگت اور پرکشش حسن کے باعث، تمام خواتین میں سب سے ممتاز نظر آرہی تھی۔ وہ اپنی خوبصورتی پر نازاں تھی، جیسے حسن کا مجسمہ ہو، گویا وہ کسی دیو مالائی پری کا عکس ہو۔

...°...

صبح سات بجے کا وقت تھا، اور سٹاک ہوم ایک خاموش، گہرے انتظار کے پردے میں لپٹا ہوا تھا۔ درختوں کے گھنے سایے تلے، جہاں ہوا میں پتے لرزاں تھے، موساد کا ایک ایجنٹ، اور گونار، ہمراہ تھے۔

درختوں کی اوٹ میں کھڑی گاڑی، جس کا انجن خاموشی سے دھڑک رہا تھا، ایک خفیہ منصوبے کا مظہر تھی۔

ان کے سامنے مسجد کا پرہیز سا یہ پھیلا ہوا تھا، جس کے اطراف میں عید کی نماز ختم ہونے والی تھی۔ ہوا کے ساتھ جھومتے درختوں کے پتے، ان کی سرگوشیاں اور سایے اس ملاقات کی پراسراریت کو مزید گہرا کر رہے تھے۔

گونار کا ساتھی، جو اپنے بھیس کے بدلنے میں ید طولیٰ رکھتا تھا، ایک اور چہرہ لے کر آیا۔

گونار نے انتہائی نفیس سفید کرتا زیب تن کیا تھا، جس کا اعلیٰ ترین کپڑا اور بے عیب تراش خراش اُس کی شخصیت کی وجاہت کو مزید نکھار رہی تھی۔

کرتا کے اوپر کے تین بٹن دانستہ طور پر کھلے چھوڑے گئے تھے، جن سے اُس کے چوڑے اور مضبوط سینے کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آرہی تھی۔

یہ منظر اُس کی پُراثر مردانگی اور رعب کا عکس تھا، جو کسی بھی دیکھنے والے کو بے اختیار اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔

اس کے جسم پر بے داغ سیاہ ترازو پہنا ہوا تھا، جس کا قیمتی کپڑا اور درست فٹ اُس کے پُرکشش جسم کی بناوٹ کو مزید اُجاگر کر رہا تھا۔

گونار کی آنکھوں پر گہرے فریم والی عینک تھی، جس کے پیچھے اُس کی سرد اور تیز نگاہیں پوشیدہ تھیں، گویا وہ کسی گہری اور پُر اسرار سوچ میں غرق ہوں۔ دائیں کان میں چمکتی ہوئی سیاہ بالی اُس کی شخصیت میں ایک منفرد اور پُر اسرار انداز کا اضافہ کر رہی تھی۔

اُس کے پاؤں میں گوچی کے انتہائی بیش قیمت اور نفیس جوتے تھے، جن کی پالش اور نزاکت اُس کے اعلیٰ ذوق اور شاندار طرزِ زندگی کی گواہی دے رہے تھے۔

گونار کی پوری شخصیت سے ایک مقناطیسی کشش ٹپک رہی تھی، جو نہ صرف اس کی وجاہت بلکہ اس کے طرزِ گفتگو سے بھی عیاں تھی۔

جب اُس نے ہموار اور بے عیب عبرانی زبان میں گفتگو کا آغاز کیا تو اُس کی آواز کی گہرائی اور سنجیدگی نے ماحول کو ایک گونج دار خاموشی میں ڈبو دیا۔

۔ ”اب، جیسے ہی وہ اپنی عبادت سے فارغ ہوں گے، تمہارا لمحہ قریب آ رہا ہے“، اُس نے ایک دھیمالیکن بوجھل لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا، جس میں ایک غیر معمولی کشش اور جاذبیت تھی، جو سننے والے کے دل و دماغ کو جکڑ لیتی تھی۔

فضا میں ایک ناگوار سا تناؤ تھا، جسے گونار نے فوراً محسوس کیا۔ اس کے ساتھی کی گردن تناؤ میں اکڑی ہوئی تھی، اور اس کی بے قراری واضح تھی۔

گونار نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، ”تمہیں یہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہیں ڈر ہے تو ہم کوئی دوسرا منصوبہ بھی بنا سکتے ہیں، تاکہ میں ٹیم کو بتا سکوں کہ ہم اپنے مقصد سے پیچھے کیوں ہٹے۔“

مگر اُس آدمی کی آنکھوں میں ایک گہری، صدیوں پرانی نفرت جل رہی تھی۔ اس نے کہا، ”یہ خیر کا بدلہ ہے۔ یہ وہ انتقام ہے جو نسل در نسل ہمارے سینوں میں سلگ رہا ہے، اور ہم اسے کبھی بھلا نہیں سکتے۔“

گونار، جو سرد اور منظم دماغ کا مالک تھا، اُس شخص کی اندرونی آگ کو باآسانی پہچان گیا۔ وہ خود بھی حیران ہوا کہ اس قدیم عداوت کی جڑیں کتنی گہری تھیں۔ اس کے ذہن میں ایک لمحے کو سوال اٹھا: ”چودہ سو سال پرانے واقعات آج کے اس لمحے میں کیسے اثر انداز ہو سکتے ہیں؟“ اُس نے اپنے اندر اٹھتے ہوئے اس سوال کو دبا لیا، اور ایک بے حس سرد مہری کے ساتھ کہا، ”اگر وہ تمہاری تورات یا تلمود کے ساتھ وہی سلوک کریں جو تم ان کی مقدس کتاب کے ساتھ کر رہے ہو؟“

یہ الفاظ، جیسے کسی برف کی سرد لہر کی طرح فضا میں پھیل گئے، اور لمحے بھر کے لیے اُس شخص کو ہلا کر رکھ دیا۔ مگر پھر وہ ہنس پڑا، جیسے کسی سنگدل اداکار کی طرح، اور بولا، ”ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ ہر چیز ہمارے قابو میں ہے۔“

سلوان مومیکا، جس کا نام دنیا بھر میں ایرانی پناہ گزین کے طور پر مشہور تھا، حقیقت میں موساد کے ایک خفیہ آپریٹو کے روپ میں یہاں موجود تھا۔

وہ محض ایک پناہ گزین نہیں، بلکہ ایک پیچیدہ اور گہرے منصوبے کا حصہ تھا، جس کا مقصد قرآن کو جلانے کی مذموم کوشش کو سویڈن اور ڈنمارک تک پھیلانا تھا۔ اس کی نقاب پوشی اور چالاکی نے اس کی اصل شناخت کو دھندلا دیا تھا۔

گونار، جو اندر سے اس سارے منصوبے سے اختلاف رکھتا تھا، بظاہر اس کا حصہ بننے پر مجبور تھا۔ وہ کسی خاص مذہب سے وابستہ نہیں تھا، مگر وہ ان اقدامات کے اخلاقی پہلوؤں سے نالاں تھا۔

لیکن، اسے معلوم تھا کہ کھلم کھلا مخالفت کرنا خود کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اس لیے اس نے اندرونی تضاد کو چھپا کر، اپنے آپ کو اس کھیل کا ایک مہارت بھرا کھلاڑی ظاہر کیا۔

سٹاک ہوم کی کھر آلود صبح میں، تناؤ نے ایک ظاہری سکون کی چادر اوڑھ رکھی تھی، لیکن گونار کی اندرونی جنگ واضح تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اپنے فیصلے پر غور کیا، لیکن پھر خود کو اس ذہنی کشمکش میں جھونک دیا، جہاں اخلاق اور حکم کے درمیان سرد جنگ لڑی جا رہی تھی۔

...°...

نمازی، زیادہ تر ترک نژاد، مسجد سے باہر نکلنا شروع ہوئے تو ان کا صبح کا سکون تیز ہوا کے ساتھ بکھر گیا۔

خاموشی کی چادر میں لیٹے اس لمحے کو جب پولیس کی زبردستی حرکتوں نے چیر ڈالا، مسجد کے احاطے سے انہیں باہر دھکیلنے کا عمل کسی سرد مشینری کی مانند بے حس اور بے رحم تھا۔

خاردار تار کی سرد اور غیر انسانی رکاوٹ، جو ایمان اور بے خوفی کے سامنے کھڑی تھی، ہر مزاحمت کی کوشش کو روکنے کی مکروہ علامت بن گئی۔

حیران اور مشتعل نمازیوں کی چیخیں گونجنے لگیں، جیسے درد و اضطراب کا شور ان فضاؤں میں گونجا ہو، مگر یہ آوازیں ان قوتوں کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں، جو ایک منظم نا انصافی کو فروغ دے رہی تھیں۔

موبائل فونز کا ابھرنا، اس لمحے کی بے بسی اور نا انصافی کو پکڑنا، ایک ڈیجیٹل ریکارڈ بنانا تھا جس کی بازگشت مسجد کی دیواروں سے کہیں دور، عالمی ضمیر میں سنائی دینے والی تھی۔

پولیس کی آہنی گرفت میں بے حرمتی کے اس شو کی تیاری مکمل تھی۔ نمازیوں کی برادری، جو مزاحمت کرنے کی کوشش میں تھی، اب حکومتی مشینری کی بے رحم دیواروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ جیسے ہی یہ منظم انتشار پھیلتا گیا، سلوان مومیکا اپنی خفیہ قوت کے ساتھ اسٹیج پر ابھرا۔

اس کے دائیں ہاتھ میں قرآن مجید کا ایک نسخہ تھا، جب کہ بائیں ہاتھ میں ایک اسپیکر، جو اس کے الفاظ کو ایک تیز دھار تلوار کی طرح ہوا میں پھیلا رہا تھا۔

مسلمانوں کے غم و غصے کی لہریں محسوس کی جاسکتی تھیں جب انہوں نے آنے والی بے حرمتی کی بدبو محسوس کی۔ ان کی آنکھوں میں ایک چمک اور دلوں میں لرزش تھی، جو پولیس کی آہنی گرفت میں دبائے جا رہے تھے۔

لیکن کچھ چہرے، جو بھیڑ میں پوشیدہ تھے، نعرے لگانے لگے، جیسے اس مکروہ فعل کی نمائندگی کر رہے ہوں۔ ”قرآن کو جلا دو!“ ان ناپاک الفاظ کی بازگشت ہوا میں گونجی، جیسے شیطانی قوتوں کا ایک کھیل کھیلا جا رہا ہو، جو جمع شدہ مومنین کی تکلیف اور دکھ کو چیر رہی ہو۔

گونار، اس پورے منظر کو ایک سرد اور محتاط نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر ایک خاموش جنگ جاری تھی، بیعت اور انسانیت کے اصولوں کے درمیان۔

سلوان مومیکا کا ہر قدم ایک منصوبہ بند مکروہ عمل کا حصہ تھا، جس کا مقصد ان لوگوں کے دلوں میں آگ لگانا تھا جو مقدس چیزوں کو اپنی زندگیوں کا محور سمجھتے تھے۔

گونار جانتا تھا کہ اسے اس بے حرمتی کو روکنے کے لیے کچھ کرنا ہوگا، لیکن اس کے پاس وقت کم اور مشکلات زیادہ تھیں۔

سلوان مومیکا نے قرآن کو اپنے ہاتھ میں بلند کیا، اور اس کے بے رحم الفاظ ہوا میں پھیل گئے۔۔۔“ میں تمہاری اس مقدس کتاب کو جلا کر تم سے بدلہ لوں گا!“۔ وہ قہقہہ مار کر بولا، جیسے اُس کی روح میں نفرت کی آگ دہک رہی ہو۔

مومین کی آنکھوں میں درد اور غصہ یکجا تھا، جیسے وہ جانتے ہوں کہ ایک مکروہ عمل ان کے سامنے برپا ہونے والا ہے۔ لیکن پولیس کے مضبوط شکنجے نے ان کی ہر حرکت کو مفلوج کر دیا۔

گونار کا دل بو جھل ہو گیا، وہ جانتا تھا کہ اگر وہ سلوان مومیکا کے اس اشتعال انگیز فعل کو نہ روک سکا، تو اس کی ضمیر ہمیشہ کے لیے بو جھل رہے گی۔ جیسے ہی سلوان نے قرآن پاک کو زمین پر بے حرمتی کے ساتھ پھینکا، فضا میں ایک خوفناک خاموشی چھا گئی۔

یہ لمحہ، جس میں مقدس کتاب کی توہین کی گئی تھی، ایک ایسا زخم تھا جو مومین کے دلوں میں ابد تک زندہ رہے گا۔

سلوان مومیکا کی نفرت انگیز آواز فضا میں گونجی، ”کہاں ہے تمہارا خالق؟ وہ مجھے کیوں نہیں روک رہا؟“ ان الفاظ کے پیچھے نفرت اور جہالت کا سمندر تھا، جو اس کے اندر کی برائی کو ظاہر کر رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی حرکات مومین کے دلوں میں ایک آگ نہیں، بلکہ صبر اور یقین کی ایک ناقابل تسخیر قوت کو جگا رہی ہیں۔

مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ قرآن کی طاقت صرف اس کے صفحات میں نہیں بلکہ اس کے ماننے والوں کے دلوں میں بسی ہوئی تھی۔ وہ صفحات جو اس وقت بے حرمتی کا نشانہ بنے تھے، ان کے پیچھے ایک ناقابل شکست ایمان کی روشنی تھی، جو کبھی بجھ نہیں سکتی تھی۔

...°...

جیسے ہی ایمان اور اس کا نام نہاد خاندان سرور کے پُر شکوہ محل میں داخل ہوا، ایک گھمبیر اور دم گھونٹنے والا منظر ان کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ فضا میں مہنگے پھولوں کی خوشبو، جیسے کسی گہری سازش کا دیباچہ ہو، معلق تھی۔ ہر شے اپنی جگہ پر ایسے رکھی گئی تھی، جیسے جشن کے پردے میں کوئی پوشیدہ راز دفن ہو۔

روشنیوں کے سیلاب نے داخلی دروازے کو سنہری پرچھائیوں میں نہلا دیا تھا، جو مہمانوں کو ایک پر تعیش لیکن دھوکہ باز دعوت کی طرف بلاتا تھا۔ ہر گوشہ اس قدر باریکی سے سجا ہوا تھا کہ اس میں بے سکونی کا احساس پوشیدہ تھا۔

گھر کا پورا منظر کسی خوابناک محل کی مانند چمک رہا تھا، لیکن اس چمک میں سرد مہری کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

مرکزی لان، جو اس رات کی تقریبات کا محور تھا، ایک ایسی دنیا میں بدل چکا تھا جہاں فطرت کے حسن کو انسان کے مصنوعی عجائبات کے ساتھ ملا کر ایک بے روح شان و شوکت میں ڈھالا گیا تھا۔

ایک شاندار فوارہ مرکزی حیثیت میں تھا، اس کے پانی کا رقص گویا کسی اجنبی موسیقی کے زیر اثر تھا، جو لمحے کی خوشی سے زیادہ خوف کو منعکس کر رہا تھا۔

سرخ پتوں والے قدیم درخت کے نیچے، دلہن گل بانو ایک عالیشان صوفے پر بیٹھی تھی، جس کا لباس اور زیور ہر زاویے سے مکمل لیکن کہیں نہ کہیں انمول تھا، جیسے یہ شان و شوکت اس کی حقیقت سے کہیں زیادہ بھاری ہو۔

اس کی سجاوٹ میں باریکی اور نفاست تھی، لیکن وہ آنکھوں کے سامنے ایک بوجھل ذمہ داری کی تصویر پیش کر رہی تھی۔

جب ایمان نے اس پورے منظر کو اپنی آنکھوں میں سمیٹا، تو وہ تنہا کھڑی ہوئی، جیسے یہ بھیڑ اسے قبول کرنے سے قاصر ہو۔

گل بانو، جس کا چہرہ اس جشن کا مرکز تھا، ایمان کی نظروں کی گرفت میں آگئی۔ ایمان کی نظریں تنگ ہوئیں، اور پھر جیسے پہچان کے دھماکے نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ ”یہ تو وہ ہی لڑکی ہے“ وہ زیر لب بڑبڑائی، ایک پراسرار حقیقت کی پردہ دری کرتے ہوئے۔

۔ ”جس نے اس دن مولوی سرور کے گھر کا راستہ پوچھا تھا۔ دم کروانے آئی تھی اور اب یہاں دلہن بنی بیٹھی ہے۔“ اس سوال نے اس کے دل میں ایک عجیب بے قراری بھر دی۔

ایمان کا دماغ الجھنے لگا اور وہ اپنے قدموں کو گل بانو کی طرف بڑھانے لگی۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچی، گل بانو کی نگاہیں نیچی تھیں، لیکن ایمان کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ”تم مولوی سرور کے گھر آئی تھی، دم کروانے، اور اب یہاں دلہن کیسے بن گئی؟“۔

گل بانو کی آنکھوں میں جھجک اور بے بسی کے آثار نظر آئے، جیسے وہ اپنے آپ کو ایمان کی نظروں سے بچانے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ ایمان کی استفسار نے اسے ایک بار پھر زمین پر گرا دیا۔ ”میں وہ ہی ہوں جس سے تم نے راستہ پوچھا تھا،“ ایمان نے آہستگی سے کہا، جیسے وہ حقیقت کا بوجھ اٹھا رہی ہو۔

گل بانو نے بے چارگی سے نظریں جھکائیں، اور ایک طویل خاموشی کے بعد، اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا، ”ہاں، میں آئی تھی، لیکن بات کچھ اور ہے۔“۔

ایمان کے اندر بے یقینی اور تجسس کی لہریں تیزی سے دوڑنے لگیں۔ ”اور تمہارا شوہر؟ وہ کہاں ہے؟“ ایمان نے غیر یقینی انداز میں پوچھا۔

گل بانو کے چہرے پر آنسو جھلکنے لگے اور اس نے دھیرے سے کہا، ”میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔“۔

یہ انکشاف ایمان کے دل پر ایک بوجھل سوال بن کر آیا۔ ”کیوں؟“ اس نے دبے لہجے میں استفسار کیا۔

گل بانو کی سرگوشی نے وقت کو لمحہ بھر کے لیے منجمد کر دیا۔ ”ضروری تھا...“ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی، لیکن اس مختصر جملے نے ایمان کے دماغ میں سوالات کی لہر پیدا کر دی۔

ایمان نے ایک لمحے کے لیے اپنے ارد گرد کے حالات کا جائزہ لیا، جیسے ہر چیز میں کوئی پوشیدہ مطلب ڈھونڈ رہی ہو۔ ”سندس آپی کہاں ہیں؟“ ایمان نے بے چینی سے پوچھا۔

گل بانو نے سنجیدگی سے جواب دیا، ”وہ تو دودن سے غائب ہیں، شادی کا سن کر گھر چھوڑ گئیں۔“

ایمان کے ذہن میں سوالات مزید الجھنے لگے۔ ”مگر مولوی سرور کے مرید نے تو کہا تھا کہ وہ گھر میں ہیں...“ ایمان نے حیرت سے کہا، جیسے حقیقت اور فریب کے درمیان پھنس گئی ہو۔

ایمان کو اندر ہی اندر خطرے کی بو محسوس ہو رہی تھی، جیسے سرور اور اس کے مرید کے ارد گرد ایک سازش کا جال بُنا جا رہا ہو۔ ”یہ جھوٹ کیوں بولا؟ یہ کیا سازش کر رہے ہیں؟“ وہ بڑبڑائی، اس کے دماغ میں سوالات کا سیلاب اٹھ آیا۔

گل بانو نے ایمان کے چہرے پر بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا، ”تم اتنی پریشان کیوں ہو؟“

ایمان نے گہری سانس لی اور خود سے کہا، ”ایک سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا... جنت کی کنجی کیا ہے؟ اور کل بابا سے پوچھنا چاہتی تھی، لیکن بھول گئی۔ اور سندس آپنی غائب ہیں، اوپر سے سرور کے مرید کا جھوٹ...“ ایمان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، اور وہ اس صورتحال کو سمجھنے کے لیے کوشاں تھی۔

۔ ”مجھے معلوم کرنا ہوگا،“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”لیکن فی الحال مجھے لوگوں کے ساتھ رہنا ہوگا، کیوں کہ مجھے لگتا ہے یہاں کچھ غلط ہو رہا ہے۔“

یہ جملے ایمان کے دماغ میں گردش کر رہے تھے، جیسے کوئی خطرہ اس کے قریب سرکنا آ رہا ہو، اور وہ تنہا اس معے کو حل کرنے کی کوشش میں تھی۔

ایمان سوچوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر قدم پیچھے کی طرف بڑھاتی جا رہی تھی، جیسے وہ اپنے اندر کی گہرائیوں میں کہیں کھور ہی ہو۔

سٹیج سے نیچے اترنے کے بعد، اس کا دھیان بے جان لگتا تھا، جب کہ دنیا اس کے ارد گرد ہلچل میں تھی۔ ایک دم مولوی سرور کے شاگرد کی خاموش، محتاط آمد نے اسے چونکا دیا۔ وہ دبے پاؤں، شب کی طرح خاموشی سے اس کے سامنے ابھرا، جیسے کوئی سایہ جو بے آواز بینائی کے دائرے میں سرک جائے۔

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی، مگر اس کی آنکھوں میں دھوکہ اور مکاری پوشیدہ تھی، ایک ایسی چمک جو خطرے کی علامت تھی۔

۔ ”سندس بی بی آپ سے ملاقات کی خواہشمند ہیں،“ اس کے لہجے میں ایک غیر معمولی چمک تھی، جیسے کوئی خفیہ راز چھپائے ہو۔ ”میں نے ان سے آپ کا ذکر کیا تھا۔“

ایمان نے اس کی بات پر ایک لمحے کے لیے سوچا، جیسے کسی خطرناک بھول بھلیاں میں قدم رکھنے سے پہلے ایک بار پھر غور کر رہی ہو۔ ”وہ یہاں کیوں نہیں آئیں؟“ اس کے لہجے میں شک اور کھوج کا رنگ شامل ہو گیا۔

شاگرد نے فوراً جواب دیا، جو پہلے سے تیار لگتا تھا، ”وہ اس شادی سے خوش نہیں ہیں، بس۔“ مگر اس کی آواز میں کچھ ایسا تھا، جیسے کسی گہرے راز کا پردہ ابھی اٹھنے والا ہو۔

ایمان کی مسکراہٹ دھیرے دھیرے گہری ہو گئی، اور اس نے نرمی سے کہا، ”تو وہ کہاں بٹلا رہی ہیں؟“

شاگرد نے اپنی آنکھوں سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا، ”گھر کے پچھواڑے۔“

مکالمہ بظاہر سادہ تھا، مگر اس کے نیچے ایک پراسرار گونج تھی، جیسے کوئی نظر نہ آنے والی سازش پنپ رہی ہو۔ اس دوران، دوسری طرف مولوی سرور اپنے تاریک کمرے میں شیطانی رسومات میں گم تھا۔

کمرے کی فضا مدہم سرخ روشنی میں لپٹی ہوئی تھی، جہاں وسط میں ایک انسانی کھوپڑی رکھی ہوئی تھی۔ کھوپڑی کے سامنے جلتی ہوئی موم بتی کی لو آہستہ آہستہ لرز رہی تھی، اور سرور کی زبان سے نکلتی ہوئی شیطانی آیات فضا میں سرگوشیوں کی مانند گونج رہی تھیں۔

ہر لفظ کے ساتھ تاریکی اور خوف کا سایہ مزید گہرا ہو رہا تھا۔

ایمان کی آنکھیں، جو ابھی تک معمولی نظر آرہی تھیں، اچانک ایک پراسرار سرخی میں ڈوب گئیں۔ جیسے کسی پوشیدہ طاقت نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ وہ شاگرد کی جانب مڑی، اور ایک سرد، بے حس لہجے میں بولی، ”میں وہاں جاؤں گی جہاں تم کہو گے۔“

شاگرد کی مسکراہٹ میں اب مکاری اور بدکاری کی جھلک واضح ہو گئی۔ ”چلو،“ اس نے اشارہ کیا، اور ایمان کو پیچھے آنے کا حکم دیا۔ وہ آگے بڑھا، اور ایمان اس کے پیچھے پیچھے چل دی، بے خبری کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی۔

ہوا میں ایک بھاری بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا، جیسے کائنات خود اس لمحے کی شاہد ہو۔ ایک پیش گوئی کی مانند، ایک منحوس سوال فضا میں تیر رہا تھا: کیا آج ایمان کی قسمت کا فیصلہ ہو گا؟ کیا وہ تاریکی کی قوتوں کی قربانی بننے جا رہی تھی؟ ان سوالات کا گہرا سایہ ماحول پر چھایا ہوا تھا۔

شاگرد نے ایمان کو درختوں کے درمیان ایک خستہ حال، ویران ڈھانچے کی طرف بڑھنے کا اشارہ دیا۔ فضا میں سرد، خوفناک روشنی جھلملاتی تھی۔ ہر قدم کے ساتھ ایمان، ایک انجانے خطرے کے قریب بڑھتی چلی جا رہی تھی، جیسے اس کی روح خود بخود اس تاریک تقدیر کی طرف کھنچی جا رہی ہو۔

مولوی سرور کے کمرے میں خوف اور وحشت کا عالم تھا۔ ایک پلیٹ میں خون بھرا ہوا تھا، اور اس کے اوپر خنزیر کی گردن لٹکی ہوئی تھی، جس سے خون کے قطرے سست روی سے پلیٹ میں گر رہے تھے۔

سرور کے شیطانی منتر پورے ہونے کے قریب تھے۔ اس نے مٹھی بھر دھول اٹھا کر ہوا میں اڑادی، اور ذرات شیطانی سرگوشیوں کی طرح فضا میں بکھر گئے۔

اب وقت صبح کا دس بج کر چالیس منٹ ہو چکا تھا۔ ایمان کی زندگی کے محض انیس منٹ باقی تھے۔

گرد و غبار نے ایمان کو اپنے حصار میں لے لیا، اور اس کا بدن لرزنے لگا۔ بے حس و حرکت، وہ اس شیطانی کمرے کے اندھیروں میں ڈوب گئی۔ شاگرد نے فوراً دروازہ بند کر دیا، جیسے تقدیر پر آخری مہر لگا دی ہو۔

مولوی سرور اپنی جگہ سے اٹھا، اور انسانی کھوپڑی میں سے ایک تیز دھار چاقو نکالا، جس پر پراسرار، شیطانی علامات نقش تھیں۔ یہ چاقو عذاب کا پیامبر تھا، اور ایمان

کی، تقدیر کا آخری فیصلہ اب تھا۔

...°...

سٹاک ہوم کے قلب میں، اس جابر، سنگدل شخص نے انتہائی سفاکی سے قرآن مجید کے مقدس اوراق کی توہین کی، انہیں چیر کر بکھیر ڈالا، اور الہامی کتاب کو بے دردی سے سرد اور سنگلاخ زمین پر پھینک دیا۔

ہر حرکت میں بے احترامی اور نفرت کی جھلک تھی، جیسے وہ ایمان کی ہر علامت کو اپنے قدموں تلے مسلنا چاہتا ہو۔

فضا میں تناؤ اس قدر گہرا تھا کہ ہوا میں کڑواہٹ محسوس ہو رہی تھی، اور گونار کی طرح غصے اور بے بسی میں ڈوبے ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا اپنی گاڑی تک پہنچا۔

تماشائی خوف اور غصے کے عالم میں بے بسی سے لرز رہے تھے، لیکن ان کی چیخ و پکار اور احتجاج کے باوجود پولیس نے بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجرم کو روکنے کی بجائے ایک دیوار کی مانند کھڑے ہو کر مداخلت کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

اس دل دہلا دینے والے منظر میں، جس میں قانون کے محافظ خود بے عملی کے شکار نظر آتے تھے، مجرم کی بے خوفی اور نفرت نے آگ میں تیل کا کام کیا۔

اس کے چہرے پر نفرت بھری مسکراہٹ اور آنکھوں میں طنز کی چمک تھی۔ اُس کا قہقہہ بے حسی اور توہین کا مرکب تھا، گویا وہ مومنوں کے دلوں میں لگنے والے زخموں پر نمک چھڑک رہا ہو۔

اُس نے نہایت گستاخی سے فضا میں چیلنج دیتے ہوئے کہا، ”تمہارا اللہ کہاں ہے؟ اس سے دعا کرو، اپنی قیمتی کتاب کی حفاظت کرو۔ مجھے تو اللہ کہیں نظر نہیں آ رہا ہے کہیں چھپ کر بیٹھ گیا ہے“ یہ جملے کفر اور تضحیک سے بھرپور تھے، جو ہر مومن کے دل میں خنجر کی طرح اتر رہے تھے۔

اس المناک منظر میں ایک خاموش آہ و بکا چھپی ہوئی تھی، ایک ایسا سوگ جو ایمان کے زخموں، بے بسی اور غضب کی گہری لہروں میں گونج رہی تھی۔ مومنوں کے دل بو جھل اور رو حیں لرزیدہ تھیں، جیسے ہر لمحہ ایک ناگہانی آفت کی پیش گوئی کر رہا ہو، اور اس بے حرمتی کا داغ ہمیشہ کے لیے اُن کے دلوں پر ثبت ہو چکا ہو۔

...°...

سرور کے مرید نے دروازہ آہستگی سے بند کیا، اس کے لبوں پر ایک گہری، بدنیت مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ دروازہ جو ایک تاریک راز کا محافظ تھا، اس نے نہایت نفاست اور چالاکی سے بند کر دیا۔

وہ ابھی تہوار کے ہنگامے میں واپس آیا ہی تھا کہ ایک تجسس بھرا مہمان اُس کے سامنے آکھڑا ہوا اور بے صبری سے سوال کیا، ”نکاح کب تک ہوگا، اور مولوی سرور کہاں ہیں؟“۔

مرید نے نہایت سکون کے ساتھ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی، پھر بظاہر پر سکون لہجے میں کہا، ”نکاح بس کچھ دیر میں ہوگا، اور مولوی سرور جلد ہی ہمیں اپنی موجودگی سے مشرف فرمائیں گے۔۔“۔

مہمان بظاہر مطمئن ہو کر تقریب میں مگن ہو گیا،۔ جبکہ مرید اب کی بار سرور کے حجرے کی جانب بڑھ گیا۔ جب وہ کمرے میں پہنچا تو کمرے میں ایک عجیب ٹھنڈک تھی، ایک ایسا سکوت جو مولوی سرور کی بدنیت موجودگی کو مزید گہرا کر رہا تھا۔

اُس کے ہر قدم میں ایک خوفناک خاموشی تھی، گویا وہ کسی تاریک راز کے انکشاف کے لیے تیار ہو رہا ہو۔ مرید، انتہائی ادب کے ساتھ، مولوی سرور کے قریب آیا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا، ”مولوی صاحب، کام ہو چکا ہے۔۔“۔

سرور کی آنکھوں میں ایک مکروہ چمک تھی، اس کے لبوں پر ایک شیطانی تبسم پھیلا ہوا تھا، گویا اُس کے اندر کاشرات بھرا وجود اُس لمحے کے لیے بے چین تھا۔ اُس نے مرید کے ہاتھ میں خنجر تھمایا، جس کی چمک میں موت کا سایہ جھلک رہا تھا۔ ”اس کی گردن بالکل ۵۹:۱۰ پر کاٹ دو،۔۔“۔ سرور نے ایک سرد،

حتیٰ لہجے میں حکم دیا۔ اُس کی آواز میں ایک تاریک قوت اور حکم کا ناقابل تردید وزن تھا، جیسے وہ موت کی گھڑی کو بھی قابو میں رکھنے کا فن جانتا ہو۔

سرور نے ایک گلاس مرید کی طرف بڑھایا، اُس کی آنکھوں میں ایک شریر چمک تھی، اور ہدایت دیتے وقت اُس کے لہجے میں خباثت کی گونج تھی۔ ”اس گلاس کو اُس کے خون سے بھر دینا، اور یاد رکھو، وقت کی مقدس اہمیت کو پامال مت کرنا۔ نہ ایک منٹ آگے، نہ ایک لمحہ پیچھے۔ اگر وقت کی بے حرمتی ہوئی تو ہم برباد ہو جائیں گے۔“

مرید، مولوی سرور کی منحوس وارنگ کے زیر اثر، اپنے فرض کو قبول کرتے ہوئے آگے بڑھا، جیسے وہ اُس ناپاک تقدیر کی طرف بڑھ رہا ہو۔

...°...

الہی نور کی لپیٹ میں آکر اندھیرے کا خاتمہ ہو چکا تھا، اور ایک مقدس دائرہ کھل گیا تھا، جہاں ستاروں کی جھلکیاں رکھنے والے درخت دونوں جانب نگہبان کی مانند کھڑے تھے۔

آسمانوں نے مخملی رات کے پس منظر میں چمکتے ستاروں کی چادر بچھا دی تھی، جبکہ دور دراز سے دلوں میں گونجنے والی بچوں کی ہنسی کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

ہوا میں روشن اور نازک پروں والی تتلیاں الہی روشنی کے درمیان رقص کر رہی تھیں، اور پس منظر میں ایک عظیم پہاڑ اپنے شان و شکوہ کے ساتھ پھیلا ہوا تھا، جس کے قدموں میں ہرے بھرے میدان سجے ہوئے تھے۔

اس مبارک منظر کے بیچ میں سے دودھ کی نرم دھار بہہ رہی تھی، جو پاکیزگی اور ربانی فراوانی کی علامت تھی۔

ایمان، سفید چمکتی ہوئی فراک میں ملبوس، آگے بڑھی۔ اس کے کپڑے تتلی کے پروں کی مانند دمک رہے تھے، اور اس کا حجاب ہوا کی مدھم سرسراہٹ کے ساتھ ہل رہا تھا۔ ہوا میں نازک بلبے تیرتے ہوئے اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے، اور اس فضا کو پراسرار حسن سے بھر دیا تھا۔

جیسے ہی وہ الہی روشنی کی طرف بڑھی، آسمان سے گلاب کی پنکھڑیاں نازل ہوئیں، ان کی خوشبو بارش کی نرمی کی مانند تھی۔

اپنی عقیدت کی انتہا میں ایمان نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور گہری محبت و احترام سے بھرپور لہجے میں پکارا، ”ہماری جان، ہمارا مال، سب کچھ آپ پر قربان، میرے پیغمبر، آپ کا کیا حکم ہے؟“۔

اس کے الفاظ کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی، اور پھر ایک روشن نور، پہلے سے کہیں زیادہ دلکش اور گرم، ایمان کو گھیرنے لگا۔

ایمان کی آنکھیں جو پہلے خوف سے لرز رہی تھیں، اب ربانی محبت اور فہم کی نئی چمک سے روشن ہو گئیں۔
اس کی نگاہیں بائیں جانب مڑیں، جہاں آسمانی درختوں میں ایک مقدس چابی چمک رہی تھی، زمرد اور
سونے کی چمک سے دمکتی ہوئی۔ ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی جب اس نے چابی حاصل
کرنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

لیکن اچانک ایمان اس پاکیزہ خواب سے بیدار ہو گئی اور خود کو ایک بھیانک حقیقت میں پایا۔ چاروں طرف
کا منظر دھندلایا ہوا تھا، جیسے نارنجی رنگ کی کسی بھیانک روشنی نے دنیا کو اپنے دائرے میں لے لیا ہو۔
اس کے ارد گرد ایک غیر فطری دھند نے ماحول کو پر اسرار بنا دیا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر
کسی غیبی طاقت نے اس کے جسم کو بے جان کر دیا تھا۔

اس کی آنکھوں کی سفیدی پر خون کی سرخی چھا چکی تھی اور اس کی سانسیں بوجھل ہو گئیں تھیں۔
اچانک، ایمان کو اپنے ارد گرد دو عجیب و غریب گلہریاں نظر آئیں۔ ایک سرخ اور دوسری بھوری، جویوں
لگ رہی تھیں جیسے اس کی جانب کوئی پیغام لائی ہوں۔

اس کا دل انہیں دیکھ کر بھر آیا اور ایک پر اسرار سی یاد اس کے دل میں ابھری۔ وہ گلہری جسے ایک بار اس
نے شکاری باز سے بچایا تھا، آج اس کے ہاتھ پر چڑھ کر اپنے شکر کی گواہی دے رہی تھی۔

پھر بھی، اس پر اسرار تبادلے کے بیچ، دروازے کی سمت سے ایک عجیب و غریب سمعی اضطراب ایمان کے کانوں تک پہنچا۔ سرخ گلہری، جس کے حرکات میں عجلت اور اضطراب نمایاں تھے، ایسے آگے بڑھی جیسے اس کے دل میں کوئی بے چین پیغام محفوظ ہو۔

ایمان کے لیے یہ لمحہ پر اسرار تعلق کی رمزیت میں ڈوبا ہوا تھا، جو اس ماورائی حقیقت کی پوشیدہ داستان کو پردہ ظہور میں لا رہا تھا۔

اچانک، وہ تال کی دستک جو لمحہ بہ لمحہ فضا میں گونج رہی تھی، خاموش ہو گئی، اور اس سکوت نے ایمان کو نہایت احتیاط سے دروازہ کھولنے کی ترغیب دی۔

دروازے کی دہلیز پر تین مزید گلہریاں، گویا چھوٹے آسمانی پیامبر، اس کے استقبال میں موجود تھیں۔ وہ سب کسی مخفی پیغام کی حامل نظر آئیں، جیسے قدرت کی زبانی کوئی غیر مرئی کلام ان کے چہروں میں پنہاں تھا۔

ایمان کے دل میں اس غیر معمولی اتصال کا ادراک ہوتے ہی، اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی روشنی پھیل گئی، اور اسی لمحے ایک الو ہی نور نے تمام منظر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

یہ اس حقیقت کا مظہر تھا کہ اس غیر مادی دنیا میں، اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی سلطنت کے ان بے زبان سفراء کے ذریعے اپنی مدد نازل کی تھی۔

یہ پانچ وفادار گلہریاں، اپنی موجودگی کی پر اسرار زبان میں، گویا ایک الہی پیغام رسانی کی رمز بن گئیں۔

جیسے ہی گونار دبے قدموں افراتفری میں ڈوبی ہوئی گونجی آوازوں کی پُر اسرار ہنگامہ آرائی سے گزرا، فضا پر ایک غیر مرئی بے چینی طاری ہو گئی۔ ایک سمت میں، بے ہنگم شور و غل نے جیسے ماحول کو چیر دیا ہو۔

کفر کے فتوے اور ان لوگوں کی دھمکی آمیز صدائیں جن کی نگاہوں میں وہ شخص مجرم تھا۔

دفعۃً گونار بے خوف، مکمل مہارت اور عیاری کے ساتھ سائے میں گھومتا رہا، جیسے کوئی پوشیدہ بھوت، جس کی حرکات قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں اور جذباتی ہجوم کی نگاہوں سے بچنے کی ماہر تھیں۔

اس کی منزل، اس کی گاڑی کے ٹرنک میں چھپی ہوئی پناہ گاہ تھی، جہاں اس نے راز کا خزانہ چھپا رکھا تھا۔ گونار کی حرکت میں ایک حسابی مہارت تھی، جب اس نے ٹرنک کھولا تو اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی امید کی جھلک مواد کی سنجیدگی کو واضح کر رہی تھی۔

جیسے ہی اس نے بیگ نکالا، ماحول میں ایک ناگوار تناؤ ابھرا — راز داری اور کھل جانے والے انکشاف کا ایک خوفناک امتزاج۔ اس کی آنکھوں میں پل پل بڑھتا ہوا اندیشہ اور جسم کی حرکات میں پوشیدہ خطرات کی جھلکیاں اس کے اس راز کو ہر لحظہ مزید سنگین بنا رہی تھیں۔

گونار، گویا ایک پُر اسرار معممہ، ہجوم کی تیز اور شکوک بھری نظروں سے بچتا، اپنی خفیہ مہم میں آگے بڑھا۔ اس کی چال میں سائے کے ساتھ جیسے کسی پوشیدہ رقص کا اشارہ تھا، اور اس کی ہر حرکت میں ایک ایسی عجلت تھی جو تھیلے کے اندر سے نکلنے والی مدھم، دبنگ سرگوشیوں کی مانند گونجتی تھی۔

ہر لمحہ بڑھتے ہوئے اسرار اور اندیشے کی یہ بھاری فضا جیسے اس کے ساتھ سایہ بن کر چل رہی تھی، اور اس کی موجودگی ہر قدم پر منڈلاتے ہوئے خطرے کا واضح اعلان تھی۔

...°...

ایمان دروازے میں کھڑی تھی، تشکر کے الجھتے احساس میں گرفتار، جیسے پانچ گلہریوں نے اس کی ناقابل یقین رہائی کا بندوبست کیا ہو۔

ان کی حرکات میں ایک غیر معمولی چُستی اور ترتیب تھی — دو دائیں کندھے پر اور تین بائیں طرف براجمان، جیسے کوئی الہی پیغام رسان ہو۔ ایمان کی مسکراہٹ، جو پہلے ممنونیت کا اظہار تھی، اچانک ماند پڑ گئی جب اس کی نظر شاگردِ سرور کی بے یقینی سے بھرپور آنکھوں سے ملی، جو حیران و پریشان کھڑا تھا۔ ”یہ کیسے نکل آئی؟“ اس نے بے یقینی کے عالم میں سوال کیا،

جس پر ایمان نے پُر عزم لہجے میں کہا، ”آج تیرا آخری دن ہے۔ سرور کے کتے“ یہ اعلان جیسے ایک لرزہ خیز چنگھاڑ تھی جو ہوا میں ارتعاش پیدا کر گئی۔

ایمان نے ایک آہنی چھڑی اٹھائی، اس کی گرفت میں عزم کی چمک تھی، جیسے وہ آنے والے خطرے کو مات دینے کا ارادہ رکھتی ہو۔

شاگرد، حیرت اور کفر کے ملے جلے جذبات سے مغلوب، خنجر نکال کر ایمان کی جانب لپکا۔ مگر ایمان کے ہاتھوں کی برق رفتاری نے چھڑی کو حرکت دی اور شاگرد کے سر پر ایک بھرپور ضرب لگائی، جس کی شدت نے اسے لڑکھڑادیا۔

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے کراہنے لگا، اور عین اس لمحے گلہریاں، جیسے الہی مددگار، ایمان کے ساتھ قدم بہ قدم کھڑی ہو گئیں، انتظار میں کہ اگلا قدم کیا ہوگا۔

لیکن شاگرد، جس کا جسم چھڑی کی ضرب سے درد میں ڈوبا تھا، ایک آخری جھٹکے میں ایمان کی پنڈلیوں پر ضرب لگانے میں کامیاب ہوا۔

ایمان اوندھے منہ زمین پر گر گئی، اس کی سانسیں بے ترتیب ہو گئیں، جیسے وقت نے یکدم دھیرے سے چلنا شروع کر دیا ہو۔

لمحہ لمحہ گزر رہا تھا، گھڑی کی سوئیوں کی بے حد خاموشی میں جیسے خطرے کی آہٹ بڑھ رہی تھی۔۔۔ ”کیا یہ میرا آخری لمحہ ہے؟“ ایمان کے دل میں یہ سوال ابھر آیا، جیسے وقت کے دائرے نے اسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہو۔

وہ مرید جواب زخمی تھا، اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایمان نے اپنی تھکن زدہ آنکھوں سے اسے دیکھا، اور اپنی انگوٹھی سے اس تیز دھار نوک کو نکالنے کی کوشش کرنے لگی، مگر وہ تیز دھار نوک باہر نہ آئی۔

یہ بات عجیب اور ناقابلِ فہم تھی۔ ایمان کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار نمودار ہوئے، جبکہ مرید نے اس کے بازو کو بے رحمی سے پکڑ لیا اور اسے زمین پر گھسیٹتے ہوئے کمرے کی تاریکی میں لے جانے لگا۔ گلہریاں، جنہوں نے ایمان کا ساتھ نہ چھوڑا تھا، پیچھے پیچھے چلنے لگیں، جیسے کسی تقدیر کی کہانی لکھنے والی قاصد ہوں۔

اس دوران، سرور آئینے کے سامنے اپنے بال سنوار رہا تھا، جیسے وقت کی ستم ظریفی کا مذاق اڑا رہا ہو۔ لیکن پھر ایک دم ٹھٹھک کر رک گیا۔ کچھ تھا، کچھ جو ناقابلِ فرار تھا۔

مرید نے ایمان کو دیوار کی طرف گھسیٹتے ہوئے پھینکا، اور جیسے ہی اس کے حواس دھندلا گئے، اسے اس بات کا احساس ہوا کہ اس کی طاقتیں، جن پر اسے کبھی ناز تھا، یکایک غائب ہو چکی ہیں۔ اس کے دل میں حیرت کی ایک لہر دوڑ گئی، ”میں کیوں نہیں لڑ پارہی؟“ ایمان کے چہرے پر خوف کے سائے ابھر آئے، لیکن اس کے باوجود وہ ہمت کا دامن چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔

۔ ”تمہیں کیا چاہیے؟ تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟“ اس کی آواز میں اک عزم تھا، جیسے موت کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

مرید نے اس کی پرواہ کیے بغیر خنجر کو اٹھایا، اور کمرے کی فضا پر ایک سیاہ سایہ چھا گیا۔ ایمان نے آنکھیں بند کر لیں اور دل کی گہرائیوں سے دعا مانگنے لگی، ”اے اللہ، میری مدد کر۔“

لمحے لمحے کے ساتھ کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا، جیسے روشنی کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ ماحول پر ایک گہری خاموشی نے قبضہ جمالیا، اور ایمان کی سانسیں جیسے تھم سی گئیں۔۔۔۔۔

...°...

گونار، جیسے رات کی تاریکی میں چھپی ہوئی موت کی کوئی علامت، مسجد کی دیواروں کے پیچھے دبکا رہا، ایک خاموش چھلاوا جو اپنی وحشیانہ قدرتی عقل کے ساتھ شکار کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کی آنکھیں اس بدنصیب شخص پر مرکوز تھیں جس نے قرآن کے مقدس اوراق کی بے حرمتی کی تھی، اور جس کی ناپاک حرکات نے ماحول کو زہر آلود کر دیا تھا۔

اس کے تھیلے میں سے نکلنے والی سرگوشیوں جیسی سسکیاں، جیسے موت کی گہری آوازیں، منظر پر ایک مہلک خوف کا سایہ پھیلا رہی تھیں۔

گونار کی مسکراہٹ، اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں چھپی ہوئی، ایک شاطر شکاری کی مانند، ہر لمحے کا حساب لگا رہی تھی۔

۔ ”جو لوگ مقدسات کی بے حرمتی کرتے ہیں، وہ اس زمین پر جینے کا حق نہیں رکھتے،“ گونار نے اپنی سرد اور بے رحم سرگوشی میں خود سے کہا۔

اس کے دستانے والے ہاتھوں نے خود کو موت کے کسی بھی غیر متوقع وار سے محفوظ کر رکھا تھا۔ جب لمحہ قریب آیا، تو اس نے آہستگی سے تھیلے کو کھولا اور کوبروں کے قہر کو آزاد کر دیا۔ ایک ایسی فوج جو زہر سے لدی اور موت کی نقیب تھی۔

سانپوں کا ریلا، جو زہر میں ڈوبا ہوا تھا، بے حرمتی کرنے والے کی طرف بڑھا، جیسے کسی الہی فرمان کی تعمیل کر رہے ہوں۔

گونار نے اپنے مہلک منصوبے کی کامیابی پر ایک گہری تسکین محسوس کی اور پھر خاموشی سے، سایوں میں واپس ڈوب گیا۔

سانپ، جو اب ایک انتقام کی طاقت بن چکے تھے، جیسے مقدس غضب کے ایجنٹ، اپنے شکار کی طرف تیزی سے لپکے۔

وہ بدبخت شخص، جس نے کچھ لمحے پہلے اپنی توہین آمیز حرکت سے ہجوم کو مسحور کر رکھا تھا، اب دہشت میں غرق ہو گیا۔ کوبروں کی سرسراہٹ، جیسے ہوا میں زہر کی بو، ہجوم میں خوف کا زہر گھول رہی تھی۔

گونار کے سائے سے نکلتے ہی منظر کی سنگینی گہری ہو گئی۔ اس کی موجودگی میں ایک سرد مہری تھی جو دلوں کو لرزا رہی تھی، اور وہ شخص، جس نے پہلے مقدس کلمات کی بے حرمتی کی تھی، اب سانپوں کے غصے کا سامنا کر رہا تھا۔

اس کے چیخنے کی آوازیں، جو پہلے طنزیہ ہنسی میں ڈوبی ہوئی تھیں، اب موت کی گرفت میں دب چکی تھیں۔
سانپوں نے اپنی سرسراتی زہریلی زبانوں سے اسے لپیٹ میں لے لیا، اور اس کی چیخیں خوفناک زہر میں
ڈوب گئیں۔

پہلے طنز اور تمسخر سے بھرا ہوا ہجوم اب عجلت میں منتشر ہو گیا، جیسے موت خود ان کے قریب آگئی ہو۔
پولیس والے، جو پہلے اس معاملے کو ہنسی میں ٹال رہے تھے، خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگے، ان کے چہروں پر
خوف کی ایک نئی رنگت نمودار ہو گئی۔

یہاں تک کہ وہ بھی زہر کے کاٹنے سے بچ نہ سکے۔ کوبرا، جنہیں ایک ناقابلِ فہم طاقت سے رہنمائی حاصل
تھی، اب مقدسات کی توہین کرنے والے کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔

اس کی چوڑی آنکھیں خوف میں بڑی ہو گئیں جب دو کوبروں نے اس کے کھلے منہ میں اپنی پھنکار بھری
زبانیں داخل کر دیں۔

جیسے ہی سانپ اس کے گلے میں سرایت کر گئے، ایک خوفناک اور غیر فطری حرکت اس کے جسم میں
شروع ہوئی۔ اس کا پیٹ، جیسے کسی عجیب و غریب قوت کے زیر اثر ہو، اندر سے حرکت کرنے لگا، اور اس
کی سانسیں درد اور اذیت کی لہروں میں ڈوب گئیں۔

اچانک، اس کا جسم ایک جھٹکے سے کانپ اٹھا، اور اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں، جیسے موت نے اپنا آخری وار کیا ہو۔

اس کے ہونٹوں سے خون کی ندیاں بہنے لگیں، سرخ رنگ کی تیز دھاریں اس کی ٹھوڑی سے نیچے بہہ رہی تھیں، اور اس کا بدن ایک بے جان برتن کی مانند زمین پر گر گیا۔

ایک آخری خوفناک جھٹکا، جیسے اس کے جسم کے اندر کوئی آخری معرکہ برپا ہو،۔۔

خون کے بہاؤ نے زمین کو سرخ کر دیا، جیسے موت خود اس کے اوپر ناپچ رہی ہو۔

...°...

سرور کے چہرے پر خوف کی ایک لہر دوڑ گئی جیسے ہی اس نے سامنے ابھرتے ہوئے گہرے سیاہ دھوئیں کو دیکھا، جو ایک ناپاک موجودگی کی بد صورتی سے بھرپور علامت تھی۔ گیارہ بجنے کی آواز کے ساتھ ہی، جیسے کسی شیطانی طاقت نے وقت کو پکڑ لیا ہو، دھواں لرزتے ہوئے ہوا میں پھیلا اور اس کے دل کو خوف کے پنچوں میں جکڑ لیا۔ پھر اچانک، دھوئیں سے ابھرتے ہوئے مافوق الفطرت مخلوقات کا ایک ہجوم ظاہر ہوا، ان کے بدن سیاہ سایوں میں لپٹے ہوئے تھے، جن کی آنکھیں جیسے سرور کی روح کو کھینچنے کے لیے دہک رہی تھیں۔

سرور کی آنکھیں ان پر اسرار اور خوفناک ہستیوں کی شکلوں پر تیزی سے گھوم رہی تھیں، ہر ایک حرکت دل میں دہشت کی ایک اور کیل ٹھوک رہی تھی۔

اس کے پیچھے پیچھے، دھواں پھر سے اٹھا اور ایک خونی سایہ بن کر اس کے ارد گرد پھیل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ محض کوئی عام دھواں نہیں، یہ کسی خوفناک انجام کا پیش خیمہ تھا، جیسے یہ شیطانی قوتیں اُس کے ہر قدم کو اپنے شکنجے میں لے چکی تھیں۔

۔ ”حکمت نے میرا کام کر دیا۔“ اس کی سرگوشی میں ایک عجیب سی فخر بھری ہوئی تھی، جیسے وہ موت کی جانب دیکھ رہا ہو اور اسے اپنے ہاتھ میں محسوس کر رہا ہو۔ لیکن اس کا اطمینان لمحاتی تھا، تقدیر کے اندھیرے جال نے اسے جکڑ لیا۔

اچانک، دھواں اُس کے پیچھے، سایوں کی صورت میں نمودار ہوا، جیسے کسی شیطانی طاقت نے اچانک وار کیا ہو۔

سرور کو لگا جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اس کی بغلوں میں جکڑ لیا ہو۔ وہ ایک زبردست جھٹکے سے پیچھے کی جانب کھنچا، اس کے ہاتھ اور پاؤں بے بس ہو گئے۔ وہ چھٹپٹا رہا تھا، لیکن سایوں نے اس کے جسم کو جیسے زمین سے جکڑ لیا تھا۔

دروازہ، جو کبھی کھلا ہوا تھا، اب سایوں کی مانند بند ہو گیا، اور اس کے ارد گرد تاریکی کا ہجوم مزید گہرا ہو گیا۔

سرور کی چیخیں دل دہلا دینے والی تھیں، مگر ان کا کوئی جواب نہ آیا۔ جیسے سائے اسے دنیا سے نکالنے کے لیے تیار تھے، اس کی روح کو ان اندھیروں میں غرق کرنے کے لیے جن کا کوئی واپسی کا راستہ نہیں تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے منظر دھندلا ہوتا جا رہا تھا، اور گھڑی کی سوئیاں گیارہ کے قریب رک گئی تھیں، جیسے وقت نے بھی اس کے لیے حرکت کرنا چھوڑ دیا ہو۔

سوالات کی ایک دھند اس کے ذہن میں چھا گئی: کیا ایمان بچ پائے گی؟ یا یہ شیطانی قوتیں اسے بھی گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جائیں گی؟

فضا میں معلق سوالات کے ساتھ، سرور کا جسم سایوں میں مکمل طور پر ڈوب چکا تھا، اور صرف اس کے درد سے بھرے چیخوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

دھڑکتے دل کے ساتھ، ہر لمحہ دہشت کی ایک نئی لہر لیے ہوئے تھا، اور اس کے آس پاس کی ہر چیز ایک پراسرار اور خوفناک انجام کی طرف بڑھ رہی تھی۔

...°...

ایمان کے لرزتے ہونٹوں سے دعا کی گونج فضا میں بلند ہوئی،، ”اے اللہ، میری مدد کر۔“۔

جیسے ہی اس مقدس التجا کی صدا نے کمرے کی فضاؤں کو چھوا، چاروں جانب ایک غیر معمولی خاموشی پھیل گئی، گویا کائنات کی روح نے سانس روک لی ہو۔

ہوا میں ایک خفیہ بوجھ محسوس ہونے لگا، جیسے ہر ذرہ، ہر زاویہ الہی مظہر کی پیش بینی کر رہا ہو۔

فضا میں تناؤ اس قدر بڑھ گیا کہ سانس لینا دشوار ہو گیا۔ اچانک، اس ماحول کو لپیٹنے والی ایک آسمانی طاقت کی جھلک محسوس ہوئی، جس نے زمین پر فساد کے ارادے رکھنے والوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔

حکمت، جس کے ہاتھ میں چمکتا خنجر ایمان کے خلاف مکر و دغا کی آخری کڑی بن چکا تھا، اچانک اس کے ارادے لرز اٹھے۔

خنجر جو اس کی گرفت میں تھا، ایک غیر مرئی طاقت کی مداخلت سے اس کے ہاتھوں سے اس طرح پھسل گیا جیسے قدرت خود اس کی حرکت کو روک رہی ہو۔

اس کی آنکھیں دہشت اور بدگمانی کے ملے جلے جذبات میں پھٹ گئیں، جیسے وہ خدائی عدالت میں اپنے جرم کا سامنا کر رہا ہو۔

اس لمحے میں، سایوں سے ابھرتا ہوا ایک سیاہ بچھو، جس کی چال میں کائناتی نظم کی جھلک تھی، آگے بڑھا۔

بچھو کی ہر حرکت میں وہ خوفناک سکوت پوشیدہ تھا جو فطرت کی انتقامی قوتوں کا اشارہ دیتا ہے۔ وہ بچھو ایک غیر مرئی مشن کے تحت تیزی سے حرکت کرتا ہوا، حکمت کی جانب لپکا۔

اس کا زہریلا ڈنک بجلی کی رفتار سے حکمت کے بدن میں پیوست ہو گیا، جیسے یہ الہی فرمان کی تعمیل کر رہا ہو۔ حکمت کی آنکھوں میں ہولناک خوف کا عکس تھا، وہ ایک لمحے کے لیے اپنے اختتام کو بھانپ چکا تھا۔

اچانک، ایک چیخ اس پر اسرار خاموشی کو چیرتی ہوئی کمرے میں گونجنے لگی، جیسے درد و عذاب کی پکار ہو۔ حکمت زہر کی تپش سے نڈھال ہو کر زمین پر گرا، اس کی آنکھوں میں وحشت اور درد کی آخری جھلکیاں باقی تھیں۔

ایمان، جس نے اس عجیب و غریب مداخلت کا مشاہدہ کیا، پروردگار کے کرم کی گرفت میں سکون و ہیبت کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔

شکر گزاری کے آنسو اس کی آنکھوں میں چمکنے لگے، جبکہ اس کی سانسیں حیرت و تعجب سے تھر تھرا رہی تھیں۔

گلہریاں، جو خاموشی سے اس درخشاں ڈرامے کی چشم دید گواہ تھیں، غیر مرئی ہاتھ کی رہنمائی کو تسلیم کرتی ہوئی ایمان کے گرد حفاظتی گھیرا بناتی چلی گئیں، گویا وہ قدرت کے خدائی ارادے کا حصہ بن چکی تھیں۔

ان کی موجودگی اس الہی مداخلت کی گہرائی میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔

کمرہ، جو چند لمحے پہلے بدی کے ارادوں سے آلودہ تھا، اب الہی تقدیر کا مظہر بن چکا تھا۔

حکمت، جو سرور کے فریب کا حصہ تھا، اذیت کی آخری سانسوں میں گر کر اپنے انجام کو پہنچا۔ اس کا بدن بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا، اور کمرے کی فضاء میں الہی انصاف کی دھمک گونج رہی تھی۔

یوں ایمان کے قدموں میں تقدیر نے اپنا سر جھکا لیا، اور اس لمحے میں ہر شے نے اعتراف کیا کہ اللہ کی مدد ہر تاریکی کو روشنی میں بدلنے کی قدرت رکھتی ہے۔

...°...

ایمان، پردے کے پیچھے چھپے ہوئے الہی راز کو گہرائی سے محسوس کرتے ہوئے، دھیرے دھیرے خود کو سامنے آنے والے منظر سے الگ کرتی گئی۔

اس کا ہر قدم ایک بلند و بالا مقصد کی گونج کے ساتھ اٹھتا تھا، گویا اللہ کی مرضی کی پوشیدہ حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

اس کا یقین، جس میں ایک غیر مرئی کشش تھی، نے ایک عظیم الشان راز کو سینے میں چھپائے رکھا۔

ایمان کی حکمت سے دوری، حقیقت میں ایک جان لیوا تصادم سے بچاؤ تھا؛ وہ تصادم جو ایمان اور حکمت کے درمیان ہو سکتا تھا۔ لیکن تقدیر کا منصوبہ کچھ اور تھا۔ حکمت کی موت، جو اب بچھو کے زہر سے منسوب کی جا چکی تھی، ایک ایسا موڑ تھا جو منطقی فہم کو چکنا چور کر گیا۔

تقدیر کے اس الجھے ہوئے رقص میں ایمان نہ صرف ایک معمولی حصہ بن کر سامنے آئی بلکہ وہ الہی ارادے کی مجسم علامت بن گئی، جو اس کمرے کو اس قدر گہری توانائی سے بھر رہا تھا کہ انسان اس دائرے سے باہر کی قوتوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔

وحی کی اس طوفانی حالت میں، ایمان ہجوم کو چیرتی ہوئی اس راز کو بے نقاب کرنے کے لیے آگے بڑھی جو سرور اور مرید سرور کے مذموم منصوبے سے وابستہ تھا۔

اس کا دل جل رہا تھا، اس کا ہر قدم زمین پر دھڑک رہا تھا۔ جب وہ سرور کے کمرے کی کھڑکی کے قریب پہنچی، اس کی سانس تیز ہو گئی۔ الفاظ کا ہجوم اس کے لبوں سے نکلنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک بہری کر دینے والی آواز فضا میں گونج اٹھی، اور سرور کے کمرے کی کھڑکی سے ایک شے نیچے آگری۔

ایمان نے تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن آنکھوں کے سامنے جو منظر آیا، اس نے اس کے وجود کو ہلا دیا۔

مجمع میں ہانپنے کی آوازیں اور چیخیں بلند ہوئیں، اور سب کی نگاہیں اس ہولناک تماشے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

شور و غل کے بیچ گل بانو، اس اچانک موڑ پر لرزتی ہوئی کھڑی ہو گئی، اس کا ہاتھ بے ساختہ اس کے منہ پر جا پڑا۔ ایمان کے چہرے پر جو عزم و ہمت کی روشنی تھی، اب خوف اور حیرانی میں بدل چکی تھی۔

جو منظر ان کے سامنے بکھرا ہوا تھا، وہ کوئی اور نہیں بلکہ خود سرور تھا، زمین پر گرا ہوا، بے حس و حرکت۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہ رہا تھا، اور اس کی آنکھیں، جن میں بے بسی اور پچھتاوے کا سمندر تھا، ایمان پر جمی ہوئی تھیں، گویا وہ اس لمحے کی گواہی دے رہی ہوں۔

مجمع میں ایک اجتماعی ہانپ سنائی دی، اور ایک ہولناک خاموشی چھا گئی۔ وہ ہجوم، جو ابھی تک زندہ تھا، یکایک پتھر کی طرح جامد ہو گیا۔

۔ ”ایمبولینس بلاؤ!“ آوازیں ہر طرف گونجنے لگیں، لیکن سرور کے جسم میں کوئی حرکت باقی نہ رہی۔ ان کی موت نے ماحول کو سیاہ سایوں میں لپیٹ لیا۔ یہ موت، جیسے کہ خود تقدیر کی مہر تھی، نہ صرف سرور بلکہ حکمت اور سلوان مومیکا کی تقدیر کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لائی۔

مختلف حصوں پر سلوان اور حکمت نے غیر معمولی منظر کو دیکھا، ان کے دل خوف سے دھڑک رہے تھے۔ آسمان پر ایک آگ کا دروازہ نمودار ہو چکا تھا، ایک آسمانی ہستی کا اعلان کرتے ہوئے۔ موت کا فرشتہ۔

وہ وجود شعلوں میں لپٹا ہوا، خوفناک اور چمکدار چہرے کے ساتھ نمودار ہوا۔ وہ ان دونوں کی روحوں کی طرف دیکھ رہا تھا، جیسے ان کی تقدیر پر فیصلہ صادر کرنے آیا ہو۔

ایک لمحے میں، جب موت کا فرشتہ ایمان کے قریب سے گزرا، ایک پراسرار اور غیر مرئی تعلق نے ایمان کو جکڑ لیا۔

اس کے دل پر ایک بھاری گرفت محسوس ہوئی، جیسے وہ کسی مافوق الفطرت وجود کے قابو میں ہو۔ ایمان نے فوراً اپنے دل پر ہاتھ رکھا اور ایک گہری سانس لی۔ فرشتہ، جس کا مقصد سرور کی روح کا دعویٰ کرنا تھا، تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

سرور نے فرشتے سے بچنے کی کوشش کی، لیکن اس کا جسم اس کے قابو میں نہ رہا۔ ایک ہی لمحے میں، تقدیر کی سخت گرفت نے تینوں کی زندگیوں کو ختم کر دیا۔ سلوان، حکمت، اور سرور، سب کے سب زمین پر بے جان پڑے تھے، اور ان کی روحوں نے موت کے فرشتے کے حوالے ہو چکی تھیں۔

فضا میں ایک خوفناک آواز گونجی، ”لگتا ہے مولوی صاحب ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔“

ایک اور آواز نے جواب دیا، ”مولوی صاحب واقعی نیک تھے۔“

سرگوشیوں کے بیچ ایک بلند اعلان ہوا، ”مولوی صاحب جنت کے دروازے کھول کر عید کے موقع پر اپنے معراج کے لیے روانہ ہو گئے۔“

اور ایک اور آواز نے مزید کہا، ”اللہ مولوی صاحب کی مغفرت فرمائے۔“

مرنے والوں کی ارواح اور فضا میں پھیلا ہوا خوف، ہر نفس کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ تقدیر کے اس بے رحم کھیل میں، موت کا فرشتہ اپنے کام کو مکمل کر چکا تھا، اور زمین پر ایک خوفناک سکوت طاری تھا۔

...°...

شعلوں کے وحشیانہ رقص نے فضا کو سرخ اور سنہری روشنی میں غرق کر رکھا تھا، جس کے درمیان ایک ہولناک چمک نے جہنم کی دہشت ناک گہرائیوں کو روشن کر دیا تھا۔

ہوا آگ کی شدت سے چیخ رہی تھی اور زمین کانپتے ہوئے یوں لرز رہی تھی جیسے وہ اس عذاب کی شدت سے پناہ ڈھونڈ رہی ہو۔ چیخوں اور آہ وزاری کی گونج نے ماحول کو ایک دل دہلا دینے والی خوفناک شکل میں بدل دیا تھا۔

اس بھری ہوئی آگ اور سُلگتے عذاب کے سمندر میں، سرور خود کو ایک زبردست اور شیطانی ازگر کی کنڈلیوں میں جکڑا ہوا پایا۔ ازگر کی آنکھیں شیطانیت سے دھک رہی تھیں اور اس کے جبرے سرور کے منہ کے گرد سفاکی سے لپٹے ہوئے تھے، اس کی چیخوں کو دبا رہے تھے۔

سرور کی سانسیں گھٹ رہی تھیں، اس کے جسم کے گرد ازگر کے جبروں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی دم کو ایک خاردار درخت سے بے دردی سے باندھ دیا گیا تھا، اور وہ آگ اور سانپ کے جبروں کے درمیان لٹک رہا تھا۔

شعلے اس کے بالوں کو چمکدار روشنی کے ساتھ نگل رہے تھے۔ اس کی نصف وجود آگ میں جھلس رہا تھا، جبکہ دوسرا حصہ ازگر کی قید میں تھا۔ یہ درد ایک ناختم ہونے والے عذاب کا پیش خیمہ تھا۔

دوسری طرف، حکمت ایک عذاب سے دوچار تھا جو روح تک جا پہنچا تھا۔ ایک نادیدہ قوت نے اسے خاردار درخت پر جکڑ دیا تھا، جس کے کانٹے اس کے گوشت میں پیوست ہو چکے تھے۔

ہر سانس اس کے لیے ایک نیا عذاب لے کر آتی تھی، ہر لفظ ایک نئی اذیت کی گواہی دیتا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا، جو درخت کی ٹہنیوں پر بے رحم قطرات کی طرح ٹپک رہا تھا۔

حکمت کی نظریں سرور پر جمی تھیں، اس کی آنکھوں میں مایوسی اور غصہ ایک ساتھ اُٹ رہا تھا۔
- ”سرور!“ - اس نے غم اور غصے کے ملے جلے لہجے میں کہا، -

”تم نے مجھے اس جہنم میں دھکیل دیا، تمہاری بدکاری نے مجھے اس ابدی عذاب میں جھونک دیا۔“ اس کی آواز میں ایک ایسی شدت تھی کہ جیسے وہ اللہ کے دربار میں سرور کے خلاف فیصلہ چاہتا ہو۔

۔ ”یا اللہ! اس ملعون سرور کو ویسا ہی عذاب دے جیسا تو نے مجھے دیا ہے، بلکہ اس سے دگنا، اس کو ایسا درد دے جو کبھی ختم نہ ہو! اے رب العزت، میں تیری بارگاہ میں التجا کرتا ہوں کہ مجھے بخش دے! میں نے جو کچھ بھی کیا، اس ظالم کے بہکانے پر کیا، اس کی اندھی تقلید میں چلتا رہا۔

یا اللہ! اس کو وہ عذاب دے جو ہمیشہ کے لیے اس کی روح کو ہلا ڈالے۔ میں برباد ہوا اس کے کہنے پر، اور اب یہ میرے انجام کا ذمہ دار ہے، اے اللہ اس پر بھی وہ لعنت نازل کر جو ہمیشہ کے لیے اس کے وجود کو جلا ڈالے!“۔

حکمت کی چیخیں دم توڑتی جا رہی تھیں، اس کے الفاظ آگ میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ پوری طرح اس دکھتی ہوئی آگ میں قید ہو چکا تھا، اس کا وجود ایک لامتناہی درد میں تحلیل ہو رہا تھا۔

یہ جہنم کا وہ عذاب تھا جہاں چیخیں بھی بے اثر ہو جاتی ہیں، اور جسم و روح دونوں ایک ایسے اذیت ناک انجام کی طرف بڑھتے ہیں جس کا کوئی خاتمہ نہیں۔

...°...

نیند اور بیداری کے بیچ کی دھندلی سرحد پر، شانزہ نے خود کو ایک ڈراؤنے خواب کے عمیق گہرائیوں میں پھنسا پایا۔

جس کمرے میں وہ بیدار ہوئی، وہ ایک عجیب تضاد تھا۔ عیش و عشرت کا نمونہ اور اندرونی بے چینی کا استعارہ۔ کھڑکی کی درزوں سے آتی ہوا، باہر کے حسین منظر کو بے نقاب کرتی، جہاں ایک ندی کے کنارے گھوڑے سرسبز گھاس چر رہے تھے، لیکن اس منظر کی خاموشی میں کہیں نہ کہیں ایک نامعلوم خطرہ چھپا ہوا تھا، ایک انجانا اندھیرا، جس نے ہوا میں بے چینی کی لہر دوڑادی۔

قرآن کی تلاوت میں مشغول سندس نے جیسے ہی شانزہ کے اچانک بیدار ہونے کو محسوس کیا، اس کے چہرے پر ظاہر ہونے والے جھٹکے اور ہر اس کو فوراً بھانپ لیا۔

شانزہ کی آنکھیں خوف اور وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں، جیسے کمرہ خود اس پر حاوی ہو رہا ہو، اس کی سانسیں بے قابو تھیں، اور وہ اپنے وجود کی گہرائیوں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سندس نے اپنی پریشانی کو فوراً محسوس کیا اور اس کے پاس دوڑتی ہوئی آئی۔ اس نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے پانی کا گلاس بھرا اور شانزہ کے سامنے پیش کیا۔

شانزہ نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھاما اور ایک ہی سانس میں پانی پی گئی، جیسے وہ اپنی پیاسی روح کو اس ٹھنڈک سے تسکین دے رہی ہو۔

پانی نے وقتی طور پر اس کی گھبراہٹ کم کی، لیکن اس کی پریشانی پر پسینے کے قطرے ابھی بھی جمی ہوئی چمک رہے تھے، جیسے وہ کسی نامعلوم عذاب کی علامت ہوں۔

اس نے اپنے حواس کو مجتمع کیا، اور وہ لفظ زبان سے ادا کیا جس نے اس کے خواب میں خوفناک گونج پیدا کی تھی۔ ”بابا۔“

سندس، جواب تک شانزہ کی کیفیت سے متوجہ تھی، اس لفظ کے اثر سے لرزا اٹھی۔ جیسے ہی شانزہ کی زبان سے یہ کینیت نکلی، کمرہ مزید سرد اور خاموش ہو گیا۔

سندس کی آنکھوں میں ماضی کے بوجھ کی جھلک تھی۔ ایک درد جو ہمیشہ دل کے اندر چھپا رہتا تھا، لیکن آج شانزہ کے الفاظ نے اسے بے نقاب کر دیا۔

شانزہ کی آواز میں کانپتی ہوئی صداقت اور اذیت تھی جب اس نے اپنے خواب کے مناظر بیان کرنے کی کوشش کی، ”بابا... وہ عذاب میں ہیں، سندس... وہ شدید تکلیف میں ہیں۔“

یہ سن کر سندس کے دل میں ایک نامعلوم درد جاگ اٹھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنی آنکھوں میں چھپے غم کو دباتے ہوئے، اپنی نظریں جھکا لیں۔

شانزہ کی باتوں میں جو خوف اور وحشت تھی، وہ سندس کے دل کے گوشوں میں چھپے رازوں کو جھنجھوڑنے لگی۔ ”بابا نے اپنے اعمال کی سزا پالی ہے...“

سندس نے دھیمے لہجے میں کہا، جیسے وہ خود اپنے دل کو تسلی دے رہی ہو، لیکن شانزہ کی نظریں اس کی طرف متوجہ تھیں، اور وہ حقیقت سے منہ نہیں موڑ سکتی تھی۔

سندس نے لمحہ بھر کے لیے خاموشی اختیار کی، پھر ایک گہری اور تھکی ہوئی سانس کے ساتھ وہ تلخ حقیقت زبان پر لے آئی جسے برسوں سے شانزہ دل کے نہاں خانوں میں دفن کیے ہوئے تھی۔ وہ سچ، جو ایک بوجھ بن کر اس کے سینے میں جکڑا رہا تھا۔ جب سندس پر سرور کے سیاہ کارناموں کا پردہ چاک ہوا، تو اس نے یہ راز بھی عیاں کر دیا، گویا سالوں کی خاموشی ایک ہی لمحے میں ٹوٹ گئی ہو۔

۔ ”وہ... کالا جادو کرتے تھے، شانزہ۔ اور میری ماں... وہ بھی ان کے سیاہ اعمال کا شکار ہو گئی تھی۔ بابا نے جادو کے زور سے امی کو اذیت میں مبتلا کر دیا تھا، اور پھر... ان کی موت کا باعث بنے۔“

۔ ”ہمیں یہ سچ سب کو بتانا ہو گا، سندس!“ شانزہ نے پختگی کے ساتھ کہا،

وہ مزید بولی۔

۔ ”بابا کوئی نیک شخص نہیں تھے۔ وہ ایک گھناؤنے انسان تھے جنہوں نے ہماری زندگیاں تباہ کر دیں۔“

سندس، جو پہلے سے ہی اس راز کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی، شانزہ کی اس اچانک شدت کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ سندس نے بے یقینی سے پوچھا، جیسے وہ جانتی ہو کہ شانزہ کسی خطرناک راستے کا انتخاب کرنے والی ہے۔

شانزہ نے ایک لمحہ کے لیے توقف کیا، پھر پختگی سے جواب دیا، ”میں گل بانو کی سہیلی کے گھر جا رہی ہوں۔ وہ وہاں موجود ہے، اور میں سب کو بتانے جا رہی ہوں کہ ہمارے بابا کون تھے، اور انہوں نے کیا کیا تھا۔“

سندس نے شانزہ کو روکنے کی کوشش کی،

۔ ”کیا آپ کو یاد ہے جب ہم آخری بار احمر کے گھر گئے تھے؟ وہاں جو افتاد پیش آئی تھی، وہ آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔ انہوں نے نہایت تحقیر آمیز انداز میں ہمیں گھر سے بے دخل کر دیا تھا، اور بابا نے تمام تر الزام آپ کے سر تھوپ دیا تھا کہ آپ ان کے روحانی اعمال میں خلل ڈالنے کی سعی کر رہی ہیں۔

بابا کا دعویٰ تھا کہ آپ کی دشمنی کی جڑیں بہت گہری ہیں، اور اسی بنا پر آپ نے احمر پر سحر کیا تا کہ بابا کا عمل الٹا پڑ جائے۔ احمر کی والدہ کا گمان تھا کہ آپ اس نکاح کو اس لیے روک رہی ہیں کہ کہیں بابا یہ جادو نہ توڑ دیں، اور کہیں آپ کی سعی ناکام نہ ہو جائے۔“

شانزہ کی آنکھوں میں ایک عزم کی چمک تھی، وہ اب پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی۔ ”اس بار ہمارے پاس ثبوت ہیں۔ اگر مجھے بابا کی قبر بھی کھودنی پڑی تو میں یہ سچائی سب کو بتا کر رہوں گی۔“

سندس نے آخر کار شانزہ کے ارادے کو قبول کر لیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور کہا، ”ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ دونوں نے اس مشترکہ عزم کے ساتھ قدم بڑھائے کہ اب خاموشی کوئی آپشن نہیں رہی۔

سرور کے گناہوں کا سایہ ان پر پڑتا جا رہا تھا، اور وہ جانتی تھیں کہ اب سچائی کا پردہ اٹھانا ہی ان کا واحد راستہ تھا۔

...°...

گل بانو نے خود کو ایک ایسے کمرے میں تنہا پایا جس کی فضا میں پھیلی ہوئی اداسی اور پراسرار خاموشی نے گاؤں کی روایتی دلکشی کو ایک عجیب و غریب ماحول میں ڈھال دیا تھا۔

وہ کھڑکی کے قریب ایک پیچیدہ نمونوں سے مزین بستر پر بیٹھی، نرمی سے اپنی پشت کو دیوار کے ساتھ ٹکائے باہر کے منظر کو تکتے ہوئے ایک عجیب بے چینی میں مبتلا تھی۔

دن کی روشنی جو کھڑکی سے چھن کر اندر آرہی تھی، گویا اس کی داخلی بے سکونی کو مزید نمایاں کر رہی تھی۔ اس کے ارد گرد خاموشی کا پہرہ تھا، لیکن سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی مدھم آواز، جو آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی، اس کے دل میں کسی انجانی امید کو جگا رہی تھی۔

اسی اثنا میں، اس کی میزبان، جو کہ اس کی ایک قریبی سہیلی تھی، کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا، ”گل بانو، شانزہ تم سے ملنے آئی ہے۔“ یہ خبر سن کر گل بانو کے دل میں کئی جذبات بیک وقت جاگ اٹھے۔

ابتدا میں اس کے چہرے پر غصے اور ناگواری کی جھلک دکھائی دی، لیکن جیسے ہی سندس بھی شانزہ کے ساتھ اندر آئی، گل بانو کے چہرے کے تاثرات نرم پڑنے لگے۔ ”تم بھی شانزہ کے ساتھ ہو؟“۔۔ گل بانو نے حیرت اور تجسس کے ملے جلے جذبات سے پوچھا، ”مولانا صاحب نے تو کہا تھا کہ تم اس شادی کے حق میں نہیں تھیں، اسی لیے تم نے اپنی سہیلی کے گھر پناہ لی ہے۔“۔

سندس، جو سفید عبایا اور نقاب میں ملبوس تھی، آہستہ سے اپنی چادر کا نقاب ہٹا کر گل بانو کے قریب آئی۔ سندس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا، ”میں اس شادی کے خلاف اس لیے تھی کیوں کہ یہ شادی نہیں، بلکہ ایک جرم تھا۔“۔

گل بانو، جو کہ سندس کی بات سے پوری طرح آشنانہ تھی، سوالیہ انداز میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور بولی، ”آہ... مطلب؟“۔

شانزہ نے جیب سے دو تصویریں نکالیں اور گل بانو کے سامنے پھینک دیں۔ گل بانو کے چہرے پر تشویش کی سلوٹیں گہری ہونے لگیں۔ پہلی تصویر میں احمر کو دکھایا گیا تھا، جس پر کالے جادو کے اثرات صاف نظر آرہے تھے، جبکہ دوسری تصویر میں خود گل بانو تھی، جس کے چہرے پر محبت کے جادو کے اثرات واضح تھے۔

شانزہ نے ایک تلخ حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا، ”یہ میں نہیں تھی، گل بانو... یہ سب بابا کا کیا دھرا تھا۔ تم پر جادو کیا گیا تھا، اور احمر بابا کی بدنیتی کا شکار ہوا تھا، نہ کہ میری وجہ سے۔ میں تمہیں اس دن خبردار کرنے آئی تھی، لیکن بابا نے تمہیں میرے خلاف کر دیا۔“

پھر شانزہ نے گل بانو کے سامنے نیلی اور گلابی کنگھیوں کو پیش کیا اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا، ”یہ وہ ہی کنگھیاں ہیں جو تم اور احمر نے بابا کے گھر استعمال کی تھیں۔ بابا نے ان بالوں پر جادو کر کے احمر کو شدید بیماری میں مبتلا کر دیا۔“

یہ سن کر گل بانو کی آنکھوں میں ندامت اور شرمندگی کے آنسو بھر آئے۔ اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور جیسے اپنی بے بسی اور شکست کو محسوس کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔

شانزہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، جیسے وہ گل بانو کے دل کے درد کو تسکین دینے کی کوشش کر رہی ہو۔

گل بانو نے شکستہ لہجے میں شانزہ کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی خاموش التجا تھی۔ شانزہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، ”تم نے اللہ کو چھوڑ کر دنیاوی فریبوں پر بھروسہ کیا، لیکن یہ سب اللہ کی طرف سے ہم سب کے لیے ایک آزمائش تھی۔“

گل بانو کی آواز آنسوؤں سے بھرپور تھی جب اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا، ”اب میرا کیا ہو گا؟ مجھے طلاق مل چکی ہے...“۔

شانزہ نے نرمی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”فکر نہ کرو، تمہارے پاس دو موقع ہیں۔ اور ساتھ ہی اللہ نے مجھے علم عطا کیا ہے، اور میں احمر کے اوپر سے جادو کو ختم کر دوں گی۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا، ان شاء اللہ۔“۔

دفعۃً گل بانو کی سہیلی ایک سفید رنگ کا لفافہ تھامے کمرے میں داخل ہوئی، ہوا میں ایک عجیب سا سکوت طاری ہو گیا۔ سہیلی نے لفافہ گل بانو کی طرف بڑھایا، جس کے تھر تھراتے ہاتھوں نے بے یقینی کے عالم میں اسے تھاما۔

کمرے کی فضا میں ایک غیر مرئی بوجھ سائٹک رہا تھا، جیسے کہ آنے والے انکشاف کی سنگینی کو سب محسوس کر رہے ہوں۔

گل بانو نے انتہائی دھیمی اور نازک حرکت سے لفافہ کھولا، جیسے وہ کسی مقدس راز کی پر تیں چاک کر رہی ہو۔ لفافے کا کاغذ کھلتے ہی، اس کی آنکھیں حیرت کے سمندر میں ڈوب گئیں۔

ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ اس کے چہرے پر دھیرے سے مسکراہٹ پھیلنے لگی، اور اس نے بے ساختہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا، جیسے کسی ناقابل یقین حقیقت کو قبول کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

شانزہ اور سندس، جو اس کی حالت کو بغور دیکھ رہی تھیں، خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

ان کے چہروں پر ایک خاموش فہمیدگی کی جھلک تھی۔ پھر جیسے سب کچھ ایک لمحے میں واضح ہو گیا۔ گل بانو ماں بننے والی تھیں۔ ایک ایسی خبر جو اس کے لیے شاید دنیا کا سب سے بڑا انعام اور سکون تھا۔

شانزہ نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ گل بانو کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولی، ”دیکھو، اللہ نے تمہاری دعا سن لی۔“

اس کے الفاظ میں ایک گہری روحانی سچائی اور تسلی چھپی تھی، جیسے وہ زندگی کے رازوں اور الہی منصوبے کی گہرائیوں کو سمجھ رہی ہو۔ ”سب کچھ اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ ہم نہ جلدی میں ہیں اور نہ دیر سے۔ یہ سب اللہ کے منصوبے کا حصہ ہوتا ہے، جو ہم نہیں جانتے، لیکن جس میں ہماری بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔“

شانزہ کے یہ الفاظ اس لمحے کی سنجیدگی اور تقدس کو مزید بڑھا رہے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا معجزہ تھا، اللہ کی قدرت کا ایک نمونہ جو زندگی کے پردوں میں چھپا رہتا ہے اور وقت پر ظاہر ہوتا ہے۔

امید، رحمت اور الہی حکمت کی یہ گھڑی، گویا قسمت کے پیچیدہ دھاگوں کا ایک منظر تھا جو اپنے وقت پر کھل کر سامنے آ گیا تھا۔

گل بانو، جو ابھی کچھ دیر پہلے اپنی زندگی کی مشکلات میں گم تھی، اب اپنی آنکھوں میں ایک نیا عزم اور شکر گزاری لیے بیٹھی تھی۔

یہ لمحہ، اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا ایک معجزہ تھا۔ ایک نئی زندگی کی نوید، جو سب کے دلوں کو امید اور سکون سے بھر گئی۔

...°...

احمر کے گھر کو عروسی شان کے ساتھ سجاوٹ کی زینت بخشی گئی تھی، جس کی ہر ایک کونے میں خوشبوؤں کا ہلکا سا ارتعاش محیط تھا۔

نرم روشنیوں نے سچی ہوئی محرابوں پر چمکتے ہوئے موتیوں کی مانند جھلک دکھائی، اور خوشبودار پھولوں کے گلدستوں سے نکلتی مہک ہوا کے ساتھ بہکتی چلی گئی۔

میزیں جو مخملی کپڑے اور سنہری کشیدہ کاریوں سے مزین تھیں، دلہن اور دولہا کے لیے ایک مقدس چبوترے کی طرح آراستہ تھیں۔

اس میز کے اطراف میں، احمر اور گل بانو بیٹھے تھے، ایک دوسرے کے سامنے، جیسے کہ اس نئے تعلق کے آغاز کا ایک دلکش منظر ہو۔

احمر، جس کا چہرہ بیماری کی دبیز پرتوں سے گھرا ہوا تھا، اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے جیسے زندگی کی طویل جدوجہد کا گواہ ہوں، پھر بھی ایک ایسی مسکراہٹ سے مزین تھا جس میں سچائی اور محبت کی شعاعیں جھلک رہی تھیں۔

اس کے چہرے کی زردی کے باوجود، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی نرمی نے تمام دردوں کو بھلا دیا۔ گل بانو، جس کی آنکھوں میں سکون کی روشنی تھی، اس منظر کی سادگی میں ایک غیر معمولی حسن دکھا رہی تھی، جیسے کہ وہ اس لمحے کو تقدیر کا حسین فیصلہ مان رہی ہو۔

ان کے ارد گرد موجود خیر خواہوں نے اس لمحے کی عظمت کو محسوس کرتے ہوئے دعاؤں میں ہاتھ اٹھائے۔ کمرے کے ایک طرف، شانزہ اور سندس، نازک مخمل کے عباؤں میں ملبوس، جیسے دو خوشنما مجسمے کھڑی تھیں، اپنے دل میں خاموشی سے اس مقدس تقریب کی برکتیں مانگ رہی تھیں۔ ہوا میں ایک غیر مرئی تسکین کا احساس تھا، جیسے قدرت نے اس گھڑی کی قدرو منزلت کو تسلیم کر لیا ہو۔

نکاح کے مقدس الفاظ ادا ہوتے ہی، تتلیوں کا جھرنا ہوا میں چھوڑا گیا، جو ہوا کے ہلکے جھونکوں کے ساتھ ناچتی ہوئی فضا میں بکھرتی چلی گئیں۔ یہ تتلیاں، جن کے پروں پر زندگی کے رنگ بکھرے ہوئے تھے، ان مشکلات کا اختتام اور ایک نئی خوشی کا آغاز تھیں، جنہیں گل بانو اور احمر نے برداشت کیا تھا۔

اللہ نے انہیں آزمائشوں میں ڈالا، ان کی قوتِ صبر کو ناپا، لیکن آخر کار ان کی دعائیں سن لی گئیں۔

گل بانو، جو پہلے اپنی لاعلمی کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی تھی، اب الہی حکمت کے اس راز کو پا چکی تھی کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے، اور وہ ہی ہر مشکل کے بعد آسانی پیدا کرنے والا ہے۔

فضا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی جب رنگین بادل پہاڑوں کے پیچھے سے طلوع ہونے والے سورج کے ساتھ جھلملانے لگے۔ یہ بادل، اپنی چمک میں، گاؤں کی زندگیوں میں سکون اور ہم آہنگی کی علامت تھے۔

احمر اور گل بانو کے اس مقدس اتحاد کی خوشی میں ایک پرندہ، اپنے نازک پروں کو ہوا کے ساتھ تھپکتے ہوئے، آسمان کی وسعتوں میں اڑتا ہوا دور چلا گیا۔

اس کے پروں کی نرم تھپکیوں کے ساتھ، وہ زمین کے اس حسین منظر میں تیرتا گیا جہاں ہر درخت، ہر مکان، اور ہر ذرے نے ان خوشیوں کا مشاہدہ کیا جو اس اتحاد کے ساتھ جڑی تھیں۔ پرندہ، آزادی اور سکون کی علامت بن کر، نیلے آسمان میں دور تک اڑتا رہا، اور زمین کی تزئین میں بدلتے مناظر کو اپنی نظروں میں سمیٹتا رہا۔

نیچے، سرسبز کھیتوں کے بیچ، شانزہ اور سندس ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ دونوں بہنیں، اپنے نقاب اور عباؤں میں ملبوس، زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے، خاموشی سے اپنے مقصد کی طرف رواں تھیں۔ فضا میں پردے ہلکے ہلکے جھوم رہے تھے، جیسے ہوانے ان کے قدموں کی آہٹوں کے ساتھ اپنی ہم آہنگی ملا لی ہو۔

پرندہ، اس فضا میں اپنی سمت کی تلاش میں، آخر کار شانزہ اور سندس کی جانب اترنے لگا۔ وہ دونوں اپنی گفتگو میں مشغول تھیں، لیکن پرندے کی پھڑپھڑاہٹ نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔

جیسے ہی پرندہ آہستہ آہستہ نیچے اُترا، وہ ایک ایسی قوت کی نمائندگی کرتا تھا جس نے ان سب کی زندگیوں کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔ رنگ برنگے بادلوں کی چمک اور پہاڑوں کی شان و شوکت کے نیچے، یہ پرندہ زندگی کی خوبصورتی اور آزمائشوں کے بعد حاصل ہونے والے سکون کی علامت تھا۔

فضا میں ایک خاموش عزم کی بازگشت سنائی دے رہی تھی، اور ہر منظر، ہر حرکت، اور ہر سانس میں قدرت کی حکمت کی جھلک تھی۔

...°...

شانزہ اور سندس، سرسبز کھیتوں کی تہہ کو اپنے قدموں تلے محسوس کرتی ہوئی، دھیرے دھیرے اپنے گھر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ندی کا گنگنا تا بہاؤ ان کے ساتھ ساتھ جیسے کوئی قدیم گیت گنگنا رہا ہو، جبکہ نرم ہوا کے جھونکے میں جنگلات کی خوشبو اور پھولوں کی مہک شامل ہو کر ایک وجدانی ماحول باندھ رہی تھی۔

ان کا گھر، جو کہ ہنزہ کے طرز تعمیر کا شاندار مظہر تھا، ایک وسیع و عریض پہاڑ کی آغوش میں بنا ہوا تھا، اور اپنے آپ میں ایک آرٹ کا نمونہ دکھائی دے رہا تھا۔

جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچیں تو شانزہ کی نظر ایک وکیل پر پڑی، جو ان کا منتظر تھا۔ اس کے پہلو میں کھڑا، بہرام، اپنی پرسکون شخصیت اور روایتی ہنزائی لباس میں، سرسبز آنکھوں کی سحر انگیز چمک کے ساتھ مکمل تھا۔

شانزہ نے حیرت بھری نگاہوں سے پوچھا، ”بہرام، سب خیریت ہے؟“۔

بہرام نے اپنی خاموش مگر مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا، ”ہاں، وکیل جائیداد کے کاغذات لے کر آیا ہے۔“

تاہم، سندس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے اضطراب کی پرچھائیں گزریں، جیسے اس کے والد، سرور کے گناہوں کی وراثت نے اس کے دل میں ایک بوجھ ڈال دیا ہو۔ شانزہ نے سندس کے اندرونی اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے وکیل کی طرف متوجہ ہو کر کہا، ”چلیں، یہ معاملات گھر کے اندر ہی زیر بحث لاتے ہیں۔“

گھر کے اندر کا ماحول، قدرتی روشنی سے معمور اور ہوا کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ سے معمور تھا۔ کھڑکیوں سے باہر، وادی کا حسن اپنی انتہا کو چھو رہا تھا، جیسے قدرت نے اس بحث میں اپنی موجودگی کا اظہار کر رکھا ہو۔

وکیل نے، اپنی پیشہ ورانہ مگر نرمی سے بھرپور آواز میں، جائیداد کی قانونی حیثیت اور اس کے حقوق کی تفصیلات بیان کیں۔ ”یہ جائیداد، جو کئی برسوں کی محنت اور جمع شدہ دولت کا نتیجہ ہے، اب آپ دونوں یعنی شانزہ اور سندس کی قانونی ملکیت ہے۔“

بہرام نے اطمینان بھری نگاہ دونوں بہنوں پر ڈالی، جیسے ان کی حمایت میں خاموشی سے شامل ہو۔ لیکن سندس کے دل میں والد کی ماضی کی خطاؤں کی تلخی گونجتی رہی۔ اس نے کاغذات کو مٹھی میں جکڑا اور ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی، ”میرے والد نے یہ جائیداد ناجائز طریقوں سے حاصل کی، کمزوروں کو دھوکہ دے کر، ان کی محنت کا استحصال کر کے۔ ہم اس داغدار وراثت کو قبول نہیں کر سکتے۔“

شانزہ نے سندس کے جذبات کی توثیق کرتے ہوئے کہا، ”یہ دولت ہمارے لیے آزمائش ہے، ہمیں اس کا کوئی حق نہیں۔ ہم اپنی آخرت کے بدلے دنیاوی فائدہ نہیں لے سکتے۔“

اس لمحے میں، آس پاس کی قدرتی مناظر بھی جیسے اس مکالمے کے بوجھ کا حصہ بن گئے۔ پھولوں کی تازگی اور دریا کی نرم بہاؤ، اس روحانی منحصے کے عکاس بن گئے، جس میں دونوں بہنیں مبتلا تھیں۔

وکیل نے بہرام کی طرف دیکھا، جیسے کوئی حل نکالنے کی توقع کر رہا ہو، لیکن بہرام نے کندھے اچکاتے ہوئے اشارہ کیا کہ یہ معاملہ وہی بہتر جانتی ہیں۔

وکیل نے ایک لمحہ خاموشی کے بعد ایک متبادل پیش کیا، ”آپ اس دولت کو ایک نیک مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، جیسے کہ یتیم خانہ قائم کرنا۔ یہ دولت ان لوگوں کی خدمت میں لگائی جاسکتی ہے جو اس کے اصل حقدار ہیں۔“

بہرام نے شانزہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس تجویز کی حمایت کی،۔

۔ ”بے شک، یہ دولت جب کسی نیک مقصد کے لیے وقف ہو جائے گی، تو گویا اس کی تطہیر ہو جائے گی، اور اس کا اصل فائدہ روشن ہو گا۔

لیکن اگر یہ مال کسی اور کے سپرد کیا جائے، تو اس کی خیر یا شر میں استعمال کی بابت کوئی یقینی گمان قائم نہیں کیا جاسکتا۔ کون جانتا ہے کہ وہ اس امانت کو نیک ارادوں کے ساتھ خرچ کریں گے یا اس کا حق ادا نہ کر سکیں گے؟ اس کے مصرف کے بارے میں بے یقینی ہمیشہ باقی رہے گی، اور یہ شک بھی کہ آیا وہ اس دولت کو جائز مقاصد کے لیے بروئے کار لائیں گے یا نہیں۔”

شانزہ اور سندس نے آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا، اور ان کی آنکھوں میں اتفاق کی جھلک نظر آئی۔
”ہمیں اس دولت پر کوئی حق نہیں، لیکن ہم اسے لوگوں کی خدمت کے لیے استعمال کریں گے۔“
دونوں بہنوں نے یک زبان ہو کر اس منصوبے کو قبول کیا، اور یوں داغدار وراثت کو نیکی کے راستے پر لگانے کا فیصلہ کیا۔

یہ لمحہ قدرت کی آغوش میں ایک نئی شروعات کا پیش خیمہ تھا، جہاں اخلاقی آزمائشوں نے روحانی فتح کا دروازہ کھولا، اور دنیاوی مال و دولت کو ایک نیک مقصد کے لیے وقف کرنے کی خواہش نے دونوں بہنوں کے دلوں کو سکون عطا کیا۔

...°...

عقاب ہنزہ کے بلند و بالا پہاڑوں کے اوپر اپنے شاہانہ پروں کو پھیلائے ہوا کے نرم جھونکوں کے ساتھ بہتا ہوا جا رہا تھا، جہاں برف کی سفید چادر میں لپٹے پہاڑ اور سرسبز و شاداب وادیاں قدرت کے حسن کی شاعری کا اظہار کر رہی تھیں۔

عقاب کی پرواز میں ایک سکون تھا، جیسے وہ اس بلندی سے نیچے پھیلے مناظر کو اپنے ذہن میں جذب کر رہا ہو، وادیوں کے ساکت و ساکن خاموش مناظر اور دریا کے سرگوشی جیسے بہاؤ کو۔

یہ پرندہ جیسے ہی آگے بڑھا، ہنزہ کے دلکش مناظر دھندلا گئے اور اس کی جگہ اسلام آباد کی شہری وسعت نے لے لی۔

مارگلہ کی پہاڑیوں کے نیلے شیڈ، فیصل مسجد کے چمکتے گنبد، اور سینٹورس کی عظیم الشان عمارتوں کے سائے اس کے نیچے پھیلتے چلے گئے۔

عقاب نے اسلام آباد کے منظم سیکٹروں کو پار کیا، جیسے کسی پوشیدہ نقشے کی پیروی کر رہا ہو، حتیٰ کہ وہ ایمان کے گھر کی مانوس فضا تک پہنچ گیا۔

گھر کے اندر، ایمان اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی، ماضی کی تلخ یادوں میں گندھی ہوئی، جیسے وہ اپنی ہی کہانی کا تمسخر اڑا رہی ہو۔ ”کیا میں باہر تمہارے لیے سرخ قالین بچھاؤں؟ اور پھر اس پر کھڑے ہو کر گاؤں کی گلیوں میں گنگناؤں؟“ مورا تم بن جیانا جائے؟“ اس کے

الفاظ میں چھپے طنز کی کاٹ صاف محسوس ہوتی تھی، جیسے وہ اپنے اندر کے درد کو یوں ہوا دے رہی ہو کہ وہ تمسخر کے پردے میں ڈھل جائے۔

دوسری جانب نیچے لان میں خالدہ اپنی ہی دنیا میں مگن تھی، جبکہ اس کا بلالان کے کسی کونے میں بے فکری سے کھیل رہی تھی۔

ایمان، جس کے بال ایک وقت گنچے ہو چکے تھے، اب گھنے اور شہد رنگ بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے، جو اس کی دادی سے ورثے میں ملے تھے۔

اس نے موبائل فون اپنے کان سے لگا رکھا تھا، اور کال کے دوسری طرف سے مونیٹر کی آواز آرہی تھی۔
”تین ماہ ہو گئے ہیں، ایمان۔ تب بولا میں نے کہ تمہیں میری یاد نہیں ستاتی مگر تم تو بدل چکی ہو۔“

ایمان نے ایک سرد اور بے پروائی بھرے انداز میں جواب دیا، ”کیا میں کوئی گرگٹ ہوں جو رنگ بدل دوں؟ وہ ہی نیفسی ہوں جو ہمیشہ تھی۔“

مگر مونیٹر، جو ایمان کی تبدیلی کو محسوس کر چکا تھا، فوراً بولا، ”کیا تم نے اپنی زبان کو زہر میں ڈبو لیا ہے؟ تم پہلے جیسی نہیں لگ رہی، ایمان۔“

ایمان کی نگاہ چھت کی طرف اٹھی اور اس نے چہتے ہوئے لہجے میں جواب دیا، ”لیکن میرے زہر کا تمہارے اوپر کوئی اثر کیوں نہیں ہو رہا مویز۔“ اس کے لہجے میں تلخی اور ملامت دونوں کی گہری آمیزش تھی۔

مویز نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے ملاقات کی بات چھیڑی، ”کل مل رہے ہیں، ایمان ہم۔“

ایمان نے نیم بے زاری سے جواب دیا، ”ہاں، کل ملتے ہیں۔“ اس نے بے پروائی سے اپنے ناخنوں کے کناروں کو کریدتے ہوئے کہا اور موبائل فون کو اپنے پہلو میں رکھ دیا، جیسے وہ اس گفتگو سے آزاد ہو چکی ہو۔

یہ خاموش لمحے ایمان کی زندگی میں ایک گہرے راز کی ترجمانی کر رہے تھے، جس میں سرور اور اس کا شاگرد ایک پر اسرار حادثے کا شکار ہوئے تھے۔

ایمان کی زندگی کی تاریک پرتوں میں یہ واقعہ ایک مخفی راز کی طرح دفن تھا، جو بظاہر حادثہ تھا لیکن در پردہ اس کی اپنی شرکت کا اشارہ دے رہا تھا۔

سرور اور اس کے عقیدت مند شاگرد کا اختتام ایک الہی منصوبے کا حصہ تھا، جس میں ایمان خود بھی انجانے طور پر شریک تھی۔

ایمان کو اس بات کا یقین تھا کہ یہ راز ہمیشہ اندھیروں میں ہی دفن رہے گا۔ سرور کی موت اور اس کے شاگرد کی حادثاتی ہلاکت ایک ایسی داستان تھی جس کی اصلیت کو ہمیشہ پوشیدہ رکھا جائے گا۔ ایمان نے ان واقعات کو الہی منصوبہ بندی کا حصہ تسلیم کر لیا تھا، جو کہ اس کی زندگی کا رخ بدلنے والا واقعہ تھا۔

ان گہرے خیالات کے درمیان، ایمان اپنے آس پاس موجود پانچ گلہریوں میں سکون پاتی تھی۔ وہ گلہریاں، جو ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی تھیں، اب اس کے لیے کسی الہی پیغام کی مانند بن گئی تھیں۔ جیسے ابابیل پرندے کعبہ کی حفاظت کے لیے الہی مددگار بنے تھے، ویسے ہی یہ گلہریاں ایمان کی زندگی کے اہم موڑ پر اس کی مددگار بن چکی تھیں۔

ایمان نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے دل کی گہرائیوں سے اللہ کے اس فیصلے پر یقین کرتے ہوئے کہا، ”اللہ کی مصلحتوں کو کون جان سکتا ہے؟ شاید یہ گلہریاں بھی اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ ہوں، جیسے ابابیل کعبہ کے لیے تھیں۔“ اس نے محسوس کیا کہ اللہ کے منصوبے میں کوئی بھی چیز معمولی نہیں، ہر شے میں ایک حکمت اور مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔

...°...

لان کی خاموشی، جہاں سورج کی کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن کر گھاس پر پیچیدہ نقش و نگار بنا رہی تھیں، اچانک ایک عجیب ہلچل کا مرکز بن گئی۔

خالدہ کا بلا، جو اپنے وقار میں ڈوبا ایک تنہا چوکیدار کی مانند بیٹھا تھا ارد گرد کے ماحول پر اپنی نیم بند آنکھوں سے نظر جمائے ہوئے تھی۔

اس کی نگاہیں ریگتے ہوئے کیڑوں پر مرکوز تھیں، جو وقتاً فوقتاً اس کی بے چین ہوتی ہوئی دم کی حرکت سے متوجہ ہو رہے تھے۔

اچانک، پانچ شریر گلہریاں، جنہوں نے اُس دن ایمان کے لئے دروازہ کھولا تھا، منظر میں وارد ہوئیں۔ ان کی چمکتی آنکھوں میں شرارت کے الاؤ جل رہے تھے، اور وہ ایک طرف محفوظ پناہ گاہ میں جمع ہو کر جیسے کوئی خفیہ منصوبہ ترتیب دے رہی تھیں۔

ان کی پھولی ہوئی دیم بار بار حرکت کرتی تھیں، جیسے کسی بڑی سازش کی تیاری ہو رہی ہو۔ ان میں سے ایک گلہری، جو شاید سب سے زیادہ دلیر تھی، آگے بڑھی اور ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا لیا۔

اس گلہری کی نیت صاف تھی: بلے کو پریشان کرنا۔ وہ نشانہ باندھ کر پتھر کو انتہائی مہارت سے بلے کی طرف اچھالتی ہے۔ پتھر بلے کی آنکھ پر جا لگتا ہے، اور بلے کے جسم میں ایک غیر متوقع جھٹکا بھر جاتا ہے۔

بلا جو اپنی خاموش مشاہداتی حالت میں تھا، اس اچانک حملے سے ہڑبڑا کر اٹھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور غصہ بھر ا ہوتا ہے، اور وہ فوراً ان چالاک گلہریوں کا تعاقب کرنے کے لئے لپکتا ہے۔

یوں، ایک پرسکون لان چند لمحوں میں ایک میدانِ جنگ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گلہریاں اپنی قدرتی پھرتی اور چالاکی کے ساتھ بلے کے حملے سے بچ نکلنے کی کوشش کرتی ہیں۔

ان کے تیز پنچے زمین پر مشکل سے چھوتے ہیں، جیسے وہ ہوا میں تیر رہی ہوں، اور بلا، جو اب ایک جنونی شکاری میں تبدیل ہو ہو چکا ہے، اپنی جبستی قوتوں کے ساتھ ان کے پیچھے دوڑتا ہے۔

بلے کے پنچے گھاس کو کاٹتے ہیں، جیسے وہ دشمن کو گھیرنے کے لیے زمین پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا ہو۔ ایک گلہری، جو شاید بلے کے خطرناک پنچوں کے انتہائی قریب آگئی تھی، خود کو موت کے دہانے پر محسوس کرتی ہے۔

بلے کے نوکیلے دانت اس سے چند انچ کے فاصلے پر تھے کہ عین وقت پر ایک اور گلہری، جس نے بہادری اور فراست کا مظاہرہ کرتے ہوئے، ایک اور پتھر بلے کی طرف پھینکا۔

یہ پتھر بلے کے منہ پر جا لگتا ہے، اور وہ لمحاتی طور پر اپنے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔ یہ موقع غنیمت جان کر وہ گلہری، جو بلے کے پنچوں کے نیچے تھی، جلدی سے اپنی جان بچا کر بھاگ جاتی ہے۔

بلا، جو ایک لمحے پہلے فتح کے قریب تھا، اب ناکامی کی تلخی کا سامنا کر رہا ہے۔

لان، جو کچھ دیر قبل سکون اور آرام کا منظر تھا، اب فریتی گلہریوں اور ان کے ضدی شکاری کے درمیان ایک سنسنی خیز دوڑ کا گواہ بن چکا تھا۔

بلے کی نظریں ان پر جمی تھیں، اور وہ بار بار ان کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا، مگر گلہریوں کی چالاکیاں اور ان کی شاطرانہ حکمتِ عملی اسے ناکام بناتی رہیں۔

یہ تعاقب اُس وقت اپنے نقطہ عروج پر پہنچا جب گلہریاں ایمان کے کمرے کی کھڑکی کے قریب پہنچیں، جیسے انہوں نے اپنی محفوظ پناہ گاہ کا راستہ پالیا ہو۔ بلا، جو اب پوری شدت سے ان کے قریب پہنچ چکی تھا اپنی آخری کوشش میں ان کے پیچھے لپکا۔

مگر گلہریوں نے، اپنے دشمن کی فطری جبلت سے واقف ہوتے ہوئے، ایک آخری چال کھیلی۔ ایک گلہری نے نٹ اٹھا کر بلے کی طرف پھینکا۔

یہ نٹ بلے کے منہ پر لگا، اور بلا توازن کھو کر زمین پر گر گیا۔ وہ، جو کچھ دیر پہلے ایک چست شکاری تھق، اب بے بسی کے عالم میں پڑا تھا۔

خالدہ، جو اس تمام منظر کی گواہ تھی، حیرت زدہ ہو کر بلے کی طرف لپکی۔ وہ حیرانی اور تشویش میں بلے کو اٹھا کر پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہے۔

مگر بلا جو اس لمحاتی شکست کا سامنا کر رہا تھا، اپنی آنکھوں میں ایک غیر مرئی شکار کے عزم کو لیے ہوئے، گرد و نواح کو دیکھ رہا تھا۔

لان میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی، جیسے یہ سب کچھ ایک خواب تھا۔ مگر اس خاموشی کے پیچھے وہ ہی شریر گلہریاں تھیں، جو اپنے منصوبے کی کامیابی پر دل ہی دل میں قہقہے لگا رہی تھیں، جیسے وہ جانتی ہوں کہ آج کے دن کی فتح انہی کے نام رہی۔

...°...

ایمان چھت پر نظریں جمائے، بستر پر چت لیٹی ہوئی، خیالوں میں غرق تھی۔ کمرے میں پھیلی خاموشی کو سورج کی روشنی آہستگی سے پردوں کے ذریعے چھان کر نرم سی چمک بخش رہی تھی، جیسے وقت رک سا گیا ہو۔

دفعۃً، پانچ چست گلہریاں، جواب ایمان کی زندگی میں نئے رفیق بن چکی تھیں، کمرے کی کھڑکی سے اچانک نمودار ہوئیں، جیسے کسی خفیہ پیغام کو پہنچانے آئی ہوں۔

ایمان نے نیم مسکراہٹ کے ساتھ گلہریوں کی طرف دیکھا اور پوچھا، ”تو کیا خبر ہے؟“۔

گلہریوں نے اپنے مخصوص چنچل پن سے جواب دیا، ایک تیز چھلانگ لگاتے ہوئے ایمان کی طرف لپکیں، جیسے کسی مہم جوئی کا آغاز ہو رہا ہو۔

ایمان کے لبوں پر حقیقی مسکان نمودار ہوئی، اور اس نے مزاحیہ انداز میں اعلان کیا، ”چلو، اب ایک نیا مشن۔ گلہری ریسکیو کا آغاز کرتے ہیں۔“

بستر سے اٹھتے ہوئے، ایمان نے سفید اور گلابی پھولوں سے مزین ایک نازک سی نرم شرٹ پہنی، جو بیبی پنک پٹیا لہ شلوار کے ساتھ خوبصورتی سے میل کھاتی تھی۔

اس کے بال، جو پہلے کبھی چھوٹے تھے، اب حیرت انگیز طور پر درمیانے لمبے ہو چکے تھے، درمیانی پونی کی صورت نیچے آزادانہ طور پر بہنے لگے۔

اس نے ایک چنچل موڈ کے ساتھ کیپ پہنی، جو اس کے منفرد انداز کو مزید نمایاں کرتی تھی۔

بالوں کو ایک سلیقے سے باندھ کر، کیپ کے نیچے محفوظ کرتے ہوئے، وہ تیار ہوئی۔ اس نے فلیٹ جوتے پہنے، اور ایک ماسک چہرے پر چڑھا کر کہا، ”چلو، وقت آگیا ہے!“

گھر سے نکلتے ہوئے، ایمان نے اپنی دو ہزار اٹھارہ ماڈل مہران کی ڈرائیور سیٹ پر جگہ سنبھالی، جو حالیہ تین ماہ کے دوران اس کی زندگی کا حصہ بنی تھی۔

ان مہینوں میں اس نے ڈرائیونگ میں مہارت حاصل کر لی تھی، لیکن پھر بھی اس نے مہران کی سادگی اور افادیت کو ترجیح دی، جو اس کی متوازن اور غیر دکھاوے والی شخصیت کی عکاس تھی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ کر، ایمان نے اپنے نو آموز ساتھیوں کی موجودگی کو محسوس کیا، جو اب ہر قدم پر اس کے ساتھ تھے۔

کار جیسے ہی پورچ سے آگے بڑھی، چوکس گارڈ نے بڑی سرعت سے گیٹ کھول دیا۔

ایمان نے اپنی روایتی خوش اخلاقی کے ساتھ، تین انگلیاں ماتھے تک لے جا کر انہیں نیچے کی طرف حرکت دی، یہ ایک منفرد انداز کا سلام تھا جو عزت و احترام کا غماز تھا۔ گارڈ نے جواباً مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیا اور سلامی کا احترام جواب دیا۔

یوں، مہران نے اپنی مختصر رفتار میں سڑک کا سفر شروع کیا، اور ایمان اپنے چھوٹے ساتھیوں کے ساتھ ایک غیر معمولی مہم کی طرف گامزن ہوئی۔ اس سفر میں پوشیدہ امکانات اور نادیدہ مسرتیں اس کے منتظر تھیں، جیسے زندگی نے ایک نئے باب کا آغاز کیا ہو۔

...°...

دیہات کی خاموش شام اپنے دامن میں سکون سمیٹے ہوئی تھی جب ایمان نے اپنی گاڑی گرد آلود راستے کے کنارے روک دی اور پیدل سفر جاری رکھنے کا ارادہ کیا۔

قدرت کا حسن اپنے جو بن پر تھا، سرسبز وادیوں، گھنے درختوں اور لہلہاتے میدانوں نے فضا میں ایک عجیب سی مسحور کن کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔

جیسے ہی ایمان کے قدموں کی آہٹ فضاء میں گھلی، گلہریاں درختوں کی شاخوں میں چھپتی نظر آئیں، گویا قدرت کے اس ماحول کا حصہ بن چکی ہوں۔

دور ایک گھر کی کھڑکی سے اسے ایک عجیب منظر دکھائی دیا جہاں تین گلہریاں ایک پنجرے میں قید تھیں، ان کی آنکھوں میں چھائی ہوئی اداسی نے ایمان کے دل میں ایک نامعلوم خلش پیدا کر دی۔

قریب ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی اپنے سبزیوں کے باغ کی آبیاری میں مصروف تھا۔ ایمان دھیرے سے اس کے قریب پہنچی، اس کے ہونٹوں پر ایک نرم مسکراہٹ تھی۔ مگر ان کے درمیان لوہے کی سلاخیں حائل تھیں، جیسے کوئی نادیدہ دیوار۔ ایمان نے شائستگی سے سلام کیا، ”السلام علیکم، چچا۔“

بوڑھے آدمی نے اپنی کمرسیدھی کی، چہرے پر سختی اور بے رخی واضح تھی، گویا اجنبیوں سے گفتگو کرنے کا عادی نہ ہو۔ اس نے سر دلچے میں پوچھا، ”کیا چاہیے؟“

ایمان نے دل میں ایک لمحاتی جھجک محسوس کی، مگر اپنے چہرے پر تاثر کا کوئی شائبہ نہ آنے دیا اور سکون سے جواب دیا، ”میں شہر سے آئی ہوں۔ گاڑی کا ٹائر پنچر ہو گیا ہے اور مکینک آنے والا ہے، مگر وہ کب پہنچے گا، یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ مجھے پیاس لگی ہے، کیا کچھ پانی مل سکتا ہے؟“

اسی لمحے ایمان کی نگاہ گلہریوں پر جا ٹھہری، جنہوں نے چھپتے ہوئے درخت کے پیچھے سے سب کچھ دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

بوڑھے نے بھی ان کی طرف نگاہ ڈالی اور ایک گہری فکر سے بھرپور نظر ایمان پر ڈالی۔ ان گلہریوں کا مضحکہ خیز انداز چھپنے میں مزید واضح ہو چکا تھا، جیسے وہ ایمان اور بوڑھے کے درمیان مکالمے کا کوئی راز جاننے کی جستجو کر رہی ہوں۔

بوڑھے کے چہرے پر سختی آہستہ آہستہ نرم پڑنے لگی، اس کی آنکھوں میں ایک پراسرار چمک نمودار ہوئی، جیسے وہ ایمان کے حقیقی ارادوں کو سمجھ چکا ہو۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا، ”ہاں بچی، اندر آ جاؤ، میں تمہیں پانی دیتا ہوں۔“

وہ ایمان کو دیہاتی مکان کے اندر لے گیا، جہاں پرانے فرنیچر اور بوسیدہ صوفے ماضی کی کسی بھولی بصری داستان کا پتہ دیتے تھے۔

بوڑھے شخص نے ایمان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور ایمان نے نرمی سے مسکراتے ہوئے تعمیل کی۔ جیسے ہی وہ شخص دیوار کی سمت بڑھا، ایمان کی نظریں ایک غریب و پراسرار شے پر جم گئیں — دیوار پر لٹکی ہوئی بندوق! ایک بے چینی کی لہر جیسے جسم کے ریشے ریشے میں دوڑ گئی۔

دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں جب کھڑکی سے چپکے چپکے گلہریوں نے کمرے میں داخل ہونا شروع کیا۔ ایمان نے ضبط سے اپنی حیرت کو دباتے ہوئے گلا صاف کیا اور بظاہر سکون کا پردہ چہرے پر ڈال لیا۔

اچانک، ایک بھیانک گولی کی آواز فضاء میں گونجی، جیسے آسمان کے سینے پر چوٹ لگی ہو۔ ایمان حیرت سے اچھل پڑی، دل کی دھڑکنیں ناقابلِ بیان حد تک تیز ہو گئیں۔ اضطراب اور غیض کے ملے جلے احساسات کے ساتھ وہ چیخی، ”بوڑھے، تمہارے دماغ کو کیا ہوا ہے؟ پاگل ہو گئے ہو؟“۔

بوڑھے نے غافل ہو کر گلہریوں کی طرف گولی داغ دی، گویا وہ کسی دشمن پر وار کر رہا ہو۔ ایمان کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا، اس نے صوفے کے پیچھے پناہ لیتے ہوئے اپنی آنکھیں پھیلائیں، خوف اور تحیر کی آمیزش کے ساتھ۔

بوڑھے کی وحشیانہ گولی صوفے سے ٹکرا گئی، جس سے کپڑا اور چشمے ہوا میں بکھر گئے، گویا کسی پرانی دنیا کا فرنیچر زمین بوس ہو رہا ہو۔

سنیما کی سست رفتاری جیسے لمحات میں، گولی ایمان کے قریب سے گزر گئی، اس کی وسیع آنکھوں میں خوف کی ایک جیتی جاگتی داستان درج کر گئی۔

ایمان نے اپنی ہمت کو مجتمع کیا اور جھپٹتے ہوئے صوفے کے پیچھے سے نکل آئی۔ اس کا وجود غصے سے دہکنے لگا، گویا کسی طوفانی دریا نے اپنی سطح پھاڑ دی ہو۔

اس نے چڑ کر چیخ ماری، ”کیا تمہیں کسی پاگل کتے نے کاٹ لیا ہے؟ کیوں بے تحاشا گولیاں چلا رہے ہو؟ ہم تمہارے باغ کے خزانے لوٹنے نہیں آئے، ہم گلہریوں کے لیے آئے ہیں!“۔

بوڑھے کا پاگل پن اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک اور گولی چلائی جو ایمان کے قریب سے گزر کر ایکویریم پر لگی۔ شیشے کے ٹکڑے جیسے ہوا میں ناچتے ہوئے زمین پر بکھر گئے۔ پانی کا طوفان فرش پر بہہ نکلا، اور اس کے ساتھ بیٹا مچھلی کی جدوجہد دیکھنے والی تھی، جو جیسے موت کی دہلیز پر تڑپ رہی تھی۔ ایمان نے تیز رد عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک گلاس اٹھایا اور مچھلی کو بچا کر اس عارضی ظرف میں ڈال دیا۔

اس دوران، بوڑھا آدمی غصے میں بھرتے ہوئے چیخا، ”یہ گلہریاں میرے باغ کی سبزیاں چوری کرتی ہیں!“۔

ایمان، جس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، بوڑھے کو ڈانٹتے ہوئے بولی، ”سبزیاں؟ تمہاری سبزیاں چراتی ہیں؟ کیا تم اتنے احمق ہو کہ گلہریوں کو اپنی سانسیں چرانے والا سمجھ رہے ہو؟ کیا یہ معمولی چور ہیں یا کوئی جان لیوا خطرہ؟ جو تمہارے گردے چرا رہی ہیں۔“

گلہریاں اس غیر انسانی شور و غل سے کانپتی ہوئی کمرے کے ایک گوشے میں پناہ لینے لگی تھیں، گویا وہ اس بے عقلی کے طوفان سے بچنے کی جستجو کر رہی ہوں۔..

ایمان یکدم اس جگہ سے بھاگی سامنے دیوار دیکھ وہ ٹھٹھ گئی۔

اب کی بار دیوار پر ٹنگی ایک عجب شے نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ دیوانگی میں لپٹا ہوا ایک عجیب و غریب فریم شدہ عہد نامہ، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا ہوا، جس کی عبارتوں میں پاگل

پن کی واضح جھلک تھی۔ ایمان نے ایک گہری سانس لی، دل کی دھڑکنیں دھیرے دھیرے تیز ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے آپ سے سرگوشی کرنے لگی، ”یہ شخص واقعی دیوانہ ہے، یہ ہی وجہ ہے کہ یہ تنہائی کے سائے میں گھرارہتا ہے۔“

ایمان کے دماغ میں ایک خاموش انکشاف ابھرنے لگا۔ چند بے ضرر گلہریوں کے لیے اس نے اپنی جان کو موت کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔

خوف کی شدت نے اس کے دل میں جیسے سرد لہر دوڑادی۔ اچانک، بوڑھے آدمی نے اپنی بندوق کو اٹھایا، اس کی نظریں ایمان پر گر گئیں۔

اس کی آنکھوں میں وحشت کی جھلک تھی، اس کے ہونٹوں پر خطرناک مسکراہٹ۔ ایک سفاک لہجے میں اس نے کہا، ”آج تمہارا آخری دن ہے۔“

ایمان کے دل میں دہشت کی تپش اٹھی، مگر اس نے اپنے چہرے پر کسی کمزوری کا شائبہ نہیں آنے دیا۔ اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے، وہ آگے بڑھی اور اپنے مضبوط عزم کے ساتھ کہا، ”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“

اس لمحے میں، ایمان نے اپنی آخری سانسوں کے لیے ذہنی تیاری کر لی تھی۔ وہ ایک مسلمان کے طور پر شہادت کا لفظ ادا کرنے کے لیے تیار تھی، لیکن اسی اثناء میں بوڑھے آدمی نے مزید خباثت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”شہادہ پڑھو، تمہارا وقت قریب ہے۔“

ایمان کے دل میں خوف کی ایک اور لہر اٹھی، مگر اس نے اپنے لہجے کی خشکی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا، ”کن الفاظ کا انتخاب۔۔۔!“ وہ ابھی یہ الفاظ مکمل کر ہی رہی تھی کہ اچانک ایک تیز چیخ فضا میں گونجی۔

بوڑھے کی بندوق اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی، اور وہ درد کے مارے اپنی جگہ پر مڑنے لگا۔ ایک تیز چیختی ہوئی آواز میں اس نے اپنے بدن کو چھڑانے کی کوشش کی۔

خالدہ کے بلے نے اپنے دانت بوڑھے کی پشت میں گاڑ دیے تھے، اور وہ اذیت کے مارے گھوم رہا تھا۔

ایمان کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ چھا گئی، موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھی اور بوڑھے کے گرنے سے پہلے ہی بندوق کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

بوڑھا بے بسی سے فرش پر گرتا رہا، مگر ایمان نے بغیر وقت ضائع کیے خالدہ کی بلی کو اٹھالیا، اس کے ریشمی بدن پر ایک شکر گزار بوسہ دیا، ”میرے پیارے عجوہ، تم نے آج میری جان بچالی۔“

اس نے عجوہ کو اب کی بار نیچے اتارا۔

عزم و جواں حوصلے کے ساتھ، ایمان پنجرے کی جانب بڑھی اور دیکھا کہ اس بوڑھے نے نہ صرف

بالغ گلہریوں بلکہ ان کے ننھے بچوں کو بھی قید کر رکھا تھا۔ پنجرے کو بازوؤں میں بھرا ساتھ ہی اس گلاس کو بھی پکڑا جس میں وہ مچھلی تھی۔ ایمان نے گھر کی دہلیز عبور کی، اس بوڑھے کی چیخ و پکار پیچھے چھوڑتی ہوئی۔

باہر نکلتے ہی گلہریاں اور عجوہ بھی اپنی جان بچا کر دوڑ پڑیں۔ بوڑھا آدمی اب اپنا بیجا تعاقب کرتا ہوا ایمان کے پیچھے بھاگنے لگا، مگر ایمان کی رفتار کے سامنے اس کی ہمت کمزور پڑ گئی۔

ایمان جلدی سے اپنی کار تک پہنچی، بندوق و پنجرے کو پچھلی سیٹ پر رکھا، جب گلہریاں اور عجوہ گاڑی میں آگئیں لمحے کی تاخیر کے بغیر گاڑی اسٹارٹ کر کے دور نکل گئی۔

بوڑھا، جواب خاک میں گرنا پڑتا اپنے ناکام ارادوں کی چوٹ سہ رہا تھا، بے بسی میں زمین پر زور سے پاؤں مارا اور آسمان کی طرف منہ کا رخ کیا اور زوردار چیخ ماری۔

چیخ کی گرج فضا میں گونجی، جیسے آسمان خود لرز اٹھا ہو، اور درختوں میں بیٹھے پرندے، جو ساکت تماشائی بنے ہوئے تھے، خوفزدہ ہو کر چاروں سمت میں بکھر گئے۔

...°...

رات کی پُر اسرار تاریکی میں، ایمان نے ہائی وے پر اپنی گاڑی رواں رکھی، ہر لمحے ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی اندھیرے کو چیرتی ہوئی اپنے راستے بنا رہی تھی، گویا ظلمت کے پردے کو آہستہ آہستہ چاک کر رہی ہو۔

حالیہ خطرناک تجربے سے نکل کر اس کے دل میں سکون اور شکر گزاری کی لہر دوڑ گئی، خاص طور پر عجوہ کے لیے، جس کی موجودگی نے اسے محفوظ رہنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

پچھلی نشست پر گلہریاں اپنے بچوں کے گرد گھیرا تنگ کیے بیٹھی تھیں، ان کی حفاظتی جبلت بیدار تھی، اور ان کی نگاہیں اپنی اولاد کے تحفظ پر مرکوز تھیں۔

خالدہ کا بلا، جو ایمان کا مستقل ساتھی تھا سامنے والی نشست پر بیٹھ کر اعتماد اور وفاداری کے جذبات سے سرشار تھا۔

ایمان نے عجوبہ کی طرف نگاہ ڈال کر نیم مسکراہٹ کے ساتھ چھیڑ خانی کی، ”عجوبہ، تم واقعی حیرت انگیز ہو، تمہاری مالکن تو دھوکہ دہی میں ماہر ہے، لیکن تمہاری وفاداری بے مثل ہے۔“

اس کے ہاتھ کی نرم جنبش نے اس کی تفریح اور شکر گزاری کو مزید نمایاں کر دیا۔ جب اس نے پیچھے مڑ کر گلہریوں پر ایک نظر ڈالی، تو گویا ماضی کے کسی لطیف لمحے کو یاد کرتے ہوئے بولی، ”تم سب جانتے ہو، عجوبہ ہمیشہ تمہارے ساتھ کھیلنے کی کوشش کرتا تھا، مگر تم سب، بجائے اسے اپنا سمجھنے کے، میرے بے چارے عجوبہ پر پتھر پھینکتے تھے۔“ اس نے اپنے لبوں کو لمحہ بھر کے لیے بھینچا، پھر ایک محبت بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

۔ ”خیر، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اتنے وفادار ساتھیوں سے نوازا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے عجوبہ کی طرف ایک محبت بھری نگاہ ڈالی، جواب اپنی نشست پر بیٹھ کر نہایت انہماک سے اپنے بچوں کو صاف کر رہی تھی۔

گلہریوں میں سے ایک ڈھٹائی سے ایمان کے کندھے پر آکر بیٹھ گئی، اور ایک نئی، غیر متوقع دوستی کی بنیاد استوار ہو گئی۔

راستے کی یکسانیت کو اچانک ایک انوکھے منظر نے توڑا۔ ایمان کی نظر گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھی اُس شیشے کے کنٹینر پر پڑی جس میں وہ بیٹا مچھلی تھی، جسے وہ اپنی گزشتہ مہم سے بچا کر لائی تھی۔

وہ مچھلی اپنی حدود میں تیزی سے تیرتی، اپنی زندگی کی گہرائیوں کو دوبارہ پانے کی جستجو میں مصروف تھی، گویا اس چھوٹے قید خانے میں بھی اسے نئی طاقت مل گئی ہو۔

مگر عجوبہ کی اس مہم میں شمولیت کی کہانی بھی کچھ کم دلچسپ نہیں تھی۔ جب ایمان نے اپنی گاڑی کا دروازہ بند کیا، تو عجوبہ بڑی خاموشی اور چالاکی سے پچھلی سیٹ کے نیچے ایک مناسب جگہ تلاش کر کے خود کو چھپانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

...°... ---

ایمان نے انتہائی مہارت سے اپنی گاڑی کو پورچ کی روشن پناہ گاہ میں لا کر کھڑا کیا، جہاں کی روشنی اور سکون نے اس کے ساتھ ساتھ اس کی بھروسے مند سواری کو بھی دلگیر انداز میں خوش آمدید کہا۔

یہ منظر گویا کسی بہاؤ کی مانند تھا، جس میں ایمان نے دنیا میں اپنے مقام کو یوں پیدا کیا جیسے پانی اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔

کار سے باہر قدم رکھتے ہی اس نے عجوبہ کو محبت سے چوما، وہ بلا جس کے ساتھ اس کی تین سالہ رفاقت نے ان کے درمیان الفت کے نئے رنگ بکھیر دیے تھے۔

آج کی رات، ان کے درمیان تعلق کی گہرائی اور محبت کا احساس بہ یک وقت جاری تھا۔

گلہریاں بھی یقین اور تسلی کے ساتھ گاڑی سے نکلیں، ان کی حرکات میں جیسے سکون کی نرمی چھلک رہی تھی۔ ایمان نے پنجرے میں مقید گلہری ماں اور اس کی اولاد کو نہایت احتیاط سے آزاد کیا۔ اسی دوران اس نے اس شیشے کے کنٹینر کو بھی نرمی سے اٹھا رکھا تھا جس میں وہ بیٹا مچھلی موجود تھی، جسے اس نے اس قید سے آزاد کرایا تھا۔

جب وہ اپنے گھر کے وسیع و عریض ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئی تو اس کی نگاہیں دیوار کے ساتھ پیوست عظیم الشان ایکویریم پر پڑیں، جو سمندری زندگی کے رنگین مناظر کا گواہ تھا۔

اس صاف شفاف پانی کے اندر مچھلیوں کی ایک رنگارنگ جماعت متحرک تھی، جیسے کہ پانی کے رقص میں مدغم ہو چکی ہو۔ ایمان نے نرمی سے بیٹا مچھلی کو شیشے سے باہر نکالا اور اسے اس کے نئے، وسیع تر آبی ماحول میں متعارف کرایا۔

محدودیت سے آزادی کی جانب جانے والی یہ مخلوق، خوشیوں کی نئی وسعتوں میں چھلانگ لگاتے ہوئے ایکویریم کے اندر گویا اپنی نئی دنیا کی سیر کرنے لگی۔

اس کی رنگ برنگی دم نے پانی کے اندر ایک خوبصورت کہکشاں کا منظر پیش کیا، جو جیسے ایک جشن تھا، اس کی رہائی کا۔ ایمان کی مسکراہٹ اس نظارے کا عکس تھی، اس کی اپنی خوشی مچھلی کی آزادی میں سرایت کر گئی تھی۔

ایمان نے آہستہ سے ایکویریم کے شیشے پر انگلی کی نرم ضرب دی، جیسے وقت کی نبض کو چھو رہی ہو۔ یہ لمحہ دونوں کی رضامندی اور اطمینان کا تھا۔

کمرے کی خاموشی میں ایک عجیب قسم کا سکون گھل گیا تھا۔ ایمان نے ایکویریم کو اس کے آبی باشندوں کے حوالے کر دیا، انہیں ان کی زیر آب دنیا میں پُر سکون خوشیوں میں مدغم ہوتے چھوڑ کر خود پیچھے ہٹ گئی۔

...°...

اگلے روز، صبح کی نیم روشنی میں، ایمان درخت کی ایک مضبوط شاخ پر بیٹھی، اپنی ٹانگیں سست روی سے جھلاتی ہوئی تھیں۔

اس کے چہرے پر ایک ویلڈنگ ماسک سجا ہوا تھا، جو کہ کسی آرام دہ صبح کے منظر سے کہیں زیادہ کسی مشقت طلب کام کی علامت تھا۔ نیچے سے خالدہ کی بلند ہوتی آواز نے سکون کی اس فضا کو چیر دیا، اس کی باتیں ویلڈنگ مشین کی گڑگڑاہٹ میں مدغم ہو رہی تھیں۔

۔ ”اوئے! مصیبت کی جڑ، کیا بگاڑ رہی ہے؟“ خالدہ نے اپنی روایتی تلخی میں لپٹی چیخ بلند کی، اس کی آواز مکیٹکل شور میں دبے کو تھی۔

ایمان نے ماسک کو ایک جھٹکے میں ہٹایا اور مشین کو بند کر دیا۔ خالدہ کی طرف نیچے جھانکتے ہوئے اس نے سستی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”جی فرمائیے، سلطانہ عالی مقام؟“۔

خالدہ نے اپنے ہاتھوں کو کمر پر جما کر، ماتھے پر خفگی کی شکنیں ڈالیں، ”تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو تو دن چڑھے کتیا کی طرح سویا کرتی تھی، اب یہ کیا نئی مصیبت اٹھالی ہے؟ اوپر سے ہمارا سکون بھی غارت کر رہی ہے، بد بخت!“۔

ایمان نے بے نیازی سے آنکھیں گھمائیں اور ایک اور جھٹکے سے مشین کو اپنے ہاتھ میں سیدھا کرتے ہوئے کہا، ”کچھ نہیں، تمہاری محبت میں ایک پھندا بنا رہی ہوں۔ سوچا تھا کہ تیرے وزن اور تیری گردن کی گائے جیسی موٹائی کو مد نظر رکھتے ہوئے کچھ ایسا تیار کروں کہ جب تیرا وقتِ آخر آئے تو رسی نہ ٹوٹے۔“۔

خالدہ نے غصے سے ناک پھلائی اور کمر کے دونوں طرف ہاتھ رکھ کر بولی، ”بد بخت! میں کیوں پھانسی چڑھوں؟ تجھے جو اپنی جان سے اتنی محبت نہیں ہے تو خود ہی پھانسی لگالے۔“۔

ایمان نے ایک نازک ادا سے کندھے اچکائے، ”ارے میں تو خانہ کعبہ میں مرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ وہ مقدس جگہ ہے، اور میں وہاں اپنے انجام کو پہنچنا چاہتی ہوں۔“۔

خالدہ نے طنز سے بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، ”ہو نہہ، خانہ کعبہ؟ تجھ جیسی کافرہ کو وہاں موت نصیب ہو؟ اتنی خوش نصیبی تیری کہاں!“۔

ایمان نے ایک تمسخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا، ”بہت ہو گیا، تھیٹر بند کر، اور اپنی آوارہ کتیا کی طرح بھونکنے کی عادت چھوڑ دے۔ ویسے بھی، تیرے منہ کی حالت دیکھ کر لگتا ہے جیسے پرانے اخبار کا پھٹا ہوا ٹکڑا ہو۔“

خالدہ نے دانت کچکا کر غصے کو ضبط کیا، ناک پھلائی اور بھناتے ہوئے ایمان کی طرف دیکھا، لیکن جھگڑے میں کہیں تفریح اور طنز کا عجیب امتزاج تھا، جیسے صبح کا جھگڑا روزمرہ کی ہنسی مذاق میں بدل گیا ہو۔ خالدہ جھنجھلاتی ہوئی پلٹ گئی اور ایمان دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی

۔ ...°...

صبح کی مدھم روشنی ایمان کے چہرے کو دلکش چمک دے رہی تھی، گویا دن کی روشنی اس کی روح کے اندر کی روشنی کا عکس ہو۔

اب وہ پرسکون اور خوشحال رہنے لگی تھی، راتیں بھی معمول کے مطابق گزرنے لگی تھیں، حالانکہ کمرہ ہمیشہ روشنی میں ڈوبا رہتا تھا۔ آصف سے بدلہ لے کر بھی، وہ رات کی تاریکی سے ابھی تک بے چین ہو جایا کرتی تھی، لیکن دن کی کرنوں میں، وہ ایک نئی خود اعتمادی کے ساتھ جی رہی تھی۔

آئینے کے سامنے کھڑی، اس نے اپنے گھنے، چھلانگیں مارتے کرل بالوں کو نرمی سے چھوا، انہیں اپنی انگلیوں سے ترتیب دیتے ہوئے، جیسے کوئی قیمتی شے کو سنوار رہا ہو۔

بی بی پنک رنگ کی ایک خوبصورت مگر سادہ شرٹ، جو اس کے نازک بدن پر نرم پروں کی مانند لپٹی تھی، کے ساتھ ہم آہنگ ہلکے رنگ کا سیکرٹ ٹراؤزر اس کی شخصیت کو نفاست بخش رہا تھا۔

شرٹ کے کنارے باریک کڑھائی کے کام سے مزین تھے، اور آستینوں کی قلیل لمبائی نے اس کے سراپے کو نکھارا ہوا تھا۔

اس کے کانوں میں جھومتی چھوٹی سی چمکتی سلور بالیاں، جیسے روشنی کی کرنیں اس میں قید ہو گئی ہوں، اور انگلی میں ایک نازک سی انگوٹھی، جو اس کی نزاکت اور خوبصورتی کا غماز تھا، اس کے لباس کو مزید دلکشی دے رہی تھیں۔

اس کے پیروں میں سنہری چمک لیے ایڑیوں والے جوتے، جو زمین پر کسی روشنی کی کرن کی مانند بکھر رہے تھے، اور ہاتھ میں گلابی رنگ کا ایک چھوٹا سا کلچ، اس کی شخصیت میں وقار کا رنگ بھرتا تھا۔
شانوں سے نیٹ کا ہلکا سا دوپٹہ آہستگی سے ڈھلکتا، اس کی چال میں ایک دلکشی پیدا کر رہا تھا۔

وہ پل بھر کے لیے رکی، آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا، اور عکاس مسکراہٹ کے ساتھ خود سے سرگوشی کی، ”ایمان، تو واقعی اتنی خوبصورت ہے کہ میں نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا۔ ماشا اللہ۔“ اپنے لبوں پر مطمئن مسکراہٹ سجائے، اس نے ایک آخری نظر آئینے میں اپنے سراپے پر ڈالی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

جیسے ہی اس نے اپنے سنہری جوتوں میں قدم جمایا، اعتماد اور وقار کا امتزاج اس کی ہر حرکت میں نمایاں تھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں، دونوں ہاتھوں کو اپنے کانوں تک لے جا کر اور سر ہلکا سا جھکا کر دل میں کہا، “قربان جاؤں میں تجھ پر”۔

سیڑھیاں اتر کر، وہ آہستگی سے اپنی گاڑی کے پاس پہنچی۔ گاڑی کے اندر بستے ہوئے، اس نے موبائز کو فون ملایا۔ اس کی آواز میں اطمینان اور عزم جھلک رہا تھا۔ “ہاں، میں جناح سپر جا رہی ہوں، وہاں مجھ سے ملو۔”۔

موبائز کی حیرت بھرے سوال پر، “تم وہاں کیسے پہنچو گی؟”۔

ایمان نے بے نیازی سے کہا، “تم نے کیا یہ سوچا تھا کہ میں تین ماہ تک گھر میں قید رہوں گی؟”۔

جیسے ہی انجن کی گڑ گڑاہٹ موبائز کی سماعتوں میں پہنچی، وہ حیران ہو کر بولا، “تم نے گاڑی چلانا سیکھ لی؟”۔

ایمان نے بے پرواہ انداز میں شانے اچکائے، “جیسا میں نے کہا، میں بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہوں۔”۔

گاڑی روانہ ہو چکی تھی، راستے میں ایک خاموش اور پُر اسرار فضا چھوڑتے ہوئے، جیسے ایمان نے اپنے اندر کے اندھیروں پر مکمل قابو پا لیا ہو۔

ایمان نے جناح سپر کے فصیل دار بازار کی حدود میں اپنی گاڑی کو نہایت مہارت سے پارک کیا، جہاں سڑک کنارے درختوں کے سائے اور فٹ پاتھ پر بنے اسٹالوں کی دھوپ میں غرق ہلچل جاری تھی۔

مسلل بہتی گاڑیوں کا سلسلہ ایک سمندر کی مانند تھا، جو چہل پہل اور دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ عمارتوں کے سامنے بھکاریوں کا جمگھٹ اور غبارے بیچنے والے، بازار کی گہما گہمی کا حصہ تھے، اور اس شور میں ایمان کی نظر موئیز پر جا کر ٹھہر گئی، جو جیسے کسی غیر محسوس شدت سے ایمان کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر گیا۔

موئیز، جو سلیف لیس شرٹ میں ملبوس تھا اور جس کے ساتھ کیپریس کا ناپختہ انتخاب، اس کے بدن کو مزید بدتر بنا رہا تھا۔ اس کا انداز، جس میں نسائیت کی جھلک پیدا کرنے کی ناکام کوشش واضح تھی، خاص طور پر اس کے بالوں میں لگا چھوٹا کلپ، نہایت ناپختہ اور بے ہودہ دکھائی دے رہا تھا۔

اس کی ہلکی سی چال اور اپنے موبائل فون میں مگن انداز نے ایمان کی ناگواری کو مزید گہرا کر دیا۔

جیسے ہی ایمان اس کے قریب پہنچی، موئیز نے حیرت سے کہا، ”ایمان، تم تو بالکل بدل گئی ہو!“۔

ایمان نے بیزاری سے مسکراہٹ دی، گویا ”کاش میں بھی یہ کہہ سکتی۔“

لحظہ بھر میں چہرے کا تاثر پلٹا۔ چہرے پر غضب لاتے ہوئے اس نے کہا، ”قسم سے، تم تو کسی بدشگونی کا چلتا پھرتا اشتہار لگ رہے ہو!“۔

مونیز کا چہرہ ذرا سا بگڑ گیا اور اس کے ہونٹ غصے میں لرزنے لگے۔ ایمان نے ایک نظر اس کے ٹیٹوز پر ڈالی اور طنزیہ انداز میں کہا، ”یہ تم نے اپنے جسم پر کیا خرگوشوں اور بلیوں کی تصویریں کھینچ رکھی ہیں؟ انتہائی مضحکہ خیز ہے۔“

اس کے بعد اس نے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان خلا بنا کر گویا اپنے اندر کا استہزا اور افسوس یکجا کر لیا، ”قسم سے، تم خوفناک لگ رہے ہو۔“

مونیز نے بے نیازی سے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا، ”کم از کم ہم قدامت پسند اسلام کے جال میں نہیں پھنسے ہیں۔ ہمارے جسم، ہمارے انتخاب۔“

ایمان نے مونیز کی اس بات پر قہقہہ لگایا، پھر اتفاقاً اس کی گاڑی کے بونٹ کو خراش دیتے ہوئے جھٹکا دیا، جیسے یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر ہوا ہو۔

مونیز پریشانی سے بولا، ”یہ کیا کر دیا تم نے؟“

مبالغہ آمیز حیرت سے مونیز کی گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے ایمان نے کہا، ”اوہ، ہا! تم واقعی کافر ہو۔ جب تمہارا جسم تمہاری مرضی ہے، تو پھر تمہاری گاڑی بھی کیوں نہیں؟ اس پر بھی کچھ پیسے خرچ کرو، بھائی!“ ایمان نے طنزیہ ٹھوڑی اونچی کی۔

جیسے ہی مونیز کا چہرہ اضطراب سے بھر گیا، ایمان نے بڑی چالاکی سے گاڑی کے اس حصے سے اسٹیکر اتارا، جو کہ اس نے پہلے سے چپکار کھا تھا۔

اس نے نہایت مہارت سے اسٹیکر لگایا تھا تاکہ یہ خراش کی مانند نظر آئے، اور پھر فاتحانہ انداز میں بولی،
”یہ خراش نہیں تھی، بس ایک چالاکی سے لگایا ہوا اسٹیکر تھا۔“

مونی نے سکون کا سانس لیا اور یقین دہانی کے لیے اپنی گاڑی کا معائنہ کیا۔ ایمان، اپنے اطراف کی
پرکشش نظاروں کو بڑی نفاست سے دیکھتے ہوئے، آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور مونی خاموشی سے اس کے
پیچھے چل دیا۔

...°... _ _ _ _

ریستوران کی پچھلی جانب ایک شاداب اور ہری بھری جگہ پھیلی ہوئی تھی، جس کے بچوں بیچ سے ایک
پیچیدہ روش سڑک سے جا ملتی تھی۔

کھلی ہوا اور اندرونی حصوں کا حسین امتزاج اس ہوٹل کی دلکشی میں اضافہ کرتا تھا، جہاں گزر گاہیں اس
طرح ترتیب دی گئی تھیں کہ عملہ بہ آسانی اور چابکدستی سے حرکت کر سکے۔

ہوٹل کے دونوں اطراف گاہک بیٹھے تھے، اور ان کی موجودگی نے ایک گہما گہمی کا سماں باندھ رکھا تھا۔
ایمان اور مونی عقب میں موجود ایک میز پر آمنے سامنے براجمان تھے۔

ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دونوں سبزے میں گھری کھلی فضا کے حامل ریسٹورنٹ میں ایک دوسری دنیا کے ماحول میں بیٹھے ہوئے ہوں۔

ایمان نے، جو سامنے کے سبزہ زار میں کھوئی ہوئی معلوم ہوتی تھی، موئیز کی طرف دیکھا، جس کے لبوں پر ایک دھیمی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ دونوں کے درمیان میز پر کھانے کے بچے کچھے آثار، ان کے معدے کے مشترکہ سفر کی داستان سنار ہے تھے۔

موئیز، کی نظریں کبھی ایمان پر، کبھی پلیٹوں پر بھٹک رہی تھیں، اور اس کی پیشانی پر ہلکی سی پریشانی کی لکیریں ابھرتی جا رہی تھیں۔

۔ ”مہران گاڑی؟“ اس نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا، اس کی پیشانی پر سوچ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ ایمان نے بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا، اس کی انگلیاں اس کے پانی کے گلاس کے کنارے کو ایک غیر محسوس آہنگ میں چھو رہی تھیں۔

۔ ”اتنی دولت کے ساتھ، تم کچھ زیادہ بہتر نہیں لے سکتی تھیں؟“ موئیز نے ذرا طنزیہ انداز میں کہا، جیسے اپنے الفاظ کی سچائی پر فخر ہو۔

ایمان نے اپنے ہاتھ کو ایک معمولی حرکت دیتے ہوئے اسے مسترد کیا، اس کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک تھی۔

- ”گاڑیوں کا مقصد تو محض ہمیں ہماری منزل تک پہنچانا ہے، چاہے وہ مہراں ہو یا لیمبورگینی، دونوں کا مقصد تو ایک ہی ہے۔“ اس نے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

- ”اور جیسا کہ میں نے کہا تھا شخصیت کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے۔ دیکھو، اگر میں دو روپے کی انگوٹھی بھی پہن لوں تو وہ بھی برانڈ لگتی ہے، کیوں کہ میں خود ایک برانڈ ہوں۔“

ایمان نے اپنی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ جاری رکھا، اس کے ہاتھوں کی جنبش میں ایک خاص انفرادیت نمایاں تھی۔

- ”ایک شخص کو اس کی ذات میں قدر چاہیے۔ اعلیٰ شخصیت ہو تو معمولی چیزیں بھی عمدہ لگتی ہیں۔ دیکھو نا، اسلام آباد میں بھکاری بھی کروالے کر پھرتے ہیں، لیکن کیا اس سے ان کی شخصیت میں کوئی اضافہ ہوتا ہے؟“ اس نے اپنی بات کو طنزیہ انداز میں ختم کیا، کندھے اچکاتے ہوئے گویا ہوئی، ”بالکل نہیں۔“

پھر اس نے کانٹے سے ایک سبزی کا ٹکڑا اٹھایا اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”اصل میں بات انفرادیت کی ہے۔“ ایمان کی باتوں میں وہ ہی اعتماد اور خود اعتمادی تھی جس نے مونیز کو حیران کر رکھا تھا۔

ایمان نے اپنے جوس کا گلاس اٹھایا اور ایک دلنشین انداز میں اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا، اس کی آنکھوں میں چمک اور شرارت نمایاں تھی، جیسے کہ وہ کسی غیر محسوس طنز کا اشارہ دے رہی ہو۔

دوسری طرف مونیز اپنی پلیٹ میں مشغول تھا، جیسے وہ ہر لقمہ انتہائی توجہ سے لے رہا ہو۔ ہر ذائقے کو وہ اس انداز میں چکھ رہا تھا جیسے کوئی فنکار اپنے شاہکار کو مکمل کر رہا ہو۔

اچانک مونیز نے ایک گہری سانس لی اور ایمان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا، ”تمہاری سالگرہ آئی اور چلی گئی، اور تم نے کوئی خاص جشن نہیں منایا۔ اب تو ستمبر بھی گزر رہا ہے۔“

ایمان نے تھوڑی سی بیزاری کے ساتھ جواب دیا، ”مجھے اپنی پیدائش میں کوئی خاص خوشی محسوس نہیں ہوتی، تو پھر جشن کیوں مناؤں؟“

مونیز نے ایک ہلکا سا مذاق کیا، ”تم بہت بور ہو گئی ہو، کچھ تو خاص کرو۔“ جواباً ایمان نے آنکھیں گھمائیں اور طنزیہ لہجے میں بولی، ”تو کیا میں سرکس کے بندروں کی طرح سڑک پر جا کر قلابازیاں لگاؤں؟“

مونیز کی نظریں ایمان پر گڑی ہوئی تھیں، ان میں ایک الجھن، تجسس اور تھوڑی سی ناگواری کی لہر تھی۔ وہ گہری سانس لیتے ہوئے اپنی کرسی پر سیدھا ہو بیٹھا اور میز پر ہاتھوں کی مثلث بناتے ہوئے کہا، ”ایمان، مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

ایمان، جواب تک کھانے میں مگن تھی، نے بے دلی سے جواب دیا، ”ہوں؟“

مونیز نے گہرائی سے بھری آواز میں کہا، ”ایمان، میں ایک بہت بڑی تبدیلی سے گزر رہا ہوں، جو میری ذات کے بہت گہرے پہلوؤں کو چھو رہی ہے۔ دراصل، میں نے یہ سب ایک لڑکے کے لیے شروع کیا تھا، لیکن جیسے جیسے میں نے اس کے لیے اپنے دل میں جگہ بنائی، میری سوچ مزید پختہ ہوتی گئی۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایک لڑکی بھی درمیان میں ہے، جسے وہ چاہتا ہے، حالانکہ وہ لڑکی اس بات سے بے خبر ہے۔ اب میں اس لڑکی کے ساتھ کیا کروں؟“۔

ایمان نے گہری سوچ کے ساتھ سر ہلایا، پھر آگے جھکتے ہوئے بولی، ”مونیز،“ اس کا لہجہ انتہائی سنجیدہ تھا، جیسے وہ کوئی بڑی دریافت کرنے والی ہو۔

مونیز اس کی بات سننے کے لیے بے چینی سے آگے بڑھا، جیسے وہ کسی راز کا پردہ فاش ہونے والا ہو۔

ایمان نے تھوڑا توقف کیا اور پھر بڑے اطمینان سے کہا، ”تم اپنے دماغ کا علاج کرواؤ۔“۔

یہ سن کر مونیز کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آیا، جیسے کسی نے اس کے جوش کے غبارے سے ہوا نکال دی ہو۔ اس نے بے ساختہ آنکھیں گھمائیں اور ایک ہلکی سی ”فررر“ کی آواز نکالی، جیسے وہ ایمان کی بات کو نظر انداز کرنا چاہتا ہو، لیکن ناکام ہو رہا تھا۔

ایمان نے بے باکی کے ساتھ، دو ٹوک لہجے میں کہا، ”سوررشتے اور جنس میں تمیز نہیں کرتے؛ انہیں جو بھی نظر آتا ہے، اس پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ لیکن تم سورر نہیں ہو، تم انسان ہو۔“۔

مونیز کی آنکھوں میں غصے کی ایک خفیف لہر ابھری اور اس نے پتلیوں کو تنگ کرتے ہوئے جواب دیا،
”تم میرا مقابل جانوروں سے کر رہی ہو؟“۔

ایمان کی ہنسی بے اختیار چھوٹ گئی، جیسے اُس نے مونیز کی بات پر دھیمامگر گہرا تہقہہ لگایا ہو،۔ “جانور تم سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں۔ بھیڑیے اور اونٹ کا جائزہ لے لو، وہ جنس اور رشتے میں فرق رکھتے ہیں۔ لیکن تم...” اُس نے اپنے سر کو افسوس کے ساتھ جنبش دی، جیسے کہ مونیز کی فطرت پر افسوس کر رہی ہو۔

مونیز کا چہرہ غصے کی ایک باریک جھلک سے مسخ ہو گیا، اور اُس کی آنکھوں میں رنجیدہ نفرت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اُن دونوں کے درمیان ایک خاموش دشمنی کی فضا طاری ہو گئی تھی، ایک ایسا غیر محسوس بیلے جو بات کیے بغیر بھی تناؤ کی شدت کو بڑھا رہا تھا۔

پھر بھی، جیسے ہی یہ غیر محسوس اختلاف ختم ہوا، وہ دوبارہ اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ریسٹوران کی ہلکی ہلکی سرگوشیاں اور اطراف کی مدھم آوازیں اس سکوت کو پر کر رہی تھیں جو اُن کی گفتگو میں ابھر آیا تھا۔

کھانے کے سفر کے اختتام پر پہنچتے ہوئے، مونیز نے بے ساختہ اپنی انگلی سے ویٹر کو بل کی آمد کا اشارہ دیا۔ مگر ایمان نے خود اعتمادی سے اعلان کیا، “بل کی ادائیگی میں کروں گی۔”۔

مونیز نے ناپسندیدگی میں سر ہلایا، لیکن ایمان نے پرسکون رہتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور کہا، ”اچھا، چلو بل آدھا آدھا بانٹ لیتے ہیں۔“

یہ بظاہر سادہ سامانی فیصلہ اُن کے درمیان خاموش مذاکرات کی عکاسی کر رہا تھا، جہاں ہر نظر اور ہر اشارہ بے زبانی میں ایک بھاری مکالمہ تھا۔

بل، جواب ان کے مشترکہ اخراجات کا عملی اظہار تھا، برابر تقسیم ہو چکا تھا۔ ہر ایک کا حصہ چھ ہزار پانچ سو تھا۔ یہ مالی ترتیب بظاہر سادہ تھی، لیکن اس میں اُن کے تعلقات کی گہرائی کی جھلک موجود تھی۔

مونیز نے اپنے کندھے پر بیگ رکھ کر بل ویٹر کے حوالے کیا۔

ایمان اور مونیز جب ریستوران کے شور و غل سے باہر نکلنے لگے تو وہ ایمان اپنے ہاتھ میں موبائل تھامے، گہرے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اچانک ایک لڑکی سے غیر متوقع ٹکرا ہو گئی۔

اس حادثے میں ایمان کا موبائل ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور اس کی نازک شیشے کی سطح چکناچور ہو گئی۔ جیسے ہی یہ منظر رونما ہوا، گرد و پیش میں موجود لوگوں کی نگاہیں اس طرف مائل ہو گئیں، مونیز بھی قدم روک کر یہ منظر دیکھنے لگا۔

لڑکی، جو اس اچانک پیش آنے والے واقعے سے شدید مضطرب ہو گئی تھی، فوراً معذرت کرتے ہوئے گھبراہٹ بھرے لہجے میں بولی، ”مجھے معاف کیجیے، یہ میری ہی غلطی تھی، مجھے از حد افسوس ہے۔“

ایمان نے ایک لمحے کے لیے حیرت اور بے ساختہ تفریح کے امتزاج کے ساتھ زمین پر گرے موبائل کے ٹکڑوں کو دیکھا، پھر دھیرے سے جھک کر اُن ٹکڑوں کو جمع کرنے لگی۔ یہ وہ ہی موبائل تھا جو پہلے ہی اپنی آخری ہچکیاں لے رہا تھا، اور اب بکھر کر فنا ہو چکا تھا۔

ایمان نے لڑکی کی بے چینی کو بھانپتے ہوئے اُسے تسلی دی، ”کوئی بات نہیں، پریشان مت ہو۔“ وہ دوبارہ آگے بڑھنے کو تھی کہ لڑکی کی عاجزی بھرے لہجے نے اُسے روک دیا، ”مہربانی کر کے رکیے!“۔

ایمان نے پلٹ کر دیکھا، آنکھوں میں حیرت لیے ہوئے۔ لڑکی نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور وہاں سے ایک نیا، بالکل سیل بند موبائل نکال کر ایمان کے سامنے کر دیا۔ عاجزی اور ندامت سے بھرپور انداز میں اُس نے موبائل پیش کرتے ہوئے کہا، ”یہ لیجیے، آپ کا موبائل میں نے توڑ دیا، ازالہ کے طور پر یہ قبول کریں۔“۔

ایمان نے حیرت کے عالم میں اُس کی اس پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے کہا، ”نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“۔

مگر لڑکی نے اصرار کیا، ”نہیں، براہ کرم، میں اصرار کرتی ہوں، آپ کو یہ لینا پڑے گا۔“۔

ایمان کے چہرے پر ایک لمحاتی شرمندگی چھا گئی، کیوں کہ تماشائیوں کی نظریں اُن دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ لڑکی نے پختہ عزم کے ساتھ موبائل ایمان کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا، ”آپ کو یہ رکھنا ہی ہوگا، کوئی اور صورت نہیں ہے۔“

ایمان نے انکار کی کوشش کی، ”یہ آپ کا ہے، آپ نے اپنے لیے خریدا ہوگا، میں اسے کیسے قبول کر سکتی ہوں؟“

لڑکی نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا، ”آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں، بس اسے رکھ لیجیے، میں اپنے لیے دوسرا لے لوں گی۔“

ایمان کی ہچکچاہٹ واضح تھی، لیکن لڑکی کے اصرار نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ یہ غیر متوقع تحفہ قبول کرے۔

ایمان نے موبائل لیتے ہوئے نرمی سے کہا، ”آپ اپنا بینک اکاؤنٹ مجھے بتادیں، میں آپ کو پیسے بھیج دوں گی۔“ لڑکی نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور محبت بھرے لہجے میں کہا، ”آپ مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔“

ایمان کے چہرے پر جذبات کا ایک عجیب امتزاج چھا گیا، اور وہ اس سخاوت کو قبول کرنے میں تذبذب کا شکار تھی۔ اُس نے کچھ توقف کے بعد اپنے کچ سے ایک خوبصورت گھڑی نکالی، جو اُس نے ذاتی طور پر بڑی

محبت سے خریدی تھی، اور پیش کرتے ہوئے کہا، ”یہ گھڑی شاید آپ کے تحفے کے برابر نہ ہو، لیکن براہ کرم اسے قبول کریں، کیوں کہ میں یہ تحفہ یوں قبول نہیں کر سکتی۔“

لڑکی نے شکرگزاری کے ساتھ گھڑی قبول کی اور خاموشی سے اپنی مٹھی میں تھام لی، اور نرمی سے بولی،
”خوش؟“

ایمان نے مختصر سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”ہاں، خوش ہوں۔“

...°...

ایمان، جو اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی مخفی سازشوں سے بے خبر تھی، پُر سکون انداز میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کی پشت پر وہ عورت تھی، جو کسی گہرے راز کی چادر میں لپیٹی ہوئی، اُسے اُس نگاہ سے دیکھ رہی تھی جو اپنے اندر پوشیدہ عزائم اور بظاہر نہ ٹلنے والے ارادوں کا ایک سمندر چھپائے ہوئے تھی۔

لمحے کی موزونیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اُس عورت نے انتہائی احتیاط اور رازداری کے ساتھ اپنے موبائل پر ایک کال کی، اُس کی انگلیاں بے صدا مگر پھرتی سے اُس آلے پر چل رہی تھیں، جیسے کوئی خاموش کہانی لکھ رہی ہوں۔

کچھ ہی لمحوں میں دوسری جانب سے گونار کی جچی ٹلی اور پُر اسرار آواز گونجی، ”کہو!“

اُس عورت نے نہایت فرمانبرداری کے ساتھ سرگوشی بھرے لہجے میں جواب دیا، ”سر، جو حکم آپ نے دیا تھا، اُس پر پوری نزاکت اور نفاست سے عمل درآمد ہو چکا ہے۔“

جیسے ہی یہ الفاظ اس عورت کے لبوں سے نکلے، ریسٹوران کے دروازے سے اُس کا بے آواز اور محتاط خروج اُس کی بات کی تصدیق کر رہا تھا۔

گونار، جو اپنے ماحول اور واقعات پر کسی ماورائی آگاہی کی مثل قابض تھا، نے بے پناہ سکون کے ساتھ جواب دیا، ”مجھے وہ گھڑی بھیجو، جو اُس نے تمہیں دی ہے۔“

اُس کی آواز میں کوئی لغزش یا جذبات کا شائبہ نہ تھا، گویا وہ ہر امر کو پہلے سے جانتا ہو، جیسے یہ کھیل اُس کی ہتھیلی پر بکھرا ہوا ہو۔

گونار کوئی معمولی فرد نہ تھا۔ وہ سازشوں کے پیچیدہ دھاگے بُننے والا ایک ایسا استاد تھا جو انسانوں کے ذہنوں اور اُن کی اندرونی کیفیات کو اُن کی ذات سے بھی زیادہ جانتا تھا۔

اُس کا علم اور فہم محض معلومات تک محدود نہ تھا، بلکہ یہ اُس کے رفقاء کی روح اور جوہر کی عمیق ترین تفہیم پر مبنی تھا، جس نے اُسے ایک خوفناک برتری عطا کی تھی۔

دوسری طرف عورت، جس کی آنکھوں میں ایک لحظہ کے لیے خوف کی ایک چمک ابھری، نے خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے گھبراہٹ میں تھوک نکلا۔ اُس کی آواز میں ایک انجانی کپکپاہٹ در آئی،۔“جی، سر!“ اُس کے لبوں سے نکلے یہ الفاظ فرماں برداری اور پُر ہول اضطراب کا ملاپ تھے۔

یہ گفتگو محض ایک سادہ پیغام رسانی نہ تھی، بلکہ یہ گونار کے وسیع تر کھیل میں ایک مہلک چال کا جزو تھی، جسے وہ انتہائی حساب سے چلا رہا تھا۔

یہ اُس کی ناقابلِ تسخیر موجودگی کا مظہر تھا، جو ہر قدم پر اپنے جوڑ توڑ اور چالوں کو کسی ماہر فنکار کی طرح ترتیب دے رہا تھا، اور اُس کی ہمہ گیر گرفت اس پر اسرار کائنات پر پھیلی ہوئی تھی۔

...°...

گاڑی شہر کی پر پیچ گلیوں میں سے گزرتی، گویا خود کو بے معنی شور و غل سے الگ تھلگ کر رہی ہو۔

انجن کی گونج اُس خاموشی کے ساتھ گھل رہی تھی جو مومیز اور ایمان کے بیچ کسی ان دیکھی دیوار کی طرح معلق تھی۔

ایمان، اس شہری بھول بھلیاں میں سے گزرتے ہوئے، اپنی قسمت کے اس عجیب و غریب موڑ پر غور و فکر میں گم تھی، جیسے کوئی اپنے ہی ذہن کی بھول بھلیاں میں کھوجائے۔

اُسے اُس پر اسرار عورت کی فیاضی یاد آئی، جس نے اسے اتنی قیمتی چیز بخش دی تھی کہ اُس کا کوئی معقول جواب اُس کے پاس نہ تھا۔

مونیز نے گاڑی کے اندرونی حصے کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے بے تکلفی سے تبصرہ کیا، ”ویسے، گاڑی اندر سے خوبصورت ہے۔“

لیکن ایمان تو اپنے ہی خیالات کے جال میں الجھی ہوئی تھی۔ اُس نے زیر لب سوچا، ”آخر کوئی اجنبی اتنا قیمتی تحفہ یوں ہی کیسے دے سکتا ہے؟“

اچانک، مونیز کے قہقہے نے اُس فضا کی جامد خاموشی کو چیر ڈالا۔ اُس کے لہجے میں ایک عجیب سی فلسفیانہ چمک تھی، ”امیروں کے لیے دولت، مٹی کی مانند ہوتی ہے، ایمان۔“

ایمان نے اُس کے مزاحیہ لہجے کو سمجھتے ہوئے، ذرا سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”اچھا ہے کہ میں غریب ہوں!“

مونیز نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا، ”کوئی خدا ہو تو اللہ سب کو تمہارے جیسا غریب کر دے!“

ایمان نے ان خیالات کو جھٹکتے ہوئے ایک سنجیدہ سوال داغا، ”تم بتاؤ، ان تین مہینوں میں کیا کچھ کیا تم نے؟“۔

کار کا سفر جیسے ہی آگے بڑھا، موئیز نے ماضی کے پردے کو اٹھاتے ہوئے ان تین مہینوں میں ہونے والے واقعات کو سامنے لانا شروع کیا۔

اُس نے پاکستان میں ایک متنازع مرکز کھولنے کے منصوبے کا انکشاف کیا، جس کی مالی اعانت جینڈر انٹرایکٹو الائنس کر رہا تھا۔ ”جی آئی اے، امریکی تنظیم نے مجھے فنڈ فراہم کیا تھا کہ میں یہاں سیکس سینٹر کھولوں، ”موئیز نے افسوس کے ساتھ کہا، ”مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔“۔

ایمان نے حیران ہو کر اُس کے اس قدم کی منطق پر سوال اٹھایا، ”تمہیں کیا ملتا ہے اس سب سے؟“ اُس کی آواز میں تجسس اور تشویش کی ایک جھلک تھی۔

موئیز نے لا پرواہی سے جواب دیا، ”اس میں کیا غلط ہے؟“۔

ایمان نے ایک لمبی سانس لی اور سر کو جنبش دی، جیسے اُس نے اس صورتحال کی الجھن کو قبول کر لیا ہو۔

مگر اندر ہی اندر وہ کشمکش کا شکار تھی۔ اُس نے موئیز کے منصوبوں کے بارے میں معلومات کو راز میں رکھنے کے فیصلے پر سوچا۔ ”کیا مجھے اُس کے راز افشا کر دینے چاہئیں؟“ اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

۔ ”کسی برائی کو جانتے ہوئے بھی خاموش رہنا خود ایک گناہ ہے۔“

اب کی بار وہ ان سوچوں میں محو سی تھی

گاڑی، جو اب ان دونوں کے غور و فکر کی گواہ تھی، شہر کی ہنگامہ خیز سڑکوں پر سے گزر رہی تھی۔ گاڑی کے اندر موجود ہر فرد اپنے خیالات کے بھنور میں گھرا ہوا تھا، اپنے ضمیر کی پیچیدگیوں میں غوطے لگا رہا تھا، جیسے یہ راستے اُن کے اندرونی تضادات کا عکس ہوں۔

...°...

مارگلہ ہلز کی گہری سیاہی میں ستاروں کی بے نور چمک اور فضا میں معلق نادیدہ مخلوقات کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔

ہر شے خاموشی کی دبیز چادر میں لپیٹی ہوئی تھی، گویا زمین اور آسمان کے بیچ کوئی خفیہ کٹھ جوڑ ہو رہا ہو۔

ایمان اور موئیز کے درمیان گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ موئیز نے اچانک ایک بم پھینکا، ”میں کل امریکہ جا رہا ہوں، صنفی تبدیلی کے لیے۔ لوگ میری شناخت پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں، اب تو سب کو ہی علم ہو گیا ہے کہ میں کوئی خواجہ سرا نہ تھا۔ اسے پہلے یہ بات اور آگے نکلے مجھے اپنی جنس بدلنی ہوگی۔“

ایمان ابھی اس اچانک انکشاف کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک فضا میں ایک غیر مرئی تناؤ در آیا۔

سائے میں سے چار دھمکی آمیز شخصیتیں نمودار ہوئیں، ان کے چہرے پردے میں چھپے ہوئے، ہاتھوں میں بندوقیں تھامے ایمان اور مونیز کی طرف بڑھیں۔

ان کے قدموں کی چاپ زمین پر موت کا اعلان کرتی معلوم ہو رہی تھی۔

ایمان نے بے خوف ہو کر اُن کا سامنا کیا، جیسے طوفان کے سامنے کوئی اٹل چٹان کھڑی ہو۔ اُس کی گہری آواز نے فضا کا سکوت توڑا، ”تم کون ہو؟“۔

-

ایک طنزیہ قہقہہ گونجا، جیسے موت کی گود سے نکلی ہوئی ہنسی ہو۔ ”ہم تمہارے لیے آئے ہیں، پیاری۔“

ایمان کے چہرے پر بے خوفی کا تاثر گہرا ہو گیا۔ اس نے سر دلچے میں کہا، ”ہاتھ مت لگانا، ورنہ تمہاری ہاتھوں کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔“

مونیز نے جھٹ سے کہا، ”ایمان، بھاگ!“۔

مگر ایمان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی استقامت تھی، ”ہم کہاں بھاگیں؟ ہر طرف یہ ہی ہیں اور سنگل بھی نہیں کہ پولیس کو بلایا جاسکے۔“

گھسیٹیوں میں سے ایک نے مونیز کو حقارت سے دیکھا، ”اسے پکڑو اور لے آؤ۔“

ایمان نے غصے سے قدم بڑھایا، ”اُسے ہاتھ بھی مت لگانا!“ مگر اُس کی وارننگ کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ڈاکو نے موئیز کو دھکا دیا اور دوسرے نے اُس کے سر پر زوردار ضرب ماری۔

موئیز زمین پر گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ ایمان کی آنکھوں میں غصے کی چمک لپک اٹھی۔۔۔ ”موئیز!“ اُس کی آوازیں رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی گونجی۔

ڈاکوؤں کا قہقہہ گونجا، جیسے موت کی خبردار کرنے والی آواز ہو۔ ”تمہیں، کیا لگا تھا جانم ہم اس پر اپنا وقت ضائع کریں گے جو نہ تین میں ہے نہ تیرہ میں۔“

ایمان نے اپنے جبرے بھینچتے ہوئے تنبیہ کی، ”میرے قریب بھی مت آنا، ورنہ تمہیں ایسی عبرت کا نشانہ بناؤں گی کہ زمین بھی تمہارے وجود سے انکار کر دے گی۔“

ڈاکوؤں میں سے ایک نے قہقہہ لگایا، ”واہ، بڑے بڑے دعوے!“ اُس نے تمسخر سے اپنی بندوق نکالی اور ایمان کی طرف تان لی۔

ایمان نے بیرل کی طرف گھورتے ہوئے قدم آگے بڑھایا اور کہا، ”اگر ہمت ہے تو آزما کر دیکھو!“

اچانک، ایمان کی ٹانگ بجلی کی تیزی سے فضا میں اٹھی اور سیدھی اُس کے رانوں کے درمیان لگی۔ ڈاکو کی آنکھیں پھیل گئیں، اُس کے چہرے پر صدمے کا سایہ چھا گیا۔ اُس نے اپنی بندوق گرائی اور گھٹنوں کے بل گر گیا، سانس کے لیے ہانپتے ہوئے۔

ایمان نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور اُس کے بال پکڑ کر زبردستی اُس کا چہرہ قریب کے درخت سے ٹکرا دیا۔ وہ زمین پر بے جان پڑا تھا، شکست خوردہ۔

اُس کے تین ساتھیوں نے آنکھوں میں بے یقینی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

ایمان کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ”میں نے کہا تھا، یہ صرف لفظوں کا کھیل نہیں ہے۔ میں نے زندگی کے طوفانوں کا سامنا کیا ہے۔ تم جیسے لوگ میرے سامنے بھونکنے والے کتے ہو، جنہیں خاموش کرنے کے لیے ایک معمولی پتھر ہی کافی ہے۔“

ایمان کے اعلان نے ہوا میں گرج کی سی کیفیت پیدا کر دی، جیسے قدرت کی کوئی طاقت اپنے کمال پر پہنچ گئی ہو۔

تینوں ڈاکو اب غصے میں بھرے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ ایمان نے اپنے قدم جمائے رکھے، اُس کی آنکھوں میں عزم کی چمک تھی۔ اُن میں سے دو نے اس کے بازو پکڑے اور زبردستی اسے ایک درخت کے ساتھ ٹکرا نے کی کوشش کی۔

ایک ڈاکو نے ایمان کے منہ پر زور دار تھپڑ مارا۔ تھپڑ کی آوازیں رات کی خاموشی میں گونج اٹھی۔ مگر ایمان کے چہرے پر غصے کی سرخی کے سوا کچھ نہ آیا

۔ اس کی آنکھیں اب اور بھی بھڑک اٹھیں۔ جیسے ہی اُس نے اپنے بائیں جانب والے ڈاکو کو رانوں کے درمیان زور دار کلک ماری، وہ چیخ کر زمین پر گر ا۔

ایمان کی توجہ اب دائیں جانب والے ڈاکو پر مرکوز ہو گئی، جس نے اس کے دوپٹے کو کھینچ کر اتار دیا تھا۔ ایمان نے بغیر وقت ضائع کیے اپنی پیشانی سے اُس کے گلے پر ضرب لگائی، اُس کا سانس رک گیا اور وہ زمین پر گر کر ہانپنے لگا۔

اب ایمان کے سامنے صرف ایک دشمن بچا تھا۔ وہ خوف سے لرز رہا تھا۔ ایمان نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ”یہ تو ابھی شروعات ہے۔ تمہارے باقی ساتھیوں کے لیے بھی یہ ہی انجام ہے، اگر تم لوگ پیچھے نہ ہٹو تو۔“

دفعۃً ایمان نے اپنی پیشانی پر اڑتی لٹوں کو پیچھے کیا، دوپٹہ جھاڑ کر زمین سے اٹھایا اور پھر سامنے کھڑے اسیر کے چہرے پر یہ لپیٹا، وہ کسی عذاب کی علامت بن گیا۔

دوپٹے کو جھٹکے سے گھماتے ہوئے، ایمان نے اُس کے سر کو ایک قریبی درخت کے بے ڈھنگے تنے سے پوری قوت سے مارا، اور ایک ہی لمحے میں اُس کے چیخ و پکار نے رات کے سکوت کو چیر کر رکھ دیا۔

درخت کے تنے سے ٹکرا کر اُس شخص کی کراہیں فضا میں گونجتی رہیں، جیسے وہ درد کے سمندر میں ڈوب رہا ہو۔

ایمان نے تپتی نگاہوں سے اُس شخص کی طرف دیکھا جس نے اس کے منہ پر ہاتھ اٹھانے کی جسارت کی تھی۔ وہ ہی جو نیچے زمین پر گرے درد سے کراہ رہا تھا۔

ایمان کی نگاہوں میں انتقام کا انگارہ دکھ رہا تھا۔ قریب پڑی ایک شیشے کی بوتل پر ہاتھ مارا اور اُس کے ٹوٹنے کی آواز جیسے کسی المیے کا اعلان تھی۔

ایمان نے اُس بوتل کا تیز دھار ٹکڑا اٹھایا، اُس کے چہرے پر برہمی اور عزم کا غیر متزلزل تاثر تھا۔ ایک ہی لمحے میں، ایمان نے شیشے کا ٹکڑا اُس شخص کی ہتھیلی میں گاڑ دیا، جیسے اُس کی سسکتی رگوں میں عذاب کا زہر بھر رہی ہو۔

اُس شخص کی اذیت بھری چیخیں رات کے اندھیرے میں بھٹکنے والے پرندوں کی طرح ہوا میں پھیل گئیں۔

ایمان کے بدن میں گویا کوئی فوق الفطرت طاقت سمائی ہوئی تھی۔ اُس نے تیسرے حملہ آور کی طرف نظر کی، جو اُس کا دوپٹہ کھینچنے کی جسارت کر چکا تھا۔

ایمان کی گرفت لوہے کی طرح مضبوط تھی جب اُس نے اُس کے بالوں کو جکڑ لیا اور ایک جھٹکے میں اُسے اپنی جانب کھینچا۔

اُس کی آواز برف کی مانند سرد اور الفاظ تلوار کی دھار کی مانند تھے، ”کہاں بھاگ رہا ہے؟ ادھر آ، بہت شوق ہے تجھے ڈوپٹہ اُتارنے کا!“ ایمان نے اُس کے ہاتھ کو دوپٹے سے جکڑ لیا، جیسے اُسے اپنی قید میں لے لیا ہو۔

اگلے ہی لمحے، ایمان نے اُس آدمی کو ناہموار، پتھروں اور شیشے کے ٹکڑوں سے بھرے علاقے کی طرف دھکیل دیا۔ اُس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ حملہ آور کا جسم ایک گٹھڑی کی طرح اُس زمین پر لڑھکتا چلا گیا، یہاں تک کہ اُس کے حواس گم ہو گئے، اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

ایمان نے اپنا دوپٹہ جھٹک کر صاف کیا، اُس کی حرکات میں ایک خاص وقار اور شان تھی۔

اُس نے اُسے دوبارہ اپنے وجود کے گرد لپیٹ لیا، گویا اپنی طاقت کو دوبارہ باندھ رہی ہو۔ اپنے ہاتھوں سے مٹی صاف کرتے ہوئے، ایمان مونیئرز کے بے جان وجود کے قریب پہنچی۔

اُس کی قوت کا مظہر اُس وقت ہوا جب اُس نے مونیئرز کو اپنے کندھے پر اٹھالیا۔ جیسے وہ دنیا کی تمام آزمائشوں کو اپنے کندھے پر لے کر چل رہی ہو۔

ایمان کے وجود سے ایک مافوق الفطرت قوت کا پرتو ابھرتا محسوس ہو رہا تھا، وہ جیسے رات کی تاریکی کو چیرتے ہوئے نکل رہی تھی، ہر قدم کے ساتھ اُس کی شخصیت میں مزید ہیبت اور دبدبہ بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ رات کی سناٹا توڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی، اور پیچھے وہ دشمن رہ گئے تھے جو کبھی اُسے نقصان پہنچانے کا خواب دیکھتے تھے، مگر اب خوف اور سراسیمگی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ایمان اُس طاقتور عورت کا مجسمہ بن کر نکل رہی تھی، جو نہ صرف اپنے وجود کی حفاظت کرتی ہے بلکہ اپنے دشمنوں کو عبرت کا نشان بھی بنا دیتی ہے۔ اُس کی داستان وہ کہانی بن گئی جسے رات کی گہرائیوں میں سرگوشیاں کرنے والے دہراتے، اور جس کا ذکر ہمیشہ

قوت اور بہادری کی علامت کے طور پر کیا جائے گا۔

...°...

ایمان نے دروازہ جھٹکے سے وا کیا اور اندر قدم رکھا۔ جوں ہی اُس نے کمرے کی فضا میں داخل ہو کر ایک لمحہ بھر کی جھرجھری لی، کمرہ اچانک روشنی کے جھرمٹ میں غرق ہو گیا۔

اُس نے انتہائی احتیاط کے ساتھ مومیز کو اُس کے کندھوں سے پکڑا اور بستر پر دھیرے سے لٹا دیا۔ چند لمحے وہ ساکت کھڑی رہی، اُس کی نگاہیں اپنے دوست کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں، گویا کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔

وہ خاموشی سے سر ہلاتے ہوئے واش روم کی جانب بڑھی، اور وہاں کونے میں رکھی پانی سے لبریز بالٹی نے اُس کی نظر پکڑ لی۔

اُس نے ایک چپل کو اُس تیخ بستہ پانی میں پانچ یا چھ مرتبہ غوطہ دے کر گیلا کیا اور باہر نکالا۔

مونیزا ابھی تک نیند کے گہرے غلاف میں لپٹا پڑا تھا، چہرے کے بل لیٹا ہوا۔ اچانک، بغیر کسی پیشگی اطلاع کے، ایمان نے وہ گیلی چپل اُس کی کمر کے نچلے حصے پر پوری قوت سے مار دی۔ درد کی اس تیز لہر نے مونیزا کو جھٹکا دیا، اور وہ بے ساختہ بستر سے اچھل پڑا، اُس کی چیخ دب گئی مگر اُس کی نظروں میں شعلے لپک رہے تھے۔ اُس نے نچلے لہجے میں دل ہی دل میں درد کو سہارنے کی کوشش کی، اور ایمان کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

شاید، وہ اب جان چکا تھا کہ ”بھگو بھگو کر جو تمارنا“ کسے کہتے ہیں۔

ایمان کے لبوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی، اُس نے طنزیہ لہجے میں کہا، ”تم ہوش میں تھے، سارا وقت ڈرامہ کر رہے تھے بے ہوش ہونے کا!“۔

مونیزا نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جواب دیا، ”میں نازک مزاج ہوں، میں کیسے برداشت کر سکتا تھا؟ میں نے جان بوجھ کر یہ نالک کیا کہ میں بے ہوش ہوں کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ تم مجھے اس اذیت سے بچالو گی۔“۔

ایمان نے نفرت سے آنکھیں گھماتے ہوئے کڑی آواز میں جواب دیا، ”کتا اگر شیر کی کھال اوڑھ لے، تو شیر نہیں بن جاتا۔ تم عورت کا لباس پہن کر اپنی جنس نہیں بدل سکتے۔ اگر پانچ سو سال بعد کسی آثارِ قدیمہ کے ماہر کو تمہاری ہڈیاں ملیں، تو تمہاری ہڈیاں یہ گواہی دیں گی کہ تم مرد تھے، وہ یہ نہیں بتائی گی کہ تم اپنے آپ کو عورت سمجھتے تھے۔ تو تم عورت تھے

سمجھے۔ تم اس وقت کیسے اُس مشین کو روک سکو گے جو تمہاری جنس کا تعین کرے گی؟“۔

ایمان کی نظروں میں ایک سختی اور طنز تھا، اُس نے مزید کہا، ”اپنی جنس تبدیل کرنے سے پہلے ہزار بار سوچنا۔ اگر تم ایسا کرو گے، تو دوبارہ مجھ سے بات نہ کرنا۔“ یہ کہہ کر ایمان نے اپنے ہاتھ کی ایک تیز جنبش سے دروازہ بند کیا اور غصے میں بھرے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

مونی نے بند ہوتے دروازے کی طرف خالی نظروں سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت اور کراہت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔

...°...

صبح کا سورج اپنے سنہری شعاعوں سے فضاء کو آہستہ آہستہ روشن کر رہا تھا، جب مونی نے احتیاط سے اپنے سفری بیگ گاڑی کے ٹرنک میں رکھے۔

یہ منظر ہوائی اڈے کی جانب سفر کی طرف اشارہ کر رہا تھا، مگر ایک پوشیدہ اور پراسرار راہ اس کے ارادوں میں مکتوم تھی۔ وہ پچھلی نشست پر براجمان ہوا تو اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی استقامت اور خاموش عزم جھلک رہا تھا، جس کا اشارہ ہوائی اڈے کے آگے، کسی اور منزل کی جانب تھا۔

جوں جوں ٹیکسی شہر کی پیچیدہ اور مصروف شاہراہوں سے گزرتی جا رہی تھی، موئیز کے خیالات ایک گہرے راز کی گرہیں کھولتے محسوس ہو رہے تھے۔ اُس کے ذہن میں پوشیدہ ارادوں کا طوفان مچل رہا تھا۔ جب اسپتال قریب آیا تو اُس کی آنکھوں میں اسپتال کی شاندار عمارت کا عجیب سا عکس تھا، گویا اس کے اندر کوئی پوشیدہ معمّا پنہاں ہو، جواب کھلنے والا تھا۔

اسپتال کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی، موئیز نے اس کے سفید و جراثیم سے پاک راہداریوں کو مکمل آگاہی کے ساتھ عبور کیا، جیسے وہ ان کے ہر موڑ، ہر قدم سے واقف ہو۔

اُس کے قدم بے خودی میں چلتے رہے، یہاں تک کہ وہ اُس دروازے کے سامنے جا پہنچا جس کے پیچھے ایک راز چھپا ہوا تھا۔

دروازہ کھلا، اور اندر کمرے میں موجود چار چہرے اُس کی آمد پر سختی سے جڑ گئے، ان کے چہروں پر ناراضی اور گھبراہٹ کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔

ان کی نظریں ملیں اور فضا میں ایک عجیب سا تناؤ پیدا ہو گیا، جیسے کسی بھاری راز کا بوجھ ہوا میں معلق ہو۔
مونی نے اپنی گہری آواز میں بول کر خاموشی کو توڑا، اُس کے الفاظ قطعی اور بے لچک تھے ”اگر تم ایک
لڑکی کو قابو میں نہیں رکھ سکتے، تو مرد کہلانے کا حق نہیں رکھتے۔ ایک چھوٹی سی لڑکی کو قتل کرنے کی ہمت
نہیں ہوئی تم سے۔“

کمرے میں موجود سب نے سانسیں روک لیں، اُس کی باتوں کا گہرا اثر اُن کے دلوں پر ہوا۔ ایمان کے
انتقام کی مار کھائے ہوئے ان افراد نے ایک زبان ہو کر اعتراف کیا، ”ہم ویسے بھی مرد نہیں رہے؛ اُس
کے انتقام نے ہماری ساری قوت ختم کر دی ہے۔“

ان کی باتیں اُس کمرے میں تاریخ کی گونج بن کر پھیل گئیں، گویا کوئی قدیم راز کھل کر سامنے آ گیا ہو۔
کمرے کی فضا اُن کے الفاظ کے بوجھ سے بھاری ہو گئی، اور ماضی و حال کے درمیان معلق مونی نے اپنے
گلے میں کسی ان کہے جرم کا دباؤ محسوس کیا۔

پھر وہ اچانک کمرے سے نکل کھڑا ہوا، اُس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی سچائیوں کا بھاری بوجھ تھا، جو کسی
گہرے راز کا آئینہ دار تھا۔ دروازہ اُس کے پیچھے بند ہو گیا، اور کمرے میں موجود چاروں افراد
اپنی لگائی آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔

اسپتال کی راہداری ایک بار پھر خاموشی میں ڈوب گئی، اور وہ اسرار جو ابھی کچھ لمحے پہلے کھل چکا تھا، اُس کی گواہی دے رہی تھی۔ مونیز کی روانگی نے اُس کے الگ راستے کی تصدیق کی، ایک ایسا راستہ جو اُس نے اپنے پیچھے چھوڑا، اسرار و پوشیدہ حقائق سے لبریز۔

...°...

مونیز ٹیکسی کی پچھلی نشست پر بیٹھا، اُس کے ذہن میں انکشافات کی بھاری زنجیریں جکڑی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی اُس نے اپنے موبائل کی جانب ہاتھ بڑھایا، گونار کا نام اسکرین پر نمودار ہوا، جس کی روشنی اُس کے چہرے پر ایک بھیانک، مکروہ مسکراہٹ پیدا کر گئی۔

فون کان سے لگاتے ہی، گونار کی زہر آلود آواز اُس کے کانوں میں سرایت کر گئی، ایک ایسی آواز جس نے اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑادی۔

۔ ”ایمان اکیلی نہیں ہے،“۔ گونار کے الفاظ زہر کی مانند ٹپک رہے تھے، جنہوں نے مونیز کے دل پر خوف کی چھاپ لگادی تھی۔

گونار نے اپنی بات کو جاری رکھا، اُس کی آواز میں ایک سرد و گرم چنگاری تھی، ”نہ وہ کوئی عام لڑکی ہے؛ وہ میری محبت کے جوہر کا مجسم عکس ہے۔ جو بھی اُس کو گزند پہنچانے کی ناپاک جسارت کرے گا، اُسے اسی زمین پر عذاب کی ایک نہ ختم ہونے والی کھائی میں دھکیل دیا جائے گا۔ ایک ایسا جہنم جہاں ہر سانس بھاری قیمت کے ساتھ آئے گا، اور درد اُس کا ہمہ وقت ساتھی بن جائے گا۔“۔

مونیز کا چہرہ فق ہو گیا، گونار کے الفاظ کا بوجھ اُس کے کندھوں پر گہرا اثر چھوڑ گیا۔ فون کے اُس پار سے گونار کی نفرت بھری صدائیں ابھر رہی تھیں، گویا وہ مونیز کو ایک خون آشام جنون میں جھونک رہی ہوں۔

اُس نے بے چینی سے اپنی ارد گرد کی فضاء کو دیکھا، اُس کی سانسیں بھاری ہو رہی تھیں، جب اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا، گویا اپنے منتشر اعصاب کو قابو میں کرنے کی بے سود کوشش کر رہا ہو۔

گونار کا سرد انتباہ اپنی شدت سے برقرار رہا، ”میرے وفادار، درختوں کے سائے میں چھپے، ہمیشہ تیار ہیں۔ اگر ایمان تمہارے ناپاک ارادوں میں رخنہ نہ ڈالتی تو تمہارا یہ سفر ہوائی اڈے کی جانب نہ ہوتا؛ بلکہ تمہاری منزل قبرستان ہوتی، جہاں چار کاندھوں پر تمہاری لاش اندھیرے کے کفن میں لپیٹی جاتی۔“

گونار کی باتیں ہوا میں معلق تھیں، سرد اور دہشت ناک۔ مونیز کے چہرے کی رنگت مزید پیلی پڑ گئی، اُس کے لبوں پر ایک پتلی لکیر کی مانند خوف کا سایہ صاف دکھائی دے رہا تھا، گویا وہ گونار کے بے رحم انتقام کے دائرے میں قید ہو گیا ہو۔ پھر گونار کی آواز نے انگریزی میں اپنی زہریلی شدت کو آگے بڑھایا

“And let me make this crystal clear—I won't succumb to the absurdity of falling for a boy. Straighten up; my role is to champion LGBTQ causes, not to be ensnared by them. Take a pause to reassess your

misconceptions about me. Mark my words, the next misstep, and your
”path might well be paved on four shoulders, not your feeble two legs

اور سن لو، یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے کہ میں کسی لڑکے کے عشق میں گرفتار ہونے کی
حماقت نہیں کروں گی۔ سیدھے ہو جاؤ؛ میرا فرض ہے کہ میں ایل جی بی ٹی کیو تحریکوں کی حمایت کروں، نہ
کہ اُن کے جال میں پھنس جاؤں۔ ایک لمحہ رُک کر اپنی غلط فہمیوں پر نظر ثانی کرو۔ یاد رکھو، اگلی لغزش پر
تمہارا سفر دو کمزور ٹانگوں کے بجائے چار مضبوط کندھوں پر بھی طے ہو سکتا ہے۔

کال اچانک ختم ہو گئی۔ مونیز کا ہاتھ لرزتا ہوئے موبائل کو پکڑے رہا، اُس کی آنکھیں بے یقینی اور خوف
سے اسکرین کو گھورتی رہیں۔

جیسے ہی اُس نے فون کو بوجھل سانس کے ساتھ نیچے رکھا، اُس کے چہرے پر بیزاری کے سائے نمایاں
تھے۔ اُس نے زیر لب بڑبڑایا، ”سمجھ نہیں آتا کہ آخر اس ایمان میں ان مردوں کو کیا ملتا ہے۔“

گونار کی وارننگ کا بھاری بوجھ ابھی تک فضا میں منڈلا رہا تھا، اور مونیز اس عجیب اور گھٹن زدہ احساس کو
جھٹک نہیں پارہا تھا کہ اُس کے ہر عمل پر نگاہ رکھی جا رہی تھی۔

گونار کے ہولناک الفاظ کے سامنے، مونیز کو یہ ادراک ہونے لگا کہ وہ جس کھیل میں ملوث ہوا، اُس کا داؤ
اُس کی توقع سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔

مویز نے خود کو ہوائی اڈے کے متحرک اور ہنگامہ خیز پوت میں پایا، جو انسانی قصے کہانیوں کا ایک دلکش مجموعہ تھا۔

ہر مسافر اپنی اپنی منفرد کہانیوں کے ساتھ، روانگی اور ملاپ کی توانائی سے گونجتے ہوئے ٹرمینل سے گزر رہا تھا۔

مویز جیسے ہی ایک نشست پر بیٹھا، ارد گرد کا منظر ایک شاہکار کی صورت میں اس پر آشکار ہوا۔ نیون روشنیوں کی کرنیں دیواروں پر چھلکتی ہوئی، گزرنے والے مسافروں کے چہروں کو مدھم سی چمک سے سجا رہی تھیں، اور کہیں دور سے اعلانوں کی ہلکی سی بھنبھناہٹ سامان کے پہیوں کی چرخ کے ساتھ مل کر ایک عارضی جھانکی تخلیق کر رہی تھی۔

ہوائی اڈے کے ماحول میں وقت جیسے رک سا گیا تھا، مگر ہر لمحہ ان دیکھے سفر کی طرف مائل تھا۔

اسی ہنگامے کے درمیان ایک ساتھی مسافر آہستگی سے مویز کے قریب بیٹھا۔ اس کی توجہ ایک اخبار پر مرکوز تھی، جس کی سرخیاں اُس کے سنجیدہ چہرے پر اترتے سائے کی طرح لہریں بناتی تھیں۔ اچانک، اُس نے ایک نیم خیال کے ساتھ خاموشی توڑی، ”انسان دنیا کی آسائشوں میں ڈوب رہا ہے، جبکہ اصل حقیقت آخرت کی ہے۔“

مونیز نے ایک سوالیہ نگاہ اُس کی طرف ڈالی، اور بظاہر خاموشی سے پوچھا، ”کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“۔

لڑکے نے مونیز کی توجہ اخبار کی ایک خبر کی طرف دلائی اور نہایت سکون سے کہا، ”یہ خبر دیکھیں، ایک شخص نے دولت کے لیے اسلام چھوڑ دیا،“۔

مونیز نے ایک خفیف اشارے سے اس موضوع کو نچلا بٹھانے کی کوشش کی، ”تو کیا؟ ہر کسی کو اپنی مرضی کرنے کا حق ہے۔“۔

لڑکے نے نہایت متانت سے اور گہرے عقیدے کے ساتھ کہا، ”ہمیں اپنی مرضی کے بجائے اللہ کی مرضی کی پیروی کرنی چاہیے۔“۔

مونیز نے اس بیان کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے ایک سنگین مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔

اُس شخص نے مزید بات جاری رکھتے ہوئے ایمان کی سچائی پر زور دیا اور ایک فلسفیانہ انداز میں کہا، ”آخر کار، ہمیں لوٹ کر اللہ کی طرف ہی جانا ہے۔“

عین اُسی لمحے، فضا میں مونیز کی پرواز کا اعلان گونجنے لگا۔ پورا ٹرمینل جیسے متحرک ہو گیا۔ مسافروں کا ایک بہاؤ اپنے اپنے دروازوں کی جانب بڑھنے لگا۔

مونیز نے رخصت کی تیاری کرتے ہوئے ایک آخری نظر اُس مسافر کی جانب ڈالی۔ لیکن لڑکے نے آخری الفاظ کے طور پر، ایک گہری سنجیدگی کے ساتھ قرآن کی سورہ فُصِّلَتْ کی ایک آیت تلاوت کی جو لوگ ہماری آیتوں میں کج راہی کرتے ہیں، وہ ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ بھلا جو شخص دوزخ میں ڈالا جائے وہ بہتر ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن و امان کے ساتھ آئے؟ جو چاہو کرو، وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ (40) وہ لوگ جنہوں نے اس نصیحت کو نہ مانا جب وہ ان کے پاس آئی، اور یہ ایک بلند رتبہ کتاب ہے (41) اس پر نہ آگے سے اور نہ پیچھے سے جھوٹ کا دخل ہو سکتا ہے۔ یہ حکمت والے اور خوبیوں والے اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ (42) اور تم سے وہی باتیں کہی جاتی ہیں جو تم سے پہلے پیغمبروں سے کہی گئیں، اور بے شک تمہارا رب معاف کرنے والا اور دردناک سزا دینے والا ہے (43)

یہ مقدس کلمات، فضا میں ایک مقدس راگ کی طرح معلق ہو گئے۔ ہوائی اڈے کا ہنگامہ چند لمحوں کے لیے جیسے خاموش ہو گیا ہو، اور مونیز کی سانسوں نے بے ترتیبی اختیار کر لی۔

دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، اور وہ قرآن کی اس آیت کی گونج کو اپنے اندر محسوس کرتا ہوا، جیسے کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر، بورڈنگ گیٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

جیسے ہی مونیز نے اپنا سفر شروع کیا، اُس لڑکے کی موجودگی، جو کہ ایک فرشتے کی مانند پیغام لے کر آیا تھا، غائب ہو گئی۔ ہوائی اڈے کے اُس لمحاتی تقدس میں، دنیاوی سفر اور روحانی بیداری ایک دوسرے میں یوں

ضم ہو گئے کہ مونیز کو ایک نئے فکری سفر پر روانہ کر دیا، جہاں خود شناسی اور روحانی حقیقتیں ایک نئے معنی میں ظاہر ہو رہی تھیں۔

...°...

گونار نے اپنے ارد گرد کے خاموش کمرے میں ایک گہری سانس لی، جہاں لکڑی کی دیواروں پر وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔

وہ نار تھ سوڈن کے ایک دور دراز گاؤں میں موجود تھا، جہاں زندگی کی رفتار سست ہو چکی تھی اور ہر شے میں ایک پراسرار سکوت کا سایہ تھا۔ آتش

دان کی مدھم سی روشنی کمرے میں پھیکی روشنی بکھیر رہی تھی، جس کی آگ سے اٹھتا دھواں کمرے کو جلتی لکڑی کی مخصوص خوشبو سے بھر رہا تھا۔

گہری سوچوں میں ڈوبا گونار، قالین والے فرش پر بیٹھا تھا، اس کی نظر کھڑکی سے باہر، برف کی ایک لا متناہی سفید چادر پر جا ٹھہری تھی۔ قطب شمالی کی طویل رات کے باوجود، آسمان میں ایک معجزاتی منظر تھا — برف پر سبز، نیلے اور جامنی رنگ کی روشنیوں کا دلکش رقص، اور ورا کی جادوئی شعائیں، جو کائنات کے حسن کی گواہی دے رہی تھیں۔ یہ منظر دل کو چھو جانے والا تھا، جیسے قدرت کا کوئی پیغام ہو جو گونار کی روح میں اتر رہا ہو۔

کھڑکی سے آتی ہلکی روشنی اور کمرے کے اندر مدہم آگ کی روشنی کے ملاپ نے ماحول کو اور بھی جذباتی بنا دیا۔

گونار کی نگاہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر جار کی — وہ ہی گھڑی جس کو ایمان نے اس عورت کو دے تھی اور اس عورت نے وہ گھڑی گونار کو۔

یہ زبردستی کالیا گیا تحفہ ایک ایسا تحفہ تھا جس نے گونار کی زندگی کو ایک نئی روشنی دی تھی۔ گونار کے لبوں پر ایک اداس مسکراہٹ آئی، جیسے وہ کسی پرانی یاد میں کھو گیا ہو۔ ”شکریہ، ایمان،“ اس نے ہلکی آواز میں سرگوشی کی۔

یہ گھڑی جو کبھی نازک اور نسوانی تھی، اب اس کے ہاتھوں میں تبدیل ہو چکی تھی — بالکل اسی طرح جیسے گونار خود بھی زندگی کے ہاتھوں ڈھل چکا تھا۔

لکڑی کی میز پر کھلا ایک پرانا البم تھا، جس میں دو تصاویر رکھی تھیں — ایک ایمان کی، اور دوسری اس کی ماں کی۔

حیرت انگیز طور پر، دونوں کی صورت میں ایک عجیب مشابہت تھی، جیسے وہ کسی طرح ایک دوسرے سے جڑی ہوں۔ گونار کی نظریں ان تصویروں پر ٹکی رہیں، اور ایک گہری چھن اس کے دل میں اتری۔

- ”میں ایک شیطان بن گیا تھا، ایمان،“ اس نے دھیرے سے کہا، جیسے اپنے دل کی گہرائیوں سے بات کر رہا ہو۔

- ”زندگی نے مجھے ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا جہاں میں اپنے آپ سے بھی بھٹک گیا تھا۔ لیکن تمہاری ایک جھلک نے میری حقیقت کو بدل دیا۔ تم نے میری ٹوٹی ہوئی انسانیت کو بحال کیا، اور میرے دل میں ایک نئی روشنی بھری۔“

اس کی نظریں اپنی ماں کی تصویر پر جا رکیں۔ آنکھوں میں چھپی ہوئی اداسی گہری ہو گئی۔

- ”ہیرا اور ولن دونوں ایک جیسے راستے سے گزرتے ہیں،“ گونار نے خود سے کہا۔

- ”دونوں کو دکھ کی صلیب پر چڑھایا جاتا ہے، لیکن ان کے انتخاب انہیں مختلف بناتے ہیں۔ ولن، اپنے درد کے ہاتھوں بے بس ہو کر، دوسروں کو چوٹ پہنچانے لگتا ہے۔ جبکہ ہیرا، اپنے غم کو روشنی میں بدل دیتا ہے، اور درد کو طاقت بنا کر آگے بڑھتا ہے۔“

گونار کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ ”شاید میں نے بھی زندگی میں غلطیاں کی ہیں، شاید میں بھی اپنے ماضی کے بوجھ سے آزاد نہیں ہو سکا۔ میرے قدموں کے نشان غلط فیصلوں سے بھرے پڑے ہیں، ہر لمحہ پچھتاوے کی گونج میں ڈوبا ہوا ہے۔“

اس کے وجود کی گہرائیوں سے ایک خاموش آہ نکلی، جو کمرے میں مدھم سی گونج بن کر رہ گئی۔

گونار کی آنکھ سے ایک اکیلا آنسو ٹپکا، جیسے اس کی روح کے بوجھ کا نچوڑ ہو، اور وہ نرمی سے اس کے گال کا راستہ طے کرتا ہوا نیچے کی طرف لڑھکنے لگا۔

بغیر کسی شور کے، یہ آنسو سیدھا ماں کی فریم شدہ تصویر پر جاگرا، جیسے ماضی اور حال کے درمیان ایک خاموش پل بن گیا ہو، ایک ایسا رابطہ جو گونار کے دل کی گہرائیوں میں کہیں دفن دکھ اور اس کی یادوں کو دوبارہ زندہ کر گیا۔

کمرے میں ایک مدھم سی آواز گونجی — ”ٹپ، ٹپ“ — جیسے اس آنسو نے ایک تال میل پیدا کیا ہو۔

گونار کی نظریں ایک دم کھڑکی کی طرف مڑ گئیں، جہاں چھت سے ٹپکتی ہوئی پانی کی بوندیں اس اداسی میں ایک اور جہت شامل کر رہی تھیں۔

باہر برف کا پُرسکون میدان اور اوپر رقص کرتی اور ورا کی روشنی بدل کر اب مختلف منظر میں تبدیل ہو گئی تھی یہ سفر مستقبل سے ماضی کا تھا۔

گزشتہ منظر کی بازگشت۔۔

کمرے کی ہر چیز اب گونار کے بچپن کا عکس بن چکی تھی، وہ ہی کمرہ جو کبھی اس کی پناہ گاہ ہوا کرتا تھا۔ دیواروں پر بچپن کے ہیر و سپر مین کے پوسٹر اب اس کے کھوئے ہوئے معصوم دنوں کی نشانی بنے ہوئے تھے، لیکن اس روشنی کے پیچھے زندگی کے تلخ اسباق چھپے ہوئے تھے۔

بارہ سالہ گونار اپنے بستر کے قریب کھڑا تھا۔ اس کی ماں، جو نورڈک حسن کا مجسمہ لگتی تھی—سنہرے بال، نیلی آنکھیں، اور دودھیا سفید رنگت—نرمی سے گونار کو ایک شرٹ پہنا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ماں کی مہربان مسکراہٹ تھی، جو گونار کو زندگی کے پیچیدہ اسباق سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

—”بیٹا، ہمیشہ دوسروں کا خیال رکھو، خاص طور پر لڑکیوں کا۔“ اس کی ماں نے نرمی سے کہا، جیسے وہ حکمت کے الفاظ اس کے دل میں اتار رہی ہو۔ ”چاہے وہ تمہاری ماں ہو، بہن ہو، یا کوئی اور—ان کے دل نازک ہوتے ہیں، اور انہیں تکلیف دینا سب سے بڑی نا انصافی ہے۔ جاؤ، اپنی بہن زیبا سے معافی مانگو، کیوں کہ کسی کو بلا وجہ دکھ پہنچانا ٹھیک نہیں۔“

گونار کا چھوٹا دل ان الفاظ کے بوجھ تلے دب گیا، اور اس کی آنکھوں میں شرمندگی کا سایہ اُتر آیا۔ اس کی ماں نے نرمی سے اس کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں لے کر اوپر اٹھایا۔

ان نیلی آنکھوں میں ایک ماں کی محبت اور شفقت کی جھلک تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک گہری دانش بھی۔

۔ ”ایز کنیل...“ اس کی ماں نے اس کا اصل نام پکارا، جیسے اس نام کی گہرائی کو یاد دلارہی ہو۔ ”گناہ یا غلطی پر شرمندہ ہونا نیکی کی علامت ہے، لیکن بیٹا، وہ شرمندگی بیکار ہے اگر وہ غلطی آخری نہ ہو۔“

اس کی ماں نے اس کے گھنے، شاہ بلوطی بالوں کو نرمی سے سنوارا، اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا، ”ماں باپ غلطیاں معاف کر دیتے ہیں مگر دنیا نہیں کرتی۔“

ایز کنیل نے اپنے جذبات کی گہرائی کو سنبھالتے ہوئے پُر ملامت لہجے میں کہا، ”جی، موم، میں اپنی غلطی کا بوجھ دل پر اٹھائے ہوئے ہوں اور صدقِ دل سے ندامت کا اظہار کرتا ہوں۔“

اُس کی ماں، جو ایثار و محبت کا مجسم پیکر تھی، نے اپنی پر مہر آنکھوں سے اُسے دیکھا اور ماتھے پر ایک ہلکا سا بوسہ دیا۔ اُس نے ایز کنیل کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے نہایت شائستگی سے فرمایا، ”چلو، ہم از سر نو اُس معافی کے سفر کا آغاز کریں، کہ معافی تلافی سے انسان پست نہیں ہوتا، بلکہ اس کی باطنی عظمت مزید نکھر جاتی ہے۔“

ایز کنیل نے اپنی ماں کا ہاتھ تھاما اور زینوں سے اترتے ہوئے محسوس کیا کہ ماضی کی مغموم یادیں، فضاء میں کہیں معلق ہیں۔

نیچے اترتے ہی بائیں سمت مڑ کر وہ ایک کشادہ لاؤنج میں داخل ہوا، جسے شیشے کے بھاری پردوں نے دلکش انداز میں جدا کیا ہوا تھا۔

اُس سکون بخش فضا میں اُس کی نظر اپنی بڑی بہن زیبا پر پڑی، جو ٹیلی ویژن کی روشنی میں مستغرق تھی۔ ایز کئیل نے آہستگی سے قدم بڑھا کر اُسے پیچھے سے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا؛ یہ وہ بے ساختہ ملاپ تھا جو بہن بھائیوں کے رشتے کی خلوص بھری گرمی کا عکاس ہوتا ہے۔

زیبا، جس کی صورت میں اُس کی ماں کی جھلک نمایاں تھی۔ نیلی آنکھوں اور لبوں پر نزاکت سے سبھی مسکان۔ نے یکایک اُس کے غیر متوقع گلے کا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ زیبا، جو عمر میں ایز کئیل سے چھ برس بڑی تھی، اُس لمحے اپنے جذبات میں مشفقانہ روشنی بھرے، جیسے اُس تعلق کی خوبصورتی کو اپنے دل میں سمو لیا ہو۔

ایز کئیل نے کچھ توقف کے بعد اپنی گزشتہ غلطیوں پر غور کرتے ہوئے آہستگی سے کہا، ”سوری، سسٹر۔“

زیبا کی مسکراہٹ اُس خاندانی مفاہمت کا ثبوت تھی، جس نے ایز کئیل کو تسلی دی، ”اُس اوکے۔“

یہ منظر مزید گہرا ہوا جب ایز کئیل نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی اِسعیاہ کو اپنی محبت بھری آغوش میں لیا۔

بکھرے ہوئے کھلونوں کے درمیان، اُس نے اُس معصوم بچے کو ہوا میں اٹھا کر کہا، ”یہ رہا میرا پیارا اِسعیاہ!“ پانچ سالہ اِسعیاہ نے، جیسے ہی اُس کے گال پر ایز کئیل کا بوسہ محسوس کیا، خوشی سے مسکرایا۔

اور وہ بھی اسے لپٹا ”آپ بھی میرے بھائی ہیں میرے پیارے ایز کئیل بھائی۔“

ایز کنیل کی ماں نے اُس منظر کو محبت بھری خاموشی کے ساتھ دیکھا، جیسے وہ اُس تعلق کے اُس خاموش دھاگے کی گواہ ہو جو اُس کے بچوں کے دلوں میں بُنا ہوا تھا۔

تاہم، دروازے کی گھنٹی کی گونج نے اُس سحر کو لمحاتی طور پر توڑ دیا۔ وہ ہلکی سی چونک کر اُٹھی اور مہمان کی جانب متوجہ ہوئیں۔

ایز کنیل کی ماں، جو اپنے انداز و اطوار میں ایمان اور وجاہت کی آئینہ دار تھی، ایک خوش ذوق لباس میں ملبوس تھیں۔ اُنہوں نے ایک سیاہ فراک زیب تن کیا تھا، جس پر جامنی رنگ کے پھولوں کی نفیس کڑھائی تھی۔

اُن کی کلائیوں میں جامنی کر سٹل کی بریسلٹ جھلملا رہا تھا اور کانوں میں اسی مناسبت کی نازک بالیاں لٹک رہی تھیں۔

جب وہ دروازے کی سمت بڑھی، تو گھر کی اندرونی عظمت کا جلوہ اور زیادہ نمایاں ہو گیا۔ نفاست سے تراشے گئے فریم، پیچیدہ سجاوٹ، اور روشنیوں کی نرم چمک اُس شاندار داخلی دروازے کو ایک پُر شکوہ تاثر دے رہی تھی۔

کالی وردی میں ملبوس ایک نوکرانی نے دروازہ کھولا اور سامنے ایز کنیل کے والد، ابراہام، کھڑے تھے۔ وہ ایک باوقار اور کرشماتی شخصیت کے مالک تھے، جن کی شبیہ اور وجاہت ایز کنیل میں جھلکتی تھی۔ میری نے اپنے شوہر کا بیگ تھامتے ہوئے کہا، ”خوش آمدید!“

ابراہام نے مسکراتے ہوئے اُس کے ماتھے پر پیار بھرا بوسہ دیا اور نرم لہجے میں کہا، ”شکریہ میری۔“

(merry)(مریم)

میری نے ایک مطمئن سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”شکریہ، ابراہام، تم جلدی آگئے، تمہارا بیٹا آج خاصے غصے میں ہے۔“

ابراہام نے تعجب سے استفسار کیا، ”کیوں؟ آخر کیا ہوا اسے؟“ اس کی آنکھوں میں سوالوں کی جھلک تھی۔

لیکن میری نے چپ رہنے کا اشارہ کیا، گویا کچھ نہ کہنا بہتر ہے۔ عین اسی لمحے، ایک منحوس اور مکدر ہستی منظر میں نمودار ہوئی، ہر گونجتا قدم جیسے ماحول پر منفی اثر ڈالتا جا رہا تھا۔

یہ شخص، جس کے پاس ابراہام کے کاروبار کا بیس فیصد حصہ تھا، اس کا سگا بھائی ڈریک تھا۔ ڈریک کے چہرے پر بد تمیزی اور غرور کی واضح جھلک تھی، جو اس کی بد خلق فطرت کی غمازی کرتی تھی۔

ڈریک کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا، بارہ سالہ ایلکس، جس کی معصومیت ایک مکروہ سایہ تلے دہتی نظر آرہی تھی۔

جب ڈریک نے گھر کے ماحول کا جائزہ لیا، تو جیسے کمرے کی فضا کا ایک بدل گئی، بھاری اور غیر محسوس سی ہو گئی۔

میری نے ایکس کو بظاہر شفقت بھری مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہا، ”اوہ، ایکس۔“ اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ ایکس کے کندھے پر رکھا اور پھر شوہر اور ڈریک کو نظروں کے اشارے سے ڈرائنگ روم کی طرف جانے کو کہا، ”آپ لوگ ڈرائنگ روم میں چلیں، میں ابھی چائے بھجواتی ہوں، آپ دونوں کے لیے۔“

اس کے بعد وہ ایکس کو آرام سے لے جاتے ہوئے بولی، ”آؤ، ایکس، ایز کئیل کے ساتھ کھیلو، وہ اندر ہو گا۔“ جب وہ ایکس کو لے کر روانہ ہوئی، تو ڈریک نے میری کی پشت پر ایک عجیب سی نظر ڈالی، گویا کہ وہ کسی مخفی نیت کا حامل ہو۔ ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کمرے کا ایک سرسری جائزہ لیا۔ ابراہام بے خبری میں آگے بڑھ رہا تھا، اس کے برادر کی چالاکیوں سے نا آشنا۔ ڈریک کی موجودگی میں ایک غیر مرئی شیطانی چمک تھی، جو جیسے ایک پراسرار اور پرخطر واقعے کی پیشین گوئی کر رہی ہو۔

....°....

میری، ایکس کو ایز کئیل کے کمرے میں لے کر آئی، جہاں ایز کئیل

اپنی گیم کی دنیا میں مگن اور، بھاری ہیڈ فونز کے سائے تلے غرق تھا، ریموٹ کنٹرول کے ساتھ بھرپور یکسوئی سے مصروف عمل تھا، جیسے وہ ورچوئل میدان جنگ میں اپنی فتوحات رقم کر رہا ہو۔ میری نے آہستگی سے ایز کئیل کے کانوں سے ہیڈ فون اتارے، وہ مڑتے ہی حیرت سے بولا، ”موم کیا ہوا؟“ اور

فوراً اس کی نظر ایکس پر جا گئی، جسے دیکھ کر اس کے لبوں پر مسرت آمیز تبسم بکھر گیا، ”ارے، ایکس! آؤ، نئی فائٹنگ گیم کھیلتے ہیں۔ فائٹنگ دازومبی ارینا بھی لاؤنچ ہوئی ہے۔“ ایکس فوراً جوش کے ساتھ قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا، جیسے ایک مجازی میدان میں معرکہ آرائی کے لیے آمادہ ہو۔

لیکن اس پورے منظر نامے کے پس پردہ، ان دونوں کو علم نہ تھا کہ مستقبل میں یہ ہی ایکس، جسے ایز کنیل نے گونار بن کر اپنے غنغوان شباب میں ایک المناک اور خون آلود انجام تک پہنچا کر، تیزاب کے بے رحم دریاؤں میں غرق کر دینا تھا۔۔

۔ قسمت کے اس کھیل نے ان کے حالیہ گیمنگ مقابلے کو ایک پوشیدہ حقیقت کا آئینہ بنا دیا تھا، ایک ایسا کھیل جس کے قواعد و ضوابط محض ورچوئل دنیا تک محدود نہیں تھے۔

میری نے اچانک مداخلت کرتے ہوئے ان دونوں کو خبردار کیا، ”کھیلتے کھیلتے لڑنے مت جانا،۔ میں تم دونوں کے لیے فنگر چپس بھجواتی ہوں۔“ وہ ایک نرمی بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی اور دروازہ بند کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

اب ان بے خبری میں مگن کھلاڑی اپنی مجازی دنیا کی رنگینیوں میں غرق ہو چکے تھے، اس بات سے بے خبر کہ ان کے درمیان پنہاں وہ گہرا اندھیرا موجود تھا جو نادانستہ طور پر ان کی دنیا کو ہمیشہ کے لیے بدل سکتا تھا۔

خوبصورت ڈرائنگ روم کی پرسکون فضا میں، ابراہام اور ڈریک دستاویزات پر غور کرتے ہوئے بیٹھے تھے۔
کمرہ نفیس سجاوٹ اور قدیم فانوس کی روشنی سے مزین تھا۔

چائے کا وقت قریب تھا، اور دروازے کی جانب سے ہلکی آواز آئی۔ اولیویا، ابراہام کی دیرینہ ملازمہ، ایک
نفیس چائے کی ٹرالی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

اس ٹرالی پر ایک خاص قسم کی سویڈش چائے رکھی تھی، جسے مقامی طور پر ”سویڈش پونچ ٹی“ کہا جاتا تھا، یہ
چائے سویڈن کی مخصوص مہک اور ذائقے سے بھرپور تھی، جس میں ہلکی مسالے دار خوشبو، دار چینی اور
لونگ کے اجزاء شامل تھے۔

چائے بنانے کا عمل اپنے اندر ایک الگ ہی فن تھا۔ اولیویا نے بڑے سلیقے اور نپے نکلے انداز سے چائے کی
پتی، جو کہ سویڈش پونچ چائے تھی، ایک خوبصورت چائے دانی میں ڈالی۔ اس نے تازہ ابلا ہوا پانی ڈالا، اور
چائے کی خوشبو فوراً کمرے میں پھیلنے لگی۔

ساتھ ہی، وہ ایک باریک سنہری چھلنی سے لیموں کے قتلے کاٹ کر چائے میں ڈالنے لگی، جس سے چائے کی
خوشبو میں ایک الگ تازگی پیدا ہو گئی۔

ڈریک نے چائے کی خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے اپنی چالاکی سے بھری آنکھیں ابراہام کی طرف اٹھائیں۔
ابراہام اپنے کام میں مگن تھا، اور اس کا دھیان کاغذات پر تھا۔

اولیو یا چائے تیار کرنے کے دوران باریک بینی سے دونوں مردوں کو دیکھتی رہی، گویا کچھ پوشیدہ رازوں سے واقف ہو۔

چائے کا عمل مکمل ہوتے ہی، چائے کے پیالے میز پر رکھ دیے، اور ساتھ ہی نفاست سے تراشا ہوائی رنگ
کیک پیش کیا۔

ڈریک کی آنکھوں میں ایک جھلک سی نمودار ہوئی، جسے اولیو یا نے نظر بھر کر دیکھا اور کچھ دیر کو مسکراہٹ
دبالی۔ ابراہام نے نرمی سے چائے کا کپ اٹھا کر ڈریک کی جانب بڑھایا، ”لو، چائے پیو ڈریک،“ اس نے
معصومانہ انداز میں کہا، جیسے وہ ہر فریب سے بے خبر ہو۔

ڈریک نے چائے کا کپ لیتے ہوئے، ہونٹوں پر ایک کپٹی مسکراہٹ سجائی، ”پہلے یہ کاغذات دستخط کر دو،
ابراہام۔ یہ بہت ضروری ہیں۔“ ابراہام نے ایک نظر ڈالی، مگر اسے کوئی شبہ نہ ہوا،

ابراہام سائن کرنے لگا تو ڈریک بظاہر معصوم بنتے بولا ”ایک مرتبہ پڑھ لو۔“

”پڑھنے کی کیا ضرورت؟ میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں۔ تم میرے بھائی ہو اور بھائیوں پر تو شک نہیں کیا
جاتا۔“

اس کے یہ کہنے پر ڈریک کے چہرے پر شریر اطمینان اور بڑھ گیا۔ ”یقیناً، بھروسہ ہی سب کچھ ہے،“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ جب ابراہام نے بے پروائی سے دستاویزات پر دستخط کیے، ڈریک کے ہونٹوں پر ایک پلید مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ جیسے ہی ابراہام نے آخری صفحے پر قلم پھیرا، ڈریک نے فائل اٹھالی اور ہر صفحے کو بغور دیکھا۔

۔ ”چائے کا ذائقہ واقعی لاجواب ہے،“ اس نے طنز بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ابراہام نے لا پرواہی سے جواب دیا، ”اولیویا کے ہاتھوں میں ایک الگ ہی ذائقہ ہے۔“

اولیویا، جس کی خاموش موجودگی نے پورے منظر کو پراسرار کر دیا تھا، ایک سائے کی طرح وہاں سے رخصت ہو چکی تھی۔ وہ، جو چائے اور دستاویزات کے اس پراسرار کھیل کا ایک خفیہ کردار تھی، آنے والے دھوکے کی محرک ثابت ہونے والی تھی۔

...°...

رات کے گہرے سناٹے میں، میری اور ابراہام دبے قدموں گونار یعنی ایز کنیل، کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایز کنیل اپنی کتاب میں مکمل طور پر محو تھا، صفحے در صفحے، گویا وہ کسی اور ہی دنیا میں کھو چکا ہو۔

اس کے والدین کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے، اس نے سر اٹھایا، اور ابراہام کی آنکھوں میں ایک نرم سی مسکراہٹ نے جھانکا۔

۔ ”کتابوں میں تو تمہارا دل لگا رہتا ہے، ہے نا؟“ ابراہام نے محبت بھری نرمی سے کہا۔

ایز کنیل نے کتاب آہستگی سے بند کی اور ایک عارفانہ سا انداز اپناتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

۔ ”ڈیڈ، آپ جانتے ہیں، مجھے کتابیں بہت پسند ہیں۔ خاص طور پر کاکس۔“ اس نے کتاب کے کناروں کو نرمی سے چھوا، اپنی انگلیوں کی پوروں سے صفحات کو ٹٹولا، گویا الفاظ کی گرمی کو محسوس کر رہا ہو۔ ”جب میں ان صفحات کو چھوتا ہوں، تو یہ احساس مجھے کسی اور دنیا میں لے جاتا ہے۔ جیسے میں الفاظوں کو محسوس کر سکتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں ایک خاص قسم کی بے خودی تھی۔

ابراہام نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے کہا، ”ٹھیک ہے، لیکن اب سونے کا وقت ہو گیا ہے۔ کل ہم بات کریں گے ایک ضروری چیز کے حوالے سے۔“ ابراہام کی آواز میں ایک عجیب سنجیدگی تھی، جیسے کسی پوشیدہ حقیقت کو بیان کرنے سے قاصر ہو۔

ایز کنیل نے سر جھکایا، گویا اپنی خامی کا اعتراف کر رہا ہو، ”میں نے معافی مانگ لی ہے۔“ اس کے لہجے میں ندامت جھلک رہی تھی۔

ابراہام اسے مزید شفقت بھرے انداز میں بولا۔

یہ بات تمہیں سمجھنا ہوگی کہ دنیا میں درست اور غلط کا شعور دھندلا ہوتا ہے۔ باہر کی دنیا کے نزدیک، اصولوں کی کوئی خاص قدر نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب تم غلطی کرو تو دنیا تمہیں داد دے گی، تمہارے برے فیصلوں پر تالیاں بجائے گی، اور تمہیں کامیاب ہونے کا فریب دے گی۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ

تمہیں سچائی کا آئینہ دکھائیں، کیوں کہ یہ فریب زدہ دنیا تمہیں صحیح اور غلط کی حقیقی پہچان دینے سے قاصر ہے۔ ہماری تربیت کا مقصد یہ ہی ہے کہ تم ان فریبوں کو پہچان سکو اور زندگی کے صحیح راستے پر چل سکو۔”

ابراہام کی باتوں میں ایک عجیب سی وزنی فکر تھی، گویا یہ لمحات بہت اہم تھے۔

ابراہام اور میری نے ایزکئیل کو آغوش میں بھر لیا، ان کا لمس گرم اور پُر شفقت تھا، جیسے یہ ان کے درمیان آخری ملاقات ہو۔ گونار کی ہلکی سی مسکراہٹ، ایک رازدار پردہ تھی، جو اس کے اندر پنہاں تشویش کو چھپا رہی تھی۔

میری نے نرمی سے اس کے سر کو چھوا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا، اور ابراہام نے بھی خاموشی سے اس کی تقلید کی، جیسے یہ اشارے ان کے دلوں کے پوشیدہ جذبات کا عکس تھے۔

”اب سو جاؤ، کل بات کریں گے۔“ میری کی آواز میں ایک خاموش پیشین گوئی تھی، جیسے وہ مستقبل کی آہٹ سن رہی ہو۔

ایزکئیل نے اپنے والدین کے گالوں پر نرمی سے بوسہ دیا اور مدھم آواز میں سرگوشی کی، ”آئی لو یو موم، ڈیڈ۔“

میری کی مسکراہٹ، جس میں گہرے خدشات پوشیدہ تھے، ایز کیل کو نرمی سے نصیحت کرتے ہوئے بولی، ”چاہے کچھ بھی ہو جائے، اپنے اور اپنے بہن بھائی کا خیال رکھنا۔ شیطانیت اور برائیوں سے بچنا۔“

دروازے کی خاموش بندش کے ساتھ ہی کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا، ایک پراسرار تقدیر کی جانب بڑھتے ہوئے لمحے کا آغاز ہو چکا تھا۔ گونار کے چہرے پر غمگین تاثرات کے سائے لہرا رہے تھے، جیسے وہ آنے والے طوفان کی گرج سے بے خبر تھا، مگر کسی انجان خوف کے سائے تلے دبے ہوئے۔

...°...

میری نے کمرے کا دروازہ کھولا، جس کی دیواریں مکمل طور پر خاص نوعیت کے شیشے سے بنی ہوئی تھیں، جنہیں ون وے گلاس کہا جاتا ہے۔ باہر سے کوئی اندر کا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا، مگر اندر سے باہر کا پورا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔

شیشے کی دیواروں کے پار چاندنی رات کا دلکش منظر تھا، جس میں چاند کی کرنیں فضا کو منور کر رہی تھیں۔ کمرے کا فرش بھی شیشے سے بنا ہوا تھا، جس کے نیچے قدرت کے مناظر پوشیدہ تھے، اور چھت کی شفافیت نے آسمان کو اس کمرے کا حصہ بنا دیا تھا۔

کمرہ مکمل طور پر پرسکون اور عیش و عشرت سے بھرا ہوا تھا۔ ابراہام بستر پر نیم دراز تھا، اس کے پاؤں سیدھے تھے اور گود میں لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا، جو کام اور آرام کے درمیان ایک مثالی توازن کا عکاس تھا۔

جب میری کمرے میں داخل ہوئی، تو ایک خاموشی کا احساس غالب تھا، مگر میری کے چہرے پر تشویش کے آثار واضح تھے، جیسے اس کے دل میں کوئی بھاری بوجھ ہو۔

ابراہام نے فوری طور پر اس کے اضطراب کو محسوس کر لیا۔ اس نے لیپ ٹاپ کو آہستگی سے ایک طرف رکھ دیا اور میری کی طرف متوجہ ہوا، اس کی نگاہوں میں محبت اور فکر کی جھلک تھی۔ ”کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔

میری نے گہری سانس لی اور ایک لمحے کے لیے خاموش رہی، پھر بولی، ”مجھے نہیں معلوم۔ دل میں ایک عجیب سا خوف محسوس ہو رہا ہے، جیسے کوئی ناپسندیدہ واقعہ قریب ہو۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں اِسعیاہ کو ایز کنیل کے کمرے میں چھوڑ آؤں، اس لیے میں اسے وہاں چھوڑ آئی۔“

ابراہام نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”تم نے صحیح کیا۔ جب دل میں بے چینی ہو تو اپنی جبلت پر عمل کرنا ضروری ہے۔“

میری نے ابراہام کے کندھے پر سر رکھا، جیسے اسے وہاں سکون مل رہا ہو، لیکن اس کی تشویش ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی۔ ”آج، ایز کنیل نے اپنے مسلمان ترک ہم جماعت کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ اس نے اور اس کے دوستوں نے اسے دہشت گرد کہہ کر مارا ہے، صرف اس لیے کہ وہ مسلمان ہے۔ یہ بہت پریشان کن ہے،“ اس کی آواز میں بے چینی نمایاں تھی۔

ابراہام نے نرمی سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور تسلی دیتے ہوئے کہا، ”فکر مت کرو، اس نے بعد میں سب کے سامنے معافی مانگ لی تھی، جیسا کہ تم نے بتایا تھا۔“

مگر میری کی تشویش ختم نہیں ہوئی تھی۔ ”ہاں، مگر مسئلہ یہ ہے کہ جب زیبا کو یہ واقعہ معلوم ہوا، تو اس نے غصے میں آکر ایز کنیل سے کہا کہ وہ بھی اسلام قبول کر لے گی۔ اس پر ایز کنیل نے غصے میں اسے دھکا دے دیا۔“

میری اب پوری طرح سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور گہری نظر سے ابراہام کو دیکھتے ہوئے بولی، ”مجھے ڈر ہے کہ اگر ایز کنیل کو معلوم ہو جائے کہ زیبا واقعی پروفیسر تراب حسینی کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے، تو وہ کیسا رد عمل دے گا؟ اور اگر اسے پتہ چلے کہ ہم دونوں بھی اسلام قبول کر چکے ہیں تو وہ کیا کرے گا؟“

ابراہام نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر اس کا ہاتھ تھاما اور نرمی سے کہا، ”یہ بات یقینی طور پر پیچیدہ ہے، لیکن ہم اسے سمجھائیں گے۔ ابھی اس کا غصہ وقتی ہے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ اسے سمجھ آئے گی کہ ہم نے یہ قدم کیوں اٹھایا ہے۔“

میری نے آہستگی سے سر ہلایا، مگر اس کی آنکھوں میں اب بھی فکر کی لہر تھی۔ ”میں بس چاہتی ہوں کہ ایز کنیل کو ہمارے فیصلے کی حقیقت سمجھ آئے، اور اسے نقصان نہ پہنچے۔“

ابراہام نے نرمی سے اس کے آنسو صاف کیے اور کہا، ”ہم دعا کریں گے کہ اللہ ہمیں اس آزمائش میں صبر عطا کرے اور ہمارے بیٹے کو صحیح راستہ دکھائے۔“

میری کی آواز میں امید کے ساتھ ایک ہلکی سی فکر بھی شامل تھی، جب اُس نے بے تابی سے سوال کیا، ”کیا وہ اسلام قبول کر لے گا؟“ اُس کی نظریں ابراہام کی آنکھوں میں گڑی تھیں، جیسے وہ اس کے جواب میں یقین کی تلاش کر رہی ہو۔

ابراہام نے ندامت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا، جیسے وہ خود بھی اس معاملے کی نزاکت سے آگاہ ہو، اور ہولے سے کہا، ”وہ بہت ذہین ہے۔ جب وہ قرآن کی تعلیمات پر غور کرے گا، تو اسے سچائی کا راستہ خود بخود مل جائے گا۔“

میری نے گہری سانس لی اور مداخلت کرتے ہوئے کہا، ”یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ معاملات بہت پیچیدہ ہیں۔“ اس کے لہجے میں تشویش اور پیچیدگی کی جھلک واضح تھی۔

ابراہام نے نرم انداز میں اُس کے دونوں کندھوں کو تھپتھپایا اور اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، سرگوشی کرتے ہوئے تسلی دی، ”اب سونے کی کوشش کرو، اپنے دماغ کو سکون دو۔ زیادہ پریشانی ہماری ہونے والی اولاد کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے“ جیسے ہی وہ دونوں ایک دوسرے کی باہوں میں سمٹ کر لیٹے، کمرے پر ایک گہری خاموشی چھا گئی، جو رات کی چاندنی سے منور ہو رہی تھی۔

کمرے کی شفاف بلوری چھت سے آسمان کے تارے جھانک رہے تھے، اور چاندنی کی نرم روشنی کمرے کو ایک آسمانی منظر میں ڈبو رہی تھی۔

لائٹس خود کار طور پر بند ہو چکی تھیں، اور باہر کا منظر اب جیسے اس آرام دہ جگہ کا حصہ بن چکا تھا۔ مگر وہ دونوں اس سکون میں چھپی ہوئی اس پیشگوئی کو محسوس نہ کر سکے جو ان کی زندگیوں میں آنے والی تھی۔ ایک ان دیکھی تقدیر جو جلد ہی اُن کے سکون پر ایک غیر متوقع سایہ ڈالنے والی تھی۔

یہ سکون صرف ظاہر کا تھا، اور چاندنی کی یہ روشنی دراصل آنے والے طوفان کی تیاری کی خاموش علامت تھی۔

...°...

مدھم روشنی کی سخت گیر خاموشی میں جھولتا ہوا دروازہ، جہاں ایک اکیلا چراغ لرزتے سائے بکھیر رہا تھا، ہر زاویے پر دھوکے کی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اولیویا کا ہر قدم نپاٹلا، ایک گہرا سکوت لیے ہوئے تھا، جیسے کسی قدیم راگ کا لرزتا ہوا تاثر جو زمین کے اندر چھپے طوفان کی آمد کی خبر دیتا ہو۔

ڈریک، سائے کا ایک ماہر کاریگر، اندھیروں سے ابھر کر ہال میں داخل ہوا، اس کی چہرے پر پھیلی پر اسرار مسکراہٹ اُس چھپی ہوئی بددیانتی کی غمازی کر رہی تھی جسے وہ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھا۔

ان کے بیچ جو الفاظ گردش کر رہے تھے، وہ ظاہر اُبے ضرر مگر باطن میں زہر آلود سازش کے اشارے تھے۔ ابراہام کے علم میں لائے بغیر، ڈریک نے ایکس کی ماں اولیویا سے جڑے جھوٹ کا ایک ایسا جال بُنا تھا، جو جب کھلے گا تو سچائی کا ایسا طوفان لے کر آئے گا کہ معمول کی چمک دمک بکھر جائے گی۔

ہر گوشہ اور زاویہ ان کہی باتوں اور دفن رازوں کا امین تھا، ہوا میں تناؤ کا غبار تھا، اور ایسا لگتا تھا کہ داخلی راستہ کسی ایسی دنیا کا دروازہ ہے جہاں سچائی اور جھوٹ آپس میں گتھم گتھا ہیں۔

اولیویا، اپنے نپے ٹٹے انداز میں آگے بڑھتی، جیسے خود بھی کوئی متغیر ہو رہی ہو۔ اُس کے لباس کا اُترنا اور بدلنا محض ظاہری تبدیلی نہ تھی بلکہ ایک نئی ہستی کا جنم تھا، ایک ایسی ہستی جو اپنے مقاصد کو کسی بھی قیمت پر پورا کرنے کو تیار ہو۔

اس کا سرخ لب رنگ، خطرے کی ایک لال لہر تھی، اُس خون کی علامت جو ابھی بہنا تھا۔

ڈریک نے اس تبدیلی کا مشاہدہ کیا اور اُس کی لبوں پر پھیلتی مسکراہٹ ایک ناقابلِ بیان سرد مہر تھی، جیسے وہ موت کے فرشتے کی آمد کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ سائے کی آغوش میں چھپے نقاب پوش، اپنی حرکات میں توازن کے ساتھ نمودار ہوئے، جیسے وہ اسی اندھیر قصہ کا حصہ ہوں جو ہر لمحے زیادہ بھیانک ہوتی جا رہی تھی۔

اولیویا کی آواز، جو ایک خفیہ زہر سے بھری ہوئی تھی، نے ایک سرد اور لرزہ خیز مکالمے کا آغاز کیا

- ”آج رات وہ نیند سے کبھی نہ جاگنے کے لیے سو جائیں گے، اور ہماری عیاشیاں، ہمارے دن، ایک نئے سورج کے نیچے جاگیں گے۔“

ڈریک نے ایک زہریلے طنز کے ساتھ جواب دیا، ”ہمارا راز آشکار ہو گا، اور وہ ان اندھیروں کا نظارہ کریں گے جو ہم اُن پر نازل کرنے والے ہیں۔“

فضا میں موجود ہر شے دھیرے دھیرے گھٹنے لگی، جیسے وقت تھم کر اُس لمحے کی پکار سن رہا ہو۔ ان کے قدموں کی بازگشت ایک لرزہ خیز دھڑکن میں تبدیل ہو رہی تھی، اور وہ داخلی دروازہ، جو کبھی محض ایک راستہ تھا، اب ایک کھائی کا دروازہ بن چکا تھا۔

جہاں سائے اور راز آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے، ایک تاریک بھنور کے انتظار میں تھے کہ کب وہ بے خبر نفوس کو اپنے اندر کھینچ لیں۔

...°...

ابراہام کے کمرے کا سکوت ایک غیر متوقع دستک کی گونج سے درہم برہم ہو گیا، جیسے فضا میں ٹھہری ہوئی ہوا میں ایک ناخوشگوار جنبش نے ہلچل پیدا کر دی ہو۔

دستک کے ساتھ ہی کمرے کی خاموشی ایک اجنبی اور خوفناک روشنی میں بدل گئی، جس میں ابراہام اور میری کے حیران چہرے صاف نظر آنے لگے، جو نیند کی دھند سے اچانک جاگ چکے تھے۔

فضا میں ایک غیر محسوس تناؤ نے اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی، جب میری کی کانپتی ہوئی آواز نے اس خاموشی کے بوجھ کو توڑ دیا: ”یا اللہ، اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ ان دونوں کے بے اختیار قدم ایک ساتھ دروازے کی طرف بڑھے، گویا کسی چپے ہوئے خوف نے انہیں ایک ساتھ باندھ رکھا ہو۔

لکڑی کا دروازہ جیسے ہی ان کے ہاتھوں کی رسائی میں آیا، وہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا اور سامنے اولیویا کی شبیہ ابھر آئی۔ اس کی موجودگی ایک جراتمندانہ تمکنت سے بھری ہوئی تھی، جو رات کی گھمبیرتا اور پراسراریت کے عین برعکس تھی۔

میری کی آنکھوں میں حیرت اور تشویش کا ایک عجیب امتزاج تھا، جو اُس کے لبوں سے بے ساختہ نکل آیا ”اولیویا؟ کیا سب خیریت ہے؟“ اولیویا کے چہرے پر پھیلی پراسرار مسکراہٹ میری کی آنکھوں میں ایک پل کے لیے شک اور خوف کا عکس دے گئی۔

اولیویا نے ایک لمبے اور سرد سانس کے ساتھ کہا ”نہیں، کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ اس کی آواز کی سرد مہر کی کمرے کی فضا میں تناؤ کی تلخی اور بڑھا گئی۔

میری نے اس بڑھتے ہوئے طوفان کو بھانپتے ہوئے بے چین ہو کر کہا ”اگر کچھ ٹھیک نہیں ہے، تو مسکرا کیوں رہی ہو؟“۔

اولیویا کی مسکراہٹ اچانک ایک بھیانک تبدیلی میں بدل گئی، جیسے کسی گھنے جنگل میں چھپے بھیڑیے کی جھلک، اور پھر وہ بلا اطلاع آگے بڑھی۔

اس کے ہاتھ ایک جھٹکے میں میری کے بالوں کی طرف لپکے، اور ایک وحشیانہ گرفت نے میری کو سسکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی مٹھی کی سختی ایسی تھی کہ درد کی تیز چیخ میری کے لبوں سے بے قابو ہو کر کمرے کی دیواروں سے ٹکرا گئی۔

کمرہ، جو ابھی لمحے پہلے سکون کا گہوارہ تھا، اب اذیت ناک چیخوں سے گونجنے لگا تھا۔

ابراہام، اپنے وجود کی پوری طاقت سے اولیویا کو روکنے کے لیے لپکا، لیکن جیسے ہی اس نے قدم بڑھایا، اندھیروں میں سے چار منحوس اور ڈراؤنی شخصیتیں نمودار ہوئیں۔

یہ وہ سایے تھے جن کی آنکھوں میں سفاکیت کی چمک تھی، اور ان کی موجودگی نے ابراہام کے قدموں کو باندھ دیا۔ ان کی نظروں نے اُس کے دل میں خوف کی ٹھنڈی لہر دوڑادی، جیسے موت کے فرشتے کسی شکار کو دیکھ رہے ہوں۔ ابراہام نے ان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی، لیکن وہ نادیدہ زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آواز غصے اور نفرت سے لرزتی ہوئی نکلی

”اولیویا، کیا تم پاگل ہو چکی ہو؟“

اولیویا، جس کا چہرہ ایک ظالمانہ سکون سے بھرا ہوا تھا، میری کوبالوں سے گھسٹتے ہوئے آگے بڑھتی گئی۔ اس کے لبوں پر ایک ایسی سفاکیت پھیلی ہوئی تھی جس میں خوف کا نام و نشان نہ تھا، اور اُس کے ہر قدم میں وہ اعتماد تھا جو ایک قاتل اپنے شکار کے سامنے ظاہر کرتا ہے۔

اس نے اپنے سر دلہجے میں اپنے سائے جیسے ساتھیوں کو حکم دیا، ”انہیں نیچے لے چلو۔“

زینوں سے نیچے اترنے کا منظر ظلم و بربریت کی ایک واضح جھلک پیش کر رہا تھا، جہاں ہر قدم پر بے بسی اور تشدد کا سایہ منڈلا رہا تھا۔

زیبا پہلے ہی ڈریک کے قدموں میں جھکی ہوئی تھی، اس کی سانسیں دھیمی تھیں، جسم پر بہتا ہوا خون اور چہرے پر بنے وحشیانہ زخموں کے نشانات اس کی بے بسی اور درد کی داستان سنارہے تھے۔

ناک سے مسلسل بہتے خون نے اس کی سفید جلد کو بے رنگ اور بے جان کر دیا تھا، اور اس کی آنکھوں میں بے حس لاچاری چھلک رہی تھی، جیسے روح کا ہر ذرہ بکھر کر زمین میں دفن ہو چکا ہو۔

”دیکھو یہاں کون ہے،“ ڈریک نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، اس کی آواز میں چھپی بدکاری اور نفرت کی سرد لہر پورے کمرے میں گونج اٹھی، جیسے وہ اس منظر کا مزالے رہا ہو۔ میری، جو اولیویا کے مضبوط پنچے میں جکڑی ہوئی تھی، بے سود طور پر چھٹکارے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں بیک وقت خوف اور مایوسی کا شدید امتزاج واضح تھا۔

وہ جانتی تھی کہ آج کی رات بربادی سے بھری ہوئی تھی۔

ابراہام، جو اپنی پوری قوت سے اپنے خاندان کو بچانے کے لیے لڑ رہا تھا، حملہ آوروں کی فولادی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن ان کے آہنی ہاتھوں نے اس کی ہر تحریک کو روک دیا تھا۔

اس منظر نے ایک ایسی تصویر کی شکل اختیار کر لی تھی جس میں ہر چیخ، ہر درد، اور ہر جھٹکا ایک بے انتہا خاموشی میں دفن ہو رہا تھا۔

جب وہ نچلی منزل پر پہنچے تو ایزکئیل اور عیسیاہ کی عدم موجودگی نے فضا میں ایک عجیب اور خوفناک خلا پیدا کر دیا، جیسے کوئی بلا آنے والی ہو جس کا کوئی بچاؤ ممکن نہ ہو۔ ان کے سامنے مسلح نقاب پوشوں کا ایک خطرناک گروہ کھڑا تھا، جو کسی بھی قسم کے فرار کی راہ کو مسدود کر رہا تھا۔

ابراہام اور میری کو زبردستی ایک صوفے پر بٹھا دیا گیا، آنکھوں میں کرب اور دل میں اذیت کا سمندر۔ ڈریک سامنے کھڑا تھا، اپنی فتح کی شیطانی مسکراہٹ چہرے پر سجائے۔ ابراہام، اپنی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کے شعلے لیے، ڈریک کی طرف پلٹا اور غرایا، ”یہ سب تمہارا کھیل تھا؟“۔

زیبا کے بکھرے وجود نے ایک لمحے کے لیے ابراہام کے دل میں امید جگادی، اور وہ اپنی بیٹی کی طرف لپکا۔ اس کے گالوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے، اس کی آواز غم اور محبت کے ایک نازک تاثر میں ڈوبی ہوئی

تھی ”میری بیٹی...“ زیبائی آنکھیں خالی تھیں، جیسے اس کے اندر سے زندگی کا ہر نشان چھین لیا گیا ہو، اور اس کے جسم پر تشدد کے نشانات گواہی دے رہے تھے کہ وہ کس حد تک بربریت کا شکار ہوئی ہے۔

ابراہام کے قدم لڑکھڑا گئے، جیسے زمین اس کے پیروں کے نیچے سے کھسک رہی ہو۔ زیبائی بربادی نے اس کے وجود کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا، اور جب حقیقت کی تلخی پوری شدت کے ساتھ اس پر عیاں ہوئی، تو اس کا غصہ بے قابو ہو گیا۔

وہ ڈریک کی طرف لپکا، لیکن ڈریک کے محافظوں نے اسے مضبوطی سے جکڑ لیا، اس کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔

”کینے، میں نے تم پر بھروسہ کیا اور تو نے میری دنیا کو جلا دیا!“ ابراہام کی آواز غصے اور شکست کی لرزتی ہوئی بازگشت تھی، جو کمرے کی فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

ڈریک، جو اپنی فتح کے نشے میں چور تھا، نے ایک سفاک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”کاروبار اور جنگ میں سب جائز ہے، ابراہام۔ تم نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی تباہی پر دستخط کیے۔ یہ سب کچھ، تمہاری جائیداد، تمہارا کاروبار، تمہارا گھر، اب میرا ہے۔ ہر وہ سطر جس پر تم نے آنکھیں بند کر کے دستخط کیے، مجھے ان سب کا مالک بنا چکی ہے۔“

ابراہام، جکڑنے والے ہاتھوں کی زنجیروں میں بندھا، اپنی بے بسی سے جدوجہد کر رہا تھا، ”میری بیٹی کو کیوں نشانہ بنایا، اے وحشی؟“ اس کی آنکھیں غصے سے دہک رہی تھیں، جیسے وہ ہر زنجیر کو توڑنا چاہتا ہو۔

ڈریک نے الفاظ کو جیسے زہر میں بجھا کر، غصے اور نفرت سے لبریز لہجے میں کہا، ”تُو نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔“

اُس کے چہرے پر پھیلی سفاکی اور آنکھوں میں جلتی ہوئی آگ واضح تھی۔ ”پہلے تو ڈیڈ نے اپنی جائیداد کا ۸۰ فیصد حصہ تیرے نام کر دیا، جیسے میں کبھی تھا ہی نہیں۔ اور پھر...“ اُس کی آواز گھٹتے ہوئے مزید کڑوی ہو گئی، ”تُو نے میری محبت، میری کو بھی مجھ سے چھین لیا، اُس سے شادی کر لی، اور میری نے مجھے محض رسوائی اور غم دیا۔“

ڈریک کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا، جیسے اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک رہی ہو۔ اُس نے آگے جھک کر سرد مگر گھمبیر آواز میں کہا، ”لیکن اب میں تم دونوں کو وہ درد دوں گا جو تم نے کبھی محسوس نہ کیا ہو، ایسا کر ب دوں گا کہ تمہاری روحیں کانپ اٹھیں گی، ہر سانس تمہیں اذیت دے گی۔“

میری، جو اپنے خاندان کی تباہی کے اس لمحے کی گواہ تھی، بے اختیار فرش پر گر گئی۔ اس کی آنکھوں میں بکھری ہوئی مایوسی اور درد کی جھلک نمایاں تھی۔

اولیویا، جو اب بھی سرد اور بے حس کھڑی تھی، میری کے قریب آئی، اور اس کی نگاہوں میں نفرت اور حقارت کی ایک گہری لہر ابھر آئی۔ وہ میری کی اذیت کا نظارہ کرتے ہوئے ایک سفاک مسکراہٹ کے ساتھ جھکی، جیسے اس کے درد سے کوئی عجیب سی تسکین حاصل کر رہی ہو۔

پھر محظوظ ہو کر وہ پیچھے ہٹی اور ڈریک کے ہمراہ کھڑی ہو گئی۔۔

دفعۃً میری کے کانپتے ہاتھ زیبا کے گالوں کو تھامے ہوئے لرز رہے تھے، جیسے کسی ناتواں وجود کو دوبارہ زندگی دینے کی بے سود کوشش ہو۔ ”زیبا،“ اس نے دھیمی مگر گہری اذیت میں ڈوبی ہوئی آواز میں پکارا، اس کے لہجے میں ایک ماں کی گہری مایوسی اور بے بسی چھلک رہی تھی۔

میری نے زیبا کی بے حس پیشانی پر بوسہ دیا، جیسے وہ اس خاموش وجود میں چھپے ہوئے درد کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو، ”بیٹی، کچھ بولو، پلیز، خدا کے واسطے!“ زیبا نے اپنی خالی، بجھی ہوئی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا، جیسے وہ اسے پہچاننے سے قاصر ہو۔ اس کے چہرے پر کوئی ردِ عمل نہ تھا، صرف ایک بے روح خاموشی جو صدیوں کی شکست اور اذیت کو بیان کر رہی تھی۔

یہ خاموشی اس گھاؤ کی بازگشت تھی جو صرف جسم پر نہیں، بلکہ دل پر لگا تھا، جیسے رشتوں کی ڈوری اب ہمیشہ کے لیے ٹوٹ چکی ہو۔

ابراہام جو یہ سب دیکھ رہا تھا، میری اور زیبا کے چہروں پر بکھری اذیت کو محسوس کرتے ہوئے، آنسوؤں کو بمشکل روک سکا۔

ایک باپ ہونے کے ناطے، اسے اپنی بیٹی کے ٹوٹے ہوئے وجود کو دیکھ کر وہ اذیت ہو رہی تھی جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ ایک باپ کا غم، اپنی اولاد کو ایسی حالت میں دیکھ کر، کہ جیسے وہ مر چکی ہو، لیکن جسم ابھی زندہ ہو۔

ڈریک کی موجودگی اس درد کے سمندر میں نمک چھڑکنے جیسی تھی۔ اس کی گندی مسکراہٹ، اس کے چہرے پر پھیلا ہوا شیطانی اطمینان، جیسے وہ ہر لمحہ اس درد سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

اچانک، ڈریک نے میری کے چہرے پر لات ماری، اور وہ پیچھے فرش پر جا گری، اس کا سر زمین سے ٹکرا گیا، اور ایک کراہ اس کے لبوں سے نکل آئی۔

ابراہام کی اندر کی دھاڑ، غصے اور اذیت کی ایک بھرپور چیخ میں بدل گئی۔ وہ اپنے تمام تر وجود کے ساتھ ڈریک پر جھپٹنے کی کوشش کرنے لگا، مگر اس کے ہاتھ اور جسم نوکروں کے مضبوط شکنجے میں تھے۔ اس کی آنکھیں غصے اور خوف کے ملے جلے جذبات سے دھک رہی تھیں، جیسے وہ اس دنیا کو جلا دینا چاہتا ہو جس نے اس کے خاندان کو برباد کر دیا تھا۔

ابراہام کے جسم میں نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنی ہر ممکن طاقت کو جمع کر کے ڈریک کی طرف لپکا، اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے، اس کی گردن اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لی۔

اس کی انگلیاں ڈریک کے حلق کے گرد شکنجہ بن گئیں، جیسے وہ بدی کے سرچشمے کو اپنی گرفت میں لے کر ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینا چاہتا ہو۔

ڈریک، جو کبھی طاقتور تھا، اب ایک شکار کی مانند تھا، اپنے ہی بنائے ہوئے کھیل میں بے بس۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی چمک تھی جب اس نے ابراہام کی گرفت میں اپنی جان نکلتی محسوس کی۔

کمرہ اس خونی تصادم سے لرز اٹھا تھا۔ ابراہام کی انگلیاں ڈریک کے گلے کو جکڑتے ہوئے ایک وحشیانہ طاقت کے ساتھ دبا رہی تھیں، جیسے وہ اپنے ہر درد کا بدلہ لینا چاہتا ہو۔

میز پر پڑا ہوا چاقو، جو پہلے ایک بے ضرر سا اوزار تھا، اب ابراہام کے ہاتھ میں ایک مہلک ہتھیار بن گیا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے چاقو کو ڈریک کی آنکھ میں گھونپ دیا، اور خون کا ایک دھارا ڈریک کے چہرے سے بہنے لگا۔

ڈریک نے ایک وحشیانہ چیخ ماری، اور وہ پیچھے ہٹ گیا، زمین پر گر کر اپنی آنکھوں کو تھامے چیختا رہا۔

لیکن قسمت کا ایک اور بھیانک موڑ تھا۔ تقریباً بارہ آدمی ابراہام پر ٹوٹ پڑے، اسے فرش پر پٹخ کر اس کے جسم کو جکڑ لیا۔ وہ اب بے بس تھا، جیسے کوئی زندہ لاش جسے باندھ کر رکھا گیا ہو۔

کمرہ اس وقت تک ایک بھیانک رقصِ ظلم کا گواہ تھا، جس میں درد، مایوسی اور اذیت کا ایک ناپاک تماشا ہو رہا تھا۔

میری، جو اس پورے منظر کی گواہ تھی، فرش پر بے بسی کے عالم میں گری پڑی تھی۔ اولیویا، جو اب بھی سرد اور بے حس کھڑی تھی، میری کے قریب آئی۔ اس کے بال دبوچ کر اس کی پیشانی زور سے زمین پر ماری کی خون کا چھینٹا زمین پر جا کر لگا اور۔ ایک پل کے لیے میری اپنا ہوش کھو بیٹھی۔

اس خونی تصادم کے بیچ، ڈریک نے اپنے نوکروں کو حکم دیا، ”انہیں باہر لے جاؤ، یہ وقت کمزور ہونے کا نہیں۔“

اس کی آواز میں ایک وحشیانہ قوت تھی، جیسے وہ ہر لمحہ اپنی فتح کا جشن منا رہا ہو۔ اولیویا نے سر جھکا کر اس کے حکم کی تعمیل کی۔

مگر اس ہنگامہ آرائی کے بیچ میری کے ذہن میں ایک خوفناک سوال جاگا۔ ”ایزکئیل اور عیسیٰ کہاں ہیں؟“ اس نے لرزتی آواز میں پوچھا، اس کی آنکھوں میں خوف صاف جھلک رہا تھا۔

کمرے میں ایک لمحے کے لیے پراسرار خاموشی چھا گئی۔ پھر، اچانک گولیوں کی آواز نے اس سکوت کو چیر ڈالا۔ دو فائر، جیسے موت کا ایک تاریک پیغام، اوپر کی منزل سے گونج اٹھے۔ ہر گولی کی آواز، جیسے ایزکئیل اور عیسیٰ کی بربادی کی آخری دستک ہو۔

میری کی سانسیں رک گئیں، اور ابراہام کا دل دہل گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری، جیسے اس کا وجود ٹوٹ کر بکھر گیا ہو۔ یہ چیخ، ایک باپ کی اذیت بھری پکار، جو اپنی اولاد کو بے بسی میں مرتے دیکھ رہا ہو۔

اولیویا کی مسکراہٹ اس لمحے اور بھی پھیل گئی، جیسے وہ اپنے ہی بنائے ہوئے جہنم میں راج کر رہی ہو۔ اس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا، ”انہیں باہر لے جاؤ، اور کچھ لوگ سرڈریک کے ساتھ رہیں۔“

ابراہام اور میری کی تقدیر، زیبا ایز کنیل اور عیسیاہ کی بربادی، اور اس تمام تباہی کے درمیان، اولیویا کی سرد مسکراہٹ نے اس ظلم کو مکمل کر دیا تھا۔ یہ کمرہ، جہاں ایک وقت میں زندگی کی خوشبو ہوا کرتی تھی، اب مایوسی اور تباہی کا گڑھ بن چکا تھا۔

فضا میں بادلوں کا گھنا جال بچھا ہوا تھا، جہاں کبھی روشن چاند اپنی چمک بکھیرتا تھا، اب وہ مقام ایک گہرے، مٹیالے اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔

رات اپنی خاموشی اور سردی کی شدت کے ساتھ اس وسیع اور ویران علاقے پر چھائی ہوئی تھی۔ دور دراز، جنگل کے بیچوں بیچ، ابراہام کا وہ وسیع و عریض اور شاندار گھر کھڑا تھا، جو کبھی شان و شوکت کا مظہر تھا، مگر اب ماضی کی یادگار بن چکا تھا۔

یہ مقام شہری آبادی سے میلوں دور تھا، جیسے جان بوجھ کر تنہائی میں لپیٹ دیا گیا ہو، جہاں نہ کوئی انسانی شور سنائی دیتا اور نہ ہی کوئی مدد پہنچ سکتی تھی۔

اگر یہ گھر کسی انسانی بستی کے قریب ہوتا، تو شاید چیخ و پکار، بندوقوں کی گونج، اور آہوں کی بازگشت سن کر لوگ وہاں پہنچ جاتے، مگر قسمت کے کھیل میں ایسا نہ تھا۔ دور دراز کی یہ جگہ اس حادثے کے لیے جیسے منتخب کی گئی تھی، جہاں موت اور درد کا سلسلہ بلا روک ٹوک جاری رہا۔

ہوا اپنے سرد اور خوفناک شور کے ساتھ ہر طرف سے آرہی تھی، جیسے کسی ان دیکھے عذاب کی پیش قدمی ہو رہی ہو۔

درختوں کے پتے شوشوں کی آوازوں کے ساتھ جھومتے، جیسے ہر چیز اپنی جگہ سے ہل چکی ہو۔ آسمان پر بجلی کی چمک کہیں دور سے نظر آتی، مگر وہ روشنی اتنی مدہم تھی کہ اس سے ماحول کے اندھیرے اور خوف میں اضافہ ہوتا رہا۔

یہ موسم کی بے یقینی تھی، جو سردیوں کے دنوں میں کبھی کھلتا اور کبھی اندھیرے میں ڈوب جاتا تھا، مگر اس رات کا اندھیرا جیسے ہمیشہ کا سا تھی بن چکا تھا۔

زیبا اور میری کو بے دردی سے زمین پر دھکیل دیا گیا، ان کے گرد بے جان باڈی گارڈز اور سیکورٹی اہلکاروں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔

وہ لاشیں، جو کبھی محافظ تھے، اب بے حس و حرکت گواہ بن چکے تھے، ایک بے رحم انجام کے۔ ان کے عظیم الشان گھر کا بلند و بالا ڈھانچہ، جو کبھی مضبوطی اور طاقت کا مظہر تھا، اب ایک بھوت بنگلے کی مانند کھڑا تھا، جیسے وہ خود اپنے ہی اندر تباہی کے مناظر دیکھ رہا ہو۔

مکان کا جلال اب فنا ہو چکا تھا، اور اس کی جاہ و حشمت اب اس ظلم کی تاریکی میں دفن ہو گئی تھی جو وہاں ہوا تھا۔

میری زمین پر گرتے ہی اپنی بیٹی زیبا کو بے چینی سے گلے لگا لیا، اس کی بانہوں میں مایوسی اور بے بسی کا بوجھ تھا۔

زیبا کی آنکھیں خوف اور صدمے سے خالی تھیں، جیسے اس کی روح پہلے ہی کہیں کھو چکی ہو۔ رات کے اندھیروں میں میری کے آنسو خاموشی سے بہہ رہے تھے، بجلی کی چمک کبھی کبھار اس کی بھیگی آنکھوں میں جھلک دیتی تھی، مگر اس ماحول کی وحشت میں یہ آنسو کسی کے لیے بھی قابل ذکر نہ تھے۔

درختوں کے سائے میں، ایک طرف دو سائے کھڑے تھے — ایز کئیل اور عیسیاہ۔ یہ وہ خوش قسمت تھے جو موت کی گرفت سے نکل آئے تھے، مگر وہ اس لمحے کی بھیانک حقیقت کا سامنا کر رہے تھے۔

ایز کئیل کا چہرہ خون کہ چھینٹوں سے لت پت تھا، اس کی آنکھوں میں وہ دہشت واضح تھی جو ابھی ابھی اس پر گزری تھی۔

دونوں بھائی درختوں کی آڑ میں، خوف اور گہرے صدمے کے عالم میں، خاموشی سے وہ مناظر دیکھ رہے تھے۔

ان کا وجود اس تباہی میں چھپ گیا تھا، جیسے وہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو چکے ہوں، لیکن وہ حقیقت کے گواہ بنے رہے۔ دنیا یہ مان چکی تھی کہ وہ دونوں مر چکے ہیں، مگر وہ اس ویران محل کے کھنڈرات کے بیچ زندہ تھے، ایک خوفناک اور بھیانک حقیقت کے خاموش ناظر۔

----- خیال

گہری نیند کے تاریک سمندر میں غرق ایز کئیل بے چینی کی ایک نامحسوس لہر سے بیدار ہوا، گویا خواب کی لطیف گرفت آہستہ آہستہ اس کے گرد ڈھیلی پڑ گئی ہو۔

شب کی پُر سکون خاموشی میں لیٹا، وہ ابھی تک نیند کی دھند سے پوری طرح آزاد نہ ہوا تھا جب اچانک ایک نامعلوم پیاس نے اسے جگا دیا، ایک ایسی پیاس جو اسے رات کی تاریک راہداریوں میں لے جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔

اس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھولیں اور بستر سے اٹھتے ہوئے اپنی نظریں اس سائید ٹیبل پر مرکوز کیں جہاں روزانہ پانی کا گلاس ہوتا تھا۔

مگر آج وہ خالی پڑا تھا، جیسے کسی نے جان بوجھ کر اس کی پیاس کا مذاق اڑایا ہو۔

ایز کئیل نے جھر جھری لیتے ہوئے اپنے قدم نیچے پیٹری کی طرف بڑھائے، اس خیال سے کہ وہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے باورچی خانے کا رخ کرے گا۔

جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا، نیچے سے دھیرے دھیرے بلند ہونے والی سرگوشیوں نے اس کے قدموں کو روک لیا۔ وہ سرگوشیاں نہیں تھیں، بلکہ غصے اور منصوبہ بندی کی مدہم آوازیں تھیں، جو اولیویا، ڈریک اور ان کے بے رحم ساتھیوں کے درمیان جاری تھیں۔ ایز کئیل کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی جب اس نے اپنے والدین کی قسمت کے بارے میں ان کے منصوبے کو واضح طور پر سن لیا۔ ”ہم اوپر جا کر میری اور ابراہام کا بندوبست کرتے ہیں۔“

ایز کئیل کے دل میں خوف کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس کی سانسیں تھم سی گئیں، جیسے وہ ایک لمحے میں ہی پتھر کا ہو گیا ہو۔

وہ آدھی سیڑھی پر رک گیا، اس کے دماغ میں خیالات بجلی کی طرح دوڑنے لگے۔ نیچے کی طرف سے آتی ہوئی آوازوں نے ایک اور کرناک انکشاف کیا۔ اولیویا نے دو بے رحم کارندوں کو حکم دیا کہ وہ اوپر جا کر ایز کئیل کو مار ڈالیں، اور اگر کوئی اور موجود ہو تو اسے بھی نیست و نابود کر دیں۔ ایک لمحے میں ایز کئیل کے سامنے موت کی گہری کھائی تھی، اور وہ وہاں اپنی زندگی کے آخری لمحات کا تصور کرتا ہوا خاموشی سے کھڑا تھا۔

۔ ”اوپر جاؤ، وہاں ایک لڑکا ہے،“ اولیویا کی ہدایت گویا موت کا پروانہ تھی، ”ایز کئیل، اور اگر اس کا بھائی بھی ساتھ ہو، تو اسے بھی ختم کر دو۔“ ان کا یہ شیطانی منصوبہ خوفناک وضاحت کے ساتھ سامنے آیا۔ ایز کئیل نے اپنے وجود میں لرزتی ہوئی لرزش کو روکنے کی کوشش کی، جب کہ چار اور ساتھی ان کے ساتھ شامل ہوئے، جو اس کے والدین کو بھی نقصان پہنچانے کے ارادے سے آگے بڑھ رہے تھے۔

ایز کئیل نے خود کو دیوار سے لگا لیا، جیسے وہ اپنی سانسوں کو بھی قابو میں لانے کی کوشش کر رہا ہو تا کہ کسی کو سنائی نہ دے۔

ایز کئیل تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا جلدی جلدی اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ اپنے والدین کو ساری حقیقت بتا سکے۔

اس کا دل تیز دھڑک رہا تھا اور وہ ہر پل بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن جب وہ اپنی منزل پر پہنچا، تو لفٹ کا دروازہ کھلا اور اولیویا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ راہداری میں

اندر داخل ہوتی نظر آئی۔

یہ دیکھتے ہی ایز کئیل فوراً ایک دیوار کے پیچھے چھپ گیا اور چھپ کر ان کی حرکات پر نظر رکھنے لگا۔

اولیویا ابراہام اور میری کے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ ایز کئیل کی سانسیں مزید بے ترتیب ہو گئیں، دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ فوراً پلٹا اور تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھا تا کہ اپنے والدین کو کال کر کے انہیں سب کچھ بتا سکے۔

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایز کئیل نے دروازے کی کنڈی مضبوطی سے چڑھائی۔ اس کا دل خوف اور اضطراب سے دھڑک رہا تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ہمت نہ کی تو وہ اور اس کا چھوٹا بھائی، عیسیا، بچ نہیں پائیں گے۔ مگر کچھ کرنے سے پہلے اس کو اپنے والدین کو کال کرنی تھی۔ مگر ایز کئیل کو اچانک یاد آیا کہ اس کے پاس موبائل نہیں ہے، لہذا وہ اپنے والدین سے رابطہ کرنے کے لیے مجبوراً لینڈ لائن استعمال کرنا چاہتا تھا، جو ہر کمرے میں موجود تھی۔

وہ جلدی سے ٹیلیفون کی طرف بڑھا، مگر جب اس نے ریسیور اٹھایا تو تاریں کٹی ہوئی تھیں اور سنگل کہیں جا نہیں رہے تھے۔ اس پر ایک لمحے کے لیے خوف اور مایوسی کا سایہ چھا گیا۔

اس نے تھکی ہوئی سانس لی اور غم و اندوہ کی شدت سے آنکھیں بھینچ لیں۔ کچھ لمحے توقف کے بعد، اس نے دوبارہ خود کو سنبھالا اور اپنی نگاہیں عیسیا کی طرف موڑیں، جو بے خبر بستر پر گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔

ایز کئیل محتاط انداز سے عیسیا کے پاس آیا اور اُسے جگانے لگا، جو گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ عیسیا نے نیند کے خمار میں کچھ بے چین ہو کر کروٹ بدلی، اور پھر دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ نیم وا آنکھوں سے اس نے اپنے ہاتھوں سے آنکھیں ملیں، اور اٹھ کر بیٹھ گیا، گویا نیند کے بوجھ سے لڑ رہا ہو۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں میں حیرانی جھلک رہی تھی۔

۔ ”مجھے کیوں جگایا ہے، بھائی؟“ عیسیا نے نیم بیدار آواز میں، سستی سے ایک جماہی لیتے ہوئے کہا۔

ایز کنیل نے گردن موڑ کر دروازے کی جانب ایک سرسری نظر ڈالی، پھر سرگوشی کے سے لہجے میں نہایت سنجیدگی سے بولا، ”عیسیا، ہمارے گھر میں کچھ بدنیت لوگ گھس آئے ہیں۔ ہمیں فوراً ان سے بچنا ہو گا۔ تمہیں میرے ساتھ آنا ہو گا، چپکے سے۔“

ایز کنیل کی بات سنتے ہی عیسیا کے معصوم چہرے پر ایک دم خوف کی لہریں دوڑ گئیں۔ اس کی بڑی، بے گناہ آنکھیں خوف سے پھیل گئیں، جیسے وہ ایک دم کسی سنگین حقیقت کا سامنا کر رہا ہو جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو۔ اس کی چھوٹی سی معصوم دنیا اچانک خطرے میں گھر چکی تھی۔

۔ ”عیسیا، تمہیں الماری میں چھپنا ہو گا،“ ایز کنیل نے پُر عزم مگر نرمی سے کہا۔

۔ ”لیکن بھائی، میں... میں خوف زدہ ہوں،“ عیسیا کی لرزتی ہوئی آواز میں کمزوری جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

ایز کنیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے کہا، ”مجھے پتہ ہے تم ڈرے ہوئے ہو، لیکن ہمیں اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کرنا ہو گا۔ کچھ بھی ہو جائے، باہر مت آنا، سمجھ گئے؟“ عیسیا نے سر ہلایا، آنسو بہتے رہے لیکن اس نے اپنے بھائی کے حکم کو ماننے کا عہد کیا۔

ایز کنیل نے تیزی سے الماری کا دروازہ کھولا، کپڑے اور کمبل اندرونی حصے میں ہٹائے تاکہ عیسیا وہاں آرام سے چھپ سکے۔ ”یہاں، اندر دبک جاؤ۔“ اس نے عیسیا کو آہستہ سے الماری میں دھکیلا اور ایک

موٹا کمبل اس کے گرد لپیٹ دیا، جیسے وہ اسے مزید محفوظ محسوس کروا رہا ہو۔ ”یہاں محفوظ رہو گے، اور یاد رکھنا، کوئی آواز نہیں نکالنی۔“ عیسیاہ نے اپنے آنسو صاف کیے اور چپ چاپ کمبل میں لیٹا رہا، اس کی آنکھوں میں بھائی کے لیے اعتماد اور خوف کی ملی جلی کیفیت تھی۔

ایزکئیل نے جلدی سے الماری کا دروازہ بند کیا اور اُس کو تالہ لگا دیا تاکہ عیسیاہ بالکل محفوظ رہے۔
- ”تمہیں کچھ نہیں ہوگا، میں سب سنبھال لوں گا،“ اس نے دل میں کہا۔

اب ایزکئیل نے اپنے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ اُس کے پاس وقت کم تھا اور دشمن جلد ہی دروازے پر دستک دینے والے تھے۔ اُس نے اپنی حکمت عملی کے تحت فوراً عمل شروع کر دیا۔

اس نے کمرے میں پڑے ہوئے تکیے اور کمبل کو بستر پر ایسے ترتیب دیا کہ ایک سوتے ہوئے انسان کا ہیوولی نظر آئے۔ کمبل کو اس طرح لپیٹ دیا کہ گویا کوئی وہاں آرام کر رہا ہو۔

پھر وہ دروازے کے قریب آیا اور سامنے ٹیبل سے ایک رسی نکالی، جو اس نے خاص طور پر تیار کی تھی۔ اس رسی کو اس نے دروازے کی نوب پر باندھ دیا، جس کے ساتھ ایک باریک دھاگے میں جڑی ہوئی بندوق میں گولی منسلک تھی۔ یہ رسی دروازہ کھلتے ہی حرکت میں آتی اور گولی تیزی سے سامنے والے کو نشانہ بناتی۔

اس کے بعد، ایز کنیل نے فرش پر نظر دوڑائی اور ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں کو احتیاط سے چن کر فرش پر بکھیر دیا، خاص طور پر ان جگہوں پر جہاں کوئی بھی بے خبری میں قدم رکھ کر زخمی ہو سکتا تھا۔ شیشے کے ٹکڑے چمک رہے تھے اور ایک مہلک جال بن چکے تھے۔

اب ایز کنیل نے زنگ آلود کیلوں کو کمرے کے مختلف کونوں میں چپکے سے نصب کیا، وہ جانتا تھا کہ اگر کوئی شخص کمرے میں داخل ہو گا، تو ان کیلوں سے بچ نہیں پائے گا۔

آخر کار، اس نے آئینے پر چکنائی لگائی اور اسے ایک دھندلے، غدار عکس میں بدل دیا، تاکہ کوئی بھی اس میں اپنی درست تصویر نہ دیکھ سکے۔ آئینہ اب اس کی حکمت عملی کا ایک حصہ بن چکا تھا، جو دشمن کو دھوکا دینے میں مدد دے سکتا تھا۔

اب ہر چیز تیار تھی۔ ایز کنیل نے ایک لمحے کے لیے اپنے کمرے کا جائزہ لیا، اس کے منصوبے کا ہر حصہ تیار تھا۔ قدموں کی آہٹ باہر سے سنائی دینے لگی تھی۔ وہ دروازے کے قریب آچکے تھے۔

ایز کنیل نے اپنی سانس تھام لی اور ایک کونے میں چھپ کر انتظار کرنے لگا۔ اچانک، دروازے کی نوب گھومی، اور دروازہ آہستہ سے کھلنے لگا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا، رسی حرکت میں آئی، اور گولی تیزی سے سیدھی حملہ آور کی گردن میں جا لگی۔ ایک چیخ فضا میں گونجی، اور حملہ آور فرش پر گرتے ہی زخموں سے کراہنے لگا۔

فرش پر بکھرے ہوئے شیشے اور زنگ آلود کیلوں نے اس کی چیخوں میں اضافہ کیا۔ ابھی یہ منظر مکمل نہیں ہوا تھا کہ دوسرا حملہ آور بھی دروازے کی طرف لپکا۔ لیکن اس کی قسمت بھی پہلے والے کی طرح مہلک جال میں پھنس چکی تھی۔

ایز کنیل اپنی جگہ سے باہر نکلا اور دھیرے دھیرے آگے بڑھا، قدموں کی آہٹ مدھم مگر دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ کمرے کے کونے میں بے حس و حرکت پڑے دو اجسام، جن کے ارد گرد خون کا لال سمندر سا پھیل چکا تھا، موت کی خاموش گواہی دے رہے تھے۔

خون کی کا دریا زمین پر پھیل چکا تھا، جیسے ہر بوند اس رات کی ہولناکی کو بے نقاب کر رہی ہو۔ ایز کنیل نے ایک تیز نظر اُن پر ڈالی اور آگے بڑھتے ہوئے ایک کی جیب سے سرد دھات کی گن نکالی۔ اس کی گرفت میں گن کا وزن بوجھ کی طرح محسوس ہو رہا تھا، جیسے اسے کسی انتہائی قدم کا اشارہ دے رہا ہو۔

ایک گہری سانس لی اور گن لوڈ کرنے کی آواز کمرے میں گونجی۔ پھر، بغیر کسی پیشگی اطلاع کے، ہوا میں دو دھماکے ہوئے، گولیوں کی آواز ایسی تھی جیسے آسمان پھٹ گیا ہو۔

فائر کے بعد خون کے چھوٹے قطرے ایز کنیل کے چہرے پر بکھر گئے، گرم اور نم، اُس کے سنجیدہ چہرے پر لال دھبے ڈال گئے، جیسے تقدیر نے اپنے ہاتھ سے اُس پر نشان ثبت کر دیا ہو۔

پھر وہ الماری کی طرف بڑھا، اس کے ہاتھوں میں چابک دستی تھی، جیسے ہر قدم نپ تول کر اٹھا رہا ہو۔ اُس نے دروازہ کھولا اور عیسیاہ، جو اب تک لرزتے ہوئے اندر چھپا بیٹھا تھا، باہر آیا۔

خوف سے عیسیاہ کے چہرے کی زردی واضح تھی۔ ایک لمحے میں وہ ایز کئیل سے لگ گیا، جیسے اس کی مضبوط بانہوں میں پناہ تلاش کر رہا ہو۔ ”بھائی، موم اور ڈیڈ کہاں ہیں؟“ اُس کی آواز میں لرزش تھی، ایک ایسی معصومیت جو اس ہولناک منظر کے بچ کھو چکی تھی۔

ایز کئیل نے اپنے ہاتھ سے اُس کے بالوں کو نرمی سے سہلایا، مگر اُس کے چہرے پر ایک گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ ”ہم انہیں بچالیں گے، تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے نا؟“ اُس کے الفاظ میں امید سے زیادہ ایک ذمہ داری کا بوجھ تھا، ایک ایسا وعدہ جو اُس نے شاید اپنے آپ سے بھی کیا ہو۔

اس کے بعد ایز کئیل واپس اُن مردہ جسموں کے قریب گیا، اُن کی جیبیں ٹٹولنے لگا جیسے کسی اہم شے کی تلاش ہو۔ مگر مایوسی اُس کے چہرے پر پھیل گئی جب اُس کے ہاتھ خالی نکلے۔ کوئی موبائل نہ ملا، کوئی اشارہ نہیں۔ وہ بے چینی سے ایک لمحے کے لئے رکا، پھر تیزی سے واپس عیسیاہ کے پاس آیا، جیسے کوئی فوری فیصلہ لینا ہو۔

۔ ”اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا،“ اُس نے سرگوشی میں کہا، مگر آواز میں ایک غیبی تنبیہ تھی، جیسے وہ ہر لمحہ اپنے خلاف وقت کی دوڑ میں تھا۔

کھڑکی کی طرف دیکھا، جہاں زپ لائن بندھی ہوئی تھی، جو ان کے فرار کا واحد راستہ تھی۔ رات کی سرد ہوا کھڑکی سے اندر آرہی تھی، جیسے اس نے بھی اُن کی مشکل کا اندازہ لگالیا ہو۔

ایز کئیل نے زپ لائن کو ہاتھ میں پکڑا، اور اپنے بھائی کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ”مضبوطی سے پکڑو، ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہے۔“

عیسیاہ خوف زدہ تھا، مگر ایز کئیل کے بھروسے نے اسے مضبوطی سے آگے بڑھنے پر مجبور کیا۔ جیسے ہی وہ زپ لائن پر لٹک گئے، ہوا کی ایک تیز لہر اُن کے چہروں سے ٹکرائی، جس نے اُن کے وجود کو کپکپا دیا۔ رات کی خاموشی میں صرف ہوا کا شور اور اُن کی سانسوں کی آواز تھی، جو سرد ہوا میں منجمد ہوتی جا رہی تھی۔

ہر لمحہ جیسے ایک صدی بن گیا، زپ لائن کا ہر جھٹکا اُن کی گرفت کو کمزور کرتا جا رہا تھا۔ ایز کئیل کے ہونٹوں سے پسینہ بہنے لگا، اُس کی پیشانی پر تناؤ کی لکیریں واضح ہو رہی تھیں، مگر اُس نے اپنے بھائی کو ایک لمحے کے لئے بھی چھوڑنے نہ دیا۔

آخری لمحے میں، وہ دونوں زمین پر اترے، جہاں ٹری ہاؤس کا سایہ اُنہیں اپنی پناہ گاہ کی طرح محسوس ہوا۔ مگر یہ پناہ عارضی تھی، کیوں کہ اُس رات کا اندھیرا ابھی تک اُن کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔

ایز کنیل اور عیسیاہ، جو خون، سردی اور خوف کے درمیان جکڑے ہوئے تھے، ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ چاندنی، جو ٹری ہاؤس کے ارد گرد پھیلی ہوئی تھی، جیسے اُن کی خاموش کامیابی کا جشن منا رہی ہو۔ مگر اُس رات کی ہواؤں میں ایک پراسرار پیش گوئی چھپی ہوئی تھی، جسے ایز کنیل نے ابھی تک پوری طرح سمجھا نہیں تھا۔

ایز کنیل اپنی جگہ سے اٹھا اور وہ کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں

اندھیرے میں لپٹا ہوا ٹری ہاؤس نیم روشن ہو گیا، جب ایز کنیل نے دھیرے سے ایک موم بتی جلائی، اُس کا ہلکا سا لرزتا شعلہ کمرے کی دیواروں پر خوفناک سائے بنا رہا تھا۔

عیسیاہ دیوار کے ساتھ سمٹا بیٹھا تھا، اُس کی آنکھوں میں خوف کی چمک تھی اور اُس کے بازو گھٹنوں کے گرد لپٹے ہوئے تھے جیسے وہ اپنے اندر چھپنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ایز کنیل نے اُس کے خوف کو محسوس کیا، قریب آیا اور زمین پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر ایک تسلی بخش مسکراہٹ تھی، جیسے اُس نے اپنے آپ کو یہ ذمہ داری سونپ لی ہو کہ وہ اس معصوم دل کو اس بھوت بنگلے جیسے ماحول سے محفوظ رکھے گا۔

۔ ”ہم بچ جائیں گے،“ اُس نے آہستہ سے کہا، جیسے اپنے الفاظ میں یقین بھر رہا ہو۔

”جلد ہی ہم باہر نکلیں گے، کہیں نہ کہیں سی مدد مل جائے گی۔“

عیسیاہ نے خوف زدہ آنکھوں سے اپنے بھائی کو دیکھا، اور اگلے ہی لمحے اُس کے مضبوط سینے سے لپٹ گیا، جیسے وہ اس خوفناک دنیا سے بچنے کے لئے واحد پناہ گاہ ہو۔

ایز کنیل نے اسے نرمی سے اپنے گلے میں سمیٹا، اُس کی پیشانی پر ایک دھیرے سے بوسہ دیا، ”تم میرے ساتھ محفوظ ہو، کوئی چیز تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔“

ایز کنیل کھڑا ہوا، اُس کی آنکھوں میں عزم کی چمک تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ کو عیسیاہ کی طرف بڑھایا، ”چلو، اب ہمیں نکلنا ہو گا۔ جو بھی راستے میں آئے گا، ہم اس کا سامنا کریں گے، ساتھ مل کر۔“

ان کے ہاتھوں نے ایک دوسرے کی انگلیاں مضبوطی سے تھامی ہوئی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے ٹری ہاؤس سے باہر نکلے، چاندنی کے سائے نے ان کو ایک گلے کی طرح ڈھانپ لیا تھا، جیسے رات کا اندھیرا اُن کے ساتھ سازگار ہو گیا ہو۔

درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے، تیز ہوا اُن کے قدموں کے ساتھ سرگوشیاں کر رہی تھی، اور آسمان پر بجلی چمک رہی تھی، جیسے زمین اور آسمان ایک دوسرے سے ہم کلام ہو رہے ہوں۔

اچانک، اُن کی حرکت رُک گئی۔ ایک لمحے کے لئے دونوں بھائی تھم گئے۔ سامنے، گھر کے دروازے کے قریب، زیبا اور میری کے سائے خوفناک انداز میں ابھرے۔

میدان کا نقشہ جیسے کسی وحشیانہ جنگ کی داستان سنا رہا ہو—چاروں طرف محافظوں اور سیکیورٹی اہلکاروں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں، اور ڈریک کے وحشی غنڈے ہر کونے میں پھیل چکے تھے، جیسے شکاری اپنے شکار کی تلاش میں ہوں۔

ایز کنیل اور عیسیاہ نے فوراً ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا، جیسے کسی خاموش اشارے کا تبادلہ ہوا ہو۔ دونوں نے درختوں کے بیچ چھپنے کا فیصلہ کیا، جہاں کی گھنی چھاؤں اُن کی پناہ بن سکتی تھی۔

سائے میں گھل مل کر، وہ دونوں درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو گئے، اُن کی سانسیں دھیمی اور قدم محتاط۔ اندھیرے کے ساتھ کھیلتے ہوئے سائے اُن کے وجود کو چھپانے میں مدد دے رہے تھے۔

اب آگے----

میدان کی سنجیدہ خاموشی میں اچانک زیبا اور میری کی بھاری قدموں کی آواز گونجی، اُن کے قریب آتے قدم جیسے زمین پر موت کی چاپ ہو۔

ہر قدم کے ساتھ بھائیوں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، جیسے اُن کے ارد گرد کا خوف اُنہیں اپنی لپیٹ میں لے رہا ہو۔

ایز کنیل نے ایک نظر عیسیاہ پر ڈالی، اُس کی آنکھوں میں تسلی بھری تھی، مگر دل کے اندر خوف کا طوفان تھا۔

زیبا اور میری کو۔ زمین پر دھکیل دیا گیا وہ دونوں زمین پر سمٹی ہوئی، خوف کی زد میں آچکی تھیں، جیسے یہ خاموش ماحول ان کے لیے زہریلا سانس لے رہا ہو۔

ڈریک کی مکروہ آواز نے فضا میں جلتی بجلی کی طرح لرزہ ڈال دیا، جس نے ان کے دلوں میں خوف کے سنگچہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ”اوپر دیکھو!“ اُس کا طنزیہ قہقہہ گونجا، اور ہر چیز ایک ہی لمحے میں جیسے ساکت ہو گئی۔

فضا میں بجلی کی چمک اور زور کی گرج کے ساتھ، اوپر چھت کی ریلنگ سے ابراہام لٹکا ہوا نظر آیا۔ زنجیروں میں جکڑا، دس آدمیوں کے ہاتھوں میں گڑیا کی طرح معلق، اُس کا جسم بے جان تھا، مگر اذیت اُس کے چہرے پر صاف لکھی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، اور اُس کے وجود میں جو آخری بغاوت تھی وہ بھی فنا ہو چکی تھی۔ زنجیریں اُس کے جسم کے گرد جیسے سزائے موت کا پھندا تھیں، جو ہر لمحے اُسے موت کے مزید قریب کر رہی تھیں۔

ڈریک نے ایک سفاک مسکراہٹ کے ساتھ اعلان کیا، ”میں نے تم سب کو غلام بنا لیا ہے!“۔ اُس کے الفاظ سردیوں کے بادلوں کی طرح چاروں طرف پھیل گئے، اور زیبا اور میری کی آنکھوں میں ہولناکی نے جگہ بنالی۔

بجلی کی ایک اور چمک نے آسمان کو روشن کیا، جیسے خود قدرت اس خوفناک منظر پر آسمانی آنسو بہا رہی ہو۔ ابراہام کے نیچے کی زنجیریں ہلکوں کی گرفت میں ڈھیلی ہوئیں اور جیسے ہی اُس کا جسم نیچے کی طرف گرا، لگتا تھا کہ موت کی خود کار مشینری حرکت میں آگئی ہو۔

زمین پر گرتے ہی اُس کی ہڈیاں ٹوٹنے کی کرہہ آواز گونجی، جیسے کوئی پرانا درخت طوفان میں ٹوٹ جائے۔ اُس کا جسم تڑپتے ہوئے زمین سے ٹکرا گیا، اور ٹوٹے ہوئے اعضا خون میں بھیگ گئے۔

ایزکئیل نے اپنی چیخ ضبط کر لی، آنکھیں سختی سے بند کر لیں، اور تڑپتے دل کے ساتھ عیسیاہ کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ یہ منظر نہ دیکھ سکے۔ ایک مدہم سی آہ ”بابا...“ اس کے لبوں سے نکلی، جو درختوں کی خاموشی میں کہیں گم ہو گئی

اس نے اپنی آنکھیں زبردستی کھولیں، گویا پلکوں پر بوجھ کسی پہاڑ کا ہو۔ سامنے کا منظر اس کی روح کو چیرنے والا تھا—ایک اذیت ناک تصویر، جس میں ہر زاویے پر دکھ اور سفاکیت رقم تھی۔

ابراہام کا جسم خون میں ڈوبا ہوا تھا، اُس کے زخم ایک زبردست اذیت کی داستان سنارہے تھے۔ جیسے اُس کی جلد کے نیچے سے روح کو نوچا جا رہا ہو، اور ہر قطرہ خون اُس کی زندگی کا گواہ بن گیا تھا۔

زمین پر خون کا جھیل بنتا جا رہا تھا، اُس کا جسم بے جان پڑا تھا، اور خون کا سرخ سیلاب چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا۔

ابراہام تو تب ہی مر گیا تھا جب اس نے زیبا کو اس برباد حالت میں دیکھا تھا۔ ایک باپ کے لیے اس سے بڑھ کر اذیت کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی بیٹی کی عصمت اور عزت لٹی ہوئی اس کے سامنے ہو اور وہ بے بس کھڑا، کچھ بھی نہ کر سکے۔

اس لمحے کی بے بسی اور دکھ نے ابراہام کی روح کو روند ڈالا تھا۔ وہ تب ہی اندر سے ٹوٹ چکا تھا، جیسے زندگی کی آخری امید بھی بجھ چکی ہو۔ وہ لمحہ اس کے لیے موت کی پہلی ساعت تھی، جس کا سوگ اس کے دل میں سرایت کر گیا تھا۔

اور اب، آج جسم بھی وہی انجام پا گیا۔ ابراہام مکمل طور پر مر چکا تھا، اس دکھ کے ساتھ جو اسے پہلے ہی اندر سے کھا چکا تھا۔

میری کی اذیت بھری چیخ رات کی خاموشی میں گونجی، اُس کی روح جیسے اُس منظر کے سامنے فنا ہو گئی تھی۔
”نہیں!“ اُس کی آواز بجلی کے کڑکنے کے ساتھ ہی ختم ہوئی، جیسے خود قدرت نے اُس کی چیخ کو نگل لیا ہو۔

ایز کئیل، خوف میں جکڑا ہوا، جیسے پتھر کا مجسمہ بن چکا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے باپ کی موت کا منظر تھا، اور اُس کے چھوٹے بھائی کی آنکھیں اندھیرے میں تھیں۔

ایز کئیل کی روح چیخ رہی تھی، مگر اُس کی زبان خاموش تھی۔

ڈریک نے اطمینان بھری مسکراہٹ کے ساتھ زمین پر گرتے ابراہام کی طرف دیکھا، جیسے وہ ایک کھیل دیکھ رہا ہو جس کا اختتام اُس کے ہاتھ میں تھا۔

طوفان کی ہوائیں زور سے چلنے لگیں، اور بارش کی موٹی بوندیں ابراہام کے خون سے ملی زمین پر گرتے ہوئے ایک عجیب خوفناک تصویر بنا رہی تھیں۔

ہر بوند جیسے زمین کو خون سے تر کر رہی ہو۔

جہاں کبھی چاندنی کی چمک تھی اب وہاں آسمانی بجلی کی گرج چمک رہی تھی، جیسے قدرت بھی اس قتل عام پر چیخ رہی ہو۔

زمین کے ہر کونے میں خون کی لکیریں بہہ رہی تھیں، اور ایز کئیل کی آنکھوں میں آگے بڑھنے کی ہمت مفقود ہو چکی تھی۔

وہ ایک پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے باپ کے خون سے لت پت جسم کو دیکھ رہا تھا۔

یہ خوفناک منظر کسی بھیانک خواب کی طرح رات کے سناٹے میں پھیلا ہوا تھا، اور ڈریک، اس اندھیرے تھیٹر کا مالک، اپنی کامیابی کے نشے میں مخمور تھا۔ اُس کے آدمی، جیسے شیطانی سایے، اطمینان کے ساتھ منظر کا جائزہ لے رہے تھے، اُن کی آنکھوں میں سفاکی کی ایک چمک تھی۔

۔ دوسری جانب اولیویا کی مسکراہٹ اب بھی جمی ہوئی تھی، سرد اور بے جان، مگر اس کی آنکھوں میں شرارت کا عجیب سا رقص تھا، جیسے وہ خود شیطان کی سازش کا حصہ ہو۔

زیبا کا جسم منجمد، وہ اپنے باپ کی لاش پر ساکت نظریں جمائے تھی، اندرونی طوفان سے مغلوب، جہاں غم اور اذیت کا ایک بے لگام دریا بہہ رہا تھا۔

مگر اس طوفان کے بیچ کہیں ایک انتقام کی چنگاری بھی تھی، جو ابھی دہکنے کو تھی۔ میری، اب اپنے آپ کو مکمل طور پر بے سہارا محسوس کرتی، زمین پر بیٹھے ابراہام کے بے جان وجود کو چھو رہی تھی، جیسے وہ اپنے ماضی کی محبت کو واپس لانے کی آخری کوشش کر رہی ہو۔

مگر اندھیروں میں گرج کی دھمک اور بجلی کی کوندت نے ڈریک کے شیطانی منصوبے کے پردے کو چاک کر دیا۔ وہ اوپر سے نیچے اتر چکا تھا، اُس کی آنکھوں میں مکروہ اطمینان رقص کر رہا تھا، جیسے یہ سب اُس کے ہاتھ کا کھیل ہو۔ “میں نے تمہیں پیشکش کی تھی، میری، مگر تم نے ایک بزدل کو چنا!” اُس کی آواز میں

زہر تھا، جو ہر لفظ کے ساتھ اُس کے گہرے بغض کو ظاہر کر رہی تھی۔ جیسے ہی اُس نے میری کے بالوں کو پکڑا اور اُس کا سر اوپر کیا، اُس کے ہاتھ کی وحشت میری کی کمر تک جا پہنچی۔

۔ ”ابراہام کو تم نے میرے مقابلے میں ترجیح دی، مگر آج میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں!“ اُس نے اولیو یا کی طرف رخ کیا اور اُس راز کا پردہ چاک کیا جو سالوں سے دفن تھا۔

۔ ”یہ اولیو یا میری بیوی۔۔۔ ہاں، وہ ہی بیوی جو تمہاری نظروں میں مردہ تھی۔ زندہ و سلامت، تمہارے ہی درمیان رہتی رہی، بس تمہاری دنیا میں جاسوسی کرتی تھی، تمہاری ہر حرکت پر نظر رکھتی تھی۔ دیکھو کیسے تم سب کو دھوکے میں رکھا! تمہاری بھول یہ تھی کہ تم نے اسے مٹی میں دفن سمجھا، جبکہ وہ زندہ تھی، تمہارے سروں پر سایہ کیسے ہوئے۔ اور ایلکس؟ ہاں، وہ ہم دونوں کا بیٹا ہے۔ ہمارا خون۔۔۔“

ڈریک نے اپنا زخمی آنکھ پر بندھا سفید پٹی تھوڑی سی چھوئی، اور پھر اُس کے لبوں پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”پیسہ خونی رشتوں کو نہیں جانتا،“ اُس نے دھیمی آواز میں کہا، ”میرے والد نے ابراہام کو جانداد کے لیے بہتر سمجھا، مجھے نہیں۔ مگر آج میں نے وہ ہی سب کچھ لے لیا ہے، جو مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔“ اُس کی آنکھوں میں فتح کی روشنی تھی، مگر میری کی نگاہیں اُس پر لعنت کے طور پر تھوکنے کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکیں۔

میری کی اس حرکت پر ڈریک کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور بے دردی سے میری کے چہرے پر زوردار تھپڑ مارا، جس سے اُس کے گال پر سرخ نشان بن گیا۔ ”اب بتاؤ!“ وہ چیخا، ”میری بنو گی یا مرو گی؟“۔

لیکن میری کی روح جھکنے والی نہ تھی۔ اُس نے ڈریک کی جانب نفرت بھری نظر ڈالی، جیسے اُس کے وجود میں کوئی طاقتور قوت چھپی ہو، جو تاریکی کے سب سے گہرے سایوں کو بھی مات دے سکتی تھی۔

ڈریک نے اچانک زیبا کی طرف قدم بڑھایا، اُس کے چہرے پر شیطانی تسکین تھی، جیسے وہ جانتا ہو کہ اُس کا ہر عمل ایک اور دل خراش سانحے کو جنم دے گا۔ ایز کئیل، جو سائے میں چھپا ہوا تھا، خوف میں مفلوج تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ بھی اُس کو روکنے کے قابل نہیں تھا۔ ڈریک نے ایک بندے کو اشارہ کیا، جو خطرناک بندوق اٹھائے ہوئے زیبا کی طرف بڑھا۔

زیبا بے خبری میں بس اپنے باپ کی میت کو دیکھ رہی تھی، اُس کے چہرے پر صدمے کا سایہ تھا، مگر اب وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

ٹرگر کھینچا گیا۔ گولی کی گونج نے رات کی خاموشی کو چیر دیا جب آگ بندوق سے باہر نکلی، اور زیبا کے وجود کو آتش کی لپیٹ میں لے لیا۔ آگ نے اُسے گھیر لیا، اُس کے گوشت کی تیز بو ہوا میں پھیل گئی، جیسے یہ ظلم کا ایک گہرا ثبوت ہو۔

زیبا کی چیخیں رات کے سکوت کو چیرتے ہوئے ایز کئیل کے ذہن میں گونجنے لگیں، جیسے یہ چیخیں اُس کے اندر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جائیں گی۔

شعلے بے قابو ہو چکے تھے، دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے، خوفناک سایے بناتے جو اُس شیطانی منظر کا حصہ بن چکے تھے۔

زیبا کا جسم تڑپ رہا تھا، اذیت کے آخری لمحات میں مچل رہا تھا۔ ڈریک کی آنکھوں میں فتح کی چمک تھی، جیسے وہ اس سب کا بادشاہ ہو۔

زیبا کے جلتے ہوئے جسم سے اٹھنے والی روشنی نے دیواروں پر ایک مکروہ سائے ڈالے، جو اس خوفناک واقعے کا خاموش مگر دل دہلا دینے والا ثبوت پیش کر رہے تھے۔

ٹمٹماتے شعلوں کی روشنی میں بگڑی ہوئی شبیہیں اس جگہ کے خوفناک ماحول کو مزید وحشت ناک بناتی جا رہی تھیں۔

زیبا کی ماں میری، اس ہولناک منظر کے سامنے بے بس زمین پر پڑی، اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی، اس کا چہرہ غم و الم کا مجسمہ بن چکا تھا۔

وہ گہرائی جس میں وہ غرق تھی، کسی بھی لفظ کی حدود سے باہر تھی۔ اُس کی آنکھوں میں صدمے اور غم کی شدت عیاں تھی، ہر آنسو اُس کے بے پناہ نقصان کی گواہی دے رہا تھا۔

اس کے برعکس، اولیویا جو کہ ڈریک کی بیوی تھی، اُس کے ہونٹوں پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں وحشت کی چمک تھی، اور اُس کے لبوں سے نکلتی قہقہہ ایز کنیل کے دل میں نیزوں کی طرح چبھ رہی تھی۔

ایز کنیل درختوں کے پیچھے چھپا یہ اندوہناک منظر دیکھ رہا تھا، اپنے بھائی کے چہرے کو اپنے سینے سے لگائے تاکہ وہ یہ دردناک واقعہ نہ دیکھ سکے۔ اولیویا کی آنکھیں سفاکی سے چمک رہی تھیں، جیسے وہ اس عذاب کا پورا لطف اٹھا رہی ہو جس کا وہ بھی ایک حصہ تھی۔

ڈریک نے طنزیہ انداز میں کہا، ”بہت ٹھنڈ تھی، سوچا کہ زیبا کو جلا کر ماحول کو گرم کر دوں۔“ اُس کے الفاظ میں سفاکیت کی ایک سرد لہر تھی، جیسے وہ اس ظلم کو مذاق بنا رہا ہو۔

ایز کنیل، جس کا دل غم اور بے بسی کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا، اپنی بہن کی موت کے مناظر کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہوا میں جلتے گوشت کی بدبو اور دھواں پھیلتا جا رہا تھا، جیسے یہ سانحہ جسمانی اور روحانی دونوں دنیاؤں میں گھاؤ ڈال رہا ہو۔

جیسے ہی آگ کی لپٹیں مدھم ہونے لگیں، اولیویا کی قہقہے کی آواز فضا کو چیرتی رہی۔ زیبا کا جلا ہوا جسم اب زمین میں پھیلتا جا رہا تھا، اور کمرے کی دیواروں پر پڑنے والے سائے ایک اذیت ناک موت کی گواہی دے رہے تھے۔

جب آخر کار آگ بجھی، زیبا کا بے جان وجود ایز کئیل کی یادوں میں ایک انمٹ نقش چھوڑ گیا تھا۔ ڈریک، جس کے چہرے پر ذرہ برابر بھی ندامت نہ تھی، بندوق کو مروڑتے ہوئے اُس دل دہلا دینے والے عمل کی تکمیل کرتا دکھائی دیا۔

زیبا کی باقیات سے اٹھتا دھواں رات کی سیاہی میں گھل رہا تھا، اور ایز کئیل اپنی بہن کی المناک موت کی تلخ حقیقت سے دوچار تھا۔ یہ رات جو کبھی تاریک تھی، اب اُس کی زندگی کی روشنی کو بجھا چکی تھی، اور اُس کی روح کا ایک ٹکڑا ہمیشہ کے لیے سیاہی میں ڈوب چکا تھا۔

اسی دوران، ڈریک میری کے پاس گیا اور اُس کے بالوں کو بے دردی سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ اُس کا سر پیچھے کرتے ہوئے وہ زہریلے الفاظ میں بولا، ”تو نے مجھے سب کے سامنے رسوا کیا، اب میں تجھے رسوا کروں گا!“ ایز کئیل، درختوں کے سایوں میں چھپا یہ لرزہ خیز منظر دیکھ رہا تھا، جہاں اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔

ڈریک نے ایک ہی جھٹکے میں میری کے لباس کو پھاڑ دیا، اور اُس کے جسم کو بے لباس کر دیا۔ میری کی دل سوز چیخیں ہوا میں معلق ہو گئیں، اور وہ شیطان صفت انسان، جن کی نظریں میری پر جمی ہوئی تھیں، وحشیانہ انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

میری شرم سے زمین میں گڑتی جا رہی تھی، نظریں نیچی کیے ہوئے۔ ڈریک نے ایک بار پھر اُس کے بالوں کو پکڑا اور اُسے کھینچ کر کھڑا کیا۔ میری اپنے جسم کو سمیٹتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے خود کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر اُس کی بے بسی عیاں تھی۔

ڈریک نے اپنی آنکھوں میں خباثت کی چمک لیے حاضرین کو دیکھتے ہوئے کہا، ”اس کے جسم کا ایک حصہ بھی تمہاری حیوانیت سے نہ بچے، اسے اتنا رسوا کرو کہ یہ میرے جوتوں کی نوک پر اپنی ناک رگڑتے ہوئے مجھ سے موت کی بھیک مانگے۔“

...°...

ایز کیل کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا، جیسے حقیقت خود اس کی گرفت سے پھسل رہی ہو۔ وہ پتھرا کر کھڑا تھا، میری کی اذیت ناک چیخیں کانوں میں گونج رہی تھیں، ہر ایک چیخ اس کی روح کو چھلنی کر رہی تھی۔

میری کا نازک جسم جانوروں کی طرح ان ظالموں کے پنجوں میں تڑپ رہا تھا، گوشت اور ہڈیاں درد کی ایک سنگین تصویر پیش کر رہی تھیں۔ چاروں درندے جب پیچھے ہٹے تو مریم کی حالت کسی زندہ انسان کی نہیں رہی تھی۔ بس ایک ٹوٹا ہوا جسم، زمین پر پڑا، ہر سانس کے ساتھ موت کے قریب تر۔

اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار واضح تھے؛ آنکھوں میں درد کا دریا موجزن تھا، جو شاید کسی کو نہیں بھا سکتا تھا۔

میری کا جسم ان چار درندہ صفت انسانوں کی درندگی کا شکار ہو چکا تھا، جسم پر ان کی سفاکی کے گہرے زخم ثبت تھے، اور اس کی ہونٹوں پر بند سسکیاں خون آلود آنسوؤں کے ساتھ ٹپک رہی تھیں۔

ہر سانس، ایک نئی اذیت کا اعلان تھا، اور درد اس کی رگوں میں چمکتا ہوا بہہ رہا تھا۔ اچانک، اس کی نیم مردہ نظریں بے اختیار دائیں طرف مڑ گئیں، جہاں درختوں کے سایے تلے اس کے بیٹے کھڑے تھے۔

اس لمحے میں، اس نے ایک مختصر سا سکون محسوس کیا، جیسے ٹوٹے دل کو یک لخت آرام مل گیا ہو کہ اس کے بیٹے زندہ ہیں۔

مگر اس کی آنکھوں سے آنسو پھر بھی بہتے رہے، جیسے وہ جانتی ہو کہ وہ انہیں ہمیشہ کے لیے نہ دیکھ سکے گی۔ وہ خوش تھی کہ اس کا بیٹا ابھی زندہ ہے، مگر اس کے دل میں ایک غم کی لہر نے جنم لیا کہ وہ اپنی ماں کو اس ذلت میں، اس شکستہ حالت میں دیکھ رہا ہے۔

اس کی سانسوں میں ایک ایسی لرزش تھی جو سکون اور اذیت کے مابین معلق تھی، مگر بیٹے کی نظروں میں جو دکھ وہ محسوس کر رہی تھی، اس نے اس کی خوشی کو بھی ماتم میں بدل دیا۔ یہ دل دہلا دینے والا منظر دیکھ کر، میری کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں، جیسے وہ اس بے بسی اور ذلت کو مزید برداشت نہ کر سکتی ہو۔ در

ڈریک قریب آیا، جیسے موت کی چمکتی ہوئی تلوار لے کر۔ وہ میری کے پاس جھکا، اس کے آنسوؤں کا مذاق اڑاتا ہوا بولا، ”تمہارے بچے کو دنیا میں آنے میں چند مہینے ہی رہ گئے تھے، لیکن افسوس، یہ دنیا اس کے لائق نہیں تھی۔“ اس نے سفاکی سے مریم کے پیٹ پر قدم رکھا، جیسے زندگی کو روند رہا ہو، اور مریم کی آنکھوں میں آخری بار درد کا وہ شدید اظہار ابھرا، جیسے اس کی روح خود ہی باہر نکلنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کا جسم جھٹکوں میں لرزا اٹھا، اور ایک دھیمی چیخ اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

ایزکئیل اپنے گھٹنوں کے بل عیسیٰ کو لیے گر پڑا۔ اس کی ماں کا چہرہ، جو کبھی محبت اور حفاظت کی علامت تھا، اب خون میں رنگا ہوا تھا، جیسے زندگی نے اس پر اپنے تمام ظلم کے نشانات چھوڑ دیے ہوں۔

اس کے آنسو بے اختیار بہہ رہے تھے، لیکن اس کے دل کی چینیں اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئیں۔۔۔ میری نے اپنی آخری سانسیں لیتے ہوئے کلمہ شہادت کو زبان پر لایا، ہچکیوں اور درد میں لپٹی آواز میں، جیسے آخرت کی دہلیز پر کھڑی ہو۔

۔ ”اے اللہ...“ اس کے ہونٹوں سے آخری دعا نکلی، ”میرے بیٹوں کو سیدھا راستہ دکھا...“۔

میری کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں، اور ایزکئیل نے دیکھا کہ وہ ایک سکون کی کیفیت میں جا چکی تھی، لیکن وہ سکون موت کی خوفناک حقیقت کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔

اس کی گردن بے جان ہو گئی، اور وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے ایک آخری مرتبہ ایز کنیل اور عیسیاہ کو دیکھ رہی تھی۔ ایک ایسی نگاہ، جس میں صدیوں کا دکھ اور اذیت سمٹی ہوئی تھی۔

خاموشی نے چاروں طرف موت کی گونج کے ساتھ قبضہ کر لیا۔ میری کی موت ایز کنیل کے لیے محض ایک انسانی زندگی کا خاتمہ نہیں تھی، بلکہ یہ ایک خاندان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی دردناک علامت بن گئی تھی۔ اس خاموشی میں وہ چیخیں دب چکی تھیں جو دلوں کو پھاڑ دیتی ہیں، اور وہ آنسو جو روحوں کو جلا دیتے ہیں۔

...°...

ویرانی کی سنگین چادر نے اس درختوں سے گہری جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، درختوں کی خاموشی کسی پرانے مقبرے کی سرد مہری جیسی تھی۔ ایز کنیل، اپنے دل میں ایک بھاری بوجھ لیے، گہری اذیت میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ چپ چاپ، خون کے آنسو روتا ہوا، درخت سے ٹیک لگائے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ عیسیاہ کو اپنے سینے سے لگائے، وہ دونوں دکھ کے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ آنسو اس کے چہرے پر بے قابو ندیاں بن کر بہہ رہے تھے، جیسے اس کی روح ان آنسوؤں میں تحلیل ہو رہی ہو۔

اس کے چاروں طرف اس کے خاندان کی بے جان لاشیں پڑی تھیں، ماں، باپ، بہن، اور وہ ناپید بچہ جسے کبھی دنیا دیکھنے کا موقع نہ ملا۔

اس منظر کی ٹھنڈی بازگشت ہوا میں پھیلی ہوئی تھی، جیسے موت خود ایک سیاہ پرچم لہرا رہی ہو۔ ایز کنیل کی ماں، میری، خون میں لت پت، ظلم و ستم کا شکار بنی بے حس و حرکت پڑی تھی۔

اس کی کوکھ جس میں ایز کنیل کے بہن یا بھائی کی امید چھپی تھی، ظالمانہ طور پر ڈریک کے بوجھل جوتے تلے کچل دی گئی تھی۔

اس غیر پیدائشی جان کی دردناک موت ایز کنیل کے دل پر ایسا داغ بن گئی جسے کوئی وقت مٹا نہ سکتا۔ ڈریک کے جوتے کی سفاکانہ ٹھوکرنے نہ صرف بچے کی نازک ہستی کو روند ڈالا، بلکہ ایز کنیل کی زندگی کو بھی ایک نہ ختم ہونے والے دکھ میں تبدیل کر دیا۔

خون آلود زمین پر ننھے وجود کی خاموشی نے ایز کنیل کے دل کی چیخوں کو اور گہرا کر دیا۔ جیسے ہی وہ منظر دیکھ رہا تھا، اس کا دل درد سے پھٹنے کے قریب تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیں، لیکن جانتا تھا کہ حقیقت سے منہ موڑنے سے وہ ظلم مٹ نہیں سکتا۔ مجبوراً اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھولیں، جانتے ہوئے کہ یہ منظر اس کی زندگی کا انمٹ حصہ بن چکا تھا۔

ڈریک، ظلم و ستم کا معمار، اپنے ظلم کے ہر پہلو سے محفوظ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکیت کی چمک تھی، اور اس کے لبوں پر بے رحمی کی مسکراہٹ۔ اس نے سرد لہجے میں اپنے ساتھیوں کو حکم دیا، ”ان سب کی لاشیں اندر لے جاؤ، ان کے کمروں میں رکھ دو۔ پورے گھر کو جلا دو، اور ایسا ظاہر کرو جیسے گیس کے دھماکے میں ان کی موت ہوئی ہو۔ دنیا اس جھوٹی کہانی کو مان لے گی۔“

اولیویا، جو کہ اس ساری سازش کی شریکِ جرم تھی، سامنے آئی۔ اس کے چہرے پر سفاکیت کی ایک خاموشی چھپی ہوئی تھی، وہ اپنی سازش میں شامل مرغوں کو ہمت دلاتے حسابی انداز میں بولی،۔ “فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہمیں فرانزک لیب یا پولیس سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا، کیوں کہ ہمارے تعلقات مضبوط ہیں۔ بیان یہ وہ ہی ہوگا جو ہم چاہتے ہیں۔” اُس کی مسکراہٹ اس سازش کی گہرائی کو مزید نمایاں کرتی تھی۔

یہ سازش، ایک ایسا جال جس میں انصاف کو دھوکہ دیا جا رہا تھا، سویڈن کے پولیس نظام میں جڑ پکڑ چکی تھی۔ جہاں سویڈن کی ساٹھ فیصد آبادی اپنی پولیس پر اعتماد کرتی تھی، وہاں اندر چھپی بد عنوانی کا سایہ بھی اتنا ہی گہرا تھا جتنا کسی اور ملک میں ہو سکتا ہے۔

پاکستان کی طرح، سویڈن کی پولیس میں بھی کچھ افسران قوم کی خدمت کے لیے پر عزم تھے، مگر وہ کالی بھیڑیں جو مفاد پرستی کے جال میں پھنسی ہوئی تھیں، وہ ادارے کے وقار کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھیں۔

ایز کنیل اور عیسیاہ اس نظام کے شکار تھے، ایک ایسی بے حسی کا شکار جس نے ان کے خاندان کو برباد کر دیا تھا۔

ان کے آنسو اس نا انصافی اور ظلم کی داستان کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر گئے، اور دنیا کے سامنے ایک کہانی رہ گئی جسے کوئی کبھی جان نہ سکے گا۔

دوسری جانب ایز کنیل۔ کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں، اور اس نے فطرت کے اُس خاموش سکون کو اپنے دل میں جذب کیا، جو لمحہ بھر کے لیے اُسے اس درد سے آزاد کر رہا تھا۔

سرگوشی کرتے پتوں کے بیچ، اچانک ایک نورانی سی آسمانی روشنی نمودار ہوئی۔ اُس میں میری کی شبیہ نمودار ہوئی، اُس کا وجود سفید، آسمانی لباس میں لپٹا ہوا تھا، جو جیسے کسی اور دنیا کی چمک سے روشن ہو رہا تھا۔ میری کا وجود مقدس روشنی میں ڈوبا ہوا تھا، اُس کی سر پر نازک پھولوں کا تاج اس کے بہتے بالوں کو مزید مقدس بنا رہا تھا، اور اُس کی مسکراہٹ میں ماں کی مامتا کا ابدی سکون چھپا ہوا تھا۔

اُس کے ہونٹوں سے ایک نرمی بھری آواز نکلی، ”میرے بیٹے، ہماری جدائی عارضی ہے۔ امن کا ایک دائرہ ہمارے دوبارہ ملاپ کا منتظر ہے۔ جنت کی کنجی تلاش کرو؛ یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں دوبارہ ملائے گا۔ مگر ابھی خود کو اور اپنے بھائی کو بچاؤ۔ وقت تمہیں تمہاری پختگی کی گہرائی دکھائے گا۔“

میری کی روحانی شبیہ دھیرے دھیرے سفید دھوئیں میں تحلیل ہونے لگی، جیسے آسمانی شعاعیں زمین سے رخصت لے رہی ہوں۔

دھواں ہوا میں تحلیل ہوتا گیا، ایز کنیل کو حقیقت اور روحانی دائرے کے بیچ لٹکا ہوا چھوڑ گیا۔ اس کے الفاظ کی بازگشت درختوں کی سرد ہوا میں گونجتی رہی، جیسے وہ مقدس لمحہ ہمیشہ کے لیے ایز کنیل کے وجود کا حصہ بن چکا ہو۔

جیسے ہی وہ دھند چھٹ گئی، ایز کئیل کی آنکھیں کھلیں، اور اُس کی نظر سیدھا اپنے چھوٹے بھائی عیسیاہ پر پڑی، جو اسی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

اُس نے ایک نظر اپنے ارد گرد ڈالی، لیکن ماں کا، باپ کا، اور بہن کا جسم وہاں نہیں تھا۔ یہ غائب ہو چکے تھے۔

مگر جو کچھ میری نے کہا تھا، وہ اُس کے ذہن میں ایک گہری چوٹ کی مانند نقش ہو چکا تھا۔ اُس خواب جیسے تصادم کے اثرات نے ایز کئیل کو حقیقت کے کنارے پر لا کھڑا کیا۔

اُس کی نظریں بار بار عیسیاہ کی معصومیت اور پیچھے ہٹنے والی شریر شخصیات کے درمیان گھوم رہی تھیں، جو اندھیرے میں تحلیل ہو رہی تھیں۔

مگر پھر، جیسے خواب نے خود کو ایک بھیانک حقیقت میں بدل دیا ہو، ایز کئیل کی سانسیں تیز ہو گئیں۔ اُس کی ماں کا آخری منظر، خون آلود، درختوں کے سائے میں بکھری ہوئی، ذہن میں ابھر آیا۔

اُس کا پیٹ، جہاں کبھی زندگی پل رہی تھی، ڈریک کے بوٹوں تلے کچلا جا چکا تھا۔ ایز کئیل کے آنکھوں کے سامنے وہ منظر پھر سے لوٹ آیا جب میری کا بے جان جسم، اپنی بے بسی میں، ظالمانہ موت کی گواہی دے رہا تھا۔

خون کی دھاریں زمین پر جم چکی تھیں، اور وہ دردناک چیخیں اُس کی سماعت میں گونجنے لگیں جو اُس کی ماں کے ہونٹوں سے نکلی تھیں۔

ڈریک اور اولیویا کے شریر منصوبے، جنہوں نے اُس کے خاندان کو نیست و نابود کر دیا، اب ایک بھیانک یاد کی صورت میں سامنے تھے۔

درندہ صفت ڈریک کی آنکھوں میں سفاکیت کی جھلک، اور اولیویا کی سرد مسکراہٹ، جو موت اور تباہی کی بازی کھیل رہی تھی۔ جیسے ہی وہ دونوں اپنے ظلم کے آثار چھوڑ کر غائب ہوئے، ایزکئیل اور عیسیاہ ویران زمین پر رہ گئے، اُس پیشین گوئی کے سائے میں، جس نے اُن کے مستقبل کو تاریک کر دیا تھا

اسی لمحے ایزکئیل نے عزم کی روشنی کے ساتھ اپنے بھائی عیسیاہ کے قریب جا کر اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُس کے لہجے میں بے پناہ طاقت اور نرمی کا امتزاج تھا، جیسے دنیا کے تمام مصائب کو روکنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ ”ہمیں یہ سب جھیلنا ہوگا، عیسیاہ یہ غداری ہمارے صبر اور طاقت کا امتحان ہے، لیکن ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا،“ ایزکئیل نے گہری آواز میں کہا، جیسے وہ اپنے الفاظ سے اپنے بھائی کے دل میں امید جگانا چاہ رہا ہو۔

عیسیاہ کے چہرے پر خوف کے سائے اور معصومیت کے نشان ایک ساتھ ابھر آئے، اور کانپتے لبوں سے اُس نے بمشکل اپنی ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے سرگوشی کی، ”وہ ہمیں ختم کر دیں گے۔“

ایزکئیل نے مضبوطی سے اپنے ارادے کو تھاما، اُس کے چہرے پر ایک غیر متزلزل عزم نمایاں ہو گیا۔ اس نے نگاہیں اُس پر آنے اور اجڑے ہوئے مین گیٹ پر مرکوز کیں، جو ہر طرف سے گھیری ہوئی تاریکی میں ایک آخری امید کا نشان تھا۔

- ”عیسیٰ، مجھ پر بھروسہ رکھو۔ جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ ہم دونوں، مل کر، اس جہنم سے گزریں گے اور نئی صبح کو پائیں گے۔“

یہ کہہ کر، ایزکئیل نے اپنے بھائی کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا، اور اس کا دل سنبھالتے ہوئے آگے بڑھا۔ وہ اپنے جسم کی طاقت سے لاعلم تھا، جیسے ساری کائنات کا بوجھ اُس کے اندر سمٹ آیا ہو، مگر پھر بھی اُس نے عیسیٰ کو مضبوطی سے سنبھالے رکھا۔

درختوں کے اُس گھنے قفس میں، جہاں ہر پتہ اور ہر سایہ ایک نئے خطرے کی نشاندہی کر رہا تھا، دونوں بھائی خاموشی سے آگے بڑھتے گئے، جیسے اندھیرے کو چیرتے ہوئے روشنی کی طرف جارہے ہوں۔

ان کے قدم زمین پر ایک خاموش بغاوت کی طرح پڑ رہے تھے، اور ہر قدم کے ساتھ ہوا میں ایک ناگہانی تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

پھر اچانک، گیٹ سامنے آیا۔ ایک دہلیز، جو دونوں کے لیے امید اور خوف کا نشان تھا، نجات اور ہلاکت کا موڑ۔ لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ انہیں دیکھنے والی آنکھیں اُن کے وجود پر پہلے ہی اپنا سایہ ڈال چکی تھیں۔

اولیویا، جو ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ اندرونی دروازے میں چھپی ہوئی تھی، اچانک اپنے وجود کا احساس دلانے لگی۔ جیسے ہی اُس کی نظر اُن دونوں پر پڑی، اُس کی آنکھوں میں حیرت کی لہر دوڑ گئی اور وہ یکدم پھرتے لہجے میں چلاتی بولی، ”وہ زندہ ہیں! وہ بھاگ رہے ہیں!“۔

ڈریک، جو اپنی فتح کی خوش فہمی میں ڈوبا ہوا تھا، فوراً پلٹا اور اپنے شکار کی اس غیر متوقع چک پر حیران رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک قہر ابھر آیا، جیسے اس کی سوچیں تیزی سے کسی بد مزگی کی طرف جارہی ہوں۔

۔ ”پکڑ لو ان دونوں کو!“ ڈریک دھاڑا، اور اس کے آدمی فوراً ایز کنیل اور عیسیاہ کی طرف لپکے، جیسے ہوا میں ایک عجلت بھری لہر پھیل گئی ہو۔

ایز کنیل نے ایک فیصلہ کن لمحے میں مردہ محافظ کے پاس پڑی بندوق اٹھالی۔ اُس کے ہاتھوں میں بندوق کا وزن اب بوجھ نہیں تھا، بلکہ ایک آخری ہتھیار تھا، جس سے وہ اپنے اور اپنے بھائی کی نجات کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ جیسے ہی اُس نے فائرنگ شروع کی، گولیوں کی کڑک آسمان اور دالانوں میں گونج اٹھی۔

عیسیاہ، جو اس تصادم کی شدت کو محسوس کر رہا تھا، خوف کے عالم میں اپنی آنکھیں بند کر لی، جیسے کسی بھی لمحے اُسے موت کی آغوش میں لے جاسکتی ہو۔ ہر گولی کی آواز اُس کی سانسیں تیز کرتی، ہر دھماکہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دیتا۔

دشمن کی صفوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی، جیسے وہ ایز کئیل کے غیر متوقع حملے سے بے خبر تھے۔ وہ پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر ہر جانب سے موت کا سایہ اُن پر چھایا ہوا تھا۔

پھر ایز کئیل نے ایک تیز حرکت میں گیٹ کی طرف دوڑ لگائی، اور زوردار آواز کے ساتھ اُسے بند کر دیا۔ اس ایک عمل نے لمحاتی طور پر خطرے کو روکا، مگر دلوں میں پھیلی دہشت کی دھڑکنیں ابھی تک تھم نہیں سکیں تھیں۔

....°....

موت کی اس خطرناک رات میں ایز کئیل کے پیچھے گیٹ بند ہوتے ہی ایک نرم کلک کی گونج ماحول میں پھیل گئی۔

ہر طرف کہر کا ایک روحانی غلاف چھایا ہوا تھا، جیسے فطرت نے ان کے پراسرار فرار کو اپنے پردے میں چھپانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ ٹھنڈی اوز ہوا میں معلق تھی، اور اس نے ان کی بدنما پوشاک پر ایک غیر مرئی روشنی ڈال دی تھی، گویا یہ کوئی الہی چمک تھی۔

ایز کنیل نے عیسیاہ کو اپنے بازوؤں میں اٹھا رکھا تھا، اس کے نازک جسم کو اپنے سخت بازوؤں میں سہارا دیتے ہوئے، دونوں کے جسم رات کے تیز ٹھٹھرتے موسم سے لرز رہے تھے۔ ان کے قدموں تلے زمین گیلی اور شبنم سے سنی ہوئی تھی، جیسے خود زمین ان کے خوفناک رازوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی ہو۔

اچانک، بادلوں کے پردے سے بجلی کی ایک کرخت لکیر نمودار ہوئی، آسمان میں ایک لمحاتی روشنی پیدا ہوئی جس نے خطرناک سائے نمایاں کر دیے۔

ایز کنیل، جس کی آنکھوں میں عزم کی چمک تھی، نے تھوڑی دیر کے لیے توقف کیا، لیکن پھر آگے بڑھ گیا۔ اس کا جسم سردی میں تھرتھراتا تھا، لیکن خوف نے اس کے قدموں کو تیز کر دیا تھا۔

ان کے پیچھے، گیٹ کی دراڑ سے ایک مدھم سی آواز سنائی دی، اور اس کے ساتھ ہی گھر کے اندر سے ایک ڈریک اور اولیویا کی شکلیں ابھر آئیں۔ ان کے چہرے پریشانی میں ڈوبے ہوئے تھے، اور آنکھیں بے یقینی میں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔

ایز کنیل نے عیسیاہ کو اور مضبوطی سے اپنی گود میں جکڑ لیا، جیسے وہ اسے اس دنیا کی تمام مصیبتوں سے بچا لے گا۔

عقب سے، قاتلوں کی گونجتی ہوئی آوازیں سنی جاسکتی تھیں، جو زور دے رہے تھے کہ ان بچوں کو پکڑ لو۔ ایز کنیل کے دل کی دھڑکن اس تیز آواز سے ہم آہنگ ہو چکی تھی، لیکن وہ بے خوف، بجلی کی چمک سے رہنمائی لیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔

کچھ دیر بعد ایز کئیل کے عقب میں ایک دھماکہ ہوا۔ اس گھر کی عمارت کے پھٹنے کی آواز فضا میں گونجی، اور ہر طرف روشنی پھیل گئی۔

ان کے پیچھے گھر آگ کی لپیٹ میں تھا، شعلے آسمان تک بلند ہو رہے تھے۔ قاتلوں کی بے رحم چیخیں ان کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھیں، اور ڈریک اور اولیویا غصے میں چیختے ہوئے کہہ رہے تھے، ”ان دو کمینوں کو ڈھونڈو!“

دفعۃً ایک اور دھماکہ ہوا، مگر ایز کئیل نے پلٹ کر دیکھنے سے انکار کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں صرف ایک ہی مقصد تھا: اپنے بھائی، عیسیاہ کو بچانا۔ رات کی دھند اور اس کے بیچ میں ان کے قدم مدھم ہوتے جا رہے تھے، لیکن اس کا عزم پہاڑوں کی مانند اٹل تھا۔

ایز کئیل کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، مگر خوف یا درد کا احساس معدوم ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پیچھے مڑنے کا مطلب تھا ہار ماننا، اور ہار اس کے لغت میں نہیں تھی۔ ماحول کا شور، جلتے ہوئے گھر کی بدبو، اور قاتلوں کی گونجتی ہوئی آوازیں سب اس کے عزم کے سامنے بے معنی ہو چکی تھیں۔

جیسے ہی وہ ایک ویران راستے کے کنارے پہنچے، سامنے ایک کچرے کا ٹرک نظر آیا۔ ٹرک کا دروازہ آہستہ آہستہ بند ہو رہا تھا، اور ایز کئیل نے فوراً اپنا ارادہ پختہ کیا۔ قاتلوں کی گاڑیاں قریب آتی جا رہی تھیں، ان کی ہیڈ لائٹس نے دھند میں خوفناک سائے ڈالے۔ ایز کئیل نے آخری لمحے میں ٹرک کی طرف دوڑ لگائی، اس کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں۔

اس کے پیروں کو گھوڑے لگ گئے تھے، سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ سامنے کچرے کا ٹرک تھا، دروازہ دھیرے دھیرے اوپر ہوتا اور بند ہوتا جا رہا تھا۔

اس کی سانسیں اٹک رہی تھیں، مگر وقت کم تھا، گاڑیوں کا شور پیچھے سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ ان قاتلوں کے انجن کی گرج جیسے اس کی گردن کے بالکل پیچھے سنائی دے رہی تھی۔

ہر لمحہ قیمتی تھا۔ ایز کیئیل کی نظریں بار بار ٹرک کے دروازے پر اور پیچھے آتی گاڑیوں کی چمکتی ہیڈ لائٹس پر جا ٹکراتی تھیں۔ وقت ختم ہو رہا تھا۔ دروازہ بند ہونے سے پہلے وہ چھلانگ لگانا ضروری تھا۔

دفعۃً، گاڑیوں کی گڑ گڑاہٹ اور قریب آئی۔ قاتل پہنچ چکے تھے۔ ایز کیئیل نے ایک آخری بار سانس بھری، اسے اس نے پورے زور سے اسے کچرے کے ٹرک میں پھینک دیا۔

گاڑیاں اب بالکل پیچھے آگئی تھیں، ان کی ہیڈ لائٹس اندھیرے کو چیرتے ہوئے ایز کیئیل کی پشت پر جا پڑیں۔ لمحہ بہ لمحہ موت کا سایہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔

یکدم، جیسے وقت تھم گیا ہو۔ ایز کیئیل نے بھی چھلانگ لگائی، اور عین اس لمحے جب قاتلوں کی گاڑیاں نمودار ہوئیں، ٹرک کا دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہو گیا۔ اندھیرے میں چھپے، ٹرک کے پیچھے، وہ دونوں سانسیں روک کر خاموشی سے بیٹھے تھے۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس سیدھے بند دروازے پر پڑ رہی تھیں، جیسے کسی شکار کو تلاش کر رہی ہوں، مگر اب وہ ان کی پہنچ سے دور تھے۔

اندر کی بدبو ناقابل برداشت تھی؛ گلے سڑے کچرے اور کیڑوں کی آوازیں ان کے ارد گرد منڈلا رہی تھیں۔ ایز کئیل نے اپنے بھائی کو تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن اس کی اپنی حالت بھی خراب ہو رہی تھی۔

عیسیاہ کمزوری سے کھانسنے لگا، اس کے منہ سے الفاظ بمشکل نکلے، ”بھائی، مجھے سانس نہیں آرہی، مجھے الٹی آرہی ہے۔“

ایز کئیل نے خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کی، ”بس تھوڑی دیر اور، بھائی، برداشت کرو۔“

اسی لمحے کی گاڑی ٹرک کے عین پہلو میں آکھڑی ہوئی تھی۔ ڈرائیور، جو بھاگنے کی جلدی میں تھا، اچانک رک گیا۔

گاڑی کے بائیں جانب شیشہ نیچے سرکا، اور اندر سے ایک سرد لہجے میں آواز آئی، ”تم نے یہاں سے کسی بچے کو گزرتے دیکھا ہے؟“

ایز کئیل نے اس لمحے عیسیاہ کے منہ پر ہاتھ مضبوطی سے رکھ لیا، سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ خوف کی دبیز چادر ہر سمت پھیلی ہوئی تھی۔ ایز کئیل کا دل جیسے سینے میں رکنے کو تھا، اور کچرے کی متعفن بونے سانس لینا محال کر رکھا تھا۔

اس کے جسم پر کیڑے رینگنے کا احساس ہو رہا تھا، ہر چیز چیچھاہٹ سے لبریز تھی، جیسے زندگی نے اپنے آخری لمحے تک ان کے ساتھ وفانہ کرنے کی قسم کھالی ہو۔

دوسری جانب ڈرائیور نے کندھے بے نیازی سے اچکائے، ”نہیں، میں نے کچھ نہیں دیکھا۔“ قاتل کی آنکھوں میں شک کا سایہ گہرا ہو گیا۔ وہ ڈرائیور کو گھورنے لگا، جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کو ایک آخری نظر سے پرکھ رہا ہو۔

ایز کنیل کو نیچے کچرے کے ڈھیر میں دبے نرم، متعفن چیزوں کا بے ہودہ احساس ہو رہا تھا۔ اوپر سے مسلسل قے کرنے کا جی چاہ رہا تھا، مگر ہمت جواب دے چکی تھی۔ پسینے میں بھیگا ہوا وہ ہر لمحہ زندگی اور موت کی باریک سرحد پر لرز رہا تھا۔

پھر اچانک ڈرائیور کی آواز گونجی، ”آپ چاہیں تو ٹرک دیکھ لیں۔“ ایز کنیل کا دل جیسے سینے سے باہر نکلنے کو تھا۔ قاتل نے پل بھر کے لیے سر ہلایا، جیسے کسی اندرونی کشمکش میں مبتلا ہو۔ پھر، گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

گاڑی کے چلتے ہی ٹرک میں ایک زوردار گڑ گڑاہٹ ہوئی اور وہ بھی آگے بڑھا۔ ایز کنیل نے گہری، لرزتی ہوئی سانس لی، اور آہستہ سے عیسیاہ کے منہ سے ہاتھ ہٹایا۔ اس کے ہونٹ کانپتے ہوئے سرگوشی میں نکلے، ”عیسیاہ، سب ٹھیک ہے“ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔

ایز کئیل کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے عیسیاہ کو ہلایا، مگر وہ بے جان پڑا رہا۔ اندھیری رات کی بے رحمی میں، کچرے کے اس عفریت میں دبے، ایز کئیل کے آنکھوں میں خوف کا سمندر اٹھ آیا۔ آنسو اُس کے گالوں پر بہنے لگے، جیسے ہر قطرے میں اس کی آخری امید بھی رخصت ہو رہی تھی۔

رات کی پراسرار خاموشی میں، اُس کی بے بسی کی آواز کہیں گم ہو گئی، جیسے تقدیر نے ایک بار پھر اس سے اُس کا سب کچھ چھین لیا ہو۔

...°...

ڈپنگ گراؤنڈ کے جابرانہ اندھیرے میں، کوڑے کا ٹرک دھند میں لپٹا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ دھند اتنی گھنی تھی کہ اس کے پیچھے چھپی وحشت نمایاں ہونے سے قاصر تھی۔ آسمان پر بجلی کوند رہی تھی، بادلوں کی گرج فضا میں ایک عجیب دہشت کا احساس پھیلا رہی تھی۔

ٹرک نے تنگ، گھماؤ دار سڑک پر چلتے ہوئے کوڑے کے بڑے ڈھیروں کے درمیان اپنی جگہ بنائی۔ درختوں کی کھوکھلی شاخیں جیسے آسمان کی طرف ہاتھ پھیلاتی دکھائی دے رہی تھیں، اور دور ایک دھندلا سا سویڈش سائن بورڈ نظر آرہا تھا جس پر لکھا تھا ”کچرے کو جلا کر توانائی بڑھاؤ۔“

گیٹ ایک کرخت آواز کے ساتھ کھلا، اور ٹرک اندھیرے میں داخل ہوا۔ اندر کا منظر خوفناک تھا۔ دوسرے ٹرک پہلے ہی اپنے کام میں مصروف تھے، کوڑے کا ڈھیر مسلسل بڑھ رہا تھا۔

ایک کمینیکل لفٹ ٹرکوں سے کچرا اٹھا کر آگ کی طرف لے جا رہی تھی، جیسے یہ جگہ زمین نہیں، بلکہ جہنم کا ایک حصہ ہو۔

وہ ٹرک بھی اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا جس میں ایز کنیل اور عیسیاہ موجود تھے۔ جیسے ہی وہ ٹرک رکا، ایک لمحے کے لیے چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ ایز کنیل کی سانسیں تیز ہو گئیں، اس کا دل بے قابو دھڑکنے لگا۔

یہ آخری ٹرک تھا، اس کے بعد کوئی اور نہیں آنا تھا۔ چاروں طرف موت جیسی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جیسے کسی المناک انجام کا انتظار ہو۔ ایز کنیل اور عیسیاہ اس ٹرک کے پچھواڑے میں دبے بیٹھے تھے، ان کے دل خوف سے ساکت، اور سانسیں بے ترتیب تھیں۔

اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا، جیسے ہر طرف سے موت انہیں گھور رہی ہو۔

دفعاً، ٹرک کا پچھلا حصہ آہستہ آہستہ نیچے کی طرف جھکنے لگا۔ جیسے کوئی دیو ہیکل عفریت اپنی زہریلی زبان باہر نکال کر انہیں نگلنے کو تیار ہو۔

ایز کنیل کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی، ہر شے جیسے پل بھر میں رک سی گئی ہو۔ اس کے سامنے ٹرک کا پچھواڑا کھلا اور ایک گہری، سیاہ کھائی نمودار ہوئی۔ نیچے محض اندھیرا تھا، ایسا اندھیرا جو نہ ختم ہونے والا معلوم ہوتا تھا۔

ٹک ٹک... آہستہ آہستہ ٹرک پیچھے کو جھکتا جا رہا تھا۔ ایز کنیل کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی، جیسے ہر دھڑکن میں موت قریب آرہی ہو۔ پھر یکایک، ایک جھٹکا آیا اور دروازے پوری طرح کھل گئے۔ لمحہ بھر کے لیے ہر چیز ساکت ہوئی، وقت جیسے رک گیا تھا، اور پھر وہ دونوں نیچے اندھیرے کی کھائی میں گرنے لگے۔

ایز کنیل چیخ مارنا چاہتا تھا مگر خوف سے اس کی آواز تک نہ نکلی۔ اس کا جسم ہوا میں معلق تھا، اور نیچے وہ نہ ختم ہونے والی تاریکی انہیں نگلنے کو تیار تھی۔ ایز کنیل نے عیسیاہ کے بے جان جسم کو پکڑنے کی کوشش کی، مگر وہ دونوں بے قابو ہو کر تیزی سے نیچے گرنے لگے۔ چاروں طرف کی ہوا ان کے کانوں میں گونج رہی تھی، اور اندھیرا ہر شے کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔

یہ لمحہ جیسے ہزار سال کا تھا۔ ہر دھڑکن کے ساتھ موت قریب آتی جا رہی تھی۔

کوڑے کے ڈھیر میں ایز کنیل بے بس گر پڑا تھا، ارد گرد پھیلے گہرے اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اوپر سے چھت بند ہو چکی تھی اور ان کا ٹرک آخری منزل پر رک چکا تھا۔ یہ جگہ عجیب سی خاموشی اور خوف سے بھری ہوئی تھی، جہاں موت ہر طرف چھپی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایز کنیل کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، لیکن اب وہ اپنے بھائی، عیسیاہ کو ڈھونڈنے کے علاوہ کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔

اس کی سانسیں بے قابو ہو رہی تھیں، اور وہ کچرے میں ڈوبتے ہوئے ہر جگہ ہاتھ مارنے لگا۔ کوڑے کی بدبو، ہر چیز کی چیچھاہٹ اور سردی نے ماحول کو مزید خوفناک بنا دیا تھا۔ ”عیسیٰ!۔“ ایزکئیل کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دے رہی تھیں، مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ کچرے میں اس کے پاؤں بار بار پھسل رہے تھے، اور وہ گہرا دھنستا جا رہا تھا۔

پھر، دفعتاً، اندھیرے میں ایک دھندلی سی روشنی نمودار ہوئی۔ ایزکئیل نے چونک کر اُس روشنی کی طرف دیکھا، اور اس کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے تھم سا گیا۔

روشنی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی، اور جیسے ہی وہ قریب ہوئی، ایزکئیل نے عیسیٰ کو اُس روشنی میں دیکھا۔ وہ کچرے کے ڈھیر میں بے جان پڑا تھا۔

ایزکئیل کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے تیزی سے عیسیٰ کے قریب پہنچ کر اُسے اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا، ”عیسیٰ، اُٹھو!“ اس کی آواز لرز رہی تھی، اور اس کے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن جاگی تھی۔

لیکن جیسے ہی اُس نے عیسیٰ کو ہلایا، اُس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

ایزکئیل نے اچانک یہ محسوس کیا کہ وہ روشنی کوئی عام روشنی نہیں تھی۔ وہ نیچے سے آرہی تھی۔ اُس نے گردن اٹھا کر نیچے کی طرف دیکھا اور اُس کا دل لرز گیا۔ وہ روشنی دراصل بھڑکتی ہوئی آگ کی تھی۔ نیچے کوڑے کا ایک دکھتا ہوا گڑھا تھا، جہاں کوڑا آگ میں جلتا جا رہا تھا۔

اب ایز کنیل کو احساس ہوا کہ وہ ایک دوزخی سمندر کے کنارے کھڑے ہیں، جہاں نیچے جلتے ہوئے شعلے ان کو نکلنے کے لیے تیار تھے۔

اُس نے عیسیٰہ کو مضبوطی سے پکڑنے کی کوشش کی، لیکن عیسیٰہ اُس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ ”نہیں!“ ایز کنیل چیخا، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

دونوں نیچے کی طرف گرنے لگے، کوڑا اُن کے جسموں کے ساتھ ساتھ نیچے کی جانب بہتا جا رہا تھا۔ ایز کنیل نے ایک آخری بار اپنے بھائی کو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن اُس کا ہاتھ خالی رہ گیا۔

آگ کے شعلے تیز ہو رہے تھے، اور ہر طرف سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ ایز کنیل کی چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں، لیکن شعلوں کی گڑ گڑاہٹ ان پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔

وہ دونوں تیزی سے آگ کی طرف گر رہے تھے، اور چاروں طرف موت کی بو پھیل چکی تھی۔

آخری لمحے میں، ایز کنیل نے اپنے بھائی کا ہاتھ تھام لیا، لیکن یہ محض ایک پل کا لمس تھا۔ اس کے بعد، شعلے بلند ہو گئے، اور وہ دونوں کوڑے کے اس دہکتے سمندر میں گم ہو گئے۔

اور پھر یکدم ایک ایسی آواز آئی، جیسے کسی نے زنجیریں توڑ ڈالی ہوں، یا جیسے کسی شے نے بھاری سانس لی ہو۔ آگ کے شعلے بھڑک اٹھے، اور ان سے ایک خوفناک سی گڑ گڑاہٹ پیدا ہوئی۔

لمحہ بھر کے لیے فضا میں ایسی دہشت چھا گئی، جیسے کوئی انتہائی سنگین واقعہ پیش آچکا ہو۔

جلتے ہوئے کوڑے کی بھٹی سے ایک تیز دھواں اُٹھا، جس نے ہوا کو سیاہ کر دیا۔ دھوئیں کا وہ گہرا بادل اوپر کی طرف لپکا، جیسے خود زمین کی گہرائیوں سے کوئی منحوس ارواح آزاد ہو رہی ہو۔ ایز کنیل کی سانس جیسے رک سی گئی تھی، اور اُس لمحے ہر طرف موت کی بو، آگ کی تپش، اور دھوئیں کا گھٹن محسوس ہو رہا تھا۔

دھیرے دھیرے ہر طرف پھیلا ہوا اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔ شعلے مدھم مدھم ہو کر بجھنے لگے، اور اس کے بعد باقی رہ گیا تھا فقط ایک گہری، خوفناک خاموشی۔

...°...

یکدم ایز کنیل کی تیز، گھبرائی ہوئی سانسوں کی آواز سنائے کو چیر گئی۔ وہ ساکت اس کچرے پر پڑا تھا، آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں، اور اس کے ہاتھوں میں عیسیاہ کا بے جان جسم تھا۔ سامنے آگ کی لپٹیں بلند ہو رہی تھیں، جیسے کسی جہنم کے دہانے پر کھڑا ہو۔

ایز کنیل نے اپنے بھائی کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے سینے سے لگا لیا، اس کا دل جیسے سینے میں دھڑکنا بند ہو رہا تھا، مگر وہ ہمت نہیں ہار رہا تھا۔

ایز کنیل نے عیسیاہ کو اپنے سینے میں بھینچا، اور ایک گہری، کانپتی ہوئی سانس لی۔ عیسیاہ کی بے سدھ حالت نے اس کا دل چھلنی کر دیا تھا، لیکن اس کی محبت اور بھائی کے لیے خوف اسے ایک نئی طاقت دے رہا تھا۔

- ایک پل کے لیے اس نے اپنی آنکھیں بند کیں، جیسے ہمت مجتمع کر رہا ہو

یکدم ایز کنیل کی نظر دائیں جانب پڑی، جہاں لوہے کی زنگ آلود سیڑھیاں اندھیرے میں نمودار ہو رہی تھیں۔ وہ سیڑھیاں ایک اونچی جگہ کی طرف جا رہی تھیں، جہاں سے شاید باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ یہ ایک موقع تھا، ایک امید کی کرن۔

ایز کنیل نے عیسیاہ کو مضبوطی سے اپنی گود میں اٹھایا، اور آگے بڑھا۔ ہر قدم گویا زمین کے ٹوٹنے سے پہلے کا تھا، جیسے ہر لمحہ ایک نئے خطرے کا اعلان کر رہا ہو۔ کچرے کے ڈھیر اور بو کی چپچپاہٹ کے درمیان، ایز کنیل نے خود کو دھکیلتے ہوئے اس سیڑھی تک پہنچایا۔

اس نے عیسیاہ کو زمین پر نرمی سے رکھا اور خود تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اوپر پہنچ کر وہ عیسیاہ کے سینے پر دباؤ ڈالنے لگا، اس کا دل چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر دباؤ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سمندر اترتا جا رہا تھا، لیکن اس کی امید اب بھی زندہ تھی۔

پھر، معجزہ ہوا۔

عیسیاہ نے یکدم گہری سانس لی۔ ایزکئیل کا دل جیسے تھم گیا۔ ”عیسیاہ!“ اس کی چیخ خوشی اور غم کے درمیان گونجی۔ عیسیاہ کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ جیسے کسی لمبے خواب سے جاگ رہا ہو، اس کے چہرے پر تھکن اور حیرت کا امتزاج تھا۔

ایزکئیل نے اپنے بھائی کو گلے لگا لیا، آنسوؤں کے ساتھ ہچکیاں لیتے ہوئے، جیسے ایک طویل جدائی کے بعد دوبارہ ملا ہو۔ اس کے آنسو عیسیاہ کے چہرے پر گر رہے تھے، اور دونوں بھائی ایک دوسرے میں سمٹ گئے۔ ”تم ٹھیک ہو، عیسیاہ، تم ٹھیک ہو!“ ایزکئیل کی آواز لرزتی ہوئی تھی، مگر اس میں سکون تھا۔

عیسیاہ نے گہری سانس لی اور کمزور آواز میں پوچھا، ”بھائی، ہم کہاں ہیں؟“ اس کے لہجے میں حیرت اور خوف تھا، جیسے ابھی بھی وہ اس بھیانک تجربے سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔

ایزکئیل نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”ہم جہاں بھی ہیں، بھائی، ہم ٹھیک ہیں۔“ یہ الفاظ اس کے دل سے نکلے، جیسے اُس نے اپنے بھائی کو موت کے منہ سے واپس کھینچ لیا ہو۔

اس نے عیسیاہ کی پیشانی کو نرمی سے چوما، آنکھوں میں بھائی کی محبت کی گہرائی تھی۔ یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ مشین جو کچرے کو آگے بڑھا رہی تھی، اچانک معجزاتی طور پر رک چکی تھی، یہ اللہ کی قدرت تھی۔

یہ صرف مشین کا رکنا نہیں تھا، یہ اللہ کی رحمت تھی جو ان دونوں بھائیوں پر نازل ہوئی تھی۔

ایز کئیل کی سانسوں میں سردی کی شدت گھل چکی تھی، اور اس کا دل ابھی تک تیز دھڑک رہا تھا جیسے کسی غیبی قوت نے اس کی جان چھیننے کی کوشش کی ہو۔

عیسیاہ ابھی بھی اس کے قریب تھا، گہری سانسیں لیتا ہوا، جیسے موت کے دہانے سے واپس آیا ہو۔ ان کے پیچھے ایک اندھیرا اچھایا ہوا تھا، جس میں وہ خوفناک کھائی موجود تھی جہاں سے ابھی وہ بچے تھے۔

ہر قدم انہیں اس اندھیرے سے مزید دور لے جا رہا تھا، لیکن ان کے دل میں وہ تاریکی جمی ہوئی تھی، جیسے ابھی بھی تعاقب میں ہو۔

۔“عیسیاہ، ہمیں یہاں سے نکلنا ہے،” ایز کئیل نے دھیمی مگر پختہ آواز میں کہا۔

اس کے الفاظ میں ایک تھکن چھپی ہوئی تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں ایک نئی امید کا چراغ روشن ہو چکا تھا۔ عیسیاہ نے اپنے قدموں کو مدھم قدموں سے آگے بڑھایا، اپنے بھائی کے پیچھے چلتا رہا، جیسے وہ دونوں کسی اندھی دنیا سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

ان کے عقب میں اچانک ایک دھاتی گڑگڑاہٹ سنائی دی، اور مشین پھر سے چل پڑی۔ کوڑا آگ میں گرنے لگا، اور وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھنے لگے، جیسے پیچھے مڑنا موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہو۔

ایز کنیل نے عیسیاہ کا ہاتھ پکڑے رکھا، اور دھیرے دھیرے وہ دونوں اس اندھیرے میں غائب ہونے لگے، جیسے زمین نے انہیں نگل لیا ہو۔

جیسے ہی وہ کچھ آگے پہنچے، سامنے ایک مدھم سی روشنی نظر آنے لگی۔ یہ روشنی صبح صادق کی روشنی تھی، جو ان کے دلوں میں ایک امید کی کرن بن کر ابھر رہی تھی۔ وہ جگہ سنسان تھی، خاموشی نے اسے ایک پراسرار سا ماحول دیا تھا۔

دائیں جانب سے ایک ہلکی روشنی چھن رہی تھی جو باہر جانے کا راستہ تھا۔ ان کی سانسیں بھاری تھیں، اور قدم تھکے ہوئے، لیکن ان کے دلوں میں ایک نئی قوت جاگ رہی تھی۔

باہر نکلنے پر، سامنے ایک دھند چھائی ہوئی تھی، جس نے پرے کی دنیا کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ دھند نے ہر چیز کو دھندلا اور اسرار میں لپیٹ رکھا تھا، جیسے یہ دنیا ابھی کسی خواب سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہو۔ عیسیاہ نے سردی کی شدت محسوس کی، اور پیچھے مڑ کر اس خوفناک جگہ کی طرف دیکھا جہاں سے وہ ابھی ابھی نکلے تھے۔ ”بھائی، ایسا لگتا ہے کہ ہم اپنے پیچھے کوئی ڈراؤنا خواب چھوڑ آئے ہیں،“ عیسیاہ کی آواز میں خوف اور حیرانی کا ملا رنگ تھا۔

ایز کنیل نے اپنے قدموں کو زمین پر مضبوطی سے رکھتے ہوئے جواب دیا، ”ہاں، عیسیاہ، ایسا ہی ہے۔ لیکن یاد رکھو، ڈیڈ ہمیشہ کہتے تھے کہ ڈراؤنے خواب آخر کار ختم ہو جاتے ہیں۔“ اس کے چہرے پر ایک

ہلکی سی مسکان تھی، لیکن آنکھوں میں وہ تھکن اور اداسی نمایاں تھی، جوان پر گزری آزمائشوں کی نشانی تھی۔

جب وہ دونوں دھیرے دھیرے باہر نکلنے کے قریب پہنچے، تو ہوا میں سردی کا ایک شدید جھونکا آیا۔ ایزکئیل، جس نے سلیپنگ سوٹ پہنا ہوا تھا، اچانک رک گیا۔

اس کے چہرے پر تھکن اور سردی کی شدت جھلک رہی تھی، اور اس کی سانسوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ عیسیاہ نے اپنے بھائی کی حالت دیکھتے ہوئے تشویش کے ساتھ کہا، ”بھائی، آپ کانپ رہے ہیں میرا سویٹر پہن لیں۔“

ایزکئیل نے کمزوری کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک تسلی بخش مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”نہیں، میں ٹھیک ہوں، عیسیاہ۔ لیکن پیشکش کے لیے شکریہ۔“

ایزکئیل کو بخوبی ادراک تھا کہ عیسیاہ کی سویٹر اس کے وجود پر موزوں نہیں آئے گی، مگر اس حقیقت کو زبان پر لا کر وہ اُس کے دل پر کاری ضرب نہیں لگانا چاہتا تھا۔ وہ محض خاموشی سے مسکرایا، جیسے اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپے بے شمار جذبات کو دفن کرنے کا جتن کر رہا ہو۔

مگر عیسیاہ بھی عیسیاہ تھا وہ ایزکئیل کا بھائی تھا وہ باضد تھا۔

اس نے اپنی آنکھوں میں سمجھداری کی جھلک کے ساتھ اصرار کیا، ”بھائی، دکھاوانہ کرو۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ میرا سویٹر پہن لو۔“

وہ گویا اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑا ہو چکا تھا، اس کی باتوں میں ایک بڑی ذمہ داری اور پیار جھلک رہا تھا، حالانکہ وہ ابھی پانچ سال کا بچہ ہی تھا۔

ایز کنیل کی نظر اچانک سامنے والی دیوار پر گئی، جس پر کچھ پرانے ڈوڈلز اور پینٹنگز بنے تھے۔ وہاں اتفاق سے ایک جیکٹ لٹک رہی تھی، جو عمر کے ساتھ تھوڑی بوسیدہ ہو چکی تھی، لیکن ابھی بھی موٹی اور گرم تھی۔

ایز کنیل نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا، اور پھر بغیر کچھ کہے تیزی سے اس جیکٹ کو پکڑ لیا۔ عیسیاہ نے معصومیت کے ساتھ مسکرا کر کہا، ”دیکھو، یہ بالکل فٹ بیٹھتی ہے۔ اب اسے پہن لو، بھائی۔“

ایز کنیل نے خاموشی سے جیکٹ پہن لی، جیسے وہ سردی اور ان خوفناک یادوں سے بچنے کے لیے خود کو ڈھال رہا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ اب ان پر یہ وقت آیا ہے کہ جو ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتے تھے، آج خود مدد کے طلبگار ہو چکے ہیں۔

ایز کنیل نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے عیسیاہ کی طرف دیکھا اور نرم لہجے میں کہا، ”اب اس دھند سے آگے جو کچھ بھی ہے، ہم مل کر اس کا سامنا کریں گے، عیسیاہ۔ ہماری کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔“

دونوں کے منہ سے دھواں نکل رہا تھا، جیسے ان کی باتوں میں چھپے درد کو فضا میں بکھیر رہا ہو۔ عیسیٰ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، ”ہاں، ہم مل کر اس کا سامنا کریں گے۔“

اس کے ساتھ ہی، وہ دونوں دھیرے دھیرے دھند میں داخل ہو گئے۔ دھند نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا، اور وہ دونوں جیسے اس دنیا سے جدا ہو کر ایک نئے باب کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے قدموں کی بازگشت ابھرتی اور مدھم ہوتی گئی، اوریوں، ان کی کہانی ایک نئے موڑ کی طرف بڑھ گئی۔

...°...

ایز کئیل اور عیسیٰ کی جسمانی کیفیت اس پبلک ٹوائٹ کی گندگی میں ڈھکی ہوئی تھی جس کا استعمال وہ ابھی کر چکے تھے۔

بدبو اور کھجلی نے ان کے جسموں کو ناگواری کی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ لیکن ایز کئیل کا ذہن اپنی چابکدستی میں ہمیشہ سے ماہر تھا، اور اس مشکل کا حل بھی اس نے جلدی نکال لیا۔

ایک تنگ و تاریک گلی کے کونے میں موجود دکان پر ایز کئیل نے بڑی ہوشیاری سے صابن کی ٹکیہ چوری کر لی۔ گو کہ اس صابن کی معمولی سی خوشبو ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی، لیکن یہ ان کی مجبوریوں اور ضرورتوں کے درمیان ایز کئیل کی چابکدستی اور عقل مندی کی علامت تھی۔

ایز کنیل کو معلوم تھا کہ کہاں وہ دونوں جسمانی صفائی حاصل کر سکتے تھے، اور وہ بے فکری سے ایک پل کے نیچے جا پہنچے جہاں گاڑیاں اوپر سے گڑ گڑا رہی تھیں، اور نیچے ایک جھیل، جس کا پانی سردی کی آغوش میں جمود کا شکار تھا، ان کا انتظار کر رہی تھی۔

پل کے نیچے یہ جھیل گہنے درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی تھی، گویا یہ دنیا سے الگ ایک محفوظ پناہ گاہ ہو۔ دونوں بھائیوں نے سخت سردی کے باوجود جھیل کے پانی میں کودنے کی جرات کی اور اپنے جسم سے جی ہوئی میل کچیل کو دھو ڈالا۔

سرد پانی نے ان کے جسموں کو سن کر دیا تھا، لیکن اس جمود میں بھی ایک طرح کی آزادی پوشیدہ تھی، ایک طرح کی طہارت۔

جھیل سے نکلتے وقت دونوں کا حال بگڑ چکا تھا، ان کے کپڑے بھیگ چکے تھے اور سردی سے ان کے جسم کانپ رہے تھے۔

جیسے ہی وہ درختوں کے پیچھے چھپے، انہوں نے تیزی سے چوری شدہ کپڑے پہن لیے۔

لیکن کپڑوں کی نرمی بھی انہیں مکمل طور پر سردی سے بچانے میں ناکام رہی، اور سرد ہوا کے تیز جھونکے ان کے جسموں کو جھنجھوڑ رہے تھے۔

”عیسیاہ نے کانپتے جسم کے ساتھ ایز کنیل سے کہا، ”بھائی، بہت ٹھنڈ ہے۔“

ایز کنیل کے وجود میں بھی سردی نے سرایت کر لی تھی۔ وہ خاموشی سے عیسیاہ کا ہاتھ تھام کر چلنے لگا۔

عیسیاہ کا ہاتھ برف کی مانند سرد تھا، مگر ایز کنیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر کیا کہتا، جب وہ خود کسی سوال کا جواب نہیں جانتا تھا۔

دونوں اُس سنسان، جنگل نما مقام پر بے مقصد گھومتے رہے، جہاں عقب میں ایک قدیم پل کے اوپر سے گاڑیاں اپنی دھندلی سی روشنیوں کے ساتھ گزرتی جاتی تھیں۔ درختوں کے سروں پر سرد ہوانے دستک دی تھی اور ہر شے پر خزاں کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔

چلتے چلتے، اُن کی نگاہیں اب ایک خستہ حال عمارت پر جا ٹکیں۔ عمارت کی کھڑکیاں شکستہ تھیں، اور ان میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا، جو جیسے انہیں اپنی جانب کھینچ رہا ہو۔ دیواروں پر بے ربط ڈوڈلز اور مبہم تحریریں ثبت تھیں، جو اُن لوگوں کی داستانیں سناتی تھیں جو اس ویران جگہ کو وقتی پناہ تصور کرتے تھے۔

ایز کنیل کی نگاہ ایک شکستہ کھڑکی پر جار کی، جس میں سے دھواں اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو رہا تھا، لیکن اُس کا دھیان جلد ہی وہاں جمع ہجوم کی طرف منتقل ہو گیا، جو ایک زنگ آلود ٹین ڈرم کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے، جس کے اندر مدھم آگ جل رہی تھی۔ وہ لوگ، جن کے لباس بوسیدہ اور جسم مفلسی کی چغلی کھا رہے تھے، اُس آگ کی حدت میں عارضی تسلی تلاش کر رہے تھے۔

ایز کنیل نے ایک گہری سانس لی اور تمام حوصلہ مجتمع کر کے عیسیاہ کو ساتھ لے کر اس پر اسرار جگہ کے اندر قدم رکھ دیا۔

ایک بچہ، جو بظاہر انہی میں سے تھا، نے ایز کنیل اور عیسیاہ کی طرف متجسس نظروں سے دیکھا۔ عیسیاہ خوف سے ایز کنیل کے قریب ہو گیا۔

ایک بوڑھا آدمی، جس کے چہرے پر زندگی کی سختیوں کے نقوش واضح تھے، نے نرمی سے کہا، ”ڈرومت، آؤ، آگ کے پاس کھڑے ہو جاؤ اور خود کو گرم کرو۔“

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اور پھر آہستہ آہستہ آگ کی طرف بڑھے۔ ایز کنیل نے اپنے ہاتھ ٹین کے ڈرم کے قریب رکھے تاکہ اس کی گرمی کو محسوس کر سکے، جبکہ عیسیاہ کو اپنی گود میں اٹھالیا تاکہ اسے بھی گرمی پہنچا سکے۔

آگ کے شعلے دھیرے دھیرے ان کے بدن کی سردی کو دور کر رہے تھے، اور ان کے دل میں ایک لمحاتی سکون پیدا کر رہے تھے۔ اس دوران ایک اور بچہ، جو قریب ہی کھڑا تھا، نے ایز کئیل سے سوال کیا، ”کیا تم روم سے ہو؟“ اس نے سویڈش میں سوال کیا جو ایز کئیل نے نفی میں سر ہلایا۔

اس سوال نے رومانیہ سے تعلق رکھنے والے روم بھکاریوں کی جانب اشارہ کیا، جو سویڈن میں اکثر دکھائی دیتے تھے اور تین ماہ تک بغیر ویزا قیام کر سکتے تھے۔

ایک اور بوڑھا آدمی، جس نے انہیں آگ کے پاس کھڑے ہونے کی دعوت دی تھی، ان کے نئے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے بولا، ”تم لوگ بھکاری ہو۔“

ایز کئیل نے سخت لہجے میں کہا، ”ہم بھکاری نہیں ہیں۔“

بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا، ”شاید، لیکن ہم چوری تو کرتے ہیں، نہیں؟“

ایز کئیل نے اپنے لہجے میں مضبوطی لاتے ہوئے کہا، ”ہم نے وہ ہی کیا جو ضروری تھا۔“

بوڑھا آدمی ہنس پڑا، ”بھیک مانگنا بھی ضروری ہی ہوتا ہے۔“

ایز کئیل نے جواب میں کہا، ”بعض لوگ تب بھیک مانگتے ہیں جب وہ محنت کیے بغیر چیزیں حاصل کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔“

یہ مختصر مکالمہ ان کی زندگی کی مشکلات کا آئینہ دار تھا۔ آگ، جو کبھی خطرے کا پیش خیمہ سمجھی جاتی تھی، اب ان کی زندگی میں تسلی اور گرمی کا ذریعہ بن چکی تھی۔ شعلوں کی روشنی میں ان کے چہرے دمک رہے تھے، اور ان کی باتوں میں سردیوں کے دنوں کی تلخی کو کچھ دیر کے لیے بھلا دیا گیا تھا۔

ایز کنیل نے دھیرے دھیرے کچھ ٹہنیاں اور خشک پتے اکٹھے کیے اور انہیں آگ میں ڈال دیا۔ بھوک ان دونوں کو چمٹ چکی تھی، اور درد ان کی جسمانی اور ذہنی تھکن کو اور زیادہ واضح کر رہا تھا۔ ایز کنیل نے ایک ماچس کی تیلی کو جلایا تو ایک آدمی قریب آیا اور اپنی بھکاریوں کی ٹیم کو حکم دیتے بولا، ”چلو، یہاں سے نکلتے ہیں۔“ اس کے الفاظ مہمردی اور عملیت کا ملا جلارنگ تھا۔

بوڑھا آدمی، جس نے ایز کنیل اور عیسیاہ کو آگ کی طرف بلایا تھا، بولا، ”تم دونوں بہت چھوٹے ہو، اور محنت ابھی تمہارے بس کی بات نہیں۔ دنیا ظالم ہے، یہ تمہیں مار دے گی۔“

وہ انہیں پیروی کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ ایز کنیل نے عیسیاہ کی طرف فکر مند نگاہ ڈالی، جو بھوک اور مشکلات کے اثرات سے بخوبی واقف تھا۔

کچھ لمحے کے لیے ہچکچاتے ہوئے، ایز کنیل اس شخص کے پیچھے ہو لیا، اور عیسیاہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رکھا۔

راستے میں وہ شخص انہیں دنیا کی سختیوں کے بارے میں بتاتا رہا، اور ایز کنیل کے ذہن میں ان کے حالیہ مشکلات اور مستقبل کی غیر یقینی صورتحال کے خیالات ابھرتے رہے۔ ہر قدم ان کے لیے ایک نئے چیلنج کا سامنا تھا، اور ایز کنیل کے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ مزید بھاری ہو رہا تھا۔

...°...

ڈروٹننگاٹن۔

(Drottningatan)

ایک طویل اور مشہور گلی ہے جو سٹاک ہوم کے دل میں اپنی تاریخ اور موجودہ زندگی کے امتزاج کو بُنتی ہے۔

یہ گلی اپنے آغاز سے ہی شاہی شان و شوکت کا اظہار کرتی ہے، جس کا نام مناسب طور پر ملکہ کرسٹینا کے اعزاز میں رکھا گیا ہے، جنہوں نے 1632 سے 1654 تک سویڈن پر حکمرانی کی۔

اس تاریخی گلی کی ابتدا شاہی پل ریکسبرون

(Riksbron)

سے ہوتی ہے، جو نورسٹروم۔

(Norrström)

کے پُر سکون پانیوں پر ایک دلکش منظر پیش کرتا ہے، اور یہ گلی شہر کے ایک مشہور علاقے نوررلم (Norrmalm) میں جاتی ہے۔

ڈروٹنگاٹن کے موچی پتھروں پر چلتے ہوئے، کوئی بھی اس کی تاریخی و معاصر ورثے کو محسوس کر سکتا ہے۔

یہ گلی ایک زندہ کرچ کی مانند ہے، جہاں ماضی کی گونج اور موجودہ وقت کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔ گلی کے دونوں اطراف پر 17 ویں اور 18 ویں صدی کی عمارتیں جدید شیشے اور اسٹیل سے مزین اسٹور فرنٹس کے ساتھ ہم آہنگ ہیں، ایک ایسا تضاد جو اس شہر کے ارتقاء کی نشانی ہے۔

جیسے ہی ایزکئیل اور ایسعیہ ڈروٹنگاٹن کی بھیڑ میں داخل ہوئے، ان کے قدموں کے نیچے موچی پتھر ماضی کی یادیں تازہ کر رہے تھے، جبکہ ارد گرد کے جدید سٹورز اور کیفے زندگی کے تسلسل کا مظہر تھے۔

یہ ایک شام کا وقت تھا اور گلی بھکاریوں، دکانداروں، اور سیاحوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایزکئیل کے ذہن میں اس مقام کی تاریخی اہمیت ضرور ہوگی، لیکن اس لمحے میں اس کے لیے یہ گلی محض بقا کا ایک ذریعہ بن چکی تھی۔

وہ اور اس کا چھوٹا بھائی عیسیاہ دو دن سے بھوکے تھے، اور ان کے پاس پیسے ختم ہو چکے تھے۔

ایز کنیل کو علم تھا کہ انہیں کسی طرح سے زندہ رہنے کے لیے کچھ کرنا ہو گا۔

اور راستہ صرف بھیک مانگنا تھا۔

وہ دونوں بھائی جو کبھی، جو کبھی آسائشوں میں پلنے والے بچے تھے، آج ڈروٹنگاٹن کی مصروف سڑک کے کنارے بھیک مانگنے پر مجبور ہو چکے تھے۔

کبھی وہ وقت تھا جب ان کے ارد گرد زندگی بھر پور اور خوشحال تھی، لیکن وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ وقت کی خاصیت ہی یہی ہے کہ یہ انسان کو ایسی جگہوں پر لے آتا ہے جہاں وہ کبھی خود کو سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ جو کبھی شاہانہ دسترخوان پر بیٹھتے تھے، آج سڑک کے کنارے، راگیروں کے رحم و کرم پر چھوڑے گئے تھے۔

ایز کنیل زمین پر بیٹھا، اپنی گود میں عیسیاہ کو تھامے، ہاتھ میں چند بے وقعت سکے پکڑے، لوگوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک گہری اداسی تھی، جیسے وقت نے اس سے سب کچھ چھین لیا ہو۔ آس پاس سے گزرنے والے لوگ اکثر نظر انداز کر دیتے، کچھ رحم کی نگاہ ڈالتے، لیکن زیادہ تر اپنی دنیا میں مصروف تھے، ان دونوں کی حالت سے لا تعلق۔

”Hjälp lite“

(-“کچھ مدد کریں،”-)

ایز کنیل نے دھیمے اور تھکے ہوئے لہجے میں راگیروں سے التجا کی۔ ہر بار اس کے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن جاگتی، شاید کوئی رک جائے، شاید کوئی ان کے لیے کچھ کر دے۔

لیکن اکثر لوگ سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ جاتے، جیسے وہ یہاں موجود ہی نہ ہوں۔

یہ ہی وہ لمحہ تھا جب ایز کنیل نے دل میں عہد کیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح، اس دنیا میں اپنا اور اپنے بھائی کا وجود برقرار رکھے گا، چاہے حالات کتنے ہی ظالم کیوں نہ ہوں۔

کئی گھنٹے یوں ہی گزر گئے۔ دونوں بچے بھوکے تھے، سردی ان کے جسموں میں سرایت کر رہی تھی۔ ایز کنیل نے جیب میں موجود وہ چند سکے نکالے جو انہیں دن بھر کی بھیک سے ملے تھے۔ اسے علم تھا کہ یہ بہت کم ہیں، لیکن شاید اتنے ہوں کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے لیے کچھ کھانے کا بندوبست کر سکے۔ وہ قریب ہی موجود ایک بیکری کی طرف بڑھا۔

بیکری کی خوشبو ایز کنیل کے نھنوں میں بس گئی، لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ یہاں کچھ زیادہ نہیں خرید سکتا۔ اس نے بیکری کے مالک سے درخواست کی، اور جو تھوڑے بہت سکے اس کے پاس تھے، انہیں کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ بدلے میں، اس نے انہیں ایک چھوٹی سی سویڈش روٹی دی۔

ایز کنیل نے وہ روٹی عیسیاہ کو دی، لیکن عیسیاہ جانتا تھا کہ اس کا بڑا بھائی بھی بھوکا ہے۔ اس نے روٹی کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور آدھا حصہ ایز کنیل کو پیش کرتے ہوئے کہا

”یہ لیں کھالیں بھائی“

ایز کنیل نے اپنے بھائی کی اس محبت کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے پیار سے چومتے ہوئے کہا:-

”شکریہ میرے پیارے بھائی“

دونوں نے مل کر روٹی کھائی، لیکن اس کے بعد انہیں یہ احساس ہوا کہ آگے بھی مشکلات کا سمندر ان کا انتظار کر رہا ہے۔ ڈروٹنگاٹن کے ارد گرد کی چمکتی ہوئی روشنیوں اور پرہجوم بازاروں کے درمیان، وہ خود کو دنیا سے بے تعلق محسوس کر رہے تھے۔

ایز کنیل کے دل میں اپنے چھوٹے بھائی کی حفاظت کی خواہش تھی، اور اس کا ذہن اپنی اور اس کی بقا کے لیے پریشان تھا۔

جب وہ آگے بڑھے تو عیسیاہ نے معصومانہ سوال کیا۔

”بھائی، ہم پولیس یا کسی اور کے پاس کیوں نہیں جا رہے؟“

ایز کنیل نے گہری سانس لی اور دھیمے لہجے میں جواب دیا

۔ ”پولیس ہمارے ساتھ نہیں ہے، عیسیاہ۔ اگر ہم ان کے پاس گئے تو وہ ہمیں پکڑ لیں گے، اور میں ڈرتا ہوں کہ وہ ہمیں چھوڑیں گے بھی نہیں۔ ”۔

پھر وہ دل میں بولا ”اور ہمارا انجام ہمارے خاندان والوں کے طرح ہو جائے گا۔“

عیسیاہ نے مزید کہا

۔ ”بھائی، ہم کب تک ایسے ہی رہیں گے؟ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ کاش ہم ماما اور پاپا کے ساتھ ہوتے۔“۔
ایز کنیل نے اپنے بھائی کی بات سن کر اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہرا عزم تھا، اور ایک توقف کے بعد اس نے پختہ یقین سے کہا۔

”جو ہمیں اس حال تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں، وہ جلد اپنی سزا بھگتیں گے۔“

ایز کنیل نے عیسیاہ کے کندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا، گویا اسے تسلی دے رہا ہو، اور خاموشی سے اسے اپنے ساتھ آگے لے جانے لگا۔ چلتے چلتے، ارد گرد کا بغور جائزہ لیتے ہوئے، ایز کنیل کی نظر ایک دفعہ پھر کونے میں موجود نیم تاریک گوشے پر جا ٹھہری۔

دھندلی روشنیوں میں بھی وہ انہیں پہچان چکا تھا۔ باہر وہ بوڑھا جس نے ان کی بھیک مانگنے میں رہنمائی کی تھی اپنے ساتھی کے ساتھ کسی گہرے مکالمے میں مصروف تھا، دونوں کے لب و لہجے میں پراسراریت کی جھلک تھی، جو ایز کنیل کے ذہن میں الجھن پیدا کر رہی تھی۔

بھیڑ میں سے چھپتے چھپاتے، ایز کنیل عیسیاہ کو اپنے ساتھ لیے خاموشی سے آگے بڑھ رہا تھا تاکہ وہ بوڑھا شخص اسے نہ دیکھ سکے۔ اُن کے اور بار کے درمیان اب ایک دیوار حائل تھی، دیوار کے اُس پار اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

عقب میں کوڑے کے ڈرم قطار میں کھڑے تھے، جو اُس تاریک اور ویران ماحول میں مزید خوفناک سایے ڈال رہے تھے۔

ایز کنیل دیوار کی اوٹ میں محتاط انداز میں دبک گیا۔ دیوار گھومتی ہوئی تھی، اس کے خم سے بوڑھے آدمی اور اس کے ساتھی کا مبہم نظارہ ہو رہا تھا۔

بار کی مدھم روشنیوں میں ان کے چہرے جزوی طور پر نمایاں ہو رہے تھے، اور بوڑھے آدمی کی آواز مدھم سی گونج رہی تھی، جیسے کوئی بھیانک راز افشا کر رہا ہو۔

ایز کنیل نے چونک کر سنا، ”ہم ان دونوں بچوں کے اعضاء نکال کر بیچ سکتے ہیں۔“ یہ جملہ ایز کنیل کے کانوں میں گویا کسی بم کی طرح پھٹا، اور اُس کے وجود میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

ایز کنیل نے جلدی سے عیسیاہ کو ساتھ لیا اور موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے فرار کی راہ اپنائی۔ باہر نیون لائٹس کی چمک اُسے تعاقب کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، اور بار کی طرف سے جھلملاتی ایل ای ڈی سکرین کی روشنی اُس کے دل میں مزید اضطراب پیدا کر رہی تھی۔

وہ ایک بے رحم اور ناقابل معافی شہر کی وحشتوں میں گھر چکے تھے۔

ایز کنیل اور عیسیاہ لوگوں کے ہجوم میں دبے قدموں سے آگے بڑھتے گئے، ہر قدم کے ساتھ شہر کی نبض تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اُن کی بے ترتیبی میں اچانک اُس وقت خلل پڑا جب سیاہ طوفانی بادل اُن کے سروں پر منڈلانے لگے، فضا میں ایک منحوس خاموشی طاری ہو گئی۔

جب وہ چوک میں پہنچے، تو اُس کے وسط میں ایک فوارہ تھا، جہاں بارش سے پناہ مانگتے لوگ عارضی طور پر جمع تھے۔

بارش کے قطروں نے فوارے کے کناروں پر چھلکنا شروع کر دیا، اور ایز کنیل کی نگاہیں اتفاقاً ایک آشنا چہرے پر جا رکیں۔ وہاں، ہجوم کے درمیان ڈریک کھڑا تھا، وہ ہی شخص جو ان کے خاندان کی تباہی کا ذمہ دار تھا۔

ڈریک ایک پولیس افسر سے باتوں میں مشغول تھا، اور ایز کنیل کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ اُس کے چہرے کا رنگ خوف کے عالم میں گویا بارش کے ساتھ بہہ رہا تھا، جیسے پانی کے ساتھ اُس کا سارا وجود تحلیل ہو رہا ہو۔

اس غیر یقینی اور خوف زدہ ماحول کے بیچ ایز کنیل کے دل میں ایک بے چینی نے انگڑائی لی، اُس کی جبلتیں اسے خطرے سے آگاہ کر رہی تھیں۔

وہ لمحہ بہ لمحہ پیچھے ہٹنے پر آمادہ تھا۔ اُس کی نظریں غیر ارادی طور پر پلٹ کر اپنے کندھے کے پار پڑیں اور اُس بوڑھے شخص اور اس کے ساتھی کے سیاہ سایوں کو دیکھا، جن کے چہروں پر مکارانہ مسکراہٹیں پھیلی تھیں۔

بار کے قریب خمیدہ دیوار کے پیچھے چھپے ہوئے، وہ کسی گہری اور مذموم سازش میں مصروف تھے۔ ان کی دھیمی آوازیں کانوں میں سرسراتی ہوئیں بن کر گونج رہی تھیں، اور اُن کے بدنیتی سے بھرپور منصوبے کی جھلکیاں، جسمانی اعضا کی غیر قانونی تجارت، ایز کنیل کے کانوں میں ایک سفاک راگ کی طرح بج رہی تھیں۔

بارش کی رفتار تیز ہو گئی، اور ساتھ ہی ایز کنیل کے دل کی دھڑکن بھی بے قابو ہونے لگی۔ اُس کے ذہن میں ہنگامہ برپا تھا—کیا ٹھہرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہو گا یا بھاگنے میں کوئی عافیت ملے گی؟ عین اُسی وقت، جب ڈریک کی نظروں نے ہجوم میں اُس کی تلاش شروع کی، ایز کنیل نے تیز ہوشیاری سے ایک فیصلہ کیا اور بھیڑ میں چھتریوں اور اجنبی چہروں کے درمیان غائب ہو گیا، جیسے کوئی سایہ پگھل کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

بوڑھے شخص اور اس کا ساتھی اپنی گفتگو میں مگن رہے، کسی کو بھی احساس نہیں ہوا کہ ان کی نظروں سے بچ کر کوئی فرار ہو چکا ہے۔

ان کے چہروں پر پھیلا ہوا اسرار، سرد ہوا میں مزید دہشت کا احساس بھر رہا تھا، جیسے ہوا خود ان کی مذموم سازشوں کا گواہ ہو۔

اس لمحہ جان لیوا خاموشی میں، جہاں ماضی اور حال کے دھندلے خاکے آپس میں گھل مل گئے، انتقام اور بقا کی جنگ نے اس بارش سے بھیگے شہر میں ایک تلخ کہانی بُن دی۔

ایز کنیل اور عیسیاہ نے ایک ویران گوشے میں پناہ لی، دوریستورانوں کے بیچ کی تنگ گلی میں، جو طوفان کے بے رحم تھپیڑوں سے بچانے کے لیے گویا خاموش سپاہی بنے ہوئے تھے۔ بارش کے بے قابو قطروں نے آسمان کو گویا چیر ڈالا تھا، اور ہر بوند زمین پر اپنے ساتھ ہوا کے شور و غل میں شدت لا رہی تھی، کہیں دور بجلی کے کوندوں نے اپنی گرج کا اضافہ کر دیا تھا۔

دو عمارتوں کے بیچ یہ تنگ اور نیم تاریک جگہ ایک عارضی پناہ گاہ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اوپر لوہے کی چھت طوفان کی بے رحم قوتوں سے لڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ یہ کمزور ڈھال بارش کی بوندوں کے خلاف گویا فطرت کی سختیوں کے سامنے شکست تسلیم کیے ہوئے تھی۔

وہاں ایک پرانا اور بوسیدہ کوڑے کا ڈرم، اس غیر مانوس تنہائی کا واحد ساتھی تھا، جو اس برباد کونے کی ویرانی میں کھڑا تھا۔

سرڑکیں، جو کبھی ہنگامہ خیز ہوا کرتی تھیں، اب ویران اور بھولی بسری ہو چکی تھیں، اپنی وحشت میں مزید گہرائی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ سماج جو کبھی رنگین تفریح میں غرق تھا، اب اس وحشت ناک سکوت کے مقابل ایک خوفناک تماشہ پیش کر رہا تھا۔

ایز کنیل اور عیسیاہ سردی اور خوف کے بوجھ تلے لرز رہے تھے۔ عیسیاہ کے آنسو بارش کی بوندوں میں مدغم ہو چکے تھے، جیسے دکھ کی کوئی خاموش کہانی اُن آنسوؤں کے ساتھ بہہ رہی ہو۔

اُس کی لرزتی ہوئی آواز، لوہے کی چھت پر پڑتی بارش کی بوندوں کے شور میں دب کر کہنے لگی، ”میں نہیں رہنا چاہتا، مجھے موم ڈیڈ اور سسٹر کے پاس جانا ہے۔“

ایز کنیل نے اُس کے شانے پر سختی سے ہاتھ رکھا، جیسے اُسے اس بے رحم حقیقت سے بچانے کی کوشش کر رہا ہو جس میں وہ دونوں پھنسے ہوئے تھے۔ ”ایسا مت کہو،“ ایز کنیل نے مدہم لہجے میں کہا، لیکن اُس کے الفاظ بارش میں کھو گئے۔

اُس کی اپنی سانسیں سرد ہوا میں بھاپ کی صورت میں نمودار ہو رہی تھیں، اور عیسیاہ کی کپکپاہٹ نے ایک اور سوال جنم دیا، ”بھائی، اتنی سردی ہے، میں کیسے برداشت کروں گا؟“۔

دونوں کے چہروں پر پھیلی زردی، اُن کے گرد پھیلے ٹھنڈے اور بھگے ماحول سے ہم آہنگ ہو کر ناامیدی کی ایک دلخراش تصویر بن گئی تھی۔ بارش اور طوفان کی اندھیری آندھیوں کے درمیان، اس مختصر پناہ گاہ میں ایز کنیل اور عیسیاہ ایک دوسرے کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے، دور و حیل جو اس طوفان کی بھری ہوئی

موجوں کے درمیان کسی گوشہ اُمن کی متلاشی تھیں۔ اُن کی کمزوری اور بے بسی اس طوفان کے دل میں کھلی ہوئی تھی، اور شاید اس جنگل نما شہر میں اُن کا واحد ہتھیار، ان کا باہمی رشتہ تھا۔

...°...

صبح کی ٹھنڈی روشنی نے آسمان پر ایک نرم گلابی چھاپ چھوڑ دی تھی، جس کی ہلکی گرمائش ایز کنیل اور عیسیاہ کے ماند پڑے وجودوں کو چھوتی ہوئی گزری۔

دونوں بھائی ایک دوسرے کے کندھوں پر ٹیک لگائے، ایک مختصر نیند کی مہلت میں سکون کی تلاش کر رہے تھے۔ جیسے ہی افق پر صبح کے سائے پھیلے، ایک عارضی سکون نے ان کے تھکے ہوئے جسموں کو لپیٹ لیا۔

لیکن یہ پُر سکون لمحہ بھونکنے والے کتے کی زہریلی آواز سے بکھر گیا۔ ایز کنیل خوف کے جھٹکے سے نیند سے جاگ اٹھا، اُس کے چہرے پر ہر اس چھا گیا۔ اُس کی آنکھیں غیر یقینی اور خوف سے پھیل گئیں جب اُس نے سامنے ایک بھونکنے والے کتے کو دیکھا جو عیسیاہ کے جوتوں پر دانت گاڑ رہا تھا۔

ایز کنیل کا دل زور سے دھڑکنے لگا، ایک لمحے کے لیے خوف نے اُسے جکڑ لیا، لیکن فوراً ہی اُس کے اندر کا بھائی جاگ اٹھا۔ عیسیاہ کو بچانے کی بے تابی میں اُس نے زمین سے ایک بڑا پتھر اٹھایا اور بے دریغ غصے میں کتے کی آنکھ کو نشانہ بنایا۔

پتھر کی ضرب کتے کے چہرے پر زور سے پڑی، اور ایک لمحے کے لیے وہ دھاڑتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔
کتے کی چیخیں ہوا میں پھیل گئیں، اور وہ لنگڑاتا ہوا صبح کی خاموشی میں گم ہو گیا، اپنی ہانپتی ہوئی سانسوں کی
گو نج چھوڑ کر۔

ایز کنیل کے ہاتھ اب تک کانپ رہے تھے۔ اس نے کتے کو غائب ہوتے دیکھا، لیکن جیسے ہی اُس کی
نظریں عیسیاہ کی طرف پلٹیں، اُس کا دل رک گیا۔ ”اُٹھو، عیسیاہ!“ اُس نے گھبراہٹ میں اپنے بھائی کو
پکارا، اُس کی آواز میں عجلت اور خوف لرزاں تھی۔

اُس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے عیسیاہ کے سرد جسم کو چھوا، اور اُس نے بے بسی سے اُس کے ساکت جسم
کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کی مایوس کن آواز صرف خاموشی میں گم ہو گئی۔

ایز کنیل کی انگلیاں عیسیاہ کے منجمد چہرے پر بے دلی سے پھسلتی رہیں۔ اُس کا چہرہ، جو کبھی زندگی سے
بھر پور تھا، اب ایک سرد پتھر کی مانند لگ رہا تھا۔

اُس کے ہونٹوں کا نیلا ہٹ میں ڈوبا ہوا رنگ، اور اُس کی جلد کی سفیدی نے ایز کنیل کے دل میں خوفناک
حقائق کو جنم دیا۔ عیسیاہ کے بے جان وجود نے ایک ایسی خاموشی کو جنم دیا جو کائنات کی سب سے بڑی چیخ
کی مانند تھی۔

ایز کنیل کے دل پر شدید مایوسی کی چادر چڑھ گئی۔ اُس نے اپنے بھائی کے نازک جسم کو اپنی بانہوں میں اٹھایا، اُسے اپنے سینے سے لپیٹتے ہوئے اُس سرد دنیا کی بے رحم سختی سے بچانے کی بے بسی میں ڈوبا۔

اُس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں، دل گویا سینے میں طوفان برپا کیے ہوئے تھا۔ عیسیاہ کے چہرے کی بے رنگ خصوصیات، اُس کے سرد ہونٹ، اور اُس کا جامد جسم ایز کنیل کے دل پر گہرے زخم چھوڑ رہا تھا۔

اس کے قدم تیز ہو گئے، مگر دل بوجھل ہو چکا تھا۔ اُس نے عیسیاہ کو اپنے سینے سے لگایا اور سخت صبح کے ماحول میں قدم رکھا، اُس دنیا میں جس نے کبھی گرجوشتی کا وعدہ کیا تھا، مگر اب صرف ناقابلِ برداشت دل گرفتگی اور صدمہ دیا تھا۔

صبح کی ٹوٹتی روشنی کے بیچ، ایز کنیل اپنے بھائی کی لاش کو لے کر اُس بے رحم زندگی کے سامنے جھکتا ہوا آگے بڑھا، وہ صبح جو اُن کی اُمیدوں کو مٹی میں ملا چکی تھی۔

...°...

ایز کنیل نے اپنے بھائی کے سرد، بے جان جسم کو اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے ایک ناگزیریت کی تلخی محسوس کی۔ اُس نے بے سود کوشش کرتے ہوئے عیسیاہ کی پیٹھ کو رگڑنے لگا، جیسے اس لمس سے وہ زندگی کی کوئی چنگاری واپس لاسکے گا، مگر ہر لمحہ، اس کی امید مایوسی میں بدلتی گئی۔ اُس کے ہونٹ کانپتے ہوئے

دعاؤں میں الجھ گئے، سرگوشیوں میں تسلی کے الفاظ پھسلنے لگے، لیکن اُس کے دل میں ایک ایسی خاموشی تھی جو چیختی ہوئی مایوسی کی گہرائیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

اُس کی آنکھوں میں امید کی آخری کرنیں مدھم ہونے لگیں، جیسے کوئی چراغ ہوا کے جھونکے سے لرزتا ہو۔

ایز کنیل کی نظریں بے چین ہو کر لوگوں کی طرف دوڑنے لگیں، اُس نے انہیں قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا، لیکن ہر چہرہ، ہر وجود ایک بے رحم بے حسی کی تصویر بن گیا۔

کوئی بھی اُس کی طرف دیکھنے کا روادار نہ تھا، لوگوں کو یہ گمان تھا کہ یہ محض بھکاریوں کی چالبازیاں ہیں، جیسے اکثر یہ راہ کے کنارے بیٹھے لوگ اپنی بے بسی کا ڈھونگ رچاتے ہیں تاکہ چند سگے جھولی میں ڈال دیے جائیں۔

مگر ان ناواقف اور بے حس آنکھوں کو اس حقیقت کا ادراک نہ تھا کہ یہ کوئی کھیل نہ تھا، نہ ہی کوئی بناوٹی فریب۔

یہ محض سکوں کی خواہش یا دھوکہ دہی کی حکمت عملی نہیں تھی، بلکہ ایک تلخ حقیقت تھی، ایک ایسی حقیقت جس نے جسم و روح کو شکستہ کر دیا تھا۔

۔ وہ اُن کے دکھ اور درد سے ناواقف تھے، اُن کی کھوئی ہوئی دنیا، تباہ حال خاندان، اور گزری ہوئی زندگی کا اندازہ لگانے سے قاصر تھے۔

ایک ایسا خاندان جو کبھی خوشیوں کا گہوارہ تھا، اب وقت کی دستبرد میں مٹی کا ڈھیر بن چکا تھا۔ انہیں نہ باپ کا پیار نصیب رہا، نہ ماں کا سایہ، نہ بہن کی مسکراہٹیں باقی رہیں۔ سب کچھ خون کے داغوں اور قتل عام کی وحشت میں دفن ہو چکا تھا۔

ایزکئیل کا دل ایک ناقابلِ برداشت غصے کی لہر سے بھر گیا، ایک ایسی غصے سے جو اُس کے وجود کو جلا رہی تھی۔ وہ چیخنا چاہتا تھا، اس بے حس دنیا کو ہلا دینا چاہتا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ اُس کی آواز، ان بہرے انسانوں کے کانوں تک نہیں پہنچے گی۔

اُس نے اپنی آنکھوں میں جھلملاتی ہوئے آنسوؤں کو روکا، جانتے ہوئے کہ کوئی بھی اُس کی بے بسی کو نہیں سمجھے گا، کوئی اُس کے دل کی آواز نہیں سنے گا۔

دنیا کے ظالم نظام نے اُس کی امیدوں کو روند دیا تھا، اور وہ جانتا تھا کہ اپنے بھائی کے لیے اسے مضبوط رہنا ہو گا، خوابوں کے بکھر جانے کے باوجود، جینا ہو گا۔

جب وہ ڈروٹنگاٹن کی مصروف گلیوں سے گزرتا رہا، تو وہ شہر کی چمکتی ہوئی دکانوں، فن تعمیر کے دلکش نظاروں اور لوگوں کی بے ہنگم زندگی سے نفرت کرنے لگا۔

اُس کے سامنے ہر عمارت، ہر سجاوٹ، ہر جھنڈا جیسے اُس کے زخموں پر نمک چھڑک رہا تھا۔ وہ اجنبیوں کے درمیان ایک گمشدہ مسافر تھا، اُس کا وجود بے معنویت کی گہرائی میں گم ہو چکا تھا، اور اُس کی مایوسی اُسے ایک ایسی دلدل میں دھکیل رہی تھی جہاں سے کوئی واپسی نہ تھی۔

پھر اُس کی آنکھیں ایک نجی اسپتال کی طرف اٹھیں، اور ایک لمحے کے لیے اُس نے امید کی ہلکی سی جھلک محسوس کی۔ جدید عمارت، سبز و سفید رنگت میں لیٹی، دور سے امید کا مرکز لگ رہی تھی۔ لیکن اُس کے دروازے پر کھڑا محافظ اُس امید کو مزید چکنا چور کرنے کے لیے تیار تھا۔ اُس نے ایز کئیل اور اُس کے بھائی کو نفرت بھری آنکھوں سے دیکھا، جیسے وہ کسی وبا کے شکار ہوں یا دھوکے باز۔

ایز کئیل نے محافظ کی طرف بڑھتے ہوئے مدد کے لیے التجا کی، اُس کی آواز میں عاجزی اور درد کا ایک بحر سمندر چھپا ہوا تھا۔ ”خدا کے واسطے، میرے بھائی کو بچالیں، وہ مر سکتا ہے۔“ - ایز کئیل کے الفاظ دھند کی سرد ہوا میں تحلیل ہو گئے، جیسے موسم نے بھی اُس کے دکھ کو بھانپ لیا ہو۔

محافظ کی سرد آواز اُس کی امیدوں کو توڑنے کے لیے کافی تھی۔ ”رقم ہیں؟“ اُس نے طنزاً پوچھا۔ ایز کئیل نے سرنفی میں ہلایا، لیکن اُس کے الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلے، ”نہیں، رقم نہیں ہیں، پر خدا کے واسطے ہمیں مدد کیجئے۔ ہم سڑکوں پر بھٹک رہے ہیں، بھوک اور سردی سے مر رہے ہیں۔“

محافظ کا طنزیہ قہقہہ اُس کے وجود کو مزید چیر گیا۔ ”یہ کوئی خیرات خانہ نہیں، جاؤ اور کہیں اور مرنے کے لیے جگہ ڈھونڈو!“

ایز کئیل نے بے بسی سے، آنکھوں میں آنسو لیے، فریاد کی، ”خدا کے واسطے، ایسا نہ کہیں۔ میرا بھائی نیم جان ہے، وہ کسی بھی لمحے دم توڑ سکتا ہے۔ خدا کے واسطے اس پر رحم کریں۔ میں آپ کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ میں آپ کے جوتے صاف کروں گا، فرش دھوؤں گا، غلام بن جاؤں گا، بس میرے بھائی کی جان بچالیں۔“

محافظ نے اس کی بے چارگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی سرد بے حسی کے ساتھ کرخٹ لہجے میں کہا، ”تمہیں لگتا ہے میں اتنا احمق ہوں؟ تمہارے جیسے بھکاری روز یہاں آتے ہیں، اپنی جھوٹی کہانیاں سنا کر لوگوں سے ہمدردی بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں تمہارے ان فریبوں میں نہیں آنے والا۔ یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ پولیس کو بلا کر تمہیں کہیں اور لے جانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ اس نے ایز کئیل کا کان پکڑ کر سختی سے مروڑا، ایز کئیل درد سے چیخ اٹھا اور محافظ نے اسے دھکیل کر زمین پر گرا دیا۔

ایز کنیل بمشکل اپنے بھائی کو سنبھال سکا تا کہ وہ زمین پر نہ گرے۔ اُس نے محافظ کی جانب دیکھا، جس کی آنکھوں میں نہ ہمدردی تھی، نہ رحم، بس ایک سخت نفرت کی جھلک۔

ایز کنیل کے دل میں غصے اور بے بسی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ چیخنا چاہتا تھا، اپنا اور اپنے بھائی کا دفاع کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ وہ محافظ کی سنگدلی، نظام کی بے حسی اور دنیا کی بے رحم حقیقت کے آگے خود کو شکست خوردہ محسوس کر رہا تھا۔

اُس نے اپنے بھائی کو سینے سے لگایا، اُس ہسپتال کی طرف دیکھا جسے کبھی امید کا استعارہ سمجھا تھا، لیکن اب وہ ہی جگہ ایک سنگدل دھوکے کی تصویر تھی۔

وہ جو کبھی شفقت اور مدد کی علامت تھا، اب محض ایک ظلم اور نا انصافی کا مظہر بن گیا تھا۔

ایز کنیل جانتا تھا کہ اُس کے پاس کوئی راستہ نہیں بچا۔ اُس نے اپنے قدم پلٹا لیے اور خاموشی سے چلنے لگا۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اُس کے دیکھنے سے کچھ نہیں بدلے گا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے، یا وہ کہاں جا رہا ہے، لیکن اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ وہ اپنے بھائی کو بچانے کے لیے کچھ بھی کرنے پر مجبور ہے۔ دنیا کی تلخی اور اس کے بے رحم پن نے اُس کے دل کو مجروح کر دیا تھا، لیکن اس کے قدم ابھی تک رُکے نہیں تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جینا ہے، زندہ رہنا ہے، اس دنیا کے اندھے اور بے حس لوگوں کے درمیان اپنے بھائی کے لیے ایک روشنی کی کرن تلاش کرنی ہے

ایز کنیل ڈروٹینگاٹن کی سردی سے کانپتی گلیوں میں بے حس و حرکت اپنے مردہ بھائی، عیسیاہ، کو بانہوں میں لیے لرز رہا تھا۔

اس کے دل میں چیخیں تھیں، مگر ہونٹ خاموش۔ عیسیاہ کی آنکھیں نیم وا تھیں، جیسے وہ ابھی کچھ کہنا چاہتا ہو، مگر اب وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا تھا۔ عیسیاہ اس حقیقت سے نظریں چرا رہا تھا کہ عیسیاہ اس دنیا سے جا چکا ہے۔

اس کے ذہن میں بے یقینی کی لہر دوڑ رہی تھی — شاید وہ ابھی زندہ ہو، شاید ابھی امید باقی ہو۔

چاروں طرف قدیم اور شاندار عمارتیں خاموش تماشائی تھیں، اور لوگ اپنے کاموں میں مصروف، ایز کنیل کے پاس سے گزرے جا رہے تھے، اسے بھکاری سمجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے۔

ایز کنیل کی آنکھوں میں ایک سوال تھا، ایک چیخ جو کہنے کو بے تاب تھی: ”کیا کوئی نہیں دیکھ رہا؟ کیا کوئی اس کی مدد کرے گا؟“ لیکن بے رحم سردی اور بے حس ہجوم نے اسے جواب نہیں دیا۔

پھر اچانک، ایک سفید کوٹ پہنے ہوئے آدمی اس کے قریب آیا جس کے بیچ پر نام، ڈاکٹر اینڈرسن لکھا ہوا تھا ”کیا ہوا ہے؟“ وہ ہمدردی جتاتے ہوئے بولا۔

ایز کنیل نے لرزتے ہوئے کہا، ”میرا بھائی بے ہوش ہو چکا ہے، کوئی ہماری مدد نہیں کر رہا۔“

ڈاکٹر نے بچ کی طرف اشارہ کیا اور بولا، ”اسے یہاں بٹھاؤ، میں چیک کرتا ہوں۔“

ایز کنیل نے عیسیاہ کو بچ پر بٹھایا اور ڈاکٹر نے سٹیٹھو سکوپ نکال کر اس کا معائنہ شروع کیا۔ مگر ایز کنیل کو کیا خبر تھی کہ ڈاکٹر اینڈرسن کی مسکراہٹ کے پیچھے کیا پوشیدہ تھا۔ اس نے سٹیٹھو سکوپ کو عیسیاہ کے سینے سے لگایا، مگر کوئی آواز نہ آئی۔ کوئی دھڑکن نہ تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے ایز کنیل کو یہ حقیقت نہیں بتائی۔
- ”تمہارا بھائی ٹھیک ہے، لیکن ہمیں اسے ایک خاص اسپتال لے جانا پڑے گا،“ ڈاکٹر نے چالاکی سے کہا۔
ایز کنیل فوراً متفق ہو گیا، ”مجھے آپ پر یقین ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تیز قدموں سے ٹیکسی لینے بھاگ گیا۔

مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا یقین صرف اپنے خدا پر کرنا چاہیے، انسان کی چمک اکثر اس کے اندر چھپی ہوئی سیاہی کو چھپا نہیں سکتی۔

ڈاکٹر اینڈرسن کی آنکھوں میں مکاری کی چمک تھی۔ جیسے ہی ایز کنیل نظروں سے اوجھل ہوا، اس نے اپنا بیگ کھولا اور سرنج نکالی۔

ایک عجیب و غریب مادہ سرنج میں بھر کر اس نے اسے عیسیاہ کے بے جان جسم میں داخل کر دیا۔

ایز کنیل ٹیکسی کے انتظار میں بے چینی سے کھڑا تھا، ارد گرد کی گاڑیاں مسلسل شور مچاتی آگے بڑھ رہی تھیں، مگر وہ پیچھے مڑ کر ایک بار بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہر لمحہ جیسے اس کے دل پر بوجھ ڈالتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ ایک گاڑی کی ہوا اس کے چہرے کو چھو کر گزری، اور اس کا سانس چند لمحوں کے لیے جیسے رک گیا۔

اچانک، اس کی نظریں ایک گاڑی کے اندر موجود ڈرائیور پر جم گئیں۔ ایز کنیل کے دل میں ایک لرزہ دوڑ گیا، جیسے وقت لمحے بھر کے لیے تھم گیا ہو۔

وہ ہی چہرہ، وہ ہی سفاک آنکھیں، وہ ہی شخص جس کے ہاتھوں میں اس نے اپنے بھائی عیسیاہ کو بھروسے کے ساتھ سونپا تھا۔ مگر اب وہ بھروسہ ایک زہر آلود تیر کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا۔

اور اس کے یقین کا وہ ہی انجام ہوا جو ہمیشہ انسانوں پر بھروسہ کرنے کا ہوتا ہے — دھوکہ، فریب اور پچھتاوا۔

ایز کنیل کے ذہن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اُس نے بے ساختہ پیچھے مڑ کر دیکھا، لیکن پیچھے نہ عیسیاہ تھا، نہ وہ ڈاکٹر۔

ایز کنیل کا دل جیسے پھٹنے کو تھا۔ خوف اور بے بسی کا ایک طوفان اس کے اندر اٹھنے لگا۔ اچانک، وہ پوری قوت سے سڑک کی طرف بھاگنے لگا۔ ”رکو! وہ میرا بھائی ہے، رکو!“ وہ چیختا رہا۔

گاڑی تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی، اور ایز کئیل دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

بھاگتے بھاگتے اس کے منہ سے دوبارہ چیخ نکلی، ”رکو! رکو! یہ میرا بھائی ہے! اسے واپس دو۔“

لیکن گاڑی جیسے بے رحم تھی، ہجوم سی بھری سڑک پر تیز رفتاری سے گزرتی ہوئی اس کے الفاظ کو نظر انداز کرتی ہوئی غائب ہوتی گئی۔

ایز کئیل کا دل جیسے ہزار ٹکڑوں میں بٹ گیا، وہ لوگوں اور گاڑیوں کے ہجوم کو چکمہ دیتے ہوئے دیوانہ وار اس گاڑی کے پیچھے دوڑنے لگا۔

آنکھوں کے سامنے دھندلے مناظر تیرنے لگے، اور اس نے اپنے ہی دل کی دھڑکنیں سنیں جو اب ایک ناقابلِ برداشت بوجھ کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔

اچانک، گاڑی ایک موڑ مڑتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ایز کئیل کے قدم جیسے زمین میں جکڑ گئے، اس کا دل مایوسی اور شکست کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔

ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ شاید وہ اپنے بھائی کو ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہے، جیسے دنیا کی بے حسی نے اس کے واحد سہارے کو چھین لیا ہو۔

پھر، اس کی نظریں ایک دکان کے سامنے کھڑی سائیکل پر جا ٹھہریں۔ سائیکل لاک نہیں تھی، اور اس کا مالک کہیں دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک لمحے کا بھی تردد کیے بغیر، ایز کئیل نے سائیکل کی طرف لپک کر اسے تھام لیا اور بغیر کسی احساس جرم کے اس پر سوار ہو گیا۔ وہ قانون، اخلاقیات، یا کسی اور چیز کی پرواہ کیے بغیر تیز رفتاری سے پیڈل پر زور دینے لگا۔ اس وقت اس کی دنیا میں بس ایک ہی مقصد تھا—عیسیا کو بچانا۔

سرد ہوا اس کے چہرے پر کوڑے کی طرح لگ رہی تھی، اور اس کے منہ سے دھواں سا نکل رہا تھا۔ اس کا چہرہ سردی سے لال ہو چکا تھا، ہونٹ سفید پڑ گئے تھے، اور آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے جو سرد ہوا کے لمس سے فوراً منجمد ہو رہے تھے۔

مگر وہ کسی بے قابو طوفان کی مانند آگے بڑھ رہا تھا، جیسے اس کی تمام تر زندگی اب اس سائیکل پر سوار ہے، اور منزل وہ گاڑی تھی جو دور کہیں جا رہی تھی۔

اچانک اس کے کانوں میں کسی کی چیخ سنائی دی، ”ارے، میری سائیکل! اس چور کو روکو!“ یہ سائیکل کا مالک تھا، جو اب دکان سے باہر نکل چکا تھا اور غصے میں ایز کئیل کو دیکھ رہا تھا، لیکن ایز کئیل نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

اس کے لیے دنیا کی آوازیں خاموش ہو چکی تھیں۔ سائیکل کا مالک اس کے پیچھے دوڑنے کی کوشش میں تھا، لیکن بہت سست تھا۔ چند لمحوں بعد، مالک نے ہار مانتے ہوئے پولیس کو فون کر لیا۔

ایز کنیل نے اپنی تمام تر طاقت لگاتے ہوئے خود کو حد تک دھکیل دیا۔ اس کے جسم کا ہر پٹھا جیسے درد کی چیخیں مار رہا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں صرف ایک ہی منظر تھا—وہ گاڑی جو ابھی بھی دور تھی، لیکن اس کے سامنے تھی۔ امید کی ایک مدھم کرن اس کے اندر جاگی، جیسے اندھیری رات میں کوئی ٹمٹماتی روشنی ہو۔ شاید وہ ابھی بھی اپنے بھائی تک پہنچ سکتا تھا۔

ایز کنیل نے اپنی رفتار مزید بڑھائی، اس کے دل میں ایک ہی جذبہ تھا: اپنے بھائی کو بچانا، اس ظالم ڈاکٹر کا سامنا کرنا، اور عیسیاہ کو واپس لانا۔

...°...

ایز کنیل تنگ، بل کھاتی گلیوں میں اس گاڑی کا پیچھا کر رہا تھا جو اس کے بھائی، عیسیاہ، کو لے گئی تھی۔ اس کا دل بے قابو دھڑک رہا تھا، سانس جیسے سینے میں الجھ گئی ہو، اور ٹانگیں تھکن سے جل رہی تھیں۔

وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس نے اس آدمی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ ہی جس نے خود کو ڈاکٹر ظاہر کیا تھا اور عیسیاہ کو ڈور ٹنگسٹن سٹی کے بیچ سے چھین کر لے گیا تھا۔ ایز کنیل کو اب یقین ہو چکا تھا کہ وہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔

ایز کنیل کی زندگی پہلے ہی زخموں سے چور ہو چکی تھی۔ اس کے ماں، باپ اور بہن کو ایک ظالمانہ سازش میں قتل کیا گیا تھا، جس کی بنیاد لالچ اور جائیداد کا تنازعہ تھا۔ اس کے اپنے چچا نے ان کی موت کا بندوبست کیا تھا۔

وہ بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوا تھا، اور تب سے سڑکوں پر زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن عیسیاہ؟ عیسیاہ وہ واحد شخص تھا جس نے ایز کنیل کے درد کو سمجھا تھا، جس نے اس کے ٹوٹے خوابوں اور دبی ہوئی امیدوں کو سہارا دیا تھا۔ وہ ایز کنیل کی آخری امید، آخری سہارا تھا۔

اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے گاڑی کو ایک پرانے اور بوسیدہ کلینک کے سامنے رکتے دیکھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا، اور اس نے اپنی سائیکل کی رفتار تیز کر دی۔

خوف اور مایوسی کے سائے اس کے دل و دماغ پر چھا رہے تھے۔ گاڑی میں موجود شخص کہیں اندر غائب ہو جانے سے پہلے اسے پکڑنا ضروری تھا۔

جیسے ہی وہ کلینک پہنچا، اس نے بے تابی سے سائیکل کو چھوڑا اور دروازے کی طرف لپکا، مگر دروازہ بند تھا۔ ایز کنیل نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا اور نیچے تہہ خانے کی طرف جاتی سیڑھیوں کو دیکھا۔

وہ بغیر سوچے سمجھے سیڑھیوں کی طرف بھاگا، دل کی دھڑکن اور پیروں کی چاپ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو چکی تھی۔ تہہ خانہ نم، تاریک اور بدبو سے بھرا ہوا تھا۔ ہوا میں نمی اور خون کی سی بساند تھی، جیسے کوئی ماضی کے گناہوں کی بھنک دے رہا ہو۔

ایز کنیل نے دیوار کو تھام کر آگے بڑھنے کی کوشش کی، اس کی انگلیاں سرد، چیچچی دیوار سے لپٹ رہی تھیں۔ اچانک، ایک ہلکی سی آواز نے اس کے قدموں کو روک دیا۔

اس نے سرخ روشنی والے دروازے کو دیکھا، اور دل جیسے حلق میں آکر اٹک گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے دروازے کا نوب گھمایا اور اسے زور سے کھول دیا۔

لیکن جو منظر اس کے سامنے تھا، وہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ بھیانک تھا۔ وہ سانس لینا بھول گیا۔

سامنے ایک دھاتی میز پر، خون اور تاروں میں لپٹی ہوئی، عیسیاہ کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ اس کا سینہ چیرا گیا تھا، جیسے کسی قصاب کی دکان پر گوشت کا ٹکڑا ہو، اور اس کے دل اور پھیپھڑوں کے کٹے پھٹے ٹکڑے بے نقاب تھے۔

عیسیاہ کی بے جان آنکھیں بے رحمی سے خلا میں گھور رہی تھیں، جیسے وہ اپنی روح کی چیخوں میں کسی کو مدد کے لیے پکار رہا ہو۔ ایز کنیل کے جسم میں خون جم گیا۔

میز کے ساتھ ہی ایک شخص کھڑا تھا، سفید کوٹ پہنے، ہاتھ میں اسکیپل اور کلپ بورڈ تھا۔ وہ آرام سے ایز کنیل کی طرف مڑا، اس کی آنکھوں میں سرد وحشت تھی۔ ”آہ، تم آہی گئے،“ وہ عجیب سکون سے بولا، جیسے کچھ غیر معمولی نہ ہو۔

- ”مجھے تمہارے نقصان کا افسوس ہے۔ جب میں نے اسے پایا تو وہ پہلے ہی مر چکا تھا۔ میں نے اس کی لاش کچھ تجربات کے لیے استعمال کی ہے۔ فکر نہ کرو، میں تمہاری پریشانی کا ازالہ کر دوں گا۔“

ایز کنیل کے قدموں تلے زمین نکل گئی، دل اور روح ایک ساتھ جیسے چیر کر الگ ہو گئے۔

ایز کنیل کے اندر غصے کی ایک طوفانی لہر اٹھی، جو اس کے پورے وجود کو جلا رہی تھی۔

اس نے دائیں طرف جھپٹ کر ٹیبل سے سکریو ڈرائیور اٹھایا۔ مٹھی نے اسے اس شدت سے جکڑ لیا جیسے وہ کوئی عام اوزار نہیں، بلکہ اس کے انتقام کا دھتکا ہوا الاؤ ہو۔

وہ بے قابو ہو کر ڈاکٹر کی طرف لپکا، اور اس کے سینے میں سکریو ڈرائیور اتار دیا۔ ڈاکٹر نے ایک درد بھری چیخ ماری، اسکیپل اور کلپ بورڈ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گرے، لیکن ایز کنیل کے ہاتھ نہیں رکے۔ وہ اندھا دھند ڈاکٹر کے چہرے، گردن، اور آنکھوں پر وار کرتا رہا، جیسے ہر ضرب کے ساتھ اپنے اندر کے درد اور غصے کو نکال رہا ہو۔

خون کے چھینٹے ہر طرف بکھر رہے تھے، اور ڈاکٹر کا جسم بالآخر بے جان ہو کر زمین پر گر پڑا، عیسیاہ کی مسخ شدہ لاش کے پہلو میں۔ فرش پر خون کی ایک گہری جھیل بن گئی۔

ایز کئیل کے قدم جیسے جامد ہو گئے، اس کی نظریں اپنے بھائی کی تباہ شدہ لاش پر جم گئیں۔ عیسیاہ کا چہرہ، جو کبھی زندگی اور محبت کا عکس تھا، اب ایک خالی اور مسخ شدہ خول بن چکا تھا۔ آنکھوں کے ساکٹ خالی اور خون آلود تھے، جیسے کسی بھیانک خواب کی تعبیر۔

اس کا دل، پھیپھڑے، اور گردے بے دردی سے نکالے گئے تھے، اور ایک دھاتی میز پر صفائی کے ساتھ رکھے تھے، گویا وہ کسی سرد، بے جان تجربے کا حصہ تھے۔ ایز کئیل کا دل جیسے کسی بھاری پتھر تلے دب گیا ہو۔

وہ بے قابو ہو کر روتے ہوئے عیسیاہ کی طرف لپکا اور اسے گلے سے لگا لیا۔ ”عیسیاہ، مجھے معاف کر دو! میں نے تمہیں ناکام کر دیا، میں تمہاری حفاظت کا وعدہ کرتا تھا، لیکن میں ناکام ہو گیا!“

اس نے عیسیاہ کے سرد گالوں پر لرزتے ہونٹوں سے بوسہ دیا، ”میں بزدل بھائی ہوں، میں تمہارے لائق نہیں تھا۔ مجھے اس عفریت پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جب ہمیں دنیا نے تنہا چھوڑ دیا تھا، تو میں کیسے اس سے کوئی بھلائی کی امید رکھ سکتا تھا؟“

اس کی چیخوں نے تہہ خانے کی دیواروں کو لرزادیا، ”اے خدا، تو نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ میرے اپنوں کو مجھ سے کیوں چھین لیا؟ پہلے ڈیڈ، پھر زیبا، پھر موم، اور اب عیسیاہ؟“

وہ پیچھے ہٹا، اس کی آنکھوں میں غصے کی لپیٹیں بھڑک رہی تھیں۔ اس کے اندر کی خاموش نفرت اب ایک لاوے کی طرح پھٹنے کو تیار تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اب کیا کرنا ہے۔

اپنے آنسو پونچھتے ہوئے، اس نے ایک پلاسٹک کا تھیلا اٹھایا اور اپنے بھائی کے کٹے ہوئے اعضا کو ایک ایک کر کے اس میں رکھا۔ پھر اس تھیلے کو ایک بڑے بیگ میں بھرا، جیسے اپنے دل کے ٹکڑوں کو اکٹھا کر رہا ہو۔ اس نے عیسیاہ کی پیشانی کو آخری بوسہ دیا، ”مجھے افسوس ہے، لیکن مجھے اب بدلہ لینا ہے۔ مجھے یہ کرنا ہو گا۔“

اس نے عیسیاہ کو اس بڑے بیگ میں ڈال دیا اور پھر

بیگ کو زپ کیا اور اسے ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ ہاتھ روم میں گیا، اپنے وجود پر جمے خون کو دھونے لگا۔ آئینے میں اس کا عکس ایک بارہ سالہ لڑکے کا تھا، مگر وہ لڑکا اب اپنے بچپن اور معصومیت کو کھو چکا تھا۔ قد لمبا تھا، پانچ فٹ دس انچ کا، لیکن اس کی آنکھوں میں اب صرف نفرت اور اذیت کا عکس تھا۔

اس نے ڈاکٹر کے کپڑے پہنے، جو حیرت انگیز طور پر اس پر ٹھیک بیٹھ رہے تھے۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ، اے ٹی ایم کارڈ، اور کچھ نقدی نکالی۔

جب اس کی نظر کاغذ پر پڑی تو وہاں ایک پن کوڈ تحریر تھا، گویا یہ ڈاکٹر چیزیں بھولتا تھا اسی لیے اس نے کاغذ پر پن کوڈ لکھا تھا۔ جو کچھ بھی تھا، رقم کا ملنا، اے ٹی ایم کارڈ کا ہاتھ آنا، اور کوڈ کا میسر ہونا۔ یہ سب محض

اتفاق نہیں تھا۔ شاید یہ تقدیر کی کوئی گہری حکمت تھی، یا ممکن ہے کہ یہ براہِ راست قدرت کی طرف سے عطا کردہ ایک اشارہ تھا، جیسے اسباب کی اس کڑی میں الہی مداخلت کا فرما ہو۔

ایز کنیل نے رقم اور کارڈ کی طرف دیکھا، اور دل میں ایک تلخی سی چھا گئی۔ یہ سب اب بے معنی تھا۔ وہ رقم جن کی انہیں ضرورت تھی جب وہ اور عیسیاہ بھوک سے مر رہے تھے، اب اس کے لیے بیکار تھے۔ عیسیاہ اب مرچکا تھا، اور پیسوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔

ایز کنیل کی آنکھوں میں آنسو اب خشک ہو چکے تھے، اور اس کے دل میں ایک ہی جذبہ بچا تھا — انتقام، بے رحمانہ اور سرد انتقام۔

کچھ دیر بعد وہ ہاتھ روم سے نکلا تو اس کا جسم تو صاف تھا، لیکن اس کی روح پر وہ بد نما داغ چمک رہے تھے جو کبھی دھل نہیں سکتے تھے۔ سامنے ڈاکٹر کی لاش فرش پر بے جان پڑی تھی، ایز کنیل کی آنکھوں میں کوئی رحم نہیں تھا، صرف نفرت اور غصے کی لپیٹیں تھیں۔

اس نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے پیٹرول کا کین اٹھایا، اور ڈاکٹر کی لاش پر انڈیل دیا، گویا اس مردہ جسم کو بھی بھسم کرنے کی جلدی تھی۔

اس کی مٹھی میں پکڑی ماچس کا ایک تیلہ چکا اور فوراً جلتا ہوا ڈاکٹر کی لاش پر جا گرا۔ آگ کے شعلے بے دردی سے ڈاکٹر کے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کرنے لگے، اور سیاہ دھواں ہوا میں گھلنے لگا۔ ایز کنیل چند لمحے بے تاثر نظروں سے یہ منظر دیکھتا رہا، جیسے کوئی آخری عدالت لگا رہا ہو، پھر وہ پلٹا۔

ایز کنیل نے اپنے خون آلود کپڑے اسی بڑے بیگ میں ڈال دیے جس میں عیسیاہ کی لاش موجود تھی۔ وہ بیگ، جس میں اس کے بھائی کے باقیات موجود تھے، اب اس کے لیے ایک کڑوا بوجھ بن چکی تھی۔ وہ باہر نکلا جگہ سنسان تھی اس نے بیگ کو سائیکل کے پچھلے ریک پر رکھا، خود آگے بیٹھا، اور پیڈل چلانے لگا۔ سائیکل آگے بڑھتی رہی، مگر ایز کنیل کو یہ پرواہ نہیں تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ ہر گلی، ہر موڑ اسے ایک نئی بے مقصدیت کی طرف دھکیل رہا تھا۔

ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے کو کاٹ رہی تھی، اس کے جسم کو سن کر رہی تھی، لیکن اس کے اندر کا خلا اتنا گہرا تھا کہ کوئی سردی اسے محسوس نہ ہو رہی تھی۔ دھند اس کی آنکھوں کے سامنے ہر منظر کو دھندلا کر رہی تھی، جیسے دنیا کی حقیقت بھی اب اس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی ہو۔

ایز کنیل اب بے حس تھا، خالی تھا، تنہائی اس کے وجود میں سرایت کر چکی تھی۔ اس کے پاس جینے کا کوئی مقصد باقی نہیں تھا، سوائے ایک آخری بدلے کے۔ انتقام اس کے

دل کا آخری دھڑکتا حصہ تھا۔

ایز کئیل نے اپنی سائیکل کو کچی سڑک کے کنارے آہستگی سے دھکیلا۔ اس کے ارد گرد دیودار کے بلند و بالا درخت ایسے کھڑے تھے جیسے وہ اُسے اپنی قدیم کہانیوں کے راز بتا رہے ہوں۔ ہوا میں ٹھنڈک اور نمی گھل چکی تھی، اور آسمان سرمئی بادلوں سے بھاری تھا، جیسے یہ منظر ایک المیہ کی گواہی دینے والا ہو۔۔

سمندر کی دور دراز گرج نے ماحول میں ایک عجیب سی سنسنی پھیلا دی، اور دھند کے اس پار نیلی لہروں کی جھلک ایک لمحے کے لیے دیکھی جاسکتی تھی۔

سائیکل کے پیچھے بندھی ہوئی کدال کی آواز ہلکے سے بجی، جیسے ہر جنبش پر موت کے سایے کی سرگوشی ہو۔ ایز کئیل نے پیٹھ پر لد اہوا بیگ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا، جس میں وہ واحد چیز تھی جو اس کی بوسیدہ دنیا سے بچی تھی: اس کے بھائی کی لاش۔ اس کا دل بھاری تھا، لیکن قدم مضبوط تھے۔

ویران جگہ پر پہنچ کر سڑک بے ترتیب ہو گئی، اور دیودار کے درخت ایک قدرتی رکاوٹ کی طرح سامنے آ گئے۔ ایز کئیل نے اپنی سائیکل کو آہستگی سے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا کیا، جیسے وہ اس کو بھی اپنی محنت کی گواہ بنانا چاہتا ہو۔

کدال اٹھا کر وہ خاموشی سے زمین میں گڑھا کھودنے لگا۔ اس کے بازو حرکت کرتے رہے، پسینہ اس کی پیشانی سے ٹپکتا رہا، اور اس کے کندھوں میں درد پھیلتا رہا، لیکن وہ ان سب کو نظر انداز کرتا رہا۔ ہر وار کے ساتھ مٹی کا بوجھ کم ہوتا گیا اور اس کی روح کا بوجھ بڑھتا گیا۔

زمین میں جب گڑھا اتنا گہرا ہو گیا کہ اس میں ایک جسم کو دفنایا جاسکے، تو وہ رک گیا۔ سانسیں بے ترتیب تھیں، دل تھکا ہوا تھا، لیکن کام ابھی باقی تھا۔

وہ اپنی سائیکل کی طرف پلٹا، اور بیگ کو کھولا۔ اس کا دل لرز رہا تھا جب اس نے اپنے مردہ بھائی عیسیاہ کی لاش کو بیگ سے باہر نکالا۔ وہ اس کے سرد جسم، اس کی سخت اعضاء، اور موت کی وحشت کو محسوس کر سکتا تھا جو اب اس کے بھائی کی حقیقت بن چکی تھی۔

ایزکئیل نے نرمی سے اپنے بھائی کو گڑھے میں لٹا دیا، جیسے وہ اسے آخری مرتبہ سلانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے ہاتھوں سے اس کے جسم کو اس ترتیب میں رکھا جس میں وہ زندگی میں تھا، اس کی ٹانگیں سیدھی، اس کے بازو، جیسے زندگی نے انہیں وقت سے پہلے ہی چھو اہو

بعد ازاں ایزکئیل نے لرزتے ہاتھوں سے عیسیاہ کے بدن کے کٹے پھٹے اعضاء کو مٹی میں دفن کرنے کی تیاری کی۔ قبر گہری، تاریک اور سرد تھی، جیسے خود موت کی آغوش نے اسے اپنے اندر سمیٹ رکھا ہو۔

اُس نے ایک پل کے لیے عیسیاہ کے بے جان جسم پر نظر ڈالی۔ سینہ چاک تھا، خون کی خونی لکیریں اس کے جسم کے اطراف میں جم چکی تھیں، جیسے بدن کی ہر رگ چیخ چیخ کر اپنی بے بسی اور تشدد کا قصہ سناتی ہو۔

عیسیاہ کی آنکھوں کے ساکٹ خالی اور خوفناک تھے، جیسے کسی نے زندگی کو ان کی گہرائی سے نوچ کر نکال دیا ہو۔ اُس کا چہرہ بے رنگ، زرد موم کی مانند، جسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے روح خود اپنی قید سے نکلنے کی ناکام کوشش میں ہانپ رہی ہو۔

ایز کنیل نے گہری سانس لی، جیسے اُس نے خود موت کو چھو لیا ہو، اور اُس پل اس کے دل میں ایک چھتی ہوئی چنگاری جاگ اٹھی۔

اُس نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ اندر رکھے عیسیاہ کے بکھرے ہوئے اعضاء ایک ایک کر کے باہر نکالے۔ ان کا منظر ناقابل برداشت تھا۔ گوشت کے لو تھڑے، جن سے خون کے سرخ دھاگے لٹک رہے تھے، زمین کی سردی سے مل کر سخت ہو چکے تھے، لیکن ان سے جڑا ہوا ہر لمحہ ایز کنیل کی آنکھوں میں ایک بھیانک یاد کی مانند تھا۔

اُس نے ہاتھ بڑھا کر عیسیاہ کا دل اٹھایا، جس پر خون کی جم چکی تہہ واضح تھی، اور اُسے قبر میں رکھ دیا۔ دل رکھنے کے بعد اُس نے باقی اعضاء بھی مٹی میں ڈال دیے، جیسے وہ اپنے ہی وجود کے ٹکڑے دفن کر رہا ہو۔ ہر عضو کی گرتی آواز قبر کی خاموش فضا میں گونجتی رہی، جیسے مٹی خود ایز کنیل کی چیخوں کو سمیٹ کر دفن کر رہی ہو۔

ایز کنیل نے اپنا دل گرفتہ کر کے عیسیاہ کے خون سے سنے ہاتھوں کو صاف کرنے کی کوشش کی، لیکن اُس کے ہاتھوں پر لگے خون کے نشانات مٹنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، جیسے یہ موت اُس کی روح پر ایک دائمی داغ بن کر چپک گیا ہو۔

کچھ وقت بعد وہ مٹی کے ڈھیر کو اپنے ہاتھوں سے آہستگی سے اس کے اوپر ڈالنے لگا، جیسے ہر مٹھی میں اپنے دل کا ایک ٹکڑا بھی ڈال رہا ہو۔

پھر اس نے آس پاس سے کچھ بڑے پتھر جمع کیے اور انہیں قبر کے اوپر رکھ دیا، جیسے وہ ان پتھروں سے اپنے بھائی کی یاد کو محفوظ کر رہا ہو۔

پتھر ایک ایک کر کے قبر پر رکھتے گئے، اور قبر مکمل طور پر ان پتھروں سے بھر گئی۔ ہر پتھر کے نیچے اُس کے دل کی ایک اور چیخ دبی ہوئی تھی۔

پھر اس نے کانپتے ہاتھوں سے جیب میں رکھا سکریو ڈرائیور نکالا اور آہستہ آہستہ درخت کی سخت چھال پر کندہ کرنے لگا۔ ہر ضرب کے ساتھ اس کا دل بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ ”میرے پیارے بھائی عیسیا، تم جنت کے پرندے بن جاؤ۔“۔

اس کی انگلیاں لرزش میں تھیں، جیسے دکھ اور پچھتاوا ہر لفظ کے ساتھ اُس کے اندر اتر رہا ہو۔ مگر، الفاظ واضح تھے، جیسے ان میں اُس کی تمام محبت اور حسرت سمٹ آئی ہو۔

ایز کنیل نے پیچھے ہٹ کر قبر کو دیکھا، اور جذبات کی ایک طوفانی لہر نے اسے گھیر لیا۔ اداسی، غصہ، اور جرم، تینوں ایک ساتھ اُس پر نازل ہوئے۔ اُس کی ٹانگوں نے بوجھ برداشت نہ کیا، اور وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔

اُس نے سر جھکا کر آہستہ سے دعا کی، سرگوشی میں خدا سے درخواست کی کہ وہ اس کے بھائی کو اپنی پناہ میں لے لے۔

کچھ لمحوں بعد، ایز کنیل نے بے دلی سے اپنی سائیکل اور بیگ کو گھسیٹتے ہوئے ساحل کی جانب سفر کیا، جہاں سمندر کی بے قرار لہریں چٹانوں سے سر پٹختی تھیں۔ اُس نے اپنی نظریں اُس بیگ پر جمائیں، جو کبھی اُس کے بھائی کی بے جان لاش کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔

یہ بیگ جو صرف نفرت، کراہت اور شکست کی علامت تھا۔ یہ بیگ اُس کے زخموں کو گُریڈتا، اُس کے ماضی کی تلخ یادوں کو تازہ کرتا، اُسے اُس کے مرے ہوئے بھائی کا نوحہ سُنا تا۔

ایز کنیل نے ایک سرد آہ بھری اور بیگ کو غصے سے بھرا ہوا سمندر کی گہرائیوں میں پھینک دیا۔ وہ لمحہ بھر کو اُس کے ہاتھ میں لرزتا رہا، پھر سمندر کی موجوں میں دفن ہو گیا، جیسے اُس کے بھائی کا غم بھی ان موجوں میں کہیں گم ہو جائے گا۔

سائیکل کے ساتھ بھی اُسی طرح کا سلوک کیا، ایک آخری ناپسندیدگی بھری نظر اُس پر ڈالی اور اُسے بھی سمندر کے حوالے کر دیا، جیسے اپنے ماضی کا ہر نشان مٹا دینا چاہتا ہو۔

اُس نے ساحل سے منہ موڑ کر جنگل کا رخ کیا، اُس خاموش اور بے حس قبرستان کی جانب، جہاں اس کے بھائی عیسیاہ کی قبر واقع تھی۔ جیسے جیسے وہ قریب آیا، پتھروں کی ترتیب اور درخت کی چھال پر لکھے ہوئے

الفاظ اُس کے دل میں ایک عجیب سی کپکپاہٹ پیدا کرتے رہے۔ وہ اس مقدس جگہ کے سامنے گھٹنے ٹیکتا ہوا زمین کو چھونے لگا، مٹی کی سردی اور نمی اُس کے دل میں ایک گہری چھب پیدا کر رہی تھی۔

اُس کی یادیں اُس پر حملہ آور ہو گئیں۔ عیسیٰ کی ہنسی، اُس کی معصوم مسکراہٹ، اُس کی گرمجوشی۔ سب کچھ اُس کے سامنے جیسے زندہ ہو گیا ہو، مگر ساتھ ہی ساتھ جرم کا ناقابل برداشت بوجھ اُس کی روح کو جکڑنے لگا۔ و

ہ زمین پر جھکا اور آہستگی سے سرگوشی کرنے لگا، ”عیسیٰ، مجھے افسوس ہے، میں تمہارا گناہ گار ہوں۔ میں نے تمہیں ناکام کیا، میں تمہیں بچانہ سکا، مجھے تمہارے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ میں تمہارا محافظ تھا، لیکن میں نے تمہیں کھو دیا۔“

اُس کی آواز لرز گئی، آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اور وہ اپنی پیشانی کو مٹی پر رکھ کر لیٹ گیا، جیسے اُس مٹی کے اندر اپنے بھائی کی قربت تلاش کر رہا ہو۔ اُس کے ہونٹ کپکپاتے رہے، ”عیسیٰ، میرے بھائی، تم میرے سب کچھ تھے۔“

اُس نے آنکھیں بند کر لیں، اور دھیرے دھیرے اُس کے ذہن میں خواب اُبھرنے لگے۔ اُس کے بھائی کے، اُس کے خاندان کے، اُس بدلے کے، جواب اُس کے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ اور جوش مارتا تھا۔۔

پچھلے دو ہفتوں سے، ایز کئیل ساحل کے قریب اس چھوٹے سے شہر کے کنارے زندگی کے دن گن رہا تھا۔ وہ وقت جس نے اُس کی روح کو ساکت کر دیا تھا، جیسے اُس کی دنیا کا ہر لمحہ اُس برف کی طرح جم چکا تھا جو اب سویڈن کی سر زمین پر پھیلا ہوا تھا۔

ڈاکٹر کے لباس سے جو اس کو رقم ملی تھی اُسے ایک سستے ہوٹل کے کمرے میں گزارنے پر خرچ کر دی۔ ایک چھوٹا، اندھیرا کمرہ، جہاں وہ خود کو دھوسکتا تھا، کپڑوں کو صاف کر سکتا تھا، اور کچھ پل کے لیے دنیا کے دکھوں سے بچا رہ سکتا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اسٹاک ہوم میں زیادہ دیر قیام کرنا اُس کی طاقت سے باہر تھا۔ اُس کے پاس نہ تو مزید رقم تھی اور نہ ہی کوئی اور جگہ جہاں جاسکتا۔ یہ شہر، جس نے کبھی اُس کے خوابوں کو جنم دیا تھا، اب اُس کے لیے ایک برفانی قید خانہ بن چکا تھا۔

سویڈن کے اس سفید آسمان کے نیچے، جہاں برف ہر چیز پر ایک خوبصورت کمبل کی مانند تھی، ایز کئیل کو ہر سفید ذرہ جیسے سانپ کی طرح ڈس رہا تھا۔

برف سے اُسے نفرت تھی، سردی سے بھی زیادہ نفرت۔ اُس کی ہر سانس میں غم کا ایسا بوجھ تھا جو وہ سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ سٹاک ہوم دروننگاٹن سٹریٹ یہ جگہ جہاں اُس کے بھائی کی زندگی ختم ہوئی تھی، وہ جگہ تھی جو اُس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر چکی تھی۔

وہ آج کے دن سرخ بس میں سوار ہوا جس کی اُس نے آن لائن بکنگ کی تھی، کیوں کہ سویڈن میں اکثر چیزیں آن لائن ہی ہوتی تھیں، اور یہ اس کی مجبوری بن چکی تھی۔ وہ کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا اور باہر کے منظر کو غور سے دیکھنے لگا۔

برف ہلکے ہلکے گر رہی تھی، جیسے آسمان خود بھی اس درد میں شریک ہو۔ برف کی نرم چادر نے ماحول کو پرامن بنادیا تھا، مگر ایز کئیل جانتا تھا کہ یہ امن محض ایک فریب تھا۔

اُس کی دنیا میں کہیں بھی سکون یا حسن نہیں تھا، وہاں بس درد تھا، تکلیف تھی۔

بس ایک مخصوص مقام پر رکی، جہاں وہ خاموشی سے نیچے اترا۔ وہ جنگل کی جانب چل دیا، جہاں اُس کے بھائی عیسیاہ کی قبر تھی۔ وہ اپنے کندھے پر ایک اسپورٹس بیگ لٹکائے ہوئے تھا، جس میں اُس رقم کو چھپانے کا ارادہ تھا جو اُس نے چند روز قبل اے ٹی ایم سے نکالی تھی۔

برف نے قبر کو ایک سفید پہاڑی کی صورت دے دی تھی، جیسے وہ زمین کا ایک خاموش راز ہو جو اُس کے دل میں دفن ہو چکا ہو۔ ایز کئیل نے احتیاط سے قبر کے اوپر سے برف ہٹائی، اور مٹی کو اپنے ہاتھ سے چھوا، جیسے اپنے بھائی کی آخری نشانی کو محسوس کر رہا ہو۔

ایز کنیل کا دل ایک بھاری بوجھ کے نیچے دب چکا تھا، اُس کے ذہن میں عیسیاہ کا چہرہ، اُس کی ہنسی، اُس کی باتیں گونجنے لگیں۔ ایک اداس مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر ابھری، یہ سوچ کر کہ عیسیاہ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے دو ہفتے گزر چکے ہیں، مگر اُس کے دل میں یہ خلا آج بھی ویسا ہی ہے جیسے پہلے دن تھا۔

وہ برف کی سردی کو اپنے ہاتھوں میں محسوس کرتا رہا، اور اُس کی آنکھ سے ایک آنسو گرا، اُس کے بے تاثر چہرے پر یہ آنسو ہی وہ واحد نشانی تھی جو اُس کے دل کی گہرائی کو ظاہر کر رہی تھی۔

مگر اُس نے خود کو سخت کر لیا۔ اُس کے دل میں غم کی جگہ غصہ ابھر آیا تھا، ایک عزم جو اُس کے وجود کی گہرائی سے نکلتا تھا۔ اُس نے قبر کے سامنے جھکتے ہوئے کہا،

۔ ”عیسیاہ، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے مقصد کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔ ہمارے وہ چچا، جنہوں نے ہم سے سب کچھ چھین لیا، ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ مگر انہیں کیا خبر کہ تم بھی موم، ڈیڈ اور زیبا کے پاس جا چکے ہو۔ پیچھے صرف میں بچا ہوں۔ میں جا رہا ہوں، مگر ڈر کر نہیں جا رہا۔ میں واپس آؤں گا... اور ہمارے ہر دکھ کا حساب لوں گا۔“۔

اُس نے قبر کی مٹی کا ایک چھوٹا سا حصہ اپنے ہاتھوں میں لیا، جیسے وہ اپنے بھائی کا کوئی ٹکڑا ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہو۔

اُس نے اُسے اپنے کوٹ کی جیب میں موجود ایک چھوٹی پوٹلی میں ڈالا،

اور آہستگی سے اٹھا اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ اُس جھاڑی کی جانب بڑھا، جہاں اُس نے مٹی کے تلے ایک قبر نما گڑھے میں پیسوں سے لبریز پلاسٹک کا تھیلا چھپا رکھا تھا۔

اُس نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے مٹی کو کھودنا شروع کیا۔ جیسے ہی تھیلا باہر آیا، اُس نے اسے احتیاط کے ساتھ اپنے اسپورٹس بیگ میں سمو دیا۔ بیگ کا بوجھ کندھے پر بھاری تھا، مگر دل پر بدلے کی آگ اُس بوجھ سے بھی زیادہ گراں گزر رہی تھی۔

اُس نے قبر کی طرف آخری نظر ڈالی، جیسے وہ عیسیٰ کو دوبارہ دیکھنے کا وعدہ کر رہا ہو، اور کہا، ”میں واپس آؤں گا۔“ اُس کے ہونٹوں سے نکلنے والی سانس بر فیلے ہوا میں دھویں کی مانند بکھر گئی۔ ہر سانس کے ساتھ دھواں گھنا ہوتا گیا، اور دھیرے دھیرے وہ دھند میں گم ہو گیا۔ سفید برف کے پردے نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا، اور وہ اُس دھند میں مکمل طور پر اوجھل ہو گیا، جیسے دنیا کے منظر نامے سے مٹ گیا ہو۔

...°...

سویڈن کے شمالی خطے میں رات گہری اور تخی بستہ تھی، جہاں سورج فقط ایک سراب کی مانند افق کے کنارے پر بمشکل نمودار ہوا تھا اور پھر غائب ہو گیا تھا، جیسے آسمان نے خود کو رات کے سیاہ پردے میں لپیٹ لیا ہو۔

تاریکی کی اس چادر میں ایک ہی روشنی کا منظر تھا، وہ بھی سبز رنگ کی وہ رقص کرتی اور اس جو آسمان کو چمکدار پردے کی مانند ڈھانپ رہی تھیں۔

یہ شمسی ہوا کے چارج شدہ ذرات کا نتیجہ تھا، جو سورج کی گہرائیوں سے نکل کر زمین کے مقناطیسی میدان سے ٹکراتے تھے۔ یہ منظر بظاہر ایک حسین خواب کی مانند تھا، مگر یہ حقیقت کی نزاکت کی ایک تلخ یاد دہانی بھی تھی۔

برف کی ان جمی ہوئی وسعتوں کے درمیان ایک سایہ دار شخصیت قدم بڑھاتی دکھائی دے رہی تھی۔ ونیچ ہیٹ، لمبا کوٹ، پینٹ شرٹ اور چیلیسی کے جوتے پہنے وہ شخص اپنے ہاتھ میں ایک لالٹین اٹھائے برف کی سفید چادر میں سے گزرتا ہوا ایک مجسمے کی مانند دکھائی دے رہا تھا، جیسے وہ کسی گمشدہ زمانے سے نکل کر یہاں آیا ہو۔

لیکن اس برف زار میں، وہ قطعی غیر متوازن نہیں تھا، بلکہ گویا یہ زمین اُس کی تقدیر کا حصہ تھی۔ وہ ماسٹر لی تھے، ایک چینی سیاح اور ماہر مہم جو، جو ان برفانی میدانوں میں اور ورا کا نظارہ کرنے آیا تھا۔

ماسٹر لی، جو شاولن کنگ فو میں ماہر تھے، وہ قدیم چینی فن جو انہیں اُن کے دادا نے سکھایا تھا، جو خود بھی چین کے مشہور شاولن مندر کے راہب رہ چکے تھے۔ وہ اُس آنگلو کے قریب پہنچے جو برف سے تراشا ہوا ایک گنبد نما ڈھانچہ تھا۔ اس بیابان میں یہ واحد نشانِ انسانی وجود تھا۔ اُس نے اِگو کے باہر کھڑی ایک خاموش شخصیت کو دیکھا، جو برفیلے آسمان پر رقص کرتی اور اس کو دیکھ رہی تھی۔

ماسٹرلی نے اُسے پہچان لیا، یہ ایز کئیل تھا، ایک لڑکا جس سے اُس کی ملاقات اسٹاک ہوم میں ڈیڑھ ماہ قبل ہوئی تھی۔

ایز کئیل، جس کی عمر فقط بارہ برس تھی، لیکن اُس کا چہرہ اور جسم ان گنت مشکلات اور جفا کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اُس کے وجود پر زمانے کی بے رحمی نے ایک ایسی سختی پیدا کر دی تھی جو اُس کی عمر سے کہیں بڑھ کر تھی۔

اُس نے موٹی جیکٹ، اونی ٹوپی، اور مضبوط جوتے پہنے ہوئے تھے، جیسے اُس کا وجود برف کی سردی سے لڑنے کے لیے تیار ہو۔ اُس کے کندھے پر کھیلوں کا بیگ لٹک رہا تھا، جس میں وہ رقم چھپی ہوئی تھی جو اُس نے ڈاکٹر کے اے ٹی ایم کارڈ سے نکالی تھی۔

ماسٹرلی اُس کے قریب آئے اور نرم آواز میں کہا، ”ہیلو، ایز کئیل، کیا تم جانے کے لیے تیار ہو؟“۔ ایز کئیل نے مختصر سا سر ہلایا، اُس کی خاموشی اُس کی تکلیف کی گہرائیوں کو عیاں کر رہی تھی۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ماسٹرلی کے ساتھ سویڈن چھوڑ دے گا، جو اُسے چین لے جانے اور شاؤلن راہبوں کے ہاں تربیت دینے کا وعدہ کر چکے تھے۔

یہ تربیت اُس کے لیے ایک نئے سفر کا آغاز تھی، نہ صرف اپنے دفاع کے لیے بلکہ اپنے مرے ہوئے بھائی کی یاد کو عزت دینے کے لیے۔ اُس کا عزم تھا کہ وہ خود کو ایک نئے، مضبوط، اور بہتر انسان میں ڈھالے گا۔

۔ ”ہاں، میں تیار ہوں،“ ایز کئیل کی آواز سرد ہواؤں میں گونجتے ہوئے ماسٹر لی تک پہنچی۔

ماسٹر لی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک ہمدرد مسکراہٹ دی، جیسے وہ اُس کے درد کو سمجھتے ہوں۔
”بہت خوب،“ ماسٹر لی نے کہا، ”پھر چلو، ہمیں ایک طویل سفر طے کرنا ہے۔“

وہ دونوں سنو موبائل کی طرف بڑھے، جو قریب ہی کھڑی تھی۔ ماسٹر لی نے ایز کئیل کو چڑھنے میں مدد دی، اور پھر خود بھی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اُنہوں نے انجن اسٹارٹ کیا اور اس جگہ سے دور نکلنے لگے۔

جیسے ہی گاڑی آگے بڑھی، ماسٹر لی نے آسمان کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لی، ”لوگ ارور اس کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ یہ چمکدار مناظر کیسے وجود میں آتے ہیں۔ اگر وہ جانتے، تو خوش ہونے کی بجائے خوف محسوس کرتے۔“

ایز کئیل کی تلخ مسکراہٹ اُس کے چہرے پر ابھری، جیسے اُس نے دنیا کے اس ظاہری حسن کی حقیقت کو پہچان لیا ہو، ”ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے، ماسٹر لی۔“

ماسٹر لی نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا اور باہر دیکھتے ہوئے کہا، ”ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔“

وہ سنو موبائل کو تیز رفتاری سے چلاتے ہوئے ہوائی اڈے کی جانب بڑھنے لگے، جہاں ایک طیارہ اُن کا انتظار کر رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ وہ لوگ کسی حکومتی طیارے سے تو سفر نہیں کر رہے تھے۔ ایز کئیل اور اُس کا خاندان دنیا کی نظروں میں سو مرچکا تھا۔ اس لیے ایز کئیل کو انتہائی رازداری کے ساتھ ایک نجی جیٹ میں چین منتقل کیا جا رہا تھا۔ یہ کام نہایت پیچیدہ اور خطرات سے بھرپور تھا، لیکن تیز فہم اور شاطر ماسٹرلی کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔ اُن کی مہارت اور اثر و رسوخ نے ہر ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا، اور یہ سفر بھی انہی چالوں کا حصہ تھا جس سے ایز کئیل کو دنیا کی آنکھوں سے اوجھل رکھنا مقصود تھا۔

ماسٹرلی نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، کیوں کہ انہوں نے برف، سردی اور اُس کے اسراروں کی سرزمین کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

اب ان کی نگاہیں اُس آگ اور ڈرگینوں کی سرزمین کی طرف تھیں، جہاں ان کا نیا سفر اور نئے خواب اُس کے منتظر تھے۔ ماسٹرلی نے ایز کئیل کی طرف دیکھا اور کہا، ”تمہارا نیا مستقبل تمہارے سامنے ہے، شاؤلن مندر تمہیں بلا رہا ہے۔“

...°...

مقام چائنہ:-

ایز کئیل اور ماسٹرلی ایک سر بہ فلک پہاڑی کی بلندی پر کھڑے تھے، جہاں سے شاؤلن ٹیمپل کا منظر ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ مندر کا پیچیدہ طرز تعمیر اور اس کی روحانی گونج فضا کو ایک غیر معمولی سحر میں ڈبوئے ہوئے تھی۔

برف سے ڈھکی چوٹی پر بسایہ مندر درختوں اور بادلوں کے گھیرے میں خاموشی سے ایستادہ تھا، جیسے فطرت اور انسان کے درمیان کسی قدیم عہد کا امین ہو۔ سورج کی کمزور کرنیں سرمئی آسمان کے دامن سے پھوٹی ہوئی منظر پر ایک ہلکی سی روشنی بکھیر رہی تھیں، جیسے کسی افسانوی داستان کا آغاز ہو رہا ہو۔

ایز کنیل کے لبوں پر ایک عجیب مسکراہٹ پھیل گئی، اس کے چہرے پر وہ تاثر تھا جو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا۔ اس کی زندگی ایک نہ ختم ہونے والی آزمائش تھی، درد، المیہ اور نقصان کی لامتناہی زنجیر میں جکڑی ہوئی۔

اُس کے چچا، ڈریک، نے اُس کے پورے خاندان کا سفاکی سے قتل کیا اور ان کی وراثت چھین لی۔ ایز کنیل اور اس کا چھوٹا بھائی، عیسیا، اس ظلم کے بعد اسٹاک ہوم کی بے رحم گلیوں میں در بدر ہو گئے۔ مگر قسمت کا ایک اور زہریلا وار، عیسیا کو موت کی وادی میں دھکیل گیا۔

ایز کنیل نے اپنے بھائی کا انتقام لیا، اور پھر اُس کی راہیں ماسٹرلی سے ملیں، جنہوں نے مدد کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ ماسٹرلی ایک چینی سیاح اور مہم جو تھے، جو سویڈن کی سرزمین پر ارورہ بوریا لیس کا منظر دیکھنے اور برفانی بیابان کی سیر کرنے آئے تھے۔

لیکن وہ صرف ایک سیاح نہ تھے، وہ شاولن کنگ فو کے ماہر تھے، وہ فن جسے انہوں نے اپنے دادا سے سیکھا تھا، جو کہ شاولن مندر کے مشہور راہبوں میں سے تھے۔ ماسٹرلی نے ایز کنیل میں کچھ غیر معمولی دیکھا، ایک صلاحیت، ایک پوشیدہ قوت، جسے وہ پروان چڑھانا چاہتے تھے۔

انہوں نے ایز کئیل کو چین لے جانے اور اُسے شاولن راہب کی تربیت دینے کا فیصلہ کیا۔

ایز کئیل نے ماسٹر لی کے ساتھ سویڈن کو مختصر وقت کے لیے چھوڑنے کا ارادہ کر لیا، اُن کے وعدے کے تحت وہ نہ صرف اپنے دفاع کے لیے کنگ فو سیکھے گا بلکہ اپنے بھائی کی یاد اور عزت کا بھی خیال رکھے گا۔

مگر یہ سفر صرف جسمانی قوت کا نہیں تھا؛ ایز کئیل اس راہ پر قدم رکھتے ہوئے ذہنی اور روحانی طور پر بھی اپنے آپ کو بدلے کے لیے تیار کر رہا تھا۔

اُس کی نگاہیں اپنے وطن کی جانب تھیں، جہاں اُس کا چچا اب بھی اُس کی تلاش میں سرگرداں تھا، اور ایز کئیل اپنے حق کو واپس لینے کے لیے بے تاب تھا۔

۔ ”میرا مستقبل وہ ہو گا جس میں میں اپنا انتقام لوں گا“، ایز کئیل کی آواز میں سرد مہر یقین اور عزم کی گہرائی تھی۔

ماسٹر لی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ وہ ایز کئیل کے دل میں اترے درد اور غصے کو سمجھتے تھے، لیکن اُسے اس جنون کی پاتال میں گرنے کا اندیشہ بھی تھا۔

وہ جانتے تھے کہ انتقام کی راہ انتہائی خطرناک اور تباہ کن ہو سکتی ہے، جو انسان کو کھا جاتی ہے اور اُسے ایک وحشی درندے میں بدل دیتی ہے۔

- ”انتقام بظاہر میٹھا لگتا ہے، لیکن یہ دل کو برف کی مانند سرد اور بے حس کر دیتا ہے“، ماسٹر لی نے احتیاط سے اسے نصیحت کی۔

ایز کئیل نے ایک گہری نظر سے اُن کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں عاجزی کی چمک تھی، مگر وہ اپنے ارادوں میں ثابت قدم تھا۔ وہ گلیوں کا بھٹکا ہوا لڑکا نہیں تھا، وہ ایک تجربہ کار اور ہوشیار شخص بن چکا تھا۔

اُس نے سڑکوں پر زندہ رہنا سیکھا، حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا، اپنی عقل کو بروئے کار لانا، اور ہر قدم پر چوکنا رہنا۔ اُس نے یہ بھی سیکھ لیا تھا کہ دنیا میں کسی پر اعتماد نہ کیا جائے، سوائے اپنے آپ کے، اور اپنے جذبات کو دل کی گہرائیوں میں دفن کر دیا جائے۔

- ”مجھے اپنے دل کی فکر نہیں، مجھے صرف انصاف سے غرض ہے“، ایز کئیل نے اپنے لہجے میں چیلنج کے ساتھ کہا، جیسے اُس کی روح میں بدلے کی آگ بھڑک رہی ہو۔

...°...

ایز کئیل ایک قدیم اور کھردری لکڑی کی سیڑھی کی آخری پائیدان پر بیٹھا تھا، اُس کی کمر ٹھنڈی پتھریلی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔

اس کے پیچھے کاکمرہ گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، جہاں خاموشی کا راج تھا، سوائے چند خراٹوں کی آوازوں کے جو کبھی کبھار دوسرے شاگردوں کی طرف سے آتی تھیں۔ رات گہری ہو چکی تھی، اور شاولن مندر کے باہر جلتی مشعلوں سے مدھم روشنی پتلی کھڑکیوں سے اندر آرہی تھی۔

برف کے گرتے گالے بادلوں کی اوٹ سے ٹپک رہے تھے اور آہستہ آہستہ زمین کو سفید چادر میں لپیٹ رہے تھے، ہر طرف خاموشی کی چادر تنی ہوئی تھی، جیسے پوری دنیا ایک لمحے کے لیے تھم گئی ہو۔

ایزکنیل نے اپنی گردن موڑی تو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ ماسٹر لی تھے، اس کے سر پرست، اُس کے رہنما۔ وہ خاموشی سے اُس کے قریب بیٹھ گئے اور اُس کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگے۔

دودن قبل، ماسٹر لی اسے سویڈن سے لمبے اور تھکا دینے والے سفر کے بعد یہاں لائے تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے شاولن راہبوں کی طرح تربیت دیں گے، اُسے کنگ فو کے فن میں مہارت سکھائیں گے اور مندر کے روحانی رازوں میں جھانکنے کا موقع دیں گے۔

ماسٹر لی کی گہری، پروتار آواز نے خاموشی کا پردہ چاک کیا۔ ”تمہیں چین کے اس وسیع و عریض دیار کی سیر میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لگتی،“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ایزکنیل نے کندھے اچکائے اور بے پرواہی سے جواب دیا، ”میں سیر و تفریح کے لیے یہاں نہیں آیا ہوں، میں یہاں سیکھنے آیا ہوں، اور بس یہی میرا مقصد ہے۔“

ماسٹرلی نے سر ہلایا اور گہری نظروں سے اسے دیکھا، ”میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری توجہ بہت مضبوط اور واضح ہے۔ لیکن یاد رکھو، اس سرزمین کی وسعت اور تنوع میں بھی ایک گہرائی ہے۔ یہاں سیکھنے کے لیے کنگ فوسے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہے۔“

ایزکنیل نے غور سے ماسٹرلی کی طرف دیکھا، اور پھر ہچکچاتے ہوئے کہا، ”آپ میرے ساتھ اتنا نرمی کا سلوک کیوں کرتے ہیں؟ آج میں نے دیکھا کہ آپ نے ایک شاگرد کو دیر سے آنے پر سخت سزائیں دیں، سوپش اپس کروائے۔“

ماسٹرلی ہلکا سا ہنسنے اور نرمی سے بولے، ”وہ شاگرد دست اور بے ادب تھا، جبکہ تم میں لگن ہے، ایک غیر معمولی صلاحیت ہے۔ تم محنتی ہو اور عزت کرنے والے ہو۔ میں تم میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو بہت کم لوگوں میں ملتا ہے۔ تم مجھے میری جوانی کی یاد دلاتے ہو، جب میں تمہاری عمر کا تھا۔“

ایزکنیل کی ہونٹوں پر ایک دھیمی مسکراہٹ ابھری، ”میں چاہتا ہوں کہ آپ میری تربیت ہر روز سخت کریں۔ میں مضبوط بننا چاہتا ہوں، تیز اور بے خوف۔ میں ہر آزمائش کے لیے تیار ہونا چاہتا ہوں۔“

ماسٹرلی نے شفقت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کہا، ”تمہارے اندر ایک آگ ہے، ایزکنیل۔ ایک ایسی آگ جو تمہیں طاقتور بنا سکتی ہے، یا تمہیں جلا کر خاک کر سکتی ہے۔ تمہیں یہ سیکھنا ہو گا کہ اس آگ کو

کیسے قابو میں رکھنا ہے۔ توازن اور ہم آہنگی ہی شاولن کی اصل روح ہے۔ امن اور محبت ہماری حقیقی طاقت ہیں۔”۔

ایز کنیل نے سر جھٹکتے ہوئے کہا، ”مجھے امن اور محبت کی ضرورت نہیں، مجھے طاقت اور انصاف چاہیے۔ میرے چچا نے میرے خاندان کو برباد کر دیا، میں اُن سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ مجھے وہ واپس لینا ہے جو میرا حق ہے۔”۔

ماسٹرلی نے گہری سانس بھری اور نرم لہجے میں بولے، ”بدلہ ایک زہر ہے، ایز کنیل۔ یہ زہر تمہیں اندر سے کھا جائے گا، اور تمہیں تباہی کی طرف لے جائے گا۔ تمہیں اپنی نفرت چھوڑنی ہوگی، اپنے زخموں کو بھرنے کا یہ ہی واحد راستہ ہے۔ معافی میں ہی سکون اور نجات کا راز ہے۔”۔

ایز کنیل کی آنکھوں میں سختی آگئی، اُس کا چہرہ سرد اور بے رحم ہو گیا۔ ”میں اسے معاف نہیں کر سکتا، ماسٹر۔ میں اُس کا گناہ نہیں بھول سکتا۔ اُس نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا، اور وہ اپنے جرائم کی سزا کا مستحق ہے۔ میں اس وقت تک چین سے نہیں سو سکوں گا جب تک اُس کی موت اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔”۔

ماسٹرلی نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ”تم غلط راہ پر ہو، ایز کئیل۔ یہ انتقام تمہاری زندگی کو بے مقصد بنا دے گا، اور تمہیں مزید درد و کرب میں مبتلا کرے گا۔ حقیقی طاقت محبت میں ہے، اور کنگ فوکا اصل مقصد امن اور ہم آہنگی ہے۔“

ایز کئیل نے اپنی نظریں پھیر لیں اور سرگوشی میں کہا، ”آپ نہیں سمجھتے، آپ کو اندازہ نہیں کہ میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ آپ نہیں جانتے کہ میں نے کیا کھویا ہے، اور میں کیا چاہتا ہوں۔“

ماسٹرلی نے اُس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا، ”میں تمہیں سمجھتا ہوں، ایز کئیل۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے کیا کھویا ہے، اور میں جانتا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں درحقیقت کیا چاہیے۔ تمہیں طاقت کی نہیں، حکمت کی ضرورت ہے۔ تمہیں بدلے کی نہیں، معاف کر دینے کی ضرورت ہے۔“

ایز کئیل نے حیرت سے ماسٹرلی کی طرف دیکھا اور بولا، ”آپ کو یہ سب کیسے معلوم؟ آپ مجھے اتنی گہرائی سے کیسے جانتے ہیں؟“

ماسٹرلی مسکرا کر بولے، ”کیوں کہ میں تم ہوں، ایز کئیل۔ میں تمہاری ہی کہانی ہوں، ماضی سے۔“

ایز کئیل نے حیرانی سے آنکھیں پھیلانیں، ”یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ کا کیا مطلب ہے؟“

ماسٹرلی نے نرمی سے کہا، ”یہ ایک طویل کہانی ہے، جسے کل سناؤں گا جب سورج طلوع ہو گا۔ ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے، کیوں کہ تمہارے سامنے ایک بڑی آزمائش ہے۔“

ایز کنیل الجھن اور تجسس سے ماسٹرلی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، ”میرے پاس بہت سے سوالات ہیں۔ میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔“

ماسٹرلی نے پیار سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا، ”سچ وقت کے ساتھ سامنے آجائے گا، لیکن ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ مجھ پر بھروسہ کرو، ایز کنیل، جیسے تم خود پر بھروسہ کرتے ہو۔“

ایز کنیل نے سر ہلایا اور کہا، ”ٹھیک ہے، ماسٹر۔ میں آپ کی بات مان لیتا ہوں، اگرچہ لفظ۔‘ بھروسہ‘ میرے لیے ہمیشہ سے ایک زہر کی طرح تلخ رہا ہے۔“

ماسٹرلی نے اطمینان بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”اس بار ایسا نہیں ہو گا۔ خیر، اب جا کر سو جاؤ۔“

ایز کنیل اٹھا اور اندھیرے کمرے کی طرف چل پڑا۔

ماسٹرلی نے اُس کو جاتے ہوئے دیکھا اور ایک خاموش فخر کے ساتھ مسکرائے۔ ”مجھے تم پر فخر ہے، ایز کنیل۔ اور اُس پر جو تم بنو گے۔“

ایک نئی صبح کا آغاز ہوا۔ برف آہستہ آہستہ گر رہی تھی، برف ہر ایک ذرہ زمین پر اترتے ہی اس جگہ کو مزید چمکدار بنا رہا تھا۔

ہوا تیز اور کاٹ دار تھی، ایک ایسی سردی جو ہڈیوں کے اندر تک اترتی محسوس ہو۔ پہاڑ کی چوٹی پر شاو لن مندر اپنے پورے جلال اور شکوہ کے ساتھ ایستادہ تھا، اُس کی پیچیدہ نقش و نگار سے سچی چھتیں اور دیواریں برف کی تہہ میں دفن ہو چکی تھیں۔

اس تاریخی مقام کا حسن اور اس کی سختیاں ایک ہی ساتھ عیاں تھیں۔

مندر کے سامنے برف سے ڈھکے صحن میں طلباء کا ایک گروہ تربیت میں مصروف تھا، ننگے بدن، صرف پتلون پہنے وہ طلباء اپنے وجود کو سردی کے حملوں کے سامنے ڈھال رہے تھے، جیسے سخت موسم اُن کے فولادی عزم کی آزمائش ہو۔

ان میں سب سے آگے، ایز کئیل بھی کھڑا تھا، جو مسٹر لی کے ساتھ دور دراز سویڈن سے آیا تھا۔ اُس کے ماضی کی تاریکی اور دردناک یادیں اب اُس کے وجود کا حصہ بن چکی تھیں، لیکن یہاں مندر میں اُسے نیا مقصد اور ایک نیا خاندان ملا تھا۔

وہ آٹھ سال سے مسلسل تربیت کر رہا تھا، جس کے دوران اُس نے کنگ فو کے اسرار و رموز کو اپنی روح میں پیوست کر لیا تھا۔

ایز کنیل اب ایک نو عمر لڑکا نہیں رہا تھا، وہ ایک طاقتور، خطرناک نوجوان بن چکا تھا۔ اُس کا جسم، جیسے فولاد کا ڈھلا ہوا، ہر عضلہ کسی چٹان کی مانند ابھرا ہوا تھا، اُس کی رگیں اس کے بازوؤں اور ٹانگوں پر ایسی چمک رہی تھیں جیسے اُن میں خون نہیں، لوہا بہہ رہا ہو۔

اُس کے لمبے شاہ بلوطی رنگ کے بال، جو اب اُس کے کندھوں تک پہنچتے تھے، ماتھے پر بندھے سرخ کپڑے کے ساتھ، یوں دکھائی دیتے جیسے کسی جنگجو کا پرچم لہرا رہا ہو۔

وہ اس وقت اپنی ایک انگلی پر، سر کے بل، بغیر کسی جنبش کے توازن برقرار رکھے ہوئے تھا۔ برف اُس کے چاروں طرف گر رہی تھی، لیکن اُس کے وجود سے ٹکرانے پر پگھل جاتی۔

ایک پورا گھنٹہ گزر چکا تھا، لیکن نہ اُس کے ماتھے پر پسینہ تھا، نہ اُس کی سانسوں میں اضطراب۔ یہ وہ ہی ایز کنیل تھا جس نے اپنی محنت اور عزم سے اپنے جسم کو درد کے شکنجے میں ڈھالا تھا، جو پتھروں کو اپنے ماتھے سے توڑ سکتا تھا، جو لوہے کی سلاخوں کو اپنے ہاتھوں سے مروڑ سکتا تھا۔

وہ ایک دیوانہ تھا۔ ایک بے خوف اور خطرناک وجود، جس کی اندرونی آگ دن بدن بھڑکتی جا رہی تھی۔ اُس کی طاقت میں اب ایسی شدت آگئی تھی کہ اُس نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا جہاں وہ پانی پر چل سکتا تھا،

دیواروں کو بغیر سہارے کے پھلانگ سکتا تھا، اُس کی چھاتی پر جب تلوار سے وار کیا جاتا، تو لوہے کی دھار کندہ ہو کر پلٹ جاتی۔

اُس کی بے پناہ طاقت کے سامنے کوئی بھی چیز مضبوط نہیں تھی۔

وہ اب بیس سال کا ہو چکا تھا، ایک ایسی عمر میں جہاں اُس کا بدن فولاد، ذہن چاقو کی دھار اور اُس کا دل انتقام کی آگ سے بھرا ہوا تھا۔

اُس کے لیے کنگ فو کی تربیت محض جسمانی نہیں تھی، یہ اُس کے اندر کی وحشی آگ کو ایندھن فراہم کرنے کا ذریعہ تھی۔ ہر لمحہ، ہر تربیت کا لمحہ، اُس کے اندر رونی غضب کو مزید بھڑکاتا تھا۔

ماضی کا سایہ ابھی بھی اُس کے تعاقب میں تھا۔ اُس کا چچا، ڈریک، جس نے اُس کے خاندان کو برباد کیا تھا، اُس کی دولت، اُس کی عزت، اُس کے پیارے چھین لیے تھے۔

اُس کے دل میں نفرت کا ایک لاوا بہہ رہا تھا، ایک ایسا لاوا جو اُس کی رگوں میں دوڑتا، اُسے سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ وہ اپنے چچا کے چہرے کو، اُس کی مسکراہٹ کو، اور اُس کے ہاتھوں میں چھپے ظلم کو ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا تھا۔

ایز کنیل نے اپنے چچا کو معاف نہیں کیا تھا۔ اور کبھی کرے گا بھی نہیں۔ اُس کی نفرت وقت کے ساتھ بڑھتی گئی تھی، جیسے ہر تربیتی مشق، ہر آزمائش اُسے اُس انتقام کے قریب لے جا رہی ہو جس کا وہ انتظار کر رہا تھا۔ اُس کا دل ایک آتش فشاں تھا، اور وہ لمحہ جب وہ اپنے چچا کا سامنا کرے گا، وہ اُس کے اندر کی آگ کو آزاد کر دے گا۔

لیکن ایز کنیل نے کبھی اپنی تربیت کو ترک نہیں کیا۔ اُس نے اپنے انتقام کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے اُسے اپنے اندر دفن کر رکھا تھا، اُس لمحے کا انتظار کر رہا تھا جب اُسے مندر سے نکل کر اپنا مقصد پورا کرنے کا موقع ملے گا۔

وہ جانتا تھا کہ مسٹر لی اُس کے ساتھ ہیں، اُس کے سر پرست، جنہوں نے اُس کی ہر قدم پر رہنمائی کی، اُسے زندگی کے اصول سکھائے۔

مگر ایز کنیل کے دل میں محبت کی جگہ نفرت نے لے لی تھی، اور اُس کے لیے اب صرف ایک ہی مقصد تھا۔ اپنے چچا کو تباہ کرنا، اور اپنے خاندان کی عزت کو واپس لینا۔

ہوا میں برف کے گرتے گالوں کے درمیان، ایز کنیل کا وجود ایک پگھلتے آتش فشاں کی مانند لگ رہا تھا، جسے کسی بھی لمحے بھڑکنا تھا۔

ایز کنیل اپنے کمرے میں تنہا تھا، جیسے ایک شیر اپنے شکار کی تاک میں ہو۔ کمرے میں محض لکڑی کا فرش اور دیواروں پر چند پرانے طومار تھے جو اُس کی طویل مشقوں کے گواہ تھے۔ وہ اپنے ننگے مٹھیوں سے اینٹوں کی دیوار پر مسلسل ضرب لگا رہا تھا۔

اُس کے مکے دیوار کے جمود کو چیرنے والے کسی آتش فشاں کی مانند تھے، اور ہر ضرب کے ساتھ دیوار میں نئی دراڑیں پیدا ہو رہی تھیں۔ ایز کنیل کے بازوؤں کی رگیں ابھر کر پھٹنے کو تیار تھیں، اُس کے جسم سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی تھیں، جیسے زہر اُس کی رگوں میں دوڑتا ہو۔

اُس کی فندق رنگ کی آنکھیں نفرت اور انتقام کی چمک سے جل رہی تھیں۔

ہر وار، ہر مکا اُس کی اندرونی آگ کو اور بھڑکا رہا تھا۔ وہ ایک قید شدہ جانور تھا جسے اپنی قید سے نکلنے کی جلدی تھی۔ اُس کی سانسیں تیز تھیں، اُس کا جسم درد کی ہر لہر کو قبول کرتا تھا، جیسے وہ اس درد سے زندگی کھینچ رہا ہو۔

وہ اب ایک عام انسان نہیں رہا تھا؛ وہ ایک ایسا جنگجو تھا جس کے اندر نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اُس کے ہر وار میں انتقام کا زہر گھلا ہوا تھا۔

وہ اپنی زندگی کو کنگ فو کی تربیت کے لیے وقف کر چکا تھا، اور اب اس کے وجود کا ہر لمحہ، ہر سانس، اُس انتقام کی تکمیل کے لیے تھا جو اُس کے دل میں جل رہا تھا۔

اچانک، دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ رکا، اُس کی آنکھوں میں چمک اور زیادہ شدید ہو گئی۔ اُس نے اپنی مٹھیاں کھولی اور مڑ کر دیکھا۔ دروازے پر ایک نوجوان راہب، خوفزدہ اور ہانپتا ہوا، کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں دہشت اور گھبراہٹ تھی، جیسے کسی ہولناک خبر کا پیغامبر ہو۔

”بھائی، میں ایک ضروری خبر لے کر آیا ہوں... ماسٹرلی... وہ اپنی آخری سانسیں لے رہے ہیں۔“ اُس کی آواز لرز رہی تھی، جیسے وہ اپنی سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ایز کئیل نے اپنے سینے میں جذبات کی ایک طوفانی لہر محسوس کی۔ ایک پل کے لیے تو اس نے سوچا کہ کیا واقعی یہ لمحہ آگیا ہے؟ صدمہ، اداسی، اور خوف کی ایک گھنی چادر اس کے دل پر چھا گئی۔

ماسٹرلی، اس کے سر پرست، استاد، اور روحانی باپ، اس کی زندگی کے ہر موڑ پر اس کا ساتھ دینے والے، اب ایک کمزور حالت میں بستر پر تھے۔ ایز کئیل جانتا تھا کہ یہ دن آئے گا، لیکن وہ اس کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہوا تھا۔

اس نے سختی سے نگلا اور نوجوان راہب کو سر ہلایا۔ پھر وہ جلدی سے اپنے لباس اور جوتے پہنے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

مندر کی راہداریوں سے گزرتے ہوئے، دوسرے راہبوں کی نگاہوں میں تجسس اور ہمدردی کی جھلک تھی۔ ایز کئیل کے دل میں ایک عجیب سا درد محسوس ہو رہا تھا، جیسے ہر قدم کے ساتھ اس کی دل کی دھڑکن سست ہو رہی ہو۔

جب وہ ماسٹرلی کے چیمبر میں پہنچا، تو یہ ایک بڑا اور آرائشی کمرہ تھا، جہاں بدھا کا مجسمہ، کنول کا تالاب، اور ایک بستر تھا۔ اس نے دیکھا کہ ماسٹرلی موم بتیوں اور بخور کے دھوئیں میں گھرا ہوا بستر پر لیٹے ہیں۔

وہ بہت کمزور اور پیلے پڑ چکے تھے، لیکن جب انہوں نے ایز کئیل کو دیکھا تو ان کی آنکھوں میں ایک مسکراہٹ چمکی۔ انہوں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

ایز کئیل نے ان کے پہلو میں گھٹنے ٹیک کر ان کا ہاتھ پکڑا۔ نبض سست اور بے ہوش محسوس ہوئی، جیسے وقت رک گیا ہو۔ اس نے گہری اور عقلمندی سے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ آہستگی سے اس نے کہا، ”ماسٹر، میں حاضر ہوں۔“

ماسٹرلی نے کھانسی کی اور ان کی آواز بمشکل سرگوشی میں ڈھل گئی۔ ”ایز کئیل، کیا تم جانتے ہو کہ تم میں اور مجھ میں کیا مشترک ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

ایز کئیل نے اپنی آواز کو سنبھالتے ہوئے قریب جھک کر جواب دیا، ”کیا ماسٹر؟“

ماسٹرلی نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں، پھر دوبارہ کھولیں۔ ”ہم دونوں نے اپنے والدین کو ایک ہی طریقے سے کھو دیا۔ میرے چچا نے، طاقت اور لالچ کی خاطر، میرے ماں باپ کو سرد میں خون جما کر مارا۔

اس نے مجھے بھی مارنے کی کوشش کی، لیکن میرے دادا نے مجھے بچا لیا۔ وہ مجھے اس مقام تک لے آئے جہاں میں نے شاولن کا طریقہ سیکھا۔ میں نے معاف کرنا، شفا دینا، اور خدمت کرنا سیکھا۔ میں نے سیکھا کہ جو لوگ اس دنیا میں برائی کرتے ہیں وہ اگلی دنیا میں اپنا حساب دیں گے۔ اس لیے میں اپنی طاقت کو امن و سکون کے لیے استعمال کرتا ہوں۔”

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ایز کئیل کی آنکھوں میں آنسو تھے، لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماسٹرلی نے پھر کہا، ”ہیر و اور ولن میں ایک چیز مشترک ہے، کیا تم جانتے ہو؟“

ایز کئیل نے سر ہلایا، اور آنکھوں میں ایک پل کی چمک آئی۔ ”کیا ہے، ماسٹر؟“

ماسٹرلی نے مسکرا کر جواب دیا، ”و لن کہتا ہے،‘ میں دنیا کے تمام درد کا علاج نہیں کر سکتا، لیکن میں ان کے ساتھ برا کر کے انہیں اپنا درد دکھا سکتا ہوں۔‘ اور ہیر و کہتا ہے،‘ اگر میرے ساتھ برا ہوا ہے تو مجھے دوسروں کو تکلیف نہیں دینی چاہیے۔“

ماسٹرلی پھر مسکرائے، ان کی آنکھوں میں گہرائی تھی۔ ”ہاں، یہ درست ہے۔ اور تم، ایز کئیل، تم ایک ہیر و ہو۔ تم نے بہت زیادہ قابو پا لیا ہے، پھر بھی تم نے انتقام کی آگ کو بھسم نہیں ہونے دیا۔ تم نے شاولن کے طریقے کی پیروی کی ہے، اور تم ایک عظیم جنگجو اور ایک عظیم انسان بن گئے ہو۔ مجھے تم پر فخر ہے، بیٹا۔ تم میرے گونا گوار ہو۔“

گونار کا مطلب جنگجو ہوتا ہے۔ اور ایز کنیل حقیقت میں جنگجو تھا۔

ایز کنیل نے اپنے گلے میں ایک گانٹھ محسوس کی۔ ”میں آپ کا گونار ہوں، ماسٹر۔ آپ بہت مہربان ہیں۔ آپ میرے لیے باپ کی طرح ہیں۔“

ماسٹر لی نے آگے بڑھ کر ایز کنیل کے گال کو چھوا۔ ”مجھے ایک اور بات بتانی ہے، ایز کنیل۔ ایک چیز جسے میں نے کافی عرصے سے خفیہ رکھا ہوا ہے۔ کوئی ایسی چیز جو تمہیں چونکا دے، لیکن مجھے امید ہے کہ تم مجھے سمجھو گے۔“

ایز کنیل نے تجسس اور تشویش سے ان کی طرف دیکھا۔ ”ماسٹر، کیسی بات؟“

ماسٹر لی نے ایک گہرا سانس لیا، اور کہا، ”میں ایک مسلمان ہوں، ایز کنیل۔ میں کئی سالوں سے مسلمان ہوں۔ میں نے اسلام قبول کیا جب میں جوان تھا، جب میں ایک عقلمند اور شریف آدمی سے ملا جس نے مجھے اللہ اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سکھایا۔ اس نے مجھے اپنے ایمان کی خوبصورتی اور سچائی دکھائی، اور میں نے ایک ایسا تعلق محسوس کیا جس سے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔“

ایز کنیل نے چونک کر ماسٹر لی کو دیکھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا سن رہا ہے۔ ”ماسٹر، آپ یہ سب کیسے کر سکتے ہیں؟ آپ مجھ سے، ہم سب سے جھوٹ کیسے بول سکتے ہیں؟ آپ بیک وقت مسلمان اور شاولن راہب کیسے ہیں؟“

ماسٹر لی نے اس کی طرف اداسی اور شفقت سے دیکھا۔ ”ایز کئیل، براہِ کرم ناراض نہ ہو۔ مجھے مت آزماؤ۔ اس کو تبدیل نہ ہونے دو کہ تم میرے بارے میں یا اپنے بارے میں کیسا محسوس کرتے ہو۔ میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا، میں نے صرف اپنے ایک حصے کو روکا جو میں نے محسوس کیا کہ ہمارے تعلقات سے متعلق نہیں ہے۔ میں تمہیں الجھانا نہیں چاہتا تھا، یا کسی پریشانی کا سبب نہیں بننا چاہتا تھا۔“

”لیکن، ماسٹر...“ ایز کئیل نے تڑپتے ہوئے کہا، ”یہ تو ایک دھوکہ ہے!“

ماسٹر لی نے گہری سانس لی اور کہا، ”میں اپنے عقائد تم پر یا کسی اور پر مسلط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم اپنا راستہ، اپنا ایمان، اپنی سچائی خود تلاش کرو۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں، ایز کئیل، اور میں ہمیشہ کروں گا۔ اسے کچھ نہیں بدل سکتا۔ جو کچھ ہم نے بانٹا ہے، جو کچھ ہم نے سیکھا ہے، وہ سب کچھ تبدیل نہیں ہو سکتا۔“

ایز کئیل نے اپنے سینے میں ایک نئی لہر محسوس کی — یہ غم، محبت، اور اداسی کا ملا جلا احساس تھا۔ ”ماسٹر، آپ میرے لیے سب کچھ ہیں۔“

ماسٹر لی نے مسکرا کر کہا، ”ایز کئیل، میں نے ہمیشہ شاولن کے راستے کا احترام کیا ہے، اور میں نے کبھی بھی دونوں راستوں کے درمیان کوئی تنازعہ محسوس نہیں کیا۔ وہ دونوں ایک ہی منبع، ایک ہی روشنی، ایک ہی محبت کی طرف لے جاتے ہیں۔“

ایز کنیل نے گہری سانس لی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے محسوس کیا کہ ماسٹر لی اب بھی وہ ہی شخص ہیں، جسے وہ ہمیشہ جانتا تھا، ہمیشہ احترام کرتا تھا، ہمیشہ پیار کرتا تھا۔ اس کے دل میں ایک سکون کی لہریں دوڑ گئی، اور اسے محسوس ہوا کہ اسے ماسٹر لی کی ضرورت ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک تلخ لمحہ ہے، لیکن اس نے اپنے دل کی آواز سنی۔ اس نے ماسٹر لی سے محبت کی تھی، اور وہ ہمیشہ کرے گا۔

۔ ”جی، ماسٹر، میں آپ کے ایمان اور آپ کی پسند کا احترام کرتا ہوں۔ میں آپ سے پیار کرتا ہوں، ماسٹر۔ آپ میرے والد، میرے استاد، میرے دوست، میرے بھائی ہیں۔ آپ میرے شاولن ہیں۔ میں آپ کو سمجھتا ہوں۔“

ماسٹر لی مسکرائے اور ایک آہ بھر کر کہا، ”تمہارا شکریہ، ایز کنیل۔ مجھے سمجھنے کے لیے شکریہ۔ مجھ سے محبت کرنے کے لیے شکریہ۔ میرے بیٹے ہونے کا شکریہ۔“

پھر، ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ماسٹر لی نے کہا، ”ایک آخری خواہش، کیا تم میرے لیے یہ کرو گے، بیٹا؟“

ایز کنیل نے پھر سر ہلایا، ”کچھ بھی، ماسٹر۔ آپ جو چاہیں۔“

۔ ”ایز کنیل...“ ماسٹر لی کی آواز کمزور اور مدہم تھی، لیکن ان کے الفاظ میں ایک غیر معمولی وزن تھا۔

۔ ”میرے لیے میری آخری رسومات مسلم طریقے سے ادا کرنا۔“ انہوں نے رک کر ایک گہرا سانس لیا، گویا وہ دنیا سے رخصت ہونے کی آخری تیاری کر رہے ہوں۔

ایز کنیل کے دل میں ایک لمحے کے لیے دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے ماسٹر لی کی طرف دیکھا، ان کے جھریوں بھرے چہرے پر سکون کی ایک عجیب سی روشنی تھی۔

۔ ”جب میں مر جاؤں، تو میرے لیے شہادت کہنا، جیسے میں نے تمہیں سکھائی تھی۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اسے تین بار دہرانا، پھر آہستہ سے میری پلکیں موند دینا... اور میرے ناتواں جسم کو سفید کفن میں لپیٹ دینا۔ پھر کسی قریبی مسجد سے امام صاحب اور چند لوگوں کو بلا لینا، انہیں کہنا کہ میرا جنازہ پڑھا دیں... اور جب یہ فریضہ ادا ہو جائے، تو مجھے مسلمانوں کے قبرستان میں لے جا کر امانتاً خاک کے سپرد کر دینا۔“

ایز کنیل نے ان الفاظ کو سننے کے بعد خود کو اور زیادہ بے بس محسوس کیا۔ وہ کبھی بھی ماسٹر لی کی باتوں سے انکار نہیں کر سکا تھا، اور آج بھی، جبکہ موت ان کے قدموں میں بیٹھ چکی تھی، وہ ان کے حکم کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔

مگر آج کا دن کچھ الگ تھا۔ آج کا حکم صرف ایک تعلیم یار روایتی تربیت کا حصہ نہیں تھا، بلکہ یہ ماسٹر لی کی آخری وصیت تھی۔ ایک آخری درخواست، جسے وہ پورا کرنا چاہتا تھا، مگر دل کے اندر کہیں ایک اندیشہ تھا جو اسے جکڑ رہا تھا۔

۔ ”میں جو دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ رہے، ایز کئیل... ”ماسٹرلی کی آوازاں اور زیادہ مدھم ہو چکی تھی۔
”میرے سامنے جو ہے، وہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔“

ایز کئیل کی آنکھوں میں نمی بھر آئی۔ ماسٹرلی کی باتیں روحانی تھیں، اور ان کا ہر لفظ دل کے اندر کہیں گہرائی میں جا کر رچ بس رہا تھا۔ مگر وہ اندر ہی اندر تذبذب کا شکار تھا۔

کیا وہ ماسٹرلی کی آخری خواہش کو پورا کر سکتا تھا؟ کیا یہ اس کے اپنے ایمان اور روحانی عقائد کے خلاف نہیں تھا؟ اس کے دل میں ایک لمحے کے لیے ہچکچاہٹ پیدا ہوئی۔

اس نے آنکھیں بند کیں،، مگر ماسٹرلی کی سالوں پر محیط تربیت اور ان کی محبت اس کے ذہن میں گونجنے لگی۔

۔ ”کیا تم میرے لیے ایسا کرو گے، ایز کئیل؟“ ماسٹرلی کی آواز میں ایک آخری امید کی جھلک تھی، جیسے ان کی روح ایز کئیل کے جواب کی منتظر ہو۔

ایز کئیل کی سانسیں بھاری ہو گئیں۔ اس کا دل دو متضاد سمتوں میں کھینچ رہا تھا۔ ایک طرف ماسٹرلی کا حکم، ان کا پیار، ان کی تربیت؛ اور دوسری طرف اس کا اپنا ایمان، اپنی شناخت۔

مگر اس لمحے اسے یہ احساس ہوا کہ ماسٹرلی صرف ایک استاد نہیں تھے، وہ اس کے لیے باپ جیسے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اس کا ساتھ دیا تھا، اس کی ہر قدم پر رہنمائی کی تھی، اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ کیا وہ ان کی آخری خواہش پوری نہیں کر سکتا تھا؟

۔ ”جی، استاد...“ ایز کنیل کی آواز کانپ رہی تھی، جیسے وہ اپنی ہمت مجتمع کر رہا ہو۔ ”میں آپ کے لیے ایسا کروں گا۔“

ماسٹرلی کی آنکھوں میں سکون اتر آیا۔ ان کے چہرے پر ایک نرم مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”شکریہ، بیٹا! اللہ تمہیں جزا دے۔“ انہوں نے آہستہ سے کلمہ شہادت کا ورد شروع کیا، اور پھر ان کی آنکھیں ساکت ہو گئیں، جیسے وہ اپنی روح کو خدا کے سپرد کر رہے ہوں۔

ایز کنیل کے دل میں ایک زوردار دھڑکن ہوئی۔ اس نے آنکھیں میچ لیں، اور ایک لمحے کے لیے دنیا اس کے گرد ساکت ہو گئی۔ آنسو بے ساختہ اس کی آنکھوں سے بہنے لگے، اور اس نے محسوس کیا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی ذمہ داری اٹھا چکا ہے۔ ماسٹرلی کی آخری خواہش۔ کچھ وقت بعد

ایز کنیل نے دھیرے سے کلمہ شہادت دہرانا شروع کیا۔ ”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں...“ اس کے الفاظ لرز رہے تھے، جیسے اس کے دل میں ایک بھاری بوجھ ہو۔ ”محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں۔“ اس نے یہ الفاظ تین بار دہرائے، ہر بار اس کی آواز مزید لرز جاتی، جیسے وہ کسی نامعلوم خوف کا سامنا کر رہا ہو۔

اس کے دل میں ہلچل مچ رہی تھی۔ کیا وہ یہ سب ماسٹر لی کے لیے کر رہا تھا، یا خود اپنے لیے؟ کیا یہ اس کے دل سے نکلے الفاظ تھے، یا محض ایک فرض کی ادائیگی؟ وہ نہیں جانتا تھا، لیکن وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ اس نے وہ ہی کیا تھا جو ماسٹر لی چاہتے تھے۔

اس نے ماسٹر لی کی آنکھیں بند کیں، ان کے لبوں پر سکون کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی، جیسے ان کی روح اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکی ہو۔ ایز کئیل نے ان کے جسم کو سفید کفن میں لپیٹ دیا، ان کے اعضاء کو سیدھا کیا، اور ان کا رخ مکہ کی طرف کر دیا۔

وہ جانتا تھا کہ اس نے ماسٹر لی کے لیے جو کچھ کیا، وہ محبت اور احترام کا آخری اظہار تھا۔ لیکن اس کے دل میں اب بھی ایک عجیب سی خالی پن تھی۔ کیا یہ سب کافی تھا؟ کیا اللہ اسے قبول کرے گا؟ کیا ماسٹر لی کے ایمان کا یہ آخری عمل اس کے لیے درست تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا۔

ایز کئیل نے ایک آخری نگاہ ماسٹر لی کے چہرے پر ڈالی، اور دھیرے سے دعا کی۔ ”اے اللہ، ماسٹر لی کو سکون عطا فرما، ان کی مغفرت فرما۔“

اس نے دعائوں کی، مگر یہ دعا شاید صرف ماسٹر لی کے لیے تھی۔ خود اُس کا کسی مذہب پر یقین نہیں تھا۔ کلمہ پڑھتے وقت اُس کا دل عجیب کیفیت سے دوچار تھا، جیسے یہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے نہیں بلکہ محض ماسٹر لی کی خواہش کی تکمیل کے لیے ادا ہو رہے ہوں۔ ہر لفظ میں ایک اندرونی خلش اور بے یقینی کی گونج محسوس ہو رہی تھی۔

اُس نے اس کیفیت کو یوں نظر انداز کر دیا کہ یہ صرف ماسٹر لی کے لیے ہے۔ وہ کسی بھی طرح اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اُس نے خود کو یہ سمجھایا کہ یہ صرف ایک عارضی جذباتی بہاؤ ہے، اور اس خیال کو اپنے دل سے جھٹک دیا، جیسے یہ کوئی بے بنیاد شے ہو۔

اُس کی روح میں موجود اس جھنجھلاہٹ کو وہ زبردستی دبانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اندر ہی اندر، ایک چنگاری جلتی رہی جو اُس کی سچائی کا انتظار کر رہی تھی۔

جب ماسٹر لی کو دفنایا جا رہا تھا، تو ایز کئیل کے قلب میں ایک عجیب سا روحانی اضطراب چھایا ہوا تھا۔ اُس کا دل، بظاہر سکون میں تھا، لیکن باطن میں ایک طوفان سا چل رہا تھا، جیسے روح اور ضمیر کے درمیان کوئی پوشیدہ جنگ جاری ہو۔ ٹیمپل کے لوگوں نے جنازے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی، وہ خاموشی سے اس عمل میں شامل تھے، جیسے ماسٹر لی کی رخصتی کو تقدیر کی ایک لازم شے سمجھا جا رہا ہو۔

ماسٹر لی کو مسلمان قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا، اور جنازے میں کچھ قریبی لوگ شامل تھے۔ اس ظاہری سکون کے باوجود، ایز کئیل کے دل میں ایک انجانا سا بوجھ اتر رہا تھا۔ جیسے کسی نامعلوم فرض کی ادائیگی نے اُس کے وجود کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہو۔ جب اُس نے ماسٹر لی کے سکھائے ہوئے کلمات دہرائے، تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہی وجود کو دھوکہ دے رہا ہو، جیسے اپنے عقائد اور پہچان کے ساتھ خیانت کر رہا ہو۔

یہ کلمات زبان سے تو نکل رہے تھے، مگر دل میں ایک غیر مرئی شور برپا تھا، جیسے یہ الفاظ اُس کی حقیقت کے خلاف جارہے ہوں۔ دل میں یہ سوال بھر رہا تھا کہ کیا یہ واقعی اُس کا یقین ہے؟ یا یہ صرف ماسٹر لی کی خاطر ادا کیے گئے الفاظ تھے؟ اُس نے ماسٹر لی کے سکھائے ہوئے عقیدے کا احترام تو کیا، مگر دل کی گہرائیوں میں اس احترام کی صداقت نہیں تھی۔

ایک لمحہ کے لیے، ایز کئیل نے خود کو دو دنیاؤں کے درمیان گھرا ہوا پایا۔ ایک دنیا وہ تھی جس میں وہ ماسٹر لی کے عقیدے کو عزت دے رہا تھا، اور دوسری وہ جس میں اُس کے اندر بے یقینی کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں۔

یہ چنگاریاں اُس کے دل میں ایک سوال چھوڑ گئیں کہ کیا یہ عمل صحیح تھا؟ کیا یہ واقعی اخلاص پر مبنی تھا؟ کیا وہ ماسٹر لی کی روح کے سامنے سچائی کے ساتھ کھڑا تھا، یا یہ محض ایک فرض شناسی تھی؟

یہ تمام سوالات اُس کے دل کے خلا میں گونج رہے تھے، مگر ساتھ ہی ایک عجیب سی فرض شناسی بھی اُس کے وجود میں رقص کر رہی تھی۔ اُس کے دل میں وفاداری اور احسان مندی کا ایک دریا بہہ رہا تھا، جیسے ماسٹر لی کے سامنے وہ ایک مقروض تھا، جیسے یہ اُس کی آخری ذمہ داری تھی۔

اس اندرونی کشمکش کے باوجود، ایز کئیل نے ماسٹر لی کو اُس عقیدے کے مطابق عزت دی، جسے وہ جانتا تھا کہ اُن کے لیے اہم تھا۔

لیکن اُس کے اپنے ایمان اور شناخت کے درمیان ایک گہری خلیج پیدا ہو گئی تھی، جیسے دل اور زبان دو مختلف سمتوں میں چل رہے ہوں۔

اُس کے اندر یہ کشمکش جاری رہی کہ آیا اُس نے جو کچھ کیا، وہ سچائی کے ساتھ تھا یا صرف وفاداری اور انسانیت کے تقاضوں کے تحت۔

دل اور زبان کا فرق اسے بخوبی محسوس ہو رہا تھا۔ زبان کا اقرار عارضی اور بدلنے والا ہوتا ہے، لیکن دل کا یقین ثابت قدمی کی علامت ہے۔ وہ جو الفاظ جو اس نے دہرائے تھے، وہ صرف ظاہری طور پر ادا کیے گئے تھے، دل کی گہرائیوں سے نہیں نکلے تھے۔

ایز کنیل جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، وہ صرف ماسٹر لی کے لیے کر رہا تھا، اپنے لیے نہیں۔ اُس کے دل میں ایک غیر یقینی سی کیفیت تھی کہ آیا یہ عمل اُس کے ایمان کے مطابق تھا یا نہیں۔ مگر وہ اس سوال سے لاعلم تھا کہ اس عمل کا انجام کیا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اُسے قبول فرمائیں گے یا اُس کے عقیدے کو آزمایا جائے گا؟

ایز کنیل کے دل میں یہ سوالات گویا کسی طوفان کی مانند گونج رہے تھے۔ کیا واقعی کوئی خدا موجود ہے؟ اگر کوئی خدا تھا، تو پھر اُس کے ساتھ یہ مصیبتیں کیوں آئیں؟ اُس کی زندگی میں اتنا اندھیرا کیوں چھا گیا؟

اگر کوئی رب تھا، تو اُس نے اُس کے خاندان کو اُس سے کیوں چھین لیا؟ کیوں اُس کا بھائی ایسی دردناک موت سے دوچار ہوا، جو کسی سنگین آزمائش سے کم نہ تھی؟

یہ سوالات اُس کے وجود میں گھلتے جا رہے تھے، جیسے ہر سوال ایک زخم بن کر اُسے کرید رہا ہو۔ اگر واقعی کوئی خدا ہے، تو کہاں ہے وہ؟ کیوں نہیں اُس کی آواز سنی جا رہی؟ کیوں نہیں اُس کی چیخیں کسی آسمان تک پہنچ رہی؟ اُس کا دل شک و شبہات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، ایک لامتناہی الجھن میں پھنس چکا تھا۔

کیا واقعی یہ دنیا کسی خالق کے حکم سے بنی ہے؟ یا یہ سب ایک بے مقصد سراپ ہے، ایک بے منزل سفر؟ وہ ان سوالات کا کوئی جواب نہیں پارہا تھا، اور دل میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ زندگی کے حقیقی معنوں کی تلاش میں سرگرداں تھا، لیکن اُس کے دل کے اندر ایک انکار تھا، ایک انکاری کیفیت جو اُسے کسی بھی مذہب کو تسلیم کرنے سے روک رہی تھی۔

اُس کے دل میں یہ احساس ابھرتا تھا کہ شاید سب کچھ بے مقصد ہے، شاید کوئی الہی طاقت نہیں ہے جو اس دنیا کو سنبھالتی ہو، اور شاید وہ ایک ایسے سفر پر ہے جس کی کوئی منزل ہی نہیں۔ وہ ان سوالات کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا، جیسے ایک تلاش میں ہو، مگر جواب نہ پارہا ہو۔

وہ ٹھیک وہیں کھڑا تھا، جہاں آٹھ برس قبل ماسٹر لی کے ساتھ قدم رکھا تھا، اپنے دوسرے گھر یعنی شاولن ٹیمپل کی جانب نظر دوڑاتا ہوا۔ مندر کا منظر انتہائی دلفریب تھا، قدیم طرزِ تعمیر اور پیچیدہ نقش و نگار دھوپ کی روشنی میں چمک رہے تھے، گویا کوئی خوابیدہ حقیقت ہو۔

ارد گرد کے درخت، گھنے اور سرسبز، ہوا کے ہلکے جھونکوں سے سرسراتے ہوئے کسی پراسرار خاموشی کا حصہ معلوم ہوتے تھے۔ نیلا آسمان بالکل صاف تھا، بس چند بادل آہستگی سے تیرتے نظر آرہے تھے، جیسے سکوت میں کسی سفر پر گامزن ہوں۔

اس نے سیاہ جینز اور میرون شرٹ کے ساتھ سفید جوگرز پہنے ہوئے تھے، اوپر سے سیاہ ڈینیم جیکٹ اس کے بدن کو مزید سخت اور پرکشش بنا رہی تھی۔

ہاتھوں میں چند انگوٹھیاں چمک رہی تھیں اور کندھے تک کے بال ایک ربڑ بینڈ سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کی پیٹھ پر ایک سپورٹس بیگ لٹک رہا تھا جس میں اس کا سامان اور ہتھیار موجود تھے۔ ظاہری طور پر وہ ایک جدید اور سچیلانوجوان دکھائی دیتا تھا، لیکن اندرونی طور پر وہ ایک ماہر شاولن جنگجو تھا۔ قاتلانہ مہارتوں اور بے رحمانہ قوت کا حامل۔

ایک لمحے کے لیے وہ ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ اداسی اور غم کا سایہ اس پر چھا گیا جب اسے ماسٹر لی کے ساتھ یہاں آنے کا پہلا دن یاد آیا۔ اسے وہ لمحہ یاد آیا جب ماسٹر لی نے اس کا استقبال کیا تھا، اسے نہ صرف جنگجو بنایا بلکہ ایک بہتر انسان بننے کی راہ پر ڈالا تھا۔

اسے وہ لمحات یاد آئے جب ماسٹر لی نے اپنے راز، اپنے عقائد اور اپنی آخری خواہش کو آشکار کیا تھا، اور پھر ایز کنیل کی بانہوں میں دم توڑ دیا تھا، ایک ابدی سکون کے ساتھ۔

ایز کنیل نے ایک گہری سانس لی، اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسے اپنے دل میں ایک خالی پن محسوس ہوا، جیسے کسی نے اس کی روح سے کوئی قیمتی چیز چھین لی ہو۔

اس نے آنکھیں دوبارہ کھولیں اور مندر کو دیکھا۔ اس کے اندر شکر گزاری اور احترام کا ایک شدید احساس ابھرا، ہر اُس شے کے لیے جو شاولن ٹیمپل نے اسے دیا تھا، اور ہر وہ سبق جو ماسٹر لی نے اسے سکھایا تھا۔

اس کا کسی رب یا مذہبی نظام پر یقین تو نہیں رہا، مگر پھر بھی اُس نے دل ہی دل میں دعا کی، ماسٹر لی کی مغفرت اور سکون کے لیے دعا کی، اپنے لیے طاقت اور استقامت کی درخواست کی، اور اپنے دشمنوں کے لیے اُن کے انجام اور سزا کی دعا کی۔

یہ سب کرتے ہوئے، نہ جانے کیوں اُس کے دل میں یہ احساس ابھرا، مگر وہ اس کی حقیقت کو سمجھ نہ پا رہا تھا۔

یہ دعا ایک داخلی کشمکش میں جنم لے رہی تھی، جیسے اُس کی روح کی گہرائیوں میں ایک نامعلوم ضرورت اُبھر رہی ہو۔ وہ جانتا تھا کہ یہ دعا محض الفاظ نہیں ہیں، بلکہ ایک اندرونی طلب کی عکاسی ہے، جو اُس کی گمشدہ یقین کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

ایز کنیل نے سر جھکایا اور سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ اس کے سامنے ایک طویل سفر تھا—خون آلود اور خطرناک۔

اسے دوبارہ سویدن جانا تھا، اس زمین پر جسے وہ کبھی اپنا وطن کہتا تھا، جہاں اس کے سب سے بھیانک خواب پروان چڑھے تھے۔ وہاں اس کے دشمن، اس کے چچا اور ان کے ساتھی، وہ لوگ جنہوں نے اس کے خاندان کو برباد کیا تھا، اس کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ جانتا تھا کہ اسے ان سے سامنا کرنا ہے، ان سے لڑنا ہے، اور آخر کار انہیں نیست و نابود کرنا ہے۔

یہ اس کے خاندان کا بدلہ تھا، اپنے والدین، اپنے بھائی اور اپنی بہن کا بدلہ۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سفر آسان نہ ہو گا—دشمنوں، چیلنجوں اور مشکلات سے بھرپور ہو گا۔ لیکن اس کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا، کوئی تردد نہیں تھا۔ اس کے سامنے صرف ایک مقصد تھا، ایک نصب العین، اور وہ تھا انتقام۔

ایز کنیل کے پاس کھونے کو کچھ نہیں تھا، پانے کو کچھ نہیں تھا، جینے کو کچھ نہیں تھا۔ صرف ایک کام تھا جسے پورا کرنا تھا، ایک بدلہ جس کے لیے مرنا تھا، اور ایک قسم جس کے لیے لڑنا تھا۔ ماسٹرلی کا احترام، اسلامی اور انسانی دونوں طریقوں سے، اور اپنے خاندان کی عزت، سویڈش اور شاو لن انداز میں۔

اب سویڈن اس کا منتظر تھا۔ اسٹاک ہوم اس کا منتظر تھا۔ اور اس کا انتقام، وہ ہی واحد حقیقت، اس کا انتظار کر رہا تھا۔

...°...

سویڈن، اسٹاک ہوم کی گلیوں کے درمیان ایز کنیل کھڑا تھا، اس کی نظریں اس مکان پر جمی تھیں جہاں اس کے خاندان کی داستان خون میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہ وہ ہی گھر تھا جسے دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا، لیکن ایز کنیل کے دل میں اس جگہ کی وحشت اب بھی تازہ تھی۔

اس مکان کی دیواریں نہ صرف اینٹوں اور پتھروں سے بلکہ الم ناک یادوں سے بنی تھیں، وہ یادیں جو کبھی بھلائی نہ جاسکیں۔ یہ جگہ اُس کے خاندان کے بہیمانہ قتل کی علامت بن چکی تھی، جہاں ہر کونہ اُس کی اذیت ناک ماضی کی گواہی دے رہا تھا۔

ایز کنیل نے کالے رنگ کی پی کیپ اور دھوپ کا چشمہ پہن رکھا تھا، جیسے وہ اپنی آنکھوں کی شدت کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔

اُس کی چیک شرٹ کے کف ہمیشہ کی طرح لپٹے ہوئے تھے۔۔، شرٹ کے نیچے کالے رنگ کی ٹی شرٹ اور نیلی جینز تھی، ایک ایسا لباس جو اُس کے بظاہر سادہ شخصیت کے برعکس اُس کے دل میں اُبلتے ہوئے انتقام کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

اُس کے کندھے پر لٹکا ہوا سپورٹس بیگ کسی عام سفر کا حصہ معلوم ہوتا تھا، مگر اس میں اُس کے قاتلانہ ارادے اور ہتھیار دونوں ہی موجود تھے۔

اچانک اُس نے دیکھا کہ اُس کا چچا، ڈریک، گھر سے نکلا۔ اُس کے چہرے پر ایک بناوٹی مسکراہٹ تھی، اور اُس نے ایک شاندار سوٹ پہن رکھا تھا۔ ڈریک، ابراہام کا بھائی، وہ ہی ابراہام جو ایز کنیل کا باپ تھا، اور وہ ہی ڈریک جس نے ایز کنیل کے خاندان کے قتل کی سازش رچی تھی۔

ڈریک کی گاڑی، ایک چمچماتی سیاہ کار، دولت اور طاقت کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ محافظ نے دروازہ کھولا، اور ڈریک اندر بیٹھ گیا، ایز کنیل کے وجود سے بالکل بے خبر۔ وہ محافظ ان بائیس مردوں میں سے ایک تھا جو ایز کنیل کے خاندان کے قتل میں شریک تھے۔

ایز کنیل کی نظریں چار لوگوں پر جا ٹھہریں جنہوں نے اُس کی ماں میری کے ساتھ وہ ناقابل بیان ظلم کیا تھا، جسے یاد کر کے اُس کی مٹھیاں خود بخود بھینچ گئیں۔

یہ چاروں اب ڈریک کی خدمت میں تھے، لیکن ایز کنیل کے لیے یہ محض شکار تھے۔ اُس کی آنکھوں میں انتقام کی آگ تھی، اور دل میں صدیوں کا غصہ۔

اولیویا، ڈریک کی بیوی، بھی گھر سے باہر آئی۔ اُس نے فیشن کے تقاضوں کے مطابق کپڑے پہنے تھے اور چہرے پر ایک فرضی مسکراہٹ سجا رکھی تھی۔ وہ ایک سنگدل عورت تھی، ایز کنیل کے خاندان کی تباہی میں ملوث، اور انہیں تکلیف میں دیکھ کر اُس نے ایک گھناونی خوشی محسوس کی تھی۔

ایز کنیل نے اپنی آنکھیں بند کیں، لمحے بھر کو ماضی کے دکھ اور حال کی حقیقت کو جذب کیا، اور پھر آنکھیں کھول کر زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی کی ”آخر کار تم سب اکٹھے ہو۔ اب تمہیں ختم کرنا میرے لیے مشکل نہیں ہوگا۔“

اس کے دل میں فقط ایک ہی جذبہ تھا—انتقام۔

...°...

ماضی چائے میں

چین کے خاموش پہاڑوں کے درمیان، ایز کئیل اپنے وسیع اور پُر تعیش کمرے میں داخل ہوا، جہاں ہر چیز اُس کے نفسانی وجود کی کامیابیوں کی گواہ تھی۔ ابھی ابھی اُس نے ڈارک ویب پر ایک اور خفیہ معاہدہ مکمل کیا تھا، اور بٹ کو انز میں ملنے والی دولت اُس کی دنیاوی فتوحات کی تجدید تھی۔ کمرے کی وسعت، اُس کی دیواروں پر شیشوں کی چمک اور باہر جنگلات کا دل فریب منظر اُسے فانی دنیا کی عارضیت کا احساس دلاتے ہوئے بھی اُسے اُس کی فتح کا ثبوت دے رہے تھے۔

کنگ سائز بستر پر نرم و لطیف خاکستری چادریں بچھی ہوئی تھیں، تکیے ایسے تھے جیسے پھولوں کا گہوارہ۔

ایک سنہرے بالوں والی لڑکی بستر پر بے صبری سے اُس کی منتظر تھی، لیکن ایز کئیل کی نگاہیں اُس کی طرف نہیں تھیں۔ اُس کے لیے یہ عورت صرف ایک ذریعہ تھی، ایک راہدار جس کے ذریعے وہ اپنی ضروریات پوری کرتا، مگر اُس کی ذات سے مکمل طور پر بے نیاز۔ وہ ایک شطرنج کے مہروں میں سے ایک مہرہ تھی، جسے وہ اپنے کھیل میں استعمال کرتا۔

اُس کے کمرے کے ایک طرف ایک سادہ مگر قیمتی اسٹول پر اُس کا لیپ ٹاپ اور نقدی سے بھرا ہوا سوٹ کیس رکھا تھا۔ پلنگ کے دونوں جانب موجود میزوں پر ہتھیاروں کی ٹھنڈی دھاروں کا عکس تھا، جن کے درمیان کتابیں اور چراغ روشنی بکھیرتے تھے، جیسے یہ ساری مادی اشیاء اُسے اُس کے اندرونی عفریت کی پرورش کے لیے تیار کر رہی ہوں۔

دیوار کے ساتھ کھڑا آئینہ اُس کے سامنے ایز کنیل کا عکس پیش کر رہا تھا۔ شاہ بلوطی رنگت کے بال، کنڈلی دار آنکھیں، اور ایک چہرہ جو اپنے اندر ایک دنیا کا غم چھپائے ہوئے تھا۔

یہ چہرہ وہ نہیں تھا جو دوسروں کو دکھائی دیتا تھا، بلکہ یہ وہ چہرہ تھا جسے وہ خود دیکھتا تھا، اپنے انتقام اور گناہوں کا حقیقی مجسمہ۔

ایز کنیل نے آئینے میں اپنے آپ کو ٹٹولا، جیسے وہ اپنے ماضی کی بھول بھلیوں میں واپس جا رہا ہو۔ اُس کے ذہن میں یادوں کی ایک پرانی فلم چلنے لگی۔ اُس کا چچا ڈریک، وہ ہی خبیث جو اُس کے والدین، بہن اور بھائی کا قاتل تھا، خاندانی جائیداد اور کاروبار کی ہوس میں اندھا ہو چکا تھا۔

اُسے اپنی ماں اور بہن کا چہرہ یاد آیا جو اُس کے چچا کے آدمیوں کے ظلم کا شکار ہوئی تھیں۔ وہ درد، وہ بے بسی، وہ چیخیں جو اُس کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے گونجتی رہیں۔ اُسے اپنے بھائی عیسیاہ کی موت یاد آئی، جسے بے رحم سردی نے نگل لیا تھا، اور وہ ڈاکٹر جو اُس کے اعضاء کاٹنے کے لیے اس کا مردہ جسم اغوا کر چکا تھا۔ وہ سب کچھ ایز کنیل کے دل و دماغ میں پھر سے ابھر آیا تھا، جیسے وہ دُھند میں چھپے خوفناک ماضی کی گہرائیوں میں غوطہ لگا رہا ہو۔

لیکن پھر اُسے وہ دن یاد آیا جب اُس نے چینی شاولن راہب ماسٹر لی سے ملاقات کی تھی۔ وہ راہب اُس کی زندگی کا نیا موڑ تھا، جس نے اُسے جنگی فنون، مراقبہ کا علم دیا تھا۔

اُسے ڈارک ویب پر اپنے سفر کی شروعات یاد آئیں، جہاں وہ ”گونار“ کے نام سے جانا جانے لگا تھا۔ وہ شخص جس نے دنیا کو ظلم، گناہ اور شیطانیت کے گرداب میں کھینچ لیا تھا، لیکن جس کی درندگی میں ایک ناقابلِ فراموش اصول تھا—وہ معصوموں کو نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔

گونار نے اپنا وقت اور صلاحیتیں اُن لوگوں کے لیے وقف کر دی تھیں جو تاریکی کی دنیا کے سربراہ تھے—
مافیا، کینگسٹرز، اور برائی کے معمار

۔ وہ اُن کا بادشاہ بن چکا تھا، لیکن اُس کے دل میں ہمیشہ سے ایک مقصد تھا—بدلہ۔ وہ اپنے چچا ڈریک اور اُس کے ساتھیوں سے وہ سب کچھ چھیننا چاہتا تھا جو انہوں نے اُس سے چھینا تھا۔ اُس نے ڈارک ویب کو اپنے کھیل کا میدان بنایا، اور اپنی غیر قانونی سرگرمیوں کے ذریعے دولت اور طاقت حاصل کی۔

اُس نے ایلومیناتی کو نشانے پر رکھا، اُن کے اندر گھسنے کے لیے منصوبے تیار کیے، اور اُن کی طاقت کا مرکز ڈھونڈ نکالا۔

اب، اُس کے لیپ ٹاپ کی بیپ نے اُس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ اُس نے لیپ ٹاپ کھولا اور اُسکرین پر ایک مانوس علامت نمودار ہوئی—وہ ہی ایک آنکھ کا لوگو جسے دیکھ کر اُس کی رگوں میں انتقام کی آگ دوڑ گئی۔

یہ ایلومیناتی کا نشان تھا، وہ خفیہ تنظیم جس نے دنیا کے بیشتر وسائل پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ایک ویڈیو کال کی درخواست اُس کی اسکرین پر ظاہر ہوئی، اور اُس نے بے خوفی سے قبول کر لیا۔ ماسک پہنے ہوئے ایک

شخص کی شبیہ اُس کے سامنے نمودار ہوئی، وہ ہی شخص جس نے اُسے ایلومیناتی میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔

گونار نے مسکراتے ہوئے کہا، ”ہیلو، سر۔“ اُس کی مسکراہٹ میں ایک سفاکانہ مکاری تھی۔

اُس نے دل ہی دل میں بڑبڑاتے ہوئے کہا، ”میں تم لوگوں کا کافی عرصے سے انتظار کر رہا تھا آخر کار انتظار ختم ہوا۔“

...°...

سویڈن

ایزکنیل کی گاڑی آہستہ آہستہ جنگل کے قریب آکر رکی، جہاں آٹھ برس قبل اس نے اپنے ماضی کی تلخ یادوں کو دفن کیا تھا۔

گاڑی کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے، اسے ایک سرد ہوا کا جھونکا محسوس ہوا، جو اس کے وجود کو تپتے ہوئے زخموں کی مانند چھو کر گزری۔

اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر قدم رکھا۔ گاڑی کے عقب سے ایک پھولوں کا گلدستہ نکالتے ہوئے، وہ پرانی یادوں کے ساتھ اس مانوس راستے پر چل پڑا، جو اب بھی ویسے ہی غیر معمولی سنائے میں لپٹا تھا جیسے وہ برسوں پہلے تھا۔

قدم بہ قدم، وہ جنگل کے اس حصے میں پہنچا جہاں گھنے درختوں کے درمیان ایک چھوٹا سا کھلا میدان تھا۔ میدان کے وسط میں ایک قدیم درخت کھڑا تھا، جس کی شاخیں سمندر کے کنارے کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔

سمندر کی بھری ہوئی لہریں کنارے سے ٹکرا کر عجیب سی آوازیں پیدا کر رہی تھیں، جیسے یہ جگہ کسی المناک داستان کی گواہ ہو۔ ایز کنیل نے درخت کے قریب پہنچ کر قدم روکے، اُس جگہ پر جہاں گھاس کے نیچے ایک چھوٹا سا ٹیلہ چھپا ہوا تھا، یہ اس کے بھائی عیسیاہ کی قبر تھی۔

قبر کو دیکھ کر اُس کے دل میں غم کی وہ لہر دوڑ گئی جو برسوں سے اس کے دل کے کونے میں چھپی ہوئی تھی، ایک ایسا درد جو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

ایز کنیل نے گلدستہ قبر کے قریب رکھتے ہوئے گھٹنے ٹیک دیے۔ اُس نے قبر پر جی مٹی اور پتوں کو آہستگی سے ہٹایا اور پھولوں کو نرمی سے اس جگہ رکھا جہاں کبھی اُس کا بھائی دفن کیا گیا تھا۔ اُس نے نگاہ اٹھا کر درخت کی طرف دیکھا، جہاں سالوں پہلے اُس نے اپنے ہاتھوں سے چند الفاظ تراشے تھے:

”میرے پیارے بھائی عیسیاہ، تم جنت کے پرندے بن جاؤ۔“

الفاظ کے نشانات آج بھی واضح تھے، جیسے وقت نے انہیں چھوا ہی نہ ہو۔ اس نے ان الفاظ پر اپنی انگلیاں پھیریں، درخت کی کھر دری چھال کو محسوس کیا، اور دل میں وہ بھاری پن محسوس کیا جس کا بوجھ وہ برسوں سے اٹھا رہا تھا۔

عیسیاہ کی یادیں اُس کے دل و دماغ میں بھر آئیں، اُس کا مسکراتا چہرہ، اس کی ہنسی، وہ وقت جو انہوں نے ساتھ گزارا تھا۔

وہ یادیں جو ہر لمحے اس کے وجود کو تکلیف دیتی تھیں، اسے وہ وعدہ یاد آیا جو اس نے اپنے بھائی سے کیا تھا کہ وہ ہمیشہ اس کی حفاظت کرے گا، مگر وہ ناکام رہا تھا۔

ایز کنیل نے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں سے بہتے محسوس کیا، بائیں آنکھ کے کونے پر ایک گہرا، پرانا زخم نمایاں تھا، جو اس نے خود خنجر سے کاٹا تھا۔ اس نیت سے کہ دنیا اسے خطرناک جانے۔ یہ زخم اب اس کے چہرے کا حصہ بن چکا تھا، جیسے جنگ میں زخمی شیر کی جھلک، جس کی نظریں اب بھی دشمن کو چیر ڈالنے کی طاقت رکھتی تھیں۔

آنکھ کے اس زخم نے اس کی شخصیت میں ایک وحشیانہ اور ہیبت ناک عنصر شامل کر دیا تھا۔ ایک ایسا خوفناک اثر جو دور سے ہی دل دہلا دے۔

اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اپنی آواز دھیمی رکھی، جیسے اپنے بھائی سے راز کی بات کر رہا ہو۔ ہیلو عیسیاہ، یہ میں ہوں۔ ایز کنیل۔ میں واپس آ گیا ہوں، تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں آؤں گا؟ دیکھو، میں بڑا

آدمی بن گیا ہوں۔ وہ ہی جو ہم نے خواب دیکھے تھے۔ میں گونار بن گیا ہوں، ڈارک ویب کا بادشاہ۔ میں نے پیسہ کمایا، طاقت حاصل کی، سب کچھ کیا۔ لیکن یہ سب تمہارے لیے تھا۔ موم، ڈیڈ، زیبا... ہم سب کے لیے۔ میں نے یہ سب کیا، تاکہ ہمارا بدلہ لیا جاسکے۔”

اس کی آواز کانپنے لگی، اور اس کی نظریں قبر کی مٹی پر جم گئیں، جیسے وہ عیسیٰ کو دیکھ رہا ہو۔ اس نے اپنی جیب سے چھوٹی سی پوٹلی نکالی، جو عیسیٰ کی قبر کی مٹی سے بھری ہوئی تھی۔

وہ مٹی جسے وہ برسوں سے اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھا، ہمیشہ اپنے بھائی کو اپنے قریب محسوس کرنے کے لیے۔ اس نے مٹی کو قبر پر نرمی سے ڈال دیا اور بولا “میں نے تمہیں کبھی خود سے دور نہیں ہونے دیا، تم ہمیشہ میرے ساتھ تھے، عیسیٰ۔”

ایک لمحے کے لیے ایزکئیل کی آنکھوں میں غصے کی چمک آئی۔ وہ ڈریک کو، ان لوگوں کو جو اس کے خاندان کی بربادی کا سبب بنے تھے، یاد کر رہا تھا۔ وہ ان سے بدلہ لینے کے لیے ہر قدم پر تیار تھا، ایک مکمل منصوبہ تیار تھا، جس میں اُس نے اپنے ذہن کی تمام تر صلاحیتیں لگائی تھیں۔

۔“میرے پاس تمہارے لیے ایک سر پرانز ہے، عیسیٰ۔ ایک ایسا سر پرانز جو دنیا کو ہلا کر رکھ دے گا۔ ان لوگوں کو تکلیف میں مبتلا کر دے گا، جیسے انہوں نے ہمیں دیا۔ میں ان سے سب کچھ چھین لوں گا۔ انہیں فنا کر دوں گا، جیسے انہوں نے ہمیں مارا۔ یہ ان کا انجام ہے، عیسیٰ۔ میں نے سب کچھ تیار کر لیا ہے۔”

ایز کنیل نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی، شام کا وقت تھا، سورج کی روشنی سمندر کی لہروں میں ڈوب رہی تھی، جیسے یہ ایک آخری وداعی سلام ہو۔ اس نے ایک آخری بار قبر کو دیکھا، اپنے بھائی کو الوداع کہا، اور آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے کپڑوں سے مٹی جھاڑی اور مدھم مدھم پیچھے ہونے لگا۔

اب وہ اس سفر پر روانہ ہونے والا تھا جس کا مقصد صرف انتقام تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصے اور عزم کی چمک تھی، اس کی بائیں آنکھ کا زخم اب اور بھی گہرا لگ رہا تھا۔ وہ اپنے چچا کے انجام کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کے ہر قدم میں فیصلہ کن آگ تھی۔ ”میں اپنا بدلہ لوں گا، میں اپنا وعدہ پورا کروں گا،“ وہ اپنے آپ سے بڑبڑایا۔

ایز کنیل جنگل کے راستے سے نکلتا گیا، وہ درخت، وہ قبر، وہ یادیں، سب پیچھے رہ گئے تھے، لیکن اُس کا انتقام اُس کے سامنے تھا۔

...°...

رات کی سیاہی گہری اور بھیانک تھی، جیسے ہر طرف موت کی پرچھائیاں رقص کر رہی ہوں۔ ہوا میں وحشت گھلی ہوئی تھی، اور درختوں کے سائے انجان خطرات کی نشاندہی کر رہے تھے۔ بھیڑیوں کی ہولناک چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں، اور چاند جیسے آسمان پر چھپتا جا رہا تھا، اس کا مدھم نور ایک سرگوشی کی طرح زمین پر جھلک رہا تھا۔

ایز کنیل ایک ایسے جزیرے پر موجود تھا جو دنیا کی نگاہوں سے اوجھل تھا، رازوں سے بھرا، وہ اسرار کا مسافر تھا، ایک ایسی سرزمین کا باسی جہاں موت کی مہک ہر جھاڑی میں چھپی ہوئی تھی۔ چار نقاب پوش، لمبے سرخ چونگوں میں ملبوس، اسے یوں لے جا رہے تھے جیسے وہ ایک قربانی کا جانور ہو۔

ان کے چہرے ماسکز میں چھپے تھے، جو انہیں انسان کم، اور موت کے قاصد زیادہ دکھا رہے تھے۔ دو اس کے آگے تھے اور دو پیچھے۔ وہ ایک گونجتی ہوئی خاموشی میں گھرا ہوا تھا، جیسے ہر لمحہ ایک قیامت خیز واقعہ کی پیشین گوئی کر رہا ہو۔

اس کے قدم اس راستے کی طرف بڑھ رہے تھے جو جنگل کے بیچوں بیچ جا رہا تھا۔ راستے کے اختتام پر ایک دیو قامت درخت کھڑا تھا، جس کی شاخیں خوفناک سایے ڈال رہی تھیں۔

یہ درخت دوسرے تمام درختوں سے الگ تھا۔ اس کی شاخیں خون کی طرح سرخ اور اس کے پتے کالے تھے، جیسے صدیوں کی وحشت ان میں چھپی ہوئی ہو۔

ایک ہڈ پوش نے اس سے کارڈ پکڑ کر درخت کی طرف اشارہ کیا۔ کارڈ پر ایک عجیب و غریب پینٹا گرام بنا ہوا تھا، اس کے مرکز میں ایک آنکھ تھی، جو کسی نامعلوم خوف کا نشان تھی۔

ایز کنیل نے ہچکچاتے ہوئے کارڈ کو درخت کی چھال سے لگایا، جیسے ہی کارڈ چھالا، درخت میں ایک ہولناک چیخ گونجی، اور زمین ہلنے لگی۔ درخت پھٹنے لگا، اس کے اندر ایک پوشیدہ راستہ عیاں ہو گیا۔

یہ راستہ زمین کے اندر جا رہا تھا، جیسے کسی عمیق گہرائی کی طرف بلا رہا ہو۔ دیواروں پر نمکین نمی اور ٹمٹمی مشعلیں ماحول کو اور بھی زیادہ خفقان زدہ کر رہی تھیں۔

راستہ اتنا تنگ تھا کہ دیواروں کے درمیان گزرتے ہوئے سانس رکنے کا احساس ہو رہا تھا، جیسے ہوا کا ہر جھونکا جان لیا ہو۔

جب وہ نیچے پہنچا، تو سامنے ایک گول کمرہ تھا جس کی چھت فلک کی مانند بلند اور آسمان کی نقش نگاری سے مزین تھی۔ وسط میں ایک تخت تھا جس پر بکری کے سروالے نقاب پوش نے قبضہ جما رکھا تھا۔ چاروں طرف نقاب پوش عجیب اور بھیانک انداز میں رقص کر رہے تھے، ان کے حرکت کرتے ہوئے جسم جیسے کائناتی اسرار کو ظاہر کر رہے تھے۔

وہ ایک ایسے رقص میں مگن تھے جس میں زحل کی تعظیم ہو رہی تھی۔ یہ رقص طاقت اور کنٹرول کی علامت تھا، جس میں ہر قدم ایک پُر اسرار کہانی بیان کر رہا تھا۔

ایز کنیل کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، اس کا پورا جسم تناؤ کا شکار تھا۔ اسے ایک ایسی حقیقت کا سامنا تھا جو اس کے تصور سے پرے تھی۔

تخت پر موجود شخص، ایلومیناتی کا سرغنہ، وہ ہی تھا جس کے پاس دنیا کی طاقت اور اس کے اسرار کا مکمل اختیار تھا۔ یہ وہ ہی لوگ تھے جو دنیا کے ہر کونے پر چھائے ہوئے تھے، ہر فیصلے کو اپنے مفادات کے تحت موڑنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

ایزکئیل کی وڈیوز جن میں وہ زندہ سانپ کھا جاتا، بار سے لڑکیاں لے کر ان کے ساتھ راتیں گزار کر ان کی وڈیوز کو ڈارک ویب پر فروخت کرتا، اسے ایک جنونی مجرم کے طور پر پیش کر چکی تھیں۔ اس کے عریاں و حیوانی اعمال میں بلیوں کی گردن میں دانت گاڑ کر، ان کا خون پینا، اور کچا گوشت چبانا شامل تھا۔

ایک مرتبہ اس نے اپنی وڈیو میں تیزاب پی لیا تھا، اور پھر پیٹرول اپنے منہ میں ڈال کر آگ لگا دی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود، وہ دھیٹ زندگی کی طرف لوٹ آتا تھا، جیسے اسے موت نے اپنا غلام نہیں بنایا ہو، جیسے اس کے جسم میں کوئی جادوئی طاقت بھری ہوئی ہو۔

یہ سب ایلومیناتی کے لیے ایک لالچ بن گیا تھا۔ انہوں نے اس کے جنون کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے ایزکئیل کو اپنی صفوں میں شامل ہونے کی دعوت دے دی تھی، اسے ان کا حصہ بنا کر دنیا کی تاریکیوں کو مزید گہرا کرنے کا عزم کیا۔

ایزکئیل نے اپنی زندگی کو تباہی اور ظلم کے راستے پر چلانے کا جو خواب دیکھا تھا، وہ اب حقیقت بننے کے قریب تھا۔ مگر اس کے دل میں ایک اور جذبہ پل رہا تھا: انتقام۔ یہ وہ ہی آگ تھی جو اسے جلاتی جا رہی تھی، اور وہ تیار تھا کہ دنیا کو اسی آگ میں بھسم کر دے۔

- ”ایز کنیل... ” ایک گہری، سرد آواز تخت سے گونجی۔ ”کیا تم تیار ہو؟“۔

ایز کنیل نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا، اس کی آنکھوں میں خون کی پیاس اور انتقام کی چمک تھی۔

تخت نشین شخص نے چہرے پر بلی کی شبابہت والا سنہری نقاب اوڑھ رکھا تھا، جس کی چمک دمک اور پیچیدگی اس کی شخصیت میں ایک پراسرار وقار کا اضافہ کر رہی تھی۔ نقاب کے پیچھے چھپے تاثرات کو پرکھنا مشکل تھا، مگر اس کی موجودگی میں ایک غیر مرئی رعب اور دبدبہ محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ خود کو پوشیدہ رکھ کر بھی مکمل طور پر منظر پر غالب ہو۔

اس کی آواز میں ایک خطرناک سرگوشی چھپی تھی۔ ”کافی عرصے سے تم پر نظر تھی۔ تم نے اپنی مہارت اور ہمت سے مجھے متاثر کیا ہے۔ تمہارے اندر وہ صلاحیت موجود ہے جسے ہم اپنے مقصد کے لیے بروئے کار لاسکتے ہیں۔“۔

ایز کنیل کے دل میں فخر کی ایک لہر ابھری، مگر ساتھ ہی ایک چھپا ہوا غصہ بھی، جب اس کا ماضی اس کے ذہن میں ابھر آیا۔

اسے یاد آیا کہ کس طرح اس کے چچا اور چچی نے اس کے والد کو بے دردی سے قتل کیا تھا اور اس کی ماں اور بہن کو وحشیانہ ظلم و زیادتی کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کا دل انتقام کی آگ میں جلتا رہا تھا، اور وہ کئی سالوں تک اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے تیار ہوتا رہا تھا۔

- ”میں آپ کے ساتھ کیوں شامل ہونا چاہوں گا؟“ ایز کئیل کی مسکراہٹ میں طنز تھا، اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

- ”میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے چچا اور ان کی بیوی سے میرا بدلہ لینے میں میری مدد کریں، جو میرے خاندان کے قاتل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے وہ طاقت اور دولت دیں جس کا میں حقدار ہوں، اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ایلومیناتی کے ان اسرار میں داخل کریں، جن تک عام انسانوں کی رسائی نہیں۔“

تخت پر بیٹھے شخص نے سر کو خم دیا، جیسے ایز کئیل کی باتوں کو قبول کر رہا ہو۔ ”تمہاری خواہشات بڑی ہیں، لیکن یہ راستہ ایک طرفہ ہے،“ اُس کی آواز میں گہرائی تھی، جیسے اس کے ہر لفظ کے ساتھ ایک خطرناک راز چھپا ہو۔ ”ایک بار ہمارے ساتھ شامل ہو گئے، تو واپسی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر تم نے کبھی ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کی تو اس کی قیمت تمہیں اپنی جان سے چکانی پڑے گی۔“

ایز کئیل نے بناتامل سر ہلایا۔ اسے اپنی زندگی کی کوئی پرواہ نہیں تھی، اس کے اندر صرف انتقام کی آگ جل رہی تھی۔

تخت پر بیٹھے آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا، ”بہت خوب۔ تو پھر، ہم اس معاہدے پر مہر لگاتے ہیں۔ خوش آمدید، ایز کئیل، ہماری دنیا میں۔“

اس کی تالی بجتے ہی کمرہ پھر سے زندگی سے بھر گیا۔ رقصوں نے دوبارہ اپنے مخصوص دائرے بنائے اور نعرے بلند ہونے لگے۔ جیسے ہی وہ ایز کنیل کے گرد گھومنے لگے، ایک عجیب سی جنونی کیفیت کمرے میں پھیل گئی۔ وہ اسے اٹھا کر تخت کی جانب لے گئے، جہاں وہ پراسرار آدمی بیٹھا ہوا تھا۔

ایز کنیل کو تخت کے قریب لاتے ہی وہ شخص اپنا ماسک اتارنے لگا۔ جیسے ہی اس کا چہرہ بے نقاب ہوا، ایز کنیل کے دل میں ایک انجانا خوف سرایت کرنے لگا۔ وہ چہرہ جانا پہچانا لگ رہا تھا، جیسے وہ ماضی کے کسی بھولے ہوئے خواب کا حصہ ہو۔

ایز کنیل کی آنکھوں میں حیرانی اور عدم اعتماد کے سائے گہرے ہو گئے۔ یہ ایک جال تھا، ایک دھوکہ۔ اُس کے دل میں اچانک شک پیدا ہوا، جیسے اس کی ساری سوچ، ساری منصوبہ بندی خاک میں مل رہی ہو۔ اس آدمی نے نقاب کو ایز کنیل کے چہرے پر دھیرے سے رکھا، جیسے ایک آخری عمل کر رہا ہو۔
- ”ایلو میناتی میں خوش آمدید، ایز کنیل۔ جہنم میں خوش آمدید۔“ اس کی آواز میں سفاکیت کی لہر تھی۔

اچانک ایز کنیل کے دماغ میں شدید درد کی لہر اٹھی۔ ایک لمحے میں اُس نے محسوس کیا کہ اس کے ذہن پر حملہ ہو چکا ہے، اس کی مرضی جیسے کسی ناپاک قوت کے سامنے ٹوٹ رہی ہو، اس کی شناخت مٹ رہی ہو۔ ایک چپ اس کے دماغ میں پیوست کی جابجی تھی، اور اس کا وجود اب اُس کے قابو میں نہیں رہا تھا۔

وہ اب ایز کنیل نہیں تھا، وہ گونا نہیں تھا۔ وہ ایک کٹھ پتلی تھا، ایک بے جان شے جو اب اس خفیہ سوسائٹی کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کی روح قید ہو چکی تھی، اور وہ حقیقت کے اندھیروں میں ہمیشہ کے لیے ڈوب چکا تھا۔

ایلویناتی کی خاموش ہنسی اس کے ارد گرد گونج رہی تھی، جیسے وہ سب اس کی شکست سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

...°...

رات کی تاریکی زمین پر موت کی چادر کی مانند بچھی ہوئی تھی، صرف ٹمٹماتے شعلے تھے جو منظر کو بھیانک انداز میں روشن کر رہے تھے۔ ہر طرف خوف کا سایہ تھا، اور اس کے درمیان ایک بنجر میدان میں، سرخ لباسوں میں ملبوس افراد کا ایک گروہ بال نامی دیوتا کی سنہری مورتی کے گرد جمع تھا۔

مورتی کے پیٹ میں شعلے بھڑک رہے تھے، گویا وہ موت اور بربادی کی آگ سے دہک رہی ہو۔ اُن افراد کے چہروں پر دیوانگی اور جنون کے آثار تھے، جیسے وہ کسی منحوس رسم میں مشغول ہوں، اور ان کے بیچ اسیر بے بس پڑے تھے، جنہیں ایک پراسرار آدمی نے اغوا کیا تھا۔

یہ آدمی، جو خود کو ان کا نجات دہندہ ظاہر کرتا تھا، دراصل ان کا جلا د تھا۔ اُس کا چہرہ ایک سیاہ ہڈ کے پیچھے چھپا ہوا تھا، اور اُس کی آنکھوں میں قاتلانہ جنون تھا۔ وہ اپنے شکار کی مانند ان لوگوں کے درمیان چلنے لگا، اور جیسے ہی وہ ایک مخصوص جوڑے کے سامنے رکا، اُس کی سرد مسکراہٹ نے اندھیرا مزید خوفناک کر

دیا۔ ”ہیلو، انکل ڈریک۔ ہیلو، آنٹی اولیویا،“ اس کی سرگوشی میں موت کی گھن گرج تھی۔ ”کیا تمہیں میں یاد ہوں؟“۔

ڈریک کے چہرے پر دہشت کے آثار ابھر آئے، جبکہ اولیویا کا رنگ خوف سے سفید ہو گیا۔ اُن دونوں نے اُسے آٹھ سال قبل مرچکا سمجھا تھا، اُس قتل عام میں جس میں اُنہوں نے اُس کے باپ ابراہام کو قتل کیا تھا، اور اس کی ماں اور بہن کو وحشیانہ طریقے سے عصمت دری اور قتل کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ اُنہوں نے پورے خاندان کو مٹا دیا ہے،

مدتوں سے نہ عیسیاہ کی کوئی خبر تھی اور نہ ایزکئیل کا کوئی سراغ ملا تھا، یہاں تک کہ سب یہ ہی گمان کر بیٹھے تھے کہ دونوں فنا کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ مگر آج عیسیاہ تو وہاں موجود نہ تھا مگر ایزکئیل ان کے سامنے گوشت و پوست کی صورت میں موجود تھا، جیسے تاریخ نے خود کو پلٹا دیا ہو اور یہ گمشدہ کردار، تقدیر کے کھیل میں دوبارہ وارد ہو گیا ہو۔

اب ایک بے رحم جنگجو اور ایلومیناتی کا خونی رکن بن کر۔

۔ ”میں ایزکئیل ہوں، ابراہام کا بیٹا،“ اس کی آواز میں سردی اور نفرت کی آمیزش تھی، ”جس کی مسکراہٹ تم نے مٹا دی تھی۔ اب مرنے کی باری تمہاری ہے۔ تم بھی اسی اذیت سے گزرو گے جس اذیت سے میرا خاندان گزرا تھا۔ تم جم جاؤ گے جیسے میرا بھائی جماتا تھا، تم جل جاؤ گے جیسے میرا خاندان جلاتا تھا۔“۔

اُس کی آنکھوں میں خون کی پیاسی وحشت تھی، اور اس نے اُنہیں اُن کے لباس سے پکڑ کر ایک فریزر کی جانب گھسیٹا۔ اُن کی چیخیں رات کے سناٹے میں گونجیں، لیکن ایز کنیل نے ان کی رحم کی بھیک کو نظر انداز کر دیا۔

فریزر کا دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی، اندر کا درجہ حرارت اُنہیں موت کی گود میں دھکیل رہا تھا۔ اُن کے جسم سردی سے جم گئے، اور اُن کی سانسیں ٹوٹنے لگیں۔

ایز کنیل کا انتقام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اُس کی نظریں اب باقی لوگوں پر جمی تھیں، وہ بائیس افراد جو اس کے چچا کے ساتھ مل کر اُس کے خاندان کو ختم کرنے میں شریک تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ہنستے ہوئے اُس کے والدین کی لاشوں پر قدم رکھا تھا، جنہوں نے اُس کے خاندان کی بربادی کو تماشا بنایا تھا۔ اب اُن کی باری تھی۔

ایز کنیل نے چار آدمیوں کی طرف قدم بڑھائے، وہ ہی جنہوں نے اُس کی ماں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا تھا۔ اُس نے اُنہیں بالوں سے گھسیٹا اور ایک لوہے کے پنجرے میں ڈال دیا، جہاں بھوکے شیر پہلے ہی انتظار کر رہے تھے۔

جانوروں کی آنکھوں میں خون کی طلب تھی، اور جیسے ہی ایز کنیل نے پنجرہ کھولا، وہ انسانوں پر پل پڑے۔ اُن کی چیخیں جنگل کے کسی عفریت کی طرح سنائی دیں، اور ان کے جسم شیر کی خونخوار جبرٹوں کے نیچے کچلے گئے۔

باقی اٹھارہ افراد کورسیوں سے جکڑ کر ایز کئیل کے بندوں نے کھینچتے ہوئے ایک تیزاب کے تالاب کے کنارے پہنچایا، جس کے نیچے گندھک کا اُبلتا ہوا سمندر ان کے انجام کا منتظر تھا۔ ہر طرف سے چیخیں اور رحم کی بھیک گونج رہی تھی، لیکن گونار نے کوئی جواب نہ دیا۔

ایک ایک کر کے اُنہیں اُبلتے ہوئے تیزاب میں پھینکا گیا، جہاں اُن کے جسم جھلس کر راکھ میں بدلنے لگے۔ اذیت کا منظر ناقابل برداشت تھا، لیکن ایز کئیل کے چہرے پر کوئی احساس نہ تھا۔ اُس کے دل میں اب صرف انتقام کی آگ دہک رہی تھی۔

جب آخری فرد بھی تیزاب میں گھل گیا، تو ایز کئیل نے گہرا سانس لیا، جیسے اُس نے کوئی بڑی جنگ جیت لی ہو۔ اس نے اپنے چچا اور چاچی کی منجمد لاشیں فریزر سے نکالیں، اور انہیں گھیٹتے ہوئے دیوتا بال کی مورتی تک لے گیا۔

وہ اُنہیں اُس آگ میں پھینکنا چاہتا تھا جو اُس مورتی کے پیٹ میں دہک رہی تھی، تاکہ اُن کا وجود ہمیشہ کے لیے مٹ جائے۔

لاشیں شعلوں میں جل کر راکھ ہو گئیں، اور مورتی کی پیشانی پر موجود سب دیکھنے والی آنکھ چمکنے لگی، گویا دیوتا نے اس کی قربانی قبول کر لی ہو۔ ایک دھاڑ کی آواز فضا میں گونجی، جیسے وہ موت کی گواہی دے رہی ہو۔

جب ایزیکیل نے اپنے چچا، چچی اور ان کے ساتھ وابستہ گروہ سے اپنا انتقام لے لیا تو فوراً سوئڈن میں اپنی وراثت پر اس نے حق جتایا۔ اس کے پاس ناقابل تردید ثبوت موجود تھا کہ اس کے چچا نے اس کے والد کی وصیت میں جعل سازی کی تھی اور ان کا کاروبار و جائیداد ہتھیالی تھی۔ قانونی جنگ کا آغاز کرتے ہوئے، ایزیکیل نے ایک ماہر وکیل کی خدمات حاصل کیں اور عدالت میں اپنے چچا کی جائیداد پر دعویٰ دائر کیا، انصاف اور مکمل معاوضے کا مطالبہ کرتے ہوئے۔

یہ مقدمہ اس کے حق میں آسانی سے فیصلہ ہو گیا، اور یوں ایزیکیل ایک بڑی اور کامیاب کمپنی کا مالک بن گیا، ساتھ ہی متعدد جائیدادیں اور قیمتی اثاثے بھی اس کے قبضے میں آ گئے۔

تاہم، اس نے اپنی اصل شناخت کسی پر بھی ظاہر نہ کی۔ وہ گونار کے نام سے جانا جانے لگا اور خود کو ابراہام کی دوسری بیوی کا بیٹا ظاہر کیا جو کہ ایک جالی کہانی تھی۔

اسے علم تھا کہ الیکس بے گناہ ہے اور اس کے خاندان کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ ایزیکیل نے الیکس کے ساتھ ہمدردی برتنے کا فیصلہ کیا اور نیک نیتی کے اظہار کے طور پر کمپنی کے بیس فیصد حصے کی پیشکش کی۔

اس کے ساتھ ہی، اس نے الیکس کو کاروبار کی باریکیوں میں مہارت دلانے کے لئے ایک مینٹور بھی روانہ کیا۔ الیکس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے گونار کی پیشکش قبول کر لی، لیکن وہ اس حقیقت سے لاعلم تھا کہ گونار دراصل ایزیکیل ہی ہے اور ایلومینائی کا ایک اہم رکن ہے۔

ایزیکیل کو اس خفیہ تنظیم کی وفاداری اب تک یاد تھی، جس نے اسے ایک نئی شناخت اور زندگی کا نیا مقصد دیا تھا۔ وہ اپنے مشن کو نہیں بھولا تھا، جس کا مقصد نیو ورلڈ آرڈر کی خدمت کرنا اور ایل جی بی ٹی کیو ایجنڈے کو دنیا بھر میں آگے بڑھانا تھا۔

اپنی دولت اور اثر و رسوخ کو بروئے کار لاتے ہوئے، ایزیکیل نے سویڈن اور دیگر ممالک میں ایل جی بی ٹی کیو کے مقاصد اور تنظیموں کو نہ صرف مالی مدد فراہم کی بلکہ ان کے مختلف منصوبوں کی سرپرستی بھی کی۔ وہ تقریباً ہر میدان میں سرگرم رہا، چاہے وہ فلا جی مہمات کی فنڈنگ ہو، سیاستدانوں کی لائنگ ہو، یا اپنی کمپنی کے ذریعے ایل جی بی ٹی کیو مواد کی تیاری اور تقسیم۔

وہ یہ سب تنہا نہیں کر رہا تھا۔ دوسرے ممالک میں اس کے ساتھی اور رابطے تھے، جو ایلومینائی کا حصہ تھے اور اس کے مقاصد کے ہم نوا تھے۔

انہی میں ایک مونیز بھی تھا، جو پاکستان میں ایک سرگرم کارکن تھا اور وہاں ایل جی بی ٹی کیو کے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہا تھا، باوجودیکہ اسے ہر طرف سے مخالفت اور خطرات کا سامنا تھا۔

مونیٹر کو ایزیکیل کی مالی معاونت حاصل تھی، اور اس نے پاکستان میں ایک نیٹ ورک قائم کیا تھا جو ایل جی بی ٹی کی وارا کین اور ان کے حامیوں پر مشتمل تھا۔

اس نے پاکستان میں مورت مارچ، احتجاجی جلوس، اور جلسوں کا انعقاد کیا، جن کا مقصد ایل جی بی ٹی کیو کمیونٹی کے لئے مساوی حقوق اور ان کی تسلیم شدگی کا مطالبہ تھا۔

ایزیکیل نے اپنی کاروباری سرگرمیاں الیکس سے ہمیشہ الگ رکھیں اور اسے کبھی بھی اپنی ایلومیناٹی سے متعلق سرگرمیوں میں شامل نہ کیا، تاکہ الیکس کو کسی بھی شک یا خطرے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہ الیکس کو حقیقت سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ ایزیکیل کو اپنے افعال پر ندامت اور اندرونی تنازع کا سامنا تھا۔

ایزیکیل کو یہ خبر نہ تھی کہ الیکس کو سب کچھ معلوم ہو چکا تھا، اور اس نے کیتھرین اور گستاو کی مدد سے گوناوہ کو بے نقاب کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا۔

مگر گوناوہ، وہ شخص جس کے وجود میں خطرہ سانس لیتا تھا، ایک چپ چاپ آگ تھی، جو اپنی حدت پوشیدہ رکھ کر دشمن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔

وہ جانتا تھا، ہر سازش، ہر فریب اور ہر وار جو اس کے خلاف رچا جا رہا تھا، اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھا۔ اس کے چہرے کی خاموشی میں تباہی کا طوفان چھپا ہوا تھا۔ وہ ایسا فنکار تھا جو موت کے کھیل کا استاد تھا، ایک ایسا جلا د جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہاتھوں میں موت کی زنجیریں تھیں۔

الیکس، اپنی ہی سازشوں کے تاروں میں الجھتا جا رہا تھا، جسے سمجھ نہ آئی کہ گونار کے مقابلے میں وہ ایک بچکانہ مہرہ تھا۔ وہ یہ نہ جان سکا کہ گونار وہ ہی خاموش شیر ہے، جس کی خاموشی سب سے زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ گونار کے علم اور تجربے کے سامنے، الیکس کا ہر قدم اسے انجام کے قریب لے جا رہا تھا۔

جس لمحے الیکس کا زوال قریب آیا، اس کے سامنے گونار کا چہرہ ایک بے رحم مسکراہٹ سے روشن تھا، جیسے وہ اپنی مہارت کا شاہکار دیکھ رہا ہو۔

الیکس کو تیزاب کے دیگ میں ڈالنا، گویا گونار کے لیے ایک فنکارانہ عمل تھا، جسے وہ خاموشی اور بے نیازی سے سرانجام دے رہا تھا، جیسے موت کا یہ کھیل اس کا روزمرہ کا مشغلہ ہو۔ الیکس کا جسم تیزاب میں پگھلتا گیا، اور گونار نے اسے ایسے دیکھا جیسے کوئی استاد اپنے شاگرد کی ناکامی کو بے رحمی سے نظارہ کر رہا ہو۔

گونار موت کے اس کھیل کا ماہر تھا، ایک ایسا آگ کا دریا جو اپنی حرارت میں سب کچھ فنا کر دیتا ہے۔ وہ تباہی کا وہ ہی ستون تھا جس سے بچنا ممکن نہیں تھا۔

الیکس کا انجام ایک عبرت ناک داستان بن چکا تھا، اور گونار کی خاموش وحشت اب بھی چاروں طرف منڈلا رہی تھی، جیسے موت خود اس کی شاگرد ہو۔

لیکن اب ایزیکیل کیسے اس دلدل سے نکلے گا؟ شاید گونار کے موجودہ دور میں اس کا پتہ چلے، جہاں اسے ایمان نامی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی، جس کی شباهت اس کی ماں سے حد درجہ مشابہ تھی، یا شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہو کہ ایمان کی صورت میں ایزیکیل کی ماں کی تصویر زندہ ہو گئی تھی۔ ایمان نے اس کی ماں کی یادوں کو از سر نو بیدار کر دیا تھا۔

یہ کہانی اب ایزیکیل کے ماضی اور گونار کے مستقبل میں جا کر کیا رخ اختیار کرے گا اب یہ سوالیہ نشان تھا۔

...°...

گونار کا آج:-

پچیس سالہ گونار اور انیس سالہ ایمان کے لیے تقدیر کے نئے امتحانات اور آزمائشوں کا آغاز۔

گونار میز پر سر رکھے سو رہا تھا، اس کے قریب ماں اور ایمان کی تصویریں رکھی تھیں، جن میں وہ دونوں اسے ہمیشہ کی طرح خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔

ایمان کے موبائل میں نصب کیا گیا خفیہ سافٹ ویئر، جو گونار کی چالاکی کا غماز تھا، اسے ہر پل ایمان کی زندگی کی نگرانی کرنے کی طاقت دیتا تھا۔

وہ سافٹ ویئر ایمان کی ہر بات، ہر حرکت گونار تک پہنچا رہا تھا، جیسے وہ خود اس کے ساتھ سائے کی طرح موجود ہو۔

اس کا خواب اچانک ایک چیخنی ہوئی آواز سے ٹوٹا—یہ ایمان کی آواز تھی، غصے سے بھرپور، جو اس کے فون کے اسپیکر سے گونج رہی تھی۔ گونار نے بو جھل آنکھیں کھولیں، جیسے وہ خواب اور حقیقت کے درمیان کسی دھندلی حد پر معلق ہو۔

کمرے میں آتشدان کی بھڑکتی آگ رات دو بجے تک روشن تھی، مگر اب صبح کے پانچ بج چکے تھے اور آگ بجھ چکی تھی۔ باہر کی کھڑکی سے آسمان پر سبز اور راز کے پردے لہرا رہے تھے، صبح کے پانچ بج چکے تھے، لیکن شمالی سویڈن کی تخیل بستہ سردیوں میں وقت کا کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ قطب کے قریب، جہاں سورج مہینوں تک دکھائی نہیں دیتا، وہاں صبح بھی رات کا ہی تسلسل معلوم ہوتی ہے۔

اس گہرے اندھیرے میں، جہاں دن اور رات کا فرق مٹ جاتا ہے، ہر لمحہ گویا ایک لامتناہی رات میں ڈھل جاتا ہے۔ اسے ”پولر نائٹ“ یا قطبی رات کہا جاتا ہے—ایک ایسی حقیقت جہاں وقت کی قید ٹوٹ جاتی ہے، اور صبح کا مفہوم بھی رات کی تاریکی میں گم ہو جاتا ہے۔

گونار نے ہموار سانس لیتے ہوئے اپنے اطراف کا جائزہ لیا، اسے اچانک یاد آیا کہ سویڈن اور پاکستان کے وقت میں گرمیوں میں تین اور سردیوں میں چار گھنٹے کا فرق ہوتا ہے۔ پاکستان میں اس وقت صبح کے نونج رہے تھے، اور ایمان بازار میں تھی۔

وہ اس کی باتیں سننے لگا، جن میں غصہ اور تلخی جھلک رہی تھی، لیکن یہ غصہ گونار کے دل میں پہلی بار ایک حقیقی مسکراہٹ لے آیا۔ یہ کوئی طنزیہ یا زہر آلود مسکراہٹ نہ تھی، بلکہ دل سے اٹھنے والی ایک سچی مسکراہٹ تھی۔

دوسری جانب، ایمان بازار کی گہما گہمی میں موجود تھی، اپنے سیاہ دوپٹے کو سر پر ہلکی سی نزاکت سے اوڑھے ہوئے۔ اس نے سیاہ رنگ کا فراک زیب تن کر رکھا تھا، جس کی آستینیں لمبی اور اس کے نازک بازوؤں کے گرد دلکش انداز میں لپٹی ہوئی تھیں، جیسے وہ اس کی عصمت و عفت کی محافظ ہوں۔

اس کے بالوں کی گھنی چٹیا، دوپٹے کے احاطے سے نکل کر کندھے سے نیچے بہتی ہوئی ایک خاموشی میں پنہاں تھی، لیکن وہ دوپٹے سے باہر جھلکتی ہوئی اس کے حسن کی روشنی میں گویا اضافہ کر رہی تھی۔

ایمان کی سادگی اور پاکیزگی، اس کے جسم کی تراش خراش کے بغیر بھی، ایک منفرد چمک کے ساتھ نمایاں ہو رہی تھی، جیسے اس کی فطرت میں چھپا جمال، کسی آرائش کے بغیر اپنی مکمل شان کے ساتھ جلوہ گر ہو۔

ایمان نے آدمی کی غلیظ نظریں اپنے وجود پر محسوس کیں تو جیسے اس کے اندر نفرت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تیزی سے اس کے قریب گئی اور غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں پھنکاری، ”کیا گھور رہا ہے؟“۔

آدمی نے فوراً معصومیت کی جھوٹی چادر اوڑھ لی اور گھبرائے ہوئے بولا، ”کچھ نہیں، بہن۔“۔

ایمان کی آنکھوں میں غصے کے شعلے مزید بھڑک اٹھے، وہ پوری طاقت سے چیخی، ”بہن؟! کیا اپنی بہن کو بھی ایسی ہی گندی نظروں سے دیکھتا ہے؟“۔

آدمی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا، اور وہ بوکھلا کر بولا، ”میری کوئی بہن نہیں۔“۔

ایمان کی آنکھوں میں نفرت کی چمک کے ساتھ طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے دانت پیس کر بولی، ”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تیری کوئی بہن نہیں! ورنہ تجھ بے غیرت کی گندی نیت اُس پر بھی آپڑتی۔ ماں تو ہو گی نا؟ اُس کا کیا؟ کیا اُس پر بھی تو اسی طرح نظریں گاڑتا؟ اور کل کو جب تیری بیٹی ہو، تب بھی کسی کی نظر اُس پر یوں پڑے تو کیسا لگے گا؟“۔

اُس نے اُس آدمی کو نفرت بھری نگاہوں سے اوپر سے نیچے تک دیکھا، جیسے اس کی روح کو چھلنی کر رہی ہو، پھر ناک چڑھا کر بولی، ”کمینہ! کھچرا! تم جیسے لوگ معاشرے کے گندہو۔“۔

پھر ایمان واپس دکان کی طرف مڑ گئی اور دکاندار سے کہا، ”چار بطخ کے انڈے اور ایک درجن دیسی انڈے دے دو، اور بکری کا دودھ جو میں نے پہلے ہی پیسے دے دیے تھے۔“

دکاندار نے انڈے اور دودھ کے پیکیٹس پکڑائے اور بولا، ”پانچ سو ہو گئے، میڈم۔“

ایمان نے پیسے دیے اور اسی، انداز میں سختی سے بولی ”مرغیوں اور بطخوں نے سونے کے انڈے دینا شروع کر دیے ہیں کیا؟“

ایمان نے اپنے ہاتھوں میں شاپر تھاما اور وہاں سے جانے کے لیے مڑی، لیکن اس کی پشت پر وہ آدمی اب بھی اپنی غلیظ نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

ایمان نے قدم روکے اور کچھ لمحوں کے لیے اُس کی طرف رخ موڑا۔ وہ خاموشی سے چند پل تک اُس کی آنکھوں میں نگاہیں گاڑ کر دیکھتی رہی۔

ایمان کی آنکھوں میں نفرت اور غضب کی ایسی آگ تھی، جو کسی بھی وجود کو بھسم کر سکتی تھی۔ اُس کے چہرے پر شعلوں کی جھلک تھی، اور جیسے جیسے اس کی نظریں آدمی کی طرف جمی رہیں، وہ شخص اُس کی شدتِ غضب کو برداشت نہ کر سکا۔

اُس کی آنکھوں کی تپش کے آگے وہ آدمی لرزنے لگا، اس کی ہمت جواب دے گئی، اور وہ ہڑبڑا کر فوراً وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا، جیسے اس کے پاؤں زمین سے اُکھڑ چکے ہوں۔

ایمان کا غصہ اتنا شدید تھا کہ اگر وہ پہاڑوں پر گرتا تو انہیں بھی پگھلا کر رکھ دیتا۔ اُس کے چہرے پر ایک فاتحانہ اور فخریہ مسکراہٹ نمودار ہوئی، گویا اُس نے اپنی عزت اور غیرت کا دلی طور پر دفاع کر لیا ہو۔

وہ مطمئن قدموں سے چل دی، جیسے اپنے پیچھے خوف کا طوفان چھوڑ آئی ہو۔

دوسری طرف، گونار اپنے فون سے ایمان کی باتیں سن کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ وہ ہنستے ہوئے اپنے سر کو ہاتھ سے تھپک کر بولا، ”یہ لڑکی کیا چیز ہے یار، حد ہے!“۔

اس کی نگاہ اچانک دیوار پر لگے آئینے پر جا ٹھہری، جہاں اس کا اپنا عکس بے حد خاموشی اور گہری سنجیدگی کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ کیا وہ مسکرا سکتا تھا؟ کیا اس کی تقدیر میں مسکراہٹ کی کوئی گنجائش باقی تھی؟

کتنا عرصہ ہو چکا تھا کہ اُس نے دل سے مسکرا کر زندگی کو محسوس کیا ہو؟ اگر کبھی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر آتی بھی تو وہ کرخ، زہریلی اور فحش کی خونچکاں دھار لیے ہوئے ہوتی۔

مگر آج کی یہ مسکراہٹ... آج کی مسکراہٹ اُس کے دل کی کسی گہرائی سے نکل کر آئی تھی، ایک ایسی گہرائی جہاں روشنی کبھی پہنچ نہیں پائی تھی۔

مگر نہیں... گونا رہنس نہیں سکتا تھا، اُس کی مسکراہٹ ایک دم سے رک گئی۔ چہرے کی نرمی پلک جھپکتے میں
سنجیدگی کی سختی میں بدل گئی۔

اس کی نظریں آہستہ سے ٹیبل پر رکھی ہوئی تصویروں اور موبائل پر جم گئیں۔

ایک لمحے کی گہری خاموشی کے بعد، اس نے اپنے مضبوط ارادے کے ساتھ سر کو اثبات میں ہلایا۔ ہونٹوں
پر ایک خاموش لیکن بے پناہ عزم سے مدھم اور گمبھیر لہجے میں بولا،

”It’s time to go back to Stockholm“

(اسٹاک ہوم واپس جانے کا وقت آ گیا ہے)

وہ ہلکے سے مسکرایا، اُس کی گہری آواز میں اعتماد کی چمک تھی۔ اُس کی آنکھوں کی چمک اور مسکراہٹ میں
ایسی کشش تھی جو کسی کو بے بس کر دے۔

”Let’s remind them who runs this game“

یہ الفاظ اُس کے اندر چھپے وحشیانہ اعتماد اور کشش کی عکاسی کر رہے تھے، جیسے ہر حرف میں ایک پوشیدہ ارادہ اور خطرناک چمک ہو، جیسے وہ جانتا ہو کہ اب دنیا اُس کے قدموں کے نیچے ہوگی، چاہے اس کی قیمت کچھ بھی ہو۔

یہ آخری جملہ جیسے گونار کی زندگی میں ایک نیا موڑ تھا، جہاں وہ نہ صرف اپنی پرانی جنگوں کا سامنا کرے گا بلکہ نئی آزمائشوں کی تیاری بھی کرے گا۔

...°...

وہ اسٹاک ہوم کی مشہور شاہراہ کونگسگاتن

(Kungsgatan) کے کنارے چل رہا تھا، ایک جانب جدید عمارتیں، دوسری جانب قدیم فن تعمیر کے نمونے، جو شہر کی تاریخ اور ترقی کی عکاسی کر رہے تھے۔

گونار نے اپنی چمڑے کی چیلسی بوٹس میں قدم رکھا ہوا تھا، اور ٹرٹل نیک سویٹر کے اوپر سے لمبا، سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا، جس کی سادگی میں وقار اور دلکشی پوشیدہ تھی۔ ڈریس پینٹ کے فولڈز اور جوتوں کی چمک نے اس کی شخصیت میں ایک عجیب سا جلال پیدا کیا ہوا تھا، جیسے وہ شخص جو اپنی دنیا میں آزاد اور مطمئن تھا لیکن اس کے اندرونی اضطراب کی گہرائیاں کوئی نہیں جانتا تھا۔

سڑک پر چلتے ہوئے وہ اطراف میں موجود کیفے، ریسٹوران اور دکانوں کو دیکھ رہا تھا، جن سے اٹھنے والی تازہ بیکری کی خوشبو، گرم کافی کی بھاپ اور مختلف مسالوں کی خوشبو شہر کے سرد موسم کو مزید خوشگوار بنا رہی تھی۔

ہوا میں برف کے نرم گالے گرتے جا رہے تھے، جو اسٹاک ہوم کی پرسکون صبح کو ایک اور طرح کی خوبصورتی عطا کر رہے تھے۔ ٹریفک کے شور و غل کے درمیان وہ خود کو ایک عجب سکون میں محسوس کر رہا تھا، جیسے ارد گرد کا ہنگامہ اس کے وجود کے اندر ایک مہیب خاموشی میں ڈھل چکا ہو۔

گونا جب ایک پل کے نیچے سے گزرا تو اچانک ایک دکان پر اس کی نظر پڑی۔ دکان کے بورڈ پر لکھا تھا:

”اسلامسک بوکھندل آف پروف. تراب حسینی“ (اسلامی کتابوں کی دکان پروفیسر تراب حسینی)

نیچے چھوٹے حروف میں لکھا تھا

”En Koran på svenska“

”(سویڈش ترجمہ میں قرآن)۔“

اس بورڈ کو دیکھتے ہی گونا کے اندر کچھ ہلچل سی مچ گئی۔ اسلام اور قرآن سے اس کی دل چسپی ہمیشہ رہتی تھی، لیکن کبھی وقت یا مواقع نہیں ملے تھے کہ وہ اس حوالے سے کچھ جان سکے۔

وہ کچھ پل رکا، جیسے کسی اندرونی کشمکش میں مبتلا ہو، اور پھر فیصلہ کن انداز میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
دکان کا دروازہ کھولتے ہی اندر سے ایک مدہم سی گھنٹی کی آواز سنائی دی اور وہ ایک گرمی اور آرام دہ فضا
میں داخل ہو گیا۔

دکان کے اندر ہر طرف کتابوں کی الماریاں تھیں، جن میں اسلام سے متعلق کتابیں، رسالے، اور سی ڈیز
بھری پڑی تھیں۔

ہوا میں بخور اور موم بتیوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی، جو دکان کے اندر کے ماحول کو روحانی اور پرامن بنا رہی
تھی۔ کہیں سے قرآن کی تلاوت کی آواز آرہی تھی، جو دکان کے ماحول کو مزید مقدس اور پاکیزہ بنا رہی
تھی۔

گونار کی توجہ اس شخص کی طرف گئی جو قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، اس شخص نے
تلاوت روک دی اور سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

گونار کی نظروں نے اس شخص کا جائزہ لیا، وہ دبلا پتلا لیکن پروقار شخصیت کا مالک تھا، جس کی آنکھوں میں
علم اور حکمت کی چمک تھی۔ اس نے لمبے گہرے کالے بال اور سلیقے سے تراشی ہوئی داڑھی رکھی ہوئی
تھی، جو اس کی وقار بھری شخصیت کو اور نکھار رہی تھی۔

گونار نے اپنی آواز میں تحمل رکھتے ہوئے کہا، ”مجھے قرآن چاہیے۔“

اس شخص نے مسکراتے ہوئے ایک قرآن پاک کاؤنٹر سے نکالا اور گونار کے سامنے رکھ دیا۔

گونار نے قرآن کو اپنے ہاتھوں میں تھاما، اس کے سینے میں ایک عجیب سی گرمی پھیل گئی، جیسے وہ کچھ بہت خاص چیز تھامے ہوئے ہو۔

۔ ”اس کی قیمت کیا ہے؟“ گونار نے تھوڑا الجھتے ہوئے پوچھا۔

وہ شخص مسکرایا، ”یہ کتاب انمول ہے، اس کی کوئی قیمت نہیں۔“

گونار نے حیرانی سے کہا، ”آپ مجھے یہ مفت میں دے رہے ہیں؟“

وہ شخص بولا، ”نہیں، مجھے اس کے بدلے جنت ملے گی۔“

گونار اس جواب پر دم بخود رہ گیا۔ اس نے دوبارہ قرآن کی طرف دیکھا اور اس کی انگلیاں بے اختیار قرآن کے صفحات پلٹنے لگیں۔ اس کی آنکھوں نے عربی رسم الخط کے حروف کو دیکھا اور اس کے دل میں ایک عجیب سا سکون اتر۔ جیسے وہ ان الفاظ کو نہ صرف پڑھ رہا تھا بلکہ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے پہلا صفحہ کھولا اور پہلی آیت پڑھی: ”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔“

یہ الفاظ پڑھتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک کپکپاہٹ دوڑ گئی۔ اسے لگا جیسے وہ کسی روحانی تجربے کا حصہ بن رہا ہو، جو اس کی زندگی کو بدلنے والا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور دل ایک ناقابل بیان سکون سے بھر گیا۔

گونار نے قرآن بند کیا اور اس شخص کی طرف دیکھا، جواب بھی مسکرا رہا تھا، جیسے وہ جانتا ہو کہ گونار کے دل میں کیا چل رہا ہے۔ پھر اس شخص کی آنکھوں میں اچانک ایک روشنی چمکی، وہ بولا، ”بیٹا، تم مجھے شناسا سے لگتے ہو۔“

گونار نے بھی ایک لمحے کے لیے غور کیا اور بولا، ”مجھے بھی آپ کا چہرہ و نام جانا پہچانا لگتا ہے۔“

دونوں چند لمحوں کے لیے خاموش رہے، جیسے یادوں کے کسی بادل میں گم ہوں، اور پھر پروفیسر تراب حسینی یکدم بولے ”زیبا کے بھائی ایز کیل!“

پروفیسر تراب حسینی نے گونار کو پہچانتے ہوئے مسکرا کر کہا، ”ایز کیل، تم زندہ ہو!“

گونار کی مسکراہٹ گہری ہو گئی، ”اور آپ زیبا کے استاد، کیرولنسکا انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر!“

دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگا لیا، جیسے برسوں کی جدائی اور گمشدہ یادیں پل بھر میں لوٹ آئی ہوں۔ پروفیسر نے گونار کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا، ”مجھے لگا تھا کہ تم اس دن مر گئے تھے جس رات وہ حادثہ ہوا۔“

گونار کی آنکھوں میں درد کی پرچھائیاں جھلکیں، ”میں اور عیسیا بھاگ گئے تھے، لیکن سویڈن کی سردیوں نے میرے بھائی کو نگل لیا۔ پھر میں چین چلا گیا، جہاں میری ملاقات ایک عظیم استاد سے ہوئی اور میں نے شاو لن منک کے طور پر تربیت حاصل کی۔“

پروفیسر تراب حسینی ایک معتبر اسلامی اسکالر اور ماہر تعلیم ہیں، جنہوں نے اسلامی علوم کے فروغ اور طب کے میدان میں گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

ان کی شخصیت کی گہرائی صرف علم تک محدود نہیں، بلکہ ان کا فکری اور روحانی سفر بھی بے مثال ہے۔ ہنزہ کے خوبصورت اور قدرتی حسن سے مالا مال علاقے سے تعلق رکھنے والے پروفیسر تراب نے اپنے علمی سفر کا آغاز پاکستان سے کیا، جہاں کی فضا اور تہذیب نے ان کے اندر حکمت اور دانائی کی بنیاد رکھی۔

انہوں نے سویڈن کے معروف طبی ادارے کیرولنسکا انسٹی ٹیوٹ میں طب کی تعلیم حاصل کی، جہاں انہوں نے نہ صرف اپنی تعلیم میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا، بلکہ اپنی علمی تحقیقی صلاحیتوں کی بدولت ایک منفرد مقام حاصل کیا۔

ان کی شخصیت میں ایک ایسی جامعیت تھی جس نے طب اور اسلامی علوم کے درمیان ایک پل تعمیر کیا۔ وہ ایک محقق، استاد اور اسلامی تعلیمات کے مبلغ تھے، جنہوں نے اپنی زندگی کو انسانیت کی خدمت اور علم کے فروغ کے لیے وقف کر دیا۔

پروفیسر تراب کا سویڈن میں قیام کا فیصلہ اس امر کا مظہر تھا کہ وہ ایسے معاشرے میں رہنا چاہتے تھے جہاں علم کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ذہین افراد کو عزت بخشی جاتی ہے۔

ان کی زندگی کا مقصد ہمیشہ سے انسانیت کی فلاح اور اسلام کے حقیقی پیغام کو دنیا بھر میں پھیلانا رہا۔ ان کی تعلیمات اور خدمات نہ صرف سویڈن بلکہ دنیا بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

کمرے میں ہلکی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی، جو وہاں موجود ہر شے پر ایک خاموشی اور سکون کا سایہ ڈال رہی تھی۔ کمرہ چھوٹا مگر نہایت نفاست سے سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر فن پارے اور کتابیں، اور بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر رکھے گلدان میں تازہ پھول اپنی لطافت کا اظہار کر رہے تھے۔

اوپر چھت سے ایک پرانی طرز کی لالٹین جھول رہی تھی، جس کی زرد روشنی نے فضا کو ایک قدیم سی روحانی کیفیت میں بدل رکھا تھا۔

میز پر رکھا سوپ کا پیالہ بھاپ چھوڑ رہا تھا، اور اس کی مہک کمرے کے اندر پھیلی ہوئی تھی، جیسے ایک نئے مکالمے کا آغاز کرنے کو بیتاب ہو۔

یہ غالباً پروفیسر تراب حسینی کا گھر تھا، جہاں ان کی شخصیت کی مانند سادگی اور علم کا امتزاج نظر آ رہا تھا۔ گونار اور پروفیسر آمنے سامنے بیٹھے تھے، اور ایک عجیب سی خاموشی دونوں کے درمیان موجود تھی، جسے ایز کئیل کی آواز نے توڑا، ”بہت سی مشکلات دیکھیں، اور شاید اسی لیے آج میں گونار ہوں۔“

پروفیسر تراب نے ایک پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا، جیسے وہ ایز کئیل کے دل کے درد کو سمجھ رہے ہوں۔

وہ گہری نظریں گونار پر جماتے ہوئے بولے، ”تمہارے چچا کی موت ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔“ گونار نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، اور پروفیسر کی آنکھوں میں جھانکا، جیسے وہ پہلے سے سب جانتے ہوں۔

۔ ”پہلے تو میں نے سوچا کہ ان کی موت ایک حادثہ تھی،“ پروفیسر تراب نے آہستگی سے کہا، ”مگر تمہیں زندہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ تمہارے چچا کے انجام میں تمہارا ہاتھ بھی شامل ہے۔“

پروفیسر تراب نے کچھ لمحوں کے لیے خاموشی اختیار کی، پھر ایک گہری سانس لے کر گونار کی طرف دیکھا، جو خاموشی سے سوپ کا چمچ اپنے لبوں تک لے جا رہا تھا۔ اس نے نرمی سے کہا، ”بدلہ تو لینا ہی تھا۔“ اس کے الفاظ میں درد اور تلخی چھپی ہوئی تھی۔

پروفیسر تراب نے سوپ کی بھاپ کو دیکھتے ہوئے کہا، ”یہ دنیا محض ایک امتحان ہے۔ تمہارے چچا نے جو کچھ کیا، اس کا حساب اگلے جہان میں ہو گا۔“ ان کی باتوں میں ایک روحانی گہرائی تھی، جو گونار کو سوچ میں ڈال رہی تھی۔

پھر جیسے کسی بھاری بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے، پروفیسر نے کندھے اچکائے اور نرم لہجے میں کہا، ”لیکن ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی“

پروفیسر تراب نے ایک پل کے لیے توقف کیا، اور پھر اچانک پروفیسر تراب نے ایک اور سوال اس کی طرف پھینکا، ”کیا تمہاری ماں اور والد نے تمہیں ایک اور حقیقت سے آگاہ کیا تھا؟“۔

گونار کے ہاتھ لرزنے لگے، وہ سوالیہ نظروں سے پروفیسر کی طرف دیکھنے لگا، ”کیسی حقیقت؟“۔

پروفیسر تراب نے گہری نظر سے اسے دیکھا، جیسے کوئی راز افشا کرنے والا ہو، ”تمہاری ماں میری، تمہاری بہن زیبا، اور تمہارے والد ابراہام، وہ سب مسلمان ہو چکے تھے۔“۔

یہ جملہ گونار کے دل میں کسی بم کی طرح پھٹا، وہ ایک دم سکتے میں آگیا، اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات چھا گئے۔ ”مجھے اس کا علم نہیں تھا،“ اس نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا، جیسے اس حقیقت کو قبول کرنے میں ہچکچا رہا ہو۔

پہلے ماسٹر لی، جنہوں نے یہ راز چھپایا کہ وہ مسلمان تھے، اور اب اس کا اپنا خاندان بھی۔ ایک لمحے کے لیے گونار کو لگا کہ زمین اس کے قدموں تلے سے نکل گئی ہے۔

پروفیسر تراب نے ایک پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”جس رات تمہارے خاندان پر وہ سانحہ گزرا، تمہاری ماں نے مجھے کال کی تھی۔ وہ خوف زدہ تھیں، یہ سوچ کر کہ تمہیں یہ بات کیسے بتائی جائے، کیوں کہ اس دن تمہاری ایک مسلمان لڑکے سے لڑائی ہوئی تھی۔“۔

گونار حیرت اور پریشانی کے عالم میں خاموش تھا۔ پروفیسر تراب نے مزید کہا، ”میری چاہتی تھی کہ تم بھی مسلمان ہو جاؤ، لیکن اس کی خواہش ادھوری رہ گئی۔“

گونار کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے کو تھے۔ وہ اپنی ماں کی محبت اور اس کی خواہش کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔

...°...

گونار کے کمرے میں نیم اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک لیمپ رکھا تھا، جس کی زرد روشنی کبھی کمرے کو اجالے میں نہلاتی اور کبھی دوبارہ اندھیرے میں چھوڑ دیتی، جب وہ بار بار اسے بٹن سے آن اور آف کر رہا تھا۔

اس روشنی کے ہلکوروں میں، گونار کا چہرہ کبھی روشنی میں چمکتا تو کبھی اندھیرے میں گم ہو جاتا۔ اس کے دل و دماغ میں خیالات اور سوالات کا طوفان برپا تھا، جیسے وہ اس انکشاف کے اثر میں ڈوبا ہوا ہو کہ اس کے والدین اور بہن نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

گونار خود کو کسی مکروہ، گناہ گار اور گمراہ انسان کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ ایک ایسا شخص جو ایلومیناتی کے اسرار کا حصہ بن چکا تھا، ایک غلط راہ کا مسافر، جس کے قدم شاید ہمیشہ کے لیے پستی میں دھنس چکے تھے۔

لیکن اب وہ اس سوال میں الجھا ہوا تھا کہ کیا وہ خود مسلمان ہو سکتا ہے؟ کیا وہ اس سچائی کا حصہ بن سکتا ہے جسے اس کے خاندان نے قبول کیا تھا؟

اس کے ذہن میں گو نجی آوازیں اسے یاد دلاتی تھیں کہ وہ سب جانتا تھا—اسلام کی حقیقت، اس کی سچائی، اور وہ سب کچھ جو اس سے چھپایا جا رہا تھا۔

مغربی میڈیا اور خفیہ تنظیمیں، جن کے مفادات اسلام کے خلاف تھے، اس عظیم مذہب کو بدنام کرنے میں مصروف تھے۔ وہ ہی معاشرے، وہ ہی فلمیں، جو مسلمانوں کی شبیہ کو بگاڑنے کا ذمہ دار تھیں، تاکہ انسانیت کو اس سچ سے دور رکھا جاسکے جس کی رہنمائی اسلام نے کی تھی۔

اسلام ایک ایسا پیغام تھا جو زندگی کی حقیقتوں کو سادگی سے سمجھاتا تھا۔ اس نے ہر اس چیز سے روکا تھا جو انسانیت کے زوال کا سبب تھی—شراب، چرس، نشہ، اور ہر وہ گناہ جو آدمی کو اس کی فطرت سے دور کر دیتا تھا۔

گونار کے دل میں یہ سوال گونجنے لگا کہ مغربی دنیا کیوں اس مذہب کے پیچھے پڑی ہوئی تھی؟ کیوں اس حقیقت کو چھپانے کے لیے ایسی سازشیں کی جا رہی تھیں؟

—”اسلام میں سب درست ہے،“ اس نے دل میں سوچا۔ ”یہ ہی وجہ ہے کہ یہودی زایونسٹ، جو دنیا کی معیشت پر قابض ہیں، اسلام سے خوف زدہ ہیں۔ اگر دنیا کے لوگ اسلام قبول کر لیں، تو ان کے حرام کاروبار، جو دنیا میں گمراہی پھیلا رہے ہیں، ختم ہو جائیں گے۔“

لیمپ کی روشنی ایک بار پھر کمرے کو روشن کرتی، گونار کا چہرہ پھر سے چمک اٹھتا، اور وہ اپنے خیالات کی تاریک گہرائیوں سے باہر آتا۔ پھر جیسے ہی لیمپ آف ہوتا، وہ دوبارہ اندھیرے میں غائب ہو جاتا۔ اس کے اندر کی کشمکش بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ اسلام نے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی روح قرار دیا ہے، جبکہ مغربی میڈیا نے نام نہاد “ایمپاورمنٹ” کے نام پر خاندانی نظام کو برباد کر دیا تھا۔ اس کے والدین نے اسلام میں وہ سچائی دیکھی تھی جو اس نظام زندگی کی بنیاد تھی۔

۔ “ہاں، یہ ہی وہ حقیقت تھی جس نے انہیں اسلام کی طرف مائل کیا تھا۔” گونار نے خود کلامی کی۔

لیکن کیا وہ، جو اتنا گناہ گار تھا، جو اتنے باطل نظریات کا پیروکار رہا تھا، وہ بھی مسلمان ہو سکتا تھا؟ یہ سوال اس کے دل میں خنجر کی طرح پیوست ہو گیا۔ اس کا دل جواب جانتا تھا، لیکن اس کا ذہن اس حقیقت کو قبول کرنے سے قاصر تھا۔

وہ جدوجہد کر رہا تھا، اندھیرے اور روشنی کے درمیان جھولتا ہوا، جیسے اس کا وجود خود ایک لیمپ کی طرح کبھی روشن ہوتا اور کبھی اندھیرے میں ڈوب جاتا۔

لیمپ ایک بار پھر روشن ہوا، اور گونار کا چہرہ چمک اٹھا، مگر جیسے ہی لیمپ بند ہوا، وہ اندھیرے میں گم ہو گیا، اپنے خیالات کے بوجھ تلے دبے ہوئے۔

گونار خاموشی سے اپنی نشست سے اٹھا اور شیشے کی بڑی کھڑکی کے سامنے آکر رک گیا، جو برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا منظر پیش کر رہی تھی۔ باہر کی دنیا پر سفید چادر تنی ہوئی تھی، مگر اس کے دل کے اندر گہری کشمکش اور ہلچل تھی۔

سامنے میز پر قرآن مجید رکھا ہوا تھا، گویا وہ اسی کے انتظار میں ہو۔ گونار نے لرزتے ہاتھوں سے قرآن کھولا، اور خاموشی سے پڑھنے لگا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا، جیسے ہر آیت ایک گہری حقیقت کو اس کے دل میں اتار رہی ہو۔

رات گزر گئی، گھڑی کے کانٹے مسلسل چلتے رہے، مگر گونار کی نظریں قرآن کے الفاظ پر جمی رہیں۔ ایک ایک آیت پڑھتے ہوئے اس کے دل میں ایک حیرت انگیز شعور بیدار ہو رہا تھا۔

وہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ قرآن کا عددی نظام، اس میں بیان کردہ معاشی اصول، سائنسی حقائق، اور ریاضی کی گہری بصیرتیں، وہ سب کچھ جو انسانی ذہن کی پہنچ سے باہر تھا۔

۔ ”دو سمندر جو کبھی آپس میں نہیں ملتے،“ وہ آیت اس کی سوچ میں گھومتی رہی۔ ”سات آسمان، سورج اور چاند کا فاصلہ، کائنات کے راز، سورج کا درجہ حرارت، اور وہ ستارہ جو کائنات کے دل میں دھڑکتا ہے، یہ سب کیسے کسی انسان کے لکھے ہوئے ہو سکتے ہیں؟“ اس نے حیرت سے سوچا۔ پھر اس کے ذہن میں وہ پہاڑ آئے جو چین میں دریافت ہوئے تھے، رنگ برنگے پہاڑ جن کا ذکر قرآن میں چودہ سو سال پہلے آیا تھا۔

۔ ”سمندر کے اندر بہنے والا دریا... ” اس نے دہرایا، ” یہ کوئی انسان نہیں لکھ سکتا۔ یہ اللہ کے الفاظ ہیں، یہ اللہ کی کتاب ہے۔ بے شک، اسلام ہی سچا ہے۔ ” اس نے دل کی گہرائیوں سے اس سچائی کو محسوس کیا۔

اس پر حیرت اور شکر گزاری کا احساس طاری ہو گیا۔ اس کے دل میں عاجزی اور تسلیم کا جذبہ جاگا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے کسی نے اسے روشنی کی طرف لے جا کر ایک نیا راستہ دکھایا ہو۔

قرآن کی تعلیمات نے اس کے دل کی گہرائیوں میں ایمان کی چنگاری روشن کر دی تھی۔ اس کے دل میں ایک نیا سکون اتر آیا، ایک اطمینان جو الفاظ سے پرے تھا۔

وہ قرآن کی آخری آیت پڑھ کر چپ ہو گیا۔ اس کا دل ایمان سے لبریز ہو چکا تھا۔ وہ سیٹ پر جا کر ٹیک لگائے بیٹھ گیا اور دل کی گہرائی سے بولا، ” یہ سب اللہ کے الفاظ ہیں، یہ سب اللہ کے الفاظ ہیں۔ ”

گونار کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اسے یاد آیا کہ آخری مرتبہ اس نے یہ الفاظ کب کہے تھے۔ جب ماسٹر لی نے اسے اپنے آخری لمحات میں کہا تھا کہ وہ ”لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ“ کہے۔

اس نے وہ لمحات یاد کیے جب ماسٹر لی اس کی بانہوں میں دم توڑتے ہوئے مسکرائے تھے اور کہا تھا، ”تم میرا مستقبل ہو، ایز کئیل، تم میرا مستقبل ہو۔ ” اور پھر یہ الفاظ اس کے دل میں گونجنے لگے ”تم جلد جان جاؤ گے۔“

اس نے آنکھیں بند کیں، اور اس کے لبوں پر سرگوشی ابھری: ”لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ۔“

ان الفاظ کے ادا ہوتے ہی اس کی روح میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے، مگر یہ آنسو دکھ یا پچھتاوے کے نہیں تھے، یہ آنسو شکر گزاری اور عاجزی کے تھے۔

جیسے اس نے اپنی زندگی کا مقصد پالیا ہو، جیسے وہ برسوں کی تلاش کے بعد اپنی منزل پر پہنچ گیا ہو۔

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ برف سے ڈھکے پہاڑ صبح کی پہلی کرنوں میں چمک رہے تھے۔ آسمان صاف اور نیلا تھا، جیسے اس کے دل کی الجھنیں بھی چھٹ گئی ہوں۔

پرندے آزادانہ فضا میں اڑ رہے تھے، ان کی چہچہاہٹ فطرت کی مدھر موسیقی بن چکی تھی۔ گونار نے ہر طرف اللہ کی نشانیاں دیکھیں، ہر منظر میں ایک پیغام دیکھا۔

اس نے دل کی گہرائیوں سے اسلام کی حقانیت کو تسلیم کیا۔ ہر چیز صاف اور واضح تھی۔ زندگی کا مقصد، انسان کی حیثیت، کائنات کی عظمت—سب کچھ اس کے سامنے کھل گیا تھا۔ اسے اب کوئی شک باقی نہیں رہا تھا۔

وہ مسکرایا، اپنے آنسو پونچھے، اور دل میں ایک نیا ولولہ محسوس کیا۔ وہ اب ایک بدلا ہوا انسان تھا، ایک مومن، ایک مسلمان۔ اس کے دل میں امن اور سکون تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اب ایک نئی زندگی کی طرف بڑھ رہا ہے—ایک ایسی زندگی جو ایمان، محبت اور سچائی سے معمور تھی۔

اس نے آخری مرتبہ کھڑکی سے باہر دیکھا، اور اپنی جگہ ایک نئی امید اور یقین کے ساتھ قدم جما لیے۔

ایز کنیل کی آنکھوں میں اب بھی وہ ہی اضطراب تھا، وہ جواب جان چکا تھا، لیکن اسے اپنی دنیا کی حقیقتوں سے نبرد آزما ہونا تھا۔ وہ الیومیناتی کا حصہ تھا، اس کی زندگی صرف عقیدے کی روحانی گہرائیوں میں غرق ہو کر نہیں گزر سکتی تھی۔

اسے ان تاریک راہوں پر بھی چلنا تھا، جہاں سے واپس مڑنا شاید اتنا آسان نہ ہو۔

وہ بو جھل قدموں سے اٹھا اور واش روم کی طرف بڑھا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے چہرے اور بالوں پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے، جیسے رات بھر کے غور و فکر نے اسے اندر سے تازگی بخشی ہو۔ اس نے زیتون کے سبز رنگ کا نفیس سویٹر پہنا، جس کی فٹنگ اس کے لمبے، پُرکشش جسم کو نمایاں کر رہی تھی۔

گرے ڈریس پیٹ کی نرمی اور شائستگی نے اس کی شخصیت میں ایک منفرد دلکشی بھر دی تھی۔ اس کے چیلیسی بوٹ، جو اعلیٰ معیار کی چمڑے سے بنے تھے، خاموشی سے اس کے ذوقِ نفیس کی گواہی دے رہے تھے۔

اس کے ہر قدم میں اعتماد کی جھلک تھی، ہر حرکت میں ایک غیر معمولی مردانگی اور وجاہت جھلکتی تھی۔

ایز کنیل نے میز کے سامنے جا کر گاڑی کی چابی اٹھائی اور نیچے اترا۔ وہ مہنگی اور شاندار گاڑی، جو دولت اور طاقت کی علامت تھی، اس کے منتظر تھی۔

اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر تیزی سے آگے بڑھا۔ انجن کی گرجتی آواز اس کے اندر کی کشمکش کا اظہار کر رہی تھی۔ راستے میں بادلوں نے آسمان کو گھیر رکھا تھا، جیسے قدرت بھی اس کی اندرونی کیفیت کی عکاسی کر رہی ہو۔

مگر برف ابھی تک زمین پر نہیں گری تھی، جیسے کسی اہم لمحے کا انتظار ہو۔

پارکنگ ایریا میں پہنچ کر، گونار نے گاڑی کھڑی کی اور پروفیسر تراب کے گھر کی طرف چل پڑا۔ نو کرنے دروازہ کھولا تو وہ اندر داخل ہوا۔ پروفیسر تراب موبائل فون کان سے لگائے بات کر رہے تھے، ان کی آواز میں سکون اور گرم جوشی تھی۔ ”ہاں، میں جلد ہی پاکستان آؤں گا، فکر نہ کرو... ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد۔“

جب پروفیسر تراب کی نظر ایز کنیل پر پڑی، تو ان کے چہرے پر ایک نرم مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کال ختم کرتے ہوئے کہا، ”ٹھیک ہے، اللہ حافظ، بعد میں بات ہوتی ہے۔“ وہ ایز کنیل کی طرف بڑھے اور گرم جوشی سے اسے گلے لگایا۔ ان کی آنکھوں میں ایک استاد کا فخر اور شفقت تھی۔

پروفیسر تراب نے پیچھے کھڑے نوکر کی طرف دیکھا اور حکم دیا، ”حیدر، ہم دونوں کے لیے ناشتہ لے آؤ۔ غالباً ایز کنیل ساری رات قرآن پڑھتا رہا ہے اور ابھی تک ناشتہ نہیں کیا ہوگا۔“

ایز کنیل حیران رہ گیا کہ پروفیسر کو یہ کیسے معلوم ہوا، مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ نوکر خاموشی سے سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

پروفیسر تراب کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی محبت تھی۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے بولے،
- ”میرے بیٹے بہرام نے فون کیا تھا، ماشاء اللہ، میری بہو نے جڑواں بچوں کو جنم دیا ہے۔“ وہ چند لمحوں کے لیے رکے، پھر مسکراتے ہوئے ایز کنیل کی طرف متوجہ ہو کر کہا، ”میری بہو کا نام شانزہ ہے۔“

پروفیسر نے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایز کنیل بھی ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ پروفیسر کی نگاہوں میں سنجیدگی اور حکمت کی جھلک تھی۔ انہوں نے براہ راست ایز کنیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، ”اب بتاؤ، کیا چیز تمہیں پریشان کر رہی ہے؟“

وہ پروفیسر تراب کے نفیس ڈرائنگ روم میں براجمان تھے، جو جدید فرنیچر اور سلیقے سے کی گئی آرائش کے سبب راحت اور خوبصورتی کا پیکر تھا۔ ان کے عقب میں ایک وسیع شیشے کی کھڑکی سے شہر کا پُرہنگام منظر، چلتی ہوئی گاڑیاں، مصروف انسان صاف دکھائے دیتے تھے۔ فرش پر بچھا گہرے نیلے رنگ کا قالین صوفوں کے شاندار رنگوں سے ہم آہنگ تھا۔ سامنے سفید میز پر ایک گلدان تھا جس میں تازہ پھولوں کی

لطافت اور چند کتابیں رکھی تھیں، اور ایک فرش لیمپ سے اضافی روشنی فراہم کی جا رہی تھی۔ گفتگو سوئڈش زبان میں ہو رہی تھی، جس میں دونوں کو مہارت حاصل تھی۔

گونار کے ذہن میں بے شمار سوالات اور شبہات ہجوم کیے ہوئے تھے، اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے ابتدا کرے۔ اس نے بات کا آغاز اردو میں کرتے ہوئے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا، جو کبھی ایمان نے اس عورت کو دی تھی اور اب وہ ہی گھڑی زنانہ خدو خال سے مردانہ خدو خال میں بدل چکی تھی جو گونار کی کلائی پر بندھی تھی۔ ”قرآن کہتا ہے کہ فرقوں میں مت بٹو، تو مسلمان قرآن کی اس ہدایت پر کیوں عمل نہیں کرتے؟ انہیں کیسے پتہ چلتا ہے کہ کون سا فرقہ صحیح ہے اور کون سا گمراہ؟“۔

پروفیسر تراب نے مسکراتے ہوئے نرمی سے جواب دیا۔ وہ ایک جید اسلامی اسکالر اور مشہور مصنف تھے جنہوں نے اپنی زندگی اسلام کی خدمت اور پیغام حق کو عام کرنے کے لیے وقف کر دی تھی۔۔ ”اللہ تعالیٰ نے فرقہ واریت کو حرام قرار دیا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔“ پھر انہوں نے سورہ انعام کی آیت (۶:۱۵۹) کا ترجمہ پڑھا: ”یقیناً آپ کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہوں میں بٹ گئے۔ ان کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، اور وہ ہی انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا۔“

گونار نے گہری سانس لیتے ہوئے سوال کیا ”پھر مسلمان متحد کیوں نہیں ہیں؟“۔

پروفیسر تراب کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی، ”یہ ہی تو اصل مسئلہ ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر کہتا ہے، اور یہ ہی وجہ ہے کہ ہم ایک امت بننے میں ناکام ہیں۔ ہم امت نہیں، محض ایک بے ہنگم ہجوم ہیں۔ اس لیے آج مسلمان کمزور ہیں۔ میں جب یہ باتیں کہتا ہوں تو مولوی حضرات مجھے اسلام کا دشمن گردانتے ہیں، صرف اس لیے کہ میں پینٹ شرٹ پہنتا ہوں، ٹوپی نہیں پہنتا، اور تسبیح میرے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ ہمارے معاشرے میں بڑی داڑھی کو تقویٰ کی علامت مانا جاتا ہے۔ ہمیں یہ گمان ہے کہ جو شخص حج کر کے آیا ہے، وہ نیک اور صالح مسلمان ہے۔ ہم نے اسلام کو دل کی بجائے ظاہری صورت تک محدود کر دیا ہے۔ داڑھی ہو تو مسلمان، ورنہ نہیں۔ ہر فرقے کا مولوی اپنے فرقے کا دفاع کرتا ہے، لیکن اسلام کی حقیقی روح کو کسی نے نہیں اپنایا۔ ہر مسلمان کو خود اسلام کا مطالعہ کرنا چاہیے، ورنہ وہ ان ہی مخصوص علما کی پیروی کرے گا جنہوں نے اپنی قوموں کو گمراہی کی طرف دھکیلا، جیسے یہودی اور مسیحی۔“

ایزکئیل نے پھر گہری سانس لی۔ اس کے دل و دماغ پر علمی بارش برس رہی تھی، ”انسانیت کے مختلف طبقے، ہر فرد ایک مخصوص جوہر کا مالک ہے، لیکن پھر بھی ہم اکثر ان لوگوں کی طرف کھنچتے ہیں جو ہمارے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں، ہمارے خیالات کی توثیق کرتے ہیں۔ پھر ہم ان لوگوں کی تعریف کیوں نہیں کر پاتے جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں؟“

پروفیسر تراب نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں جواب دیا، ”

یہ ہماری فطرت کا خاصہ ہے کہ ہم دوسروں کے خیالات کو سمجھنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کرتے، حالانکہ حقیقت یہ ہی ہے کہ لوگوں کو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی کے تجربات اور نظریات کی بنیاد پر دنیا کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔

فرض کریں دو افراد آمنے سامنے کھڑے ہوں اور ان کے درمیان ایک عدد ”چھ“ لکھا ہو۔ جو شخص اسے بائیں طرف سے دیکھے گا، اسے ”چھ“ ہی نظر آئے گا، جبکہ جو دائیں جانب سے دیکھے گا، اسے وہ ”نو“ دکھائی دے گا۔

یہ ان کا نقطہ نظر ہے، مگر اگر کسی کا نظریہ حقیقت سے بعید ہو تو ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اسے درست سمت دکھائیں اور قرآن کی روشنی میں جواب دے کر حقیقت کی طرف راہنمائی کریں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کا اپنا زاویہ نظر ہوتا ہے، جس میں حکمت کا کوئی نہ کوئی پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔ جب ہم مختلف خیالات کو قبول کرنے کا ہنر سیکھ لیں گے، تب ہی ہم انسانیت میں حقیقی ہم آہنگی اور امن کو فروغ دے سکیں گے۔“

پروفیسر کی آواز میں علم، شفقت اور عاجزی کی گہرائی تھی۔ ان کی گفتگو کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ روح کے اندر تک اترتے جا رہے ہوں۔ گونار پر اس کا گہرا اثر ہوا۔

گونار نے اپنی مخصوص سرد مہری سے کہا، ”مممم، مسلمانوں کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ لوگ جھوٹے مسیح کے مندر کی تعمیر کے لیے فلسطین پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں۔“

پروفیسر تراب نے گونار کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا اور نرمی سے استفسار کیا، ”یہ کون لوگ ہیں؟“۔

گونار نے فقط مختصر اور بے تاثر لہجے میں کہا، ”ایلو میناتی۔ فری میسنز۔“

پروفیسر تراب نے ایک مشکوک نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا، ”تمہیں کیسے معلوم؟“۔

ایز کئیل نے کندھے اچکائے۔ وہ ان کے سامنے اپنی شمولیت کا اعتراف کرنے سے کترارہا تھا۔ پروفیسر تراب نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا، ”جو میں سوچ رہا ہوں اللہ کرے وہ نہ ہو“ ان کا لہجہ سنجیدگی اور فکر مندی سے بھرا ہوا تھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات نے ظاہر کر دیا کہ وہ سمجھ چکے تھے کہ ایز کئیل ایلو میناتی کا حصہ ہے۔

گونار نے ایک بے پروائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور شانے اچکائے۔ اس کے انداز میں اعتماد اور لا تعلقی تھی، جیسے اسے کسی بات کی پروا نہ ہو۔ پروفیسر تراب نے ایک گہری سانس لی اور نظر جھکالی۔ پھر انہوں نے مایوسی اور غصے سے لبریز آواز میں کہا، ”وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔“

ایز کئیل نے لا پرواہی سے جواب دیا، ”ہاں، انہوں نے میرے دماغ میں ایک چپ ڈالی تھی۔ کہا یہ کہ اگر میں ان کے خلاف گیا تو وہ مجھے برین ہیمرج سے ختم کر دیں گے، لیکن ایک پیچیدہ اور خطرناک آپریشن کے ذریعے میں نے وہ چپ، جو چاول کے دانے کے برابر تھی، نکلوا دی۔“

اس کے لہجے میں کوئی خوف یا پچھتاوا نہیں تھا۔ وہ پرسکون تھا، جیسے یہ بات محض ایک معمولی واقعہ ہو۔

پروفیسر تراب نے گہری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا، ”اب سوال یہ ہے کہ تمہارا مقصد کیا ہے؟ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“ ان کے لہجے میں ایک متجسس اور ہمدردانہ پہلو تھا، جیسے وہ واقعی اس کی مدد کرنا چاہتے ہوں۔

ایز کنیل نے ایک لمحے کے توقف کے بعد سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا، ”میں نے بہت سے سنگین گناہ کیے ہیں، اور اس کا آغاز اس وقت ہوا جب میرا بھائی اور میں بے سروسامانی کے عالم میں گلیوں میں بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ سردراتوں میں کوئی ہماری مدد کو نہ آیا، اور میرے بھائی کی موت سردی کے باعث ہو گئی۔ اس کے بعد میرے دل میں لوگوں سے انتقام لینے کی آگ بھڑک اٹھی، اور میں نے اسی جذبے کے تحت یہ سب کیا۔“

اس کا لہجہ پشیمانی اور ملال سے بوجھل تھا۔ اس کی باتوں میں ایک گہرے دکھ اور ندامت کی جھلک تھی۔ پروفیسر تراب نے نرمی سے کہا، ”اگر تم یہ سب بتانا نہیں چاہتے تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔“ ان کے لہجے میں احترام اور ہمدردی تھی۔

ایز کنیل نے تھوڑا جھجکتے ہوئے کہا، ”نہیں، میں بتانا چاہتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں خلوص اور شکرگزاری تھی، جیسے وہ پروفیسر کی مہربانی کا قائل ہو۔

پھر اس نے اپنی داستان جاری رکھی، ”میں نے منشیات کی تجارت کی، ایل جی بی ٹی کیو تنظیموں کو مالی مدد فراہم کی، نوجوان ذہنوں کو برین واش کیا، اور کئی قتل کیے۔ ان میں سے اکثر مافیا کے سرغنوں اور ان جیسے

لوگوں کے خلاف تھے۔ کبھی ان کے ہاتھ پیر کاٹ دیے، کبھی کسی کو اغوا کیا۔ یہ سب کام میں نے بلا جھجک کیے، جیسے کوئی معمولی کام ہو۔“

اس کی باتوں میں وہ ہی لا پرواہی تھی، جیسے یہ سب کچھ محض ایک کھیل ہو۔ لیکن اس کے لہجے میں پچھتاوے اور افسوس کی جھلک بھی موجود تھی۔

پروفیسر تراب نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا، ”یہ ماضی کی خطائیں ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ تم ان سے سبق لو اور انہیں درست کرنے کی کوشش کرو۔ ہر انسان غلطیاں کرتا ہے، لیکن انہی غلطیوں پر اڑے رہنا حقیقی گناہ ہے۔“

ایزکئیل نے پروفیسر کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا، ”ہاں، میں نے کافی عرصے سے ایل جی بی ٹی کیونکی فنڈنگ روک دی ہے، اور اب میں ایسے کسی بھی کام میں ملوث نہیں ہوں۔ بہت جلد میں ایلومیناتی کے بارے میں حقیقت سب کے سامنے لاؤں گا۔“

اس کے لہجے میں امید اور عزم تھا، جیسے وہ اپنے ماضی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا

اس نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد گہری سانس لی اور بولا، ”جانتے ہیں، جب کل میں نے قرآن کو بغور پڑھا تو ایک عجیب خیال ذہن میں آیا۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا، شاید اللہ نے میری آزمائش کے لیے چنا تھا۔ اور جو کچھ میرے خاندان پر گزرا، شاید وہ ان کی عظمت کا اظہار تھا۔ شاید اللہ نے میری ماں، میری

بہن، اور میرے باپ کو پسند کیا، اسی لیے انہیں آزمایا اور بالآخر اپنے پاس بلا لیا۔ شاید میرے والد کو زندہ رکھ کر انہیں کسی بڑے گناہ میں مبتلا ہونے سے بچانا تھا۔ اور جو میرے ساتھ ہوا، وہ بھی محض ایک کڑی آزمائش تھی۔”

گونار نے توقف کیا، پھر نگاہیں نیچی کر کے بولا، ”جیسے ہر نبی اور ان کے پیروکاروں کو بھی سخت سے سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن پھر بھی میں نے وہ سب کیا کیوں کہ دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی، لیکن اب مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ میں ایک تاریک کھائی میں جا گرا ہوں۔”

پروفیسر تراب ہلکی سی مسکان کے ساتھ بولے، ”چلو، تمہیں اس حقیقت کا ادراک تو ہوا۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ جس کا دل اتنے گناہوں سے پتھر ہو چکا ہو، وہ اتنی آسانی سے کیسے پگھل گیا؟”

گونار نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ جواب دیا، ”شاید اللہ کے پاس اپنے راستے ہوتے ہیں، وہ وسیلے بناتا ہے، اور شاید اس نے مجھے سیدھا راستہ دکھانے کے لیے مختلف لوگوں کو میرا وسیلہ بنایا ہو۔ ماسٹر لی بھی شاید اسی مقصد کے لیے آئے کہ میرے سنگ دل میں ایک دراڑ ڈال سکے اور”

یہ کہہ کر گونار ایک لمحے کے لیے رکا، سر جھکا کر سوچنے لگا، ہونٹوں پر ایک مبہم مسکراہٹ ابھر آئی۔

پروفیسر تراب نے اس کی طرف متجسس نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا، ”اور؟”

اس کی مسکراہٹ میں ایک ایسی نرمی تھی جس نے اس کے اندر ایک عجب سکون بھر دیا۔ ”وہ لڑکی، جس نے میرے سخت دل کو ایسا توڑا کہ اسے ایک نئی زندگی مل گئی۔“ اس کا لہجہ ایک عجیب سی شائستگی میں لپٹا ہوا تھا، جیسے وہ اپنے جذبات کو چھپا کر بھی ان کا اظہار کر رہا ہو۔۔۔“ مجھے کبھی یقین نہیں آیا کہ وہ میری زندگی کا اتنا اہم حصہ بن جائے گی، حالانکہ میں نے اسے کبھی سامنے نہیں دیکھا صرف تصویریں دیکھیں ہیں۔“

اس نے کچھ پل خاموشی اختیار کی، پھر گویا ہوا، ”شاید اس کا چہرہ میری موم جیسا ہے، اسی لئے میں اسے کھونے کا خوف محسوس کرتا ہوں۔ ہاں شاید یہ ہی وہ سبب ہے جو اسے میرے لئے اتنا خاص بنا دیتا ہے۔“

پروفیسر تراب نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، لیکن اس بار ان کی مسکراہٹ میں حیرانی بھی شامل تھی۔ ”یہ تو معجزہ ہے کہ اس کا چہرہ تمہاری موم سے مشابہت رکھتا ہے۔“

گونار نے ایک لمحہ کے لیے رک کر گہرا سانس لیا، جیسے کوئی بھاری بوجھ اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ”ہاں، لیکن وہ مجھ سے چھ سال چھوٹی ہے۔ میں دسمبر میں چھبیس کا ہو جاؤں گا اور وہ انیس کی ہے۔ اور یہ کہ وہ مردوں سے نفرت کیوں کرتی ہے، مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔“

پروفیسر تراب کی آنکھوں میں تشویش تھی، لیکن ایز کئیل کے چہرے پر ہلکی سی سرد مسکراہٹ نے ان کے سوالوں کو روکا۔ ”اس نے اپنی سوتیلی ماں کو بھی نہیں بخشا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی والدہ کا چہرہ بدبودار

خراب انڈے کی طرح ہے ان باتوں کو سن کر لگتا ہے کہ وہ انسانوں سے بیزار ہو چکی ہے۔ ”اس کی آواز میں ایک بے پرواہ سی سختی تھی، جیسے وہ اس کے رویے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھی اسے سمجھتا ہو۔

۔ ”وہ اپنے والد کی شان کو بھی برباد کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مجرے کی محفل میں پیسے چننے والے دلال، اس کے والد سے کہیں زیادہ باعزت ہیں۔“

پروفیسر طور اب کی آنکھوں میں حیرانی کی جھلک آئی۔ ”یہ لڑکی واقعی انسانیت اور انسانی رشتوں سے اکتائی ہوئی لگتی ہے۔ اور باتیں سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ لڑکی بہت خطرناک ہے یہاں تک کہ ایلومیناتی کے ارکان بھی اس سے خوفزدہ ہیں۔“

انہوں نے گونار پر معنی خیز نظر ڈال کر ایک موقر مسکراہٹ پیش کی۔

گونار کے چہرے پر ایک غیر متزلزل، لیکن محبت بھری سرد مسکراہٹ ابھری۔ ”شاید، لیکن میں اسے بدل دوں گا، جیسے اس نے مجھے بدل دیا ہے۔“ اس کے لہجے میں ایک خاموش خود اعتمادی تھی، جیسے وہ پہلے ہی جانتا ہو کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔

پروفیسر تراب نے کچھ لمحے خاموشی سے اسے دیکھا اور پھر دھیرے سے کہا، ”یہاں تک کہ اگر تم ایلومیناتی کا حصہ ہو، تمہیں اس کی پرائیویسی کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔“ ان کی آواز میں ایک پوشیدہ تنبیہ تھی۔

گونار نے سنجیدگی سے ان کی بات سنی، لیکن اس کے چہرے پر سرد تاثرات برقرار رہے۔ ”میں نے اس کی پرائیویسی کا خیال رکھا ہے۔ میں اس کی دل سے عزت کرتا ہوں“ اس کے الفاظ میں ایک ایسا عزم تھا جو بے حد مضبوط تھا، جیسے وہ اس کی حفاظت کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہو۔

پروفیسر تراب نے ایک گہری سانس لی، پھر مسکراتے ہوئے بولے، ”کیا وہ لڑکی جانتی ہے کہ تم اسے پسند کرتے ہو؟“۔

گونار نے اپنے سرد تاثرات کے ساتھ نفی میں سر ہلایا، اس کی نظریں لمحہ بھر کے لیے دور کہیں کھو گئیں۔ ”نہیں۔“ اس کا لہجہ بے لچک تھا، لیکن اس کے اندر چھپی محبت محسوس ہو سکتی تھی۔

۔ ”تو پھر کب اس کا سامنا کرو گے؟“ پروفیسر تراب نے متجسس انداز میں پوچھا۔

گونار نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ ”بس ایک بار اس دلدل سے نکل جاؤں، پھر میں اسے بتا دوں گا۔“ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش ارادہ تھا

پروفیسر نے گرمجوشی سے کہا، ”ٹھیک ہے، میں ریٹائر ہو رہا ہوں، دو تین سال بعد شاید پاکستان منتقل ہو جاؤں، تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔“۔

ایز کئیل کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ”آپ کی رہائش ہنزہ میں ہے اور وہ اسلام آباد ڈی ایچ اے سے ہے۔“۔

پروفیسر چونک گئے، ”اچھا، تو شاید میری بہو کی بہن اسے جانتی ہو۔ اس کی رہائش بھی ڈی ایچ اے کی ہے۔“

گونار نے گہری سانس لی، ”اعلیٰ! یہ میرے لیے چیزیں آسان کر دے گا۔“

...°...

..

ایمان اور مونیزا ایک خوابِ ہولناک میں جکڑے ہوئے تھے، ہر سمت آگ کا قہر تھا۔ شعلے ہوا میں دیوانہ وار ناچ رہے تھے، دھاڑتے ہوئے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ آسمان سے دہکتے پتھر برس رہے تھے جو ان کی جلد کو بھون ڈال رہے تھے، ان کے کپڑے شعلوں کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔

بھاگنے کی ہر کوشش ناکام تھی، جیسے زمین نے ان کے قدموں کو جلا کر اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ زمین تپتے لوہے کی مانند بھٹی بنی ہوئی تھی، مونیزا کی ہڈیوں تک کو جلاتی، اس کے جسم کو تھکاوٹ اور مایوسی کے ساتھ بو جھل کرتی جا رہی تھی۔

ایک شدید درد نے مونیز کے سر کو چیر دیا، وہ پیچھے مڑا تو ایمان کو ایک بھاری پتھر تھامے دیکھا۔ اس کی آنکھیں جنونی تھیں، جیسے اس میں انسانی شعور باقی نہ رہا ہو۔ ”تم مجھے کیوں مار رہی ہو؟“ مونیز کی چیخ میں بے بسی اور غصے کا تاثر تھا۔

۔ ”تم نے کیا کیا ہے؟“ ایمان کی آنکھوں میں نفرت اور خوف کی وحشت گہری تھی۔ ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہے!“ وہ چیخ اٹھی۔ ”تم نے مجھے اس جہنم میں دھکیلا! تم نے مجھے وہ گناہ کرنے پر مجبور کیا جسے میں کبھی انجام نہ دینا چاہتی تھی! تم نے میری زندگی تباہ کی! میں تمہارے گناہوں پر خاموش رہی، یہ اسی کی سزا ہے، احمق انسان!“۔

ایمان نے ایک اور پتھر پوری طاقت سے پھینکا، مگر مونیز بچ نکلا۔ وہ قریب آیا اور ایمان کا بازو پکڑ لیا، اسے حقیقت کا احساس دلانے کی کوشش کی، مگر ایمان جنون میں اس کے منہ پر ایک اور وار کر بیٹھی۔ مونیز نے خون کی دھار اپنی ناک اور ہونٹوں سے بہتے محسوس کی، اس کا پورا چہرہ غم اور درد کی لکیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔

اسی لمحے ایک گونج دار آواز نے فضاء کو چیر ڈالا “تم گناہ پر خاموش تھی، تم گناہ پر خاموش تھی۔۔۔” یہ آواز ان کے اندر کے جرم، خوف اور پشیمانی کا عروج تھا، ایک بھیانک حقیقت کا اعلان جو ان کے اندر ہی سے پھوٹ رہی تھی۔

ایمان نے پتھر چھوڑا، وہ زمین پر گھٹنے ٹیکتے ہوئے گرتی چلی گئی۔ اس نے کانپتے ہاتھ آسمان کی طرف جوڑے، آنکھوں میں موت کی وحشت لیے پکار اٹھی ”خدا کے واسطے، مجھے معاف کر دو! میں دوبارہ گناہ پر خاموش نہیں رہوں گی! میں سب کچھ اقرار کروں گی، توبہ کروں گی! بس مجھے اس جہنم سے نکال لے یا رب!“۔

مگر وہاں کوئی رحم نہیں تھا، کوئی سننے والا نہیں تھا۔ ان کی چیخیں زمین کی طرح بے حس تھیں۔ اچانک زمین لرزی، ان کو ہوا میں اٹھا کر دھندلا دی۔ جب وہ دوبارہ زمین پر گرے تو ان کے جسم چور چور ہو چکے تھے، ہڈیاں چٹخ رہی تھیں اور گوشت کے ریشے تک نوچے جا چکے تھے۔ وہ اپنی اذیت میں چیختے رہے، مگر کوئی انہیں سن نہ رہا تھا

وہ اپنے ہی گناہوں کے بنائے ہوئے جہنم میں اکیلے مجبور و بے یار و مددگار تھے۔

...°...

ایمان ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے خوابِ ہولناک سے جاگ اٹھی، اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ پورا جسم پسینے سے شرابور، دل خوف سے تیز دھڑک رہا تھا۔

کھڑکی سے صبح کی مدھم روشنی اندر آرہی تھی، لیکن اس روشنی میں کوئی سکون یا راحت نہ تھی، گویا یہ روشنی بھی اسے ہر اس میں مبتلا کر رہی ہو۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھوا اور ایک سرد آہ

بھری، سرگوشی میں خود سے بولی، ”اے پروردگار، میں اب خاموش نہیں رہوں گی۔ یہ خواب کسی بے معنی خیال سے زیادہ ہے، میں جانتی ہوں اس کا مفہوم کیا ہے۔“

اس کے لبوں سے نکلے الفاظ نفرت اور خوف کے تیزاب میں بھیگے ہوئے تھے۔ ”مویز، وہ لعنتی، وہ کمینہ۔ وہ میری جان کا دشمن ہے، وہ یہاں پاکستان میں شیطانیت پھیلانے کے درپے ہے۔ خود تو کھائی میں گرے گا ہی، لیکن وہ مجھے بھی ساتھ لے ڈوبنا چاہتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں تھیں، ”اللہ اس پر اپنا غضب نازل کرے، کیڑے پڑیں اس پر، ڈاکٹر اس کو بے ہوشی کی جگہ سانپ کا زہر لگا دے، اور وہ اسی حال میں مر جائے!“

ایمان کی زبان پر الفاظ آگ کی طرح نکل رہے تھے، جیسے اس کے اندر کوئی لاواپک رہا ہو۔ اس نے کھڑکی کے باہر آسمان کی طرف دیکھا، گہری سانس لی اور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”جہنم، مجھ سے دور رہ، اگر تو نے میرا رخ کیا، تو اللہ کا غضب تجھ پر نازل ہو گا!“

اس نے ایک آخری نظر اپنے ارد گرد ڈالی۔ اس کے پیچھے بستر پر عجوبہ کونے میں سکون سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ لیکن ایمان کی نظر میں وہ بھی بے چینی کا نشان تھی۔ جیسے ہی ایمان کمرے سے باہر نکلی، کھڑکی کے باہر درختوں سے آٹھ گلہریاں اندر چھلانگ لگاتے ہوئے بستر پر آگئیں اور عجوبہ کے پہلو میں گہری نیند میں مدغم ہو گئیں۔

ایمان تھوڑی دیر بعد واپس اپنے کمرے میں داخل ہوئی، اس کے قدموں کی ہلکی چاپ کمرے کی خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ وہ اب اپنے گلے میں دوپٹہ لپیٹے، مہندی کے رنگ کے سادہ فرائ میں ملبوس تھی۔ فرائ کی لمبائی زمین کو چھوتی ہوئی اسے ایک نفیس سا تاثر دے رہی تھی۔ اس کے بال کندھوں پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے، گویا وہ اس کے بوجھ تلے دبے ہوں۔

اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور واٹس ایپ پر مونیٹر کا نمبر ڈائل کیا۔ جب تک رابطہ قائم ہوتا، وہ بستر پر آکر بیٹھ گئی۔ عجوبہ، اپنی مخملی کھال اس کی ٹانگ سے رگڑنے لگی، جیسے وہ ایمان کی بے چینی کو محسوس کر رہی ہو۔ دوسری طرف گلہریاں، بے فکری سے تکیوں اور کنبلوں میں اُلجھ کر کھیلنے میں مشغول تھیں۔

مونیٹر نے کال اٹھائی، اور ایمان نے خود کو سیدھا کیا، جیسے اپنے آپ کو کسی اہم فیصلے کے لئے تیار کر رہی ہو۔ اس کی آواز دھیمی اور نرم تھی، مگر اس کے الفاظ کے نیچے ایک دباؤ پوشیدہ تھا۔ ”ہیلو، مونیٹر، کیسے ہو؟“ اس کے جواب پر ایمان نے سر ہلایا، جیسے خود کو تسلی دے رہی ہو کہ وہ واقعی اس مکالمے کا حصہ ہے۔ ”ہاں، میں ٹھیک ہوں، بس ذرا تھکی ہوئی ہوں۔“

اس نے کھڑکی کی جانب دیکھا، جہاں سورج کی شعاعیں بے جان لگ رہی تھیں، بالکل اس کی اپنی کیفیت کی مانند۔ اس نے ساری رات ڈراؤنے خواب کے اثر سے نجات پانے کی دعائیں کی تھیں، مگر اب بھی وہ دل میں ایک اندھیرا محسوس کر رہی تھی۔

مونیز کی آواز نے اسے واپس حال میں کھینچ لیا۔ ”کٹن کٹائی ہو گئی تمہاری؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن کی جھلک تھی، پھر وہ فوراً سمجھ گئی اور تصحیح کی، ”مطلب، سرجری ہو گئی؟“ اس نے اپنے سوال کو واضح کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں، جیسے وہ اپنی اندرونی تلخی سے نجات پانا چاہ رہی ہو۔

۔ ”اوہ، کل سرجری ہے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے مصنوعی خوشی کا اظہار کیا۔

۔ ”یہ بہت اچھی بات ہے، میں تمہارے لئے بہت خوش ہوں۔“ ایمان کی مٹھی سختی سے بند تھی، اور ناخن اس کی ہتھیلی میں دھنسے ہوئے تھے، لیکن اس نے اپنے اندر کی چیخوں کو دبا لیا۔ وہ اس لمحے مونیز پر لعن طعن کرنا چاہتی تھی، اس کی بزدلی پر لعنت بھیجنا چاہتی تھی، مگر اسے اپنی مکاری چھپانی تھی۔

اس نے دھیرے سے پوچھا، ”ٹھیک ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟“ دل ہی دل میں امید تھی کہ یہ عمل لمبا ہو یا اس سے بھی بہتر، کوئی بدترین پیچیدگی پیدا ہو جائے جو اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دے۔

۔ ”دو ہفتے؟“ اس نے آہ بھرتے ہوئے جواب سنا۔ ”یہ تو زیادہ برا نہیں ہے، تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ اس نے اپنے جھوٹے الفاظ کا زہر چبایا، دانت پیستے ہوئے زبردستی کہا، ”میں تم سے دوبارہ ملنے کا انتظار نہیں کر سکتی۔“

جب اس نے مونیز کو یہ کہتے سنا کہ وہ بھی اسی انتظار میں ہے، تو اسے متلی کا احساس ہوا۔ ایمان نے جبراً مسکراہٹ سجا کر کہا، ”بہت یاد آرہی ہے مونیز۔“ مگر یہ الفاظ اس کے لئے عذاب کی مانند تھے، وہ ان کو فوراً نگلنا چاہتی تھی، تھوک دینا چاہتی تھی۔

جب مونیز نے رخصت لی، تو ایمان نے سر دمہری سے جواب دیا، ”ٹھیک ہے، اپنا خیال رکھنا۔“ پھر جیسے ہی کال کٹی، اس نے فون کو بیڈ پر غصے سے پھینک دیا۔

اس کی آنکھوں میں غضب کی لکیریں نمایاں ہو گئیں، وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی، ”اس کا کل امریکی وقت کے مطابق آپریشن ہے، دو بجے۔“ اس کا لہجہ سرد اور سخت ہو گیا۔

”اللہ کرے، کمینہ کا آپریشن غلط ہو، اور وہ وہیں مر جائے۔“ اس کے الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تھے، ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ بولی، ”کتا کہیں کا، لعنتی!“

ایمان اپنے پرانے موبائل کی اسکرین کو غور سے دیکھ رہی تھی، اس موبائل سے اسے ایک عجیب سا جذباتی تعلق تھا۔ یہ موبائل گویا اس کے ماضی کا ساتھی تھا، کئی بار گرتا، ٹوٹتا، اور خراب ہوتا رہا، مگر ہر بار ٹھیک ہو جاتا تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ مزید ٹھیک ہونا بعید از قیاس تھا، مگر قسمت نے اسے دوبارہ قابل استعمال بنا دیا تھا۔

حالانکہ اس کے پاس گونار کا دیا گیا موبائل بھی موجود تھا، جو اس نے احتیاطاً الماری کے اندھیروں میں چھپا رکھا تھا، لیکن اس پرانے موبائل کا لمس اسے ایک الگ تسکین دیتا تھا۔

ہونٹوں کو دانتوں سے کچلتے ہوئے وہ زیر لب بولی، ”کل، امریکی وقت کے مطابق دوپہر 2 بجے، مونیٹز کا آپریشن ہے۔“ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی، اور چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اس کا آپریشن جنس کی تبدیلی کا ہے، اور میرا آپریشن اس کی جاسوسی کا۔ اس کمبخت کو دونوں طرف سے کاری ضرب لگے گی۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ بہت ہوشیار ہے، گھر میں کیمرے نصب کرتا ہے تاکہ کوئی اس کے راز نہ جان پائے۔“

وہ اپنی جگہ سے آہستہ سے اٹھی، گویا اپنے منصوبے کی سنجیدگی کا بوجھ اس پر عیاں ہو رہا ہو۔ ”مگر میں اس سے زیادہ چالاک ہوں، میں پانی کی طرح ہوں، جہاں راستہ نہ ملے، وہاں بھی اپنا راستہ بنا لیتی ہوں۔ اب میں اسے کسی کو نقصان پہنچانے نہیں دوں گی۔ مونیٹز، تم نے مجھے اعتماد میں لے کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ جب دوست دشمن بنتا ہے، تو اس کے پاس وہ راز ہوتے ہیں جو خنجر کا کام کرتے ہیں۔“

ایمان کے چہرے پر شدید نفرت ابھر آئی۔ ”تم تو شروع سے میرے دشمن تھے، میں تمہارے گناہوں پر خاموش رہی، لیکن تم نے لوگوں کو فریب دیا۔ جو دوسروں کو دھوکہ دے، اس پر خاموش رہنا گناہ ہے۔“ اس نے اپنی مٹھی بھینچی، آنکھیں بند کیں اور اپنے آخری لفظ کو یوں تھوک دیا جیسے زہر نکال رہی ہو، ”بے غیرت۔“

پھر ایمان نے اپنے پرانے موبائل پر امریکہ اور پاکستان کے وقت کا فرق چیک کیا، گویا اس شیطانی منصوبے کو آخری بار دہرا رہی ہو۔ ”ہم ایسا ہی ہے، امریکہ پاکستان سے دس گھنٹے پیچھے ہے۔ یعنی وہاں جمعہ کی دوپہر ہوگی، اور یہاں ہفتہ کی آدھی رات۔ آپریشن اندھیرے میں ہوگا۔“ وہ ایک اور مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی، ”اب اصل کھیل شروع ہوگا۔“

ایمان نے عجوبہ، کو اٹھالیا، اور اسے گود میں بھر لیا۔ گویا اپنے اندر کی ہلچل کو عجوبہ کی نرم کھال سے سکون دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ ”چلو، تم نیچے چلے جاؤ، ورنہ خالدہ آئی تو میرا بھیجا چاٹ جائے گی۔“ اس نے عجوبہ کو فرش پر رکھ دیا اور عجوبہ نے ناپسندیدگی سے ”میاؤں“ کی آواز نکالی، پھر بھاگ گیا۔ گلہریاں، جیسے کسی کھیل کے پیچھے ہوں، عجوبہ کا پیچھا کرتی ہوئیں کھڑکی سے باہر کود گئیں۔

ایمان نے کھڑکی بند کی، اسے لاک کیا، پھر بیگ اور چابیاں اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی۔ جاتے ہوئے اس نے ایک آخری نظر کمرے پر ڈالی، گویا کسی میدانِ جنگ سے روانہ ہو رہی ہو، اور دروازہ لاک کر کے باہر نکل گئی۔

...°...

اسلام آباد کی رات اپنے سنائے میں مدغم ہو چکی تھی، اور گھڑی کی سوئیاں رات کے بارہ بج رہی تھیں۔ امریکہ میں جمعہ کا دن دوپہر کی روشنی میں ڈوبا ہوا تھا، جبکہ یہاں اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا۔ ایمان ایک ویران جگہ پر، ایک بوڑھے درخت کے نیچے اپنی گاڑی میں بیٹھی تھی۔

اس کے گرد پھیلا سناٹا صرف دور کی اسٹریٹ لائٹس کی مدھم روشنی سے منقش ہو رہا تھا، جو زمین پر لرزاں سائے بکھیر رہی تھی۔

وہ ان سائے دار درختوں کے پیچھے، اپنے ہدف کی طرف نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں موزیز کے اپارٹمنٹ کی عمارت پر گڑی ہوئی تھیں، جہاں روشنیوں کے درمیان وہ عمارت چھپی بیٹھی تھی، جیسے کوئی شکار اپنی کمین گاہ میں دبکا ہو۔

ایمان نے اپنے پرانے موبائل پر موزیز کا نمبر ڈائل کیا اور فون کے بجنے کا انتظار کرنے لگی۔ خاموشی کی گونج کے بیچ، اچانک کال کنیکٹ ہوئی اور دوسری طرف سے موزیز کی آواز ابھری۔۔۔ ”ہاں، موزیز؟“ اس نے انتہائی مصنوعی تشویش کے ساتھ سوال کیا۔ ”مجھے لگا تھا کہ وہ تمہیں ابھی تک آپریشن کے لئے لے گئے ہوں گے۔“ ایمان کی آواز میں فکر مندی کا تاثر تھا، لیکن اس کی آنکھوں میں ایک سرد، بے حس نفرت صاف عیاں تھی۔

سٹریٹ لائٹس کی مدھم روشنی سے زمین پر بننے والے بھیانک سائے اسے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ ”میں نے سوچا کہ تمہیں آپریشن تھیٹر میں لے جانے سے پہلے تم سے ایک آخری بات کر لوں۔“

ایمان نے جعلی جذبات کا لبادہ اوڑھ کر کہا، جیسے وہ روہان سے پن میں ڈوبی ہو۔

- ”اب وہ تمہیں لے جا رہے ہیں؟ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“ اس نے نرمی سے کہا، لیکن اس کے چہرے پر چڑھی ہوئی سفاکیت کو وہ اپنے جذبات کے بہروپ سے چھپانے میں ناکام رہی۔

- ”ٹھیک ہے،“ مونیز کے جواب پر ایمان نے سر ہلایا،

- ”اپنا خیال رکھنا۔“ اس نے چند لمحوں کا توقف کیا اور مزید کہا،

- ”کاش میں تمہارے ساتھ ہوتی۔“ اس کے لبوں پر بیزاری کے آثار نمایاں تھے۔ وہ ہر لفظ کے ساتھ مونیز سے نفرت کا وزن اپنے کندھوں پر محسوس کر رہی تھی، جیسے وہ زبردستی کسی بوجھ کو اپنے اندر چھپا رہی ہو۔

- ”پہلے تو مجھے تمہاری اس تبدیلی سے مسئلہ تھا... لیکن اگر یہ تمہیں خوشی دیتا ہے، تو...“ اس نے زبردستی مسکراہٹ سجا کر کہا، ”چلو، تم جاؤ۔“ اور بغیر ایک لمحے کے توقف کے، اس نے کال کاٹ دی۔

اس کا دل تسکین سے بھر گیا تھا، جیسے کسی بوجھ سے نجات مل گئی ہو۔ فون کو گاڑی کے ڈیج بورڈ میں رکھ کر، اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور زیر لب شکر بجالائی، ”شکر یہ یا اللہ۔“

یہ شکر، مونیز کے جرائم کے پردے کو اٹھانے کی شکر گزاری تھی۔ ایمان نے خود کو اس شخص کے سامنے بے نقاب ہونے سے بچا لیا تھا، جو اپنے گناہوں کو چھپانے میں ماہر تھا۔ وہ اس کے ہاتھ سے اب نکلنے والا نہیں تھا۔

اس نے اپنی آنکھوں کے قریب سے چند نم آنسو پونچھے اور انہیں بے نیازی سے جھٹک دیا، جیسے کوئی بیکار چیز ہو۔ ”کرائے کے آنسو، کرائے کے جذبات،“ وہ بڑبڑائی۔

پھر اس نے اپنے چہرے کو سیاہ کپڑے سے ڈھانپ لیا اور ہڈ کو مضبوطی سے اپنے سر پر جمالیا۔ وہ رات کے اندھیرے میں خود کو چھپانے کے لئے تیار ہو چکی تھی، جیسے کوئی چور اپنے جرم کا ارتکاب کرنے کے لئے نکلتا ہے۔

وہ کالی پینٹ، شرٹ، جیکٹ اور جوتوں میں ملبوس، ایک مجسمہ کی مانند بے حس و حرکت کھڑی رہی، پھر اپنے شکار کی طرف بڑھنے لگی۔

مونیٹر کے اپارٹمنٹ کا دروازہ بند تھا، مگر ایمان کے پاس چابیاں نہیں تھیں۔ البتہ، وہ ہمیشہ تیار رہتی تھی۔ اس کے بالوں میں لگا ایک سادہ ساپن دراصل اس کی چابیاں بننے والا تھا۔

وہ خصوصی چشمے بھی پہن چکی تھی، جو پوشیدہ کیمروں اور انفرا ریڈ بیم کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس نے بالوں کا پن نکالا اور اسے تالے میں ڈال کر احتیاط سے ہلانے لگی، جیسے وہ کسی پیچیدہ راز کو کھولنے کی کوشش کر رہی ہو۔ چند لمحوں کے بعد، ایک دھیمی سی کلک کی آواز سنائی دی۔

دروازہ کھل گیا۔

ایمان نے دروازہ آہستگی سے بند کر کے پیچھے مڑ کر احتیاط سے تالا لگا دیا، جیسے ہر حرکت کا پلڑا ترازو پر تولتا جا رہا ہو۔ کمرے میں موت جیسا سناٹا تھا، ہر چیز اپنی جگہ جیسے قفل زدہ تھی۔

اس کے قدموں کی آواز گھٹی گھٹی سی گونج میں تحلیل ہو رہی تھی۔ اندھیرا ایسا کہ آنکھوں کو بھی بے وفائی کا گمان ہونے لگے۔ مگر اس کے دل کی دھڑکنیں ایک ماہر جاسوس کی طرح تربیت یافتہ تھیں، نہ گھبراہٹ، نہ بے چینی، صرف سکون سے سانس لیتے ہوئے محتاط منصوبہ بندی۔

یہ وہ کمرہ تھا، جہاں وہ اپنے شیطانی راز چھپائے بیٹھا تھا۔ ایمان جانتی تھی کہ وہ اسے ہر ممکن طریقے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے گا، کیمرے، سیکیورٹی سسٹم، اور وہ گارڈ جو ہر رات چکر لگاتا تھا، سب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مگر اس نے بہت پہلے ان سب کا اندازہ لگالیا تھا۔ اس کی یہ بزدلی ایمان کے ہتھیاروں کے مقابلے میں معمولی تھی۔

اس نے اپنے خاص چشمے چڑھائے، جو ہر خفیہ کیمرے، انفراریڈ بیم کو ظاہر کر دیتے تھے۔ دیوار کے اوپر لگی ہوئی تصویروں کو غور سے دیکھا، ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر ایک سرخ نقطہ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دیا۔

ایک پوشیدہ کیمرہ تھا جو ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتا تھا۔ وہ آرام سے قریب گئی اور اسے آہستہ سے گھمایا، یہاں تک کہ کیمری بند ہو گیا۔ اب وہ اپنی باقی تلاش جاری رکھ سکتی تھی۔

ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھایا گیا تھا، جیسے وہ کسی پیچیدہ پزل کو حل کر رہی ہو۔ ہر چال پر گہری نظر، ہر حرکت پر مکمل قابو۔ وہ دروازے، بستر، اور الماری کے پیچھے چھپے کیمروں کو ایک ایک کر کے نیوٹرلائز کرتی گئی۔ یہ اس کی محنت کا نتیجہ تھا، کہ وہ مونیٹر کی عادات، اس کے معمولات، اور اس کی سیکورٹی کا جائزہ پہلے سے لے چکی تھی۔

لیکن جیسے جیسے وہ اندر بڑھ رہی تھی، ایک چھپا ہوا راز جیسے اسے کھینچ رہا تھا۔ الماری کے دروازے کو کھولتے ہوئے اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوا۔

ایک ہینگر، جو باقیوں سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس نے اسے آہستہ سے کھینچا، اور اچانک ایک سرگوشی جیسی کلک کی آواز آئی۔ کپڑوں کے پیچھے ایک پوشیدہ دروازہ کھل گیا۔ ایمان کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کو رک گئی، جیسے رازوں کا خزانہ اس کے سامنے کھل گیا ہو۔

۔ ”یہ ایک خفیہ کمرہ ہے!“ وہ زیر لب بڑبڑائی، لیکن اس کا دماغ فوراً کسی پوشیدہ خطرے کی طرف مائل ہوا۔ ”کیا یہاں بھی کیمرے ہیں؟“ یہ سوال اس کے ذہن میں آیا۔

اس نے دوبارہ چشمے چڑھائے اور کمرے کے اندر قدم رکھا، جہاں اندھیرے نے ہر شے کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

سیڑھیاں کسی خوفناک خواب کی طرح نیچے تہہ خانے کی طرف جا رہی تھیں۔ ہر قدم پر اسے لگتا جیسے زمین نیچے سے کھسک رہی ہو، لیکن وہ مکمل چوکنا تھی۔

ایمان کا ہر قدم جیسے کسی آسیب زدہ خواب کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا۔ مدھم روشنی میں لرزتے ہوئے سائے اور خاموشی کی گہرائی میں چھپے راز، اس کے دل کی دھڑکن کو تیز کر رہے تھے۔

ٹارچ کی زرد روشنی جب شیلف پر پڑی، تو ایک لرزہ خیز منظر اس کے سامنے ابھرا۔ فائلوں کے انبار، جن میں مونیٹرز کے گھناؤنے منصوبے قید تھے، اُس کے بدترین خوابوں سے بھی زیادہ سیاہ حقیقت بن کر ظاہر ہو رہے تھے۔

یہ فائلیں پاکستان میں ایل جی بی ٹی کیو ایجنڈا کو پھیلانے کی سازشوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان میں رابطے، منصوبے اور پروپیگنڈے کے وہ ناقابل تردید ثبوت تھے جو اس کے دل میں نفرت کی چنگاری کو بھڑکا رہے تھے۔

ایمان کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس کی آنکھیں دہشت اور غصے سے پھیل گئیں۔ ہاتھ بے ساختہ اس کے منہ پر جا پڑے، جیسے وہ سانس لینا بھی بھول گئی ہو۔

وہ جانتی تھی کہ مونیٹرز غیر قانونی نشہ آور اشیاء کے دھندے میں ملوث تھا، لیکن یہ جو اس کے سامنے تھا، وہ اس کے تصورات سے کہیں زیادہ خوفناک تھا۔ اس کے قدم لرز گئے، جیسے زمین اس کے نیچے سے کھسک رہی ہو۔

ایک دس سالہ بچی کی تصویریں، جن میں اس پر بھیانک تشدد کے نشانات واضح تھے۔ وہ بچی، جس کے معصوم جسم کو بربریت کا نشانہ بنایا جا رہا تھا، مونیٹرز کے ان گھناؤنے رازوں میں سے ایک تھی۔ ایمان کی

روح تک کانپ اٹھی۔ اس کے ذہن میں وہ تمام لمحے بجلی کی تیزی سے گزرنے لگے جب مونیز خود کو مظلوم اور عورتوں کے حقوق کا علمبردار ظاہر کرتا تھا۔ ”یہ شخص، جو عورت ہونے کا دعویدار تھا، ایک بھیڑیے کی مانند معصوم بچیوں کی زندگیوں سے کھیل رہا تھا۔“

اس کی سانسیں بھاری ہو گئیں، دل جیسے دھڑکنا بھول گیا ہو۔ وہ سچ جو اس کے سامنے تھا، اس کا سامنا کرنے کے لیے اس کی ہمت جواب دینے لگی تھی، مگر اس نے خود کو سنبھالا۔

ایمان نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے تلخی سے کہا، ”میں نے پہلے ہی کہا تھا، عورت کا روپ دھارنے سے کوئی عورت نہیں بن جاتا، یہ بھی انہی دو غلے مردوں جیسا نکلا۔ دو ٹکے کا گھٹیا انسان، جو عورت کا تقدس نہ سمجھ سکا۔“

اس نے خود کو ملامت کرتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑایا، ”کہاں کہاں میں اس بے غیرت کے ساتھ نہیں گئی، ہر قدم پر اس کے ساتھ رہی۔ مگر یہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، اس کی کیا اوقات تھی اگر کچھ کرنے کی جرأت بھی کرتا تو ویسے ہی ذلیل ہوتا جیسے اُس رات مارگلہ کی پہاڑیوں پر اس کے کتے اپنی موت کا سامنا کر رہے تھے۔“

وہ لمحہ بھر کو رک کر گہری سانس لینے لگی، پھر غصے سے تھر تھراتی آواز میں بولی،

”یہ تو پہلے ہی بے ضمیر تھا، مگر آج تو درندگی کی تمام حدیں پار کر گیا۔ کتنا پست، کتنا بے غیرت نکلا! یہ اس قابل ہی نہیں کہ انسان کہلایا جائے۔“

لحظہ بھر میں اس نے بیگ اتار کر ٹیبل پر رکھا اور جلدی سے فائلوں کو بھرنا شروع کر دیا۔ ہر فائل، ہر کاغذ جیسے کسی خونی راز کی دستاویز تھی۔ اسے پرواہ نہیں تھی کہ ان میں کیا کیا راز چھپے ہیں، وہ ہر ایک ثبوت کو اکٹھا کرنا چاہتی تھی تاکہ دنیا کو مونیز کی اصلیت دکھا سکے۔

ایک فائل پر نظر پڑتے ہی، اس نے بے اختیار اسے کھولا۔ مگر جو کچھ اس میں دیکھا، وہ اس کے حواس پر بجلی کی طرح گرا۔ وہ اپنے قدم پیچھے ہٹانے لگی، جیسے کوئی زہریلا سانپ اس پر جھپٹنے والا ہو۔ فائل کو دوبارہ بیگ میں رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ”کیا یہ سب جانتا ہے ایسا کیسے ہو سکتا ہے،“ اس نے خود کو سختی سے جھنجھوڑا، لیکن اس کے قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ مشن کا ہر قدم طے کرنا ضروری تھا۔

بیگ کو کندھے پر دوبارہ لٹکاتے ہوئے، ایمان نے ایک آخری بار اس خفیہ کمرے پر نظر ڈالی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور اسے دوبارہ تالا لگا دیا۔

باہر آتے ہی اس کے لبوں سے ہلکی سی سرگوشی نکلی، جیسے اس نے خود سے وعدہ کیا ہو: ”میں نے یہ کر لیا، مونیز، میں نے تمہارے راز فاش کر دیے ہیں۔ تمہارے کالے کرتوت اب دنیا کے سامنے آئیں گے۔ تم اب بچ نہیں سکتے۔“

ایک دلیرانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ ”اب تمہاری باری ہے، مونیز۔ تمہارے جرائم کا حساب دینے کا وقت آ گیا ہے۔“

ایمان نے لائٹس کو مدھم کر کے دوبارہ کیمرے لگائے تو دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔ کمرے کی خاموشی میں ہر سانس گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کام کو مکمل کرنے کے بعد جیسے ہی دروازے کی طرف بڑھی، اچانک اس کی نظر دائیں طرف پڑی۔ مونیز کے دوست! دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ سب جیسے سایے کی طرح آرہے تھے، اور ایمان کو معلوم تھا کہ یہ وہ ہی لوگ ہیں، جو مونیز کی طرح ایل جی، بی ٹی کے کٹر حمایتی ہیں۔

اس کے ہاتھ لرز گئے، جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ ”اب کیا؟“ دماغ بھٹک رہا تھا، جیسے سب کچھ ایک ہی لمحے میں ختم ہونے والا ہو۔

اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا، جیسے وہ ہی واحد راستہ ہو، مگر ہر طرف کیمروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بیڈ کے کنارے سے گزرنے کی کوشش کی، ہر قدم تول تول کر رکھا، جیسے ہر حرکت پر اس کی زندگی کا دارومدار ہو۔

عینک، جو خفیہ کیمروں کا پتہ لگاتی تھی، آنکھوں پر جمار کھی تھی، لیکن کیمروں سے بچنا ناممکن لگ رہا تھا۔ وہ کان لگا کر سنتی رہی، قدموں کی آواز قریب آرہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں جیسے تھمنے لگی تھیں، جب دستک ہوئی۔ دروازہ کھلا۔

مونیز کے دوست اندر آئے، سب مرد، لیکن عورتوں کے لباس میں! کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ایمان کا سانس جیسے رک گیا، اور سب کی نظریں سیدھا اس کی طرف تھیں۔

ایمان کی سانسیں جیسے رکنے لگیں جب انہوں نے لائٹس آن کیں۔ سامنے کا منظر دیکھ کر وہ سب حیران رہ گئے۔ بیڈ پر ایک کاکروچ تھا، اور ان میں سے ایک فوراً بیڈ کے قریب پہنچا۔ اس نے جوتا اتارا اور بے دردی سے کاکروچ پر مارنے لگا۔ جوتے کی مسلسل ضربوں سے کاکروچ کا جسم مسلا جا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد، وہ تینوں بیڈ پر بیٹھ گئے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ایمان درخت کی شاخ سے لپٹی ہوئی تھی، اس کا سانس بے ترتیب اور دل جیسے سینے سے باہر نکلنے کو تھا۔ وہ کھڑکی سے کود کر درخت کی شاخ پر پہنچی تھی، جہاں سے نیچے جھانکنے پر دنیا محض ایک دھندلا منظر محسوس ہو رہا تھا۔

پردے کھڑکی کے سامنے لٹک رہے تھے، اور کمرے کے اندر بیٹھے لوگوں کی پشت کھڑکی کی سمت تھی۔ درخت کی گھنی شاخیں ایمان کو نگاہوں سے اوجھل رکھے ہوئے تھیں، گویا قدرت خود اس کے لیے پردہ بن گئی ہو۔

وہ نیچے اتر سکتی تھی، مگر ان کی گفتگو نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ شاید کوئی کارآمد بات سننے کو مل جائے، کوئی راز فاش ہو جو اس کے کام آ سکے۔ لیکن ان کی باتیں بے لطف اور بیزار کن تھیں، جیسے کسی خالی ذہن کی گپ شپ۔ وہ کسی ”گو نار“ کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک ایسا شخص جس نے اسلام قبول کرنے کے بعد ایل جی بی ٹی کیو ممبران کی مالی اعانت روک دی تھی۔

ایمان کا ذہن جیسے پل بھر کے لیے الجھ گیا، لیکن پھر اُس نے خود کو سنبھالا۔ اُس کی گرفت شاخ پر مضبوط ہو گئی، اور وہ ان کی ہر بات کو جذب کرنے لگی، کہ شاید اس معمولی گفتگو کے پردے میں کوئی بڑی سازش پوشیدہ ہو۔ کچھ لمحوں بعد اس نے تھک کر فیصلہ کیا کہ نیچے اترنا ہی بہتر ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، یہ یقین کر لیا کہ کوئی اسے نہیں دیکھ رہا۔ ساحل صاف تھا۔

ایمان کی انگلیاں درخت کی شاخ پر سختی سے جمی ہوئی تھیں، لیکن جیسے ہی اس نے اپنی ٹانگیں شاخ سے نیچے لٹکائیں اور اترنے کی کوشش کی، وہ اچانک ایک چمگاڈ کے بالکل سامنے آ گئی۔

یہ چمگاڈ درخت کی شاخ سے الٹا لٹکا ہوا تھا، اس کی چمکتی سرخ آنکھیں ایمان کی آنکھوں میں گر گئیں۔

ان تیز، نوکیلے دانتوں سے بھرے منہ کے ساتھ، جیسے ابھی حملہ کرنے والا ہو، وہ ایمان کو دہشت میں مبتلا کر گیا۔ ایمان کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا ہو، اور خوف کی ایک چیخ اس کے گلے سے نکلنے کو تھی، لیکن وہ فوراً اپنے ہاتھ سے منہ ڈھانپ کر چیخ کو روک گئی۔

چمگاڈ اچانک پھڑپھڑایا، اس کے پروں کی تیز آواز رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی سنائی دی۔ وہ چیختا ہوا ایمان کے سامنے اڑنے لگا، اور ایمان کو ایک لمحے کے لیے لگا جیسے وہ زمین پر گر جائے گی۔ ایک سرد لہر اس کے وجود میں سرایت کر گئی۔ چمگاڈوں سے اس کی دیرینہ نفرت اور خوف جیسے اسے منجمد کر گئے ہوں۔

چمگاڈ مزید قریب آیا، اس کی خوفناک آنکھیں ایمان پر جمی ہوئی تھیں۔

ایمان نے گھبرا کر اپنی ٹارچ نکالی، لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ ٹارچ خراب تھی، اور اس کے ساکٹ سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ اب مکمل بے یار و مددگار تھی، جیسے چمگادڑ اس پر قابو پانے والا ہو۔

اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا، سانس جیسے حلق میں پھنس گیا ہو۔ چمگادڑ دیوانہ وار اس کے قریب آرہا تھا، اور ایمان کو اپنے وجود کی ہر سانس خطرے میں محسوس ہونے لگی۔

یکدم ایمان کے دماغ میں ایک جھمکا ہوا۔ اس نے ٹارچ کی لیزر کا رخ چمگادڑ کی چمکتی ہوئی آنکھوں کی طرف کیا، اور ایک لمحے کے لیے لیزر کی تیز روشنی نے چمگادڑ کو جھنجھوڑ دیا۔

چمگادڑ پیچھے ہٹا، اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور چیخیں رات کے سناٹے کو مزید وحشت ناک بنا رہی تھیں۔ لیکن چمگادڑ نے ہار نہ مانی۔ وہ پھر سے ایمان کی طرف لپکا، جیسے ایمان اس کا آخری شکار ہو۔

ایمان کا دماغ چکرارہا تھا، اس نے لیزر کی روشنی کو ایک بار پھر چمگادڑ کی طرف پھینکا اور کھڑکی کی طرف رخ کیا۔ چمگادڑ اندھا دھند اس روشنی کے پیچھے بھاگا اور زور سے کھڑکی سے جا ٹکرایا۔

اسی لمحے موئیز کے دوستوں کی چیخیں کمرے میں گونج اٹھیں، ان کی چیخوں نے ایمان کے دل کی دھڑکن کو اور تیز کر دیا۔ ”یہ کیا تھا؟“ ایک نے خوف سے لرزتی آواز میں کہا۔

- ”باہر جا کر دیکھو کیا ہو رہا ہے!“ دوسرے نے گھبرا کر کہا۔

ایمان نے اپنی سانس کو قابو میں رکھتے ہوئے خود کو درخت کے پیچھے چھپایا، جبکہ چمگاڈ کھڑکی کے شیشے سے چمٹا ہوا اب تک پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی خونخوار تھیں، لیکن وہ مغلوب ہو چکا تھا۔ ایمان کا دل تیز دھڑک رہا تھا، لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ لمحہ عارضی تھا۔ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا، اور مونیٹرز کے ہم جو لے باہر نکلنے والے تھے۔

اس کو فوراً احساس ہو چکا تھا اس نے بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ اس کی موجودگی کا راز فاش ہو چکا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ جلدی سے وہاں سے فرار ہونے کا سوچنے لگی، مگر جیسے ہی نیچے دیکھا، اس نے ایک سیکیورٹی گارڈ کو آتے دیکھا۔

وہ ہنگامہ سن کر تفتیش کرنے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ اور بندوق تھی۔

ایمان پھنس گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر سرد پسینہ آگیا۔ لڑائی کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس نے چاقو تک پہنچنے کی کوشش کی، لیکن اسی لمحے چمگاڈ واپس اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی سے بھٹک چکا تھا اور اب ایمان کی طرف لپک رہا تھا۔ ایمان نے چمگاڈ کی طرف لیزر مارا، لیکن اس دوران وہ اپنا توازن کھو بیٹھی۔

ایک لمحے میں، وہ شاخ سے نیچے گری، زمین پر زور سے ٹکرا گئی۔ درد کی ایک تیز لہر اس کے ٹخنے میں دوڑ گئی۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔!!

...°...

گارڈ کی ٹارچ کی روشنی سیاہ رات کو چیرتی ہوئی بلڈنگ کے دروازے تک پہنچی، جہاں وہ اپنے بھاری قدموں سے داخل ہونے ہی والا تھا کہ اچانک ایک ہلکی سی آہٹ نے اس کے اعصاب میں کھنچاؤ پیدا کر دیا۔ جیسے ہی وہ مڑا، زمین پر بلا اور آٹھ گلہریوں کی عجیب و غریب فوج کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ یہ سب ایمان کے پوشیدہ اشارے پر درخت سے کودے تھے، اور ان کی حرکات میں ایک بے ساختہ پاگل پن تھا۔ گارڈ متحسّس ہو کر ان کے قریب ہو گیا، ان کے قہقہے اور شور جیسے کسی پوشیدہ سازش کا حصہ معلوم ہو رہے تھے۔

ایمان درخت کے گھنے سائے میں دبکی ہوئی، دل کی دھڑکنوں کو قابو میں رکھنے کی سعی کر رہی تھی۔ اس نے گہرا سانس لے کر عجب، اور گلہریوں کو خفیہ تربیت دی تھی تاکہ ایسے لمحوں میں، جب فرار ناگزیر ہو، وہ ایک خلفشار پیدا کر سکیں۔ آج وہ ہی گھڑی آپہنچی تھی، اور اس کے جانور اپنی تربیت کا عملی مظاہرہ کر رہے تھے۔

مونیز کا دوست کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں چمگاڈ کے بے ترتیب پرواز پر ٹک گئیں جو درخت کے گرد منڈلا رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ شور بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔ شاخ پر موجود آوارہ بلی پر اس کی نظر پڑی، جو چمگاڈ کی طرف دبے قدموں بڑھ رہی تھی۔

اس نے فوراً کھڑکی بند کی اور پیچھے مڑتے ہوئے کہا، ”کوئی خاص بات نہیں، بس ایک چمگاڈ ہے جو خوفزدہ ہو کر چیخ رہا ہے، اور بلی اس کے پیچھے ہے۔“

ایمان نے سکون کا سانس لیا، اور اپنی نظریں درخت کی اوپر والی شاخ پر موجود ایک آوارہ بلی پر گاڑ دیں۔ وہ شکر گزار تھی کہ بلی نے صورتحال میں کوئی مداخلت نہیں کی۔

گارڈ عجوہ اور گلہریوں کے قریب جا پہنچا۔ وہ جھک کر عجوہ کو گردن سے پکڑنے ہی والا تھا کہ اچانک عجوہ نے اپنے پنجوں سے اس کی کلائی میں گہری خراشیں ڈال دیں۔

گلہریاں اس موقع کو غنیمت جان کر اس کے ٹخنوں اور پنڈلیوں میں اپنے تیز دانت گاڑنے لگیں۔ عجوہ نے ایک جھپٹا مارا اور گارڈ کے کان کو کاٹ لیا۔ گارڈ کی درد بھری چیخ رات کے سناٹے میں گونجی، اور اس نے عجوہ کو چھوڑ دیا۔

وہ اپنے قدموں کو سنبھالنے کی کوشش میں پیچھے ہٹا، لیکن اس کا توازن بگڑ گیا، اور جانوروں کو پکڑنے کی ناکام کوشش میں مزید الجھتا چلا گیا۔

ایمان نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔ وہ درخت کی آڑ سے نکل کر بلڈنگ کے گیٹ کی طرف لپکی۔ اس کے پاؤں میں شدید درد کی لہر اٹھی، مگر اس نے اسے نظر انداز کیا اور بلڈنگ کے گیٹ کے قریب گرے فولڈر کو اٹھالیا۔

وہ اپنی گاڑی کی طرف بھاگی، جہاں اس کی گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وقت ختم ہو رہا تھا، اور اسے ہر حال میں مونیٹر کی کرپشن کو بے نقاب کرنا تھا۔ اس کی بقا اسی پر منحصر تھی۔

گاڑی تک پہنچتے ہی اس نے دروازہ جھٹکے سے کھولا اور بیگ کو پچھلی سیٹ پر پھینک دیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی جب اچانک اس کی نظریں سامنے دوڑتی ہوئی عجوہ اور گلہریوں پر پڑیں، جو گارڈ کو کامیابی سے چکما دے چکی تھیں۔

وہ فوراً دوبارہ دروازہ کھول کر ان کو اندر جانے کا اشارہ دیتی ہے۔ وہ جانور، جنہوں نے اپنی تربیت کا شاندار مظاہرہ کیا تھا، جلدی سے اندر کود گئے۔

ایمان نے دروازہ بند کر کے انجن اسٹارٹ کیا۔ وہ تیزی سے گاڑی کو اندھیری رات میں دوڑا رہی تھی، جیسے اندھیرا اس کے پیچھے اپنی لپیٹ میں لینے کو ہو۔

...°...

ایمان کمرے میں داخل ہوئی اور بجلی کا بٹن دبا کر بلب روشن کر دیا۔ تھکی ہوئی، اس نے اپنی جیکٹ کرسی پر پھینکی اور جوتے اتار کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

اس کے کندھوں سے لٹکا ہوا اسپورٹس بیگ، جس میں مونیٹرز کے خفیہ کمرے سے چوری کی گئی فائلیں
بھری تھیں، بیڈ پر پھینکا گیا۔ اس نے بیگ کی زپ کھول کر ایک ایک فائل نکالی اور سنجیدگی سے ان کا
مطالعہ کرنے لگی۔ اس کا نیا موبائل، جو اس کے سامنے میز پر پڑا تھا، ہر لمحہ ریکارڈ کر رہا تھا۔

۔ ”گو نار...“ ایمان کے لبوں سے نکلا، جیسے کوئی بھید کھل گیا ہو۔ اس کی نظریں معاہدے پر جمی رہیں جہاں
گو نار کا نام صاف لکھا ہوا تھا۔

اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”یہ ہی وہ نام ہے جو میں نے مونیٹرز کے دوستوں سے بھی سنا تھا۔ یہ سب کے
پیچھے ہے!“۔

دوسری طرف گو نار اپنے کمرے میں بستر پر نیم دراز تھا، اور میگزین پڑھ رہا تھا۔ اس کے بیڈ سائیڈ لیمپ کی
روشنی میں اس کا چہرہ پرسکون تھا، مگر جیسے ہی ایمان کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی، وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

اس نے فوراً میگزین ایک طرف رکھ دی اور سائیڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھالیا۔ اس کی سکرین پر ایمان کا
چہرہ نمودار تھا، جو مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

۔ ”تو مونیٹرز جو کچھ بھی کر رہا تھا، کیا گو نار بھی اس سب کے پیچھے تھا؟“ ایمان نے حیرت سے فائلوں کے
صفحات پلٹتے ہوئے خود سے سوال کیا۔ ”نشہ آور ادویات کی فروخت، لڑکیوں کی اسمگلنگ...؟“۔

گونار نے ایک دھیمی، مکارانہ ہنسی کے ساتھ سرگوشی کی، ”تو تمہیں مونیز کی حقیقت کا علم ہو ہی گیا؟ لیکن افسوس، تم میرے بارے میں زیادہ جان گئی ہو۔“

اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ ”میں نے مونیز کو اس کی برائیوں سے نکالا، لیکن ہاں، اسے سمجھانا آسان نہیں تھا۔ کچھ بجلی کے جھٹکے اور سانپ کا زہر کافی ثابت ہوئے۔“

وہ خود سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا، ”لیکن یہ براہوا کہ تم نے یہ راز جان لیا۔“

ایمان نے نفی میں سر ہلایا اور ایک پیغام پڑھتے ہوئے کہا، ”مونیز نے یہاں لکھا ہے کہ گونار سے ملنے کے بعد اس نے یہ سب چھوڑ دیا تھا۔“ وہ مسکرائی، جیسے کسی بھید نے اسے سکون دیا ہو، پھر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

گھبراہٹ میں اس نے اپنے ناخن چبائے اور کہا،

، ”اب مونیز کی حقیقت سب کے سامنے آئے گی، چاہے کچھ بھی ہو۔ اور جہاں تک گونار کا تعلق ہے، جہنم میں جائے وہ۔“

گونار نے اپنی آنکھیں موبائل کی سکرین پر جمائے رکھیں، پھر ایک سست مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیا، جیسے اسے کسی بات کا کوئی اثر ہی نہ ہو۔ ”جہنم؟“ اُس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا، ”اگر تم وہاں ہو تو

میرے لیے جہنم بھی جنت کی مانند ہوگی، کیوں کہ تمہارے بغیر تو جنت بھی بے رونق اور سنسان ہے۔
جنت کی حقیقت تم ہو، بٹر فلائے!“۔

ایمان نے ایک گہری سانس لی اور عزم کے ساتھ فائلیں واپس بیگ میں رکھ دیں۔ مونیز کی کرپشن کو بے نقاب کرنے کا ارادہ اس کے دل میں پختہ ہو چکا تھا۔

وہ بیڈ پر لیٹ گئی، آنکھیں بند کر لیں، نیند کو بلانے کی کوشش کی۔ لیکن کمرے میں ابھی تک روشنی جل رہی تھی، جیسے رات کی خاموشی میں کوئی چھپا ہوا راز اپنی روشنی سے اسے بے نقاب کر رہا ہو۔

مونیز کی زندگی ایک سیاہ رات کی مانند تھی، جس میں معصومیت کی کوئی روشنی باقی نہ تھی۔ وہ دھندلا وجود، جو چھوٹے بچوں اور بے گناہ لڑکیوں کی زندگیوں سے کھیلتا، انہیں سمگل کر کے تاریک دلدل میں دھکیل دیتا تھا۔

اس کے مکروہ کام کا پردہ چاک تب ہوا، جب اس کی ملاقات گونار سے ہوئی۔ گونار۔ جس کی آنکھیں جیسے رازوں کی تھوں کو چیر کر اندر تک دیکھ لیتی تھیں۔ نے مونیز کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ مونیز کے ہاتھ کس گندگی میں لت پت ہیں۔

جب گونار نے مونیز کو اپنی گرفت میں لیا، تو جیسے شیطان کے لیے بھی موت کا لمحہ آ پہنچا ہو۔ گونار نے مونیز کو بجلی کے جھٹکے دیے، جنہوں نے اس کی نسوں کو جلا کر رکھ دیا، اور پھر سانپ کا زہر اس کے جسم

میں اتارا، جو سرد سانس کی طرح رگوں میں بہہ رہا تھا۔ مویز کے چہرے پر وحشت کے آثار نمودار ہوئے، اور اس کی چیخیں رات کے سناٹے میں گم ہو گئیں۔ خوف کے سائے میں لرزتا مویز گونار کی آنکھوں میں جھانکنے کی ہمت نہ کر سکا۔

گونار نے اسے اپنے فولادی ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے اس کی روح تک میں خوف بھر دیا۔ ”اگر تم نے دوبارہ کسی معصوم لڑکی یا کسی بے قصور کی زندگی سے کھیلا، تو تمہارا انجام قبر کی تہہ تک لے جا کر تمہارے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا،“ گونار کی آواز برف سے زیادہ سرد اور موت سے زیادہ یقینی تھی۔ یہ الفاظ مویز کے کانوں میں زنجیروں کی گونج کی طرح بجنے لگے۔

گونار نے اسے ایک آخری موقع دیا، ایک نیا کام — پاکستان میں ایل جی بی ٹی کیو کمیونٹی کو سپورٹ کرنے کا، نہ کہ معصوم جانوں کی سوداگری کرنے کا۔

اس کی نظروں میں آگ تھی، لیکن وہ جانتا تھا کہ مویز جیسے لوگوں کا خون پلید ہوتا ہے، وہ تبدیلی قبول نہیں کرتے، مگر پھر بھی اسے ایک موقع دینے پر مجبور تھا۔ وہ اس کو قتل کر دینا چاہتا تھا، اس کے جسم کو بے دردی سے روند دینا چاہتا تھا، مگر گونار خود بھی ایک بڑے کھیل کا حصہ تھا۔ اس کے پیچھے وہ طاقتیں تھیں جو اسے روکنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

جب مونیز گونار کے ماتحت آیا، تو اسے مجبوراً اپنے گندے کاروبار سے ہاتھ کھینچنا پڑا۔ اس کی آنکھوں میں گونار کا خوف اور اس کی وحشت اس طرح سرایت کر گئی تھی، کہ اس نے وہ سب چھوڑ دیا جس سے وہ اپنی کمینگی کا ثبوت دیتا تھا۔

اب وہ اپنے گناہوں کے بوجھ تلے دب کر، گونار کی آنکھوں سے بچنے کی کوشش کرتا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ اگر کبھی بھی دوبارہ اس کی پرانی حرکتیں سامنے آئیں، تو گونار اس کا خاتمہ کر دے گا۔ ایک ایسا انجام جس سے وہ کبھی بچ نہ سکے گا۔

...°...

ریستوران ایک اونچی پہاڑی پر واقع تھا جہاں سبزہ نیچے تاحدِ نظر پھیلا ہوا تھا اور ہوا میں خنکی تھی، ایمان ایک میز کے کنارے بیٹھی اپنے سامنے پھیلی ہوئی وادی کو دیکھ رہی تھی۔

سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا، لیکن ہوا کی سرد مہک اور ہلکا ارتعاش اسے گہرائی میں کہیں چھوٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے وہی پرانا، مہندی رنگ کا فراک زیب تن کیا ہوا تھا۔

اس کے سامنے تین مرد آکر رکے، جن سے اس نے رابطہ کیا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو بد عنوانی اور نا انصافیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے مشہور پوڈ کاسٹ چلاتے تھے۔

ان کے قدموں کی آہٹ سن کر وہ ہلکی سی چوکنی ہوئی،۔۔ وہ تینوں اپنی اپنی نشست سنبھالتے بولے
”السلام علیکم“۔

ایمان نے سر ہلایا اور بے تکلفانہ انداز میں جواب دیا، ”وعلیکم سلام، شکریہ کہ آپ آئے۔“۔

پہلا شخص بولا جس کی داڑھی تھی، آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا اور وہ نیلی شرٹ اور جینز میں ملبوس تھا۔ وہ
مسکراتے بولا، ”مونیز نے ہمیں یقیناً کافی برا بھلا کہا ہو گا؟“۔

ایمان نے اس کی بات سن کر کچھ لمحے خاموشی اختیار کی، پھر نظریں جھکاتے ہوئے بولی، ”ہاں، اس کا ذکر
اکثر آپ لوگوں کے بارے میں ہوتا تھا۔“۔

مرد نے ہنس کر کہا، ”ہمیں اس کی باتوں کی پروا نہیں، ہم تو سچ کو سامنے لانے والے ہیں، اس کے اور اس
جیسے لوگوں کے گندے کام ہم ہی دنیا کے سامنے لاتے ہیں۔“۔

ایمان نے اس گفتگو کے دوران ایک لمحے کے لیے اپنے اعصاب کو سنبھالا، پھر اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر
فائلیں نکالیں اور میز پر رکھ دیں۔ اس نے ان فائلوں کو آہستہ سے مردوں کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا،
”یہ وہ ثبوت ہیں جو میں نے مونیز کے خلاف جمع کیے ہیں۔ وہ اسمگلنگ، منشیات کی فروخت، اور لڑکیوں
کے استحصال میں ملوث رہا ہے۔ اور ہاں ایل جی بی ٹی کیو پاکستان میں پھیلا نا اس کے علاوہ باقی گند جو بھی ہے
اس میں شامل ہے“ اس کی آواز میں سرد مہری تھی اور نظریں محتاط۔

مردوں نے فائلیں کھول کر ان کے اندر موجود معاہدے، رسیدیں، بینک اسٹیٹمنٹ اور تصاویر کو بغور پڑھا۔ انہوں نے نام، تاریخیں اور رقم کے حسابات کا جائزہ لیا اور ہر ثبوت کو گہری نظر سے جانچا۔

ایک گنجے آدمی، جو سیاہ چمڑے کی جیکٹ اور اس کے ساتھ پیٹ پرنے ہوئے تھا، نے ایمان سے پوچھا، ”کیا آپ کو معلوم ہے وہ کس کے لیے کام کرتا تھا؟“۔

ایمان نے کچھ لمحوں کے لیے سوچا، پھر بولی، ”کوئی عجیب سا نام تھا، انار یا کچھ ایسا۔ مجھے یاد نہیں آرہا۔“۔
پھر اس نے قدرے جھجھکتے ہوئے مزید کہا، ”فائلوں میں سب کچھ ہے۔ آپ کو یہ باتیں پوڈکاسٹ میں لانی ہوں گی۔ اس میں بہر امند کھوسٹ اور اس کی فلم، ’ونڈر لینڈ‘ کی بھی حقیقت ہے کہ وہ پاکستان میں خاشی پھیلانے کے لیے ایسی فلمیں بنا رہا ہے۔“۔

داڑھی والے شخص نے سر ہلایا اور فائلیں اٹھا کر اپنے بیگ میں ڈال لیں۔ وہ ایمان کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا، ”مگر تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟ اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟“۔

ایمان نے اپنے کندھے اچکائے، اس کی آنکھوں میں کسی قسم کی بے حسی تھی۔ ”کیوں کہ گناہ کو دیکھ کر خاموش رہنا خود گناہ ہے۔ میں اس سب میں شریک نہیں ہونا چاہتی۔“۔

داڑھی والے شخص نے مسکراتے ہوئے کہا، ”تم واقعی ایک بہادر عورت ہو۔ تم نے بہت بڑا قدم اٹھایا ہے۔ ہم یہ سب منظر عام پر لائیں گے، یقین رکھو۔“

ایمان کو مردوں کی تعریف سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ ان پر بھروسہ کرنا کبھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ کھڑی ہوئی، اپنا بیگ کاندھے پر ڈالا اور ان پر تنبیہی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا، ”میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا، اور میرا نام اس کہانی سے دور رکھنا۔ آپ لوگ کسی ایمان کو نہیں جانتے نہ میں نے ثبوت آپ کو دیے ہیں۔“

اس نے ہر لفظ مضبوطی اور سرد مہری سے ادا کیا۔ مردوں کی طرف سے کوئی رد عمل حاصل کیے بغیر، وہ تیز قدموں سے میز سے ہٹ کر ریستوران سے باہر نکل گئی۔

...°...

یہ خبر پورے پاکستان اور دنیا بھر میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ بدنام زمانہ فلم پروڈیوسر بہرامند کھوسٹ کو اس کے سنگین جرائم کی پاداش میں گرفتار کر کے عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا گیا۔

ایمان اپنے کمرے میں سکون سے بیٹھی تھی، جہاں بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں کھڑکی سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس نے کالی پوری آستینوں والی شرٹ اور پٹیلہ شلوار پہن رکھی تھی، اس کے چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت چھائی ہوئی تھی، جیسے وہ اپنے دل میں سکون اور فتح کا احساس پال چکی ہو۔ اس کی کامیابی کا کوئی ذکر نہیں تھا، کوئی اسے نہیں جانتا تھا کہ یہ سب اس کی محنت کا نتیجہ تھا، لیکن اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا

تھا۔

اس کے سامنے موبائل رکھا تھا، اور دوسری طرف مونیٹر اس سے بات کر رہا تھا، امریکہ میں کہیں بے بسی سے۔

۔ ”کیا تم اب پاکستان واپس نہیں آ سکتے؟“ اس نے اپنی آواز میں گہرا افسوس بھرتے ہوئے پوچھا، مگر اس کی آنکھوں میں کوئی دکھ نہیں تھا، صرف ایک چمک تھی، جو دھوکہ اور مکاری سے بھرپور تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، مگر یہ مسکراہٹ صرف الفاظ کی تھی، دل کی نہیں۔

۔ ”ہاں، مونیٹر، یہ ممکن ہے کہ تمہارے دوست ہی تمہیں دھوکہ دے گئے ہوں،“ اس نے نرمی سے کہا، جیسے وہ مونیٹر کے خیالات کو بھٹکانے کی پوری کوشش کر رہی ہو۔

۔ ”تمہیں ان پر نظر رکھنی چاہیے، شاید وہ ہی لوگ تمہاری جگہ لینا چاہتے ہوں۔“ اس کی آواز میں مخلصی تھی، لیکن دل میں ایک زہر تھا جو مونیٹر کو مزید الجھانے کی خاطر چھپایا ہوا تھا۔

ایمان نے یہ بھی اشارہ دیا کہ وہ کیمرے جو مونیٹر نے اپنے کمرے میں نصب کیے تھے، ان سے کچھ بھی ریکارڈ نہیں ہوا۔ ”کیمروں میں کچھ بھی نہیں آیا،“ اس نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، حالانکہ حقیقت میں وہ کیمرے ہیک کر چکی تھی اور وہ تمام ثبوت مٹا چکی تھی جو اسے پھنسا سکتے تھے۔

۔ ”فکر نہ کرو،“ اس نے مونیٹر کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا،

- ”تم نے اتنا بڑا آپریشن کروایا ہے، اپنے آپ کا خیال رکھو۔“ اس کے الفاظ میں نرمی تھی، مگر وہ نرمی صرف الفاظ کی حد تک تھی۔ دل میں وہ مکمل طور پر لا تعلق تھی، اسے مونیز کے در دیا حالت کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

- ”چلو، ان چیزوں کے بارے میں زیادہ مت سوچو،“ اس نے پرسکون انداز میں کہا، مگر مقصد تھا کہ مونیز ان سب سے دور ہو جائے اور اس کی زندگی میں دوبارہ کبھی واپس نہ آئے۔

کال کاٹنے کے بعد ایمان نے موبائل کو میز پر رکھ دیا اور ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ ”تم نے مجھے مارنے کی کوشش کی، مونیز، اور میں نے تمہیں مار دیا،“ اس نے اپنے آپ سے کہا، جیسے اپنے انتقام کا جشن منا رہی ہو۔

وہ لمحات یاد کرتے ہوئے جب مونیز نے اسے جنگل میں مروانے کی کوشش کی تھی، وہ اپنے قابل فخر بالوں میں ہاتھ پھیر کر فخر سے مسکرا دی۔

- ”میرا نام نینسی ہے، میرا کام فینسی ہے،“ اس نے خود سے چالاکی سے کہا اور زور سے ہنس دی۔ باہر کھڑکی پر بارش مسلسل برس رہی تھی، اور گلہریاں حیرت سے ایمان کو دیکھ رہی تھیں، جیسے وہ اس کے اندرونی طوفان کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

بارش کی بو چھاڑ اور طوفان کی گرج نے کمرے کے ماحول کو مزید پراسرار بنا دیا، لیکن ایمان کو اس سب کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ اپنی فتح، اپنے انتقام اور اپنی چالاکی کے نشے میں مست تھی۔

...°...

گونا رزینوں کے نچلے حصے میں کھڑا تھا، جہاں ایک عجیب نیلی روشنی اندھیرے کے پردے میں چمک رہی تھی، جیسے روشنی کی موجیں ہوا میں تحلیل ہو رہی ہوں۔

اس نے لمبا سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے وجود کو مزید پراسرار اور خوفناک بنا رہا تھا۔ گہرے سبز رنگ کی ٹرٹل نیک شرٹ اس کے سفید چہرے کے تضاد کو نمایاں کر رہی تھی، اور اس کی گہری آنکھوں میں چھپی شیطانیت صاف نظر آرہی تھی۔ گرے پیٹ اور کالے چیلی کے جوتے اس کی شخصیت کو ایک عجیب سا جاذبیت اور طاقت عطا کر رہے تھے، جیسے کوئی ایسا شخص ہو جو دنیا کے تمام راز جانتا ہو۔

اس کے سامنے سات پراسرار سائے سیڑھیوں کے اوپر کرسیوں پر براجمان تھے، دھند میں چھپی ہوئی صورتیں، جیسے یہ دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں ہوں، جن کا کوئی چہرہ نہیں، مگر ان کی موجودگی ہی کافی تھی کہ کوئی بھی ان کے سامنے کانپ اٹھے۔

ہر طرف تین رہنما، بائیں اور دائیں، اور درمیان میں سب سے بڑے رہنما کی کرسی، جو اس خفیہ معاشرے کا ماسٹر تھا۔ ایلومیناتی کا سردار، وہ طاقت جس کا وجود خود ایک راز تھا۔

گونار کا سامنا ان سات شخصیات تھا جن کے چہرے دھندلے اور غیر واضح تھے، لیکن ان کی آنکھوں کی تپش اور غصے کی شدت واضح تھی۔ وہ سب اسے شک اور نفرت بھری نظروں سے گھور رہے تھے۔

ان کے درمیان بیٹھا شخص بولا، اس کی آواز گونجدار اور سرد تھی، ”وہ مونیز تمہارے لیے کام کرتا تھا۔“ یہ الفاظ فضا میں تیرنے لگے جیسے کسی آسیب کی سرگوشی ہو، اس الزام کا وزن اور اہمیت واضح تھی۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ گونار نے انہیں دھوکہ دیا ہے، لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کون ان کے راز افشا کر چکا ہے۔

گونار نے اپنی ابرو کو ہلکا سا اٹھایا اور ایک لاپرواہ انداز میں کندھے اچکائے۔ اس کا چہرہ پر اعتماد، مگر اندرونی اضطراب کو چھپانے کی مہارت لیے ہوئے تھا۔ ”آپ لوگ سب کچھ جانتے ہیں، ایک آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے،“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا، اور ان کی علامت کی طرف اشارہ کیا، جیسے وہ انہیں ان کے اپنے نظریے کے جال میں پھنسا رہا ہو۔

درمیان میں بیٹھا شخص غصے سے کرسی کی ہتھی پر ہاتھ مار کر بولا، ”تم مسلمان ہو گئے ہو!“ اس کے شک میں ایک زہر تھا، جیسے وہ گونار کے اس نئے مذہبی انتخاب پر یقین نہیں کر رہا تھا۔

اس کے خیال میں گونار نے محض کچھ لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے یہ چال چلی تھی، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون لوگ تھے۔

گونار نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کی ہنسی میں ایک ایسی لاپرواہی تھی جیسے وہ ان کے شک کا مذاق اڑا رہا ہو۔ اس کا چہرہ مکار اور طنزیہ تھا، لیکن اندرونی طور پر وہ غصے میں تھا۔ وہ ان سے نفرت کرتا تھا، جو اسے ہمیشہ ایک پیادے کی طرح استعمال کرتے تھے۔ ”یہ سب ایک چال تھی،“ اس نے جھوٹ بولا، مگر اس کے الفاظ میں ایک گہرائی تھی، جیسے وہ جانتا ہو کہ وہ ان سے بہتر چالیں چل سکتا ہے۔ وہ دھوکہ دینے کا ماہر تھا، حقیقت کو مسح کر کے لوگوں کو وہ دکھاتا تھا جو وہ دکھانا چاہتا تھا۔ لیکن اس بار، وہ حقیقت میں اسلام قبول کر چکا تھا، اور اسی سچائی نے اسے ان کے خلاف مزید مضبوط کر دیا تھا۔

دائیں طرف بیٹھا شخص اپنی کرسی پر جھکتے ہوئے بولا، ”تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں، پھر تم بچ کیسے گئے؟“ اس کی آواز میں بے اعتمادی اور شک کی تیز دھار تھی۔

گونار کے اندر اضطراب کی ایک لہر اٹھی، لیکن اس نے چہرے پر کوئی تبدیلی ظاہر نہ ہونے دی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ایمان نے اس کا نام گونار سے انار بنا دیا تھا، اور یہ چیز اس کے حق میں گئی تھی۔ اس نے اپنے سر کو جھکایا، جیسے وہ ان کے سوالات سے الجھ گیا ہو، اور پھر کندھے اچکائے۔ ”مجھے خود نہیں معلوم کہ میرا نام کیوں نہیں آیا، لیکن میں نے اپنی حفاظت کے لیے پہلے ہی قدم اٹھالیا تھا۔“ اس نے جھوٹ اور سچ کے درمیان ایک باریک لکیر پر چلتے ہوئے کہا۔

بائیں طرف بیٹھا شخص، جو گونار کی باتوں سے قائل نہ ہوا، دھمکی آمیز لہجے میں بولا، ”اگر تم نے ہمیں دھوکہ دیا تو۔۔۔“ اس کے الفاظ میں موت کی بو تھی، جیسے وہ گونار کو اس کی غداری کی سزا دینے کی تیاری کر رہا ہو۔

گونار نے اپنے ہاتھ کو ہوا میں ہلایا، جیسے وہ ان کی دھمکیوں سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اس کے چہرے پر پرسکون تاثرات تھے، مگر اندر ہی اندر وہ جانتا تھا کہ اسے ان سے بچنا ہو گا۔ ”ہاں، میں جانتا ہوں، تمہارے پاس میری برین چپ ہے، تم مجھے برین ہیمرج سے مار سکتے ہو،“ اس نے ڈھٹائی سے کہا، لیکن اس کے الفاظ میں ایک عجیب سنجیدگی تھی، جیسے وہ انہیں کھلے عام چیلنج دے رہا ہو۔

درمیان میں بیٹھا سردار اسے شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا، ”جاؤ، ہم خود حقیقت معلوم کریں گے۔“ گونار نے سر جھکایا اور پلٹ گیا، اس کے چہرے پر ایک مطیع اور فرمانبردار شخص کے تاثرات تھے، لیکن اس کے دل میں بغاوت اور انتقام کا شعلہ بھڑک رہا تھا۔

اس نے نکتے ہوئے کہا، ”گڈ لک۔“ اس کی آواز میں طنز اور بددعا تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ان کا انجام قریب تھا، اور وہ اس کے ہاتھوں تباہ ہوں گے۔

گونار سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گیا، اس کے قدموں کی آواز دھیرے دھیرے گونج کر خاموش ہو گئی، اور نیلی روشنی کی چمک میں، ایلو میناتی کے رہنما اپنی کرسیوں پر بیٹھے، سوچتے اور منصوبے بناتے رہ گئے، لیکن ان کی آنکھوں میں شک کا دھندلا عکس باقی رہا۔

...°...

گونار اور پروفیسر تراب لاؤنج میں خاموشی سے ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے۔ گونار کا چہرہ تفکرات کی دبیز لکیروں میں چھپا ہوا تھا، جیسے وہ کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا ہو۔

وہ آج پروفیسر تراب سے ملنے آیا تھا، مگر اس کی بے چینی صاف ظاہر تھی۔ پروفیسر تراب نے اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے جھک کر پوچھا، ”کیا بات ہے، میرے دوست؟ تمہاری پریشانی کی وجہ کیا ہے؟“۔

گونار نے اپنی انگلیاں اپنے چہرے پر پھیلا کر ایک گہری سانس لی اور تھوڑی دیر بعد آنکھیں نیم وا کرتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ”میں ایمان کے معاملے میں سخت فکر مند ہوں، اور خود بھی ایک عجیب بے سکونی کا شکار ہوں۔ دل بے تحاشا دھڑک رہا ہے، جیسے کسی بے قابو ڈھول کی آواز۔۔۔“۔

پروفیسر تراب نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”تم نے بتایا تھا کہ ایمان نے نہایت چابکدستی سے فائلیں حاصل کی ہیں، اور تم نے مونیٹرز کے گھر کے کیمرے بھی بے اثر کر دیے تھے۔“

گونار کے لبوں پر ایک مدہم سی مسکراہٹ ابھری، جس میں فخر کی ایک جھلک نمایاں تھی۔ ”ہاں، ایمان نے کیمرے بند کر دیے تھے، لیکن اسے یہ علم نہیں تھا کہ میں نے نہ صرف کیمرے جام کیے بلکہ فوٹیج اور وقت کو بھی درست کر دیا تھا۔ اگر مونیٹرز ویڈیو دیکھتا، تو اسے معلوم ہوتا کہ دروازہ کھلا، روشنی ایک لمحے کے لیے نظر آئی، کیمرے اچانک بند ہوئے اور پھر دوبارہ کھل گئے۔ اگر وہ کھڑکی سے کسی سائے کو درخت کی جانب لپکتا دیکھتا تو شک یقین میں بدل جاتا اور وہ ایمان کو ٹریس کر لیتا۔ لیکن میں نے ایسا کوئی موقع فراہم نہ کیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مونیٹرز کو کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ ایمان نے فائلیں بآسانی حاصل کر لیں، مگر افسوس کہ مونیٹرز اور بہرامند کھوسٹ کل کا سورج دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہیں گے۔“

پروفیسر تراب نے سوالیہ نگاہوں کے ساتھ گونار کی طرف دیکھا اور کہا، ”تو کیا تمہارا دل ان کے لیے بے چین ہے؟“

گونار نے نفی میں سر ہلایا، مگر جب بولنے کی کوشش کی تو گلے میں جیسے کوئی گانٹھ محسوس ہوئی۔ ”نہیں، وہ نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہے،“ اس نے آہستگی سے کہا۔

پروفیسر تراب اپنی نشست پر پیچھے کو جھک گئے، سینے پر ہاتھ باندھے اور متفکرانہ انداز میں استفسار کیا، ”پھر کیا ہے؟“

گونار نے بے بسی سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا، جیسے اپنے اندر پنہاں زخموں کو محسوس کر رہا ہو۔

۔ ”گناہ...“ اس نے سرگوشی کی، ”گناہ کبھی دکھائی نہیں دیتے، مگر ان کا بوجھ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ یہ دل و دماغ کو اس قدر جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں کہ انسان کہیں بھی سکون نہیں پاسکتا۔ ہمیں اپنے نفس کو مغلوب کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اپنے ادنیٰ نفس کو قتل کرنے کا۔ لیکن ہم نے کیا کیا؟ ہم نے اپنے ضمیر کو قتل کر دیا۔“

گونار کی آنکھیں پروفیسر تراب کی جانب اٹھیں، جیسے مدد کی طلبگار ہوں۔ ”میں نے جو کچھ کیا ہے، اس کے بعد میں خود کے ساتھ کیسے رہ سکتا ہوں؟“

پروفیسر تراب کی آنکھوں میں ایک نرمی اور شفقت کی جھلک ابھری۔ وہ ہولے سے مسکرائے اور نہایت آرام سے بولے، ”بیٹا، تم اس درد میں اکیلے نہیں ہو۔ ہم سب گناہ گار ہیں، ہم سب اپنے اعمال پر پشیمان ہیں۔ لیکن ہمارے پاس ایک رحیم اور کریم رب ہے، جو توبہ کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے۔ تم نے اسلام قبول کر کے پہلا قدم اٹھالیا ہے۔ یہ وہ پہلا قدم ہے جو انسان کو اپنی روح کی تطہیر اور دل کی پاکیزگی کی طرف لے جاتا ہے۔“

گونار نے سر جھکا کر دوبارہ نفی میں ہلایا، ”لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میں نے حقیقت میں اسلام قبول کیا ہے یا نہیں۔ کیا میں نے اسے صرف اپنی زبان سے قبول کیا ہے یا اپنے دل سے؟ میں نہیں جانتا کہ میرا یقین مضبوط ہے یا شک نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔ کیا میں مسلمان ہوں یا منافق؟“۔

پروفیسر تراب نے ایک بار پھر نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا، ”فکر نہ کرو، اللہ تمہیں نشانیاں دکھائے گا۔ وہ تمہارے دل کے پردے ہٹا دے گا، کیوں کہ تم نے اس کی طرف قدم بڑھانے کا ارادہ کیا ہے۔ وہ اپنی نشانیاں ان لوگوں پر ظاہر کرتا ہے جو اسے دل کی گہرائیوں سے تلاش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:-

اور اے حبیب! جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو بیشک میں نزدیک ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرے تو انہیں چاہئے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں۔

(البقرہ 186:2)۔

گونار نے اپنے سینے میں امید کی ایک خفیف سی لہر محسوس کی، گویا اس کی روح کو زندگی کی ایک نئی رمت مل رہی ہو۔ وہ سچے دل سے ایمان لانا چاہتا تھا، ہدایت کا طالب تھا، اور اللہ کے قرب کی جستجو میں تھا۔

اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور دھیمے لہجے میں کہا، ”تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں اپنی زندگی کیسے بسر کروں؟ اور اپنے ماضی کے گناہوں کا بوجھ کیسے اُتاروں؟“۔

پروفیسر تراب نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ سر اٹھایا اور کہا، ”عربی کا ایک پرانا مقولہ ہے، ’جو شخص خود کو مٹانے کا ارادہ کرے، وہ سمندر میں کود جائے، لیکن جب وہ پانی کی تہوں میں ڈوب رہا ہوگا، تب اُسے احساس ہوگا کہ اُس نے اپنی زندگی کی قدر و قیمت نہ پہچانی۔‘ اُس لمحے اُسے پچھتاوا ہوگا کہ اُس نے اپنے آپ کو نیست و نابود کرنے کی خواہش کی، جبکہ حقیقت میں اُس کی جان نہیں بلکہ دل میں چھپا ہوا کوئی غم، کوئی کرب، کوئی دکھ تھا جو اُسے بے چین کر رہا تھا۔ کاش وہ اپنے مسائل کا سامنا کرتا، بجائے فرار اختیار کرنے کے۔ کاش اُس نے اللہ سے مدد مانگی ہوتی۔ کاش وہ اپنی زندگی کی مشکلات کو اللہ کی رحمت اور قدرت پر بھروسہ کر کے حل کرتا، نہ کہ مایوسی کے اندھیروں میں بھٹک جاتا۔“

گونار نے خاموشی سے سر ہلایا، اُس کے دل میں پروفیسر کی باتیں پیوست ہو رہی تھیں۔ وہ جان چکا تھا کہ وہ اپنی حقیقت سے، اپنی ذمہ داریوں سے فرار کی کوشش کر رہا تھا۔

خود سے نفرت، خود انکاری اور اپنے ہی وجود سے بیزاری کی کیفیت میں مبتلا ہو کر زندگی گزار رہا تھا، لیکن سکون اسے کبھی نہ مل سکا۔ اس کے حصے میں صرف بڑھتا ہوا درد، گناہ کا ناقابل برداشت بوجھ، اور خوف کی تاریکی آئی تھی۔

گونار نے پروفیسر کی طرف نگاہ کی اور دھیمے مگر کرب بھرے لہجے میں سوال کیا، ”تو میں اس پر کیسے قابو پا سکتا ہوں؟ میرے دل کے ان زخموں کا مداوا کیسے ہوگا؟ مجھے حقیقی سکون کیسے نصیب ہوگا؟“

پروفیسر تراب نے نہایت گہرائی سے بولنا شروع کیا، ”صبر، ایمان اور اللہ کے احکامات کی مکمل اطاعت سے۔ سکون اُس کو ملتا ہے جو اللہ کے راستے کو اپناتا ہے، جو حق، عدل اور بھلائی کے اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ ہر لمحہ، ہر سانس میں، ہر حال میں اللہ کو یاد کرو، اُس کی بخشش طلب کرو، اُس کی رہنمائی اور مدد مانگو، اور اُس کے فیصلوں اور حکمت پر مکمل بھروسہ رکھو۔ اُس کی محبت اور رحمت پر یقین رکھو اور اُس کے قوانین کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالو۔

جو اللہ کو ہر لمحہ یاد رکھے گا، اُس کو سکون نصیب ہوگا، اور جو اُسے بھلا دے گا، وہ عمر بھر پریشانی، بے چینی اور بے سکونی کے اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا۔ بس، یہ ہی وہ راستہ ہے جس پر چلنے سے دل کے زخم بھرنے لگتے ہیں، اور حقیقی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔“

گونار نے اپنے دل میں پہلی بار سکون اور شکر گزاری کی حقیقی لہر محسوس کی۔ وہ ایک اندرونی گرمی، ایک نیا تعلق اور ایک نئی روشنی محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی زندگی میں اب ایک مقصد، ایک واضح سمت اور ایک معنی پیدا ہو گئے ہوں۔

اس نے پروفیسر تراب کی طرف نظریں اٹھائیں اور آہستہ سے کہا، ”شکریہ، پروفیسر۔ آپ کے الفاظ، آپ کی رہنمائی اور آپ کے تعاون کا شکریہ۔ آپ میرے استاد، میرے رہنما اور میرے دوست ہیں، اور میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے راستہ دکھایا، سچائی کا پیغام دیا، اور اللہ کی قربت کی جستجو میں میری مدد کی۔“

پروفیسر تراب نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور دھیمے لہجے میں کہا، ”بیٹا، تمہیں اسلام اور بھائی چارے کے دائرے میں خوش آمدید۔ تمہیں اللہ کی رحمت، اس کی ہدایت اور اس کی مدد نصیب ہو۔ یہ وہ تحفہ ہے جو کسی بھی انسان کو ملنے والا سب سے بڑا انعام ہے: ایمان۔“

دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔ ان کے درمیان اب ایک نئی محبت، ایک نیارشتہ تھا جو خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط، دوستی سے زیادہ گہرا، اور دنیاوی تعلقات سے زیادہ بامقصد تھا۔ وہ رشتہ، جس کی بنیاد اللہ پر ایمان اور اس کی محبت پر تھی۔

وہ دوبارہ بیٹھے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر باتیں کرتے رہے۔ وہ اسلام، زندگی، اور مستقبل کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ گونار نے اپنے ماضی کے دکھ، اپنے خاندان کے نقصانات اور اپنے دل کی ٹوٹ پھوٹ کے بارے میں بتایا۔ وہ ایمان اور اپنے احساسات کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا، اس کے دل میں ایک عجیب خوف تھا۔

گونار نے کہا، ”مجھے ایمان سے ایک عجیب خوف ہے، جیسے ہر لمحہ اسے کھودینے کا ڈر دل میں بیٹھا ہو۔ موم، ڈیڈ، میری بہن، ماسٹرلی—سب مجھ سے چھن گئے، اور ہر بار دل کا ایک حصہ ان کے ساتھ چلا گیا۔ عیسایہ میرے ہاتھوں میں دم توڑ گیا، اور اُس کے ساتھ میرا وجود بھی ٹوٹ گیا۔ میں محبت، احساس، سب سے دُور ہو گیا تھا، زندگی جینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

پھر ایمان کی ایک جھلک نے میری دنیا میں روشنی بھری، میری مردہ روح کو زندگی کا احساس دیا، جیسے اس کی موجودگی نے مجھے جینے کی ایک نئی وجہ دے دی ہو۔”۔

پروفیسر تراب نے تحمل سے کہا، ”بیٹے، خوف تمہارا دشمن ہے۔ وہ تمہیں کمزور کرتا ہے، تمہیں روکتا ہے، اور تمہاری سوچ کو زنجیروں میں جکڑتا ہے۔ خوف شیطان کا ہتھیار ہے، جو تمہیں اللہ سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تمہیں یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ تمہیں کوئی پسند نہیں کرتا، تمہاری خوشی ختم ہو جائے گی، اور تم ناکام ہو جاؤ گے۔ مگر جان لو کہ وہ جھوٹا ہے۔ اللہ تمہارا محافظ ہے، وہ تم سے محبت کرتا ہے، اور وہ تمہیں ہر اس چیز سے بچائے گا جو تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس لیے اللہ پر بھروسہ کرو، اس کی حکمت پر یقین رکھو، اور اس کے منصوبے پر بھروسہ رکھو۔”۔

گونار نے اپنی گھبراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ”لیکن پروفیسر، مجھے ایلو مینا تی سے نکلنا ہو گا۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ مجھے آپ اور ایمان کو بچانے کے لیے کوئی تدبیر کرنی ہو گی۔”۔

پروفیسر تراب نے سنجیدگی سے سر ہلایا اور کہا، ”میں جانتا ہوں، بیٹا، لیکن خوف ہمیں مفلوج نہیں کر سکتا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، اور اپنے دل میں یقین پیدا کرو کہ ہم محفوظ ہیں۔ اگر تمہیں خود کو اور ایمان کو بچانے کے لیے کوئی قدم اٹھانا ہے، تو اٹھاؤ، لیکن یاد رکھو، اس دنیا کے بڑے بڑے منصوبے بھی اللہ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اللہ کی رضا اور اس کی حفاظت پر بھروسہ رکھو، اور اپنا راستہ صاف نیت اور مضبوط ارادے سے اختیار کرو۔”۔

گونار نے پروفیسر کی باتوں سے دل کو تقویت دی، اس کے چہرے پر پختگی کے آثار نمودار ہوئے۔

...°...

ایمان کی روح بے قراری اور اضطراب میں ڈوبی ہوئی تھی، وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے گویا اپنے دل کی گھٹن کو قدموں تلے کچلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے گھریلو زندگی کی محدود فضا سے ہمیشہ بیزاری رہی تھی، اس کی آرزو ہمیشہ وسیع آسمانوں میں پرواز کرنے کی رہی تھی، جہاں جوش و خروش اور مہمات کی دنیا ہو۔

آج بھی وہ اسی جذبے کے زیر اثر تھی، ایک سرخ ریشمی فراک اس کے جسم کو ایسے سمیٹے ہوئے تھا جیسے یہ اس کی بے باکی اور سرکشی کا آئینہ ہو۔

اس کے کندھوں پر ہلکا سرخ شفون کا دوپٹہ بے نیازی سے پڑا تھا، اور اس کے لبوں پر سرخ لپ اسٹک اس کی بھڑکتی ہوئی شخصیت کا عکاس تھی۔ بال کھلے ہوئے اس کے چہرے کے گرد سنہرے بادلوں کی طرح لہرا رہے تھے۔

وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک ٹی وی لاؤنج کے شیشے کے پار کچھ آوازیں سن کر اس کے قدم ٹھہر گئے۔ اسے جیسے ایک انجان اندیشہ آگھیرتا ہے، اور وہ بے اختیار رک کر سکریں کی جانب متوجہ ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک خبر نشر ہو رہی تھی: ”اہم خبر: معروف ٹرانس جینڈر ایکٹیوسٹ، میرب مونیئز، امریکہ کے ایک اسپتال میں مردہ حالت میں پائے گئے ہیں۔ موت کی وجوہات ابھی تک سامنے نہیں آ سکیں، لیکن ذرائع اسے پراسرار اور مشکوک قرار دے رہے ہیں۔ مونیئز حالیہ دنوں میں تنازع کا شکار رہے

جب ایک نامعلوم و سِل بلور نے ان کے پوشیدہ منصوبوں کا پردہ فاش کیا تھا۔ حکام ابھی تک اس و سِل بلور کی شناخت تلاش کر رہے ہیں۔”۔

ایمان کے جسم سے جیسے جان نکل گئی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور دل بے قابو ہو کر تیز دھڑکنے لگا۔ سانس لینے میں دشواری محسوس ہوئی، جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ اس کا وجود لرز اٹھا اور آنکھوں میں تاریکی چھانے لگی۔

کسی نہ کسی طرح وہ اپنے کمرے تک پہنچی اور دروازہ بند کر کے فرش پر ڈھے گئی، چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہ زار و قطار رونے لگی۔

وہ ہی تھی جو و سِل بلور تھی، اس نے ہی مونیٹرز کے راز چرائے اور انہیں انکشاف کرنے والوں تک پہنچایا تھا۔ لیکن وہ ہرگز اس انجام کی خواہاں نہیں تھی۔ یہ سب غصے، دکھ اور ناامیدی کی حالت میں کیا گیا ایک قدم تھا، اس نے کبھی مونیٹرز کی موت کا ارادہ نہیں کیا تھا۔

وہ آپہں بھرتے ہوئے بولی، “مونیٹرز، تم نے کیوں مجھے دھوکا دیا؟ کیوں تم نے مجھے اس حد تک پہنچایا؟ میں نے تمہیں بچانے کی کوشش کی، تمہیں بارہا روکا، مگر تم نے کبھی سننے کی زحمت ہی نہیں کی۔ تم نے اپنی دنیا کو خود تباہ کر دیا، اپنی آخرت کو اپنی ہی ضد اور سرکشی میں جلا ڈالا۔”۔

اس کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے، ناک سے خون کا ایک قطرہ بہہ نکلا، اور سانس گھٹنے لگی۔ وہ بمشکل گہرے سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی لیکن جسم جواب دے رہا تھا۔

زندگی کا سب سے کرب ناک لمحہ وہ ہوتا ہے جب ہم اپنی آنکھوں کے سامنے کسی عزیز کو گمراہی کے راستے پر بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں، بارہا اُسے روکنے کی سعی کرتے ہیں، مگر وہ ہماری پُر خلوص فریادوں کو نظر انداز کر کے اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی میں خود کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ جب وہ اپنی بربادی کا شکار ہو جاتا ہے تو ایک ناقابلِ بیان بے بسی ہمارے وجود پر حاوی ہو جاتی ہے، جو تمام عمر دل پر ایک ناگہانی بوجھ کی طرح باقی رہتی ہے، اور ہم بے یار و مددگار اس اذیت کو برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایمان بھی ایسی ہی اذیت سے دوچار تھی۔

اس نے آہستگی سے سرگوشی کی، ”مونیز، تم نے اپنے ساتھ کیا کیا؟ دنیا کی عارضی فریب میں گرفتار ہو کر تم نے اپنی ابدی حیات کو ضائع کر دیا۔ اب تم ہی بتاؤ، کیا یہ دنیا ہمیشہ کی ہے، یا وہ آخرت جس کا وعدہ سچ ہے؟“

وہ الفاظ کہتے ہوئے وہ بے بسی کے عالم میں نیچے گر گئی، اس کی بصارت دھندلا گئی، اور آخر کار ندامت کی گہری تاریکی اسے نگل گئی۔

چاروں طرف آگ کے شعلے بے قابو ہو کر بھڑک اٹھے، زمین دھک رہی تھی اور آسمان سے بھاری، دہکتے ہوئے پتھروں کی برسات ہو رہی تھی، جو ٹکرا کر چنگاریاں بکھیر رہے تھے۔

فضا چیخوں، ماتم اور دھوئیں سے بھری ہوئی تھی، ہر سمت عذاب کا شور تھا۔ اس ہولناک ماحول کے بیچ مویز ٹھوکر کھا کر ایک شخص سے ٹکرا گیا۔ وہ شخص مکمل طور پر زخموں سے چھپ چکا تھا، اس کا جسم جھلسا ہوا تھا اور اس کے سر پر سنگین پتھر برس رہے تھے جن پر اس کا نام کندہ تھا۔ اس کی آواز میں ایسا درد اور حسرت تھی کہ مویز لرز اٹھا۔

۔۔۔ ”تم کون ہو؟ یہ کون سی جگہ ہے؟“ مویز نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

زخموں سے چور شخص نے سراٹھایا اور اپنی نحیف آواز میں جواب دیا، ”ہم وہ ہی بد نصیب قوم ہیں جو قوم لوط کہلائی۔ ہم نے پیغمبر کی باتوں کو جھٹلایا، اللہ کی نافرمانی کی اور اپنے گناہوں میں ڈوب گئے۔ نشانیاں آئیں مگر ہم نے نظر انداز کر دیں۔ ایک دن آیا اور ہمارا وجود صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ اُس وقت سے ہم پر یہ عذاب ٹوٹ رہا ہے، ہم نے معافی کی دعائیں کیں، لیکن یہاں کوئی معافی نہیں، کوئی نجات نہیں۔ اور یہ ایک دن ختم ہونے کو نہیں آ رہا۔“

مویز کا چہرہ دہشت سے سفید ہو گیا۔ ”یہ ایک دن نہیں، یہ ابدیت ہے!“ اس نے کہا۔ ”تمہاری تباہی کو ہزاروں سال بیت چکے ہیں، تم ہمیشہ کے لیے اس عذاب میں مبتلا رہو گے۔“

اچانک زمین لرز نے لگی، جیسے کوئی عذاب زدہ مخلوق اپنی پیاسی آنتوں سے کچھ نکالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ مویز کا توازن بگڑ گیا، وہ زمین پر گر پڑا، اور اوپر سے ایسی گونجدار آواز آئی کہ اس کا دل کانپ اٹھا۔

۔ ”تمہیں ہدایت دی گئی تھی، لیکن تم نے کفر اور سرکشی کا راستہ اپنایا۔ تم نے دنیا کی محبت میں اپنے ایمان کا سودا کیا، اور اب تم اس ابدی عذاب کا سامنا کرو گے۔“

-

آسمان سے جلتے ہوئے ڈالرز اور سونے کے سکے برسنے لگے، مگر یہ دولت نہیں تھی، یہ عذاب تھا۔ یہ سونے کے سکے اور ڈالرز ان کے جسموں میں پیوست ہو رہے تھے، ان کی جلد میں سوراخ کر رہے تھے، ان کے گوشت کو جلا رہے تھے، ان کی چیخیں آسمانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

ان کے جسم جلتے، گرتے اور ٹوٹتے رہے، اور ان کی کھال کی جلتی ہوئی بدبو ہر طرف پھیل گئی۔

بہرامند نے مویز کی طرف دیکھا اور کہا، ”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا، مویز۔ تم نے ہمارے راز فاش کیے، تم نے ہماری زندگیوں کو برباد کیا، تم نے مجھے دھوکہ دیا اور اب یہ سب تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے تم نے ہمیں اس جگہ پر پھینکا ہے اگر سچائی سامنے نہ آتی تو ہمارے پاس مہلت ہوتی!“

مویز کے جسم پر اس کے نام کے پتھر گر رہے تھے، اس کی ہڈیاں کچل رہی تھیں، گوشت چھلنی ہو رہا تھا۔
اس کی روح چیخ رہی تھی، مگر موت کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اچانک وہ روشنی میں لپٹی ہوئی ایمان کو دیکھتا ہے، جو روشنی کی ہالہ میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سکون اور نور تھا، جیسے وہ دنیا سے ماورا کسی حقیقت میں محو ہو۔

۔ ”ایمان!“ معیز نے چیخ کر کہا، ”مجھے بچاؤ! مجھے اس آگ سے نکالو! میں نادم ہوں، میں نے تمہیں دھوکہ دیا، میں اپنے گناہوں سے توبہ کرنا چاہتا ہوں!“۔

ایمان نے سرد آواز میں کہا، ”مویز، میں تمہیں نہیں بچا سکتی۔ توبہ کا وقت دنیا میں تھا، اور تم نے اسے ضائع کر دیا۔ اب تمہیں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنی ہوگی۔ یہ وہ ہی عذاب ہے جس کا تم نے مذاق بنایا تھا، اور اب تمہاری روح ہمیشہ کے لیے اس میں جلتی رہے گی۔“۔

آسمان سے پھر وہ ہی گونجدار آواز آئی ”یہ جہنم تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے، یہ وہ ہی کھیتی ہے جسے تم نے اپنے ہاتھوں سے بویا تھا۔ اب یہ فصل تمہیں کھائے گی، تمہارا جسم ہمیشہ کے لیے اس میں پھڑکتا رہے گا، تم نے اپنے نصیب کو اپنے ہاتھوں سے برباد کیا۔“۔

پتھروں اور آگ کے درمیان مویز کی چیخیں اور درد میں بلبلاہٹ دم توڑ رہی تھی، اور وہ ہمیشہ کے لیے اس بے رحم عذاب کی زنجیروں میں جکڑا گیا تھا، جس سے نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

گونار شیشے کی دیواروں والے کمرے میں بیٹھا، نظریں سامنے پھیلے برف زاروں پر جمی ہوئی تھیں۔ شفاف چھت اور کھڑکیاں اسے ان برف پوش پہاڑوں کا دلفریب مگر سنسان منظر دکھا رہی تھیں، جنہیں دیکھ کر وہ سکون کی تلاش میں تھا، لیکن اندر کی خالی جگہ کو کچھ بھی پُر نہیں کر پا رہا تھا۔ باہر کی دنیا تاریک اور سرد تھی، مگر کمرے میں گرمی اور روشنی تھی، گویا روشنی اور اندھیرے کا تضاد اُس کے دل کی کیفیت کو آئینہ دکھا رہا ہو۔

چینی کی گرمی اور آرام دہ صوفے پر بیٹھے ہونے کے باوجود، سکون کی تلاش میں وہ بے چین تھا۔ اس کا ذہن پیچھے کی طرف بھٹک گیا۔ مونیز۔ وہ شخص جس نے اپنی خود غرضی اور طاقت کی ہوس میں ایمان کے تمام انتباہات کو ٹھکرا دیا تھا۔ ”مونیز،“ گونار نے تلخی سے سر ہلایا، ”ایمان نے تمہیں بچانے کی بھرپور کوشش کی تھی، تمہیں بار بار خبردار کیا تھا، مگر تم نے اپنی گمراہی کے راستے کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ تم نے اپنی آخرت کو خود اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیا۔ تمہیں خوشی کا راستہ مل سکتا تھا، لیکن تم نے جہالت اور عذاب کو چن لیا۔“

گونار کی آواز میں مزید تلخی در آئی۔ ”تم اور سلوان دونوں اب جہنم کی آگ کے لقمے ہو چکے ہو۔“ وہ آنکھیں بھینچتے ہوئے درد بھرے لہجے میں بڑبڑایا، ”وہ خواب جس میں، میں نے سلوان کو دیکھا تھا... اس کا گندا جسم نالے کی غلاظت اور گٹر کی بدبو میں لت پت، ہر طرف خنزیر تھے جو اس پر اپنی غلاظت پھینک رہے تھے۔ اُس کے چہرے پر پیپ سے بھرے زخم تھے، اور اُس کے منہ میں ناپاک گندگی

زبردستی ٹھونس جا رہی تھی۔ کبھی اس پر جمنے والی سردی کا عذاب نازل ہوتا تو کبھی دکھتی ہوئی آگ کا عذاب۔ وہ اس ناپاک بدبو اور اذیت کے اندھیرے میں دھنستا جا رہا تھا... تم دونوں اندھے کنویں میں خود جا گرے ہو، تمہیں کسی نے نہیں دھکیلا۔”

گونار کا دل کرب سے بو جھل ہو چکا تھا۔ اُس نے کھڑکی سے باہر جھانکا، برف کے گرتے ہوئے نرم گالے زمین پر سفید چادر کی مانند بچھ رہے تھے، گویا فطرت کی خاموشی اور حسن اُس کی روح کو قرار دینے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن اُس کے دل میں ایک بے نام اداسی تھی جو کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

اُس کا دل ایمان کی یادوں میں محو ہو گیا۔ وہ ایمان جو اس کی محبت کا مرکز تھی، جو اس کی زندگی کی روشنی تھی، جو اُس کے دل کا سکون تھی۔ مگر جس کی غیر موجودگی نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ ایمان کے بغیر زندگی کا ہر لمحہ اُسے خالی محسوس ہوتا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ ایمان خطرے میں ہے، وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی جان کو قربان کرنے پر آمادہ ہے۔ گونار کا دل چاہتا تھا کہ وہ اُس کے قریب ہو، اُسے اپنی حفاظت میں لے، اُسے بتا سکے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔

وہ بے بسی سے آہ بھر کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ ”اے اللہ، اُس کی حفاظت فرما، اُسے کامیابی سے ہمکنار کر، اور اُسے خوشیوں کی دولت سے مالا مال کر۔“ اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی کہ جلد وہ لمحہ آئے جب وہ ایمان کو اپنے جذبات سے آگاہ کر سکے، اور وہ امید کی شمع جلاتا رہا کہ ایمان ایک دن اُس کی ہوگی۔

...°...

مونیز کی وفات کو مہینے بیت چکے تھے۔ خزاں کا موسم سردیوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مہینے کب سال میں ڈھل گئے، یہ احساس بھی نہ ہو سکا۔ دسمبر ۲۰۲۲ کب ختم ہوا اور جنوری ۲۰۲۳ کی شروعات کب ہوئی، یہ سب دھند میں چھپ گیا تھا۔

فضاء سرد، اداسی سے بوجھل اور دھندلے بادلوں سے بھرپور تھی۔ سڑکیں گیلی اور خطرناک حد تک پھسلن سے لبریز تھیں، جب کہ درخت پتوں سے عاری اور افسردہ نظر آتے تھے۔

ایمان، جو کھڑکی کے پاس اپنے بستر پر بیٹھی تھی، خالی نگاہوں سے مدھم آسمان کو تکتے ہوئے گم سم تھی۔ اُس نے سفید قمیض اور شلوار زیب تن کر رکھی تھی جو کہ روایتی پاکستانی لباس تھا۔ اس کے بالوں کو ڈھیلی سی کھجوری چوٹی میں باندھا گیا تھا، جس کی ایک لٹ بے ترتیبی سے اس کے کندھے پر گری ہوئی تھی۔

اُس کے ہاتھ اس کے گالوں پر ٹکے ہوئے تھے اور چہرے پر ہلکی زردی اور پڑمردگی تھی۔ وہ دل ہی دل میں بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی، گویا کسی انجانی قید میں مبتلا ہو۔

اس کی آٹھ گلہریاں، جو اس کی واحد دوست اور ساتھی تھیں، اس کے برابر والے بستر پر سر جھکائے بیٹھی تھیں، گویا وہ بھی کسی گہری سوچ میں مبتلا تھیں۔ یہ چھوٹے جاندار ایمان کے لیے بہت اہم تھے، اس کے دکھوں کا مدد ادا اور اس کی تنہائی کا سہارا۔

ایمان نے ہلکی سی آہ بھری اور گلہریوں کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

”کتنے دن گزر گئے ہیں، ہم کہیں نہیں گئے۔ آؤ، میرے ساتھیو، کچھ لمحے باہر گزاریں۔“

پھر اُس نے ایک لمحہ توقف کے بعد عجوبہ کی طرف دیکھا، مسکرائی، اور نرم لہجے میں کہا

”عجوبہ! کیا ہم مری چلیں؟“

مری، جو اسلام آباد کے قریب ایک خوشنما پہاڑی مقام تھا، ایمان کے دل میں گہرے جذبات سے جڑا ہوا تھا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں وہ مونیئرز کے ساتھ، اُس کی زندگی میں جایا کرتی تھی۔ آج اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر کی فضا، اپنی یادوں کی زنجیروں اور دل کے درد سے دور ہو جائے۔

ایمان نے اپنا سامان باندھنا شروع کیا، گویا وہ فوراً نکلنے کے لیے تیار ہو رہی ہو۔ اُس کے پاس ایک چھوٹی سی مہران گاڑی تھی، اُس نے خود ہی گاڑی چلانا سیکھا تھا اور اکثر مشکل وقتوں میں اسے اپنی آزادی کا ذریعہ بنایا تھا۔ اُسے گاڑی چلانا بہت پسند تھا، خاص طور پر بالوں میں ہوا کا لمس اور منظر نامہ ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا تجربہ۔

سفر کرنا، نئی جگہوں کا کھوج لگانا اور اجنبی راہوں پر نکلنا ایمان کو ہمیشہ سے دلکش لگتا تھا۔ وہ اکثر اپنے گھر والوں کی باتوں کو نظر انداز کر کے، اپنی گلہریوں کے ساتھ دنوں تک نکل جاتی تھی۔

اب، اس کے دل میں اور کچھ باقی نہیں تھا، بس اپنے آپ اور اپنی گلہریوں کے ساتھ عجمہ کا خیال تھا۔

...°...

--

وہ ایک ہلکی سی دھن گنگنائی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ کچن سے سفر کے لیے کچھ اسٹیکس اور پانی لے لے۔ جب وہ جتوئی کے کمرے کے قریب پہنچی، جہاں وہ خالدہ کے ساتھ رہتا تھا، دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور اندر سے ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں اس کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، اور ان کے لہجے میں واضح ناپسندیدگی تھی۔

۔ ”تم اس لڑکی کو یوں ہی کیوں جینے دے رہے ہو؟“ خالدہ کی آواز کڑک اور تلخی سے لبریز تھی،۔ ”اسے ختم کروادو، وہ بوجھ ہے۔ وہ ذلت کا نشان، بے وقعتی کی تصویر، اور لعنت کا پیکر ہے۔ ایک بے مصرف وجود، جو نہ کسی کام کا ہے اور نہ کسی کے لیے باعث سکون۔ اس کے سوا ہمیں کوئی دکھ نہیں، کوئی رنجش نہیں۔ وہ ہماری بد قسمتی اور دکھ کی جڑ ہے۔ اسے مٹا دو گا، ختم ہونا ہو گا۔“۔

ایمان کے قدم وہیں تھم گئے، دل کی دھڑکن جیسے رک سی گئی ہو۔ اس کا وجود پتھر کا سا ہو گیا، اور اس کے کان میں یہ باتیں سن کر جھنجھلاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ آنکھیں پھیلی ہوئی، سانس بے قابو تھی۔ وہ نہیں مان سکتی تھی کہ جو وہ سن رہی ہے وہ حقیقت ہے۔ وہ جانتی تھی کہ جتوئی اور خالدہ اس سے محبت نہیں کرتے، مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس سے اتنی نفرت کرتے ہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے وجود کو اتنا حقیر سمجھتے ہیں، کہ اس کی زندگی کا خاتمہ چاہتے ہیں۔

۔ ”مگر میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟“ جتوئی کی آواز سرد اور پرسکون تھی، جیسے وہ کوئی کاروباری معاملہ زیر بحث لا رہا ہو۔ ”میرے پاس قانونی رکاوٹیں ہیں۔ امی نے تمام جائیداد ایمان کے نام کر رکھی ہے۔ اگر وہ چالیس سال سے پہلے مر جاتی ہے تو جائیداد نیشنل جوڈیشل آرگنائزیشن کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ یہ ہی وصیت میں لکھا ہے۔“

خالدہ نے سانس بھری، ”تو پھر؟ کیا ہم ہمیشہ اس کی غلامی کریں گے؟“

جتوئی نے گہری سانس لی، ”یہ سب امی کی ضد کا نتیجہ ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ ایمان پر بھروسہ کرتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں نے اسے کبھی قبول نہیں کیا۔ اسی لیے انہوں نے یہ جائیداد اس کے نام کر دی۔ انہوں نے اپنے آخری دنوں میں ہم سے نفرت کی، کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ ہم ایمان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔“

ایمان کا دل جیسے چٹانوں تلے دب گیا ہو۔ اُس کے باپ سے اسے کسی ہمدردی کی توقع نہیں تھی، کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ وہ محض ایک خود غرض اور لالچی شخص ہے۔ ایک ایسا شخص جو پیسہ، طاقت اور اثر و رسوخ سے معمور تھا مگر محبت سے عاری۔

میکائیل، جتوئی اور خالدہ کا بیٹا، اس کی پرورش آن بان کی فضا میں ہوئی تھی۔ جتوئی نے ہمیشہ اس کا ساتھ دیا اور ایمان کو ہر طرح سے نظر انداز کیا۔

میکائیل کی بدکرداری اور ایمان کی زندگی کو خطرے میں ڈالنا، سب اسی کا نتیجہ تھا۔ ایمان جانتی تھی کہ اس کا باپ نہ صرف ایک خود غرض تاجر ہے بلکہ ایک بے حس باپ بھی ہے۔

لیکن جو کچھ اُس نے ابھی سنا، وہ اُسے حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی تھا۔ ایک باپ اتنا بے حس اور خود غرض بھی ہو سکتا ہے، یہ اُس کی توقعات سے باہر تھا۔

۔ ”جب تمہیں علم ہو چکا تھا کہ آصف نے اس کے ساتھ وہ سب کچھ کر ڈالا ہے، تو لازم تھا کہ تم اسے خوفزدہ کر کے کاغذات پر دستخط کروا تیں،“ خالدہ کی آواز میں سرد مہر لہجہ تھا، گویا وہ ماضی کی تلخیوں کو غیر محسوس انداز میں چھو رہی ہو۔ ”وہ بے خبر تھی کہ اس کے ارد گرد کیا کھیل رچایا جا رہا ہے، اور وہ نادان اس جال میں بے خبر پھنستی چلی گئی۔“

خالدہ کی آواز میں کچھ اور گہرائی آگئی، جیسے کسی قدیم زخم کی یاد تازہ ہو رہی ہو۔ ”اس جیسی جاہل کو دستخط کا شعور کہاں تھا؟ خیر، انگوٹھا تو بہر حال لگ ہی جاتا، مگر جو کچھ تمہارے بیٹے نے کیا، وہ... وہ سراسر حماقت اور بربادی کا پیغام تھا۔“

جتوئی کی نگاہیں جیسے خالدہ کی باتوں کا مفہوم ٹٹولنے لگیں، مگر خالدہ نے سلسلہ جاری رکھا۔ ”مگر جب مجھے اپنی غلطی کا ادراک ہوا، وہ بھی بیدار ہو چکی تھی۔ اُس نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے کہا کہ وہ ہمیں عدالت میں لا سکتی ہے۔ اُس نے کہا کہ اُس کے پاس ثبوت ہیں، گواہ ہیں، اور وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔“

ایمان کی رگوں میں ایک بے چینی سرایت کر گئی۔ اُس کے ذہن میں وہ رات جھللا اٹھی جب میکائیل نے اُس کے ساتھ ظلم کیا تھا۔ جسم بے جان تھا، لیکن اُس لمحے کی کڑواہٹ ابھی تک باقی تھی۔ وہ یاد، وہ اذیت، اُس کی روح کو پھر سے ماند کرنے لگی۔

۔ ”وہ ہمیں کمتر سمجھتی ہے،“ خالدہ کی زہر بھری باتوں نے ایمان کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔۔ ”اُس نے کہا کہ وہ ہم سے نفرت کرتی ہے، تم سے نفرت کرتی ہے، اور چاہتی ہے کہ ہم تباہ ہو جائیں۔“

ایمان کی آنکھوں میں بے یقینی کی جھلک تھی، جیسے وہ جو سن رہی تھی، سچ ہی تھا۔ اُس کا باپ، جسے وہ دل سے برا جانتی تھی درحقیقت وہ درندہ تھا جو، اُس کی زندگی کی پرواہ کیے بغیر اُسے مرنے دینا چاہتا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کمرے کی طرف جاتے ہوئے اُس نے خود کو جیسے ایک بندھن سے آزاد پایا۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ فرش پر گر پڑی، اور آنسو خاموشی سے اُس کے رخساروں پر بہنے لگے۔

ایمان دروازے سے ٹیک لگائے، ہاتھوں میں چہرہ دبائے خاموش آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا اضطراب تھا، جیسے دنیا کی تمام مصیبتیں ایک پل میں اس پر نازل ہو چکی ہوں۔

وہ حیران تھی کہ آخر اسے ایسی آزمائشوں میں کیوں ڈالا گیا تھا۔ کیا اس کی تقدیر میں کبھی سکون لکھا بھی گیا تھا؟ دل چاہتا تھا کہ اس کا باپ،، اس کے لیے ڈھال بنتا، اسے ان سفاک ہاتھوں سے محفوظ رکھتا جنہوں نے اس کی روح کو تاراج کیا تھا۔

۔ ”کاش، اس نے ان لوگوں سے حساب لیا ہوتا جنہوں نے میری عزت پامال کی تھی،“ ایمان نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس کی آرزو تھی کہ اس کا باپ ان کے سامنے کھڑا ہوتا، انہیں سزا دیتا، جیسے ایک محافظ۔ مگر وہ تو بے بسی کی انتہا پر کھڑا تھا، ایک خاموش تماشائی۔

اس کی سسکیاں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اس نے اللہ سے سوال کیا، ”یارب، کیا اس دنیا میں ایسا باپ بھی ہوتا ہے جو اپنی بیٹی کی بے عزتی پر خاموش رہتا ہے؟“ اُس کی آواز لرز رہی تھی، جیسے ہر لفظ میں ایک کرب چھپا ہو۔

ادھر سویڈن میں، گونار اپنی پینٹنگ میں غرق تھا۔ اس نے ایمان کی تصویر کو جیسے کوئی افسانوی مخلوق بنادیا تھا۔ خوبصورتی کی ایک مجسمہ۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی، ایک ایسی چمک جس میں ساری کائنات کا حسن چھپا ہوا تھا۔ مگر اچانک ایمان کی درد بھری آواز سن کر وہ رک گیا۔ اس کے فون پر نصب سافٹ ویئر نے اسے خبردار کیا کہ ایمان رو رہی تھی۔

گونار نے اس کے رونے کی آواز سنی اور اس کے دل میں بے چینی پھیل گئی۔ ”پہلے میرے سوتیلے باپ نے میری عصمت دری کی،“ ایمان کی آواز نے اس کی روح میں ہلچل مچادی۔ گونار کا دل جیسے چور ہو گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا سوتیلے باپ کون تھا یا اس نے کیا ظلم کیا تھا، مگر اس بات کا اندازہ ضرور ہو چکا تھا کہ وہ زخم گہرے تھے۔

ایمان جہاں نیم مدہوش حالت میں بیٹھی تھی، اس کے قریب ایک پرانی، زنگ آلود ڈرائی دھری تھی، جس پر بے دھیانی سے پڑا موبائل دراصل اُس کا ہر حرکت اور گفتگو گونار تک پہنچا رہا تھا۔ وہ معمولی سی شے، جو ظاہرًا غیر اہم دکھائی دیتی تھی، درپردہ ایک خاموش جاسوس کی طرح ہر لمحے کی نگرانی کر رہی تھی۔

۔۔ ”پھر اس سوتیلے بھائی نے مجھے پامال کیا، میں تیرہ برس کی عمر میں دوبار حاملہ ہوئی دونوں بار میرا پیٹ چیرا گیا۔“ ایمان کی اس بات نے گونار کو جیسے جنون میں مبتلا کر دیا۔ اس نے مٹھیاں بھیجنے لیں، اس کی

رگوں میں خون جوش مارنے لگا۔ وہ ایمان کے ان ظالموں سے نفرت کرنے لگا تھا، اس کے باپ سے، اس کی سوتیلی ماں سے، اور ان سب سے جنہوں نے ایمان کو برباد کیا تھا۔

گو نار کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان سب کو نیست و نابود کر دے، ان کی زندگیوں کو برباد کر دے، جیسے انہوں نے ایمان کی زندگی کو برباد کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایمان کو ان سے نجات دلائے، ان ظالموں سے بدلہ لے۔

ایمان کی چیخ نے اس کی ہمت کو مزید بڑھا دیا، ”کیا کوئی ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہو؟“ وہ دل سے کہنا چاہتا تھا، ”میں تم سے محبت کرتا ہوں، ایمان۔“ مگر ایمان نہیں جانتی تھی کہ سویڈن میں ایک اجنبی لڑکا اس کی محبت میں مبتلا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کی خاطر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔

ایمان نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اوپر کی طرف دیکھا اور سرگوشی کی، ”یا اللہ، یہ میرا امتحان ہے۔“ اس نے ٹوٹے دل سے کہا، ”میں نے اپنا معاملہ تیرے سپرد کر دیا ہے۔ میں تجھ سے انصاف مانگتی ہوں۔“۔

اُس کی آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا، مگر دل میں کرب چھپا ہوا تھا۔ ”ان گیلی آنکھوں کے ساتھ میں تجھ سے مانگتی ہوں کہ تو انہیں دنیا میں سکون دے، مگر آخرت میں ان کے لیے بدترین عذاب لکھ دے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنے اعمال کے بدلے سزائیں بھگتیں، کہ ان کی رو حیں کانپ اٹھیں۔“ اس نے اپنی بد دعا کو دل کی گہرائیوں سے نکال کر آسمانوں کی طرف بھیجا، جیسے وہ یقین رکھتی ہو کہ اللہ اس کی فریاد کو ضرور سنے گا۔

- ”یہ میری بددعا ہے، یا اللہ، ”اُس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا، ”اور مجھے یقین ہے کہ تُو مجھے انصاف دے گا۔ تُو میرے آنسوؤں کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔“

گونار کی آنکھوں میں خون اتر اہوا تھا، اور ان کی سوجن اس کے دل میں اٹھنے والے طوفان کی عکاس تھی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس ٹکڑوں میں بکھر گیا، مگر وہ جیسے اس درد سے بے نیاز تھا۔

کوئی زخم، کوئی خون، کوئی تکلیف اس کے دل کی افیت کے سامنے ہیچ تھی۔ وہ ایک شاولن راہب تھا، جسمانی مشقت کا عادی، مگر یہ جذباتی کرب اس کے صبر کی تمام حدیں پار کر چکا تھا۔ ایمان کی سسکیاں، جو اس کے فون سے ابھرتی تھیں، جیسے اس کے دل کو نوچ رہی تھیں۔

گونار نے ایک مدہم سی سرگوشی میں کہا، ”ایمان، اگر یہ تمہاری دعا ہے کہ اللہ تمہارے ظالموں کو آخرت میں رسوا کرے، تو میں تمہاری اس خواہش کو تسلیم کرتا ہوں۔ میں خود بھی انہیں نیست و نابود کر سکتا تھا، مگر تمہاری رضا کو مقدم جانا۔ اگر تم اللہ سے چاہت کرتیں کہ وہ ان کی زندگیوں کو جہنم بنا دے، تو اللہ ان پر مجھے عذاب بنا کر نازل کرتا۔ لیکن میں تمہاری دعا کے مطابق خاموش ہوں۔“

اس کی آواز لرز رہی تھی، محبت اور درد کا امتزاج تھا۔ ”میں بہت جلد تمہارے پاس آؤں گا، ایمان۔ فکر نہ کرو، خوف نہ کرو۔ امید مت ہارو۔ میری محبت تمہارے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ ہے۔“

ایمان کی کانپتی ہوئی آواز دوبارہ ابھری۔ اس کے لہجے میں مایوسی اور تلخی کا گہرا سایہ تھا۔ ”کاش میں اسی دن مر جاتی جب مولوی سرور کا شاگرد مجھے کالے جادو کی نذر کر رہا تھا۔ لیکن اس مرنے کا کیا فائدہ؟ میں موت

کی آرزو بھی نہیں کر سکتی، اس حوالے سے سوچ بھی مجھے گوارا نہیں۔ میں مرنا نہیں چاہتی جب تک میں اسلام کی سچائی، نجات اور سکون نہ پاؤں۔ جب تک میں اللہ کو نہ پاؤں، جو سب سے زیادہ رحیم، سب سے زیادہ محبت کرنے والا اور سب سے زیادہ منصف ہے۔”

آنسو بے اختیار اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے، دل کی گہرائیوں سے سسک کر اس نے کہا، ”اللہ الرحمن ہے تو الجبار بھی ہے، القہار بھی ہے، اور ذوالجلال بھی ہے۔ وہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے، مگر جب انسان سرکشی اور گناہوں میں مبتلا ہو جائے، تو پھر وہ اپنا قہر و جلال بھی نازل کرتا ہے۔ اُس نے بھی تو سرکشوں کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے، تو میں کیوں معاف کروں؟”

گونہگار کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔ اس نے اپنی آستین سے انہیں صاف کیا اور نرم لہجے میں کہا، ”تمہیں وہ سب کچھ ملے گا، ایمان۔ تم اپنے رب کو پاؤ گی، اور وہ تمہیں تمہارے صبر کا صلہ دے گا۔ تم مجھے بھی پاؤ گی، اور میں تمہاری ہمت اور خوبصورتی کی قدر کروں گا۔ تمہیں خوشی ملے گی، ایسی خوشی جو تمہارے تمام دکھوں اور غموں کو بھلا دے گی۔ تمہیں زندگی ملے گی، اور تم اسے اس شان سے جیو گی جس کا تم حق رکھتی ہو۔ ایمان، تمہیں وہ سب کچھ ملے گا۔ اور میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔”

گزشتہ منظر کی بازگشت:-

ایمان اپنے گھر کے باہر روڈ پر کھڑی تھی، گویا وہ ایک بنجارن ہو جس کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو۔ اُس کی عمر تیرہ برس تھی، لیکن اس مختصر زندگی میں وہ وہ سب دکھ سہ چکی تھی جو لوگ عمریں گزار کر بھی نہ دیکھتے۔

اُس کی ماں، آمنہ، اُس پر خشمگین نگاہیں ڈالے کھڑی تھی، آنکھوں میں سردی اور سفاکی بھرے۔ آمنہ نے زہر آلود لہجے میں تھوک کر کہا، ”تم کسی سے کچھ نہیں کہو گی کہ آصف نے تمہارے ساتھ کیا کیا، یا تمہارا حمل میں نے کیسے گرایا تھا۔“

اُن کے قریب ایک درخت کی اوٹ میں میکائیل کھڑا تھا، ایمان کا سوتیلا بھائی، جو پندرہ سال کا تھا۔ اُس کی چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی، جیسے ایمان کی اذیت اُس کے لیے تفریح کا سامان ہو۔

ایمان کی روح دکھ اور بے بسی میں گھلی جا رہی تھی، اُس کی شرم اور ذلت نے اُسے گہرے گھاؤ دیے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں دفن ہو جائے، لیکن وہ جانتی تھی کہ مرنا اس کے لیے فرار کا راستہ نہیں تھا۔

اُس نے ماں کی طرف دیکھا، شاید کہیں سے تھوڑی سی شفقت، تھوڑا سا رحم یا محبت مل جائے، مگر وہاں نفرت کی بخ بستہ دیوار تھی۔

۔ ”تم ماں کے نام پر دھبہ ہو،“ ایمان نے لرزتے لبوں سے کہا، اُس کی آواز میں گہرا کرب تھا۔ لیکن آمنہ نے ایک لمحے کو بھی دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ پہلے ہی آصف کے ساتھ مل کر سب کچھ طے کر چکی تھی، وہ ہی آصف جو ایمان کے بچپن سے اُس کے ساتھ حیوانیت کرتا آیا تھا۔

تیرہ سال کی نحیف و نزار ایمان جب اندر داخل ہوئی تو اسے خالدہ کا سامنا کرنا پڑا، جو ایک جابر اور ظالم عورت تھی۔

اُس نے ایمان کو ہمیشہ نوکرانی کی طرح برتا، نہ کبھی اُس کو سکون دیا، نہ آرام، نہ کوئی ہمدردی۔ وہ بھی ایمان کی زندگی کو عذاب بنانے والوں میں شامل ہو چکی تھی، اس پر ہاتھ اٹھاتی، گالیاں دیتی۔ اُس کی تلخ روح نے ایمان کے وجود کو اور بھی کچل ڈالا تھا، جیسے کوئی کانٹے دار جھاڑیاں ہوں جو ہر قدم پر چبھتی ہیں۔

خالدہ نے ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ کہا، ”آجا میڈم، کام شروع کر، باجی!“ اُس نے کپڑا اُس کے چہرے پر پھینکا اور فرش کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس گندگی کو صاف کر، اور شکایت کرنے کی جرأت مت کرنا۔ تجھے شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم نے تجھے یہاں رہنے دیا، ورنہ تجھے کب کاسٹرکوں پر پھینک دیا جاتا۔“ ایمان کپڑا اٹھا کر خاموشی سے صفائی کرنے لگی۔ اُس کی سانسیں بھاری تھیں، وہ بیمار تھی، تھکی ہوئی تھی، ناامید تھی۔ اُس کے دل میں صرف تاریکی تھی، وہ تنہا تھی، جیسے کوئی بے آسرا پرندہ جو آندھی میں اپنا آشیانہ کھو بیٹھا ہو۔

اُس کے پاس کوئی ماں، کوئی باپ، کوئی دوست، کوئی ہمدرد نہ تھا۔ اُس کے پاس محبت کا کوئی سایہ، بھروسے کا کوئی ہاتھ، یا اعتماد کا کوئی ستون نہ تھا۔ اُس کی زندگی میں کوئی روشنی، کوئی سکون، کوئی خوشی باقی نہ تھی۔

اُس کے دل میں صرف درد تھا، آنکھوں میں صرف آنسو، لبوں پر صرف بددعائیں تھیں۔ اُس کے پاس بس دعا کی آخری اُمید باقی تھی، جو شاید قبول ہو جائے یا نہ ہو۔

میکائیل اکیلا کمرے میں تھا، لیپ ٹاپ اس کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ باہر ہر کوئی اپنے معمولات میں مصروف تھا، اور گھر کی خاموشی نے اس کے دل میں عجیب سی بے چینی پیدا کر دی تھی۔ وہ ویب سائٹس پر بھٹکنے لگا جہاں حرام اور ناپاک مناظر دکھائے جا رہے تھے، جن کی بدولت انسان اپنے حقیقی رشتوں کا تقدس بھول جاتا ہے۔

یہ وہ چیزیں تھیں جنہوں نے لوگوں کی روحوں کو آلودہ کر دیا تھا، اور ان کے اندر موجود انسانیت کو ختم کر دیا تھا۔

یہ مواد شیطانی قوتوں (ایلو میناتی) کا ہتھیار تھا، جو دلوں کو تاریکی کی طرف دھکیلنے کے لیے جان بوجھ کر تیار کیا گیا تھا۔

۔ (یہ شیاطین اپنی مکروہ سازشوں کے تحت ایسے مواد تخلیق کرتے ہیں جن کا واحد مقصد انسان کو اُس کی فطری انسانیت سے دور کر کے حیوانیت کی پستیوں میں گرانا ہے۔ یہ فتنہ انگیز فلمیں اور تصاویر انسان کے دل و دماغ پر ایسی ضرب لگاتی ہیں کہ وہ اپنی تمیز اور اخلاقیات کو پس پشت ڈال کر، حیوانی جبلتوں کے زیر اثر اعمال کرنے لگتا ہے۔

یہ شیطانی حربے انسان کو جانوروں کی مانند بے حس و بے فکر بناتے ہیں، تاکہ وہ اپنے نفس کی پیروی میں مبتلا ہو جائے اور حق و باطل کا فرق مٹا دے۔

شیطان نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انسانوں کو گمراہ کرے گا، انہیں دنیاوی لذتوں میں الجھا کر ان کے دلوں میں خدا کے خوف اور آخرت کی فکر کو مٹا دے گا۔ آج یہ ہی وعدہ پورا ہوتا دکھائی دیتا ہے، جہاں شیطانی طاقتیں انسانوں کو حیوانیت کی راہ پر ڈال کر انہیں وہ اعمال کرنے پر مجبور کرتی ہیں جن سے خود شیطان مسرور ہوتا ہے۔

یہ مواد نہ صرف معاشرتی رشتوں کے تقدس کو پامال کرتا ہے، بلکہ انسانی عقل و شعور کو اس حد تک متاثر کرتا ہے کہ وہ اپنی فطری فطانت کو کھودیتا ہے۔

شیطان کا مقصد یہ ہی ہے کہ انسان اپنے کردار، ایمان اور عقل و دانش کو ترک کر کے ایسے کاموں میں ملوث ہو جائے جن سے وہ خود کو برباد کر دے اور اپنی حقیقت کو بھول کر جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے لگے۔

یہ ہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان اپنی معراج سے گر کر شیطان کا آلہ کار بن جاتا ہے، اور شیطان اپنے دعوے میں سرخرو ہو کر اللہ کے سامنے انسان کی کمزوریوں کا مذاق اڑاتا ہے۔

ان گمراہ کن فلموں کے عنوانات، جو خاندان کے مقدس رشتوں کو داغدار کرتے ہیں، میکائیل کے ذہن میں ایک زہر کی طرح سرایت کر چکے تھے۔ اس کا دل بھٹک چکا تھا، اور وہ ان چیزوں کا شکار ہو چکا تھا۔

ایک ویڈیو نے اس کے اندر سوئی ہوئی برائی کو جگا دیا۔ وہ ذہنی طور پر کمزور ہوتا جا رہا تھا، اور اب اس کی سوچیں اس کی اپنی سوتیلی بہن ایمان کی طرف مڑنے لگی تھیں۔

ایمان، جو اپنی زندگی کی آزمائشوں سے گزر رہی تھی، اسے دنیا میں کہیں بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں وہ ان دکھوں کا سامنا کر رہی تھی جن کا اندازہ لگانا بھی دشوار تھا۔ سوتیلے باپ کے ظلم اور اپنی ماں کی بے رخی نے اسے بالکل تنہا کر دیا تھا۔

میکائیل کا دل مزید تاریک ہو چکا تھا۔ وہ ایمان کے کمرے میں گیا، جہاں وہ فرش پر بیٹھی رو رہی تھی۔ میکائیل نے اس کے آنسوؤں کی پرواہ کیے بغیر اپنی ناپاک نیت ظاہر کی۔ ”کیا تم اس لیے رو رہی ہو کہ تمہارے سوتیلے باپ نے تمہارے ساتھ ظلم کیا؟“ اس کی آواز میں ایسی برائی چھپی تھی جس نے ایمان کو خوف میں جکڑ لیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اس کا جسم لرزنے لگا۔

میکائیل کی ناپاک نیتیں عیاں ہو چکی تھیں، اور اس نے ایمان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بری نیت سے کہا، ”چلو، میرے ساتھ چلو، کوئی کچھ نہیں جان پائے گا۔“ ایمان نے فوراً خطرہ بھانپ لیا اور دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی، لیکن میکائیل کی شیطانی حرکتوں نے اسے روک دیا۔ ایمان کو لگا جیسے پوری دنیا اس پر ٹوٹ پڑی ہو۔ اسے بچاؤ کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔

ایمان بے ہوش ہو چکی تھی، اور میکائیل اپنے ناپاک ارادے پورے کر چکا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے وہاں سے چلا گیا، اور اس کے دل میں کسی قسم کا خوف یا ندامت نہیں تھی۔ وہ ایک ایسی راہ پر تھا جہاں اللہ کا خوف دلوں سے نکل چکا تھا، اور انسانیت دم توڑ چکی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں عقل، قلب اور روح کے ساتھ ساتھ ایک اور نہایت اہم جوہر۔ ”نفس“ کو ودیعت فرمایا ہے، جو انسانی فطرت کا ایک مستقل حصہ ہے۔

اگرچہ نفس بظاہر ایک ہی ہے، تاہم اس کی مختلف کیفیات اور درجات ہیں، جن کی بنا پر اس کی سات اقسام ظاہر ہوتی ہیں۔ ہر قسم کے نفس کی اپنی جداگانہ صفات اور اثرات ہوتے ہیں، جو انسانی طبعیت، مزاج، عادات و خصائل، اور اخلاق و اعمال پر اپنا نقش ثبت کرتے ہیں۔

نفس کی چار بنیادی جبلتیں ہیں جو اس کی فطری خواہشات اور تقاضوں کی اصل جڑ ہیں:-

ضعف: یہ انسانی خاکی وجود کی خشک مٹی کا فطری تقاضا ہے، جس سے جسمانی کمزوری اور ناتوانی پیدا ہوتی ہے۔

بخل: یہ تر مٹی کی فطرت کا لازمی نتیجہ ہے، جو انسان کو خود غرضی اور کنجوسی کی طرف مائل کرتی ہے۔

شہوت: اس کی بنیاد کچھ پر مبنی ہے، جو انسان کے اندر نفسانی خواہشات اور لذت طلبی کو بھڑکاتی ہے۔

جہالت: یہ خشک اور سوکھی مٹی کی خاصیت ہے، جو عقل و فہم کی کمی، نا سمجھی اور لاعلمی کی حالت کو فروغ دیتی ہے۔

نفس کے تمام اخلاقی کمزوریوں اور انحرافات کی دو بنیادی جڑیں ہیں: اول غصہ اور جلد بازی، دوم طمع اور حرص۔ نفس کا غصہ دراصل اس کی جہالت کا نتیجہ ہوتا ہے، جبکہ طمع اور حرص کی جڑ نفس کی کمینگی اور دنیاوی لذتوں کی بے انتہا طلب میں پوشیدہ ہے۔

نفس دو طرح کے افعال میں ملوث ہوتا ہے: ایک معصیت اور نافرمانی، دوسرا دل کی کینہ پروری اور بری خصلتیں جیسے تکبر، حسد، بخل، اور غصہ۔ یہ وہ اعمال اور باتیں ہیں جو شرعاً اور عقلاً ناپسندیدہ اور قابل مذمت ہیں۔

نفس کی فطرت میں جو برائیاں پوشیدہ ہیں، وہ ”دیکھنا، بولنا، اور کرنا“ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں، اور ہر برائی کی جڑ کسی نہ کسی قسم کے نفس کی فطرت میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

میکائیل نفس کی پہلی جڑ یعنی دیکھنے کی برائی کا شکار ہو چکا ہے، جس کا تعلق نفسانی خواہشات کو بھڑکانے والے مناظر سے ہے۔

میرب مویز نفس کی دوسری جڑ یعنی کنجوسی میں مبتلا ہے، جو تر مٹی کی فطرت کے عین مطابق بخل و خود غرضی کو فروغ دیتی ہے۔

آصف میکائیل نفس کی تیسری جڑ یعنی شہوت کا شکار ہے، جو یکچڑ کی مٹی کی خاصیت کے تحت نفسانی لذتوں اور جسمانی خواہشات کو غالب کرتی ہے۔

جہالت، جو نفس کی چوتھی جڑ ہے، خالدہ، آمنہ، جتوئی، اور میرب مویز میں عیاں ہے، کیوں کہ ان میں علم و حکمت کی کمی اور فہم و فراست کا فقدان نمایاں ہے۔

نور العین حسد و کینہ پروری کی مریض ہے، جو دل میں بغض، نفرت اور رقابت کو جنم دیتا ہے، اور انسان کو ہمیشہ اندرونی بے چینی اور مایوسی کی دلدل میں دھکیل دیتا ہے۔

یہ ہی وہ برائیاں ہیں جنہوں نے ان افراد کو اپنے قابو میں کر کے شیطانی راہوں پر ڈال دیا ہے، اور یہ ہی شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے جو انسان کو اس کی اصل سے دور کر کے اسے پستی میں گرا دیتا ہے۔

کچھ دنوں بعد کمرے کی فضاء میں ایک وحشیانہ تناؤ چھایا ہوا تھا۔ خالدہ اور میکائیل آمنے سامنے بیٹھے تھے، ایک عجیب خاموشی کے درمیان خفگی اور مایوسی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ اچانک، خالدہ نے غصے سے میکائیل

کے سر پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور چبھتے ہوئے الفاظ میں بولی، ”تمہیں اور کوئی نہیں ملی تھی؟ وہ ہی منحوس، بے غیرت ملی تھی اس سب کے لیے!“۔

میکائیل، جو اپنی ماں کے غضب سے ہمیشہ لرزتا تھا، پلٹ کر ڈرتے ہوئے بولا، ”موم، اس کے سوتیلے باپ نے بھی تو اس کے ساتھ وہ ہی کیا تھا۔“۔

خالدہ کی آنکھوں میں نفرت کی چمک پیدا ہوئی۔ اُس نے سفاکی سے میکائیل کی جانب دیکھا اور حقارت بھرے لہجے میں کہا، ”تو پھر؟ ہم اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کر سکتے تھے! ان لوگوں کو تباہ کرنے کے لیے، ان کا کاروبار برباد کرنے کے لیے۔ لیکن تم نے کیا کیا؟! اب سنو، وہ کمبخت کتیا پھر سے حاملہ ہے، اور اسے اس بات کی خبر تک نہیں!“۔

میکائیل کا رنگ پھیکا پڑ گیا، وہ کپکپاتے ہوئے بولا، ”ہاں، موم۔ کچھ کرو، مجھے جیل نہیں جانا۔“۔

خالدہ نے کچھ لمحوں کے لیے توقف کیا۔ اُس کے اندر کی خباثت اور شیطانی عقل حرکت میں آچکی تھی۔ ایک خطرناک مسکراہٹ اس کے چہرے پر رقص کرنے لگی۔ ”تم نے کہا تھا، تمہارا ایک دوست ہے جو پیسوں کے لیے لوگوں کو ختم کرتا ہے؟“ خالدہ کی آواز میں مکرو فریب چھپا ہوا تھا۔

میکائیل نے ہچکچاتے ہوئے سر ہلایا، ”ہاں، موم۔ ہے، مگر اُس سے کیا کروانا ہے؟“۔

خالدہ کی آنکھوں میں شیطانی شعور کی روشنی اور بھی گہری ہو گئی۔ وہ ہونٹوں کو کاٹتے ہوئے بولی، ”آج رات اُسے بلاؤ میرے پاس اس کے لیے کام ہے۔“ اُس کی مسکراہٹ اور بھی مکروہ ہو گئی۔

اسی لمحے خالدہ کی آنکھوں میں بے رحمی کی ایک چمک بھری روشنی چمکی، جیسے کسی اندھیری گلی میں چور اچانک اپنی اصلیت آشکار کرتا ہے۔ اُس نے اندر ہی اندر ایک خفیہ خوف کو دل میں دفنایا اور سرد مہری سے خود کو یاد دلایا، ”مجھے ایمان کو راستے سے ہٹانا ہو گا۔ اگر وہ زندہ رہ گئی اور ڈی این اے رپورٹ سامنے آ گئی، تو میرا بھانڈا بھی پھوٹ سکتا ہے کہ میکائیل جتوئی کا بیٹا نہیں ہے۔“

خالدہ کے ذہن میں ابلیسی شاطری پوری قوت سے گردش کرنے لگی۔ ”اگر یہ راز کھل گیا تو میں دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ کیسے بتاؤں گی کہ میرا جتوئی کے سوا کسی اور شخص سے بھی خفیہ تعلق تھا؟ میں نے جتوئی کو دھوکہ دیا؟“ وہ لرزاں لہجے میں خود سے ہمکلام تھی۔

اس نے گہری سانس لی اور دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا، ”اب ایمان کو ختم کرنا ہی آخری حل ہے، ورنہ سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔“

حقیقت یہ ہی تھی کہ میکائیل جتوئی کا بیٹا نہیں تھا۔ خالدہ نے چالاکی سے اپنی بساط بچھائی تھی، ایک ایسا کھیل جس میں اس کا جتوئی کے علاوہ ایک اور مرد سے خفیہ تعلق تھا۔

وہ تعلق جو نہ صرف شرمناک تھا بلکہ مکمل طور پر گناہ کی دلدل میں دھسنے کے مترادف تھا۔ خالدہ نے اپنی زندگی کو دوہری چالوں کا مرکز بنا لیا تھا، ایک طرف جتوئی کو بس ایک احتیاطی پتے کی مانند استعمال کر رہی تھی، اور دوسری طرف وہ شخص تھا جس کے ساتھ وہ تعلق میں تھی۔

خالدہ کے اندر چھپی یہ مکاری اس کی عزت اور اسلام کی تعلیمات کے برخلاف تھی۔ اس نے نہ صرف اپنے آپ کو جتوئی کے ساتھ حرام تعلقات میں مبتلا کر لیا تھا بلکہ جتوئی اس سے مکمل بے خبر تھا۔

وہ تو اسے مخلص سمجھتا تھا، اس کی وفاداری پر یقین رکھتا تھا، جبکہ وہ اس کی پیٹھ پیچھے دھوکے کی کڑیاں بنتی جا رہی تھی۔

اس دوران، جتوئی کی آمنہ سے شادی کی بات چل رہی تھی۔ جتوئی نے اپنے باپ کو زیر کرنے کے لیے ایک شیطانی چال چلی۔ اُس نے کہا کہ اگر وہ شادی سے پہلے باپ بن گیا، تو اس کا باپ عزت بچانے کے لیے مجبوراً اس کی شادی خالدہ سے کر دے گا۔

مگر قدرت کا نظام کچھ اور تھا، جتوئی کے والد نے الٹا کہہ دیا کہ اگر وہ میکائیل اور خالدہ کو اپنائے گا تو وہ اسے جائیداد سے عاق کر دے گا۔

جتوئی نے خالدہ پر جھوٹ باندھا کہ اس نے اسقاطِ حمل کروالیا ہے، حالانکہ یہ سب جھوٹ تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ خالدہ نے جتوئی کو بری طرح دھوکا دیا تھا۔ جب دوسرے شخص کو پتہ چلا کہ خالدہ کے بطن میں پلنے والا بچہ اسی کا ہے، تو وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

مگر خالدہ کے پاس جتوئی کا فریب بچا ہوا تھا، وہ اسے باآسانی اپنی چالوں میں الجھا کر رکھے ہوئی تھی۔

یوں جتنی سالوں سے اس وہم کا شکار تھا کہ میکائیل اس کا بیٹا ہے، جبکہ حقیقت کچھ اور تھی۔ وہ اتنے برسوں سے کسی اور کے بچے کی پرورش کر رہا تھا، اور اسے اس بات کا ذرہ برابر بھی ادراک نہ تھا۔

خالدہ کے باپ کو جب یہ علم ہوا کہ اس کی بیٹی شادی سے پہلے ماں بننے والی ہے، تو وہ شرم و ندامت سے ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر مر گیا۔

اور وہ گلدان جو ایمان سے ٹوٹا تھا اور خالدہ نے اسی بہانے اسے گھر سے نکالا تھا، درحقیقت اس کی کہانی بالکل مختلف تھی۔ وہ گلدان خالدہ کے باپ کا عطا کردہ نہیں تھا، بلکہ اس کے پیچھے ایک اور ہی راز پوشیدہ تھا۔

، دراصل اس کا تعلق خالدہ کے ماضی کے عاشق سے تھا، جو اس کے ساتھ گناہ کی نشانی کے طور پر محفوظ تھا۔ جو شروعات میں ایمان نے جو کہا تھا، وہ گہرائی میں حقائق سے بھرپور تھا۔ کہ خالدہ کے باپ کو کم از کم اس گناہ کا عذاب ضرور ملے گا کہ اس نے خالدہ جیسی بیٹی کو جنم دیا۔

جانے کتنے سالوں تک شادی کی کوئی صورت نہ بن پائی، جتنی کے دل میں آمنہ کے لیے نہ جانے کیوں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے طلاق نہ دے، بلکہ اس کے نام کے ساتھ باندھ کر رکھے جیسے کوئی بوجھ ہو۔ نہ اسے بیوی کے حقوق عطا کرے اور نہ ہی رشتہ ختم کرے۔

لیکن آمنہ نے اپنے حق کے لیے جدوجہد کی اور بالآخر خلالے کر آزاد ہو گئی۔ یوں جب ایمان پانچ سال کی ہوئی اور میکائیل سات سال کا، جتوئی نے خالدہ سے نکاح کر لیا جب کہ آمنہ نے آصف سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔

حقیقت یہ تھی کہ جس ایمان کو خالدہ سالوں سے برا بھلا کہتی آئی تھی، وہ دراصل خود ہی تمام بدکرداریوں کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ ایمان کو وہ زانیہ اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر ذلیل کرتی رہی، مگر آئینے میں اصل چہرہ اس کا اپنا تھا، جو وہ ایمان کے خلاف اپنے الفاظ میں دیکھتی اور کہتی تھی۔

یہ ایک تاریک اور بے صد ارات تھی، ہوا میں سردی کی نمی اور سکوت تھا۔ گھر کے تمام افراد نیند کی گہری وادی میں غرق تھے، سوائے دو روحوں کے جو برائی کے گرداب میں غرق ہو چکی تھیں خالدہ اور میکائیل۔

ان کے ذہنوں میں ایک شیطانی منصوبہ گردش کر رہا تھا، ایک ایسا منصوبہ جس کی تکمیل کے لیے انہوں نے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر ایک قاتل کی خدمات حاصل کی تھیں۔

خالدہ اپنی خباثت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کمرے سے چپکے سے باہر نکلی، اُس نے سرگوشیوں کے سائے میں قاتل کے لیے دروازہ کھولا۔ قاتل، جو کہ سیاہ لباس میں ملبوس ایک اندھیرے میں ڈوبا سا یہ معلوم ہوتا تھا، آہستہ سے اندر داخل ہوا۔

اُس کے ہاتھ میں چمکتا ہوا خنجر، جیسے کوئی زہر آلود سانپ اپنے شکار کی تلاش میں ہو۔ خالدہ نے سرگوشی میں اسے ایمان کے کمرے کا راستہ دکھایا، اور وہ بغیر کوئی آواز کیے آگے بڑھ گیا، جیسے موت خود چلتی ہوئی ایمان کے قریب جا رہی ہو۔

کمرے میں زیرو واٹ کا کمزور بلب ایک مدھم، زرد روشنی پھیلا رہا تھا، جو ایمان کی معصومیت پر آخری لمحوں کی روشنی ڈال رہا تھا۔ قاتل نے خاموشی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا، اُس کی نظریں اُس بے خبر لڑکی پر جمی تھیں جو نیند کے آغوش میں مطمئن لیٹی ہوئی تھی۔

اُس نے دھیرے سے بیڈ کے قریب پہنچ کر خنجر کو اوپر اٹھایا، جیسے کوئی بے رحم جلاد اپنے شکار پر آخری وار کرنے والا ہو۔

ایک لمحہ ایسا آیا جب خنجر ایمان کے نازک جسم کے قریب پہنچا، اور پھر اچانک قاتل نے خنجر کو زور سے اُس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ ایمان نے شدید درد اور دھچکے کے ساتھ اپنی آنکھیں کھولیں۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کی لہریں تیر رہی تھیں۔

اُسے اپنے جسم پر گرم اور چپچپا مادہ محسوس ہوا، جیسے اُس کے اندر سے زندگی کا سیلاب نکل رہا ہو۔ اُس نے دھندلی روشنی میں اپنی سفید چادر کو دیکھا، جو اب لال خون سے تر ہو چکی تھی، اور بیڈ پر گرتے خون کے قطرے موت کی بے رحمی کا منظر پیش کر رہے تھے۔

ایمان کے دل و دماغ میں ناقابل برداشت تکلیف نے طوفان برپا کر دیا تھا، اُس نے بے اختیار اپنے سینے اور پیٹ میں جلن اور درد محسوس کیا۔ اُس کے سانس لینے میں رکاوٹ آرہی تھی، اُس نے چیخنے کی ناکام کوشش کی لیکن اُس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

اُس نے اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی، مگر اُس کے جسم نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، وہ مفلوج ہو چکی تھی۔ اُس کے سامنے خنجر بار بار آسمان کی طرح اوپر اُٹھتا اور پھر زور سے اُس کے جسم میں اترتا، ہر وار اُس کی زندگی کو مزید قریب کر رہا تھا۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی، جیسے اُس کی زندگی کا چراغ مدھم پڑ رہا ہو۔ اُس نے آخری کوشش کی، مگر اُس کے جسم نے مکمل طور پر ہار مان لی تھی۔ قاتل کا خنجر آخری وار کر کے اُس کی زندگی کی ڈور کاٹ چکا تھا۔

دوسری طرف، خالدہ کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی، اُس کے چہرے پر سفاکی اور وحشت کی چمک تھی۔ اُس کی سانسوں میں خوشی کی سرگوشیاں تھیں۔

اُس نے ایمان کو قتل کروا دیا تھا، اُس لڑکی کو جس نے اُس کی زندگی میں اتنی مشکلات پیدا کی تھیں، جس نے اُس کی طاقت کو چیلنج کیا تھا، اور جس کی موجودگی اُس کے لیے ایک خطرہ بن چکی تھی۔

خالدہ کے دل میں کوئی پچھتاوا نہ تھا، کوئی شرمندگی یا ندامت نہ تھی۔ اُس کے چہرے پر سکون کی ایک عجیب سی کیفیت تھی، جیسے اُس نے ایک بڑا بوجھ اتار پھینکا ہو۔

ایمان کی موت اُس کے لیے ایک فتح تھی، ایک ایسی کامیابی جس کے بعد اُس نے خود کو محفوظ اور فاتح محسوس کیا۔

خون کے چھینٹوں سے تر کمرے میں موت کی سرد ہوا چل رہی تھی، مگر خالدہ کے چہرے پر ایک ابلیسی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

...°...

خالدہ دھیرے سے اپنے کمرے میں واپس آئی جہاں میکائیل بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔ اس کی آنکھیں خوف اور تجسس سے بھری ہوئی تھیں جب اُس نے خالدہ کے ہاتھ میں خون آلود چاقو دیکھا۔ میکائیل نے کپکپاتے لہجے میں پوچھا، ”کیا کام ہو گیا؟“۔

خالدہ نے سرد نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور سنگدلانہ انداز میں سر ہلایا۔ ”ہاں، سب ختم ہو گیا ہے۔ وہ کمزور تھی، لاچار اور بے وقعت۔ اُس کا وجود ویسے بھی بوجھ تھا، اور آج وہ بوجھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔“۔

میکائیل کی آواز میں بے قراری تھی، ”کیا میں دیکھ سکتا ہوں؟ کیا میں دیکھ سکتا ہوں کہ اس نے اُس کے ساتھ کیا کیا؟“۔

خالدہ کے ہونٹوں پر ایک سخت مسکراہٹ ابھری۔ ”نہیں، تمہیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اُس کی حالت تمہارے دیکھنے کے لائق نہیں رہی۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے، اور تمہیں اُس کی موت کا سامنا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ختم ہو گئی، اور وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔“۔

خالدہ نے آگے بڑھ کر میکائیل کو گلے لگایا، اُس کے کان کے قریب سرگوشی کی، ”ہم آزاد ہو چکے ہیں، میکائیل۔ اب کوئی ہمیں نہیں روک سکتا۔ اب کوئی نہیں جو ہمیں سزا دے سکے۔ ہم نے اپنے راستے کا ہر کاٹا ختم کر دیا ہے۔“۔

میکائیل کی سانسیں تیز ہو گئیں، اُس نے دھیمی آواز میں کہا، ”ہاں، آزاد... ہم آزاد ہیں۔“۔

دونوں نے ایک لمحے کے لیے خاموشی میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر اچانک اُن کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جیسے ایک ہی پل میں سب کچھ بھول گئے۔ ایمان کی معصومیت، اُس کا خون بہنا، اُس کی درد بھری چیخیں، ہر چیز جیسے اُن کی خود غرضی کے اندھیرے میں ڈوب گئی۔

وہ دنیا کی ہر حقیقت سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ نہ اُنہیں اللہ کا خوف تھا، نہ عدل کی فکر، نہ عذاب کا ڈر۔ اُن کے ذہن میں بس اپنی شیطانی فتح کا نشہ تھا۔

لیکن جو وہ نہیں جانتے تھے، وہ یہ تھا کہ وہ حقیقت میں آزاد نہیں تھے۔ اُن کے دلوں پر گناہ کے سائے اور اُس کے اثرات چھائے ہوئے تھے۔ وہ خود کو فاتح سمجھتے تھے، لیکن درحقیقت وہ اپنی آخری ہلاکت کی جانب بڑھ رہے تھے، گناہ اور پستی کے راستے پر۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ اُن کے جرائم کی سزا ایک دن اُنہیں گھیر لے گی۔ وہ سمجھتے تھے کہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے، لیکن یہ صرف آغاز تھا۔

...°...

ایمان بھی کوئی عام لڑکی نہیں تھی، وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو اتنی آسانی سے موت کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے آبِ حیات پی رکھا ہو۔

مگر وہ اللہ، جس کی حکمتیں انسان کے ہر منصوبے سے بالاتر ہوتی ہیں، اس نے ایمان کی زندگی کو محفوظ رکھا تھا۔ خالدہ، مائیکل اور جتوئی کے مکروہ عزائم پر گویا اللہ نے پانی پھیر دیا تھا۔

یہ بات بھی واضح تھی کہ اگر وہ ایمان کو اسپتال نہ لے کر جاتے، تو چہ میگوئیاں شروع ہو جاتیں، سوالات اٹھتے۔ اسی خوف سے مجبور ہو کر انہیں ایمان کو اسپتال لانا پڑا، ورنہ ان کے اپنے منصوبے پر ہی سوالیہ نشان کھڑا ہو جاتا۔

جب وہ ایمان کو اسپتال لے کر پہنچے تو فضا میں عجیب سی خاموشی تھی، صرف ایمبولینس کے سائرن کی چیخنی ہوئی آواز ارد گرد کی ہوا میں لرزش پیدا کر رہی تھی۔ جتوئی کے چہرے پر کوئی پریشانی یا کچھتاوے کا نشان نہیں تھا، بلکہ وہ ایک خوبصورت طور پر گھڑی گئی کہانی کو اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے تھا۔

گاڑی جیسے ہی اسپتال کے گیٹ پر رکی، جتوئی نے ایک طویل سانس لیا، جیسے اپنی بدنیتی کو چھپانے کا آخری لمحہ ہو۔

”یہ چوروں کا کام تھا،“ جتوئی نے اپنے آپ کو یاد دہانی کراتے ہوئے کہا، جیسے یہ حقیقت ہو اور نہ کہ جھوٹ کا ایک گھڑا ہوا افسانہ۔

وہ جانتا تھا کہ اگر کچھ غلط ہوا تو اس کے پاس یہ کہانی موجود۔ تھی کہ ایمان پر چوروں نے حملہ کیا تھا، جب کہ یہ کام ان کا تھا جن کا مقصد محض ایمان کے پیٹ میں پلتے ہوئے اس ناپسندیدہ بچے سے نجات حاصل کرنا تھا۔

ایمبولینس جیسے ہی اسپتال کے گیٹ کے اندر داخل ہوئی، جتوئی نے گاڑی کا رخ گیٹ کی طرف موڑا۔ سائرن کی آواز فضا میں گونج رہی تھی اور خالدہ پچھلی سیٹ پر خاموشی سے بیٹھی تھی۔

اس کا چہرہ سپاٹ تھا، لیکن اندر ایک خوف اور بے چینی کا سمندر تھا، جیسے وہ جانتی ہو کہ کیا ہونے والا ہے۔

جتوئی نے ایک زہریلی نگاہ خالدہ پر ڈالی اور سرد لہجے میں بولا، ”نادان عورت! کیا تجھے یہ شعور نہیں تھا کہ ایمان ہمارے لیے کس قدر ناگزیر ہے؟ اس کے نام پر ساری جائیداد قائم ہے، اور تو نے اپنی جہالت سے سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا!“۔

خالدہ نے سسک کر بے بسی سے کہا، ”مجھے اس وقت کچھ سوچا ہی نہیں کہ کیا کروں۔“۔
لحظہ بھر میں خالدہ کا چہرہ غصے سے تن گیا، جڑے بھینچتے ہوئے وہ غرائی، ”دل تو کر رہا ہے تمہاری ماں کو قبر سے نکال کر سولی پر چڑھا دوں۔“۔

جتوئی اسے آنکھیں تنگ کر کے بولا، ”اپنی نالائقی کا خمیازہ میری ماں پر کیوں ڈال رہی ہو؟“۔
پھر جتوئی نے اپنی پلکوں کو مدھم انداز میں موند لیا، جیسے اپنے اندر کے طوفان کو قابو میں لانے کی سعی کر رہا ہو۔ چند لمحے خاموشی میں گزرے، پھر وہ اپنی تلخی کو دبائے ہوئے ایک مخملی مگر گہرے لہجے میں گویا ہوا،
۔

۔ ”فکر نہ کرو،“ اس کی آواز میں ایک ٹھنڈی سختی اور اطمینان تھا۔ ”یہاں اسپتال میں آمنہ کی دوست نور العین ہے، وہ سب کچھ سنبھال لے گی۔“۔

خالدہ نے ہلکے سے سر ہلایا، اس کے چہرے پر سختی اور بے پرواہی تھی، جیسے وہ صرف نتیجے کی منتظر ہو۔
”ہاں، جو کرنا ہے کر لو،“ خالدہ نے سرد لہجے میں کہا۔

وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ ایمان سے نہیں، بلکہ اس کے بطن میں پلنے والے بچے سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہو رہا تھا۔ وہ بچہ جس کا باپ میکائیل تھا، اور خالدہ اپنے بیٹے کی حفاظت کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔

ایمبولینس کے پیچھے گاڑی پارک کرتے ہی جنوئی اور خالدہ باہر نکلے۔ جیسے ہی ایمان کو اسٹریچر پر لایا گیا، نور العین اسپتال کے داخلی دروازے پر پہلے سے ہی موجود تھی، اس کے چہرے پر ایک جعلی مسکراہٹ سچی ہوئی تھی۔ اس نے ایمان کو فوراً پہچان لیا۔ یہ وہ ہی لڑکی تھی جس کا اس نے کچھ مہینے پہلے اسقاطِ حمل کیا تھا۔

وہ حیران تھی کہ ایمان ایک بار پھر یہاں کیوں ہے، لیکن اسے زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا۔ پیسے ملنے تھے، بس یہ ہی اہم تھا۔

نور العین نے سر ہلاتے ہوئے جنوئی کی طرف دیکھا، جو اسٹریچر کے پیچھے چل رہا تھا، اس کی آنکھوں میں برف جیسی ٹھنڈک تھی۔ ”تمہیں اپنا کام کرنا ہے اور ہمیں اس گندگی سے چھٹکارا دلانا ہے۔ ایمان کا زندہ

رہنا ضروری ہے ورنہ ہم پر سوال اٹھے گیں، لیکن یہ بچہ نہیں رہنا چاہیے، ”جتوئی نے اس سے سرگوشی میں کہا، اس کی آواز میں خطرناک حد تک بے رحمی تھی۔۔

اصل معاملہ محض سوالات کے اٹھنے کا نہ تھا، بلکہ اصل گتھی جائیداد کے پیچ و خم میں الجھی ہوئی تھی، کہ ایمان کے نام پر ساٹھ فیصد حصص تھے اور اس کے علاوہ دیگر قیمتی جائیدادیں بھی۔ قانون کے مطابق، اگر وہ چالیس سال کی عمر سے پہلے رحلت کر جاتی، تو یہ تمام جائیداد حکومت پاکستان کی ملکیت قرار پاتی۔

جتوئی اس قدر کوتاہ اندیش ہرگز نہ تھا کہ دولت و ثروت کو یوں آسانی سے ہاتھ سے جانے دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ دولت اس کے اختیار سے نکل جائے تو اس کی تمام منصوبہ بندی درہم برہم ہو جائے گی۔

نور العین ہلکے سے مسکرائی، ”یہ تو میرا پسندیدہ کام ہے، فکر نہ کرو، یہ ہو جائے گا۔“ اس نے ایک آنکھ مار کر جتوئی کی طرف دیکھا، جیسے سب کچھ معمول کا ہو۔

جتوئی نے آپریٹنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے نور العین کو ایک طرف کھینچ لیا، اس کی آنکھوں میں اضطراب کی جھلک تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، یہ یقینی بنانے کے لیے کہ کوئی سن نہ رہا ہو۔ پھر اس نے نور العین کا بازو پکڑ کر اس کے کان میں سرگوشی کی، ”ایمان کے بارے میں کسی کو مت بتانا، خاص طور پر آمنہ کو۔“ اس کا لہجہ سخت اور دھمکی آمیز تھا۔

نور العین کی مسکراہٹ گہری ہو گئی، ”تم فکر نہ کرو، میں نے ایمان کے ساتھ پہلے بھی یہ کام کیا تھا جب آمنہ اسے لائی تھی، اور میں دوبارہ کر سکتی ہوں۔ تم بس پیسوں کا بنڈل تیار رکھو“ اس نے جتوئی کی طرف عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور پھر اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیا۔

نور العین کے لیے یہ سب کچھ ایک معمول تھا۔ اسے ایمان کی زندگی یا اس کے احساسات کی کوئی پروا نہ تھی، وہ تو محض پیسوں کے لیے یہ کام کر رہی تھی۔ اس نے ایمان کے ساتھ پہلے بھی ایسا کیا تھا اور اب دوبارہ وہ ہی کرنے جا رہی تھی۔ بغیر کسی رحم کے۔

جتوئی نے ایک لمبی سانس لی اور اپنا فون نکال کر میکائیل کو کال کی، جو گھر پر بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی کال ملی، جتوئی نے پرسکون لہجے میں کہا، ”فکر مت کرو، سب کچھ ٹھیک ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“

...°...

حال۔۔

وہ اب بھی اُن کی آوازیں اپنے دماغ کے کونے کونے میں گونجتی محسوس کر رہی تھی۔ وہ آوازیں جو اس کی عقل و ہوش کا مذاق اڑاتی تھیں، اسے دھمکاتی اور کچلاتی تھیں۔

جیسے اُس کے خیالات کے اندر بے رحمی سے پنچے گاڑ کر اسے گھسیٹتی ہوں۔ وہ اب بھی اپنے جسم پر ان کے بے رحم ہاتھوں کی تلخ گرفت کو محسوس کر سکتی تھی، وہ ہاتھ جو ہر لمحہ اس کے وجود کی حرمت کو پامال کر

رہے تھے، اسے ریزہ ریزہ کر رہے تھے۔ وہ خود کو ٹوٹتا ہوا دیکھ رہی تھی، اس کی روح پر لگنے والے زخم ناقابلِ برداشت تھے۔

اس نے بارہا بھاگنے کی کوشش کی تھی، کہیں پناہ ڈھونڈنے کی تمنا کی تھی، مگر ہر بار وہ بے رحم سایے اسے جکڑ لیتے تھے، اس کی ہر امید، ہر دعا کا خون کرتے ہوئے اسے مزید اذیت میں دھکیل دیتے تھے۔

اب تو یوں لگتا تھا کہ وہ ساری محبت، اور ہر امید سے یکسر خالی ہو چکی تھی۔ اس کی روح تاریک ہو چکی تھی، جیسے اس پر ہر دروازہ بند ہو چکا ہو۔

اچانک اس کے پرانے موبائل سے نوٹیفیکیشن کی آواز آئی اس

اس نے اس بوسیدہ ڈرالی کی جانب، ہاتھ بڑھائے جس کے کنارے اس

کے نئے موبائل کے ساتھ اس، کا پرانا موبائل پڑا تھا۔

لرزتے ہاتھوں سے اس نے موبائل اٹھایا، جیسے اُس میں کوئی بھاری بوجھ ہو۔

وہ سسکتی ہوئی نظریں اٹھا کر اسکرین کی طرف دیکھنے لگی۔ انسٹاگرام کا نوٹیفیکیشن آیا تھا۔

ایک ویڈیو پیغام۔ وہ متعجب تھی، اسے حیرت ہوئی کہ کس شخص نے اسے یہ پیغام بھیجا؟ وہ انسٹاگرام پر کسی شخص یا پیج کو فالو نہیں کرتی تھی۔

اس نے ہچکچاتے ہوئے میسج کھولا۔ پیج کا نام تھا:

Towards Allah۔ اُس کے دل میں عجیب سا خوف اور تجسس پیدا ہوا۔

اس نے ویڈیو پر کلک کیا اور جیسے ہی ویڈیو چلی، قرآن پاک کی تلاوت کی آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔ تلاوت کے ساتھ اردو سب ٹائٹلز تھے، اور ہر لفظ اس کے اندر ایک انقلاب برپا کر رہا تھا۔

الفاظ کی تاثیر جیسے اس کے اندر سکون کا ایک سمندر بھر رہی تھی، ایک ایسا سکون جس کی وہ مدتوں سے پیاسی تھی۔ وہ سرد سی تاریکی، جو اس کی روح کو لپیٹے ہوئے تھی، جیسے ایک روشنی سے گھلنے لگی ہو۔ اُس نے ایک کے بعد ایک ویڈیو دیکھی، اور ہر لفظ اسے اللہ کی طرف کھینچ رہا تھا، اس تعلق کی طرف جسے اس نے کہیں کھو دیا تھا۔

پہلی آیت جو اس کے دل میں اتری، وہ سورۃ القلم کی آیت نمبر 16 تھی:

”اچھا دیکھو تو ہم عنقریب اس کے ناکڑے (ناک) پر داغ لگائیں گے“

اس کے دل میں ایک عجیب سی کپکپاہٹ دوڑ گئی۔ یہ آیت اُسے اُس شخص، آصف، کی یاد دلارہی تھی، جو اپنی سرکشی اور غرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ شخص جس نے گناہوں کا انبار لگا دیا تھا، اور اللہ کی یاد کو فراموش کر بیٹھا تھا۔

آیت کی شدت نے اسے یوں محسوس کروایا کہ جیسے یہ الفاظ آصف کے لیے خاص طور پر نازل ہوئے ہوں، اس کے نفس کی گستاخی اور سرکشی کو بے نقاب کرنے کے لیے۔

دوسری آیت

سورہ آل عمران، آیات 135-136

۔ ”اور وہ لوگ جب کوئی بے حیائی یا اپنی جان پر ظلم کر بیٹھتے ہیں، تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخش سکتا ہے؟۔ اور وہ جانتے بوجھتے اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے۔ ان کا بدلہ ان کے رب کی جانب سے مغفرت اور وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور نیک کام کرنے والوں کا بہت اچھا اجر ہے۔“۔

وہ اپنے ماضی کی خطاؤں اور کوتاہیوں پر غور کرتی رہی، وہ گناہ جنہیں اُس نے دانستہ کیا تھا یا جو اُس کے ساتھ سرزد ہوئے تھے۔ اس کے دل میں ایک سوال پیدا ہوا: کیا وہ واقعی مجرم تھی؟ کیا وہ ان گناہوں کی سزا کی مستحق تھی؟ کیا یہ سب کچھ اُس کی اپنی دعوت پر آیا تھا؟ اور پھر ایک لمحے کے لیے اُس کے دل میں ندامت کا ایک تیز سیلاب اُٹھ آیا۔

کیا وہ اب بھی اپنے کیے کی معافی مانگ سکتی تھی؟

ہاں، یقیناً اللہ معاف کرنے والا ہے۔ وہ دل میں اس عزم کے ساتھ سر ہلاتی کہ اُس نے اپنے گناہ چھوڑ دیے ہیں۔ اس نے گناہوں سے توبہ کر لی تھی، اُس نے وہ تمام کام چھوڑ دیے تھے جو اُس کی نافرمانی کے باعث تھے

کلب جانا ترک کر دیا تھا۔

مغربی لباس کو خیر باد کہہ دیا تھا، اور دیگر بے پردگی کی باتیں بھی ترک کر دی تھیں۔

لیکن ایک اور سوال اُس کے دل میں ابھرا: کیا وہ اب بھی نیکوکاروں میں سے ہے؟ کیا اللہ نے واقعی اُسے معاف کر دیا؟

تیسری آیت

سورہ یٰسین، آیات 53-58

صرف ایک زور کی آواز کا ہونا ہو گا کہ سب کے سب ہمارے روبرو آ حاضر ہوں گے اس روز کسی شخص پر کچھ ظلم نہیں کیا جائے گا اور تم کو بدلہ ویسا ہی ملے گا جیسے تم کام کرتے تھے اہل جنت اس روز عیش و نشاط کے مشغلے میں ہوں گے وہ بھی اور ان کی بیویاں بھی سایوں میں تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے وہاں ان کے لئے میوے اور جو چاہیں گے (موجود ہو گا) پروردگار مہربان کی طرف سے سلام (کہا جائے گا)

وہ قیامت کے روز کی ہولناکیوں کا سوچتی رہی۔ وہ دن جب ہر راز فاش ہو جائے گا، جب ہر عمل کا حساب ہوگا، جب انصاف کا ترازو حق و باطل کو کھول کر رکھ دے گا۔ اُس کے دل میں خوف کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔

کیا وہ ان خوش نصیب لوگوں میں شامل ہوگی جو جنت کے باغات میں تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے؟ یا وہ ان بد بختوں میں سے ہوگی جنہیں دائمی عذاب کا سامنا کرنا ہوگا؟ اُس کے دل میں خیالات کا ایک ہجوم تھا: کیا وہ اُس دن خوشیوں میں مگن ہوگی یا غموں کی سولی پر لٹکی ہوگی؟ کیا اُس کا کوئی شریک حیات ہوگا، کوئی محبوب جو اُس کی خوشیوں میں شریک ہو؟

چوتھی آیت

سورہ مائدہ، آیات 90-92:

اے ایمان والو! شراب اور جو اور بت اور قسمت معلوم کرنے کے تیرنا پاک شیطانی کام ہی ہیں تو ان سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہ ہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض و کینہ ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو کیا تم باز آتے ہو؟ اور اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ہوشیار رہو پھر اگر تم پھر جاؤ تو جان لو کہ ہمارے رسول پر تو صرف واضح طور پر تبلیغ فرما دینا لازم ہے۔

وہ ان بدکاریوں کو یاد کرتی رہی جن کا سامنا اُس نے اپنی زندگی میں کیا تھا۔ اُس نے الیکٹرک شیشہ پینا شروع کیا تھا، ایک ایسا فعل جو اُس کے لیے شاید کوئی بڑی بات نہ تھی، لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ اس کی روح کو داغدار کر رہا ہے۔

وہ سوچتی رہی کہ ان نشہ آور چیزوں نے اُس کی ذات اور اُس کے روحانی مقام کے درمیان کیسا فاصلہ پیدا کر دیا تھا۔

اُسے وہ تلخ عداوتیں یاد آئیں جو ان ناپاک عادات نے اُس کے دل میں ابھار دی تھیں۔ لوگوں کے ساتھ اور اللہ کے ساتھ۔

اچانک، وہ ایک جذباتی کیفیت میں ڈوب گئی۔ ندامت کے آنسو اُس کی آنکھوں سے بے اختیار بہہ نکلے، جیسے اُس کے دل پر برسوں کی تہہ لگی غفلت اور گناہ دھلنے لگے ہوں۔

وہ پھر سے قرآن کی تلاوت سننے لگی اور سورۃ المومنون کی یہ آیت سامنے آئی

۔ ”برائی کا بدلہ اسی سے دو جو سب سے بہتر ہو، ہم خوب جانتے ہیں جو باتیں وہ بناتے ہیں۔ اور کہو، اے میرے رب! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور، اے میرے رب، اس بات سے کہ وہ میرے قریب آئیں۔“۔

(المومنون:-96)۔

بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو۔ اور یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں ہمیں خوب معلوم ہے

اس نے آیت کے الفاظ پر گہرے دھیان سے غور کیا اور اپنے رویے کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ یاد کرنے لگی کہ کیسے وہ اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بہنوں کی توہین کا جواب توہین سے دیا کرتی تھی، اور کیسے دل میں ان کے لیے بغض و کینہ پالے رکھتی تھی۔

اُس کے دل میں بارہا یہ خواہش جنم لیتی تھی کہ وہ ان کو اذیت دے، ان سے بدلہ لے، اور ان کی زندگی میں تلخیاں بھر دے۔ اُس کے دل میں ایک مسلسل آگ دہک رہی تھی، جس کا ایندھن ان کی جانب سے ہونے والی توہین اور بد سلوکی تھی۔

مگر آج اس آیت کے الفاظ نے اُس کے اندر کچھ بدل دیا۔ اُس نے سوچا کہ آیا وہ واقعی صحیح کر رہی ہے یا اپنے جذبات کے آگے ہتھیار ڈال کر اور ظلمت کی اس آگ میں مزید ایندھن ڈال رہی ہے؟ کیا اُس کی توہین اور ان سے نفرت کا یہ سلسلہ برائی کا بدلہ برائی سے دینے جیسا نہیں تھا؟ کیا وہ اپنے رد عمل میں غلط نہیں تھی؟ کیا اس کا یہ طرزِ عمل قرآن کی ہدایت کے مطابق تھا؟

اُس کے دل میں ایک سوال گونجا

۔ ”کیا میں نرمی اختیار کروں؟ کیا میں خاموش رہوں؟ کیا میں انہیں معاف کر دوں یا اپنے حق کا مطالبہ کروں؟“۔

اس کی روح میں الجھن تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اللہ اس کے دل کو صاف کرے گا؟ کیا وہ اسے شیطان کے وسوسوں سے بچائے گا، جو اُسے مسلسل اکساتے ہیں؟ وہ اپنے اندر ایک گہری پشیمانی اور ندامت محسوس کرنے لگی۔

اُسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ قرآنی ہدایات کے خلاف چل رہی تھی، کہ وہ اُس برائی کا جواب بہتر طریقے سے نہیں دے رہی تھی، جیسا کہ اُسے قرآن میں سکھایا گیا تھا۔ وہ شیطان کے وسوسوں سے اللہ کی پناہ بھی طلب نہیں کر رہی تھی اور نہ ہی اُس کے منصوبے پر بھروسہ کر رہی تھی۔

یہ سب سوچ کر اُس کے دل میں ایک تبدیلی کا احساس پیدا ہوا۔ اُس نے دل میں عزم کیا کہ وہ اپنے رویے میں تبدیلی لائے گی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب اُن کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آئے گی اور سختی اور تلخی سے باز رہے گی۔

اُس نے تہیہ کیا کہ وہ اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دے گی، کیوں کہ وہ ہی بہترین منصف اور مددگار ہے۔

اُس نے اپنے دل میں یہ عزم کیا کہ وہ اب زیادہ رحمدل، شفیق اور نرم دل انسان بنے گی۔ اُس نے اپنے رب سے دعا کی، اُس کی مدد طلب کی، اور کہا

۔ ”اے اللہ! میرے گناہوں اور لغزشوں کو معاف فرما، اے میرے رب، مجھے سیدھے راستے پر چلا اور برائی کا جواب بہترین طریقے سے دینے کی توفیق عطا فرما۔ مجھے شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رکھ اور

مجھے ان سے دور رکھ جو مجھے گمراہ کرتے ہیں۔ اے اللہ! تو ہی دنیا اور آخرت میں مجھے سکون اور کامیابی عطا فرما۔ تُو سب سے زیادہ رحم کرنے والا، سب سے زیادہ معاف کرنے والا، سب سے زیادہ عطا کرنے والا ہے۔ تُو بہترین منصوبہ ساز ہے، تُو ہی میرا سب سے بڑا مددگار اور دوست ہے۔“

یہ دعا کرتے ہوئے اُس کے دل میں ایک عجب قسم کی راحت اور سکون اترنے لگا۔ اُس نے اللہ کی مغفرت اور اُس کی رہنمائی کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا۔ اُس کے دل میں ایک تحفظ اور اعتماد کا احساس پیدا ہوا، کیوں کہ اُس نے جانا کہ اللہ اس کی مدد کو ہمیشہ موجود ہے۔ وہ مسکرائی، اور دل سے بولی

”تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو رب العالمین ہے۔“

اس نے سکروں کیا اور ایک اور آیت اس کے نظروں کے سامنے آئی۔

۔ ”کیا تمہارے پاس بڑے حادثے کی خبر پہنچی؟ کچھ چہرے اُس دن عاجزی اور شکست خوردگی میں ہوں گے، مشقت کرتے، تھکے ہارے، بھڑکتی آگ میں داخل کیے جائیں گے۔ انہیں اُبلتے ہوئے چشمے سے پانی پلایا جائے گا۔ ان کے لیے صرف ایک زہریلا، کانٹے دار درخت ہوگا، جو نہ ان کی بھوک مٹائے گا، نہ ان کو کوئی طاقت بخشے گا۔ کچھ اور چہرے اُس دن خوشی میں دمک رہے ہوں گے، اپنے اعمال کی جزا کے بدلے میں۔ وہ بلند و بالا باغات میں ہوں گے، جہاں کوئی بیہودہ بات نہ سنیں گے۔ وہاں ایک بہتا چشمہ ہوگا، اونچے تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، اور چمکدار پیالے گردش میں ہوں گے۔“

وہ آیات سُن کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے دل میں اپنے سوتیلے والدین، بہنوں میکائیل اور اپنے حقیقی والدین کے رویے کا خیال اُٹ آیا۔ وہ سوچنے لگی کہ کس طرح انہوں نے اس کے ساتھ بد سلوکی کی، اسے دھتکارا، اُس کی زندگی میں صرف تکلیفیں اور رنجشیں بھر دیں۔ انہوں نے کبھی اُس کی پرواہ نہیں کی، نہ ہی کبھی اُس کے درد کو محسوس کیا۔

اُس کے دل میں یہ سوال گونجنے لگا کہ کیا وہ لوگ کبھی اللہ کے سامنے اپنے اعمال کا حساب دیں گے؟ کیا وہ قیامت کے روز اُس عظیم دن کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں؟ کیا انہیں معلوم ہے کہ اُن کے اعمال کا انجام کیا ہوگا؟ وہ سوچنے لگی کہ وہ کس طرح اُس دن اپنے برے اعمال کے نتیجے میں تباہی کا سامنا کریں گے، اور اُن کے چہروں پر کیا حالات ہوں گے۔

اُس کی آنکھوں میں غصے کی چمک تھی۔ اُس کے دل میں ان کے لیے نفرت اور حقارت نے جنم لیا۔ اُس کے جذبات اتنے شدید تھے کہ وہ یہ تصور کر رہی تھی کہ وہ لوگ، جو اُس کے ساتھ برائی کرتے رہے، اللہ کے عذاب کا سامنا کیسے کریں گے۔

وہ اُن چہروں کا تصور کر رہی تھی جو اُس دن ذلت اور رسوائی سے بھرے ہوں گے، جو جہنم کی آگ میں جھونک دیے جائیں گے، اور جنہیں زہریلے کانٹے دار درخت کی خوراک دی جائے گی۔

۔ ”وہ وہ ہی ہوں گے،“ اُس نے خود سے کہا، ”جو ابدی عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ وہ آگ میں جھلسائے جائیں گے، وہ کھولتے ہوئے پانی سے اپنی پیاس بجھائیں گے۔ اُن کے چہرے عاجزی اور شکست خوردگی میں غرق ہوں گے۔ وہ اللہ کے قہر کا سامنا کریں گے، اور کوئی ان کو نجات نہیں دلا سکے گا۔ وہ ناکام ہوں گے، وہ ذلیل و رسوا ہوں گے۔“

یہ سوچتے ہوئے، اُس کے دل میں ایک لمحے کے لیے ترس کا احساس پیدا ہوا۔ اُسے دکھ ہوا کہ وہ لوگ، جو اُسے تکلیفیں دیتے رہے، دنیا میں کتنے غافل تھے اور آخرت کے لیے کوئی تیاری نہ کر سکے۔ مگر ساتھ ہی اُسے اللہ کی حکمت اور عدل پر بھروسہ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ہر ایک کو اُس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملے گی۔

اُس نے اپنی سوچ کا رخ اپنی طرف موڑا اور کہا

۔ ”لیکن میں ان لوگوں میں سے ہوں گی جن کے چہرے اُس دن روشن ہوں گے، جو اللہ کی رضا اور خوشنودی میں ہوں گے۔ میں اُن باغات میں ہوں گی جہاں کوئی بے ہودہ بات نہیں سنی جائے گی۔ میں اللہ کی رحمت اور اُس کی کرم نوازی سے مالا مال ہوں گی۔ میرے لیے چشمے ہوں گے، پھل اور انواع و اقسام کی نعمتیں ہوں گی۔ میں خوش نصیب ہوں گی،۔ وہ جو اُس دن عزت و وقار میں ہوں گے، وہ جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ کی نعمتوں میں ہوں گے۔“

اُس نے اپنے دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کیا اور دعا کی

۔ ”اے اللہ! تو انصاف کرنے والا ہے، تو ہی سب سے زیادہ رحم کرنے والا اور دانا ہے۔ اے اللہ، میں تیرے عدل اور رحمت پر ایمان رکھتی ہوں۔ تو ہی یوم حساب کا مالک ہے، تو ہی فیصلہ کرنے والا ہے۔ اے اللہ، میں تیری پناہ چاہتی ہوں، اور تیری ہدایت طلب کرتی ہوں۔ تو ہی ہے جو بلند و بالا ہے، تو ہی سب کا رب ہے۔“

یہ کہہ کر اُس کے دل میں سکون کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے اللہ کی قدرت اور اُس کی مہربانی کا تصور کیا اور اس کے دل میں ایک عجیب سی راحت اور سکون پیدا ہوا۔

اس نے دوبارہ سکول کیا اور اب کی بار سورہ آل عمران کی یہ آیات سامنے آئیں:-

۔ ”یہ وہ لوگ ہیں جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں (اور دعا کرتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بیکار پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب! بے شک تو جس کو آگ میں ڈالے گا وہ ہی ذلیل ہوگا، اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا، اور ہم ایمان لے آئے۔ پس اے ہمارے رب! ہمارے

گناہوں کو معاف فرما، اور ہماری خطاؤں کو بخش دے، اور ہمیں نیکیوں کے ساتھ موت دے۔ اے ہمارے رب! ہمیں وہ عطا فرما جس کا تو نے اپنے رسولوں کے

ذریعے وعدہ کیا، اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی نہ کرنا۔ بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔”

(آل عمران: 191-194)۔

ایمان ان آیات کے الفاظ پر غور کرنے لگی۔ اس نے سوچا کہ اس نے کس طرح ہر حال میں اللہ کو یاد کیا ہے، چاہے وہ کھڑی ہو، بیٹھی ہو، یا اپنے بستر پر لیٹی ہو۔ اس نے سوچا کہ وہ کائنات کی ہر چیز میں اللہ کی نشانیاں کیسے دیکھتی تھی اور ان پر تدبر کرتی تھی۔

وہ اللہ کی عظمت اور قدرت کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتی تھی، اور اس کی تخلیق پر حیران رہتی تھی۔

اس نے اللہ سے ڈر محسوس کیا، اور اس کے عذاب سے پناہ کی دعا کی۔ وہ زمانے جاہلیت سے نکالنے کے بعد ہمیشہ اپنی بخشش اور نجات کی طالب رہی تھی۔ وہ اپنے گناہوں پر پشیمان تھی اور صالحین کے ساتھ اپنی موت کی دعا کیا کرتی تھی، کہ اللہ اسے نیک لوگوں میں شامل فرمائے اور قیامت کے دن اسے شرمندگی سے بچائے۔

ایمان نے نیچے سکرول کیا تو ایک اور آیت سامنے آئی

اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کر لو (کہ کسی کچھ دوہی نہیں) اور نہ بالکل کھول
ہی دو (کہ سب ہی دے ڈالو اور انجام یہ ہو) کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ ﴿۲۹﴾

(بنی اسرائیل / الاسراء: 29)۔

یہ آیت دیکھ کر ایمان کے دل میں عجیب سی بے چینی محسوس ہوئی۔ اسے فوری طور پر اس کا مطلب سمجھ
میں نہیں آیا۔ اس نے غور سے ترجمہ پڑھا، لیکن اس کا مفہوم اس کے ذہن میں واضح نہیں ہوا۔ اسے یہ
آیت اپنے حالات سے غیر متعلقہ لگی۔ وہ نہیں جان پائی کہ اللہ اسے کس بات سے متنبہ کر رہا تھا۔

ایمان نے اپنی زندگی میں کئی مواقع پر دوسروں کو سب کچھ دینے کی عادت بنا رکھی تھی، حتیٰ کہ اپنے
حقوق، ضروریات اور خوشیوں کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔

وہ دوسروں کی ضروریات کے آگے اپنی ذات کو بھول جاتی تھی، اپنے مال اور وقت کو بلا تفریق خرچ کرتی
تھی، یہاں تک کہ خود کو تکلیف پہنچا لیتی تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کا یہ رویہ نہ صرف اسے
مادی طور پر کمزور کر رہا تھا، بلکہ اسے عزت اور خودداری کے لحاظ سے بھی نیچے گرا رہا تھا۔

یہ آیت دراصل اُس کے لیے اللہ کی طرف سے ایک انتباہ تھا کہ اعتدال اور توازن سے زندگی گزارو۔ نہ تو
اتنے کنجوس بنو کہ ضرورت کے وقت بھی ہاتھ روک لو، اور نہ اتنے سخی بنو کہ خود کو مشکلات میں ڈال دو۔

لیکن ایمان کو اس آیت کی حکمت سمجھ نہیں آئی۔ اُس نے اس آیت کو نظر انداز کیا، جیسے کہ یہ اُس کے لیے نہ ہو۔

اس نے کندھے اچکائے اور اگلی ویڈیو پر سکرول کیا، کیوں کہ وہ کچھ زیادہ ”متاثر کن“ دیکھنے کی متمنی تھی۔ وہ نہیں جان پائی کہ یہ آیت دراصل اُس کے مستقبل کے لیے ایک قیمتی رہنمائی تھی۔

، اچانک سورہ رعد کی آیت نمبر ۲۸ سامنے آئی۔

وہ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں، سن لو اللہ کی یاد ہی میں دلوں کا چین ہے
(سورہ رعد: 28)

یہ آیت سنتے ہی ایمان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اللہ اس سے براہ راست مخاطب ہو رہا ہو۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے دل میں سکون کی لہر دوڑ گئی۔ یہ وہ ہی جواب تھا جس کا وہ ہمیشہ انتظار کرتی رہی تھی، جس کی وہ کتنے مہینوں سے تلاش میں تھی۔

یہ آیت جیسے اسے اندر سے جھنجھوڑ کر بیدار کر رہی تھی۔ "دل کا سکون اللہ کی یاد میں ہے۔" یہ جواب اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔

ایک وقت تھا جب یہ سوال اس کی زندگی کا سب سے بڑا امتحان بن گیا تھا۔

اب ایمان کے ذہن میں ہر چیز واضح تھی۔ اللہ نے اسے وہ جواب دے دیا تھا جس کی اسے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

وہ آیت، وہ روشنی، وہ سکون، جیسے اس کے دل کی ہر گتھی سلجھ گئی تھی۔

ویڈیو میں آیت ختم ہوئی تو ایمان کے سینے میں جیسے کوئی دھماکہ ہوا۔ اس نے اپنا فون زمین پر گر اسادیا اور تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ شکر گزاری اور خوشی کے جذبات سے مغلوب ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اللہ کی محبت اور شفقت کے احساس سے اس کا دل بھر گیا۔

"اللہ اکبر! اللہ سب سے بڑا ہے!" ایمان نے بلند آواز میں کہا، اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ اللہ نے اسے وہ جواب دیا تھا جس کی وہ ہمیشہ تلاش میں تھی۔

پھر اچانک اسے یاد آیا...

کہ ایک مرتبہ اس ڈھونگی مولوی سرور نے اس کی بہنوں اور میکائیل کو "حی علی الفلاح" کا مطلب سمجھایا تھا، بچپن میں اس نے یہ سنا تھا مگر وقت کے ساتھ وہ یہ سب بھول گئی اسے یہ یاد نہ رہا۔ اب جب یہ الفاظ

اس کے ذہن میں بازگشت کرنے لگے، تو سرور کی وہ ہی آواز اس کے کانوں میں گونج اٹھی، جیسے وقت کی گردش اسے واپس لے آئی ہو۔

یہ الفاظ جو وہ ہر دن مسجد سے پانچ بار سنتی تھی، لیکن کبھی ان پر غور نہیں کیا تھا۔ "جی علی الفلاح" — "کامیابی کی طرف آؤ۔" اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا، "میں کتنی بے وقوف تھی!" یہ وہ ہی کامیابی تھی جس کی وہ تلاش میں تھی، جس کا ذکر اذان میں تھا، جسے وہ ہمیشہ نظر انداز کرتی رہی تھی۔

اس نے نماز کو نظر انداز کیا تھا، وہ فریضہ جو ہر مسلمان کے لیے سب سے اہم تھا۔ "نماز ہی دل کا سکون ہے، جنت کی کنجی ہے!" اس نے خود سے کہا۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ کس طرح اتنی اہم چیز سے غافل رہی۔ وہ ایک پل کے لیے بیٹھ گئی، آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے۔

"میں اتنی غافل کیسے ہو سکتی ہوں؟" ایمان نے اپنے آپ سے کہا۔ اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ جو سکون وہ تلاش کر رہی تھی، وہ ہمیشہ اس کے سامنے تھا۔ اللہ نے ہر روز اس کے سوال کا جواب اذان میں دیا تھا، اور اس نے اس کا جواب نہ جانے کہاں کہاں نہ دھونڈا۔ اور نہ ہی وہ اذان کو کبھی سمجھ نہیں پائی تھی۔

"اب میں کیا کروں؟" ایمان الجھن میں تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ نماز کیسے شروع کرے؟ اس نے کبھی صحیح طریقے سے نماز پڑھنا نہیں سیکھا تھا، نہ ہی وضو کرنے کا درست طریقہ جانتی تھی۔

اس نے پھر اپنے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی، "اے اللہ، میری رہنمائی فرما۔ مجھے ان لوگوں میں شامل کر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔ مجھے جنت میں داخل فرما اور مجھے آگ سے بچا۔"

پھر اس نے کہا: "الحمد للہ، تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔"

دوسری طرف، سویڈن میں گونا گے ذہن میں ایک جھماکہ سا ہوا، جیسے کسی دور دراز یاد نے اس کے شعور کے پردے پر دستک دی ہو۔ ایک بھولا بسرا خیال، ایک دھندلا سا منظر، اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے گزرا۔

وہ لمحہ جب اس کی ماں نے دنیا کو الوداع کہا تھا، اسے وہ خواب یاد آیا جو اس نے اپنی ماں کی موت کے بعد دیکھا تھا، ایک ایسا خواب جو برسوں سے اس کے اندر کہیں چھپا ہوا تھا۔

لحظہ بھر کے اندر اندر اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔

اس کی ماں سفید لباس میں ملبوس، خوبصورت اور چمکدار نظر آرہی تھی، جیسے نور کی چمک اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہو۔ وہ مسکرا رہی تھی، ایک پرسکون اور پُر مہربانی مسکراہٹ، اور پھر وہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے جیسے آسمانوں سے کوئی پیغام ہو

"جنت کی کنجی تمہیں ہم تک لا سکتی ہے۔"

وہ یکدم بولا "موم کا مطلب کیا تھا؟"

کیا وہ واقعی جنت میں تھی؟ اور کیا وہ کبھی دوبارہ اس سے مل سکے گا؟ وہ اپنے جذبات کی شدت کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے آہستہ سے بولا

"آہ... یہ تو صلاۃ ہے۔ یہ ہی وہ چیز ہے جو ایمان کر رہی ہے۔ میری ماں اسی بارے میں بات کر رہی تھی... یہ ہی جنت کی چابی ہے۔"

اس کے الفاظ میں مردانہ وجاہت اور ایک مضبوط یقین کی گونج تھی، جیسے وہ اپنے آپ سے عہد کر رہا ہو۔ اس کے لبوں پر ایک نیم مسکراہٹ تھی، اور آنکھوں میں وہ ہی چمک جو اسے ہمیشہ منفرد بناتی تھی۔

اس لمحے، گونار نے اپنے اندر ایک گہرا جذبہ محسوس کیا۔ اس کا دل ایک نئی سمت میں قدم بڑھا رہا تھا، جیسے ایک نیا سفر شروع ہو رہا ہو۔ اسے تجسس کی ایک لہر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا "صلاۃ... جنت کی کنجی"

اس نے اپنے اندر امید اور خواہش کا ایک نیا احساس محسوس کیا، جیسے وہ اب اپنی ماں کو خوش کرنے اور اس کے قریب پہنچنے کی تمنا کر رہا ہو۔ اس کا دل ایمان کی طرف کھینچ رہا تھا، جیسے وہ اس کے عقائد میں شریک ہو کر اپنے آپ کو مکمل کر سکے۔

"ایمان..." وہ زیر لب بولا، اس کے نام سے ہی گونار کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ وہ محبت اور تعریف کے جذبات میں گم تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اب اسے اپنے راستے پر آگے بڑھنا ہے۔

ایمان نے ایک بار پھر اپنا موبائل اٹھایا اور انسٹا پیج

Towards Allah

کی بھیجی گئی ویڈیوز دیکھنے لگی۔ وہ اسلام کی تعلیمات اور ایک نیک مسلمان بننے کے طریقوں کے متعلق گہری آگاہی حاصل کر رہی تھی۔

مردوزن کے لباس کے اسلامی آداب پر مبنی ویڈیوز نے اس کی توجہ خاص طور پر مبذول کی۔ اس نے سورۃ النور کی آیات ۳۰ اور ۳۱ کی تلاوت سنی، جن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔ بے شک اللہ ان کے اعمال سے خوب آگاہ ہے۔ اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو اس میں سے ظاہر ہو اور اپنے خمر اپنے گریبانوں پر ڈالے رکھیں۔"

یہ سن کر ایمان کے ذہن میں ایک گہری سوچ نے جنم لیا۔ اس نے جانا کہ یہ حکم نہ صرف مردوں اور عورتوں کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا ہے بلکہ اپنی عفت اور پاکدامنی کی حفاظت کرنے کا بھی ہے۔ لفظ "نُحُور" کے مطلب پر غور کرتے ہوئے اسے اندازہ ہوا کہ یہ سر پر لیا جانے والا اسکارف ہے جو عورتیں اپنے بالوں اور گردن کو ڈھانپنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اسے یہ احساس ہوا کہ حجاب صرف ایک ظاہری پردہ نہیں بلکہ ایک دینی فریضہ ہے جو عورت کی عزت و عصمت کی حفاظت کرتا ہے۔

اگلی ویڈیو میں سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۹ پر روشنی ڈالی گئی تھی:

"اے نبی! اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں اوڑھ لیا کریں، یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچانی جائیں اور ستائی نہ جائیں۔"

ایمان خود سے بڑھائی۔

"اوہ! تو اس لیے عورتیں برقع پہنتی ہیں، تاکہ نامحرم ان پر نگاہ نہ ڈال سکیں۔"

ایمان نے محسوس کیا کہ حجاب صرف لباس کا معاملہ نہیں بلکہ اللہ کے حکم کی تعمیل ہے

ویڈیو میں سورۃ النور کی آیت ۳۱ دوبارہ دکھائی گئی:

"اور مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو اس میں سے ظاہر ہو اور اپنے دوپٹے اپنے گریبانوں پر ڈالے رکھیں، اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اپنے شوہروں یا اپنے باپوں یا اپنے شوہروں کے باپوں، یا اپنے بیٹوں یا اپنے شوہروں کے بیٹوں، یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں یا اپنی بہنوں کے بیٹوں یا اپنی عورتوں یا اپنے غلاموں یا مرد خادموں سے جو خواہشات نہیں رکھتے یا ان بچوں سے جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے آگاہ نہیں ہیں، اور اپنے پاؤں زمین پر زور سے نہ ماریں کہ ان کی پوشیدہ زینت ظاہر ہو۔"

ایمان نے اس آیت کی گہرائی کو محسوس کیا۔ یہ حکم تھا کہ عورتیں اپنے سینے اور جسم کے دیگر حصوں کو ڈھانپ کر رکھیں۔ اسے اس بات کا بھی ادراک ہوا کہ پردہ عورت کی عزت و عصمت کا محافظ ہے اور اس کا مقصد اسے فتنہ اور فحاشی سے محفوظ رکھنا ہے۔

پھر ایمان نے سورۃ غافر کی آیت ۲۱ کی ویڈیو دیکھی:

"کیا انہوں نے زمین میں سیر نہیں کی کہ دیکھتے ان سے پہلے کے لوگوں کا انجام کیا ہوا، وہ لوگ قوت میں ان سے زیادہ سخت تھے اور زمین میں آثار چھوڑے تھے۔ پس اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا، اور اللہ کی طرف سے ان کے لیے کوئی بچانے والا نہ تھا۔"

اس آیت کے کلمات نے ایمان کے دل میں خوف اور تعظیم کا ایک عجیب سا احساس پیدا کیا۔ وہ ان پچھلی قوموں کے انجام پر غور کرنے لگی جنہوں نے اللہ کے پیغام کو جھٹلایا اور پھر عذاب الہی کا سامنا کیا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ اللہ کی نافرمانی کا انجام سخت اور ہولناک ہو سکتا ہے۔

اس کے بدن میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی جب اسے یہ احساس ہوا کہ آج کی دنیا بھی اسی انجام کی طرف بڑھ رہی ہے، اگر وہ اپنے اعمال میں اصلاح نہ کریں۔

ایمان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے دل سے دعا کی

"اے اللہ! میں تیری ہر ہدایت کو تسلیم کرتی ہوں، میں تیری رحمت اور مغفرت کی طلبگار ہوں۔ میں تیری مرضی اور حکم کو دل و جان سے قبول کرتی ہوں۔ تو ہی میرا رب ہے، اور میں تیری رضا کی طالب ہوں۔"

یہ کلمات اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلے، جیسے اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کو پالیا ہو۔ سوئڈن میں، گوناوار اپنے موبائل کی اسکرین پر ایمان کی آواز سنتا ہوا ایک گہری خاموشی میں ڈوب گیا تھا۔ اس کے دل میں ایمان کی محبت نے ایک مضبوط گرفت جمار کھی تھی۔

وہ خاموشی سے زیر لب مسکرایا، جیسے دل کے کسی گوشے میں کوئی روشنی بھر گئی ہو، اور آہستہ آواز میں بولا "ایمان، ہم وہ ہی راستہ اپنائیں گے جو اللہ نے اپنے برگزیدہ لوگوں کے لیے منتخب کیا ہے، وہ ہی حق اور صداقت کا راستہ۔"

ایمان کی آنکھوں میں ایک گہری غور و فکر کی جھلک تھی جب اس نے اپنی اسکرین پر سورۃ ہود کی آیت نمبر 57 دیکھی:

"پھر اگر تم منہ موڑو گے تو میں تمہیں وہ پیغام پہنچا چکا ہوں جو میرے ذریعے تمہاری طرف بھیجا گیا تھا۔ میرا رب تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا، اور تم اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔"

یہ الفاظ ایمان کے دل میں ایک گہرا ارتعاش پیدا کر گئے، جیسے کوئی نامعلوم خوف اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر آیا ہو۔ وہ بے اختیار موبائل کو ایک طرف رکھتے ہوئے گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ اس کے لب کپکپا اٹھے اور اس کے دل سے التجائیں بلند ہونے لگیں "اے اللہ! اے رب العالمین! اے تمام جہانوں کے مالک، تو ہی میری مدد کر، تو ہی مجھے راہ دکھا، اے غفور و رحیم! میری خطاؤں کو معاف فرما، میرے دل کو

سکون عطا کر، اور مجھے اپنے راستے کی ہدایت دے۔ اے اللہ، میں تیرے حضور جھکتی ہوں، تو میرا بجا و ماویٰ ہے، تیری رضا ہی میری آخری منزل ہے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، دل کی سچائی اور خوف کے ساتھ، جیسے ساری دنیا اس کے سامنے معدوم ہو گئی ہو۔

دوسری طرف، گونار بھی خاموشی سے بیٹھا تھا، اس کی آنکھوں میں نمی اور دل میں ایمان کی محبت کے ساتھ ایک عجیب سی نرمی آ گئی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی، اس کے لب لرزنے لگے اور وہ ہولے سے بولا: "اللہ ہمیں معاف کر دے گا، ایمان۔ ہم نے اپنا راستہ پالیا ہے۔"

گونار کی آنکھوں میں یقین کی روشنی تھی، جیسے وہ بھی اسی سچائی کے سفر میں ایمان کے ساتھ شریک ہو چکا ہو۔

...°...

دو دن بعد

گونار نے سیاہ ٹرٹل نیک شرٹ اور اسٹیل گرے رنگ کی ڈریس پینٹ میں اپنی فطرت کی جاذبیت کو مزید عیاں کیا تھا۔ اس کے قدموں میں چیلیسی کے شووز، جو اس کے اعتماد اور وقار کی علامت تھے، خاموشی سے زمین کو چھو رہے تھے۔

وہ اپنے کمرے کے کشادہ صوفے پر نیم دراز تھا، اس کی آنکھوں میں گہرائی اور چہرے پر مردانہ سختی نمایاں تھی۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، گویا وہ جانتا ہو کہ دنیا کا ہر راز اس کی مٹھی میں ہے۔ گونار کے مضبوط ہاتھ میں ایک سگار تھا جس سے دھواں دھیمادھیمّا کمرے کی فضاء میں تحلیل ہو رہا تھا۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو اس کے ہونٹوں پر نفرت بھری مسکراہٹ ابھری۔ اپنی گہری اور خراش بھری آواز میں بولا، ”آجاؤ۔“ جیسے اس کے الفاظ میں حکم پوشیدہ تھا، جس سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا تھا۔

نوکر اندر آیا، ہاتھ میں ایک اینویلیپ تھا۔ ”سر، یہ وہ ہی پارسل ہے جس کے آپ منتظر تھے۔“

گونار نے بغیر کسی جذبات کے نوکر کو دیکھا، ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر اس نے پیچ لیا، اور نوکر کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کا حکم دیا، جیسے وہ ایک فرمانروائے مطلق ہو جو اپنی رعایا سے گفتگو کرتا ہو۔

”مک کو کہو، آج کے ناشتے میں پاکستانی ذائقہ چاہیے۔“

اس کے انداز میں ایک عجیب سی طلب تھی، جیسے وہ دنیا کے ہر ذائقے کا مالک ہو۔

نوکر خاموشی سے نکل گیا۔ گونار نے کیسٹ کا پیکیج کھولا اور اس پر نظر ڈالی۔ ایک آنکھ کا نشان، جسے فوراً اس نے ایلومیناتی کے لوگو کے طور پر پہچانا۔ ”میرب مونیز اور بہرامند کھوسٹ: دی فائنل کٹ۔“ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آئی، جیسے کسی شکاری نے اپنے شکار کو بے بس دیکھا ہو۔

کیسٹ ڈی وی ڈی پلیئر میں ڈالتے ہی، اس نے ریموٹ سے پلے کا بٹن دبایا۔ ایل ای ڈی اسکرین پر ایک اسپتال کا منظر ابھرا۔ مونیز بستر پر نیم مردہ حالت میں لیٹا تھا۔ نرس اندر آئی، ایک مصنوعی مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔ ”فکر نہ کریں، مس مونیز۔ آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔“ اس کی آواز میں ایک غداری چھپی تھی، جو صرف گونار جیسا انسان سمجھ سکتا تھا۔

نرس نے ڈرپ میں زہر نہایت مہارت سے ملایا، جیسے اس کا کام ہوشیاری کا مجسمہ ہو۔ جیسے ہی وہ کمرے سے نکلی، مونیز کی حالت غیر ہونے لگی۔

اس کے جسم میں ایک لرزہ سادوڑ گیا، جیسے اندر کوئی آتش فشاں پھٹنے والا ہو۔ اس کی سانسیں ایک دم بے ترتیب اور گہری ہو گئیں، جیسے کوئی غیبی ہاتھ اس کا گلا دبا رہا ہو۔

مونیز کی آنکھیں خوف سے باہر نکلنے کو تھیں، پلکیں تیز جھپک رہی تھیں، اور وحشت کی ایک ایسی لہر اس کے چہرے پر نمودار ہوئی جیسے وہ موت کو سامنے دیکھ رہا ہو۔ اس کی گردن کی رگیں پھولنے لگیں، ماتھے

پر پسینے کے موٹے قطرے نمودار ہو گئے، جو اس کے چہرے سے نیچے گرنے لگے۔ اس کا جسم جھٹکے لینے لگا، انگلیاں بے بسی سے بستر کی چادر کو نوچ رہی تھیں۔

مونیز کے لب ہل رہے تھے، جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو، لیکن آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ زبان بے قابو ہو کر لڑکھڑا گئی، الفاظ گڑ گڑا ہٹ میں بدل گئے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں، جیسے کسی درندے کی قید میں ہو، اور اس کا جسم تڑپتے ہوئے بے جان ہونے کے دہانے پر تھا۔

اب کی بار، اس کی زبان گویا قفس سے رہائی پا گئی، اور جیسے ہی تقدیر کے تالے ٹوٹے، اُس کے لبوں سے بے اختیار الفاظ کا سیلاب اُٹھ آیا

۔ ”مجھے نہیں مرننا۔۔۔ مجھے نہیں مرننا۔۔۔“ وہ زور زور سے چیخنے لگا، جیسے کسی دوزخی مخلوق سے چھٹکارا چاہتا ہو، لیکن آواز بے اثر ہو چکی تھی۔

وہ ہوا میں بے ترتیب نظریں دوڑا رہا تھا، جیسے کوئی اندیکھی مخلوق اسے گھور رہی ہو، یا پھر شاید وہ خود کو کسی عذاب دینے والی وجود کی قید میں پھنسا محسوس کر رہا ہو۔۔

اس کا وجود بیڈ پر تڑپ رہا تھا، بے چین، ہر سمت میں نگاہ دوڑاتے ہوئے، جیسے چھپنے یا بھاگنے کی بے کار کوشش کر رہا ہو۔ ”جاؤ... یہاں سے جاؤ تم بہت ہیبت ناک ہو“ اس کے کانپتے لبوں سے الفاظ بو جھل اور خستہ حال نکلے، مگر ان میں کوئی اثر نہ تھا۔

قسمت کی بے رحم گرفت نے اسے جکڑ رکھا تھا، اس کی روح جیسے قید تھی اور بدن بے بس۔

گونا گونا اپنی گہری آنکھوں کو اسکرین پر جمائے رکھے ہوئے تھا، اس کے چہرے پر ہلکی سی تیوری تھی، جیسے وہ مونیٹر کی اس اذیت سے ایک عجیب لذت کشید کر رہا ہو۔

اس کی خاموش مسکراہٹ اس دکھ کا مشاہدہ کر رہی تھی جو مونیٹر کو دبوچ چکا تھا، مگر پھر یکایک اس کے تاثرات میں تبدیلی آئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، جیسے اس نے کچھ انوکھا دیکھ لیا ہو۔ مونیٹر کس سے اتنا خوف زدہ تھا؟ کون تھا وہاں جسے وہ جانے کا کہہ رہا تھا؟

یکدم مونیٹر کی کمر جھٹکے سے پیچھے کو پلٹی، اس کا پاؤں لرزنے لگا، جیسے وہ کسی آن دیکھی زنجیر سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہو، مگر ناکام۔

اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا، تڑپ اس کے پورے وجود کو جکڑنے لگی۔ وہ سانس لینے کے لیے ہانپنے لگا، اس کی سانسیں بھاری اور بے ترتیب ہو چکی تھیں۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگی، جیسے اندرونی تکلیف کا اظہار ہو۔

آنکھیں الٹی ہو گئیں، اور جسم میں آخری جھٹکا ہوا — ایک دردناک لمحہ، جس میں زندگی نے اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

پھر اسکرین پر ایک ناقابل برداشت سکوت چھا گیا، اور فلیٹ لائن کی سرد، بے رحم آواز نے کمرے کو موت کی خاموشی سے بھر دیا۔

جوں ہی سکرین نے جیل کے منظر کو واضح کیا، کمرے میں ایک عجیب سرد سکوت چھا گیا۔ بہرامند کھوسٹ، ایک وقار یافتہ پروڈیوسر جس کی زندگی کے ہر رنگ میں میڈیا کی جادوگری رچی بسی تھی، اب ایک تاریک کوٹھڑی میں تنہا بیٹھا تھا۔

اس کے ہاتھ میں ایک پرانی کتاب تھی، جس کے صفحات جیسے زندگی کی تلخیوں سے جھلس گئے ہوں۔ وہ اس گہرے سکوت میں اپنی زندگی کے لمحے شمار کر رہا تھا، جیسے کسی انجام کے قریب پہنچ چکا ہو۔

دفعۃً، دروازے پر بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ ایک مرد پولیس کی وردی میں آیا، جس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی، گویا اس کے لبوں پر چھپی ہوئی مکاری اور سازش کا پرتو تھا۔

اس نے ایک ٹوکری بہرامند کے سامنے رکھی، جس پر کپڑا پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر وہ شخص چپکے سے مسکرایا اور بائیں آنکھ دبا کر بولا، ”یہ تمہارا یہاں سے نکلنے کا ٹکٹ ہے، ہمارے لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

اس کی آواز میں جواز ہر تھا، بہرامند نے اسے فوراً محسوس کیا، مگر اپنی بے بسی کے عالم میں، اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ آدمی دروازے سے نکلتے وقت ایک آخری نظر ڈال کر گیا، جیسے اس نے اپنے شکار کو ایک آخری بار مشاہدہ کیا ہو، پھر وہ دروازہ بند کر گیا۔

گونار اپنی نشست سے سکون سے دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں کسی قسم کی حیرانی نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ آدمی بھی ایلومیناتی کا ایک ایجنٹ تھا، اور جو کچھ وہ بہرامند کے لیے چھوڑ کر گیا تھا، وہ کوئی ہمدردی نہ تھی بلکہ ایک بھیانک سزا تھی۔

بہرامند نے بے یقینی سے ٹوکری کی طرف دیکھا، جیسے اس میں چھپے راز کو پہچاننے سے قاصر ہو۔ اس کے ہاتھ لرزتے ہوئے آگے بڑھے اور اس نے کپڑا ہٹا دیا۔ آنکھوں کے سامنے جیسے موت کا نقاب اتر گیا ہو، ایک کوبرا سانپ ٹوکری میں بل کھائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے چمکتے ہوئے دانتوں میں زہر کا اثر تھا، جیسے وہ صرف اپنے شکار کے انتظار میں ہو۔

بہرامند کی چیخ گونجی، وہ حواس باختہ کتاب سانپ کی طرف پھینک بیٹھا، مگر کتاب بے اثر زمین پر جا گری۔ سانپ کی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگیں، اور وہ لپک کر بہرامند کی گردن میں اپنے نوکیلے دانت گاڑھ بیٹھا۔

زہر بہرامند کی رگوں میں پھیلنے لگا، ایک ناقابل برداشت جلن اور اذیت کا طوفان اٹھا۔

اس کے ہاتھ بے چینی سے گردن پر جا پہنچے، جہاں کوبرانے اپنے زہریلے دانت اتارے تھے۔ اس کے جسم نے لرزنا شروع کیا، جیسے زندگی کا ہر ذرا، ہر نسج ایک آخری بار تڑپ رہا ہو۔

بہرامند کا سانس اکھڑنے لگا، اس کی آنکھیں پھیل گئیں، لب خشک ہو گئے۔ درد کی شدت اتنی تھی کہ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

زہر نے تیزی سے اس کے وجود کو جکڑ لیا، سانس کے لیے ہانپتے ہوئے، اس نے گردن کے آس پاس انگلیاں جمائے رکھی، مگر وقت کا پہیہ رک چکا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ، زندگی اس کے جسم سے نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اور ایک آخری لرزتی ہوئی چیخ کے ساتھ، وہ فرش پر بے جان ہو کر گر پڑا۔

سکرین پر اس کا ساکت جسم، خون آلود چہرہ اور بے جان آنکھیں دکھائی دینے لگیں، جو موت کے سرد سائے میں ڈھل چکی تھیں۔ ویڈیو کا یہ منظر ایک بار پھر سیاہ پردے میں بدل گیا۔

گونار نے ایک گہرا سانس لیا، جیسے یہ سب اس کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہو۔ اس کی آنکھوں میں نہ کوئی حیرت تھی اور نہ ہی کسی جذبات کی جھلک۔ وہ ایلو میناٹی کے اصولوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے ایجیکٹ کا بٹن دبایا، کیسٹ نکالی، اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

کیوں کہ اب یہ کیسٹ بے کار ہو چکی تھی۔ ایک بار دیکھنے کے بعد اس کی حیثیت یوں تھی کہ دوبارہ چلانے پر صرف تاریکی میں ڈوبی ہوئی سیاہ اسکرین نظر آتی تھی، جیسے کوئی بھید چھپانے کے لیے اسے جان بوجھ کر مٹا دیا گیا ہو۔ یہ کیسٹ اب محض ایک بے جان خول تھی، جس میں کبھی کی گئی ریکارڈنگ کی کوئی رمت باقی نہ رہی تھی۔

بہر حال گونار کو مونیز یا بہر امند کھوسٹ کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ نہ ہی ایلو میناتی کے ایجنڈے کی فکر تھی۔

اس کی تمام تر توجہ اور مقصد صرف ایک چیز پر مرکوز تھا—ایمان۔ اس کا دل ایمان کی محبت میں قید تھا، اور وہ جلد سے جلد پاکستان جا کر اس کو اپنے دل کی حقیقت بتانا چاہتا تھا۔ باقی سب کچھ غیر اہم تھا۔

...°...

ایمان نے شلوار قمیض زیب تن کر رکھی تھی، سر پر حجاب لپیٹا اور اوپر ایک طویل چادر ڈال لی۔ عبایا پہننے کا مرحلہ ابھی باقی تھا، اس کے لیے اسے مزید وقت درکار تھا۔ وہ گاڑی کی ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ گئی اور ریڑیو پر مرر میں خود کو بغور دیکھا۔

ایک ہلکی سی گہری سانس لیتے ہوئے، اس نے اپنے فون پر ایک نمبر ڈائل کیا اور جواب کا منتظر رہی۔ سپیکر کا بٹن دبا کر فون کو ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

۔ ”السلام علیکم، انکل حاشر۔ میں ایمان بول رہی ہوں، کیا آپ کو یاد ہوں؟“ اس کی آواز میں دھیمی سی لرزش تھی، جسے وہ اپنی بے چینی کے پردے میں چھپانے کی سعی کر رہی تھی۔ دوسری طرف سے ایک نرم اور مانوس مسکراہٹ میں لپٹی آواز آئی، ”ایمان بیٹا، پہچان لیا میں نے آپ کو۔ کیسی ہو؟ کیسے یاد کیا؟“۔ ایمان نے اپنے ہونٹوں کو بے ساختہ کاٹتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا، گویا اپنے الفاظ کو ترتیب دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ ”انکل، مجھے آپ سے ایک بہت اہم معاملے پر گفتگو کرنی ہے۔ کیا آپ سے فوراً ملاقات ہو سکتی ہے؟ میں چاہ رہی تھی کہ ہم ایف-8 کے کسی ریستوران میں ملیں۔ یہ بات فون پر نہیں ہو سکتی، پلیز، یہ بہت ضروری ہے۔“۔

دوسری طرف ایک پل کی خاموشی کے بعد، ایک دوستانہ رضامندی بھری آواز سنائی دی۔ ”ٹھیک ہے، ایمان بیٹا، تمہاری بات سننے کو تیار ہوں۔ کب ملنا چاہتی ہو؟“۔

ایمان نے جلدی سے جواب دیا، ”بہت شکریہ، انکل حاشر۔ آپ کا بہت شکریہ۔ میں بس ابھی پہنچ رہی ہوں۔“۔

اس نے گاڑی کی چابی گھمائی اور انجن کی گونج سنائی دی۔ ”جی انکل، ایف-8 کا وہ ہی ریستوران۔ بالکل، میں جلدی پہنچ رہی ہوں۔ اللہ حافظ۔“۔

فون بند کرتے ہی اس نے گاڑی کو رفتار دی اور تیزی سے روانہ ہو گئی۔ دل میں ایک عجیب بے چینی اور گھبراہٹ تھی جو قدم قدم پر اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

اسے امید تھی کہ حاشر اس کی بات پر شک نہیں کریں گے اور غیر ضروری سوالات سے گریز کریں گے۔ ایمان کے ذہن میں ایک واضح منصوبہ تھا، اور اسے ہر حال میں اس پر قائم رہنا تھا۔

...°...

بارش کی بوندیں شیشے سے یوں ٹکرا رہی تھیں جیسے قدرت کے دل کی دھڑکنیں ان کے اندرونی اضطراب کی گواہ ہوں۔ بجلی کی تیز چمک لمحہ بہ لمحہ روشنی کا ایک ہیجان برپا کرتی اور پھر ماحول پھر سے نیم اندھیروں میں ڈوب جاتا۔

ریستوراں کی مدہم روشنی میں، جہاں باہر کا طوفانی موسم اپنی داستان سناتا تھا، ایمان اور حاشر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایمان کا چہرہ بار بار بجلی کی روشنی سے چند لمحوں کے لیے روشن ہو جاتا اور پھر ایک بار پھر دھند لکوں میں چھپ جاتا۔

حاشر کی نظریں ایمان کے حجاب میں ملفوف چہرے پر جمی ہوئی تھیں، حیرت اور استعجاب کی لہر اس کے اندر سرایت کر چکی تھی۔

کبھی وہ مغربی لباس میں ملبوس ہوتی تھی، اور اب اس کی مکمل اسلامی پوشاک نے گویا اس کی ذات میں انقلاب کی خبر دی تھی، جو حاشر کے دل میں ایک خاموش مسرت کا باعث بن رہی تھی۔

خود حاشر، وقت کے تھپیڑوں کے باوجود، اپنے پرانے وقار اور سکون کی تصویر بنا ہوا تھا۔

اس کے چہرے کی وہ ہی مانوس نرمی ابھی بھی برقرار تھی، مگر اب اس کے ماتھے اور کنپٹیوں پر اترتی ہوئی سفیدی نے عمر کی گہرائی اور زندگی کے تجربات کی خاموش گواہی دی تھی۔

ہر سفید بال گویا ایک نہ کہی کہانی کا نشان تھا، جو اس کی ذات کے نشیب و فراز کی عکاسی کر رہا تھا۔

۔ اس نے اپنی نرم، گرم آواز میں کہا، ”بیٹی، کیا ہوا؟“۔

ایمان نے گہرا سانس لیا، گویا الفاظ اس کے لبوں سے نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہوں۔ ”انکل حاشر... میری وہ تمام جائیداد جو دادی نے میرے نام کی تھی، میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے جتنی کے نام کر دیں۔“ اس کی آواز دھیمی، لیکن فیصلہ کن تھی۔۔

حاشر چونک کر آگے جھک گیا۔ ”بیٹی، تمہیں اندازہ ہے کہ اگر یہ جائیداد تمہارے باپ کے نام ہو گئی تو وہ تمہارے ساتھ کیا کرے گا؟ وہ ابھی خاموش ہے کیوں کہ جائیداد تمہارے نام ہے، لیکن اگر یہ اس کے

ہاتھ لگ گئی تو... تم جانتی ہو، وہ تمہیں کس طرح برباد کر دے گا؟” اس کی آنکھوں میں غصے اور تشویش کی جھلک تھی۔۔

ایمان نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظریں جھکائیں، لیکن پھر اپنی بات جاری رکھنے سے پہلے بجلی کی ایک زور دار چمک نے پورا ماحول روشن کر دیا۔ ”انکل، میں جانتی ہوں کہ دادی نے یہ سب کچھ میرے نام کیا تھا تاکہ وہ مجھے نقصان نہ پہنچا سکے، لیکن مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ سب چھوڑ کر جانا چاہتی ہوں۔ یہ دولت، یہ دنیاوی آسائشیں... یہ میرے زخموں کا مداوا نہیں ہیں۔“

حاشر نے سوالیہ نظروں سے ایمان کو دیکھا، اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے، ایمان نے اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا،

۔ ”انکل، ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ بت صرف سنگ و خشت کے ہوتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شے جو انسان کے دل میں اللہ کی محبت سے بڑھ کر جگہ پالے، وہ ہی بت بن جاتی ہے۔ میرے لیے یہ دولت و جائیداد بھی ایک بت کی مانند ہے۔ یہ دنیوی ساز و سامان میرے دل کی خلش اور اندرونی کرب کو کبھی زائل نہیں کر سکتے۔“

حاشر خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا، اس کے چہرے پر غور و فکر کی کیفیت تھی۔

ایمان کی نظریں بارش کے قطروں پر ٹکی تھیں جو شیشے پر نقش و نگار بنا رہے تھے، اور پھر اس نے ایک لرزتی ہوئی سانس لی۔ ”انکل، جب بچپن میں ہم بلاوجہ مسکراتے ہیں، وہ مسکراہٹیں خالص ہوتی ہیں۔ لیکن جب ہم بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ ہی مسکراہٹیں ہمارے دکھوں کا پردہ بن جاتی ہیں۔ میں بچپن سے مسکراہٹ کے پیچھے درد چھپاتی آئی ہوں۔“

حاشر کے چہرے پر ملال کی ایک لہر چھا گئی، لیکن وہ ایمان کی بات کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ ایمان کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

۔ ”لیکن بیٹی...“ اس نے ایک آخری کوشش کی، ”تمہارے والد... وہ کبھی نہیں مانیں گے، وہ تمہیں... باہر نکال دے گا۔“

ایمان نے اپنی نظریں اس پر جمائیں، جیسے اپنی بات کی گہرائی میں اسے ڈبونا چاہ رہی ہو۔ ”انکل، کبھی کبھی ہمیں اپنی مرضی کے نتائج بھگتنے کے لیے خود کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ اور میں تیار ہوں۔“

حاشر نے خاموشی سے گہرا سانس لیا، چائے کا کپ اٹھایا، اور اس کا گھونٹ لیا۔ باہر طوفان نے ایک اور زور دار گرج کی، گویا قدرت بھی ایمان کی پیچیدہ زندگی کے بارے میں اپنی خاموش رائے دے رہی ہو۔

پارک کے مناظر اس شام اور زیادہ دلفریب تھے جب برف ہر طرف سفید چادر کی مانند پھیلی ہوئی تھی۔
اونچے درختوں کی ننگی شاخیں برف کی سفید جھالروں سے ڈھکی ہوئی تھیں، اور آسمان کا نیلا پن ان پر
حیرت انگیز طور پر اپنا عکس چھوڑ رہا تھا۔

برف پر قدموں کی آہٹ کی کھنک، پارک کی خاموشی کو ایک عجیب سا جادوئی رنگ دے رہی تھی۔
پروفیسر تراب اور گونار، ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملا کر چل رہے تھے، لیکن ان کے لباس اور
شخصیتوں میں ایک نمایاں تضاد تھا۔

گونار نے میرون رنگ کی ٹرٹل نیک شرٹ پہن رکھی تھی، جو اس کے چوڑے سینے اور مضبوط بازوؤں کو
ایسے لپیٹے ہوئے تھی جیسے وہ اس کے جسم کا حصہ ہو۔

شرٹ کی نرم کپاس اس کے جسم کی ہر خدو خال کو واضح کر رہی تھی، جیسے یہ کپڑے نہیں بلکہ اس کے اپنے
پٹھوں کی ایک قدرتی جھلک ہو۔

اس کی سیاہ ڈریس پیٹ، جو اس کی لمبی اور متوازن ٹانگوں پر نفاست سے جمی ہوئی تھی، اس کے فیشن کے
اعلیٰ ذوق اور شان دار شخصیت کی غماز تھی۔

چیلیسی بوٹس، جو چمکدار اور سیاہ تھے، اس کے قدموں کی مضبوطی اور عزم کو ظاہر کر رہے تھے، جیسے وہ کسی جنگجو کی طرح ہر لمحہ تیار ہو۔

اس کا لباس نہ صرف فیشن کی علامت تھا، بلکہ یہ اس کی غیر معمولی شخصیت اور شاؤلن راہب کی تربیت کی عکاسی بھی کر رہا تھا۔

موسم کی سردی اس کے لیے بے معنی تھی۔ وہ اس سردی کو محسوس ہی نہیں کر رہا تھا، جیسے یہ اس کی جلد تک پہنچنے میں ناکام رہی ہو۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس کی طاقت کا اندازہ اس کی سادگی اور سرد مہری سے لگایا جاسکتا تھا۔

سردی یا گرمی اس کے لیے کچھ بھی نہیں تھی۔ اگرچہ وہ لوگوں کی نظر میں مناسب لباس پہنتا تھا، مگر اس کی اصل ضرورت صرف یہ تھی کہ وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں میں ہم آہنگی پیدا کرے، تاکہ لوگ اسے دوسری دنیا کی مخلوق نہ سمجھیں۔

دوسری جانب پروفیسر تراب بھاری جیکٹ اور گرم شوز میں لپٹے ہوئے تھے۔ ان کے قدم ہر بار برف میں دھنس جاتے اور پیچھے نشانات چھوڑ جاتے، جیسے وہ برف میں اپنے سفر کا نقشہ بنا رہے ہوں۔

گونار کا چہرہ بے تاثر تھا، لیکن اس کی آنکھوں میں ایک سرد مہری اور غصے کا شعلہ چمک رہا تھا۔ ”میں ایمان کے بارے میں پریشان ہوں،“ وہ سرد لہجے میں بولا، اس کی آواز میں ایک عجیب قسم کی تھکن اور اداسی تھی۔

اس کے لبوں پر ایک عجیب سکوت چھایا ہوا تھا۔ ”اس کے گھر والے اس کے ساتھ وہ سلوک کرتے ہیں جیسے وہ کوئی بوجھ ہو۔ اس کے باپ نے اسے کبھی وہ محبت نہیں دی جس کی وہ مستحق تھی۔ وہ مردوں سے نفرت کرتی ہے کیوں کہ اس کا باپ ہمیشہ اس سے دور رہا، جیسے وہ اس کے لیے غیر موجود ہو۔“

گونار کی نگاہیں دور افق پر جمی ہوئی تھیں، لیکن اس کے چہرے کی سختی نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اندر ہی اندر ایک شدید جنگ لڑ رہا تھا۔ اس کے مضبوط جڑے بھینچے ہوئے تھے اور مٹھیاں سختی سے بند تھیں۔

وہ جانتا تھا کہ وہ ایمان کی تکلیف کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں دے سکتا، کیوں کہ وہ ایمان کی عزت کا محافظ تھا۔ پروفیسر تراب جیسے درویش انسان کو بھی وہ یہ سب نہیں بتا سکتا تھا، کیوں کہ ایمان کا درد اس کا ذاتی معاملہ تھا، اور گونار اسے کبھی کسی کے سامنے بے نقاب نہیں ہونے دے گا۔

پروفیسر تراب نے گونار کی باتیں سن کر آہستہ سے سر ہلایا اور نرمی سے پوچھا، ”تو تم اب کیا کرو گے؟“

گونار نے اپنی آنکھیں پروفیسر پر مرکوز کیں۔ اس کے لہجے میں سردی اور غصہ چھپائے نہیں چھپ رہا تھا، ”اگر ایمان چاہتی، تو میں ان لوگوں کو اس دنیا میں دکھ دے کر جہنم دکھاتا، لیکن وہ چاہتی ہے کہ ان کے

گناہ اس دنیا میں پوشیدہ رہیں اور وہ آخرت میں اپنے کیے کا حساب دیں۔ میں نے پہلی بار اسے روتے ہوئے سنا جب اس نے کہا کہ وہ چاہتی تھی کہ مولوی سرور کا شاگرد اسے اس دن مار دیتا جب وہ اسے کالے جادو کی قربانی کے لیے منتخب کر رہا تھا۔”

پروفیسر تراب مولوی سرور کا ذکر سن کر رک گئے، ان کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کی آمیزش تھی۔ “کون سا مولوی؟” انہوں نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا، جیسے وہ سننا نہیں چاہتے تھے جو انہوں نے ابھی سنا تھا۔

گونار نے چونک کر جواب دیا، “مولوی سرور۔ آپ اسے جانتے ہیں؟”

پروفیسر تراب کا چہرہ ایک گہری سنجیدگی میں بدل گیا۔ ان کے اندر غصہ، غم اور حیرانی کے جذبات ایک ساتھ جاگ اٹھے۔

انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے دل گرفتہ لہجے میں کہا، “وہ میری بہو کا باپ تھا، سرور۔ وہ کالا جادو کرتا تھا۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہو گا۔ اُس نے میری بہن سے شادی کی اور جب میری بہن کو اُس کا اصل مکروہ چہرہ نظر آیا، اُس نے اُسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں اپنی بھانجیوں کو اس سچائی سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا، انہیں دُکھ دینا نہیں چاہتا تھا، مگر حقیقت چھپی نہ رہ سکی۔”

تراب نے دھیمالہجہ اپناتے ہوئے مزید کہا، ”سرور اب مرچکا ہے، اور اُس کا مرید بھی انجام کو پہنچ چکا ہے، لیکن فکر مت کرو۔ اگر ایمان اُسے جانتی ہے تو یہ طے ہے کہ میری بھانجی سندس بھی ایمان کو جانتی ہوگی۔ میں سندس کو جلد ایمان کے پاس بھیج دوں گا، وہ اُس کی مدد کرے گی۔“

گونار نے تراب کی بات سن کر اپنے اندر ایک عجیب سی راحت کی لہر محسوس کی، گویا اُس کے سینے سے بوجھ اتر گیا ہو۔ اُس کی آنکھوں میں پہلی بار امید کی چمک نمودار ہوئی۔ وہ پروفیسر تراب کی طرف دیکھ کر خلوص کے ساتھ مسکرایا اور نرم لہجے میں کہا، ”شکریہ، پروفیسر تراب۔ آپ ایک سچے دوست ہیں۔“

پروفیسر تراب نے دوستانہ انداز میں گونار کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا، جیسے اس کی حمایت اور یکجہتی کا اظہار کر رہے ہوں۔ ان دونوں کے دلوں میں ایمان کی حفاظت کا عزم جاگزیں تھا، اور گونار کو ایمان سے ملانے کی خواہش نے ان کے قدموں میں استقامت پیدا کر دی تھی۔

انہوں نے اس نئے عہد کے ساتھ ایک بار پھر خاموشی سے چلنا شروع کر دیا، جیسے ان کے درمیان اب کوئی لفظ نہ بچا ہو جسے ادا کیا جائے، سوائے عمل کے۔

...°...

سندس ہنزہ کی برا فراز سڑک کے کنارے چل رہی تھی، جہاں دائیں بائیں برف پوش پہاڑوں کی چوٹیاں اپنی رفعت اور جمال کے ساتھ آسمان کو چھو رہی تھیں۔ پہاڑوں پر سورج کی روشنی کی پہلی کرنیں جیسے سفید چمک بکھیر رہی تھیں اور ہوائیں، جو ہر لمحے سرد تر ہو رہی تھیں، سندس کے چہرے پر ہلکی سی چھن چھوڑ رہی تھیں۔

اس نے اپنے آپ کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے عبایا کے ساتھ ایک گرم جیکٹ لپیٹی ہوئی تھی، جو اسے بیرونی سرد ہواؤں سے بچائے ہوئے تھی۔

اسی اثناء میں، سندس کی جیکٹ کی جیب سے ہلکی سی موبائل کی وائبریشن کی آواز سنائی دی۔ اس نے فون نکالا اور اسکرین پر نمودار نام دیکھ کر اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

یہ اس کے ماموں، پروفیسر تراب کی واٹس ایپ کال تھی، جو ہمیشہ اپنی محبت اور علم کی روشنی سے سندس کی زندگی میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔

۔ ”السلام علیکم، ماموں جان!“ سندس نے انتہائی گرمجوشی سے سلام عرض کیا۔

پروفیسر تراب کی گہری آواز سن کر سندس کو سکون محسوس ہوا، ”الحمد للہ، آپ کی بہو اور پوتا پوتی تینوں خیر و عافیت سے ہیں،“ اس نے خبر دیتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے خوشی کا اظہار کیا۔ پروفیسر تراب کی خوشی اس کے لیے باعثِ اطمینان تھی۔

چند لمحوں کی گفتگو کے بعد، سندس نے پروفیسر تراب کو اُس یتیم خانے کا ذکر کیا، جسے وہ اپنی بہن کے ساتھ مل کر ضرورت مند بچوں کے لیے بنا رہی تھی۔ جس کے بعد پروفیسر تراب نے ”ایمان“ کا تذکرہ کیا، جو زندگی کے ظلم و ستم سہتے ہوئے گمنامی کی وادیوں میں کھو چکی تھی۔

”ہاں ماموں، میں جانتی ہوں کہ ایمان ایک نیک سیرت لڑکی ہے، مگر ظالم ہاتھوں نے اسے بھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اسے اپنا نمبر دیا تھا، لیکن اُس نے کبھی رابطہ نہیں کیا۔“ سندس کی آواز میں ایک غیر مرئی اداسی کا رنگ نمایاں تھا، جیسے ماضی کے کسی دکھ بھرے لمحے کی یاد نے اُس کے دل کو چیر دیا ہو۔

سندس، جو بلا توقف بات کیے جا رہی تھی، اچانک ایک عجیب سی خلش نے اُس کے ذہن میں شعلہ سا بھڑکایا، جیسے کسی انجانے احساس نے اُس کے وجود کو جھنجھوڑ دیا ہو۔

وہ قدم روکتے ہوئے یلخت ساکت ہو گئی، جیسے لمحے کی صداقت نے اُس کی روح کو جکڑ لیا ہو۔

اُس کے دل کی دھڑکن گویا پل بھر کو تھم سی گئی، اور آنکھوں میں حیرت کا عکس جم سا گیا۔

بے اختیار اُس کی نگاہیں خلا میں کچھ تلاشنے لگیں، جیسے وقت نے اُس کے ارد گرد اپنی گردش روک دی ہو اور وہ ایک ناقابل بیان احساس کے شکنجے میں گرفتار ہو چکی ہو۔

”آپ ایمان کو کیسے جانتے ہیں، ماموں؟“ اُس نے حیرانی سے سوال کیا، اور پھر تیز قدموں سے چلنا شروع کیا۔

- ”اچھا، اگر آپ نہیں بتانا چاہتے تو مت بتائیں۔“ سندس نے دل میں شکوہ سا کرتے ہوئے کہا، اور گفتگو جاری رہی۔

اُسی دوران، ایک گاڑی نے گزرنے کے ساتھ ہی بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوڑے سے بھرے ایک شاپر کو سڑک کے کنارے پھینک دیا۔

اُس میں سنیکس کے خالی پیکٹ اور دیگر فضول اشیاء تھیں۔ سندس نے حقارت سے اُس شاپر کو زمین سے اٹھایا۔ آس پاس کوئی کچرے کا ڈبہ موجود نہیں تھا، اور سندس کو کوڑے کی یہ بدترین عادت نہایت نفرت انگیز محسوس ہوئی۔

دل میں ایک کراہیت کا احساس لیے، وہ پھر سے اپنی راہ پر چلنے لگی۔

- ”ماموں، میں جلد ہی اسلام آباد جاؤں گی، مگر فی الحال آپ جانتے ہیں کہ آپنی کو میری ضرورت ہے۔ جیسے ہی فرصت ملی، میرا پہلا کام یہ ہی ہو گا۔“ سندس نے پختہ ارادے کے ساتھ پروفیسر تراب کو یقین دلایا۔

- ”اللہ حافظ، اپنا خیال رکھیے گا، ماموں!“ سندس نے مکالمے کا اختتام کیا، اور فون جیب میں واپس رکھتے ہوئے برفانی ہوا کے سنگ سفر جاری رکھا۔

ہنرہ کی پُر عظمت فضا، اپنی برقیلے رنگ میں ڈھلی پہاڑی عظمتوں اور سکوتِ شب کی طرح خاموشی سے
لبریز تھی، مگر سندس کادل داخلی کشمکش اور سوالات کی گونج میں ہنوز دھڑک رہا تھا۔

...°... -

تین روز بعد...

ایمان آہستہ آہستہ زینے طے کر رہی تھی کہ اچانک نیچے لاؤنج سے خالدہ کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ وہ
رک گئی اور کان لگا کر سننے لگی۔ خالدہ جتوئی سے مخاطب تھی، ”تمہاری پہلی بیوی اسپتال میں داخل ہے،
بد نصیب۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کے گردے کام چھوڑ رہے ہیں اور حالت دن بہ دن بگڑ رہی ہے، شاید
وہ زندہ نہ بچے۔“

جتوئی کی بے حسی سے بھری آواز سنائی دی، ”تو پھر ہم کیا کریں؟“ اس نے ایسے پوچھا جیسے اس سے اس کا
کوئی واسطہ نہ ہو۔

ایمان کادل غصے اور افسوس سے بھر گیا۔ آمنہ، جو اس کی حیاتیاتی ماں تھی، نے کبھی اس کے ساتھ نرم رویہ
اختیار نہ کیا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنے شوہر آصف کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن کر ایمان کو زہر آلود باتوں سے داغدار کرتی رہی۔ ایمان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ باوجود اس کے کہ آمنہ نے ہمیشہ ظلم اور سنگدلی کا مظاہرہ کیا، پھر بھی وہ اس کی ماں تھی۔

نو مہینے اپنی کوکھ میں اسے برداشت کیا تھا، گو کہ وہ اسے دنیا میں لانا نہیں چاہتی تھی، مگر آخر کار اس کی ماں ہی تھی۔

ایمان کے دل میں کشمکش جاری تھی کہ آیا اسے اپنی ماں کی عیادت کے لیے جانا چاہیے یا نہیں، یا پھر ایک بار پھر اسے رد کر دیا جائے گا۔

اس کے قدم وہیں رکے رہے جب اس نے جتوئی کی آواز کی شدت میں تغیر محسوس کیا۔ جتوئی کا فون بجا اور اس نے خالدہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کال سننے لگا۔ ”ہاں، حاشر!“ اس نے حیران ہو کر کہا۔

تھوڑی دیر خاموشی سے سنا، پھر جیسے بجلی کے جھٹکے سے چلا اٹھا ”کیا؟“۔

اس نے حیرت بھری نگاہوں سے خالدہ کی طرف دیکھا، اور خالدہ تجسس سے اسے دیکھنے لگی۔ خالدہ نے بے چینی سے فون اس کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی، مگر جتوئی نے اسے روک دیا اور بولا، ”کیا واقعی ایمان نے ساری جائیداد میرے نام کر دی ہے؟ اچھا، میں فوراً آ رہا ہوں۔“۔

فون بند کرتے ہوئے جتوئی کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ خالدہ نے خوشی سے اچھلتے ہوئے پوچھا، ”کیا واقعی ایمان نے ساری جائیداد ہمارے حوالے کر دی ہے؟“۔

جتوئی نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ”بالکل!“ پھر ہاتھ آپس میں ملتے ہوئے بولا، ”ہمارا مقصد پورا ہو گیا!“۔

خالدہ کی آنکھوں میں چمک آگئی، ”پھر دیر کس بات کی؟ اسے دھکے دے کر باہر نکال دو۔ ہم نے اسے کافی سال برداشت کیا!“۔

خالدہ کی برسوں کی بغض اور کینہ آج اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا، اور جتوئی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، ”جو کرنا ہے کرو ہمیں تو ہماری جائیداد مل گئی!“ وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔

ایمان دروازے کے پیچھے یہ سب سن رہی تھی۔ دل کی گہرائیوں میں مایوسی اور کرب کی موجیں اٹھنے لگیں۔ اس نے خود کو ان کے ظلم سے نجات دلانے کے لیے جائیداد سے دستبردار ہو جانا قبول کیا تھا، لیکن یہ لوگ پھر بھی اپنے ارادوں میں سگندل اور بے مروت ہی رہے۔ ان کے دلوں میں کوئی احساس نہ تھا، بس اسے مزید ذلیل اور رسوا کرنا چاہتے تھے۔

ایمان نے دل میں کڑواہٹ کے ساتھ کہا، ”دنیا تو فانی ہے، لیکن روزِ محشر کی عدالت ہمیشہ کے لیے ہے۔“۔

وہ خاموشی سے زینے چڑھتی چلی گئی، اس کا لباس سادہ اور سیاہ تھا، اور سر پر چادر جھکی ہوئی۔ وہ ایک متقی اور عاجز لڑکی دکھائی دیتی تھی، جس نے دنیا کے جبر کو اپنی خاموشی میں سمولیا تھا۔

ایمان اتنی سادہ لوح ہر گز نہ تھی۔ اس نے پیشگی تدبیر کے طور پر اپنے بینک اکاؤنٹ سے پوری رقم، جو قریباً بیس کروڑ تھی، نکال کر حاشر کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی تھی۔

نہ صرف یہ بلکہ اس نے خاصے زیورات بھی خریدے اور وہ بینک لا کر میں محفوظ کر دیے تھے۔ وہ جتوئی اور خالدہ کے لیے کچھ بھی چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی، جنہوں نے ہمیشہ اسے ایک غلام کی طرح برتا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ایمان نے اپنا سفری بیگ نکالا اور ضروری کپڑے اس میں ڈالنے لگی۔ اس کے پاس باندھنے کے لیے زیادہ سامان نہیں تھا، بس چند کپڑے اور ضروری اشیاء۔

وہ اچانک کھڑکی کی طرف متوجہ ہوئی جہاں اس نے اپنی گلہریوں کو اندر آتے دیکھا۔ یہ چھوٹی مخلوقات اس گھر میں اس کی تنہائی کے دنوں کی اکلوتی ساتھی تھیں۔ وہ مسکرائی اور نیم ہنستے ہوئے کہا،

۔ ”کیا تم لوگ میرے ساتھ چلنا چاہو گے؟“ گلہریاں اس کی بات سمجھتے ہوئے کھڑکی سے پھرتی کے ساتھ باہر نکل گئیں، جیسے ایمان کا اشارہ مل چکا ہو۔

دوسری طرف خالدہ کا بلا، عجوہ، دروازے کے قریب کھڑا ایمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ خالدہ اگرچہ ایک ظالم عورت تھی، مگر عجوہ کو ایمان سے بے حد محبت تھی۔

ایمان نے اسے وقت پر کھانا دیا اور اکثر اس کے ساتھ کھیلتی تھی۔ عجوہ بھی، بظاہر، اس تبدیلی کا احساس کر رہا تھا۔ ایمان نے نرمی سے کہا، ”ہاں، تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔ آؤ، چپکے سے گاڑی میں سوار ہو جائیں تاکہ خالدہ کو خبر نہ ہو۔“

ایمان نے عجوہ کو آہستہ سے اٹھا کر ایک ٹوکری میں رکھا اور اسے کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ خالدہ اسے عجوہ کے ہمراہ دیکھے، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ اس پر غضب نازل ہو جائے گا۔

اس نے اپنا سفری بیگ اور عجوہ کی ٹوکری اٹھائی اور آخری بار اپنے کمرے کو دیکھا۔ وہ اس کمرے یا اس گھر سے کوئی خاص وابستگی محسوس نہیں کرتی تھی۔

یہ کمرہ جیسے اس کی زندگی کی اذیت کا عکس تھا۔ فرسودہ، بوسیدہ، دیواریں چھلک رہی تھیں اور فرش میں دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ بستر سخت تھا اور تکیہ بالکل پتلا۔ کھڑکی ٹوٹی ہوئی اور پردہ چاک تھا۔ ہر چیز اس کی مایوسی اور تنہائی کی کہانی سناتی تھی۔

ایمان نے ہلکی آہ بھری اور دھیمے لہجے میں کہا، ”اب اپنا خیال رکھنا۔“ یوں بولی جیسے یہ کمرہ کوئی جاندار ہو جو اس کی طرح دکھ سہتا رہا ہو۔ ”تم میرے درد اور آنسوؤں کے خاموش گواہ تھے۔ تم ہی وہ ہو جس نے

میرے دکھوں کا بوجھ سہا۔ لیکن اب مجھے تمہیں چھوڑنا ہے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں، لیکن میرا جانا ضروری ہے۔”

اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملائے، لیکن وہ انہیں پوچھ کر بولی ”میں نے یہاں کئی ڈراؤنے خواب دیکھے، کئی مصیبتیں جھیلیں، لیکن اب میں جارہی ہوں۔ امید ہے کہ تمہیں بھی کبھی سکون نصیب ہوگا، جیسے میں امید کر رہی ہوں کہ کہیں نہ کہیں مجھے بھی ملے گا۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹی اور دروازے سے باہر نکل گئی، بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے۔ دروازہ بند کر کے اس نے اسے مقفل کیا اور چابی فرش پر پھینک دی۔ اسے اب اس کمرے یا اس گھر کی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے فیصلے پر ثابت قدم تھی۔ اس نے اپنی قسمت کی باگیں خود سنبھال لی تھیں، اور اب وہ اپنے دل کی راہ پر گامزن ہو چکی تھی۔

ایمان نے بیگ اور ٹوکری تھامے ہوئے سیڑھیوں سے اترنا شروع کیا۔ دل میں عزم کی شمع روشن تھی اور نظریں مستقبل کے اجالے پر مرکوز تھیں۔

اس نے اس گھر کو، جو اس کے لیے قید و بند کی مانند تھا، ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ آزادی کی خاطر اس نے سب کچھ ترک کر دیا تھا۔ دل میں ایک منصوبہ تھا، ایک خاموش امید جس کا کسی کو علم نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی راہ دشوار ہے، لیکن اس کی منزل روشن تھی۔

دروازے کی دہلیز تک پہنچنے سے ذرا پہلے، اس کی نگاہ اپنی سوتیلی ماں خالدہ اور بہنوں پر پڑی۔ وہ کمرے میں بیٹھے، بے فکری سے ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے نمکین کھارہی تھیں۔ ان کے چہروں پر کوئی فکر یا دکھ کا سایہ تک نہ تھا۔ ایمان خاموشی سے ان کے سامنے سے گزرنے کی کوشش کر رہی تھی، کہ اچانک خالدہ کی طنزیہ آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

”دیکھو، یہ دیکھو! کیسے کمبل میں لپٹی ہوئی ہے۔“ خالدہ نے حقارت سے اس کی طرف اشارہ کیا اور اپنی بیٹیوں کو ہنسی میں شریک کیا۔ وہ سب بے حس و بے خبر، ایمان کا مذاق اڑانے لگیں۔ پہلے وہ ایمان کے مغربی لباس کا مذاق اڑاتے تھے اور اب اس کے پردے اور حجاب پر طنز کر رہے تھے۔ انہیں نہ اس کے احساسات کی پروا تھی، نہ اس کے ایمان کی۔

ایمان نے دل میں چھپنے والی تکلیف اور غصے کی لہر کو محسوس کیا، مگر اپنے چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہ آنے دیا۔ اس نے اس وڈیو میں قرآن کا ترجمہ پڑھا تھا کہ اگر کوئی تمہیں برا کہے تو تم جواب میں برائی نہ کرو۔ اس نے دل میں ایک مضبوط فیصلہ کیا اور نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”ہاں، اللہ نے مجھے ہدایت دی ہے۔ یہ نعمت توفیق کی صورت میں ملتی ہے، جو اللہ جسے چاہے دیتا ہے۔“ اس کے لہجے میں سکون اور اعتماد کی جھلک تھی۔ اس نے اپنی کمزوری کو ان کے سامنے عیاں نہیں ہونے دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے کبھی کمزور نہ سمجھیں۔

اس کے الفاظ سن کر خالدہ کی آنکھوں میں بے چینی کی جھلک پیدا ہوئی، لیکن اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور اس کے بیگ پر نظر ڈالی۔ خوش قسمتی سے، خالدہ نے ٹوکری نہیں دیکھی، جس میں ایمان کی محبت بھری ساتھی، عجوہ، آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔

خالدہ کو یہ گمان تک نہ تھا کہ ایمان اس بلے کو ساتھ لے جانے کا منصوبہ بنا چکی ہے، وہ بلا جس نے ہمیشہ ایمان کے ساتھ محبت کی اور اس کے دکھ کے لمحوں میں اس کا ساتھ دیا۔

۔ ”ہاں، بس اب دوبارہ اس گھر میں اپنی صورت نہ دکھانا!“ خالدہ نے سخت لہجے میں کہا، جیسے وہ بوجھ سے نجات پا چکی ہو۔ اس کے لہجے میں بے حسی اور سنگدلی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایمان ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے، جیسے وہ اس دنیا میں کبھی تھی ہی نہیں۔

ایمان آگے بڑھی اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر نرمی سے کہا، ”ہم میں یہ بات مشترک ہے۔، مگر ایک دن آئے گا جب ہم آخرت میں آمنے سامنے ہوں گے۔“ اس کی آواز میں ایک پرسکون یقین تھا۔ وہ حقیقت کی یاد دہانی کر رہی تھی، انہیں ان کے اعمال کے نتائج سے آگاہ کر رہی تھی۔ وہ امید کرتی تھی کہ شاید خالدہ اور اس کی بیٹیاں اپنے رویے پر نظر ثانی کریں اور بدل جائیں، لیکن یہ محض ایک خاموش امید تھی۔

خالدہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے ایک سرد لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی میں محسوس کی۔ آخرت کے ذکر نے اسے بے چینی میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ روز قیامت اور حساب کتاب کے بارے میں سننا بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے نظر پھیر لی اور ٹی وی کا ویلیم بڑھا دیا، جیسے وہ سب کچھ نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

ایمان خاموشی سے باہر نکل آئی اور اپنی مہران گاڑی کے قریب پہنچی۔ اس نے بیگ اور ٹوکری پچھلی سیٹ پر رکھ دی۔ ٹوکری کا کپڑا ہٹا کر عجوہ کو آزاد کیا۔

بارہ گلہریاں پہلے ہی پچھلی سیٹ پر موجود تھیں، جیسے وہ سفر کے لیے تیار تھیں۔ عجوہ کو دیکھتے ہی وہ سب گلہریاں خوشی سے جھومنے لگیں۔ ان سب کے بیچ، ایمان کو سکون ملا۔ یہ ننھی مخلوقات اس کی اصل ساتھی تھیں، اس کی دنیا تھیں۔

۔ ”ہم ایک نئی دنیا میں جا رہے ہیں، ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے جا رہے ہیں، جہاں ہمیں خوشی نصیب ہوگی۔“ اس نے دل میں جوش اور امید کے ساتھ کہا۔ وہ ان سب کی طرف محبت سے دیکھ رہی تھی۔

ایمان نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور دروازے بند کر کے آگے کا سفر شروع کیا۔ اس نے اپنے پیچھے گھر کو نہیں دیکھا۔ یہ وہی گھر تھا جس نے اس کی زندگی کو تاریک کر دیا تھا۔ یہاں صرف اذیت اور مایوسی کے سائے تھے، جن سے وہ ہمیشہ کے لیے دور ہو رہی تھی۔

جیسے ہی گاڑی آگے بڑھی، اچانک گھر سے خالدہ کی چیخ سنائی دی: ”عجوہ!“ درختوں پر بیٹھے کوئے گھبرا کر اڑنے لگے۔ خالدہ کو احساس ہو چکا تھا کہ ایمان عجوہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ وہ غصے سے چیختی چلاتی

باہر نکلی اور دور جاتی ہوئی ایمان کی گاڑی کو دیکھنے لگی۔ بے بسی اور غصے میں اس نے چپل اتار کر گاڑی کی طرف پھینکی، مگر وہ دور جا چکی تھی۔ خالدہ کی چیخوں میں حسرت اور شکست کی جھلک تھی۔

--

یہ ہی وہ لمحہ تھا جب خالدہ نے سب کچھ کھو دیا تھا۔ نہ صرف عجوہ، بلکہ خود پر اختیار بھی چھن چکا تھا۔ وہ تنہا اور بے بس کھڑی رہی، جبکہ کوئے ”کائیں کائیں“ کرتے ہوئے اس کے سر پر منڈلاتے، جیسے وہ بھی اس کی بربادی کا ماتم کر رہے ہوں۔ وہ اڑ گئے، ایمان کے پیچھے، جیسے اس کے نئے سفر کی گواہی دینے کے لیے۔ ایمان آگے دیکھ رہی تھی۔ پیچھے چھوڑا ہوا گھراب اس کے ماضی کا ایک دھندلا سایہ بن چکا تھا۔ وہ اب اپنے مستقبل کی طرف دیکھ رہی تھی، ایک نئی زندگی کی طرف جہاں امید اور روشنی کا سفر تھا۔

...°...

ایمان نے اسپتال کے ہجوم سے بھرے استقبالیہ میں قدم رکھا، اس کے ہاتھوں میں دبے پرس کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ وہ ایک بے چینی اور اُلجھن کے ساتھ استقبالیہ پر موجود کمرہ نمبروں کو بغور دیکھنے لگی۔ اس کی نظریں اس نشان کو تلاش کر رہی تھیں جسے وہ پانے آئی تھی۔ جب وہ ریسپشنسٹ کے قریب پہنچی تو ہلکی سی آواز میں بولی، ”کیا آپ مجھے آمنہ آصف کے بارے میں بتا سکتی ہیں؟ وہ کس کمرے میں ہیں؟“۔

رپیشنسٹ نے ایک لمحہ کے لیے اس کی طرف دیکھا، پھر کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جما کر چند کلکس کیے۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی، ”آمنہ آصف کمرہ نمبر بیس میں ہیں، دالان کے آخر میں بائیں طرف۔“

ایمان نے سر ہلایا اور ایک شکر گزار مسکراہٹ چہرے پر لا کر کہا، ”بہت شکریہ۔“ اس نے ہجوم سے بھرے ہال سے گزرتے ہوئے لوگوں اور وہیل چیئرز کو چکمتے ہوئے تیزی سے قدم بڑھائے، دل میں ایک عجیب سی بے چینی کے ساتھ۔

جب وہ کمرہ نمبر 20 کے سامنے پہنچی تو چند لمحے رک کر گہرا سانس لیا اور دروازے کا ہینڈل گھما کر اسے آہستگی سے کھولا۔

کمرہ کشادہ تھا، دھیمی روشنیوں میں گہرا، ایک بڑی کھڑکی سے شہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا، گویا وہ منظر بھی اس خاموشی کا حصہ تھا۔ بیڈ کے پاس مشینیں اپنی مخصوص آوازوں میں گنگنا رہی تھیں، جو آمنہ کی زندگی کے نازک پن کی گواہی دے رہی تھیں۔ وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی، مشینوں سے جڑی، اس کا رنگ زرد اور چہرہ تھکاوٹ سے جھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، گویا وہ ایک گہری نیند میں ہو۔

کمرے کے کونے میں موجود صوفے پر آصف بیٹھا تھا، ایک اخبار میں ڈوبا ہوا۔ جب ایمان کمرے میں داخل ہوئی تو آصف نے اخبار سے نظریں اٹھائیں، اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت ابھری۔ جیسے اس کے سامنے کھڑی ایمان نہیں، بلکہ کوئی روح ہو جس نے اسے ننگی تاروں سے جھٹکا دیا ہو۔ جو کہ خیر حقیقت بھی تھا۔

ایمان اُس کی نگاہوں کے رازوں سے بخوبی واقف تھی۔ اس کی ایسی حالت کو دیکھ کر ایمان کے لبوں پر ہنسی کا شائبہ تو ضرور آیا، مگر اُس نے خود کو ضبط کر لیا۔ لیکن جب آصف نے اسے اسلامی طرز کے لباس میں ملبوس دیکھا، تو ایک لمحے کے لیے حیرت نے اُسے آلیا۔ وہ غیر متزلزل وقار اور بے مثال سکون کی حامل نظر آرہی تھی، جیسے اُس کے باطن میں اٹھنے والے طوفانوں کے باوجود اُس کے وجود میں ایک عجیب ٹھہراؤ اور سکون پوشیدہ تھا۔

ایمان نے آصف پر ایک سرد نظر ڈالی اور خشک لہجے میں کہا، ”یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے اُن سے مخاطب ہونا ہے۔“ اس کی آواز میں نہ کوئی نرمائش تھی اور نہ ہی جذبات کی گرم جوشی، بلکہ ایک تخیل بستگی تھی جو اس کے عزم کو عیاں کر رہی تھی۔

آصف نے آمنہ کی طرف ایک سرسری نظر ڈالی، جو ابھی تک نیند میں تھی، پھر خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا، اس کی خاموشی میں ایک گہرا ڈر اور شکست عیاں تھی۔

ایمان آہستہ سے آمنہ کے پاس گئی، اس کا ہاتھ تھاما اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ آمنہ کا ہاتھ سرد تھا، اور نبض بہت ہلکی۔ ایمان نے آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا، پھر جھک کر سرگوشی میں بولی، “میں یہاں تمہاری حالت دیکھ کر تمہارا مذاق اڑانے نہیں آئی ہوں،۔۔”

ایمان آپ کی مرؤت سے فائق تھی۔ جو کچھ آمنہ نے اس کے ساتھ کیا تھا، اس کے باوجود کہ وہ اس کی خیریت دریافت کرنے آئی، یہ ایک غیر معمولی امر تھا۔ لیکن، آپ ہرگز نہیں۔۔۔

آمنہ کی پلکیں لرزیں، جیسے کسی بھاری بوجھ تلے دبی ہوں۔ اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں اور سامنے اپنی بیٹی کو دیکھا، جسے وہ برسوں سے نظر انداز کرتی رہی تھی۔ یہ وہ ہی بیٹی تھی جس کے دل کو توڑنے میں اس نے کبھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی تھی۔

آج وہ ہی بیٹی اُس کے سامنے تھی، لیکن اب وہ لڑکی نہیں رہی تھی، وہ ایک مضبوط عورت بن چکی تھی۔ آمنہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ایمان کے آنسو بھی ضبط کے باندھ توڑنے لگے۔ “ماں تو اپنے بچوں کی محافظ ہوتی ہے،” ایمان نے آہستگی سے کہا، “مرغی بھی ماں بن جائے تو بلی اس سے ڈرتی ہے۔ لیکن تم نے کبھی میری حفاظت نہیں کی، ہمیشہ اپنے شوہر کا ساتھ دیا۔۔”

ایمان کا سر جھک گیا، اس نے اپنی انگلیوں کے پوروں کو چھوا اور ہلکی آواز میں بولی، “پھر بھی... تم میری ماں ہو۔ اور مجھے یہاں آنا ہی تھا۔۔”

آمنہ زور زور سے رونے لگی، ندامت اور گناہ کے احساس نے اُس کے دل کو مفلوج کر دیا تھا۔ وہ برسوں کی خطاؤں کا بوجھ اٹھائے ہوئے اپنی بیٹی کو گلے لگانا چاہتی تھی، معافی مانگنا چاہتی تھی، ہر زخم کو بھر دینا چاہتی تھی۔ لیکن الفاظ اس کے لبوں پر نہیں آرہے تھے۔

ایمان نے ماں کے دل کی تڑپ کو محسوس کیا اور اُس کے قریب آکر اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ ایمان نے پہلی بار اپنی ماں کی محبت کو محسوس کیا، جو برسوں کی سرد مہری کے نیچے کہیں چھپی ہوئی تھی۔

آمنہ روتے ہوئے بولی، ”مجھے معاف کر دو، میری بچی، میں تمہاری گناہ گار ہوں۔ میں نے کبھی تمہاری حفاظت نہیں کی، میں نے ہمیشہ غلطی کی۔“

ایمان نے ماں کے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے آہستہ سے کہا، ”تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، اور میرے لیے یہ ہی کافی ہے۔“

آمنہ کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں، گویا برسوں کی ندامت ایک ہی پل میں اس کے دل سے چھلک رہی ہو۔ نرسوں نے کمرے کے باہر سے جھانک کر دیکھا، لیکن ایمان نے انہیں تسلی دی کہ سب ٹھیک ہے۔

ایمان نے ماں کے آنسو پونچھے اور کہا، ”تمہیں ایک گردے کی ضرورت ہے نا؟ میں اپنا گردہ دوں گی۔“

آمنہ نے ایک کمزور سی مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی کی، ”ایمان...“ اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ایمان نے ماں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھا، ”تمہیں کچھ نہیں ہوگا، ل۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“۔
پھر ایمان بیڈ سے اٹھی، ”تم آرام کرو۔“ اس نے اپنا موبائل نکالا اور یوٹیوب پر قاری عبدالباسط کی آواز میں سورۃ الرحمن کی آیات چلائیں۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے یہ ہی سنتی آرہی تھی، ان الفاظ میں اسے سکون ملتا تھا۔

جب ایمان کمرے سے باہر نکلی تو اس نے آصف کو دیکھا، وہ دالان میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور غصے کی جھلک تھی، جیسے وہ ایمان کی موجودگی سے مضطرب ہو۔ ایمان کو یاد آیا کہ کس طرح اس نے ماضی میں اسے تکلیف پہنچائی تھی، اور کیسے ایمان نے انتقام لیا تھا اسے بجلی کے ننگی تاروں سے جھٹکے لگا کر۔

ایمان نے اسے مضبوط لہجے میں کہا، ”میں اپنا گردہ دینے کے لیے تیار ہوں کیوں کہ قرآن ہمیں والدین سے حسن سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔ میں وہ ہی کر رہی ہوں جو میرے رب نے کہا ہے۔ ڈاکٹر سے بات کرو، میں چاہتی ہوں کہ وہ میرا آپریشن کریں۔“۔

آصف نے ایمان کو گھور کر دیکھا، پھر دروازے کے شیشے سے آمنہ کی طرف نگاہ ڈالی، جو بیڈ پر بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے دوبارہ ایمان کی طرف دیکھا، ”تم مان گئی؟“ اس کے لہجے میں حیرت اور سکون کی آمیزش تھی۔

ایمان نے گہری سانس لی، ”ہاں، جب میرا گردہ ماں کے ساتھ میچ کر رہا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لوگ آدھے گردے پر بھی زندہ رہتے ہیں۔“ اس کے الفاظ پر اعتماد تھے، لیکن دل میں ایک ہلکی سی کپکپاہٹ نے اسے جکڑ لیا۔

آصف نے سر ہلایا، ”ٹھیک ہے، چلو میں تمام بندوبست کرواتا ہوں“ وہ فوراً فون کے پاس پہنچا، جیسے وہ جلد از جلد اس معاملے کو انجام تک پہنچانا چاہتا ہو۔

ایمان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا، اسے آصف کی بے قراری بالکل پسند نہیں آئی۔ آصف کی نظروں میں کچھ عجیب تھا، جیسے کوئی خفیہ منصوبہ ہو۔ آصف نے اس کی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے کہا، ”میں چاہتا ہوں کہ سب کچھ جلد ہو جائے، میں آمنہ کو صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔“

آصف نے ایک بناوٹی مسکراہٹ چہرے پر سجائی، لیکن ایمان نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے سر ہلایا، ”مممم، ٹھیک ہے۔“ مگر دل میں شک کے بیج بوئے۔

دو دن بعد، رات کے سناٹے میں جب اسپتال کی راہداریوں میں عموماً خاموشی اور سکوت ہوتا ہے، آصف ایک ڈاکٹر کے ساتھ دبے قدموں آمنہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ ایمان پہلے ہی وہاں موجود تھی، گہرے خیالوں میں گم، ماں کے ساتھ گردے کی منتقلی پر آمادہ ہو چکی تھی۔

ایمان کے چہرے پر سکون اور اضطراب کی عجیب سی آمیزش تھی۔ وہ اپنی ماں کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی، مگر اندر ہی اندر ایک نامعلوم خدشہ اسے گھیرا ہوا تھا۔

آمنہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی، بظاہر کمزور اور بے کس نظر آتی، لیکن اُس کے اندر ایک سرد منصوبہ بندی اور بغض چھپا ہوا تھا۔ درحقیقت، وہ بالکل تندرست تھی،

اس کا جراحی عمل پہلے ہی انجام پا چکا تھا اور گردے کی پیوند کاری ہو چکی تھی، مگر وہ ایمان کو فریب میں مبتلا کر رہی تھی، دھوکے کی تاریکیوں میں اسے گھسیٹ رہی تھی۔۔۔

یہ سب آصف اور آمنہ کی منصوبہ بندی کا حصہ تھا، جس کا مقصد صرف ایمان سے انتقام لینا تھا، اُس دن کا انتقام جب ایمان نے آصف کو بجلی کے جھٹکوں سے ذلیل کیا تھا۔

ڈاکٹر نے ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کمرے میں قدم رکھا اور جعلی کلپ بورڈ کو دیکھتے ہوئے خوشخبری سنائی، ”مبارک ہو، گردے کا میچ ہو گیا ہے۔“ اس کی آواز میں ایک عجیب سی مٹھاس تھی، گویا وہ ایک غیر مرئی دھاگے سے پردہ اٹھا رہا ہو۔

ایمان نے نادانستہ طور پر مسکراتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا، لیکن دل کے کسی کونے میں ایک ہلکی سی کڑواہٹ تیرنے لگی۔ اسے اندر سے بے چینی کا سامنا تھا، جیسے کوئی ان دیکھے خطرے کا اشارہ دے رہا ہو۔ ڈاکٹر نے آمنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”اب آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی، آمنہ صاحبہ۔“ پھر ایمان کی طرف رخ کیا اور دھیمی آواز میں کہا، ”بیٹی، تم بہت بہادر ہو، ماں کے لیے اپنی جان کی بازی لگا رہی ہو۔“

ایمان نے ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائی، لیکن اس کے دل میں وہ ہی پرانی چبھن پھر جاگ اٹھی۔ وہ لمحے بھولنے کے قابل نہ تھے جب اس کی ماں نے ہمیشہ آصف کا ساتھ دیا تھا، اور ایمان کو کبھی اپنی آغوش میں نہ لیا۔

ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کلپ بورڈ کو بند کرتے ہوئے کہا، ”چلیں، ہم آپریشن تھیٹر تیار کرتے ہیں، آپ لوگ تیار ہو جائیں۔“ اس کی آواز میں کچھ پراسراریت جھلکتی تھی، جیسے کسی خفیہ ارادے کی بازگشت ہو۔

ڈاکٹر کمرے سے نکلنے لگا، آصف بھی اس کے ساتھ ساتھ چل دیا، مگر جاتے ہوئے ان دونوں کی نگاہوں میں ایک عجیب قسم کی چمک تھی، ایک خفیہ منصوبے کی روشنی جو ایمان کی معصومیت سے مکمل طور پر پوشیدہ تھی۔

ان کی مسکراہٹوں میں ایک مکارانہ جذبات کی آمیزش تھی، جیسے وہ دونوں ایک ایسے کھیل کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکے ہوں جس کا نتیجہ پہلے ہی طے تھا۔

کچھ دیر بعد ایک نرس کمرے میں داخل ہوئی، اُس کے قدم ہلکے اور نظریں جھکی ہوئی تھیں، جیسے وہ بھی اس سازش کا حصہ ہو۔ اُس نے ایمان کی طرف دیکھا اور کہا، ”آئیے، آپ کو آپریشن تھیٹر کے لیے تیار کرنا ہے۔“ اس کی آواز میں ایک غیر مرئی دباؤ تھا، جسے ایمان سمجھ نہ سکی۔

ایمان نے سر ہلایا اور بے دلی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کے قدم بو جھل تھے، لیکن وہ اپنی ماں کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ جیسے ہی وہ نرس کے پیچھے کمرے سے باہر نکلی، آمنہ کے چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ ابھر آئی، ایک مسکراہٹ جو محبت کی نقاب میں چھپی ہوئی دھوکہ دہی کا پتہ دے رہی تھی۔

تینوں کے چہرے مختلف جذبات کا عکس پیش کر رہے تھے۔ آمنہ کی مسکراہٹ میں کینہ اور انتقام تھا، آصف کی مسکراہٹ میں مکاری اور فریب کی چمک، اور ایمان کی مسکراہٹ میں ایک نادانی اور معصومیت،

جس کا وہ خود بھی شکار تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کے گرد گھیر لیا جانے والا جال کیا شکل اختیار کر چکا ہے۔

...°...

ایمان کو نرس خاموشی سے چینجنگ روم میں لے گئی، جہاں ہلکی روشنی میں ہر چیز پر اسرار اور خاموش دکھائی دے رہی تھی۔ نرس نے اسے سفید گاؤن اور ٹوپی تھمائی، جو ایک رسمی سالباس تھا، سرجری کے لیے۔

ایمان نے بوجھل قدموں سے وہ لباس پہنا، جیسے کسی انجانے بوجھ کے تلے دبی ہو۔ اس نے اپنے کپڑے اور سامان لا کر میں رکھا اور چابی جیب میں ڈال کر، خود کو آئینے میں دیکھا۔ اُس کا چہرہ اضطراب اور خوف کا آئینہ تھا، جیسے کوئی معصوم ہر نی شکاریوں کے درمیان گھری ہو۔

اس نے آہستہ سے اللہ سے دعا مانگی، ”یارب العالمین، میری اور میری ماں کی حفاظت فرما۔“ اس کے دل میں وسوسے اٹھ رہے تھے، لیکن وہ اس دعا سے خود کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

جیسے ہی وہ دروازہ کھولنے لگی، باہر سے مدھم سی آوازیں آنے لگیں۔ وہ رک گئی، اور فوراً ہی ان آوازوں کو آصف اور ڈاکٹر کے مکالمے کے طور پر پہچان لیا۔ اُس کا دل اچانک تیز دھڑکنے لگا، اور اس کے قدم زمین سے چپک گئے۔

آصف کی بے چینی بھری آواز سنائی دی، ”کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ منصوبہ کام کرے گا؟“

ڈاکٹر نے ایک سرد اور پراعتماد لہجے میں جواب دیا، ”مجھ پر بھروسہ کرو، سب کچھ منصوبے کے مطابق ہوگا۔ میں یہ پہلے بھی کئی بار کر چکا ہوں۔ کوئی شک نہیں کرے گا، اور نہ ہی کسی کو شک ہونے کی گنجائش ہوگی۔“

یہ سن کر ایمان کا دل دہل گیا، لیکن اس نے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ پھر ڈاکٹر کی مزید پریشان کن آواز سنائی دی، جیسے کسی راز کے بھید کھولتے ہوئے، ”لیکن اگر اسے پتہ چل گیا؟“

آصف کی حقارت سے بھری ہنسی سنائی دی، ”وہ کچھ نہیں سمجھے گی، بہت معصوم اور خود اعتمادی کی دھند میں لپیٹی ہوئی ہے۔ وہ یہ سوچتی ہے کہ اس کی ماں اس سے محبت کرتی ہے، وہ نہیں جانتی کہ ہم اسے صرف اپنے انتقام کا نشانہ بنا رہے ہیں۔“ آصف کی آواز میں چھپی سفاکی اور کینہ ایمان کے دل میں خنجر کی طرح اتر گئی۔

آصف کی مکاری بھری آواز دوبارہ سنائی دی، ”اور اُس دوسرے گردے کا کیا؟ جو تم نے بلیک مارکیٹ سے حاصل کیا ہے؟“

ڈاکٹر نے ایک مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

۔ ”وہ کولر میں موجود ہے، ایمان کے خون کی نوعیت سے مکمل ہم آہنگ ہے، لیکن سرطان زدہ خلیوں سے آلودہ ہے۔“

ہم ایمان کے صحت مند گردے نکال کر، اس میں یہ سرطان آلودہ گردے نصب کر دیں گے۔

جیسے ہی ہم یہ گردے پیوند کر دیں گے، چند ماہ کے اندر ہی وہ فنا کے گھاٹ اتر جائے گی اور کسی کو اس سازش کی ہوا تک نہ لگے گی۔”

ڈاکٹر کی آواز میں چھپی برائی سن کر ایمان کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

آصف نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا، ”اور پھر میرے دل کی آگ بجھے گی، وہ بدلہ پورا ہو گا جو اس نے میرے ساتھ کیا تھا۔”

ڈاکٹر نے سرد لہجے میں جواب دیا، ”بالکل۔ اور تمہیں اس منصوبے میں مدد کرنے پر میں اپنا حصہ بھی وصول کر لوں گا۔ یہ ہمارے لیے ہر لحاظ سے فائدہ مند ثابت ہو گا۔”

یہ سن کر ایمان کی روح کانپ اٹھی۔ اُس کے اندر خوف، وحشت اور بے یقینی کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا سن رہی ہے۔ وہ ایک ایسی خوفناک حقیقت سے روبرو تھی جس نے اس کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا کرے، کہاں جائے۔

ہر لفظ جو اُس کے کانوں تک پہنچ رہا تھا، اُس کے اندر زہر کی طرح اتر رہا تھا۔ یہ انکشاف اُس کے لیے قیامت کے مترادف تھا۔ آصف اور ڈاکٹر کے یہ مکروہ مکالمے، جیسے موت کے پروانے پر دستخط ہو رہے ہوں، اور وہ معصوم جس کا مقدر لکھا جا چکا تھا، وہ خود تھی۔

ایمان کا دل چیخ رہا تھا، مگر وہ خاموش رہی۔

ایمان نے فوراً دروازہ بند کیا اور دروازے سے ٹیک لگالی۔۔

ایمان کے اندر خوف، غصہ اور بے یقینی کی ایک طوفانی لہر دوڑ گئی تھی، جیسے کسی نے اُس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہو۔

آصف اور ڈاکٹر کے شیطانی عزائم اُس کے سامنے بے نقاب ہو چکے تھے۔ وہ اُس کا گردہ چرانے، اور اسے ایک بیکار اور کینسر زدہ گردہ دے کر موت کے منہ میں دھکیلنے کا سوچ رہے تھے۔ اُس کا دل کڑواہٹ اور نفرت سے بھر گیا۔

۔ ”کیا میں ہمیشہ ہی اتنی نادان رہی؟“ اُس نے خود سے تلخی سے کہا۔

۔ ”یہ سب جھوٹ تھا، فریب تھا۔ وہ ماں، جو کچھ دیر پہلے مجھے اپنے وجود کا حصہ بول رہی تھی، اس کا محبت بھرا لمس بھی دھوکہ تھا۔“ اس کے وجود میں نفرت کی ایک آگ بھڑک اٹھی۔

۔ ”یہ کیسا تعلق تھا؟ میں کیسے بھول گئی وہ تو کوئی اور ماں باپ ہوتے، ہیں جنہیں اپنی اولاد کی فکر ہوتی ہے۔ میرے ماں باپ جیسے لوگ تو لعنت کے مستحق ہیں!“۔

اُسے یاد آیا کہ کس طرح ہمیشہ وہ آصف کو ترجیح دیتی رہی تھی، ایمان کو نظر انداز کر کے اُس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینے کی عادی تھی۔ اُسے اپنے ہی جذبات پر غصہ آنے لگا۔ وہ احساسِ جرم کی بوجھ تلے دبتی رہی وہ جان چکی تھی، یہ سب دھوکہ تھا۔ محض خود غرضی اور مطلب پرستی اور انتقام۔

اچانک، اُس کے ذہن میں ایک آیت کا عکس روشن ہوا۔ — سورۃ الاسراء کی آیت ۲۹ —

اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کر لو (کہ کسی کچھ دوہی نہیں) اور نہ بالکل کھول ہی دو (کہ سب ہی دے ڈالو اور انجام یہ ہو) کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ

اُس کے اندر ایک سکون کی لہر آئی، جیسے اُس آیت نے اُسے طاقت بخش دی ہو۔ ”اللہ ہمیشہ میرے ساتھ ہے، وہ ہی میرا سہارا ہے!“ اُس نے خود کو تسلی دی۔

جلدی سے اُس نے دروازے کی طرف دیکھا اور اسے اندر سے تالا لگا دیا۔ گاؤن اور ٹوپی کو جھٹک کر اتار پھینکا، اور جلدی سے اپنے اصل کپڑے پہن لیے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی سختی اور عزم جھلکنے لگا۔ اُس نے لا کر سے اپنا پرس اور موبائل اٹھایا اور کھڑکی کی طرف بھاگی، جو کمرے کے آخری کونے میں تھی۔

کھڑکی کو کھولتے وقت، اُس کے دل میں خوف اور مایوسی کی بجائے ایک عجیب سی تسکین اور نجات کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔

جیسے ہی اُس نے باہر جھانکا،

اسپتال

کی پچھلی گلی سنسان اور خاموش نظر آئی۔ وقت کم تھا، اور وہ جانتی تھی کہ ہر لمحہ قیمتی ہے۔ اُس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور زمین پر آگئی۔

زمین پر قدم رکھتے ہی اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ وہ اپنے اندر کی اضطرابی کیفیت کو قابو میں رکھتے ہوئے پارکنگ کی طرف بھاگی، جہاں اُس کی گاڑی کھڑی تھی۔

اُس کے ہر قدم میں عزم کی ایک نئی لہر تھی، جیسے وہ ہر قدم کے ساتھ اپنے ماضی اور دشمنوں کو پیچھے چھوڑ رہی ہو۔

وہ گاڑی تک پہنچی، دروازہ کھولا اور اندر بیٹھتے ہی انجن اسٹارٹ کر دیا۔ اُس کی آنکھوں میں نفرت کی چمک تھی، اور لبوں پر تلخی بھری مسکراہٹ۔ ”تمہیں لگا کہ تم مجھے بے وقوف بنا سکتے ہو؟“ اُس نے زہریلے لہجے میں خود سے کہا، ”تم نے سوچا کہ تم مجھے اپنے شیطانی منصوبے میں پھنسا سکتے ہو، مگر تم بھول گئے کہ اللہ ہمیشہ میرے ساتھ

ہے۔“

اُس کے دل میں ایک نئی قسم کی مضبوطی اور آزادی کا احساس جاگا۔ ”میری ماں؟ اُس نے تو کبھی مجھے قبول ہی نہیں کیا۔ اُس کے آنسو، اُس کے جذبات۔ سب جعلی تھے۔ اور آصف؟

وہ تو، ہے ہی“

وہ لبوں سے دشنام کے قریب پہنچی ہی تھی کہ خود پر قابو پا لیا اور پلکیں نیچی کر لیں، ”جس کی ہستی ہی اس کے لیے لعنت ہو، اسے دشنام دے کر زبان کو آلودہ کرنے کا کیا فائدہ؟“

اُس کی آنکھوں میں کوئی پچھتاوا نہ تھا، کوئی ندامت یا افسوس نہ تھا۔ اُس کے دل میں صرف نجات کا احساس تھا، جیسے اُس نے ایک بڑے بوجھ سے چھٹکارا پالیا ہو۔ ”ایسے ماں باپ؟“ اُس نے زہر بھرے الفاظ تھوک

دیے۔

۔۔۔ "لعنت ہے ایسی اولادوں کے ماں باپ پر جو خود اپنی ہی اولاد کا خون چوسنے والے

ہوں۔"

...°...

رات کی تاریکی میں آسمان پر بادلوں کی دھمکی آمیز گڑگڑاہٹ گونج رہی تھی، اور بجلی کے کوندوں نے چند لمحوں کے لیے منظر کو خوفناک طور پر روشن کر دیا۔

تیز ہوانے درختوں کی شاخوں کو بے دردی سے جھنجھوڑا، جیسے قدرت خود کسی خوفناک حادثے کی پیش گوئی کر رہی ہو۔ بارش زوروں پر تھی، جیسے بوندیں زمین کو چھیدنے کے ارادے سے برس رہی ہوں۔ ایمان

نے اس وحشت ناک رات میں اپنی گاڑی کی رفتار بڑھا رکھی تھی، اس کا دل دھڑک رہا تھا، ذہن میں بے شمار خیالات گردش کر رہے تھے۔ وہ اسپتال سے فرار ہو رہی تھی، جہاں اسے اپنی زندگی کی سب سے تلخ حقیقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اسپتال کا وہ منحوس وقت، جب اسے علم ہوا کہ اس کی اپنی ماں اور سوتیلی باپ، آصف، نے اسے دھوکہ دیا ہے، ایک سازش جس کا انجام اس کی موت تھا۔ ان کا مقصد اس کا قتل کر کے انتقام پانا تھا۔

یہ سوچ ایمان کے دل میں خوف کی ایک لہر دوڑا دیتی تھی، لیکن ساتھ ہی غصہ اور نفرت اس کے اندر آگ بن کر جل رہے تھے۔ اس کے لیے یہ ناقابل یقین تھا کہ جن کے ساتھ اس نے نیکی کرنے کا سوچا تھا وہ ہی اس کے سر پر چڑھ کر موت کا تانڈو کر رہے تھے۔

گاڑی کے شیشے پر تیز رفتار بارش نے منظر کو مزید دھندلا دیا تھا، لیکن ایمان نے پیچھے کی طرف دیکھا، اور ریڑیو مرمر میں گاڑیوں کی روشنیوں کی چمک دکھائی دی۔

اس نے ان سائے دار چہروں کو پہچان لیا۔ وہ آصف کے آدمی تھے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، خوف اور غصے کا طوفان اس کے اندر برپا تھا۔ وہ فرار کی کوشش میں

ایکسلیریٹر پر دباؤ ڈال کر رفتار تیز کرتی رہی، لیکن سڑک کی پھسلن اور تیز موڑ اسے زیادہ رفتار سے گاڑی چلانے نہیں دے رہے تھے۔ ہر لمحہ ایک نیا خطرہ تھا، ایک نیا امتحان۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ راستہ تنگ ہو رہا ہے، اور چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ بے بس محسوس کر رہی تھی، جیسے تقدیر نے اسے گھیر لیا ہو۔ "یا خدا!" وہ ہلکے سے بڑبڑائی، دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی لعنتی الفاظ اس کے لبوں سے پھسلے۔

اس نے جھٹ سے اپنا موبائل فون اٹھایا، شاید کسی کو مدد کے لیے بلایا جاسکتا ہو۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ نمبر ڈائل کرتی، اچانک فون کی گھنٹی بجی۔

اس کی نظریں اسکرین پر گئیں، اور دل لرز اٹھا۔ کالر آئی ڈی پر آصف کا نام چمک رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی، دل میں خوف اور غصہ ایک ساتھ اٹھ آیا، مگر پھر اس نے کانپتے ہاتھوں سے کالر ریسیو کی۔

"ایمان، تم واقعی بہت تیز ہو، لیکن کیا تمہیں لگتا ہے کہ تم ہم سے فرار ہو جاؤ گی؟" آصف کی بے پرواہ آواز فون سے ابھری، جس میں طنز اور سرد مہر قہقہہ شامل تھا۔

..

"مجھے اکیلا چھوڑ دو، آصف! تم ایک درندے ہو! تم اور آمنہ، تم دونوں نے مجھے مارنے کی کوشش کی،۔ تم نے مجھے دھوکہ دیا! تم نے میرے بھروسے کا خون کیا!" ایمان کی آواز میں زخموں کی گہرائی، غصے کی

شدت، اور دل کی ٹوٹ پھوٹ واضح تھی۔ وہ جیسے اپنے اندر کی ساری تلخی ایک ہی لمحے میں نکال دینا چاہتی تھی۔

آصف کی ہنسی اور بھی بے دردی سے گونجی۔ "ایمان، تم بہت بھولی ہو۔ تمہیں لگتا ہے کہ دنیا میں جذبات کی کوئی قیمت ہے؟ تمہاری سادگی واقعی تمہاری سب سے بڑی کمزوری ہے۔"

اچانک، فون کے دوسری جانب سے آمنہ کی بے رحم آواز سنائی دی، جیسے اس کی ماں کے الفاظ زہر سے بھرے ہوں۔ "تم واقعی کچھ نہیں سمجھتیں، ایمان۔ تمہیں کیا لگا، ہم تمہارے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ تم میرے لیے کچھ بھی نہیں ہو۔"

ایمان کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ اس کا سانس حلق میں اٹک گیا۔ "تم... تم ایسا کیسے کر سکتی ہو؟ تم میری ماں ہو! تم نے مجھے دھوکہ دیا، میری زندگی برباد کر دی، میں نے تم پر بھروسہ کیا تھا!" اس کے الفاظ درد سے لبریز تھے، جیسے وہ اپنی آخری امید کے ٹوٹنے کی داستان سنار ہی ہو۔

آمنہ نے بے حسی سے کہا، "تمہیں ابھی تک سمجھ نہیں آیا؟ تم میرے لیے محض ایک ذریعہ تھیں، اور تمہارا کام ختم ہو چکا ہے۔"

ایک بار پھر آمنہ کی شیطانی ہنسی فضا میں گونجی، جیسے زہر کی بوندیں ہوا میں تحلیل ہو رہی ہوں۔۔۔ ”ایمان، تمہیں کیا لگتا تھا کہ میں اس اسپتال میں اس لیے تھی کہ مجھے تمہارا گردہ چاہیے؟“ وہ وقفے سے بولی، جیسے ہر لفظ ایک تیر کی مانند ہو۔ ”نہیں، باولی، ایسا بالکل نہیں ہے۔“

آمنہ کے لہجے میں طنز کا زہر بھرا ہوا تھا۔ ”یہ تمہارے ساتھ ہونے والا کوئی حادثہ نہیں تھا، بلکہ میں تو تم سے انتقام لینا چاہتی تھی... سمجھیں؟“

ایمان کا دل جیسے لمحے بھر کو رک گیا۔ اس کی سانسیں تیز ہو گئیں، آنکھیں بے یقینی سے بھر آئیں۔

آمنہ کی آواز پھر سے گونجی، اس بار اور بھی سفاکی سے، ”مجھے گردہ تو پہلے ہی مل چکا تھا، اور میری سرجری ہوئے ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ تم نے تو اپنی سادگی میں کچھ اور ہی سمجھ لیا تھا۔“

ایمان نے آنکھیں میچ لیں، جیسے اس وحشی حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت اکٹھی کر رہی ہو۔ آمنہ کی بے رحم ہنسی جیسے اس کے دل کے ہر ٹکڑے پر چھری چلا رہی ہو۔ ”یہ سب کچھ تمہارے لیے نہیں تھا، ایمان۔ یہ تو تمہاری سزا ہے، اس چیز کا بدلہ ہے جو تم نے میرے شوہر کے ساتھ کیا تھا۔“

ایمان کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا ہو، وہ بے حس و حرکت تھی، جیسے جسم سے روح نکل گئی ہو۔ آنکھوں کے سامنے ماضی کی تصویریں تیرنے لگیں، وہ پل جب سب کچھ بکھر گیا تھا، جب زندگی نے اسے اندھیروں میں دھکیل دیا تھا۔

آمنہ کی بے حس آواز دوبارہ آئی، ”اور یہ مت سوچنا کہ میں تمہاری سگی ماں ہو کر ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔“ اس کے الفاظ ایمان کے دل میں خنجر کی مانند اترتے گئے۔ ”رشتے خون سے نہیں بنتے، رشتے جذبات سے بنتے ہیں، اور میرے دل میں تمہارے لیے کوئی جذبہ باقی نہیں رہا۔“

دوسری طرف سے آصف، جو قاتلوں کو حکم دے رہا تھا، کی گونجتی ہوئی آواز موبائل کی دوسری لائن سے ابھری، جیسے موت خود ایمان کے قریب آگئی ہو۔ ”اسے ختم کر دو۔“ اس کی آواز میں ایک سرد خنجر کی سی کاٹ تھی۔ ”یہ بچ نہ پائے۔“

ایمان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ لمحہ اس کے انجام کا تھا۔ اس کا دل خوف سے بے قابو ہو رہا تھا، لیکن اس کے اندر عجیب سی خاموشی تھی۔ وہ موت سے خوفزدہ نہیں تھی، لیکن یہ سوچ اس کے دماغ میں گونج رہی تھی۔ وہ اللہ کے حضور کیا جواب دے گی؟ قبر کے سوالات کیا ہوں گے؟ اسے وہاں کیا جواب دینا ہو گا؟ اس کی روح لرز رہی تھی، یہ سوالات اس کے ذہن میں گونج رہے تھے، جیسے کسی طوفان میں بے چین لہریں ہوں۔

”کیا یہ میرا آخری وقت ہے؟“ ایمان نے خود سے پوچھا۔ یہ خیال، جیسے موت کی گھنٹیاں بجا رہا ہو، اس کے اندر کی ساری قوتوں کو نچوڑ رہا تھا۔

گاڑیوں کی روشنی اب اس کی پشت سے معدوم ہو چکی تھی۔ ایمان نے ایک گہرا سانس لیا، جیسے اس کے دل کی دھڑکن لمحے بھر کو تھم گئی ہو۔ اس نے لمحے بھر کو اپنی نظریں اٹھائیں، گویا سامنے کہیں نجات کی امید چھپی ہو۔ لیکن سامنے جھانکنے پر اس کی آنکھوں میں وحشت جاگ اٹھی۔ گاڑیاں اب عقب کی بجائے سامنے سے آرہی تھیں، اُن میں سے سائے دھندلے مگر خطرناک صورتوں میں ڈھلتے جا رہے تھے۔

ان آدمیوں کے چہرے جو گاڑیوں سے اتر رہے تھے، سفاکی اور وحشت کا نمونہ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں، اور وہ سیدھے ایمان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ایمان نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد بریک پر دباؤ ڈالا اور گاڑی رک گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن جیسے کسی بجلی کی مانند تیز ہو چکی تھی، لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ اس نے دروازہ کھولا اور بے اختیار جنگل کی طرف دوڑ لگا دی، اُس امید میں کہ شاید وہ اس تاریک جنگل کی گھنی شاخوں میں چھپ سکے۔

لیکن وہ آدمی، جو شکاریوں کی مانند اس کے پیچھے تھے، تیز اور بے رحم تھے۔ جنگل کی خاموشی گولیوں کی چیخوں سے گونج اٹھی، اور ایمان نے اپنی جان بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، لیکن گولیاں اور ان کی چیخیں اُس کے گرد منڈلا رہی تھیں۔

درختوں کی شاخیں جیسے اُس کے قدموں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں، اور اُسے ہر پل اپنے خاتمے کا خوف ستا رہا تھا۔

ایک لمحہ ایسا آیا جب وہ ٹھٹھک گئی۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے، اور اس سے پہلے کہ وہ خود کو سنبھال پاتی، وہ آدمی اُس تک پہنچ چکے تھے۔ اُن کے مضبوط ہاتھوں نے اسے قابو کر لیا۔ ایمان نے پوری طاقت سے مزاحمت کی، اس کے ہاتھ پنوں کی طرح ان کے چہروں پر حملہ آور ہوئے، اُس نے لاتیں ماریں، چیخی، اور حتیٰ کہ دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کی تعداد زیادہ تھی، اور ان کی طاقت ایمان کی مزاحمت کو بے اثر کر چکی تھی۔

ایک لمحے میں، ان میں سے ایک نے ایک سرخ نکالی، اور بے دردی سے اس کے بازو میں گھونپ دی۔ ایمان نے ایک تیز درد اپنے بازو میں محسوس کیا، جیسے کوئی خنجر اس کی جلد کے نیچے اتر رہا ہو۔ غنودگی کی لہر اس کے وجود کو آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لینے لگی، اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں، اور جسم اس کا ساتھ چھوڑنے لگا۔

آخری منظر جو اس کی دھندلی ہوتی آنکھوں میں نقش ہوا، وہ ان آدمیوں کے بے رحم چہرے تھے—ظالم، بے حس، اور بے لگام لالچ سے بھرے ہوئے۔

ان کی آنکھوں میں انسانیت کا کوئی شائبہ نہ تھا، کوئی پشیمانی، کوئی ترس، صرف نفرت اور ہوس۔ یہ وہ چہرے تھے جو اب اُس کے لیے ایک دائمی خواب کا حصہ بن چکے تھے—ایسے چہرے جنہوں نے اُسے موت کے کنارے پہنچا دیا تھا۔

اور پھر، تاریکی نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

سوڈن کے سرد، خاموش ماحول میں، اسٹاک ہوم کی فضا میں تناؤ کی ایک لہر تھی۔ گونار اپنے ہاتھوں میں موبائل فون سختی سے بھینچے، ایمان کی دل دہلا دینے والی چیخیں سن رہا تھا، جو آصف کے درندہ صفت آدمیوں کے چنگل میں گرفتار ہو چکی تھی۔

اس کے دل میں ایک طوفان برپا تھا، اور اس کی آنکھیں غصے سے شعلہ ور ہو گئیں۔ جیسے وہ اپنے قابو سے باہر ہوتا جا رہا تھا، اس کے وجود میں غیظ و غضب کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

گونار کے ہاتھ سرد لیکن مضبوطی سے موبائل کو تھامے ہوئے تھے۔ اس کے اندر ایک بے قابو جنون جاگ رہا تھا، ایک جنون جو کسی بھی صورت ایمان کو بچانے کے لیے بے قرار تھا۔

اُس نے موبائل پر ایک نمبر ڈائل کیا، اور اس کی آواز میں ایک سرد اور قاتلانہ سنجیدگی تھی،۔“ میں تمہیں ایک لوکیشن بھیج رہا ہوں۔ وہاں پہنچو، اور ان لوگوں کی ایسی حالت کرو کہ وہ اپنی زندگی پر افسوس کریں۔ انہیں ایسا درد دو کہ وہ اپنے والدین پر لعنت بھیجیں کہ انہیں کیوں جنم دیا۔ وہ چھ افراد ہیں، اور لڑکی کو بچانا ہے۔ فوراً روانہ ہو جاؤ۔“

اس کی آواز میں وہ ہی سرد خون تھا، جیسے وہ فیصلہ سنا چکا ہو۔ اس نے کال کاٹ دی اور پھر فوراً دوسرا نمبر ڈائل کیا۔“ جیٹ تیار کرو، میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔“ یہ حکم اس کے نجی پائلٹ کے لیے تھا۔۔

پائلٹ نے ہچکچاتے ہوئے موسم کی خرابی کا ذکر کیا اور کہا کہ جیٹ کو تیار کرنے میں وقت لگے گا، لیکن گونار کو کوئی عذر سننے کا یارا نہ تھا۔ اس کی آواز میں ایسی شدت تھی، جیسے وہ اپنے سامنے آنے والی ہر رکاوٹ کو روند ڈالنے پر آمادہ ہو۔

۔ ”مجھے موسم کی پرواہ نہیں ہے!“ اس نے غضبناک انداز میں کہا۔ ”تمہیں بس جہاز تیار کرنا ہے۔ مجھے ایمان کو بچانا ہے، اور اگر مجھے اپنی جان بھی دینی پڑے، تو میں دے دوں گا۔ تمہیں بس وہ ہی کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔“

اس نے کال کاٹ دی اور بے چینی سے قدم بڑھاتے ہوئے اپنے دفتر کا دروازہ کھولا۔ باہر کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے، اس کے چہرے پر جذبات کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔ غصہ، اضطراب، اور محبت کا ایک خطرناک امتزاج۔

انجن کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ، اُس نے گاڑی کو ایسی رفتار سے چلایا کہ جیسے ہوا کو چیرتا ہوا، اپنے مقصد کی طرف بڑھ رہا ہو۔

گونار کی نظریں سیدھی سڑک پر مرکوز تھیں، لیکن اس کی آنکھوں میں ایک شدید عزم تھا۔ اس کے لیے کوئی رکاوٹ، کوئی موسم، کوئی خطرہ معنی نہیں رکھتا تھا۔ اُس کا ہر خیال، ہر سانس ایمان کی حفاظت اور ان درندوں سے انتقام لینے پر مرکوز تھا، جو اس کے پیار کو چیرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

چاروں طرف جنگل کا گھنا اندھیرا اور طوفان کی گرج تھی، جیسے قدرت بھی ان وحشیانہ مناظر کا گواہ ہو۔ ایمان کو ایک بڑے درخت سے رسوں سے بے دردی سے باندھ رکھا گیا تھا۔ اس کی کلائیاں زخمی ہو چکی تھیں، رسیاں اس کے گوشت میں پیوست ہو کر خون رسنے کا سبب بن رہی تھیں۔ اس کے جسم پر تشدد کے تازہ نشانات صاف نمایاں تھے۔

ایمان کی آنکھیں نیم دا تھیں، ہر پل اس کی سانسیں گھٹی محسوس ہو رہی تھیں۔ جب اس نے آنکھوں کی دھندلی پرت کے پیچھے آگ کے شعلوں کو دیکھا، تو اس کا دل دہل اٹھا۔

وہ بمشکل ہونٹ ہلا پا رہی تھی، درد کی شدت نے اس کی آواز کو گہرا اور مدھم کر دیا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ چکے تھے، اور منہ کے گرد جلن کی شدید سوزش تھی، گویا کسی نے تپتا ہوا لوہا اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیا ہو۔

اس کی سانسیں بھاری تھیں، اور گلے میں سلگتی جلن اسے پل پل موت کی آہٹ کا احساس دلو رہی تھی۔ جب اُس نے گردن کو بمشکل موڑ کر نیچے دیکھا، تو اس نے اپنی جلد پر ایک گہرا، جلتا ہوا نشان محسوس کیا۔ وہ داغ جوان وحشیوں نے اسے گرم لوہے سے دیا تھا۔

اس کے چہرے پر درد کی گہری لکیریں تھیں، اور آنکھیں لال انگاروں کی طرح جل رہی تھیں، آنسوؤں سے بھرے ہوئے، جو بے آواز اُس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

آگ کے شعلے اُس کے سامنے دھیرے دھیرے بلند ہو رہے تھے، اور راکھ کا غبار اُس کی طرف اڑ رہا تھا، جیسے اُس کے جسم کے انجام کا انتظار کر رہا ہو۔ ایمان کو اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے گلے میں یہ اذیت کیوں ہو رہی ہے۔ وہ کونسلے جو ان سفاک درندوں نے اس کے منہ میں ٹھونس دیے تھے، اس کی زبان اور گلے کو جلا کر خاکستر کر چکے تھے۔

اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل رہی تھی، بس درد کی بے آواز چیخیں تھیں، جو اس کے اندر قید ہو کر رہ گئی تھیں۔

ایمان کے سامنے آصف کے آدمی تھے۔ ان کی نظریں اُس پر جمی ہوئی تھیں، اُن کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کی چمک تھی، جیسے وہ کسی بے جان چیز کو دیکھ رہے ہوں، ایک ایسی شے جس کا کوئی وقار نہ ہو، کوئی قدر نہ ہو۔ اُن کے چہروں پر شیطانی مسکراہٹیں تھیں، اور اُن کی آنکھوں میں وہ وحشیانہ لالچ تھی جو انہیں انسانیت سے کوسوں دور لے جا چکی تھی۔

ایمان کے لال، سو بے ہوئے ہونٹوں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں، اور اس کے چہرے پر اذیت کی تمام نشانیاں ثبت تھیں۔

درد کی شدت سے اُس کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ مسخ ہو چکا تھا، جیسے ہر شے دھند اور دھوئیں میں لپٹی ہو۔

آصف کے آدمی ایمان کی نیم بے ہوشی پر زہریلی مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے دوبارہ ٹینٹ کے نیچے، جہاں وہ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے، مشغول ہو گئے۔ ایک شخص نے سرد لہجے میں کہا، ”آصف صاحب کب آئیں گے؟“۔

دوسرا آدمی بے لچک انداز میں بولا، ”ان کا حکم ہے کہ اسے اذیت دے دے کر موت کے حوالے کیا جائے اور وڈیو ان تک پہنچادی جائے۔ وہ خود نہیں آسکتے، ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔“۔

تیسرا شخص گویا ہوا، ”اب تو وہ ہوش میں ہے۔“۔

چوتھے نے لا پرواہی سے کہا، ”ہوش میں ہے، مگر مکمل نہیں۔ جب پوری طرح ہوش میں آئے گا، تب دیکھیں گے۔“۔

ایمان نے گردن دائیں جانب موڑی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں؛ اس کے سامنے سفید کوبرا تھا، نیلی آنکھوں والا، ایک پراسرار مخلوق جو یوں لگتا تھا جیسے تقدیر نے اسے کوئی پیغام دینے بھیجا ہو۔ ایمان کے لیے وہ سانپ امید کا نشان تھا، جو اُسے یاد دلانے آیا تھا کہ زندگی موت سے بھی زیادہ طاقتور ہو سکتی ہے، بشرطیکہ انسان میں حوصلہ ہو۔

ایمان نے اپنی سانسوں کو قابو میں کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں، دل کی بے ہنگم دھڑکنوں کو سنبھالا اور اپنے ارد گرد کی حقیقت کو ٹٹولنے لگی۔ چیخنے کی کوشش بے فائدہ تھی، گلے سے کوئی آواز نہ نکل سکی، لیکن وہ جانتی تھی کہ یہاں ٹھہرنا اس کی موت کے مترادف تھا۔

مگر بھاگنے کا کوئی امکان نہ تھا، وہ رسیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ لیکن اسے اچانک محسوس ہوا کہ کچھ چوہے رسیوں کو کاٹ رہے ہیں۔ ایمان نے آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر شکر ادا کیا اور جیسے ہی اسے یقین ہو گیا کہ رسیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے، وہ فوراً آزاد ہو گئی۔

درد اور تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ لرزتے قدموں سے کھڑی ہوئی، ایک لمحے کے لیے لڑکھرائی، مگر پھر فوراً دوڑ پڑی، جیسے موت سے زندگی کی بازی جیتنے کا عزم کر چکی ہو۔

آصف کے آدمیوں کی آوازیں، اُن کے قہقہے، بندوقوں کی چمک، یہ سب جیسے کسی دور دراز کائنات کا حصہ تھے۔ وہ چھ تھے، ہتھیاروں سے لیس، بے رحم اور خون کے پیاسے۔

جب اُن لوگوں نے ایمان کو فرار ہوتے دیکھا تو ایک جھٹکے سے سب اپنے مقام سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُس کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔

ایمان کے وجود پر ہر قدم کے ساتھ ایک بے پناہ گراں باری طاری ہو رہی تھی، جیسے وقت کی ریت اُس کے جسم پر وزنی چادر کی مانند چڑھتی جا رہی ہو، مگر اُس کے قلب میں بچ نکلنے کی تڑپ ایک بھڑکتی ہوئی چنگاری کی طرح فروزاں تھی۔ وہ جھاڑیوں، خاردار درختوں اور پتھروں سے بچتی بچاتی، جنگل کے گھنے سائے میں جا چھپی۔

درختوں کی پر پیچ چھاؤں تلے اُس نے پناہ لی، سانسیں بے ترتیب تھیں، بدن نڈھال تھا، مگر اُس کی آنکھوں میں اب بھی ایک چوکنا پن جھلک رہا تھا۔

ہوا میں بندوق کی دھمک اور آدمیوں کی بگڑتی آوازیں گھل رہی تھیں، جیسے وحشی درندے اپنے شکار کے قریب پہنچنے والے ہوں۔ ایمان نے درخت کے پیچھے سے جھانکا، اُس کی آنکھیں بجلی کی چمک سے لمحے بھر کے لیے روشن ہوئیں۔

وہ دیکھ سکتی تھی کہ ایک آدمی اُس کے قریب آ رہا تھا، اُس کی آنکھوں میں سفاکیت تھی، ہاتھ میں بندوق، اور دل میں وحشت۔ وہ درخت کے قریب پہنچا، ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا، جیسے اُسے کچھ مشکوک لگا ہو۔

اُس نے زمین پر بکھرے پتھروں، بجری، اور پتوں کے بیچ ایک سایہ محسوس کیا، جیسے کوئی چھپ رہا ہو۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، لیکن جیسے ہی اُس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا، ایمان اپنی پناہ گاہ سے برق کی سی تیزی سے نکلی۔

اُس نے لمحے بھر کی ہچکچاہٹ کے بغیر اُس پر حملہ کر دیا، اُس کے پیٹ میں زوردار لات ماری جس سے وہ چیخ اٹھا، اُس کی بندوق زمین پر گری۔

ایمان کے دل میں ایک لمحے کے لیے کوئی رحم نہ تھا۔ اُس نے بندوق اٹھائی اور لمحے بھر کی تاخیر کے بغیر اُس کی کھوپڑی میں گولی اتار دی۔ ایک خوفناک دھماکے کی آواز گونجی، اور آدمی زمین پر زیر ہو گیا۔ خون کی بوندیں زمین پر گرنے لگیں، اور ایمان کے کانوں میں یہ آوازیں جیسے موت کے ساز کی طرح بجنے لگیں۔

باقی آدمیوں نے گولی چلنے کی آواز سنی، اور وہ پلٹے۔ اُن کی آنکھوں میں حیرت اور غصے کا امتزاج تھا۔ انہوں نے ایمان کو بندوق تھا مے ہوئے، اپنے شکار سے بچتے ہوئے، تیز رفتاری سے بھاگتے دیکھا۔

...°...

ایمان نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ان کے وحشیانہ تعاقب کی شدت بڑھ چکی تھی۔ ان کی گولیاں سرسراتی ہوئی درختوں میں جا پیوست ہو رہی تھیں، مگر اس کے وجود کو چھونے سے قاصر تھیں۔

ہر قدم کے ساتھ اس کا سانس بے ترتیب ہو رہا تھا، لیکن اس کے اندر ایک عجیب سی قوت جاگ رہی تھی، جیسے اللہ کی کوئی نادیدہ مدد اسے سنبھالے ہوئے تھی۔ درختوں کی بھاری شاخوں اور ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے، وہ مسلسل دعائیں مانگ رہی تھی—خاموشی سے، دل کی گہرائیوں میں۔

اچانک، ایک درخت کے پیچھے سے جھانکنے پر، اس کی نظر اُس سفید سانپ پر پڑی، جو نیلی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ ایمان کا دل دھڑک اٹھا، لیکن حیرت انگیز طور پر، خوف کی بجائے ایک غیر معمولی سکون اس کے اندر سما گیا۔ جیسے یہ پر اسرار مخلوق نہ ہو، بلکہ کوئی آسمانی اشارہ ہو۔

وہ سانپ اس کے قریب آیا اور نرمی سے اس کے بازو کے گرد لپٹ گیا۔ ایمان کا دل مطمئن ہو گیا۔ یہ سانپ اب اس کا محافظ بن چکا تھا، اس کا نجات دہندہ۔

جو نہی آصف کے دو آدمی قریب پہنچے اور درخت کے پیچھے چھپتی ایمان کو دیکھ لیا، ان کی نگاہوں میں وحشت اور سنگدلی جھلک رہی تھی۔ ان کے قدم بھاری تھے اور ارادے بے رحم۔

ان کے ہاتھوں میں ہتھیار چمک رہے تھے۔ وہ موت کی علامت کی طرح ایمان کی طرف بڑھے۔ ایمان نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سانپ کو ان کی طرف پھینک دیا۔ سانپ، جیسے کسی آسمانی طاقت کے زیر اثر ہو، ایک تیز حرکت کے ساتھ ان کی طرف لپکا اور لپٹ گیا۔ ایک جھٹکے میں، اس کے نوکیلے دانتوں نے ان کے گوشت میں سرایت کر لیا۔

چنچیں گونجنے لگیں، جیسے زہر کی لہر ان کے رگوں میں سرایت کر گئی ہو۔ ان کی آنکھوں میں خوف اور تکلیف کا امتزاج صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاکر زمین پر گرے، ان کے جسم بے جان ہو چکے تھے۔ ایمان نے ان کی مردہ لاشوں پر ایک نگاہ ڈالی، مگر وقت ضائع کیے بغیر ان میں سے ایک کا پستول اٹھالیا۔

اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے ہتھیار مضبوطی سے پکڑا اور ایک لمحے کے لیے سانس بحال کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ابھی مزید خطرات باقی ہیں۔ ایمان نے اپنے قدموں کو مضبوطی سے جماتے ہوئے دوبارہ دوڑ لگائی۔ ہر قدم میں یقین تھا، ہر سانس میں عزم تھا۔ وہ اس جگہ سے نکلنے کے لیے تیار تھی—آزاد اور بے خوف، اپنے اندر کی قوت کے ساتھ۔

گونار کی گرفت موبائل پر سخت ہو گئی، اس کی آواز میں تناؤ اور غصے کی گونج تھی، جیسے ہر لفظ کے پیچھے صدیوں کی پیاس اور بے قراری ہو۔

وہ سٹاک ہوم کی تاریک اور برقی سڑکوں پر گاڑی کو اس بے رحمی سے چلا رہا تھا کہ جیسے وہ صرف وقت کو شکست دینے کی کوشش میں تھا۔ وہ کئی گاڑیوں کو پیچھے چھوڑ چکا تھا، اور دوبار اس کی گاڑی دوسرے کاروں سے ٹکراتے پچی تھی، لیکن گونار کو اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اس کے دماغ میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ ایمان۔

اسلام آباد، پاکستان کی طرف جانے والی فلائٹ پکڑنے کے لیے وقت تیزی سے ختم ہو رہا تھا، اور ایمان کی تکلیف دہ چیخیں، جو اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں، اسے مزید وحشی بنا رہی تھیں۔ وہ ان آدمیوں کی آوازیں سن چکا تھا جنہوں نے ایمان کو قید کر کے اذیتیں دی تھیں، اور اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس کی انگلیاں اسٹیرنگ و ہیل پر لرزتی ہوئی جیسے ہر لمحہ قیامت کا دھڑکنا تھا۔

گونار نے پاکستان میں اپنے آدمیوں کو فوراً کال کی۔ ”کیا تم لوگوں نے وہاں پہنچنے کا بندوبست کر لیا ہے؟“ اس کی آواز میں جلتی ہوئی جلد بازی اور غصہ تھا۔ اس کی نظریں سختی سے سڑک پر تھیں، لیکن اس کے کانوں پر بلیوٹوتھ کے ذریعے آنے والی ہر آواز میں اضطراب بھر رہا تھا۔

۔ ”ابھی تک نہیں، باس۔ موسم بگڑ رہا ہے۔ طوفان اور دھند نے سب کچھ دھندلا دیا ہے، کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔“

گونار کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ چیختے ہوئے بولا، ”وقت ضائع مت کرو! اگر اڑنا پڑے تو آسمان پھاڑ کر جاؤ! میں تمہیں ایمان کے قریب دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی، فوراً!“ اُس کے الفاظ میں اُس جذبے کی شدت تھی جو ہر حالت میں فتح چاہتا ہو۔ اس نے غصے میں موبائل کو سیٹ پر پٹخ دیا اور ایک جنون کے عالم میں گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ اس کی سانسیں گہری تھیں، جیسے ہر سانس میں اس کا ضبط پگھل رہا ہو۔

اُس نے ایئر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے گاڑی کو رفتار کی حدوں سے آگے دھکیل دیا، ٹریفک لائٹس کو نظر انداز کرتے ہوئے، جیسے ہر لمحہ اس کے لیے قیمتی تھا۔

اُس کے جسم پر سیاہ شرٹ اور سیاہ پتلون تھی، جس نے اُس کی بے رحمانہ خوبصورتی کو مزید نمایاں کیا۔ اُس کا چہرہ تناہوا تھا، جبرے کی ہڈیوں پر تناؤ کے نشانات، آنکھوں میں سرخی اور اضطراب جیسے کسی اندرونی طوفان کی علامات ہوں۔ اُس کا ہر عمل اُس کے اندر اُبلتے جذبات کا مظہر تھا۔ ایک مرد جو سب کچھ تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، مگر افسوس وہ ایمان سے دور تھا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں طوفانی بادل اور برف کے بھاری گرتے ہوئے تودے زمین کو سفید قبرستان میں تبدیل کر رہے تھے۔ اُس نے گہرے لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے دعا کی، ”اے اللہ، ایمان کی حفاظت فرما، مجھے اُس تک پہنچا دے۔“ اُس کی آواز میں اضطراب، محبت، اور خواہش کا امتزاج تھا، جیسے وہ اپنی آخری امید اللہ سے مانگ رہا ہو۔

ہر گزرتا لمحہ اُس کے اندر ایک اور زخم ڈال رہا تھا، جیسے اُس کی روح پر شکنیں ڈال رہا ہو۔ اس کے وجود میں ایڈرینالین کی لہر دوڑ رہی تھی، جیسے اُس کا جسم خود کو تیار کر رہا ہو کسی جنگ کے لیے، کسی بڑے معرکے کے لیے۔

وہ ایمان سے بے پناہ محبت کرتا تھا، اور وہ اُس کے بغیر اپنی زندگی کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، اُس کی آنکھیں جل رہی تھیں، اور اُس کا جسم ٹوٹ پھوٹ کے دہانے پر تھا، لیکن اُس کے عزم میں کوئی کمی نہ تھی۔

وہ جانتا تھا کہ وہ ایمان کو بچائے گا۔ چاہے اُسے اس کے لیے دنیا کے تمام قوانین اور حدوں کو توڑنا پڑے، چاہے کچھ بھی ہو۔

ایمان کے دائیں ہاتھ میں موبائل کانپ رہا تھا، اس کی سانسیں بے ترتیب تھیں، دل میں خوف اور مایوسی کی لہر تھی، مگر ساتھ ہی ساتھ ایک بے پناہ قوت کا احساس بھی۔ وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ ہر قدم جیسے زمین پر بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ پیچھے آنے والے آدمیوں کے قدموں کی آہٹ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ تین وحشی، آصف کے آدمی، اپنے تعاقب میں اس کے قریب آتے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خونخوار مسکراہٹیں تھیں، جیسے وہ اپنے شکار کو بالکل قابو میں لے چکے ہوں۔

ایمان کی سانس رکنے لگی جب وہ چٹان کے کنارے پر پہنچ گئی۔ نیچے گہری کھائی تھی، جس میں خطرناک نوکیلے پتھر بکھرے پڑے تھے۔ زمین پر قدم جمانا مشکل تھا اور چاروں طرف موت کی ہولناک خاموشی تھی۔

پیچھے مڑنے پر ان تین ظالموں کی آنکھوں میں درندہ صفت چمک تھی۔ ان میں سے ایک نے ایمان کے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی طرف اشارہ کیا اور طنزیہ لہجے میں بولا، ”استاد یہ اس کا فون ہے، یقیناً کسی سے مدد طلب کی ہوگی۔“

لیڈر، جس کا سر گنجا تھا، بڑی موٹی مونچھیں اور ظالم مسکراہٹ نے ایمان کو نظر بھر کے دیکھا۔ اس نے سفید قمیص، شلوار اور چمکتے زیورات پہنے ہوئے تھے، گویا اس کے سفاکانہ ارادوں کی کوئی حد نہ ہو۔ وہ اپنی درندگی اور ظلم میں سرشار تھا۔ ہنستے ہوئے بولا، ”مدد؟ تیرے لیے کوئی مدد نہیں آنے والی، مرنے کے لیے تیار ہو جا۔“

یہ وہ ہی شخص تھا جس نے ایمان کو اذیتیں دی تھیں۔ اس کی گردن کو گرم لوہے سے داغا تھا اور اس کے منہ میں دھتے کوئلے ڈال کر اس کے منہ کو جلادیا تھا، اس کا دائمی زخم اس کے بدن پر نقش ہو چکا تھا۔ اس کا دل نفرت اور وحشت سے بھرا ہوا تھا، اور وہ اپنے شکار کو مزید اذیت دینے کے لیے بے چین تھا۔

ایمان نے اپنے دل کی گہرائیوں سے غصے کی ایک شدید لہر کو محسوس کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اب نہ لڑی، تو ہمیشہ کے لیے ہار جائے گی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خطرناک چمک ابھری، جیسے کوئی جنگجو اپنی

آخری جنگ کے لیے تیار ہو۔ ایمان کا ہاتھ جو پیچھے اس کی پشت سے جڑا تھا اس نے اپنا ہاتھ سامنے کیا اور لیڈر کے دائیں بائیں کھڑے آدمیوں کو نشانہ بنایا۔

گولی چلتے ہی وہ دونوں آدمی بے جان ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گئے، ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ لیڈر گھبرا گیا، یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کا ملا جلا اظہار تھا، مگر فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

ایمان کی زبان خاموش تھی، شاید ہمیشہ کے لیے، لیکن اس کی آنکھوں میں زہر بھری نفرت کی آگ تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے دشمن کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، جیسے اس کے الفاظ کی ضرورت نہ ہو، اس کی خاموش نفرت سب کچھ بیان کر رہی تھی۔ لیڈر نے دانت پیستے ہوئے کہا، ”تو آسانی سے مرنے کو تیار نہیں ہے ٹھیک ہے۔ دیکھتے ہیں، تو کتنی دیر تک اس جنگ میں زندہ رہ سکتی ہے۔“

یہ الفاظ جیسے موت کا فرمان تھے، لیکن ایمان کے دل میں اب ایک نیا عزم جاگ چکا تھا۔ وہ اپنی آخری سانس تک لڑنے کے لیے تیار تھی، اور وہ جانتی تھی کہ یہ جنگ اس کی زندگی یا موت کی آخری حد تک جا سکتی ہے۔۔۔

اس منحوس چہرے والے شخص نے جیسے ہی اپنے لباس سے تیز دھار خنجر نکالا، ایمان کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے رک سی گئی۔ وہ قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا، جیسے ہر قدم کے ساتھ موت قریب آتی

جارہی ہو۔ ہوا کی سرد تیزیاں ہر طرف چیخ رہی تھیں، فضا میں دھند کا بھاری پردہ پھیل رہا تھا، اور بجلی کی چمک ہر چند لمحوں بعد اندھیرے کو چیر کر منظر کو لمحاتی روشنی میں بدل دیتی تھی۔

نیم تاریکی میں وہ خنجر کی چمک ایمان کی آنکھوں میں چھپنے لگی۔ ہر قدم، ہر جھپک، ہر بجلی کی گرج دل کو تھام لینے والی تھی۔

.....

ایمان کی نظریں تیزی سے نیچے گہری کھائی پر پڑیں، جہاں موت اپنے نیچے پھیلانے کھڑی تھی۔ سامنے لیڈر اسے قتل کرنے کی نیت سے قدم بہ قدم قریب آ رہا تھا، اور ایمان کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے پستول کا نشانہ بنایا اور لیڈر کے ہاتھ پر گولی داغ دی۔ گولی کے لگتے ہی لیڈر کی بندوق نیچے گر گئی، اس کے درد سے بوجھل چہرے پر ایک غیظ و غضب کی چمک تھی، لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹا۔

اس کی آنکھوں میں شعلے دہک رہے تھے، اور اس کے دوسرے ہاتھ میں چاقو تھا، جو اُس کی آخری سانس چھیننے کے لیے تیار تھا۔

ایمان کا جسم لرزنے لگا۔ سامنے خونخوار لیڈر اور پیچھے مہیب کھائی۔ بارش کی موٹی بوندیں اس کی جلد کو سرد اور زمین کو کیچڑ سے بھر رہی تھیں۔

بجلی کی کوند اور گرج کے بیچ یہ رات نہایت بھیانک ہو چکی تھی، اور ہر جھٹکے پر ایمان کا دل جیسے دہلنے لگا تھا۔ درختوں کے پتے اور شاخیں ہوا کی شدت سے جھوم رہے تھے، جیسے آسمان کی آہنی مٹھی نے سب کو اپنے جال میں قید کر لیا ہو۔

ایمان نے دل میں ایک مختصر دعا کی، وہ لمحہ بھر کے لیے ساکن ہو گئی، جیسے اندرونی طور پر کسی عظیم فیصلے کا انتظار کر رہی ہو۔ جیسے ہی لیڈر قریب آیا، وہ بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف لپکی، مگر اس کی قوت اُس سے زیادہ تھی۔ لیڈر نے اس کے ہاتھ سے بندوق چھینتے ہوئے ایک زوردار جھٹکا دیا، جس سے ایمان پیچھے کی طرف جا گری۔ یکدم زمین اس کے پیروں تلے نکل گئی، اور وہ چیخ کے ساتھ گہرائی میں گرنے لگی۔

گونار کی گاڑی کے اندر موبائل پر ایمان کی چیخ گونج اٹھی۔ اُس کی بے بسی اور مایوسی کی شدت میں مزید اضافہ ہوا، وہ اپنی گاڑی کی اسٹیئرنگ کو زور سے پکڑے ہوئے تھا اور دل میں غم و غصہ بھر رہا تھا۔ “ایمان!” اُس نے دھاڑتے ہوئے کہا، مگر موبائل اس کے ہاتھ سے پھسل کر گاڑی کے فرش پر جا گرا۔ رابطہ کٹ چکا تھا، صرف سناٹا اور باہر بجلی کی چمک اور بارش کی دھماکہ خیز آوازیں باقی تھیں۔

دوسری طرف، ایمان اب بھی ہوا میں بے وزنی کی حالت میں معلق تھی۔ اس نے بجلی کی چمک کے ذریعے نیچے بھرتے دریا اور نوکیلی چٹانوں کو دیکھا۔ لمحہ بہ لمحہ، زمین قریب تر ہو رہی تھی اور ہر سانس جیسے آخری لگ رہا تھا۔ اچانک، ایک زوردار جھٹکے سے اُس کا جسم نیچے گہرائی میں موجود ایک نوکیلے خشک درخت کی موٹی ٹہنی پر آگرا۔ ٹہنی اس کے پیٹ میں اتر کر اُس کے جسم کے پار نکل گئی۔

ایمان کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے زندگی کی روشنی مدھم ہونے لگی، اس کا جسم بے جان ہوتا جا رہا تھا۔ خون اس کے زخم سے بہہ کر درخت کی ٹہنی اور نیچے زمین کو بھگور رہا تھا۔ وہ اس تکلیف کو شدت سے محسوس کر رہی تھی، جیسے ہر بوند خون کی اُس کی زندگی سے رخصت ہو رہی ہو۔

اس کا جسم ساکن تھا، مگر اُس کی آنکھوں میں ابھی تک زندگی کی ایک آخری چمک باقی تھی، جیسے وہ اب بھی اللہ کی قدرت سے امید لگائے بیٹھی ہو۔

...°... -----

ایمان کا جسم دھیرے دھیرے بے جان ہوتا جا رہا تھا، جیسے زندگی کی روشنی اُس سے روٹھتی جا رہی ہو۔ نوکیلا درخت کا خشک ٹکڑا اُس کے پیٹ میں پیوست ہو چکا تھا، اور خون کا ایک گرم، لال سیلاب اُس کے لباس سے بہہ کر زمین کو سرخ کرتا جا رہا تھا۔

بارش کے بے رحمانہ قطروں نے خون کی اس رنگت کو اور بھی گہرا کر دیا تھا، ہر بوند اُس کے زخم کی داستان سناتی محسوس ہو رہی تھی۔

ایمان نے اپنی مدھم ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولا اور آسمان کی طرف دیکھا، جو سیاہ بادلوں اور کوندتی بجلی کے درمیان خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔

بجلی کی ہر چمک جیسے اس کی زندگی کے آخری لمحات کو گن رہی تھی۔ ہوا کے جھونکے اُس کے چہرے پر تیز تلوار کی مانند لگ رہے تھے، اور بارش کے قطرے اُس کے وجود کو مزید سرد کر رہے تھے۔

لیکن اس سب کے بیچ، اس کے بازو پر ایک عجیب سی گرمی کا احساس ہوا۔ اُس نے بمشکل سانس لیتے ہوئے اپنی آنکھیں جھپکائیں اور دیکھا۔ وہ ہی سانپ، جس کی نیلی آنکھیں خوفناک طوفان کے بیچ ایک امید کا نور لگ رہی تھیں۔

وہ آہستگی سے اس کے بازو کے گرد لپٹا ہوا تھا، جیسے اُس کے آخری لمحات میں اُس کا ساتھ ہو۔

ایمان نے اپنی کمزور سانسوں کے ساتھ ہلکی سی مسکراہٹ دی۔ اُس کے ہونٹ لرز رہے تھے، مگر اُس کی آنکھوں میں ایک سکون تھا، جیسے وہ اپنے انجام کو قبول کر چکی ہو۔ اُس نے دل میں سرگوشی کی، ”شکریہ، میرے دوست۔ صرف تم نے میرا ساتھ دیا، جب کسی اور نے پرواہ نہ کی۔“

اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں، اور اُس کے اندر ایک عجیب سی راحت کا احساس چھا گیا۔ وہ سب کچھ چھوڑ رہی تھی۔ درد، خوف، غم، نفرت—سب کو پیچھے چھوڑ رہی تھی۔ اس کی روح ایک گہرے سکون میں ڈوبتی جا رہی تھی، جیسے کسی نے اس کی روح کو نرمی سے چھوا ہو۔

اچانک، اُسے اپنے دماغ میں ایک نرم اور پیاری آواز سنائی دی، ”اے عبداللہ، ڈر مت، تو نے بہت صبر کیا ہے، بہت برداشت کیا ہے۔ تو نے اپنی آخرت کی تیاری کر لی ہے۔ میں تجھے لے جانا آیا ہوں۔“

ایمان کے سینے میں گرمی کی لہر دوڑ گئی، جیسے ایک روشنی اُس کے وجود کو روشن کر رہی ہو۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس کی روح اُس کے جسم سے باہر نکل رہی ہے، آہستہ آہستہ، جیسے کوئی نازک پرندہ ہوا میں اڑ رہا ہو۔ اس کے وجود کو کسی نے نرمی سے گلے لگایا، اُس کے ماتھے پر ایک بوسہ دیا، جیسے اُسے خوش آمدید کہا جا رہا ہو۔ اس کے چہرے پر ایک سکون بھری مسکراہٹ آئی، جیسے وہ کسی ایسی منزل پر پہنچ گئی ہو جہاں صرف محبت اور امن تھا۔

ایک آخری بار، اُس کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا، جو بارش کے قطرے کے ساتھ مل کر زمین پر جا گرا۔ ”ٹپ“ کی ہلکی سی آواز سنائی دی، اور اُس کا جسم بے جان ہو گیا۔ اُس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا، اور زندگی اُس کے جسم سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی۔ بارش اب بھی برس رہی تھی، اور نیچے بہنے والا پانی خون سے سرخ ہو چکا تھا۔

ایمان اس دنیا سے جا چکی تھی۔ سب کچھ پیچھے چھوڑ کر۔ اُس کی آزمائش کا اختتام ہو چکا تھا۔ اُس نے جنت کی خوشبو پالی تھی، وہ اپنی آخرت سنوار چکی تھی۔ ایمان نے زندگی کی آخری جنگ جیت لی تھی۔ ایمان، ایمان کی دولت پا چکی تھی۔

وہ جیت چکی تھی وہ جا چکی تھی ہمیشہ کے لیے۔۔۔۔۔

...°...

گونار کے کانوں میں تین شیروں کی دھاڑ کی گونج زوردار طوفان کی طرح گھس گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ پاکستان کے سنگلاخ پہاڑوں کے شیر ہیں، جو اپنی درندگی اور وحشت کے لیے بدنام ہیں۔

اس کے دل پر خوف اور افسوس کی ایک لہر دوڑ گئی، کیوں کہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ درندے ایمان کی لاش کو چیر پھاڑ رہے ہیں۔ ان کا نوچنا، خون بہانا اور ہڈیوں کا ٹوٹنا ایک وحشت ناک منظر اس کے ذہن میں ابھر آیا۔ وہ وحشت سے بھر گیا، اور ایک گہرا کرب اس کی روح میں سرایت کر گیا۔

گونار کا ہاتھ کانپتے ہوئے اس کے موبائل فون سے پھسل گیا، جیسے کسی آگ نے اس کی انگلیوں کو جلا دیا ہو۔ موبائل زمین پر گر ا اور اسکرین پر ٹوٹے خواب کی طرح دھندلا منظر ابھرا۔

ایک آنسو اس کے چہرے پر لرزتا ہوا نیچے آیا، اور وہ بے بسی کی انتہا تک پہنچ گیا۔ اس کے دل میں یہ خیال کہ وہ ایمان کو کھو چکا ہے، اس کے جسم کو سُن کر گیا۔ وہ اس کی محبت تھی، اس کی زندگی کا محور، اور اب وہ ختم ہو چکی تھی۔ وہ اس خیال کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔

سٹاک ہوم کی ویران، سرد اور سنسان سڑک پر گونا گوار ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے پوری دنیا اس کے خلاف ہو گئی ہو۔ چند لمحے قبل وہ اسلام آباد کی فلائٹ پکڑنے کی تیاری کر رہا تھا، امید کی آخری کرن تھی کہ شاید وہ ایمان کو بچا سکے۔

لیکن اب اس کا دل ٹوٹ چکا تھا، امید کی کوئی شمع باقی نہ رہی تھی۔ اس کے دماغ میں وہ لمحے تازہ ہو گئے جب اس نے ایلومیناتی کے ایک ایجنٹ کو قتل کیا تھا، جو اسلامی صحیفوں کی بے حرمتی کر رہا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر دھوکہ دیا تھا، اور وہ جانتا تھا کہ ایلومیناتی اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اب وہ اس کے پیچھے تھے۔

سامنے سڑک پر ایک گاڑی آہستہ آہستہ اس کے قریب آ کر رک گئی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ کون تھے، کالے سوٹ، اور ہتھیاروں سے لیس۔ یہ ایلومیناتی کے کارندے تھے، اور وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ چکے تھے۔

گونار نے گاڑی روکی، اور اپنی جگہ سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا، لیکن اس کے دل میں ایک گہرا خالی پن اُٹ آیا۔ وہ جینا نہیں چاہتا تھا، ایمان کے بغیر زندگی بیکار تھی، بے مقصد، اور بے معنی۔ اس کی زندگی کا ہر مقصد اس کے ساتھ دفن ہو چکا تھا۔

اچانک اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی، جو گاڑی کے کارپٹ پر پڑا تھا۔ اس نے بے دلی سے فون اٹھایا، اور دوسری طرف سے اس کے بندے کی آواز سنائی دی۔ ”سر، یہاں تین شیر ہیں۔ انسانی انگلیاں اور ایک عورت کا جوتا، پھٹے ہوئے کپڑے، ایک کان جس میں کانٹا لٹک رہا ہے، اور بکھرے ہوئے بال۔ یہ ایمان ہے، سر، وہ مر چکی ہے۔“ بندے کی آواز میں افسوس اور ٹوٹ پھوٹ واضح تھی۔

گونار کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو، ایک بے انتہا اذیت اور درد نے اسے چور چور کر دیا۔ اس نے فون بند کر کے پھینک دیا، جیسے کوئی بیکار شے ہو۔ وہ شکست خوردہ، بے جان، اور بے روح ہو کر گاڑی سے باہر نکلا، جیسے اب اس دنیا میں اس کا کوئی مقام نہ ہو۔ جیسے ایمان کے ساتھ وہ بھی مر گیا ہو ایمان کی روح کے ساتھ اس کی روح نے بھی پرواز کر لی ہو۔

گونار کے سامنے ایلومیناتی کے سرد مہر کارندے ابھرے، ان کے چہرے سنگدلانہ سفاکیت سے بھرپور، جیسے انسانیت کی کوئی رمت ان کے دلوں میں باقی نہ رہی ہو۔ ان کے قدموں کی آہٹ موت کا اعلان کر رہی تھی، اور ان کی نگاہوں میں قتل کا پختہ عزم تھا۔ لیکن گونار کو اب کوئی غرض نہیں تھی۔ نہ خوف کی

چھایا تھی، نہ کسی قسم کا اضطراب۔ وہ پہلے ہی اپنی زندگی سے بیگانہ ہو چکا تھا، جیسے ایمان کی موت نے اس کی روح کو غارت کر دیا ہو، اس کے دل میں کوئی باقی ماندہ تمنانہ تھی۔

وہ جو کبھی فولاد کی مانند مضبوط تھا، اب ایک ناتواں ذرہ بن چکا تھا۔ ایمان کی حفاظت میں ناکامی کا بوجھ اس کے دل پر کسی ناقابلِ برداشت بوجھ کی طرح لد گیا تھا، اور اس کا سینہ غم کی ناقابلِ بیان گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا۔ محبت کا قیمتی رشتہ اس کے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل گیا تھا، اور وہ خود کو ناکامی کی ملامتوں میں جکڑا محسوس کر رہا تھا۔

اس لمحے اسے ماسٹر لی کی آواز کی بازگشت سنائی دی، جو کسی قدیم درس کی طرح اس کے ذہن میں گونجی۔ “ایز کنیل۔ یہ انتقام تمہاری زندگی کو بے مقصد بنادے گا، اور تمہیں مزید درد و کرب میں مبتلا کرے گا۔ حقیقی طاقت محبت میں ہے، اور کنگ فوکا اصل مقصد امن اور ہم آہنگی ہے۔”

مگر اب یہ نصیحتیں اس کے لیے محض بیکار اور فضول لگتی تھیں۔ اس کے دل میں نہ کوئی معافی تھی، نہ ہی کوئی سکون کی جستجو۔ برف کے گرتے گالے جیسے اُس کے درد کو دبا کر اس کی زندگی کے ہر احساس کو مٹا رہے تھے۔

ہر برف کا ذرہ اس کے وجود پر بکھرتے ہوئے موت کی دستک محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک بوجھل سانس بھری، جیسے آخری بار دنیا کے ساتھ اپنا تعلق ختم کر رہا ہو۔

گونار کی نگاہیں دھندلا گئیں، اور اس کے دل میں صرف موت کی خواہش باقی رہ گئی۔ وہ مرنا چاہتا تھا، تاکہ وہ ایمان کے ساتھ اگلی دنیا میں مل سکے۔ اسے امید تھی کہ اللہ اسے معاف کر دے گا اور اُسے اپنی محبوبہ کے ساتھ جنت میں یکجا کرے گا۔

یکایک اس نے گاڑی کا اسٹیرنگ بے دردی سے مروڑا اور اپنی کار کو بے قابو کرتے ہوئے سامنے کے درخت سے جا ٹکرایا۔ گاڑی کے پرچے اڑ گئے، اور ایک دھماکے کے ساتھ اس کا جسم اندر ہی اندر پاش پاش ہو گیا۔ گاڑی کے بچوں بچ اس کی لاش اب گوشت کے ٹکڑوں کی مانند بے حس و حرکت پڑی تھی۔ ظاہر آئیے ایک حادثہ معلوم ہوتا تھا، لیکن وہ اپنی مرضی سے مرچکا تھا۔

ایلو میناٹی کے ایجنٹ اُس کی لاش کو اپنے ساتھ لے گئے، جیسے کوئی راز کی شے ہو۔ انہوں نے نہ صرف اس کی جسمانی موجودگی کو مٹا دیا، بلکہ اس کی محبت، اس کی قربانی اور اس کی کہانی کے ہر نشان کو صفحہ ہستی سے محو کر دیا۔ گونار اور ایمان کی داستان اب ختم ہو چکی تھی، اور ان کی زندگی کے نقوش وقت کے دھند لکوں میں گم ہو گئے۔

یہ تھا دولتِ ایمان میں ایمان اور گونار کا اختتام، جس کے بعد ایک نئی کہانی نے جنم لیا۔ مینسا اور معارج سلطان کی داستان، جو جنت کی کنجی سے ہمسفر بننے تک کا سفر طے کریں گے۔۔۔

جیسے ہی میں اس خاکی عالم کی سرحدوں سے باہر قدم رکھتا ہوں، زمین اپنے لطیف وجود کے ساتھ میری نظروں کے سامنے عیاں ہوئی، ایک کمزور سبزہ مائل گولا جو آسمانی وسعتوں میں معلق تھا۔ سیاروں کی گردش نے ایک فلکی رقص کو جنم دیا، اور زمین اپنی محوری حرکت سے اس رقص کا حصہ تھی، جہاں کائناتی سرگوشیوں کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ یہ فلک نمائیل آسمانی محور حرکت تھا، اور زمین سورج کے گرد اپنے معتدل اور نپے تلے چکروں کے ساتھ محور سفر تھی، گویا فلکی وقت کی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

فلک کے اس بے پایاں پردے میں، تقدیر کے پراسرار ہاتھوں کی رہنمائی میں، میں نے ایک روحانی تبدیلی کا مشاہدہ کیا۔ ایک ایسا سفر جس کی تمام تر حرکات و سکنات کے پس پردہ الہی حکمت تھی۔

جیسے ہی میں کعبہ کی حدود میں داخل ہوا، میری آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو عقل انسانی سے ماورا تھا۔ مقدس عمارت، آسمانی نور کی شعاعوں میں ڈھلی ہوئی، آسمان و زمین کے درمیان ایک انمٹ واسطے کے طور پر قائم تھی۔

بارش کا پہلا قطرہ آسمان سے ٹپکا اور کعبہ کے سنگین فرش پر پڑا۔ یہ قطرے، شفاف اور درخشاں، گویا آسمان کے دیار سے خوشیوں کی آنسوؤں کی صورت میں برس رہے تھے۔

ہر قطرہ اپنے اندر ایک مقدس خوشبو لئے ہوئے تھا، جو آسمانی تجلی کا مظہر تھا، اور فانی دنیا کی حسی حدود سے کہیں بلند تھی۔

جیسے ہی آسمانی اجسام کی صف بندی ہوئی، فلکی وسعتوں میں ایک گونج سنائی دی، ایک آواز جو زمان و مکان کے حدود سے آزاد تھی۔ اس نے ۲۰۲۸ کا وہ دور یاد دلایا جب مکہ مکرمہ پر آسمانی بارش کا نزول ہوا تھا۔

ہر بوند میں الہی رحمت پنہاں تھی، اور کعبہ اپنی شان و شوکت میں کائناتی احترام کا محور بن گیا تھا۔ ہواؤں نے ایک روحانی پردے کو اٹھا دیا، جو مقدس حدود کو نورانی تجلی سے نہلا رہا تھا، اور کعبہ اس نور میں ڈوبا ہوا، گویا زمین و آسمان کے دائروں کے درمیان کی حدود کو پار کر رہا تھا۔

اس روحانی منظر میں، جہاں بارش کی بوندیں کائناتی ہم آہنگی میں گھل مل گئی تھیں، کعبہ ایک دائمی عقیدت کی علامت کے طور پر قائم تھا۔

نہ صرف زمینی زائرین بلکہ فلکی مخلوقات بھی اس کی تعظیم میں محو ہو چکی تھیں، جیسے ایک مینار الوہیت کائنات کی وسعتوں میں جگمگا رہا ہو۔

دفعۃً فضا میں ایک شخص کی آواز بلند ہوتی ہے، گہری خاموشی میں گونجتی، جیسے یہ زمین کے پردوں سے نکل کر سات آسمانوں کی وسعتوں تک جا پہنچے۔

اس نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا، نگاہیں سجدہ ریز، اور ہاتھ دعا کے لیے بلند کیے۔ بارش کی بوندیں آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر برس رہی تھیں، مگر وہ ان سے بے پرواہ تھا، اس کے دل کی بے چینی اور روح کی گہرائیوں میں چھپا اضطراب، اس کی دعا کی طاقت کو بڑھا رہا تھا۔

۔ ”اے مالک کائنات، تو ہر شے کا رازدان ہے، زمین و آسمان کے ذرات، پہاڑوں کی چوٹیاں، اور سمندروں کی گہرائیوں میں پوشیدہ زندگی کے راز تک تیری قدرت میں ہیں۔ میں تیری طرف ہاتھ اٹھاتا ہوں، تیری بے پایاں رحمت کا طلبگار بن کر، کہ تو میری یہ عاجزانہ التجا سن لے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ہر حال میں رحم کرنے والا ہے، اور بے جان کو جان بخشنے والا ہے۔“

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہا، جیسے الفاظ کے انتخاب میں وقت لے رہا ہو، اور پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

۔ ”اے اللہ، میں تجھ سے التجا کرتا ہوں، اس پاکیزہ روح کے لیے، جس نے خود کو تیری محبت میں ڈھال رکھا ہے۔ میں اس کی زندگی کے لیے دعا گو ہوں، کہ تو اسے ایسی زندگی عطا کر جو تیری رضا کے مطابق ہو، اور اس کے دل کو ایسی روشنی سے بھر دے جو تیرے قرب کی گواہی ہو۔“

اے رب العالمین، اسے ایمان کے وہ درجے عطا فرما جو اسے ہر آزمائش میں ثابت قدم رکھے، اور ہر لمحے میں تیری محبت کے سائے میں پناہ دے۔“

بارش کی بوندیں اب تیز ہو چکی تھیں، مگر وہ اپنی دعا میں مصروف رہا، گویا اس کا دل آسمان کی وسعتوں سے کوئی جواب حاصل کیے بغیر پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔

- ”اے مالک، میں صرف زندگی کی التجا نہیں کرتا، میں ایک ایسی زندگی کی طلب کرتا ہوں جو وفا، یقین اور محبت سے لبریز ہو، ایسی روشنی سے منور ہو جو اندھیروں کو چھانٹ دے، اور ایسی نعمتوں سے بھرپور ہو جو تیرے بندوں کے دلوں میں امید کی کرن جگائے۔“

اس نے ایک گہری سانس لی، اور پھر جیسے اپنی دعا کے اختتام کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

- ”اے اللہ، میری دعا کو سات آسمانوں کے پردوں سے پار کر دے، اسے تیری بارگاہ میں قبولیت کا مقام عطا فرما، اور اس پاکیزہ زندگی کے لیے میری التجا سن لے۔ میں تیرے علم اور تیری قدرت کا گواہ ہوں، اور تجھ سے اس بابرکت وجود کے لیے زندگی کا طلبگار ہوں جو تیری یاد کے ساتھ ہر لمحہ سرشار ہو۔ اے خالق کائنات، میری دعا کو قبول فرما، اور اس پاکیزہ روح کو ایسی زندگی عطا فرما جو تیرے قرب اور خوشنودی کا باعث ہو۔ آمین۔“

وہ احرام میں ملبوس، کعبہ کے سامنے دراز قد شخص آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کی قامت میں ایک جلالی استقامت تھی، کمر ایسی سخت جیسے صدیوں کے تجربات نے اسے فولاد میں ڈھال دیا ہو۔ بارش کے قطرے اس کے لباس کو تر کرتے ہوئے اس کی جلد تک رسائی پا چکے تھے، اور اس کے گھنے، بکھرے بال پیشانی سے چپکے ہوئے تھے، گویا بارش اور آنسو ایک ہی رستے سے بہہ رہے ہوں۔

وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہے، بارش کی نمی اور آنسوؤں کو ایک ساتھ صاف کرتے ہوئے۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی طوفان کی داستان سناتا تھا، تازگی اور تھکن کا ایک عجیب امتزاج، جیسے آزمائشوں نے اس کے اندر ایک نامعلوم بوجھ ڈال دیا ہو۔

اسی لمحے، پروفیسر تراب اس کے پیچھے نمودار ہوئے، ان کی نگاہوں میں فہم کی روشنی اور لمس میں شفقت کی حرارت تھی۔ انہوں نے معارج کے کندھوں پر ہاتھ رکھا، اور نرمی سے کہا، ”معارج، چلنے کا وقت آگیا ہے۔“ ان کے الفاظ میں ایک خاموشی کا پیغام چھپا ہوا تھا، جیسے وہ جانتے ہوں کہ معارج کے دل کی گہرائیوں میں کیا طوفان برپا ہے۔

معارج نے آہستگی سے پلٹ کر پروفیسر کی طرف دیکھا۔ پروفیسر کے ساتھ کھڑا وہ شخص، جو لمحے بھر پہلے ناممکن کی حدوں میں جا چکا تھا—وہ زندہ تھا۔ گونا، جسے موت کے حوالے سمجھا جا چکا تھا، اللہ کی قدرت سے بچ نکلا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک خاموشی اور چہرے پر وہی اکتاہٹ چھائی ہوئی تھی، جیسے اس نے کوئی قیمتی شے ہمیشہ کے لیے کھودی ہو۔

معارج نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ”ہاں، پروفیسر، چلتے ہیں۔“

اس نے ایک آخری بار کعبہ کی طرف دیکھا، جہاں سے ایک روحانی نور اس کے قلب کو چھو رہا تھا۔ ہونٹوں پر ایک خفیف مسکراہٹ نمودار ہوئی، جیسے اسے اس امر کا یقین ہو کہ اس کی ذمہ داری پوری ہو چکی ہے۔

دل میں ایک بے پایاں تشکر اور سکون کی لہر دوڑ گئی۔ بارش کے قطرے اور آسمان میں چمکتی بجلی گویا اس کے جذبات کی شدت کی گواہ بن چکے تھے، ہر روشنی اور ہر قطرہ اس کے دل کے اندرونی تلاطم کی بازگشت معلوم ہوتا تھا۔۔۔

وہ جانے کو پلٹا ہی تھا کہ یکدم دل کی دھڑکنیں بے قابو ہونے لگیں، جیسے کوئی انجان قوت دل کی طنابیں کھینچ رہی ہو۔ قدم وہیں کے وہیں رک چکے تھے، اور نگاہیں بے اختیار کسی اور سمت اٹھ گئیں۔

وہاں، کچھ فاصلے پر، ایک وجود تھا—عبایا میں ملفوف، اسرار کی دھند میں لپٹا ہوا۔ وہ پشت کیسے کھڑی تھی، اس کا چہرہ پردے میں چھپا ہوا تھا، لیکن اس وجود سے چھلکتی ہوئی ایک پراسرار روحانی طمانیت ماحول میں رچی بسی تھی۔

وہ خانہ کعبہ کے سامنے خاموشی سے ایستادہ تھی، اور معارج کے دل کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، جیسے وہ اس وجود کو کسی ازلی وابستگی سے جانتا ہو، جیسے وہ اس کی روح کا گمشدہ حصہ ہو، جیسے کوئی پراسرار راز ہو جو پردہ شعور پر دستک دے رہا ہو، مگر وہ اُس کا مفہوم نہ سمجھ پا رہا ہو۔ کچھ تھا، جو اُسے کھینچتا تھا، مگر اس کی نوعیت سے وہ لاعلم تھا۔

متردد قدموں سے وہ اسے تکتے ہوئے پلٹا اور وہاں سے روانہ ہونے لگا۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ دفعۃً اُس لڑکی کی مدھم مگر دلگداز آواز جو اس کے قلب کی آواز تھی فضا میں گونجی۔ وہ کوئی معمولی صدا نہ تھی،

گویا کسی نازک دل کی آہ تھی، جو صرف اللہ ہی سن، سکتا تھا۔ یہ الفاظ دعاؤں کی صورت میں اس کے دل سے پھسل رہے تھے، جو دل کے اندرون سے نکل کر عرشِ بریں تک بلند ہو رہی تھیں۔

وہ وجود، جس کی سمت سے پھولوں کی لطیف خوشبو کا احساس ہو رہا تھا، دل کی تڑپ کو بیان کر رہی تھی، الفاظ میں ایک غیر مرئی طاقت تھی:-

- ”اے میرے رب، اے کائنات کے مالک، اے اللہ تو سب کا خالق و پروردگار ہے، میں تیری بندگی کا اقرار کرتی ہوں اور تجھے سجدہ کرتی ہوں، کہ تو ہی میرا پالنے والا ہے، میرا خالق ہے، اور میرا نگران ہے۔ تیری رحمت میری سمجھ سے بالاتر ہے، اور میں تیری رضا میں خود کو مکمل طور پر سوپتی ہوں۔ اے وہ ذات، جس کی عنایات لا محدود ہیں، مجھے اپنی نیک بندیوں کی صفات سے مزین فرما، جو تیری رحمت کے جلوے میں پلتی ہیں۔“

اس کی دعا میں نرمی اور خشوع تھا، مگر ساتھ ہی ایک مضبوطی اور عزم بھی

- ”اے اللہ، مجھے حضرت مریم (رضہ) جیسی طہارت عطا فرما، جنہیں تو نے تمام عالمین کی عورتوں میں چنا۔ مجھے آسیہ بنت مزاحم جیسی استقامت عطا فرما، جنہوں نے فرعون کی تمام تر جاہ و حشمت کو رد کر کے تیری عبادت میں جان دی۔ اے میرے پروردگار، مجھے حضرت خدیجہؓ جیسی فہم و بصیرت عطا کر، جنہوں نے تیرے رسول ﷺ کے مقصد میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔“

ہر لفظ گویا آسمان تک پہنچنے کا عزم لیے ہوئے تھا، دعا کی سچائی اس کی روح میں سرایت کر چکی تھی۔
- ”اے مالک، مجھے حضرت عائشہؓ جیسی حکمت عطا فرما، جو تیری رہنمائی کا سرچشمہ بنیں، اور اپنے علم سے
امت کو سیراب کیا۔ مجھے حضرت فاطمہؓ جیسی وفاداری نصیب فرما، جو تیرے محبوب نبی

ﷺ

کی مصیبتوں میں صبر و ثبات کی اعلیٰ مثال تھیں۔“۔

اس کے الفاظ بارش کے قطروں کی طرح دل پر گر رہے تھے، گویا کائنات اس کی دعا کا جواب دینے کے
لیے سن رہی ہو۔

”مجھے حضرت زینب (رضہ) کی استقامت اور عزم سے حصہ عطا فرما، جنہوں نے اپنے بھائی حسین (رضہ)
اور ان کے وفادار ساتھیوں کی شہادت کے بعد میدان کربلا کی آگ میں بھی ثابت قدمی کا پرچم تھامے
رکھا

اے اللہ! مجھے

ام رباب (رضہ)

جیسا صبر و جرات عطا فرما، جنہوں نے اپنے معصوم علی اصغر کی قربانی تیری رضا کے لیے پیش کی، اور صبر کی وہ مثال قائم کی کہ روح کانپ اٹھے۔ جنہوں نے اپنے لخت جگر کے گلے پر تیر دیکھا، مگر تیرے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔

یہ دعا دل کو چھوتی، روح کو جھنجھوڑتی، ایک خالص تڑپ تھی۔

"اے میرے مالک، میں تیرے فضل و کرم کی طلب گار ہوں، تیری عنایات کی متمنی ہوں۔ اے وہ ذات، جس کے ہاتھوں میں ہر چیز کی باگ دوڑ ہے، میری دعا کو قبول فرما اور مجھے ان عورتوں کی صفات سے نواز، جو تیرے قرب کا اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ تو ہی سب سے بڑا معاف کرنے والا، سب سے زیادہ علم رکھنے والا، اور سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

لڑکی کی آواز خاموش ہوئی، مگر اس کی دعا کی بازگشت فضا میں گونجتی رہی، جیسے وہ کائنات کے ہر ذرے کو اس پیغام سے آگاہ کر رہی ہو کہ ایک بندہ اپنے خالق کی بارگاہ میں التجا کر رہا ہے۔

...°...

طیارہ بادلوں کی وسیع چادر کے اوپر رواں دواں، بلندیوں میں پاکستانی سرزمین کی جانب محو سفر تھا۔ معارج سلطان — جو نام اس نے از خود چنا تھا، جس کا مطلب ہے "بلندیوں کی طرف بڑھنا"۔۔ اور یہ قرآن کی

سورة المعارج سے ماخوذ ہے۔ اپنی نشست پر سیاہ قمیض اور شلوار میں ملبوس بیٹھا، کھڑکی کے باہر پھیلے لا متناہی نیلے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔

ہواؤں کی ہلکی سی سرسراہٹ اور جہاز کی تیز رفتاری نے جیسے اس کے دل کی دھڑکنوں کو بھی بڑھا دیا ہو۔ جب جہاز نے بلندی اور رفتار میں تغیر پیدا کیا، اس نے اپنی سیٹ بیلٹ کو کس کر باندھ لیا اور اپنے دل کی بے چینی کو قابو کرنے کی کوشش کی۔

اس کے ساتھ پروفیسر تراب بیٹھے تھے، جو معارج کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے دھیرے سے بولے، ”تمہیں کچھ فکر لاحق ہے؟“

معارج نے انکار میں سر ہلایا، اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ ”نہیں، فکر نہیں... خوشی ہے کہ میں پاکستان جا رہا ہوں۔ آخر کار، اللہ کی نشانیاں میں نے دیکھ لی ہیں، اب مجھے ایمان کو تلاش کرنا ہے۔“

اس کے لہجے میں گہرا عزم تھا، جیسے اس نے زندگی کا ایک نیا مقصد پا لیا ہو۔ پروفیسر تراب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا، ان کی نظروں میں تحسین اور ہمدردی کی ملی جلی کیفیت تھی۔

وہ جانتے تھے کہ معارج نے ان سالوں میں ایمان کو تلاش کیا ہے، اور جب اسے یہ اطلاع ملی کہ وہ دنیا سے رخصت ہو چکی ہے، تو اس کے دل پر جو قیامت گزری، اس کا اندازہ الفاظ سے باہر تھا۔ باوجود اس حقیقت

کے کہ ایمان کا انتقال ہو چکا تھا، معارج پھر بھی دیوانہ وار اسے تلاش کرتا رہا، جیسے وہ حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہو۔

۔ ”کیا تمہیں اب بھی یقین ہے کہ وہ زندہ ہے؟ تم نے گزرے سال، نہ جانے کتنے مہینے، دن اور ساعتیں اسی جستجو میں گزار دی ہیں، ”تراب نے دبے لہجے میں سوال کیا، گویا الفاظ خود اپنی گہرائی میں ڈوب رہے ہوں۔

معارج کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک در آئی۔ ”میں نے ایک خواب دیکھا تھا، جس نے مجھے یقین دلایا کہ ایمان زندہ ہے۔ اسی خواب نے مجھے ہمت دی کہ ایلومیناتی کے چنگل سے نکلوں۔“

پروفیسر نے معارج کے کندھے پر ہاتھ رکھا، ”میری دعا ہے کہ ایمان سلامت ہو، اور تمہیں جلد ہی اپنی منزل مل جائے۔“

معارج نے خاموشی سے شکریہ ادا کیا اور آنکھیں بند کر کے دل سے دعا کی کہ اللہ اس کی ایمان کو رہنمائی عطا کرے اور ہر نقصان سے بچائے۔ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی یہ دعا اسے ایک سکون بخشی ہوئی اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔

اچانک، پائلٹ کی آواز گونجی، ”ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ رہے ہیں۔“ طیارہ آہستگی سے مڑ رہا تھا۔ معارج نے آنکھیں کھولیں اور کھڑکی کے باہر دیکھا تو ہنزہ کی خوبصورت وادی، سرسبز کھیت اور بلند و بالا پہاڑ اپنی جلالت میں اسے اپنی طرف بلا رہے تھے۔

اس کے دل میں ایک عجیب سی امید نے جنم لیا، وہ پھر سے ایمان سے ملنے کی آرزو میں کھو گیا۔ مگر دل کا ایک کوناب بھی یہ حقیقت تسلیم کرنے سے انکاری تھا کہ ایمان اب اس دنیا میں نہیں۔

...°...

طیارہ ہنزہ ایئرپورٹ کی فضائی پٹی کی طرف نیچے اتر رہا تھا، جو ایک چھوٹی سی سرزمین ہے، چاروں طرف فلک بوس پہاڑوں کا حسین منظر، نیلگوں آسمان اور صاف شفاف ہوائیں۔

وادی کی قدرتی خوبصورتی، جہاں سبزہ، برف پوش چوٹیاں اور چمکتے چشمے ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے، ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معارج، جسے کبھی گوناہ کہا جاتا تھا، کھڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی، ایک اضطراب اور جوش کی ملی جلی کیفیت، کیوں کہ اُس کا قدم پاکستان کی مقدس مٹی پر پڑنے والا تھا۔ یہاں اُسے اپنی بچھڑی ہوئی محبت، ایمان، کو پانے کی امید تھی۔

معارج کی یادوں کے درپچوں میں وہ لمحہ پھر سے جاگا جب اُسے یقین ہوا تھا کہ اُس نے ایمان کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔

یہ سٹاک ہوم کی ایک سرد، تاریک اور برف سے ڈھکی رات تھی۔ ایومیناتی کے ایجنٹس ایک عرصے سے اُس شخص کی تلاش میں تھے جس نے قرآن کی بے حرمتی کرنے والے کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

وہ بخوبی واقف تھے کہ سویڈن میں انڈین کوبروں کی موجودگی کسی عام معاملے کا حصہ نہیں ہو سکتی۔ یہاں ان کو ضرور کسی خفیہ قوت نے پہنچایا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ معاملات کی پیچیدگی مزید گہری ہوتی گئی، اور جلد ہی اُنہیں یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ ”گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے“ کی مثل اُن پر صادق آتی تھی۔

اُنہیں اس بات کا شدید رنج تھا کہ جس جڑ پر وہ سالوں سے انحصار کر رہے تھے، وہ ہی اب اُنہیں ڈھانے کے درپے تھی۔

گونار، جو کبھی اُن کا راز دار اور ہم رکاب تھا، غداری کے رستے پر نکل چکا تھا۔ اُس نے ایومیناتی کے خفیہ منصوبے سے انحراف کیا اور مسلمانوں کی صف میں شامل ہو کر اُن کی تمام تدابیر کو خاک میں ملانے کا بیڑا اٹھالیا تھا۔

وہ اُس کے پیچھے ایک سنسان سڑک تک پہنچ چکے تھے، جہاں اُنہوں نے اپنے جال بچھا رکھے تھے۔ رات کی سیاہی میں وہ خاموشی سے گونار کے انتظار میں تھے۔

اُنہوں نے اپنی گاڑی میں ایک لاش رکھی تھی، جسے وہ مردہ خانے سے چرالائے تھے۔ یہ لاش جسمانی طور پر گونار سے مشابہ تھی، اور اُس کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔

منصوبہ یہ تھا کہ گونار کو زندہ گرفتار کیا جائے، تاکہ اُس سے راز اگلوانے کے لیے اذیت دی جاسکے۔ اُن کے چہروں پر کر خنگی، بدن پر سیاہ لباس اور ہاتھوں میں مسلح چاقو اور گنیں تھیں۔ ان میں کوئی رحم نہیں تھا۔ جیسے ہی گونار کی گاڑی قریب آئی، اُنہوں نے گاڑی کو گھیر لیا، اور اپنی بندوقیں اُس پر تان لیں۔

گونار نے اپنا فون زمین پر گرادیا اور اُس کی دوسری جانب سے آواز سنی۔

اُنہوں نے گونار پر ہتھکڑیاں ڈال دیں اور اُسے اپنی گاڑی میں بیٹھالیا۔ منصوبے کے تحت، لاش کو گونار کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا دیا، شراب کی بوتل سے کپڑوں پر چھینٹے دیے اور گاڑی کو ایک درخت سے ٹکرا دیا۔

آگ کی لپٹیں اور دھواں آسمان کی طرف بلند ہوا۔ اُنہوں نے ایک لمحے کو توقف کیا اور مسکرائے۔ یہ دنیا کے لیے ایک نیا دھوکا تھا، گونار کی جھوٹی موت کا فریب۔

اس منظر کا ہر نقشہ، ہر قدم، گونار کے اُس خواب کی موت کا اعلان تھا جس میں محبت، وفا، اور زندگی کی تمام امیدیں شامل تھیں۔

...°...

گونار گہری بے ہوشی کی حالت میں تھا، اُس انجکشن کے اثر میں جو الیومیناتی کے اہلکاروں نے اُسے دیا تھا۔ یہ ایک شکستہ حال اور تاریک کمرہ تھا، جہاں کئی دنوں تک اُس پر وحشیانہ تشدد کیا جاتا رہا تھا۔ مگر، شاولن

راہب کی تربیت نے اُسے اتنا صبر و استقامت دیا تھا کہ جسمانی اذیت کا احساس اُس کے لیے گویا معدوم ہو چکا تھا۔

تاہم، جو غصہ اُس کے دل میں پل رہا تھا، وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ اپنی محبت ایمان کو بچانے میں ناکام ہو چکا تھا۔ جس عورت سے وہ ٹوٹ کر محبت کرتا تھا، وہ اُسے ہمیشہ کے لیے کھودینے کا یقین رکھتا تھا۔

اُسے لگتا تھا کہ ایمان کسی پہاڑی شیر کا شکار ہو چکی ہے، اور یہ خیال اُس کے دل میں درد کا ایک نہ ختم ہونے والا دریا بہا رہا تھا۔ وہ اپنے دل میں موت کی آرزو لیے جیتا تھا تا کہ اس تکلیف دہ زندگی سے رہائی پائے اور مرنے کے بعد دوسری دنیا میں سکون پائے۔

لیکن نیند کی آغوش میں جاتے ہی اُس نے ایک خواب دیکھا۔ وہ خواب جو اُس کی زندگی میں کبھی نہ آیا تھا، اتنا ہی دلکش اور خوبصورت جتنا کوئی طلسماتی منظر ہو سکتا تھا۔

اُس خواب میں ایک اُمید اور سکون کا احساس تھا، گویا فطرت نے اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا ہو۔

اُس نے دیکھا کہ وہ کسی گہرائیوں میں گھری ہوئی وادی میں کھڑا ہے، جہاں کی ہوا کی لطافت دل کو چھو لینے والی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سنہری روشنی پھیلی ہوئی تھی اور نیچے بچھے ہوئے سرسبز میدانوں میں ہر سمت زندگی کا رنگ بکھرا ہوا تھا۔

تتلیاں اپنے رنگ برنگے پروں کے ساتھ ہواؤں میں رقص کر رہی تھیں اور پھولوں کی بوندیں جیسے قدرتی زیور کی مانند چمک رہی تھیں۔ ایک ندی اپنے دھیمہ اور مدھر ترنم کے ساتھ پہاڑوں سے بہتی ہوئی چمکدار جواہرات کی طرح نیچے آرہی تھی۔

گونار نے ندی کی جانب بھاگنا شروع کیا، اُس کے قدموں میں ایک ایسی خوشی اور آزادی کا احساس تھا جس سے وہ ناواقف تھا۔ جب وہ ندی کے قریب پہنچا تو اُس نے پانی میں ایک عکس دیکھا، لیکن یہ عکس اُس کا نہیں تھا۔

یہ ایمان کا عکس تھا۔ وہ وہاں زندہ اور صحت مند تھی، ہری گھاس پر بیٹھی ہوئی، اور اُس کے برابر ایک سیاہ فارسی بلا اور بارہ گلہریاں کھیل رہی تھیں۔ وہ ایک سفید سادہ لباس میں ملبوس تھی، اُس کے شہد رنگے بال کھلے ہوئے تھے اور ہوا میں لہرا رہے تھے۔

وہ ایک ایسی چمک اور روشنی میں نہائی ہوئی تھی جیسے کسی افسانوی شہزادی کی صورت میں اُسے جلا ملی ہو۔ ایمان نے اُس کی طرف دیکھا اور اُس کی مسکراہٹ نے اُس کا دل جیسے پگھلا دیا۔ گونار نے بے یقینی اور حیرت سے کہا، ”ایمان، تم یہاں ہو؟“ اُس کی آواز میں حیرت اور جذبات کا طوفان چھپا تھا۔

ایمان نے اپنی میٹھی اور نرم آواز میں جواب دیا، ”ہاں، تم مجھے ڈھونڈ رہے تھے نا؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر وہ اُسے ایک جھولے کی طرف لے گئی جو سمندر کے اوپر لٹکا ہوا تھا، اور اُس کے اندر کا حسن ایک خوابیدہ فضا میں گھل رہا تھا۔

ایمان جھولے پر بیٹھی وہ ایمان کو جھولے پر بیٹھتا دیکھ رہا تھا، دل میں ایک عجیب گرم جوشی اور سکون محسوس کرتے ہوئے۔ اُس نے ایمان کی آنکھوں میں دیکھا، اور ایک ایسی محبت اور تعظیم کا احساس ہوا جس کا تجربہ اُس نے کبھی نہ کیا تھا۔ ”آؤ، میرے ساتھ بیٹھو،“ ایمان نے ایک پُر شفقت انداز میں کہا۔

گونار نے ایمان کے ساتھ بیٹھ کر اُس کے وجود سے بہنے والے سکون کو محسوس کیا۔ پھر ایمان نے اپنی نرم آواز میں کہا، ”مجھے بزدلوں سے نفرت ہے، اور تم بزدل نہیں ہو۔ تمہیں اپنے مقصد کے لیے لڑنا ہوگا، تم مضبوط ہو۔“ اُس کی باتوں میں ایسا فخر اور حوصلہ تھا جیسے وہ اُسے دوبارہ زندگی کی طرف دھکیل رہی ہو۔

گونار نے اُس کی باتوں پر مسکرا کر جواب دیا اور اُس کے دل میں ایسی طاقت اور یقین جاگ اُٹھا جو پہلے کبھی نہ تھا۔ اُس نے سمندر کی طرف دیکھا، جہاں مچھلیاں اُچھل رہی تھیں، اور لہریں زندگی کے نئے ترانے گا رہی تھیں۔

ایمان نے دانشمندانہ انداز میں کہا، ”تمہارے سامنے ایک لمبی زندگی ہے، اللہ پر بھروسہ کرو اور کمزور نہ ہو۔ تم ایک شاو لن راہب ہو، مشکلات تمہارے آگے سر جھکا سکتیں ہیں مگر تم مشکلات کے آگے نہیں جھک سکتے“ گونار نے اُس کی باتوں میں ایک نیا یقین اور طاقت محسوس کی۔

پھر ایمان کھڑی ہوئی اور سمندر کی دھند میں گم ہونے لگی۔ گونار کو جیسے ایک انجانا خوف اور گھبراہٹ نے آگھیرا۔ وہ دوبارہ اُسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے پکارا، ”براہ کرم، مجھے چھوڑ کر مت جاؤ!“ ایمان کی

آواز ہوا میں گونجنے لگی، ”تمہیں جیتنا ہے، تمہیں اسلام کو پانا ہے، اُس کا راستہ تمہارا انتظار کر رہا ہے، اور میں بھی تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

دھند کا پردہ اٹھتے ہی اُس کی نظر ایک شاہراہ پر جا ٹھہری، جس کے انتہا پر ایک تابناک اور دلکش روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اُس روشنی میں ایسی کشش اور جاذبیت تھی جس کا تجربہ گونار نے اپنی حیات میں پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

اُس کے اندر ایک انوکھا جذبہ اور اشتیاق پیدا ہوا، گویا وہ روشنی کسی باطنی راز کی خبر دے رہی ہو۔ اُس نے اس سفر کو اختیار کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا، اور اپنے دل میں اُبلتی ہوئی اُمیدوں کے ساتھ، اُس پر اسرار روشنی کو پانے کی خواہش میں محو ہو گیا۔

گونار جھولے سے آہستگی سے اُٹھا، اور بے ساختہ اُس روشنی کی سمت قدم بڑھانے لگا۔ جیسے جیسے اُس کے قدم تیز ہوتے گئے، ویسے ہی اُس کے دل میں ایک غیر معمولی تحرک اور ہیجان پیدا ہوتا گیا، جیسے اُس کا وجود ایک نوید مسرت کی طرف بڑھ رہا ہو۔

ہر قدم کے ساتھ اُس کے اندر کی توانائی تیز ہو رہی تھی، اور اُس کا دل ایک ایسے ولولے سے معمور تھا جسے اُس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔

روشنی کی طرف بھاگتے ہوئے، اُس کے دل میں اسلام کی جستجو اور طلب کی ایک گہری لہر اُٹھنے لگی۔ وہ روشنی میں گم ہونے کو بے تاب تھا، جیسے وہ ہی اُس کی نجات کا ذریعہ ہو۔

وہ اپنی منزل کی طرف لپکتا چلا گیا، گویا اُس کی تمام کھوئی ہوئی اُمیدیں اُس روشنی کے ساتھ پیوستہ تھیں۔

گونار نے اپنے خواب سے آنکھیں کھولیں تو اُس پر انجکشن کا اثر نہ تھا جو ایلومیناتی کے ایجنٹوں نے اُس کے جسم میں داخل کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ اُس کے شعور پر قابو پانے اور اُس کے ادراک کو مسخ کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہیں۔

وہ اُسے ایسی دھوکہ دہی میں مبتلا کرنے کی سعی کر رہے تھے جو حقیقت کے پردے میں ملفوف جھوٹ ہو۔ اُس کی نگاہ اندھیرے کمرے میں چاروں طرف گھومی، جہاں وہ قید تھا، جس میں صرف ایک پھیکی روشنی بلب سے آرہی تھی، جو چھت کے وسط میں بے بس لٹک رہا تھا۔

اُس کے کانوں میں شیروں کی گرج اور شکاری پرندوں کی چیخیں گونجنے لگیں، لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ سب محض مصنوعی آوازیں تھیں، جو اس کی نفسیات کو متاثر کرنے اور اُس کے ذہن میں وہم بٹھانے کے لیے استعمال کی جا رہی تھیں۔

وہ بظاہر کسی ویران جزیرے میں تھا، لیکن اُسے یہ حقیقت اچھی طرح معلوم تھی کہ یہ بھی ایک فریب ہے، ایک مصنوعی دنیا کا حصہ جسے اُس کے لیے تراشا گیا تھا۔

وہ ایک طویل اور صبر آزما سفر کے بعد یہاں لایا گیا تھا، جس نے اُس کی جسمانی طاقت کے ساتھ ساتھ اُس کے ایمان کا بھی امتحان لیا تھا۔ اُس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف قدم بڑھائے، جس پر ایک

سکرین نصب تھی جو باہر کا مصنوعی منظر پیش کر رہی تھی۔ باہر اب بھی گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، جہاں درختوں کی ہیولے اور پتھروں کے سائے ہی دکھائی دیتے تھے۔

گونار نے اپنے حواس مجتمع کیے اور اپنے آپ سے کہا، ”میں ایمان کی تعلیمات کے مطابق عمل کروں گا، میں تمہیں شکست دوں گا، ایلومیناتی! تمہاری یہ گمراہ کن آوازیں، یہ جھوٹے سراب — یہ سب میرے لیے بے معنی ہیں!“۔

اُسے یہ یقین تھا کہ کل کے روز وہ دوبارہ آئیں گے، اُسے ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر خوف اُس کی طبیعت میں نہ تھا؛ اُس کے دل میں ایک عزم تھا، ایک فولادی ارادہ۔

وہ لڑائی کے لیے تیار تھا، اُس کا جسم اُس سخت تربیت کا مرہونِ منت تھا جو اُسے شاولن راہبوں سے ملی تھی۔

گونار کی نگاہوں میں بے نیازی اور ایک عجیب سی چمک تھی۔ وہ تشدد کے بے رحم طریقوں سے گزرتا رہا، ایلومیناتی کے ایجنٹوں نے ہر ممکنہ حربہ استعمال کیا، لیکن ان کے ہر وار پر گونار کی قوت برداشت نے انہیں شکست دی تھی۔

کوئی ہتھیار، کوئی بجلی کا جھٹکا، کوئی گرم سلاخ یاد رکھتے ہوئے کوئلے، کچھ بھی اس کے اعصاب کو ہلا نہیں سکا تھا۔ وہ پہلا آدمی تھا جس نے ان ایجنٹوں کو بے بس کر دیا تھا۔

گونار ایک بار پھر اپنے سامنے کھڑے آدمی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اُس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سا سکون اور خطرناک انداز تھا۔ اُس کی مضبوط، مردانہ آواز میں وہ پوچھا، ”یہ جگہ کیا ہے؟ مجھے بتاؤ۔“

آدمی نے ایک پُرانی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”ظاہری بات ہے، جنگل یا جزیرہ۔“

گونار کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر ایک ایسا دلکش مگر خطرناک تاثر تھا کہ کسی کے بھی دل کی دھڑکن رک سکتی تھی۔ اُس نے لاپرواہی سے جواب دیا، لیکن اُس کے لہجے میں خطرناک خود اعتمادی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

جب اس نے ایک سرد اور جان لیوا مسکراہٹ کے ساتھ انگریزی میں کہا:۔

“As a retired master of lies and manipulation, I can smell deceit before it even hits the air. Don't think you can play me—I wrote the game.”

۔ (ایک منجھے ہوئے استادِ فریب و ریاکاری کے طور پر، میں دھوکے کی بو کو اس سے پہلے ہی محسوس کر لیتا ہوں کہ وہ فضا میں سرایت کرے۔ یہ مت سمجھو کہ تم مجھ پر چال چل سکو گے۔ اس کھیل کے اصول تو میں نے خود وضع کیے ہیں۔)۔

یہ کہتے ہوئے اُس کی آواز میں ایک ایسا جادو تھا کہ جیسے وہ نہ صرف اپنے الفاظ سے بلکہ اپنی موجودگی سے بھی کسی کا دل قابو کر لے۔

۔ اس کے جواب میں ایک شخص نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”تمہاری اس عقل مندی اور چالاکی نے ہی تمہیں یہاں پہنچایا ہے، گونار۔“

گونار کی ہنسی میں بے پرواہی اور زہریلی طعنے بازی تھی۔ اُس نے آرام سے جواب دیا، ”خیر، مجھے تمہارے آنے کا انتظار ایسے ہی رہتا ہے جیسے کسی عاشق کو اپنی محبوبہ کی دید کا۔ تمہاری اذیتیں، جیسے روز کا کھانا، میری روزمرہ کی عادت بن چکی ہیں۔“ اُس کی آنکھوں میں چمک تھی، جیسے اُس نے سب کچھ دیکھ لیا ہو اور اُس کا دل سخت ہو چکا ہو۔

اس کی حالت عجیب تھی۔ اتنی مار پیٹ، جبر، اذیت کے باوجود اُس کے جسم پر کوئی نمایاں زخم نہیں تھا۔ گویا وہ لوہے کا بنا ہوا ہو۔ اُن چار آدمیوں میں سے کوئی بھی اُس کی برداشت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

چاروں آدمیوں کے ہونٹوں پر شریر ہنسی پھیل گئی۔ اُن میں سے ایک نے ایک ڈبہ اٹھایا اور اس کا ڈھکن کھول دیا۔ پانچ خطرناک بلیک ممباساں فرش پر سسکیاں لیتے ہوئے گرے۔ گونا کی نظریں ان پر گڑی رہیں۔ اُس نے افریقہ میں یہ سانپ پہلے دیکھے تھے، جانتا تھا کہ یہ چند منٹوں میں موت کا پیغام بن سکتے ہیں۔

لیکن اُس کے چہرے پر ذرہ بھر بھی خوف نہ تھا۔ اُس نے سانپوں سے نمٹنا اپنے شاولن ماسٹرز سے سیکھا تھا۔ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا، ”اوہ، سانپ کا گوشت؟ میں تو کافی عرصے سے اس کے مزے کا منتظر تھا۔ بہت شکریہ، دوستو!“۔

وہ چار آدمی ہنسنے لگے۔ اُنہیں یقین تھا کہ سانپ گونا کو چیر پھاڑ دیں گے، لیکن گونا کے چہرے پر ایسی لاپرواہی اور اعتماد تھا جو کسی موت کے خوف سے آزاد شخص کا ہو سکتا ہے۔

سانپ فرش پر ریگتے ہوئے گونا کی طرف لپکے۔ اُس نے اپنی سرد آنکھوں سے اُنہیں دیکھا، انتظار کرتا رہا، جیسے وہ صحیح لمحے کا منتظر ہو۔

وہ آدمی کمرے سے باہر نکلنے لگے، اُنہیں پورا یقین تھا کہ گونا کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ دروازے تک پہنچے، ایک زوردار چیخ نے اُنہیں پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ اُنہوں نے پلٹ کر دیکھا تو گونا نے سانپوں کو دُموں سے پکڑ لیا تھا، اور اُنہیں کوڑے کی طرح لہرا رہا تھا۔

سانپوں کے بدن اس کے ہاتھ میں بل کھا رہے تھے، اور جب وہ آدمیوں کی طرف پھینکے گئے، اُن کی زہریلی دانت اُن کے جسموں میں پیوست ہو گئے۔

سانپوں نے بے رحم کاٹ لیا، زہر نے فوراً اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ آدمی زمین پر تڑپنے لگے، اُن کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو گیا، جسم جھٹکے کھا رہے تھے، اور آنکھوں میں خوف کی لہر تھی۔ چند سیکنڈ میں وہ سب مر چکے تھے۔

گونار نے بے حسی سے اُنہیں دیکھا پھر اُس نے مردوں کی جیبوں کی تلاشی لی اور ایک ٹارچ اور چابی نکال لی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ چابی باہر کے دروازے کی ہے، جس کا اُسے پہلے ہی اندازہ تھا۔

گونار نے ٹارچ روشن کی اور دیوار کے سائے میں خاموشی سے آگے بڑھا۔ باہر نکلتے ہی پیچھے کا منظر خون میں لت پت تھا۔ فرش پر بلیک ممبا کا سر بے جان پڑا تھا، یوں جیسے کسی وحشی درندے نے اسے اپنے ننگے دانتوں سے چیر ڈالا ہو۔ اُس کے زہر سے بھرپور جسم کے ٹکڑے، جنہیں گونار نے چند لمحوں میں بے دردی سے چبا کر نگل لیا تھا، اور اس کا سر فرش پر مسخ شدہ تھا۔

گونار بیسیمینٹ کی بھول بھلیاں سے گزر کر ایک نئے جہان میں نکل آیا۔ اس نے دروازہ تلاش کر کے چابی لگا دی اور دروازہ کھول کر باہر قدم رکھا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے اس کا استقبال کیا، اور مصنوعی روشنی نے اس کی آنکھوں کو چمکایا۔ جب اس نے ارد گرد نظر دوڑائی تو وہ حیرت میں پڑ گیا۔ وہ ایک عالیشان پل پر کھڑا تھا، جو سمندر کے اوپر پھیلا ہوا تھا۔ پل پر کاریں اور بسیں رواں دواں تھیں، جبکہ فلک بوس عمارتیں افق میں بلند ہو رہی تھیں۔

اس نے ہر جانب لوگوں کا ہجوم دیکھا، وہ بورڈز اور نشانات، جو چمک رہے تھے اور اپنی جگہ پر چل رہے تھے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ نیویارک میں ہے، وہ شہر جو کبھی سوتا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور ذہن میں سوالات کا طوفان اُٹ آیا۔ وہ سٹاک ہوم سے یہاں کیسے پہنچا؟ وہ کب تک قید رہا؟ یہ سب سوالات اس کی عقل کو چیلنج کر رہے تھے، مگر اس کے دل میں ایک واضح حقیقت تھی: اسے فرار ہونا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے پیچھے آئیں گے، اسے ختم کرنے کی کوشش کریں گے

گونار پل کے پار بھاگتے ہوئے ایلو میناٹی کے جال سے بچنے میں کامیاب ہوا۔ اُس کے چہرے پر ٹھنڈی ہوا کی لہر چل رہی تھی، جبکہ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ وہ سیاہ شرٹ اور پینٹ پہنے ہوئے تھا، مگر سردی کا اس پر کوئی اثر نہ تھا۔

شاو لن راہب ہونے کی حیثیت سے، اس نے اپنے جسم کی حرارت کو کنٹرول کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ موسم کی شدت یا شہر کی چالاکی سے بے نیاز تھا۔ اس کی واحد فکر ایمان کو تلاش کرنا اور اسے اپنی محبت کا اقرار کرنا تھا۔

پل پر چلتے ہوئے، گونار اچانک رک گیا۔ اس کے سامنے ایک شخص کھڑا تھا جس نے موٹا سویٹر اور بھاری کوٹ پہن رکھا تھا، اس کی کپکپاہٹ سے عیاں تھا کہ وہ شدید سردی میں لرز رہا تھا۔ اس نے ہچکچاہٹ کے ساتھ گونار کی طرف نگاہ اٹھائی، جیسے کوئی بے چارہ، بے گھر، یا نیم پاگل شخص ہو، مگر گونار کی آنکھوں کی گہرائی اور اس کی پر اعتماد مسکراہٹ نے اسے ایک لمحے کے لیے حیران و ششدر کر دیا۔

گونار کی بدن پر ایک پرانی، جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی ڈریس شرٹ تھی، جس کے نیچے اس کی مضبوط، پتھر کی مانند عضلاتی چھاتی کے پیچیدہ ٹیٹو جھلک رہے تھے۔ اس کے بازوؤں کے کف لپٹے ہوئے تھے، اور ان کے نیچے اس کی ابھری ہوئی رگوں سے مزین بازو، جو ٹیٹو سے سجے تھے، نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کی پینٹ اس کے مضبوط پیروں سے چپکی ہوئی تھی، جیسے کسی مجسمے کو تراشا گیا ہو۔

وہ شخص حیران و پریشان، گونار کی طرف دیکھتا رہا اور اس کی موجودگی میں مزید لرزنے لگا۔ اس کے دل میں یہ سوال اٹھا کہ آیا یہ شخص واقعی انسان تھا یا کسی غیر زمینی مخلوق کا حصہ۔

اس ٹھنڈ میں، جو جسم کو کاٹنے پر آمادہ تھی، گونار اس مختصر اور ہلکے لباس میں بغیر کسی تکلیف یا کپکپاہٹ کے کھڑا تھا، جیسے سردی اس کے وجود کے لیے بے معنی ہو۔

گونار اس کی حیرانگی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا، ”وقت کیا ہے اور آج کی تاریخ کیا ہے؟“۔ آدمی نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور جواب دیا، ”وقت صبح کے دو بجے ہیں اور تاریخ چار فروری دو ہزار تیس ہے۔“۔

گونار نے اپنے ذہن میں حساب لگایا۔ ”یہ تو اٹھائیس جنوری کا دن تھا جب ایمان کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا، اس کا مطلب ہے کہ میں ایک ہفتے سے قید ہوں۔ ایک ایسا ہفتہ جو لمحہ لمحہ کٹھن محسوس ہوا۔“ اس نے آدمی کا شکریہ ادا کیا اور فوراً وہاں سے نکل گیا۔

وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، اور نہ ہی کسی کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانا چاہتا تھا۔ اس کا یقین تھا کہ ایلومیناتی اس کا پیچھا کریں گے، اس لیے اسے انتہائی محتاط رہنا تھا۔ وہ روشنیوں اور کیمروں سے بچتا ہوا گلیوں میں دوڑنے لگا، تاریک اور سنسان جگہوں کی طرف، جہاں کوئی اس کی موجودگی کا ادراک نہ کر سکے۔

۔ وہ تاریکی کے اندھیرے میں، ایک سنسان راستے پر، بھاگتے بھاگتے اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر طرف ایسا سا ٹاٹھا جیسے کائنات خود خاموش ہو گئی ہو۔ اچانک، اس کی آنکھوں کے سامنے ایک روشنی کی کرن سی ابھری، اور ایک شاندار مسجد کا منظر سامنے آیا۔ یہ مسجد دیگر عمارتوں سے منفرد تھی، سفید اور سبز رنگوں کی چمک میں، اور جیسے ایک امن کا قلعہ۔ اس کے گنبد پر کلمہ طیبہ کندہ تھا، جو چاند یا ستارے کی

جگہ مسجد کی اصلی علامت تھی۔ کیوں کہ اسلام کی حقیقی علامت کلمہ ہے، جو اللہ اور اس کے رسول کا پیغام ہے۔

گونار مسجد کی طرف لپکا، اس کے دل میں ایک امید جاگی کہ شاید یہاں اسے پناہ اور ہدایت نصیب ہو۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ دروازہ کھلا تھا، جیسے اسے اندر آنے کی دعوت دی جا رہی ہو۔

دستک دینے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ ایک خوبصورت نوجوان باہر نمودار ہوا۔ اس نے سفید عربی چوغہ پہنا ہوا تھا، جس کا ڈھیلا ڈھالا انداز اس کے اندرونی وقار کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس کے سر پر سفید ٹوپی اور چہرے پر ایک خوبصورت داڑھی تھی، جو اسے عالم دین اور ولی جیسا بناتی تھی۔

نوجوان نے نرم لہجے میں انگریزی میں کہا، ”آپ یہاں باہر سردی میں کیوں کھڑے ہیں؟ اندر تشریف لائیے۔“ اس کے الفاظ میں ایسی مٹھاس تھی کہ گونار کو فوراً سکون محسوس ہوا۔

وہ نوجوان کے پیچھے اندر داخل ہوا اور مسجد کے اندرونی حسن میں کھو گیا۔ ہر چیز نفاست اور احترام کی علامت تھی: نرم قالین، فنکارانہ خطاطی، اور روشنی پھیلانے والے چراغ، سب ایک خاص سکون اور روحانی فضا پیدا کر رہے تھے۔

نوجوان نے قرآن کو اسٹینڈ سے اٹھا کر کہا، ”میں قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ یہ اللہ کا کلام ہے، جو ہماری رہنمائی اور روشنی کا منبع ہے۔ کیا آپ قرآن سننا پسند کریں گے؟“ گونار نے جواب میں خاموشی سے سر ہلا دیا، اس کا دل اس نورانی کلام کو سننے کے لیے بے تاب تھا۔

۔ ”لیکن پہلے،“ نوجوان نے کہا، ”آپ غسل خانے میں جا کر وضو کریں۔ قرآن سننے سے پہلے جسمانی اور روحانی صفائی ضروری ہے، تاکہ آپ اللہ کے کلام کی قدر اور احترام سے مستفید ہو سکیں۔“ نوجوان نے اسے گرم کپڑے دیے، اور وضو کرنے کا طریقہ سکھانے کے لیے ساتھ لے گیا۔

گونار نے وضو کیا، اور اسے جسمانی تازگی کے ساتھ ساتھ روحانی سکون بھی محسوس ہوا۔ جیسے اس کے دل پر پڑی ہوئی گرد صاف ہو گئی ہو۔ نئے کپڑے پہننے کے بعد، جو سیاہ عربی چوغہ تھا، اس نے خود کو مختلف محسوس کیا۔ وہ نوجوان کے پاس واپس آیا، جس نے اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا، ”ماشاء اللہ، آپ بہت اچھی لگ رہے ہیں۔ اب ہمیں فجر کی نماز ادا کرنی چاہیے۔“

فجر کی اذان کے وقت نوجوان نے کہا، ”یہ نماز دن کی سب سے پہلی اور اہم ترین عبادت ہے۔ یہ وہ نماز ہے جو دن کا آغاز کرتی ہے اور دن کے باقی حصے کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنتی ہے۔“

گونا نے اذان کی بلند و بالا آواز کو سنا، جو دل کو چھو لینے والی اور پاکیزہ تھی۔ اذان کے الفاظ، ”اللہ اکبر“ سے لے کر ”لا الہ الا اللہ“ تک، ایک طاقتور پیغام تھے جو گونا کے دل میں اترتے جا رہے تھے۔ وہ اذان کے ہر لفظ کے ساتھ خود کو اللہ کے قریب محسوس کر رہا تھا۔

نوجوان نے پھر گونا کو وضو کی اہمیت اور اس کے روحانی پہلوؤں سے روشناس کرایا، اور نماز کے اراکین کو سمجھایا۔ اس نے گونا کو بتایا کہ نماز میں کی جانے والی ہر حرکت اور کہے جانے والے ہر لفظ کا ایک روحانی مفہوم ہے، اور یہ سب اللہ کی عبادت اور بندگی کا اظہار ہے۔

جب گونا نے پہلی بار نماز ادا کی، تو اس نے اپنی روح میں ایک غیر معمولی سکون محسوس کیا۔ اس کے لیے یہ صرف ایک جسمانی عمل نہیں تھا، بلکہ اس کی روحانی زندگی کا ایک نیا آغاز تھا۔ اس نے اللہ کے سامنے جھک کر، عاجزی کے ساتھ اپنی زندگی کے تمام معاملات اللہ کے حوالے کر دیے۔

نماز کے بعد نوجوان نے قرآن کی تلاوت شروع کی، جس کی آواز مسجد کے سکون میں گونج رہی تھی۔ اس کی تلاوت میں ایک ایسی دلکشی تھی کہ گونا کی روح بھی اس میں ڈوب گئی۔ قرآن کے الفاظ جیسے دل کو سکون بخش رہے تھے، اور گونا نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی میں ایک نیا روحانی باب کھل رہا ہے۔

نوجوان نے مسکرا کر کہا،

- “آپ کا ایمان بے شک مضبوط ہے، اور اللہ آپ کو راہِ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مگر یہ بات یاد رکھو کہ شیطان بھی اللہ کی ذات کا قائل ہے، لیکن اسے ایمان کا نور نصیب نہیں۔ حقیقی ایمان صرف اللہ پر یقین کا نام نہیں، بلکہ اس کی راہ میں درپیش آزمائشوں کو ثابت قدمی اور صبر کے ساتھ برداشت کرنے، اور ہر حالت میں اس کا شکر بجالانے کا نام ہے۔ یہ ہی وہ مقام ہے جہاں بندہ مومن کی بصیرت اور شیطان کی گمراہی کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔”-

گونار نے لڑکے کو سینے سے لگایا اور نہایت سنجیدگی اور گہرائی سے کہا، “آپ کی رہنمائی کا بے حد شکر گزار ہوں۔”-

لڑکے نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا، “اللہ کا شکر ادا کریں، کہ وہ ہی اصل رہنما ہے، وہ ہی آپ کو راہ دیکھانے والا ہے۔”-

گونار نے محسوس کیا کہ لڑکے کی آواز مدہم ہوتی جا رہی تھی، جیسے کوئی سرگوشی کی گونج فضا میں تحلیل ہو رہی ہو۔ پھر اچانک اس کی نظر دھندلانے لگی، جیسے ہر طرف ایک غیر مرئی دبیز پردہ چھا گیا ہو۔ اس کے جسم میں بے وزنی کا احساس ہونے لگا، جیسے وہ دھیرے دھیرے اپنے وجود سے الگ ہو رہا ہو۔

اچانک، گونار کو ایسا لگا جیسے کوئی لطیف اور نہایت نرم پرندہ اسے اپنے پروں کے حصار میں لے رہا ہو، ہوا میں معلق کر رہا ہو۔ اس کی سانسیں گہری اور بے ترتیب ہونے لگیں، دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک حیرت انگیز روشنی پھوٹ پڑی۔

یہ روشنی اتنی چمکدار اور درخشاں تھی کہ گونار نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، لیکن اس روشنی کی شدت دل کے اندر گہرائیوں میں اترتی محسوس ہوئی۔

گونار نے اپنے آپ کو جیسے کسی ارفع مقام پر پہنچتے ہوئے پایا، ایک ایسی بلندی جہاں سے دنیا اور اس کے معاملات حقیر معلوم ہونے لگے۔

اس کے ارد گرد برقی سی آوازیں گونجنے لگیں، جیسے کوئی کائناتی سمفنی ہو رہی ہو۔ اسے ایسا لگا کہ وہ دنیا کے دائروں سے نکل کر خلا کی بے کراں وسعتوں میں تیر رہا ہو، جہاں وقت اور جگہ کی قید ختم ہو چکی ہو۔

گونار کا دل کسی انجان خوف اور بے پناہ حیرت سے لرزنے لگا، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک عجیب سکون بھی تھا، جیسے کسی روحانی طاقت نے اس کی ذات کو لپیٹ میں لے لیا ہو۔ اس کی حسیات دھیرے دھیرے ماند پڑنے لگیں، اور وہ مکمل بے خودی کے عالم میں ڈوبتا چلا گیا۔

ایک لمحے کے لیے اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ آسمان کی لامحدود بلندیوں میں پرواز کر رہا ہے، جیسے اس کا جسم مادی دنیا سے نکل کر کسی روحانی سفر پر گامزن ہو چکا ہو۔ روشنی اور آوازیں اب اس کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو گئی تھیں، جیسے ایک نیا جنم، ایک نیا احساس زندگی اس کے اندر پیدا ہو رہا ہو۔

یہ لمحہ، گونار کے لیے ایک ناقابلِ فہم معجزہ تھا، جہاں وہ دنیاوی قید سے آزاد ہو کر ایک روحانی عالم میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کی روح ایک نئی حقیقت سے ہمکنار ہو رہی تھی، جہاں ہر چیز مقدس اور بے داغ محسوس ہو رہی تھی۔

...°...

گونار نے صبح کی روشنی کو اپنی پلکوں میں چھن کی طرح محسوس کیا اور دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ اس کے کانوں میں سویڈش زبان کی مانوس سرگوشیاں گونجیں،۔

اس کی نگاہیں ارد گرد پھیلتی زندگی پر جمی رہیں۔ مختلف عمارتوں کی بلند قاتیاں، پلوں پر بہتی ٹریفک، پُر رونق سڑکیں اور عجائب گھر کے گنبد، سبھی نظارے اسے شناسا لگے۔ لوگ موٹے کوٹ اور گرم ٹوپیاں پہنے، ہجوم میں رواں دواں تھے، ہاتھوں میں چھتریاں اور تھیلے تھامے۔

اچانک اس کی نظر ایک دیوہیکل بل بورڈ پر جا پڑی، جس پر وقت اور تاریخ واضح طور پر درج تھی۔ وہ سنٹرل اسٹیشن کے قریب ایک بیچ پر پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ حیرت اور پریشانی کے جال میں جکڑ گیا

کیوں کہ نیویارک کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلا گیا، جہاں وہ ایلومیناتی کے چنگل سے بچ نکلا تھا۔
نہ وہ مسجد میں تھا، جہاں اس نے قرآن کی تلاوت کی تھی، اور نہ وہ 2023 کے زمانے میں تھا۔

اب وہ 2025 کے سٹاک ہوم میں موجود تھا۔ اپنے ماضی سے دو سال آگے۔ وہ بے یقینی کے عالم میں
پلکیں جھپکاتا رہا، امید کرتا رہا کہ یہ محض ایک خواب ہو، ایک دھوکہ یا کسی قسم کی غلطی۔ لیکن یہ سب
حقیقت تھی، ٹھوس اور ناقابل انکار۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ یہ کیسے ہوا یا کیوں۔ یہ ایک معجزہ تھا یا آزمائش،
اس کا بھی اسے اندازہ نہیں تھا۔

گونار اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک راہ گیر سے انگریزی میں سوال کیا، ”یہ کون سی جگہ ہے؟“۔

آدمی نے جواب دیا، ”یہ اسٹاک ہوم ہے، سویڈن کا دل۔“ انداز سویدش تھا اس نے بل بورڈ کی طرف
اشارہ کیا اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا، جیسے گونار کے سوال کو بے وقوفی سمجھ کر نظر انداز کر رہا ہو۔

گونار کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ کسی ناقابل فہم صورتحال میں پھنس چکا تھا۔ زمان و مکان کی حدوں کو توڑ کر سفر
کرنے کا تجربہ، جو اس کی فہم سے بالاتر تھا۔ کیا یہ اللہ کی طرف سے کوئی نشانی تھی؟ کیا یہ رہنمائی تھی، یا
کسی عظیم امتحان کی پہلی قسط؟ کیا وہ مستقبل کی ایک جھلک دیکھ رہا تھا، جو اس کے ماضی اور حال سے بالکل
مختلف تھا؟

گونار کے ذہن میں بے شمار سوالات ابھرنے لگے، مگر کوئی جواب نہ ملا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے جلد از جلد حقیقت تک پہنچنا ہے، کسی طرح سے۔ اُس نے دوبارہ نگاہ اٹھا کر شہر کو دیکھا—ایک پراسرار فضا میں لیٹی ہوئی زندگی، سوالات اور اسرار، ہر طرف پھیلا ہوا ایک چیلنج۔

گونار کے دل میں خوف اور تجسس کی ایک عجیب آمیزش تھی—سایوسی اور امید کا امتزاج۔ اللہ پر ایمان کی روشنی اسے تھامے ہوئے تھی، مگر اس کا دل جوابوں کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔

یہ سفر اُس کے لیے محض ایک معجزہ نہیں تھا، بلکہ ایک آزمائش، ایک چیلنج، اور شاید ایک پیغام—اسے خود کو تلاش کرنا تھا، اور جلد کرنا تھا۔

...°...

پروفیسر تراب حسینی کے لیے یہ خبر کسی پہاڑ کے ٹوٹنے سے کم نہ تھی کہ گونار ایک کار حادثے میں جاں بحق ہو چکا ہے۔ ان کا دل غم کی شدت سے مضمحل ہو گیا اور انہوں نے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ اس کی مغفرت کے لیے دعا کی۔

گونار کی موت کے بعد پروفیسر کو دو سال بیت چکے تھے، اور اس دوران انہوں نے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ مگر ایک دن، اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ پروفیسر نے حیرت سے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ باہر ایک شخص کھڑا ہے۔

وہ شخص سیاہ سویٹر، سیاہ ڈریس پینٹ اور ریخرز کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ اس کی داڑھی اب گہری ہو چکی تھی، مگر نفاست سے تراشی ہوئی تھی، جس سے اس کے سخت جڑے کی لکیریں نمایاں تھیں۔ وہ بظاہر جانا پہچانا لگ رہا تھا، لیکن اس کے چہرے پر ایک نیا انداز جھلک رہا تھا۔

پروفیسر نے اسے بغور دیکھا اور دھیرے سے کہا، ”ایز کیٹل! کیا یہ تم ہو؟“ یہ الفاظ پروفیسر کی بے یقینی اور صدمے کا عکاس تھے۔

اس شخص نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلایا، ”ایز کیٹل نہیں، معارج سلطان ہوں، پروفیسر! میں زندہ ہوں!“ معارج نے نہایت آرام سے جواب دیا اور پروفیسر کو گلے لگا لیا۔ پروفیسر تراب کی آنکھوں میں حیرت کا عالم تھا، وہ اسے اندر لے آئے۔ انہیں اپنے حواس پر یقین نہیں آ رہا تھا، ان کے دل و دماغ میں سوالات کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ معارج زندہ تھا؟ اور وہ ان کے سامنے موجود تھا؟

پروفیسر نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور معارج نے اپنی کہانی شروع کی۔ وہ انہیں ایلومیناتی کی خفیہ سرگرمیوں کے بارے میں بتانے لگا، کہ کیسے انہوں نے اس کی موت کی جھوٹی خبر پھیلائی اور اسے اغوا کر لیا۔ اس نے پروفیسر کو اس پر ہونے والے تجربات، اذیت ناک تشدد اور اپنے فرار کی داستان سنائی۔ پھر اس نے اپنا خواب سنایا پھر مسجد میں ہونے والے روحانی تجربات کا ذکر کیا، جہاں اس نے قرآن سنا اور دعا

کی۔ اس نے انہیں وقت کے سفر کی کہانی بتائی اور یہ کہ دو سال بعد وہ معجزاتی طور پر اپنے آبائی شہر واپس کیسے پہنچا۔

پروفیسر تراب کی آنکھیں حیرت اور حیرانی میں ڈوبی رہیں۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ معارج کیسے اس تمام عذاب سے بچ نکلا، اور یہ واقعہ اللہ کی حکمت اور قدرت کا غماز تھا۔

انہوں نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ معارج کی بات سنی۔ ”تم ہمیشہ نشانی مانگتے تھے، معارج، اور دیکھو! اللہ نے تمہیں اپنی قدرت کی نشانی دکھائی ہے۔ اس نے تمہیں ایلومیناتی کے ظلم سے نجات دی، اور اسلام کی روشنی کی طرف رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی رحمت اور فضل کا کرشمہ ہے۔ اس نے تمہیں توبہ اور اصلاح کا موقع دیا ہے، اور تمہارے لیے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔“

معارج کی آنکھیں بھی نم ہو چکی تھیں۔ اُس نے نرم لہجے میں کہا، ”کیا واقعی اللہ مجھے جیسے گناہ گار، قاتل، اور خطاکار کو معاف کر سکتا ہے؟ کیا وہ مجھ پر اپنی رحمت نازل کر سکتا ہے؟ میں نے اتنے بڑے گناہ کیے ہیں، لیکن پھر بھی اللہ نے میری رہنمائی کی، مجھے معجزے دکھائے، اور اپنی محبت کا اظہار کیا۔“

پروفیسر تراب مسکرا دیے اور کہا، ”اللہ کی رحمت بے انتہا ہے۔ وہ ہر گناہ کو معاف کر سکتا ہے، بشرطیکہ بندہ خلوص دل سے توبہ کرے۔ جنت انہی کے لیے ہے جو گناہوں سے تائب ہو کر نیکی کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ تم نے حق کا راستہ چنا، تم نے ظالموں کے خلاف جہاد کیا، تم نے اسلام کی سچائی کو پایا، اور اب

تمہیں اس راہ پر استقامت کے ساتھ چلنا ہے۔ اللہ نے تمہارے اندر ایمان کی شمع روشن کی ہے، اور اب تمہارا فرض ہے کہ اس کو دنیا میں پھیلاؤ۔”

معارض نے گہری سانس لی اور اپنی نظریں جھکا لیں۔ ”مجھے ایلومیناتی کے لوگوں کو ایک پیغام دینا ہے، پروفیسر۔ میں انہیں خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اللہ کے انصاف سے بچ نہیں سکتے۔ وہ مومنین کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، اسلام کی روشنی کو ماند نہیں کر سکتے، اور نہ ہی وہ اللہ کے غضب سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔”

پروفیسر تراب نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ”یقیناً، معارج، یہ تمہارا مقصد ہے۔ تمہیں اللہ کی نصرت پر بھروسہ کرنا ہے، اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرنی ہے۔ اللہ نے تمہیں نشانیاں دکھائی ہیں، اور اب تمہیں ان نشانیوں کا علم دوسروں تک پہنچانا ہے۔”

...°...

گونار آہستہ قدموں سے ایلومیناتی کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوا، جہاں سناٹے میں ڈوبی ہوئی فضا کسی غیر مرئی خوف کا پتہ دے رہی تھی۔ کمرہ بے حد تاریک تھا، لیکن اس کے ہر گوشے میں جدید ٹیکنالوجی اور آرکیٹیکچر کی پیچیدگی چھپی ہوئی تھی۔

داخلی دروازے کے قریب دو مشینی روباوٹ، انسانی خدوخال میں ڈھلے، نگاہیں جمائے سخت پہرہ دے رہے تھے۔

گونار کی نظریں اس بلند پلیٹ فارم پر جم گئیں جہاں ایک شخص بے تکلفی سے بیٹھا تھا۔ وہ لوسیفر تھا، وہ ہی جس نے گونار کے قتل کا فرمان جاری کیا تھا، اسے اغوا کر لیا تھا، اور آج وہ اس کے سامنے حیران و پریشان نظر آیا، جیسے موت کی پرچھائیں اس پر طاری ہو گئی ہو۔

لوسیفر کی آنکھوں میں شکوک و شبہات کے سائے لہرا رہے تھے۔ ”تم زندہ ہو؟“ اس کے ہونٹوں سے غصے اور بے یقینی میں ڈوبے الفاظ نکلے۔

گونار کی آنکھوں میں انتقام کا جوش اور چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری، جیسے وہ جانتا ہو کہ وہ پلٹ کر آیا ہے، اس بار مکمل غلبے کے ساتھ۔

”ہاں، میں زندہ ہوں۔ تمہاری تمام کوششوں کے باوجود، میں نہ صرف زندہ ہوں، بلکہ اب تم میرے سامنے ہو، اور میرے جال میں پھنس چکے ہو۔ کیا واقعی تمہیں یہ خام خیالی تھی کہ تم مجھے مٹا سکتے ہو؟ کیا تم یہ سوچتے تھے کہ میں تمہارے مکروہ منصوبوں کا شکار ہو جاؤں گا؟“ گونار کی آواز میں حقارت اور زہر کی آمیزش تھی، جیسے وہ لوسیفر کے وجود کو مٹی میں رلا دینا چاہتا ہو۔

”کیا تم نے یہ سمجھا کہ میں تمہارے جھوٹے وعدوں کو حقیقت مان لوں گا؟ تمہاری مکاری کا حصہ بن جاؤں گا؟ اور کیا تم نے یہ گمان کیا کہ میں اپنے ایمان کو بیچ کر تمہارے سیاہ راستے پر چل پڑوں گا؟“۔

گونار نے افسوس سے سر ہلایا،

۔ ”تم انسان ہو جانور نہیں، تمہیں عقل کا استعمال سیکھنا چاہیے تھا۔ لیکن اتنی بھی نہیں کہ میرے سامنے کھڑے ہونے کی حماقت کر بیٹھے۔ یاد رکھو میرے سامنے جو گردن اکڑاتا ہے، اُس کی پشت ہمیشہ کے لیے خاکسار ہو جاتی ہے، اور وہ ہمیشہ کے لیے قبر کی ظلمات میں دفن ہو جاتا ہے۔“

لو سیفر نے ہونٹوں کو حرکت دینے کی کوشش کی، لیکن گونار نے ایک سخت نگاہ ڈالی اور شہادت کی انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں اتنی سختی اور اختیار تھا کہ لو سیفر بے بسی سے چپ ہو گیا۔

۔ ”کان کھول کر سنو! گونار کا مطلب جنگجو ہے، اور جنگجو بے وقوف نہیں ہوتے۔ ایلومیناتی کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی میں تمہارے ہر اڈے کو بموں سے بھر چکا تھا، اور تمہارے دماغوں میں زہر بھرے چپس ڈال چکا تھا۔ تاکہ کوئی ہوش مند انسان میرے سامنے سراٹھانے کی جرات نہ کر سکے!“

گونار نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا ریموٹ نکالا، جسے دیکھ کر لو سیفر کا رنگ زرد پڑ گیا۔

۔ ”یہ ریموٹ میرے ہاتھ میں ہے، اور تمہاری زندگی میرے اختیار میں۔“ گونار نے بٹن دبایا اور زوردار دھماکے کی آواز کمرے میں گونجی۔ ایک روبوٹ زور سے نیچے گرا اور فنا ہو گیا۔ گونار کے چہرے پر ایک خوفناک مسکراہٹ پھیل گئی، ”یہ مسلمان ہونے کے بعد میرا پہلا روبوٹ قتل ہے۔“

لوسیفر کا جسم لرز اٹھا، سانسیں بھاری ہونے لگیں۔ ”تم نے یہ کیسے کیا؟ میرے نظام میں گھسنانا ممکن تھا۔ تمہیں میرے راز کیسے معلوم ہوئے؟ اور تم نے اسلام کو کیسے قبول کر لیا؟“ لوسیفر کے سوالات اس کے ذہن میں ہلچل مچا رہے تھے، مگر گونار کی آنکھوں میں صرف برہمی اور بے پناہ طاقت کی جھلک تھی۔

۔ ”کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں چھپا رہنا چاہیے،“ گونار نے اپنے لبوں پر ایک سرد مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

۔ ”اور کچھ سوالات کے جوابات دینے کے قابل ہی نہیں ہوتے۔“ وہ تھوڑا آگے جھکا، اس کی نظریں تیز تھیں، جیسے سامنے والے کی روح تک کو چیر رہی ہوں۔

۔ ”لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو۔ اگر تم نے میری راہ میں کوئی قدم بھی اٹھایا، تمہارے پیروکار فنا ہو جائیں گے، اور تمہاری دنیا خاک ہو جائے گی۔“ اس کی مسکراہٹ خطرناک حد تک پھیل چکی تھی، جیسے کھیل ابھی شروع ہوا ہو۔

دوسرا بٹن دبایا گیا اور ایک اور روبوٹ زمین پر گرا، بے جان ہو گیا۔

۔ ”یہ مسلمان ہونے کے بعد میرا دوسرا قتل ہے۔“ گونار کی آواز میں سختی اور برہمی نمایاں تھی۔۔ ”تم یہ سوچتے ہو کہ میں رک جاؤں گا؟ اگر تم باز نہ آئے تو میری سنجری بھی مکمل ہو جائے گی۔ میں تمہاری ہر برائی کو ختم کر دوں گا۔ جب تک تمہاری حقیقت دنیا کے سامنے نہ آجائے، میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔“

معارج نے کمرے میں لگے کیمرے کی طرف دیکھا، جیسے کسی پوشیدہ سامعین سے مخاطب ہو،

“In your tale, I play the villain, but in mine, you’re merely the jester.”

”Stay in your lane

تمہاری کہانی میں شاید میں خبیث ہوں، لیکن میری داستان میں تم محض ایک مسخرے سے زیادہ (کچھ نہیں۔ اپنی حد میں رہو)۔

پھر وہ لوسیفر کی جانب مڑا اور بولا، ”تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے، اور اب تم فرار نہیں پاسکتے۔“

لوسیفر کا چہرہ زرد تھا، اس کی دھڑکنیں کمزور پڑ چکی تھیں۔

گونار کی آنکھوں میں ایک قاتلانہ چمک تھی، جیسے وہ اپنے سامنے موجود لوسیفر کو ایک حقیر مخلوق سمجھتا ہو۔ لوسیفر نے زہر بھرے انداز میں کہا، ”تم ایسا نہیں کر سکتے، گونار!“

گونار کی مسکراہٹ میں ایسی خباثت تھی جو کسی کے دل کی دھڑکنیں روک دے۔ وہ دھیرے سے بولا، ”کیا تم نے مجھ سے کہیں لکھوایا تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں؟ اگر لکھوایا بھی ہے، تو میں اس لکھے کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں۔“

گونار نے ایک تیز، زہرناک تبسم کے ساتھ سر اٹھایا، ایسا تبسم کہ جیسے لوسیفر کے قلب کو پارہ پارہ کر کے اس کی روح تک کو چھلانی کر رہا ہو۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں، جنہیں دیکھ کر لوسیفر بھی زمینی جہنم کا

مفہوم سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔ وہ نگاہیں مثل برف سرد اور مانند آتش بے رحم تھیں، جیسے ہر لمحہ گویا خاموشی سے فنا کی نوید دے رہی ہوں۔

گونار کے وجود میں ایک خاموش ہیبت تھی، جیسے اس کا ہر سانس خونریز معرکہ کا پیش خیمہ ہو، اور اس کی خاموشی میں ہزاروں قیامتیں پنہاں ہوں۔

۔ ”ابھی تو دنیا کو یہ بتانا باقی ہے کہ تم لوگ ایل جی بی ٹی کیو کے گند کو کیوں پھیلا رہے ہو؟ فیمنیزم کا جال کیوں بچھا رہے ہو؟ تمہاری سازشیں فیملی سسٹم کو کیوں تباہ کر رہی ہیں؟ تم وہ بایکوں لے کر آئے جس نے کھربوں کی جان لی، صرف اس لیے کہ دنیا کی آبادی کم ہو جائے اور تم آسانی سے لوگوں کے ذہنوں کو غلام بنا سکو؟ تاکہ تم اپنی مکروہ دجالی فوج تیار کر سکو؟ فلسطین میں قتل عام کروا رہے ہو، تاکہ تم اپنے جھوٹے مسیحا کے مندر کی بنیاد رکھ سکو اور ون ورلڈ آرڈر کے ذریعے دنیا کو اپنے قدموں تلے روند سکو!“۔

گونار کی نگاہیں لوہے کی مانند سخت ہو گئیں، اور اس کی زہریلی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے بغیر ایک پل ضائع کیے، اپنے ہاتھ میں موجود ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔ لوسیفیر کا جسم اچانک لرز کر ہوا میں معلق ہو گیا اور سیڑھیوں سے نیچے گر کر تڑپتے ہوئے گونار کے قدموں کے سامنے آ پڑا۔ وہ جس تکبر سے تخت نشین تھا، اب ذلت کی خاک چاٹ رہا تھا۔

گونار نے بلا جھجک اپنے بھاری جوتے لوسیفر کی گردن پر رکھ دیے، اس کی ایڑھی کے نیچے سے لوسیفر کی سانسیں ٹوٹنے لگیں، اور وہ موت کی دہلیز پر لرزنے لگا۔ جیسے جیسے لوسیفر کی تڑپ بڑھتی گئی، گونار کی آنکھوں میں قاتلانہ چمک بڑھتی گئی۔ اچانک لوسیفر کے منہ سے خون کا فوارہ نکلا، اور اس کا جسم ایک بے جان پتلے کی طرح ساکت ہو گیا۔

گونار نے خون آلود جوتے پیچھے کھینچے، ایک پل کو خون کی بو کو محسوس کیا اور پھر زہریلے لہجے میں، سرکشی سے بولا، ”شیطان کا ایک اور پلید کتا اپنے انجام دوزخ کو پہنچا۔“

اس کی باتوں میں نہ صرف موت کی دھمک تھی، بلکہ دنیا کے لیے ایک پیغام بھی کہ جو بھی ظلم کا پجاری ہو، وہ میرے قدموں میں تڑپے گا۔ پھر وہ ایک بے خوف فاتح کی طرح، شریر چال چلتا ہوا وہاں سے چلا گیا، پیچھے ایک خاموش لاش اور دہشت کی گونج چھوڑتے ہوئے۔

یہاں، گونار کی ہر حرکت میں ایک مقصد پوشیدہ تھا، جیسے وہ دنیا کو دکھا رہا ہو کہ ظلم اور فساد کی جڑیں کہاں سے نکلتی ہیں اور انہیں جڑ سے کیسے کاٹنا ہے۔

...°...

ہنزہ کی وادی اپنی تمام تر قدرتی جلوہ گریوں کے ساتھ ایک دھوپ بھرا دن بسر کر رہی تھی۔ اس وادی کا ہر گوشہ حسن کی ایک نئی تصویر پیش کرتا تھا، عظیم پہاڑوں کے سائے میں آباد، یہ ایک دلکش مقام تھا جو دور تک سبزہ و شادابی کے قالین پر بچھا ہوا نظر آتا تھا۔

یہ ہی مقام پروفیسر تراب کا مسکن تھا، جس کا کٹیج اپنی سادگی میں بھی دلکش تھا اور ایک وسیع و عریض باغ سے گھرا ہوا تھا۔

وہ اور ان کا خاندان اسی باغ میں ایک لکڑی کے بیچ پر بیٹھے ماحول کی خوبصورتی میں گم، فطرت کے دلکش مناظر اور پر لطف کھانے کا مزہ لے رہے تھے۔

باغ کی فضاء میں گلاب اور چمبیلی کی مخمور خوشبو نے ہر گوشے کو معطر کر رکھا تھا، جیسے ہوا میں کوئی لطیف عطر بکھر گیا ہو۔ نرم ہوا کے جھونکوں میں یہ مہک دلوں میں سرور بھر دیتی تھی، اور اس کے ساتھ پرندوں کی مترنم چہچہاہٹ دل و دماغ کو مسرت و سکون کا احساس بخشی تھی، گویا قدرت نے فطرت کی موسیقی کو بہ کمال احتیاط ترتیب دیا ہو۔

اسی دلاویز ماحول میں ایک شفاف ندی بل کھاتی ہوئی چٹانوں کے درمیان سے بہتی تھی، جیسے سنگ و خشت کا سینہ چیرتی ہوئی فطرت کی اس لطیف تخلیق نے اپنی راہ نکالی ہو۔

ندی کا پانی جب چٹانوں سے ٹکراتا، تو ایک لطیف آبشار کی شکل میں بلندی سے گرتا اور اپنے ساتھ رس بھری روانی میں باغ کے بیچوں بیچ بہتا ہوا دریا کی صورت اختیار کر لیتا۔ یہ آبشار اور ندی نہ صرف فطری

حسن کی علامت تھے بلکہ سکون اور روحانی طمانیت کا بھی ذریعہ تھے، گویا قدرت کی یہ تخلیق قلب و نظر کو فطرت کی خاموش مگر گہری جمالیات سے روشناس کر رہی تھی۔

ہوا میں ایک لطیف ٹھنڈک اور تازگی تھی جو ہر سانس کے ساتھ زندگی کا احساس بڑھاتی جا رہی تھی۔ درختوں کی شاخوں پر بسیرا کیے پرندے اپنی سریلی آوازوں میں مشغول تھے، اور سبز گھاس کی نرم سطح پر ہلکی ہوا کے دوش پر ہلکورے لیتے پتے دل کو سکون دے رہے تھے۔

اسی لمحے، پروفیسر توراب کی بہو، اور بھانجی شانزہ، جو رنگین دوپٹے میں لپیٹی ہوئی تھی، مسکراتے ہوئے، معارج کی جانب بڑھ آئی اور اس کے سامنے ایک تھال رکھ دیا جس میں خوشبودار ہنزہ پلاؤ تھا۔ یہ روایتی ڈش خشک میوہ جات اور مصالحوں کے ساتھ بڑی مہارت سے تیار کی گئی تھی۔ شانزہ نے محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”معارج بھائی، تکلف نہ کریں، کھانا کھائیں اور بتائیں کیسا ہے۔“

معارج نے بھی نرم مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”شکریہ، یہ بہت مزے دار لگ رہا ہے۔“

اسی اثنا میں، سندس، جو مکمل سیاہ نقاب میں ملبوس تھی، اپنی آنکھوں کے علاوہ تمام چہرہ چھپائے، کچن سے مزید کھانا لینے جا ہی رہی تھی کہ پروفیسر تراب نے اسے روکا۔ وہ فکر مند لہجے میں بولے،۔“ سندس، تم ایمان کے گھر گئی تھیں، تم نے مجھے بتایا نہیں، انہوں نے کیا کہا؟” سندس نے تھکے ہوئے انداز میں کندھے جھکاتے ہوئے جواب دیا،“

۔“ماموں جان، مجھے یہ خبر دی گئی کہ ایمان کا انتقال ہو چکا ہے، وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر اپنی گاڑی سمیت گہری کھائی میں جا گری۔ مگر جس چیز نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، وہ وہاں کا ماحول تھا۔ عجیب کیفیت تھی، ہر طرف خوشی کی لہر چھائی ہوئی تھی، جیسے کوئی عظیم سانحہ نہ ہوا ہو۔ ان کا کاروبار بھی دن دو گنا اور رات چو گنا بڑھ رہا ہے، اور میکائیل کی شادی بھی بغیر کسی ملال کے انجام پا چکی ہے۔ آصف اور آمنہ کو بھی دنیا کی فانی آسائشوں میں اس قدر غرق پایا کہ انہیں ایمان کی موت کا کوئی ملال نہ ہوا، گویا انہوں نے آخرت کے حساب و کتاب کو فراموش کر دیا ہو۔”

یہ کہہ کر سندس ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گئی، جب کہ معارج کا دل غم اور غصے کی کشمکش میں ڈوبا ہوا تھا۔ اگر ایمان کی آخری خواہش کا پاس نہ ہوتا تو وہ یقیناً ان سب کو نیست و نابود کر دیتا۔

بہرام، جو تراب کا بیٹا تھا، نے اس تناؤ کو محسوس کرتے ہوئے گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ وہ معارج کے چہرے پر چھائی مایوسی کو دیکھ چکا تھا۔ اُس نے اپنے والد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا،“بابا، میں نے حاشر چاچا سے بات کی ہے، وہ آج حیدر اور سندس کی شادی کی تاریخ لینے آئیں گے۔”

- تراب نے حاشر کے متعلق تفصیلات بیان کرتے ہوئے معارج کی طرف نظر ڈالی، گویا اُس کی توجہ حاصل کرنی ہو۔“ حاشر میرا پرانا دوست ہے۔ وہ شروع میں یہاں ہنزہ میں رہتا تھا، لیکن نوکری کی غرض سے اسلام آباد منتقل ہو گیا تھا۔ شاید چار یا تین سال پہلے واپس آیا اور تب سے یہاں مقیم ہے۔ حیدر اُس کا بہنوئی ہے نور بھابھی کے ماں باپ کے انتقال کے بعد، حاشر اور نور بھابھی نے اس کی پرورش اپنے بچوں کی طرح کی ماشاء اللہ بہت اچھا اور خوش اخلاق بچہ ہے۔”

سندس نے میٹھے سے بھری ہوئی طشتری ہاتھوں میں تھامے باہر قدم رکھا تو بہرام نے اسے دیکھتے ہی دلاسنہ دیتے ہوئے نرمی سے کہا، ”تم بالکل پریشان نہ ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر کسی نے تمہیں تکلیف دی تو مجھے بتانا، میں خود اس سے سدھار لوں گا۔”

سندس نے طشتری کو میز پر رکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا، ”مطلب؟“

شانزہ نے ہنستے ہوئے وضاحت کی، ”یہ بہرام کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔“

سندس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”مجھے خوب علم ہے کہ میرا بھائی ہر حال میں میرے ساتھ ہے۔۔۔ بہت شکریہ، بہرام بھائی۔“

معارج نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس منظر کو دیکھا، جیسے وہ بھی اس بات سے مطمئن ہو گیا ہو کہ سب کچھ بہتر ہو جائے گا۔ وہ ایک ہفتے سے ہنزہ میں مقیم تھا اور وہ خود کو اس گھر کا ایک فرد ہی محسوس کرنے لگا تھا۔

پروفیسر تراب نے بات بدلتے ہوئے کہا، ”بہتر ہو گا کہ ہم حاشر کے گھر خود چل کر جائیں، اُس کو سر پرانز دینا چاہتا ہوں۔ بہرام، تم نے حاشر کو میرے آنے کی اطلاع تو نہیں دی؟“۔

بہرام نے فوراً جواب دیا، ”نہیں بابا، میں نے ابھی تک اُن سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔“۔

پروفیسر تراب نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور پھر سب کو کھانے جاری رکھنے کا کہتے ہوئے کہا، ”چلو، کھانا جاری رکھو، شاباش۔“

وہ چیخ اٹھاتے ہوئے پلاؤ کا مزہ چکھنے لگا اور شانزہ کے پکوان کی تعریف کرتے ہوئے ماحول کو مزید خوشگوار بنا دیا۔ یوں گفتگو اور قہقہوں کے ساتھ اُن کا کھانا جاری رہا اور لمحہ بہ لمحہ فضا میں خوشیوں کی گونج بڑھتی گئی۔

...°...

شام کا وقت قریب آ رہا تھا اور ہنزہ کی وادی کے آسمان پر سورج کی مدھم ہوتی روشنی گلابی اور جامنی رنگوں میں تبدیل ہو رہی تھی۔ فضاء میں سردی کی ہلکی سی لہر تھی اور گھر کی روشنیوں نے ایک پرسکون اور گرم ماحول پیدا کر دیا تھا۔

معارض سفید شلوار قمیض اور خاکی چادر اوڑھے شانزہ کے جڑواں بچوں، عباس اور زینب، کے ساتھ باغ میں فٹبال کھیل رہا تھا۔

عباس، سنہرے بالوں، شربتی آنکھوں اور سفید جلد کے ساتھ اپنے والد کی شبیہ تھا، جبکہ زینب اپنی ماں شانزہ کے مشابہ، سیاہ بالوں، بھورے چشموں اور سرخ گالوں کے ساتھ ہنزائی حسن کی زندہ تصویر تھی۔ بچے بے فکری کے ساتھ باغ میں ہنستے اور بھاگتے ہوئے گیند کولات مارتے رہے۔

تراب اپنے کاٹج کے دروازے پر نمودار ہوئے اور بچوں کو کھیلتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے، ”میرے پوتا اور پوتی انکل معارج کو بہت پسند کرتے ہیں۔“ عباس اور زینب نے فوراً گیند چھوڑ دی اور اپنے دادا کے پاس دوڑتے ہوئے گئے، انہیں گلے لگا کر ان کے گالوں پر بوسے دیے۔ معارج نے مسکرا کر دیکھا اور آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھا۔

زینب نے اچانک کہا، ”جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو میں انکل معارج سے شادی کروں گی۔“ معارج نے ہنستے ہوئے کہا، ”واقعی؟ ابھی تم بہت چھوٹی ہو، شادی کے بارے میں سوچنے کے لیے۔“

تراب نے ہنستے ہوئے زینب کے گال کو پیار سے چوما اور بولا، ”جب تم بڑی ہو جاؤ گی، تب تک انکل معارج میری طرح بوڑھے ہو جائیں گے۔“ اور اپنی سفید داڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

زینب نے ناگواری سے منہ بناتے ہوئے کہا، ”نہیں، وہ جوان اور خوبصورت رہیں گے۔“ پھر وہ دوڑتی ہوئی معارج کی طرف آئی اور اس کی ٹانگ سے لپٹ گئی۔ معارج نے اسے اٹھا کر گود میں بٹھایا اور مسکراتے ہوئے کہا،

۔ ”زینب، میں ستائیس سال کا ہوں اور تم ابھی صرف پانچ سال کی ہو۔“ اس نے شرارتی انداز میں آنکھ مارتے ہوئے کہا، ”اور ویسے بھی، میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں۔ لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے لیے مجھ سے بہتر شوہر ڈھونڈوں گا۔“

یوں ہوا کہ وہ دسمبر میں اپنی پچیسویں سالگرہ کی خوشیوں میں محو تھا کہ فروری دوہزار تئیس کے اوائل میں، زمان و مکاں کی حدیں پار کرتے ہوئے وقت کے سفر کی ایک پراسرار کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کی عمر کا ایک طویل باب ایک ہی پل میں سمٹ آیا ہو، گویا وقت کی ایک پوشیدہ موج اس کے وجود پر سے گزرتی ہوئی اس کے سنہین کی گنتی کو بے ترتیب کر گئی ہو۔

وہ دو برس، جو عام دنیا کے پیمانے پر بیت چکے تھے، اُس کے لیے پلک جھپکنے کے برابر ثابت ہوئے۔ اُس پر وقت کا اثر گویا معطل ہو چکا تھا، اور وہ برسوں کا یہ وقفہ اُس کے وجود کے لیے ایک خیالِ خام بن چکا تھا۔ جب دوہزار چھبیس کی دہلیز پر قدم رکھا، تو وہ جسمانی طور پر اُس ہی عالم میں تھا جیسے ابھی کل کی بات ہو۔

لیکن دو ہزار اٹھائیس کی ساعتوں نے جب اُس پر معمول کے گزرنے کا عمل شروع کیا، تب وہ زندگی کے دو سال کا بوجھ محسوس کرنے لگا۔ یوں وہ زمانے کی عمومی رفتار میں واپس آچکا تھا اور بالآخر اُس کی عمر ستائیس برس کو جا پہنچی۔

زینب معارج کی داڑھی کے ساتھ کھیلتے ہوئے بولی، ”مجھے آپ جیسا شوہر چاہیے۔“

معارج نے زور سے قہقہہ لگایا، جبکہ تراب ہنستے ہوئے بولے ”زینب تم اتنی خوبصورت ہو، مجھے یقین ہے کہ تمہیں ایک دن بہترین شوہر ملے گا۔“

عباس، جو گونگا اور بہرہ تھا، لیکن بے حد ہوشیار اور ذہین تھا، اپنے مخصوص انداز میں اشاروں سے سب کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی نوٹ بک اور قلم ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتے تھے جس پر وہ اپنے خیالات لکھ کر دوسروں کو دکھاتا تھا۔ پروفیسر تراب نے اسے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا، ”اچھا عباس، تمہاری بیوی کیسی ہو؟“

عباس نے پروفیسر تراب کے ہونٹوں کی حرکت کو غور سے پڑھا اور مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے اپنی آنکھوں کی طرف اور پھر معارج کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا، جیسے وہ کہنا چاہ رہا

ہو کہ وہ ایسی بیوی چاہتا ہے جس کی آنکھیں معارج جیسی ہوں۔ معارج کی آنکھیں واقعی حسین تھیں،
فندق رنگ کی جو روشنی میں چمکتی تھیں۔

پروفیسر تراب نے عباس کے بالوں کو محبت سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا، ”عباس، تم نے بڑی نایاب چیز کا
انتخاب کیا ہے۔ ایسی آنکھیں واقعی خاص ہوتی ہیں۔“

معارج نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ عباس کو دیکھا اور اشارے سے کہا، ”شکریہ، عباس۔ لیکن یاد رکھو،
سب سے اہم چیز آنکھیں نہیں، بلکہ دل ہوتا ہے۔ تمہیں ایک ایسی بیوی تلاش کرنی ہوگی جس کا دل صاف
ہو، جو تمہیں سمجھے، تمہارا خیال رکھے، اور تم سے سچی محبت کرے۔“ اس نے عباس کو گلے لگاتے ہوئے
کہا، ”تمہارا دل بہت اچھا ہے، تم ایک بہادر اور مضبوط لڑکے ہو۔“

اس کے بعد، اس نے عباس کی پیشانی پر پیار کیا اور کہا، ”مجھے تم سے بہت محبت ہے، عباس، تم میرے لیے
میرے بھائی عیسیاہ کی طرح ہو۔“ عباس نے اپنی نوٹ بک میں لکھا، ”مجھے بھی آپ سے محبت ہے،
معارج بھائی، آپ میرے لیے ایک حقیقی بھائی کی طرح ہیں۔“

معارج نے وہ نوٹ پڑھ کر مسکرا دیا اور عباس کو گلے لگایا۔ پھر وہ پروفیسر تراب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا،
”عباس واقعی بہت پیارا ہے، وہ مجھے ہمیشہ خوش کر دیتا ہے۔“

پروفیسر تراب نے بھی ان الفاظ کو سراہا اور بچوں کو گلے لگاتے ہوئے کہا، ”تم سب میرے لیے قیمتی خزانے ہو، اور مجھے تم سب پر فخر ہے۔“

آسمان پر ستارے چمکنے لگے تھے اور رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ پروفیسر تراب نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”چلو، اب اندر چلتے ہیں، ہمیں ابھی حاشر انکل کے گھر بھی جانا ہے۔“

زینب نے معارج کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا، ”چلیں معارج انکل، اندر چلتے ہیں۔“

...°...

وہ سب رات کے ستاروں کی جھلملاتی چادر تلے حاشر کے مسکن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ معارج ذہنی اضطراب کا شکار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سندس گھر پر موجود ہوگی، اسی سوچ نے اُسے ان کے ہمراہ چلنے پر مجبور کر دیا۔

بچوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ چاندنی کی لطیف روشنی میں ان کی آنکھیں مثل ستارہ چمک رہی تھیں، ان کی ہنسی ہوا میں جیسے نغمے بکھیر رہی تھی۔

بہرام نے معارج کی تذبذب بھری حالت کو محسوس کیا اور اس کے کندھے پر ایک دلاسا بھرا ہاتھ رکھا، اس کی گرمجوش مسکان رات کی سرد مہری کو چیر رہی تھی۔ ”میں بے حد خوش ہوں، معارج، کہ تم بھی ہمارے ساتھ ہو۔“ بہرام نے خلوص بھری چمک کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

معارض نے ہلکی سی مسکراہٹ دی، مگر اس کی نظریں بہرام کی آنکھوں میں دوبارہ جھانکنے سے قبل زمین پر گر گئیں۔ ”سندس میری بھی بہن ہے، اور یہ میرا فرض ہے کہ میں بھی جاؤں۔“ اس کے لہجے میں ذمہ داری کی آمیزش صاف دکھائی دے رہی تھی۔

بہرام دل کھول کر ہنسا، اس کی ہنسی رات کے پرسکون ماحول کو زینت بخش رہی تھی، جہاں کہکشاں کی لڑی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ایک ایسا نظارہ جو دیہی فطرت کا آئینہ دار تھا، شہر کی روشنیوں کی آلودگی سے نا آشنا۔ ”ہاں“ اس نے ہنسی کے درمیان کہا، ”ہاں حیدر ہم سے ڈر کر رہے گا۔“ معارج بھی بے اختیار ہنسا اور لمحہ بھر کے لیے اپنے تمام تحفظات بھول گیا۔

گاڑی یونہی رواں دواں تھی، پیچھے شانزہ، عباس، زینب اور پروفیسر تراب تھے۔ پروفیسر تراب نے زینب کو اپنی گود میں بٹھا رکھا تھا، اور وہ چاند کو خموشی سے تک رہی تھی، جیسے چاند ان کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہو۔ ”دادا، چاند ہمارے ساتھ کیوں چل رہا ہے؟“ زینب نے اپنی معصومیت بھری حیرانی سے پوچھا۔

پروفیسر تراب نے مسکرا کر زینب کی طرف دیکھا، پھر سامنے پھیلے دلکش منظر پر نگاہ ڈالی۔ سامنے ایک بڑا پہاڑ چمک رہا تھا، اور اس کے دامن سے گرتا ہوا پانی بل کھاتا جا رہا تھا، دونوں طرف ہرے بھرے کھیتوں کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔

پروفیسر تراب نے شفقت بھری آواز میں جواب دیا، ”چاند تو اپنی جگہ قائم ہے، یہ ہماری گاڑی کی رفتار ہے جو ہمیں ایسا گمان دیتی ہے کہ چاند ہمارے ساتھ چل رہا ہے۔“

زینب نے ہونٹ سُکڑ کر کہا، ”مجھے تو ابھی بھی سمجھ نہیں آئی۔“

پروفیسر تراب نے ہنستے ہوئے کہا، ”جب بڑی ہوگی تو سب سمجھ آ جائے گا۔“ عباس بھی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا باہر کے حسین مناظر میں کھویا ہوا تھا۔

....°....

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد، وہ آخر کار حاشر کے گھر کے سامنے پہنچے۔ گھر کی روشنیاں تاریک رات میں یوں چمک رہی تھیں جیسے ستارے آسمان پر جھلما رہے ہوں۔ جیسے ہی وہ گاڑی سے باہر نکلے، ان روشن شعاعوں نے ان کے چہروں کو دمک سے بھر دیا۔ دروازہ کھلتے ہی حاشر کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک صاف نظر آنے لگی۔ اُس کا چہرہ جیسے اچانک کسی خواب سے جاگا ہو، اُس پر وہ ہی تازگی تھی جو فجر کی پہلی کرن سے زمین پر بکھرتی ہے۔

۔ ”تراب؟“ حاشر کی آواز میں حیرت اور خوشی کا واضح امتزاج تھا۔

۔ ”یہ کیسی خوشگوار حیرت ہے! تم سویڈن سے کب واپس آئے؟“ اس کی خوشی بے قابو ہو گئی، اور وہ فوراً تراب سے لپٹ گیا، جیسے برسوں کا بچھڑنا ایک پل میں ختم ہو گیا ہو۔

تراب نے مسکراتے ہوئے، مگر آنکھوں میں چمک لیے، کہا، ”میں نے تمہیں حیران کرنا چاہا تھا، حاشر، اس لیے خاموشی سے واپس آیا۔“

حاشر نے اسے دوبارہ گلے لگایا، جیسے پرانی یادیں اور گہری دوستی کی وہ ہی خوشبو ایک لمحے میں لوٹ آئی ہو۔ اس کے دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ رہی تھی، اور آنکھوں میں حیرانی کی وہ چمک تھی جو دوستوں کے درمیان برسوں کی دوری کے بعد ملنے پر ہوتی ہے۔

حاشر پروفیسر تراب سے گلے مل کر پیچھے ہوا اس نے پُر جوش مسکراہٹ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور فوراً اندر آنے کی دعوت دی۔ ”آؤ، اندر آؤ، میری بیوی نور اور بیٹی مینسا صبح سے تم لوگوں کے لیے دسترخوان تیار کرنے میں مصروف ہیں۔“ وہ انہیں دیوان خانے کی طرف لے گیا، جہاں بڑی سی میز پر انواع و اقسام کے لذیذ پکوان اور خوش رنگ مشروبات قرینے سے سجائے گئے تھے۔ اُس نے معارج کی طرف دیکھ کر کہا، ”بیٹا، یہ گھر بھی تمہارا ہی ہے، بے تکلفی سے بیٹھ جاؤ۔“ پھر نشستوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا کہا۔ سب نے مسکراتے ہوئے حاشر کا شکریہ ادا کیا اور اس کے گھر کی پُر خلوص مہمان نوازی کا دل سے لطف اٹھاتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

جب انہوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، تو اس گھر کی شاندار بناوٹ اور طرزِ تعمیر نے انہیں متاثر کر دیا۔ سرمئی پتھروں سے بنا ہوا یہ گھر اپنی دہاتی سادگی میں پُر وقار مگر منفرد دکھائی دے رہا تھا۔

بڑی بڑی کھڑکیاں دونوں منزلوں پر ترتیب سے نصب تھیں، جو دن کی روشنی کو اندر کھینچتی تھیں۔ اوپر کی منزل میں ایک بالکونی بھی تھی، جو ارد گرد پھیلی ہوئی قدرتی خوبصورتی کو دیکھنے کا ایک موزوں مقام فراہم کرتی تھی۔

چھت کافلیٹ انداز اس قدیم طرز تعمیر میں جدیدیت کا حسین امتزاج پیش کر رہا تھا۔ گھر کے سامنے ایک وسیع سبزہ زار پھیلا ہوا تھا، جس میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ درختوں نے چاروں طرف سے گھر کو گھیر رکھا تھا، جو سایہ اور قدرتی حسن کا تاثر دیتے تھے۔

سب دسترخوان کے گرد جمع ہو گئے اور اُن لذیذ کھانوں سے لطف اندوز ہونے لگے جو خاص طور پر مینسا نے تیار کیے تھے۔ حاشر کی بیوی نور، سیاہ لباس میں ملبوس، عزت و وقار کا پیکر نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے سر پر دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا اور مہمانوں کی خدمت میں پیش پیش تھیں۔ ”یہ سب میری بیٹی مینسا نے بڑی محنت سے آپ لوگوں کے لیے بنایا ہے،“ نور نے محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اپنی بیٹی کے ذکر پر فخر کا اظہار کیا۔

تراب نے ارد گرد نظریں گھمائیں اور تجسس بھری آواز میں پوچھا، ”تمہاری بیٹی کہاں ہے؟“۔

نور نے ہنستے ہوئے کہا، ”وہ ایک آزاد روح ہے، اکثر اپنی دنیا میں گم رہتی ہے۔ کچھ دن پہلے ہی اچانک غائب ہو گئی تھی، ہمیں فکر ہوئی تو ہم پولیس اسٹیشن جانے کا ارادہ کر رہے تھے، اتنے میں اس کی کال آئی کہ وہ سعودیہ میں ہے، عمرہ کرنے کا دل کر رہا تھا، تو فوراً چلی گئی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اصطبل کی طرف اشارہ کیا، جہاں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ”ابھی شاید وہ اپنے گھوڑے بادل پر سوار ہو۔ فارم کے پچھلے حصے میں۔“۔

شانزہ نے مسکراتے ہوئے کہا، ”ہم نے تو اُسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔“۔

نور نے محبت سے کہا، ”وہ اکثر سفر میں رہتی ہے، سوڈان میں ادھر کے لوگوں، کی مدد کے لیے کہیں منصوبے شروع کیے ہیں، یہاں بھی بس چند دنوں کے لیے آتی ہے۔ تمہیں اُس سے ملنے کا موقع اس لیے نہیں ملا کیوں کہ ابھی شادی کے چرچے شروع ہوئے تھے تو وہ فلسطین چلی گئی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے نور کی آنکھوں میں اپنی بیٹی کے لیے فخر جھلک رہا تھا۔

سب کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ شانزہ نے پوچھا، ”عباس کہاں ہے؟ ابھی ہم آئے ہی تھے کہ وہ فوراً گھر کے اندر دوڑ گیا تھا۔۔۔“

”

نور نے شفقت بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”وہ بھی گھوڑوں کے فارم میں مینسا کے ساتھ ہے۔ پہلے تو کچھ وقت بلیوں اور گلہریوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، پھر مجھے خود کو باہر لے جانے کا اشارہ کیا، میں نے اُسے کھانے کا ٹفن بنا کر دیا تھا، مینسا اسے کھانا کھلا دے گی۔“

شانزہ نے ہنستے ہوئے کہا، ”تو وہ بھی گھوڑے پر سوار ہے؟“

نور نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ”ہاں، اُسے جانوروں سے بہت محبت ہے، بالکل مینسا کی طرح۔ وہ بھی بہت نرم دل اور مہربان ہے۔“

حاشر نے معارج کی طرف متوجہ ہو کر کہا، ”میں آپ کا پوڈکاسٹ باقاعدگی سے دیکھتا ہوں۔ آپ جس انداز سے ایلومیناتی اور خفیہ تنظیموں کے راز فاش کرتے ہیں، وہ واقعی قابلِ ستائش ہے۔ میں آپ کی بصیرت سے بے حد متاثر ہوں اور اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ آج ایک اتنا نامور شخص ہمارے گھر موجود ہے۔“

معارج نے مدہم مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”یہ تو آپ کا خلوص ہے، حاشر صاحب، آپ کی محبت کا شکریہ۔“

حاشر نے اپنے تاثرات کو مزید خوشگوار بناتے ہوئے کہا، ”ویسے، آپ نے اپنا کاروبار پاکستان منتقل کر دیا ہے یا ابھی بھی بیرونِ ملک ہے؟“

معارج نے جواباً کہا، ”فل الحال نہیں، مگر اس پہ غور کر رہا ہوں۔“

نور، جو محفل میں خوش دلی سے شریک تھیں، نے تبسم کے ساتھ کہا، ”اللہ خیر کرے، اور آپ کے کاروبار کو مزید ترقیاں نصیب ہوں۔ آمین۔“

معارج نے سر جھکا کر عاجزی سے کہا، ”آمین، آپ کا بے حد شکریہ۔“

معارض دسترخوان پر لذیذ طعام سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک اس کا فون بجنے لگا، مگر ناقص سگنل کے باعث کال فوراً منقطع ہو گئی۔ اُس نے فون کی اسکرین پر نظر ڈالی اور اپنی مہتممہ دفتر ”کانام چمکتا ہوا دیکھا۔ معذرت خواہانہ انداز میں نشست سے اُٹھتے ہوئے بولا، ”معاف کیجیے گا، یہ ایک اہم کال ہے، اسے وصول کرنا ضروری ہے۔“

نور، حاشر کی بیوی، مسکراتے ہوئے بولیں، ”کوئی بات نہیں بیٹا، آگے بڑھو، لیکن یہاں تمہیں سگنل نہیں ملے گا۔ اصطبل کی طرف چلے جاؤ، وہاں کھلی فضا ہے اور ہر طرف سبزہ زار پھیلا ہوا ہے۔ وہاں تمہیں بہتر سگنل مل جائیں گے۔“

معارض نے ممنونیت کے ساتھ سر ہلایا اور کہا، ”بہت شکریہ۔ میں فوراً واپس آتا ہوں۔“

اتنے میں شانزہ کی بیٹی زینب جوش میں اپنی نشست سے اُٹھی اور معصومیت سے بولی، ”معارض انکل، میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی، مجھے گھوڑے دیکھنے ہیں۔“

معارض نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”ٹھیک ہے، آؤ۔ مگر خاموش رہنا، مجھے فون پر بات کرنی ہے۔“ اُس نے زینب کا نرم ہاتھ تھاما اور دونوں گھر سے باہر سبزہ زار کی طرف روانہ ہو گئے۔۔۔

باہر رات کا منظر دلکش اور سحر انگیز تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے سرسراتے ہوئے درختوں کے پتوں سے گزرتے، فضا میں سکون کی ایک لطیف سی چادر بچھا رہے تھے۔ آسمان پر چمکتا ہوا چاند، جو مکمل اپنے جو بن پر تھا، زمین پر ایک چاندنی کی مانند روشنی بکھیر رہا تھا۔

جیسے یہ رات، زمین اور آسمان ایک دوسرے سے محبت کی سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ ستارے جھلملا رہے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے آسمان زمین کے قریب آگیا ہو۔ سبزہ زار کے وسط میں پھیلا ہوا میدان، رات کی پراسرار خاموشی میں نکھر ا ہوا تھا۔

معارض نے فطرت کی ان تمام رعنائیوں کو محسوس کرتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا، جیسے یہ پرسکون منظر اس کے اندر کی بے چینی کو مدھم کر رہا ہو۔ دفعتاً اس کی نظر اصطبیل کے نزدیک چمکتی ہوئی سنہری روشنی پر پڑی۔

اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی اکیلے ٹیکے نسل کے گھوڑے پر سوار تھی، جو ترکمانستان کی نایاب نسلوں میں سے ایک تھا، اس کا نام بادل تھا۔ گھوڑے کی سنہری کھال چاندنی میں اس قدر چمک رہی تھی جیسے آسمان سے کوئی پری زمین پر اتری ہو۔

لڑکی کا عبایا ہوا میں لہرا رہا تھا، وہ سواریاں کر رہی تھی اور اُس کے ساتھ، عباس، بیٹھا تھا۔ مینسا، کا چہرہ نقاب میں ڈھکا ہوا تھا، لیکن اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں نقاب کے پیچھے سے بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں وہ چمک تھی جو نہ جانے کیوں، معارج کے دل کو بے چین کر گئی تھی۔

زینب نے بے ساختہ تالی بجائی اور معصومیت سے کہا، ”دیکھو، معارج انکل، یہ منظر کتنا حسین ہے، جیسے کوئی پری اپنے یونیکورن پر سوار ہو!“۔

معارج نے مسکراتے ہوئے اُس کی بات سن لی، مگر اُس کا دھیان مینسا پر ہی تھا۔ گھوڑے کی ہر حرکت، لڑکی کا ہر انداز، ایک خواب کی مانند تھا۔ اُس نے دیکھا کہ مینسا نے گھوڑے کو روک کر ایک درخت کے نیچے لایا، جہاں ہوا میں پتے سرسراتے ہوئے گر رہے تھے۔ اس لمحے، معارج کو لگا جیسے اُس کے ارد گرد کی ہر شے، اس حسین منظر کو سراہ رہی ہو۔

اس کی آنکھوں نے جب مینسا کی آنکھوں کا سامنا کیا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ آنکھیں، بھوری، لمبی پلکوں سے مزین، چاند کی روشنی میں چمکتی ہوئی، اُسے وہی جانا پہچانا احساس دے رہی تھیں، جیسے وہ کبھی پہلے بھی اُن آنکھوں کو دیکھ چکا ہو۔ مگر کہاں؟ کب؟ یہ سوال اُس کے ذہن میں ابھرتا رہا۔

اُس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں، دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ یہ عجیب سی کشش، یہ غیر متوقع احساس، اُسے ایک ایسے جذبے کی طرف کھینچ رہا تھا جو اُس کی سمجھ سے بالا تر تھا۔

اُس نے خود کو یاد دلانے کی کوشش کی کہ وہ ایمان کا ہے، جس سے محبت کرتا ہے، مگر مینسا کی آنکھوں کی وہ شدت؟ کیا وہ محض ایک لمحہ فکر یہ تھا یا کچھ اور؟

جیسے ہی گھوڑا اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوا اور مینسا نے لگام کو قابو میں کیا، معارج کی نظریں پھر اُس کی طرف اٹھ گئیں۔ یہ لڑکی، جو نقاب میں ڈھکی ہوئی تھی، اُس کے دل پر ایسی چھاپ چھوڑ رہی تھی جو اُس نے ایمان کے لیے محسوس کی تھی۔

مینسا نے بھی ایک لمحے کے لیے اُس کی طرف دیکھا، مگر پھر چپکے سے نظریں پھیر لیں اور گھوڑے سے نیچے اتر آئی۔

دونوں کی نگاہیں پھر ملیں، اور اس بار وقت جیسے ٹھہر گیا ہو۔ دل کی دھڑکنوں کا شور، احساسات کی شدت، خوف اور کشش کا ملا جلا احساس، یہ سب کچھ ایسا تھا جسے وہ نہ سمجھ سکتا تھا اور نہ بیان کر سکتا تھا۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ ایک خواب دیکھ رہا ہو، ایک جادوئی، حسین خواب۔

جب مینسا نے عباس کو نیچے اتارا اور اُس کے ساتھ اصطبل کی طرف چل دی، معارج وہیں کھڑا رہا، جیسے وہ وقت کے دائرے میں قید ہو گیا ہو۔ اُس نے دیکھا کہ مینسا کی نقاب میں ڈھکی ہوئی شکل آہستہ آہستہ اُس کی نظروں سے او جھل ہو رہی تھی، اور اُس کے دل میں ندامت کی لہر ابھرنے لگی کہ اُس نے کچھ کہا کیوں نہیں؟ اُس نے کوئی قدم کیوں نہیں اٹھایا؟

جیسے ہی مینسا غائب ہوئی، معارج کے ارد گرد جگنو پھیل گئے۔ ان جگنوؤں کی روشنی نے اُس لمحے کو اور بھی جادوئی بنادیا، اور وہ وہیں کھڑا رہا، اس خوبصورت اور پراسرار ملاقات کے اثر میں ڈوبا ہوا۔

یہ رات کی چاندنی، ستاروں کی ٹھنڈی روشنی، اور وہ پراسرار لڑکی — سب کچھ معارج کے دل پر انمٹ نقوش چھوڑ چکا تھا۔ جیسے اس کے وجود کی حقیقت محض ایک سراب تھی اور مینسا ایک ایسا خواب، جس کی مہک دل و دماغ پر چھائی رہی، لیکن جسے چھونا ممکن نہ تھا۔ معارج خود ایک بھٹکتا ہوا خیال تھا، اور مینسا اُس خواب کی مانند، جسے پانے کی خواہش ہمیشہ رہتی ہے مگر وہ کبھی گرفت میں نہیں آتا۔

معارج نے اپنے فون کی طرف نظر ڈالی، جہاں مس کال کا نشان جھلک رہا تھا۔ اُس نے گہری سانس لی اور فون جیب میں واپس رکھتے ہوئے خود سے کہا کہ یہ کال بعد میں کر لے گا۔ زینب کا چھوٹا ہاتھ تھامے وہ واپس گھر کی طرف چلنے لگا، مگر اس کے دل کی دھڑکن اب بھی بے قابو تھی، جیسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوا ہو۔ زینب نے اسے تجسس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، ”انکل، آپ نے کسی سے بات نہیں کی۔“

معارج نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”بعد میں بات کر لوں گا۔“ لیکن اس کے چہرے کی ہلکی سی کھنچاؤ اس کے اندرونی اضطراب کو چھپانے لگی۔

زینب نے سر ہلایا، اور ہنستے ہوئے کہا، ”چلو واپس چلتے ہیں، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

- ”ہاں، چلو واپس چلتے ہیں،“ معارج نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا، لیکن اس کے قدموں کی رفتار مدہم تھی، اور اس کی سوچیں کہیں اور ابھی ہوئی تھیں۔

وہ اب بھی مینسا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ بھوری آنکھوں والی لڑکی، جو گھوڑے کی پشت پر سوار تھی، درختوں کے سائے میں لپٹی ہوئی، جیسے رات کا کوئی خواب۔ کیا وہ ایمان تھی؟ یا اس کا کوئی اور تصور؟ اُس کی آنکھوں میں وہ ہی تجسس اور کشش جھلک رہی تھی جس نے معارج کے دل کو جکڑ لیا تھا۔ اس کی یادیں بار بار اس لمحے پر پلٹ رہی تھیں، جب اُس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جو الفاظ میں بیان کرنا مشکل تھا۔ جیسے کوئی بھید، کوئی پوشیدہ راز، جو دل کے اندر کہیں گہرائی میں چھپتا ہو۔

اُس کا دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا، جیسے اُس کے شعور میں کسی نئی حقیقت نے دستک دی ہو۔ وہ لڑکی اس کے ذہن پر چھا گئی تھی، اُس کا ہر انداز، اُس کا گھوڑے پر سوار ہونا، درخت کے نیچے کی خاموشی، اُس کی بھوری آنکھوں کا جادو، جو معارج کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر گیا تھا۔

...°...

مینسا عباس کا ہاتھ تھامے دے قدموں سے گھر میں داخل ہوئی۔ اُس کے چہرے پر نقاب تھا اور اُس کے نازک ہاتھ عباس کے کندھوں پر نرم انداز میں رہنمائی کر رہے تھے۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو

سب لوگ چائے کی پیالیوں میں محو گپ شپ تھے، لیکن جیسے ہی مینسا کی آمد ہوئی، محفل کی گفتگو رک گئی۔

سب کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہو گئیں، حیرانی اور تجسس کے ساتھ، جیسے کوئی بھید بھری شخصیت داخل ہوئی ہو۔ مینسانے باوقار انداز میں لب کشائی کی، ”معذرت خواہ ہوں، مجھے دیر ہو گئی۔ عباس بضد تھا کہ وہ گھوڑے پر سواری کرے، اور اس کے ہمراہ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔“

اُس نے اپنا رخ شانزہ کی طرف کیا، جو صوفے پر براجمان تھی۔ مینسا شانزہ سے گلے ملی اور محبت بھرے لہجے میں بولی، ”شانزہ، آپ کیسی ہیں؟“

شانزہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”میں خیریت سے ہوں، مینسا، آپ سنائیں؟“

مینسانے نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”اللہ کا شکر ہے، میں بھی ٹھیک ہوں۔“ شانزہ نے عباس کو گود میں بٹھا کر اس کے گال پر محبت بھرا بوسہ دیا اور پوچھا، ”مجھے امید ہے اس نے آپ کو تنگ نہیں کیا ہوگا؟“

مینسانے سر کو انکار میں ہلاتے ہوئے کہا، ”ارے نہیں، ماشاء اللہ، عباس تو بہت فرمانبردار اور ہوشیار بچہ ہے۔ بادل کے ساتھ بہت بہادری اور شرافت سے سوار تھا۔“

یہ کہتے ہوئے اُس نے عباس کی تعریف کی اور اسے پیار دیا۔ پھر وہ آگے بڑھی اور تراب کے پاس جا کر مودبانہ انداز میں سر جھکایا، ”السلام علیکم۔“

تراب نے اُسے دعاؤں میں لپیٹتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا، ”وعلیکم السلام، اللہ تمہیں خوش رکھے، بیٹی۔“

مینسانے سر جھکا کر تشکر بھری مسکراہٹ سے جواب دیا، ”شکریہ، انکل۔“ اُس کے لہجے میں ادب اور عقیدت کی گہرائی تھی۔

پھر اُس نے شانزہ کی طرف متوجہ ہو کر نرمی سے کہا، ”یہ عباس مجھے کاغذ پر لکھ کر کہتا ہے کہ آپ کی آنکھیں بے حد دلکش ہیں، اور دعویٰ کرتا ہے کہ جب میں بڑا ہوں گا تو آپ سے نکاح کروں گا۔“

یہ سن کر سب لوگ ہنس پڑے، مگر عباس ان تمام باتوں سے بے فکر اپنی امی کی گود میں بیٹھا بس سب کو سوالیہ دیکھ رہا تھا۔

بہرام نے مسکراتے ہوئے کہا، ”اب تو لگتا ہے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی، میرے بچوں نے پہلے ہی اپنے جیون ساتھی چن لیے ہیں!“ اس نے مذاق میں شانزہ کی طرف آنکھ مارتے ہوئے کہا، جس پر سب کا قہقہہ بلند ہوا۔

اتنے میں معارج اندر داخل ہوا، اور جیسے ہی اس کی نظر مینسا پر پڑی، اُس کی نظریں غیر ارادی طور پر جھک گئیں۔ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا، لیکن پھر بھی اپنی نگاہیں اس سے ہٹانہ سکا۔ اُس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو چکی تھی، جیسے کوئی پراسرار چیز اسے اندر سے کھینچ رہی ہو۔

وہ حیرت میں ڈوبا ہوا سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی آخر کون ہے؟ اس کا چہرہ کیسا ہوگا؟ اس کے دل میں اس سے گفتگو کرنے کی شدید خواہش بیدار ہو چکی تھی، مگر وہ خود کو روکے ہوئے تھا۔ وہ اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ آیا یہ واقعی ایمان ہے یا پھر معارج کا محض کوئی خیال، کیوں کہ معارج کی چھٹی حس کبھی غلط نہیں ہو سکتی تھی۔

زینب کی آواز نے اس کی خیالات کو توڑتے ہوئے کہا، ”کھانا کہاں گیا؟ آپ لوگوں نے سب کچھ کھا لیا، ہمارے لیے کچھ نہیں بچا!“۔

مینسا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”زینب، فکر مت کرو، کچن میں اور کھانا موجود ہے، چلو چلتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے مینسا نے زینب کا ہاتھ پکڑا اور نرمی سے اُسے ساتھ لے گئی۔

معارج اپنی خیالوں کی دنیا میں گم تھا۔ جیسے ہی مینسا کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی، اُسے احساس ہوا کہ یہ آواز ایمان کی مدھر اور سریلی آواز نہیں تھی۔ اس میں ایک چھپی ہوئی سختی تھی، جیسے کوئی دل کی گہرائی میں موجود زخم اسے بولنے میں مشکل پیدا کر رہا ہو۔ پھر بھی، اس آواز میں کچھ ایسا تھا جو معارج کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

زینب نے معارج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”انکل، آپ نے بھی ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا، آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔“

معارج نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ”نہیں، زینب، مجھے بھوک نہیں ہے، تم جاؤ اور مزے کرو۔“

اُس کی آواز میں تھوڑی تھکن تھی، لیکن وہ اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا احساس تھا، جیسے وہ مینسا کا پیچھا کرنا چاہتا ہو، لیکن اُسے اپنے جذبات سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے، کیا کہے، اور کیسے عمل کرے۔

مینسا، زینب اور عباس کے ہمراہ کچن کی طرف بڑھ گئی، اور معارج کی نظریں اُس کے پیچھے چلتی رہیں۔ دل میں ندامت، کمی کا احساس اور اُس لمحے کا ضیاع۔ اُس نے گہری سانس لی اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن اُس کا ذہن اب بھی اُسی لڑکی کی جانب مائل تھا۔

...°...

رات کی ملگجاسا اندھیرا فضا میں بکھر چکا تھا، ہوا میں ہلکی سی خنکی محسوس ہو رہی تھی، اور لان میں لگے پھولوں سے اٹھنے والی خوشبو فضا کو معطر کر رہی تھی۔ درختوں کی شاخوں پر جھولتی لائٹس رات کی گہری خاموشی میں روشنیوں کی جگمگاہٹ پیدا کر رہی تھیں، جیسے کوئی تہوار کا سماں ہو۔

حاشر نے ماحول کی سنجیدگی کو توڑتے ہوئے کہا، ”مکہ میں ایک ہفتے بعد سندس اور حیدر کا نکاح سادگی سے کر دیا جائے گا۔“

اس دوران، ایک کونے میں بیٹھا معارج بے چین نظر آ رہا تھا، جیسے اس کے دل میں کوئی اضطراب کی لہر چل رہی ہو۔ وہ مینسا کے خیال سے نکل نہیں پا رہا تھا وہ بے دھیانی میں ماحول سے کٹ کر باہر کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جب اس نے مینسا کو زینب کا ہاتھ تھامے دروازے سے نکلتے دیکھا۔

جیسے ہی اس کی نظر مینسا پر پڑی، دل کی دھڑکنوں میں شدت آ گئی۔ سفید عبایا میں لپٹی ہوئی، وہ گویا ایک پرچھائیں کی طرح تھی جس کے نقاب نے چہرے کو چھپایا تھا مگر آنکھوں کا بھورارنگ اس کے دل میں گہرائی سے اتر رہا تھا۔ وہ آنکھیں جنہوں نے اس کے دل کو الجھن اور حیرانی کے احساسات میں جکڑ دیا تھا۔

معارج نے اپنی اضطرابی کیفیت کو چھپانے کے لیے اچانک فون نکالا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مجھے ایک اہم کال کرنی ہے،“ کہہ کر وہ بہانہ بنا کر گروپ سے دور چلا گیا۔ اسے اپنا چہرہ گرم محسوس ہوا،

ہاتھوں میں پسینہ تھا، اور دل کی دھڑکن بے قابو۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے کہیں شیطان کے دوسو سے اس پر حاوی نہ ہو جائیں۔

تراب نے معارج کی یہ حالت محسوس کی اور ایک لمحے کے لیے رک کر اس کا مشاہدہ کیا۔ اسے لگا کہ کچھ غیر معمولی ہے۔ معارج کے چہرے پر جو بے چینی تھی، وہ ابھی سے نہیں بلکہ اس وقت سے تھی جب وہ باہر سے آیا تھا۔ تراب نے سوچا کہ اس سے بات کرنی چاہیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ کس الجھن کا شکار ہے۔

ادھر مینسا، شانزہ کے پاس جا کر بیٹھ چکی تھی۔ ”زینب بہت باتونی ہے، ماشاء اللہ، اللہ اسے سلامت رکھے،“ مینسا نے مسکراتے ہوئے کہا اور زینب کے گال کو نرمی سے چٹکی لی، جس پر زینب بھی مسکرا دی۔ شانزہ نے جواب دیا،

۔ ”آمین، اسے بھی آپ بے حد پسند آئی ہیں۔ ابھی کچھ دیر قبل کہہ رہی تھی کہ آپ حوروں کی مانند“ دلکش اور پُر نور ہیں

مینسا نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”آپ کی مہربانی، شانزہ۔ میں بھی اسے بہت پسند کرتی ہوں، ماشاء اللہ یہ بہت ذہین اور پیاری بچی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے زینب کو گلے سے لگا لیا، جیسے ان دونوں کے درمیان ایک رشتہ قائم ہو گیا ہو۔

تراب نے پھر گفتگو کا رخ بدلا، ”ہاں، انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم سندس اور حیدر کے لیے بہت خوش ہیں۔ وہ ایک بہترین جوڑی ہیں، ماشاء اللہ۔“

مزید نور نے دعا کرتے ہوئے کہا، ”اللہ دونوں کو خوشیوں بھری زندگی عطا فرمائے، ان کی شادی کو کامیاب بنائے، آمین۔“

حاشر نے سر ہلایا اور کہا، ”انشاء اللہ، حیدر بھی کل دبئی سے آجائے گا، پھر ہم مکہ جانے کی تیاری کریں گے۔“

تراب نے کہا، ”تو اسے کہو کہ وہیں سے مکہ روانہ ہو جائے، کہ فاصلہ قریبی ہے۔“

حاشر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”کہا تو تھا، مگر وہ کہہ رہا تھا کہ پاکستان آنا ضروری ہے، کچھ دوستوں سے ملنا ہے اور چند اہم معاملات بھی ہیں۔ خیر، ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں؟“

کچھ وقت بعد اس الوداعی ملاقات میں ایک طرف خوشی کی لہر تھی تو دوسری طرف جدائی کا غم۔ سب نے ایک دوسرے کو گلے لگایا، دعاؤں کے ساتھ الوداع کہا، اور دل میں محبت و احترام کے جذبات کے ساتھ رخصت ہوئے۔

معارض اب بھی گاڑی کے باہر کھڑا فون پر بات کرنے کا بہانہ کر رہا تھا، جب اس کی نظر زینب اور عباس پر پڑی جو مینسا

سے الوداعی ملاقات میں مشغول تھے۔ ”مینسا آپی! ہم جارہے ہیں، آپ ہمیں یاد آئیں گی۔“

زینب نے پیار سے کہا اور اس کے گلے لگ گئی۔ مینسا نے مسکراتے ہوئے ان دونوں کو الوداع کہا، ”تم لوگ بہت پیارے ہو، انشاء اللہ جلد ملاقات ہوگی۔“

معارض گاڑی میں آگے کی نشست پر بیٹھا تھا، جبکہ بہرام ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ پچھلی نشست پر تراب کے ساتھ شانزہ، عباس اور زینب براجمان تھے، جن کے چہرے خوشی اور جوش کے جذبات سے جگمگا رہے تھے۔ مکہ کے سفر کی تیاری نے سب کے دلوں میں ایک خاص اضطراب اور شوق بھر دیا تھا، اور یہ سفر ان کے لیے کسی دیرینہ خواب کی تعبیر سے کم نہ تھا۔

اللہ کی عنایت اور کرم پر سب ہی شکر گزار تھے کہ اس طویل منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع مل رہا تھا۔

گھر کے دروازے سے جھانکتی ان کی عزیز واقارب کی نگاہیں ان کو الوداع کہہ رہی تھیں۔ وہ سب محبت اور مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ہلا رہے تھے، گویا یہ لمحہ رخصت ہوتے ہوئے بھی ان کے درمیان ایک نیارشتہ بن رہا تھا۔

حاشر اور اس کے خاندان کی میزبانی کا لطف اور سخاوت کی یادیں ان کے دلوں میں تازہ تھیں، اور اس مختصر وقت نے ان کے رشتوں کو مزید گہرا اور مستحکم کر دیا تھا۔

معارض نے اپنی نظریں سائیڈ ویو مرر پر دوڑائیں، اور اُس لمحے میں وہ ٹھٹک گیا۔ ایک درخت کے سائے تلے وہ کھڑی تھی، ایک خاموش مگر گہرائی سے لبریز ہستی۔ سفید عبایا میں ملبوس، اُس کا چہرہ اور جسم مکمل طور پر ڈھکا ہوا تھا، مگر معارج کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی نگاہیں اُس کی روح کو چھو رہی ہوں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اُسے دیکھ رہی ہے، اُس کا مطالعہ کر رہی ہے، جیسے وہ اُس کے ہر احساس کو جانچ رہی ہو۔

ہوا میں ہلکی ہلکی لالٹینیں جھول رہی تھیں، درخت کی شاخوں سے الجھ کر وہ روشنی کی ہلکی سی چھاؤں اس کے اطراف میں بکھیر رہی تھیں۔ جگنو بھی جیسے اُس لمحے کا حصہ بن گئے تھے، اُس کے گرد رقصاں تھے، اور چاندنی رات میں اُس کا وجود کسی راز کا استعارہ لگ رہا تھا۔

معارض نے اس پر اسرار کشش کو محسوس کیا، مگر اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے فون نکال کر جعلی ڈرامہ رچایا۔ اس کی اندرونی بے چینی کو چھپانے کے لیے اس نے مصروف ہونے کا بہانہ کیا۔

مینسا جو درخت کے نیچے کھڑی تھی، وہ جانتی تھی کہ معارج نے اسے دیکھا ہے، محسوس کیا ہے، مگر وہ اپنی کیفیت کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ حقیقت میں بات نہیں کر رہا بلکہ اپنے جذبات کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔

معارج نے پھر ایک آخری نگاہ مر میں ڈالی۔ وہ اب بھی وہاں موجود تھی، مگر جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھ رہی تھی، وہ دھندلا رہی تھی، اُس کا وجود چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ درخت کی چھاؤں میں گھل رہی تھی، جیسے وہ حقیقت سے نکل کر خواب بن گئی ہو۔

جیسے وہ ایک خواب ہو اور معارج ایک خیال۔۔۔ یوں معارج نے اسے پیچھے چھوڑ دیا، ایک ایسی یاد کے طور پر جو خواب اور حقیقت کے درمیان معلق تھی، ایک راز کی مانند جسے دونوں جانتے ہوئے بھی انجان بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک چنگاری کی مانند تھی جو بظاہر بجھ گئی ہو، مگر دل کی گہرائیوں میں کہیں شعلہ بن کر جلتی رہی۔

...°...

معارج تہجد کے وقت باہر سرسبز لان میں نماز کے لیے مستعد تھا۔ اُس کے سر پر کالی ٹوپی سجی ہوئی تھی، اور بدن پر سیاہ شلوار قمیص کے اوپر ایک کالی شال تھی جو رات کی سیاہی میں ایک تسکین بھری پرچھائیں پیش کر رہی تھی۔

جائے نماز ہری بھری گھاس پر بچھی ہوئی تھی، اور معارج قبلہ رخ گھٹنے ٹیک کر دست بستہ دعا مانگ رہا تھا۔ اُس کے آنکھیں موندی ہوئی تھیں، ہاتھ دعا میں بلند تھے، اور لب خاموشی سے اللہ کی بارگاہ میں نجوی کر رہے تھے۔ اُس کے وجود میں ایک ایسا سکون تھا جو دنیا کے ہنگاموں سے ماوراء تھا؛ گویا وہ اپنے خالق کے سوا ہر شے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

نماز کے اختتام پر جب وہ دھیماسا سلام پھیر کر اٹھا تو پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی اُس کی نگاہ پروفیسر تراب پر پڑی جو قریب ہی ایک لکڑی کے بیچ پر بیٹھے مسکراتے ہوئے اُس کی عبادت کا نظارہ کر رہے تھے۔ پروفیسر تراب کا پیر ہن ایک سادہ کرتا پا جامہ تھا، جس کے کاندھوں پر ایک سفید شال لپیٹی ہوئی تھی۔ اُن کے ہاتھ میں ایک خوبصورت تسبیح تھی جس کے موتیوں کو انہوں نے اپنی نرم انگلیوں سے تھام رکھا تھا، اور وہ اطمینان سے ان موتیوں کی گنتی کر رہے تھے۔

پروفیسر تراب نے محبت بھری مسکان کے ساتھ کہا، ”یہ تہجد کا لمحہ عجیب ہے، جب انسان رب کریم سے محو گفتگو ہوتا ہے تو وہ دنیا کی ہر شے سے غافل ہو جاتا ہے۔“ انہوں نے اپنے برابر والے بیچ پر ہاتھ مارا اور کہا، ”آؤ، معارج، یہاں میرے ساتھ بیٹھو۔“

معارج نے جائے نماز لپیٹ کر قریب رکھی میز پر رکھ دی اور خاموشی سے جا کر تراب کے پاس بیٹھ گیا۔

۔ ”السلام علیکم، پروفیسر تراب، آپ خیریت سے ہیں؟ اتنے رات گئے جاگے ہوئے ہیں“ معارج نے ادب سے سلام کرتے ہوئے پوچھا۔

۔ ”وعلیکم السلام، معارج۔ ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ پروفیسر تراب نے جواب دیا اور پھر اُس کی آنکھوں میں گہری نظروں سے جھانکتے ہوئے کہا، ”لیکن تم کچھ پریشان لگتے ہو، کیا بات ہے؟ کب۔۔۔ سے دیکھ رہا ہوں تمہارے دل و دماغ میں کچھ الجھاؤ ہے۔“

معارض نے نظریں جھکاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا، ”نہیں، پروفیسر، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔“

لیکن اُس کے لہجے کی بے کلی اُس کے دعوے کے خلاف تھی۔ حقیقت میں، وہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ مینسا کے بارے میں پریشان تھا حالانکہ نظروں کی تکرار اس کے دل و دماغ میں گردش کر رہی تھی۔

مینسا جسے اُس نے پہلی بار نقاب میں گھوڑے پر سوار دیکھا تھا، اور، اُس کی آنکھیں... وہ آنکھیں جن میں اُسے اپنی پہلی اور آخری محبت، ایمان کی جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ آنکھیں جو اُسے ایک ایسی یاد کی گہرائی میں لے جا رہی تھیں جسے وہ بھول نہیں سکا۔

۔ ”وہ لڑکی... اُس کی آنکھیں بالکل ایمان جیسی تھیں۔“ معارج نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا، جیسے کوئی گناہ کا اعتراف کر رہا ہو۔ ”جب بھی وہ میرے قریب آئی، میرا دل کیوں بے قابو ہوتا گیا؟“

پروفیسر تراب نے ایک ہلکی مسکان کے ساتھ اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا، ”معارض، تم یہ سب کچھ زیادہ سوچ رہے ہو۔ مینسا کا ایمان یا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم تنہائی کی وجہ سے اپنے دل میں خیالات بُن رہے ہو، اور چونکہ تم ایمان کی کمی محسوس کرتے ہو، اس لیے یہ خلاء کسی اور کی صورت میں بھرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“

پھر تراب نے سنجیدگی سے کہا، ”اگر ایمان واقعی اُس حادثے کے بعد زندہ نہ ہو تو کیا ہوگا؟ وہ کھائی جس میں، وہ گر گئی شیر کی آوازیں... اس کے باوجود تمہیں لگتا ہے وہ زندہ ہے؟“۔

معارض نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا، ”۔

میرا ایمان پختہ ہے کہ وہ زندہ ہے۔ کیوں کہ جو کچھ سنا ہے، اُس کا گواہ تو ہوں، پر دیکھا نہیں ہے۔ اگر میری چھٹی حس فریب کا شکار بھی ہے اور ایمان اس دنیا میں موجود نہیں، تب بھی کوئی غم نہیں۔ میں قیامت تک اُس کا منتظر رہوں گا۔ قیامت کے دن سب کچھ دوبارہ زندہ ہوگا۔۔۔ حتیٰ کہ موت کو بھی موت آجائے گی، تو کون ایمان کو مجھ سے چھین سکتا ہے؟

میں اللہ کے سامنے اپنے تمام نیک اعمال کا واسطہ دے کر، جو کچھ تھوڑے بہت ہیں، جنت میں ایک معمولی سی جگہ اور ایمان کا ساتھ طلب کر لوں گا۔ میں اُس روز کا انتظار کروں گا جب ایمان اور میں دوبارہ ملیں گے، ہمیشہ کے لیے۔۔۔ ہم دونوں ساتھ ہوں گے، ایک ایسا ساتھ جو کبھی ختم نہ ہوگا۔“۔

تراب نے اپنی آنکھوں میں حیرت اور فکر کے ساتھ کہا، ”معارض، کیا تم ہمیشہ ایمان کا انتظار کرو گے؟ تم کبھی کسی اور سے شادی نہیں کرو گے؟“۔

۔ ”نہیں، پروفیسر۔ ایمان میری واحد محبت تھی، ہے، اور ہمیشہ رہے گی۔ میں اُسے بھول نہیں سکتا، نہ ہی کسی اور کو اس کی جگہ دے سکتا ہوں۔“۔

تراب نے دل سے دعا کرتے ہوئے کہا، ”میری دعا ہے کہ تم خوش رہو، معارج۔ میں تمہیں تنہا اور اداس نہیں دیکھ سکتا۔ میری خواہش ہے کہ تمہیں کوئی ایسی ہستی ملے جو تمہارے دل کو خوشی اور سکون سے بھر دے، جو تمہارے ساتھ پیار سے پیش آئے۔“

معارج نے ایک ہلکی سی مسکان کے ساتھ کہا، ”شکریہ، پروفیسر، مگر میں مطمئن ہوں۔ مجھے کسی اور کی ضرورت نہیں۔ صرف اللہ اور ایمان میرے لیے کافی ہیں۔“

تراب نے آخر میں اداس ہوتے ہوئے کہا، ”معارج، کل تم یہاں سے جا رہے ہو؟“

۔ ”نہیں، پروفیسر، میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں، بس اس گھر سے جا رہا ہوں۔ یہ فاصلہ مکان کا ہو گا، دل کا نہیں۔ آپ ہمیشہ میرے دل میں رہیں گے، اور میری دعاؤں میں بھی۔“

معارج نے آخر کار کہا، ”یہاں دو عورتیں ہیں اور مجھے یہاں غیر آرام دہ محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں جا کر اپنے دل کو سکون دوں۔“

تراب نے مسکراتے ہوئے اُس کی تسلی کی

۔ ”معارج، تم ایک نیک دل اور پاکیزہ نیت رکھنے والے انسان ہو۔ یہ گھر تمہارا ہے، اور اگرچہ تم جانا چاہو تو کوئی زبردستی نہیں مگر یاد رکھو یہ دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں، اور یاد رکھنا کہ یہ گھر ہمیشہ تمہارا ہی

رہے گا۔ میں تمہارے بابا کے مانند ہوں، بہرام تمہارا بھائی ہے، اور شانزہ اور سندس تمہاری بہنیں ہیں۔”

یہ گفتگو ستاروں بھری رات میں، جادوئی جگنوؤں کی روشنی میں ہوئی۔ ارد گرد قدرت کا حسن تھا—سبز لان، خوشبودار پھول، بلند و بالا درخت، اور آسمان پر چمکتے چاند اور ستارے۔

...°...

وادی ہنزہ کی ایک پُر سکون اور دلکش صبح تھی۔ افق پر سورج برف سے ڈھکی پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے سے نمودار ہو رہا تھا، اور اُس کے سنہری اور نارنجی رنگوں نے آسمان کو ایک خوابیدہ منظر میں بدل دیا تھا۔

ہوا میں تازگی اور خنکی کی آمیزش تھی، جس میں پھولوں کی لطیف خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ درختوں پر پرندے خوش نوا گیت گارہے تھے اور دور بہتا دریا ایک دھیمہ اور مدھر راگ الاپ رہا تھا، گویا قدرت کی زبان میں سرگوشی کر رہا ہو۔

سندس باغ کے وسط میں بیٹھی ان مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں موبائل تھا، اور وہ ویڈیو کال پر کسی سے گفتگو میں محو تھی۔ اُس کا چہرہ مسکراہٹوں کی جھلک سے روشن تھا، اور اُس کی ہلکی نیلی شلوار قمیض پر لپٹا ہوا سفید دوپٹہ اُس کے سر کو ڈھانپے ہوئے تھا، جس نے اُس کی معصومیت اور وقار کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ سندس کی آواز میں خوشی اور شگفتگی تھی، جیسے وہ کسی اپنے سے بات کر رہی ہو۔

۔ ”تم واقعی بہت سخت دل ہو، تمہیں ذرا بھی احساس نہیں!“ سندس نے مصنوعی خفگی سے کہا، مگر اُس کے چہرے کی مسکان اس کے دل کی کیفیت عیاں کر رہی تھی۔ وہ کچھ اور کہنے ہی والی تھی کہ اچانک اُس کے کانوں میں ایک گہری، مانوس آواز گونجی۔

”سندس!“

سندس کے دل میں ایک دھڑکا لگا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا تو پروفیسر تراب کھڑے تھے، چہرے پر سنجیدگی کی پرچھائیں، آنکھوں میں تفتیشی جھلک۔ اُن کے سفید کرتے اور پاجامے پر سیاہ واسکٹ اُن کے رعب اور وقار کو مزید بڑھا رہی تھی۔

۔ ”ماموں جان... آپ؟“ سندس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اُس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو چکی تھی، جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

تراب دھیرے دھیرے اُس کی طرف بڑھے، اُن کی آنکھوں میں سوالات تھے جنہوں نے سندس کی روح میں لرزش پیدا کر دی۔

۔ ”کس سے بات کر رہی ہو؟“ تراب نے پُر اسرار لہجے میں پوچھا۔ اُن کی آواز میں مشکوک پن اور سرد مہری واضح تھی۔

سندس کی زبان لرز گئی، اور اُس نے بمشکل کہا، ”دوست سے۔“

تراب کی آنکھوں میں حیرت اور شک کی ایک لہر ابھری۔ ”کس دوست سے؟“ وہ اُس کی بات پر مطمئن نہ ہوئے، اُن کا لہجہ مزید سخت اور تحقیقاتی ہو گیا۔ اُنہوں نے سندس کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا اور سکریں پر نظریں جمادیں۔

سکریں پر ایک شناسا چہرہ نمودار ہوا، جسے دیکھ کر پروفیسر تراب کا رنگ فق ہو گیا۔ اُن کی آنکھیں حیرت اور صدمے سے پھیل گئیں، گویا وہ ایک تلخ حقیقت سے دوچار ہو گئے ہوں۔ اُن کا جسم بے جان ہو کر بیچ پر ڈھے گیا، جیسے اُن کی قوت برداشت جواب دے چکی ہو۔

سندس کے دل کی دھڑکن رک گئی، ہوا میں ایک بوجھل خاموشی چھا گئی۔ تراب کی بے یقینی اور سندس کی خوف زدہ نظروں نے فضا میں ایک پُر اسرار معمہ کھڑا کر دیا تھا۔

نور اپنے گھر کے سرسبز لان میں ایک قدیم طرز کی لکڑی کی کرسی پر بیٹھے ہوئی تھی۔ اس کے ارد گرد عورتوں کا ایک گروہ دائرہ بنائے گھاس پر بیٹھا تھا، ہر ایک کی آنکھوں میں شوق اور دلوں میں نور کی باتوں کو سننے کی تڑپ تھی۔

لان کے پیچھے دریا کے بہاؤ کی ہلکی آواز فضا کو پرسرا اور سکون بخش بنا رہی تھی۔ نیلے آسمان پر سفید بادلوں کی قطاریں، برف پوش پہاڑوں کی بلندیاں، اور ہوا میں جھومتے درخت، گویا قدرت کے حسن کی گواہی دے رہے تھے۔

نور نے سیاہ رنگ کے لباس پر ایک چوڑی چادر اوڑھ رکھی تھی، جو اُس کے وجود کو ایک وقار اور سنجیدگی میں لپیٹ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر ہواؤں کے نرم جھونکوں نے روشنی بکھیر دی تھی۔ اُس کی آنکھیں آسمان کی بلندیوں میں جیسے کسی غیبی حقیقت کی جستجو کر رہی تھیں۔

نور نے اپنی بات کا آغاز ایک مسکراہٹ کے ساتھ کیا۔ ”مرد کی حقیقی ثروت اُس کے مال و زر میں پوشیدہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ اُس دل کی وسعت میں پنہاں ہوتی ہے جس میں عورت کے لیے عزت و وقار کی گہرائیاں پوشیدہ ہوں۔ جیسے عورت کی اصل زینت محض اُس کے گھر کی آرائش میں نہیں، بلکہ اُس کا وقار اُس بلند اخلاق میں ہے جو وہ اپنے شوہر کی توقیر اور اپنی اولاد کی تربیت سے عیاں کرتی ہے۔ خاندان کا استحکام، اُس ایثار میں ہے جو مرد و عورت مل کر اپنے گھر کی بنیادوں میں ڈالتے ہیں، کہ وہ گھر جسے وہ دونوں بانٹتے ہیں، صرف اینٹ و گارے سے نہیں، بلکہ محبت، قربانی اور اعتماد سے جڑا رہتا ہے۔“

اُس کی آواز میں سکون اور گہرائی تھی، گویا دلوں کے تار چھیڑ رہی ہو۔

اُس نے پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا، جن پر برف کی سفید چادر لپیٹی ہوئی تھی۔ ”دیکھو، یہ پہاڑ اپنی عظمت میں خاموش ہیں، لیکن ان کی بلندی ہمیں اللہ کی قدرت اور عظمت کا احساس دلاتی ہے۔ اسی طرح عورت کا وقار اور بلندی اُس کے پردے میں پوشیدہ ہے، جو اُسے مخلوقات کی نظروں سے محفوظ رکھتا ہے۔“

اُس کی باتوں میں گہرائی تھی، گویا ہر لفظ روح کی گہرائیوں کو چھو رہا تھا۔ ”لباس اور پردہ وہ رسی ہے جسے تھام کر ہم اپنی روح کو دنیا کی آلائشوں سے بچاتے ہیں۔“

نور نے اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر بہتے دریا اور درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اللہ کی اس زمین کو دیکھو۔ ہر درخت، ہر پھول، ہر بادل اللہ کی حمد و ثنا میں مصروف ہے۔ اور ہم؟ ہم کس طرح اللہ کے احکامات کو پس پشت ڈال سکتے ہیں؟ حجاب اُس بندگی کا نشان ہے جو ہم نے اپنے رب سے باندھ رکھی ہے۔“

عورتیں سر اپا توجہ تھیں، اُن کی آنکھوں میں جیسے نور کی باتوں کی روشنی بھر گئی ہو۔

۔ ”حجاب کا حکم، جو اللہ نے قرآن میں دیا، وہ محض جسم کا پردہ نہیں، بلکہ روح کی پاکیزگی ہے۔ اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ حجاب یا نقاب کیوں کیا جائے؟ یہ بات اپنی ذات پر منحصر ہے، مگر ایک بات طے ہے کہ آپ کو اپنے خالق کے سامنے جواب دینا ہے، اور اُس روز کیا دلیل پیش کریں گے؟ کیوں کہ قرآن مجید میں واضح حکم ہے کہ پردہ فرض ہے۔ جو مرد یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب عورت خود کو ظاہر کرتی ہے تو

ہم کیوں نہ دیکھیں؟ اُن سے کہیے کہ دوسروں کے گناہ کو اپنے گناہ کا جواز نہیں بنایا جاسکتا۔ ہر انسان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، اور اللہ کے سامنے ہر نفس اپنے کیے کا ذمہ دار ہو گا۔ آپ کی نظر، آپ کا عمل، آپ کی نیت۔ ہر شے آپ کے اور اللہ کے درمیان ہے، اور قیامت کے دن ہر کسی کو اپنے اعمال کا جواب دینا ہو گا۔”

اُس نے توقف کیا اور نگاہ اٹھا کر خواتین کی جانب دیکھا، جن کے چہروں پر اثبات کی جھلک اور لبوں پر ہلکی سی سرگوشی تھی۔ اُن کی آنکھوں میں احترام اور گہرے تجسس کو بھانپتے ہوئے، اُسے دل کی گہرائیوں سے اطمینان اور ذمہ داری کا احساس ہوا۔ وہ انہی بصیرتوں کو ان تک منتقل کر رہی تھی جو اُس نے اپنے دانشمند اور دیندار والد سے سیکھیں تھیں۔

۔“آج کل عورتوں میں نام نہاد باختیاریت کے پردے میں جہالت کی ہوا چلائی جا رہی ہے، جس کا مقصد صرف خاندانی نظام کی بنیادوں کو کمزور کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو مرد، عورت کے بغیر مکمل ہے اور نہ ہی عورت مرد کے بغیر۔ یہ دونوں ایک دوسرے کا مکملہ ہیں، اور اسی ہم آہنگی میں خاندانی نظام کی بقا پوشیدہ ہے۔ مرد کی شان عورت کے احترام میں پنہاں ہے اور عورت کی عظمت، خاندان کی تربیت و حفاظت میں۔”

اُس نے مزید کہا، “میرے والد ہمیشہ فرمایا کرتے تھے، بیٹی! جب غلاظت بے نقاب ہوتی ہے تو اُس پر گندگی کے حشرات پلتے ہیں، مگر خالص خزانہ زمین کی گہرائیوں میں چھپا ہوتا ہے۔ اُس کی جستجو محنت طلب

ہوتی ہے، اور جب وہ خزانہ ہاتھ آجائے تو اس کی حفاظت کے لیے سات پردوں میں چھپانا لازم ہوتا ہے۔
تم بھی اپنے آپ کو یوں چھپاؤ، کیوں کہ تم ایک قیمتی خزانہ ہو، اور خزانہ ہمیشہ محفوظ کیا جاتا ہے، کبھی نمایاں
نہیں ہوتا۔”

پھر وہ تھوڑا توقف کر کے گویا ہوئی، “جانتی ہو، عورت کی اصل عظمت اُس پردہ داری میں ہے، جس میں
اُسے کفن کے پانچ کپڑوں میں لپیٹا جاتا ہے۔ اُس کا جنازہ بھی رات کی تاریکی میں ادا کیا جاتا ہے، اور اُس کی
تخلیق اتنی مقدس ہے کہ فرشتوں کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ رکھی گئی۔ اگر وہ ماں ہے تو اُس کے قدموں
تلے جنت ہے، اگر وہ بیوی ہے تو وہ باعثِ برکت ہے، بیٹی ہے تو رحمت، اور بہن ہے تو عزت و ناموس کا
پیکر۔”

اُس نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہا، “اور جو یہ کہتے ہیں کہ ماڈرن اور مہذب نظر آنے کے لیے ظاہری
لباس کی ضرورت ہے، تو انہیں جواب دو کہ حیوان ابتدا ہی سے بے لباس تھے، کیا وہ مہذب تھے؟ انسان
نے لباس پہن کر تہذیب اختیار کی، اور پردہ اسی تہذیب کا حصہ ہے۔ اگر ہم دوبارہ بے پردہ ہوں تو ہم
زمانہ جاہلیت میں لوٹ جائیں گے۔”

اُس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے سر جھکا لیا، اور خواتین کی جانب سے بچنے والی ستائش کی گونج میں سر اٹھا
کر شکریہ ادا کیا۔ پھر انہیں چائے اور ناشتے کی دعوت دی، اور اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے گھر کی جانب بڑھ

گئی۔ خواتین بھی اُس کے پیچھے چل پڑیں، اور اُس کے دل میں سکون اور اطمینان کا احساس تھا کہ اُس نے اپنی ذمہ داری بخوبی نبھائی اور علم کی روشنی کو بانٹا۔

...°...

نور سکونت سے صوفے پر بیٹھی چاول چن رہی تھی۔ اُس کے دائیں جانب کھڑکی سے باہر پھولوں پر رنگ برنگی تتلیاں اڑتی دکھائی دے رہی تھیں، اور دور تک پھیلا سبزہ منظر کو دلکش بنا رہا تھا۔ نور کام میں محو تھی کہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ مینسا، جس کے انداز میں غصے کی جھلک نمایاں تھی، سامنے والی کرسی پر بیٹھی اور شدید اضطراب میں میز پر پڑا جگ اٹھا کر گلاس میں پانی بھرنے لگی۔

نور کی انگلیاں چاول چنتے

چنتے رک گئیں، جب اس نے مینسا کے چہرے پر سائے دیکھے۔ اس کی نظریں نیچی تھیں، اور لہجے میں شدت تھی۔ مینسا نے ہاتھوں میں لرزتے گلاس کو تھاما، پانی کی چھلکتی بوندیں میز پر گرنے لگیں۔

نور نے نرمی سے پوچھا، ”مینسا، بچی، کیا ہوا؟ اتنی بے چینی کیوں محسوس کر رہی ہو؟“۔

مینسا نے نقاب اتار کر ایک طرف رکھا، چہرے پر تھکن کے آثار واضح تھے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی، ”نور امی، جب انسان کی آنکھوں کے سامنے نا انصافی ہوتی ہے تو دل کس قدر بے چین ہو جاتا ہے، یہ آج میں نے محسوس کیا۔“۔

حاشر، جو ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا، نے مینسا کی بات کو سنجیدگی سے سنا اور نور کی طرف دیکھا جیسے اس سے رہنمائی طلب کر رہا ہو۔ نور نے اشارے سے حاشر کو مینسا کے پاس بیٹھنے کا کہا۔

مینسا نے آہستہ سے کہا، ”آج جنگل کے راستے پر میری نظر پڑی چار لڑکوں پر، جو ایک نقاب پوش لڑکی کے ساتھ زبردستی کر رہے تھے۔ وہاں نہ کوئی اور تھا، نہ کوئی بچانے والا۔ اور وہ لڑکی بے بسی سے اللہ کو پکار رہی تھی، جیسے شاید آخری امید کی دعا کر رہی ہو۔“

نور کے چہرے پر خوف اور غم کے آثار چھلکنے لگے۔ اُس نے آہستہ سے کہا، ”اللہ رحم کرے! پھر تم نے کیا کیا، مینسا؟“

مینسا کی آنکھوں میں غصہ بھر آیا، ”امی، وہاں اور کوئی نہیں تھا، سوائے میرے اور اللہ کے۔ میں نے ان لڑکوں کو سبق سکھایا کہ دوبارہ کسی معصوم کو ستانے کی جرات نہ کریں۔ ان کے دلوں میں نہ خوفِ خدا تھا اور نہ شرم۔ جب انہوں نے اس نقاب پوش لڑکی پر رحم نہ کیا تو ان کی کیا تربیت ہوئی؟“

حاشر نے گہری سانس لی اور بولا، ”مینسا، ہمارا دین ہمیں امن اور صبر کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن افسوس لوگ نفس کے ہاتھوں مجبور قرآن کی نہیں سنتے۔“

نور نے حاشر کی بات پر سر ہلاتے ہوئے کہا، ”قرآن میں اللہ تعالیٰ نے صاف حکم دیا ہے کہ مرد اپنی نظریں نیچی رکھیں۔ لیکن یہ کون سمجھائے ان لوگوں کو جن کے دلوں میں نفس کا غلبہ ہے؟ یہ وہ ہی لوگ ہیں جو اپنی بے راہ روی کو دوسروں کے اعمال پر ڈال کر خود کو بے قصور سمجھتے ہیں۔“

مینسانے سنجیدگی سے کہا، ”نور امی، یہ بات تو ہمارے معاشرے میں روز دہرائی جاتی ہے کہ خواتین کو پردہ کرنا چاہیے۔ لیکن آج وہ لڑکی پردے میں تھی، اس کی پاک دامنی ظاہر تھی، تو الزام کس پر دھریں؟ کیا یہ ہمارے معاشرتی دوہرے معیار نہیں؟ کیا اس حالت میں بھی ہم یہ کہیں گے کہ لڑکی کو اپنا تحفظ خود کرنا چاہیے تھا؟“

نور نے غور سے مینسان کی بات سنی، اور گہری سوچ میں ڈوب کر بولی، ”یہ ہی تو المیہ ہے، بیٹی۔ لوگ گناہ کو صرف اسی وقت برا سمجھتے ہیں جب ان پر بات آتی ہے۔ قرآن میں اللہ نے صاف فرمایا ہے کہ ہر عمل کا ذمہ دار وہ ہی شخص ہے جس نے اسے کیا ہو۔ کسی دوسرے کو الزام دینا اسلام میں جائز نہیں۔ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے دلوں کو پاک کریں اور برائی کی طرف بڑھنے والے قدموں کو روکیں۔“

مینسانے ناراضگی سے کہا، ”امی، اگر یہ ہی حالات رہے، تو کیا ہر لڑکی کو خود اپنی حفاظت نہیں کرنی چاہیے؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہر عورت اپنے دفاع کے قابل ہو؟“

حاشر نے نرمی سے جواب دیا، ”بیٹی، اپنے حق کے لئے کھڑا ہونا اور ظالم کا مقابلہ کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ اگر ہمارا معاشرہ قرآن اور سنت کے اصولوں کو اپنائے، اور اگر حکمران ظالموں کو عبرت کا نشان بنائیں، تو شاید ایسے سانحے پیش نہ آئیں۔“

نور نے گہری سانس لے کر کہا، ”اگر ہم واقعی معاشرتی تبدیلی چاہتے ہیں، تو ہمیں پہلے اپنی سوچ بدلنی ہوگی۔ مردوں کو بھی اپنی نظریں نیچی کرنی ہوں گی، اور عورتوں کو بھی اپنی عزت و حیا کا پاس رکھنا ہوگا۔ معاشرہ تب ہی بدلے گا جب ہم سب اپنی ذمہ داری سمجھیں گے۔“

مینسا نے مزید کہا، ”نور امی، آج کے دور میں ہر لڑکی کو اپنی حفاظت کے لئے تیار ہونا چاہیے۔ یہ زندگی کا تقاضا بن گیا ہے۔ لیکن پھر بھی، جب تک قانون ان مجرموں کو سخت سزا نہیں دیتا اور معاشرہ اپنی نظریں نہیں بدلتا، تب تک حقیقی تبدیلی ممکن نہیں۔“

حاشر نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا،

۔ ”دیکھو، اُس لڑکی نے اللہ سے مدد کی دعا مانگی، اور اللہ نے تمہیں وسیلہ بنا کر اُس کی مدد کے لیے بھیج دیا۔ خیر، یہ بتاؤ کہ اُن کم بختوں کا کیا انجام ہوا؟“

مینسا نے تحقیر بھرے لہجے میں کہا، ”گاڑی سے چاروں کو ٹکڑا کر گرا دیا تھا، پھر لوہے کے ڈنڈے سے ایسی جگہ مارا کہ زندگی بھر کسی لڑکی کو بری نظر سے دیکھنے کا سوچیں بھی نہ۔ ابھی ابھی اُنہیں تھانے پھینک

کر آئی ہوں۔ وہ لڑکی کے گھر والے بھی آگئے تھے، خاصے صاحبِ ثروت لوگ ہیں۔ اب ان کم ظرفوں کا بچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔”

حاشر مسکراتے ہوئے بولا، ”تمہارے ہاتھوں سے مار کھانے کے بعد بھی؟“

مینسا نے تلخی سے کہا، ”اگر میرا اختیار چلتا، تو ان کے منہ میں ہاتھ ڈال کر ان کے جگر نکال دیتی۔ بے غیرت لوگ! اللہ ان کو نیست و نابود کرے۔۔۔ تباہ و برباد کرے۔“

نور نے بات بدلتے ہوئے کہا، ”ویسے تمہیں یہ بھی بتانا تھا کہ عجبہ پر دادا بن گیا ہے، بلی نے بچے دیے ہیں۔“

مینسا کے چہرے پر خوشی کی جھلک نمایاں ہوئی اور وہ تلخ لمحے بھول گئی۔ ”کیا واقعی؟“

نور نے سر ہلاتے ہوئے اثبات میں کہا، ”ہاں ہاں، بالکل ایسا ہی ہے۔ تم جاؤ اور دیکھ آؤ۔“

مینسا جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی، ”ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔ اللہ حافظ۔“

حاشر نے مینسا کو جاتے ہوئے دیکھا اور پھر نور سے مخاطب ہو کر کہا، ”میں آج مسجد کے امام سے کہوں گا کہ جمعہ کے خطبے میں یہ بات بیان کریں کہ مردوں کا نظریں جھکائے رکھنا کیوں ضروری ہے۔ پردہ صرف عورت پر ہی فرض نہیں بلکہ مردوں کے لیے بھی ہے۔“

نور نے گہری سانس لیتے ہوئے سر ہلایا، ”حاشر، کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ کاش ہم رسول اللہ ﷺ کے دور میں ہوتے، ان کے غلام ہوتے۔ وہ دور کتنا شاندار اور روشن تھا۔ مرد و زن ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے کوئی مسئلہ ہوتا، تو وہ سیدھے رسول اللہ ﷺ کے پاس شکایت لے جاتی۔ عورتیں جنگ میں بھی شریک ہوتی تھیں اور تجارت بھی کرتی تھیں۔ مگر آج کا یہ زمانہ۔۔۔۔۔“

اُس نے ایک گہری سانس لی اور کہا، ”آج کا زمانہ کتنا بُرا ہے، اور لوگ کتنے بُرے ہو گئے ہیں۔“

حاشر نے سنجیدگی سے کہا، ”ہر دور میں اچھے اور بُرے لوگ ہوتے ہیں، بس ہمیں بُرائی سے بچنا ہوتا ہے۔“

نور افسوس سے بولی، ”مینسا کے حقیقی والدین بھی کتنے ظالم نکلے۔ صرف دولت کے پجاری ہیں وہ۔“

حاشر نے بھی دکھ کے ساتھ کہا، ”قیامت کے دن ہر کوئی اپنے اعمال کا جواب دہ ہو گا۔“

...°...

معارض اپنے گھر کے کمرے میں موجود تھا۔ ایک وسیع و عریض اور پُر فضا جگہ، جہاں سے شیشے کی بڑی کھڑکی سے پہاڑوں کا دلکش منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ رات کی نیلی چادر پر بے شمار ستارے جگمگا رہے تھے،

اور چاندنی نے ان بلند و بالا پہاڑوں پر نرمی سے اپنا جادو بکھیر رکھا تھا، جس سے ایک پر کیف سکون کی فضا قائم ہو رہی تھی۔

ہوا میں تازگی اور کرواہٹ تھی، جسے دیودار کے درختوں اور جنگلی پھولوں کی خوشبو نے مہکایا تھا۔ ہنزہ کی یہ وادی گویا زمین پر جنت تھی، جہاں معارج نے ہمیشہ سکون اور تحریک کو پایا۔

کمرے میں ایک قدیم مگر خوبصورت لکڑی کی میز رکھی تھی، جس پر کئی اشیاء ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ کتابیں، چراغ اور ایک طرف چمکتی ہوئی گاڑی کی چابیاں۔ میز کے قریب ہی لکڑی کی ایک کشادہ الماری تھی، جس میں کئی کتابیں اور دلفریب آرائشی سامان سجا ہوا تھا، جو کمرے کی جمالیات کو بڑھاوا دے رہا تھا۔

کمرے کے دوسرے کونے میں ایک چھوٹا سا آرائشی اسٹول رکھا تھا، جس کے کناروں پر لکڑی کی باریک شاخوں کی نفیس نقش و نگار بنی ہوئی تھیں، جو فطرت کے حسن کو نمایاں کر رہی تھیں۔

اس کے ساتھ ایک نرم و ملائم آرام دہ کرسی رکھی تھی، جس کے سامنے ایک فٹ ریسٹ بھی تھا، گویا یہ جگہ بیرونی مناظر کا سکون سے لطف لینے کے لیے بہترین تھی۔ پورا کمرہ جدید طرز کے سلیقے سے چنے گئے فرنیچر سے آراستہ تھا، جس سے معارج کے نفیس ذوق اور شائستہ شخصیت کا بھرپور عکس دکھائی دے رہا تھا۔

معارض، جو بستر پر بیٹھا تھا، اس کی ڈریس شرٹ کے اوپر کے تین بٹن کھلے ہوئے تھے، جس سے اس کی چوڑی چھاتی نمایاں ہو رہی تھی۔ اس کی سفید شرٹ اس کے مضبوط جسم کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی، جو اس کی دلکش قامت کو نمایاں کرتی تھی۔

اس کے ساتھ ہی، اس نے خاکستری رنگ کی پتلون اور سیاہ چمڑے کے لوفرز پہنے ہوئے تھے، جس نے اسے بے حد دلکش اور پرکشش بنایا ہوا تھا۔ اس کے وجود میں جاذبیت کی وہ چمک تھی جسے نظر انداز کرنا ناممکن تھا۔

وہ بستر کے ایک کنارے پر جھکا ہوا، گہری سنجیدگی سے ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مکمل توجہ کی چھاپ تھی، آنکھیں تنگ، اور پیشانی پر ہلکی سی شکن تھی۔ اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجی، خاموشی کو کاٹتے ہوئے۔ جیسے ہی اس نے فون اٹھا کر کان سے لگایا، اس کی آنکھیں ایک دم پھیل گئیں۔ وہ صدمے اور حیرت میں ڈوبا، گویا کسی اچانک قیامت کا سامنا کر رہا ہو۔

۔ ”کیا؟“ اس نے دھیمی مگر پر جوش آواز میں کہا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اور ہر عضلہ تناؤ سے کھینچ گیا۔

وہ فوراً بستر سے اٹھا، اس کے انداز میں عجلت اور بے چینی کا رنگ نمایاں تھا۔ ”بہرام، فکر نہ کرو، میں فوراً آ رہا ہوں!“ اس کی آواز میں یقین اور فوری رد عمل تھا، گویا ہر لمحہ قیمتی تھا۔

معارض نے میز سے گاڑی کی چابیاں اُچک لیں اور دروازے کی جانب قدم بڑھایا۔ کمرے میں پھیلی ہلکی روشنی نے اس کے لباس اور قد و قامت کو اور بھی پر اثر بنادیا تھا۔ ایک نامکمل تحریر کاغذ پر رکھی رہ گئی، گویا ماحول کی سکونت میں اُبھرنے والی ہلچل کی گواہ ہو۔ معارج نے کمرے سے باہر قدم رکھا، اور ایک مکمل ہنگامی کیفیت میں روانہ ہوا۔

...°...

اسپتال کا منظر اداسی اور ناامیدی کی سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ دیواروں کی سفیدی اور جراثیم سے پاک بو فضا میں بکھری اداسی کو اور بھی بڑھا رہی تھی۔ معارج اور بہرام،، پروفیسر تراب کے متعلق کسی خبر کے منتظر تھے، اور یہ انتظار ان کے دلوں میں بے چینی کا بوجھ بڑھا رہا تھا۔

معارض نے اپنے لباس کو سنبھالا ہوا تھا، اس کی شرٹ کے بٹن بند تھے اور اس نے وقار کے ساتھ اس مشکل وقت کا سامنا کرنے کی کوشش کی، مگر دل کی دھڑکن اس کے چہرے کے تاثرات میں عیاں تھی۔

وہ اپنے پیٹ میں ایک عجیب سی گرہ محسوس کر رہا تھا، جو خوف و خطرے کی نشانی تھی۔ پروفیسر تراب کی طبیعت کی بگڑنے کی خبر سن کر وہ تیزی سے اسپتال پہنچا تھا۔ انہیں کچھ عرصے سے شدید سر درد اور تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی، مگر ان محسن نے یہ بات کسی سے نہ کہی تھی کہ انہیں دماغ کا سرطان ہے اور وہ بھی آخری مرحلے میں۔

ڈاکٹر نے آہستگی سے آئی سی یو کے دروازے سے باہر آکر ان لوگوں کی جانب دیکھا جو کسی کرشمے کی امید میں وہاں جمع تھے۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی نمی تھی، اور اس کی آنکھوں میں افسوس کا سایہ۔ اُس نے بو جھل آواز میں کہا، ”پروفیسر تراب کے پاس وقت کم ہے۔“

یہ الفاظ معارج پر ایک بجلی بن کر گرے۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، جیسے وہ ان الفاظ کو سن کر بھی ماننے سے قاصر تھا۔ اس نے مایوسی اور بے یقینی کی کیفیت میں ڈاکٹر کے کندھے کو پکڑ کر کہا، ”کیا؟ آپ کا مطلب کیا ہے؟ کیا وہ واقعی ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ آپ نے کیا کہا کہ وقت کم ہے؟“

ڈاکٹر نے نرم لہجے میں اُسے جواب دیا، ”معارج، سر میں معذرت خواہ ہوں۔ پروفیسر تراب کو سرطان کی لاعلاج بیماری ہے جو آخری مرحلے میں ہے۔ اُنہیں اپنے مرض کی خبر تھی مگر اُنہوں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ یہ اُن کی خواہش تھی کہ اُن کی زندگی نارمل رہے اور کسی کو دکھ نہ پہنچے۔ اب ان کے پاس بس چند لمحے ہیں۔“

یہ سن کر معارج کی آنکھوں میں ایک خوفناک دکھ اور مایوسی کا سایہ چھا گیا۔ اس کے پیر کمزور ہو گئے اور وہ ایک جھٹکے سے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بے اختیار آنسوؤں سے رونے لگا۔

بہرام، اس کے قریب آیا۔ اس کی آنکھیں بھی نم تھیں اور چہرہ غم سے زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے معارج کو گلے لگایا، اور دونوں کی سسکیاں فضا میں گونج اُٹھیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کے درد کو محسوس کیا، وہ دوست نہیں بلکہ بھائی تھے، ایک دوسرے کے دل کے راز داں تھے۔

قریب ہی، شانزہ اور، سندس، کھڑی تھیں۔ اُن دونوں نے پروفیسر تراب کو اپنے والد کی طرح سمجھا تھا۔ شانزہ کی آنکھوں میں آہوں کا سمندر موجزن تھا۔ وہ پروفیسر تراب کو اپنے والد کی طرح مانتی تھی اور ان کی شفقت و محبت کی مقروض تھی۔ وہ روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئی، اُس کے آنسو اُس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

سندس بھی وہاں موجود تھی، اپنے دل کی گہرائیوں سے پروفیسر تراب کے شفقت آمیز کردار کی ممنون تھی۔ وہ اُس کے لیے ایک مشعل راہ تھے، اُس کی راہنمائی کا ذریعہ، اُس کے خوابوں کی تعبیر۔ سندس نے شانزہ کو گلے لگایا اور دونوں بہنوں کی آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں عیاں تھیں۔

فضا میں اداسی اور غم کی گہرائی چھا چکی تھی، اور اسپتال کے ماحول نے ایک عمیق سکوت اوڑھ رکھا تھا۔ وہ سب ایک ایسے دردناک لمحے کا سامنا کر رہے تھے جو کبھی نہ ختم ہونے والا محسوس ہو رہا تھا۔ ان سب کی آنکھیں اُداسی کے گہرے ساگر میں ڈوب چکی تھیں، اور یہ منظریوں تھا جیسے ہر کوئی اپنا دل تھامے اپنی زندگی کا اہم حصہ کھو چکا ہو۔

مینسا اپنے گھوڑے بادل کے ہمراہ اصطبل میں موجود تھی۔ سنہری ترکمانستانی اخل ٹیک، جیسے بادلوں کی چوٹی پر قدم رکھے ہو۔ وہ سفید ریشمی عبایا پہنے، شال کندھوں پر بکھری، جو پروں کی طرح ہلکی تھی۔ ہوائیں نرم چل رہی تھیں، اور اس کے پاؤں کے نیچے گھاس نرمی سے لہرا رہی تھی۔ اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا، جہاں چاند کا ٹھنڈی چمک پھینک رہا تھا۔ بادل روئی کی مانند تیزی سے آسمان میں بکھر رہے تھے۔ مینسا نے ایک طویل سانس لی، ہوا میں جڑی بوٹیوں اور پھولوں کی لطیف خوشبو اسے سکون دے رہی تھی۔

اچانک نور نے بھاگتے ہوئے آکر اس کے سامنے قدم رکھا۔ اس کا چہرہ پیلا اور فکر مند تھا، جیسے کسی ان دیکھی بلا کا سامنا کرنے آئی ہو۔ ”مینسا، ”نور کی آواز میں اضطراب تھا۔“ ہمیں فوراً اسپتال چلنا ہو گا۔“

مینسا نے حیرت سے نور کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ”اللہ! خیریت کیا ہوا؟“۔

نور نے آنکھیں جھکا لیں، جیسے کسی دردناک حقیقت کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ”ترا ب صاحب کا وقت اب بہت کم رہ گیا ہے،“ نور نے سرد آہ بھری۔ ”وہ آخری مراحل میں ہیں،“ اس نے نرمی سے بتایا۔

مینسا نے بے یقینی سے سر جھٹکا۔ ”نہیں، ان سے میری بات ہوئی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“۔

نور نے اس کا ہاتھ تھام لیا، اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ “مینسا، ہمیں فوراً وہاں پہنچنا ہو گا۔ حاشر نے پیغام بھیجا ہے کہ ہمیں بلایا ہے۔”

نور نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا اور دونوں وہاں پہنچ گئیں۔ مینسا نے بمشکل اپنے جذبات کو قابو میں رکھا، لیکن دل کی دھڑکنوں نے اس کی سنجیدگی کو عیاں کر دیا۔ نور نے جیسے ہی گاڑی سٹارٹ کی، وہ اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھیں۔ سڑکیں ویران تھیں، جیسے ہر شے نے اس وقت کی سنگینی کو محسوس کر لیا ہو۔

...°...

اسپتال کا کمرہ نیم اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ پروفیسر تراب کا بستر بے جان مشینوں سے گھرا تھا، جن کی سرد بیپ کی آوازیں زندگی کی نازک ڈور کی آخری لرزشیں ناپ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے تاروں اور نالیوں میں جکڑے بستر پر پڑے تھے، وقت کا زہر ان کے چہرے پر زردی اور پڑمردگی کی صورت ظاہر ہو رہا تھا، مگر ان کی آنکھوں میں اب بھی دانش کی چمک باقی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دنیا کے اسرار ان کے سامنے کھلے ہوں۔

سندس اور حیدر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اُن کے بستر کے برابر کھڑے تھے، جیسے ان کی محبت میں یہ خاموش التجا ہو کہ پروفیسر کو کچھ اور مہلت مل جائے۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی انہوں نے پروفیسر کی آخری

خواہش کے سامنے سر جھکاتے ہوئے نکاح کیا تھا۔ ان کی شادی کا ارادہ تو ایک ہفتے بعد مکہ مکرمہ میں تھا، مگر حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ مقدّر کا کھیل مختلف نکلا۔

حیدر دہئی سے علی الصبح پاکستان پہنچا تھا اور آج ہی پروفیسر تراب اور چند قریبی احباب کی موجودگی میں اس کا اور سندس کا نکاح انجام پا چکا تھا۔ مولوی صاحب نے نکاح پڑھاتے ہوئے قرآنی آیات کی تلاوت کی اور سنت کے مطابق ان سے رضامندی حاصل کی۔

مولوی صاحب جب مبارک دعائیں دے کر جانے ہی والے تھے کہ ایک ہلکی مگر گہری آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کیا، ”مولوی صاحب، ٹھہریے، ابھی ایک اور نکاح پڑھوانا ہے۔“ سب کے قدم جیسے زمین میں دھنس گئے، اور تمام نگاہیں پروفیسر تراب کی طرف مڑ گئیں۔

اُن کا سر تھوڑا سا اٹھا ہوا تھا، اور وہ اپنے دیرینہ دوست، حاشر کو گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پروفیسر تراب کے لہجے میں وہ عاجزی اور سنجیدگی تھی، جسے صرف موت کی دہلیز پر کھڑا انسان ہی اختیار کر سکتا ہے۔ ”حاشر، میری آخری ساعت قریب ہے، اور میں تم سے ایک سوال کرنے آیا ہوں—میں اپنے بیٹے معارج کے لیے تمہاری بیٹی مینسا کا ہاتھ مانگتا ہوں۔“ جیسے کمرے میں موجود ہر شخص کا سانس تھم گیا ہو، اور سب نے پروفیسر کو ٹکٹکی باندھے دیکھا۔

معارج کے چہرے پر جیسے ہوائیاں اُڑنے لگیں، وہ تیزی سے پروفیسر تراب کی طرف مڑا، جو بستر پر کمزور ہاتھوں میں اپنی زندگی کی آخری رمق سمیٹ رہے تھے۔ معارج، جو ان کے پاس موجود تھا، اپنے استاد

ساتھی سے شدید محبت کرتا تھا۔ وہ ان کی دانش و حکمت کی عزت کرتا تھا۔ وہ ان کے قدموں کے نشان پر چلنے کا خواہاں تھا۔ مگر معارج کے دل میں ایک اور بھاری بوجھ بھی تھا۔ ایمان کا۔

ایمان، وہ لڑکی جس نے معارج کی روح میں ایک گہری چھاپ چھوڑ دی تھی، چند سال قبل ایک حادثے میں جاں بحق ہو چکی تھی، مگر معارج آج بھی اس کی یاد کے قفس میں قید تھا۔ وہ وعدہ کر چکا تھا کہ کبھی کسی اور کو اپنی زندگی میں جگہ نہیں دے گا، اور یہ ہی وجہ تھی کہ وہ طے شدہ شادیوں اور رواجی بندھنوں کو اپنی ذات کے ساتھ دھوکا سمجھتا تھا۔

پروفیسر تراب نے کمزور ہاتھ کو بلند کیا، جیسے وقت کی آخری التجا کی جا رہی ہو۔ ”معارج، تم نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں۔ یہ نکاح میرے لیے نہیں، تمہارے لیے ہے۔ یہ میری آخری خواہش ہے، اور میری آخری امید۔ مینسا تمہارے لیے بہترین انتخاب ہے، وہ تمہیں تمہارے درد سے نجات دے گی، تمہاری ساتھی بنے گی، تمہاری محرم راز بنے گی۔ وہ تمہاری ایمان بن جائے گی۔“

معارج کا دل اس کشمکش میں پھنسا ہوا تھا، آنکھوں میں آنسو چھلکنے کے قریب تھے، مگر ایمان کی یادوں نے اُس کے دل کو جکڑا ہوا تھا، جیسے وہ خود اپنے جذبات سے فرار کی کوئی راہ نہیں پاسکتا تھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، اس کے دل میں احساسات کا طوفان برپا تھا۔ غصہ، مایوسی، الجھن، اور خوف۔ اسے یوں لگا جیسے پروفیسر تراب، جسے وہ استاد اور دوست دونوں مانتا تھا، اسے ایک ایسا بوجھ اٹھانے پر مجبور کر رہے ہوں جو وہ ہر گز نہیں اٹھانا چاہتا۔ دل کے کسی کونے میں ایک تلخ غم بھی تھا، کہ شاید وہ

اپنے استاد کے آخری لمحات میں انہیں مایوس کر رہا ہے۔ تراب کی نگاہوں میں چھپی حکمت نے اسے شک میں ڈال دیا، شاید وہ کچھ جانتے تھے جو معارج کے علم میں نہ تھا۔

معارج کے سینے میں خوف کا بوجھ بڑھتا گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک فیصلہ جو وہ کرنے جا رہا ہے، اس کی زندگی کی بنیادیں بدل دے گا۔ اس کے دل میں پروفیسر تراب کی محبت گہری تھی، کیوں کہ انہی کی رہنمائی میں اُس نے اسلام کی حقیقت اور اس کے حسن کو پہچانا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ تراب نے اس کی کتنی مدد کی تھی، کیسے اُس کی ہر مشکل کو آسان کیا تھا۔ اس کا دل جانتا تھا کہ پروفیسر تراب اس سے کس قدر محبت کرتے تھے اور اُسے ہمیشہ خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتے تھے۔

پروفیسر تراب کے چہرے کی ہلکی مسکراہٹ نے معارج کے دل پر پہاڑ کی طرح وزن ڈال دیا۔ ایک گہری آہ، جیسے موت کا استقبال کر رہی ہو، پروفیسر کے سینے سے نکلی۔ معارج نے اپنے دل کی شدت کو دبا کر کہا، ”پروفیسر تراب، جیسا آپ کہیں گے، میں وہی کروں گا۔“

یہ سنتے ہی پروفیسر کے لبوں پر ایک سکون بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی، جیسے ان کے دل میں ایک آخری خواہش پوری ہونے کا اطمینان چھلک رہا ہو۔

دروازہ کھلا اور مینسا اور نور اندر داخل ہوئیں۔ مینسا کا دل اس قدر زور سے دھڑکنے لگا جیسے وہ کسی نامعلوم خوف میں مبتلا ہو۔ اُس نے معارج کو بستر کے قریب دیکھا، اور اس کے دل میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ اُس کی نگاہ

پروفیسر تراب کی کمزور حالت پر تھی، اور وہ بے بسی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کیا کہے۔ وہ اپنے والد اور نور کے پیچھے چلتی ہوئی بستر تک پہنچی، جہاں پروفیسر تراب کی مدہم آواز نے اُسے پکارا، “مینسا، میری بچی، یہاں آؤ۔”

مینسا پروفیسر کے قریب آئی اور ان کا کمزور ہاتھ تھاما، جس کی گرفت ابھی بھی مضبوط تھی، مگر ہاتھ کی سردی اور جسم کی کمزوری نے دل دہلا دیا۔ اس نے پروفیسر تراب کی آنکھوں میں جھانکا، وہ آنکھیں جواب بھی روشن تھیں، مگر ان میں ایک نرمی اور ملال کا سایہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پروفیسر نے آہستہ سے کہا، “مینسا، تم اللہ کی طرف سے عطا کردہ ایک نعمت ہو، تم معارج کو اس کا درد بھلا دو گی۔ تم اس کی ساتھی بنو گی، اس کی محبت، اس کی ایمان بنو گی۔”

پروفیسر نے جیسے ہی مینسا کا نازک ہاتھ معارج کی لرزتی ہتھیلیوں میں تھمایا، وقت کی سانسیں تھم گئیں، گویا آسمان کی وسعتوں میں بھی ایک لمحہ ٹھہر گیا ہو۔ جب ان کی انگلیاں ایک دوسرے کے لمس سے پہلی بار آشنا ہوئیں تو ایک عجیب سا ارتعاش معارج کے وجود کے اندر دوڑ گیا۔

وہ لرزتا ہوا دل کی بے قابو دھڑکنوں کو قابو میں لانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ نظریں جب اٹھائیں، تو مینسا کی گہری بھوری آنکھوں میں چھپی ہوئی کہانیوں کا ایک دریا بہتا نظر آیا، پلکیں گویا ان نگاہوں کے ساحل پر حسرتوں کا پہرہ ادا رہی تھیں۔

معارض کی روح کو جیسے ایک کھینچاؤ محسوس ہوا، ایک ایسا جذبہ جو الفاظ کے دائرے میں قید ہونے سے قاصر تھا۔ مینسا کی آنکھوں میں کوئی ایسی اسراریت تھی جس نے معارج کے دل میں بے چینی کو جنم دیا، لیکن یہ بے چینی ایک سکون سے لپٹی ہوئی تھی، گویا کوئی خفیہ راز تھا جو مینسا کی آنکھوں میں چھپا ہوا تھا۔

مینسا کے لمس میں وہ مضبوطی تھی جیسے کوئی وعدہ، کوئی ایسا عہد جسے توڑنا ناممکن ہو۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت میں ایک نرمی بھی تھی، جیسے وہ اپنی پوری زندگی کا یقین اس لمحے میں سوئپ رہی ہو۔ معارج کی نگاہوں میں نمی تھی، ایک ایسا بوجھ جو شاید الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ لمحہ ایک بے انتہا گہرائی کا حامل تھا، جیسے آسمان کے کنارے پر کھڑا کوئی انسان دور کی دھند میں کچھ ایسا دیکھ رہا ہو جو قریب نہیں آسکتا، لیکن اس کا وجود اُسی دھند کا حصہ بن جاتا ہے۔

مینسانے اپنی پرسکون آنکھوں سے معارج کو تسلی دینے کی کوشش کی، ایک ایسی تسلی جو الفاظ سے بالاتر تھی۔ پروفیسر تراب کی آنکھوں میں ایک گہری بصیرت جھلک رہی تھی، گویا ان کے پاس ہر سوال کا جواب تھا، لیکن وہ الفاظ میں ڈھلنے سے معذور تھے۔ ایک آخری نظر میں پروفیسر بولے۔

۔ ”معارج، یہ مینسا ہے، تمہاری بیوی۔ مینسا، یہ معارج ہے، تمہارا شوہر۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنا، محبت کرنا، اور وفادار رہنا۔“

وہ مینسا کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا، لیکن اس کی گہرائیوں میں اسے ایمان کی آنکھوں کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے مینسا کی نگاہوں کے عکس میں کہیں ایمان کا سایہ بس رہا ہو، ایک ایسا سایہ جس کی موجودگی نے معارج کے دل میں چھپی یادوں کو بیدار کر دیا تھا۔

فدقی آنکھوں میں ایمان کی تصویر ایک دفعہ پھر نمودار ہوئی، اور اس کے دل کی سوئی ہوئی داستانیں پھر سے جاگنے لگیں۔

وہ آنسو جو برسوں سے دل کے دریاؤں میں قید تھے، اچانک سے اس کی آنکھوں کے کناروں پر چھلکنے لگے۔ ایمان، جس کی یاد ہر دھڑکن میں زندہ تھی، مگر جس کا وجود صحرا میں موجود پھول کی طرح مر جھا چکا تھا۔ وہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے معارج بھول نہیں سکا تھا، نہ کبھی بھول سکتا تھا۔

مینسا کا ہاتھ، جو اس کی انگلیوں میں سردی بن کر ٹھہرا ہوا تھا، معارج کو جیسے کسی اور دنیا میں لے گیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے وہ یہاں نہیں تھا، اس کی روح کسی اور مقام پر قید تھی، ایمان کی محبت کے سائے میں۔ وہ مینسا کے پاس موجود ہوتے ہوئے بھی، درحقیقت ایمان کا اسیر تھا۔

مولوی نے جب مہر کے بارے میں پوچھا تو خاموشی چھا گئی۔ مینسا کی نظریں جھکی رہیں، پھر اُس نے مدہم مگر پُر عزم آواز میں کہا، ”میرا مہر؟ صرف ایک چادر اور تہجد کی نماز، وہ بھی معارج کے ساتھ۔“

یہ سن کر معارج کا دل دہل گیا، کہ ایک لڑکی نے ایسی پاکیزہ چیز مانگی تھی۔ پروفیسر تراب مسکرائے، اور بولے، ”یہ جہیز نہیں، یہ تو بہترین نعمت ہے۔ چادر، جو تمہیں دنیا کے سرد طوفانوں سے بچائے گی، اور نماز، جو تمہیں اللہ کے قریب رکھے گی۔“

نکاح خواں نے مینسا سے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ سوال کیا، ”کیا آپ معارج سلطان سے نکاح، ایک چادر اور تہجد کی نماز بطور مہر قبول کرتی ہیں؟“ مینسا، جس کا چہرہ نقاب میں لپٹا ہوا تھا، تین بار کانپتی اور لرزتی آواز میں گویا ہوئی، ”ہاں، مجھے قبول ہے۔“ اس کے الفاظ میں اعتماد کی جھلک تھی، مگر ساتھ ہی ایک غیر محسوس خوف بھی پوشیدہ تھا۔

اس کی آواز میں خوشی کی ہلکی سی جھٹکار تھی، مگر اندرونی اضطراب بھی صاف عیاں تھا۔ اس نے یہ جملہ امید کی ایک نازک ڈور کو تھامتے ہوئے کہا، جیسے دل میں کسی انجان مسرت کی جستجو تھی، لیکن ساتھ ہی خوف کا دھواں بھی اس کے ارد گرد گہرا تھا۔

وہ معارج سے نکاح قبول کر رہی تھی، وہ ہی معارج جو اُس کے دل کی گہرائیوں میں بسا تھا، لیکن جس کی محبت ابھی تک کشمکش کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔

مینسانے دعا کی کہ شاید وقت معالج ثابت ہو اور معارج کے دل میں اُس کے لیے محبت اُجاگر ہو جائے، کہ شاید وہ اُس کی شخصیت کو اس کے حقیقی روپ میں جانچ سکے، اُس کی خوبیوں کا اعتراف کر سکے، اور اُسے اُس مقام تک پہنچا سکے جس کی وہ خواہاں تھی۔

مینسانے دل سے اس بندھن کو قبول کیا، اور پروفیسر تراب کے علم و حکمت پر بھروسہ کرتے ہوئے اللہ سے التجا کی کہ وہ اس رشتے میں برکت ڈالے، انہیں خوشیاں عطا کرے، اور وفاداری کی دولت سے نوازے۔

معارج سے بھی وہ ہی سوال پوچھا گیا، لیکن جیسے الفاظ اُس کے کانوں میں ٹکراتے ہوئے بکھر گئے۔ ایمان کا چہرہ اُس کے سامنے آگیا، وہ ہی ایمان جو اُس کی روح کا حصہ تھی، مگر جس کا وجود اُسے چھوڑ چکا تھا۔

اُس کے کانوں میں لڑکی کا نام اور اُس کے ساتھ جڑا ہوا نام گونجا، لیکن معارج کی آنکھوں میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ وہ خاموش کھڑا تھا، جیسے یہ الفاظ اُس کی سماعت سے ٹکرائے ہی نہ ہوں، یا پھر ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ چہرے پر ایک غیر مرئی سکوت چھایا رہا، جس نے ہر احساس کو اپنے اندر دفن کر لیا تھا۔

مینسا کی آنکھوں میں ایک غیر یقینی سوال چمکنے لگا۔ آخر معارج کی اس بے حسی کی وجہ کیا تھی؟ وہ اُس کی جانب دیکھتی رہی، جیسے اس کے پتھر اُٹے ہوئے چہرے کے پیچھے چھپے رازوں کو کھوج رہی ہو۔ دوسری طرف، سندس کی حیرت ہر گزرتے لمحے میں بڑھتی جا رہی تھی؛ وہ بے یقینی کے عالم میں تھی کہ کیسے اُس کا نام معارج کے دل میں کوئی ہلچل نہ پیدا کر سکا۔ معارج کا بے تاثر چہرہ جیسے ایک دیوار تھی، جس کے پیچھے چھپے جذبات کی گہرائی کو کوئی چھو نہیں سکتا تھا۔

معارج نے آنکھیں موند لیں، اور ایمان کا سراپا اُس کی آنکھوں کے سامنے ابھر آیا۔ اُس نے زبردستی، جیسے دل پر بوجھ رکھتے ہوئے، آہستگی سے کہا، ”ہاں، مجھے قبول ہے۔“ اس کی آواز میں سرد مہری اور بے بسی کا عکس نمایاں تھا۔ اُس نے اس جملے کو یوں ادا کیا جیسے دل کی گہرائیوں سے نہیں، بلکہ محض ایک فرض نبھانے کے طور پر کہا ہو۔

اُس نے یہ کلمات غم و اندوہ میں لپٹے ہوئے کہے، جیسے کوئی بوجھ اٹھا رہا ہو جو اس کے بس سے باہر ہو۔ اس کے دل میں ایک ندامت کا احساس بھی تھا، کہ وہ ایک ایسے رشتے کو قبول کر رہا ہے جسے وہ دل سے نہیں چاہتا۔

اس نے دل میں دعا کی کہ اللہ اسے معاف کرے، اسے راہ دکھائے، اور اُسے اس آزمائش سے نکالے۔ اُسے یقین تھا کہ پروفیسر تراب کی نیت نیک تھی، اور اُن کا علم و تجربہ اُس سے کہیں زیادہ تھا۔

مولوی صاحب نے انہیں میاں بیوی قرار دے دیا، اور دعا کے کلمات ادا کیے۔ انہوں نے اس نئے سفر کی خوشیوں کے لیے دعائیں کیں اور پروفیسر تراب کی مغفرت کے لیے آسمان کی جانب ہاتھ بلند کیے۔

معارض کی روح کی گہرائیوں میں کہیں ایمان کی یادیں اور محبت کا بوجھ ابھی بھی ہلکورے لے رہا تھا، جبکہ مینسا خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے، اپنے دل میں اُمید کا دیا جلانے کھڑی تھی کہ شاید یہ رشتہ اُس کی زندگی میں روشنی اور محبت کا پیغام بن کر آئے۔

پروفیسر تراب کے لبوں پر ایک پرسکون مسکراہٹ ابھری، اور انہوں نے نہایت شکر گزاری سے کہا،
”الحمد للہ، میں اپنے دل کی گہرائیوں سے خوش ہوں۔ میری آنکھوں نے اپنے بچوں کو نئی زندگی کا آغاز کرتے دیکھا، میں نے اپنے فرض کی ادائیگی کی، اپنی تمام ترکوششیں وقف کیں۔ اب مجھے کوئی ملال نہیں، کوئی خوف نہیں۔ میں اپنے مالک کے حضور جانے کے لیے تیار ہوں، اس فانی دنیا کو ترک کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔“

انہوں نے معارج اور مینسا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، ”میرے بیٹے، میری بیٹی، میں تم دونوں سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ مجھے تم پر فخر ہے اور تمہاری کامیابیوں پر دل کی گہرائیوں سے خوشی محسوس کرتا ہوں۔ تم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کا خیال رکھو، محبت اور وفا کے رشتے کو مضبوط رکھو، ایک دوسرے کا ادب و

احترام کرتے ہوئے زندگی بسر کرو۔ خوش رہو، وفادار رہو، شاکر بنو۔ تمہاری زندگی ایک ہو، تم ایک دوسرے میں مکمل ہو جاؤ۔”

پھر ان کی نگاہ سندس اور حیدر کی طرف اٹھی، انہوں نے نہایت محبت سے کہا، ”میری بیٹی، میرے داماد، میں تم دونوں سے دل کی گہرائیوں سے پیار کرتا ہوں۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ اللہ تمہاری زندگی میں برکت ڈالے اور تمہاری راہیں ہموار کرے۔ ایک دوسرے کا ساتھ نبھاؤ، محبت کو زندگی کا محور بناؤ۔”

انہوں نے بہرام اور شانزہ کی طرف رخ کیا اور نرم لہجے میں کہا، ”بہرام، میری بھانجی بہت نازک ہے، کبھی اس کو دکھ نہ دینا۔ تم دونوں اپنے بچوں کی پرورش نیک نیتی سے کرو، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔”

اس کے بعد انہوں نے حاشر اور نور کی طرف دیکھا، اور دل سے شکریہ ادا کیا، ”میرے دوست، میری بہن، میں آپ دونوں کا دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں۔ آپ کی دوستی، آپ کی محبت اور سخاوت نے میری زندگی میں انمول مقام پایا ہے۔ میرے بیٹے کو اپنی بیٹی دینے پر آپ کا شکریہ۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے، آپ کی زندگی میں برکت اور حفاظت فرمائے۔”

پروفیسر تراب کی نگاہیں پھر کمرے میں موجود تمام احباب پر گئیں، اور انہوں نے نہایت عاجزی کے ساتھ کہا، ”میرے بھائیو، میری بہنو، میں آپ سب سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ

آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہے، میری خوشیوں اور غموں کے شریک رہے۔ اللہ آپ سب پر رحم فرمائے، آپ کو سلامتی عطا کرے۔”

پھر ان کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں اور دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کو پکارا، ”یا رب العالمین، میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، تیری عبادت میں زندگی گزاری ہے۔ ہر نعمت اور ہر آزمائش پر تیرا شکر گزار ہوں۔ اس زندگی پر تیرا احسان ہے، اور اب اس موت پر بھی تیرا شکر بجالاتا ہوں۔ میرے گناہوں کو معاف فرما، میرے اعمال کو قبول فرما اور میری خطاؤں پر درگزر فرما۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ تیرے آخری رسول ہیں۔”

پروفیسر تراب نے آنکھیں بند کیں اور نہایت خشوع و خضوع سے کہا، ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔”

یہ جملہ ان کے لبوں سے ایسے نکلا جیسے زندگی کا خلاصہ ہو، جیسے ایک بندہ مومن کا آخری اظہار محبت ہو۔ ان کی آواز میں سکون تھا، امید تھی، عاجزی تھی، لیکن ساتھ ہی خود اعتمادی اور فخر کی جھلک بھی۔ ان کی آخری گفتگو میں وفا اور شکر گزاری کی بوباس تھی، محبت اور آرزو کی نرمی تھی۔ اور پھر، وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، ایمان کی روشنی میں ڈوب کر۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہو گئے، اور اگلے جہان کی روشنیوں میں خوش آمدید کہے گئے۔ محبت کے ساتھ اس دنیا کو چھوڑا اور اُسی محبت کے ساتھ عالم بالا میں قدم رکھا۔

پروفیسر تراب لے گھر میں مینسا چیری بلاسم کے درخت کے نیچے ایک بیج پر بیٹھی تھی۔ ہوا کے ساتھ درخت کے گلابی پتے نرم نرم بارش کی طرح نیچے گر رہے تھے۔ ہر پتا اپنے لطافت بھرے رقص میں فضا کو معطر کر رہا تھا۔

بیج کے سامنے سیمنٹ کے زینے تھے بیج کے نیچے سے پانی دریا کی شکل میں بہتا ہوا، زینوں سے ٹکراتا ہوا ایک چشمہ تشکیل دے رہا تھا۔ پانی کی آواز کا مدھم نغمہ ماحول میں سکون اور خاموشی کو مزید گہرا کر رہا تھا۔ مینسا نے سیاہ ریشمی عبا یا اوڑھا ہوا تھا، جو نہایت نفاست کے ساتھ اس کے جسم اور بالوں کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھوں میں قرآن مجید کھلا تھا، وہ مقدس کتاب کی تلاوت کر رہی تھی، دل کی گہرائیوں سے سکون اور رہنمائی کی طلب میں۔ پروفیسر تراب کی وفات کو چالیس دن بیت چکے تھے، لیکن ان کی یادیں مینسا کے دل پر چھائی ہوئی تھیں۔

اسی لمحے، اس نے اپنی نظریں اٹھائیں تو معارج کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ سفید رنگ کی قمیض شلوار میں ملبوس تھا، شانے پر ایک مردانہ شال لپیٹے ہوئے، پاؤں میں پشاوری چپل، اور اس کی آنکھوں میں ایک خاص گہری کیفیت تھی۔

پاکستانی لباس میں بھی وہ اس قدر دلکش اور وجیہ لگ رہا تھا کہ سویڈش ہونے کے باوجود اس کی شخصیت میں ایک مکمل پاکستانی پن چھلک رہا تھا۔

معارض زینے چڑھ کر مینسا کے سامنے رکا اور مودبانہ انداز میں کہا، ”مینسا، کیا میں آپ سے کچھ بات کر سکتا ہوں؟ کیا یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“۔

مینسا نے قرآن پاک کو بند کر کے اپنی جھولی میں رکھا اور نرمی سے سر ہلا کر اسے بیٹھنے کی اجازت دی، ”ضرور، سن رہی ہوں، بتائیے۔“۔

معارض نے دھیمی آواز میں کہا، ”گھر جانے سے پہلے، میں آپ سے کچھ وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔“۔ مینسا نے آنکھوں میں تجسس بھر کر پوچھا، ”کیا وضاحت؟“۔

معارض نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا، ”آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ سے شادی اپنے استاد کی خواہش کی وجہ سے کی ہے، جو میرے لیے والد کی مانند تھے، ٹھیک؟“۔

مینسا نے سر ہلایا اور کہا، ”جی، مجھے معلوم ہے۔“۔

معارض کی آنکھوں میں ایک عجیب سی تھکاوٹ چھلک رہی تھی، ”اور آپ کو معلوم ہے کہ میں ایمان سے محبت کرتا تھا، اور کرتا رہوں گا، ٹھیک؟“۔

مینسا نے دوبارہ سر ہلایا اور کہا، ”ہاں، میں جانتی ہوں۔“۔

معارض کی آواز دھیمی اور دلگیر تھی، ”اور آپ جانتی ہیں کہ میں اس کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتا، ٹھیک؟“۔

مینسا کے چہرے پر بے نیازی کا ہلکا سا سایہ آیا، اس کی نظر میں ایک گہری سنجیدگی تھی۔ ”جی، میں جانتی ہوں۔“۔

اس دوران ہوا میں رقص کرتی تتلیاں ان کے ارد گرد منڈلا رہی تھیں۔ گلابی چیری بلاسم کے پتے ان پر گر رہے تھے، جیسے فطرت بھی ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کی گواہی دے رہی ہو۔

معارض نے مینسا کی طرف دیکھا، اس کی چمکدار غزالی آنکھیں جو پردے سے جھلک رہی تھیں، اس کے دل میں ایک ہلچل پیدا کر رہی تھیں۔ ”میں جانتا ہوں کہ آپ نے میرے جذبات کی قدر کی ہے، اور میں بھی آپ کا احترام کرتا ہوں۔ لیکن ایمان کے بغیر، میں کچھ نہیں ہوں۔“۔

مینسا نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”میں آپ کے جذبات کو سمجھتی ہوں، معارج۔ میں آپ سے یہ توقع نہیں کرتی کہ آپ ایمان کو بھول جائیں گے، نہ ہی میں چاہتی ہوں۔ میں بس یہ چاہتی ہوں کہ آپ میرے ساتھ انصاف کریں، اور مجھے ایک موقع دیں۔“۔

معارض نے حیرت سے پوچھا، ”کس چیز کا موقع؟“۔

مینسا کی آواز میں ایک نرمی اور معصومیت تھی، ”آپ کی زندگی میں اپنا مقام پانے کا۔“

فضا میں تتلیاں مزید قریب آرہی تھیں، ان کے پروں کا ہلکا سا ارتعاش معارج کے دل کو چھو رہا تھا۔ مینسا کے انداز میں ایک مخصوص نرمی اور خلوص تھا، جو معارج کو بے حد متاثر کر رہا تھا۔

مینسا نے سنجیدگی سے کہا، ”میں جانتی ہوں کہ آپ ایمان سے محبت کرتے ہیں، اور میں اس محبت کی بازگشت میں اپنی جگہ نہیں دیکھتی۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے ایک موقع دیں۔ میں آپ کی بیوی ہوں، اور میں چاہتی ہوں کہ آپ کے ساتھ محبت اور رفاقت کا رشتہ قائم ہو، جیسا کہ نکاح کے بندھن میں بندھے دو لوگوں کا ہوتا ہے۔“

معارج نے کچھ لمحے خاموشی میں گزارے، اس کی آنکھوں میں حیرت اور غور و فکر کی لہر دوڑ رہی تھی۔ تتلیاں اب ان کے قریب ہو کر ان کے گرد گھوم رہی تھیں، جیسے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا حصہ بننا چاہتی ہوں۔

۔ ”آپ واقعی ایسا چاہتی ہیں؟“ معارج کی آواز میں بے یقینی تھی۔

۔ ”ہاں، معارج۔ میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، آپ کی بیوی، آپ کی ساتھی بننا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ آسان نہیں ہوگا، لیکن میں اللہ پر ایمان رکھتی ہوں، اور ہم دونوں پر یقین رکھتی ہوں۔“

مینسا کی آواز میں بچکتی اور اعتماد تھا۔

معارض نے گہری سانس لی، ”میں نہیں جانتا کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔ کیوں کہ میں ایمان کو نہیں بھول سکتا۔“

مینسا نے نرمی سے کہا، ”آپ کو ایمان کو بھولنے کی ضرورت نہیں، معارج۔ میں صرف چاہتی ہوں کہ آپ مجھے ایک موقع دیں، ایک رشتہ نبھانے کا، اور ہم دونوں کے درمیان محبت اور اعتماد کا پل بنانے کا۔“

فضا میں چیری بلاسم کے پتے پھر سے گرنے لگے، اور تتلیاں ان کے گرد مسلسل رقص کرتی رہیں۔ مینسا نے معارج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”آپ کو صرف کوشش کرنی ہے، معارج۔ اور میں یقین دلانے کے لیے تیار ہوں کہ یہ کوشش ہمیں کامیابی کی طرف لے جائے گی۔“

معارض نے گہری نظر مینسا پر ڈالی، جیسے اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا، ”مجھے آپ کو گھر لے جانا ہے، مینسا۔“

مینسا نے نرمی سے جواب دیا، ”میں خود آ جاؤں گی، آپ فکر نہ کریں۔“

معارض نے اس کی طرف دیکھا اور کہا، ”آپ میری بیوی ہیں، میری ذمہ داری ہیں۔ جب آپ آنا چاہیں گی، تو میں یہاں ہوں گا۔“

مینسانے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”او کے ہو گیا جیسا آپ چاہیں۔“ پھر وہ مزید باتیں کرتے رہے، اور فضا میں تتلیاں ان کے گرد رقص کرتی رہیں۔

...°...

آسمان پر سیاہی میں لپٹا چاند آہستہ آہستہ اپنی دودھیاروشنی زمین پر بکھیر رہا تھا، ستارے جھرمٹ میں چمک رہے تھے، اور ہوا میں پھولوں کی مہک اور پُر سکون خاموشی کا لمس تھا۔

اس رات کی گھمبیر خاموشی میں، فطرت گویا سکون کی چادر اوڑھے سو رہی تھی، سوائے اس جادوئی لمحے کے جو جیسے منجمد ہو گیا تھا۔

معارج نے اپنی گاڑی گھر کے قریب ایک ویران گوشے میں کھڑی کی، جہاں درختوں کے سرسبز سائے رات کے سحر میں لپٹے ہوئے تھے۔ وہ حیران تھا کہ مینسا بغیر بتائے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے خود کو دھیمّا کیا، سوچا کہ جب اس کا دل چاہے گا، وہ خود لوٹ آئے گی۔ لیکن اس لمحے نے اسے چونکا دیا، جب اس کی نظر اوپر چھت پر ہلکی سی روشنی پر پڑی۔ جیسے کوئی پرانا چراغ ٹمٹما رہا ہو، یا موم بتیاں جھلملا رہی ہوں، وہ روشنی اسے کسی آتش فشاں کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

تجسس میں گھرا، وہ زینے چڑھتے ہوئے اوپر گیا۔ چھت کا دروازہ کھولا تو وہ دم بخود رہ گیا۔ چھت ایک سحر انگیز باغ میں بدل چکی تھی، جہاں ننھے قمقمے روشنی کی ہلکی کرنوں کے ساتھ ایک جادوئی ماحول تخلیق کر رہے تھے۔

ہوا میں لٹکا ہوا جھولا ہلکے جھونکوں کے ساتھ جھوم رہا تھا، اور پہاڑوں کا سایہ چاند کی روشنی میں ایک خوابناک سیلیویٹ بنائے کھڑا تھا۔ قریب ہی آبشار کی مدھم گونج تھی، جو فطرت کی لوری سناتی ہوئی بہہ رہی تھی۔

لیکن مینسا جس کی پشت معارج کی جانب تھی۔۔ وہ سفید فراک پہنے، جھولے پر بیٹھی تھی۔ اس کے فراک کی کلیاں ہوا کے ساتھ جھوم رہی تھیں، اور گولڈن گوٹے اور موتیوں کے کام سے سچی اس کی لباس کی قبا چاندنی رات میں ستاروں کی مانند جھلملا رہی تھی۔

اس کا مجینڈہ شفون کا دوپٹہ، جس پر سنہری منڈلے بنے ہوئے تھے، اس کے نازک کندھوں پر ہلکے سے دھیرے دھیرے لہرا رہا تھا۔

ہوا میں شہد رنگ بالوں کی لہریں اور دوپٹے کے سائے مینسا کے گرد خوابناک حصار بن رہے تھے، اور وہ کسی دیو مالائی شہزادی کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

جگنو جو اس کے گرد جیسے کسی مقدس ہالہ میں اڑ رہی تھیں، اس منظر کو مزید مسحور کن بنا رہی تھیں۔

معارض کے دل میں جذبات کا ایک طوفان سا اٹھا۔ وہ اس حسن کی تاب نہ لاسکا اور جیسے اپنی ہی سوچوں میں گم ہونے لگا۔ وہ خود کو اس لائق محسوس نہیں کرتا تھا کہ وہ مینسا کے اس قرب کا حقدار ہو۔ وہ اپنے ماضی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اس ماضی کے جو دھندلا سا سہی، مگر اس کی زندگی میں غموں کے نقوش چھوڑ چکا تھا۔

جب وہ جانے کو مڑا تو اچانک ایک مانوس سی آواز نے اسے روکا۔

۔ ”معصومیت کے دنوں میں میرا نام تھا ایز کئیل،

پھر دنیا کی سختیوں نے مجھے بنادیا گوناوار،

اور اب محبتِ الہی میں، میں معارج سلطان۔“

لمحہ جیسے ٹھہر گیا۔ ہر چیز جیسے ماضی کے پردوں میں چھپ گئی ہو، کائنات کی گردش رک گئی، وقت کا پہیہ معطل ہو گیا۔ وہ پتھر کا مجسمہ بن گیا، ایک ساکت تصویر، جس میں زندگی کی رمت باقی نہیں تھی۔

اُس کی آنکھوں میں خون جیسے جم گیا ہو، جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی جو اُس کے احساسات کو مفلوج کر چکی تھی۔ یہ آواز مینسا کی نہیں تھی، یہ تو ایمان کی تھی — ایمان، جو اُس کے دل کے کونے کونے میں بستی تھی، جس کی محبت نے اُس کے وجود کو منور کیا تھا اور جدائی نے اُس کو ایک تاریک گہرائی میں دھکیل دیا تھا۔

اُس نے آہستہ سے رخ موڑا، جیسے کسی قید خانے کے زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو۔ دل کی دھڑکنیں جیسے تھم گئیں، وقت کے قافلے نے جیسے ایک لمبی سانس لی اور ہر چیز جمود کی چادر میں لپٹ گئی۔ کائنات کی گردش رک چکی تھی، سیارے جیسے اپنی جگہ منجمد ہو گئے تھے، اور فضا میں ایک گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

اُس کی فندق رنگ آنکھوں میں حیرت کی لہر دوڑ گئی، یہ چہرہ وہ ہی تھا، وہ ہی آنکھیں، وہ ہی بال، لیکن... لیکن یہ ایمان کیسے ہو سکتی تھی؟

وہ ایمان جسے وہ برسوں پہلے کھو چکا تھا، وہ محبت جو اُس کی روح میں گہرائی تک جڑیں پکڑ چکی تھی، اور وہ ہی محبت جو اُس کی بیوی بن کر اُس کے وجود کا حصہ بن چکی تھی۔ لیکن کیا یہ ایمان تھی یا مینسا؟۔

اُس کے قدم زمین میں جیسے جڑ پکڑ چکے تھے۔ وہ ہوا کی مانند ہلکا محسوس کر رہا تھا، جیسے ہوا کی تیز لہروں میں وہ تنکے کی مانند بے قابو ہو گیا ہو۔ اُس نے چراغ کی مدھم روشنی میں اُس چہرے کو دیکھا، یہ چہرہ اُس کے ہر خواب کا محور تھا، ہر سانس کی دھڑکن تھی۔

وہ ہی آنکھیں جنہوں نے اُس کے دل کے ہر گوشے کو مسخر کر لیا تھا، اور وہ ہی بال جو ہوا کے ساتھ ہلتے ہوئے اُسے خوابوں کی دنیا میں لے جاتے تھے۔

اُس کا دل جیسے ایک لمحے کو دھڑکنا بھول گیا۔ ہر چیز تھم گئی، وقت جیسے اُس لمحے میں قید ہو گیا ہو۔ اُس کی آنکھیں حیرت میں پھیل گئیں، وہ کچھ کہنے سے قاصر تھا، اُس کے لبوں پر خاموشی کا پہرہ تھا۔ وہ صدمے، حیرانی، اور محبت کی مثلث میں قید تھا۔ وہ جذبات جو اُس نے برسوں سے دفن کر رکھے تھے، وہ لہر کی مانند اُس پر چڑھ دوڑے۔

اُس نے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ کوئی خواب ہے، کوئی گمراہ کن خیال۔ لیکن جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو وہ ہی چہرہ اُس کے سامنے تھا، وہ ہی مسکراہٹ جو اُس کے خوابوں کو حقیقت سے زیادہ قریب لاتی تھی۔

وہ ہی مسکراہٹ جس نے اُس کے دل کے اندھیروں کو روشنی میں بدلا تھا، اور وہ ہی مسکراہٹ جس کی بدولت اُس کا دل پھر سے زندہ ہو گیا تھا۔

وہ کانپتے قدموں سے اُس کی طرف بڑھنا شروع ہوا، جیسے اُسے خوف ہو کہ کہیں وہ دھواں بن کر ہوا میں تحلیل نہ ہو جائے۔ اُس کے دل میں بے یقینی کی ایک طوفانی کیفیت تھی، جیسے وہ حقیقت اور خواب کے درمیان کھڑا ہو۔

اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے چہرے کی جانب بڑھایا، ہولے سے، نرمی سے، جیسے اُس کے لمس سے کچھ نازک شے بکھر جائے گی۔

اُس نے اُس کے لبوں کو چھوا، وہ لب جو گلاب کی پنکھڑیوں سے بھی زیادہ نرم اور نازک تھے۔ وہ لمحہ اُس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا، جیسے وہ ایک پرانے خواب کا حصہ ہو۔

اچانک اُس نے اپنے ہاتھ کو پیچھے کھینچ لیا، گویا کوئی انجان خوف اُس کے دل میں سرسرا نے لگا تھا کہ اگر وہ لمحہ بھر اور رک گیا، تو یہ منظر بھی تحلیل ہو جائے گا۔ اور جیسے ایمان اُس کے باقی خوابوں کی طرح دھوئیں کی صورت میں بکھر کر فضا میں گم ہو جاتی تھی، آج بھی اُسی طرح فضا کی گہرائیوں میں چھپ جائے گی۔

اُس کی نظریں اُس کی ستواں ناک پر جا ٹھہریں، جس پر ہلکا سا نگ چمک رہا تھا، جیسے کسی آسمانی ستارے کی جھلک ہو۔

وہ مسکرا رہی تھی، اُس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی خاموش خوشی تھی، جیسے وہ اُس کے حیران تاثرات کو دیکھ کر اندرونی طور پر محفوظ ہو رہی ہو۔

پھر اُس نے دھیرے سے اُس کا نام پکارا، ”ایمان... مینسا...“ اُس کی آواز میں ایک گہرا کھنک تھا، ایک سرگوشی جو وقت کے دھارے میں تیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ”یہ تم ہو؟“

ایمان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی، جیسے وہ اُس کے ہر سوال کا جواب اپنے خاموش لبوں میں رکھتی ہو۔ اُس نے ایک قدم اُس کی طرف بڑھایا، اور اُسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا، جیسے یہ لمحہ ہمیشہ کے لیے ٹھہر جائے۔ اُس نے نرمی سے اُس کے گال پر بوسہ دیا، جیسے یہ کسی خواب کا لمحہ ہو، اور پھر سرگوشی میں کہا، ”میں زندہ ہوں، میں تمہاری ہوں۔ یہ میں ہی ہوں تمہاری ایمان معارج سلطان کی ایمان۔“

یہ الفاظ اُس کے دل میں تیر کی مانند اتر گئے۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور اُسے محسوس کیا، جیسے یہ لمحہ ہمیشہ کے لیے اُس کے دل میں نقش ہو گیا ہو۔

پہاڑوں کی وادیوں میں گونج پھیل گئی، چراغوں کی روشنی جھلملا گئی، اور آبشاروں کے نغمے بلند ہو گئے۔ جیسے قدرت خود بھی اس ملاپ پر خوشی منارہی ہو، جیسے یہ محبت کائنات کے ہر ذرے میں رچ بس گئی ہو۔

معارض نے اپنے گال کو چھوا جہاں ایمان کے نرم لبوں کا لمس ابھی بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اُس کے وجود میں عجیب سی گرمی دوڑ گئی، ایک ایسی لہر جو برسوں سے سرد ہو چکی تھی۔ وہ شخص جس سے سب خوف کھاتے تھے، جسے چھونے کی کسی کو ہمت نہ تھی، آج اُسے کوئی چوم چکا تھا۔

وہ حیران تھا، جیسے اُس کے اندر ایک طوفان برپا ہو گیا ہو، آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت تھی۔ اُس نے سر جھکایا، اور جھجکتے ہوئے، سوالیہ انداز میں ایمان کی طرف دیکھا، ”کیا یہ واقعی تم ہو، ایمان؟“۔

ایمان نے ہنس کر کہا، ”کیوں؟ کیا میرا چہرہ تمہاری موم میری سے میل نہیں کھا رہا؟“ اُس کی ہنسی میں ایک عجیب سی معصومیت تھی، ایک راز کی گونج، جیسے وہ پہلے سے ہی سب کچھ جانتی ہو۔ وہ ابھی تک حیرت کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا، یہ سوچ کر بھی سوال نہ کر سکا کہ اُس نے اُس کی خفیہ باتوں کا کیسے پتہ لگالیا۔

”ہاں... یہ وہی چہرہ ہے، جیسے میری موم کا تھا۔“ اُس کی آواز میں ایک مدہم سی لرزش تھی۔

ایمان نے سر ہلایا، نرم لہجے میں بولی، ”تو پھر شک کیسا؟“ اُس کی آنکھوں میں محبت کی چمک تھی، اور اُس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو دل کی گہرائیوں کو چھو رہی تھی۔

معارج کے اندر ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ آگے بڑھا اور اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ شدت جذبات سے لرز رہا تھا، اور آنسو اُس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ ”ایمان... تم زندہ ہو!“ اُس کی آواز میں خوشی اور غم کی ایک عجب کشمکش تھی۔ اُس کی آنکھیں محبت اور حیرت کے پانیوں سے نم تھیں، دل کے اندر جذبات کا سمندر اُبل رہا تھا۔

ایمان نے نرمی سے اُس کی پشت پر ہاتھ پھیرا، اُس کے بالوں کو پیار سے سہلایا، جیسے اُسے پر سکون کر رہی ہو۔ ”تم بہت خوش ہو، مجھے دیکھ کر۔“ اُس کی آواز میں ایک نرم سی چمک تھی، جیسے وہ اُس کے جذبات کو محسوس کر رہی ہو۔

۔ ”خوش؟“ اُس نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی ہنسی میں کہا، ”یہ ظلم ہے! میں کب سے تمہیں تلاش کرتا رہا، اور تم جانتے بوجھتے مجھے ستاتی رہیں۔“ اُس کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ تھی، لیکن اُس کی آنکھوں میں غم کی لہر صاف دکھائی دے رہی تھی۔

ایمان نے اُس کی پیٹھ تھپتھپائی، ”اگر تمہیں بغیر کسی محنت کے سب کچھ مل جاتا، اگر میں بھی یوں ہی تمہارے دامن میں آگرتی، تو شاید میری قدر تمہاری نظروں میں نہ ہوتی۔ میں نے تمہیں یہ درس دیا ہے

کہ محبت کو کیسے سنبھالا جاتا ہے۔ میں نے تمہارے دیدوں میں اپنی قیمت بڑھائی ہے، تاکہ تمہیں میری حقیقی اہمیت کا شعور ہو۔“

اُس کے الفاظ میں ایک گہری دانائی تھی۔

۔ ”تم بالکل درست کہہ رہی ہو،“ وہ مسکراتے ہوئے بولا، ”تم جیسی کوئی بھی نہیں، اور تمہارے جیسی باتیں بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ جو کچھ تم سوچتی ہو، وہ کوئی دوسرا سوچنے کا حوصلہ بھی نہیں کر سکتا۔ جو کچھ تم کرتی ہو، وہ کوئی اور کر بھی نہیں سکتا۔ کیوں کہ تم ایک انمول خزانہ ہو، اپنی مثال آپ ہو۔ اور تم میری ہو۔“

ایمان نے اُس کی چھیڑ کو محسوس کرتے ہوئے جھوٹ موٹ کا غصہ دکھایا، ”اور تم میری جاسوسی کرتے ہو؟ اور میرے خراٹے سنتے ہو؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولا،

۔ ”تمہارے خراٹے میرے لیے لوری تھے، جیسے سرسبز جنگلوں میں بہتی ہوا کی ایک مدھرتان ہو، جیسے محبت میں گندھا کوئی دھیماسانغمہ جو دل کو بہلا دے۔“

دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے رہے، جیسے وقت کا پہیہ اُن کے لیے رک گیا ہو۔ ایمان نے شرارت سے کہا، ”اب کیا تم یہاں کھڑے رہ کر مجھے ہمیشہ کے لیے گلے لگائے رکھو گے؟ یا چھوڑو گے بھی؟ دیکھو، میں نے ہیل پہنی ہوئی ہے اور پھر بھی تمہاری چھ فٹ سات انچ کی دیوار کے سامنے سٹول پر کھڑی محسوس ہو رہی ہوں!“۔

وہ ہنس پڑا، ”کاش! یہ لمحہ ہمیشہ کے لیے ٹھہر جائے اور ہم ہمیشہ اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔ مجھے ایسی راحت اور سکون پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا۔“۔

اُس نے پھر کہا، ”اب میں جان چکا ہوں کہ جب بھی تم میرے قریب ہوتی تھیں، میرا دل کیوں بے قابو ہو جاتا تھا۔ یہ تم ہی تھی، مینسا نہیں، ایمان تھی۔“۔

ایمان نے ہنستے ہوئے کہا، ”میرے ہاتھوں بے وقوف بننے کا تجربہ کیسا رہا؟“۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا، ”اگر یہ تمہارے ہاتھوں بے وقوف بننے کا نتیجہ ہے، تو میں ہمیشہ تمہارے ہاتھوں بے وقوف بننے کو تیار ہوں اور کبھی شکایت بھی نہیں کروں گا۔“۔

ایمان نے ہنستے ہوئے کہا، ”واہ بھائی! تم کب سے اتنے فیاض ہو گئے؟“۔

وہ شوخی سے بولا، ”تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے تم مجھے بہت جانتی ہو۔“۔

ایمان نے چھیڑتے ہوئے کہا، ”ہاں ہاں! میں تمہاری ’آل سینگ ون آئی‘ ہوں، مجھے تمہارے ہر راز کا پتہ ہے!“۔

”اچھا؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا، ”تو یہ آنکھ کا فنکشن کب سے ہے اور کہاں ہے؟“

ایمان نے مسکراتے ہوئے آنکھ دبائی اور ہنسی، ”وہ گھڑی جو تم نے اُس عورت سے منگوائی تھی...“۔

وہ حیرت سے پیچھے ہٹ گیا اور ایمان کو مبہوت ہو کر دیکھنے لگا۔

ایمان نے اپنی دائیں آنکھ ہلکے سے دبائی، ”استادوں کے ساتھ استادی اچھی نہیں ہوتی!“۔

وہ مسکراتے ہوئے اُس کی حیرانی کو دیکھ کر بولی، ”جس کھیل کو تم، گونار صاحب، اپنی چالاکی سمجھ کر کھیل رہے تھے، اُس کی اصل ملکہ تو میں ہوں۔“۔

معارض جو متعجب تھا، دفعتاً مسکرایا۔ اُس کی آنکھیں ہنوز نمناک تھیں، مگر اشک خشک ہو چکے تھے۔ ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی طویل مدت تک مضحل یا غمگین نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ بلاشبہ مسرت

کے آنسو تھے، معارج کی روح میں امنگ اور طمانیت کا ظہور تھا۔ اب اُس نے دل کی گہرائیوں سے ایک حقیقی ہنسی کے ساتھ سکون کا سانس لیا۔

- ”تم میری حیات کے افق پر دمکتی وہ درخشاں ملکہ ہو جس کی حکمرانی میرے دل کی سلطنت پر ہمیشہ قائم رہے گی۔ تم میری حیات کی معنویت ہو، میرے قلب کی سلطانہ، جو ہمیشہ سے میری قسمت کا حصہ رہی ہو اور ہمیشہ رہو گی، معارج کے عالم کی ملکہ۔“

...°...

وہ دونوں جھولے پر آلتی پالتی مارے ایک دوسرے کے روبرو تھے، ہاتھ ایک دوسرے میں پیوست، اور آنکھیں ایک دوسرے کی گہرائی میں گم۔ اس لمحے میں ایک ایسا احساس تھا جسے بیان کرنا ممکن نہیں تھا، ایک ایسا بندھن جو الفاظ کے پار تھا، اور ایک ایسی محبت جو تقدیر کے فیصلوں سے ماورا تھی۔ معارج نے نرمی سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا، ”تمہیں سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟ میرے بارے میں کیسے جانا؟“

ایمان نے شیریں ہنسی کے ساتھ اس کی ناک کی ہلکی سی چٹکی بھری، اور اس کا چہرہ اپنے نرم ہاتھوں میں لے لیا۔ ”شاید یہ قسمت میں تھا یا مجھ سے کچھ چھپا نہیں رہ سکتا“۔ اس نے شانے اچکائے۔

اس کے لہجے میں شوخی اور بے انتہا محبت کا ملاپ تھا۔

معارج نے بھی ہلکی سی مسکان کے ساتھ کہا، ”یہ تو میں اب میں جان چکا ہوں۔“

ایمان تھوڑی اور قریب آگئی، اس کی سانسیں معارج کے کانوں سے ٹکرار ہی تھیں، وہ سرگوشی میں بولی،
”بتاؤ، تم چاہتے ہو کہ تمہیں ساری کہانی سناؤں؟ شروع سے یا مختصر؟ یا تمہیں فلیش بیک کے ساتھ سفر پر
لے چلوں؟“

معارج اس کی سرگوشی اور نزدیکی سے کانپتے ہوئے مسکرا اٹھا، اور اسے مزید قریب کرتے ہوئے بولا،
”فلیش بیک!“

ایمان کی شرارتی آنکھیں چمک اٹھیں، اس کے لبوں پر ایک لطیف مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”کسی نے کہا
تھا کہ بعض چیزیں راز میں رکھنا ہی بہتر ہوتا ہے،“ اس نے نرمی سے کہا۔

معارج نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے محبت سے جواب دیا، ”لیکن یہ بات تم پر صادق
نہیں آتی، تم ہر حقیقت جاننے کی حقدار ہو، جیسے میں سننے کا مستحق ہوں۔“

ایمان نے مسکراتے ہوئے اس کے گال پر ہلکا بوسہ دیا، ”اور تم ہر سچائی سننے کے لائق ہو۔“ اس نے ذرا
توقف کیا، پھر اپنی کہانی شروع کی۔

”وہ دن جب میری ویڈیوز اچانک سوشل میڈیا پر وائرل ہو گئیں... اور اگلے دن، جیسے کسی نامعلوم قوت
کے زیر اثر، ان ویڈیوز کو حذف کر دیا گیا۔“

ایمان قمیض شلوار میں ملبوس، کھڑکی کے پاس بیڈ پر بیٹھی، دور خلا میں گھور رہی تھی۔ باہر شام کی دھندلی روشنی ہر منظر پر بکھر چکی تھی، اور خاموشی کا ایک عجیب سا حصار تھا جو اس کے ارد گرد چھا چکا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور جیسے کسی نہ ختم ہونے والے بوجھ کو اپنے کندھوں سے اتارنے کی کوشش میں، آہ بھر کر کہا، ”اف یار...“۔

اس نے نرمی سے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا، جیسے تھکن کو دھکیلنا چاہ رہی ہو، اور ہنستے ہوئے خود پر طنز کیا۔ ”ایک چیز رہ گئی تھی، شکریہ مونیٹر کا، جس نے میری ویڈیوز ڈیلیٹ کروائیں۔ میں تو اس مولوی سرور کے شاگرد کے چکر میں بھول ہی گئی تھی کہ اسے کال کر کے شکریہ ادا کر دوں۔“۔

امم ہم نہیں... جا کر شکریہ ادا کروں گی، کال پر نہیں۔“۔

وہ جیسے کوئی گہری سوچ میں ہو، ہونٹ بھینچتے ہوئے ہلکا سا ”امم ہم“ کہتی ہے، جیسے وہ بے دھیان ہو اور ذہن کے کسی گوشے میں چلنے والے خیال کو لفظوں میں قید نہ کر سکے۔

وہ اچانک بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی سے چپل میں پیر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے، وہ تیز رفتاری سے سوچوں میں گم ہو گئی۔ وقت گزر رہا تھا، جیسے ہر لمحہ اس کے اندر موجود اضطراب کو مزید ہوا دے رہا ہو۔ کچھ دیر بعد، وہ مونیٹر کے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچی، دروازے کو نیم کھلا پایا تو اس نے ہلکا سا دھکیل کر اندر جھانکا۔ اندر مونیٹر کی آواز سنائی دی، جو ویڈیو کال پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

وہ بے اختیار دروازے کے قریب ہو کر سننے لگی، ”ہاں، گونار نے ایمان کی ویڈیوز ہر جگہ سے مٹا دی ہیں، ورنہ ہم انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔ وہ اسے پسند کرتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے۔“

ایمان کے بدن میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ دھوکہ دہی کا بوجھ اس کے وجود پر کچوکے لگا رہا تھا۔ ”یہ گونار کون ہے؟“ اس کا ذہن سوالات سے بھرا ہوا تھا۔ ”میں اسے جانتی بھی نہیں، تو وہ مجھ سے محبت کیسے کر سکتا ہے؟“ غصے اور بے بسی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مونیز کی آواز پھر سنائی دی، ”مجھے نہیں سمجھ آتی کہ اس ایمان میں ایسا کیا ہے جو ہر مرد اس کے پیچھے ہے۔“

ایمان کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں بھڑکنے لگیں، اس کے جڑے تن گئے اور مٹھیاں بھینچ گئیں۔

یہ ایمان کی خوش بختی کا مظہر تھا کہ مونیز اُس وقت اپنے اپارٹمنٹ میں موجود تھا، جس کے سبب نگران کیمرے غیر فعال تھے، ورنہ اسے فوری طور پر علم ہو جاتا کہ ایمان اس کے آستانے پر قدم رکھ چکی ہے۔ گویا تقدیر کی کوئی نادیدہ طاقت اس لمحے ایمان کے حق میں مائل بہ کرم ہوئی تھی، ورنہ یہ راز طشت از بام ہو جاتا۔

مونیز کا مکروہ جملہ پھر اس کے کانوں میں گونجا، ”گونار جیسا ہیئنڈ سم اور غیر معمولی انسان؟ میں نہیں سمجھتا وہ ایمان میں کیا دیکھ رہا ہے، جو عورت ہو کر بھی مردوں کی خصلت پالے ہے!“

ایمان کا دماغ غصے کی شدت سے جلنے لگا۔ اس کے لب کانپنے لگے اور اندر ہی اندر وہ چیخنے لگی،

۔ ”تم مرد ہو کر مردانگی کے نام پر بدننامی کا دھبہ ہو، منحوس! کم از کم میں اپنی جنس کا انکار کر کے مردانگی کا نالک نہیں کرتی۔ مجھے اپنے وجود اور نسوانیت پر فخر ہے، لیکن تم جیسے کم ظرف اور ذہنی خبطیوں کے لیے یہ بات سمجھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ احمق!“۔

وہ قدم پیچھے ہٹاتی ہوئی تیزی سے اپارٹمنٹ سے نکلی اور وہیں سے ٹیکسی میں واپس بیٹھ گئی۔ وہ اب اپنے کمرے میں تھی، دروازے کے قریب پہنچی اور اسے زور سے لاک کر دیا۔ خود سے بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگی، ”یہ گونا پرانا نار کون ہے؟ مجھ سے محبت کر رہا ہے؟ سامنا ہو تو اس کا چہرہ بگاڑ دوں، آنکھیں نکال کر ہاتھ میں دے دوں۔“۔

وہ اپنے کمرے میں چکر کاٹتی رہی، غصے میں سرخ ہوتی ہوئی، جیسے اپنے اندر ایک طوفان کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ”گونا...“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا، ”یہ عجیب نام والا انسان کون ہے؟ یہ پتہ تو مونیز سے ہی کرنا پڑے گا۔“۔

اس نے ناخن چبانا شروع کر دیے، اور کمرے میں بے چینی سے گھومتی رہی۔

معارض ایک زور دار تہقہہ لگا کر بولا، ”اچھا، گوناہ انار!“ وہ دوبارہ ہنسا، ”اور تم میری آنکھیں نکالتی، ہاں؟“۔

ایمان کی ہونٹوں پر ایک دلکش مسکان پھیل گئی، ”وہ تو اس لمحے کی بات تھی، اب تو مجھے تمہاری آنکھیں کچھ زیادہ ہی پسند آگئی ہیں۔“۔

معارض نے ایک نگاہ آسمان کی جانب اٹھائی اور بولا، ”شکر ہے، اے رب العالمین، کہ آپ نے مجھے مولا جٹنی کے وار سے محفوظ رکھا!“۔

ایمان نے ہنستے ہوئے کہا، ”کیا؟ مولا جٹنی؟“۔

اب وہ گوناہ نہ تھا، بلکہ معارض تھا، ایک بدلا ہوا انسان، جس کی ناک پر کبھی غضب کا عالم رہتا تھا، اور آنکھوں میں سختی کی لہر دوڑتی تھی۔ مگر ایمان کے سامنے وہ کسی اور ہی شخصیت کا عکس بن گیا تھا، بہت مختلف، بہت ہی الگ۔

ایمان نے دوبارہ بات شروع کی، ”اور ہاں، یاد ہے جب ہم اُس ریسٹوران میں تھے؟ وہ عورت مجھ سے آٹکرائی تھی، اور میرا موبائل چکنا چور ہو گیا تھا۔ اُس نے فوراً اصرار کیا کہ میں اس کا موبائل لے لوں۔ حیرت کی انتہا تھی! پاکستان میں کوئی مفتی میں اپنی ناک کا بال نہ دے، اور وہ عورت اپنا قیمتی فون مجھے دے رہی تھی؟ یار، سمجھ نہیں آئی!“۔

ارے، اس ملک میں جہاں لوگ اپنی جیب سے مکھی بھی نہ اڑائیں، وہاں وہ اتنی فراخ دلی سے اپنا فون پیش کر رہی تھی؟ وہ تو جیسے امیر لوگوں کی اماں لگ رہی تھی! اور یہ وہ ہی امیر لوگ ہیں جو دوسروں کی جیبیں کاٹنے کے ماہر ہیں، پر اُس دن اُس نے مجھے اپنا فون دے دیا، اور میرا دماغ وہیں جام ہو گیا۔۔۔”

ایمان نے گہرا سانس لیا اور ہلکی مسکان کے ساتھ کہا،

۔“میں نے اُس عورت کا موبائل لے لیا، اور بدلے میں وہ گھڑی اُس کے حوالے کر دی، جو دراصل میں نے مویز کے مخفی عزائم کی بھنک لینے کے لئے خریدی تھی۔ ایک نہایت باریک خفیہ چپ سے مزین، جو اُس کے ہر پوشیدہ ارادے کا پردہ چاک کر دیتی۔ مگر دیکھو تقدیر کا عجیب کھیل، کہ وہ ہی گھڑی بالآخر تمہارے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔

اور ماسٹر مائنڈ گونار، جنت کا انار، تمہاری تدبیریں بھی کچھ ایسی ہی تھیں، ہیں ناں؟ تم یہ سمجھتے رہے کہ اس موبائل میں موجود چپ سے تم میری گفتگو سن رہے ہو۔ لیکن تم تو بس وہ ہی سنتے رہے، جو میں نے تمہیں سنانا چاہا۔”

وہ زور سے ہنسی اور ہاتھ ہلایا۔

۔“خیر، چھوڑو، آگے بڑھتے ہیں۔”

اس کی آواز میں خوش مزاجی تھی،

۔“ اور پھر وہ رات، جب جنگل کی خاموشیوں میں وہ چار سیاہ پوش نمودار ہوئے تھے، اور تم نے میری حفاظت کے پیش نظر اپنے آدمی بھی بھیج دیے تھے۔ یہ امر واضح ہو چکا تھا کہ تم مؤئیز کے سیاہ ارادوں کی گہرائیوں کو بھانپ چکے تھے۔

میں نے تمہارے محافظوں کو درختوں کے عقب میں چھپے دیکھا، اور اُس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ یہ اجنبی کون ہیں اور کیوں یہاں موجود ہیں؟ لیکن بعد ازاں حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی کہ یہ تو وہ محافظ تھے جنہیں تم نے میری سلامتی کے لئے متعین کیا تھا۔”

وہ لمحے بھر کے لیے رکی، اور معارج کی طرف دیکھتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے بولی، “شکریہ... بہت بہت شکریہ۔”

پھر اس نے بات جاری رکھی، “یاد ہے، جب تم نے مؤئیز کو دھمکی بھری کال کی تھی؟ اور اس کے بعد، جب میں اس کے گھر گئی فائلیں چرانے کے لیے، تو میں نے ایک تصویر دیکھی جس پر تمہارا نام درج تھا۔ وہ لمحہ تھا جب میں نے پہلی بار تمہیں پہچانا تھا، اور اس لمحے کی طاقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔”

ایمان نے نظر جھکائی، پھر مسکراتے ہوئے گویا ہوئی، “اور تب میں نے تمہارے وجود کی گہرائی کو محسوس کیا، ایک ایسا راز جس نے میری دنیا کو بدل دیا۔”

سابقہ منظر کی بازگشت۔۔

اس کے ذہن میں وہ تمام لمحے بجلی کی تیزی سے گزرنے لگے جب مونیہ خود کو مظلوم اور عورتوں کے حقوق کا علمبردار ظاہر کرتا تھا۔ ”یہ شخص، جو عورت ہونے کا دعویدار تھا، ایک بھیڑیے کی مانند معصوم بچیوں کی زندگیوں سے کھیل رہا تھا۔“

اس کی سانسیں بھاری ہو گئیں، دل جیسے دھڑکنا بھول گیا ہو۔ وہ سچ جو اس کے سامنے تھا، اس کا سامنا کرنے کے لیے اس کی ہمت جواب دینے لگی تھی، مگر اس نے خود کو سنبھالا۔

ایمان نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے تلخی سے کہا، ”میں نے پہلے ہی کہا تھا، عورت کا روپ دھارنے سے کوئی عورت نہیں بن جاتا، یہ بھی ان ہی دو غلے مردوں جیسا نکلا۔ دو ٹکے کا گھٹیا انسان، جو عورت کا تقدس نہ سمجھ سکا۔“

اس نے خود کو ملامت کرتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا، ”کہاں کہاں میں اس بے غیرت کے ساتھ نہیں گئی، ہر قدم پر اس کے ساتھ رہی۔ مگر یہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، اس کی کیا اوقات تھی اگر کچھ کرنے کی جرأت بھی کرتا تو ویسے ہی ذلیل ہوتا جیسے اُس رات مارگلہ کی پہاڑیوں پر اس کے کتے اپنی موت کا سامنا کر رہے تھے۔“

وہ لمحہ بھر کورک کر گہری سانس لینے لگی، پھر غصے سے تھر تھراتی آواز میں بولی،

- ”یہ تو پہلے ہی بے ضمیر تھا، مگر آج تو درندگی کی تمام حدیں پار کر گیا۔ کتنا پست، کتنا بے غیرت نکلا! یہ اس قابل ہی نہیں کہ انسان کہلایا جائے۔“

لحظہ بھر میں اس نے بیگ اتار کر ٹیبل پر رکھا اور جلدی سے فائلوں کو بھرنا شروع کر دیا۔ ہر فائل، ہر کاغذ جیسے کسی خونی راز کی دستاویز تھی۔ اسے پرواہ نہیں تھی کہ ان میں کیا کیا راز چھپے ہیں، وہ ہر ایک ثبوت کو اکٹھا کرنا چاہتی تھی تاکہ دنیا کو مونیز کی اصلیت دکھا سکے۔

ایک فائل پر نظر پڑتے ہی، اس نے بے اختیار اسے کھولا۔ مگر جو کچھ اس میں دیکھا، وہ اس کے حواس پر بجلی کی طرح گرا۔ وہ اپنے قدم پیچھے ہٹانے لگی، جیسے کوئی زہریلا سانپ اس پر جھپٹنے والا ہو۔

فائل کی طرف بغور نظریں جمادیں، جیسے اُس کے صفحات میں کوئی گہری راز پوشیدہ ہو۔ اُس فائل کے اندر موجود تصویر پر اُس کی نگاہ ٹک گئی۔ وہ شخص جسے دیکھ رہی تھی، ایک عجب حسن و دلکشی کا پیکر تھا، ویسا شخص اُس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ گونا گونا تھا۔

اُس کی نگاہیں، پلک جھپکنے کا نام نہ لے رہی تھیں، جیسے اُس کی روح کو اُس تصویر میں قید کیا جا چکا ہو۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ جانتی نہیں تھی کہ اُس شخص میں ایسی کیا بات ہے جو اُسے بے ساختہ کھینچ رہی تھی۔

تصویر کے اوپر لکھی ہوئی تحریر نے اُس کی توجہ مزید کھینچ لی۔ نام ”گونا“ اُس کے ذہن میں چمکنے لگا۔ وہ خاموشی سے سوچتے ہوئے بولی، ”خوبصورت تو ہے، اور معصوم بھی نظر آ رہا ہے۔ کیا یہ واقعی میری محبت کے لائق ہو سکتا ہے؟“۔

یکدم گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک نے اُس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ چونکی، جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ گئی ہو۔ خود کو جھنجھوڑتے ہوئے، اپنے کندھوں کو سکیڑ کر بیزار لہجے میں بولی، ”یہ تو محض خیالات ہیں، کوئی مرد میرے ساتھ اپنا نام کیسے جوڑے گا؟ وہ بھی جس کے ساتھ دوبار جنسی تشدد کا المیہ گزر چکا ہو۔“۔

اُس کے لبوں پر تلخی آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی، شانے اچکائے، اور بے پرواہی سے کہنے لگی، ”جیسے مجھے کوئی پرواہ ہے، یا میں اس بات پر مرے جا رہی ہوں۔“

فائل کو دوبارہ بیگ میں رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ”کیا یہ سب جانتا ہے ایسا کیسے ہو سکتا ہے،“ اس نے خود کو سختی سے جھنجھوڑا، لیکن اس کے قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ مشن کا ہر قدم طے کرنا ضروری تھا۔

بیگ کو کندھے پر دوبارہ لٹکاتے ہوئے، ایمان نے ایک آخری بار اس خفیہ کمرے پر نظر ڈالی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور اسے دوبارہ تالا لگا دیا۔

امروز۔۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا، ”تم نے جان بوجھ کر میری فائل چھپائی تھی،؟“ اس کی آواز میں ایک نرمی مگر حیرانی تھی اسے ایمان پر فخر محسوس ہوا۔

ایمان کی آنکھوں میں شرارت اور تعریف کی چمک تھی، وہ بھی مسکرا دی۔ ”ہاں، کیوں کہ میں جان چکی تھی کہ تم اپنے گناہوں کا اعتراف کر چکے ہو اور مسلمان ہو چکے ہو۔ تب ہی جب ان لوگوں نے، جنہیں میں نے فائل دی تھی، تمہارا نام پوچھا کہ مونیٹر کس کے لیے کام کرتا ہے، میں نے خود کو انجان ظاہر کر دیا اور تمہارا نام گونار سے انار کر دیا، تاکہ تم محفوظ رہو۔“

وہ ایک ایک سوال کرتا جا رہا تھا، اور وہ اُسی روانی سے جواب دیتی جا رہی تھی۔ ”اور یہ بتاؤ، تمہیں مجھ سے محبت کیسے ہوئی؟“ اُس کی نظریں محبت اور عقیدت سے بھری ہوئی تھیں، جیسے دل کے کسی نہاں گوشے میں چھپی ہر بات زبان پر آنے کے لیے بے تاب ہو۔

ایمان کی نظریں حیا کی شدت سے جھک گئیں، مگر دل کی گہرائیوں سے اُٹھتی محبت کی لہر اُس کے لبوں پر ایک خاموش مسکراہٹ بن کر بکھر گئی۔ اُس نے آہستگی سے معارج کے چہرے کو چھوا، گویا اُس کی انگلیوں سے اپنے جذبات کی سچائی کو بیان کر رہی ہو۔

معارج نے اُس کے ہاتھ کو نرم لمس کے ساتھ تھام لیا، اور اُس پر اپنے لبوں کی محبت بھری مہر ثبت کر دی۔ پھر اُس کے نازک ہاتھ کو اپنے سینے کے قریب کھینچ لیا، جیسے اُس کے دل کی دھڑکن کو اپنے وجود کے قریب تر کر رہا ہو۔ اس لمس کی گہرائی اور خلوص نے ایمان کے دل میں وہ کیفیت بھر دی کہ آنکھیں بے اختیار آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

وہ اپنے جذبات کو قابو کرنے کی ناکام کوشش میں الجھی رہی، مگر اُس کی لرزتی انگلیاں اُس کے دل کی بے چینی کا احوال سن رہی تھیں۔ ہر سانس میں محبت کی شدت اور ہر لمس میں ایک بے نام پیغام تھا، جو دونوں کے درمیان خاموشی کے پردے میں پنہاں تھا۔

۔۔ ”جب مجھے اپنے باپ کی اصلیت کا پتہ چلا اور انسٹا پر وہ پیغام ملا، میں جذبات کے بھنور میں اتنی گرفتار تھی کہ کچھ سمجھے بغیر موبائل کے سامنے سب کہہ گئی۔ تمہارا موبائل بھی وہیں تھا، ٹرائی پر رکھا ہوا۔ بعد

میں مجھے پچھتاوا ہوا، لیکن اس وقت میرے دل میں تمہارے لیے محبت نہیں تھی۔ فرق نہیں پڑا کہ تم نے سب سن لیا تھا، لیکن پھر بھی تم نے مجھ سے کنارہ کشی نہیں کی۔ آہستہ آہستہ مجھے تمہاری طرف کھنچاؤ محسوس ہونے لگا۔”

اُس نے گہرا سانس لیا، اور نگاہیں دوبارہ معارج پر مرکوز کیں،

۔“جب تم نے مجھے تلاش کرنا شروع کیا، تو وہ انجانی کشش آہستہ آہستہ محبت کے رنگ میں ڈھلنے لگی۔ تم وہ پہلے شخص ہو جس نے میری ظاہری موجودگی کے بغیر، صرف میرے وجود کی سچائی کو محسوس کر کے مجھ سے اس قدر گہری محبت کی۔ تم نے میرے ماضی کی تلخ حقیقتوں کو نظر انداز کیا اور میرے ہر عیب کو یوں اپنا لیا، جیسے یہ تمہارا مقدر ہو۔ تم نے میری سیاہ راتوں کا بوجھ بھی اُسی خاموشی سے برداشت کیا، اور میری ہر کمزوری کو اپنی محبت میں پناہ دے دی۔”

اُس کی آواز لرز گئی، وہ مزید کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہوئے رک گئی۔ جذبات کا بوجھ اُس کے لبوں کو بند کر گیا۔

معارج نے آہستہ سے ایمان کی ٹھوڑی تھامی اور اُس کی نگاہوں میں جھانک کر کہا،

۔“ایمان، محبت وہ احساس ہے جو ماضی کے اندھیروں کو نہیں، دل کی روشنی کو دیکھتی ہے۔ جو لوگ تمہیں تمہاری گزرے ہوئے لمحوں سے تولتے ہیں، وہ کبھی محبت کی حقیقت تک پہنچ نہیں سکتے۔ جان لو، میں نے

بھی اپنی سچائی تمہارے سامنے بے نقاب کر دی ہے۔ یہ محبت ماضی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی نہیں، بلکہ وہ رشتہ ہے جو صرف دل کی گہرائیوں سے پروان چڑھتا ہے۔”

یہ کہہ کر اُس کی آنکھیں شرمندگی سے جھک گئیں۔

۔“فرق بس اتنا ہے کہ میں نے خود اپنے ساتھ برا کیا، جب کہ تمہارے ساتھ دنیا نے ظلم کیا۔ لیکن اب یہ سب ماضی کی باتیں ہیں، ہمارا کام ہے کہ ہم مل کر اپنے مستقبل کو خوبصورت بنائیں، کیا تم اس پر یقین رکھتی ہو؟” یہ کہتے ہوئے، اُس نے نرمی سے ایمان کے بالوں کو پیچھے کر کے اُنہیں کان کے پیچھے لگایا۔

ایمان نے افسردگی سے کہا، “اگر تمہارے ساتھ یہ سب نہ ہوا ہوتا تو شاید تم مجھ سے محبت نہ کرتے، ایسا نہیں؟” اُس کی آواز میں سوال تھا، لیکن وہ رُک گئی جیسے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

معارض اُس کا مطلب سمجھ کر مسکرایا۔ “اگر میرے ساتھ وہ سب کچھ نہ ہوتا تو میں کبھی گونا نہ ہوتا، اور اگر گونا نہ ہوتا تو تمہاری تصویر میرے پاس کیسے پہنچتی؟ جو بھی ہوتا ہے، اُس میں کوئی حکمت ہوتی ہے۔ دیکھو، اللہ نے تمہارے چہرے کو میری ماں جیسا بنایا تاکہ مجھے تم سے پہلی نظر میں محبت ہو جائے۔” اُس کے لہجے میں ایمان کا یقین بھرپور تھا۔ “یہ سب اللہ کی مصلحت ہے، اور جو بھی اُس کا فیصلہ ہوتا ہے، وہ بہترین ہوتا ہے۔”

ایمان نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں چاند اور ستارے چمک رہے تھے، اُس کی آنکھوں میں اداسی اور حیرت کا امتزاج تھا۔ ”یہ دنیا واقعی عجیب ہے، آپ کسی کے درد کو اُس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ آپ خود اُس درد سے نہ گزر رہے ہوں۔“

معارض نے ہولے سے سر ہلایا، گویا اُس کے ہر لفظ کا مطلب جانتا ہو۔ ”یہ دنیا نہ صرف عجیب، بلکہ خود غرض بھی ہے۔“

ایمان نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”تم جانتے ہو، مجھے مرد کتنے برے لگتے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں پوری مرد ذات کو ختم کر دوں، اُنہیں برباد کر دوں۔“

یہ سُن کر معارج کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی، اُسے وہ لمحہ یاد آیا جب ایمان نے دکان پر سودا خریدتے وقت اچانک پیچھے کھڑے شخص کو گھورنے پر بے باک لہجے میں ڈانٹ دیا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرانے لگا، جیسے اُس واقعے کی شوخی اور ایمان کی بے ساختگی پھر سے اُس کے سامنے زندہ ہو گئی ہو۔

۔۔ ”لیکن تم وہ پہلے شخص ہو جس سے مجھے واقعی محبت ہوئی، جب تم نے میرے لیے خود کو قربان کر دیا، اپنی فکر چھوڑ کر میری فکر کی۔ ورنہ، شادی کا تو میں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ لیکن تمہاری محبت نے میری سوچ کو بدل دیا۔ تم اچھے ہو، ورنہ مجھے تو اپنے ہی لوگوں نے دھوکہ دیا تھا۔“ اُس کی آواز کٹ گئی، تلخی سے پُر اور زخمی۔

وہ اداسی سے مسکرائی، جیسے اپنے آپ کو بہادر دکھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ”قیامت میں بھی کوئی کسی کا نہیں ہوگا، نہ بھائی، نہ بہن نہ ہی ماں باپ، نہ کوئی اور۔ میں نے تو اس دنیا میں ہی قیامت دیکھ لی ہے۔“

معارض نے نرمی سے اُس کی پیشانی چومی اور دھیمے لہجے میں کہا، ”۔

قیامت کے بعد نیک لوگوں کے لیے جنت کا وعدہ ہے، میں تمہارے لیے اس دنیا میں ہی وہ بہشت بنا دوں گا جس کا تصور تم نے کبھی نہ کیا ہوگا۔ تمہارے دل پر جتنے بھی درد کے چراغ جلے ہیں، میں اپنے پیار کی روشنی سے وہ سب مدھم کر دوں گا۔ جیسے سرسبز جنگل کی نرم ہوا سکون بخشی ہے، ویسے ہی میری محبت تمہارے دل کے ہر غم کو دھندلا دے گی۔

میں تمہارے زخموں پر ایسی مرہم رکھوں گا کہ تمہاری ہر اذیت ماضی کا قصہ بن جائے گی، اور میری وفا کا پرچم ہمیشہ تمہارے دل کی فضا میں لہراتا رہے گا۔ میری زندگی کی روشنی صرف تمہارے وجود سے ہے، اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری دنیا کو ایسے رنگوں سے بھر دوں گا، جو تم نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں۔“

ایمان نے محبت میں ڈوبی ہوئی نظروں سے اُس کی جانب یوں نگاہ کی، گویا اپنی تقدیر پر فخر کر رہی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں گہرے جذبات کی ایک ایسی پوشیدہ داستان تھی، جو زبان پر آئے بغیر ہی سب کچھ عیاں کر

رہی تھی۔ ہر پل جیسے خاموشی کے دائرے میں مقید تھا، اور اُس لمحے کی لطافت دل کی گہرائیوں میں اتر رہی تھی۔

معارض نے اُس کی طرف ایک پر خیال نگاہ ڈالی، اور پھر دل میں اتر جانے والے محبت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔ اُس کے الفاظ یوں نکلے جیسے کوئی لطیف سرگم ہو جو فضا کو مہکا دے۔ محبت کا ہر ایک لمحہ اُس خاموش سرگوشی میں پنہاں تھا، جیسے کائنات نے اِس پل کو اپنی ابدیت میں محفوظ کر لیا ہو۔

۔ ”تمہیں مجھ سے محبت کب ہوئی؟“ یہ سوال وہ بار بار دہرانا چاہتا تھا، جیسے اس کی روح کو تسکین کی تلاش تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایمان کی محبت کا اقرار سن کر دل کو اطمینان ملے کہ وہ بھی اُسے ویسی ہی شدت سے چاہتی ہے جیسا کہ وہ کرتا ہے۔ ایمان اُس کی محبت کو سمجھتی تھی اور ہر بار کے جواب میں وہی نرمی اور پیار بھرا اطمینان جھلکتا تھا۔ وہ اُس کے دہراتے سوالات سے کبھی نہیں اکتاتی تھی۔

ایمان نے مسکراتے ہوئے کہا،۔

جب تم نے محبت کا اظہار کیا، تب میں نے جانا کہ محبت کا حق دار وہی ہوتا ہے جو پہلے دل ”کھولتا ہے۔ سچی محبت اُسی سے کی جانی چاہیے جو تمہاری قدر اور وجود کی گہرائیوں کو سمجھتا ہو۔ محبت کی عظمت اُسی میں ہے جو پہل کرے، کیونکہ وہی دل کی سچائی اور وفا کا امین ہوتا ہے۔“

اُس نے نرمی سے معارج کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا، اور معارج نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”اور اگر تمہیں مجھ سے پہلے محبت ہو جاتی؟“

ایمان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ابھری، اور اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے دھیرے سے کہا،۔
فرض کرو، اگر میں پہلے محبت کا اظہار کرتی اور تمہیں کسی اور سے محبت ہو جاتی، تو شاید میں خود کو ”
قصور وار ٹھہراتی کہ یہ دل تم سے کیوں لگایا؟ کیوں کہ اُس محبت کا ملنا پھرنا ممکن ہوتا۔ لیکن اب جب تم
نے میرا ماضی جانتے ہوئے بھی مجھ سے محبت کو نبھایا، تو میں نے سیکھا کہ سچی محبت وہ ہی ہوتی ہے جو دل کی
سچائی اور وفا پر قائم رہے۔

محبت ہمیشہ اُس سے کرو جو تمہیں تمہاری حقیقت کے ساتھ قبول کرے، اور پہل کرنے کا حوصلہ رکھے۔
جو محبت میں پہل کرے، وہ ہی تمہاری اصل قدر جانتا ہے، اور اُس محبت میں کبھی جھوٹ یا فریب کی جگہ
نہیں ہوتی۔“۔

ایمان ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی، ”اب دیکھو، میں فائدے میں ہوں۔ تم میرے ماضی سے واقف ہو، میں
تمہارے ماضی سے، اور ہمارا آج دونوں کے ماضی کو قبول کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ اگر تم چاہتے تو
مجھے چھوڑ دیتے، اور میں پھر بھی مطمئن رہتی، کیوں کہ میں نے تم سے پہلے محبت نہیں کی تھی، محبت تو بعد
میں شروع ہوئی۔“ اُس نے شرارتی انداز میں معارج کو آنکھ ماری۔

معارج نے اُسے اپنی بانہوں میں مضبوطی سے بھر لیا، اُس کے دل کی دھڑکن کو اپنی بانہوں میں محسوس کرتے ہوئے بولا، ”میں تم سے محبت کرتا ہوں، ایمان۔ تم میری زندگی کا وہ چراغ ہو جو ہر اندھیری راہ کو منور کرتا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں، تمہاری زندگی کو خوشیوں سے بھر دوں گا۔“

ایمان نے اُس کی اس پاکیزہ محبت کو محسوس کیا، اور نرم مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی کی،

”میں بھی۔ اب ہم دونوں اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نئے سفر کا آغاز کریں گے، جہاں ہم ایک دوسرے کے زخموں کا مرہم بنیں گے اور دکھوں کو محبت کی طاقت سے مٹا دیں گے۔ ہماری محبت ایک ایسی روشنی بنے گی جو ہمارے ماضی کے سارے غموں کو ماند کر دے گی۔ اُس روشنی میں ہمارے سارے درد اور پریشانیاں گھل جائیں گی، اور ہم ایک دوسرے کے سہارے زندگی کی راہوں کو خوبصورت بناتے جائیں گے۔“

انہوں نے پہاڑ کی طرف نگاہ ڈالی جہاں آبشار بہہ رہی تھی، گویا اُن کی محبت کا استعارہ ہو۔ اُن کے دلوں میں سکون تھا، روحوں میں اُمید، اور زندگی میں ایک نئی خوشی نے جنم لیا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو پایا، شفا دی، اور محبت میں ڈھل گئے۔

کچھ دیر بعد، معارج سیدھا ہو کر بیٹھا اور پوچھا، ”پروفیسر تراز کو تمہارا علم کیسے ہوا تھا؟“

ایمان نے ہلکا سا مسکرا کر جواب دیا،

۔ “جب تم خانہ کعبہ کی زیارت کر رہے تھے، میں بھی وہیں موجود تھی۔ وہ لڑکی جو عبا یا میں تھی، وہ میں تھی، جس کی پشت تمہاری جانب تھی۔ پروفیسر تراب کی ملاقات مجھ سے جانہ کعبہ میں ہی ہوئی تھی، اور انہیں میرے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ مگر میں نے انہیں یہ کہہ کر روکا کہ وہ تمہیں کچھ نہ بتائیں، کیوں کہ میں صحیح وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ میری خاموشی میں ایک گہرائی تھی، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ جب میں تمہارے سامنے آؤں، تو میری محبت کی کہانی مکمل ہو چکی ہو۔”

معارض نے پھر پوچھا، “اور سندس کو کیسے پتہ چلا؟”

ایمان نے اپنے ذہن کو ٹٹولا اور کہا، “جب میں کھائی میں گری تھی، حاشا انکل نے مجھے اسپتال پہنچایا تھا۔ سندس وہاں شانزہ کے ساتھ آئی تھی اور اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ اُسی وقت سے سب کچھ جانتی تھی، لیکن میں نے اُسے منع کیا تھا کہ کسی کو کچھ نہ بتائے۔”

پھر اُسے اچانک کچھ یاد آیا اور وہ بولی، “پروفیسر تراب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں مینسا ہوں انہیں اپنی موت سے ایک دن پہلے پتہ چلا، جب وہ سندس کو مجھ سے بات کرتے پکڑ چکے تھے۔ اُس لمحے انہیں علم ہوا کہ مینسا ہی ایمان ہے۔”

معارض نے اُلجھن بھری نگاہوں سے پوچھا، “اور تم نے انہیں یہ پہلے کیوں نہیں بتایا کہ مینسا ہی ایمان ہے؟”

ایمان نے کندھے اچکائے اور ہلکے پھلکے لہجے میں کہا، ”دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ انہوں نے ہمارے نکاح کو دیکھ لیا۔ اللہ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین۔“

۔ ”تم آمین،“ معارج نے دھیماسا جواب دیا۔

معارج نے ایک اور سوال پوچھا، ”تم زندہ کیسے بچی تھیں؟ وہ شیر کی دھاڑ کی آواز، وہ کپڑے، وہ سب کیا تھا؟“

ایمان نے ہنستے ہوئے کہا، ”وہ سب ایک نظر کا دھوکہ تھا، جس میں میں ماہر ہوں۔ حالانکہ میرے گلے میں کوئلہ تھا، میری زبان بند تھی، مگر دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں نا، زبان میں آگ ہو تو دماغ چمکنے لگتا ہے۔ اور ویسے بھی میرا ایک اصول ہے: ہم تو ڈوبیں گے صنم، تمہیں بھی لے ڈوبیں گے۔ اُس دن بھی یہ ہی ہوا تھا۔“

....°....

سابقہ مناظر کی بازگشت۔۔۔

گونار سویڈن کے شمال میں اپنے کمرے میں تھا۔ کمرہ نیم اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، باہر کے آسمان پر رقص کرتی اور وہ روشنیوں نے فضا میں ایک پراسراریت پیدا کر رکھی تھی، جو کھڑکیوں سے دکھائی دے رہی تھیں۔

چھٹی کی گرمی نے سرد موسم کو قابو میں کر رکھا تھا، مگر گونار کے اندر کا طوفان کمرے کے سکون سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اُس نے سیاہ چمڑے کی جیکٹ اور سیاہ ڈریس پینٹ پہن رکھی تھی، اور ہاتھ میں وہ ہی گھڑی تھامی ہوئی تھی جو ایمان نے اس عورت کو دی تھی اور اس عورت نے آخر کار گونار تک پہنچا دی تھی۔

گونار کی آواز میں زہر بھرا تھا جب اس نے مونیز کو پکارا۔ ”ایمان اکیلی نہیں ہے،“ ”اس کے لہجے میں سردارانہ سنگینی تھی، جیسے الفاظ کی تلواریں ہوں۔

گھڑی کی چپ کی بدولت ایمان سویڈن سے آنے والی گونار کی آواز کو سن کر حیران رہ گئی یہ کیسی حیرت انگیز حقیقت تھی کہ وہ گھڑی راتوں رات پاکستان سے سویڈن کی سرزمین پر پہنچ چکی تھی۔ ایمان اپنے موبائل کی اسکرین پر اُس چپ سے موصول ہونے والے سگنلز کا مشاہدہ کر رہی تھی، جو اُس کے سامنے سویڈن کی سرحدوں سے جڑ رہے تھے۔

وہ سگنل جو درحقیقت ہزاروں میلوں کے فاصلے کو یکنخت مٹا چکے تھے، وقت اور مقام کی حد بندیوں کو پس پشت ڈال کر ایک پل میں اُسے گونار کے قریب لے آئے تھے۔

۔ ”نہ وہ کوئی عام لڑکی ہے؛ وہ میری محبت کے جوہر کا مجسم عکس ہے۔ جو بھی اُس کو گزند پہنچانے کی ناپاک جسارت کرے گا، اُسے اسی زمین پر عذاب کی ایک نہ ختم ہونے والی کھائی میں دھکیل دیا جائے گا۔ ایک ایسا جہنم جہاں ہر سانس بھاری قیمت کے ساتھ آئے گا، اور درد اُس کا ہمہ وقت ساتھی بن جائے گا۔“

گونار نے مزید کہا، اس کی آواز میں مدہم حرارت تھی، جیسے کوئی گہرا زفاش کر رہا ہو۔“

میرے وفادار، درختوں کے سائے میں چھپے، ہمیشہ تیار ہیں۔ اگر ایمان تمہارے ناپاک ارادوں میں ”رخنہ نہ ڈالتی تو تمہارا یہ سفر ہوائی اڈے کی جانب نہ ہوتا؛ بلکہ تمہاری منزل قبرستان ہوتی، جہاں چار کاندھوں پر تمہاری لاش اندھیرے کے کفن میں لپیٹی جاتی۔“

ایمان نے گونار کی محبت کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر ایک نرم مسکراہٹ بکھیری۔

”گونار، تم واقعی میرے لیے انار ہو، جنت کا میٹھا پھل،“ وہ دل ہی دل میں ہنس دی، جیسے کوئی خفیہ خزانہ پا لیا ہو۔

گونار کی مٹھی میں گھڑی اب بھی تھی، اور اُس کے ارد گرد کوئی ایسا تھا جس نے اس پر نظر رکھ رکھی تھی، مگر ایلومیناتی کا ایجنٹ ہونے کے باوجود گونار کو اس کی بھنک تک نہ تھی۔

ایمان تلخی سے بولی ”تمہیں شرم آنی چاہیے، مونیز۔ تم نے مجھے مارنے کا ارادہ کیا تھا، انتہائی بے غیرت ہو تم۔“

گونار کی وارنگ ہوا میں معلق رہی، اُس کی شدت مونیز کے دل میں ایک بر فیلی لہر بن کر دوڑ گئی۔ لیکن

And let me make this crystal clear—I “won’t succumb to the absurdity of falling for a boy. Straighten up; my role is to champion LGBTQ causes, not to be ensnared by them. Take a pause to reassess your misconceptions about me. Mark my words, the next misstep, and your path might well be paved on four shoulders, ...not your feeble two legs

ایمان نے گہری سانس لی اور ذرا اکتائی، “ارے بھائی، اردو میں بات کرونا۔ یہ انگریزی بیچ میں آکر سارا مزہ خراب کر دیتی ہے۔”

گونار کی آواز دوبارہ آئی، اب اردو میں، “ایمان، جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں، کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تم میری محبت ہو۔”

ایمان نے تلخی سے مسکرا کر موبائل دیکھا اور خود سے کہا، “تمہیں اگر میرے ماضی کا علم ہو جائے، تو شاید تم پلٹ کر بھی نہ دیکھو۔”

لیکن ایک دن گونار کو ایمان کا راز پتہ چل ہی گیا تھا۔ ایمان جذبات میں اتنا ڈوب گئی تھی کہ بھول گئی تھی کہ اس کا دوسرا موبائل ساری گفتگو ریکارڈ کر رہا ہے۔ گونار کو جب اس حقیقت کا سامنا ہوا، تو وہ پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔ وہ گونار تھا، وہ جس سے محبت کرتا، اُس سے آخری سانس تک دستبردار نہ ہوتا۔

...°...

رات کی گھمبیرت میں بادل دھاڑ رہے تھے، اور بارش کی تیز بوندیں زمین پر یوں برس رہی تھیں جیسے زمین پر غصے کا اظہار کر رہی ہوں۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، مگر ایمان کی نگاہیں اُس کھائی کی گہرائیوں میں گڑی ہوئی تھیں، جہاں نیچے موت کا گڑھا اپنے منہ کھولے منتظر تھا۔

اُس کے سامنے گینگ کا سردار خنجر ہاتھ میں لیے اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قدموں کی آوازیں بارش کی شدت میں مدھم ہو چکی تھیں، مگر ایمان کا دل ایک زہریلے عزم سے بھرا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے دل میں سرگوشی کی، ”آج اگر میں یہاں فنا ہوں گی، تو تم بھی میرے ساتھ اس گڑھے میں دفن ہو گے۔“

سردار جیسے ہی ایمان کے قریب آیا، ایمان نے جھپٹ کر اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ چالاکی سے، اپنے موبائل کو اُس کی جیب میں ڈال دیا۔

۔ پھر ایک جھٹکے سے، اُسے کھینچ کر اپنے ساتھ کھائی کی گہرائیوں میں لے گئی۔

گونار نے جو چیخ سنی، وہ ایمان کی نہیں تھی۔ یہ سردار کی آواز تھی، ایک ایسی چیخ جس میں موت کا خوف، اذیت اور ناامیدی گھل مل گئی تھی۔ ی

ہ چیخ بارش کی گڑ گڑاہٹ اور ہوا کی سرگوشیوں میں دب گئی تھی، مگر اُس کی دہشت دل دہلا دینے والی تھی۔ چند ہی لمحوں میں، چیخ تھم گئی، کیوں کہ سردار کھائی میں چھپے ہوئے بھوکے شیروں کے چنگل میں جا گرا تھا۔

یہ درندے، جو مہلک شکاری تھے، اُس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اُن کے تیز دانتوں اور بھاری پنوں نے اُس کے جسم کو چیر ڈالا، گوشت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

ہوا میں گوشت کے پھٹے جانے اور ہڈیوں کے ٹوٹنے کی خوفناک آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اور شیروں کی غراہٹ اور سردار کی بے بس گڑ گڑاہٹ کے بیچ بارش کے قطروں نے خون میں تربتِ زمین کو مزید داغدار کر دیا تھا۔ ہر طرف خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے، جو بارش میں مل کر مٹی کو سرخ کر رہے تھے۔

سردار کی آنکھیں، جن میں اب زندگی کی کوئی چمک باقی نہ تھی، آسمان کی طرف ٹکی ہوئی تھیں، جہاں بجلی کڑک رہی تھی اور آسمان چمک رہا تھا۔

ایمان زمین پر بے جان درخت کے ایک نوکیلے ٹکڑے پر گری ہوئی تھی، اُس کی سانسیں ٹوٹ رہی تھیں اور جسم میں درد کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔

وہ ٹکڑا جیسے ہی اُس کے پیٹ میں گھس کر آ رہا ہوا، اُس کا خون قطرہ قطرہ کر کے نیچے زمین پر ٹپکنے لگا، گویا اُس کے جسم سے زندگی کا آخری قطرہ بھی نکل رہا ہو۔ ہر قطرہ زمین پر پڑ کر موت کا پیغام دے رہا تھا۔

ایمان کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں، درد نے اُس کے حواس کو تاریک دھند میں ڈبو دیا تھا۔ اُس کے گرد و پیش کے منظر دھندلا رہے تھے، جیسے وہ دنیا اُس کی گرفت سے نکلتی جا رہی ہو۔ دل کی دھڑکنیں مدھم مدھم ہو کر گونجنے لگیں، اور اُس کی سانسوں کی لرزش اُس کی کمزوری کو عیاں کر رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ موت اُس کے قریب آچکی ہے، لیکن اُس کے اندر ایک آخری امید کی کرن باقی تھی۔

اُس کی دھندلی نظروں نے اُس موبائل کو تلاش کیا جو سردار کے قریب گرا ہوا تھا، اُسے یہ گمان تھا کہ شاید گونار نے اس خوفناک منظر کا ہر لمحہ سن لیا ہو گا۔ خون کی بوندیں اُس کے چہرے پر یوں محسوس ہو رہی تھیں جیسے اُن میں زندگی کی آخری رمق بھی ختم ہو رہی ہو۔ اُس کا دل اس امید پر قائم تھا کہ گونار نے اُس کی قربانی کا مطلب جان لیا ہو گا۔

ایمان کا جسم سرد ہو رہا تھا، اُس کی پلکیں بھاری ہو کر بند ہونے کو تھیں، لیکن اُس کی گرفت زندگی کے دھاگے پر آخری حد تک قائم تھی۔ اُس کی روح گویا اُس کے جسم سے نکلنے کو تھی، لیکن اُس کی آنکھوں میں اُس خوفناک منظر کی آخری جھلک محفوظ تھی۔

دریں اثنا، گونار اپنی کار میں بیٹھا ہوا ہوائی اڈے کی طرف پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔

جب اس کے کانوں میں شیر کی دھاڑ اور گوشت چبانے کی آواز گونجی تھی۔ اُس کے دل میں ایک ناقابلِ بیان خوف سرایت کر گیا تھا کہ شاید یہ ایمان تھی جو کھائی میں جا گری تھی۔ اُس نے غم، غصے اور پچھتاوے

کا بوجھ اپنے سینے میں محسوس کیا۔ اُس نے خود پر لعنت بھیجی کہ وہ ایمان کی حفاظت کے لیے وہاں موجود کیوں نہ تھا، اور اب وہ شاید اُسے ہمیشہ کے لیے کھو چکا تھا۔

گونہ گونہ کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا، اور ایمان نے اپنی ہوشیاری سے اُسے ایک ایسی حقیقت میں جکڑ لیا تھا جہاں محبت اور موت کے بیچ صرف ایک لمحے کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

ایمان جس لمحے آنکھ کھولتی ہے، اُس کی نظروں کے سامنے اندھیرے میں لپٹا ہوا آسمان نمودار ہوتا ہے۔ طوفانی بادل گرجتے ہوئے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے، بجلی کے کوندے ہر پل خوف کا طوق اس کے دل پر ڈال رہے تھے۔ بارش کی تیز بوندیں اُس کے چہرے پر مسلسل پڑ رہی تھیں، جو اُس کے خون آلود چہرے کو دھو رہی تھیں۔

اچانک، اُس نے اپنے بازو پر ایک نرم و گرم احساس پایا۔ وہ ایک سانپ تھا، جس کی نیلی آنکھیں اُس پر مرکوز تھیں، اُس کی آنکھوں میں عجیب سی سکون بخش کیفیت تھی، جیسے وہ ایمان کے درد اور اذیت کو سمجھتا ہو۔ سانپ نے اپنے وجود کو ایمان کے بازو کے گرد لپیٹ رکھا تھا، جیسے اُس کی جان بچانے کا عزم کر چکا ہو۔ ایمان نے اُس کی جانب کمزور مسکراہٹ بھیجی اور دل میں سوچا، ”شکریہ، میرے دوست۔ صرف تم نے میرا ساتھ دیا، جب کسی اور نے پرواہ نہ کی۔“

ایمان کے دل میں یہ آخری خیال چمکا تھا، جیسے وہ اپنی موت کے سامنے سکون کے ساتھ جھک رہی ہو۔ اُس نے اپنے زخموں اور درد کو چھوڑ دیا، اپنے دل سے خوف اور نفرت کو نکال پھینکا، اور جیسے زندگی کے تمام غم و پریشانیوں سے آزاد ہو گئی۔

اچانک اُس کے لاشعور میں ایک نرم اور پیار بھری آواز گونجی، جو شاید اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی تھی: ”اے عبداللہ، ڈر مت، تو نے بہت صبر کیا ہے، بہت برداشت کیا ہے۔ تو نے اپنی آخرت کی تیاری کر لی ہے۔ میں تجھے لے جانا آیا ہوں۔“۔۔ ”ایمان نے اپنے سینے میں ایک گرم جوشی اور دل میں عمیق سکون محسوس کیا۔

جیسے ہی وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی، اُس کے چہرے پر ہلکی سی گدگدی محسوس ہوئی۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو گلہریاں اُس کے جسم کے اوپر بیٹھ کر گری دار میوے چبا رہی تھیں۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی، معصوم شکلیں اُسے ایک لمحے کے لیے حقیقت سے دور لے گئیں۔ باقی گلہریاں اُس کے گرد خشک لکڑیوں کے ٹکڑے کاٹ رہی تھیں، جیسے اُسے بچانے کا کوئی عجیب طریقہ نکال رہی ہوں۔

اچانک، جیسے ہی ایک گلہری نے اُس درخت کی شاخ کو کاٹ دیا، ایمان کا جسم نیچے منہ کے بل جا گرا۔ اُس کی آنکھیں پھیل گئیں، جیسے لمحہ بہ لمحہ اُس کے سامنے سب کچھ ختم ہو رہا ہو۔ زمین پر گرتے ہی اُس نے

اپنے پیٹ کے زخم کی شدت کو پھر سے محسوس کیا۔ ایک تیز دھار لکڑی اُس کے جسم کے پار ہو چکی تھی، اور ہر سانس کے ساتھ خون کا قطرہ اُس کی زندگی کو چھین رہا تھا۔

اُس نے خود کو اُس اذیت سے نکالنے کی کوشش کی، اور بڑی مشکل سے اُس تیز لکڑی کو اپنے جسم سے کھینچ نکالا۔ خون کے دھارے اُس کے زخم سے بہہ رہے تھے، جیسے اُس کی آخری طاقت بھی ساتھ لے جا رہے ہوں۔

ایمان نے اپنے گرد لپٹے ہوئے سکارف کا ایک حصہ پھاڑ کر زخم کے گرد باندھ دیا، اُمید کرتے ہوئے کہ خون کا بہاؤ تھم جائے گا۔

اُس کا جسم کپکپانے لگا، لیکن اُس کی آنکھوں میں عزم کی چنگاری باقی تھی۔ وہ اُس ظلمت میں، پیٹ کے زخم کو نظر انداز کرتے ہوئے، خود کو اٹھانے میں کامیاب ہو گئی۔

ایمان نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا، اُس کی نظریں ہر سمت میں پھسلتی ہوئیں اس اندھیری، بارش زدہ رات میں کسی فرار کے راستے کو تلاش کر رہی تھیں۔

اُس کی سانسیں بے ترتیب تھیں، گویا موت نے اُس کے وجود پر اپنا سایہ ڈال رکھا ہو۔ کچھ فاصلے پر، لیڈر کی چیتھڑے چیتھڑے لاش پڑی ہوئی تھی، اُس کا جسم کئی جگہوں سے پھٹا ہوا، جس میں سے خون رس رہا تھا۔ اُس کے جسم کے باقیات کے ساتھ شیر کے پنوں کے نشانات صاف دکھائی دے رہے تھے،

جیسے اُنہوں نے اُس کے بدن کو چیر کر رکھ دیا ہو۔ چند ہڈیاں اور کچھ کپڑے کے ٹکڑے زمین پر بے جان پڑے تھے۔

ایمان کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کی شدید چنگاری بھڑک اٹھی۔ یہ وہ ہی شخص تھا جس نے اسے اغوا کیا تھا، اُس پر بے پناہ تشدد کیا تھا، اور اُس کے منہ میں دھکتا ہوا کوئلہ ڈال دیا تھا۔

اُس کی زبان اور حلق شدید جلن کی وجہ سے بے حس ہو چکے تھے، اور وہ بولنے کی طاقت کھو چکی تھی۔ ہر بار جب اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، اُس کے گلے سے صرف خاموشی کی کراہیں نکلیں۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اُس ظالم نے اُسے مارنے کی کوشش کی تھی، لیکن اُس کی بدنصیبی نے اُسے ناکام کر دیا تھا۔ ایمان نے اپنے جسم کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے، اپنی زخمی حالت کے باوجود، سامنے موجود درختوں کی جھاڑیوں کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کی۔ اُس کا دل خوف سے بے قابو ہو رہا تھا، اور ہر قدم اُسے موت کی دہلیز کے قریب لے جا رہا تھا۔

لیڈر کے قریب پڑے اُس کے کپڑوں کے پھٹے ہوئے ٹکڑوں پر ایمان کی نظر ٹھہر گئی۔ کچھ دیر بعد۔ اُس نے بڑی مشکل سے کپڑوں کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا دوسرا موبائل نکالا۔ اُس کی انگلیاں لرز رہی تھیں، لیکن اُس کے دل میں عزم کی چنگاری جل رہی تھی۔

اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے حاشر انکل کو میسج لکھا ”حاشر انکل، جلدی سے میرے پاس پہنچیں، میں خطرے میں ہوں۔ میں بول نہیں سکتی، میرے منہ میں انگارہ ڈال دیا گیا ہے، آواز گم ہو گئی ہے۔ شیر میرے سامنے ہے، خدا کے لیے، عورت کا لباس ساتھ لے آئیں۔“

ایمان نے میسج بھیجنے کے بعد درخت سے ٹیک لگا کر گہرا سانس لیا۔ اُس کا وجود تھکن سے چور تھا، لیکن اُس کے دل میں خوف اور کمزوری کی آمیزش ہو رہی تھی۔ اچانک اُسے چکر آنے لگے، اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

اُس نے اپنے بالوں کو ایک پتھر سے کاٹنا شروع کر دیا۔ بال، جو کبھی اُس کی عزت اور وقار کی علامت تھے، اب اُس کے وجود کی بقا کے دشمن بن چکے تھے۔

ایمان نے اپنے دل میں گہرا عزم باندھ لیا تھا کہ وہ ابھی گوناوار کے سامنے نہیں آئے گی۔ اسے ایک گہری جانچ کرنی تھی، اپنے دل کی کیفیت کو پرکھنا تھا، اور یہ یقین حاصل کرنا تھا کہ آیا وہ اُس شخص کے لیے تیار ہے جس کی محبت میں اُس نے خود کو جکڑا ہوا محسوس کیا۔ مگر ابھی اس کے لیے وقت موزوں نہیں تھا۔ اُسے پہلے اپنے اندر کے طوفان کو ٹھنڈا کرنا تھا، اپنی روح کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھنا تھا کہ کیا وہ واقعی اُس کے ساتھ رہنے کا حوصلہ رکھتی ہے، یا نہیں۔

لیکن یہ لمحہ، یہ مقام اُس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ ابھی اُس کی اولین ترجیح اپنی بقا تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گونار کے آدمی جلد ہی اُسے بچانے کے لیے یہاں پہنچ جائیں گے، اور اُسے یہ احساس تھا کہ وہ اُن کے شکنجے سے بچ نہیں پائے گی اگر وہ یہاں زیادہ دیر ٹھہری رہی۔

اُس کا دل ابھی تک اُلجھا ہوا تھا، اور وہ جانتی تھی کہ اُس کے فیصلے کی گھڑی قریب ہے، لیکن فی الحال وہ اس کا سامنا کرنے سے قاصر تھی۔

اُس کے کانوں میں موجود ہیڈ فون کی وجہ سے وہ گونار کی آواز کو صاف سن سکتی تھی جو اُس کے دوسرے موبائل کی بدولت اُس کے کانوں میں رس رہی تھی۔

ہر لفظ، ہر سانس جیسے اُس کے دل پر نقش ہو رہا تھا۔ یہ ایک عجیب سا ملاپ تھا—محبت کی کشش اور خطرے کی سنگینی۔ ایمان نے اپنی آنکھوں میں ایک چمک محسوس کی، ایک فیصلہ کی روشنی جو اُس کی تقدیر کو بدلنے والی تھی۔

ابھی نہیں، اُس نے خود سے عہد کیا، ابھی وہ گونار کا سامنا نہیں کرے گی۔ اس کے دل میں گو نجی ہوئی گونار کی آواز میں بے قراری تھی، مگر ایمان کا ارادہ اب پختہ تھا۔

وہ اس وقت تک اُس کی محبت کا جواب نہیں دے گی جب تک وہ اپنے دل کے تمام شک اور وسوسوں سے پاک نہیں ہو جاتی۔

اُس نے اپنے ائیر پوڈز نکال کر گہری سانس لی اور ایک لمحے کے لیے اُنہیں اپنی مٹھی میں مضبوطی سے تھامے رکھا، جیسے کوئی آخری یاد کو رخصت کر رہا ہو۔

پھر بے نیازی کے ساتھ اُنہیں دائیں جانب بہتے ہوئے چشمے کی جانب پھینک دیا۔ چشمے کا پانی خاموشی سے اُن ائیر پوڈز کو اپنے ساتھ بہا لے گیا، جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔

آدھے گھنٹے کے بعد، حاشر کی گاڑی اس ویران مقام پر پہنچی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس جھاڑیوں پر پڑتے ہی، گہری اندھیروں میں ایمان کی موجودگی کا احساس ہوا، وہ جھاڑیوں کے پیچھے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھی۔

حاشر کے دل میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے پیغام پڑھ کر فوراً یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا، ساتھ میں عورت کا لباس اور ایک بندوق لایا تھا، تاکہ شیروں کو دور بھاگ سکے۔ وہ جانتا تھا کہ ایمان کس طرح کے حالات میں گہری ہو سکتی ہے۔

گاڑی کے ہارن کی گونج سن کر شیر ایک لمحے کے لیے سہمے اور جنگل کی گہرائی میں غائب ہو گئے۔ حاشر نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہی ایمان کی حالت پر نگاہ ڈالی۔ اُس کا دل دہل گیا۔ ایمان کی چہرے پر مٹی اور خون کا آمیزہ تھا، اُس کی جلد جلی ہوئی تھی اور جسم پر زخموں کے نشان واضح تھے۔ بارش کی ہلکی بوندیں اُس کے خون سے لت پت چہرے پر گر رہی تھیں، اور اُسے ایک عجیب سی جلا بخش رہی تھیں۔

- ”ایمان!“ حاشر کی آواز دل دہلا دینے والی تھی، جیسے اُس کا دل اس منظر کو برداشت نہ کر پا رہا ہو۔ وہ جھٹ سے اُس کے قریب آیا اور اُسے تھام لیا، جیسے اُس کے وجود کو بچانے کے لیے آخری وقت آگیا ہو۔ ایمان نے لڑکھڑاتے ہوئے اُس کی طرف سر ہلایا، اُس کی سانسیں پھولی ہوئیں اور چہرہ بے نور تھا، مگر اُس کے ہونٹوں پر ایک کمزور سی مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو، ”میں ابھی زندہ ہوں۔“ اُس کی آنکھوں میں غم اور سکون کا ایک عجیب ملاپ تھا۔

حاشر نے کپڑوں کا گٹھا اُسے تھماتے ہوئے کہا، ”یہ لو، بیٹی۔ میں لباس بھی لایا ہوں اور تمہاری حفاظت کے لیے بندوق بھی، مگر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تمہاری یہ حالت؟“ اُس کی آنکھیں ایمان کے جلے ہوئے چہرے پر جمی تھیں، جہاں سے درد اور تکلیف ٹپک رہی تھی۔

ایمان نے اشاروں میں جواب دیا، جیسے اُس کی زبان گم ہو چکی ہو، ”یہ سب بعد میں بتاؤں گی۔“ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی روشنی تھی، جیسے وہ انتقام اور سکون کا سنگم ہو۔

حاشر نے ارد گرد نگاہ دوڑائی، اور اُس کے قدم وہیں تھم گئے جہاں لیڈر کا پھٹا ہوا، ادھورا جسم بکھرا پڑا تھا۔ ”یہ... یہ کس کے اعضاء ہیں؟“ اُس کے وجود میں سرد لہر دوڑ گئی، جیسے اُس کی ریڑھ کی ہڈی منجمد ہو گئی ہو۔

ایمان نے اُسے اشاروں میں کہا، ”جو بھی تھا جیسے اس کے کرتوت تھے ویسا انجام ہوا۔“ اُس کے اشارے میں ایک سرد مہر شجاعت تھی، جیسے وہ اس دردناک منظر کے بعد بھی فولادی ارادے کے ساتھ زندہ ہو۔

ایمان آگے بڑھی اس نے سردار کے کپڑے جو پھٹے اور خون میں لت پت تھے، حاشر کی طرف بڑھا دیے۔ حاشر نے اُنہیں ہاتھ میں لیتے ہوئے گہری نگاہ سے ایمان کو دیکھا، اُس کی آنکھوں میں بے شمار سوالات لرز رہے تھے، مگر ایمان کے چہرے پر ایک عجیب سا سکون طاری تھا، جیسے اُسے اپنے ہر قدم کا علم ہو۔

شیر سردار کا چہرہ نوچ کر چبا چکے تھے، اُس کا وجود بکھرا ہوا اور ادھورا تھا، جیسے وہاں سے زندگی کے سارے نشان مٹ چکے ہوں۔ پیچھے جو باقیات رہ گئیں تھیں، وہ صرف جالی اور بریکار تھیں، جیسے قدرت نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہو۔

یہ سب ایسا لگ رہا تھا کہ قدرت خود ایمان کے ساتھ ساز باز میں ہو، اور وہ بھی چاہتی ہو کہ اس خون آشام کھیل کا انجام کچھ ایسا ہی ہو۔ سب کچھ اس کی منصوبہ بندی کے عین مطابق تھا، جیسے موت کی تصویر میں محض ایک لڑکی ہی اپنی آخری قربانی دے چکی ہو۔

ایمان نے زنانہ لباس کے وہ ٹکڑے جو اُس نے نوچ کر پھاڑے تھے، انتہائی بے نیازی سے اس ویران مقام پر پھینک دیے۔ کپڑوں کے ٹکڑے بکھر گئے، جیسے کوئی ماضی کے راز کو ہوا میں چھوڑ رہا ہو۔

، سردار کی کٹی ہوئی کلائی اٹھائی اور اُس کی انگلیوں میں اپنی انگوٹھیاں پہنائیں۔ سردار کی انگلیاں اب زنانہ لگ رہی تھیں، جیسے کوئی پیچیدہ راز دفن کر دیا گیا ہو۔

ایمان نے اپنے بال جو کاٹے تھے، اُنہیں ہوا میں بکھیر دیے، اور بال نیچے گر گئے جہاں سردار کا۔ جسم پھاڑا گیا تھا۔

ایمان نے سردار کے گوشوں سے جھلکتی ہوئی بالیاں اتاریں، جیسے چاندنی کا زیور شب کی تاریکی میں کھو رہا ہو۔ وہ خاموشی سے اس کے کان میں اپنی نازک بالی ڈالنے لگی، جو نہایت نفیس اور انوکھے طرز کی تھی، جیسے کسی نایاب خزانے کا حصہ ہو۔

۔ وہ اپنی تدبیر کی ایک آخری کڑی باندھ رہی تھی، ایک ایسا منظر بنا رہی تھی جو کسی کو بھی دھوکا دے سکے۔

حاشر اُس کے قریب آیا، اور اُس کی آنکھوں میں سوالات کا سمندر تھا، مگر ایمان نے ایک پلک جھپک کر اُسے خاموش کر دیا، جیسے کہہ رہی ہو کہ ابھی کچھ پوچھنے کا وقت نہیں۔ ”چلیں“ اُس نے اشاروں میں کہا، اور حاشر نے فوراً گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے اُسے سہارا دے کر اندر بٹھا دیا۔

گاڑی کا انجن دھڑکنے لگا، جیسے حاشر اور ایمان کے دلوں کی دھڑکنیں ایک ساتھ تیز ہو رہی ہوں۔ وہ اُس جگہ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے گہرے اندھیروں میں گم ہو گئے، جہاں بارش کی بوندیں خون آلود زمین کو دھیرے دھیرے دھور ہی تھیں اور گاڑی کے نشان مٹ گئے۔

شیر دوبارہ اُس مقام پر لوٹ آئے تھے، جہاں سردار کی بکھری ہوئی باقیات اب تک اپنی بربادی کا قصہ سنانے کو موجود تھیں۔ انہوں نے جو بچا کچا تھا، اُسے بھی چیر پھاڑ کر نگل لیا۔ سردار کا اب کوئی نام و نشان باقی نہ تھا۔ وہ انگلیاں اور کان جو کبھی مرد کے تھے، اب ایک عورت کی پہچان بن چکے تھے۔

گونار کے بھیجے ہوئے چھ آدمی، جو اپنی بندوقوں سے لیس تھے، اُس مقام پر پہنچے۔ ان کی آمد بے وقت ہو چکی تھی۔ وہ جب وہاں پہنچے، تو شیروں کو اپنے شکار پر قابض پایا۔

انہوں نے اس منظر میں خون آلود کپڑے، عورت کی کانوں میں جھولتی بالیاں، بکھرے ہوئے بال، اور کٹے ہوئے اعضاء دیکھے، اور یقین کر بیٹھے کہ ایمان کو شیروں نے چیر پھاڑ کر کھالیا ہے۔

اُن کے دلوں میں دہشت طاری ہو گئی، اور گونار کے قہر کے خوف سے اُن کی آوازیں لرزنے لگیں۔
انہوں نے لرزتی آوازوں میں گونار کو فون کیا:

سر، یہاں تین شیر ہیں۔ انسانی انگلیاں اور ایک عورت کا جوتا، پھٹے ہوئے کپڑے، ایک کان جس ”میں
کاٹاٹک رہا ہے، اور بکھرے ہوئے بال۔ یہ ایمان ہے، سر، وہ مر چکی ہے

وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ سب ایمان کا شاطرانہ فریب تھا۔ اُس نے لیڈر کے کٹے ہوئے کان اور ہاتھ میں
اپنی بالیاں اور انگوٹھیاں پہنا دی تھیں۔۔۔

اُس نے اپنے کٹے ہوئے بال بھی اس جگہ بکھیر دیے تھے۔ ایک ایسا منظر تخلیق کیا تھا کہ ہر کوئی یہ سمجھنے
پر مجبور ہو گیا تھا کہ یہ ایمان کی لاش ہے جو شیروں کا نوالہ بن چکی ہے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ ایمان زندہ اور ہوشیار تھی، اور اپنے انکل حاشر کے ساتھ محفوظ طریقے سے وہاں سے
فرار ہو چکی تھی۔ اُس نے گونار کے آدمیوں کو بے وقوف بنایا، اور وہ واپس گونار کو یہ ہی اطلاع دینے لوٹ
گئے۔ ایمان کی چال کامیاب رہی، اُس کی ہر حرکت میں کمال کا شائبہ تھا۔

شیروں نے، جب یہ لوگ وہاں سے چلے گئے، تو جو کچھ باقی رہ گیا تھا، اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔ پیچھے نہ
کوئی لاش باقی تھی، نہ کوئی نشانی۔ سب کچھ قدرت کی رازداری میں لپٹا ہوا غائب ہو چکا تھا۔ لباس، بال، حتیٰ
کہ سردار کا وجود بھی یوں مٹ گیا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

ایمان کے گھر والوں نے اپنے طور پر کہانی تراش لی۔ کہ ایمان شراب پی کر گاڑی چلا رہی تھی، اور گاڑی ایک کھائی میں جا گری، جہاں وہ دھماکے سے پھٹ گئی، اور لاش کا نام و نشان بھی نہ ملا۔ یوں یہ داستان دفن ہو گئی، اور قانون کی نظر سے او جھل۔

یوں یہ قصہ ایک اندھی قبر کی مانند بند ہو چکا تھا، بغیر کسی سوال کے، بغیر کسی ثبوت کے۔

.....

حاشر، ایمان کو اسٹریچر پر ڈالے، طبی عملے کے ساتھ آئی سی یو کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایمان ہوش میں تھی، مگر شدید زخمی، اس کا بدن خون میں لت پت تھا۔ اسے ایک کھائی میں نیم مردہ حالت میں پایا تھا، اور حاشر نے بے تحاشہ جلدی کرتے ہوئے اُسے اسپتال پہنچایا تھا۔ اُس نے مدد کے لیے زور سے چیخ ماری تھی تاکہ اسپتال کے عملے کی توجہ حاصل کر سکے۔

سندس، جو شانزہ اور اس کے بچوں کے ساتھ طبی معائنے کے بعد لابی میں انتظار کر رہی تھی، اُس کی آواز پر چونک کر پلٹی۔ جیسے ہی اُس نے اسٹریچر پر بے ہوش ایمان کو دیکھا، اُس کا دل دہل گیا۔ ایمان کا چہرہ جلا ہوا تھا، اور پیٹ میں ایک گہرا زخم تھا جو اُس کی زندگی کو خطرے میں ڈال رہا تھا۔

۔ ”ایمان!“ سندس چیخ اٹھی، اُس کی آواز میں لرزش تھی۔ اُس نے بغیر سوچے سمجھے بھیڑ کو دھکیلتے ہوئے ان کی طرف دوڑ لگا دی۔

جب وہ قریب پہنچی تو اُس کے چہرے پر دکھ اور پریشانی کی ہزاروں داستانیں لکھی ہوئی تھیں۔

۔“حاشر انکل! یہ کیسے ہوا؟” اُس نے کانپتی آواز میں سوال کیا۔

حاشر نے سندس کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا، مگر پھر اپنے اندر کی اضطرابی کیفیت کو دبا کر سنجیدگی سے بولا،
“میرے بچے، میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔” اُس کی نگاہ ایمان پر تھی، جو شدید تکلیف میں تھی مگر پھر
بھی اپنی آنکھوں سے حاشر کو دلاسا دینے کی کوشش کر رہی تھی، جیسے کہہ رہی ہو کہ “فکر نہ کریں، میں
ٹھیک ہو جاؤں گی۔”

سندس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک ابھر آئی، اور اُس نے لرزتے لبوں سے کہا، “ایمان، تم واقعی
بہادر ہو۔” ایمان کی وہ جرأت اور استقامت دیکھ کر سندس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی عقیدت بھری
ہوئی تھی، جیسے وہ کسی عظیم محاذ پر جنگ جیت رہی ہو۔

عملے نے ایمان کو آئی سی یو میں لے جا کر دروازہ بند کر دیا۔ سندس نے بے چینی سے سوال کیا، “انکل، یہ
کیا ہو رہا ہے؟”

حاشر نے کچھ دیر سوچتے ہوئے اس کے سوال کے جواب کے ساتھ اپنا سوال بھی کر ڈالا، “بچے ایمان
ٹھیک ہو جائے تو وہ ہی تمہیں سب خود بتائے گی۔ تم یہ بتاؤ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟”

سندس نے تھوڑا حیرت زدہ ہو کر جواب دیا، ”شانزہ اور بچوں کا چیک اپ تھا، ساتھ عباس کا مسئلہ، اسے اگر بات کرو تو وہ کوئی رسپانس نہیں دیتا۔ کچھ ٹیسٹ ہونے تھے اور شانزہ کے بھی کچھ ٹیسٹ تھے، اسی لیے یہاں آئی تھی۔ اور ماموں نے کہا تھا کہ ایمان کو دیکھ کر آؤ تو مجھے اس کے گھر بھی جانا تھا۔“

حاشر کا چہرہ سوچ میں ڈوب گیا، اُس نے حیرت سے پوچھا، ”تراب ایمان کو کیسے جانتا ہے؟“

سندس نے کندھے اچکائے اور بولی، ”مجھے کچھ معلوم نہیں، شاید کوئی پرانی جان پہچان ہو۔“ اُس کی نظر آئی سی یو کے دروازے پر جمی ہوئی تھی جہاں ایمان زندگی کی آخری حدوں پر قدم رکھ رہی تھی۔

سندس نے لمحے بھر کی خاموشی کے بعد پوچھا، ”آپ نے پولیس کو اطلاع دی ہے نا؟“

حاشر نے نفی میں سر ہلایا اور دھیمی آواز میں کہا، ”نہیں، ایمان نے منع کر دیا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ وہ کیوں ایسا کر رہی ہے۔ اُس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟“ اُس کی آنکھوں میں بے بسی اور اضطراب واضح تھا۔

وہ آہ بھرتے ہوئے بولا، ”وہ کچھ چھپا رہی ہے، کوئی ایسی بات جو اُسے اور زیادہ خطرے میں ڈال سکتی ہے۔“

کافی دیر تک دونوں خاموشی سے باہر کھڑے رہے، ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہوئے، بے چین انتظار میں۔ پھر سندس کوشانزہ کا فون آیا اور وہ وہاں سے رخصت ہو گئی۔ وہ اپنی بہن اور اُس کے بچوں کے پاس واپس جانا چاہتی تھی، جو اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ جاتے جاتے اُس نے حاشر کو الوداع کہا اور ایمان کی خیریت کے لیے دعا کرتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

حاشر تنہا رہ گیا، اُس کی نظریں آئی سی یو کے دروازے پر جمی تھیں، جہاں ایمان زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔۔

ایمان موت کے سامنے کھڑی تھی جیسے کوئی فولاد کی دیوار ہو، جس پر وقت کے تیز دھار وار بھی کند ہو جائیں۔ وہ محض ایک عام لڑکی نہیں تھی، بلکہ وہ ایک داستانی کردار تھی جو موت کی سرد آغوش سے بھی زندگی کو کشید کرنا جانتی تھی۔ ایک بار پہلے بھی اس نے موت کو پاؤں تلے روند ڈالا تھا، جیسے کوئی دھندلا سایہ ہو جو اسے چھو کر بھی ناکام رہ جائے۔ اس کے اندر وہ بے باک ہنر چھپا تھا کہ جب موت نے اسے اپنی گرفت میں لینا چاہا، تو وہ اس کی انگلیوں سے پھسل کر زندگی کی روشنی میں واپس آ گئی، جیسے کوئی ستارہ جو اندھیروں میں کبھی گم نہ ہو۔

اس بار بھی، وہ ہی مضبوطی، وہ ہی یقین، اس کے وجود کی بنیاد تھی۔ ایمان نہ صرف موت کو جانتی تھی، بلکہ اسے ہرانے کا فن بھی جانتی تھی، جیسے کوئی فنکار جو اپنی تخلیق کو بار بار نئے رنگوں میں ڈھال لے۔ موت کی گہرائیوں سے زندگی کی روشنی کو کھینچ لانا اس کے لیے محض ایک معمولی چیلنج تھا۔۔۔

کچھ لمحوں کی تشویش کے بعد ڈاکٹر فرخ، جو کہ حاشر کے قدیم دوست اور ایک ماہر جراح تھے، آئی سی یو سے باہر آئے۔ ان کے چہرے پر تھکاوٹ کی لکیریں تھیں، مگر آنکھوں میں تسکین اور سکون کی جھلک نمایاں تھی۔ حاشر کی نگاہوں میں امید اور بے چینی کا سایہ واضح تھا، جیسے زندگی اور موت کے درمیان کھڑا ہو۔

۔ ”وہ کیسی ہے؟“ حاشر نے بے صبری سے فوراً سوال کیا، جیسے اس کے دل کی دھڑکن ایمان کی حالت سے وابستہ ہو۔

ڈاکٹر فرخ نے ہلکی مسکان کے ساتھ جواب دیا، ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی محبت اور تحسین کا ملاپ تھا۔ ”وہ بہت بہادر اور حوصلہ مند لڑکی ہے، حاشر۔ اُس نے جس طرح خود کو سنبھالا ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔ فکر نہ کرو، وہ اب محفوظ ہے۔“

حاشر نے شکر گزار دل کے ساتھ فرخ کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اُس کی نظریں نمناک تھیں، جیسے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ ”شکریہ، فرخ۔ تم نے نہ صرف اس کی جان بچائی بلکہ میرے دل کا بوجھ بھی کم کر دیا۔ اور پولیس کو شامل نہ کرنے کا بھی شکریہ، تمہاری دوستی ہمیشہ میرے لیے باعثِ افتخار رہی ہے۔“

فرخ کی مسکان اور گہری ہو گئی، اُس کی آنکھوں میں دوستانہ وفاداری اور بے غرض محبت کی جھلک تھی۔
”تمہاری دوستی کی قسم، حاشر۔ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔۔۔“

حاشر نے سر ہلا دیا، جیسے اپنی قسمت پر یقین نہیں ہو رہا ہو کہ ایسا دوست نصیب ہوا ہے۔ ”تم واقعی ایک
سچے دوست ہو، فرخ۔ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔۔۔“

فرخ نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ اس بات کو رد کرتے ہوئے کہا، ”دوستوں کے بیچ احسانات کا ذکر نہیں کیا
جاتا، حاشر۔ تمہیں کچھ واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس، اُس کا خیال رکھو، اُسے تمہاری اشد ضرورت
ہے۔۔۔“

حاشر نے خاموشی سے آئی سی یو کے دروازے کی طرف دیکھا، جہاں ایمان زندگی کے سانسوں کی جنگ لڑ
رہی تھی۔ ”ہاں، میں اُس کا خیال رکھوں گا۔۔۔“

حاشر نے تھوڑی دیر رک کر پوچھا، ”اور اُس کا گلا؟ کیا وہ دوبارہ بول سکے گی؟“

فرخ کی آنکھوں میں یقین اور امید کی چمک تھی، ”ہاں، وہ بول سکے گی۔ اگرچہ کوئلے کی تپش نے اس کی
زبان اور گلے کو جلا دیا تھا، لیکن میں نے زخموں کو احتیاط سے سینا کیا ہے۔ اسے کچھ وقت لگے گا، مگر وہ اپنی
آواز دوبارہ پائے گی۔ وہ ناقابل شکست ہے، حاشر۔۔۔“

یہ سن کر حاشر کے چہرے پر اطمینان کی ایک چمک آئی۔ ”یہ واقعی خوشخبری ہے، فرخ۔ تم نے معجزہ کر دکھایا ہے۔“

فرخ نے ہلکی مسکان کے ساتھ جواب دیا، ”معجزہ؟ نہیں، میں تو فقط ایک ڈاکٹر ہوں، حاشر۔ اصل معجزہ وہ خود ہے۔ وہ ہر رکاوٹ سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے۔ ایمان واقعی حیرت انگیز ہے۔“

حاشر نے متفق ہو کر سر ہلایا، ان کی آنکھوں میں محبت اور فخر کی چمک تھی۔ ”ہاں، وہ واقعی حیرت انگیز ہے۔“

فرخ نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی، ان کی آنکھوں میں ایک بار پھر پیشہ ورانہ وقار اور فرض شناسی کا عکس نظر آیا۔ ”مجھے اب جانا ہوگا، حاشر۔ ابھی دیگر مریض بھی ہیں جن کا علاج ضروری ہے۔ لیکن تم یہاں رہو، ایمان جلد ہی بیدار ہو جائے گی۔ کچھ دیر کے بعد تم اسے دیکھ سکو گے۔ صبر سے کام لو، وہ بہت مشکل وقت سے گزری ہے۔“

حاشر نے اثبات میں سر ہلایا، ان کی آنکھوں میں قدر اور احترام کی جھلک تھی۔ ”فرخ، میں صبر کروں گا۔“

فرخ نے ایک آخری مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”اللہ تم سے راضی ہو، دوست۔“ یہ کہہ کر وہ چپکے سے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

حاشر نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اُس نے اللہ کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے ایمان کو بچایا، اُس نے فرخ کو بھیجا، اور اُس کے دل میں امید کی کرن روشن کی۔ اُس نے ایمان کی جرأت اور مضبوطی پر اللہ کا شکر ادا کیا، جو زندگی کے ہر امتحان میں سرخرو ہو کر نکلی تھی۔

حاشر کے دل میں ایک عہد تھا— کہ وہ ایمان کا ہمیشہ خیال رکھے گا، اُس کے ساتھ باپ کی طرح شفقت سے پیش آئے گا، اور اُس کی حفاظت کرے گا۔

ایمان بستر پر نیم دراز تھی، سر ہیڈ بورڈ سے ٹیک لگائے، اور پیٹ کے گرد پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کی ناک میں نازک ٹیوب لگی ہوئی تھی، جو دھیرے دھیرے اس کے جسم میں جان بحال کرنے والے مائع کی بوندیں اتار رہی تھی۔

وہ بولنے کے قابل نہ تھی، مگر اس کی انگلیاں اب بھی حرکت کر سکتی تھیں، اور لکھنے کا ہنر اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ایک سفید کاغذ پر سنجیدگی سے کچھ سطریں لکھیں، چند باتیں جو اسے مناسب لگیں۔ کچھ راز وہ اپنے دل میں دفن رکھنا چاہتی تھی، اپنے زخموں کے ساتھ۔

اُس نے اپنی شناخت کے سچ کو چھپائے رکھا، اور گھر چھوڑنے کی وجہ کا ذکر بھی نہیں کیا۔ اُس نے اپنی تحریر میں محض حادثے کا بیان کیا تھا کہ وہ کھائی میں کیسے گری، گوناوار کا ذکر کیا، اور یہ کہ تراب اور گوناوار کی آشنائی کیسے ہوئی۔ کچھ الجھے ہوئے خاکے بھی بنائے تاکہ کہانی کو اور واضح کر سکے۔

حاشر اور سندس بستر کے قریب رکھے صوفے پر بیٹھے تھے، دونوں خاموشی سے کاغذ پر لکھی تحریر کو باری باری پڑھ رہے تھے۔ ان کے چہرے حیرانی اور تفکر کی ملی جلی کیفیت میں تھے، جیسے کوئی ایسی کہانی سن رہے ہوں جس کا ہر موڑ ایک نئی گہرائی میں دھکیلتا ہو۔

سندس نے ایمان کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک تھی۔ اُس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”تو یہ گونار، بغیر بتائے، تم سے محبت کرتا رہا، اور تمہاری نگرانی بھی کرتا رہا؟ اور تم بھی اُس کی نگرانی میں مشغول رہی؟“ سندس کی بات میں ایک نرمی اور محبت تھی، جیسے اُس کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

پھر ہنستے ہوئے بولی، ”تم دونوں واقعی ایک عجیب مگر پرفیکٹ جوڑی ہو!“۔

ایمان نے ہلکے سے مسکرایا، اُس کی آنکھوں میں محبت اور کشمکش کی چمک تھی۔ گونار کا خیال اسے مضطرب بھی کرتا تھا اور اس کے دل میں ایک گرم جوش جذبہ بھی بھرتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں ہو گا، کیا کر رہا ہو گا؟ اس کے دل میں یہ سوال بھی تھا کہ آیا وہ اب بھی اسے اُسی محبت سے چاہتا ہے یا نہیں؟

پائپ سے گرتے مائع کی نرم اور مسلسل ٹپکنے کی آواز نے کمرے میں ایک عجیب سکون بھر دیا تھا۔ سندس نے تھوڑے توقف کے بعد ایمان کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے پوچھا، ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ آگے کیا کرو گی؟“۔

ایمان نے کاغذ پر لکھا، ”وہ تمہارے ماموں کے ساتھ پاکستان آئے گا، اور میں اسے یہاں سچائی بتاؤں گی کہ میں زندہ ہوں۔“ اس نے سندس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں خوف اور امید کی ملی جلی کیفیت نمایاں تھی۔ ”کیا تمہیں لگتا ہے کہ وہ مجھے معاف کر دے گا؟“ اس کی انگلیاں لرزتے ہوئے کاغذ پر دوڑ رہی تھیں۔ ”کیا وہ تب بھی مجھ سے محبت کرے گا؟۔“

سندس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا، اس کی آنکھوں میں بے پناہ حمایت اور محبت کی چمک تھی۔۔ ”ایمان، وہ یقیناً تمہیں معاف کر دے گا۔ وہ تم سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ وہ تمہیں زندہ دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ وہ تمہارے ہر قدم کو سمجھنے کی کوشش کرے گا اور تمہیں ویسا ہی قبول کرے گا جیسی تم ہو۔۔“

ایمان کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، جیسے سندس کے الفاظ نے اس کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہو۔ اس نے کاغذ پر لکھا، ”شکریہ، سندس۔ تم میری سچی دوست ہو، اور اب میری بہن بھی۔۔“

سندس کی آنکھوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے ایمان کا ہاتھ تھام لیا، گویا کہہ رہی ہو،۔۔ ”ہاں، ہم اب بہنیں ہیں۔۔“

حاشر نے ایک لمحے کے لیے دونوں لڑکیوں کو خاموشی سے دیکھا، ان کے درمیان رشتوں کی مضبوط ڈور کو محسوس کیا۔ اُس کے چہرے پر محبت اور فخر کا تاثر واضح تھا۔ ”تم دونوں بہت خوش نصیب ہو کہ ایک دوسرے کا ساتھ ہے۔ اور ایمان، تم اب ہمارے خاندان کا حصہ ہو۔۔“

یہ کہہ کر حاشر بستر کی طرف بڑھا اور ایمان کے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھا۔ اُس کی نگاہوں میں پدرانہ محبت اور فخر کے احساسات تھے۔ ”تم اب میری بیٹی ہو، ایمان۔“ اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”میرے کوئی بچے نہیں ہیں، لیکن میری بیوی تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔ وہ تمہارے بارے میں سن کر بہت افسردہ ہوئی تھی، مگر اب تمہیں دیکھ کر وہ بے حد خوش ہو گی۔ وہ تمہارا ہنزہ میں انتظار کر رہی ہے۔“ ایمان کے دل میں سکون اور احسان مندی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے جلدی سے کاغذ پر لکھا، ”شکریہ، حاشر انکل۔ آپ بہت مہربان ہیں۔“

حاشر کی آنکھوں میں محبت کی روشنی مزید گہری ہو گئی۔ ”ایمان، تم بہت بہادر ہو۔ تمہارے اپنے لوگوں نے تمہاری قدر نہیں کی، مگر اللہ نے یہ تعلقات توڑ دیے تاکہ تمہاری زندگی برباد نہ ہو۔ جو کچھ بھی اللہ کرتا ہے، وہ ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ اب تم میری ذمہ داری ہو، میری بیٹی ہو۔ میں تمہارا خیال رکھوں گا، اور تمہیں ہمیشہ محفوظ رکھوں گا۔“

ایمان نے سر ہلا دیا، دل میں ایک عجیب سا سکون محسوس کرتے ہوئے، جیسے اب وہ ایک نئے خاندان اور نئے مستقبل کی طرف دیکھ رہی ہو۔

اس نے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سے سورج کی نرم روشنی اندر آرہی تھی۔ آسمان صاف اور نیلا تھا، اور پرندے اپنے نغموں میں مگن تھے۔

ایمان نے آنکھیں بند کر لیں، دل میں ایک نئی امید اور روشنی کا احساس لے کر۔ اس نے اپنے ماضی کے درد، خوف اور نفرت کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اب وہ ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے جا رہی تھی، ایک نئے خاندان کے ساتھ، اور دل میں محبت اور سکون کے احساسات بھرے ہوئے تھے۔

گونار کو بے وقوف بنے سال گزر چکے تھے اور بے وقوف بنانے والی وہ تھی جس کے ہاتھوں وہ اپنی مرضی سے فریب کھا کر خود کو خوش نصیب سمجھتا تھا۔ وہ ایمان کے جادو میں گرفتار ہو کر بے خبری میں اُس کا شکار بن گیا تھا، جیسے کوئی شکاری خود جال میں پھنس جائے۔ جو دوسروں کو آسانی سے فریب دیتا تھا، وہ ہی ایمان کے سحر میں خود بے خبری میں گرفتار ہو گیا تھا۔

ایمان کے ہاتھوں بے وقوف بننا گونار کے لیے کسی تلخی سے زیادہ ایک میٹھی کیفیت تھی، جیسے کوئی شخص جان بوجھ کر خود کو برباد ہونے دے اور اس پر فخر بھی کرے۔۔۔ سال اتنے گزر چکے تھے۔۔۔

، اتنے سال کہ جن میں ہر لمحہ درد کی شدت اور انتظار کی اذیت نے ایمان کے دل میں ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا۔ وہ برس جن میں اس نے اپنی بکھری ہوئی زندگی کے ٹکڑوں کو جوڑنے کی جدوجہد کی، اپنے وجود کا مقصد تلاش کیا، اور دنیا پر اپنا انمٹ نشان چھوڑنے کی ٹھانی۔

ایمان اس وقت اپنے کمرے میں تھی، جہاں ہر چیز نہایت نفاست سے سجائی گئی تھی، لیکن کمرے کی سب سے منفرد خصوصیت وہ دو کھڑکیاں تھیں جو اس کی دنیا کو دو مختلف زاویوں سے دکھاتی تھیں۔ ایک کھڑکی بستر کے قریب تھی، جو قبلہ کی طرف کھلتی تھی۔ اس کا روحانی مرکز، وہ مقام جہاں وہ اپنی ہر نماز ادا کرتی تھی، اللہ کے سامنے جھکتی تھی، اور اپنی روح کو تسکین دیتی تھی۔

دوسری کھڑکی اُس کے ڈیسک کے سامنے تھی، جو ہنزہ کی وادی کی سبز پہاڑیوں کی جانب کھلتی تھی، جہاں قدرت کی عظمت اپنی تمام تردکشی کے ساتھ جلوہ گر تھی۔

جب وہ نماز میں مصروف ہوتی، اُس کے سفید عبائے اور حجاب کے نیچے اُس کی روح ایک ان دیکھی روشنی سے منور ہوتی۔ قبلہ کی جانب رُخ کیے، جائے نماز پر زانو ٹیکے، وہ آیات قرآنی کا ورد کر رہی تھی، جو اُس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست تھیں۔

باہر کی فضا سے چلنے والی نرم ہوا، اُس کے وجود کو ہلکے لمس کی مانند چھوتی، اور چاندنی کی کرنیں کھڑکی سے اندر آکر کمرے کو نیم روشن کر دیتیں۔

نماز ختم کرنے کے بعد، اُس نے پرسکون انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈیسک کی جانب قدم بڑھائے اور اپنا فون چیک کیا۔ ایک پرائیویٹ ایپ کی جانب سے نوٹیفکیشن موصول ہوا، جس میں گونار کی موجودہ لوکیشن دکھائی گئی تھی۔ وہ سعودی عرب میں تھا۔ ایمان کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ چھ سال کی طویل مسافت کے بعد، آخر کار اس چپ نے اُسے اطلاع دی تھی کہ گونار کہاں ہے۔ ”واہ! چور

بازار سے خریدی گئی گھڑی اور سستی چپ آج تک چل رہی ہیں، ”اُس نے آہستگی سے کہا، جیسے خود سے مخاطب ہو۔

وہ لمحہ جس کا وہ سالوں سے انتظار کر رہی تھی، قریب آچکا تھا۔ اُس کے دل میں جوش اور مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ”دیکھو تو، کون آیا؟ مسٹر گونار، آپ سعودی عرب میں ہیں؟ ٹھہریں، میں بھی آرہی ہوں!“ اُس نے ہنستے ہوئے کہا، جیسے سعودی عرب چند قدم کے فاصلے پر ہو۔

اُس نے بغیر کوئی اور بات سوچے اپنے بیگ میں کیڑے اور ضروری سامان ڈالنا شروع کر دیا۔ اُسے کسی کو خبر دینے، یا کوئی نوٹ چھوڑنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اُس کی دنیا کا مرکز اس وقت صرف اور صرف گونار تھا۔ وہ شخص جسے اُس نے سالوں سے دل میں بسایا ہوا تھا، جس کی محبت اُس کے دل کے کسی کونے میں ہمیشہ زندہ رہی۔

ایمان نے اپنی زندگی میں بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ ایک کامیاب کاروباری شخصیت بن چکی تھی، مختلف اسلامی ممالک میں اُس کی مصنوعات کا طوطی بولتا تھا، مگر کوئی بھی اُس کے اصل وجود سے واقف نہ تھا۔ وہ صرف ”مینسا“ کے نام سے جانی جاتی تھی، لیکن اُس کے دل کے قریب ہمیشہ گونار رہا، وہ ہی جو سالوں سے اُس سے ملنے کی امید میں تھا۔

اب، بغیر کسی کو بتائے، مینسانے گھر چھوڑ دیا۔ اُس نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو ہوائی اڈے جانے کا کہا۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، کیوں کہ وہ اُس لمحے کے قریب تھی جب وہ پہلی بار گونار کو دیکھنے والی تھی۔۔۔

ایمان کے لیے سعودی عرب کا سفر اختیار کرنا کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا، اور ٹکٹ کا حصول محض چند لمحوں کا کام تھا۔ یہ ۲۰۲۸ کا زمانہ تھا، جہاں ہر قسم کی سہولتیں بے حد آسانی سے میسر تھیں۔ ایمان نے جدید ترین نظام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چند لمحوں میں اپنا فضائی ٹکٹ حاصل کر لیا، آن لائن ادائیگی کی اور اپنی نشست بھی منتخب کر لی۔ سفر کا وقت بھی فوراً اُس کے علم میں دے دیا گیا۔ سائنسی انقلاب نے زندگی کی ہر پیچیدگی کو یوں آسان بنا دیا تھا کہ معمولی امور بھی اب پلک جھپکتے انجام پاتے تھے۔

یہ مقدس مقام خانہ کعبہ کا تھا، جہاں وہ کھڑی تھی۔ آسمان سے موسلا دھار بارش برس رہی تھی اور اس کی اور مقدس گھر کے درمیان پانی کی باریک چادر حائل ہو چکی تھی۔

ہر قطرہ جیسے کوئی انجان دعا، کوئی ان کہی فریاد تھا۔ وہ سوچ میں گم تھی کہ اسے کس جانب ہونا چاہیے، مکہ یا مدینہ؟ دونوں طرف کی کشش اسے متذبذب کر رہی تھی۔ اس کا دل اور ایمان اسے ایک سمت کی طرف کھینچ رہے تھے، مگر اس کے اندر ایک کشمکش برپا تھی۔ اس نے اپنا گھر، اپنا خاندان ترک کر دیا تھا، اور اب یہاں پہنچ کر اسے اپنے فیصلے پر کچھ تذبذب محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی نگاہ معارج پر جاٹکی، وہ شخص جس نے اس کے دل کو جکڑ رکھا تھا، جس نے اس کے احساسات کو اپنی محبت کے جال میں قید کر لیا تھا۔ وہ کعبہ کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا، اس کی پشت میزابِ رحمت کی جانب تھی، جو سنہری نلکی تھی، کعبہ کی چھت سے بارش کا پانی حطیم پر ڈال رہی تھی۔۔۔

حطیم، وہ نیم دائرہ دیوار جس میں خانہ کعبہ کی اصل بنیادیں تھیں۔ معارج نے دعا کے لیے اپنے ہاتھ بلند کیے ہوئے تھے، اس کی آنکھیں بند تھیں اور لبوں پر سرگوشی نما دعا تھی۔

وہ اللہ سے دعا کر رہا تھا، اپنے گزرے دنوں کی، اس حادثے کی جس نے سالوں پہلے ان دونوں کو جدا کر دیا تھا۔ معارج یہ سمجھتا تھا کہ وہ مر چکی ہے، اور اس نے اسے کبھی دوبارہ دیکھنے کی امید ترک کر دی تھی۔ آج وہ یہاں خانہ کعبہ میں اپنی گمشدہ محبت کی سلامتی اور معافی کے لیے آیا تھا، اور وہ دل ہی دل میں تڑپ کے ساتھ اس کا نظارہ کرتی رہی۔

اس کے دل میں محبت کی چنگاری دہک رہی تھی، جیسے بارش کے قطرے اس کے جذبات کو زندگی دے رہے ہوں۔

اسے دل کی گہرائیوں سے خواہش تھی کہ معارج اسے دیکھے، کہ وہ اس سے بات کرے، کہ وہ اس کے قریب آئے۔ لیکن معارج لا علم تھا کہ وہ زندہ ہے، وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ حادثے میں بچ گئی تھی، اور وہ

یہاں تک اس کے پیچھے آئی تھی، اپنی محبت کی آخری امید کے ساتھ۔ کتنا عجیب تھا یہ لمحہ! یا شاید یہ اللہ کی مرضی تھی کہ وہ یہاں دوبارہ ملے۔

اسی اثنا میں اس کے بیگ میں موبائل کی ہلکی سی وابریشن ہوئی۔ وہ تیزی سے ایک چھت کے نیچے آگئی جہاں بارش کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس نے نقاب ہٹا کر اپنے لبوں کو ہوا کے لمس کا احساس دیا، اور اپنے فون کو نکال کر کال کا جواب دیا۔ ”جی، نور امی،“ اس نے دھیمی اور لرزتی آواز میں کہا، ”میں آپ کو بتانا بھول گئی تھی کہ میں سعودی عرب میں ہوں۔“ پھر وہ دھیرے سے بولی، ”ہاں، میں دوبارہ یہاں آگئی ہوں۔ فکر مت کریں، یہاں مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ دو ہزار اٹھائیس کا سال ہے، بہت کچھ بدل چکا ہے۔ آپ اپنا خیال رکھیے، میں جلد واپس آؤں گی، ان شاء اللہ۔ اللہ حافظ۔“ اس نے فون بند کر کے بیگ میں رکھا۔

جوں ہی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ پروفیسر تراب۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، اور ان کے ہونٹ کھل گئے۔ ”ایمان؟“ ان کے منہ سے لرزتی آواز میں نکلا۔ ”تم زندہ ہو؟“۔

ایمان تیزی سے ان کے قریب آئی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش کروایا، منت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے۔ اس نے تراب کو سرگوشی میں کہا، ”پلیز، اسے کچھ مت بتائیے گا۔“۔

تراب حیرت زدہ تھے۔ ”تم اسے کیسے جانتی ہو؟ اور مجھے کیسے جانتی ہو؟“ انہوں نے استفسار کیا۔ ایمان نے دور کھڑے معارج کی طرف اشارہ کیا، جس کی کلائی پر سمارٹ واچ چمک رہی تھی۔۔۔ ”اس گھڑی میں ایک چپ ہے جس کی بدولت میں سب جانتی ہوں،“۔۔۔

تراب نے گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر ایمان کی طرف۔ ”تمہیں سب کچھ معلوم تھا؟“ ان کے چہرے پر بے یقینی اور حیرت کے آثار تھے۔ ”تو پھر تم نے اتنے سال خود کو کیوں چھپایا؟ تم نے اس کی زندگی میں غائب ہو کر اسے توڑ دیا۔ وہ تمہارے خواب دیکھتا رہا۔“۔۔۔

ایمان نے سر ہلایا۔ ”سب کچھ ٹھیک تھا، مگر وقت ٹھیک نہیں تھا، پروفیسر۔ آپ کو سمجھنا ہو گا، میں ابھی اس کو سچ بتانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“۔۔۔

تراب نے الجھن میں پوچھا، ”کیوں؟“۔۔۔

ایمان نے اپنے ناخنوں سے کھیلنے ہوئے نیچے دیکھا اور کہا، ”کچھ ایسی باتیں ہیں جنہیں آپ نہیں جانتے، اور میں آپ کو بتانا نہیں چاہتی۔ لیکن آپ اسے دباؤ ڈالیں، اسے شادی کے لیے تیار کریں۔ سب کچھ وقت پر ہو گا، ان شاء اللہ۔“۔۔۔

تراب نے اپنا سر ہلایا، ”تم جہاں بھی ہو، ہوشیار رہو۔ محبت میں بھی آزمائش ہوتی ہے، مگر یہ آزمائش اسے مزید توڑ نہ دے۔“۔۔۔

ایمان مسکرائی اور کہا، ”محبت میں آزمائش اس لیے ضروری ہوتی ہے تاکہ ہمیں یہ سمجھ آ سکے کہ جسے ہم چاہتے ہیں، وہ ہماری محبت کا حق دار ہے یا نہیں۔ یہ آزمائش ہمیں حقیقت دکھاتی ہے، تاکہ ہم فیصلہ کر سکیں کہ ہمیں اس رشتے کو نبھانا ہے یا نہیں۔“

تراب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، ”اللہ تم دونوں کو جلد ملوائے۔ آمین۔“

پروفیسر تراب نے قریب آ کر معارج کے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ رکھا اور دھیمی آواز میں کہا، ”معارج، چلنے کا وقت آ گیا ہے۔“

معارج، جو دعا کے بعد آہستگی سے اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا، نے گردن گھما کر ان کی جانب دیکھا اور سر ہلایا، ”ہاں، پروفیسر، چلتے ہیں۔“

اس نے پروفیسر کا پیچھا کیا، لیکن چلتے چلتے اس کی نگاہ ہجوم پر جا رہی۔ خانہ کعبہ کے سامنے ایمان عبایا میں لپٹی کھڑی تھی، اس کی پشت معارج کی طرف تھی۔ اچانک، ہوا میں ایک اجنبی خوشبو تیر گئی، ایسی خوشبو جو معارج کے دل کی گہرائیوں میں کہیں پہنچانی سی تھی۔

وہ پل بھر کے لیے رک گیا، جیسے ہوا میں بکھرے ہوئے ذروں میں کچھ غیر معمولی ہو۔ نتھنوں میں تروتازگی کی ایک لہر دوڑ گئی، اور اس کے اندر ایک بے نام کشش پیدا ہوئی۔ وہ حیران ہوا کہ یہ عورت کون ہے، کیوں اس کے وجود میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔

معارض کی آنکھیں اس عبا یا میں لپٹی عورت کے ساکت وجود پر مرکوز رہیں۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا، مگر اس کی کشش سے آزاد ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے حیرت زدہ کھڑا رہا، سوچتے ہوئے کہ کیوں اس عورت کی موجودگی اسے جانی پہچانی محسوس ہو رہی تھی۔ دل کی گہرائیوں میں کوئی انجان احساس، کوئی بھولی بسری یاد جاگتی جا رہی تھی۔

مگر پھر معارج نے جھٹکے سے اپنی سوچوں کو جھٹکا، جیسے خود کو کسی دھندلائے ہوئے خواب سے بیدار کر رہا ہو۔ اُس نے گہری سانس لی، اپنے دل کی بے چین دھڑکن کو قابو کیا، اور پلٹ کر پروفیسر کے پیچھے چلنے لگا۔ لیکن اس کا دل، جیسے ابھی بھی کچھ ادھورا تھا، اُسے پلٹ کر دوبارہ دیکھنے کی التجا کر رہا تھا۔

دوسری جانب، ایمان نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے خود کو پلٹا۔ اب معارج کی پشت اس کی طرف تھی، اور اس کی گہری نگاہیں معارج کی طرف جمی رہیں، جیسے وہ اُس کی پشت پر چپکے چپکے نظریں گاڑ رہی ہو۔ وہ اسے بھیڑ میں دیکھتی رہی، معارج کے قدم سست رو اور سنجیدگی سے آگے بڑھ رہے تھے، اور وہ ہجوم کے بحر میں گویا ایک نقطے کی مانند سکڑتا جا رہا تھا۔

اس کی نگاہوں میں ایک عجیب قسم کی روشنی جھلک رہی تھی، جیسے وہ ایک غیر محسوس رشتہ محسوس کر رہی ہو، جو اس کثرت کے باوجود اُن دونوں کے درمیان قائم ہو چکا تھا۔

ایمان کے لبوں پر ایک خاموش تبسم ابھرا۔ دل ہی دل میں اُس نے گویا ایک سرگوشی کی، ”ہم عنقریب محرم کی حیثیت سے ملیں گے، انشاء اللہ۔“

وادی ہنزہ کی ایک پُر سکون اور دلکش صبح تھی۔ افق پر سورج برف سے ڈھکی پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے سے نمودار ہو رہا تھا، اور اُس کے سنہری اور نارنجی رنگوں نے آسمان کو ایک خوابیدہ منظر میں بدل دیا تھا۔ ہوا میں تازگی اور خنکی کی آمیزش تھی، جس میں پھولوں کی لطیف خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ درختوں پر پرندے خوش نوا گیت گارہے تھے اور دور بہتا دریا ایک دھیمہ اور مدھر راگ الاپ رہا تھا، گویا قدرت کی زبان میں سرگوشی کر رہا ہو۔

سندس باغ کے وسط میں بیٹھی ان مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں موبائل تھا، اور وہ ویڈیو کال پر کسی سے گفتگو میں محو تھی۔

اُس کا چہرہ مسکراہٹوں کی جھلک سے روشن تھا، اور اُس کی ہلکی نیلی شلوار قمیض پر لپٹا ہوا سفید دوپٹہ اُس کے سر کو ڈھانپے ہوئے تھا، جس نے اُس کی معصومیت اور وقار کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ سندس کی آواز میں خوشی اور شگفتگی تھی، جیسے وہ کسی اپنے سے بات کر رہی ہو۔

وہ مصنوعی خفگی سے مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی، ”تم جانتی ہو، ایمان؟ وہ بیچارہ کتنا پریشان ہے، اس کی حالت دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ پلیر، اب اس کو سچ بتادو۔ اتنا امتحان تو اللہ بھی نہیں لیتا، اور تم اسے اتنے سالوں سے آزمائش میں ڈالے ہوئی ہو!“۔

ایمان کی طرف سے خاموشی رہی، پھر ایک گہری سانس کے بعد اس نے جواب دیا، ”کچھ وقت اور صبر کرو، جب ہم مکہ جائیں گے اور تمہارا نکاح ہوگا، تب میں اسے سب کچھ بتا دوں گی۔“۔

سندس نے ناک چڑھا کر بے مروتی سے جواب دیا، ”تم واقعی بہت سخت دل ہو، تمہیں ذرا بھی احساس نہیں!“۔ ”ابھی وہ کچھ اور کہنے ہی والی تھی کہ اس کے پیچھے سے پروفیسر تراب کی بھاری آواز گونجی۔ سندس ایک دم چونک گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پروفیسر تراب اس کے عقب میں کھڑے تھے، سفید کرتہ پاجامہ اور سیاہ واسکٹ پہنے ہوئے، چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے، اور آنکھوں میں ایک عجیب سی مشکوکیت جھلک رہی تھی۔ ”سندس“۔

۔ ”ماموں جان! آپ؟“ سندس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

پروفیسر نے چند قدم آگے بڑھ کر سنجیدہ انداز میں پوچھا، ”کس سے بات کر رہی ہو؟“ تم کس سے بات کر رہی ہو؟“

سندس کی زبان لرزش زدہ تھی۔ وہ بمشکل بول پائی، ”دو... دوست سے۔“

پروفیسر تراب نے مزید تجسس سے کہا، ”کون سا دوست؟“ سندس کا جواب سنتے ہی وہ فوراً اس کے فون کی طرف بڑھے اور سکریں کی طرف دیکھا۔ جیسے ہی ان کی نظر سکریں پر پڑی، وہ حیرت میں ڈوب گئے۔ سکریں پر ایمان تھی، جو معصومیت سے مسکرا کر ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی، ”کیسے ہیں، پروفیسر صاحب؟ کیسا لگا سر پرانز؟“

پروفیسر چند لمحے خاموشی سے سکریں کو دیکھتے رہے، پھر حیرت سے سر جھٹک کر پیچھے ہٹ گئے۔ جب خشک اور کھردری آواز جو مینسا کی تھی ان کے سمعاتوں سے ٹکرائی۔ پھر وہ حیرت زدہ ہو کر بولے ”ایمان... تم ہی مینسا ہو؟“

ایمان کی کھنکتی ہنسی فضا میں گونجی۔ وہ اپنی اصلی آواز میں ہنستے ہوئے بولی، ”جی، میں ہی ہوں!“

پروفیسر نے بے یقینی سے سندس کی طرف دیکھا، جو شرمندگی اور گھبراہٹ میں مبتلا تھی۔ سندس نے ہچکچاتے ہوئے مسکراتے ہوئے کی کوشش کی، مگر اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔

ایمان ایک بار پھر مزے سے رسائیت میں بولی، ”سندس کو سب کچھ معلوم تھا، پروفیسر صاحب، مگر میں نے ہی اسے منع کیا تھا۔“

پروفیسر نے سخت لہجے میں کہا، ”میں معارج کو سب کچھ بتا رہا ہوں۔“

یہ سن کر موبائل کی طرف سے ایمان کی پریشانی بھری آواز ابھری، ”نہیں، پلیز، پروفیسر! ایسا مت کیجیے گا۔ میں نے اس کو اپنے اور ہمارے نکاح کے بعد سب کچھ بتانا ہے، وہ بھی مکہ میں۔ آپ نے ہی ہمارا نکاح پڑھانا ہے، اور اس کو کیسے منانا ہے، یہ آپ کا کام ہے۔ پلیز، کچھ دن اور رک جائیں۔“

سندس پروفیسر کو دیکھ رہی تھی، جن کے جڑے سختی سے بند تھے۔ انہوں نے ناگواری سے کہا، ”حاشر اور نور بھی سب جانتے تھے، ہیں نا۔“

ایمان نے سر ہلاتے ہوئے اعتراف کیا، ”جی، وہ سب جانتے تھے۔“

پروفیسر نے غصے میں آکر کہا، ”حاشر نے مجھے کچھ کیوں نہیں بتایا؟“

ایمان کی آواز میں مدہم سی معذرت چھلکی، ”کیوں کہ میں نے ان سے وعدہ لیا تھا۔ وہ تو بتانے ہی والے تھے۔ مگر رک گئے۔“

پروفیسر نے سندس کی طرف دیکھا، جو خاموش کھڑی تھی۔ ”شانزہ اور بہرام بھی سب جانتے ہیں؟“

سندس نے فوراً نفی میں سر ہلایا، ”نہیں، وہ کچھ نہیں جانتے۔“ سندس کی آواز کانپ رہی تھی۔

پروفیسر نے سکرین کو دیکھا، پھر سندس کی طرف نظر کی۔ ایمان نے موقع پا کر کہا، ”چھ دن ہیں ایمان، اس کے بعد میں نہیں رکوں گا۔ پھر میں وعدے کا پاس نہیں رکھوں گا۔ معارج کو سب بتادوں گا۔“

ایمان نے فوراً ہانک لگائی، ”جی، جی، آپ بڑے ہیں، ہم کیا کہہ سکتے ہیں! بس ابھی مت بتائیے گا، ورنہ میں بیڈ سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لوں گی۔“ اس نے ذرا سی گھبراہٹ میں کہا۔

پروفیسر نے گہری سانس لی، پھر سر افسوس سے ہلایا، ”یہ لڑکی آج بھی ویسی ہی ہے جیسے چھ سال پہلے تھی۔“

ایمان نے ہنس کر کہا، ”پروفیسر صاحب، انسان کی فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ اُس کا برتاؤ، لہجہ، اور انداز بظاہر بدل بھی جائے، تو بھی اُس کی اصل خصلت وہ ہی رہتی ہے۔ چاہے جتنا بھی زمانے کے رنگ میں رنگ جائے، اپنی اصلیت سے فرار ممکن نہیں۔“

”

پروفیسر مسکرائے اور کہا، ”تم اور معارج واقعی ایک پرفیکٹ جوڑی ہو۔“

انہوں نے سندس کو موبائل تھمایا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا، ”اللہ تم سب کے نصیب اچھے کرے۔“

سندس نے نظریں جھکا لیں، احتراماً مسکرائی، مگر پروفیسر تراب کی نظروں میں کوئی تشویش چھپی تھی۔ چند لمحے وہ سندس کو دیکھتے رہے، پھر اطمینان سے پلکیں جھپکیں اور بغیر کچھ کہے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

...°...

امروز۔۔۔۔

معارج نے پوری دلجمعی سے ایمان کی داستان سنی اور آہستگی سے کہا، ”تو تم نے مجھے آزمایا تھا؟“

ایمان نے مدہم سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”قسم ہے، اگر حالات مختلف ہوتے تو یہ کبھی نہ ہوتا۔ محبت اکثر امتحانوں سے گزرتی ہے، اور جب محبت آزمائشوں کے بھنور سے نکل کر نصیب ہوتی ہے، تو وہ ایک انمول جواہر کی مانند ہوتی ہے۔ اس کی قدر وہ ہی جان سکتا ہے جو اس مرحلے سے گزرا ہو، جیسے میں

تمہاری محبت کی قدر کرتی ہوں اور تم میری محبت کی کرتے ہو۔ اور ہم دونوں کے دل میں اللہ کی محبت بھی موجود ہے۔”

معارج نے دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ ”جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب ان باتوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے کا سوچتے ہیں، مستقبل کو سنوارنے کی فکر کرتے ہیں۔”

پھر اچانک اُسے کچھ یاد آیا، ”تمہیں میرے گھر والوں کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟“

ایمان نے بنا کسی جھجک کے سچائی سے کہا، ”میں نے تمہاری ڈائری چرائی تھی۔“

معارج یہ سن کر خاموش ہو گیا، اور ایمان نے جھکی نظروں کے ساتھ افسردہ لہجے میں بات جاری رکھی، ”تمہارے بابا، اما، اور بہن کے ساتھ جو سانحہ پیش آیا، معارج، وہ واقعی روح کو ہلا دینے والا تھا۔ ایسے واقعات انسان کو جیتے جی مار دیتے ہیں، جیسے روح کو بدن سے نکال دیا جائے، اور تمہارے بھائی عیسیاہ کی موت... یہ سب حد درجہ دل دوز تھا۔ میں نے ہمیشہ سوچا تھا کہ میرے۔ ساتھ برا ہوا، لیکن جو تم پر گزری، وہ تو برے سے بھی کہیں زیادہ ہولناک تھا۔ تمہاری والدہ...“

یہ کہتے ہوئے ایمان کے لب لرزا اٹھے، آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے اور معارج کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ ایمان نے نرمی سے اس کے آنسو اپنی انگلی کی پور پر اٹھالیے۔

- “اب جب کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، معارج، میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری زندگی کو ایسی خوشیوں سے بھر دوں گی کہ تمہاری ہر تلخی، ہر دکھ یوں مٹ جائے گا جیسے کبھی وجود میں ہی نہ آیا ہو۔

تمہارا ہر غم میرے وجود کے لمس سے تحلیل ہو جائے گا، اور میں تمہارے دل کو اُس سکون اور محبت سے مالا مال کر دوں گی جس کا تم نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا ہو۔”

اُس نے معارج کو سینے سے لگا لیا، اور معارج نے اُسے گلے سے لگا کر خود میں سمولیا۔

ایمان نے سرگوشی کی، “ہم دونوں مل کر اپنے مستقبل کو اتنا حسین بنائیں گے کہ ہمیں وہ تمام دکھ ایک ڈراؤنے خواب کی مانند محسوس ہوں گے، جو ماضی کے دھندلکے میں گم ہو جائیں گے۔”

وہ دونوں ایک دوسرے کے وجود میں گم ہو کر یوں گلے لگے رہے جیسے صدیوں کی تھکن سکون میں تحلیل ہو رہی ہو۔

معارج نے ایمان سے کوئی مزید سوال نہ کیا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا، یا وہ اُسے اتنے برسوں تک ڈھونڈتا رہا، جب کہ ایمان اسے آزماتی رہی۔ وہ جانتا تھا کہ جس کرب سے ایمان گزری تھی، اُس کے بعد مردوں پر اعتماد کرنا اُس کے لیے کتنا دشوار تھا، جیسے معارج خود انسانوں پر بھروسہ کھو بیٹھا تھا۔

معارج ایمان کی حالت کو سمجھ سکتا تھا، اور اس کے دل میں ایمان کی آزمائش کا احترام جاگزیں تھا۔ وہ تمام گزرے لمحے بھلا کر اُس نے دل میں عہد کیا کہ اب وہ ایمان کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے گا۔

ایمان نے ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”گو نار صاحب، کیا اب اس ذات کے حضور شکرانے کا سجدہ ادا نہیں کرنا، جس نے ہمیں ملایا؟“۔

معارض نے مسکرا کر جواب دیا، ”اس کا تو میں جتنا شکر ادا کروں، کم ہے، ایمان۔ اُس نے مجھ مردہ دل کو زندگی عطا کی ہے، اُس نے مجھے تمہارے وجود سے نوازا ہے۔“۔

ایمان نے ایک مدہم مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”اور تم مجھے ملے تو جیسے دنیا کی تمام نعمتیں میری جھولی میں بھر دی گئیں۔ اللہ نے مجھے وہ سب کچھ عطا کیا، جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ معارج، میں جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے۔ تم وہ انسان تھے جو محبت کو ایک دھوکہ سمجھتے تھے، اور پھر اللہ نے تمہارے دل میں میری محبت کا چراغ جلا دیا۔“۔

وہ ہلکے سے ہنسی، ”اور وہ تم، جو کہتے تھے کہ محبت کچھ نہیں ہوتی، اسے مجھ سے محبت ہو گئی۔“۔

معارض نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”یہ ل اللہ کا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟“۔

ایمان نے آنکھوں میں محبت کے دیپ جلائے کہا، ”یہ یقیناً معجزہ ہے، معارج، ایک پاکیزہ معجزہ!“۔

پھر وہ پیچھے ہٹی اور اُس کی نم آنکھوں کو نرمی سے چوما، ”یہ آنکھیں اب میری ملکیت ہیں، ان میں دوبارہ آنسو نہ آئیں۔“۔

معارج نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا، ”ٹھیک ہے، اب نہیں آئیں گے، یہ پہلی اور آخری بار تھا۔“

ایمان نے نرمی سے معارج کے چہرے کو اپنے نرم و نازک ہاتھوں کے پیالوں میں بھر لیا، اُس کی بھوری، محبت سے لبریز آنکھیں معارج کی فندق آنکھوں میں یوں پیوست ہو گئیں جیسے وہ اُن میں کوئی گہرا راز تلاش کر رہی ہو۔ اُن فندق آنکھوں میں بے شمار احساسات کی لہریں دوڑ رہی تھیں، جیسے جذبات کا ایک سمندر ہو جس کی کوئی حد نہ ہو۔

وہ دونوں یوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں گم ہو گئے جیسے وقت کا سلسلہ تھم سا گیا ہو، ہوائیں اپنی رفتار بھول چکی تھیں اور پیچھے صرف دریا کے بہنے کی مدھم سرگوشی باقی تھی۔ فضا میں ایک جادوئی سکوت چھا گیا تھا۔ ایمان کے لبوں پر ہلکی سی مسکان ابھری، اور اُس نے محبت سے بھرپور لہجے میں کہا...

وسعتِ کائنات کا راز جاننے کی آرزو تھی مجھے

عمیق تہوں میں پنہاں بھیدوں تک رسائی کا جنون تھا میرے دل میں

پر جب تیری چشمِ فسوں خیز میں جھانکا

تو جانا، ہر شے فانی ہے تیری نگاہ کے جلوؤں کے سامنے

تیری آنکھوں کے سحر کو کیا نام دوں؟

کہ دنیا تیرے حسن کی مستی میں مگن ہو جائے

اُن آنکھوں کی گہرائی میں ایسے اسرار پوشیدہ ہیں

جن کو سمجھنے میں خود کائنات کے راز دان بھی عاجز ہیں۔

معارج نے اچانک اُسے دوبارہ اپنے بازوؤں میں بھر لیا، جیسے وہ خوفزدہ ہو کہ کہیں یہ لمحہ اُس کے ہاتھوں سے نکل نہ جائے۔

یہ پہلا موقع تھا جب وہ یوں ایک دوسرے سے گلے ملے تھے، اور وہ احساس جیسے زمانوں سے بچھڑی ہوئی دولہریں سمندر کی وسعتوں میں بھٹکنے کے بعد آخر کار دوبارہ یکجا ہو گئی ہوں۔

اُن کے وجود کا ارتعاش اور اُن کی دھڑکنوں کی ہم آہنگی بالکل ویسی ہی تھی جیسے لہروں کی سرگوشیاں، جو صدیوں کی مسافت کے بعد ایک دوسرے سے مل کر سکون پاتی ہیں۔

اُن کے جذبات، اُس پانی کی روانی کی مانند تھے، جو ہر رکاوٹ کو توڑ کر، آخر کار اپنے اصل میں لوٹتا ہے، اور وہ دونوں اس لمحے میں مکمل ہو گئے، جیسے کائنات نے اپنی گواہی اُن کی محبت کو دے دی ہو۔

ایمان نے معارج کا ہاتھ تھاما اور اُسے نرمی سے اپنے ساتھ لے چل دی۔ چند لمحوں کے بعد وہ لوٹے تو معارج کے سر پر ٹوپی تھی اور ایمان نے اپنے سر پر نہایت نفاست سے دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا، جس میں اُس کا چہرہ دلکش چاند کی مانند دمک رہا تھا۔ وہ دونوں آہستگی سے قدم بڑھاتے ہوئے سامنے بچھی جائے نماز کی طرف گئے، جہاں ہوا کی لطافت اور سکون نے فضا کو پر نور کر دیا تھا۔

پہاڑوں کی اوٹ میں چھپا چاند اُن کے وجود پر نرم روشنی بکھیر رہا تھا۔ وہ دونوں شکرانے کے نفل میں جھک گئے، اور ہوا میں ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ درخت سے لٹکتے شیشے کی بوتلوں میں بند قمتے، جیسے دعاؤں کی گونج سن کر ہولے ہولے جھومنے لگے ہوں۔

سامنے بہتی نہر میں آسمان کا عکس دکھائی دیتا تھا، جیسے دونوں جہانوں کی خوبصورتی اُس پانی میں منعکس ہو گئی ہو۔

جب انہوں نے سلام پھیرا، تو دونوں کی نظریں ایک دوسرے میں گم ہو گئیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کا عکس اپنی آنکھوں میں دیکھا اور پھر خاموشی سے ہاتھ تھام لیے۔ دونوں نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے، اور اُن کی دعا کی ہم آواز گونج فضاؤں میں پھیل گئی

۔ “یا اللہ! ہم تیرے بے پایاں احسانات کے سامنے سراپا عاجزی ہیں کہ تُو نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے نوازا اور ایک دوسرے کی محبت میں پرودیا۔

اے رب العالمین، تیرے شکر کی لذت کو ہم کبھی کما حقہ ادا نہیں کر سکتے، کہ تُو نے ہمیں ایمان کی دولت اور اسلام کے نور سے منور کیا۔

اے رب کائنات! ہمارے مستقبل کو نورِ ہدایت سے روشن کر اور ہماری زندگی کو ایسی بنا کہ ہر لمحہ تیری رضا کی جستجو میں گزرے۔ ہمیں وہ موت عطا فرما جو تیرے مقربین کی صف میں شامل کرے، اور ہمیں ایسی اولاد سے سرفراز فرما جو تیری رضا کے مطابق تیرے دین کی خدمت کرے، جو تیرے آخری نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرے، اور ہر قدم تیری اطاعت کے راستے پر چلے۔

یا اللہ! ہمیں اپنی محبت کی چادر میں لپیٹ لے اور ہمارے دلوں کو تیری عبادت کے سکون سے معمور کر دے، کہ ہمارے ہر سانس اور ہر عمل سے تیری رضا جھلکے۔ آمین۔

آسمان پر جگنو اڑتے ہوئے بلند ہونے لگے، جیسے اُن دعاؤں کو آسمان تک پہنچانے جارہے ہوں۔ وہ فضا میں روشنیوں کی مانند جھلملاتے ہوئے بادلوں میں گم ہو گئے۔

آسمان پر بادل چھا گئے، اور وہ دونوں جیسے دھند کی چادر میں لپیٹ گئے ہوں۔ فضا میں صرف اُن کی دعاؤں کی بازگشت باقی رہ گئی تھی، اور اُن کے دلوں میں پیار کی گہری چمک۔

جیسے ہی منظر دھندلا ہوا، ایک خوابیدہ فضاء میں اُن کے وجود چھوٹے چھوٹے ہوتے دکھائی دیے، اور آسمان کی بلندیوں سے یوں دکھائی دیا جیسے دونوں روحانی سکون کی وادی میں گم ہو چکے ہوں، پیچھے صرف اُن کے پیار کا احساس اور دعاؤں کی گونج رہ گئی تھی۔

...°...

معارض کے ذاتی محل نما گھر کے ایک گوشے میں، جہاں اُس نے ایک مخصوص جم خانہ ترتیب دیا تھا، وہ روزانہ کی طرح اپنی ورزش میں مشغول تھا۔ آج اس کے تن پر سیاہ رنگ کی ٹینک ٹاپ اور سادہ ٹراؤزر تھا، جو اُس کے کسرتی جسم کے پتھر یلے خطوط کو بخوبی نمایاں کر رہا تھا۔

اُس کے شاہ بلوطی، گھنے بال پسینے میں بھیگ کر اس کے ماتھے پر چمک رہے تھے،۔ اُس کے بازو، جو گویا سنگ تراشی کا نمونہ ہوں، ٹیٹوز سے مزین تھے، جو اُس کے ماضی کی گہرائیوں کا عکس دیتے تھے۔

کیچن میں ایمان موجود تھی، جو کاؤنٹر کے قریب کھڑی، ایک سرخ فرائ فریکس پہنے ہوئے تھی، جس پر گہرے رنگ کی کلیاں اور نفیس نیٹ پر گلاب کی نرم پتیاں سجی ہوئی تھیں۔

اُس کے بال، جو شہد کی مانند قدرتی رنگت رکھتے تھے، اُس کے کمر سے نیچے بہتے ہوئے اُس کے وجود کو ایک طلسماتی حُسن عطا کر رہے تھے۔ بالوں کی گھنگھریا لے لہریں اُس کی کمر سے نیچے تک جھول رہی تھیں، جیسے کسی قدیم داستان کی پری۔

کیچن کی کھڑکی سے باہر ایک حسین منظر دکھائی دے رہا تھا، جہاں سبزہ اور بہتا ہوا دریا، جیسے قدرت کی آغوش میں خود کو سمائے ہوئے تھا۔

معارض نے فجر کی نماز کے بعد، ورزش کے لیے جم خانہ کا رخ کیا تھا اور اب وقت کے عین مطابق سات بجے کے قریب کچن میں آیا۔ اُس کی نگاہ ایمان پر پڑی، جو مصروفیت کے باوجود انتہائی دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ ایمان سے مخاطب ہو کر کہا، ”تم ناشتہ کیوں بنا رہی ہو؟“۔ ایمان نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا اور شوخ انداز میں کہا، ”یہ میرا گھر ہے، کیا میں نہیں بنا سکتی؟“۔

وہ محویت کے عالم میں شہد کو جار میں انڈیل رہی تھی، وہ ہی شہد جو وہ صبح سویرے جنگل کی پُر اسرار گہرائیوں سے نہایت مہارت اور فنکاری کے ساتھ حاصل کر کے لائی تھی۔

اُس کی حرکات میں ایسی چابکدستی اور تجربہ پنہاں تھا جو کسی ماہر شکاری کی چالاکیوں سے کم نہ تھی، اور اُس کے چہرے پر ایک خاموش فخر کی جھلک نمایاں تھی، جیسے قدرت کو تسخیر کرنے کی ایک کامیاب کوشش۔ معارج اُس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا، اُس نے اپنی دونوں کلائیوں کو سینے پر باندھ لیا اور پیروں کو بے تکلفی سے کراں کرتے ہوئے ایمان کی طرف دیکھنے لگا۔

ایمان نے معصومیت بھری نظروں سے معارج کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے شرارت آمیز لہجے میں کہا،
”اچھا، ایک بات تو بتاؤ؟“ اُس کے لہجے میں محبت کی ہلکی سرگوشی تھی۔

”تم ابھی ورزش کر کے آئے ہو، یہ بتاؤ کہ اگر ابھی فوراً شہد کھاؤ، تو کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی؟“

معارج کو اُس کی یہ معصومانہ استفسار بے حد دلکش لگی۔ اُس کی ہلکی مسکراہٹ گہری ہو گئی، اور نرم لہجے میں
بولاً، ”نہیں، کچھ بھی نہیں ہوگا۔“

ایمان نے حیرت زدہ انداز میں آنکھیں پھیلا کر کہا، ”اوہ! میں نے تو سنا تھا کہ ورزش کے فوراً بعد کچھ کھاپی
لو، تو صحیح نہیں رہتا، اسی لیے پوچھا تھا۔“

دفعۃً ایمان نے شرارتی انداز میں اپنی انگلی پر تھوڑا سا شہد لیا اور معارج کے لبوں کی طرف بڑھا دیا۔
معارج نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا، پھر اُس کی انگلی سے شہد چکھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک چمک
اُبھر آئی اور بولاً، ”اب یہ شہد اور بھی میٹھا ہو گیا ہے!“

ایمان نے اُسی انگلی سے خود بھی شہد چکھا اور نرمی سے کہا، ”ہاں واقعی، اب زیادہ میٹھا لگ رہا ہے۔“

معارج کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری، جیسے اسے خوب معلوم ہو کہ ایمان وہ نہیں جو کسی بات
کا قرض باقی رہنے دے۔

۔ ”تم کیا بنا رہی ہونا شتے میں؟“ معارج نے محبت بھری تجسس سے پوچھا۔

- ”سوئیڈش بریڈ، زیتون، ملائی اور شہد۔ اور قہوہ بھی۔ مجھے زیادہ علم نہیں کہ تم کیا پسند کرتے ہو، اس لیے یہ سب رکھا ہے۔“ ایمان نے سنجیدگی سے جواب دیا، لیکن اُس کے لہجے میں محبت کی جھلک تھی۔

- ”اچھا ہے، فریش ہو کر آتا ہوں، پھر ساتھ ناشتہ کرتے ہیں۔“ معارج نے کہا، اُس کی مسکراہٹ میں ایک خاص جاذبیت تھی۔

ایمان نے کہا، ”جلدی آ جاؤ، ہمیں نور ماما کے گھر بھی جانا ہے، وہ ہمیں ناشتے پر بلارہی ہیں، اور انہوں نے میرے لیے خاص لچھے دار پراٹھے اور چکن ملائی بوٹی تیار کی ہے!“۔

معارج نے ہنستے ہوئے کہا، ”تمہارے لیے یہ خاص پکوان، اور میرے لیے بس زیتون اور ملائی!“۔ اُس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

ایمان ہنس پڑی، ”ارے، تم بھی کھا لینا، بس جلدی فریش ہو جاؤ، ورنہ دیر ہو جائے گی۔“۔

معارج نے ہلکا سا سر جھٹک کر کہا، ”اوکے، جارہا ہوں!“۔۔۔۔۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں خاموشی کے عالم میں ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے تھے، جیسے صبح کی تازگی کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کر رہے ہوں۔

معارض ناشتے سے بھرپور لطف اندوز ہو رہا تھا، جب کہ ایمان کی دلچسپی ناشتے میں یوں ہی واجبی سی تھی، گویا وہ اپنی مطلوبہ کرارے پن کی تلاش میں ناکام رہی ہو۔ اُس کی پیشانی پر ہلکی سی سلوٹ ابھری ہوئی تھی، جیسے کوئی خاص لذت کی طلب پوری نہ ہوئی ہو۔

معارض نے نرمی سے اُسے مخاطب کیا، ”ایسا کیا ہوا ہے؟ تم ٹھیک سے ناشتہ نہیں کر رہیں۔“۔۔ اُس کے لہجے میں محبت اور فکر کی آمیزش تھی۔

ایمان نے بے ساختہ جواب دیا، ”یار، مسئلہ یہ ہے کہ جب تک اپنے دیسی گھی میں تلا ہوا ناشتہ نہ کر لوں، مزہ نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے دن ہی نہیں گزرے گا اور میرا پی پی بھی لو ہو جاتا ہے!“ اُس کے لہجے میں ایک عجیب سی مایوسی تھی، جیسے کوئی پرانا عادی معمول چھن گیا ہو۔

معارض اُس وقت اپنے بریڈ پر مکھن اور شہد لگا رہا تھا، لیکن ایمان کی بات سن کر وہ مسکرا دیا۔ اُس نے نرم لہجے میں نوالہ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، ”چلو، یہ کھاؤ۔ یہ ہیلدی ہے، اور تمہیں اچھا لگے گا۔“۔

ایمان نے شرمیلی سی ہنسی کے ساتھ اُس کی بات مانی، اور اُس کے ہاتھوں سے نوالہ اٹھا لیا۔ جیسے ہی وہ اُس کے نوالے کو لبوں سے لگانے لگی، معارج کی نگاہیں اُس کی آنکھوں میں ٹھہر گئیں۔ وہ مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا، ”تمہاری آنکھوں کا رنگ تو پہلے کبھی بادامی سا نہیں تھا؟“۔

ایمان نے ہلکی سی ہنسی دبا کر جواب دیا، ”ہو سکتا ہے، شاید تمہارے پاس جو میری تصویر ہو اُس میں میں نے لپنس لگائے ہوں۔ ورنہ میری آنکھیں ہمیشہ سے بھوری ہی ہیں!“ اُس کے چہرے پر ایک معصومانہ شرارت تھی۔۔

معارض نے ذرا اور قریب ہوتے ہوئے کہا، ”اور تمہارے بالوں کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔“

ایمان نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ”ہائے یار! اصل میں میں گنجی تھی، اپنے بالوں سے نفرت تھی مجھے۔ اس لیے سر گنجا کروا کر وگ پہن لیتی تھی!“۔ اُس نے اپنی آنکھیں مچکائیں اور جھجھکتے ہوئے اپنا سر اوپر اٹھایا، گویا وہ اپنی بات پر خود بھی حیرت زدہ ہو۔

ایمان کی بات سن کر معارج ہنسی کو بمشکل روک پایا اور خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا، جیسے اُس کی بات کو بغیر الفاظ کے محسوس کر رہا ہو۔

ایمان، جو پہلے ہی اپنی ہی بات پر ہنس رہی تھی، نے اُس کی جانب دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی، ”کیا ہوا؟ میں نے تو ابھی کچھ بولا ہی نہیں اور تم ہنس رہے ہو!“

معارض نے ہنس کر کہا، ”تمہاری ہنسی نے مجھے بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا!“۔

ایمان نے اپنے ماتھے پر ہلکی سی چپت لگائی اور بولی، ”اوہ خدا! مجھے اپنا وہ چھپری زمانہ یاد آ گیا!“۔

معارض کی بھنویں ذرا اوپر اٹھیں، اور وہ مسکراتے ہوئے بولا، ”چھپری؟“ اُس کے لہجے میں دلچسپی اور محبت کی آمیزش تھی۔

ایمان نے شوخی سے جواب دیا، ”ہاں، چھپری زمانہ جاہلیت!“ وہ خود بھی اپنی بات پر ہنسی دباتے ہوئے اُسے دیکھنے لگی۔

ایمان نے لمحے بھر کو توقف کیا اور پھر بولی، ”یار، جب میں چودہ سال کی تھی نا، تو بتاؤں؟ کیا ہوا تھا؟ میں نے اپنے بالوں کی سپائیکس بنائی تھیں!“۔

اُس کے ذہن میں یکدم اپنی پرانی تصویر ابھری اور وہ ہنسی سے بے قابو ہو گئی۔ معارج اُسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا، اُس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، لیکن ایمان خود پر قابو نہ رکھ پائی۔ وہ ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی، ”سپائیکس! جانتے ہو؟ وہ مرغے کے تاج کی طرح نہیں ہوتا؟ میرے بال رنگ برنگے تھے!“۔

اُس کی ہنسی سے کمرے کی فضا گونج اُٹھی، اور وہ اپنا چہرہ معارج کے سینے میں چھپا کر زور سے ہنسنے لگی۔ معارج کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ وہ اُسے دیکھ کر خوش تھا، اُس کی خوشی میں جیسے معارج کی ساری دنیا سمٹ آئی تھی۔

ایمان نے تھوڑی دیر بعد خود کو سنبھالتے ہوئے پیچھے ہٹ کر، آنکھوں میں چمک لیے، شرارتی انداز میں کہا، ”تمہیں پتہ ہے؟ اگر تم اُس لمحے مجھے دیکھتے تو یقیناً کہتے، یہ کون سی جو کر ہے؟ تمہیں میں تمہاری ماما کی طرح نہیں، بلکہ باولی اور رنگین سی لگتی!“۔

معارض نے نرمی سے نفی میں سر ہلایا، پھر اُس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُس کے لمس میں ایک محبت بھری سنجیدگی تھی۔

۔ ”تمہیں جو کر کہنا تو دور کی بات ہے، اگر اُس وقت بھی تمہاری ایک جھلک ملتی، تو میں شاید اُسی پل تمہاری محبت میں گرفتار ہو جاتا۔ تمہاری مسکراہٹ ہمیشہ میرے لیے سب سے حسین تھی، جیسے جنگل میں ہریالی کی پہلی کرن یا کسی قدیم دریا کا پرسکون بہاؤ۔

جو دل کو چھو جائے، وہ کبھی ظاہری حالت کا محتاج نہیں ہوتا۔ تم ہمیشہ سے میری نظر میں خاص تھیں، اُس وقت بھی اور آج بھی۔“۔

ایمان نے شرم سے نظریں جھکا لیں، ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر تھی۔ معارج نے اُس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا، ”اچھا، ایک بات تو بتاؤ۔۔۔“۔

ایمان نے فوراً سر اٹھایا اور شرارت سے بولی، ”تم یہ اچھا ایک بات بتاؤ مت کہا کرو۔ جیسے ہی یہ سنتی ہوں، دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔“۔

معارج مسکرایا اور بولا،۔

۔ ”بہتر! ٹھیک ہے۔ اب تم بتاؤ، تمہاری طبیعت کو ٹیٹو سے گریز ہے، اور میرے جسم کا کونہ کونہ ان کے نقوش سے مزین ہے۔ حیوانات کے نقش و نگار، یک چشم شمشیر کی ہیت، اور نہ جانے کون کون سی عجیب الخلق تصاویر۔ تمہاری لطیف ذوق کو تو یہ سب کچھ بالکل بھی گوارا نہ ہوگا، ہے نا؟۔“

ایمان نے تھوڑی سی سنجیدگی اور محبت بھری نرمی سے جواب دیا،۔

۔ ”ہاں، بے شک مجھے ٹیٹو کا کوئی خاص شغف نہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ تمہاری ہر ادا، ہر رنگ ڈھنگ میرے لیے دلکش ہے۔ تم جیسے بھی ہو، تمہاری تمام حالتیں میرے لیے بے پناہ اہمیت رکھتی ہیں۔

جہاں تک ٹیٹو کا تعلق ہے، وہ تمہارے ماضی کی ایک علامت تھے، ایک ایسی نشانی جو شاید اب مدھم پڑ چکی ہے، لیزر سے دھندلا تو دیا، لیکن جسم کا حصہ کاٹنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے لیے تمہاری ذات مقدم ہے، باقی تمام چیزیں اس کے مقابلے میں حقیر اور بے معنی ہیں۔“۔

معارج نے ہلکا سا سر ہلایا، اُس کے چہرے پر مسکراہٹ نمایاں ہوئی۔ ایمان نے جیسے ایک خیال کے تحت کہا، ”یار، ہماری دوستی کتنی جلدی ہو گئی، سمجھو تو جیسے ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ ہماری انڈر سٹینڈنگ لا جواب ہے نا؟۔“

معارج کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آئی اور اُس نے دھیرے سے کہا، ”شاید یہ دل کا رشتہ ہے، تب ہی اتنی جلدی گہرا ہو گیا۔“

ایمان نے مسکراتے ہوئے اُس کی بات پر سر ہلایا، اور بولی، ”بالکل! شاید دل کو دل سے راہ ہے۔“

وہ دونوں دوبارہ ناشتہ کرنے لگے۔ جب ایمان نے دھیماسا پکارا، ”معارج۔“

معارج نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، ایک ٹکڑا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے بولا، ”جی، فرمائیے۔“

ایمان کی آواز میں ایک عجیب سی گہرائی تھی، ”تمہیں معلوم ہے، میں نے اپنے گھر والوں سے بدلہ کیسے لیا تھا؟“

معارج نے اپنی بھنویں ہلکی سی اٹھائیں اور گویا ہوا، ”تفصیل تمہارے لبوں سے سننے کی خواہش ہے، بتاؤ۔“

ایمان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آئی، ”میں نے اپنے والد کی کمپنی سے بیس کروڑ روپے نکال لیے تھے۔“

معارج کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقص کرنے لگی، ”بیس کروڑ؟“

ایمان نے ذرا سنجیدہ لہجے میں کہا، ”ہاں، میں اتنی سادہ نہیں کہ سب کچھ چھوڑ کر اُن کے لیے خود کو قربان کر دیتی۔ کمپنی میں میرا بھی حصہ تھا، اور میں نے اپنا حق وصول کیا۔ میرے والد اتنے مگن تھے اپنی کامیابیوں میں کہ انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ میں نے اتنی بڑی رقم نکال لی۔ اس کے ساتھ میں نے سونے کے زیورات بھی خریدے، تاکہ اگر کبھی مشکل وقت آئے تو وہ میرے کام آئیں۔ ان پیسوں سے میں نے اپنا کاروبار کھڑا کیا، اپنی تعلیم مکمل کی۔ میں تو شروع سے قابل تھی، بس موقع کی کمی تھی، اور جب موقع ملا تو میں نے اسے ضائع نہیں ہونے دیا۔“

معارض نے شفقت بھری نظروں سے اسے دیکھا، اور نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ”تم پر فخر ہے مجھے۔“ پھر وہ آگے بڑھا اور محبت سے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

ایمان نے جلدی سے کہا، ”اوہ، معارج! جلدی کرو، ناشتہ ختم کرو!“ وہ کرسی سے اٹھ کر تیزی سے کمرے کی جانب بھاگتے ہوئے بولی، ”مجھے بھی تیار ہونا ہے!“

ایمان آئینے کے روبرو خاموشی سے ایستادہ تھی۔ آئینہ، جو دیوار سے جدا فرش پر رکھا تھا، دوسرا ایمان کے پیچھے کھڑکی سے برف پوش پہاڑوں کا جادوئی منظر صاف دکھائی دے رہا تھا، جہاں بادل گھومتے ہوئے پہاڑوں کا طواف کر رہے تھے۔

فضا میں ایک پُر سکون اور خاموش گہری کیفیت پھیلی ہوئی تھی، گویا یہ منظر کسی عارفانہ خواب کا حصہ ہو۔

ایمان نے شاہی (رائل) نیلا عبایا زیب تن کیا ہوا تھا، جس کا دامن تلی کی پتیوں کی مانند پھیلا ہوا تھا۔ عبایا کے کشادہ آستین ہوا میں خفیف حرکت کر رہے تھے، اور وہ اپنے بالوں کو سمیٹتے ہوئے ایک نفیس گندھے ہوئے جوڑے میں باندھ رہی تھی۔ اسی اثناء میں شیشے کی سطح پر معارج کا عکس نمودار ہوا، جو چینجنگ روم سے آہستہ آہستہ باہر قدم رکھ رہا تھا۔

معارج نے سیاہ رنگ کی نفیس ڈریس شرٹ پہنی تھی، جس کے اوپری دو بٹن ہمیشہ کی طرح کھلے تھے، اور اس کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے قدموں میں چیلسی بوٹس سجے ہوئے تھے، اور چاکلیٹ براؤن پینٹ کی نفاست نے اس کے وجیہہ خدو خال کو اور نکھار بخشا تھا۔

وہ آہستگی سے ایمان کے قریب آیا، نرمی سے اپنے بازو ایمان کے گرد ڈال دیے اور اپنی تھوڑی کو اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔ دونوں کے عکس آئینے میں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے تھے۔ معارج نے ایک لمحے کے لیے آئینے میں اپنی اور ایمان کی تصویر کو محبت سے دیکھا، اور پھر دھیرے سے بولا، ”ہم دونوں ایک ساتھ کتنے خوبصورت لگتے ہیں، جیسے تخلیق کا کوئی شاہکار ہوں۔“

ایمان کی ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹ ابھری، ”ہاں، یہ سچ ہے۔“

معارض نے پیچھے ہٹتے ہوئے نرمی سے اس کے بالوں کو جوڑے کی صورت دینے لگا، جیسے وہ کسی نایاب شے حسن کو تراش رہا ہو۔ ایمان نے اس کے عمل کو ستائشی نگاہوں سے دیکھا اور ہونٹوں کو ذرا سا بھینچتے ہوئے ہلکی مسکان میں ڈوبی رہی۔۔

معارض نے عبایا کے گلے پر لگی پن کو احتیاط سے نکالا اور اس کے ریشمی بالوں کو بڑے سلیقے سے باندھ دیا۔ ایمان نے اس کی محبت بھرے لمس کو محسوس کیا اور کمرے میں خاموشی مزید گہری ہو گئی، گویا محبت کی یہ نرم گرم لہریں سب کچھ تھامے ہوئے ہوں۔

دفعۃً ایمان آہستہ سے مڑی اور اپنے رخ کو معارج کی جانب کر لیا۔ میز پر رکھا پر فیوم اٹھا کر وہ معارج کے کسرتی سینے پر پر فیوم لگانے لگی، جیسے اُس کے لمس سے خوشبو میں ایک نیا احساس جاگ اٹھے۔ پھر وہ تھوڑا سا جھکی اور پر فیوم کی مہک کو قریب سے سونگھا، گویا وہ معطر ہوا میں اُس کی محبت کو محسوس کر رہی ہو۔

معارض نے نرمی سے اپنی گردن جھکائی اور شفقت بھری محبت سے ایمان کی پیشانی پر بوسہ دیا، جیسے وہ اُس کے وجود کو اپنی قربت سے مکمل کر رہا ہو۔

ایمان پیچھے ہٹتے ہوئے ہلکی سی مسکان کے ساتھ بولی، ”اب ایسا کرو، نقاب بھی تم ہی پہنادو۔“

معارج کے لبوں پر گہری مسکان آئی۔

”Delightedly“

(بشوق)۔

وہ پیچھے ہٹا، بیڈ پر رکھا نقاب اٹھایا اور اُسے بڑے سلیقے سے ایمان کو پہنایا۔ اُس کی مہارت سے نقاب ایمان کے چہرے کو کسی نایاب فن پارے کی طرح سنوار رہا تھا۔

جب ایمان پوری طرح نقاب میں ملبوس ہوئی، معارج نے اسے اپنی جانب کرتے ہوئے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا، ”تم نقاب میں بھی قدرت کی وہ نشانی لگتی ہو، جو کائنات کے حسن کا بہترین اظہار ہے۔“

پھر وہ جھکا اور دوبارہ ایمان کی پیشانی پر نرمی سے بوسہ دیا، جیسے اُس کی محبت کو مضبوط کر رہا ہو۔ وہ دھیرے سے گویا ہوا، ”مجھے یوں لگتا ہے جیسے تمہارا وجود میری زندگی میں اُسی طرح نازل ہوا ہو، جیسے طوفانوں کے بعد ایک نایاب رحمت کا سایہ چھا جائے۔ تمہاری قربت میری ہر آزمائش کا نعم البدل ہے، گویا تمہارے وجود میں مجھے وہ جنت ملی ہے جو رب نے میری ہر صبر کی بدلے میں عطا کی ہو۔“

یہ جملے معارج کے دل کی گہرائیوں سے نکلے اور ایمان کے دل میں محبت کی لہریں دوڑنے لگیں۔

سڑک پہاڑوں کے بیچ بل کھاتی ہوئی خوابیدہ مناظر کے درمیاں گزرتی چلی جا رہی تھی۔ ایک جانب فلک بوس پہاڑ اپنی عظمت و سکوت کا مظہر تھے اور دوسری جانب سبزہ زاروں میں کسانوں کی سادہ زندگی کا منظر تھا، جہاں زمین پر جھکے محنت کش بل چلاتے اور کھیتوں میں فصل کاٹتے دکھائی دے رہے تھے۔

ہوا میں تازگی کا احساس، دور دریا کا خاموش بہاؤ اور ہنزہ کی وہ مٹی جو اپنی مہک میں دلوں کو سحر میں جکڑنے کا فن جانتی ہے۔

معارج کی نظریں ایمان کی طرف سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ وہ اسے اس انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے آج پہلی بار اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پارہا ہو۔ ایمان نے ہنستے ہوئے نرمی سے کہا، ”معارج، سامنے دیکھو! میرا جائزہ بعد میں بھی لیا جاسکتا ہے۔“

ایمان کی مسکراہٹ نے جیسے معارج کو جکڑ لیا تھا۔ وہ خود بھی مسکرا دیا، جیسے ہر لمحہ اب مسکراہٹ میں ڈھل چکا ہو۔ ”ایمان، تمہیں پتہ ہے؟ تمہاری خوبصورتی ہنزہ کی ان وادیوں جیسی ہے، جو دلوں کو مسخر کر لیتی ہیں۔ تمہارا دل بھی اتنا ہی پاکیزہ اور شفاف ہے جتنا یہاں کا نیلا آسمان۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں جیسے کوئی اپنی زندگی سے محبت کرتا ہے، اور تمہاری قدر میرے لیے ایسی ہی ہے جیسے کوئی اپنی سانسوں کی قدر کرتا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرا ہاتھ اسٹیرنگ پر مضبوطی سے رکھا۔ ایمان کی آنکھوں میں شرم اور محبت کی ملی جلی کیفیت تھی۔ مدھم لہجے میں بولی، ”مجھے یقین نہیں آتا کہ میں یوں محبت بھرے انداز میں تم سے بات کر رہی ہوں، حالانکہ میں نے ہمیشہ سوچا تھا کہ شاید مجھے کبھی محبت نہ ہو۔“

معارض کے ہونٹوں پر ایک اور مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایمان نے سر جھکا کر مزید کہا، ”سچ تو یہ ہے کہ میرے دل کی ہر دھڑکن اب تمہارے نام پر دھڑک رہی ہے۔“

معارض نے نرم انداز میں کہا، ”تمہارا دل میری زندگی کی وہ دھڑکن ہے جو کبھی تھم نہیں سکتی۔“

ایمان کی نظریں لمحہ بھر کے لیے معارج پر ٹھہر گئیں۔ ”کتنی عجیب بات ہے نا، پہلے مجھے لگتا تھا کہ مرد تو جیسے زہر ہوتے ہیں، لیکن جب میں نے حاشر انکل، بہزاد بھائی اور پروفیسر تراب کو دیکھا، تو میرا نظریہ بدلنے لگا۔ اور پھر تم سے ملنے کے بعد تو میں نے جانا کہ مرد واقعی دل کے کتنے صاف اور خوبصورت ہو سکتے ہیں۔“

اس کی آواز میں گہری محبت کی لہر تھی۔ ”معارض، تم میرے سخت ترین دنوں کا بدلا ہو، وہ تحفہ ہو جو اللہ نے مجھے نوازا ہے۔“

معارض نے محبت بھرے انداز میں اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے اپنے سینے سے لگا لیا۔ گاڑی چلاتے ہوئے کہا،

۔ ”تم میرے دل کی وہ دھڑکن ہو، جو زندگی کی ہر لے میں تمہیں ہی تلاش کرتی ہے۔ جب تک یہ دل دھڑکتا ہے، اس کے ہر ذرے میں تمہارا نام بسا ہوا ہے۔ ایمان، تم وہ چراغ ہو جس نے۔ میرے دل کی تاریک گلیوں میں روشنی بھری ہے۔ تمہارے وجود نے مجھے احساس دلایا کہ میں محض ایک جسم نہیں، بلکہ ایک دل رکھنے والا انسان ہوں۔ تمہاری محبت نے میری روح کو نکھارا اور مجھے مکمل کیا۔“

ایمان نے شرارتی انداز میں ہنستے ہوئے کہا، ”اچھا! تو اگر دل ایکسپائر ہو گیا تو تم میرے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہو گے، کیا خیال ہے؟“

معارض نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا،۔

۔ ”چاہے ہم زمین کی آغوش میں آٹھ فٹ نیچے دفن کیوں نہ ہو جائیں، میری روح تمہارے بغیر کبھی قرار نہیں پائے گی۔ جسم اور دل کا رشتہ ایسا ہے کہ وہ فنا کی قید سے بھی آزاد ہوتا ہے، جہاں بھی جاؤں گا، تمہارے ساتھ رہوں گا۔ محبت ایسی شے ہے جسے نہ موت توڑ سکتی ہے نہ خاک اسے مٹا سکتی ہے۔“

ایمان نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا،۔

۔ ”آخر کار ہمیں اپنی اپنی قبروں میں جانا ہے، مگر ہماری محبت کی خوشبو وہاں بھی ساتھ رہے گی، جیسے روح کبھی بدن سے جدا نہیں ہوتی۔“

معارض نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا،۔

۔“ہم عالم برزخ میں ہوں گے، میری معصوم تتلی، اور وہاں قیامت تک کے انتظار میں ٹھہرے رہیں گے۔ پھر جب قیامت کا دن آئے گا، انشاء اللہ ہم جنت میں بھی اکٹھے ہوں گے، وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔”۔

ایمان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ معارج کی طرف دیکھا اور شوخی سے بولی،“ہاں، وہاں تمہیں حوریں ملیں گی ہیں نا؟”۔

معارض کی آنکھوں میں ایک چمک اُبھری، اس نے محبت بھری مسکان کے ساتھ جواب دیا،“تمہاری موجودگی میں وہ حوریں کیا معنی رکھتی ہیں؟ تم میرے لیے سب کچھ ہو، وہاں بھی میری دنیا تم ہی ہوگی۔ اگر تمہارے لیے حوریں ٹھکرانی پڑیں، تو انہیں بھی بے دریغ ٹھکرا دوں گا۔ تم ہو، تو بس تم ہی ہو، ہر جگہ، ہمیشہ میرے ساتھ۔”۔

یہ سن کر ایمان کی نظریں جھک گئیں، دل کی دھڑکن جیسے لمحہ بھر کو تیز ہو گئی ہو۔ دونوں کے درمیان وہ لمحہ یوں محسوس ہوا جیسے وقت تھم سا گیا ہو، اور ان کی محبت کی گہرائی ایک خاموش وعدے میں ڈھل گئی۔

....°....

وہ دونوں حاشر کے گھر کے باہر گاڑی روکتے ہیں۔ ایمان دروازہ کھولنے ہی والی تھی کہ معارج کی آواز نے اسے روک دیا۔ ”ٹھہرو، ساتھ چلیں گے۔“

ایمان نے پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھا۔ معارج نے مسکراتے ہوئے شرٹ کے اوپری بٹن بند کیے اور بازو پر لپٹی سیلیوز جلدی سے سیدھی کر کے بٹن لگا دیے۔

ایمان کی نگاہیں اس پر ٹکی رہیں، اور جب اس کی نازک مسکراہٹ نے چہرے کا احاطہ کیا تو معارج نے وضاحت دی، ”کیا کروں؟ عادت ہے، میں بٹن ہمیشہ کھلے رکھتا ہوں۔ سدھرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔“

ایمان نے تنبیہ کرتے ہوئے لیکن ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”گھر تک ٹھیک ہے، لیکن باہر تھوڑا خیال رکھا کرو۔“

معارج نے شرارتی انداز میں سر جھکایا، ”اوکے لیڈی بوس، جیسا آپ کا حکم۔“

باہر نکلتے ہی معارج نے ایمان کے لیے دروازہ کھولا، پھر دونوں نے گاڑی کے پچھلے حصے سے وہ شاہر نکالے جن میں نور اور حاشر کے لیے کپڑے، جوتے، اور پھل رکھے تھے۔ ایمان نے معارج کے ہاتھوں سے ایک شاہر زبردستی لینے کی کوشش کی، مگر معارج پیچھے ہٹ گیا اور محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولا، ”رہنے دو، میں کر لوں گا۔“

ایمان نے شرارت سے گھورتے ہوئے کہا، ”یار، اچھا نہیں لگتا، پلیز ایک شاہ پر ہی دے دو۔“

معارض نے نفی میں سر ہلایا، ”نہیں، تم بس آرام سے چلو۔“

ایمان ہار مانتے ہوئے ہنس پڑی، ”تم واقعی بہت ضدی ہو!“

معارض کی آنکھوں میں شوخی تھی، اور ایمان کے چہرے پر ایک چمکدار مسکان۔ وہ لمحہ یوں لگا جیسے ان کے درمیان خاموشی میں ایک حسین گفتگو چھپ گئی ہو، دونوں کے درمیان ایک ان کہی محبت کا اظہار۔

نور نے جیسے ہی دروازہ کھولا، اُس کے چہرے پر ایک نرم و گرم مسکراہٹ پھیل گئی۔

اُس نے آگے بڑھ کر ایمان کو گلے لگایا اور ماتھے پر محبت بھرا بوسہ دیا۔ ”میری بچی آخر کار آگئی ہے،“ نور نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

اسی لمحے حاشر بھی مسکراتے ہوئے باہر آیا۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی، ”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، دیکھو کون آیا ہے۔“

ایمان نے احتراماً سر جھکایا اور آگے بڑھی۔ حاشر نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دیتے ہوئے کہا، ”اسلام علیکم، ایمان بیٹی۔“

۔ ”وعلیکم السلام، حاشر بابا، ”ایمان نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

معارض، جس کے ہاتھوں میں شاپر تھے، پیچھے خاموشی سے کھڑا اس سارے منظر کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔
حاشر کی نظر اُس پر پڑی تو وہ مسکراتا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔ اُس نے معارج کی پیٹھ پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور بولا، ”مجھے معاف کر دو بیٹا، میں نے تم سے سچ چھپایا تھا، لیکن حالات نے مجبور کر دیا تھا۔“

معارض نے حاشر کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمسا مسکرا کر کہا، ”کوئی بات نہیں، حاشر صاحب، میں سمجھتا ہوں۔ ویسے بھی، ایمان میں ایک ایسی خوبی ہے کہ وہ کسی سے بھی کوئی بات منوا سکتی ہے۔“

نور نے محبت بھری نگاہوں سے ایمان کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی، ”یہ تو سچ ہے، ہماری ایمان تو جیسے ایک جواہر ہے، بے مثل۔“

ایمان نے اپنی ہلکی سی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا، ”چلیں، ناشتہ بناتے ہیں۔“

نور نے ہنستے ہوئے کہا، ”آدھا تو میں بنا چکی ہوں، باقی بھی سنبھال لوں گی۔ تم ایک کام کرو، اوپر جا کر دیکھو، تمہاری بلیاں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ کل سے مسلسل میاؤں میاؤں کر رہی ہیں اور گلہریاں بھی بے چین تھیں۔“

ایمان نے ہنس کر کہا، ”گلہریوں سے تو ملاقات ہو چکی ہے، اب بلیوں سے ملنا ہے۔“

حاشر نے معارج کے ہاتھوں سے شاپر لے کر کہا، ”اس کی کیا ضرورت تھی، بیٹا؟“

معارج نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”حاشر صاحب، کیسی باتیں کر رہے ہیں، یوں شر مندہ مت کریں۔“

حاشر نے شاہر ایک طرف رکھے اور معارج کو اپنے ساتھ لان میں لے جاتے ہوئے کہا، ”چلو، آؤ چائے پیتے ہیں اور کچھ گپ شپ کرتے ہیں جب تک ناشتہ بھی بن جائے گا۔۔۔“

معارج کے دل میں ابھی ابھی ایمان کی فکر ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے بولا،۔۔۔ ”میں تو ناشتہ کر چکا تھا، لیکن ایمان گوشت اور پراٹھوں کے چکر میں ٹھیک سے ناشتہ نہ کر پائی۔“ اُس کی مسکان میں ایک ہلکی سی تشویش چھپی ہوئی تھی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ قدم بہ قدم چل رہے تھے کہ حاشر نے مسکراتے ہوئے کہا، ”ہاں، ایمان کا یہ ہی معمول ہے، جب تک وہ پاکستانی طرز کار وایتی ناشتہ نہ کر لے، اس کا دن جیسے ٹھہر جاتا ہے۔ یا تو اُس کا بی پی لو ہو جاتا ہے، یا پھر مزاج میں تندی آ جاتی ہے۔“

معارج کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”بس، وہ ناشتہ کر لے تو میری پریشانی بھی کم ہو جائے گی۔“

حاشر نے محبت بھرے انداز میں معارج کا شانہ تھپکتے ہوئے اُسے آرام سے بیٹھنے کا اشارہ کیا، جیسے اُسے ایک باوقار مہمان کی طرح عزت دے رہا ہو۔ ”بیٹھو، چائے بھی ابھی آتی ہے، ساتھ باتیں کرتے ہیں۔“

معارض نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک گہری سانس لی، اُس کے چہرے پر وقار اور ذمہ داری کا عکس تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایمان کے لیے تشویش اور تحفظ کا جذبہ نمایاں تھا، جیسے وہ اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنے والا ایک سچا محافظ ہو۔

...°...

کچھ دیر بعد، معارج دبے قدموں ایمان کے کمرے میں آیا۔ ایمان کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی اپنی چیزیں ایک ڈبے میں ترتیب دے رہی تھی۔ معارج نے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک لمحے کے لیے اُسے دور سے دیکھا، اُس کی محویت، اُس کی معصومیت، اور پھر وہ ہلکا سا مسکرایا جیسے کوئی خاموشی سے کوئی راز جان گیا ہو۔

وہ دھیرے سے قریب آیا اور ہنستے ہوئے بولا، ”تمہیں پتہ ہے، تم بالکل سنڈریلا جیسی لگ رہی ہو۔“ ایمان نے چونک کر اُسے دیکھا، بھنویں سکیڑتے ہوئے اُس کے چہرے پر معصوم حیرت نمایاں تھی، ”کون؟ سنڈریلا؟“ اُس نے جیسے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

معارض نے ایک دلکش مسکان کے ساتھ اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے اُس کے ڈبے میں ہاتھ بٹانا شروع کیا، ”تمہیں واقعی نہیں معلوم سنڈریلا کون ہے؟“۔

ایمان نے نفی میں سر ہلایا اور ہنستے ہوئے بولی، ”نہیں، تم بتاؤ، وہ کون ہے؟“۔

معارج نے مسکراہٹ کے ساتھ گہری نظروں سے اُسے دیکھا، جیسے اُسے ایک دلکش کہانی سنانے والا ہو۔
”چلو، آج میں تمہیں سنڈریلا کی کہانی سناتا ہوں، اور ساتھ ہی دکھاتا بھی ہوں۔“

ایمان نے ہنستے ہوئے کہا، ”ٹھیک ہے، لیکن ایک شرط ہے، میں اپنی بلیوں کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گی۔
تمہیں بلیوں سے کوئی الرجی تو نہیں؟ کیوں کہ سندس کو تو الرجی ہے، وہ تو اس وقت عمرے پر ہے لیکن
جب وہ واپس آئے گی، میں یہاں بلیاں نہیں رکھنا چاہتی۔“

معارج نے ایک نرمی بھرے تبسم کے ساتھ جواب دیا، ”اگر مجھے بلیوں سے الرجی بھی ہوتی تو کوئی پرواہ
نہیں، تمہارے لیے کچھ بھی، میری پیاری بٹر فلائی!“

ایمان نے محبت بھرے نظروں سے اُسے دیکھا اور مسکرا کر بولی، ”اور میرا گھوڑا بادل؟ اُس کا کیا؟“
معارج نے شرارت سے جواب دیا، ”ہم جلد ہی تمہارے بادل کے لیے ایک خوبصورت اصطبل بنائیں
گے، گھر کے پچھلے حصے میں کافی جگہ ہے، وہاں سب ہو گا۔“

ایمان کی آنکھوں میں ایک خوابناک چمک پیدا ہوئی، جیسے وہ مستقبل کی تصویر بننے لگی ہو۔ وہ شیر انداز
میں بولی، ”اچھا، تو پھر فارم بھی بناؤ، جہاں مرغیاں، بکریاں اور بیل ہوں، اور سبزیوں اور پھلوں کا بھی
ایک خوبصورت باغ ہو!“

معارض نے اُس کی آنکھوں میں محبت سے جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا، ”اوکے، بٹر فلائے، تمہارے ہر خواب کو تعبیر ملے گی۔“

معارض سامان رکھتے رکھتے ایک دم رک گیا، اس کی نگاہیں شیلف پر جا ٹکیں۔ کتابوں کی قطار کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک ستائش کی جھلک ابھری۔

کتابیں، جنہیں ابھی تک کسی نے نہیں کھولا تھا، اتنی نئی کہ ان کی مہک تک تازہ تھی۔

کچھ ناول، کچھ تحقیقی مضامین، اور کچھ تاریخی قصے اپنی موجودگی کا اعلان کر رہے تھے۔

معارض اٹھا اور خاموش قدموں سے شیلف کی طرف بڑھا۔ تجسس آمیز نگاہوں سے کتابوں کے عنوانات کا جائزہ لیا، پھر ایک کتاب احتیاط سے اٹھا کر اس کے اوراق کو دلچسپی سے پلٹنے لگا۔

۔ ”ایمان، تم کتابیں نہیں پڑھتیں؟“ معارض نے اسے مخاطب کیا، جو اپنے بیگ کی ترتیب میں مگن تھی۔

۔ ”نہیں،“ ایمان نے سرسری انداز میں جواب دیا، بنا معارض کی طرف دیکھے۔

معارض نے پہلی کتاب واپس

رکھی اور ایک اور کتاب اٹھالی۔ اس کے لہجے میں نرم تنبیہ تھی، ”کتابیں ہمارے ذہن اور تخیل کو وسعت

دیتی ہیں۔ وہ وہ دروازے کھولتی ہیں جن سے ہماری سوچ کو پرواز ملتی ہے۔“

ایمان نے بے نیازی سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور بیگ میں ڈال دیا۔ وہ ہلکا سا مسکرا کر بولی، ”مجھے کتابیں نہیں پڑھنی پڑتیں، میں لوگوں کے چہروں سے سب کچھ پڑھ لیتی ہوں۔ کتابیں تو محض خیالات کا مجموعہ ہیں، خیالی دنیا میں قید لوگ جو حقیقت کا سامنا نہیں کر سکتے، وہ ہی ان میں پناہ لیتے ہیں۔“

معارج نے ایک سانس بھری، پھر جیسے دلائل کے پل باندھتے ہوئے کہا، ”کتابیں زندگی کا آئینہ ہوتی ہیں، قرآن بھی پڑھنے کی تاکید کرتا ہے، کیوں کہ علم کا راستہ پڑھنے لکھنے سے ہی کھلتا ہے۔“

ایمان نے ہلکی سی طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا، ”زندگی کو سمجھنے کے لیے کتابیں نہیں، انسانوں کے چہروں پر لکھی کہانیاں کافی ہوتی ہیں۔ وہ حقیقت جو آنکھوں کے سامنے ہو، اسے جھٹلانا ممکن نہیں ہوتا۔“ دفعۃً ایمان دھیرے دھیرے چلتی ہوئی معارج کے قریب آئی اور اس کے سامنے وہ ڈائری رکھ دی جو اس نے چپکے سے اس کے کمرے سے چرائی تھی۔

نرم اور گہرے لہجے میں گویا ہوئی، ”باقی کتابوں کا تو مجھے علم نہیں، مگر میں نے زندگی میں ایک انسان کی ڈائری پڑھی ہے۔ اس نے مجھے حوصلہ بخشا، اور مجھے بے حد رُلا یا بھی۔ جس نے یہ ڈائری لکھی، اس کی ذات پر مجھے بے پناہ فخر ہے۔“

معارج نے دھیرے سے ڈائری اٹھائی، تلخی اور مسرت کے امتزاج سے مسکراتے ہوئے بولا، ”یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تمہیں مجھ پر فخر ہے۔“

ایمان آہستگی سے اس کے اور قریب آئی، اس کا چہرہ اپنے نرم ہاتھوں میں تھام لیا، اور اس کی دونوں آنکھوں پر ہونٹ رکھ کر مدھم سی محبت بھری سرگوشی کی، ”جب بھی سوچتی ہوں کہ تم ان آنکھوں سے روئے ہو، دل چاہتا ہے کاش حالات مختلف ہوتے۔ میں تمہارے قریب ہوتی، تمہارے ہر آنسو کا مدد اپنے عشق کے لمس اور بے پایاں محبت سے کر سکتی۔۔۔“

معارض چند قدم پیچھے ہٹا اور ماحول کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے نرمی سے موضوع کو ہلکا کر دیا۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات کا رخ دوبارہ کتابوں کی طرف موڑتے ہوئے بولا، ”جو لوگ کتابوں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہیں، وہ دنیا کو اس زاویے سے دیکھنے لگتے ہیں جو عام نظر سے اوجھل رہتا ہے۔ ہر چیز ان کے لیے ایک منفرد مفہوم لیے ہوتی ہے، ایک ایسا پہلو جو دوسروں کی نظر میں نہیں آسکتا۔“

ایمان نے اس کے بدلتے لہجے کو محسوس کر لیا تھا اور جیسے وہ جانتی تھی کہ معارج نے کیوں موضوع بدلا ہے۔ وہ بھی فوراً سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس کی بات کا جواب دینے کو تیار ہوئی، لیکن اس کے انداز میں نرم لہجہ نمایاں تھا۔

۔ ”جو لوگ انسانوں کو پڑھتے ہیں،“ ایمان نے سخت مگر دل کو چھوتے ہوئے الفاظ میں کہا، ”وہ حقیقت کے کڑوے گھونٹ پہلے ہی پی چکے ہوتے ہیں۔ انہیں مزید کچھ تلاشنے کی ضرورت نہیں رہتی، کیوں کہ وہ ہی تلخ سچائیاں ان کے سامنے برہنہ ہوتی ہیں جنہیں لوگ کتابوں میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

حقیقت وہ زخم ہے جو دل پر نقش ہو جاتا ہے اور کتابوں کی سطریں کبھی اسے مٹانے میں کامیاب نہیں ہوتیں۔”

معارض نے اس کے الفاظ کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے نرمی سے کہا، ”کتابیں ان لمحوں میں دل کو تسلی دیتی ہیں جب زندگی کی حقیقتیں بے رحم ہو جاتی ہیں۔ وہ پناہ گاہ بن جاتی ہیں، ایک ایسی دنیا جہاں ہم خود کو بچا سکتے ہیں، چاہے کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی، اس حقیقت کی بے رحمی سے جس سے بھاگنا ممکن نہیں۔“

ایمان نے شکست خوردہ لہجے میں کہا، ”تمہارے سامنے کوئی جیت نہیں سکتا، معارج۔ واقعی، میں تمہارے آگے بے بس ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ آہستگی سے پیچھے ہٹی اور بیگ اٹھانے لگی۔

معارض نے اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے قریب آ کر بولا، ”ٹھیک ہے، مان لیا تم درست ہو۔ شاید واقعی خیالی دنیا میں نہیں جینا چاہیے۔“ اس نے بیگ اٹھایا اور باہر جانے لگا۔

ایمان نے نرمی سے اسے روک کر کہا، ”معارض صاحب۔“

معارض نے پلٹ کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا، ”جی، صاحب کی صاحبہ؟“

ایمان نے پیچھے پڑے پانچ بیگنز کی طرف اشارہ کیا اور ہنستے ہوئے کہا، ”یہ کون اٹھائے گا؟“

معارض نے انتہائی احترام سے سر جھکایا اور محبت بھرے لہجے میں کہا، ”آپ کا شوہر، اور کون؟ میں یہ نیچے رکھ کر آتا ہوں، پھر یہ بھی لے جاؤں گا۔“

وہ جانے لگا تو ایمان نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے ایک نرم مسکراہٹ بکھیری، جیسے دل کی گہرائیوں سے شکر ادا کر رہی ہو۔ اس کے دل میں یہ احساس بھرپور طریقے سے جاگزیں ہو گیا تھا کہ اللہ نے اسے ایک ایسی نعمت سے نوازا ہے جس کی وہ ہمیشہ منتظر رہی تھی۔

وہ حقیقتاً زندگی کی وہ انمول نعمت تھا جو اس پر مثل خواب اتر تھا جس کی موجودگی نے ہر پل کو گویا محبت کی جاودانی خوشبوؤں سے مہکا دیا تھا۔

...°...

اصطبل میں ایک خاموشی تھی، جسے ایمان کی نرم آواز اور گھوڑے کی ہلکی سانسوں نے بکھیر رکھا تھا۔ وہ بادل کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دے رہی تھی، جیسے ایک ماں اپنے بچے کو پیار دیتی ہے۔ ”جلد ہی، میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ فکر نہ کرو، بادل۔“ اس کی آواز میں ایک عجیب سا سکون تھا۔

معارض اصطبل کے ایک کونے میں، دیوار سے ٹیک لگائے، خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ بازو سینے پر باندھے، ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔ ”ایمان، ایک سوال ہے...“ اس نے لہجے میں ہلکی سی چمک کے ساتھ کہا۔ ”تمہیں بادل سے زیادہ پیار ہے یا مجھ سے؟“

ایمان کی آنکھوں میں حیرانی اور مسکراہٹ کا ملاپ تھا۔ ”تمہیں جانوروں سے بھی حسد ہونے لگی؟ حد ہے!“ وہ بادل پر توجہ مرکوز کیے ہنس دی۔

معارض نرمی سے آگے بڑھا، جیسے کسی چالاک شکاری کی طرح جو شکار کو قریب سے جانچتا ہے۔ بادل نے معارج کی قربت محسوس کی اور فوراً اس کی پنڈلی پر ہلکی سی لات ماری، جیسے اسے خبردار کر رہا ہو کہ وہ اس کی جگہ پر قبضہ نہ کرے۔

معارض کے چہرے پر ذرا بھی فرق نہ آیا، بلکہ اس نے بادل کی طرف نگاہ کی اور طنز آمیز انداز میں کہا، ”یہ میری بیوی ہے، بادل۔ یہ بات یاد رکھو!“۔

ایمان نے ہنستے ہوئے کہا، ”اوہ، معارج! وہ جانور ہے، اسے انسانوں کی باتیں کہاں سمجھ آئیں گی۔“۔

بادل نے جیسے اس کے جواب میں معارج کے پیٹ میں اپنا سر ٹکرایا، لیکن معارج کا جسم فولاد کی مانند تھا، وہ ذرا بھی نہ جھکا۔ بادل نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر سر ہلایا، جیسے شکست قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

معارض نے اسے ایک لمحے کے لیے آنکھوں میں دیکھا، جیسے کوئی بے زبان چیلنج ہو رہا ہو۔ ”تم میرے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے، بادل!“ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی جو بادل کی نفرت کو بڑھا رہی تھی۔۔

ایمان نے مسکراتے ہوئے بادل کو ایک آخری پیار دیا اور معارج کے قریب آکر اس کا ہاتھ پکڑا۔ ”چلو، اب تمہیں اور بادل کو لڑنے کا موقع نہیں دوں گی۔“

بادل نے خراٹے بھرے، جیسے وہ ناراض ہو، لیکن ایمان اور معارج دونوں اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ وہ دونوں ہاتھ پکڑے اصطبل سے باہر نکل گئے۔

پیچھے بادل نے ایک زوردار خفگی کے ساتھ اپنی ناک سے سانس کھینچا اور دیوار کولات ماری۔ جیسے وہ اعلان کر رہا ہو کہ وہ کسی کو اپنی جگہ نہیں دینے والا، خاص طور پر معارج کو۔

بادل کے اندر یہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ بادشاہ تھا، اور معارج کو اگلی بار دکھانا تھا کہ اصلی مالک کون ہے۔

...°...

ایمان اور معارج ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے حاشر اور نور کے گھر کی دہلیز پر الوداع کے لیے کھڑے تھے۔ حاشر نے آگے بڑھ کر معارج کو گلے لگایا، اور پھر نرمی سے ایمان کے سر پر ہاتھ رکھا، گویا ایک شفقت بھرے بزرگ کی دعائیں اسے مل رہی ہوں۔ اس کی نظریں ایمان پر ٹھہریں اور اس کے لبوں سے الفاظ پھوٹے، جو بظاہر نصیحت کے تھے مگر حقیقت میں ایک جہان معنی کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھے۔

۔ ”میری بچی، زندگی کی حقیقت یہ ہے کہ ہر مخلوق میں اچھائی اور برائی کا امتزاج ہوتا ہے۔ کبھی کبھار وہ ہی خون جو تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہوتا ہے، تمہیں سب سے زیادہ اذیت دیتا ہے، اور پھر کچھ اجنبی

ایسے ہوتے ہیں جو تمہیں اپنائیت کا احساس دلاتے ہیں، اپنا بنالیتے ہیں۔ تم نے خود دیکھا، کچھ لوگ تم سے نفرت کرتے تھے، تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے، لیکن دیکھو، اللہ نے ہمارے دلوں میں تمہارے لیے محبت بھر دی۔ یہ اُس کا کرشمہ ہے کہ معارج کی ماں کا چہرہ تمہارے جیسا تھا، اور جب معارج نے پہلی بار تمہیں دیکھا، تو وہ ایک لمحے میں تم سے وابستہ ہو گیا۔ تمہیں شاید اندازہ نہ ہو، لیکن تمہارے حق میں بے شمار دعائیں ہو رہی ہیں، نہ جانے کتنے دل تمہاری خوشی کے لیے جھکے ہوئے ہیں۔ ”نم

ایمان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے، مگر وہ مسکرا دی۔ اُس مسکراہٹ میں شکر گزاری کا ایک دریا تھا جو الفاظ میں ڈھلنے سے قاصر تھا۔ اس نے اپنے لرزتے لبوں سے کہا، ”آپ دونوں میرے لیے سب کچھ ہیں۔ آپ نے اُس وقت میرا ساتھ دیا جب مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ آپ نے میرے ساتھ ہمیشہ اپنی بیٹی جیسا سلوک کیا، اور میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ آپ دونوں کو اس احسان کا بہترین بدلہ دے۔“

نور نے آگے بڑھ کر ایمان کو سینے سے لگا لیا، گویا ماں نے اپنی بچھڑی ہوئی بیٹی کو پایا ہو۔ اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے اس نے نرم لہجے میں کہا، ”میری بچی، تم تو میری جان ہو، میری بیٹی ہو۔ ہمارے ہاں کوئی اولاد نہ تھی، لیکن جب تم ہمارے گھر آئیں، تب میں نے جانا کہ بیٹی کی ماں ہونے کا احساس کتنا خوبصورت

ہوتا ہے۔ تمہاری آمد ہمارے گھر کے لیے ایک رحمت تھی، تم میری خوشی ہو، میرے دل کی راحت ہو۔“

نور نے نرمی سے ایمان کے آنسو پونچھے اور مسکرا کر کہا، ”اب کبھی ان آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔ میں جس ایمان کو جانتی ہوں، وہ دشمنوں کو رلانا جانتی ہے، خود رونا نہیں۔“

ایمان نے اپنے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا، ”نور امی، آپ بس میرے اور معارج کے لیے دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں بہترین زندگی دے، اچھا مستقبل عطا کرے، اور ہم اپنی اولاد کو بے پناہ محبت دیں۔“

نور نے ایمان کے گال پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور آنکھوں میں دعا بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”ان شاء اللہ، میری بیٹی۔ اللہ تمہارے نصیبوں کو روشن کرے، اور تمہارے گھر میں ہمیشہ خوشیاں برکت کے ساتھ آئیں۔“

معارج نے احترام سے سر جھکایا، نور نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دی، ”خوش رہو، آباد رہو میرے بچے۔ اللہ تم دونوں کو بہت دے، تم دونوں کی جوڑی ہمیشہ ایسے ہی خوشبخت، خوبصورت اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت میں بندھی رہے۔“

ایمان اور معارج نے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور قدم باہر کی طرف بڑھا دیے۔ جیسے ہی وہ دروازے سے نکلے، نور اور حاشر نے محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ انہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ ان کے

دلوں میں فخر اور مسرت کا عجیب سا امتزاج تھا۔ ان کی نظریں دور جاتے ہوئے ایمان اور معارج کے قدموں پر جمی تھیں، اور ان کے دل اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ انہوں نے اس بیٹی اور داماد میں اپنی زندگی کا حقیقی سکون اور خوشی پائی۔

نور نے حاشر کی طرف دیکھا اور کہا، ”اللہ کا کرم ہے، ہم پر یہ نعمتیں ہیں۔“

حاشر نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا، ”ہاں، اللہ ان دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے، اور ان کے نصیبوں کو سدا روشن کرے۔“

...°...

معارج بڑے انہماک سے درخت کے ساتھ لگی شاخوں میں گلہریوں کا نیا گھر نصب کر رہا تھا۔ اس کا کمرہ، جو گھر کے بلند حصے میں واقع تھا، بڑی شیشے کی کھڑکی سے مزین تھا۔ یہ وہ شیشہ تھا جسے ون وے مرر کہتے ہیں، جس سے وادی کا دلکش نظارہ کر سکتے ہیں لیکن باہر سے کوئی اندر کی حقیقت تک رسائی نہیں رکھ سکتا تھا۔ کھڑکی کے پار پھیلا ہوا منظر خواب و خیال کی طرح حسین تھا؛ سامنے ہنزہ کی وادی کا سبزہ، نیلا آسمان، پہاڑوں کی چوٹیاں اور نیچے بہتا دریا، ہنزہ، ایک مجسم خوبصورتی کی شکل میں نظر آتے تھے۔

نیچے ایمان درخت کے قریب کھڑی مسکراہٹ بھرے چہرے کے ساتھ معارج کو ہدایات دے رہی تھی، اس کی نظروں میں محبت اور فطرت کے ساتھ گہرا تعلق واضح تھا۔

جانوروں سے اس کی محبت اسے ان چھوٹی گلہریوں کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ بنانے کی ترغیب دے رہی تھی، جیسے یہ ننھے وجود اس کے دل کے قریب ہوں۔

ان گلہریوں نے، جو اپنے ننھے پنجنوں سے درخت کے گرد چکر لگا رہی تھیں، آنکھوں میں حیرت اور خوشی سمیٹے معارج کی حرکات کا مشاہدہ کر رہی تھیں، جیسے وہ یہ جان رہی ہوں کہ ان کے لیے کوئی خاص تحفہ تیار ہو رہا ہے۔

ایمان نے اپنی گردن اٹھائی، درخت کی طرف نظر کی، اور بولی، ”ہاں، یہ ٹھیک ہے، بالکل مناسب جگہ ہے۔ یہ بہت خوبصورت لگ رہا ہے، اب نیچے آؤ۔“ اس کی آواز میں محبت کی نرمی اور خیال کا عنصر جھلک رہا تھا۔

معارج نے درخت سے نیچے اتر کر اپنی بیوی کے ساتھ قدم ملایا۔ گلہریاں، جو اس دوران اپنا نیا گھر بننا دیکھ رہی تھیں، خوشی سے شاخوں پر چڑھ کر اپنے نئے آشیانے میں داخل ہو گئیں۔ وہ اپنے ننھے ننھے چہروں کو سوراخوں سے باہر نکالے، خوشی سے چہچہا رہی تھیں، جیسے ان کے دل کو یہ جگہ بہت پسند آگئی ہو۔ معارج نے مسکراتے ہوئے کہا، ”لگتا ہے انہیں یہ بہت پسند آیا ہے، یہ چھوٹی مخلوق کتنی ذہین اور چالاک ہیں۔“

ایمان نے سر ہلایا، اور اس کی نظروں میں ایک چمک پیدا ہوئی، ”ہاں، بے شک یہ بہت ذہین ہیں اور بہت معصوم بھی۔ مجھے امید ہے کہ یہ یہاں خوش رہیں گی۔ اور جب ہمارا فارم مکمل ہو جائے گا، تو ہم بادل کو بھی یہاں لاسکتے ہیں۔“

وہ اپنے گھوڑے بادل کا ذکر کر رہی تھی جو ابھی تک حاشر کے اصطبل میں تھا، لیکن اسے یہاں لانے کا منصوبہ ایمان کے دل کو خوشی سے بھر دیتا تھا۔

معارض بادل کے خیال سے مسکرایا۔ اس کے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جس میں ایک خفیہ منصوبے کا اشارہ تھا، کیوں کہ بادل کے لیے اس کے ذہن میں ایک خاص سرپرائز تھا، جس کا وہ ایمان سے ابھی ذکر نہیں کر رہا تھا۔

اس نے شرارتی انداز میں کہا، ”ہاں، اسے یہاں لانے میں واقعی بہت مزہ آئے گا، اسے یہ جگہ بہت پسند آئے گی۔“

وہ اپنے منصوبے کے بارے میں سوچتے ہوئے دل ہی دل میں مسکرایا، اور ایمان اس کے انداز کو نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرا دی۔

- ”ٹھیک ہے، چلو اب اندر چلتے ہیں، مجھے ہمارے لیے کچھ پکانا ہے۔“ ایمان نے پیار سے کہا، اور معارج کا ہاتھ تھام کر اسے گھر کی طرف لے گئی۔

راستے میں، ہوا کے نرم جھونکے ان کے چہروں کو چھو کر گزر رہے تھے، جیسے قدرت خود انہیں خوش آمدید کہہ رہی ہو۔ درختوں پر چہچہاتے پرندے، فضا میں معطر پھولوں کی مہک، اور کھیتوں میں کھلتے ہوئے رنگ برنگے پھول، سب مل کر اس منظر کو خوبناک بنا رہے تھے۔

وہ چلتے چلتے ہوا کی تازگی میں سانس لیتے رہے، اور پھلوں کی خوشبوؤں سے فضا معطر ہو رہی تھی۔ دونوں نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انہیں اتنی حسین زندگی اور اتنی خوبصورت جگہ سے نوازا تھا۔

-- ...°...

معارج اور ایمان باورچی خانے میں تھے، ایک دوسرے کی صحبت کا لطف اٹھا رہے تھے۔ باورچی خانہ کشادہ اور روشن تھا، جہاں سے ایک بڑی کھڑکی سیدھا دریا کی طرف کھلتی تھی، جس کے پر سکون بہاؤ کو معارج وقتاً فوقتاً دیکھ لیتا تھا۔ سنک اور ڈش ریک کھڑکی کے سامنے نصب تھے، اور ان کے پیچھے لکڑی کی خوبصورت شیلفیں تھیں جن میں برتن ترتیب سے سجے ہوئے تھے۔

ایمان دائیں جانب چولہے کے پاس کھڑی تھی، چولہے کے عین اوپر دھواں نکالنے والی مشین نصب تھی، دفعتاً ایمان اپنی مہارت سے گریوی میں چمچہ چلا رہی تھی۔

اس کے ہاتھوں کی ہلکی جنبش سے کچن میں خوشبو اور سکون کا احساس پھیل رہا تھا۔

معارض نہایت توجہ سے برتن دھو رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں اسپنج نرمی سے پلیٹوں کو صاف کر رہا تھا۔ اُس کے سامنے دریا کی لہروں کا ہلکا سا شور تھا جو اس کے دل کو مزید سکون بخش رہا تھا۔ ایمان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، جیسے وہ اس وقت کی گہرائی میں کھوئی ہوئی ہو۔

برتن مانجھتے ہوئے معارج نے یکدم ایمان کی جانب نظر اٹھا کر کہا، "تم تو فرما رہی تھیں آج کھانا میں تیار کروں گا۔"

ایک لمحے کو گردن خفیف سا گھما کر اس نے ایمان کی طرف دیکھا، پھر بے تکلفی سے دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

ایمان ہنستے ہوئے بولی، "اگر میں تمہیں کہوں کہ کنویں میں چھلانگ لگا دو، تو کیا تم لگا دو گے؟"۔ اس کے لبوں پر ایک شوخ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شرارت۔

معارض نے سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے کہا، "تمہارے لیے کچھ بھی، میری محبت۔ کنواں تو کیا، اگر تم مجھے آگ میں بھی کودنے کو کہو، تو میں خوشی سے کود جاؤں گا۔"

ایمان نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے نرمی سے کہا، ”خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو، معارج۔ ہم دونوں اب ایک ہیں، ایک کو چوٹ لگے گی تو درد دوسرے کو بھی محسوس ہو گا۔ ہمیں ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہے، ورنہ یہ ساتھ بے معنی ہو جائے گا۔“

معارج نے اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر بولا، ”تم صحیح کہتی ہو، میری جان۔ میں نے تو ہمیشہ تمہیں اپنی دعاؤں میں مانگا ہے، تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

ایمان نے ٹرے اٹھائی اور اس میں چاول نکالنے لگی۔ باورچی خانے میں مزیدار خوشبو پھیل گئی جس نے معارج کو اور بھی قریب کھینچ لیا۔

۔ ”واہ، کیا خوشبو ہے!“ معارج نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ایمان کے لبوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے نرمی سے کہا، ”پانچ سال قبل تو مجھے کھانا پکانے کی الف بے بھی نہیں معلوم تھی، نور امی کا شکر ہے جنہوں نے یہ سب سکھایا۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔“

معارج نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”اب تمہارے ہاتھوں میں تو جیسے ساری دنیا کے ذائقے سمٹ آئے ہیں۔“

ایمان ہنستے ہوئے بولی، ”ہاں، لیکن میری مہارت کا سہرا نور امی کے سر ہے، میں تو کچھ بھی نہیں تھی۔“۔

وہ دونوں کھانے کی میز کی طرف بڑھے، جہاں معارج نے نرمی سے ایک نوالہ ایمان کے منہ تک پہنچایا۔ ایمان نے محبت سے نوالہ کھایا اور پھر بولی، ”تم میں ایک ایسی مٹھاس ہے جو تمہارے ہاتھوں کے نوالے کو بھی میٹھا بنا دیتی ہے۔“۔

معارج نے شوخی سے جواب دیا، ”تم میری زندگی کی سب سے پیاری اور قیمتی شہ ہو، ایمان۔ تمہارے بغیر میرا وجود بے معنی ہے۔“۔

ایمان نے ہنستے ہوئے، محبت بھرے انداز میں کہا، ”تم واقعی بہت شفیق ہو، معارج۔ آج ہماری شادی کا پہلا دن ہے، مگر یوں لگتا ہے جیسے ہم صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھی ہوں۔ آج کا دن میری زندگی کا بہترین دن ہے، واقعی یہ یادگار ہے۔“۔

معارج نے مسکراتے ہوئے نرمی سے جواب دیا، ”یہ تو خوش آئند ہے، لیکن ابھی تو شروعات ہے۔ میں تمہارے ہر دن کو یادگار بنانے کا وعدہ کرتا ہوں۔“۔

معارج نے اُس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، ”یہ سچ ہے، میرے دل کی ہر دھڑکن تمہارے لیے ہے۔“

ایمان نے محبت سے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا، ”اور میری ہر سانس تمہارے ساتھ ہے۔ ہم کبھی الگ نہیں ہوں گے، انشاء اللہ۔ اللہ ہمیں ہمیشہ ایک ساتھ رکھے۔“

معارج نے ایمان کے بالوں کی ایک لٹ کو محبت سے اس کے کان کے پیچھے کیا اور کہا، ”تم میری زندگی کی سب سے قیمتی چیز ہو۔ اگر مجھے دنیا میں تمہیں اور کسی اور چیز کو چننا پڑے تو میں ہمیشہ تمہیں ہی چنوں گا۔“

ایمان نے معارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا، ”اور میں بھی تمہارے لیے وہی بنوں گی جو تم میرے لیے ہو۔ ہماری محبت ایسی ہے جو ہمیشہ قائم رہے گی، معارج، یہ رشتہ وقت کے ساتھ اور گہرا ہوتا جائے گا۔“

ایمان نے دھیرے سے معارج کی طرف دیکھا، جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو، پھر خاموشی سے چاولوں کا نوالہ بنا کر اس کے آگے بڑھا دیا۔ معارج نے اُس کی پیشکش کو محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ قبول کیا، نوالہ لیتے وقت اُس کی نظروں میں ایک ایسی شرارت جھلک رہی تھی جو لفظوں سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

ایمان نے ذرا سنجیدگی سے کہا، ”باتوں میں لگے رہے تو کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

معارج نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے نیم مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”کھانے کی فکر چھوڑو، ہماری محبت اتنی گرم ہے کہ اس کی حرارت کھانے کو بھی متاثر کرے گی۔“

ایمان نے ہنس کر کہا، ”اللہ معاف کرے، تم تو حد سے زیادہ شرارتی ہو، معارج۔“

معارج نے ہنس کر کہا، ”بس تمہارے ساتھ ہی یہ شرارتیں اچھی لگتی ہیں، ورنہ تو میں بڑا سنجیدہ ہوں۔“

پھر ذرا جھک کر اُس کی طرف آنکھ ماری اور کھانا کھانے لگا۔

...°...

رات کا آسمان ستاروں سے جگمگا رہا تھا، جیسے کسی نے سیاہ مخملی پردے پر ہیروں کی مالا لٹکا دی ہو۔ ہر ستارہ اپنی جگہ پر سکون سے چمک رہا تھا، مگر سب سے زیادہ دلکش چاند تھا، جو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ زمین پر چاندنی بکھیر رہا تھا۔

ان دونوں کے سامنے دریا کی خاموش موجیں چاندنی کو منعکس کرتے ہوئے آہستہ سے بہہ رہی تھیں، اور دور پہاڑ اپنی عظمت کا گواہ بنا کھڑا تھا، جیسے رات کی خاموشی میں بھی اپنے وقار کو برقرار رکھے ہوئے ہو۔

ہوائیں شبی پھولوں اور پھلوں کی مہک لیے چاروں طرف پھیل رہی تھیں، ہوا میں ایک لطیف سردی کا احساس تھا جو جسم کو تازگی بخش رہی تھی۔

معارض ایک گھنے درخت کے تنے سے اپنی پیٹھ ٹکائے بیٹھا تھا، جیسے وہ تنھن سے سستارہا ہو یا کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ اُس کا ایک پیرسیدھا زمین پر پھیلا ہوا تھا، اس کے جوتے کی نوک زمین سے ہلکا سا ٹکراتی ہوئی۔

دوسرا پیر گھٹنے سے اوپر اٹھا ہوا تھا، اور اس کا تلوا زمین کو چھو رہا تھا، جیسے وہ اس پوزیشن میں آرام محسوس کر رہا ہو۔

اس کی کالی شلوار قمیض پر گلے میں لپیٹی ہوئی شال، اُس کی شخصیت کو مزید گمبھیر بنا رہی تھی۔ ایمان اُس کے ساتھ بیٹھی تھی، اُس کے فراق کی سنہری لیس چاندنی میں چمک رہی تھی، اور اُس کے کھلے بالوں کی خوشبو معارج کی سانسوں میں بس گئی تھی۔ ایمان نے آہستگی سے اپنا سر معارج کے چوڑے سینے پر رکھا اور چاند کو تکتے ہوئے گہری سانس لی۔

فضا میں ایسی خاموشی تھی کہ جیسے رات نے خود کو بھی تھام رکھا ہو، مگر معارج کے دل کی دھڑکنیں اُس کے الفاظ سے پہلے ہی ایمان کو سنائی دینے لگیں۔ وہ مشتری کی طرف دیکھ رہا تھا، جہاں اس کے گرد چکر کاٹتے چاند واضح نظر آرہے تھے، جیسے وہ بھی اس لمحے کی گواہی دینے کے لیے حاضر ہوں۔

معارج نے ایمان کے ریشمی، شہد جیسے رنگ کے بالوں کو نرمی سے اپنی انگلیوں میں لپیٹتے ہوئے گہری آواز میں کہا، ”ایمان، جیسے یہ چاند ہمیشہ مشتری کے ساتھ چکر لگاتے ہیں، ویسے ہی میں ہمیشہ تمہارے گرد گھومتا رہوں گا۔ تم میری کائنات ہو، اور میں تمہارے بغیر ایک بے سمت ستارہ ہوں۔“

ایمان نے معارج کی اس بات پر مسکرا کر چاند کی طرف دیکھا اور پھر معارج کی طرف رخ کیا۔ اُس کی آواز میں محبت اور گہرائی تھی، ”معارج، تم میرے لیے چاند ہی نہیں، سورج بھی ہو، وہ سورج جو میرے دل کی دنیا کو روشنی دیتا ہے۔ تمہارے بغیر، یہ دنیا ادھوری ہے۔“

ایمان کے الفاظ میں ایسی سچائی تھی کہ معارج کے دل میں ایک نرمی سی اتر آئی۔ اُس نے ایمان کے بالوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ پھیرا اور اُس کے ماتھے پر نرمی سے بوسہ دیا۔ پھر اُس کی آواز میں ماضی کی جھلک ابھری، ”تم جانتی ہو، ایمان، جب میں مسلمان نہیں تھا، تو میں سوچتا تھا کہ مسلمان اُس خدا کی عبادت کیوں کرتے ہیں جو نظر نہیں آتا؟ پھر جب میں نے خود اُس کی تلاش شروع کی، تو اللہ نے مجھے اپنے ہونے کی نشانیاں دکھائیں۔ میں نے ایک بات سمجھی کہ جو لوگ سچائی کو دل سے تلاش کرتے ہیں، انہیں خدا ضرور اپنی قربت کا احساس دیتا ہے۔“

ایمان نے معارج کی طرف دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”ہاں، اللہ کی رہنمائی اُسی کو ملتی ہے جو اُس کی جستجو کرتا ہے۔ اور اُس کی رحمت بے حساب ہے، وہ ہمیں ہماری توقع سے بڑھ کر دیتا ہے۔“

معارج نے محبت بھری نظروں سے اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور نرم لہجے میں کہا، ”اور اُس کی رحمت دیکھو، اس دین کے ساتھ اُس نے مجھے تم جیسی محبت کرنے والی بیوی دی۔ تم میری سب سے بڑی خوش قسمتی ہو، ایمان۔“

ایمان نے مسکراتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور سرگوشی کی، ”تم میرے لیے سب کچھ ہو، معارج۔ میرے دل کی دنیا تمہارے گرد گھومتی ہے۔“

معارج نے محبت سے گردن جھکائی اور ایمان کی پیشانی پر نرمی سے بوسہ دیا۔ اُس کی گہری آواز میں ایک فکر تھی جب اُس نے پوچھا، ”ایمان، کیا تمہیں اس بات کی پرواہ ہے کہ لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟“

ایمان نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اپنا سر نفی میں ہلایا اور سنجیدگی سے بولی، ”نہیں، مجھے اس بات کی فکر نہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں یا کیا سوچتے ہیں۔ میرے لیے اہم یہ ہے کہ اللہ ہمارے بارے میں کیا رائے

رکھتا ہے۔ اور اُس کے بعد تم، کیوں کہ تم میرے شوہر ہو، میرے محافظ ہو، میرے قائد ہو، اور سب سے بڑھ کر میرے محبوب ہو۔”

ایمان کی بات سن کر معارج کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھری، مگر اُس کی آنکھوں میں گہرائی تھی۔

ایمان نے اسے سوالیہ دیکھا اور بولی ”ویسے تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔“

معارج نے مسکراتے جواب دیا ”بس، یوں ہی پوچھ رہا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ تم کیسے محسوس کرتی ہو۔“

ایمان نے اُسے محبت سے دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا، ”معارج، ایک بات یاد رکھو۔ ہمیں اپنے اعمال کا حساب اللہ کے سامنے دینا ہے، لوگوں کے سامنے نہیں۔ لوگ نہ تو ہمیں جزا دیں گے نہ سزا۔ اپنی نیکیوں میں میانہ روی اختیار کرو، نہ اتنے فراخ دل ہو کہ اپنا نقصان کر بیٹھو، اور نہ اتنے تنگ دل کہ نیکی کے دروازے بند ہو جائیں۔ اللہ ہمیں ہماری نیت کے مطابق اجر عطا کرے گا۔“

معارج نے اُس کی بات کو گہرائی سے محسوس کیا اور پھر اُس کے گال پر محبت سے بوسہ دیا، ”ٹھیک ہے، میری گھوڑوں کی ملکہ!“ اُس کے لہجے میں شرارت کی ہلکی سی چمک تھی، لیکن اُس کے دل میں ایمان کی باتوں کی گونج ابھی تک موجود تھی۔

ایمان نے آنکھیں موند کر مسکراتے ہوئے اُس کے گال پر چٹکی لی، ”ٹھیک ہے، میرے دل کے بادشاہ، لیکن زیادہ سوچا مت کرو۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہا اپنے سامنے پھیلے گھانس کو دیکھنے لگا پھر اس نے ایک اور سوال کیا، ”ایمان، تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ ایسی بات جس کا جواب میں تمہارے دل سے سننا چاہتا ہوں،“۔

ایمان نے دلچسپی سے اُس کی طرف دیکھا، ”بتاؤ، معارج۔ میرا دھیان تم پر ہے۔“۔

معارج نے ایک لمحے کے لیے آسمان کی طرف دیکھا، جیسے الفاظ کو چننے کی کوشش کر رہا ہو، پھر اُس نے ایمان کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، ”ایمان، میں تمہارے لیے اور کیا کر سکتا ہوں تاکہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھ سکوں؟“۔

ایمان کی آنکھوں میں نرمی اور تشکر کی جھلک تھی۔ اُس نے معارج کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا، ”تم نے میرے لیے پہلے ہی بہت کچھ کیا ہے، معارج۔ تم نے میری محبت کو پاکیزہ بنایا، نکاح کر کے ہمیں حلال رشتہ دیا۔ تم نے مجھے اپنی عزت بخشی، مجھے اپنی شریک حیات بنایا، اور یوں مجھے دنیا کی سب سے خوش قسمت عورت بنا دیا۔“۔

معارج نے اُس کے ہاتھ کو نرمی سے اپنے ہونٹوں تک لے جا کر بوسہ دیا اور سنجیدگی سے کہا، ”یہ سچ ہے کہ محبت دل میں خود سے پیدا ہو جاتی ہے، اُس پر ہمارا کوئی حق نہیں۔ لیکن اُسے پاک اور حلال بنانا ہمارا اختیار

ہے، اور مجھے خوشی ہے کہ ہم نے اپنی محبت کو نکاح کے ذریعے خالص بنایا۔ ایمان، تم میری محبت ہو، میری زندگی کا وہ حصہ ہو جسے میں کبھی گنوانا نہیں چاہتا۔”

اُن دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملی رہیں، اُن کی آنکھوں میں گہرے جذبات کی لہر تھی جو لفظوں کی محتاج نہ تھی۔ وہ ایک دوسرے کے قریب جھکے، اور اُس لمحے میں، محبت اور عقیدت کے احساسات نے انہیں گھیر لیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا، جیسے وہ لمحہ ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا ہو، اور اس لمحے میں اُن کی محبت پوری کائنات پر حاوی ہو گئی۔

وہ دونوں باتوں میں مگن رہے، اور رات ان کی سرگوشیوں کی گواہ تھی۔ آسمان پر چمکتے ستارے، چاند کی نرم روشنی، پہاڑوں کی خاموشی، اور درختوں کی مدھم سرسراہٹ، سب جیسے ان کی باتوں کے رازدار بنے ہوئے تھے۔

زندگی میں چاہے کتنا ہی وقت لگ جائے، اور چاہے جتنی بھی آزمائشیں آئیں، محبت کو حلال رشتے میں باندھ کر نبھانے کی جو خوشی اور اطمینان ملتا ہے، وہ کسی اور چیز میں نہیں ملتا۔ محبت ایک عام احساس ہے، مگر نکاح کو محبت سے نبھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

محبت کو صرف دل سے محسوس کرنا کافی نہیں، بلکہ اس کو عزت اور وفا کے ساتھ سنوارنا ضروری ہے۔

رشتے، چاہے وہ والدین کے ہوں، بہن بھائیوں کے ہوں، یا میاں بیوی کے، تب ہی خوبصورت بنتے ہیں جب اُن میں عزت، محبت، اور قدر شامل ہو۔ ان رشتوں کی قدر کرنے سے زندگی میں ایک نئی روشنی اور تازگی آتی ہے، اور یہ رشتے ہمارے لیے ایک مضبوط بنیاد بن جاتے ہیں۔ ہر تعلق کو سنبھالنا، اس کی پرورش کرنا اور اسے عزت دینا ہی اصل کامیابی ہے۔

...°...

تین ماہ بعد

معارج اور ایمان کا کمرہ دن کی دھیمی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ بڑی کھڑکی سے سورج کی کرنیں یوں بکھر رہی تھیں جیسے کسی مصور نے روشنی کے رنگوں کو فضا میں پھیلا دیا ہو۔ پہاڑوں کے برف پوش چوٹیاں اور نیچے پھیلی ہوئی وادی، کمرے کے اندر سے ایک خوابیدہ منظر کی مانند دکھائی دیتی تھیں، گویا قدرت نے اپنی ساری دلکشی اور رعنائی یہاں بچھا کر دی ہو۔

معارج ایک سادہ سیاہ ٹی شرٹ اور گرے رنگ کے ٹراؤزر میں ملبوس تھا، اور اس کے گھنے شاہ بلوطی بال اس کی پیشانی سے چمٹ رہے تھے، جس کی وجہ سے اُس کی وجاہت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

وہ اپنی میز پر جھکا کچھ کاغذات پلٹ رہا تھا، اُس کی آنکھوں میں گہری توجہ اور انہماک تھا جیسے کسی اہم راز کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُس کی شخصیت میں ایک غیر معمولی سکون اور سنجیدگی کا امتزاج تھا۔

اسی اثناء میں ایمان کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے سفید رنگ کا نفیس فراک پہن رکھا تھا جس پر سنہری موتیوں کی باریک کڑھائی تھی۔ فراک کی نرمی اور اس کی مہین کشیدہ کاری نے اُسے ایک پریوں کی شہزادی جیسا روپ دے دیا تھا۔

اُس کے بال کھلے ہوئے تھے اور نرمی سے اُس کے کندھوں پر بکھر رہے تھے، جیسے ہوا کی سرگوشیاں اُس کے ساتھ ہوں۔ اُس کی چال میں ایک وقار تھا اور اُس کی موجودگی میں ایک پاکیزہ کشش۔

ایمان دھیرے سے چلتی ہوئی معارج کے قریب آئی اور اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ معارج نے کاغذات سے نظریں ہٹائیں اور ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا، ”سلام، میری محبت! کیا تمہیں کوئی کام ہے جو ایسے دیکھ رہی ہو؟“ اُس کی آواز میں محبت کی ایک ہلکی سی سرگوشی تھی۔

ایمان نے چند لمحے خاموشی اختیار کی، پھر میز پر چند فائلیں رکھ کر بولی، ”وعلیکم سلام... ہاں، یہ میرے کاروبار کی فائلیں ہیں۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا، ”آج سے تم یہ کاروبار سنبھالو گے۔“ اُس کی بات میں ایک مضبوط ارادہ اور گہرا اعتماد تھا۔ ”حاشر بابا اور حیدر بھائی کی مدد سے میں نے یہ کاروبار سنبھالا، لیکن اب حیدر بھائی اپنی زندگی میں مصروف ہو چکے ہیں اور بابا کو آرام کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم یہ ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے لو۔“

معارض نے فائلیں دیکھتے ہوئے ایک لمحے کو رک کر گہری سانس لی اور بولا، ”ایمان، تم اس کاروبار کو خود کیوں نہیں سنبھالتیں؟ تم نے اسے اپنے خون پسینے سے بنایا ہے، اور تم اس میں بہترین ہو۔“ اُس کی آواز میں محبت کے ساتھ ساتھ تشویش بھی شامل تھی۔۔

ایمان نے محبت بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا، ”میں یہ کاروبار تم پر چھوڑنا چاہتی ہوں۔ شادی کے بعد میری ترجیحات بدل گئی ہیں۔ میں تمہارے ساتھ، اپنے گھر اور خاندان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ میں ایک اچھی بیوی اور اچھی ماں بننا چاہتی ہوں۔ یہ وہ کام ہے جو مجھے حقیقی خوشی دیتا ہے۔“

اُس نے اپنے ریشمی بالوں کا ایک لہر سا ٹکڑا نرمی سے اپنے کان کے پیچھے کر لیا اور بولی، ”مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تم یہ کاروبار مجھ سے بہتر طریقے سے چلا سکتے ہو۔ تم زیادہ تجربہ کار ہو، تمہارے پاس زیادہ علم اور رابطے ہیں۔ تم میں ایک خاص دلکشی اور وقار ہے جس سے لوگ تمہیں عزت دیتے ہیں۔“

اُس نے مزید کہا، ”کاروبار سے جو بھی آمدنی ہوگی، اسے بابا اور نور امی کے بینک اکاؤنٹ میں بھیجنا۔ وہ اس کے مستحق ہیں، انہوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے اور میری مدد کی ہے۔ باقی رقم تم سنبھال لو اور جو بھی گھر کے اخراجات ہوں، اُن کے لیے استعمال کر لینا۔“

معارض نے فائلوں کو دیکھتے ہوئے سر ہلایا، ”لیکن ایمان، میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ تمہیں اس کاروبار سے الگ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تمہاری محنت کا نتیجہ ہے، اور تم اسے بخوبی سنبھال سکتی ہو۔“

ایمان نے اُس کی طرف نرمی سے دیکھا اور اُس کی بات کاٹی، ”بحث مت کرو، معارج۔ میں یہ اپنی مرضی سے کر رہی ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ تم اس کاروبار کو نئی بلندیوں پر لے جاؤ گے۔ یہ سب کچھ ہماری خوشی اور ہمارے آنے والے بچوں کے لیے ہے۔“ اُس کی آنکھوں میں ایک خوابیدہ چمک تھی، جیسے وہ اپنے مستقبل کو سوچ رہی ہو۔

معارض نے گہری محبت اور ستائش کے ساتھ اُسے دیکھا اور کہا، ”تم حیرت انگیز ہو، ایمان۔ تمہاری سوچ اور قربانی مجھے ہمیشہ متاثر کرتی ہے۔ تم واقعی بے مثال ہو۔“

ایمان مسکرائی اور بولی، ”تم بھی میرے لیے اللہ کی سب سے بڑی رحمت ہو، معارج۔ میں تم سے بہت خوش ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایمان نے کہا، ”اور ہاں، یہ نہ بھولنا کہ کچھ رقم شانزہ اور سندس کے یتیم خانے کو بھی دینا ہے۔ وہ بہت اہم کام کر رہی ہیں، بے شمار بچوں کی زندگیوں کو بہتر بنا رہی ہیں۔“

معارض نے اُس کی بات کو سنجیدگی سے سنا اور سر ہلا کر کہا، ”یقیناً، یہ بہت ضروری ہے۔“

ایمان نے گہرا سانس لیا اور بولی، ”اب میں خود کو بہت ہلکا اور آزاد محسوس کر رہی ہوں۔ یہ بوجھ میرے کندھوں سے ہٹ گیا ہے۔“ اُس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک ابھر آئی تھی، جیسے اُس نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک بڑی ذمہ داری سے نجات پائی ہو۔

معارض نے اُس کی طرف مسکراتے ہوئے کہا، ”اب چونکہ تم اتنی خوش ہو، تو کیا تم میرے لیے ایک کپ چائے بنا دو گی؟ کچھ توانائی اور سکون چاہیے۔“

ایمان نے شرارت بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی، ”تم چائے کے دیوانے ہو، ایک دن تم چائے کے پودے بن جاؤ گے!“ اُس کی ہنسی میں محبت کی ایک نرم سی موج تھی۔

معارض نے ہنستے ہوئے جواب دیا، ”تو پھر تمہارے ہاتھ کا بنایا ہوا کوئی صحت مند شیک لے آؤ، اگر تم یہ ہی چاہتی ہو۔“

ایمان نے مسکرا کر سر ہلایا اور وہاں سے چل دی، اُس کی چال میں ایک خوشگوار سکون تھا جیسے دل کی ہر خواہش پوری ہو چکی ہو۔

کچھ دیر بعد ایمان خاموش قدموں سے ایک ٹرے میں جوس کا گلاس لے کر معارج کے قریب آئی۔ اُس کے چلنے میں ایک ایسی لطیف نرمی تھی، جیسے ہوا کے جھونکے میں شبنم کے قطرے بکھر رہے ہوں۔ اُس

نے محبت بھرے ہاتھوں سے جوس کا گلاس سامنے میز پر رکھا اور ٹرے ساتھ رکھ دی۔ ابھی وہ پلٹنے ہی والی تھی کہ معارج نے اُس کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔

معارج نے اُسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”ادھر آؤ، اے میری دل کی روشنی! میرے پاس بیٹھو۔“ اُس کی آواز میں ایک ایسی محبت بھری چاشنی تھی جو دل کے تاروں کو چھو رہی تھی۔ اُس نے ایمان کو اپنے قریب کر کے اپنی بانہوں کا حصار عطا کیا، اور ایک لمحے کو دنیا جیسے تھم سی گئی۔

”آؤ، اس پل کا جشن منائیں،“ معارج نے جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا، ”یہ گلاس ہمارے پیار اور خوشیوں کے نام۔ ہمارے مستقبل کی خوشبو، ہماری محبت کی مٹھاس!“ اُس نے گلاس کو اپنے لبوں سے لگا کر ایک گھونٹ بھرا، پھر ذرا شوخی سے بولا، ”لیکن لگتا ہے کہ اس میں مٹھاس کم ہے۔“

ایمان نے حیرانی سے اُسے دیکھا اور نرمی سے کہا، ”کم ہے؟ میں نے تو اس میں دو چمچ شہد ملایا تھا۔“

معارج نے گلاس اُس کی طرف بڑھایا اور کہا، ”تم بھی پیو، اگر تمہیں مجھ پر یقین نہیں تو۔“ اُس کی مسکراہٹ میں شرارت کا رنگ گہرا تھا، اور ایمان نے اُس کی آنکھوں میں چھپے ہوئے راز کو محسوس کیا۔

اُس نے گلاس کو معارج کے ہاتھوں سے تھاما اور ایک گھونٹ بھرا۔ پھر بولی، ”نہیں، یہ تو بالکل ٹھیک ہے! تمہیں ہی کوئی مسئلہ ہوگا،“ اور ہنسی کے لطیف جھونکے میں اُس کے لبوں پر ہلکی سی چمک ابھر آئی۔

معارج نے شرارتی انداز میں کہا، ”اچھا، ذرا گلاس تو دکھاؤ۔“

ایمان نے خاموش مسکراہٹ کے ساتھ جوس کا گلاس اُس کی طرف بڑھا دیا۔

معارض نے گلاس تھاما، پھر بڑے غور سے ایک گھونٹ لیا، جیسے ذائقہ کا اندازہ لگا رہا ہو۔ اُس کی پلکیں آہستہ سے لرزیں اور اس نے سر ذرا سا اوپر کیا، جیسے کچھ خاص محسوس کر رہا ہو۔

پھر اُس کی نظریں محبت بھری ستائش سے ایمان پر جم گئیں۔ ایک ہلکی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر پھیل گئی اور اُس نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”اب یہ بیٹھا ہے، کیوں کہ تمہارے لبوں نے اسے چھوا ہے۔ تمہاری محبت نے اسے اپنی مٹھاس سے بھر دیا ہے۔“

ایمان کی پلکیں شرم سے جھک گئیں، اور اُس کے گالوں پر گلاب کی سرخی پھیل گئی۔ وہ فوراً اُٹھنے لگی، لیکن معارض نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے کہا، ”اتنی حسین بیوی کو میں کیسے جانے دے سکتا ہوں؟ تم میری دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہو، ایمان۔ تمہارے بغیر یہ زندگی ادھوری ہے، تم میری روح کا سکون ہو، تم میرے دل کا قرار ہو۔“

اس محبت بھرے اقرار پر ایمان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی، مگر اُس نے جھجکتے ہوئے کہا، ”تم ہمیشہ ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ کرتے ہو۔“

معارج نے اُس کے چہرے کی طرف جھکتے ہوئے دھیرے سے کہا، ”تمہاری موجودگی میرے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، ایمان۔ تم میری محبت کی روشنی ہو، جس کے بغیر میری دنیا ویران ہے۔“

پھر اُس نے ایمان کو اپنے سینے سے لگا لیا، اُس کی بانہوں کا حصار ایک ایسی پناہ گاہ بن گیا تھا جہاں وقت تھم گیا تھا۔ دونوں لمحوں کے سحر میں گرفتار، ایک دوسرے کے قریب اتنے کہ دنیا کی ہر حقیقت مٹی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

معارج نے آہستگی سے اُس کے کان میں سرگوشی کی، ”تم میری زندگی کی سب سے قیمتی شے ہو، ایمان۔ تم میری ہر خوشی کا سرچشمہ ہو، تمہارے بغیر میری دنیا میں کچھ بھی نہیں۔“

ایمان نے اُس کے سینے سے الگ ہو کر، معارج کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھاما۔ اُس کی آنکھوں میں محبت کی چمک تھی، اور لبوں پر وہی نرم مسکراہٹ جو معارج کے دل کو ہمیشہ بے قابو کر دیتی تھی۔ ”مجھے کام کرنا ہے،“ ایمان نے نرمی سے کہا، ”اور تم بھی اپنا کام کرو۔“

معارج نے اُس کی بات سنی، مگر اُس کی نظریں اُسے روکنا چاہ رہی تھیں۔ ایمان ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ دروازے کی طرف پلٹی، اور جاتے ہوئے معارج کی آنکھوں میں وہی اداسی چھوڑ گئی جو صرف سچی محبت میں محسوس ہوتی ہے۔ معارج نے اُس کے جاتے ہوئے قدموں کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے اپنی گردن کو پیچھے کر کے مسلا اور پھر واپس کام میں مشغول ہو گیا، مگر اُس کی روح ابھی بھی ایمان کے گرد گھوم رہی تھی، جیسے اُس کی موجودگی کی خوشبو ابھی فضا میں باقی ہو۔

رات کی گہری نیند میں ڈوبا ہوا آسمان چاند کی نرم چمک میں نہا رہا تھا۔ معارج کے کمرے کی بڑی کھڑکی کے پار پہاڑوں کی چوٹیوں پر چاندنی کا ہلکا لمس تھا جو وادی کو جگمگاتی روشنی سے بھرتا جا رہا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھا تھا، اُس کی توجہ پوری طرح سے دفتر کے کام میں گم تھی، جب کہ بستر پر بے ترتیب پڑی فائلیں اس کی مصروفیت کا گواہ بن رہی تھیں۔

شیشے کی وسیع و عریض کھڑکی کے باہر چاند کی مدھم روشنی میں پہاڑ ایسے نظر آتے تھے جیسے کسی خاموش راز کے امین ہوں، دور افق پر ایستادہ، زمانوں کی کہانیوں کو اپنی گہرائی میں چھپائے ہوئے۔ وہ شفاف شیشے جو کسی دروازے کی مانند تھا، ایک طرف کھسک گیا، اور وہیں سے سرد ہوا کا ایک لطیف جھونکا کمرے کے سنائے کو چیرتا ہوا نرمی سے معارج کے چہرے کو چھونے لگا، گویا فضا میں کوئی پوشیدہ سرگوشی ہو۔

معارج کی نظر بے اختیار کسی اندرونی جذبے کے تحت سامنے کی طرف اٹھی، جہاں ایمان زمین پر خمیدہ تھی۔ اُس کے نازک ہاتھوں میں پھول تھے، جنہیں وہ نہایت دھیان اور محبت سے گلدان میں سجا رہی تھی۔ اُس کا ہر عمل اتنا ہلکا، اتنا پرکشش تھا جیسے وہ ہوا کے کسی خوابیدہ جھونکے کو ہاتھوں میں تھام رہی ہو۔ ایمان کی موجودگی میں ایک عجیب سی لطافت اور سکون تھا، جیسے کمرے کی فضا میں حسن کا کوئی سحر پھیل گیا

معارض نے لیپ ٹاپ کی اسکرین بند کی، جیسے اچانک دنیا کے سارے کام بے معنی لگنے لگے ہوں۔ اُس کی نظریں ایمان کی طرف گئیں اور اُس کے چہرے پر ایک خاموش سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ کچھ لمحے خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا، جیسے اُس لمحے کو قید کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

۔ ”بٹر فلائے،“ اُس نے نرمی سے پکارا۔

ایمان نے گلے میں پھول ڈالتے ہوئے مصروف سے انداز میں ہنکارہ بھرا ”ہمم؟“۔

معارض نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا، ”کیا تمہیں معلوم ہے، کہ جنت کی حوروں اور پریوں کی ساری دلکشی، ساری خوبصورتی کو یکجا کر کے کس کو تراشا گیا ہے؟“۔

ایمان نے الجھن بھری حیرت سے اُس کی طرف دیکھا، جیسے وہ اُس کی بات کو سمجھ نہ پائی ہو۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے معارج؟“ اُس کے لہجے میں معصومیت جھلک رہی تھی۔

معارض کی نظروں میں محبت کی گہری روشنی تھی، اُس نے نرمی سے کہا، ”ہوتا ہے، بس تم اپنی دائیں طرف دیکھو۔“۔

ایمان نے حیرانی سے دائیں طرف دیکھا، جہاں دیوار پر لگے آئینے میں اُس کا اپنا عکس جھلک رہا تھا۔ آئینے میں اُس کا چہرہ اُس چاندنی کی مانند دمک رہا تھا جو کھڑکی سے باہر پہاڑوں پر بکھری تھی۔ معارج کی نظریں اُسی پر جمی تھیں، جیسے وہ اُس عکس میں کوئی الو ہی حسن دیکھ رہا ہو۔

ایمان کچھ لمحوں کے لیے خاموشی سے اپنے عکس کو دیکھتی رہی، جیسے وہ معارج کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر اچانک، اُسے حقیقت کا ادراک ہوا اور شرم کی ہلکی لہر اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ فوراً اپنے چہرے کو نازک ہاتھوں میں چھپا کر مسکرائی اور بولی، ”یار، حد ہے۔“

معارج نے ایک گہری اور محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”جب حقیقت کا یہ دلکش شاہکار میری نظروں کے سامنے ہو، تو میں اور کیا کہہ سکتا ہوں؟ تمہاری یہ دلاویزی، ایمان، جنت کی حوروں کی ساری زیبائی کو بھی مات دے چکی ہے۔“

ایمان نے شرکیں نظروں سے اُسے دیکھا، اور اُس لمحے میں جیسے کمرے کی فضا محبت اور نرمی کی ایک لطیف چادر میں لپٹ گئی۔

...°...

اگلادن آیا تو ہوا میں خنکی کی لطافت نے فضاء کو بو جھل کر دیا تھا۔ درختوں کے پتے سرسراتے ہوئے یوں محسوس ہو رہے تھے گویا کوئی پراسرار دھن خاموشی سے بکھر رہی ہو۔

معارض اور ایمان اپنے فارم ہاؤس کی طرف جارہے تھے، جس کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی اور آج آخری جائزہ لینے کا دن تھا، جبکہ کل ان کا محبوب گھوڑا، بادل، اپنے نئے اصطبل میں منتقل ہونا تھا۔ معارج کے ہاتھ میں کینوس کا فریم، ایک مضبوط اسٹینڈرڈ، برشوں کا نفیس سیٹ اور ایک بھاری بیگ تھا جس میں رنگوں کی پیلیٹ اور دیگر فنکارانہ لوازمات موجود تھے۔

فارم ہاؤس کے در و دیوار کا بغور معائنہ کرنے کے بعد وہ دونوں خاموشی کے عالم میں ساتھ ساتھ چلتے میدان کی طرف نکلے۔ وہاں کا سبزہ ایک مخملی قالین کی طرح چمک رہا تھا، جیسے قدرت نے زمیں پر ایک خوابناک منظر تخلیق کیا ہو۔

عقب میں بلند و بالا پہاڑ اپنی ہیبت کے ساتھ پھیلے ہوئے تھے، جیسے افق کے کنارے کو چھو رہے ہوں۔ بادلوں کی نازک چادر پہاڑوں کے دامن پر تیر رہی تھی، جیسے یہ کوئی آسمانی راز ہو جو زمین پر کھل رہا ہو۔ اُن کے قدموں کی مدھم چاپ کے سوا فضا میں کسی اور آواز کا وجود نہ تھا، صرف قدرت کی خاموش سرگوشی تھی۔

کچھ دیر کے بعد وہ ایک قدیم درخت کے زیر سایہ رکے، جس کی شاخیں بلند آسمان کی طرف مائل تھیں اور زمین پر سایہ ایک ہالے کی طرح پھیلا ہوا تھا، گویا کسی مقدس جگہ کا نقشہ کھینچ دیا ہو۔ معارج نے اپنے بھاری بیگ کو زمین پر رکھا اور احتیاط سے جھکتے ہوئے اسٹینڈرڈ کو ترتیب سے کھولا، پھر کینوس کو نہایت نفاست سے اس پر جمادیا۔

ایمان خاموشی سے پیچھے کھڑی معارج کی ہر حرکت کو دیکھ رہی تھی، اُس کے چہرے پر دھیماسا تجسس جھلک رہا تھا جیسے وہ اُس کے ہر عمل کو جانچ رہی ہو۔

۔ ”آج پینٹنگ کا خیال کیسے آیا؟“ معارج نے ہاتھ میں رنگوں کی پیلیٹ تھامے، برش کو آہستگی سے رنگوں میں ڈبو تے ہوئے پوچھا، اُس کے لبوں پر ہلکی سی مسکان چھائی ہوئی تھی۔

ایمان کی آنکھوں میں چمک ابھری، وہ شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی، ”تمہارے فون میں میری ایک تصویر تھی جو تم نے بنائی تھی، وہ دیکھ کر خیال آیا کہ آج تمہیں قدرت کے اس نظارے کو کینوس پر بکھیرتے ہوئے دیکھوں، اور شاید کچھ سیکھ بھی لوں۔“

معارج نے پیلیٹ پر رنگوں کی کچھ جھلکیاں نکالیں، برش کو نرمی سے رنگوں میں ملا اور کینوس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے اُس کی نظریں ایمان پر ٹکیں، پھر اُس نے اسٹینڈرڈ کے ساتھ کھڑا ہو کر آسمان کی نیلاہٹ کو برش پر لے لیا اور نہایت اہتمام سے کینوس پر رنگوں کی سرحدیں بکھیرنے لگا۔

۔ ”کتنی دیر لگے گی؟“ ایمان نے شوق سے پوچھا، اُس کی آواز میں ہلکا سا اشتیاق تھا جیسے وہ معارج کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو۔

معارج نے رنگوں میں مصروفیت کے ساتھ دھیمالہجہ اپناتے ہوئے کہا، ”زیادہ نہیں، بس تیس منٹ کا کھیل ہے۔“

ایمان نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں، ”اتنی مشکل پیننگ تیس منٹ میں؟“ اُس کے لہجے میں بے یقینی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

معارض نے گردن موڑ کر اُس کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سکون تھا، جیسے یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کی ایک نرم لہر دوڑ گئی، ”شاید اُس سے بھی کم میں۔“

ایمان نے بے یقینی میں سر جھٹکتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا، اُس کے دل میں بے شمار سوالات اٹھ رہے تھے، مگر اُس نے انہیں زبان تک آنے نہ دیا۔

معارض نے پیننگ کو آگے بڑھایا اُس کی آنکھیں گرد و پیش کا تفصیل سے جائزہ لے رہی تھیں۔ ہر منظر، ہر زاویہ اُس کے ذہن میں ایک پُر اسرار رنگ بکھیر رہا تھا، جیسے فطرت کے پوشیدہ رازوں کو وہ اپنے کینوس پر قید کرنا چاہتا ہو۔

ہوا میں خنکی کا ایک نرم سا لمس تھا اور کہیں دور پہاڑی ندی کے بہنے کی مدھم گونج، فضاء میں گھلی ہوئی تھی۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں چہچہا رہے تھے، جیسے وہ بھی اس لمحے کا حصہ بننا چاہتے ہوں۔ ایمان پاس کھڑی خاموشی سے معارج کو دیکھ رہی تھی، اُس کی آنکھوں میں ایک انجانی مسرت کی جھلک تھی، جیسے وہ کسی خواب کے سحر میں گم ہو۔

ایمان نے اچانک ایک شرارت کا ارادہ کیا، اُس نے برش اٹھا کر اُس پر رنگ لگا کر نرمی سے معارج کی ناک پر چھینٹا مارا۔ معارج نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا، ہونٹوں پر ایک مدہم سی مسکان چھا گئی، جیسے یہ شرارت اُسے پسند آئی ہو۔

اُس کی نیم وا آنکھوں میں ایک چمک تھی، جیسے خاموشی سے خبردار کر رہا ہو کہ اب تمہارے بچنے کا کوئی راستہ نہیں۔

وہ بھی شوخی سے برش اٹھا کر ایمان کی ناک پر ہلکے سے رنگ کا چھینٹا لگا دیتا ہے، جس پر ایمان بے ساختہ ہنس پڑتی ہے۔ معارج کی اُس محبت بھری شوخی نے ایمان کے دل میں ایک خوبصورت احساس جگا دیا، گویا اُس لمحے میں ایک محبت کی گہری لہر دوڑ گئی ہو۔

ایمان کی نظریں معارج پر جمی رہیں جو مکمل توجہ سے پینٹنگ کر رہا تھا۔ وہ دیکھتی رہی کہ کیسے اُس کے ہاتھوں کی مہارت سے ہر نقشہ، ہر منظر کینوس پر ابھرتا جا رہا تھا، جیسے وہ کوئی جادوئی عمل سرانجام دے رہا ہو۔ ”اللہ! یہ کیا تم نے تصویر کھینچ کر لگا دی ہے؟“ ایمان نے حیرت بھرے لہجے میں کہا، اُس کی آنکھوں میں مکمل حیرت تھی۔

معارج نے نرمی سے مسکرا کر ایمان کو قریب کیا، اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے اپنے قریب کیا۔ اُس نے ایمان کے ہاتھ میں برش دیا اور مدہم اور محبت بھرے لہجے میں کہا، ”چلو، اب تم بھی میرے ساتھ بناؤ۔“

دونوں نے مل کر کینوس پر رنگ بھرنے شروع کیے، جیسے وہ ایک لمحے کو ہمیشہ کے لیے قید کرنا چاہتے ہوں۔ معارج نے آہستگی سے ایمان کے گال پر محبت بھرا بوسہ دیا، جیسے کوئی خواب حقیقت کا روپ دھار چکا ہو۔ اُس کی یہ قربت ایمان کے دل میں ایک لطیف احساس پیدا کر گئی تھی۔ پھر معارج نے دوبارہ کینوس کی طرف متوجہ ہو کر پینٹنگ میں مگن ہو گیا، گویا اُس کا دل اور دماغ ایک ساتھ اُس لمحے میں مرکوز ہو چکے ہوں۔

کچھ ہی دیر میں معارج کی پینٹنگ مکمل ہو گئی، اور وہ منظر حقیقت کا عکس لگنے لگا تھا۔ ایمان کی آنکھوں میں حیرت اور خوشی کی ملی جلی چمک ابھری، ”یہ تو بالکل حقیقت جیسا لگ رہا ہے!“ اُس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

معارج نے کینوس کو احتیاط سے اٹھا کر درخت کے سائے تلے رکھ دیا تاکہ وہ خشک ہو جائے، پھر اُس نے ایک اور خالی کینوس نکال کر ایمان کے سامنے لگا دیا اور دھیمی مسکان کے ساتھ کہا، ”اب تمہاری باری ہے، چلو تم بناؤ۔“

ایمان نے برش پکڑا اور معصومیت سے مسکراتے ہوئے بولی، ”کوشش تو کروں گی، لیکن اتنی خوبصورت نہیں ہوگی۔“ اُس کے لہجے میں ہلکی سی شرارت اور محبت کی چاشنی جھلک رہی تھی۔

معارض درخت کے نیچے بیٹھ گیا، اُس کی نظریں ایمان پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ ہر لمحہ اُس کی تخلیقی عمل کا حصہ بن رہا ہو۔ ایمان نے نرمی سے پینٹنگ شروع کی، اُس کی حرکتیں احتیاط بھری اور دھیمپن لیے ہوئے تھیں، جیسے یہ لمحہ اُس کے لیے نہایت خاص اور نازک ہو۔

...°...

معارض درخت سے ٹیک لگائے خاموشی سے ایمان کو دیکھ رہا تھا، اُس کی نظریں اُس کی ہر جنبش پر مرکوز تھیں، جیسے وہ ایمان کے وجود میں پنہاں ہر راز کو جانچنا چاہ رہا ہو۔

ایمان کی ہر حرکت اُسے مزید دلکش اور دلآویز لگ رہی تھی، جیسے وہ ایک ایسا منظر ہو جسے بار بار دیکھنے کی تمنا ہو۔ معارض نے قریب رکھا موبائل اٹھایا اور کیمرہ ایمان کی جانب کر دیا، اُس پل کو ہمیشہ کے لیے قید کرنے کے خیال سے۔

۔ ”ایمان!“ معارض نے مدھم اور محبت بھری آواز میں پکارا، جیسے اُس کا نام پکارنا بھی ایک لذت ہو۔

ایمان، جو اپنے کام میں منہمک تھی، ہلکی سی چونک کر بولی، ”جی؟“ اُس کی نظریں ابھی ابھی اپنی مصروفیت میں گم تھیں۔

معارض کی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری، اُس نے نرمی سے کہا، ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں چاند کیوں نہیں کہتا؟ جبکہ ہر عاشق اپنی محبوبہ کو چاند سے تشبیہ دیتا ہے۔“

ایمان نے ہنستے ہوئے جواب دیا، ”شاید اس لیے کہ چاند پر داغ ہوتا ہے؟“

معارض نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا، ”نہیں، داغ کے باوجود چاند آنکھوں کو تسکین دیتا ہے، لیکن میری وجہ کچھ اور ہے۔“

ایمان نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا، ”پھر بتاؤ، کیا وجہ ہے؟“

معارض نے اُس کی طرف گہرائی سے دیکھتے ہوئے کہا، ”چاند ہر کسی کے لیے ہوتا ہے، ہر کوئی اُسے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی اور دیکھے، تم صرف میری نظروں کے لیے ہو۔“

ایمان کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا، اُس نے نظریں جھکا لیں، جیسے معارج کے الفاظ اُس کے دل میں کہیں گہرائی تک اتر چکے ہوں۔ اُسی لمحے معارج نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس کی تصویر لے لی۔

ایمان نے چونک کر معارج کی طرف دیکھا اور پوچھا، ”یہ کیا تھا؟“

معارض نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا، ”اگر پہلے مسکرانے کو کہتا تو تم سوال کرتی، لیکن اب تم نے دل سے مسکرا دیا، اس لیے تمہاری تصویر بھی خوبصورت آگئی۔“

ایمان نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا، ”اچھا، تو فرض کرو اگر تم فوٹو گرافر ہوتے، تو کیا سب کے لیے بھی ایسی ہی تعریفیں ہوتیں؟“۔

معارض نے سنجیدگی سے کہا، ”نہیں، یہ تعریفیں تو میری زندگی کی واحد ہمسفر کے لیے ہیں، اور میں صرف اُس کا ذاتی فوٹو گرافر ہوں، کیونکہ میرے لیے دلکشی کا مفہوم تمہاری تصویروں کے بغیر ادھورا ہے۔“۔

ایمان نے مسکراتے ہوئے کہا، ”ویسے ایک بات بتاؤں مجھے تمہاری تصویریں بنانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“۔

معارض نے دلچسپی سے پوچھا، ”کیوں؟“۔

ایمان نے نرمی سے کہا، ”کیونکہ میں نے تمہارا عکس اپنی آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔“۔

معارض کے چہرے پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی، اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا اطمینان تھا۔ ”یعنی یہ معرکہ برابری پر ختم ہوا؟ ایک معارج اور ایک ایمان، برابر؟“۔

ایمان نے شرارتی انداز میں کہا، ”ہاں، دیکھ لو، میں بھی رومانس میں تم سے پیچھے نہیں ہوں۔“۔

معارض نے فخریہ انداز میں کہا، ”یہ تو میرا ہی کمال ہے۔“۔

ایمان نے ہنستے ہوئے کہا، ”معارض، ایک بات کہوں؟“۔

معارج نے دلچسپی سے کہا، ”تمہیں اجازت کی ضرورت نہیں ہے بن داس کہو جو کہنا ہے کہو۔“

ایمان نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا، ”تمہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ خیال آتا ہے کہ تم میرے دل کی روشنی ہو، اور میں تمہارے دل کی ٹھنڈک۔“

معارج نے مسکراتے ہوئے کہا، ”اور تم تو میرے لیے اُس خوشبو کی مانند ہو جسے صرف میں ہی محسوس کر سکتا ہوں، اور جو میرے دل و دماغ کو معطر رکھتی ہے۔“

ایمان مسکرا کر مزید بولی۔

، ”تمہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ ایک بات یاد آتی ہے۔“

معارج نے مزید تجسس سے پوچھا، ”کیا بات؟“

ایمان نے شوخی سے جواب دیا،

”cold for others pookie for lover“

معارج مسکراتے ہوئے بولا، ”تم تو میری زندگی کا وہ نازک پھول ہو، جسے سنبھالنے کے لیے پوکی ہی بننا پڑتا ہے، کیونکہ پھول کے ساتھ سختی برتی جائے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور بیوی تو شوہر کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اگر ریڑھ کی ہڈی کو جھکا دیا جائے، تو انسان میں کھڑے ہونے کی سکت ہی باقی نہیں رہتی۔“

ایمان نے ہنستے ہوئے کہا، ”شکر ہے میں تمہاری ریڑھ کی ہڈی سے ہوں اور وہ بھی اکیلی ہوں!“۔
انداز میں تنبیہ بھی تھی۔

معارض نے فوراً ہنستے ہوئے ہاتھ کھڑے کر دیے، ”تم اکیلی ہو، اور ہزاروں کے برابر ہو!“۔
اس ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ میں، ان دونوں کی محبت اور دل لگی خوبصورت انداز میں نمایاں ہو گئی۔

...°...

دو دن بعد ہی ایمان اپنے گھوڑے ”بادل“ کو اس کے نئے مسکن کی جانب لے آئی تھی۔ حاشر کے گھر سے، جو ایمان کے مکان سے تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا، وہ اسے بخوشی لائی تھی۔

بادل، جو ایک جاذبِ نظر اور توانائی سے بھرپور گھوڑا تھا، ہمیشہ سے ایمان کی پسندیدہ سواری رہا تھا، اور اب وہ چاہتی تھی کہ یہ اس کے محبوب، معارج، کے ساتھ وقت گزارے۔

ایمان نے بادل کی لگام تھامے، اسے کھیتوں کی طرف لے جانے کا قصد کیا، جہاں ہر سمت ہریالی کا دامن چمک رہا تھا، اور گھاس اپنی تروتازگی سے آنکھوں کو فرحت دے رہی تھی۔

سامنے اصطلبل تھا، ایک وسیع و عریض عمارت، جس کی دیواروں پر چھوٹی چھوٹی طاقچیاں تھیں، اور ہر جانب ترتیب و سکون کا عالم تھا۔

اسی اثنا میں، معارج اصطلبل سے باہر نکلا، اور ایمان اور بادل کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا، ”تو آخر کار میرا دشمن آ ہی گیا۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی شرارت تھی، مگر حقیقت میں اس کا بادل کے ساتھ ایک مخصوص حسد کا رشتہ قائم تھا۔

بادل، اپنی پوری رعونت کے ساتھ، معارج کو گھور رہا تھا، گویا وہ جانتا تھا کہ اس نے ایمان کا دل اپنے قبضے میں لے لیا ہے، اور معارج بھی ہمیشہ اس کی چالوں کو سمجھ کر برہم رہتا تھا، کیوں کہ بادل ہر ممکنہ طریقے سے معارج کو چیلنج کرتا تھا۔

ایمان، نرم قدموں سے چلتی ہوئی، بادل کو ساتھ لیے اصطلبل کی طرف بڑھی۔ پیچھے پیچھے بادل اپنی مست خرامی کے ساتھ چل رہا تھا۔ معارج نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا، ”میرا دشمن واقعی آ گیا۔“۔ ایمان، ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ لیے، معارج کی طرف دیکھتے ہوئے بولی، ”وہ تمہاری باتیں نہیں سمجھتا، وہ تو بس میری زبان سمجھتا ہے، اور وہ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی کہ تم کرتے ہو۔“

اب منظر کچھ یوں تھا کہ ایمان آگے تھی، اور اس کے پیچھے بادل اور معارج۔ جیسے ہی بادل نے معارج کو دیکھا، اس کی چال میں ایک نرمی آ گئی، اور اس نے اپنے سر کو خم دے کر معارج کے پیٹ پر ہلکی سی ٹکڑ ماری، گویا اسے پسپا کرنا چاہتا ہو۔

معارج نے بادل کو گردن سے تھام کر پیچھے ہٹانے کی کوشش کی، لیکن یہ لڑائی زیادہ دیر نہ چل سکی۔ جب ایمان نے مڑ کر دیکھا، دونوں اپنے رویے میں معصومیت لیے خاموش ہو گئے، گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

بادل اب ایک فرمانبردار کی طرح سر جھکائے معارج کے پاس کھڑا تھا، جیسے کوئی شاگرد استاد کے سامنے ادب سے کھڑا ہو۔

ایمان کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔ وہ معارج کو دیکھتے ہوئے بولی، ”تم دونوں ساتھ میں بہت خوبصورت لگتے ہو۔“ بادل، اپنی آنکھوں میں نرمی اور اپنائیت لیے، دوبارہ اپنا سر معارج کے پاس لے آیا اور اسے آہستہ سے دھکا دیا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ معارج اسے تھوڑا پیار دے، جیسے ایمان اسے دیتی تھی۔

ایمان نے ہنستے ہوئے کہا، ”دیکھو، وہ تم سے کہہ رہا ہے کہ اسے بھی تھوڑا پیار دو۔ وہ تمہارا دوست بننا چاہتا ہے۔“

معارج نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بادل کی گردن تھپتھپاتے ہوئے بولا، ”کیوں نہیں؟ یہ واقعی ایک زبردست گھوڑا ہے، اور یہ محبت کا حقدار بھی ہے۔“

معارج نے بادل کو گلے لگاتے ہوئے کہا، ”دیکھو، بچے! اب اس گھر میں تمہاری مالکن پر میرا حق ہے۔ تو بہتر ہے کہ تم اپنا رویہ درست رکھو۔ اگر تم شریف بنو گے، تو میں بھی تمہارا خیال رکھوں گا۔ ڈیل؟“

بادل نے سر کو ہلکے سے ہلایا، گویا معارج کی بات مان رہا ہو۔ لیکن جیسے ہی ایمان نے ان دونوں کی طرف پشت کی، بادل نے اپنی شرارت پھر دکھا دی۔ اس نے آہستگی سے اپنا پاؤں معارج کے پاؤں پر مارا، جیسے اسے چھیڑنا چاہتا ہو۔ معارج نے اپنی صحت مند اور مضبوط جسامت کی بدولت کوئی تکلیف محسوس نہ کی،

بس مسکرا کر بولا، ”تم بڑے شرارتی ہو، بادل! تمہیں مجھ پر چالیں چلانے کا بڑا شوق ہے۔ لیکن مجھے یہ تمہاری شرارتیں پسند ہیں۔ تم میں جذبہ اور بہادری ہے، اور تم ایک حقیقی حریف اور دوست ہو۔“

ایمان نے بادل کو راستہ دیکھایا اور اسے اس کے نئے مسکن میں داخل کر دیا، جو ایک نہایت آرام دہ اور پرسکون اسٹال تھا۔ اس کے گرد دیواروں سے ہلکی سی روشنی منعکس ہو رہی تھی اور چاروں طرف نرم، خوشبودار بھوسہ بچھا ہوا تھا، جس کی مہک فضا میں بسی ہوئی تھی۔ ایمان نے محبت سے بادل کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا، پھر اس کی پیشانی پر ہلکا سا بوسہ دیا اور دھیمے لہجے میں کہا، ”یہ تمہاری نئی جگہ ہے، بادل! اب یہاں تمہارا بسیرا ہو گا، اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں یہ جگہ بے حد پسند آئے گی۔“

بادل، اپنے خاص انداز میں گردن جھٹک کر جیسے ایمان کی بات کی تائید کر رہا ہو، جب کہ ایمان کے لبوں پر ایک نرم مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے کہا، ”تم میرے پیارے، میرے دل کے قریب ہو، بادل۔ تم میری خوشی ہو، میرا فخر ہو، اور تمہاری وفاداری میری سب سے بڑی دولت ہے۔ تم میرے ساتھ ہو، اور تم سے بڑھ کر حسین گھوڑا دنیا میں کوئی نہیں۔“

جب ایمان رخصت ہونے لگی تو معارج، جو خاموشی سے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا، اپنی چالاک مسکراہٹ کے ساتھ بادل کو بغور دیکھنے لگا۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی شرارت عیاں تھی۔ بادل کی جانب جھکتے ہوئے، اس نے رازدارانہ انداز میں کہا، ”میرے دوست، تمہارے لیے ایک خاص سرپرائز ہے۔ اگر تم نے دوبارہ مجھے چھیڑنے کی کوشش کی، تو میں تمہارے لیے ایک خوبصورت گھوڑی لے کر آؤں گا۔“

یہ کہہ کر معارج کی نگاہ میں شرارت کی چمک مزید تیز ہو گئی۔ وہ دھیرے سے بولا، ”ایسی گھوڑی جو تمہاری دنیا بدل دے گی، جو تمہیں ایمان کو بھولنے پر مجبور کر دے گی۔ ایسی حسین کہ تم اس کے سحر میں گرفتار ہو جاؤ گے، اور پھر تمہیں احساس ہو گا کہ محبت کا دوسرا رخ کیا ہوتا ہے۔“ - معارج نے دل ہی دل میں خود سے کہا، ”اور تب تم سمجھو گے کہ جب تم ایمان کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کرتے ہو، تو مجھے کیسا محسوس ہوتا ہے۔ تب تم میری عظمت کو تسلیم کرو گے، اور مجھے اپنا حاکم مانو گے۔“

معارج نے ایک ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بادل کی طرف دیکھا اور کہا، ”تو کیا کہتے ہو، بادل؟ کیا تم اس سر پرانز کے لیے تیار ہو؟“ بادل نے معارج کو غور سے دیکھا، اس کی بڑی آنکھوں میں حیرت اور کچھ شک جھلک رہا تھا۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ معارج کی چالاکی کے پیچھے کیا راز پوشیدہ ہے۔

بادل کی خاموشی میں جیسے ایک سوال تھا، اور معارج اپنی جیت پر مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

...°...

صبح کا سورج ابھی تک پہاڑوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا، لیکن مرغ کی بلند بانگ نے فجر کے طلوع ہونے کی خبر دی۔ ہوا میں تازگی تھی، پھولوں کی نازک پنکھڑیاں شبنم کے قطروں سے تر تھیں اور آہستہ آہستہ کھلنے لگیں، جیسے فطرت خود کو بیدار کر رہی ہو۔ تتلیوں نے اپنے پروں کو ہلکی ہوا میں پھیلا یا، اور مدھم مدھم

دریا کی سطح پر پہلی کرنیں چمکنے لگیں، جیسے کوئی چمکتا ہوا شیشہ ہو۔۔ گھاس کے نرم تنکے ہوا میں جھوم رہے تھے، اور پرندے اپنی دھنیں گاتے ہوئے آسمان میں اڑ رہے تھے، جیسے قدرت کی موسیقی کا حصہ ہوں۔

ایمان، اپنے سادہ گھریلو لباس میں ملبوس، صبح کے اس حسین منظر کا حصہ بنی، اپنی روزمرہ کی مصروفیت کی جانب قدم بڑھا رہی تھی۔

اپنے کھیتوں اور جانوروں سے اس کا محبت بھرا رشتہ ہر لمحہ اس کی ہمدردی اور دیکھ بھال سے نمایاں ہوتا تھا۔ وہ سب سے پہلے مرغیوں کے دڑبے کی طرف گئی اور دروازہ کھولتے ہی مرغیاں، بطخیں اور مور آزادی سے باہر نکل آئے۔ بطخوں کا ایک جھنڈ چھپر کی طرف دوڑتا ہوا گیا اور پانی میں چھلانگیں لگا کر پانی کے قطروں کو چاروں طرف بکھیر دیا، جب کہ کچھ بطخیں ایمان کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں، جیسے وہ ان کی رہنما ہو۔ ایمان نے محبت سے ان کے لیے دانہ بکھیر دیا اور ان کے مست چہچہانے میں مسکراتی ہوئی انہیں دیکھنے لگی۔

اس کے بعد وہ گودام کی طرف بڑھی، جہاں بکریاں اور گائیں بے چینی سے اس کی منتظر تھیں۔ ایمان نے محبت بھرے ہاتھوں سے ان کے باڑے کے دروازے کھولے اور وہ سبز چراگاہ کی طرف دوڑ پڑیں۔ چراگاہ دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، جہاں ہلکی ہوا چل رہی تھی اور گھاس کی نرمی جانوروں کے قدموں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی تھی۔ چاروں طرف بجلی کی باڑ تھی جو جنگلی جانوروں سے ان کی حفاظت کے لیے لگائی گئی تھی۔

ایک بکری ایمان کے قریب آئی اور اپنا سر اس کے ہاتھوں سے رگڑنے لگی۔ ایمان نے نرمی سے اس کے سر کو تھپتھپایا، جیسے اس کی محبت کا جواب دے رہی ہو۔ اس نے بکری سے دو گلاس دودھ دوہا اور باقی دودھ بکری کے بچوں کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر اس نے بکری کے سر کو محبت سے چھوا اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

اسی دوران، اس نے دیکھا کہ بادل اور معارج چراگاہ کے کنارے کھیل رہے ہیں۔ معارج، بادل کی ایال کو نرمی سے کھینچ رہا تھا، اور بادل نے شرارت سے معارج کی ٹانگ کو ہلکے سے دبا لیا، جیسے وہ اپنی نرمی سے اس کے ساتھ کھیل رہا ہو۔ ایمان یہ منظر دیکھ کر مسکرائی اور چشمے کی طرف چل دی، جہاں پانی کی دھار سیڑھیوں سے نیچے گر رہی تھی، اس نے پانی کی ٹھنڈک کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں پر محسوس کیا، جیسے قدرت نے اس کی روح کو تازگی سے بھر دیا ہو۔

پھر وہ سیڑھیوں پر چڑھ کر سبزیوں کے باغ میں پہنچی، جہاں ہر طرف ہریالی اور تازگی کا احساس تھا۔ ایمان نے کچھ تازہ سبزیاں چن کر ٹوکری میں رکھ دیں اور اس خوبصورت صبح کی رونق میں دل ہی دل میں سکون کا احساس کیا۔

اس نے اپنی زندگی کی سادگی اور قدرت کی نعمتوں کو دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور اپنے دل میں شکر گزاری کے جذبات کو محسوس کیا۔

سب کچھ بالکل ویسا ہی تھا جیسے ایمان نے ہمیشہ چاہا تھا۔ ایک پرسکون زندگی، جہاں شور و غل سے دور، وہ اپنے ہمسفر جانوروں اور فطرت کے ساتھ، اپنی دنیا میں خوش اور مطمئن تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ٹوکریاں تھامے دھیرے دھیرے قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہوئی، جیسے فطرت کے حسن کو اپنی آنکھوں میں بسالینا چاہتی ہو۔ ہر قدم کے ساتھ کھیتوں اور جانوروں کی محضوب خاموشی اس کے دل کی گہرائیوں میں سکون بھر رہی تھی۔

کچھ لمحے ہی گزرے تھے کہ وہ دوبارہ باہر آئی، اور اس کی مدھم مگر واضح آواز فضا میں گونجی،۔ “معارج، تمہاری سیکرٹری کی کال آئی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ بات ضروری ہے اور تمہیں فوراً گفتگو کرنی ہوگی۔”

معارج، جو بادل کے ساتھ کھیل میں مگن تھا، ایک آخری بار محبت بھرے انداز میں بادل کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تیزی سے گھر کی طرف لپکا۔ ایمان کی آواز میں جو سنجیدگی تھی، وہ اسے معاملے کی نزاکت کا احساس دلارہی تھی۔

ایمان کے قریب جا کر اس نے ایمان کے ہاتھ سے فون لیا، ایمان کے لبوں پر ایک مختصر مگر پُرسکون مسکراہٹ ابھری اور وہ اپنے معمولات میں مصروف ہونے کے لیے اندر چلی گئی۔

معارض نے فون کان سے لگایا اور انگریزی میں سنجیدہ لہجے میں بولا، ”ہاں، اولیویا؟ ٹھیک ہے، میں کچھ دن تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔“ فون بند کر کے اس نے خاموشی سے جیب میں رکھ لیا، اور ایک لمحے کے لیے گرد و نواح کا جائزہ لیا۔

کھلیان دور دور تک پھیلے ہوئے تھے، سبزے کی ہریالی اور جانوروں کی اطمینان بھری حرکتوں نے ایک عجیب سا سکون اس کے دل میں پیدا کیا۔ وہ اپنی زندگی کے اس حصے سے مکمل طور پر مطمئن تھا۔ ان چھ مہینوں میں ایمان کے ساتھ جو سادگی اور فطری خوشیاں اس نے دیکھیں، وہ انمول تھیں۔ معارج کو یہ پرسکون اور فطری زندگی اپنے تمام تر پیچیدگیوں سے پاک اور اپنے اندر گہرے سکون کا حامل معلوم ہوئی۔

...°...

معارض آئینے کے سامنے کھڑا اپنے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے گہرے خیالات میں تھا، جب اُس کی نگاہ ایمان پر پڑی۔ وہ لگج بیگ میں اُس کے کپڑے سمیٹ رہی تھی، اس کے چہرے پر ایک خاموش افسردگی چھائی ہوئی تھی، جیسے کوئی نرگس اپنی خوشبو کھونے کو ہو۔

ایمان نے سفید فراق پہنا تھا، جس پر سبز اور پیلے رنگ کے پھولوں کی نفیس کڑھائی، دامن کے کناروں تک پھیلتی ہوئی تھی۔ بازوؤں پر چوری دار آستینیں اُس کے حسن میں اور بھی نفاست بھر رہی تھیں، اور اُس کی کجھوری چوٹی میں جڑے سفید پھول، محبت کے کسی خاموش اقرار کی مانند معلوم ہو رہے تھے۔

معارض نے آئینے کے سامنے سے ہٹ کر نرمی سے اُس کا ہاتھ تھاما، اور اُسے اپنے قریب کیا۔ ”کیا تمہیں کچھ فکر لاحق ہے؟“ اُس نے گہرے، مدہم لہجے میں سوال کیا۔

ایمان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، جیسے وہ دل کی بات کہنے سے ہچکچا رہی ہو۔ پھر اُس نے آہستگی سے کہا، ”مجھے تمہاری یاد آئے گی، اپنا خیال رکھنا۔“

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد اُس کی آواز میں تھوڑی سی نرمی کے ساتھ تلخی بھی شامل ہوئی، ”اور تم کیا سوچتے ہو؟ ظاہر ہے کہ میں افسردہ ہوں۔“

جب میرا hubby friend

مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے تو کیسے نہ ہوں افسردہ؟“۔

معارض کی آنکھوں میں ایک لطیف مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”۔“

Hubby friend یہ کیا نئی چیز ہے۔“

ایمان نے نرمی سے کہا، ”۔“

کیوں جب بوائے فرینڈ گرل فرینڈ ہو سکتے ہیں تو

،Hubby friend

کیوں نہیں وہ جس کے ساتھ زندگی گزاری جاتی ہے، وہ دوست بھی تو ہوتا ہے۔“۔

پھر اُس نے سوچتے ہوئے بات آگے بڑھائی، ”اگر میاں بیوی ایک دوسرے کے دوست بن جائیں، تو زندگی میں سکون اور ہم آہنگی بڑھتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ رشتہ عموماً محض بچوں کی پیدائش تک محدود رہتا ہے۔ جب میاں بیوی ایک دوسرے کے دوست ہوں گے، تو نہ صرف ان کی باہمی سمجھ بہتر ہوگی، بلکہ ان کے بچوں کی پرورش بھی ایک بہتر ماحول میں ہوگی۔“

معارض نے ایمان کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ”تمہاری بات میں حقیقت کارنگ ہے۔ میرے پاس ایک ہی حقیقی دوست ہے، اور وہ میری بیوی ہے۔“ اُس نے مسکرا کر ایک آنکھ دبائی، ”اوکے،

”Wifey friend

اس نے ایک، بار پھر نرمی سے ایمان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور سرد آہستگی سے کہا، ”جب میں لوٹوں گا تو تمہارے لیے کیا تحفہ لے کر آؤں؟“

ایمان نے دل میں موجزن جذبات کو سنبھالتے ہوئے، معارج کے گلے میں اپنے بازو ڈال دیے اور دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی، ”تمہیں کچھ نہیں لانا، بس واپس آجانا۔“

ایمان کی آنکھوں میں وہ بے پناہ محبت تھی جو وقت کو ٹھہرا دے۔ معارج اُس کے گہرے آنکھوں کے سمندر میں ڈوبتا بولا، ”اگر تم اسی طرح میری آنکھوں میں یوں ہی جھانکتی رہو گی تو شاید وقت تھم جائے، اور سویڈن کی میری پرواز چھوٹ جائے گی۔“

ایمان کی پلکوں کے نیچے ایک نرم مسکراہٹ لرزا اٹھی، اُس نے نرمی سے معارج کے گال پر بوسہ دیا، ”تم تو ویسے ہی بہت خاص ہو۔“

یہ لمحہ بے وزنی کی مانند تھا، وقت جیسے دھیمہ ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد، ایمان دروازے کی دہلیز پر کھڑی تھی، سر پر دوپٹہ سنبھالا ہوا، پلو چہرے کے قریب لا کر اپنے چہرے کو چھپا رکھا تھا۔

معارج گاڑی میں بیٹھا، مگر اُس کی نظریں ایمان سے ہٹنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ ایمان کی آنکھوں میں وہ درد و انتظار تھا جو الفاظ سے بیان نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے دھیرے سے مسکرا کر کہا، ”اب تم جاؤ گے بھی تو شاید تمہاری فلائٹ چھوٹ جائے؟“

معارج مسکرایا، ایک بے بسی کی سی مسکان، اور گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی، مگر اُس کا دل جیسے ایمان کے پاس ہی ٹھہر گیا تھا۔ معارج نے پیچھے مڑ کر اُسے دیکھنا نہیں چھوڑا، اُس کا چہرہ، اُس کی موجودگی، جب تک وہ ایک دوسرے کی نظروں سے او جھل نہ ہو گئے۔

دروازہ بند ہوتے ہی، ہوا میں جیسے خاموشی سی چھا گئی۔ ایمان نے آہستگی سے دروازہ بند کیا، مگر ایک پرچھائیں، ایک سایہ جو درخت کے پیچھے چھپ کر یہ سب دیکھ رہا تھا، اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ اُس کے چہرے پر ایک پراسرار خاموشی تھی۔ وہ کسی اور ہی وقت کے انتظار میں تھا، صحیح لمحے کا۔۔۔ جب ہر ایک حساب چکتا ہو گا۔

...°...

دو ماہ بعد۔۔۔

ایمان اپنے باغ کی روشوں میں خاموشی سے سٹرابیری کے پودوں سے سرخ رنگی پھل توڑ رہی تھی۔ ایک مدھم سا چشمہ، اس کے عقب میں بہہ رہا تھا، جس کی پُرسکون اور تسلی بخش سرگوشیوں میں فطرت کا جلال محسوس ہو رہا تھا۔ یہ منظر ایک خوبصورت خواب جیسا تھا، جیسے قدرت کی ایک مہربان بانہوں میں لپیٹی ہوئی دنیا۔

اتنے میں ایمان کے موبائل پر ایک سرگوشی سی بجی۔

اُس کی آنکھوں میں چمک اُبھر آئی جب اس نے موبائل پر معارج کا نام دیکھا۔ ایک لطیف مسکراہٹ نے اُس کے لبوں پر دستک دی۔

واٹس ایپ کال تھی، وہ چلتے چلتے باغ کے وسط میں رکھے ایک بیچ تک پہنچی، جہاں نیچے سے چشمہ گنگناتا ہوا گزرتا تھا۔

اُس نے سٹرابیری کی ٹوکری نرمی سے برابر رکھی اور بیچ پر بیٹھ کر فون اٹھایا۔

دوسری جانب سے معارج کی تھکی ہوئی، مدھم سی آواز اُبھری، ”ہیلو، قلب معارج، کیسی ہو؟“۔

ایمان نے ایک مصنوعی ناراضگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، لیکن لبوں پر وہ ہی پیاری مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے کہا، ”ہیلو نہیں، سلام کہتے ہیں۔“۔

دوسری جانب سے معارج کی ہنسی سنائی دی، ”میری خواہش ہے کہ ہر نیکی کا آغاز تم سے ہو، کہ ہر بھلائی کی پہلی کرن تمہارے دل سے پھوٹے۔ دنیا کی تمام نعمتیں سب کو ملیں، مگر سب سے پہلے تم پر سایہ فگن ہوں۔ تمہاری زندگی روشنی کا مینار بنے، اور میں ہمیشہ تمہارے پیچھے چلتا رہوں، تمہارے نقش قدم پر۔“۔

ایمان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

۔۔۔ مجھے تو دنیا کی سب سے عظیم نعمت اُسی لمحے نصیب ہوئی تھی جب تم میری زندگی میں آئے تھے۔

اب، ہم ایک ہو کر نہ صرف اس دنیا کی راہوں پر چلیں گے، بلکہ ہر نیکی کو اکٹھے اپنی قسمت میں لکھیں

گے۔ تمہارے ساتھ جڑ کر زندگی کا ہر لمحہ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے وقت بھی ہمارے لیے رک سا گیا ہو، اور اب ہم مل کر اپنی ہر نیکی، ہر عبادت کو خوابوں کی حقیقت میں بدل دیں گے۔”

پھر دونوں نے ہنس کر ایک ساتھ کہا، ”السلام علیکم“، اور جواباً ”وعلیکم السلام“ بھی ایک دوسرے کے ساتھ کہا۔

یہ ہنسی اور معصوم باتیں، لمحے کو مزید خوبصورت اور پُر سکون بنا رہی تھیں، جیسے وقت رُک گیا ہو۔ معارج نے پوچھا، ”کیا کر رہی تھی، تم؟“۔

ایمان نے سٹرائیری کی ٹوکری کی جانب نظر ڈالی اور کہا، ”سٹرائیریاں چن رہی تھی۔“

پھر ساتھ ہی بولی ”اور تم“۔

معارج نے ہنستے ہوئے کہا، ”میں تمہیں یاد کر رہا تھا، ہر لمحہ تمہارے خیالوں کی دنیا میں گم۔“

ایمان نے شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا، ”میں بھی تمہیں ہر پل یاد کرتی ہوں، دن کا آغاز تمہاری یاد سے ہوتا ہے، اور اختتام تمہارے خیالوں میں۔ کاش کہ میں ابھی تمہارے پاس آذر بائجان میں آ سکتی۔“

معارج نے ایک زوردار ہنسی کے ساتھ کہا، ”آذر بائجان نہیں، ملائیشیا میں ہوں۔“

ایمان نے نازک انداز میں شکایت کی، ”تم ہمیشہ کہیں نہ کہیں اڑتے رہتے ہو، کبھی سویڈن، کبھی ازبکستان، اب ملائیشیا۔“

معارض نے نرم لہجے میں جواب دیا، ”جہاں بھی ہوں، تم ہمیشہ میرے دل میں ہوتی ہو۔“

اتنے میں ایک تتلی اڑتی ہوئی آئی اور ایمان کے ہاتھ کی پشت پر آکر بیٹھ گئی۔ ایمان نے مسکرا کر تتلی کی جانب دیکھا اور بولی، ”میرے پاس تمہارے لیے ایک سر پرانز ہے!“

معارض ہیجان میں آکر بولا، ”کیا میں باپ بننے والا ہوں؟“

ایمان نے مسکراتے ہوئے آنکھیں گھمائیں اور کہا، ”ان شاء اللہ وہ دن بھی آئے گا، مگر ابھی کچھ اور ہے۔“

پھر اُس نے تتلی کو اپنی انگلیوں سے اڑا دیا اور چشمے کے شفاف پانی میں ہاتھ ڈالا، پانی کی ٹھنڈی چھینٹیں اُس کے ہاتھوں پر بکھر گئیں اور دھوپ میں چمکنے لگیں۔ ”جب تم واپس آؤ گے، تب جان لو گے۔“

یہ کہہ کر ایمان نے پانی میں اپنے پیر ڈبو دیے، تاکہ اُس کی تھکی ہوئی روح کو بھی وہی ٹھنڈک ملے جو اُس کے پیروں کو محسوس ہو رہی تھی۔

دونوں ہنستے اور باتیں کرتے رہے، جیسے ایک دوسرے کی موجودگی کا لمس ہی سب کچھ ہو۔

سامنے مویشی سکون سے چر رہے تھے اور بادل بھی ان کے ساتھ موجود تھا۔

دور پہاڑوں کے دامن میں بکریاں آہستگی سے چرتی پھر رہی تھیں۔

پھر وقت جیسے دھیرے دھیرے آگے بڑھا، اور اچانک موسم کی تبدیلی کا احساس ہوا۔ سورج کی روشنی مدھم مدھم ہو کر برف کی سپیدی میں تبدیل ہو گئی۔

ہنزہ کی سرد وادیوں پر برف گرنے لگی، اور ہر طرف برف کی چادر بچھ گئی۔

پہاڑوں کی چوٹیاں سفید گلابوں کی مانند نکھر آئیں، اور درختوں کی شاخیں برف کی بھاری تہوں سے جھک گئیں۔ گنچے درختوں نے جیسے اپنی پرانی شکل چھوڑ کر برف کی ملکہ کی مانند ایک نیا لباس پہن لیا ہو۔ ہر طرف ایک پراسرار سی خاموشی چھا گئی تھی، جو فطرت کی اپنی زبان میں ایک راز سنار ہی تھی۔

ایمان جائے نماز پر بصد خشوع و خضوع دستِ دعا بلند کیے، سراپا التجا بنی بیٹھی تھی۔ دل کی گہرائیوں میں کہیں معارج کی شدید یادیں دل پر دستک دے رہی تھیں۔ وہ مدت سے اس سے دور تھا، اور ان کے درمیان مکالمے مختصر اور کم یاب ہو چکے تھے۔

دل کے نہاں خانوں میں وہ معارج کے لیے گہری محبت اور اُمید کو زندہ رکھے ہوئے تھی، کہ وہ جلد واپس آئے گا۔ عقب میں شیشے کی وسیع کھڑکی کے پار، برف سے ڈھکے پہاڑ اور تیز گرتے ہوئے برفانی روئیاں ایک پر کیف منظر کی عکاسی کر رہے تھے۔

کمرے کی فضا ہیٹر کی حرارت سے گرم اور پرسکون تھی۔ ایمان اپنے سیاہ لباس میں ملبوس، سکون اور راحت محسوس کر رہی تھی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، اُس نے دل سے معارج کی سلامتی اور اس کی جلد واپسی کے لیے دعا مانگی۔۔

لیکن عین اُسی لمحے دروازے کی گھنٹی کی تیز آواز نے اس کی توجہ منتشر کر دی۔ وہ چونک کر اٹھی اور آہستہ قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔

دروازہ کھولنے پر، باہر کوئی نظر نہ آیا۔ ہر طرف برف کا دبیز پردہ تھا جو مسلسل تیز رفتاری سے گر رہی تھی۔ ایمان نے کچھ الجھتے ہوئے ارد گرد نظر دوڑائی اور پھر ساتھ لگے لیٹر بوکس پر نگاہ پڑی جو کہ کھلا ہوا تھا، اور اس میں ایک خاکی لفافہ رکھا ہوا تھا۔ اُس نے جھک کر وہ لفافہ اٹھایا، اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن اس پر کوئی نام یا پتہ تحریر نہیں تھا۔ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے وہ واپس اندر آئی۔

لفافہ کھول کر جب اُس نے اندر موجود کاغذ نکالا تو الفاظ دیکھ کر اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ کاغذ پر جلی حروف میں لکھا تھا: ”میں معارج ہوں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ تمہارا ماضی میرے لیے باعثِ ندامت ہے، اور اس بوجھ کے ساتھ میں زندگی نہیں گزار سکتا۔“

ایمان کے چہرے پر ایک سرد جھونکا آیا، جیسے برف کی ٹھنڈک نے اُسے چھو لیا ہو۔ اُس نے دروازہ بند کیا اور کاغذ کو حیرت اور صدمے کے ساتھ گھورتے ہوئے، ایک لمحے کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

پھر اُس نے جبرے سخت کیے اور زیرِ لب بولی ”یہ معارج کی تحریر نہیں ہو سکتی!“۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اُس کی پیشانی پر پسینہ نمودار ہونے لگا۔ ”میرے ماضی سے کون واقف ہے؟“ اُس کے دل میں غم اور غصے کی لہر اٹھنے لگی۔

معارج اور اُس کے رشتے کو کون داغدار کرنا چاہتا تھا؟ اور اُسے تکلیف دینے کی کوشش کس کی تھی؟

دفتر کی پر شکوہ فضا میں معارج اپنے وسیع کمرے میں بیٹھا تھا۔ باہر کی مصروف دنیا کی جھلک، شیشے کی دیوار سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دبئی کی بلند و بالا عمارتیں اور برج خلیفہ کا سحر انگیز منظر اُس کے سامنے تھا، مگر اُس کے دل میں ایمان کی یادیں تھیں جو سکون چھینے جا رہی تھیں۔ دفتر میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی، لیکن معارج کا دھیان پر یزٹیشن پر پوری طرح مرکوز نہ تھا۔

وہ اپنی پُر شکوہ کرسی پر نیم دراز تھا، گہرے چاکلیٹ براؤن رنگ کی ڈریس پینٹ، جس پر سیاہ شرٹ اور اوپر سے نفیس واسکٹ اسے غیر معمولی وجاہت عطا کر رہی تھی۔

اُس نے اپنی دونوں انگلیوں کے درمیان ایک قلم کو ہلکے ہلکے گھمانا شروع کیا، ایک ایسا انداز جو اس کی شخصیت میں وقار اور فطری کشش کا مظہر تھا۔ وہ حرکت نہایت سبک رفتار، پُر اعتماد اور بے نیازی سے بھری ہوئی تھی، جیسے ہر چیز اُس کے کنٹرول میں ہو۔

لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اٹھتیں تو اس کا ہر انداز، ہر حرکت اس کے حسن و جاذبیت کو مزید نمایاں کر دیتا تھا۔

پریزنٹیشن جاری تھی، مگر اُس کا ذہن ایمان کے خیالوں میں الجھا ہوا تھا۔ وہ دل کی گہرائیوں میں اسے اپنی باہوں میں جکڑنے، اُس کے وجود کی حرارت کو محسوس کرنے، اور اپنے دل کی سچائی اُس پر عیاں کرنے کی تمنا رکھتا تھا۔

دفتر کا دروازہ ہلکے سے کھلا اور اُس کی سیکرٹری ہچکچاتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ ”سر...“ اُس کی مدھم آواز میں ہچکچاہٹ تھی۔ معارج نے قلم کی حرکت روکی اور بے نیازی سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی گہری آنکھوں میں ایک چمک ابھری، بھنویں اُٹھا کر مختصر سا کہا، ”جی؟“۔

کمرے میں موجود تمام لوگ یکدم خاموش ہو گئے، اور سب کی نگاہیں سیکرٹری اور معارج پر جم گئیں۔ سیکرٹری نے قدرے جھجھکتے ہوئے کہا، ”سر، کوئی مولا جٹنی آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ وہ میری بات سننے سے انکاری ہیں اور خاصی برہم لگتی ہیں۔“۔

معارج کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی، جیسے وہ اُس جملے کے پیچھے کی حقیقت کو پوری طرح سمجھتا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ ’مولا جٹنی‘ کس کا نام ہے — ایمان کا۔ وہ اکثر اسے اس نام سے چھیڑتا تھا، جان بوجھ کر، کیونکہ اسے پتہ تھا کہ ایمان کو یہ لقب سخت ناپسند تھا۔

اُس نے سیکرٹری کو اشارہ کیا کہ فون لاؤ، اور جب فون اُس کے ہاتھ میں آیا تو اُس نے کمرے کے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے مختصر اور باوقار لہجے میں کہا، ”

“Hold on, gentlemen. Something more important just came up“

اُس کا انداز نہایت باختیار اور مردانہ وجاہت سے بھرا ہوا تھا۔

معارض اٹھ کر شیشے کی دیوار کے قریب آیا، جہاں سے دبئی کی چمکتی دھوپ میں مصروف شاہراہیں اور بلند و بالا عمارات کا منظر پھیلا ہوا تھا۔ اُس کی نظر ایک لمحے کے لیے برج خلیفہ پر پڑی اور پھر اُس نے فون کان سے لگایا۔

”سلام جانِ معارج؟ سب خیریت ہے؟“ اُس کی آواز میں ایسی چاشنی اور گہرائی تھی جیسے وہ ہر لفظ کے ذریعے اپنے جذبات کو ایمان تک پہنچا رہا ہو۔

دوسری طرف ایمان کی بے چین روح، جو ایک نادیدہ طوفان کا سامنا کر رہی تھی۔

”معارض، مجھے ایک خط ملا ہے،“

ایمان کی آواز میں تھر تھراہٹ نمایاں تھی۔ ”اس میں لکھا ہے کہ تم مجھے میرے ماضی کی وجہ سے چھوڑ رہے ہو۔“

معارض کے چہرے پر جو مسکراہٹ تھی، وہ لمحہ بھر میں غائب ہو گئی۔ اس کے سینے میں ایک بھاری دھڑکن پیدا ہوئی، جیسے کوئی بہت ہی نازک چیز ٹوٹنے کو ہو۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی، مگر یہ غصے اور بے اعتباری کی چمک تھی۔

ایمان، اُس کا سب کچھ، اُس کی زندگی، اُس کی دھڑکن، کیسے کوئی ایسی بات کر سکتا تھا؟ اُس نے فوراً گہرے لہجے میں، مدھم مگر بھرپور محبت کے ساتھ کہا، ”یہ سراسر جھوٹ ہے، میری جان۔ ایسی بے ہودگی میری زبان سے نہیں نکل سکتی۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں، تمہاری ہر سانس میرے لیے عزیز ہے۔ تم میرے دل کی ملکہ ہو، اور تمہیں چھوڑنے کا سوچنا میرے لیے اتنا بڑا گناہ ہے جتنا اللہ کے ساتھ شرک کرنا۔“

ایمان نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں جھکا لیں۔ اُس کی سانسیں بے ترتیب تھیں، لیکن معارج کی یہ شدید محبت کی شدت اُسے تھوڑی سی تسلی دے رہی تھی۔ ”میں جانتی ہوں کہ یہ تمہاری لکھاوٹ نہیں ہے، معارج۔ اسی لیے میں نے تمہیں کال کی۔“

معارض نے گہری سانس بھری، اُس کی مضبوط انگلیاں فون پر ہلکی سی حرکت کر رہی تھیں، جیسے اُس کا ہر لفظ ہوا میں کسی پر اثر ڈالنے والا ہو۔ اُس کا لہجہ اب بھی محبت بھرا تھا، مگر اس کے اندر ایک نرمی کے ساتھ مردانہ وقار کا ایک منفرد امتزاج تھا۔ ”تم نے بہت اچھا کیا، میری جان۔ پریشان مت ہو، جب تک میں یہاں ہوں، کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میری محبت تمہاری ڈھال ہے۔ میری موجودگی میں تم محفوظ ہو، تم پر کوئی سایہ نہیں پڑے گا۔“

اُس نے کمرے میں ایک نظر ڈالی، جہاں سب لوگ اُس کے گرد خاموشی سے دیکھ رہے تھے، جیسے کوئی راز جاننے کی خواہش میں ہوں۔ لیکن معارج نے انہیں نظر انداز کیا، اُس کے لیے اُس وقت صرف ایمان کی اہمیت تھی۔ اُس نے نرم اور پُر عزم لہجے میں کہا، ”مجھے اُس خط کی تصویر بھیجو۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ بکو اس کس کی کارستانی ہے۔“

ایمان نے اسے واٹس ایپ پر تصویر بھیجی۔ معارج نے فون کو کان سے ہٹا کر تصویر پر نظر ڈالی۔ اُس کی آنکھوں میں آگ بھڑک اُٹھی، جب اُس نے ہاتھ کی لکھاوٹ کو پہچانا۔ اُس کے چہرے پر شدید غصے کی پرچھائیاں دوڑ گئیں۔ اُس کی مٹھیاں بھیبچ گئیں، اور اُس کے لبوں پر ایک خاموش قسم جاری ہو گئی۔ اُس نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ جو بھی اس سازش کے پیچھے ہے، وہ اس کا سخت انجام دیکھے گا۔

معارج نے نے موبائل دوبارہ کان سے لگایا اور پُر سکون، مگر مضبوط لہجے میں کہا، ”پریشان نہ ہو، میری محبت۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے پیچھے کون ہے۔ لیکن انہیں کبھی موقع نہیں ملے گا۔ میں انہیں ایسا سبق سکھاؤں گا جو وہ کبھی بھول نہیں پائیں گے۔ بس مجھ پر بھروسہ رکھو، میں تمہارے لیے ہر جنگ لڑنے کو تیار ہوں۔“

فون کے دوسرے سرے سے ایمان کی لرزتی، بے قراری سے بھری ہوئی آواز گونجی، ”معارج، کیسے صبر کروں؟ لڑکی کی عزت مکڑی کے جال سے بھی زیادہ نازک ہوتی ہے۔ چاہے وہ بے قصور ہو، لوگ اسے معاف نہیں کرتے۔ وہ خدا بن کر فیصلے صادر کرتے ہیں، ہر لمحہ کردار پر انگلیاں اٹھانے کو تیار رہتے ہیں۔“

معارج نے دل میں غصے کی ایک شدید لہر کو محسوس کیا، مگر اس کا لہجہ پُر سکون اور پُر اعتماد رہا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے، اُس نے دھیما مگر انتہائی پُر اثر انداز میں کہا، ”ایمان، سنو! یہ دنیا ہو یا کوئی اور، کوئی بھی اگر تم پر انگلی اٹھانے کی جسارت کرے تو یاد رکھنا، میں انہیں انگلی کے بغیر جینے کا ہنر سکھا دوں گا۔“ اُس کے الفاظ میں ایسی سرد مہری اور اعتماد تھا کہ جیسے کوئی بے رحم بادشاہ اپنی رعایا پر حکم صادر کر رہا ہو۔ اس کی آواز میں غضب کا ٹھہراؤ تھا، جیسے وہ دنیا کے تمام قوانین کو اپنے حکم کے تابع کر چکا ہو۔

ایمان نے اُس کی بات سن کر لمحہ بھر کے لیے سکون پایا، لیکن پھر اُس کی اداسی نے پھر سے گھیر اڈال لیا۔ ”مگر معارج، لوگ ہمیشہ عورت کو نشانہ بناتے ہیں، اس کے ماضی کو کھوجتے ہیں، جیسے وہ کوئی چیز ہو جسے توڑنا ان کا حق ہو۔“

معارج نے ایک گہری سانس بھری، جیسے وہ تمام دنیا کی بے حسی کو چیلنج کر رہا ہو۔ ”ایمان، تم وہ عورت ہو جو میرے دل کے سب سے محفوظ کونے میں بستی ہو۔ تمہاری پاکیزگی کو دنیا کا کوئی فتوہ، کوئی انگلی چھو نہیں

سکتی۔ میں تمہیں اپنی بانہوں میں ایسا قلعہ فراہم کروں گا، جہاں کوئی ہواؤں کا جھونکا بھی تمہیں چھونہ سکے گا۔ تم میری ملکہ ہو، میری جنگجو۔ میں تمہاری حفاظت کے لیے دنیا سے ٹکرا جاؤں گا، اور تم جانتی ہو کہ میں کبھی پیچھے نہیں ہٹتا۔”

ایمان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، جیسے اُس نے اُس کے الفاظ میں پناہ پالی ہو۔ اُس کی سانسوں میں تھوڑی سی راحت محسوس ہوئی۔ “میں جانتی ہوں معارج، مگر کبھی کبھار خوف دل پر حاوی ہو جاتا ہے۔”

معارج کی آنکھوں میں شدت کا ایک طوفان اُٹھا، وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے بولنے لگا، “ایمان، یاد رکھو! یہ دنیا جس قدر بھی تم پر انگلیاں اٹھائے، تمہاری قدر میں کوئی کمی نہیں آتی۔ تم میری آنکھوں میں وہ روشنی ہو جو کبھی مدھم نہیں ہو سکتی۔ تمہارا ماضی کوئی قید نہیں، بلکہ تمہارے وجود کی تکمیل ہے۔ میں تمہیں اس دنیا کی نظروں سے کہیں زیادہ بلند دیکھتا ہوں۔”

اُس کی آواز میں ایک شدید محبت اور وفاداری کا احساس تھا، جو ہر لفظ میں رچ بس گیا تھا۔ اس نے نرمی سے کہا، “اور تمہیں کسی کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں اس دنیا سے بھی زیادہ چاہتا ہوں۔ تمہاری ہر خاموشی، ہر بات میرے لیے قیمتی ہے۔ تمہاری مسکراہٹ میری دنیا کو روشن کر دیتی

ہے۔ تمہاری ایک جھلک میری زندگی کو مکمل کر دیتی ہے۔ تمہیں بس میرے ساتھ رہنے کی ضرورت ہے۔ باقی سب کچھ میں دیکھ لوں گا۔”

ایمان نے دل کی گہرائیوں سے سانس لی، اُس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے نرمی سے کہا، “معارض، تمہاری محبت میرے لیے ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ تم میرے لیے سب کچھ ہو۔”

معارض نے آہستہ سے مسکراتے ہوئے کہا، “اور میں جلدی آ رہا ہوں، میرے دل کی ملکہ۔ تمہارے لیے ایک ایسا سرپرائز ہے، جو تمہاری دنیا بدل دے گا۔ بس انتظار کرو، اور یاد رکھو، تم میری ہو، ہمیشہ۔”

ایمان کی آنکھوں میں ایک چمک تھی، جیسے وہ اُس کے ہر لفظ کو دل سے قبول کر رہی ہو۔ “تم بس آ جاؤ، معارض، تمہارے بغیر کوئی سرپرائز معنی نہیں رکھتا۔”

معارض نے دھیرے سے کہا، “میں تمہارے قریب ہوں، ہمیشہ تمہارے ساتھ۔ اللہ حافظ، میری محبت۔”

-- “اللہ حافظ، معارض۔ تم اپنا خیال رکھنا، ایمان نے آخری بار کہا، اور فون بند کر دیا۔

معارض کی نظریں موبائل پر مرکوز تھیں، اس کی انگلیاں برق رفتاری سے اسکرین پر چل رہی تھیں۔ اچانک اس نے ایک اور کال ملائی، موبائل کو کان سے لگاتے ہوئے اس کی نگاہیں شیشے سے باہر جمی رہیں۔ اس کا لہجہ سرد اور دھمکی آمیز تھا، جیسے موت کی سرگوشیاں کر رہا ہو۔ ”کون ہے وہ گستاخ جس نے یہ جرات کی؟“ اس کی آواز میں شدید غصے کی جھلک تھی، لیکن اس کا انداز پُر سکون تھا، جیسے طوفان آنے سے پہلے کا سکوت۔

دوسری جانب سے کوئی جواب آیا، لیکن معارج کے جبرے سخت ہو گئے، آنکھوں میں وحشت کی چمک پیدا ہوئی۔ وہ انتہائی پختہ اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا، ”ہڈیاں چورا کر دو۔ اُسے گھسیٹ کر امریکی سفارت خانے کے باہر پھینک دو، تاکہ بھیجنے والے جان لیں کہ گونا گون کون ہے۔ انہیں یہ پتہ چلنا چاہیے کہ شیر کی نیند میں خلل ڈالنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ شیر جب جاگتا ہے تو شکار کو فنا کر دیتا ہے، اور میں اب جاگ چکا ہوں۔“

معارض کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا، لیکن اس کے چہرے پر قاتلانہ سکون برقرار تھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ تھی، جو کسی بھی پل بھڑک کر سب کچھ جلا سکتی تھی۔ اُس کے ماتھے کی رگیں ابھر آئی تھیں، جیسے طوفان کے آغاز کا اعلان ہو رہا ہو، مگر لبوں پر سرد مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جس میں ایک وحشیانہ اطمینان تھا۔

وہ جانتا تھا کہ ایمان کی حفاظت کے لیے ہر ممکن قدم اٹھا چکا ہے۔ ہر موڑ پر اُس کے وفادار موجود تھے، جو پل پل کی خبر معارج تک پہنچا رہے تھے۔ چاہے وہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو، ایمان کی حفاظت کے لیے اُس نے اپنے لوگوں کو تعینات کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی بھی اُس کے قریب آنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اُس کا دل ایمان کی محبت اور دنیا سے جنگ کرنے کے عزم سے لبریز تھا۔

معارج نے موبائل بند کیا، گہری سانس لیتے ہوئے پلکیں موندیں، جیسے غصے کی تپش کو قابو میں لا رہا ہو۔ چند لمحوں بعد آنکھیں کھولیں تو اُن میں وحشت کے ساتھ سرد سکون تھا۔ اُس نے ارد گرد نظر دوڑائی، کمرے میں موجود ہر شخص کی طرف ایسا دیکھتے جیسے اُن کے وجود کی بھی پرواہ نہ ہو۔ ہاتھ کا مختصر سا اشارہ دیا تو سیکرٹری، جو پہلے ہی سہم کر کھڑی تھی، تیزی سے اس کے قریب چلی آئی۔

معارج نے موبائل سیکرٹری کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے، کالر آئی ڈی پر ”مولا جٹنی“ کی طرف اشارہ کیا اور گہری، بھرپور آواز میں کہا،

، ”جب بھی اُس نام سے فون آئے، چاہے میں کہیں بھی ہوں، فوراً یہ فون میرے پاس لے کر آنا۔ چاہے میدانِ جنگ میں ہو یا موت کا سامنا کر رہا ہوں، اُس کال کا انتظار کرنا میری ترجیح ہوگی۔“ اس کے الفاظ میں ایسی قطعیت اور حفاظت کا وعدہ تھا کہ سیکرٹری کا سر خود بخود ہاں میں جھک گیا، خوف اور احترام سے لرزتے ہوئے۔

معارض نے ایک آخری نظر سیکرٹری پر ڈالی، جیسے اسے یقین دلانا چاہتا ہو کہ اس کے احکام سے انحراف ناقابلِ معافی ہوگا، پھر اپنے قدم نشست کی جانب بڑھائے۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا، اور میٹنگ کی طرف واپس پلٹا، گویا کچھ بھی غیر معمولی نہیں ہوا تھا۔

مگر اس کے چہرے کی ہلکی سی مسکراہٹ، جو یک دم ہی اس کے لبوں پر اُبھری تھی، چھپنے میں ناکام رہی۔ میٹنگ میں موجود لوگوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، مگر معارج نے اُن کی پرواہ نہیں کی۔ اُس کے ذہن میں ایک ہی شے گونج رہی تھی—ایمان۔ اُس کی ہر بات، ہر مسکراہٹ، ہر لمحہ اُس کے دل پر گہری چھاپ چھوڑ چکی تھی۔ وہ اس کے خیالوں میں یوں گم تھا جیسے کوئی شہزادہ اپنی ملکہ کے حسن میں کھو جائے۔ اُس کے لیے ایمان کا ذکر ایک خواب جیسا تھا، اور وہ خواب اُس کی ہر سوچ، ہر قدم پر حاوی تھا۔

—“جاری رکھو،” معارج نے بے پرواہ انداز میں کہا، جیسے گفتگو میں دلچسپی نہ ہو۔ مگر اُس کے دل کی دھڑکن ایمان کے خیال سے تیز ہو چکی تھی۔ وہ اُس کی حفاظت، اُس کی محبت میں مکمل طور پر ڈوبا ہوا تھا۔

...°...

برف کا جھر مٹ دو ہفتے قبل کی مانند ہر سمت پھیل چکا تھا، گویا زمین و آسمان نے سفید پوش لباس اوڑھ لیا ہو۔ ایمان نے جانوروں کو چارہ کھلا کر ان کو گرم اصطلبل میں محفوظ کر دیا تھا، اب وہ اپنے پیارے گھوڑے بادل کے ساتھ تنہائی میں تھی۔

رات کی خاموشی، سردی کا ہلکا سا جھونکا، اور برف کے گرتے گالے ایک سحر انگیز منظر پیش کر رہے تھے۔

ایمان بڑی احتیاط سے بادل کو برش کر رہی تھی کہ اچانک اس کے سویٹر کی جیب میں رکھا موبائل فون بجنے لگا۔ وہ متوجہ ہوئی اور جلدی سے ہاتھ بڑھا کر فون نکالا۔ اس کی آواز میں اداسی چھپی ہوئی تھی، جب اس نے فون کان سے لگایا اور سرگوشی میں کہا۔

۔ ”السلام علیکم، میرے دل کی دھڑکن، تم کیسے ہو؟“ دوسری طرف معارج کی آواز نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو جیسے زندگی بخش دی۔ وہ آواز، جس کا انتظار ایمان نے بڑی شدت سے کیا تھا، اس کے دل کو ایک عجیب سی سکونت عطا کر رہی تھی۔

ایمان کو اس کی دوری بے حد پریشان کیے ہوئے تھی، اور اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا، ”معارج، خدا کے لیے اب واپس آ جاؤ۔ میں تمہاری بہت فکر میں مبتلا ہوں، مزید انتظار مجھ سے نہیں ہو رہا۔“

بادل اچانک چوکننا ہو گیا، اس نے اپنی گردن بلند کی جیسے کوئی برف پر آہستہ آہستہ قدم رکھ رہا ہو۔ ایمان، معارج کی باتوں میں کھوئی ہوئی، اس اجنبی قدموں کی چاپ سے بے خبر تھی۔ پھر یکایک، کسی نے پیچھے سے آکر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

ایمان کا دل جیسے دھڑکننا بھول گیا ہو، وہ یکدم سٹیٹا گئی۔ اس نے فوراً اپنے کہنی سے اس شخص کے سینے پر وار کیا اور پلک جھپکتے ہی اسے دیوار سے لگا دیا۔ پھر جب وہ خوف اور حیرت سے اس کی طرف مڑی، اس کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ معارج تھا!۔

اس کے چہرے پر نقاب تھا، مگر وہ آنکھیں، وہ خواب ناک آنکھیں ایمان کے دل میں ہمیشہ سے محفوظ تھیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے بے یقینی میں کھڑی رہی، پھر اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ آئی اور وہ اس کے گلے لگ گئی، جیسے برسوں کی دوری کا صبر اس ایک لمحے میں ختم ہو گیا ہو۔ معارج نے بھی اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا، اس کے دل کی دھڑکن ایمان کی سانسوں میں سما گئی تھی۔

نقاب اتارتے ہوئے، معارج نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور سرگوشی میں کہا۔

”میری زندگی، میری جاں، تمہیں اپنی نظروں کے سامنے پانے کی کس قدر تمنا کی تھی۔ یہ خواہش دل میں ہر لمحہ دھڑکتی رہی کہ تمہیں اپنے قریب محسوس کروں، تمہیں سینے سے لگاؤں۔ یہ چند مہینے گویا صدیاں بن کر بیٹے ہیں، ہر پل تمہاری قربت کا انتظار، ایک عمر کی مانند محسوس ہوا۔“

ایمان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، مگر یہ آنسو خوشی کے تھے، جنہیں وہ چھپانے کی کوشش نہ کر سکی۔ وہ ہنس رہی تھی یا رو رہی تھی، اس کا فیصلہ مشکل تھا، مگر دونوں کی خوشی عیاں تھی۔

معارج نے نرمی سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مسکراتے ہوئے کہا، ”جب تم روتی ہو، تو اتنی حسین لگتی ہو کہ میں زندگی بھر تمہیں دیکھتا رہوں، مگر یہ آنسو میرے دل پر بجلی بن کر گرتے ہیں، ایمان۔“ ایمان نے مسکراتے ہوئے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھے اور کہا، ”یہ خوشی کے آنسو ہیں، معارج۔“

معارج نے اسے دوبارہ گلے لگایا اور گویا سرگوشی کی، ”میں تمہارے پاس آکر بہت خوش ہوں، اور اب تمہارے ساتھ رہنا ہی میری زندگی کا مقصد ہے۔“

معارج نے نرمی سے ایمان کو اپنے بازوؤں سے ہٹا کر اس کے آنسو اپنی انگلیوں سے صاف کیے، پھر ہلکا سا جھک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی شفقت اور معصومیت سے بولا، جیسے کسی ننھے بچے کو سمجھا رہا ہو ”اور یہ کیا؟ تم تو کہتی تھیں کہ تمہیں کسی سے ڈر نہیں لگتا، تمہاری فکر بس یہ ہے کہ اللہ کیا سوچتا ہے، باقی دنیا کی پرواہ تمہیں کب سے ہونے لگی؟“ اس کی آنکھوں میں ایک شوخی سی جھلک رہی تھی، مگر محبت اور نرمی میں لپٹی ہوئی۔

ایمان ہلکا سا مسکرائی، مگر اس مسکراہٹ میں ایک بے بسی تھی۔ ”اس دن ڈر گئی تھی، معارج... بس یہ ہی خوف تھا کہ کہیں میری وجہ سے تمہاری عزت پر کوئی حرف نہ آجائے، میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچے۔“

ایمان کی آواز بھرا گئی، اور جیسے ہی اس نے مزید کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے، معارج نے اپنی انگلی نرمی سے اس کے لبوں پر رکھ دی۔ وہ محبت بھری گہرائی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا ”ایمان، تمہاری وجہ سے میری عزت کو کوئی گزند کیوں پہنچے گی؟ تم تو میری زندگی ہو، میری محبت ہو، اور تمہاری قربت سے میری عزت اور وقار میں اضافہ ہوگا، نقصان نہیں۔ تمہیں یہ خیال کیوں آیا کہ تم

میری عزت کے لیے خطرہ بن سکتی ہو؟ تمہارے ساتھ ہونے سے میری زندگی میں روشنی آئے گی، مجھے جینے کا مقصد ملے گا، ایمان۔ تمہاری موجودگی میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے، تمہارے ساتھ ہونے سے مجھے اپنی زندگی کا وہ سکون نصیب ہوتا ہے جس کی میں ہمیشہ سے تلاش میں تھا۔”

اس کی آواز میں ایک عجیب سکون اور یقین تھا، جیسے وہ ایمان کو یقین دلانا چاہتا ہو کہ اس کی ہر فکر اور ہر خوف بے بنیاد ہے۔ ایمان نے اس کی باتیں سن کر خاموشی سے سر جھکایا، اور اثبات میں ہلایا، مگر اس کے دل میں وہی احساس جاگزیں ہو گیا تھا کہ معارج جیسے شخص کا ساتھ دنیا کی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے۔

معارج نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر اس کے آنسو پونچھے، لیکن اس بار اس کے چہرے پر ایک دلنشین مسکراہٹ تھی۔ ”تم میرے دل کی ملکہ ہو، ایمان، اور تمہاری موجودگی میری زندگی کا وقار ہے، تمہارا ہونا میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔”

مگر کچھ یاد آتے ہی لحظہ بھر میں معارج کی آنکھوں میں جیسے آتش فشاں بھڑک اٹھا ہو، غصے کی تپش اس کی نظروں میں واضح تھی، لیکن جب اس نے ایمان کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر نرم محبت اور ہمدردی کا سایہ چھا گیا۔ وہ دھیمے مگر بے پناہ غصے میں بولا، ”ایمان، بس ایک بار مجھے اجازت دو۔ جن کمینوں نے تمہیں اذیت دی، جنہوں نے تمہارے دل کو زخمی کیا، میں ان کی زندگی کو جہنم بنا دینا چاہتا ہوں۔ میں انہیں اس دنیا میں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ ہر سانس لیتے وقت پچھتائیں۔”

ایمان کی سانسیں دھیمی ہو گئیں، اور اس نے غیر ارادی طور پر تھوک نگلا، اس کی گردن کی رگ ہلکی سی اُبھر کر پھر معدوم ہو گئی۔ “معارض، ان منحوس اور بد بخت لوگوں کا ذکر کر کے اس حسین لمحے کو خراب مت کرو۔ میں نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ ان کو دنیا میں ہر آسائش ملے، ہر خوشی نصیب ہو، مگر جب وہ آخرت میں رب کے حضور پیش ہوں، تو ذلت اور رسوائی ان کا مقدر ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کے چہرے قیامت کے دن سیاہ ہوں اور وہ اللہ کے سامنے خوار ہو کر کھڑے ہوں۔”

معارض نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے اس کے گالوں پر رکھ دیے، اس کی آنکھوں میں گہری تشویش اور محبت تھی، لیکن لبوں سے غصے کی ایک لہر ٹپکی، “ایمان، میں تمہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں ان لوگوں کو سزا دینا چاہتا ہوں، میں ان کی زندگیوں کو ان کے کیے کا خمیازہ بنانا چاہتا ہوں۔ میرے پاس ان کا ایک ایسا راز ہے، جو ان کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دے گا، ان کی دنیا کو برباد کر دے گا۔”

ایمان ایک دم چونک گئی، اس کی آنکھوں میں حیرت اور تجسس اُبھر آیا، “ک... کون سا راز؟”

معارض کی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہوئی، مگر اس کی آواز میں زہر بھری ہوئی سنجیدگی تھی۔ “ایمان، ان کا وہ چہرہ جو دنیا کے سامنے صاف اور معزز دکھتا ہے، دراصل گندگی اور گناہوں کا ڈھیر ہے۔ میں انہیں بے نقاب کرنے کی طاقت رکھتا ہوں، اور جب میں وہ راز افشا کروں گا، تو دنیا کی نظروں میں ان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔”

معارض نے ایمان کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا، تو اس کی آواز میں غصے کی سرد لہر اور راز کا بوجھ دونوں چھپے ہوئے تھے۔ ”ایمان، وہ خالدہ... تمہارے باپ کی لاڈلی بیوی، وہ ہی اس کی تباہی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔“

ایمان کی نظریں اب بھی معصومیت اور بے یقینی سے معارض کی طرف جمی رہیں، وہ بات کی گہرائی کو نہیں سمجھ پارہی تھی۔ ”معارض، صاف صاف کہو، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

معارض نے ایک گہری سانس لی اور اپنی آنکھیں غصے اور تلخی سے سکیڑتے ہوئے بولا،

۔ ”وہ میکائل، جسے تمہارے والد اپنے حقیقی بیٹے کی مانند پروان چڑھا رہے ہیں، دراصل ان کا خون نہیں ہے۔ خالدہ نے تمہارے باپ کے اعتماد کو فریب میں لپیٹ کر مسخ کیا ہے۔ اس کا ایک اور مرد سے تعلق تھا۔ بلکہ دو عشقیہ تعلقات۔ ایک طرف تمہارے والد جتوئی کو نادانی کی چادر میں لپیٹا اور دوسری طرف وہ اپنے سوسائٹی کے ایک نوجوان کے ساتھ خفیہ میل جول میں مصروف رہی۔ جب وہ حاملہ ہوئی اور اس کا دلبر اسے بے یار و مددگار چھوڑ گیا، تب اس نے میکائل کو جتوئی کی اولاد کے طور پر پیش کیا، تاکہ جتوئی کو قابو میں رکھ سکے۔ اور اب جتوئی سا لہا سال سے کسی غیر کے خون کو اپنا سمجھ کر سینے سے لگا رہا ہے۔“

ایمان کی آنکھوں میں حیرت کی ایک گہری جھلک اتر آئی، وہ بے یقینی سے معارج کی طرف دیکھتی رہی، جیسے اس کے الفاظ کو سمجھنے میں وقت لے رہی ہو۔ ”یہ... یہ کیسے ممکن ہے؟“۔

معارج نے اس کے چہرے پر تلخی بھری مسکراہٹ سے نظر ڈالی اور مزید بولا،۔

۔ ”ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس راز کو اپنی مرضی کے حربے کے طور پر استعمال کر سکتا ہوں، ان کی بربادی کے لیے۔ جہاں تک میکائیل اور آصف کا تعلق ہے، تو میں اپنی ہی مٹھی سے ان کی سانسیں چھین سکتا ہوں۔ ان کو ایسی فنا بخشوں گا کہ دنیا لرز اٹھے گی، اور ان کے نام کی بازگشت فضاؤں میں مدتوں تک خوف کی علامت بن کر گونجے گی۔“۔

ایمان نے لمحہ بھر سوچا، پھر ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خاموش مسکراہٹ پھیل گئی، جیسے کوئی راز فاش ہونے پر عجیب سا سکون حاصل ہو رہا ہو۔۔۔۔ ”معارج، تم جانتے ہو کہ جو اوپر ہے، وہ ہر شے پر نگاہ رکھتا ہے۔ وہ ہمارے نہ دیکھ سکنے والی حقیقتوں سے بھی واقف ہے۔ تم کہہ رہے ہو کہ میرے باپ نے اتنے سالوں سے کسی اور کی اولاد کو اپنا سمجھ کر پالا، اور جو اس کا حقیقی بیٹا تھا، اللہ نے اسے اس سے جدا کر دیا۔ غور کرو، اس نے ساری عمر مجھے دھتکارا، مجھے حقیر جانا، اور آج وہ خود ایسی حقیقت کا سامنا کر رہا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب کچھ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ دنیا کے فیصلے

اور تقدیریں ہمارے ہاتھوں میں نہیں، بلکہ اُس کے ہاتھ میں ہیں جو ہر پوشیدہ راز کا مالک ہے۔ ہمیں اپنے دلوں کو صاف رکھنا چاہیے، کیونکہ جو راستے ہمیں دشوار لگتے ہیں، ان کا حل صرف اُس کے علم میں ہے۔”

-

ایمان کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک نمودار ہوئی، وہ محفوظ ہو کر گویا خود سے بولی، ”یہ ہی تو عدل ہے، معارج، اللہ کا انصاف۔ وہ بیوی، جسے وہ اپنے دل سے چاہتا تھا، وہ ہی اسے دھوکہ دے گئی۔ اور جس بیٹے پر وہ اپنی نسل کے بڑھنے کی امیدیں باندھ رہا تھا، وہ اس کا بیٹا ہی نہیں ہے۔ اللہ نے کیسے ان سے بدلہ لیا، جہاں سے ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔“

معارج کا چہرہ تلخی اور غصے سے سرخ ہو گیا، مگر ایمان نے نرم لہجے میں اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بولی، ”معارج، میں ان کے اس راز کا پردہ رکھوں گی، کہ جب ہم اللہ کے سامنے کھڑے ہوں، تو وہ بھی ہمارے گناہوں کا پردہ رکھے۔ تم بس چھوڑ دو، ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اپنے پاک ہاتھ ان کے ناپاک خون سے رنگو۔ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ تم اپنی طاقت ان پر ضائع کرو۔ جو کچھ وہ کر چکے ہیں،

اللہ ان کا حساب بہت بہتر لے گا، اور تم دیکھنا، جب آگ کی لپیٹیں انہیں اپنی گرفت میں لیں گی، تب انہیں معلوم ہو گا کہ عدل کیا ہوتا ہے۔”

ایمان کے چہرے پر ایک عجیب سکون تھا، جیسے وہ ان سب واقعات کو ابھی اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھ رہی ہو۔ ”ظالم جتنا بھی ظلم کر لے، ایک دن وہ اللہ کی عدالت میں ضرور کھڑا ہو گا، اور اس دن اس کا حساب ضرور ہو گا۔”

معارض کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ایمان نے محبت بھرے لہجے میں کہا، ”اگر میں چاہتی، تو اتنی مضبوط ہوں کہ خود ہی ان سے بدلہ لے سکتی تھی۔ انہیں ایسی سزا دیتی کہ موت تک کانپ اٹھتی۔ لیکن میں نے یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ جو باتیں اللہ کے سپرد کی جاتی ہیں، وہ کبھی ضائع نہیں جاتیں۔ اللہ کا انصاف کبھی نہیں ٹلتا، اور وہ، ظالموں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔“

معارض ہولے سے مسکرایا، اور اپنی نرم آنکھوں سے ایمان کو قریب کر کے گلے لگا لیا۔ اُس نے ہمدردی سے اُس کی پشت پر ہاتھ پھیرا، گویا اُس کے دل کی گہرائیوں کو سکون دینے کی کوشش کر رہا ہو۔ جیسے ہی ایمان نے نرمی سے معارج کے بازوؤں کو چھوڑا، وہ لمحہ بھر پیچھے ہٹی اور معارج کی جانب دیکھنے لگی، مگر بادل کا چہرہ کچھ اور ہی کہانی سنارہا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں حسد کی تپش تھی، اور خفگی کا سایہ واضح تھا۔ بادل کو معارج کی موجودگی ایک آنکھ نہ بھا رہی تھی۔ وہ کسی اور کو ایمان کی توجہ چھیننے نہیں دینا چاہتا تھا۔ بادل، جو ایمان کا محبوب گھوڑا تھا، اس کے دل میں اس بات کی آگ بھڑک رہی تھی کہ ایمان کی محبت اور توجہ اُس کے سوا کسی اور کی جانب کیوں مائل ہو رہی تھی۔

بادل نے اپنا غصہ دبانے کی بجائے، اُسے عملی صورت دینے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو اُس کی نگاہ دیوار پر لگی ایک زنگ آلود کیل پر جا ٹھہری۔ اُسے ایک شیطانی خیال سوچھا۔ اُس نے اپنے بھاری کھر سے کیل کو زور سے مارا، جس سے دھات کی بھاری ٹھنک گونجی۔ اُس کی اُمید تھی کہ ایمان یہ آواز سُن کر اُس کی طرف متوجہ ہو جائے گی۔

ایمان نے اچانک شور مٹا اور مڑ کر دیکھا۔ بادل اُسے غصے میں خشمگیں نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اپنے سر کو تھوڑا جھکاتے ہوئے نرمی سے کہا، ”بادل! یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا تم نے خود کو نقصان پہنچایا ہے؟“ اُس نے فوراً معارج کو چھوڑا اور بادل کی جانب بڑھنے لگی۔

معارج نے آنکھیں گھماتے ہوئے ہلکی مسکان کے ساتھ کہا، ”ہمارے رقیب کو شاید ہمارا ساتھ گوارا نہیں ہو رہا۔“

ایمان نے جواباً کہا، ”اب مجھے بھی یہ ہی محسوس ہو رہا ہے، جیسے وہ جان بوجھ کر اپنی ضد دکھا رہا ہو۔“

معارض دل ہی دل میں مسکرا کر بولا، ”کل دیکھتے ہیں مسٹر بادل! تمہیں ٹھیک کیسے کیا جاتا ہے۔“

ایمان نے بادل کے کھر کو بغور دیکھا، کیل کی موجودگی کا اندازہ لگا لیا، اور آہستگی سے سر ہلاتے ہوئے بولی،
”تم خود کو زخمی کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ آؤ، میں یہ کیل نکال دوں۔“ اُس نے نرمی سے کیل نکالا
اور ایک طرف پھینک دیا، پھر بادل کی ایال کو ہلکی تھپکی دیتے ہوئے کہا، ”اب ٹھیک ہو؟ شرارت چھوڑ دو،
بادل۔“

ایمان نے پیار سے کہا، ”معارض کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ وہ تمہارا دوست ہے، اور تم سے محبت کرتا ہے۔
اور جان لو کہ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر ایمان نے بادل کی پیشانی پر ایک محبت بھرا
بوسہ دیا اور ہلکی مسکان چہرے پر چھا گئی۔

بادل نے جھنجھلاہٹ سے سر ہلایا، جیسے وہ معارج کو اپنے حلقے میں قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اُس کی
نظروں میں ابھی بھی معارج کے لیے ناپسندیدگی تھی۔ اُس نے ایمان کو دیکھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار
کیے بغیر ہی دل میں جلتی حسد کی آگ کو دبانے کی کوشش کی۔

معارض یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور مسکرا دیا۔ وہ ایمان کی شفقت اور مہربانی کی گہرائیوں سے متاثر تھا۔ اُسے
اس بات سے پیار تھا کہ کس طرح ایمان جانوروں کا خیال رکھتی ہے، اور وہ بدلے میں اُس سے بے پناہ

محبت کرتے ہیں۔ معارج دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ کس طرح اُس کی یہ نرم دلی دنیا کے سامنے بے مثال ہے۔

وہ ایمان کے قریب آکر بولا، ”تمہاری محبت بے مثال ہے، ایمان۔ تمہارا دل بہت وسیع اور شفیق ہے۔“ ایمان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”شکریہ، معارج۔ تم بھی لا جواب ہو۔ اور تمہارے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ بھی ہے۔“

ایمان نے معارج کی طرف جھک کر اُسے محبت بھرا بوسہ دیا، اور پھر نرمی سے کہا، ”چلو، میں تمہیں دکھاتی ہوں۔ گھر چلتے ہیں۔“

وہ معارج کا ہاتھ تھامے دروازے کی طرف بڑھی، اور اُسے کھول کر جیسے ہی دونوں باہر گئے، ایمان نے پیچھے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔

بادل نے یہ سب دیکھا۔ وہ مطمئن نہ تھا۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ ایمان اُس کے ساتھ رہے، اور معارج کہیں دور چلا جائے۔ اُس نے غصے میں دیوار کو ایک اور لات ماری اور اپنے تنکے والے بستر پر لیٹ گیا، کوشش کی کہ آنکھیں بند کر کے سو جائے۔ دل میں یہ امید لیے کہ ایمان جلدی واپس آجائے گی اور اُسے معارج سے زیادہ اہمیت دے گی۔

ایمان اور معارج گھر کی جانب بڑھ گئے، ایمان کی آنکھوں میں خوشی اور تجسس کے سائے جھلک رہے تھے۔

...°...

معارج کمرے کے دروازے کے باہر خاموشی سے کھڑا تھا، اُس کے لبوں پر حیرت کے ہلکے آثار تھے۔ اُس کی آنکھوں میں انتظار کی بے تابی جھلک رہی تھی۔ جب ایمان نے دروازہ کھولا تو کمرے کا منظر جیسے ایک خوابیدہ دنیا کی دہلیز پر لے آیا ہو۔

اندر نیم روشن ماحول، مدھم اور پُراثر، اپنے دھیان میں گم تھا۔

بڑی شفاف کانچ کی کھڑکی کے اُس پار، پہاڑوں کا پُرسکون اور خاموش نظارہ دل کو گہرائیوں میں اتر جانے والا تھا۔ ہر منظر برف کی دبیز چادر میں لپیٹا ہوا تھا، جیسے قدرت نے سب کچھ اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ آسمان سے مسلسل برف کے نرم گالے تیزی سے گر رہے تھے، ہر شے پر سفید لبادہ چڑھتا جا رہا تھا، اور یہ سرد موسم ایک عجیب سی خاموشی کے ساتھ فضا کو مزید بوجھل کر رہا تھا۔

کمرے کی دیواریں ایک سحر انگیز کائناتی منظر پیش کر رہی تھیں۔ گول سیارے اور چمکدار کہکشاں ایل ای ڈی لیمپس کے ذریعے ابھری ہوئی تھیں، جنہوں نے فضا میں ایک حیرت انگیز کائناتی اثر پیدا کر رکھا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کمرہ زمین سے ہٹ کر کہیں خلا میں معلق ہو، جہاں ہر طرف صرف روشنیوں کی جگمگاہٹ اور فلکی نظارے ہوں۔

ایمان نے مسکراتے ہوئے نرم آواز میں کہا، ”آنکھیں بند کرو! تمہارا قدامتاء اللہ اتنا لمبا ہے کہ میں یہ کام خود نہیں کر سکتی۔“

معارض کی آنکھوں میں شرارتی سی مسکراہٹ چھلکنے لگی، اُس نے مدھم لہجے میں کہا، ”یہ تو بہت اچھا ہے کہ میرا قدامتاء ہے، زندگی بھر تمہارے سامنے سر جھکائے رکھوں گا،۔“

ایمان کی ہلکی سی مسکراہٹ اُس کی چہرے پر پھیل گئی۔ معارج نے آنکھیں بند کر لیں اور ایمان نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے کمرے کے وسط میں لے جا کر کھڑا کیا۔ پھر وہ سرگوشی میں بولی، ”اب آنکھیں کھولو۔“

معارض نے آنکھیں کھولیں تو اُس کے سامنے ایک خوبصورت اور قدیم طرز کا سیاہ لکڑی کا شیلف نظر آیا، جس پر نایاب اور قیمتی کتابیں رکھی تھیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے دنگ رہ گیا۔ اُس کی نظروں میں حیرانی اور خوشی کے جذبات اُبھرتے چلے گئے۔ ”یہ وہ ہی کتابیں ہیں، جو میں ہمیشہ خریدنا چاہتا تھا! تمہیں ان کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟“ معارج نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

ایمان نے اپنے کندھے اُچکاتے ہوئے معصومیت بھرے انداز میں جواب دیا، ”تم نے جو نوٹ پیڈ پر فہرست لکھی تھی، میں نے اسے دیکھ کر خود کو بھیج دیا تھا۔ پھر میں نے یہ کتابیں تمہارے لیے خرید لیں۔“

معارض نے محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ ایمان کو اپنے بازوؤں میں لے کر گلے لگایا، اُس کی نرم پیشانی پر بوسہ دیا اور بولا، ”شکریہ، ایمان! لیکن میرے پاس یہ سب پڑھنے کا وقت کیسے ہوگا؟ اب تو ساری عمر تمہیں ہی پڑھنا ہے، تمہارا چہرہ، تمہاری مسکان، تمہاری دلکشی۔“

ایمان اُس کی بات سن کر شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش رہی۔ اُس کے دل میں محبت کی گہرائی محسوس کی جاسکتی تھی۔۔

معارض نے ایک گہری سانس لی اور ایمان کے نرم ہاتھ کو تھام کر اُسے آہستگی سے بڑے شیشے کے سامنے لے آیا۔ دونوں کی نظریں آہستہ آہستہ آئینے میں اپنے عکس پر جم گئیں۔ ایمان کا پر نور چہرہ شیشے میں منعکس ہو رہا تھا، اور معارض اُس کے پیچھے کھڑا، اُسے دیکھتے ہوئے اُس کے عکس میں کھویا ہوا تھا۔ روشنی کی ہلکی سی جھلک، کمرے کی سادگی میں ایک خوابیدہ سا تاثر پیدا کر رہی تھی۔

اچانک، معارض نے ایمان کے بال نرمی سے سمیٹے، اُس کی گردن کی ملائم سراجی پر اپنی انگلیوں کا لمس دیا، اور ایک نہایت دلکش لاکٹ اُس کے گلے میں آہستگی سے ڈال دیا۔ وہ لاکٹ چھوٹے گلوب کی صورت میں تھا، جس کے گرد نیلے سبز رنگ کی روشنی ہلکے ہیرے کی مانند چمک رہی تھی۔ گویا دنیا ایک چھوٹے سے جواہر میں سمٹ آیا ہو، اور ہر زاویے سے اُس کی جمالیاتی خوبصورتی نمایاں ہو رہی ہو۔

ایمان نے حیرت اور مسرت بھری نگاہوں سے اس خوبصورت لاکٹ کو دیکھا، اُس کے لبوں پر نرم سی مسکان پھیل گئی، گویا اُس نے ابھی ایک خواب کی تعبیر کو چھو لیا ہو۔ ”یہ بہت حسین ہے، معارج!“ اُس نے مدھم اور محبت بھری آواز میں کہا۔ معارج اُس کے اور قریب آیا، اپنے بازوؤں کا ہالہ اُس کے گرد پھیلا یا، اور اپنی ٹھوڑی اُس کے کندھے پر رکھتے ہوئے، اُن دونوں کے عکس کو آئینے میں غور سے دیکھنے لگا۔

۔ ”اب جب تم نے اسے پہن لیا ہے، یہ لاکٹ اور بھی زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے،“ معارج نے سرگوشی کی۔ اُس کی آنکھوں میں نرم سی چمک اور محبت کی گہرائی تھی۔

ایمان نے مسکراتے ہوئے معارج کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا، ”یہ دنیا کی صورت میں لاکٹ کیوں؟“۔

معارج نے اپنی انگلی میں پہنی نارنجی رنگت کی انگوٹھی کی طرف اشارہ کیا، جو سورج کی مانند چمک رہی تھی۔ اُس کا رنگ اتنا جاذبِ نظر تھا کہ لگتا تھا جیسے سورج کی کرنیں اُسے روشن کیے ہوئے ہوں۔ اُس کی آواز میں سنجیدگی اور محبت کا تاثر نمایاں تھا، ”تم میری دنیا ہو، اور میں تمہارا سورج ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ دنیا ہمیشہ سورج کے گرد گھومتی ہے، کبھی اُسے نہیں چھوڑتی۔ اور سورج بھی دنیا کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ ہمارا رشتہ بھی اُنہی سیاروں اور ستاروں جیسا ہے جو ہمیشہ ایک دوسرے کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں، کبھی جدا نہیں ہوتے، اور ایک ساتھ ہی فنا ہو جاتے ہیں۔“۔

ایمان نے مسکراتے ہوئے، شرارت بھرے انداز میں کہا، ”لیکن کیا سورج ایک دن دنیا کو نگل نہیں جائے گا؟“۔

معارض نے ہلکے سے کندھے اُچکائے اور مدھم سی مسکان کے ساتھ کہا۔

۔ ”جب سورج ایک دن اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ آسمان کے دامن کو جلا ڈالے گا، اور اپنی عظمت کے بوجھ تلے خود کو ایک دھکتے ہوئے انگارے میں بدل دے گا، تب وہ اپنے ہی وجود کی تاب نہ لاتے ہوئے بکھر جائے گا۔ وہی کشش ثقل، جو اسے تھامے رکھتی تھی، ایک دن اُس کے فنا ہونے کا سبب بنے گی۔

لیکن ہماری محبت کا رشتہ اس فنا سے ماورا ہے۔ یہ ایسی طاقتور کشش ہے کہ نہ وقت اسے کمزور کر سکتا ہے، نہ یہ کائنات کی وسعتوں میں گم ہو سکتی ہے۔

میری زندگی تمہارے بغیر اُس سورج کی مانند ہو جائے گی جو اپنے محور سے آزاد ہو کر پاش پاش ہو جائے، لیکن بڑ فلائے، ہم اپنی محبت کی کشش میں ہمیشہ جڑے رہیں گے، فنا کے اُس موڑ تک کبھی نہیں پہنچیں گے۔ ہم اُس دائمی قوت کی مانند ہیں جو کبھی جدا نہیں ہوتی، نہ ختم ہوتی ہے، نہ مدھم۔“۔

دونوں گہرے سکون میں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے، گویا اس لمحے میں ساری کائنات سمٹ کر اُن کے گرد پھیل گئی ہو۔ اُن کی محبت اور قربت کا عکس آئینے میں ایسے ظاہر ہو رہا تھا، جیسے کائنات کا ایک حسین منظر۔ دونوں کی خاموشی میں الفاظ کی ضرورت نہ تھی، اُن کے دلوں کی گہرائی میں محبت کی روشنی خود بول رہی تھی کہ ایمان کو اچانک کچھ یاد آیا، تو وہ معارج کی گرفت سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس پل کا جو رومانوی سکون تھا، وہ یک لخت ٹوٹ کر بکھر گیا۔ معارج نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور نرمی سے بولا، ”کیا ہوا؟“۔ ایمان نے متذبذب انداز میں کہا، ”یہ... یہ کتنے کا ہے معارج؟ یہ بہت قیمتی لگ رہا ہے۔“۔

اچانک اسے یہ بات یاد آگئی تھی۔ معارج نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس کا ہاتھ تھام لیا اور محبت سے بولا، ”ایمان، میری جان! اس کی جو بھی قیمت ہو، وہ تمہارے سامنے کچھ نہیں ہے۔ تمہاری قدر و قیمت کے آگے ہر چیز حقیر ہے۔ تم نے اسے پہنا ہے تو اس کی حیثیت دوچند ہو گئی ہے۔“۔

ایمان کچھ بولنے کے لیے لب کشا ہوئی، مگر معارج نے اُسے نرمی سے روک دیا۔ پھر اُس کے لاکٹ کو پکڑا اور اُس کے دو حصے کیے، جن میں ایک طرف معارج کی تصویر تھی۔ اُس نے لاکٹ ایمان کے سامنے کرتے ہوئے کہا، ”دیکھو، اس میں میری تصویر ہے تاکہ جب بھی میں تم سے دور ہوں، یہ تمہیں میرا لمس محسوس کروائے۔“۔

پھر اُس نے اپنی انگوٹھی کو دو حصوں میں بانٹا، جن میں ایک طرف ایمان کی تصویر تھی۔ اُس نے محبت بھرے لہجے میں کہا، ”اور یہ دیکھو، اس میں تم ہو، تاکہ جب ہم جدا ہوں، یہ ہمیں ایک دوسرے سے جوڑ کر رکھے، جیسے یہ ہماری محبت کا پیمان ہے۔“

ایمان نے شرمگین مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکا لیں، اور نرمی سے بولی، ”معارض، میں چاہتی ہوں کہ ہمارے بچے ہوں، بالکل تمہاری طرح پیارے اور معصوم۔“

معارض نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہماری بیٹیاں تمہاری طرح خوبصورت، بہادر اور دلکش ہوں۔“

ایمان نے حیرت سے سراٹھایا، ”بیٹیاں؟“

معارض نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”ہاں، کم از کم تین یا چار بیٹیاں۔“

ایمان نے شوخی سے کہا، ”بس دو بیٹیاں اور دو بیٹے، اور بس۔“

معارض نے اُس کی بات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے قہقہہ لگایا، ”چلو، یہ بھی ٹھیک ہے۔ ایک بیٹے کی عادات تم پر، اور ایک کی مجھ پر۔ ایک بیٹی کی عادات تمہاری جیسی، اور ایک میری جیسی۔ اور جن کی

عادات تمہاری طرح ہوں وہ میری شکل کے ہوں، اور جن کی عادات میری ہوں، وہ تمہاری صورت کے ہوں۔۔۔”

ایمان نے مسکراتے ہوئے کہا، ”فکر مت کرو، میں تمہارا ہی فی میل ورژن ہوں۔“

معارج نے شفقت سے اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا، اور ایمان نے نظریں جھکا کر اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کی۔۔۔

...°...

اگلے دن ہر سو برف کی سفید چادر بچھی تھی، جیسے پوری زمین نے سفید ریشمی لباس پہن لیا ہو۔ ہوا میں خنکی تھی اور سورج کی کرنیں برف پر پڑ کر چمک رہی تھیں۔ بادل اپنے اصطلبل میں کھڑا، سرد موسم سے بے خبر، ہلکی گھاس چبار ہاتھا، اور اس کے سامنے وسیع میدان کا نظارہ واضح تھا۔ اچانک اُس نے سر اٹھا کر ایک غیر معمولی منظر دیکھا۔ ایک شاندار اخال۔ ٹیکے اسی کی نسل کی گھوڑی برف پر سرپیٹ دوڑ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں بے پناہ جاذبیت، لمبے ریشمی بال ہوا میں لہرا رہے تھے، اور جب وہ اپنے مضبوط کھروں سے برف پر زور مارتی، تو برف کے ذرات فضا میں چھوٹے ستاروں کی طرح بکھر جاتے۔

بادل نے ایک لمحے کے لیے اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتے محسوس کی، جیسے اُس کی رگوں میں خون کا بہاؤ تیز ہو گیا ہو۔ اُس کی نظر اس گھوڑی پر جمی رہی، اور گھاس کو نظر انداز کر کے وہ اُس کی طرف بڑھا۔

اُس گھوڑی نے تھوڑی دیر کے لیے رک کر اُسے دیکھا، اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب شائستگی تھی۔ بادل نے شرماتے ہوئے اپنے منہ سے ایک سیب زمین پر گرا دیا، جیسے وہ اُسے اپنی محبت کا تحفہ پیش کر رہا ہو۔ پھر وہ متاثر کرنے کی کوشش میں اُس کے گرد چکر لگانے لگا، دل میں یہ احساس کہ وہ سورج ہے اور بادل اُس کے گرد گھومنے والا سیارہ، اور ان کا مقدر ہمیشہ ایک ساتھ ہونا ہے۔

لیکن اُس کی یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ اچانک گھوڑی نے بے نیازی سے ایک لات ماری، اور بادل ٹھوکر کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ عین اُس لمحے، معارج پیچھے سے آیا اور نرمی سے گھوڑی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اُس نے سیاہ قمیص شلوار پہنی ہوئی تھی، جس کی آستینیں کہنیوں تک لپٹی ہوئی تھیں، اور اُس کے کسرتی بازوؤں کی طاقت نمایاں ہو رہی تھی۔

گھوڑی نے جیسے ہی معارج کی آشنائی کو محسوس کیا، وہ سکون سے اُس کے قریب آگئی۔ بادل نے شرمندگی سے نظریں چرائیں، اور اپنی مہر بھاری قدموں سے زمین پر ماری، جیسے وہ اپنی ناکامی پر خفا ہو۔

معارج نے ابرو اُچکا کر بادل کی طرف شرارتی انداز میں دیکھا اور بولا، ”جب دو دل محبت میں گم ہوں، تو تیسرا پیہ بن کر آنا کیسا لگتا ہے، بادل؟“ بادل نے جواباً ناراضگی ظاہر کی اور اپنے کھروں کو مہر کے ساتھ زمین پر مارا۔ گھوڑی نے بادل کی طرف مڑ کر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی، اور اپنے ہونٹ ہلائے، جس سے بادل پیچھے ہٹ گیا۔

معارج نے محبت سے گھوڑی کے سر پر ہاتھ پھیرا، ”چلو ایڈنا،“ اُس نے نرمی سے کہا، جیسے وہ اُس کی تسلی کر رہا ہو۔

اسی دوران، دور سے ایمان اپنی گوٹ فارم سے باہر آئی۔ اُس کے ساتھ چند پہاڑی بکریاں تھیں جو سوکھی لکڑی چبھا رہی تھیں۔ ایمان نے معارج کی طرف دیکھا، اُس کے ساتھ ایک اور گھوڑا بھی تھا۔ اُس نے حیرانی سے معارج کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا، ”یہ کون ہے؟“۔

معارج نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”یہ ایڈنا ہے، میری نئی دوست۔“ پھر اُس نے شرارتی انداز میں ایمان کو دیکھا، ”اب تم اور میں ہم دونوں ریس لگایا کریں گے۔“۔

ایمان نے گھوڑی کی طرف بڑھ کر اُسے پیار سے چوما اور کہا، ”بہت پیاری اور دلکش ہے۔“ پھر اُس نے بادل کی طرف دیکھا جو اب تک اداسی کے عالم میں کھڑا تھا۔ ”بادل، تم ایڈنا سے ملے ہو؟“ اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

معارج نے ہنستے ہوئے کہا، ”بادل کو تو پہلی نظر میں ہی اس سے محبت ہو گئی تھی، لیکن ہماری ایڈنا کو متاثر کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اُس کا اپنا معیار ہے!“ ایڈنا نے ہلکی سی گردن جنبش دی جیسے وہ معارج کی بات کی تائید کر رہی ہو۔

ایمان نے قہقہہ لگایا اور چھیڑتے ہوئے بولی، ”تو تم بادل سے اپنے رومانس میں خلل ڈالنے کا بدلہ لے رہے ہو؟“۔

معارض نے کندھے اچکائے اور ہنستے ہوئے کہا، ”ہاں، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ میاں بیوی کے درمیان آنا کتنا برا ہوتا ہے!“ ایمان نے شرم سے نظریں جھکا لیں اور ہنسی نہ روک پائی۔

۔ ”اچھا، چلو، اب انہیں اصطبل میں لے چلیں۔“ وہ دونوں گھوڑوں کو لے کر اصطبل کی طرف بڑھے۔ معارج نے ایڈنا کو اُس کی مخصوص جگہ پر بند کیا، جہاں وہ آرام سے لیٹ گئی۔ اُس نے بادل کو شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور کہا، ”بادل، اب تم سمجھو گے کہ معارج کے رومانس میں مداخلت کرنا کیا رنگ لاتا ہے۔“ بادل نے اپنے ہونٹ ہلائے اور اپنی جگہ پر واپس چلا گیا، لیکن اُس کے سامنے کا دروازہ کھلا تھا، تاکہ وہ باہر کا منظر دیکھ سکے، لیکن ایڈنا تک دوبارہ رسائی نہ کر سکے۔۔

...°...

سردیوں کی رخصتی اور بہار کی آمد تھی، پہاڑوں کی برف آہستہ آہستہ پگھلنے لگی تھی اور فضا میں ایک خنکی بھری گرمی سرایت کر رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والا منظر دلوں میں ہلچل مچا دینے والا تھا۔ سامنے کا پہاڑ اپنے اوپر ڈھلتے سورج کی روشنی سے یا قوت کی طرح دہک رہا تھا، جیسے نیلے آسمان پر سنہری تاج سجا ہوا ہو۔

ڈھلوانوں پر پگھلتی برف چاندی کے آبشاروں میں بدل کر نیچے کی طرف گرتی تھی، اور برف کے اندر سے اُٹھتی بھاپ ہوا میں دھندلا سا دھواں بن رہی تھی، گویا پہاڑ خود سانس لے رہا ہو۔۔

کمرے کے اندر ایک الگ سی روحانی فضا تھی۔ معارج بستر پر بیٹھا قرآن کی تلاوت میں مصروف تھا۔ اُس کی آواز میں ایسی نرمی اور مٹھاس تھی کہ سننے والے کا دل عقیدت میں جھک جائے۔ ہر آیت پر جیسے دل میں ایک نور بھر جاتا۔ تلاوت کی گونج کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر فضاء کو مزید پر کیف بنا رہی تھی۔

ایمان ٹرے میں جو س لیے داخل ہوئی اور خاموشی سے ٹرے کو سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر معارج کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنا سر محبت سے معارج کے کندھے پر رکھ دیا۔ معارج نے اُس کے پیشانی پر نرمی سے بوسہ دیا، اور ایمان نے مسکراتے ہوئے کہا، ”معارج، تمہاری تلاوت میں ایسی مٹھاس ہے کہ دل جیسے بے اختیار جھک جاتا ہے۔ ماشاء اللہ! تم نے نہ صرف قرآن حفظ کیا ہے، بلکہ ترجمے کے ساتھ یاد کیا ہے، یہ تو بہت بڑی بات ہے۔“

معارج نے قرآن کو محبت سے بند کیا اور اپنے کندھے پر لپٹی شال کو ایمان کے گرد لپیٹ کر اُسے اپنے قریب کر لیا۔ اُس کی نظریں ایمان کے چہرے پر تھیں اور اُس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ”ایمان، قرآن کا پڑھنا صرف رسم نہیں، یہ ایک زندگی کا راستہ ہے، ایک مقصد ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔ ہم اکثر قرآن کو الفاظ کی حد تک پڑھتے ہیں، سمجھتے نہیں۔ اگر سمجھتے تو دنیا کے حالات ایسے نہ ہوتے جیسے ہمیں نظر آتے ہیں۔“

ایمان نے دل سے سر ہلایا، ”ہاں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو، قرآن کو سمجھنا اور اُس پر عمل کرنا ہی اصل مقصد ہے۔“

معارض نے ایمان کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا اور بولا، ”جانتی ہو، میں نے قرآن اس لیے حفظ کیا تا کہ ہماری آئندہ نسل کی بہترین تربیت کر سکوں۔ ہماری اولاد کو ایسی تربیت دینی ہے کہ وہ قرآن کی روشنی میں زندگی گزاریں، اور صرف انسان نہیں بلکہ انسانیت کا درس لیں۔“

ایمان نے معارج کی بات پر خاموش تائید کی، اُس کی آنکھوں میں وہی فکر تھی جو معارج کی باتوں میں جھلک رہی تھی۔ ”واقعی، آج انسان ہر جگہ موجود ہے، مگر انسانیت کہیں کھو گئی ہے، اور وہ قرآن ہی ہے جو ہمیں اصل انسانیت سکھاتا ہے۔“

معارض نے ایمان کے ماتھے پر پھر سے بوسہ دیا اور نرمی سے کہا، ”قرآن کی تعلیمات کو اپنے دل میں بسانا ضروری ہے، ورنہ یہ صرف ایک کتاب کی مانند ہو جائے گی۔“

ایمان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”بالکل، جیسے کچھ لوگ وسیلہ بنا کر اللہ سے مانگتے ہیں، حالانکہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مجھ سے براہِ راست مانگو، صبر اور نماز کے ذریعے۔ وسیلے کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں راستہ کھو جائے، لیکن اللہ تو ہر جگہ موجود ہے، ہمیں تو بس اُس کے سامنے جھکنا ہے۔“

معارج نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، ”ہاں، وہ تو اپنے بندوں کے بہت قریب ہے، اور ہمیں ہر مشکل میں اُسی سے مدد مانگنی چاہیے۔“

معارج نے گہری سانس لی اور ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، ”یقیناً، جیسے اللہ قرآن میں فرماتا ہے۔“ اُس نے تلاوت کا انداز اپناتے ہوئے سورۃ المائدہ کی آیات 103 سے 105 کو دلنشین لہجے میں پڑھا:

خدا نے نہ تو بحیرہ کچھ چیز بنایا ہے اور نہ سائبہ اور نہ وسیلہ اور نہ حام بلکہ کافر خدا پر جھوٹ افترا کرتے ہیں اور یہ اکثر عقل نہیں رکھتے (۱۰۳)

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو (کتاب) خدا نے نازل فرمائی ہے اس کی اور رسول اللہ کی طرف رجوع کرو تو کہتے ہیں کہ جس طریق پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے وہ ہی ہمیں کافی ہے بھلا اگر ان کے باپ دادا نہ تو کچھ جانتے ہوں اور نہ سیدھے رستے پر ہوں (تب بھی؟) ﴿۱۰۴﴾۔

اے ایمان والو! اپنی جانوں کی حفاظت کرو جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا تم سب کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے اس وقت وہ تم کو تمہارے سب کاموں سے جو (دنیا میں) کئے تھے آگاہ کرے گا (اور ان کا بدلہ دے گا) ﴿۱۰۵﴾۔

معارج نے مسکرا کر کہا ”دیکھو ایمان، اللہ ہمیں بار بار بتاتا ہے کہ ہم اپنی راہ خود اختیار کریں، دوسروں کے جھوٹے دوسوے اور رسوم و رواج میں نہ پڑیں۔ قرآن ہی وہ ہدایت ہے جس پر عمل کر کے ہم اپنی زندگیوں کو سنوار سکتے ہیں۔“

ایمان نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا، ”واقعی، قرآن کی ہر آیت میں ہمارے لیے زندگی گزارنے کا پیغام موجود ہے، اور ہمیں اُس پر یقین کامل رکھنا چاہیے۔“

، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد مقامات پر ہمیں خود قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کی تاکید کی ہے، تاکہ ہم درست راستے کا انتخاب کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ سورہ المائدہ کی آیت 35 میں فرماتے ہیں۔

اے ایمان والو! خدا سے ڈرتے رہو اور اس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ تلاش کرتے رہو اور اس کے رستے میں جہاد کرو تاکہ رستگاری پاؤ ﴿۳۵﴾۔

اس کے ساتھ ہی اللہ نے ہمیں یہ بھی سکھایا کہ صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کریں۔ جیسا کہ سورہ البقرہ میں فرمایا:۔

اور (رنج و تکلیف میں) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو اور بے شک نماز گراں ہے، مگر ان لوگوں پر (گراں نہیں) جو عجز کرنے والے ہیں ﴿۳۵﴾۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے

اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد لیا کرو بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۵۳﴾۔

یہ آیات ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ اللہ سے تعلق قائم کرنے کے لیے کسی اور وسیلے کی ضرورت نہیں، بلکہ اللہ نے خود ہمیں صبر اور نماز کے ذریعے اس سے مدد مانگنے کی ہدایت دی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی زندگی کے تمام معاملات میں قرآن کی روشنی کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دیں اور صرف اپنے باپ دادا کے رواج یا کہے ہوئے پر اندھا اعتماد نہ کریں، کیونکہ ضروری نہیں کہ اُن کا راستہ ہمیشہ درست ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر ایک کی انفرادی حیثیت میں جوابدہ بنایا ہے، اور مرنے کے بعد ہمیں اپنے اعمال کا حساب خود دینا ہے۔ اس لیے ہمیں درست راستے کی تلاش خود کرنی چاہیے، قرآن کو خود پڑھنا اور سمجھنا چاہیے تاکہ ہم اللہ کے ہدایت یافتہ بندے بن سکیں۔

یہ ہی پیغام ہمیں بار بار قرآن میں ملتا ہے کہ ہم کسی کے کہنے پر نہیں، بلکہ خود قرآن اور سنت کی روشنی میں اپنے راستے کا تعین کریں۔

کیوں کہ۔ صرف مسلمان ہونا کافی نہیں! بلکہ اسلام کی حقیقی روح اور صحیح فہم کا حامل ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ ہم نام کے مسلمان ہیں، لیکن اگر ہمارے اعمال اور طرزِ زندگی میں اسلامی تعلیمات کا عکس نہیں ہے، تو یہ محض ایک شناخت بن کر رہ جاتا ہے۔

ہم میں سے اکثر لوگ خود کو مسلمان تو کہتے ہیں، مگر بغیر اس گہرے شعور کے کہ اسلام کیا ہے، اس کی بنیاد کیا ہے، اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔ یہ حقیقت میں ایک ایسے سفر کی طرح ہے جس کا مسافر تو ہم ہیں، مگر راستہ بھٹک چکے ہیں۔

مسلمان ہونا اللہ کی نعمت ہے، مگر اسلام پر قائم ہونا اور اس کی صحیح سمجھ حاصل کرنا وہ اصل کامیابی ہے جس کی طرف ہمیں قرآن و سنت میں بار بار دعوت دی گئی ہے۔

اسی لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو رسم و رواج اور روایتوں کے سہارے نہ گزاریں، بلکہ ہدایت کے اس سرچشمے کی تلاش خود کریں۔ ہمیں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو خود سمجھنا ہوگا، اور اس کے لیے قرآن کو خود پڑھنا اور اس کی روشنی میں صحیح راہ کا انتخاب کرنا ہوگا۔

کیوں کہ آخر کار ہمیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، اور صرف اسلام کے نام پر جینا نہیں، بلکہ اسلام کی حقیقت کو اپنانا اصل مقصد ہے۔

پس، سیدھا راستہ تلاش کرنے کی ذمہ داری ہر فرد پر خود ہے، اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم خود اپنے ایمان اور اعمال کا جائزہ لیں اور دل سے اللہ کے احکامات کو اپنائیں۔

...°...

اسپتال کا وسیع اور روشن کمرہ سکون اور مہربان ماحول کا آئینہ دار تھا، جہاں سندس نے اپنے پہلے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ حیدر سے اس کی ازدواجی زندگی کو دو سال گزر چکے تھے، اور یہ ان کا پہلا نازک تحفہ تھا۔ کمرے کی بڑی کھڑکی سے نرم دھوپ کی سنہری کرنیں اندر آرہی تھیں، جو سفید چادروں اور تکیوں پر روشنی کی ایک ہلکی پرت بکھیر رہی تھیں۔

ہر طرف محبت اور خوشیوں کا احساس تھا، جہاں ایک صوفہ، کافی ٹیبل، اور نفیس پینٹنگز نے ماحول کو مزید خوشگوار بنا رکھا تھا۔ پھولوں کے گلدستے اور رنگ برنگے غبارے، جو حیدر سندس کے لیے لایا تھا، کمرے میں زندگی کا رنگ بھرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

ایمان، جو ہلکے پیلے رنگ کے ریشمی عبا میں ملبوس تھی، کمرے میں داخل ہوئی۔ عبا کا نفیس ریشم اس کے خوبصورت چہرے کی پاکیزگی میں مزید اضافہ کر رہا تھا، جس پر نقاب بھی ایک منفرد جمالیاتی احساس دے رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں خوشی اور شفقت کا امتزاج تھا۔ اس نے گرمجوشی سے سندس کو گلے لگایا اور اپنی محبت بھری آواز میں کہا، ”مبارک ہو سندس! میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں!“ سندس نے مسکراتے ہوئے اسے گلے لگایا اور نرم لہجے میں جواب دیا، ”بہت شکریہ، ایمان۔“

کمرے کی پُر سکون فضا میں محبت بھرے جذبات عروج پر تھے۔ ایمان نے آگے بڑھ کر شانزہ کو بھی محبت سے گلے لگایا اور کہا، ”شانزہ! تمہیں بھی بہت مبارک ہو، تم اب خالہ بن گئی ہو!“۔ شانزہ نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور اسے گلے سے لگالیا۔ پھر ایمان نور کی جانب بڑھی اور اسے گلے لگاتے ہوئے بولی، ”مبارک ہو امی!“ نور نے اسے گلے لگا کر اپنی ممتا کی خوشبو میں بسالیا اور نم آنکھوں سے کہا، ”تمہیں بھی میری جان، اللہ تمہیں بھی خوش رکھے۔“ نور نے معارج کے بارے میں استفسار کیا، ”معارج کہاں ہے؟“ ایمان نے مسکرا کر جواب دیا، ”وہ حیدر اور حاشرا نکل کے ساتھ باہر ہے۔“۔

ایمان نے سائیڈ ٹیبل پر کچھ تازہ پھل اور جوس کے ڈبے رکھے، پھر وہ نرمی سے بچے کے قریب۔ آئی، اسے اپنی گود میں اٹھایا اور محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، ”ماشاء اللہ، کتنا پیارا ہے۔ بالکل تمہاری طرح خوبصورت، سندس!“۔

سندس نے مسکرا کر کہا، ”میری دعا تھی کہ میری ایک بیٹی ہو اور وہ تمہاری طرح بہادر اور خوبصورت ہو۔“۔

ایمان نے محبت بھری نظروں سے سندس کو دیکھا اور جواب دیا، ”ہاں، اور تمہاری طرح نیک اور بہادر بھی۔“۔

پھر ایمان نے مزید کہا، ”مگر کوئی بھی اس کے والد حیدر اور انکل معارج جیسا مضبوط نہیں ہو سکتا، یا اس کے کزن عباس جیسا شیر دل۔ یہ بچہ یقیناً ان سب کی صفات کو اپنائے گا۔“

شانزہ نے مسکراتے ہوئے کہا، ”آمین!“

ایمان نے نور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ”اور اس کا دل اپنے دادا حاشر کی طرح نیک اور سخی ہو گا۔“

نور کی آنکھیں مزید نم ہو گئیں وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ایمان کو گلے لگا لیا، ”اللہ تمہیں بھی ایسا پیارا بچہ دے، میری جان!“ ایمان، سندس، اور شانزہ نے بیک زبان آمین کہا۔

ایمان نے بچے کو واپس سندس کے پہلو میں لٹایا اور پوچھا، ”تم نے اس کا نام کیا سوچا ہے؟“ سندس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”میں نے سوچا تھا کہ اگر بیٹی ہوتی تو اس کا نام ایمان رکھتی، مگر چونکہ اللہ نے بیٹا دیا ہے، اس کا نام محمد مومن رکھا ہے۔“

ایمان نے محبت بھری مسکراہٹ سے لبوں کو جنبش دی اور کہا، ”محمد مومن بہت خوبصورت نام ہے۔ اللہ اس نام کو برکت دے اور ہمارے مومن کو دین کی خدمت اور قرآن کا حافظ بننے کی توفیق عطا فرمائے، جیسے اس کا کزن عباس ہے۔“

ظاہر ہے کہ عباس سننے کی صلاحیت سے محروم تھا، لیکن اُس کی ذہانت اور حوصلے نے اُس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ آنے دی۔ اُس نے اشاروں کی زبان میں قرآن کو حفظ کر لیا تھا، اور اتنا فہم و شعور رکھتا تھا کہ ہر آیت کو انتہائی مہارت کے ساتھ اشاروں کے ذریعے بیان کرتا تھا۔ یہ اُس کی عقل مندی اور عزم کی زندہ

مثال تھی کہ باوجود سننے سے قاصر ہونے کے، اُس نے ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا جو بہت سوں کے لیے باعثِ حیرت اور فخر تھا۔

شانزہ نے پھر کہا، ”آمین!“۔

ایمان نے سندس سے کہا، ”تم گھر کب آرہی ہو؟“۔

سندس نے جواب دیا، ”دو تین دن میں انشاء اللہ۔“۔

ایمان مسکرائی اور بولی، ”ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔ اسپتال کے قوانین کے مطابق وزیٹرز کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔“ اس نے سب سے محبت بھری وداع لی اور مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی۔

...°...

گر میوں کے دن تھے، اور ہنزہ کی فضا میں پہاڑوں سے بہتی ہوئی آبشاروں کی نغمگی گونج رہی تھی۔ چاروں طرف سرسبز وادیاں اور بلند و بالا پہاڑ اپنے دامن میں ایک انوکھا سکون سموئے ہوئے تھے۔ سڑک جو وادی کے ساتھ ساتھ بل کھاتی ہوئی جارہی تھی، کالی ریشم جیسی دکھائی دے رہی تھی۔ فضا میں ایک نرمی تھی جو دل کو تسکین دیتی تھی، لیکن معارج کے دل میں کچھ اضطراب تھا۔ گاڑی کی رفتار دھیمی تھی، اور معارج کا دھیان سامنے کے اونچے سنگلاخ پہاڑوں اور پریچ سڑک پر مرکوز تھا۔ وہ ایک سادہ سی

مگر اس کی شخصیت کے مطابق جاذبِ نظر ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھا، جو اس کی چاق و چوبند طبیعت کو ظاہر کر رہے تھے۔

ایمان خاموشی سے بیٹھی ہوئی تھی، اس کی نظریں دور کہیں پہاڑوں کی چوٹیاں دیکھ رہی تھیں، جو سلہٹی رنگ کی چادر اوڑھے، آسمان کی بلندیوں کو چوم رہی تھیں۔

معارض نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے لیا، اس کی نرم اور نازک جلد کی گرمی اور نبض کی دھڑکن کو محسوس کیا۔ اُسے ایمان کی خاموشی میں چھپی ہوئی اداسی کا احساس ہو رہا تھا۔

اُس نے محبت بھرے انداز میں اس کا ہاتھ دبا کر پوچھا، ”کیا بات ہے، میری جان؟ تم آج کچھ پریشان لگ رہی ہو؟“ اس کے لہجے میں وہی مٹھاس اور محبت تھی جو ہمیشہ ایمان کو سکون دیتی تھی۔

ایمان نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ معارج کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی ہر بات، اس کی مسکراہٹ، اس کی آنکھوں اور اس کی محبت میں گم ہو جاتی تھی۔ مگر آج دل کی گہرائیوں میں ایک انجان سی اداسی کا درد اسے اندر ہی اندر ستا رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے سرگوشی کی، ”معارض...“ اُس کا نام لیتے ہوئے اس کی آواز میں ایک انجانی تھکن تھی۔

معارض نے محبت سے اُس کی طرف دیکھا اور اُس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا کر بوسہ دیا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک گہری محبت اور فکر مندی جھلک رہی تھی۔ ”ہاں، قلبِ معارج، تمہیں کیا فکر ستا رہی ہے؟“

تمہاری خاموشی میرے دل کو بے چین کر دیتی ہے، جیسے میری دھڑکن رک گئی ہو۔ تمہاری اداسی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی، بتاؤ کیا بات ہے؟”۔

ایمان نے ہونٹ دانتوں سے کاٹتے ہوئے بڑی مشکل سے وہ سوال کیا جس کا بوجھ وہ کئی دنوں سے اپنے دل پر اٹھائے پھر رہی تھی، “معارض، ہماری شادی کو دو سال ہو چکے ہیں، مگر ابھی تک ہمیں اولاد کیوں نہیں ہوئی؟”۔

یہ کہہ کر اُس نے نظریں جھکا لیں، جیسے اُس نے کوئی بہت بڑا سوال کر دیا ہو۔ معارج نے مسکرا کر اس کے گال پر اپنا ہاتھ رکھا اور نرمی سے جواب دیا، “جانِ معارج، یہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہر شے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، اور ہمیں اللہ کی مرضی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ جو وہ چاہتا ہے، وہ ہی بہتر ہوتا ہے۔”۔

ایمان نے سر ہلایا، مگر اُس کے دل میں ایک غیر محفوظی کا احساس اب بھی باقی تھا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے دل کی گہرائی سے ایک اور سوال کیا، “اور اگر میرے بچے نہ ہوئے تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟” یہ سوال اُس کی اندرونی بے چینی کا عکاس تھا۔

معارض اس سوال پر چونک اٹھا، اُس نے گاڑی فوراً سڑک کے کنارے روکی اور محبت بھری عجلت میں ایمان کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت اور محبت کا ایک سمندر موجزن تھا۔

اُس نے ایمان کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، ”تم کیسی باتیں کر رہی ہو، جانِ معارج؟ یہ کیسا خیال ہے؟ تم میری دعاؤں کا حاصل ہو، میرے ہر خواب کی تعبیر ہو۔ تمہیں چھوڑنا؟ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے میں اپنی روح کو اپنے جسم سے جدا کر دوں۔ تم میری ساتھی ہو، میری ہمسفر ہو، میری زندگی کا ہر خواب تم سے وابستہ ہے۔ تمہیں چھوڑنے کا سوچنا بھی میرے لیے ناممکن ہے۔“

اس نے محبت سے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا، پھر اس کی ناک اور رخسار پر ہونٹ رکھے۔ ایمان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے، جو معارج کے چہرے پر گر رہے تھے۔ اُس نے آہستہ سے اُن آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا اور بولا، ”کبھی بھی میرے دل میں تمہارے لیے محبت کے بارے میں شک نہ کرنا۔ تم میرے لیے کافی ہو، میری دنیا ہو، میرا سب کچھ ہو۔ تم میری زندگی کا سب سے خوبصورت خزانہ ہو، اور میری وفا کی گواہی میری ہر سانس دے گی۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا، جانِ معارج، مجھے تم سے دور صرف موت کر سکتی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اُس نے ایمان کو اور بھی مضبوطی سے اپنے سینے سے لگا لیا، جیسے وہ کبھی بھی اسے خود سے جدا ہونے نہ دے گا۔

ایمان نے کچھ پل خاموش رہ کر سوچا، پھر دھیرے سے کہا، ”مگر معارج، تمہیں بھی تو اولاد کا حق ہے۔ اپنے خون کا تسلسل اور کسی ایسے وجود کا ہونا جو تمہاری جھلک ہو، تمہارا نام لے۔“

معارج نے ایک گہری سانس لی اور ایمان کو قریب تر کر لیا، جیسے اسے اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ایک پختہ عزم اور نرم محبت جھلک رہی تھی۔ ”ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، ایمان۔ اولاد اللہ کی عطا ہے، یہ کوئی حق یا دعویٰ نہیں۔ اگر اللہ نے ہماری تقدیر میں لکھا ہے کہ ہمیں اولاد سے نوازا جائے، تو وہ ضرور ہمیں وہ لمحہ بخشے گا۔ لیکن اگر اُس کی مرضی میں کچھ اور ہے، تو ہم اس کے فیصلے پر سر تسلیم خم کریں گے اور جو کچھ ہمارے پاس ہے، اُس پر شکر ادا کریں گے۔ ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ میسر ہے، اور یہ نعمت بہت سوں کو نصیب نہیں ہوتی۔“

پھر معارج تھوڑا جھکا اور مدہم لہجے میں بولا، ”قرآن کی وہ آیت یاد ہے؟“ اس نے آیت کی تلاوت کی:-

اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے بخشتا ہے، یا انہیں بیٹے اور بیٹیاں (دونوں) جمع فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ ہی بنا دیتا ہے، بیشک وہ خوب جاننے والا بڑی قدرت والا ہے۔

(سورۃ الشوریٰ 49:42-50)۔

پھر اس نے رک کر ایمان کے چہرے پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، ”ہمیں جو نصیب ہوتا ہے، وہ اللہ کی حکمت اور قدرت کا حصہ ہوتا ہے۔ اُس کی عطا پر شک نہیں کیا جا سکتا۔“

اس کے بعد معارج نے ایک اور آیت سورۃ القلم کی تلاوت کی:

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایسی بے سروپا باتیں سوچتے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو کہ جو کچھ تم چاہتے ہو، وہ تمہیں لازمی ملے گا؟ یا تم نے ہم سے کوئی عہد لیا ہے جو قیامت تک چلے گا؟

(سورۃ القلم: 36-39)۔

معارج نے محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ ایمان کے گال پر ہلکا سا تھپکا۔ ”تم پریشان مت ہوا کرو، میری جان۔ جب تم اداس ہوتی ہو، ایسا لگتا ہے جیسے کوئی خوبصورت گلاب اپنی تروتازگی کھو چکا ہو۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم وہ گلاب بنو جو ہمیشہ خوشبو بکھیرتا رہے، ہنستا مسکراتا رہے۔ تمہاری خوشی، تمہاری مسکراہٹ میرے لیے سب سے قیمتی چیز ہے۔“

ایمان نے نم آنکھوں کے ساتھ معارج کی طرف دیکھا، اُس کی ہر بات دل کو چھو جانے والی تھی۔ اس کی محبت اور شفقت بھری نگاہوں کو دیکھتے ہوئے ایمان کی آنکھوں میں ممنونیت کی چمک تھی۔ ”تم میری زندگی کا سب سے بڑا تحفہ ہو، معارج۔ تم ہمیشہ مجھے اللہ کی رحمت یاد دلاتے ہو۔ تمہاری حکمت، تمہاری محبت، ہر بات میں میرے دل کو تسکین ملتی ہے۔ تم نے ہمیشہ میرا ہاتھ تھاما ہے، اور مجھے یقین ہے کہ تم ہمیشہ میرا سہارا بنو گے۔“

معارض نے اپنے چہرے پر محبت کی ہلکی سی مسکراہٹ لیے ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا، ”تم میری زندگی کی سب سے قیمتی نعمت ہو، اللہ کی طرف سے بخشا گیا ایک ایسا انمول تحفہ جس کی قدر کرنا میری زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے۔ تمہاری موجودگی میری زندگی کے ہر لمحے کو روشنی سے بھر دیتی ہے، جیسے سیاہ راتوں میں چمکتا چاند یا جیسے صبح کا نور اندھیروں کو مٹا دیتا ہے۔ تمہاری خوبصورتی صرف ظاہری نہیں، بلکہ تمہارا دل، تمہاری نیت اور تمہاری روح اس قدر پاکیزہ اور شفاف ہے جیسے ایک بہتا ہوا صاف چشمہ، جس کی ہر بوند میں طہارت اور پاکیزگی کا اظہار ہو۔“

وہ تھوڑا سا جھکا اور ایمان کے بالوں کو محبت سے چھوتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ”تمہارا کردار اُس پاکیزہ ندی کی طرح ہے جو ہر راستے کو شاداب کرتی ہے۔ تمہارا ایمان اور تمہاری سیرت وہ آئینہ ہے جس میں میں اپنی زندگی کی ہر خوشی اور کامیابی کا عکس دیکھتا ہوں۔ تمہارا مجھ پر اعتماد، تمہاری حوصلہ افزائی میرے لیے اس دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے، اور یہ ہی میرے دل کو سکون اور اطمینان عطا کرتا ہے، جیسے دل کو سکون اللہ کی یاد سے ملتا ہے۔“

پھر معارج نے اُس کے ہاتھ کو محبت سے تھامتے ہوئے اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور مدھم آواز میں کہا، ”تمہاری محبت میرے لیے عبادت کی مانند ہے، جیسے مسلمان کے لیے نماز فرض ہے۔ تم سے محبت کرنا میرا فریضہ ہے، اور میں اس فریضے کو ہمیشہ نبھاؤں گا۔ زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں

گا، میرے دل کی ملکہ۔ ہماری محبت، ہمارا رشتہ، اللہ کے سامنے عاجزی اور بندگی کی علامت ہے، اور میں ہمیشہ اس کے فیصلوں پر راضی ہوں گا۔ ہم نے اپنی تقدیر اُس کے حوالے کر دی ہے اور ہم اُس سے بہتر کی امید رکھتے ہیں، کیوں کہ وہ ہی ہمارے لیے بہتر جانتا ہے۔”

پھر معارج نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایمان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے رکھا۔ اُن دونوں کی نظریں سامنے پھیلے ہوئے پہاڑوں اور وادیوں کی خوبصورتی پر تھیں۔ ہر موڑ پر سبزہ، درختوں کی سرسبز ٹہنیاں، اور پہاڑوں کی بلندی اُن کے دلوں کو سکون دے رہی تھیں۔

ہوا کے نرم جھونکوں میں خوشبو تھی، جیسے فطرت خود اُن کی محبت کا جشن منا رہی ہو۔ اُن دونوں کے دلوں میں سکون کی ایک لہر دوڑ گئی، جیسے زندگی کی ساری آزمائشیں اور مشکلات ان مناظر کے سامنے بے معنی ہو چکی ہوں۔

ایمان نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا، ”معارج، تمہارا ساتھ میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔“ معارج نے مسکراتے ہوئے اُس کا ہاتھ تھپتھپایا، اور دونوں نے اس لمحے کو دل میں بسالیا، جیسے یہ لمحہ کبھی ختم نہ ہو۔

...°...

معارج نے گاڑی کو کارپورچ میں مہارت سے روک کر قفل کیا اور ایمان کے ہمراہ باہر نکل آیا۔

وہ دونوں چپکے چپکے قدموں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے، جو نہایت پرسکون گوشہ تھا، چاروں طرف ایک وسیع و عریض فارم پھیلا ہوا تھا۔ چلتے چلتے ان کی نظر بادل اور ایڈنا پر پڑی، جو اپنے چمکتے بچے کے ساتھ ہریالی میں اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔

وہ بچہ بالکل اپنے والدین کا عکس معلوم ہوتا تھا، سنہرے ریشمی بال اور بڑی، گہری آنکھیں اس کے حسن کو منفرد بنا رہی تھیں۔

فارم میں پھیلے جانور اپنے انداز میں زندگی کا لطف اٹھا رہے تھے۔

بکریاں آہستہ آہستہ چرتی ہوئیں، گائیں سرمستی میں جھومتی ہوئی، بیل مضبوط قدموں کے ساتھ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے، مرغیاں اور بطخیں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہی تھیں، جب کہ ایک مور اپنے پنکھ پھیلائے دھوپ کی روشنی میں رقص کر رہا تھا۔

بادل کا بچہ سلطان، خوشی سے اچھلتا کودتا، ایمان کی طرف لپکا اور اس نے اپنی نرم زبان سے ایمان کے ہاتھ کو چاٹنا شروع کیا۔

ایمان نے مسکراتے ہوئے اسے گود میں بھر لیا اور محبت بھری آواز میں بولی، ”سلطان، تم کتنے ذہین اور حسین ہو۔“

معارج نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ اپنا بازو ایمان کی کمر کے گرد لپیٹا اور سرگوشی کی، ”شکر ہے بادل کو ایڈنائل گئی اب وہ کباب میں ہڈی کا کام نہیں کرتا“ یہ کہتے ہوئے اُس نے ایمان کے گال پر ہلکا بوسہ دیا، جس پر ایمان شرمائی۔

اُس نے سلطان کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا، ”تمہارا دل بہت بڑا ہے، ہم تم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔“ سلطان خوشی کے مارے ایک لمبی ہمسائی کے ساتھ اپنے والدین کی طرف دوڑ گیا، اور معارج ایمان کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھنے لگا۔

اُن کی نظریں بائیں طرف موجود بلند و بالا پہاڑوں پر جا ٹھہریں، جو اپنی بلندیوں میں برف کی چمک کے ساتھ سورج کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ دائیں طرف جنگل اپنی گھنی سبز پوشاک میں ملبوس تھا، جس میں پرندوں کے نغمے اور گلہریوں کے شرارتی کھیل فضا میں ہلچل پیدا کر رہے تھے۔

درمیان سے بہتا شفاف دریا اپنی نیلگوں لہراؤں کے ساتھ اچھلتا کودتا ہوا گزرتا تھا، جس میں مچھلیاں زندگی کی حرکت کو ظاہر کر رہی تھیں۔

ہوا میں دیودار کے درختوں اور جنگلی پھولوں کی مہک گھلی ہوئی تھی، جو ماحول کو تازگی اور سکون بخشتے تھے۔

کچھ دیر بعد، وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچے، جس کی پرانی لکڑی کی خوشبو نے انہیں ایک بار پھر فطرت سے جڑے ہونے کا احساس دلایا۔

معارض نے دروازہ کھولا، اور دونوں اندر داخل ہو گئے، جہاں شام کی لطیف روشنی گھر کے اندرونی سکون کو اور زیادہ گہرا کر رہی تھی۔

ایمان کچن میں مشغول تھی، سبزیوں کو باریک کاٹتی جا رہی تھی تاکہ سوپ کی تیاری کر سکے۔ یکایک اسے باہر سے ایڈنا کے ہنگامے کی آواز سنائی دی۔ کھڑکی کی طرف نظر دوڑائی تو دیکھا کہ ایک اجنبی سفید گھوڑی تیز رفتاری سے ان کے کھیت کی طرف دوڑتی چلی آرہی تھی، اور پیچھے بادل، ان کا تنومند گھوڑا، بھی برق رفتاری سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

ایڈنا، ان کی پر جوش گھوڑی، غصے میں بادل کے راستے میں حائل ہو کر اپنی حسد کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ اسے سخت ناراضگی ہے کہ بادل اس اجنبی سفید گھوڑی کی طرف کیوں مائل ہو رہا ہے۔

وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ بادل کسی اور گھوڑی کی طرف دیکھے، اس کے دل میں یقین پختہ تھا کہ بادل پر صرف اسی کا حق ہے۔

ایمان نے چاقو ایک طرف رکھ کر فوراً باہر کا رخ کیا۔ وہ جلدی سے ایڈنا کو پرسکون کرنے اور سفید گھوڑی کو واپس لے جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کھیت میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایڈنا اب بھی اپنی ضد پر قائم ہے اور بادل کو سفید گھوڑی کے قریب آنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔

بادل کچھ خوفزدہ نظر آ رہا تھا، کیونکہ ماضی میں ایڈنا اسے زخمی بھی کر چکی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اجنبی گھوڑی کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جو کسی قدر دلچسپی سے اسے تک رہی تھی۔

ایمان ایڈنا کے قریب پہنچی اور اس کی ایال پر محبت بھرا ہاتھ رکھا۔ ”ایڈنا، میری پیاری، پرسکون ہو جاؤ۔ بادل تمہارا ہے، اسے سفید گھوڑی سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ صرف یہاں عارضی طور پر آئی ہے اور جلد ہی چلی جائے گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ایڈنا کی پیشانی کو نرمی سے چوما اور کہا، ”تم تو دنیا کی سب سے خوبصورت گھوڑی ہو، حسد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ایڈنا نے ایمان کی طرف دیکھا اور اس کی باتوں پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے سانس کھینچا، اور تھوڑا پرسکون ہو گئی۔ ایمان نے پھر سفید گھوڑی کی طرف رخ کیا اور اس کی گردن پر نرمی سے ہاتھ پھیرا۔ ”سلام خوبصورت گھوڑی، تم بے شک حسین ہو، مگر یہ جگہ تمہارے لیے نہیں ہے۔ یہ بادل اور ایڈنا کا گھر ہے، اور وہ اجنبیوں کو پسند نہیں کرتے۔ بہتر ہو گا کہ تم یہاں سے واپس چلی جاؤ جہاں سے آئی ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے گھوڑی کی لگام تھامی اور اسے کھیت کے کنارے کی طرف لے جانے لگی۔

اسی اثناء میں ایک لڑکا دوڑتا ہوا کھیت کی طرف آتا دکھائی دیا۔ ”باجی، باجی!“ اس نے آواز لگائی، اس کا لہجہ گلگتی تھا، اردو الفاظ توڑ مروڑ کے بول رہا تھا۔ ایمان کے بدن پر نقاب یا عبا یا نہیں تھا کیونکہ وہ گھر میں تھی، بس ایک سادہ لباس اور دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ لڑکے کی آواز پر اس نے فوراً اپنی آنکھیں جھپکائیں اور جلدی سے دوپٹہ کا پلو چہرے پر ڈال لیا، اور پاس کھڑے درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔

وہ اب ایسی لڑکی تھی جو اجنبی مردوں سے نظر بچانے کا خاص خیال رکھتی تھی۔ لڑکے نے بھی ایمان کی حیا کی پاسداری کرتے ہوئے نظریں نیچی کر لیں اور ادب سے کہا، ”باجی، یہ ہمارا سردار کا گھوڑی ہے، جی۔ یہ اصطبل سے بھاگ گیا تھا۔ میں اسے واپس لینے آیا ہوں۔“

اس کا لہجہ تھوڑا انجان اور دیسی تھا، اور اس کی اردو کچھ ٹوٹی پھوٹی تھی، لیکن ایمان نے اسے آرام سے سنا اور جواب دیا، ”ہاں، یہ یہاں آگئی تھی اور کچھ مسائل بھی پیدا کیے۔ اسے لے جائیں اور دیکھو کہ دوبارہ واپس نہ آنے پائے۔“

لڑکے نے سر جھکایا، ”جی باجی، معافی چاہتا ہوں۔ آپ کا شکریہ!“ اس نے سفید گھوڑی کی لگام پکڑی اور واپس لے جانے لگا۔ گھوڑی جاتے ہوئے ایک بار پھر بادل کی طرف مڑ کر دیکھنے لگی، گویا وہ اسے پسند کرتی تھی، لیکن وہ سمجھ گئی تھی کہ بادل صرف ایڈنا کا ہے۔

ایمان نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور پھر واپس ایڈنا اور بادل کے پاس آگئی۔ اس نے دونوں کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور ہنس کر کہا، ”تم دونوں تو بہت نٹ کھٹ ہو!“ اس نے ایڈنا کی طرف مخاطب

ہو کر کہا، ”تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور کوئی تمہارے بچ نہیں آسکتا۔ تم دونوں دنیا کے سب سے بہترین گھوڑے ہو!“۔

اس کے بعد ایمان بادل کی طرف دیکھ کر بولی، ”اور اگر اس نے کسی اور کی طرف دیکھا، تو ایڈنا، فکر مت کرنا، میں ایک اچھی ساس ہوں۔ تم اسے لات مار سکتی ہو اور میں تمہارا ساتھ دوں گی!“ یہ کہہ کر اس نے دونوں کو بوسہ دیا اور کہا، ”اب میں چلتی ہوں، مجھے سوپ بنانا ہے۔“۔

اس نے انہیں اصطلبل تک چھوڑا، انہیں گھاس اور تازہ پانی دیا، اور مسکراتے ہوئے کہا، ”اچھے بنو اور آپس میں لڑو نہیں!“ وہ واپس کچن کی طرف چل پڑی، راہ میں اسے وادی کی طرف سے چلتی ہو اور پہاڑوں کی بلندیوں نے ایک بار پھر اپنے سحر میں جکڑ لیا۔

اُس نے دل میں اپنی نعمتوں کا شکر ادا کیا اور اللہ سے اپنے مستقبل کی بھلائی کی دعا کی۔ ایمان نے دل ہی دل میں یہ بھی امید کی کہ ایک دن، معارج کے ساتھ اس کا بچہ ہو گا۔ وہ اپنے شوہر سے بے حد محبت کرتی تھی اور جانتی تھی کہ وہ بھی اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔

کچن میں واپس آ کر ہاتھ دھو کر اس نے پھر سے سوپ کی تیاری شروع کی، دل مطمئن اور ذہن پرسکون تھا۔

ایمان آنگن کی دیوار کے ساتھ کھڑی دھلے ہوئے کپڑے تار پر پھیلا رہی تھی۔ اس کی نظر اچانک لان کی طرف گئی جہاں معارج فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ گہرے رنگ کی قمیض شلوار میں ملبوس تھا، اور گلے میں ایک کشمیری شال ڈالے ہوئے تھا، جیسے اس نے اپنے وجود کو مکمل طور پر پاکستانی ماحول میں ڈھال لیا ہو۔

حالانکہ اس کی جڑیں سویڈن میں تھیں، وہ یہاں کالگ رہا تھا۔ اس کی زبان، رویے، ہر چیز میں یہاں کی مٹی کی خوشبو شامل ہو چکی تھی۔

ایمان کو اس کی یہ ہی بات پسند تھی، وہ اسے دل و جان سے چاہتی تھی۔

لیکن آج، معارج کی آواز میں کچھ عجیب تھا۔ وہ اس کی باتوں سے متوجہ ہو کر تھوڑی آگے بڑھی تاکہ سن سکے۔ ”دوسری شادی میں کیا مسئلہ ہے؟“ معارج کی آواز سخت اور حاکمانہ تھی۔ ”اولاد بھی ضروری ہے، لیکن دوسری شادی بھی ضروری ہے سمجھو۔“

ایمان کے قدموں تلے زمین نکل گئی۔ اس کے ہاتھوں سے کپڑے کا پلو چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ ”میں شادی پر ضرور آؤں گا، سب کچھ بھول جاؤ۔ ہاں، اپنی بیوی کو بھی بتادوں گا۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

ایمان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ ساکت کھڑی رہی، جیسے اس کا دل ایک ہی لمحے میں ہزار ٹکڑے ہو گیا ہو۔ ”کیا واقعی وہ دوسری شادی کی بات کر رہا ہے؟“ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

وہ بے یقینی کے عالم میں معارج کی طرف دیکھتی رہی جو فون بند کر کے مسکراتا ہوا مڑ گیا تھا۔

معارج نے ایمان کی طرف دیکھا اور نرم لہجے میں بولا، ”ارے، تم کیا کر رہی ہو؟“ ایمان نے زبردستی مسکرا کر کہا، ”کچھ نہیں، بس کپڑے سکھا رہی ہوں۔ تمہارا کیا حال ہے؟“ لیکن اندر ہی اندر وہ جل رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ معارج جھوٹ بول رہا ہے، اس کی باتوں میں چھپے راز کو وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔

معارج اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور ایمان اس کے پیچھے چلی گئی۔ جب وہ اندر پہنچی تو دیکھا کہ بیڈ پر ایک سفری بیگ رکھا ہوا تھا، جس میں معارج اپنے کپڑے رکھ رہا تھا۔ ”یہ سب کیا ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟“ ایمان نے دل کی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

معارج نے پلٹ کر ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر بولا، ”میں اپنے دوست کی شادی میں جا رہا ہوں، کچھ ضروری تیاری کرنی ہے۔“

ایمان کو اس کے جھوٹ پر یقین نہ تھا، مگر وہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکراتی رہی۔ ”اچھا، شادی کی تیاری میں چائے کا ایک کپ چاہیے ہوگا، کیا کشمیری چائے بنا دوں؟“ اس نے پوچھا۔ معارج کی آنکھوں میں ایک چمک آئی، ”ہاں، یہ اچھا ہوگا، کشمیری چائے ہمیشہ پسند آتی ہے۔“

ایمان نے دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ ”کشمیری چائے؟“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”یہ چائے تمہیں کشمیر کی وادیوں کی بجائے جنت کی ہواؤں میں لے جائے گی، اور جب تم اٹھو گے، شادی کا وقت گزر چکا ہو گا۔“

وہ کچن میں داخل ہوئی، جہاں ہلکی روشنی مدھم سایوں کی مانند دیواروں پر رقص کر رہی تھی۔ سکونت کا ایک عجیب سا سحر طاری تھا، جیسے کوئی پوشیدہ راز فضا میں معلق ہو۔

اس نے چولہا جلایا اور ایک بھاری دیگی میں پانی ڈالا۔ تین بسترے ہو میں ہلکی سی لرزش تھی جب اس نے پانی کو ابلنے کے لیے چھوڑا۔

کشمیری چائے کی روایتی تیاری کا آغاز خاموشی سے ہوتا ہے، لیکن آج فضا میں کچھ اور تھا۔ اس نے چمچ سے چائے کی مخصوص پتی لی، جو کشمیر کی وادیوں سے چنی گئی تھی، اور اسے ابلتے ہوئے پانی میں ڈالا۔

پانی کا رنگ دھیرے دھیرے گہرا گلابی ہونے لگا۔ وہ ہر قدم کو احتیاط سے اٹھا رہی تھی، جیسے کہ اس کے دل میں چھپا راز کسی پل بھی افشا ہو سکتا تھا۔

اب اس نے ہاون دستے میں لاپچی کے چند دانے کوٹ کر چائے میں شامل کیے۔ ایک ہلکی سی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ پھر، کچن کے ایک کونے میں پڑی ایک مخصوص بوتل کی طرف بڑھتے ہوئے، اس کی نظریں لمحہ بھر کو دروازے کی طرف گئیں، جیسے کوئی اندر آ جانے کا انتظار کر رہا ہو۔ وہ بوتل، جس میں نیند کی گولیاں تھیں، اس کے ہاتھ میں تھر تھرا رہی تھی۔

دھیرے دھیرے اس نے گولیاں چائے میں گھول دیں، لیکن پھر رک گئی۔ اس کی سانسیں بوجھل ہو گئیں۔ کیا یہ صحیح تھا؟ اس نے سوچا۔ مگر پھر ایک عجیب مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ چائے کا رنگ اب زیادہ گہرا ہو چکا تھا۔ وہ دیکھی کو ہلاتے ہوئے دودھ شامل کرنے لگی، اور اس کا دل عجیب سے خیالات کی لپیٹ میں تھا۔

چائے کو کئی منٹوں تک جوش دینے کے بعد، اس نے اسے بڑے احتیاط سے ایک مگ میں ڈالا۔ مگ کا رنگ گہرا ہوا تھا، جیسے کہ وہ اس وقت کی رازداری کا عکاس ہو۔

وہ مگ کو اٹھا کر آہستگی سے کمرے کی جانب بڑھنے لگی، جہاں ہر چیز معمول کی نظر آرہی تھی، لیکن اب چائے کا ہر قطرہ ایک گہری سازش کا عکاس تھا۔

۔ ”یہ لو، تمہاری پسندیدہ چائے۔“ اس نے مگ معارج کو تھماتے ہوئے کہا۔

معارج نے ایک گھونٹ لیا اور مسکرا کر بولا، ”واہ! یہ تو لا جواب ہے۔ تم واقعی بہترین ہو، ایمان۔“ وہ اس کے گال پر محبت بھرا بوسہ دے کر چائے پینے لگا، جب کہ ایمان اندر ہی اندر جلتی رہی، اس کی زہریلی مسکراہٹ چھپائے ہوئے۔

معارج کو خبر نہیں تھی کہ اس کا کھیل اب ایمان کے ہاتھ میں تھا۔

ایمان نے تھکے ہوئے انداز میں دیوار سے ٹیک لگائی اور معارج کو دیکھتے ہوئے دل میں پیچ و تاب کھاتی رہی، جب اس نے دیکھا کہ معارج اب بھی پوری تسلی سے چائے پی رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی، دل ہی دل میں بولی، ”اس چائے کا اثر کیوں نہیں ہو رہا؟ یہ کیسا آدمی ہے!“۔

معارج نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور ہلکا سا مسکراتے ہوئے کپ میز پر رکھا۔ ”یہ ہی سوچ رہی ہونا، کہ نیند کی گولی کا مجھ پر اثر کیوں نہیں ہو رہا؟“ اس کے لبوں پر ایک پراطمینان مسکراہٹ تھی، جیسے وہ سب جانتا ہو۔

ایمان کی سانس ایک لمحے کے لیے تھم گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی کہ معارج ایک تربیت یافتہ شاؤ لن مونک تھا؟ اس پر یہ معمولی چیزیں اثر نہیں کرتی تھیں۔

ایمان نے خود کو کوسا، لیکن چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولی، ”ہاں جی، تم تو بڑے مضبوط ہو! لیکن یاد رکھنا، اگر میں اپنے پر آگئی نا، تو تمہیں قبر میں تین سوالات کے جواب دینے پڑیں گے، نکاح کے بول تو چھوڑو!“۔

ایمان نے دھیرے دھیرے قدم اٹھائے، جیسے ہر قدم سوچ سمجھ کر رکھ رہی ہو۔ اس کا وجود اضطراب کی عکاسی کر رہا تھا، مگر چہرے پر سکون کا سالباہہ اوڑھے ہوئے تھی۔

وہ معارج کے قریب آ کر لمحہ بھر کور کی، پھر نرمی سے اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اس کی حرکات میں ایک عجیب سی خاموشی اور گہری سوچ کی جھلک تھی، جیسے وہ اپنے ہر عمل کو تول رہی ہو، اپنے دل کی بے چینی کو دباتے ہوئے اس کے ساتھ خاموشی سے شریک ہو رہی تھی۔ دفعتاً

معارج کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور گہری نگاہیں تھیں۔ وہ سکون سے بولا، ”دوسری شادی؟“۔ ایمان کی آنکھوں میں شک اور غصہ ایک ساتھ لہرا رہا تھا۔ ”ہاں، دوسری شادی۔ تمہیں کال پر صاف صاف کہتے سنا۔ بتاؤ کیا سچ ہے؟“۔

معارج نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور گہرا سانس لیا، پھر ایمان کا ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے بولا،۔۔۔ ”ایمان، تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے؟ کیا تم واقعی سمجھتی ہو کہ میں تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی سکتا ہوں؟ تم میرے لیے سب کچھ ہو۔ تم سے پہلے کوئی نہیں تھا، نہ بعد میں کوئی ہو گا۔ تم میرے دل کی پہلی اور آخری ملکہ ہو۔“۔

ایمان کی آنکھوں میں معصومیت اور درد جھلکنے لگا۔ ”لیکن... تم نے دوسری شادی کی بات کی تھی... بچوں کا ذکر کیا تھا...“ اس کے الفاظ کا نپتے ہوئے نکلے۔

معارج مسکراتے ہوئے بولا، ”یہ میرے دوست کی شادی ہے، اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور ایک بیٹی بھی ہے۔ وہ دوسری شادی کر رہا ہے تاکہ اس کی بیٹی کو ایک ماں مل سکے، اور جس سے وہ شادی کر

رہا ہے اس کی بھی ایک بیٹی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ بچوں کو وقت کے ساتھ سب قبول ہو جاتا ہے، اور اسے دوسری شادی ضرور کرنی چاہیے تاکہ عورت کی عزت بھی بحال ہو اور بچیوں کو ماں باپ کا سہارا مل جائے۔“

ایمان کا چہرہ سرخ ہو گیا، وہ شرمندگی کے مارے زمین میں گرڑھنا چاہتی تھی۔ “میں... میں معذرت چاہتی ہوں، میں غلط تھی، میں نے تم پر شک کیا۔” اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔

معارج نے نرمی سے ایمان کے چہرے پر بہتے آنسو صاف کیے، اس کے دل کی گہرائیوں میں جانتا تھا کہ ایمان کی یہ بے چینی اور اضطراب بے سبب نہیں۔

اولاد کی عدم موجودگی ایک ایسا بوجھ تھا جو اس کے دل پر مستقل دباؤ ڈالے ہوئے تھا، اور وہ اپنے اندر اس غم کو سمیٹے ہوئے تھی۔

معارج اس کے اس حال کو بخوبی سمجھتا تھا، مگر وہ اس بات سے بھی آگاہ تھا کہ اس کی محبت کسی بھی جسمانی تعلق یا دنیاوی تقاضے سے بالاتر ہے۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ ایمان کی ہر پریشانی، ہر دکھ، اُس کی اپنی ذمہ داری ہے، مگر اس کا دل کبھی بھی ایمان کے علاوہ کسی اور کی طرف نہیں جاسکتا۔

وہ جانتا تھا کہ محبت کا حقیقی مفہوم کسی شرط، خواہش یا جسمانی تقاضے میں نہیں چھپا، بلکہ یہ ایک روحانی تعلق ہے جو دونوں کے درمیان بے حد مضبوط تھا۔

وہ جانتا تھا کہ جو دل سچا محبت کرتا ہے، اس کے لیے ایک ہی وجود کافی ہوتا ہے، اور وہ ہی اس کا واحد مرکز ہوتا ہے۔

۔“اولاد کی کمی ایک آزمائش ہے، لیکن تمہاری محبت میری زندگی کا سب سے بڑا انعام ہے،” معارج نے دل میں سوچتے ہوئے خود کو یقین دلایا۔ وہ ہر لمحہ ایمان کی خوشیوں اور غموں کا شریک تھا، اور کسی بھی صورت میں اسے اس درد سے نکالنے کی کوشش کرتا تھا، کیونکہ اس کی محبت میں وفا، احترام اور صبر کی وہ خوبیاں تھیں جو اسے کامل بناتی تھیں۔

ایمان نے سر جھکا لیا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولی، “میں نے بہت بڑی غلطی کی، میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔”

معارج نے اس کے چہرے پر اپنا ہاتھ رکھا اور محبت بھری آواز میں بولا،۔

۔“ایمان، تم مجھے کبھی نہیں کھو سکتی۔ تم میری زندگی کی وہ روشنی ہو جو میرے ہر اندھیرے کو مٹا دیتی ہے۔ تمہارے بغیر میرا وجود بے معنی ہے۔ تمہاری بے قراری، تمہاری غیرت، یہ سب میرے لیے ایک عطیہ ہے۔

جن شوہروں کی بیویاں ان پر حسد نہ کریں، وہ واقعی بد قسمت ہوتے ہیں۔ لیکن میں خوش قسمت ہوں کہ تمہاری محبت میں اتنی شدت ہے کہ تم نے یہ قدم اٹھایا، یہ یقین رکھتے ہوئے کہ تمہاری جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔

مجھے تم پر فخر ہے، ایمان، کہ تم نے اپنی محبت کو اس طرح پروان چڑھایا کہ تمہارے دل میں میرے لیے ایک حفاظت کا جذبہ پیدا ہوا۔

تمہاری یہ ہی حساسیت، تمہارا یہ ہی احساس، میرے لیے بے حد قیمتی ہے۔ اور یہ ہی وہ چیز ہے جو ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔ میں جانتا ہوں، تمہارا یہ خیال کہ کوئی تمہیں مجھ سے جدا کر دے، محض تمہاری محبت کی گہرائی کا عکس ہے۔ اور یہ محبت، یہ غیرت، یہ میری زندگی کا سرمایہ ہے۔۔۔“

پھر وہ مسکرایا اور بولا،۔

۔“یاد رکھو، ایمان، میرے دل میں تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور کا تصور کرنا بھی شرک کے برابر ہے۔

تم میری عبادت کا محور ہو، میری زندگی کی وہ مرکزی دھڑکن ہو جس کے بغیر میرا وجود بے جان ہے۔

جس طرح عبادت میں دل کی پوری توجہ ہوتی ہے، ویسے ہی میری ساری محبت، ساری چاہت صرف تمہاری طرف مرکوز ہے۔ تم میرے لیے وہ واحد حقیقت ہو جس میں سکون ہے، اور تمہارے بغیر میں کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔”

ایمان نے شرمندگی کے ساتھ سر ہلایا۔ ”مجھے تم پر پورا اعتبار ہے، اور آئندہ کبھی تم پر شک نہیں کروں گی۔“

معارج نے محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا، ”اب ذرا مسکرا دو۔ تمہاری خوبصورت مسکراہٹ میری دنیا کو روشن کر دیتی ہے۔“

ایمان نے نم آنکھوں سے ہنستے ہوئے آنسو پونچھے، اور معارج نے نرمی سے اس کے رخسار کو چوما۔

”تم میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع ہو،“ وہ مزید بولا۔ ”اور ہمیشہ رہو گی۔“

...°...

سورج کی نارنجی غروب ہوتی کر نیں ہنزہ کی وادی میں بکھری ہوئی تھیں، جہاں ہر طرف برف پوش پہاڑوں کا جلال تھا اور دور تک پھیلے ہرے بھرے میدانوں میں جنگلی پھولوں کی خوشبو رچی بسی تھی۔

آسمان نیلا، نارنجی اور جامنی رنگ کا صاف اور پرسکون تھا، جیسے کوئی خوبصورت خواب جو حقیقت میں تبدیل ہو چکا ہو۔

ہوا میں ہلکی خنکی تھی، جو معارج اور ایمان کے چہروں کو چھوتی ہوئی گزرتی، ان کے دلوں میں مسابقت اور محبت کی گہری لہر پیدا کر رہی تھی۔

ایمان، جو اپنے سیاہ عبایا اور نقاب میں ملبوس تھی، ایڈنا کے قریب کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی، جیسے وہ آج کچھ خاص کر دکھانے والی ہو۔

ایڈنا، جو کہ ایک مضبوط اور تیز گھوڑی تھی، زمین پر اپنے پاؤں مار رہی تھی جیسے دوڑ کے لیے بے تاب ہو۔ ایمان نے ایڈنا کی ایال پر ہاتھ پھیرا، اور پھر معارج کی طرف دیکھا۔

دوسری طرف، معارج بادل کے ساتھ تیار کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ شرٹ اور پینٹ پہن رکھی تھی، جو اس کی پرکشش شخصیت کو اور نمایاں کر رہی تھی۔

بادل ایک جادوئی گھوڑا معلوم ہوتا تھا، جس کی آنکھوں میں آگ کی چمک اور قدموں میں بجلی کی رفتار تھی۔

معارج نے ایمان کی طرف مسکراتے ہوئے کہا، ”آج پھر تمہارے نصیب میں شکست ہے، ایمان۔ یہ دوڑ تمہارے لیے آسان نہیں ہوگی۔“

ایمان نے اپنی نقاب کے پیچھے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”محبت میں شکست اور فتح کا کوئی سوال نہیں ہوتا، معارج۔ لیکن ہاں، آج دوڑ میں تمہیں ہرانا ضرور میری کامیابی ہوگی۔“

دوڑ کی شروعات کے لیے وہ دونوں اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ فضا میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی، جیسے قدرت بھی ان کے اس مقابلے کی منتظر ہو۔

پھر اچانک ہوا میں تیز آواز گونجی، اور دونوں گھوڑے ایک ساتھ زمین کو کاٹتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ بادل اور ایڈنا کی رفتار نے میدان میں دھول اڑادی، اور وہ جیسے آسمان کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ہنزہ کی وادی کے مناظر ان کے ارد گرد تیزی سے گزر رہے تھے۔ بلند و بالا پہاڑوں کے سائے میں سرسبز درخت اور بہتے چشمے، وہ ان قدرتی مناظر میں گم ہو کر بھی ایک دوسرے کو شکست دینے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔

ایڈنا اور بادل دونوں ہی اپنی پوری طاقت سے دوڑ رہے تھے، جیسے زمین کی ہر نس پر ان کا قبضہ ہو۔

پہلا موڑ آیا، اور معارج نے بادل کو مہارت سے سنبھالا۔ بادل اپنی پوری رفتار سے آگے نکل گیا۔

معارج کی آنکھوں میں جیت کی چمک تھی، لیکن وہ جانتا تھا کہ ایمان آسانی سے ہارنے والی نہیں۔

پیچھے ایمان نے ایڈنا کی رفتار تیز کر دی، اور ایڈنا تیز ہوا کی طرح بادل کے قریب آگئی۔

ایمان کی آنکھوں میں جذبہ اور چہرے پر اٹل یقین تھا۔ اس نے معارج کو چھیڑتے ہوئے کہا، ”یہ دوڑ تو تمہارے لیے بہت مشکل ثابت ہونے والی ہے، معارج۔“

معارج نے پیچھے مڑ کر مسکراتے ہوئے کہا، ”تمہاری محبت مجھے ہر بار شکست دینے پر مجبور کرتی ہے، لیکن آج میں جیتنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

اب دونوں گھوڑے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے، جیسے آسمان اور زمین کے بیچ کوئی مقابلہ ہو رہا ہو۔

ان کے قدموں کی آواز وادی کی خاموش فضاؤں میں گونج رہی تھی۔ ایڈنا اور بادل کے درمیان مسابقت بڑھتی جا رہی تھی، کبھی بادل آگے نکلتا تو کبھی ایڈنا۔

معارج نے دل میں ایک نرم گوشہ محسوس کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایمان اسے شکست دینے کی پوری کوشش کر رہی ہے، لیکن اس کے دل میں ایمان کے لیے محبت اور عزت کا سمندر موجزن تھا۔

اس نے اپنے دل کی گہرائی سے کہا، ”تم سے ہارنا میری خوش نصیبی ہے، ایمان۔ تمہاری محبت میں جیت کا کوئی مطلب نہیں۔“

ایمان نے اپنی نظریں معارج پر جمائے رکھیں، اور دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”میں جانتی ہو معارج میری جیت تمہاری ہار میں ہے مگر تمہارے بغیر میری ہر جیت بے معنی ہے۔“

فنش لائن قریب آرہی تھی، اور دونوں نے آخری رفتار تیز کر دی۔ گھوڑوں کے قدم زمین کو ایسے کاٹ رہے تھے جیسے وہ ہوا میں تیر رہے ہوں۔

ایک لمحے کے لیے دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اور پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک ساتھ جیتیں گے۔

معارض نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، اور ایمان نے اسے تھام لیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ فنش لائن کو پار کر گئے، جیسے محبت اور مسابقت کی ایک نئی علامت قائم ہو گئی ہو۔

ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے، اور انہوں نے ہنستے ہوئے ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔
- ”ہم جیت گئے!“ دونوں نے بیک وقت کہا۔

ہوا میں خوشبو، محبت اور فتح کی خوشی گھل گئی۔ وہ دونوں اپنے گھوڑوں سے اترے اور انہیں پیار کیا۔ پھر وہ ایک دوسرے کے ساتھ درخت کے سائے میں بیٹھ گئے، جہاں سے سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان کے نارنجی اور جامنی رنگوں نے منظر کو اور بھی دلکش بنا دیا تھا۔ ٹھنڈی ہوائ نے ان کے دلوں کو مزید سکون بخشا، اور وہ ایک دوسرے سے گلے مل کر خوشی اور محبت میں ڈوب گئے۔

یہ دوڑ، جو بظاہر ایک معمولی مقابلہ لگتی تھی، درحقیقت ان کی محبت کی ایک اور گہری علامت بن گئی۔

رات کی گہری چاندنی وادی پر خاموشی سے اپنا جادو بکھیر رہی تھی۔ چاند کی روشنی ہر شے کو ایک دلکش طلسماتی روپ دے رہی تھی اور بے شمار جگنو ہوا میں چمک رہے تھے، جیسے قدرت نے آسمان سے ستارے زمین پر بکھیر دیے ہوں۔

ایمان اور معارج، اپنے گھوڑوں کی باگیں تھامے، دھیرے دھیرے اصطلبل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن کے قدموں کی آہنگ میں سکون تھا، اور اُن کے گھوڑے، ایڈنا اور بادل، ان کے پیچھے وفاداری سے چل رہے تھے۔

جیسے ہی وہ اصطلبل کے قریب پہنچے، ایمان کی نظر سلطان پر پڑی، جو اپنے مخصوص انداز میں پشت کے بل لیٹا ہوا تھا، اور کبھی کبھار اپنے پاؤں ہوا میں مارتا تھا، جیسے کوئی خوش خواب دیکھ رہا ہو۔ ایمان ہنس پڑی اور معارج کی طرف دیکھ کر کہا، ”ذرا دیکھو تو!“۔

معارج نے سلطان کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا، ”ایسا لگتا ہے کہ یہ چھوٹا شہزادہ کسی بادشاہت کا خواب دیکھ رہا ہے۔“۔

ایمان نے محبت سے معارج کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے کہا، ”یہ پیارا ہے، بالکل ہمارے خوابوں کی طرح۔“۔

معارض نے نرمی سے ایمان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور دھیمی آواز میں کہا، ”اور تم میری زندگی کی سب سے حسین حقیقت ہو۔“ وہ دونوں لمحے بھر کے لیے ایک دوسرے سے گلے ملے، اور ان کی نظروں میں وہ خاموشی تھی جو محبت اور اعتماد کی گواہی دیتی ہے۔

مگر انہیں خبر نہ تھی کہ درختوں کے پیچھے سے ایک پراسرار شخص انہیں بغور دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سیاہ لبادہ اوڑھا ہوا تھا، چہرے پر نقاب تھا، اور ہاتھ میں ایک تیز دھار چاقو تھا۔ اُس کی گردن پر ایک آنکھ کا ٹیوٹھا، جو ایک خفیہ تنظیم کی علامت تھی، جو دنیا کے معاملات کو پس پردہ کنٹرول کرتی تھی۔ وہ شخص معارج کو مارنے کے منصوبے سے آیا تھا، کیونکہ معارج اُن کے منصوبوں میں خلل ڈالنے والا ایک بڑا خطرہ بن چکا تھا۔

معارض نے ایمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”تم یہاں رہو، میں گھر میں جا کر کھانا گرم کر لوں گا۔“

ایمان نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ”ٹھیک ہے، میں کچھ وقت تک آتی ہوں۔“

معارض نے اسے گلے لگایا اور نرمی سے اس کی پیشانی چومی، ’۔

معارض رخصت ہوا اور ایمان گھوڑوں کے ساتھ اصطبل کے اندر چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر اُس نے بادل اور ایڈنا کو پیار سے تھپتھپایا اور اُن کے لیے کچھ گھاس اور پانی ڈالا۔ سلطان، جو اب جاگ چکا تھا، اپنی بے پروا

نہند سے بیدار ہو کر اُن کے پاس آگیا۔ ایمان نے ہنستے ہوئے اس کے نرم بالوں پر ہاتھ پھیرا اور خود سے کہنے لگی، ”میرے چھوٹے شہزادے، تم اتنے معصوم اور پیارے کیوں ہو؟“۔

اچانک، باہر سے ایک ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ ایمان کا دل لمحے بھر کو دھڑکنے لگا، جیسے ہوا میں کچھ غیر معمولی ہو۔ اُس نے گھوڑوں کو تسلی دی، اُن کی لائٹس بند کیں، اور دروازے کو دھیرے سے بند کرتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔۔۔۔

۔ ایمان دھیرے دھیرے قرآن کی آیت لبوں پر دوہراتی ہوئی، گھر کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔

اس کی معصومیت سے بے خبر، پیچھے کہیں سایہ دار درختوں میں، وہ شخص حرکت میں آچکا تھا جسے معارج کو قتل کرنے کا حکم ملا تھا۔

لیکن جب اس نے ایمان کو تنہا دیکھا، تو اُس کی نیت بدل گئی، اور اُس نے اپنے شیطانی منصوبے کو ایمان پر آزمانے کا فیصلہ کیا۔

وہ شخص خاموشی سے ایمان کا پیچھا کرتا رہا، جیسے جنگل کا ایک درندہ اپنے شکار کی تاک میں ہوتا ہے۔

اس کے ہاتھ میں چمکتا ہوا چاقو، چاندنی میں خون کے پیاسے بھیڑیے کی طرح چمک رہا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں ایک شرارت بھری مسکراہٹ تھی، جیسے وہ اپنے شکار کو پانے کے لیے ایک لذت محسوس کر رہا ہو۔ ”آج تمہاری قسمت میں موت ہے، معارج کی بیوی،“ وہ دل ہی دل میں زیر لب بڑبڑایا۔

ایمان کے قدموں کی آواز جیسے ہی گھر کے دروازے کے قریب پہنچنے لگی، وہ شخص مزید تیزی سے قریب آیا۔ چاقو ہوا میں لہرایا، اور وہ جیسے ہی ایمان کی پشت میں وار کرنے کے لیے جھکا، اچانک اُس کی گردن پر لوہے کی مانند سخت گرفت محسوس ہوئی۔

وہ شخص پلک جھپکنے کے موقع سے بھی پہلے ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچا گیا۔

ایمان کو کچھ محسوس نہ ہوا، وہ گھر کے اندر داخل ہو چکی تھی، مگر اس کے پیچھے معارج کا موت کا سایہ ناگہاں نمودار ہو چکا تھا۔

معارج کی مضبوط گرفت میں جکڑے اُس شخص کو زمین پر پٹا گیا، چاقو اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

معارج، جس کی آنکھوں میں انتقام کی چنگاریاں دہک رہی تھیں، اُس شخص کے اوپر جھک گیا۔ ”کیا تُو واقعی یہ سوچتا تھا کہ تو مجھے بے خبر پائے گا؟“ معارج کی آواز میں ایسا جلال تھا کہ اُس شخص کا وجود لرز اٹھا۔

معارج نے اسے بے دردی سے درخت سے لگا دیا، اور زور سے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”کیا تجھے لگا میں تجھے نہیں دیکھ رہا تھا؟ میری آنکھیں باز کی طرح سب کچھ دیکھتی ہیں، اور تیری چالیں میری نظر سے بچ نہیں سکتیں۔“

وہ شخص اب خوف سے کانپنے لگا تھا۔ اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا، ”مجھے معاف کر دو، میں صرف حکم بجالا رہا تھا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے مت مارو، پلیز۔“

مگر معارج کی آنکھوں میں رحم کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اس کی مسکراہٹ زہر سے بھرپور تھی۔ ”تُو حکم پر چل رہا تھا۔ اور میں اپنے اصولوں پر۔“ معارج نے جیب سے پیچکس نکالا اور اُس کی کنپٹی پر انتہائی بے رحمی سے وار کیا۔ ایک، دو، تین، چار... پیچکس کی ہر ضرب کے ساتھ وہ شخص زمین پر تڑپتا رہا، خون کا فوارہ چھوٹا اور اُس کی زندگی کے باقی لمحے گنتی کے ہو گئے۔

وہ شخص اب موت کے دہانے پر تھا، زمین پر تڑپتا، پیر رگڑتا، اور چند لمحوں میں اس کا وجود خاموش ہو چکا تھا۔

معارج نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی لاش کو دیکھا اور سرد لہجے میں بولا، ”جہنم میں خوش آمدید، دشمن۔ اب تیری باری ختم، اور تیرے باپوں کی باری شروع۔“

معارج نے جنگل کی طرف نظر دوڑائی، جہاں دور کہیں ایمان کا گھر روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔ اُس نے بے حس و بے جان لاش کو کھینچا اور گھسیٹتے ہوئے جنگل کے تاریک حصے میں غائب ہو گیا۔

رات کا پُر سرار اندھیرا چاروں طرف گہرائی میں ڈوبا ہوا تھا، جب معارج اپنے منصوبے کو پورا کر کے واپس آ رہا تھا۔

اُس کے لباس اور چہرے پر مٹی کے آثار نمایاں تھے، جیسے وہ ابھی ابھی مٹی کے نیچے دفن کی گئی کسی راز کی دنیا سے لوٹا ہو۔ اس کی سانس میں بو جھل تھکن تھی، مگر قدم مستحکم اور پُر عزم تھے۔

جیسے ہی وہ گھر کے قریب پہنچا، اندر سے ہلکی ہلچل اور برتنوں کی سرسراہٹ اُس کے کانوں تک پہنچنے لگی۔ وہ شیشے کی کھڑکی کے قریب پہنچا، جہاں سے اندر کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی، مگر کھڑکی ایسی تھی کہ باہر سے کچھ نظر نہیں آتا تھا، اندر سے باہر سب کچھ صاف دکھائی دیتا تھا۔

معارج کی آنکھوں میں ایک شرارتی مسکراہٹ ابھری، اُس نے یہ منظر دیکھا اور فیصلہ کیا کہ وہ اپنے مخصوص خفیہ راستے سے اندر داخل ہو گا جس کا ایمان کو کوئی علم نہ تھا۔

معارج ایک پراسرار دیوار کے سامنے رکا، اُس کی آنکھوں میں عجب چمک اور چہرے پر ایسی پراسرار مسکراہٹ تھی جیسے وہ ایک خفیہ دنیا کا راز جانتا ہو۔

اُس نے دیوار کے ایک خاص حصے کو نہایت نپے تُلے انداز میں دھکیلا اور وہ دیوار ایک خاموش دروازے کی مانند کھل گئی، جیسے کوئی بھید افشا ہونے کو ہو۔

اُس کے سامنے ایک خفیہ سرنگ کا دہانہ نمودار ہوا، جو گہرائی میں نیچے اُترتی تھی، جیسے زمین کے اندر چھپے رازوں کی دنیا ہو۔ یہ راستہ اُس کی پوشیدہ دنیا کا تھا، ایک ایسی دنیا جہاں دنیا کی نظروں سے اوچھل اُس کے تمام راز اور دستاویزات محفوظ تھے۔

سرنگ کے اندر ہر قدم جیسے دھیرے سے گونجتا، اُس کی چال میں ایک غیر معمولی سکون تھا، اور اس کے اطراف میں گہرے سایوں کی دنیا پھیلتی جاتی۔

سرنگ کے پتھریلے دیواروں پر ہلکی سی نمی اور مٹی کی بو تھی، جیسے یہ راستہ صدیوں سے اُس کے قدموں کا انتظار کر رہا ہو۔ معارج کا ہر قدم اُس کی ذہانت اور چالاکی کا مظہر تھا، اُس کا دماغ ایک شطرنج کے کھیل کی مانند ہر ممکنہ چال پر غور کرتا تھا۔

وہ اچانک ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا، جس کی فضا میں عجب پُر سرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کمرے کے اطراف میں سلیقے سے ترتیب دی گئی اہم دستاویزات، ہتھیار، اور دیگر راز چھپے ہوئے تھے، جنہیں کوئی بھی معمولی انسان کبھی نہیں جان سکتا تھا۔ یہ اُس کی چھپی ہوئی سلطنت تھی، جہاں وہ اپنے منصوبوں کو ترتیب دیتا تھا۔

کچھ دیر بعد، معارج ایک دوسرے خفیہ دروازے سے باہر آیا۔ اُس نے واش روم میں جا کر اپنے چہرے اور بدن سے گرد و غبار کو دھویا۔

جب وہ غسل خانے سے باہر نکلا تو اُس کا حلیہ بدل چکا تھا۔ اُس کے بدن پر سفید ٹی شرٹ چمک رہی تھی جو اُس کے چھپے ہوئے جسمانی نقش و نگار کو نمایاں کر رہی تھی، اور خاکی ٹراؤزر اُس کی مردانہ وجاہت کو اور ابھار رہا تھا۔

اُس کے بھیگے بال ماتھے پر لٹکے ہوئے تھے، اور اس کا بدن غسل کے بعد کی تازگی سے چمک رہا تھا۔ اس کے گرد لپٹا ہوا تولیہ اور اُس کی سانسوں کی عجیب کشش کا منظر بنا رہی تھیں، جیسے ابھی ابھی وہ کسی خواب سے نکلا ہو۔

معارج نے کمرے کے دروازے کو کھولا اور آہستگی سے باہر جھانکا۔

اُس کی نظر ایمان پر پڑی، جو اب بھی چولہے کے پاس کھڑی تھی اور کھانا پکا رہی تھی، بے خبر کہ وہ کتنا قریب آچکا ہے۔ اُس نے آہستگی سے اپنی سانسوں میں ایک سیٹی بجائی اور نرم لہجے میں کہا، ”ہیلو، میری جان۔ کیا پکایا جا رہا ہے؟“۔

ایمان نے فوراً پلٹ کر اُسے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر حیرانی اور مسکراہٹ بیک وقت نمودار ہوئی،۔ ”اوہ، تم نے مجھے ڈرا دیا!“ اُس نے معارج کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ سفید ٹی شرٹ اُس کے تنومند جسم کے ہر پٹھے کو اجاگر کر رہی تھی، اور اُس کے بھیگے بال اور چمکتا ہوا چہرہ جیسے کوئی مجسمہ تراشا گیا ہو۔

ایمان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”تم تو بالکل الگ لگ رہے ہو، جیسے ابھی ابھی غسل کر کے آئے ہو۔ میں نے سوچا تھا کہ تم کھانا گرم کر رہے ہو گے۔“ معارج نے اپنی پرکشش مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”ہاں، وہ ہی سوچا تھا، مگر پھر میں نے پہلے نہانے کا فیصلہ کیا۔ پسینے اور دھول کے بعد خود کو تازہ کرنا ضروری تھا۔“

معارج کی نگاہیں ایمان پر جمیں تھیں، اُس کی ہر حرکت کا مشاہدہ کرتے ہوئے، مگر اُس کے انداز میں ایک پُر اسرار کشش تھی جو ایمان کو ہر پل اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اُس نے نرمی سے کہا، ”تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں، میں کھانا گرم کر سکتا ہوں۔ اور روٹیاں بھی بنالوں گا۔“

ایمان نے ہنستے ہوئے کہا، ”تمہیں پتہ ہے، مجھے تمہارے لیے کھانا بنانا اچھا لگتا ہے۔ تمہارے جیسا آدمی جو دن رات محنت کرتا ہے، وہ میرے ہاتھوں سے پکا ہوا لذیذ کھانا کھانے کا مستحق ہے۔۔۔“

اس نے سالن پیالے میں ڈالا اور روٹیوں کو ہاٹ پاٹ میں رکھا۔ ”چلو، کھانا کھاتے ہیں۔ میں بھوکی ہوں۔“

معارج نے آہستگی سے ایمان کی کلائی کو پکڑا اور اسے اپنے نزدیک تر کھینچ لیا، اُس کی سانسیں اُس کے کانوں میں جیسے کسی خواب کی سرگوشی کی طرح لرز رہی تھیں۔ اُس کی مضبوط بانہوں کا حصار ایمان کو ایک دم سے محفوظ اور پیارا محسوس ہونے لگا۔

معارج نے اپنے لبوں کو ایمان کے نرم گالوں پر آہستگی سے رکھا اور سرگوشی کی، ”تم میری دنیا ہو، میری جان۔ تمہاری محبت میری زندگی کی سب سے قیمتی چیز ہے۔“

ایمان نے اپنے بازو اُس کے گرد لپیٹتے ہوئے آنکھوں میں پیار کی چمک کے ساتھ اُسے دیکھا۔ ”اور تم میرے لئے سب کچھ ہو، معارج۔ تمہارے بغیر میری دنیا بے رنگ ہے۔“ ایمان نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا، مگر اچانک جیسے کوئی خیال اس کے ذہن میں آیا اور اس نے شرارتی انداز میں کہا، ”یہ جو تم ابھی اتنے پیار بھرے ہو رہے ہو، کہیں یہ ثابت تو نہیں کرنا چاہتے کہ واقعی مرد کے دل کا راستہ پیٹ سے ہو کر گزرتا ہے؟“

معارج ہنس پڑا اور اُس کی ناک کو محبت سے چوما، ”میرے دل کا راستہ تو تمہارے میٹھے اور محبت بھرے الفاظوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ تمہاری ہر مسکراہٹ میرا دل جیت لیتی ہے۔ اور جان، میرے دل کی کنجی صرف تمہارے پاس ہے۔۔۔“

ایمان ہلکی سی مسکان کے ساتھ بولی، ”تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ تم پاکستان میں رہتے رہتے پورے دیسی بن رہے ہو۔“

معارض نے اُس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے نرمی سے جواب دیا، ”اگر میری زندگی کی سانسیں کہے تو میں اُس کے ہر لفظ کے تابع ہو جاؤں۔ تم کہو تو میں بدل جاؤں، چاہے پاکستان ہو یا سویڈن، ہر لمحہ صرف تمہارا ہے۔ ابھی تو میرے وجود میں بس تم ہو، نہ کوئی سرحد، نہ کوئی ملک، صرف ایمان۔“

ایمان نے مسکراتے ہوئے اُس کی پیشانی کے گرد بکھرے گیلے بالوں کو نرمی سے چھوا۔ ”تمہیں ویسا ہی پسند کرتی ہوں جیسے تم ہو۔ تمہیں خود کو تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اُس نے اُس کے گال کو پیار سے چوما اور کہا، ”چلو، میز پر چلتے ہیں۔ اور یہ گیلا تولیہ گردن سے اتار دو۔ اسے ایک طرف رکھ دو۔“

معارض نے تولیہ اتار کر قریب ہی کیل پر لٹکا دیا اور پھر ایمان کے پیچھے میز کی طرف آیا۔

وہ بیٹھ کر کھانے لگے، ہر لمحے کو ساتھ گزار کر انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر اپنے وقت کا لطف اٹھایا۔

معارض نے نرمی سے ایمان کی طرف دیکھا، اُس کے چہرے پر محبت کی روشنی اور آنکھوں میں سنجیدگی کی لہر تھی۔ ”ایمان، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

ایمان نے فوراً اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے کی سنجیدگی نے اُسے بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ ”کیا ہوا، معارج؟ سب ٹھیک ہے؟“

معارض نے سر ہلایا، ”ہاں، سب ٹھیک ہے۔ فکر مت کرو، لیکن مجھے ایک اہم بات کرنی ہے... مجھے سویڈن جانا ہے۔ ایک کاروباری میٹنگ کے لیے۔“

ایمان کے دل میں دھڑکن تیز ہو گئی، ”سوئڈن؟ کیسی میٹنگ؟“۔

معارج نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا، ”یہ ایک بڑی ڈیل ہے جس پر میں کافی عرصے سے کام کر رہا ہوں۔ یہ میٹنگ ہماری زندگیوں کو بدل سکتی ہے۔“۔

ایمان نے پریشانی سے پوچھا، ”کب جانا ہے؟“۔

معارج نے جواب دیا، ”آج رات۔ مجھے چند گھنٹوں میں فلائٹ پکڑنی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں پہلے نہیں بتایا، میں نہیں چاہتا تھا کہ تم پریشان ہو۔“۔

ایمان کے دل میں اداسی کی ایک لہر اٹھی۔ اُس نے خاموشی سے اپنی پلیٹ کی طرف دیکھا، اُسے معارج سے دور ہونے کا خیال برداشت نہ تھا۔

اُس نے نرم مگر مضبوط لہجے میں کہا، ”تم کب واپس آؤ گے؟“۔

معارج نے محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ چند دن میں واپس آ جاؤں گا، تمہیں معلوم ہونے سے پہلے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔“۔

ایمان نے بے چینی سے کہا، ”میں تمہیں بہت یاد کروں گی، معارج۔ تم میرے لئے سب کچھ ہو۔“۔

معارج نے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا، ”میں بھی تمہیں یاد کروں گا، میری جان۔ تم میری زندگی ہو، میرے دل کی دھڑکن ہو۔ تمہیں کبھی بھی اداس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس میری خاطر مسکراتی رہنا۔۔“

ایمان نے اپنے دل کی گہرائیوں سے مسکراتے ہوئے کہا، ”میں مضبوط رہوں گی، تمہارے لیے خوش رہوں گی۔ مجھے تم پر فخر ہے، معارج۔ تم وہ سب کچھ کر رہے ہو جو ہمارے خوابوں کو حقیقت میں بدل سکتا ہے۔۔“

معارج نے اُس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، ”تم میرے لیے سب کچھ ہو، ایمان۔ تم میری طاقت ہو، میری خوشی ہو۔۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب جھک کر گہری محبت اور اداسی کے احساسات میں ڈوبے ہوئے گلے لگ گئے۔

اس لمحے میں جیسے وقت تھم سا گیا تھا، اور وہ دونوں صرف ایک دوسرے کے وجود میں موجود تھے۔

کچھ دیر بعد، ایمان نے کہا، ”چلو، تمہارا سامان پیک کر دیں۔ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں بچا۔“

معارج نے ہنستے ہوئے کہا، ”چلو، جانِ معارج۔ میرے سفر کی تیاری تمہارے ساتھ ہی مکمل ہوتی ہے۔۔“

معارض کا لباس نفاست اور دبذبے کا مرقع تھا۔ گہرے سبز رنگ کا کوٹ اور پینٹ، جس کے ساتھ سیاہ شرٹ نے اس کی شخصیت میں ایک پراسرار مگر پُرکشش جلال بھر دیا تھا۔ بالوں کو نفاست سے ایک طرف کنگھایا کیے ہوئے، اس کے چہرے پر ایک عجیب سا کرب چھپا ہوا تھا، جو اسے نہایت پُرکشش اور غمگین بناتا تھا۔

اس کے دل کی بے چینی آنکھوں میں واضح تھی، جیسے کوئی گہرا درد اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہو۔ آج کی رات سویڈن روانگی تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ واپسی کب ممکن ہوگی۔

ایمان کا وجود اُس کے سامنے ایک معصوم تصویر تھا۔ اُس نے سرخ رنگ کا فراک زیب تن کیا ہوا تھا، جس کے ساتھ ایک پتلا دوپٹہ اُس کے دائیں کندھے پر بکھرا ہوا تھا۔ بال آزادانہ اُس کے چہرے کے گرد نرم لو کی طرح بکھرے ہوئے تھے، اور وہ ہر لمحہ مزید حسین لگ رہی تھی، لیکن اُس کے اندر کا اضطراب اُس کے چہرے کے ہر نقش میں عیاں تھا۔

آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی اور ہونٹوں پر خاموشی، جیسے کسی گہرے درد کی آواز کو چھپانے کی ناکام کوشش ہو۔ وہ معارج سے بے پناہ محبت کرتی تھی، اور اُس کی جدائی کا سوچ کر اُس کا دل جیسے بند ہونے لگتا تھا۔

معارض نے چند لمحوں تک اسے دیکھا، پھر خاموشی سے اُس کے قریب آیا۔ ایمان کے ہاتھ میں اُس کا لباس پیک کرنے والا بیگ تھا، مگر معارج کی نگاہوں میں کچھ اور ہی قیامت برپا تھی۔

اُس نے نرمی سے اُس کے کندھوں کو پکڑ کر اپنے قریب کیا، جیسے اُس کے درد کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا ہو۔ اُس کے بالوں کی خوشبو اُس کے قریب آتے ہی معطر ہوا میں گھل گئی۔ اُس نے اُس کی نرم زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اُسے قریب کیا اور اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

- ”تمہارا یہ جھکا ہوا چہرہ میرے دل کو چیر دیتا ہے۔ تم اداس کیوں ہو، ایمان؟“ اُس کے الفاظ نرم اور گہرے تھے، جیسے کسی قدیم قصے کی بازگشت۔

ایمان نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں اور پھر بوجھل سانس لیتے ہوئے کہا، ”معارض، میں نہیں جانتی کہ تمہارے بغیر یہ زندگی یہ دن یہ مہینے کیسے گزرے گے، تم میری ہر خوشی ہو، میری ہر سانس ہو۔“

معارض نے محبت بھرے لمس سے اُس کے بالوں کو سہلایا، اور ایک لمحے کو رُکا جیسے اُس کے الفاظ میں چھپے درد کو سننا چاہتا ہو۔ ”اس طرح چہرہ مت لٹکاؤ، میری جان۔ تمہارے اداس ہونے سے میرا دل بھی بکھر جاتا ہے۔ مجھے ایک آخری مسکراہٹ دے کر رخصت کرو تا کہ میری روانگی ذرا آسان ہو جائے۔“

ایمان نے زبردستی مسکرا نے کی کوشش کی، لیکن اُس کی آنکھوں کی نمی اُس مسکان کو روک رہی تھی۔ اُس نے قدم بڑھا کر الماری سے دو لاکٹ نکالے۔ اُن لاکٹوں میں آدھے دل کی شکل تھی، اور جب وہ جڑتے

تھے تو مکمل دل بن جاتے تھے۔ ایمان نے ایک لاکٹ معارج کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے پاس رکھا۔
”یہ آدھا دل ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا، اور جب بھی تم اسے دیکھو گے، تمہیں میرا لمس محسوس ہو گا۔
اور جب میں اسے دیکھوں گی، مجھے تمہاری محبت کا لمس ملے گا۔“

معارج نے اُس لاکٹ کو دیکھا اور ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا۔ ”یہ صرف آدھا
دل نہیں ہے، ایمان۔ یہ تمہاری اور میری کہانی کا وہ نشان ہے جس سے ہمارا دل مکمل ہوتا ہے۔ جب ہم
دونوں ساتھ ہوتے ہیں، ہمارا دل، ہماری روح، ہمارا جسم مکمل ہوتا ہے۔“

معارج نے اُس کی آنکھوں کو باری باری چومتے ہوئے کہا، ”ہاں، ہم ایک ہیں۔ اور جب تک ہم ایک ہیں،
کچھ بھی ہمیں جدا نہیں کر سکتا۔“

معارج نے ایک لمحے کے لیے گہری سانس لی، جیسے اپنے اندر کے ہجوم کو پرسکون کرنے کی کوشش کر رہا
ہو، اور پھر دھیرے سے ایمان کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اُس کے لب ایمان کے سر پر نرمی سے ٹکے اور
اُس نے ہلکی سی سرگوشی میں کہا، ”تم میری جان ہو، بڑھلائے، میری روح کی ساتھی۔ تمہاری محبت میری
زندگی کی سب سے قیمتی چیز ہے۔“

ایمان نے جب اُس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں ایک گہری نمی کی چمک نظر آئی۔ معارج کی آنکھوں میں
چھپے آنسو جیسے اُس کے دل کی کیفیت کا پتہ دے رہے تھے، لیکن وہ اپنے آنسو چھپانے کی کوشش میں

پلکیں جھپک کر انہیں روک رہا تھا۔ وہ اُس کے سامنے کمزور نہیں ہونا چاہتا تھا؛ اُس کا ارادہ تھا کہ ایمان کے لیے مضبوط رہے۔

دونوں دیوان خانے میں آکر صوفے پر بیٹھ گئے، اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے باتیں کرنے لگے۔ ایمان نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا، ”معارض، ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ چاہے ہم جہاں بھی ہوں، تم ہمیشہ میرے دل میں رہو گے، اور میں تمہارے دل میں۔ ہمارا بندھن ایسا ہے جسے کوئی قوت نہیں توڑ سکتی۔“

ایمان چند لمحے رک کر گہری سانس لی، پھر اُس کی آواز میں ایک غیر معمولی گہرائی اُتر آئی، ”اگر کبھی مجھے کچھ ہو جائے تو تم دوبارہ شادی کر لینا۔ تمہیں ایک خوشحال زندگی گزارنی چاہیے، تم اس کے حقدار ہو۔“

یہ الفاظ معارج کے دل میں گونجتے ہی اُسے جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ اُس نے فوراً ایمان کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا، جیسے اُس کے ہر خیال کو روکنا چاہتا ہو۔ ”ایمان، تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں نہ جاؤں؟ بس صاف الفاظ میں کہہ دو، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تمہارے بغیر میری کوئی دنیا نہیں۔ میٹنگ بھی اہم نہیں ہے، سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں، مگر تمہیں نہیں۔“

ایمان کی آنکھوں میں ایک کمزور سی مسکراہٹ ابھری، اور اُس نے دھیرے سے کہا، ”نہیں معارج، تمہیں جانا ہو گا۔ یہ تمہارے لیے ضروری ہے، ہمارے لیے ضروری ہے۔ میں نے یہ بات بس اس لیے کہی تھی کہ یہ میرے دل میں تھی۔ میں تم سے بے حد محبت کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ تم ہمیشہ خوش رہو، چاہے میں یہاں نہ بھی ہوں۔“

معارض نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، ”تم کیوں ایسی باتیں کرتی ہو، جو میرا دل چیر دیتی ہیں؟ کیوں سوچتی ہو کہ تم یہاں نہیں رہو گی؟ تم میری زندگی کی دھڑکن ہو، اور اگر دھڑکن نہ ہو تو کیا زندگی باقی رہتی ہے؟ میں تمہارے بغیر کبھی زندہ نہیں رہ سکتا، تم میری ہر خوشی ہو۔“

ایمان نے نرمی سے اُس کی بات سنی، اُس کی آنکھوں میں جھلملاتی نمی کے پیچھے ایک عجیب سا سکوت تھا۔ وہ اُٹھ کر معارج کا ہاتھ پکڑتی ہوئی دروازے کی طرف لے گئی۔ ”آؤ، میں تمہیں دروازے تک چھوڑ دوں۔ تمہاری سواری انتظار کر رہی ہو گی۔“ اُس نے دروازہ کھولا تو باہر ایئر پورٹ کی گاڑی کھڑی تھی، جیسے وقت اُسے کھینچتا جا رہا ہو۔

معارض نے ایک گہرا سانس لیا، اور جب اُس کی نگاہ ایمان پر پڑی تو دل میں ایک عجیب سا خوف جاگ اُٹھا۔ اُسے لگا جیسے یہ آخری لمحہ ہے جب وہ ایمان کو دیکھ رہا ہے۔ ایمان نے زبردستی مسکرا کر ہاتھ ہلایا، لیکن اُس کی آنکھوں میں چھپی بے چینی صاف عیاں تھی۔

معارض نے اچانک قدم بڑھایا، گاڑی کا دروازہ بند کیا اور ایمان کے پاس واپس آ کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”ایمان، میں نہیں جانا چاہتا۔ مجھے تمہارے پاس ہی رہنا ہے۔“ اُس کے لبوں پر لرزش تھی۔

ایمان نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر دھیرے سے کہا، ”رونامت، معارج۔ مثبت سوچو، سب کچھ ٹھیک ہو گا۔ تم جلد واپس آ جاؤ گے اور میں تمہاری راہ دیکھوں گی، دعا کروں گی کہ اللہ تمہیں محفوظ رکھے۔“

معارج نے ایمان کا ہاتھ اپنے لبوں تک لا کر چوم لیا۔ ”میں تم سے محبت کرتا ہوں، ایمان۔ تم میری دنیا ہو، میری ہر چیز ہو۔ اپنا خیال رکھنا۔“

ایمان نے سر جھکا کر کہا، ”میں بھی تم سے بے پناہ محبت کرتی ہوں، معارج۔ اور میں ہمیشہ تمہارے لیے دعا گو ہوں گی۔“

دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا، اور پھر ایک آخری الوداع کے ساتھ معارج گاڑی میں جا بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور دھیرے دھیرے آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ ایمان دروازے پر کھڑی رہی، اُس کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی اور دل میں ایک بھاری بوجھ اُتر رہا تھا۔ اُس کے لبوں پر سرگوشی آئی، ”اللہ، اُس کی حفاظت کرنا۔“

اُس کا دل جیسے بوجھل ہو رہا تھا، اور ایک آنسو اُس کے گال پر آہستہ سے بہہ نکلا۔ ”یارب، اُسے میرے پاس سلامت واپس لے آنا، میری زندگی کی ہر امید اُس سے وابستہ ہے۔“

معارض سویڈن کی تخت بستہ ہواؤں میں قدم رکھ چکا تھا، جیسے ہی ہوائی جہاز کے فولادی پیروں نے زمین کو چھوا، اس کا ذہن کسی ایک ہی مقصد کی طرف مرکوز ہو چکا تھا: ایلومیناتی کی نابودی۔ اسٹاک ہوم کے نواح میں ایک مخفی زیر زمین بنکر کا سراغ لگانا اس کی اولین ترجیح تھی، جو اس خفیہ تنظیم کا ایک اور ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس کے ہاتھوں میں وہ کوڈ آچکے تھے جنہیں ہیک کر کے وہ ان کے سیکورٹی نظام میں داخل ہو چکا تھا۔

خود کار ہتھیار، چمکتے اسٹیل کا چاقو اور ایک پراسرار ریموٹ اس کے ساتھ تھا۔ ایک مہلک آلہ، جس کے ذریعے وہ ان رہنماؤں کے جسموں میں نصب چپ کو فعال کر سکتا تھا۔

یہ چپ ان کے اعصاب کو پگھلا سکتی تھی، ان کو اذیت ناک موت کی دہلیز تک پہنچا سکتی تھی۔

یہ چپ اس وقت ان کے جسم میں داخل کی گئی تھی جب معارج نے ایلومیناتی کے دل میں قدم رکھا تھا، ان کے رازوں میں گہرائی تک اتر اٹھا، اور پھر انہیں دھوکہ دے کر نکل گیا تھا۔

اس کے اپنے جسم میں بھی ایک چپ نصب تھی۔ ایک آخری بندوبست، جو اس کی موت کی صورت میں خود کار طور پر ایلومیناتی کے رہنماؤں کو تباہ کرنے والا حکم ان کی چپ کو بھیجے گی۔ یعنی معارج کا خون گرنے کی دیر تھی کہ ان کا خاتمہ طے تھا۔

جیسے ہی وہ بنکر میں داخل ہوا، ہر طرف جال بچھے ہوئے تھے، محافظوں کی کڑی نظر ہر لمحے اس کے پیچھے تھی، مگر معارج کی چال میں ایسی خاموش مہارت تھی کہ وہ ان تمام رکاوٹوں سے ایک سبک رفتار شکاری کی طرح نکلتا چلا گیا۔

ہال کے دروازے کے پار، تخت نشین تین شخصیتیں اس کی منتظر تھیں۔ ایلو میناتی کے بے رحم رہنما، وہ ہی جنہوں نے اس کی زندگی کو برباد کرنے کا فیصلہ سنایا تھا، جنہوں نے اس کی بیوی پر وار کیا تھا۔

معارض جیسے ہی ان کے سامنے پہنچا، اس کا چہرہ تخی بستہ برف کی مانند سرد اور پتھریلا تھا، جڑے میں غضب کی قوت تھی، اور اس کی آنکھیں آگ برساتی شعلوں کی مانند دکھ رہی تھیں۔

وہ ایک لمحے کو رکا، پھر دھیرے سے، مگر اتنی گہری سردی اور شدید غصے میں بولا کہ ان کے جسم سنسنا اٹھے

”تمہاری عداوت مجھ تک محدود تھی، میری بیوی کو نشانہ بنانے کی جسارت کیوں کی؟“

اس کی آوازیوں گونجی جیسے صدیوں کی صدیوں تک گونجتی رہنے والی صدائے انتقام ہو، اور ان تینوں کی آنکھوں میں موت کی دھند لکیاں تیرنے لگیں۔

درمیان میں بیٹھا ہوا شخص، جو ایلو میناتی کا سب سے بلند مقام کا حامل تھا، سرد لہجے میں گویا ہوا

۔ ”وہ عورت جس نے دوبار مختلف مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات کے بعد اپنے حمل کو گروادیا، وہ جو نہ

صرف کسی اور دغا باز ہے بلکہ بدکردار اور خبیث بھی، اور سب سے بڑھ کر ایک فاجرہ، رسوا عورت۔ تم

اس ذلیل اور گھٹیا وجود کے لیے ہم سے مقابلہ کرنے آئے ہو؟“۔

معارض کا خون کھولنے لگا۔ اس نے بے قابو ہو کر ایک ہاتھ فضا میں بلند کیا اور انگلی سے اس کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے غرایا۔

۔ ”زبان سنبھال! اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے،، اگر تُو نے میری بیوی کے بارے میں ایک اور لفظ بھی بک دیا تو، تو اپنی پیدائش کو کو سے گا۔ رحم کی بھیک مانگے گا مگر ہر سانس تجھے موت کی اذیت سے آشنا کرے گی۔ تُو جان لے، میں تجھے ایسی ہلاکت دوں گا کہ قبر بھی تجھے قبول کرنے سے انکار کر دے گی۔“

معارج کی آنکھوں میں سر دانتقام کی چمک تھی، اس کی آواز گونج رہی تھی، ”تم سمجھتے ہو میں بدل گیا ہوں؟ نہیں، میں وہ ہی ہوں جو ہمیشہ سے تھا۔ شیر اپنی فطرت کبھی نہیں بھولتا، اور اگر سوئے ہوئے شیر کو جگایا جائے تو وہ دو گنا خطرناک بن جاتا ہے۔ میں گونا گوں ہوں، اور میری دھاڑ اب بھی وہ ہی ہے جو پہلے تھی۔“

اس نے اپنی جیب سے ریموٹ نکالا اور ان کے سامنے لہرایا۔ ”یہ تم میں موجود چپ کو فعال کر سکتا ہے۔ ایک ایسی چپ جو تمہیں لمحوں میں موت کے حوالے کر دے گی، اور اس کی سب سے بھیانک بات؟ یہ تمہاری آئندہ نسلوں تک منتقل ہوگی، تمہارے آنے والے بچے اسی لعنت کا شکار ہوں گے۔ اور اگر تم نے مجھے مارا، تو میرے جسم میں موجود چپ ایک سنگل بھیجے گی جو تم سب کو فنا کے گھاٹ اتار دے گی۔ یہ ریموٹ محض ایک آلہ نہیں، بلکہ ایک پورے نظام کا حصہ ہے جس پر میری کڑی نگرانی ہے۔ میرے لوگ ہر طرف موجود ہیں، ایک غلطی اور تمہارا وجود ختم ہو جائے گا۔“

ایلو میناتی کے رہنما نے طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا ”تم ڈرا نہیں سکتے، تم میں یہ کرنے کی ہمت نہیں۔ تم محض ایک مہرہ ہو، ایک کٹھ پتلی، اور ہم ایلو میناتی ہیں، دنیا کے مالک۔ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں، تمہیں تکلیف پہنچا سکتے ہیں، تمہاری بیوی کو روند سکتے ہیں۔“

معارض کی آنکھیں مزید سرخ ہو گئیں، اس کے لب زہر آلود الفاظ سے بھرے ہوئے تھے ”تم خوش فہمی میں مبتلا ہو، تمہیں اپنی طاقت کا دھوکا ہے، مگر حقیقت میں تمہارے پاس کچھ بھی نہیں۔ تم صرف خوف کی کٹھ پتلیاں ہو، تمہارے پاس صرف جھوٹ اور فریب ہے۔ تم اندھیرے کے غلام ہو، انسانیت اور خدا کے دشمن ہو۔ اور میں تمہارے سامنے جھکنے والا نہیں۔ میں معارج ہوں، اور میرے اندر معارج کی قوت ہے۔ میں گونار ہوں، اور میرے دل میں شیر کی دھاڑ ہے۔“

ان تین ہیولوں میں سے ایک ہیولے نے دھیمی آواز میں کہا، ”ہمارے بارے میں کسی کو مت بتانا۔“

معارض نے ایک نظر بھر کے اُس پر دیکھا، پھر اپنی مخصوص سرد مسکراہٹ کے ساتھ بولا، ”تمہاری حقیقت چھپانا اب ممکن نہیں رہا۔ سب جانتے ہیں تم کون ہو، میں بس تمہارے کالے کرتوتوں کا پردہ چاک کرنے آیا ہوں۔“

مرد نے طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”یہ سب تم اُس عورت کے لیے کر رہے ہو؟“

معارج نے اپنے سر کو دھیرے سے جھٹکا دیا، جیسے اُس کی بات کو حقیر سمجھ رہا ہو۔ ”نہیں، یہ میں اُس کے مستقبل کے لیے کر رہا ہوں۔ تم جیسے لوگ جو عورتوں کو محض ایک کھلونا سمجھتے ہیں، انہیں سبق سکھانا ضروری ہے۔ میری بیوی پر انگلی اٹھانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ وہ ان عورتوں میں سے ہے جن کے دامن پر کبھی کوئی دھبہ نہیں آیا۔ تمہاری دنیا نے اُس کے ساتھ ظلم کیا ہے، مگر وہ اس سب سے بلند ہے۔“

معارج کی نظریں ایک گہری سردی لیے اُس مرد پر جم گئیں۔ اُس کے لبوں پر ہلکی سی مگر زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا، مگر لہجے میں تلخی کی چھری چمک رہی تھی۔

۔ ”ویسے، تمہارے نزدیک ایک عورت کے کئی جنسی تعلقات ہونا وومن ایمپاورمنٹ ہے، ہیں نا؟“ معارج نے سوال کیا، مگر اُس کی آنکھوں میں ملامت کی گہری چمک تھی۔

۔ ”تم لوگ دوہرے معیار کے پتلے ہو۔ جب عورت تمہارے فائدے کے لیے اپنے اصول توڑے، تو وہ آزاد خیال ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے وجود اور عزت کے لیے لڑے، تب تمہیں اُس میں خرابی نظر آتی ہے۔ میری بیوی تمہارے بنائے اصولوں کے دائرے میں نہیں آتی۔ نہ تمہاری جھوٹی آزادی کی علامت ہے اور نہ تمہاری خود ساختہ اخلاقیات کی قیدی۔ وہ تم جیسے درندوں کی نظروں سے بلند ہے۔“

معارض کے چہرے پر ایک پرسکون مگر سنگین تاثر چھایا ہوا تھا۔ ”تم جس ’آزادی‘ کا پرچار کرتے ہو، وہ محض ایک دھوکہ ہے، ایک جال ہے جو تم نے اپنے مفاد کے لیے بنا ہے۔ لیکن یاد رکھو، تمہارے یہ جھوٹ زیادہ دیر قائم نہیں رہیں گے۔“

وہ مرد جو خاموشی سے معارج کو سن رہا تھا ہنسا، جیسے اُس کی بات کا کوئی وزن ہی نہ ہو۔۔۔ ”عورت؟ ہمارے لیے یہ دنیا ایک جنگل ہے، گوناوار۔ اور باقی انسان محض ذہین درندے۔ درندوں کو نہ کسی رشتے کی پرواہ ہوتی ہے، نہ عزت کی۔ وہ صرف اپنی خواہشات کا شکار کرتے ہیں۔ عورت ہو یا مرد، سب ہماری خواہشوں کے تابع ہیں۔“

معارض کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی، اور اب اُس کے چہرے پر ایک مہیب سکون طاری تھا۔ اُس نے مرد کی طرف قدم بڑھایا اور اپنی انگلی اُس کی جانب تنبیہاً اٹھائی۔ ”میری بیوی سے دور رہو۔ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔ میرے اندر کا درندہ بیدار ہو گیا، تو میں وہ تباہی لاؤں گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے گوناوار بننے میں ایک لمحہ نہیں لگے گا۔“

معارض کی بات ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ اُس نے ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔ اچانک ایک دھماکے کی گونج کمرے میں سنائی دی۔ عمارت لرزنے لگی، دیواروں سے گرد جھڑنے لگی، اور روشنیاں بے ترتیب جھپکنے لگیں۔ ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ معارج نے دھیرے سے مسکرا کر کہا، ”یہ محض ایک ابتدائی انتباہ ہے۔ اس عمارت

میں اور ڈینور ایئرپورٹ پر ہر جگہ بم نصب ہیں۔ اگر تم نے میری بیوی کو ہاتھ بھی لگایا، تو میں تمہاری نسلوں کا نام و نشان مٹا دوں گا۔”

کمرے میں موجود افراد نے گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر خوف کی چھاپ واضح تھی۔

وہ جان چکے تھے کہ معارج مذاق نہیں کر رہا تھا۔ اُس کے الفاظ میں ایک ایسی سنجیدگی اور طاقت تھی، جو انہیں ہلا کر رکھ چکی تھی۔ ایک شخص نے ہچکچاتے ہوئے کہا، ”ٹھیک ہے، تم جیت گئے۔ ہم تمہیں اور تمہاری بیوی کو جانے دیں گے۔ لیکن تمہیں ہم سے وعدہ کرنا ہو گا کہ ہمارے وجود کا راز دنیا کے سامنے ظاہر نہیں کرو گے۔“

معارج کی آنکھوں میں ہلکی سی نفرت اور تمسخر ابھرا۔ اُس کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نے جگہ بنائی۔ ”تمہارا راز؟ تمہاری حقیقت تو پہلے ہی سب پر عیاں ہو چکی ہے۔ تم نے اپنی کہانی خود ’ڈاکٹر اسٹریٹج‘ کی فلم میں دکھا دی ہے۔ دنیا جانتی ہے تم کیا ہو اور کیا کر سکتے ہو۔ اب تمہاری حقیقت چھپانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں۔“

معارض نے ایک لمحے کے لیے خاموشی اختیار کی، پھر ریموٹ کو گھماتے ہوئے بولا، ”اور خبردار، میری بیوی سے دور رہنا۔ ورنہ یہ ریموٹ تمہاری ہڈیوں کو چور کر دے گا اور تمہارے وجود کو دھوئیں میں اڑا دے گا۔“

یہ کہہ کر معارج نے بے نیازی سے پلٹ کر دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ اُس کے قدموں کی چاپ کمرے میں گونج رہی تھی، جیسے کسی فیصلے کی گھنٹی بج رہی ہو۔

جیسے ہی معارج دروازے سے باہر نکلا، کمرے میں موجود ایک آدمی نے تھکے ہوئے انداز میں گہرا سانس لیا اور دانت پیستے ہوئے بولا، ”میرب مونیز کے جرائم — عورتوں کی اسمگلنگ، منشیات کی فروخت، بچوں کا استحصال — سب کے مقدمات اُس پر ڈال دو۔ پولیس کو اطلاع دو کہ اُسے گرفتار کریں، لیکن قتل نہ کریں۔ اُس کی بیوی؟ اُسے چھوڑ دو، وہ اب ہمارے کسی کام کی نہیں رہی۔“

کمرے میں ایک لمحے کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ سب جان چکے تھے کہ انہوں نے معارج سے ٹکڑے لے کر اپنی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔

...°...

دودن بعد، ایمان نے خود کو اسلام آباد کے ایک نجی اسپتال کے نیم تاریک کمرے میں پایا۔ دیواروں پر دھندلا سا سفید رنگ تھا جو وقت کی تھکن اور ویرانی کا پتہ دیتا تھا، اور واحد کھڑکی پر بھاری پردہ لٹک رہا تھا،

جو باہر کی روشنی کو اندر آنے سے روکے ہوئے تھا۔ ایمان نے گہرا چاکلیٹ براؤن عبایا اوڑھ رکھا تھا، جس کا رنگ اُس کی زرد پڑتی ہوئی جلد سے تضاد پیدا کر رہا تھا۔ نقاب اُس کے چہرے سے سرکا ہوا تھا، لیکن اُس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو کوئی چیز چھپا نہیں پارہی تھی۔

وہ اپنے وجود میں خالی پن اور ایک بے حسی کا احساس لے کر بیٹھی تھی، جیسے دل سے کوئی رشتہ باقی نہ رہا ہو۔

ڈاکٹر، جو خود بھی حجاب میں ملبوس اور ایک مشفق چہرے والی ادھیڑ عمر کی خاتون تھیں، کچھ رپورٹس ہاتھ میں لیے اُس کے قریب آئیں اور کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اُن کے چہرے پر ہمدردی بھری سنجیدگی تھی، لیکن زبان سے نکلنے والے الفاظ دل چیر دینے والے تھے۔ ”ایمان، مجھے افسوس ہے کہ تمہارے لیے یہ بات آسان نہیں ہوگی، لیکن تم اب کبھی ماں نہیں بن سکوگی۔“

یہ جملہ گویا ہوا میں منجمد ہو گیا۔ ڈاکٹر نے چند لمحے توقف کیا، جیسے اُسے حقیقت قبول کرنے کا موقع دے رہی ہو۔ پھر آہستہ اور محتاط لہجے میں بولی

۔ ”کیا ماضی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا تھا؟ کوئی حادثہ یا ناپسندیدہ جراحی عمل؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سرجری کے دوران تمہارے تولیدی نظام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا گیا ہے۔“

رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہاری رحم گاہ نکال دی گئی ہے، اور اب تمہارا ماں بننا ممکن نہیں رہا۔ گویا تمہیں دانستہ طور پر بانجھ کر دیا گیا ہے۔“

ڈاکٹر کے الفاظ ایمان کے دل پر پتھر کی طرح گرے۔ ماضی کی وحشتیں اُس پر یلغار کرنے لگیں۔ اور راز کھلنے لگے وہ لمحے، جب میکائیل کی درندگی نے اُسے روند ڈالا تھا؛ جب اُس کے پیٹ میں خنجر پیوست کیا گیا تھا؛ جب نورالعین نے اُس کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بہانے اُس کی زندگی کے سب خواب چھین لیے تھے۔ اُس کی زرخیزی چھین کر اُسے بانجھ کر دیا گیا تھا۔

ایمان کا دل جیسے ضبط کی آخری حدوں کو چھونے لگا۔ اُس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے، مگر اُس نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر آنے نہ دیا۔ اُس نے ہونٹ بھیج کر خود کو مضبوط ظاہر کیا اور خاموشی سے سر ہلا دیا، گویا سب کچھ قبول کر چکی ہو۔ وہ ڈاکٹر کی کسی ہمدردی کی محتاج نہیں تھی، نہ ہی کسی کے ترس کی طلبگار۔ ڈاکٹر نے نرمی سے کہا: ”ایمان، تم اکیلی نہیں ہو۔ بہت سے لوگ خاندان کے خواب کو اپنانے کے لیے گود لینے کا راستہ چنتے ہیں۔“

مگر ایمان نے اُس کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔ اُس کا دماغ ماضی کے زخموں میں الجھا ہوا تھا۔ نورالعین کی وہ شبیہ اُس کے ذہن میں نمایاں تھی، جس نے اُس کی زندگی اجاڑ دی تھی۔ اُس کی مٹھیاں بھیج گئیں، اور اُس نے ضبط کے مارے نیچے کا ہونٹ کاٹ لیا۔

وہ اپنی نشست سے اٹھی، نقاب دوبارہ چہرے پر درست کیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ڈاکٹر نے اُسے روکنے کی کوشش کی، مگر اُس نے کسی کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

وہ نکل کر راہداری میں آئی، ارد گرد کے مریض اور نرسیں اُس کے غصے اور تیز رفتاری سے ایک طرف ہٹ گئے۔ اُسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

اسی اثنا میں، دو افراد چپکے سے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ چہرے پر سختی اور آنکھوں میں خاموشی کی چمک، جو صاف ظاہر کر رہی تھی کہ یہ معارج کے آدمی تھے۔ ان کے قدموں کی آہٹ دبیز خاموشی میں مدھم سی گونج بن کر رہ گئی۔

مگر ایمان کے لیے یہ سب بے معنی تھا۔ نہ اس نے پلٹ کر دیکھا، نہ کسی کا وجود محسوس کیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بس ایک ہی راستہ تھا، جو اسے باہر لے جا رہا تھا۔ وہ بغیر رکے، خاموشی سے، گویا کسی خواب کی کیفیت میں دروازے کی طرف بڑھتی رہی۔ اس کے قدم بھاری تھے مگر ارادے فولاد کی مانند۔ ہر لمحہ جیسے فضا میں کوئی انجانا خوف پھیلتا جا رہا تھا، مگر ایمان کے چہرے پر ایک عجیب بے حسی چھائی رہی۔ گویا دنیا کا شور اور ہلچل اس کے وجود سے ٹکرا کر بیکار ہو جاتی ہو۔

وہ دروازے سے نکل گئی، ایک لمحے کے لیے بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اُس نے قدم تیزی سے بڑھائے، ہسپتال کی پارکنگ میں پہنچی اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اور آنکھوں کی سرخی اُس کے اندر کی آگ کا پتہ دے رہی تھی۔ اُس نے اسٹیئرنگ وہیل پر زور سے مَکامارا اور دانت پیس کر سرگوشی کی، ”نورالعیین... یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ تم نے میری دنیا اجاڑ دی، میری گود اُجاڑ دی۔ میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔“

اُس نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا، اور ایک جنون کی کیفیت میں اُس کا پیر ایکسلریٹر پر جا پڑا۔ بدلے کی آگ اُس کے سینے میں دھک رہی تھی، اور اب اُس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا... نورالعیین کو برباد کرنا۔

...°...

اسپتال کی سرد اور خاموش راہداری میں ولید اور فرخ کا اچانک سامنا ہوا۔

ولید کے چہرے پر گھبراہٹ اور اضطراب کے آثار نمایاں تھے، جیسے کوئی بڑا راز سینے میں دبائے کھڑا ہو۔ اس نے فوراً ادب سے سر جھکایا اور کہا، ”السلام علیکم، فرخ بھائی۔“

فرخ، نورالعیین کا رفیق حیات تھا اور ولید، نورالعیین کی بہن مریم کا شریکِ زندگی۔

فرخ کی آنکھوں میں بے چینی کی ایک لہر اٹھی، اس نے قدرے حیرانی سے پوچھا، ”مریم کہاں ہے؟“

ولید کی نظریں زمین پر گر گئیں، جیسے وہ کسی مشکل بات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہو۔ بالآخر اس نے مدھم آواز میں کہا، ”نورالعیین باجی... وہ مریم کو اسقاط حمل کے لیے لے گئی ہیں۔“

فرخ کے چہرے پر اچانک سختی چھا گئی، اس کی آنکھوں میں شک کی چنگاریاں نظر آنے لگیں۔ ”کیا کہا تم نے؟“ اس کی آواز میں غصہ اور حیرت کی گونج تھی۔ ”اور تم نے ایسا ہونے دیا؟“۔

ولید نے بے بسی سے کندھے جھکا کر جواب دیا، ”فرخ بھائی، نور العین باجی کا کہنا تھا کہ بچہ ابنار مل ہے اور اسقاط حمل ضروری ہے۔“۔

یہ سنتے ہی فرخ کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے رک گیا۔

اس نے شدید اضطراب کے عالم میں اپنی نظریں ولید پر گاڑ دیں، پھر فوراً ایک گزرنے والی نرس کو اشارے سے روکا۔ اس کے لہجے میں حکم تھا،

”کیا تم نے مریم کے ٹیسٹ کیے تھے؟۔ بتاؤ کیا واقعی بچہ ابنار مل ہے؟“

نرس نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں اور فوراً کہا، ”نہیں، ڈاکٹر صاحب، بچہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے رپورٹس اور الٹرا ساؤنڈ خود چیک کیا ہے۔ سب کچھ بالکل نارمل ہے۔ یہ سوال آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“۔

یہ سن کر ولید کا رنگ پھیکا پڑ گیا، جیسے زمین اس کے قدموں تلے سرک گئی ہو۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں فرخ کی طرف دیکھا، اور فرخ کے چہرے پر غصے اور بے چینی کا ایک نیارنگ چڑھتا چلا گیا۔ وہ نرس کی طرف مڑا اور سخت لہجے میں بولا، ”نور العین کہاں ہے؟“۔

نرس نے ہچکچاتے ہوئے کہا، ”ڈاکٹر صاحب، وہ اپنی بہن کے ساتھ ابھی کچھ دیر پہلے گھر چلی گئی ہیں۔“

فرخ نے ایک لمحے کے لیے گہری سانس لی، پھر ولید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”چلو، گاڑی میں بیٹھو۔ ہمیں فوراً وہاں پہنچنا ہو گا۔“

ولید نے خاموشی سے سر ہلایا اور فرخ کے پیچھے چل پڑا۔ دونوں کے قدموں کی آواز اسپتال کی سنسان راہداری میں گونجتی رہی، جیسے کسی طوفان کا پیش خیمہ ہو۔

نور العین کی سرد اور مکروہ مسکراہٹ اس کی بے رحم فطرت کی غمازی کر رہی تھی جب وہ اپنی معصوم بہن مریم کو ایک خفیہ تہہ خانے میں لے آئی، جہاں خاموشی اور دہشت کا سایہ حاوی تھا۔

مریم کی سادہ اور بے گناہ آنکھوں میں بے یقینی جھلک رہی تھی، وہ خوف سے لرزتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ آخر کار، کانپتے لبوں سے مدھم آواز میں بولی، ”یہ کون سی جگہ ہے، آپ؟“

نور العین کی آنکھوں میں شیطانیت کی چمک اُبھری اور اس کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ رقص کرنے لگی، ”یہ وہ مقام ہے جہاں تم جیسی معصوم روحوں کو حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، میری پیاری غلاب کی پنکھڑی۔“

نور العین نے مریم کو ایک سادہ سے بستر کی طرف اشارہ کیا اور نرمی سے حکم دیا، ”چلو، یہاں لیٹ جاؤ۔“

-

مریم، بھولی اور عاجز، جیسے کسی برے خواب میں ہو، نور العین کی بات مان کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس بلا کے سامنے ہے۔ نور العین نے شیطانیت بھری اطمینان کے ساتھ ایک سرنج اور شیشی اٹھائی، جس میں موت کا پیام چھپا تھا۔

جب نور العین قریب آئی تو مریم نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ آنکھوں میں آنسو اور دل میں امید کی کرن لیے بولی، ”آپی، پلیز، مجھے یہ مت کرنے دیں! اگر میرا بچہ ابنا رمل ہے تو بھی، وہ اللہ کا عطیہ ہے۔ میں اس سے محبت کروں گی، اسے پال لوں گی۔ میں یہ نہیں کر سکتی میں ولید کو منالوں گی۔“

نور العین کی آنکھوں میں بغاوت کی چمک مزید گہری ہو گئی۔ اس نے سرد مہری سے مریم کے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور مدھم، مگر زہر آلود لہجے میں کہا، ”تم جانتی ہو نا کہ اللہ نے مجھے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا ہے؟ مجھے ان تمام عورتوں سے نفرت ہے جو ماں بننے کا خواب دیکھتی ہیں۔ مجھے ان کی مسکراہٹوں، ان کی خوشیوں، اور ان کے ان بچوں سے گھن آتی ہے جو ابھی اس دنیا میں آئے بھی نہیں۔“

اس کی سانسیں بھاری ہونے لگیں، جیسے کسی پوشیدہ زخم کی تلخی اسے اندر ہی اندر کھا رہی ہو۔۔۔“ میں اُن عورتوں کو بانجھ کر دیتی ہوں جو ماں بننے والی ہوتی ہیں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ اگر میں ماں نہیں بن سکتی، تو کوئی اور بھی نہیں بنے گی۔۔۔“

اس کے لبوں پر سفاکانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور اس نے تیز دقت سے سرنج کو مریم کے بازو میں داخل کیا۔ مریم نے خوف و بے بسی میں چیخنے کی کوشش کی، لیکن نور العین کے سفاک ہاتھوں کی گرفت مضبوط تھی۔

مریم کی آنکھوں میں دھندلاہٹ چھا گئی، اور وہ آخری لمحے میں اپنی بہن کو اس ناقابلِ یقین ظلم کی مرتکب دیکھتی رہی۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ کمزور ہوتا گیا اور پھر خاموشی سے اندھیرے میں ڈوب گیا۔

تہہ خانے کی فضا میں موت کا سایہ گہرا ہو چکا تھا، اور نور العین ایک سفاک درندے کی مانند کھڑی تھی، جس کی آنکھوں میں بے رحم سکون اور دل میں زہر بھرے ارادے پروان چڑھ رہے تھے۔

چند لمحوں کے بعد، فرخ اور ولید جلدی میں گھر پہنچے، مگر تب تک وہ کہانی ایک بھیانک انجام کو پہنچ چکی تھی۔

فرخ کی مٹھیوں سے دروازے پر زور و شور سے دستکوں کی گونج جیسے پورے گھر میں گونجتی جا رہی تھی، اس کی دھاڑیں بھی بلند ہو رہی تھیں، ”دروازہ کھولو، نور العین!“۔

ولید بھی شدت سے پکار رہا تھا، ”مریم! مریم کہاں ہو؟“ فضا میں پولیس کے سائرن گونج رہے تھے، مگر گھر کے اندر موت جیسی خاموشی تھی۔

کشادہ گھر کے چاروں طرف بلند دیواریں اور سامنے ایک وسیع باغ تھا، جو کسی بھی جانکاری کا پتہ نہ دے رہا تھا۔

فرخ نے فوراً چاروں طرف نظر دوڑائی تو اسے گھر کے دائیں سرے پر نیچے کی جانب دھنسا ہوا تہہ خانے کا دروازہ نظر آیا۔ ”یہاں تہہ خانہ ہے!“ فرخ نے ولید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم فوراً وہاں جاؤ!“۔

ولید فوراً تہہ خانے کی طرف لپکا، دروازہ کھولا تو اس کے سامنے جو منظر تھا وہ خون میں لپٹی حقیقت بن چکا تھا۔ اس کی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں جب اس کی نگاہ مریم پر پڑی، جو بے حس و حرکت، بستر پر پڑی تھی، اس کا چہرہ زرد، اور جسم بے جان دکھائی دے رہا تھا۔

ولید کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو چکی تھیں، آنکھوں کے سامنے سب کچھ دھندلا سا ہو رہا تھا۔

کمرے کے ایک گوشے میں، نور العین سکون سے بیسن میں اپنے خون آلود ہاتھ دھورہی تھی۔ نل سے بہتا شفاف پانی، خون کے قطرے بہا کر زمین پر گر رہا تھا۔

وہ ایسے کھڑی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، اور پھر وہ سفاکانہ بے نیازی کے ساتھ سر اٹھا کر ولید کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔ ”اس کا اسقاطِ حمل ہو چکا ہے، ولید۔ اب یہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ یہ ہمیشہ کے لیے بانجھ ہو چکی ہے۔“ اس کی آواز میں سردی اور بے رحمی کی ایسی گہرائی تھی کہ کمرے کی فضاء مزید بھیانک ہو گئی۔

ولید کے وجود میں ایک طوفان برپا ہو چکا تھا، غصے اور بے بسی نے اسے جکڑ لیا تھا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے نور العین کی طرف بڑھتے ہوئے، تعیش میں اس کا گلا پکڑ لیا اور چیخا، ”تم نے کیا کیا، سفاک عورت! تم عفریت ہو!“۔

نور العین کی سانس گھٹنے لگی، اس کی آواز دم گھونٹنے کی کیفیت میں پھنسی ہوئی نکلی، ”تم نے ہی کہا تھا کہ اسقاطِ حمل کرو اس کا! میں نے کچھ نہیں کیا، تم نے ہی میری بہن کو مجبور کیا تھا!“ اس کی آواز میں بے رحمی اور الزام کی سرگوشی شامل تھی، جیسے ولید کی روح کو بھی زخمی کر رہی ہو۔

اس نے کھانستے ہوئے ایک گہری سانس لی، پھر اچانک ایک شدید حرکت کرتے ہوئے ولید کے پیٹ میں لات ماری اور خود کو آزاد کر لیا۔

نور العین، آزادی پاتے ہی دروازے کی طرف لپکی۔ ولید نے اسے روکنے کی کوشش کی، مگر پیچھے سے مریم کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً مڑ کر مریم کے پاس پہنچا، اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولا، ”مریم، میں یہاں ہوں، مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔“ اس کی سرگوشی میں پشیمانی اور بے بسی کی انتہا تھی۔۔

دریں اثنا، نور العین نے دروازہ کھولا اور باہر کا منظر دیکھا۔ پولیس کی گاڑیاں اور فرخ انتظار میں تھے، مگر وہ خاموشی سے ایک درخت کی آڑ میں چھپ گئی۔

وہ جھک کر احتیاط سے سامنے دیکھ رہی تھی، اور پولیس کی موجودگی کے باوجود، ان کی نظروں سے اوچھل تھی، جیسے شیطانی قوتوں نے اسے ڈھک لیا ہو۔۔

فرخ کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے کہیں اور مرکوز تھیں، لیکن پھر اچانک اس کی نظر دائیں طرف گھوم گئی، اور اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تناؤ پھیل گیا۔ سامنے وہ چہرہ تھا، جسے وہ پہچانتا تھا—نور العین! وہ ہی عورت، جو اس کی بیوی تھی اور جس نے متعدد عورتوں کی زندگیاں برباد کی تھیں، جن میں مریم بھی شامل تھی۔

فرخ کی آنکھوں میں نفرت اور حیرانی کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے بلند آواز میں کہا، ”نور العین، بھاگنے کی کوشش نہ کرو، تم اب بچ نہیں سکتی!“۔

نور العین کا جسم ایک لمحے کے لیے ساکت ہوا، لیکن پھر اچانک جیسے اس میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے بھاگی، جیسے کہ موت کے سائے اس کے پیچھے ہوں۔

پولیس نے اپنی بندوقیں نکال کر اسے نشانہ بنایا اور سخت لہجے میں خبردار کیا، ”وہیں رک جاؤ، ورنہ گولی مار دی جائے گی!“۔

لیکن نور العین کو کسی کی پرواہ نہ تھی۔ اس کے قدم تیز تر ہوتے گئے، جیسے اسے کوئی پرچھائیں پچھاڑنے کو تیار ہو۔ وہ دیوانہ وار ایک فرار کی تلاش میں سڑک کی طرف دوڑی، اپنی زندگی کو دوبارہ شروع کرنے کی خواہش لیے، حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے اپنی بہن کی زندگی کو ناقابل واپسی نقصان پہنچایا تھا۔ اس کے سینے میں دل کی دھڑکنیں جیسے طوفانی لہریں بن گئی تھیں۔

نور العین نے سڑک پر دوڑتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا تو فرخ اور پولیس اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ فرخ کی آنکھوں میں ابھی بھی محبت کی پرچھائیں تھیں، حالانکہ نور العین کے گناہوں کا بوجھ ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ فرخ کی آواز میں ایک التجا تھی، ”رک جاؤ نور العین، میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں!“۔

لیکن نور العین کے دل میں فرخ کے لیے اب صرف نفرت اور بے بسی کا احساس تھا۔ وہ اسے ہمیشہ ایک بیکار اور بے وقعت مرد سمجھتی رہی تھی، جسے وہ کبھی پسند نہیں کرتی تھی۔

وہ ایک مصروف چوراہے کی طرف بھاگی، جہاں لوگوں کا ہجوم اور گاڑیوں کی آواجاہی عروج پر تھی۔ اچانک، اس نے ایک گاڑی کو اپنی طرف تیزی سے آتے دیکھا۔ گاڑی کی ڈرائیور ایمان تھی، جس کا دل غصے اور انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ ایمان کو بھی معلوم ہوا تھا کہ نور العین کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے بانجھ ہو چکی ہے۔ وہ دل ہی دل میں نور العین کو اس کی سزا دینا چاہتی تھی، اس سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔

ایمان کی آنکھوں میں دھندلاہٹ چھا گئی تھی، اس کے چہرے پر غضب کی تپش تھی، اور اس کے جبرے سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ وہ انتقام کے جذبے سے گاڑی کی رفتار بڑھا چکی تھی، جیسے اسے اب کچھ بھی روک نہیں سکتا تھا۔ آج وہ اس عذاب کا خاتمہ چاہتی تھی، جو اس کی زندگی پر نور العین کی صورت میں مسلط ہو چکا تھا۔

نور العین نے گاڑی کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اس کے قدموں میں لرزش پیدا ہوئی۔ خوف کی ایک شدید لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی، لیکن بچنے کی کوئی راہ نہ تھی۔ اس نے تیز رفتاری سے گاڑی کی طرف دیکھا، مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

ٹائروں کی چیختی آواز جیسے فضا کو چیرنے لگی۔ ایک زوردار دھماکہ سنائی دیا، جس کے بعد سب کچھ جیسے تھم گیا۔ نور العین کا جسم سڑک پر گر گیا، اس کا سر پہلے سڑک سے ٹکرایا، پھر دوسرا زور دھچکا لگا۔ جسے گردن لچک گئی خون کا۔ ایک لال دریا اس کے سر سے نکل کر۔ سڑک پر پھیلنے لگا اور۔ چند لمحوں میں سب کچھ سیاہ ہو گیا۔

سڑک پر ہنگامہ برپا تھا، ہر سمت ایک عجیب بے چینی سی چھائی ہوئی تھی۔ فرخ کی سانسیں بے ربط تھیں اور دل میں درد کی ایک غیر مرئی چبھن جیسے اس کے وجود کو بھسم کر رہی تھی۔ اس کی نظریں ایک مقام پر جم گئی تھیں، وہ جگہ جہاں نور العین خون میں لت پت، بے حس و حرکت پڑی تھی۔ لیکن یہ وہ گاڑی نہیں تھی جسے ایمان انتقام کے جذبے میں بھری ہوئی چلا رہی تھی۔

یہ ایک ایمبولینس تھی، جو زچگی کے آخری مراحل میں مبتلا ایک عورت کو اسپتال لے جانے کی جلدی میں تھی۔ ڈرائیور نے پوری کوشش کی کہ وہ نور العین کو بچالے، لیکن تقدیر کا لکھا کیسے مٹ سکتا تھا؟ ایمبولینس کا اثرباہ کن تھا، نور العین کی زندگی کا وہ لمحہ جو موت کی دہلیز تک لے آیا تھا، آگے بڑھنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

ایمان نے اپنی گاڑی کو ایک جھٹکے کے ساتھ روک دیا، دل میں ابال اٹھ رہا تھا، انتقام، جرم، راحت اور افسوس کی ملی جلی کیفیت نے اسے جکڑ لیا۔

وہ چاہتی تھی کہ نور العین کا خاتمہ ہو، لیکن اس طرح نہیں، حادثاتی طور پر نہیں، لوگوں کے سامنے نہیں۔ وہ ہر قدم پر سوچتی رہی، جیسے وقت نے اسے ایک ایسی کر بناک حقیقت میں پھنسا دیا ہو، جس سے نکلنا ممکن نہ تھا۔

فرخ دھاڑتا، چلاتا، گرتا، سنبھلتا ہوا جائے حادثہ تک پہنچا، نور العین کے پاس زمین پر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کا چہرہ یوں تھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ یہ وہ ہی عورت ہے، جس کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کے کئی لمحے گزارے تھے، وہ ہی عورت جس کی سنگدلی نے اتنی زندگیاں برباد کی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں غم اور محبت کا ملا جلا عکس تھا، جیسے دل ابھی بھی نور العین کی معافی کا منتظر ہو۔

- "نور العین..." اس نے مدھم سرگوشی کی، جیسے اس کے نام میں کوئی جادو ہو جو اسے دوبارہ زندگی کی طرف کھینچ لائے گا۔

اچانک، نور العین کی پلکیں دھیرے سے لرزیں، جیسے اس کے وجود میں زندگی کی آخری رمق بجی ہو۔ اس کی آنکھوں نے دھندلائی ہوئی نگاہ سے فرخ کا چہرہ دیکھا، پھر ایمان کی طرف نظر کی، جس کا چہرہ نفرت اور گناہ کے احساس سے بھرا ہوا تھا۔ نور العین نے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں نیلا ہٹ اور روشنی کا ایک خاموش تسلسل تھا، جیسے آسمان بھی اس کے انجام کا گواہ ہو۔

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن الفاظ اس کے گلے میں کہیں گم ہو گئے تھے، جیسے اس کے لبوں پر کسی اندھی لعنت نے مہر لگا دی ہو۔ اس کا جسم بے جان ہو کر سڑک پر گرنے لگا، دل کی دھڑکنیں رک گئیں، اور اس کی سانسوں کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

ایمبولینس کی نرس بھاگتی ہوئی آئی، اس نے نور العین کی نبض ٹٹولی اور ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا،
- "معذرت، یہ اب نہیں رہی۔" اس کے الفاظ میں کسی بھی جذبات کی جھلک نہ تھی، جیسے اس نے موت
کو ایک معمولی واقعہ سمجھا ہو۔ وہ پھر سے واپس اپنی ایمبولینس کی طرف لوٹ گئی، اور دنیا کی ہلچل میں گم ہو
گئی۔

ایمان وہیں کھڑی تھی، اس کا دل دھڑک رہا تھا لیکن اس کی روح میں ایک عجیب سی خاموشی پھیل گئی
تھی۔ اس نے نور العین کو ختم ہوتے دیکھا تھا، لیکن اس کے اندر وہ انتقام کی آگ بجھ نہ سکی تھی۔ وہ کچھ
اور چاہتی تھی، کچھ ایسا جو اس کے دل کے غم اور غصے کو سیراب کر دے، لیکن اسے یہ حادثہ قبول نہ تھا۔

فرخ اب بھی نور العین کے بے جان جسم کو تھامے بیٹھا تھا، اس کے آنسو بے قابو ہو کر بہہ رہے تھے، جیسے
وہ سب کچھ کھو چکا ہو۔ اس کی دنیا اب مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی، وہ شخص جس نے اسے محبت اور وفاداری
دی تھی، اب اس کے سامنے ہمیشہ کے لیے خاموش پڑی تھی۔ وہ دنیا کی تمام آسائشات رکھنے کے باوجود
خالی ہو چکا تھا۔

زندگی کا سفر چاہے تخت و تاج کے ہمراہ ہو یا کسمپرسی کے دامن میں لپٹا ہو، اس کا منتہائے مقصود بہر حال
موت کی وادی ہی ہے۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ ہم کس موت کا انتخاب کرتے ہیں۔

نورالعین، مونیز، یاسرور جیسی عبرت ناک، ذلت بھری موت؟ یا پھر، ماسٹر لی اور پروفیسر تراب جیسے معزز و باوقار انجام کی موت، جس میں وقار بھی ہے اور ایک سر بلند چراغ کی مانند بجھ جانے کی عظمت بھی؟

...°...

کمرے کی خاموشی میں گھٹن کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ ایمان کے دل پر چھائے اندھیرے نے جیسے پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ بڑے درتچے پر لٹکے بھاری پردے نے سورج کی روشنی کو روک دیا تھا، اور کمرہ ایک قبر کی مانند لگنے لگا تھا۔ ایمان دیوار سے ٹیک لگائے، زمین پر بیٹھی تھی، اُس کی ٹوٹی ہوئی سانسوں کی آواز اندھیروں میں گونج رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں نم تھیں، اور اُس کے گلے سے ایک بو جھل فریاد نکلی،

- ”میرے باپ... میرا سب سے بڑا دشمن نکلا۔ میری زندگی کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا اس نے۔ یہ لوگ میری زندگی سے نکل تو گئے، مگر ان کی منحوس پرچھائیاں اب بھی تعاقب کرتی ہیں، جیسے ان کی غیر موجودگی میں بھی ان کا زہر میری رگوں میں اترتا جا رہا ہو، میری ہر خوشی کو مسموم کر دیا ہے انہوں نے۔“

آنسوؤں کا سیلاب رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اُس نے اپنے گھٹنوں کے گرد ہاتھ لپیٹ کر، سر کو جھکا کر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

وہ اپنے اندر چھپے درد سے نبرد آزما تھی۔ دھیمے لہجے میں اُس نے کہا، ”مگر اگر اللہ کی یہ ہی مرضی ہے تو میں اُس پر راضی ہوں۔ میں اُس سے کبھی شکوہ نہیں کروں گی۔“ اُس کی آواز لرز گئی، جیسے الفاظ بھی اُس کے ضبط کا ساتھ چھوڑ رہے ہوں۔

موبائل فون کی گھنٹی نے کمرے کی سٹائٹ کو توڑا۔ اسکرین پر معارج کا نام روشن ہوا، اور ایمان کے دل میں عجیب سا اضطراب جاگ اُٹھا۔ خوف، پچھتاوے اور محبت کا عجیب امتزاج اُس کے اندر دھڑکنے لگا۔

اس نے اپنے چہرے سے آنسو پونچھے اور دل کو سنبھالتے ہوئے کال اُٹھائی۔ ”ہیلو، میری جان،“۔۔ اُس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا، مگر اُس کی آواز کی کیکپاہٹ نے سب کچھ عیاں کر دیا۔

دوسری جانب، معارج سٹاک ہوم کی تنہا فضا میں اپنے گھر کی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ پہاڑوں اور دریا کی سردی کو محسوس کرتے ہوئے، وہ اُسے یاد کر رہا تھا۔ اُس نے اسٹیل گرے رنگ کی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر پہنا ہوا تھا، اور اُس کا جسم چمکدار اور مضبوط نظر آ رہا تھا، جیسے کوئی جنگجو اپنے لباس میں تیار کھڑا ہو۔

معارج نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”کسی نے کہا تھا کہ ’ہیلو‘ نہیں، ’سلام‘ کہنا چاہیے۔“۔

ایمان کو اُس کی بات یاد آئی، اور وہ مدھم مدھم سا ہنس دی۔

ہاں، یہ تو تم نے کہا تھا کہ تم چاہتے ہو نیکی کا پہلا موقع مجھے ملے، کہ بھلائی سب کے حصے میں آئے اور ابتدا مجھ سے ہو۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ یہ سعادت تمہیں نصیب ہو، کہ بھلائی سب کے لیے ہو مگر آغاز تمہارے وجود سے ہو۔”

معارض کی ہنسی میں محبت تھی۔

۔“مگر تم نے کہا تھا کہ میں اور تم ایک ہی حقیقت ہیں، ہمارا وجود جدا نہیں، ایمان اور معارج ایک ہیں، دو جسم نہیں بلکہ ایک روح کی مانند۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ زندگی کی تمام نیکیاں، جو بھی ہوں گی، وہ ہم ایک ہی وجود کی طرح نبھائیں گے، جیسے ہماری سانسیں بھی ایک دوسرے میں گھلتی ہوں، ہماری بھلائی بھی ایک ساتھ پروان چڑھے گی۔”

دونوں نے ایک دوسرے کو ساتھ ہنستے ہوئے سلام کہا اور پھر علیکم السلام کے ساتھ اپنی ہنسی کو مزید گہرا کیا۔ ایمان کی آنکھوں میں آنسو ابھی تک چمک رہے تھے، لیکن اُن میں کچھ روشنی بھی لوٹ آئی تھی۔

معارض کے دل میں کچھ کھٹکا، اُس نے پوچھا، ”ایمان، تمہاری آواز کچھ بھاری لگ رہی ہے، سب خیریت ہے؟“

ایمان نے دھیرے سے جھوٹ بولا، ”میں بالکل ٹھیک ہوں، تم بتاؤ، تم کیسے ہو؟“ اُس کی آنکھوں میں محبت اور فکر چھپی ہوئی تھی۔

معارض نے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا، ”سب خیریت ہے، فکر مت کرو۔ اور یہ بات یاد رکھو، چاہے جو بھی ہو جائے، جتنی بھی آزمائشیں آئیں، تمہارا معارج ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔“ اُس کے لہجے میں اعتماد اور سکون تھا۔

ایمان کا دل بھر آیا، لیکن وہ مسکراتے ہوئے بولی، ”جانتی ہوں، ہم ہمیشہ ساتھ ہیں، جو بھی مشکلات آئیں گی، ہم مل کر ان کا سامنا کریں گے۔“ لیکن وہ اندرونی حقیقت چھپا رہی تھی کہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ یہ راز اُسے گھن کی طرح کھا رہا تھا، لیکن وہ معارج سے یہ بات نہیں کہہ سکتی تھی۔

معارض نے نرم لہجے میں کہا، ”ایمان، جو بھی ہو، اللہ پر یقین رکھو، سب بہتر ہو جائے گا۔“

ایمان کے دل میں اُس کے الفاظ نے عجب سکون بھر دیا۔ وہ معارج سے بے پناہ محبت کرتی تھی، اور اُسے یقین تھا کہ اُس کا ساتھ ہمیشہ رہے گا۔

پھر اُس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا، ”تم نے عیسیٰ کی قبر پر جا کر دعا کی؟“

معارض نے خوش دلی سے اُسے اپنے دن کی تفصیلات سنائیں، اور ایمان اُس کی باتوں میں کھو گئی، اپنے دکھوں کو وقتی طور پر بھولتے ہوئے۔

آخر میں، معارج نے سنجیدہ لہجے میں کہا، ”یاد رکھنا، ایمان، میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔“

کال بند کرنے کے بعد، معارج نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دل سے دعا کی، ”یا اللہ، ایمان کی حفاظت فرما، اُسے صبر اور سکون عطا کر، اور اُس کے دل کے بوجھ کو ہلکا کر دے۔“

جب ایمان بے خیالی میں ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکلی تھی، اُسی لمحے معارج کے آدمی خاموشی سے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے تھے، اور معارج کی ڈاکٹر سے تفصیلی بات چیت ہوئی تھی۔ معارج کو یہ ساری حقیقت معلوم ہو چکی تھی کہ ایمان ماں بننے کی صلاحیت کھو چکی ہے۔

مگر اس خبر نے معارج کے دل میں کوئی خلل نہ ڈالا، کیونکہ اس کے لیے یہ مسئلہ نہیں تھا۔

اُسے کسی اور بات کی پروا نہ تھی، نہ اس محرومی کا بوجھ اُس کے دل پر تھا، بس ایک ہی فکر نے اُسے گھیر رکھا تھا: ایمان کی حالت اور اُس کی کیفیت۔ وہ خوفزدہ تھا کہ یہ خبر ایمان کے ذہنی سکون کو تباہ نہ کر دے، کہ کہیں وہ غم و اندیشوں کے گرداب میں نہ جا پھنسے۔ معارج کے لیے دنیا کی ہر خوشی اور ہر غم بے معنی تھا، اگر ایمان کا دل پر سکون نہ ہو۔

اُس کے دل میں صرف ایک ہی فکر جاگزیں تھی، اور وہ تھی ایمان کی خیریت، اُس کی پروا۔

اُس کا وجود اُس وقت ایمان کی راحت اور تسکین کے گرد گھوم رہا تھا۔ جیسے ایک گھنے جنگل میں کوئی درخت اپنے سائے میں ہر شے کو محفوظ رکھتا ہے، ویسے ہی معارج کا دل ایمان کی حفاظت میں مستغرق تھا، کہ اُس کی زندگی میں کوئی زخم نہ آئے، کوئی پریشانی اُسے دبوچ نہ لے۔

معارج کی محبت میں ایک ایسا بے لوث پن تھا جو ہر تشویش، ہر ذاتی غم سے بالاتر تھا۔ ایک مثالی شوہر، جو اپنے وجود کو ایمان کی خوشیوں کے لیے فنا کرنے کو تیار تھا۔

...°...

معارج نے انٹرکام کا بٹن دبایا اور سویڈش میں حکم صادر کیا، ”فوراً آؤ۔“ اُس کا ذہن برق رفتاری سے مختلف امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کی ہر سوچ کا مرکز ایمان تھی، اور فیصلہ قطعی ہو چکا تھا۔ اُسے ہنرہ واپس جانا تھا، ایمان کے پاس۔

اُس کے چہرے پر فکر مندی کی لکیریں گہری ہو چکی تھیں، لیکن عزم کی چمک اُس کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔

چند لمحوں بعد، دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ معارج نے دروازہ کھولا، سامنے اُس کی ملازمہ کھڑی تھی۔ معارج نے سرد مہری سے، مگر تیز لہجے میں کہا، ”میرا سامان تیار کرو۔“ ملازمہ نے احتراماً سر جھکایا اور فوراً الماری کی طرف لپکی، جہاں سے اُس نے ایک سیاہ سوٹ کیس نکالا اور کپڑوں کو ترتیب سے رکھنا شروع کیا۔ معارج کا دھیان ابھی بھی ایمان کے خیالات میں الجھا ہوا تھا۔

اُسی لمحے، اُس کا فون بجا۔ اس نے فون کی اسکرین پر نظر ڈالی—یہ اس کا پائلٹ تھا۔ کال قبول کرتے ہی معارج نے مختصر مگر سخت لہجے میں حکم دیا، ”میرا پرائیویٹ جیٹ تیار رکھو، ہم ہنزہ واپس جا رہے ہیں۔“

فون بند کرتے ہی وہ تیز قدموں سے چینجنگ روم کی طرف بڑھا۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب سا تناؤ تھا، جیسے دل میں کوئی زبردست فیصلہ پک رہا ہو۔ کپڑے بدلتے ہوئے اُس نے دل میں خود سے کہا، ”میری بیوی کو میری ضرورت ہے، اور میں اُس کے لیے ہمیشہ حاضر ہوں۔ اب میں کسی کو بھی اجازت نہیں دوں گا کہ اُس کے دل کو کوئی اذیت پہنچائے۔“

معارج نے فٹ شدہ براؤن کالر والی شرٹ پہن رکھی تھی، جس کے بٹن اُس کے سینے سے بالکل چپکے ہوئے تھے، جیسے کپڑا اُس کے مضبوط جسم کو گلے لگا رہا ہو۔ شرٹ اُس کی سٹیل گرے پیٹ میں ٹکی ہوئی تھی، جس کی سلائی سیدھی اور نفاست سے کٹی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی آستینیں کہنیوں تک لپیٹ رکھی تھیں، جس سے اُس کے مضبوط بازوؤں کی شکل مزید نمایاں ہو رہی تھی۔

بائیں کلائی پر اُس کی مہنگی گھڑی چمک رہی تھی، جس کا دھاتی پٹا اور گول ڈائل اُس کے شاندار ذوق کی عکاسی کر رہے تھے۔ گھڑی کے سیاہ ہندسے اور سفید پس منظر اُس کے مرتب اور محتاط مزاج کو ظاہر کرتے تھے۔

معارض کے قدموں میں ایک خود اعتمادی کی روانی تھی، جیسے اُسے کسی چیز کا خوف نہ ہو۔ اُس کے سیاہ چہرے کے جوتے، جن میں نوکیلے اگلے حصے اور نیچی ایڑیاں تھیں، ہر قدم پر گہری چمک چھوڑ رہے تھے۔ اُس کا چہرہ پرسکون تھا، مگر اُس کے اندر طوفان برپا تھا۔

معارض پُر عزم قدموں کے ساتھ باہر نکلنے کی تیاری میں تھا، اُس کے پیچھے ملازمین خاموشی سے اُس کے حکم کے منتظر تھے۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا، تو چند لمحے کے لیے رکا، جیسے ہوا میں کچھ غیر معمولی سا معلق ہو۔ پھر اُس نے دروازہ کھولا اور سامنے ایک سخت گیر پولیس افسر کو پایا، جس کے چہرے پر سنگینی اور یونیفارم پر طاقت کا وقار چمک رہا تھا۔ بیچ اُس کی سرکاری حیثیت کا گواہ تھا، اور اُس کے چہرے پر کوئی نرم گوشہ نہ تھا۔ معارج کی نظر اُس کی طرف اٹھی تو افسر نے بے لچک اور سخت لہجے میں کہا،

۔ ”مسٹر معارج، آپ کو گرفتار کرنے کے احکامات ہیں۔ آپ پر دھوکہ دہی، غبن، قتل، بچوں کے ساتھ بد سلوکی، اور خواتین کی اسمگلنگ جیسے سنگین الزامات عائد کیے گئے ہیں۔“

...°...

معارض نے پولیس افسر کے سنگین الزامات پر بے پرواہ مسکراہٹ سجائی، جیسے یہ سب اس کے لیے کوئی نئی بات نہ ہو۔

اس کے لبوں پر ایک زہریلی مسکان ابھری، اور آنکھوں میں ایک عجیب سی بے نیازی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے قدموں کے نشانوں کو مٹا دیا گیا ہے، اور یہ کھیل موئیز کے معاملات اس پر ڈالنے کا ایک چالاکی سے بنا ہوا جال تھا۔

معارض نے ایک نظر ابرو اچکاتے ہوئے پولیس کی گاڑیوں اور سائرنوں کی طرف دیکھا، جو محل نما گھر کے باہر قطار میں کھڑی تھیں۔ باہر کا گیٹ بھی کھلا تھا اور ہر طرف پولیس کا گھیرا تھا۔ سب کچھ ترتیب وار تھا، لیکن معارج کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔

وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے ایک سرسری نظر موبائل کی اسکرین پر ڈالی اور دیکھ لیا کہ کال کرنے والا اس کا حریف ایلومیناتی کارکن تھا جس نے اس کی ساکھ کو برباد کرنے کی کوشش کی تھی۔ معارج نے کال ریسیو کی، لیکن اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ جیسے وہ پہلے سے سب جان چکا ہو۔

- ”تم سمجھتے ہو تم جیت گئے؟“ معارج کی آواز میں زہر تھا۔ ”یہ حماقت تم سے ہی متوقع تھی۔ ٹھیک ہے، مان لیا میں پھنس گیا، مگر سن لو، زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ دو ہفتے، یا شاید دو ماہ، میں۔ پھر باہر ہوں گا، اور وہ دن تمہارے لیے سب سے بھاری دن ہو گا۔ تمہاری ساری چالیں الٹ جائیں گی، اور وہ دن جب تم مجھ سے رحم کی بھیک مانگو گے، دور نہیں۔ تمہاری وہ زندگی کی لائین، وہ راز جس پر تمہاری دنیا قائم ہے، کبھی

تمہارے ہاتھ نہیں لگے گا۔ ” معارج نے ایک تلخ قہقہہ لگایا، جیسے دنیا کی کوئی حقیقت اس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکے۔

کال کاٹتے ہی وہ اپنے موبائل کی اسکرین پر نظر جمائے بیٹھا رہا، اُس کی انگلیاں تیزی سے اسکرین پر حرکت کرنے لگیں۔ اُس نے ایمان کو پیغام ٹائپ کیا، اُس کی ہر سانس میں جذبات کی شدت بھر گئی تھی، ”فکر مت کرو، ایمان۔ میں جہاں بھی ہوں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں، ہمیشہ۔ مضبوط رہنا، میں جانتا ہوں یہ وقت مشکل ہے لیکن تمہیں خود کو ٹوٹنے نہیں دینا۔ میری محبت تمہارے ساتھ ہے، ہم اس آزمائش کو بھی سر کر لیں گے۔ میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔“

اُس کا ہر لفظ جیسے دل کے کسی گوشے سے نکل رہا تھا۔

میج بھیجنے کے بعد اُس نے موبائل کو بے نیازی سے ایک طرف پھینکا، جیسے وہ کوئی غیر ضروری چیز ہو۔ پھر ایک خاص بٹن دبایا، اور لمحے بھر میں موبائل میں زوردار دھماکہ ہوا۔ سارا ماحول لرز اٹھا، اور پولیس والے یکدم چونک گئے۔ اُن کی آنکھوں میں حیرت اور خوف تھا، مگر معارج کا چہرہ کسی فاتح کی مانند پُر سکون تھا۔

اُس نے بڑی ادا سے اپنی آنکھوں میں ایک چمک کے ساتھ گاڑی کی طرف قدم بڑھائے۔ پولیس والا فوراً آگے بڑھا اور گاڑی کے پچھلے دروازے کو کھولا، جیسے توقع کر رہا ہو کہ معارج وہاں بیٹھے گا۔

لیکن معارج کے ارادے کچھ اور تھے۔ وہ گاڑی کے اگلے حصے کی طرف بڑھا، اور ڈرائیور کی بغل والی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ ایک قہر آلود نظر پولیس والے کی طرف ڈال کر بولا،

۔ ”چلو، وقت کے ضائع کرنے والے میری نظر میں ان جانوروں سے بھی زیادہ پست ہیں جو اپنی فطرت سے بھی منکر ہوتے ہیں۔“

یہ کہتے ہی اُس نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی، اور اُس کے چہرے پر ایک پُر اعتماد مسکراہٹ پھر سے ابھر آئی، جیسے وہ اس کھیل کا شہنشاہ ہو، جس کا ہر پتہ اُس کے ہاتھ میں ہو۔

معارج کی بے نیازی اور بے خوفی نے پولیس اہلکار کو حیرت میں ڈال دیا۔ جو اہلکار بے بسی سے کھڑا تھا، اُس نے نظریں جھکا لیں اور آہستگی سے بندوق تھا مے پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ وہ معارج کے طاقتور وجود اور اس کی غیر متوقع حرکات سے باخبر تھا، اور یہ جانتا تھا کہ معارج پر بھروسہ کرنا نری بے وقوفی ہوگی۔

جیسے ہی گاڑی عمارت کے احاطے سے باہر نکلی، پیچھے آنے والی گاڑیوں کا ہجوم اور پھر اچانک میڈیا کے رپورٹرز اور کیمرے معارج کی گاڑی کے گرد جمع ہونے لگے۔ شہر بھر میں اُس کی گرفتاری کی خبر پھیل چکی تھی، اور ہر کوئی اُس کی ایک جھلک پانے کے لیے بے چین تھا۔

معارض نے ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اُن کی طرف ایک نظر ڈالی، جیسے وہ کسی فلم کے سیٹ پر ہو۔
وہ اُن کے سوالات یا تبصروں کی پرواہ کیے بغیر اپنے قدموں کی چاپ کو محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ اپنی ہی دنیا کا حاکم ہو۔

اُس کے چاہنے والے، خصوصاً خواتین، اُس کے سحر میں گرفتار تھیں۔ اُن کے دلوں میں معارج کی دلکشی اور وقار کی گونج تھی، مگر معارج کے دل میں بس ایک ہی عورت تھی، جو اس کے لیے سب سے قیمتی تھی۔ ایمان۔ ایک نگاہ بے اعتنائی اُس نے ہجوم پر ڈالی، لیکن اندر کی آنکھ میں ایمان کی تصویر صاف تھی۔

گاڑی نے ہجوم کو چیرتے ہوئے راستہ بنایا، اور معارج کھڑکی سے باہر کی دنیا کو بے فکرانہ انداز میں دیکھنے لگا۔ اُس کے لبوں پر ایک پرسکون، اعتماد بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس کے پاس ایک منصوبہ تھا، اور وہ جانتا تھا کہ کوئی بھی طاقت اُس کے ارادوں کے سامنے کھڑی نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی عدالت ہو یا دشمنوں کا جال، معارج وہ شخص تھا جو اپنی کہانی خود لکھتا تھا، اور اب بھی اس کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں تھا۔

یہ وقت نہیں تھا خوف میں مبتلا ہونے کا، بلکہ معارج نے ہمیشہ کی طرح، یہ سوچ لیا تھا کہ زندگی کا ہر موڑ، ہر چال اُسی کی مرضی کے تابع ہوگی۔

رات کا گہرا سکوت ہر طرف چھا چکا تھا، آسمان پر بادلوں کی دبیز تہہ تاروں کو چھپا چکی تھی اور ہوائیں بے آواز چل رہی تھیں۔ ایمان اصطل کے دروازے کے قریب کھڑی تھی، ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی تھامے ہوئے، جیسے اس کی کمزوری کا بوجھ اس کے سر پر پڑ رہا ہو۔ اُس کی ساری بلیاں، جو کبھی اُس کی ایک ہلکی سی پکار پر دوڑتی تھیں، آج ضد میں مبتلا ہو کر اصطل سے باہر نکلنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

اس کے جسم پر عجیب سی جلن اور خارش کا احساس اسے بار بار بے چین کر رہا تھا۔ ایمان نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں موند لیں، جیسے اس تکلیف سے خود کو عارضی سکون دے رہی ہو، مگر جسم کی نرمی میں وہ کچھاؤ اور بے چینی برقرار تھی۔ اس کی کمزور حالت اور بلیوں کی ضد نے اُس کے صبر کو آزمانا شروع کر دیا تھا۔

۔ ”تم سب آج کیا چاہتی ہو؟“ اُس نے ناک چڑھا کر بلیوں کی طرف دیکھا، جنہوں نے اپنی مخصوص جگہیں سنبھال رکھی تھیں، کوئی بھی ہلنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

۔ ”تم لوگ یہیں رہو، میں جا رہی ہوں۔“ اُس نے جیسے تھکن بھری سانس لی، ”ویسے بھی مجھے خود میں اتنی کمزوری محسوس ہو رہی ہے کہ مزید کچھ کرنے کا دل نہیں کر رہا، اوپر سے یہ عجیب سی خارش اور جلن... تم لوگ بھی، بس۔“

اُس کی نظر عجب پر پڑی، جواب بوڑھے پن کی علامت لیے بے نیازی سے ایک طرف بیٹھا تھا، جیسے زندگی کے سالوں کا بوجھ اس پر چھایا ہو۔

۔ ”تم تو بالکل میری نہیں سنتے، عجب، ٹھیک ہے! تم وہیں رہو۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی بے بسی تھی۔

ایمان نے پھر باری باری اپنے پیارے بادل، ایڈنا اور سلطان کو پیار سے دیکھا اور ہلکے سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا، جیسے ان کو اپنی محبت سے ڈھانپ رہی ہو۔ ”میرے بچے، اپنا خیال رکھنا۔“ اُس نے ان سب کو دھیان سے دیکھا، جیسے وہ کوئی آخری نظر ڈال رہی ہو۔

دروازہ ہلکے سے کھلا چھوڑتے ہوئے وہ باہر نکلی، اُس کے قدموں میں بو جھل پن تھا، جیسے کمزوری نے اس کی قوت چھین لی ہو۔ اُس کے دل میں کچھ عجیب سا خدشہ تھا، جیسے کوئی انجانا خطرہ اس کے ارد گرد منڈلا رہا ہو، مگر اُس نے اس پر زیادہ غور نہیں کیا۔ شاید تقدیر نے اُسے اس لمحے کی نزاکت سے غافل رہنے کی خواہش دی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی باہر نکل آئی، دروازہ نیم وارہ گیا، اور ایمان کا دل مطمئن کیے بغیر، اس کی بے خبری میں وقت آگے بڑھ گیا۔

ہنزہ کی صبح ہمیشہ کی طرح پُر سکون اور دلکش تھی۔ پرندوں کے سریلے نغمے ہوا میں بکھر رہے تھے، پہاڑوں کی چوٹیوں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر نیچے وادی میں اتر رہی تھیں، دریا اپنی سرگوشیوں میں مگن بہہ رہا تھا اور شبنم سے دھندلائی گھاس کے کنارے جیسے چمکتے ہیروں سے آراستہ تھے۔

ایمان اپنے فارم کی جانب دھیرے دھیرے قدم بڑھاتے ہوئے دل میں ایک عجب سکون کا احساس لیے جا رہی تھی، گویا یہ منظر اسے اپنی دنیا کے تمام مسائل اور تنہائیوں سے دُور کر رہا تھا۔

لیکن جسم کی عجیب سی خارش اور نامعلوم نشانات نے اُس کی طبیعت میں بو جھل پن بھر دیا تھا۔ اس کے وجود میں چھپی ہوئی بے چینی ابھرنے لگی تھی، گویا کچھ نادیدہ خوف اُس کے ارد گرد منڈلا رہے ہوں۔

اُس کی معارج سے آخری گفتگو وہ ہی تھی جو مدت پہلے ہوئی تھی، اور اُس کے بعد کوئی رابطہ نہ ہو سکا۔ ایمان نے اُس کے بعد سے موبائل کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا، گویا اُس نے خود کو دنیا سے کاٹ لیا ہو۔ اُسے معارج کی اسٹاک ہوم میں گرفتاری کی خبر تک نہ تھی؛ وہ بے خبری کے پردے میں محصور تھی، جیسے کوئی سنگین حقیقت اُس سے دور، اُس کی دنیا کے دائرے سے باہر ہو۔

وہ بالکل تنہا تھی، بہرام شانزہ اور اُن کے بچے مکہ معظمہ میں، حاشر اور نور بھی عمرہ کی سعادت میں، اور سندس اپنے شوہر کے ساتھ دبئی میں مقیم تھے۔ ایمان کے گرد بس ہوا کے سرگوشی کرنے والے جھونکے اور اس کا سنسان فارم تھا۔

وہ چکن فارم کے دروازے تک پہنچی، گیٹ کو آہستہ سے کھولا اور مرغیوں، بطخوں اور موروں کی چہچہاہٹ سننے کی امید میں مڑی، لیکن وہاں سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا کہ فضا میں موجود آوازیں بھی گم ہو گئیں۔۔

ایمان کے قدم رُک گئے، اس کی آنکھوں میں حیرانی اور خوف نے جگہ لے لی۔ زمین پر مرغیاں، بطخیں، اور مور بے حس و حرکت پڑے تھے۔ اُن کے پر بکھرے ہوئے، گرد نیں موڑ چکی تھیں، اور آنکھیں بے جان تھیں۔۔۔

ایک دم جیسے ایمان کی روح تک میں کپکپاہٹ دوڑ گئی۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، اور دماغ میں سینکڑوں سوال اُبلنے لگے۔ یہ کیا ماجرہ تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اور کس نے یہ قیامت ڈھائی تھی؟

وہ بکریوں اور بیلوں کے فارم کی جانب دیوانہ وار بھاگی۔ اُسے امید تھی کہ شاید وہ محفوظ ہوں، لیکن وہاں پہنچتے ہی اُس کی آخری امید بھی چکنا چور ہو گئی۔ تمام جانور بے جان گھاس پر پڑے تھے، ان کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور آنکھیں جمی ہوئی تھیں۔

جس گائے نے کل ہی بچہ دیا تھا، وہ اور اُس کا بچہ بھی مردہ حالت میں تھے۔ ایمان کے پورے وجود میں ایک لہر دوڑ گئی، متلی اور خوف کا عجیب سا احساس اُس پر حاوی ہو گیا۔ دماغ میں گھنٹی بجی، اور اُس کی آنکھوں کے سامنے ہر چیز دھندلی ہونے لگی۔

اب اُس کی آخری امید اُس کے گھوڑے اور بلیلاں تھیں۔ دل میں یہ دعا لیے وہ گھوڑوں کے اصطل کی طرف دوڑی، لیکن جب وہ اندر پہنچی تو اُس کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ گھوڑے اور بلیلاں بھی بے جان، بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ان کی ایالیں بکھری ہوئیں، جسم ساکت اور ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ وہ گھٹنوں کے بل بادل کے قریب جا کر گری۔ اُس کا ہاتھ بادل کے سینے پر رکھا، وہ برف کی مانند سرد تھا، اس کی سانسیں تھم چکی تھیں۔ سلطان، ایڈنا، سبھی مردہ حالت میں تھے۔ ایمان کی چیخیں اندر ہی اندر دب گئیں، آنکھیں پتھر اگئیں، جیسے اس نے سب کچھ کھود دیا ہو۔

اچانک ایک آتشیں لہر اُس کے اندر سے ابھری، اُس نے گھٹی ہوئی سانسوں کے ساتھ پوری قوت سے چلایا، ”بادل!“۔

اُس کی آواز ہنزہ کی وادیوں میں گونجی، جیسے کسی ٹوٹے دل کا آخری نالہ ہو۔ ارد گرد موجود درختوں سے پرندے اڑ کر آسمان میں بکھر گئے، اور ایمان کی دنیا میں بس خاموشی اور ایک بے حد اذیت ناک غم باقی رہ گیا۔

ایمان کا نپتی اپنی جگہ سے اٹھی اور عجوہ کے پاس پہنچی تو اُس کا دل جیسے کسی آہنی پنچے میں جکڑ گیا ہو۔ عجوہ کے ساتھ باقی بلیلاں بھی اب بے حس و حرکت پڑی تھیں، اُس کی آنکھوں میں ویرانی سی چھا گئی۔ وہ عجوہ جس

نے ہر مشکل گھڑی میں اس کا ساتھ دیا تھا، جس کی موجودگی میں اسے ہمیشہ تحفظ کا احساس ہوتا تھا، آج وہ بھی سر دلاش میں بدل چکا تھا۔

ایمان کو اچانک گلہریوں کی یاد آئی، وہ چھوٹے جاندار جو ہمیشہ اس کے دل کی بہارتھے، جو اس کے ہر دکھ اور ہر غم میں اس کا سہارا بنتی تھیں۔ اُس کی روح کو جیسے کوئی شدید جھٹکا لگا، وہ باہر کی طرف دوڑی، قدم لڑکھڑاتے اور دل دھڑکتے ہوئے۔

کچھ لمحوں بعد وہ دوبارہ اصطبل میں لوٹی۔ اُس کے لرزتے ہاتھوں میں ان چھوٹی سی زندگیوں کی لاشیں تھیں، گلہریاں جنہوں نے ہر لمحے اُس کے ساتھ وفاداری نبھائی، جو ہر خطرے میں اُس کی محافظ تھیں، جنہوں نے اُس کے ہر دکھ اور کٹھنائی میں اُس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

مگر آج وہ اپنی مددگاروں کو نہ بچا سکی۔ وہ تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ زمین پر گر پڑی، اس کے ہاتھ جیسے بے اختیار ہو کر جھولی میں گر گئے، اور وہ ننھی لاشیں اس کی جھولی میں اتر گئیں۔

اُس نے ایک لمبا، گہرا سانس لیا، جیسے اُس کے اندر کی تمام طاقت ختم ہو چکی ہو۔ اُس کی سانسیں جیسے تھم سی گئیں، اور پھر وہ یکدم تڑپ کر زور زور سے رونے لگی۔

اس کے آنسو اُس کی آنکھوں سے یوں بہنے لگے جیسے کوئی نہ ختم ہونے والا سیلاب ہو، جیسے کسی بھرتی ہوئی ندی کا کنارہ ٹوٹ گیا ہو۔ ہر سانس کے ساتھ اُس کے دل کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا، اُس کے آنسوؤں کی روانی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

اُس نے گھٹنوں کے بل جھک کر بادل، ایڈنا، اور سلطان کی بے جان لاشوں کو گلے لگایا، جیسے وہ اُس سے آخری بار کچھ کہنا چاہ رہے ہوں، اور وہ اُن کی خاموش چیخوں کو محسوس کر سکتی تھی۔ اُس کی ہچکیاں اُس کے پورے وجود کو ہلار ہی تھیں، جیسے ہر لمحہ اُسے توڑ رہا ہو۔

اُس نے عجز اور اُس کے ساتھی کو گالوں پر بوسہ دیا، ان مردہ وجودوں کو اپنے آنسوؤں میں بھگوتے ہوئے، لیکن وہ سب کچھ کھو چکی تھی۔ وہ عالم تنہائی میں جیسے دُور تک تنہا رہ گئی تھی، ایک اجاڑ خلا میں، جہاں اُس کا کوئی ہمراز، کوئی ساتھی نہ بچا تھا۔

رونے کی آواز اُس کے گرد فضاؤں میں گونج رہی تھی، ہر سمت اُس کا نوحہ تھا، جیسے پوری کائنات اُس کے غم میں شریک ہو گئی ہو۔ وہ بہت کم جانتی تھی کہ یہ اُس کے آخری دنوں کا آغاز تھا۔ یہ آزمائشوں کا وہ لمحہ تھا جب زندگی کی ہر شے اُس سے چھینی جا رہی تھی۔ کبھی اللہ دے کر آزماتا ہے اور کبھی لے کر، اور آج ایمان کے نصیب میں اللہ نے لینے کی آزمائش لکھی تھی۔ اُس کے امتحانات ختم ہونے والے تھے، لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ اُس کے آخری امتحان تھے، اُس کے آخری اندھیرے دن۔

ایمان کی دنیا اس لمحے خاک میں مل چکی تھی، جب اس نے اپنے جانوروں کی لاشیں مٹی کے سپرد کیں۔ وہ زندہ دل اور خوشبو بھرے لمحات جیسے ماضی کے دھندلکوں میں کھو چکے تھے، جب اس کی بلیاں اور گلہریاں درختوں کے نیچے کھیلتی تھیں اور سکون سے سویا کرتی تھیں۔ آج وہ انہی درختوں کے نیچے دفن ہو چکی تھیں، جہاں ان کے وجود کی آخری نشانی ایک ہموار ہوتی زمین کے نیچے کہیں دب گئی تھی۔

جہاں بیل، بکریاں، پرندے اور ایڈنابادل زمین کی گہرائیوں میں مدفون تھے، وہاں اوپر ٹرک کا پہیہ گھومتا تھا اور مٹی کو ہموار کرتا جاتا تھا، گویا ہر چکر کے ساتھ ایمان کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے رک سا جاتا۔

ٹرک کی سست رفتار حرکت اور مٹی کے بتدریج ہموار ہونے کے عمل کو دیکھتے ہوئے، ایمان نے بے دلی سے اُس آدمی کو اجرت ادا کی، جس نے یہ دل شکن عمل انجام دیا تھا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے، اور اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک غیر محسوس سکوت پھیلتا جا رہا تھا، جیسے ہر چپٹا ہوتا ذرہ اس کی روح کو بھی دفن کر رہا ہو۔

وہ بے حس، خالی، اور دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی اپنے گھر واپس چلی گئی۔

گھر پہنچتے ہی جب اس نے نقاب اتارا، تو اس کے چہرے پر موجود پھولی ہوئی رنگت اور سرخ متورم آنکھیں اُس کے اندرونی اضطراب کی گہری غماز تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا وہ اپنے اندر کوئی طوفانی جنگ لڑ کر آئی ہو۔

اس کے چہرے پر ایک غیر معمولی کیفیت کے نشان ابھرے ہوئے تھے، گویا کسی گہری علالت کا درد یا پھر کوئی نامعلوم اذیت۔۔۔

اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر خود کو زمین پر گرنے دیا اور گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر زار و قطار رونے لگی۔
اس کے آنسو اس کی زخمی روح کی چیخ و پکار تھے، جیسے وہ سب کچھ کھو چکی ہو۔

اس کے پاس کوئی نہیں تھا جو اس کے درد کو سنبھال سکے، سوائے معارج کے، جو کسی کاروباری دورے پر تھا۔ لیکن حقیقت میں، وہ کہاں تھا، اس کا اندازہ ایمان کو نہیں تھا۔

اس نے صرف اتنا جانا تھا کہ وہ واپس آنے والا تھا، لیکن یہ سب محض ایک فریب تھا۔ درحقیقت، معارج دشمنوں کے جال میں گرفتار ہو چکا تھا، اور وہ بھی اس کے علم سے کوسوں دور۔

فون کی گھنٹی اچانک بج اٹھی۔ اس کی نم آنکھوں نے فون کی سکرین کی طرف دیکھا، دل میں امید جاگ اٹھی کہ شاید معارج ہو۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے فون اٹھایا اور کمزور مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”ہیلو، میری جان؟“ لیکن دوسری طرف آواز سندس کی تھی، جو خوف و حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ”ایمان، مجھے بہت افسوس ہے، مجھے ابھی پتہ چلا سب کا۔ فوراً کال کی، حاشر بابا اور نور امی بھی جلد پاکستان پہنچیں گے۔ فکر مت کرو۔“

ایمان کی آنکھوں میں حیرت چھلکنے لگی،۔

تمہیں یہ کس نے بتایا؟ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے کہ حاشر بابا اور نور امی کو میرا سوچ کر ”اپنا عمرہ ادھورا چھوڑ کر واپس آنے کی تکلیف اٹھانی پڑے۔ وہ جانور اللہ کی امانت تھے۔۔ جو امانت اللہ نے ہمیں دی تھی، وہ اُس کی جانب لوٹ گئی۔۔ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟“۔

سندس کی آواز میں پریشانی مزید بڑھ گئی، ”ایمان، تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں جانوروں کی نہیں، معارج بھائی کی بات کر رہی ہوں!“۔

ایمان، جو ابھی تک ذہنی گتھیوں میں الجھی ہوئی تھی، کویوں محسوس ہوا جیسے سندس جانوروں کی موت کا ذکر کر رہی ہو، مگر معارج کا نام سنتے ہی گویا اس کے ذہن پر ایک بوجھ سا آن پڑا، اور ایک لمحے کو اس کا سر چکر اگیا۔

ایک طرف اس کے چہرے اور جسم پر عجیب و غریب نشانات

کا سلسلہ تھا، اور دوسری طرف

جانوروں کی موت اور تیسری طرف یہ معارج کا تذکرہ؟ وہ شدید اضطراب کے عالم میں ہانپتے ہوئے بولی، ”معارج کو کیا ہوا ہے؟“۔

سندس کی آواز مزید گہری ہو گئی، ”۔

ایمان، معارج بھائی کو سویڈش پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔ اُن پر دھوکہ دہی، غبن، قتل اور عورتوں کی اسمگلنگ جیسے سنگین الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ یہ وڈیو تو اب دنیا بھر میں وائرل ہو چکی ہے۔ خاص طور پر عرب دنیا میں ایک طوفان کھڑا ہو چکا ہے کیونکہ وہاں کے لوگ معارج بھائی کے پوڈکاسٹ کے بڑے مداح ہیں۔ اُن کی وڈیو پورے سوشل میڈیا پر پھیل چکی ہے، اور عرب کے گوشے گوشے میں ہلچل مچ گئی ہے۔“

یہ سن کر ایمان کو ایک عجیب سا جھٹکا لگا، جیسے زمین اس کے قدموں تلے سے نکل گئی ہو۔ “یہ کیا کہہ رہی ہو؟ یہ سچ نہیں ہو سکتا۔ معارج بے گناہ ہے! وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا، وہ ایک نیک مسلمان ہے، وہ اس طرح کے گھناؤنے جرم میں ملوث نہیں ہو سکتا!“

سندس کی آواز میں اداسی اور سچائی کی تلخی تھی، “ایمان، یہ حقیقت ہے۔ یہ سب ایلومیناتی کا کھیل ہے۔ معارج بھائی ان کے کالے کرتوت کھولتے تھے، اسی لیے انہیں ان جھوٹے الزامات میں پھنسا یا گیا ہے۔“ ایمان کی سانسیں تیز ہو گئیں، جیسے کوئی اندرونی طوفان اُبھر آیا ہو۔ اس نے کانپتے قدموں سے ٹی وی لائونج کی طرف دوڑ لگائی، ٹی وی آن کیا اور نیوز چینل پر سرخی دیکھی:۔“

معروف پوڈکاسٹر اور موثر خطیب، معارج سلطان کو سویڈن میں حراست میں لے لیا گیا ہے۔ ان پر دھوکہ دہی، بد عنوانی، قتل اور بچوں و خواتین کی غیر قانونی ترسیل جیسے نہایت سنگین اور دلسوز الزامات عائد کیے

گئے ہیں۔ اس سنسنی خیز خبر نے دنیا بھر میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے، اور۔ خاص طور پر سوشل میڈیا پر۔۔ معارج سلطان کے عقیدت مند ان کے دفاع میں آواز بلند کر رہے ہیں اور ان کی رہائی کے لیے ضمانت کی اپیلیں کر رہے ہیں۔ سویڈن میں بھی احتجاج کا سلسلہ جاری ہے، خصوصاً عرب ممالک میں شدید غم و غصہ پایا جاتا ہے، جہاں ان کے مداح بڑی تعداد میں سڑکوں پر نکل کر مظاہرے کر رہے ہیں۔ معارج سلطان کی گرفتاری نے بین الاقوامی سطح پر ایک بھونچال پیدا کر دیا ہے، اور ان کے چاہنے والے انہیں بے قصور ثابت کرنے کے لیے سرگرم ہیں۔“۔

ایمان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔“ معارج۔۔۔ ”اس کے لبوں سے ایک خالی آواز نکلی، جیسے دنیا ایک بار پھر اس کے گرد منہدم ہو گئی ہو۔

ٹیلی ویژن اسکرین پر معارج کی ویڈیوز چل رہی تھیں، وہ ہی معارج جسے وہ دل و جان سے چاہتی تھی، جو اس کی زندگی کا محور تھا۔ اس نے اسے پولیس کی تحویل میں دیکھتے ہوئے بے یقینی کے عالم میں دیکھا، وہ مسکراتا ہوا نظر آیا، جیسے کوئی اندیشہ یا خوف اس کے دل میں سرایت نہ کر سکا ہو۔

معارض کے چہرے پر پُر سکون وقار تھا، آنکھوں میں ایک عجیب سا اعتماد، جیسے وہ کسی باطنی حقیقت کا شعور رکھتا ہو، جیسے اسے یقین ہو کہ یہ آزمائش وقتی ہے اور حق کی فتح اٹل ہے۔ لیکن ایمان کی دنیا میں یہ لمحہ ایک طوفان کی مانند تھا۔

اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو چکی تھی، دماغ میں ایک شدید بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی، اس کا ہر ذرہ جانتا تھا کہ معارج بے گناہ ہے، اور وہ اس کے دل کی دھڑکن، اس کی زندگی کا حاصل ہے۔

معارض کی گرفتاری کا منظر اس کے وجود پر لرزہ طاری کر چکا تھا۔ ایک بے نام خوف اور اضطراب اس کے دل و دماغ کو جکڑنے لگا۔ وہ بے اختیار تھی، جیسے دنیا اس کے گرد گھوم رہی ہو اور وہ خود بے وزن ہو کر کسی اندھیری گہرائی میں ڈوبتی جا رہی ہو۔

اچانک اس کے ہاتھ سے فون چھوٹ کر زمین پر گر پڑا، سندس کی آواز جو اس کا نام پکار رہی تھی، دھندلا سی محسوس ہوئی، لیکن ایمان جواب دینے کے قابل نہ رہی۔ اس کی سانسوں میں ایک بوجھ سا بھرنے لگا، سینے میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی، جیسے دل کسی نا دیدہ شکنجے میں جکڑا جا رہا ہو۔ اس کی نظریں ٹی وی کی اسکرین پر جم گئیں، مگر اس کے کان نیوز اینکر کے الفاظ سننے سے قاصر رہے، جو کہہ رہا تھا۔

۔ ”محمد معارج، جو اپنی اثر انگیز تقاریر اور پوڈ کاسٹ کے ذریعے شہرت رکھتے ہیں، اکثر اپنے پیغامات میں قرآن و حدیث کا حوالہ دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اللہ اپنے محبوب بندوں کو آزماتا ہے اور یہ ابتلاء

اہل ایمان کے لیے تزکیہ اور بلندی کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنے ماننے والوں کو صبر اور نماز کو مضبوطی سے تھامنے کی تلقین کی ہے اور کہا ہے کہ یہ دنیا اور آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہیں۔”

ایمان کی حالت بگڑتی جا رہی تھی، ٹی وی پر چلتے معارج کے الفاظ کا وہ اقتباس اس کے کانوں تک پہنچنے سے قاصر رہا، جس میں معارج نے ایک پوڈکاسٹ میں قرآن کی آیت کا حوالہ دیا تھا۔

۔“ اور ہم ضرور تمہیں خوف، بھوک، مال و جان اور پھلوں کے نقصان سے آزمائیں گے، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو۔ وہ لوگ جب ان پر مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: بے شک ہم اللہ کے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی رحمتیں اور برکتیں ہیں، اور یہ ہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔” (البقرہ: 155-157)

یہ الفاظ گونجتے رہے، لیکن ایمان کے لیے سب کچھ دھندلانے لگا۔ کمرہ گھومنے لگا، زمین پاؤں تلے سے نکلتی محسوس ہوئی، اور پھر اس کا جسم بے اختیار ٹیبل کی طرف لڑھک گیا، سر ٹیبل سے ٹکرایا اور وہ زمین پر گر گئی۔ پیشانی سے خون رسنے لگا، جیسے سرخ قطروں نے اس کی چمکتی ہوئی جلد کو نرمی سے چھوتے ہوئے زمین پر ایک سرخ لکیریں بنادیں۔

آنکھوں کے سامنے سب کچھ دھند میں ڈھل گیا، اور پھر گھپ اندھیرا چھا گیا۔۔۔

ایمان اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی تھی، خاموشی کا گہرا پردہ ہر طرف چھایا ہوا تھا، اور وہ ایک ٹوٹی ہوئی تصویر کی مانند نظر آتی تھی۔ اپنے پیارے جانوروں اور شوہر کے کھونے کا ناقابلِ بیان صدمہ، جس نے اُسے اندر سے ریزہ ریزہ کر دیا تھا، اُس کے چہرے پر پڑمردگی کی گہری لکیریں کھینچ چکا تھا۔ بے ہوشی کی حالت سے نکلنے کے بعد، اُس نے اپنے زخمی سر پر پٹی باندھی ہوئی تھی، جیسے یہ پٹی اُس کی بکھرتی ہوئی زندگی کو ایک بار پھر جوڑنے کی ناکام کوشش ہو۔

کمرے میں اُسے تسلی دینے والا کوئی نہ تھا، کوئی کندھا نہیں تھا جس پر وہ سر رکھ کر رو سکتی۔ وہ اندرونی کرب میں گھری ہوئی تھی، گویا زندگی کے ہر راستے پر اندھیری دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں۔ اُس کا دل ایسے شکستہ تھا کہ اسے لگتا تھا جیسے اُس کی روح پر ایک دن میں پہاڑ توڑ دیے گئے ہوں۔

وہ بیڈ کے کنارے پر خاموش بیٹھی تھی، ہاتھ میں موبائل تھا، جس کی اسکرین پر وہ آخری خوشگوار لمحہ تھا۔ اُس کی اور اُس کے جانوروں کی ایک تصویر، جو کسی بھی غم سے نا آشنا، ہنستی مسکراتی دکھائی دے رہی تھی۔

ایمان نے لرزتے ہاتھوں سے تصویر پر انگلی پھیری، جیسے ان چہروں کو پھر سے چھو لینے کی آرزو ہو۔ جانوروں کی معصوم صورتیں اُس کے دل کے نہاں خانوں میں ایک گہرا دکھ چھوڑ رہی تھیں۔ اُس کی

آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے، جو تصویر کو دھندلا کر اسکرین پر ٹپ ٹپ کرنے لگے، گویا یہ آنسو اُس کی یادوں کو بھی بہا لے جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

کمرے میں موت جیسی خاموشی چھائی ہوئی تھی، سوائے اُس کے سسکیوں کے جو ہوا میں تیر رہی تھیں۔ اُس نے کمرے کے دروازے کی طرف حسرت بھری نگاہ ڈالی، جیسے اُمید ہو کہ شاید معارج کا وجود دروازے سے اندر داخل ہو جائے، اُس کی زندگی میں روشنی پھر سے بھر دے۔

اُسے اپنے شوہر کی نرم اور پیاری آواز یاد آنے لگی، ”میری جان، میری بٹر فلائی، کیا تم اداس ہو؟“۔ اُس کے دل میں اُس کی وہ مسکراتی شبیہ ابھری، جیسے وہ اُس کے سامنے کھڑا ہے، اُس کی جانب ہاتھ بڑھا رہا ہے۔

ایمان کا دل تڑپ اُٹھا، وہ بے اختیار اُٹھ کھڑی ہوئی، بھاگتے ہوئے اُسے گلے لگانے کے لیے لپکی، جیسے وہ ایک لمحے کے لیے اُسے اپنی بانہوں میں بھر سکے۔ مگر جیسے ہی اُس نے اُسے چھونا چاہا، وہ شبیہ دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔

وہ وہاں نہیں تھا، وہ کہیں دور تھا، شاید اُس جیل کی کوٹھری میں، جہاں اُسے ان جرائم کا سامنا تھا جن کا ارتکاب اُس نے کبھی کیا ہی نہ تھا۔

اُس لمحے ایمان کا دل ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اُس کے قدم لڑکھڑائے، اور وہ فرش پر گر گئی۔ اُس کی ہچکیاں کمرے کی خاموشی کو چیر رہی تھیں۔ وہ چلا گیا تھا، وہ اُسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔۔۔ اور یہ حقیقت اُس کے وجود کو چیرنے کے لیے کافی تھی۔

اچانک اُس کی نظر موبائل کی اسکرین پر آئی۔ وہاں معارج کا آخری پیغام موجود تھا، وہ پیغام جو معارج نے گرفتاری سے پہلے اُسے بھیجا تھا۔ ایمان نے لرزتے ہاتھوں سے اُسے کھولا اور پڑھنے لگی، ہر لفظ اُس کے دل پر ہتھوڑے کی مانند ضرب لگا رہا تھا۔ “فکر مت کرو، ایمان۔ میں جہاں بھی ہوں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں، ہمیشہ۔ مضبوط رہنا، میں جانتا ہوں یہ وقت مشکل ہے لیکن تمہیں خود کو ٹوٹنے نہیں دینا۔ میری محبت تمہارے ساتھ ہے، ہم اس آزمائش کو بھی سر کر لیں گے۔ میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔”

اُس نے اس پیغام کو بار بار پڑھا، جیسے اُس میں معارج کی موجودگی محسوس کرنا چاہتی ہو، جیسے یہ الفاظ اُس کی بکھری ہوئی دنیا کو جوڑنے کا ذریعہ بن سکیں۔ لیکن اُس کے دل کی گہرائیوں میں وہ جانتی تھی کہ یہ پیغام کبھی دوبارہ نہیں آئے گا، اور معارج کبھی بھی اُسے جواب نہیں دے سکے گا۔

وہ چاہتی تھی کہ وہ اُسے بتا سکے کہ وہ اُس سے کتنی محبت کرتی ہے، اُس کی کتنی یاد آتی ہے، اور اُس کے بغیر جینا اُس کے لیے کس قدر دشوار ہو چکا ہے۔

ایمان کی دنیا اب صرف ایک ویران، سنسان خلا تھی، جہاں کوئی روشنی، کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔

ایمان کے جسم پر خارش کی شدت مزید بڑھ گئی تھی، اور یہ ازیت جیسے اُس کی روح تک میں سرایت کر گئی ہو۔ معارج کا سویڈن میں گرفتار ہونا اور جانوروں کا مر جانا، ان واقعات نے گویا ایک کے بعد ایک آزمائش کا دروازہ کھول دیا تھا۔

اُس کے چہرے اور جسم پر خراشوں کے نشان گہرے ہوتے جا رہے تھے، گویا ہر گزرتا لمحہ اُسے اندر سے توڑ رہا ہو۔ وہ پانی لینے کچن کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی نے اُسے چونکا دیا۔

فون کی اسکرین پر سویڈن کا نمبر چمک رہا تھا۔ دل جیسے ایک لمحے کو دھڑکنا بھول گیا ہو۔ اُس نے دھیرے سے کال ریسیو کی اور بے یقینی کے عالم میں کہا، ”ہیلو؟“۔

دوسری طرف سے ایک جانی پہچانی، گہری اور پر سکون آواز ابھر۔

تمہاری نگاہیں ہیں خاکِ زمیں،

جہاں میرے خوابوں کا سورج مکیں۔

تم ہو وہ چاند، وہ نورِ جمال،

جس سے ہو روشن میرا ماہ و سال۔

تم بُعد بھی ہو، تم قربت بھی،

تم لمحوں کا دریا، محبت بھی۔

تم ہو خلش، ایک چاہت کا راگ،

تمنا کا جھونکا، خماروں کا باغ۔

تمہاری یادیں ہیں دھڑکن کا ساز،

جو ہر پل سناتی ہیں دل کی آواز

تم ہو وہ خواب جو بنادے خواب کو حقیقت،

بکھرے ہوئے خوابوں میں بھر دے رفاقت۔

ہجر بھی تم ہو، وصال بھی تم،

شامِ فسرده کی چاندنی تم۔

تم سے ہے سانسوں میں تازہ بہار،

تم ہی ہو دل کا قرار و خمار۔

ایمان جیسے اُس آواز پر یقین کرنے سے قاصر تھی۔ وہ بے ساختہ بولی، ”معارج! یہ تم ہو؟“۔

دوسری طرف معارج کی نرم سی ہنسی سنائی دی، ”ہاں، بٹر فلائے، یہ میں ہی ہوں۔ کیسی ہو میری جان؟“۔

ایمان کی سانسیں جیسے رک سی گئیں۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اور وہ بے یقینی کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ”معارج... تم؟ تم وہاں کیسے ہو؟ کیا تم ٹھیک ہو؟“ اُس کی آواز لرزنے لگی اور آنکھوں میں آنسو اُٹھ آئے۔

معارج نے ایک سکون بھری سانس لی اور مسکراتے ہوئے بولا، ”میری جان، میں ٹھیک ہوں۔ بلکہ سچ کہوں تو میں مزے میں ہوں۔ یہ جیل نہیں، بلکہ جنت ہے۔“۔

اُس کی آواز میں اطمینان اور مزاح کا رنگ واضح تھا۔ ”تم سوچ رہی ہو گی کہ سویڈن کی جیلیں پاکستان کی طرح ہوں گی؟ نہیں، میری زندگی! یہ تو جیسے کسی ہوٹل کا سوئٹ ہو۔ یہاں میرے سیل میں لکڑی کی میز، ایک آرام دہ کرسی، اور خوبصورت دھاری دار بستر بچھا ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی کھڑکی بھی ہے، جس سے باہر کا منظر دل کو بہلاتا ہے۔“۔

معارض نے بات جاری رکھی، ”اور جانتی ہو؟ یہاں کے لوگ میرے ساتھ جیسے کوئی مہمانِ خاص جیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ ایک گارڈ، جو میرے پوڈ کاسٹ کا مداح نکلا، اُس نے مجھے یہ فون دیا تاکہ میں تمہیں کال کر سکوں۔ بس کاش یہاں وائی فائی ہوتا تاکہ ویڈیو کال بھی کر لیتے!“۔

ایمان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ دھیرے سے بولی، ”تم مذاق کر رہے ہو، معارج۔ تم صرف مجھے تسلی دے رہے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ وہاں تمہاری حالت اچھی نہیں ہو سکتی۔“۔

معارض کی آواز میں نرمی اور محبت گھل گئی ”نہیں، میری جان۔ میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں۔ سویڈن کی جیلیں بحالی کے لیے بنائی گئی ہیں، سزا کے لیے نہیں۔ یہاں ہر قیدی کو عزت دی جاتی ہے، اور انہیں نئی زندگی کی طرف لوٹنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تفریح، تعلیم، اور مختلف سرگرمیوں کے ذریعے ہمیں زندگی کا نیا پہلو دکھایا جاتا ہے۔ یہاں کی فضا میں سکون ہے، اور لوگ واقعی سیکھنے اور سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔“۔

ایمان نے بے بسی سے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھا اور سر جھکا لیا۔ ”مگر معارج، وہ تمہیں سزا دیں گے... تم پر سنگین الزامات ہیں...“۔

معارض نے ہلکی ہنسی کے ساتھ کہا، ”میری زندگی، سویڈن کی جیلیں ایسی نہیں ہوتیں۔ یہاں تو لوگ جیلوں میں بہتر انسان بن کر نکلتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں یہاں محفوظ ہوں، اور جلد تمہارے پاس آ جاؤں گا۔ جب تک، اپنی ہنسی برقرار رکھنا۔ تمہاری مسکراہٹ ہی میری سب سے بڑی طاقت ہے۔“۔

ایمان نے آنسو پونچھتے ہوئے سر ہلایا، مگر اُس کا دل اب بھی بے چین تھا۔ معارج کی باتوں میں جیسے سچائی تھی، مگر یہ سب کچھ اُسے حقیقت سے کوسوں دُور محسوس ہو رہا تھا۔

وہ مدھم اور شکستہ لہجے میں گویا ہوئی، ”تمہارے بغیر زندگی ویران و بے مایہ ہو گئی ہے، معارج۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے حیات کی تمام رنگینیاں پھیکی پڑ چکی ہوں اور گویا زندگی کی روح ہی پرواز کر گئی ہو۔ کبھی تمہارے چہرے کی جھلک دل کو تسکین بخشا کرتی تھی اور تمہاری یادوں کا سایہ خوابوں میں سکون بن کر نیندوں کو باندھ لیتا تھا، مگر اب سب کچھ ویسا نہیں رہا۔ خدا کے لیے، کچھ بھی کرو اور واپس لوٹ آؤ، ورنہ یہ زندگی بے معنی ہے۔“

معارج نے ایمان کی بات سنی، اور اُس کے چہرے پر چھائے سکون کے پردے میں ایک لمحے کو ہلکی سی دراڑ آئی، مگر فوراً ہی اُس کی آنکھوں میں عجب گہری چمک لوٹ آئی۔ اُس نے بے نیازی سے اپنے پیر دبانے والے شخص کو ہاتھ کے اشارے سے ہٹایا، جیسے کسی بادشاہ نے خادم کو فارغ کیا ہو۔

وہ اپنے بستر سے آہستگی سے اٹھا، دھیرے دھیرے قدموں سے میز کے پاس جا کھڑا ہوا، گویا ہر قدم میں ایک ٹھہراؤ اور تمکنت جھلک رہی ہو۔

کمرے کے ہلکے سرمئی پردے سے آتی مدھم روشنی نے اُس کے تراشیدہ چہرے کو مزید دلکش بنا دیا تھا۔ لمبے قد اور چوڑے شانوں کے ساتھ، وہ جیسے خود میں ایک مجسمہ تھا، جو عیش اور اختیار کا پیکر معلوم ہوتا تھا۔

اُس کی شرٹ کے اوپری بٹن کھلے تھے، گردن پر ہلکی رگیں نمایاں تھیں، اور مسکراہٹ کے ساتھ اُس کے لبوں پر وہی بے فکری کا رنگ تھا، جو کسی ایسے شخص میں ہوتا ہے جسے زندگی کے کسی موڑ پر جھکنا نہیں آیا۔ اُس نے میز پر رکھی کتاب کو ایک انگلی سے بند کیا، اور پھر فون کے قریب آتے ہوئے بولا، ”ایمان، سب کچھ چھوڑو۔ صرف اپنا خیال رکھو پلیز تم بتاؤ تم ٹھیک ہو؟“

ایمان کی ہچکیاں سن کر اُس کا چہرہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ دوسری طرف ایمان کا دل جیسے غم کے بوجھ تلے دب گیا تھا۔ وہ ٹوٹ کر بولی، ”میں ٹھیک نہیں ہوں، معارج۔ ہمارے سارے جانور مر چکے ہیں۔ کسی نے اُنہیں مار ڈالا۔ میں نہیں جانتی کون... اور کیوں۔ جب میں پہنچی، تو سب مردہ پڑے تھے۔ وہ ہی تو تھے میرے واحد دوست، میرا واحد سہارا، میری زندگی کی آخری خوشی۔ اور اب... اب وہ سب چلے گئے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ میں... میں اس دنیا میں بالکل اکیلی ہوں، معارج۔“

معارج کی مسکراہٹ ایک لمحے کو مدھم ہوئی، اور اُس کی آنکھوں میں گہری چمک کے ساتھ کچھ شدید بھڑک اٹھا۔ اُس کے وجود میں جیسے کوئی طوفان ہلکورے لینے لگا ہو، مگر اُس نے خود پر مکمل قابو رکھا۔ وہ

دھیرے سے پیچھے مڑا، اپنی پُر سکون چال کے ساتھ بستر پر بیٹھتے ہوئے پیر پر پیر چڑھایا اور آرام سے تکیے سے ٹیک لگائی۔ اُس کے چہرے پر وہی پُر اسرار مسکراہٹ لوٹ آئی، مگر آنکھوں میں اب بھی شعلے سلگ رہے تھے۔

۔ ”کیا کہا؟ سارے جانور؟“ اُس نے ایک بھاری سانس لیتے ہوئے کہا، جیسے یہ خبر بھی اُس کی تمکنت کو نہیں ہلا سکی۔ ”یہ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ کس میں اتنی ہمت ہوئی کہ وہ ہمارے جانوروں کو ہاتھ بھی لگائے؟“ اُس کی آواز میں ایک عجیب ٹھہراؤ تھا، مگر اندر کہیں غصے کی دبی ہوئی چنگاریاں محسوس ہو رہی تھیں۔

ایمان نے روتے ہوئے جواب دیا، ”مجھے کچھ نہیں پتہ معارج۔ میں کچھ بھی نہیں جانتی... بس اتنا کہ وہ چلے گئے ہیں۔ اور میں... میں تمہیں بھی بہت یاد کرتی ہوں۔ مجھے تمہاری سخت ضرورت ہے، معارج۔“

معارج نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں، جیسے اُس کے اندر کوئی گہری سوچ جاری ہو۔ پھر وہ آہستگی سے مسکرایا، جیسے اُس نے دنیا کے تمام مسائل کا حل اپنے ہاتھ میں لے لیا ہو۔ ”ایمان، میری جان، سنو۔ تم اکیلی نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، چاہے جیل کی یہ دیواریں ہوں یا کوئی اور دنیا۔“

اُس کی آواز میں ایک عجیب سا سحر تھا، جیسے وہ الفاظ سے ہی ایمان کو تھام رہا ہو۔ ”میں یہاں مزے میں ہوں، اپنی دنیا کا بادشاہ ہوں، اور جلد تمہارے پاس بھی آ جاؤں گا۔ جو بھی ہمارے جانوروں کے ساتھ ہوا،

میں اُس کا حساب خود لوں گا۔ تمہیں بس ایک بات یاد رکھنی ہے... تم کبھی بھی اکیلی نہیں ہو، نہ پہلے، نہ اب، نہ کبھی۔”

اُس کے یہ الفاظ جیسے ایمان کے دل میں امید کی کوئی ٹمٹماتی شمع روشن کر گئے۔

معارض کی آواز گہری اور وقار بھری تھی، جیسے ہر لفظ میں پوشیدہ کوئی نہاں معنی چھپا ہوا ہو، گویا ہر حرف ایک ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ وہ مزید مخاطب ہوا، کہ شاید ایمان کے مضطرب دل کو قرار نصیب ہو، ”ایمان، جو تم محسوس کر رہی ہو، وہ وقتی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں، زندگی کی راہیں پھر سے اپنے رنگوں میں لوٹ آئیں گی۔ صبر کرو، کہ ہر اندھیری رات کے بعد سحر ضرور طلوع ہوتی ہے۔“

وہ مزید اسے دلا سہ دیتے بولا۔

۔ ”فکر نہ کرو، میری زندگی۔ مت رو، میری جان۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ آزمائش اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ اُنہیں آزماتا ہے جن سے وہ محبت کرتا ہے، اُنہیں خالص کرنے کے لیے، اُنہیں اُن کی اصل پہچان عطا کرنے کے لیے۔ جو صبر کرے، وہ ہی اللہ کا محبوب بنتا ہے۔ یہ دنیا عارضی ہے، لیکن آخرت کی نعمتیں ہمیشہ رہنے والی ہیں۔ ہمیں خود کو اللہ کے سپرد کرنا ہو گا اور اُس کی حکمت پر بھروسہ رکھنا ہو گا۔“

ایمان کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے، مگر معارج کی باتوں میں ایسی گہری تسلی تھی کہ وہ اُس کی آواز کے سہارے خود کو تھامنے کی کوشش کرنے لگی۔ معارج نے اُسے مضبوطی سے کہا، ”ہمیں قرآن کا وہ وعدہ یاد رکھنا چاہیے

155:2-156 سورہ البقرہ

اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کچھ خوف، بھوک اور مال و جان اور پھلوں کی کمی سے، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو۔ وہ لوگ جنہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: یقیناً ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

وہ قرآن کی آیت کا ترجمہ پڑھ کر مزید بولا۔۔۔“

اللہ کی رحمت ان ہی پر برستی ہے جو آزمائشوں میں صبر کرتے ہیں۔ ہم بھی انہی میں شامل ہوں گے، ان شاء اللہ۔ ہمیں راضی رہنا ہے اُس کی رضا پر، کیونکہ وہ ہی بہتر جانتا ہے۔۔۔“

ایمان نے روتے روتے کانپتی ہوئی آواز میں کہا، ”میں بہت تھک چکی ہوں، معارج۔ میرے پاس اب کچھ نہیں بچا۔۔۔ نہ کوئی سہارا، نہ کوئی خوشی۔۔۔“

معارض نے گہری سانس لی، جیسے اپنے دل پر ضبط کا بوجھ لیے ہو۔ اُس کے الفاظ میں شفقت بھی تھی اور عزم بھی۔

- ”تم اکیلی نہیں ہو، ایمان۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تمہارا ہر آنسو اُس کے علم میں ہے، اور ہر غم اُس کی رحمتوں کے دروازے کھولنے کا سبب بنے گا۔ تمہیں بس دعا کرنی ہے، صبر کرنا ہے، اور اللہ کے قریب رہنا ہے۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا، اور اُس کے بعد جو سکون اور خوشی ملے گی، وہ کبھی ختم نہیں ہوگی۔“

معارض کی آواز میں اب بھی ایک گہری نرمی اور محبت تھی۔

- ”مجھے تم پر اور اللہ کی رحمت پر مکمل یقین ہے۔ جو بھی ہوا، وہ آزمائش ہے، لیکن تم اس میں تنہا نہیں ہو۔

یاد رکھو

إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (الشرح 6:94)۔“

ایمان نے دھیرے سے سسکتے ہوئے کہا، ”معارض، میں تمہیں بہت یاد کرتی ہوں۔“

معارض کے لبوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ ابھری، مگر اُس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی چھائی رہی۔۔ ”میں بھی تمہیں یاد کرتا ہوں، ایمان۔ لیکن یہ فاصلہ وقتی ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، اور اُس سے دعا مانگتی رہو۔

میں جلد تمہارے پاس لوٹوں گا، ان شاء اللہ۔“

اُس نے اپنی بات کے اختتام پر گہری نرمی سے کہا

- ”اللہ ہمارے دلوں کو صبر دے، ہمیں اپنی رحمت میں لپیٹ لے، اور ہمیں ان لوگوں میں شامل کرے جن پر اُس کی بے حساب نوازشات ہوتی ہیں۔ آمین۔“

ایمان نے روتے روتے سرگوشی کی، ”آمین... میں تمہارے لیے دعا کرتی رہوں گی، معارج۔ اللہ ہمیں پھر ملائے۔“

معارج نے آنکھوں میں ایک پُر عزم چمک کے ساتھ کہا، ”اللہ نے ہمیں جوڑ رکھا ہے، اور کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔ صبر کرو، دعا کرو، اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔“

فون کے دوسرے سرے پر خاموشی چھا گئی، مگر دلوں میں امید کی ایک لوروشن ہو چکی تھی۔ معارج نے فون بند کیا، آنکھیں بند کیں اور دل سے کہا، ”الحمد للہ، ہر حال میں اللہ کا شکر۔“

...°...

معارج اپنی جیل کے کمرے میں تنہا تھا، جہاں خاموشی موت کی طرح گہری تھی۔ وہ فرش پر پلکوں سے پسینہ پونچھتے ہوئے پیش اپس لگا رہا تھا، ہر بار اس کے کسرتی بازوؤں کی رگیں خون کے بہاؤ کے ساتھ نمایاں ہو کر ابھرتیں۔

اس کی سانسیں ہموار تھیں، جیسے کہ اسے اس قید خانے کے ماحول کی کوئی پرواہ نہ ہو۔ کمرے میں مدہم بلب کی روشنی اور کھڑکی سے آنے والی سرد ہوا اس کی عادت سی بن چکی تھی۔ اس کے لئے وقت کی کوئی قدر نہیں تھی، اس کا ہر لمحہ ایمان کے ساتھ جڑا ہوا تھا، اور اس کے جسم کو فٹ اور مضبوط رکھنے کا مقصد صرف ایک تھا: اپنے مقصد کو پانے کے لیے خود کو فولادی بنانا۔

دروازہ ایک غیر محسوس آواز کے ساتھ کھلا، لیکن معارج کی توجہ اپنی ورزش سے نہ ہٹی۔ ایک سایہ کمرے میں داخل ہوا، اور وہ جانتا تھا کہ یہ کون تھا۔ وہ بغیر سر اٹھائے اپنی گنتی میں مصروف رہا، جیسے آنے والے کی موجودگی سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔

سایہ خاموشی سے آکر اوپر والے بستر پر بیٹھ گیا، اور معارج نے اپنے ہاتھوں کی تالیاں بجاتے ہوئے اگلا پیش اپ شروع کر دیا۔

۔ ”میں تم سے بات کرنے آیا ہوں،“ اس سایے نے آخر کار خاموشی توڑ دی۔

معارج نے خشک لہجے میں کہا، ”میں تمہارے ساتھ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ جلدی بولو، کیا پیشکش ہے؟“۔

آدمی نے گہری سانس لی اور اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔۔

۔ ”وہ جگہ، جہاں تم نے ہماری بقا کا راز چھپایا ہے، ہمیں اس کا پتہ بتادو۔ ہم ہلاکت کے دہانے پر کھڑے ہیں، اور تمہارے بغیر ہمارا کوئی وجود نہیں۔ تمہارا خاموش رہنا ہماری موت کا فرمان ہے۔ ہمارے قائد کھانس کھانس کر اپنی آخری سانسیں گن چکے ہیں۔ ان کے لبوں سے خون اُبلنے لگا، اور آخر میں ان کی کھانسی کے ساتھ ایک جمے ہوئے خون کا لو تھڑا، گٹھلی کی صورت میں ان کے حلق سے نکل کر زمین پر گر گیا، جیسے موت نے اپنے پنجے گاڑ دیے ہوں۔

تم سمجھتے ہو کہ ہم تمہاری چالوں سے خوفزدہ ہو جائیں گے؟ تم ہمیں بھسم کرنے کی کوشش میں اپنی ہلاکت کو دعوت دے رہے ہو۔ ”

معارض کی آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، لیکن اس کے ہاتھ زمین پر مضبوطی سے جڑے رہے، پس اپس کا تسلسل نہیں رکا۔ ”وہ ہی لیڈر، جو میری بیوی پر بکواس کرتا تھا؟ اس کی موت تو میں نے اسی دن لکھی تھی۔ تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں تمہیں بچانے کے لئے یہاں ہوں؟۔ فکر مت کرو، جج کا فیصلہ تم سب کی تقدیر کا بھی فیصلہ کر دے گا۔ ”

اس کے جسم کی پٹھیاں اور رگیں تناؤ میں تھیں، جیسے وہ اپنی جسمانی طاقت سے اپنی باتوں کا وزن بڑھا رہا ہو۔ ”اگر مجھے سزا ملے گی، تو یہ میری رہائی ہوگی، میری کامیابی۔ میں ایک فاتح کے طور پر مر جاؤں گا، اور تم... تم ہمیشہ کے لیے ہارنے والے رہو گے۔ تم میں اور مجھ میں یہ ہی فرق ہے، میں طاقتور ہوں، تم کمزور۔ میں سلطان ہوں، اور تم میرے غلام۔ ”

آدمی نے دھیرے سے کہا، ”معارج، اگر وہ تمہیں تختہ دار پر لٹکا بھی دیں، تو تمہیں کیا حاصل ہو گا؟ تمہاری خاموشی آخر کیا دے گی؟ تم مر کر اپنے پیچھے کیا چھوڑو گے؟“۔

معارج نے بے پرواہ انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔ پس اپس کرتے کرتے ایک دم رک گیا۔ اپنے پیر دیوار کے ساتھ ٹکا کر، سیدھا لیٹ گیا اور پھر اچانک ایک زوردار قہقہہ لگایا، جس میں طنز اور بیگانگی کا بے پناہ رنگ تھا۔

۔ ”تم یہ بھی جانتے ہو کہ اگر میں مر گیا تو تمہاری سوسائٹی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ میرا کیا ہو گا؟ میں تو جنت کے فردوس میں چلتا پھرتا نظر آؤں گا، اور تم؟ تم لوگ جہنم کے بھڑکتے شعلوں میں سسکتے رہو گے۔ میں اپنی میراث چھوڑ کر جاؤں گا، ایک ایسا ورثہ جو رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ اور تم؟ تمہارے حصے میں فقط ذلت اور رسوائی آئے گی۔“۔

وہ لمحے بھر کورکا، پھر اس نے ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ سے سر ہلایا۔ اپنے پیر دوبارہ دیوار کے ساتھ ٹکائے اور ایس کی ورزش کرتے ہوئے اپنے جسم کو اوپر نیچے کرنے لگا۔ ہر اٹھان میں اس کی مضبوط پٹھیاں واضح ہو کر چمک اٹھتیں، جیسے وہ جسمانی طاقت کا مجسمہ ہو۔

۔ ”میں اپنی بیوی کے لیے افلاک کا وہ محافظ گنبد ہوں، سورج کی تپش اور اوزون کی وہ باریق تہہ ہوں جو ہر بلا اور آفت سے اس کا حصار کرتی ہے۔ تم میں اتنی جرات نہیں کہ میرے سامنے کھڑے ہو سکو۔ اگر تم

نے میری راہ میں قدم رکھا تو میں تمہیں ایسے جسم کر دوں گا جیسے سورج نے مرتح کو راکھ میں بدل دیا تھا۔
یہ میرا وعدہ ہے! تمہارے پاس سوچنے کا وقت کم ہے، فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اور سنو، اگر میں اس
قید خانے میں بھی ہوں تو یہ قید میرے لیے جنت سے کم نہیں۔ ایک خواب جو سویڈن کی نرم شاموں کی
طرح مجھ پر سایہ فگن ہے۔ لیکن تم؟ تم آزاد ہو کر بھی میری گرفت میں ہو، تمہارے سینے میں وہ دل ہی
نہیں جو سکون سے دھڑک سکے۔ تم کبھی آزاد نہ ہو گے، کبھی چین کی سانس نہ لے سکو گے۔ میں تمہاری
رگوں میں ایسا سراپ بن کر دوڑوں گا کہ تمہیں نہ نیند آئے گی نہ راحت۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیے، میں قید ہو کر بھی آزاد ہوں، اور تم آزاد ہو کر بھی میری مٹھی میں جکڑے ہوئے
ہو۔ یہ قید صرف تمہاری شکست کا پیش خیمہ ہے، تمہاری بربادی کا نقارہ بج رہا ہے۔”

آدمی، جو پہلے معارج کی باتوں سے زنج ہو چکا تھا، شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا اور زہر بھری آواز
میں بولا، ”اور اگر تمہاری بیوی مر جائے تو؟“

معارج کی حرکت جیسے پل بھر کے لیے منجمد ہو گئی۔ اس کے چہرے پر سرد مہری تھی، لیکن آنکھوں میں
کچھ لمحوں کے لیے ایک چمک تھی جو دل کے اندر کی چوٹ کو ظاہر کر رہی تھی۔ آدمی نے خود کو فاتح سمجھا،
سیدھا ہو کر بیٹھا، اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے، جیسے معارج کو پچھاڑ دیا ہو۔

لیکن معارج اچانک ہنس دیا۔ اس کی ہنسی ایک گہری تلخی کے ساتھ تھی، جس میں ایک شدید طنز کا رنگ بھی شامل تھا۔ ”تم لوگ چھوٹے موٹے کھیلوں کے کھلاڑی ہو، لیکن میں... میں زندگی کے شطرنج کا بادشاہ ہوں۔ تم جو چال چلے ہو، وہ محض بچوں کی سی ہے۔“

وہ دوبارہ ورزش میں مصروف ہو گیا، پیش اپس کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا جیسے گفتگو میں کوئی وزن ہی نہ تھا۔

۔ ”جاؤ، مار دو میری بیوی کو۔ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اُس میں کچھ اور بھی سرایت کر چکا ہے، میری ذات کا حصہ، وہ جو میری روح کے ساتھ میرے جسم سے گزرتا ہوا اُس تک پہنچا ہے۔ میرے ڈی این اے میں چھپی وہ چپ، جو اب اُس کے وجود کا حصہ بن چکی ہے۔“

وہ تھوڑا رکا، ایک طنزیہ ہنسی لبوں پر ابھری، ”اور جب ہماری نسل آگے بڑھے گی، تو وہ چپ بھی آگے بڑھے گی، ہماری اولاد میں منتقل ہو جائے گی۔ تم سمجھتے ہو کہ تم اسے ختم کر سکتے ہو؟ تمہیں اندازہ بھی نہیں کہ یہ کھیل تمہاری سوچ سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، تمہاری ہر چال میرے ہی دائرے میں گھومتی رہے گی۔“

آدمی کے لبوں پر خاموشی چھا گئی تھی، دل میں خوف کا لہرہ دور تک پھیل گیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ معارج کی موت کے بعد کوئی انجام اُن کے لیے نجات کا پیغام نہیں لاسکتا۔ آدمی کے چہرے پر وہ ہی خوفناک

تاثرات دوبارہ ابھرے، ماتھے پر شکنیں گہری ہو گئیں، جیسے موت کی سرگوشیاں اُس کے اندر گونجنے لگی ہوں۔

وہ کچھ دیر معارج کو سرد مہری سے ورزش کرتے دیکھتا رہا۔ اُس کے پٹھے تنے ہوئے، عرق آلود جسم ہر حرکت کے ساتھ مزید شاندار نظر آتا تھا۔ آدمی معارج کی طاقت کے مظہر کو دیکھتا رہا، پھر بو جھل قدموں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

اُس کے اندر ایک سرد لہر دوڑ گئی تھی، ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ اُسے معلوم تھا کہ معارج کے الفاظ محض دھمکی نہیں تھے، وہ جانتا تھا کہ معارج کی شخصیت میں وہ سرد مہرچمک ہے جو تباہی کے دہانے پر لے جاتی ہے۔

اُس نے اپنی آنکھوں سے معارج کی چالاکیاں دیکھی تھیں؛ اُس نے دیکھا تھا کہ وہ کس طرح لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتا ہے، میڈیا کو اپنی مٹھی میں کرتا ہے، قانون کی گرفت سے بچ نکلتا ہے، اور کس طرح اپنے دشمنوں کے سروں پر پیسوں اور طاقت کی مار کرتا ہے۔

اُس نے دیکھا تھا کہ کس طرح معارج لوگوں کو اپنی محبت کا اسیر بناتا ہے یا اُن کے دلوں میں خوف پیدا کرتا ہے، کس طرح وہ اپنے مداحوں کو اپنا غلام بنا لیتا ہے۔

وہ جان چکا تھا کہ معارج کی شخصیت محض ایک انسان نہیں، ایک ایسا جال تھا جس میں وفاداریاں اور راز پنہاں تھے۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ معارج اپنی ذہانت، دولت، اور چالبازی کے ذریعے جو چاہے حاصل کر سکتا ہے۔

وہ اپنی کرشماتی شخصیت سے ہر جنگ جیت سکتا ہے، ہر مقابلے میں غالب آ سکتا ہے۔ وہ واقعی زندگی کے شطرنج کا شہنشاہ تھا۔

آدمی جانتا تھا کہ معارج کے ساتھ کوئی کھیل کھیلنے کا انجام اُن کی موت پر ہی ختم ہو گا۔ اُس کی نگاہوں میں سرد مہری، غرور اور خود غرضی واضح تھی۔ وہ جانتا تھا کہ معارج کے خلاف جیتنا محال ہے۔

لیکن وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔ اس کے غرور سے، اُس کی کامیابیوں سے، اُس کی محبتوں اور اُس کے ایمان سے۔

بے بسی اور تلخی کے ساتھ وہ کمرے سے نکل گیا۔ دل میں درد اور بد دعا کی لہر تھی، جیسے کوئی شکست خوردہ سپاہی آخری دم تک لڑنا چاہتا ہو، مگر جانتا ہو کہ وہ بے بس ہے۔ اُس نے دروازے کی طرف مڑ کر دیکھا، معارج کا نام سیاہ سیاہی سے لکھا ہوا تھا، جیسے اُس کے دل پر نقش ہو گیا ہو۔

اُس نے غصے سے فرش پر تھوکا اور سرگوشی میں لعنت بھیجی، ”خبیث! سویڈن کے جنگلی کتے، لعنت ہو تم پر، معارج!“

اندر سے معارج کی گہری، محفوظ ہنسی کی بازگشت گونجی، اور اُس کی سرد آواز دروازے کی دراڑوں سے باہر پھسل آئی، ”مجھے پھر واقعی کتابنے پر مجبور مت کرو، ورنہ تمہارا ٹکڑوں میں بٹا ہوا جسم کسی پرانے بیگ میں بند ہو کر یہاں سے جائے گا۔ جانتے ہو؟ میرے لیے تم جیسے کیڑے کو خاموشی سے جہنم کے خطوط پر بھیجنا کوئی مسئلہ نہیں، وہ بھی بغیر کسی چارج کے، بالکل فری ڈلیوری کے ساتھ۔“

معارج کی آواز میں ایک ایسی سرد آگ تھی کہ آدمی کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں، اور وہ غصے اور بے بسی کے عالم میں فوراً وہاں سے نکل گیا۔

...°...

ایمان کی حالت پہلے سے بھی زیادہ بگڑ چکی تھی، اس کے چہرے پر مزید بد نما نشان ابھر آئے تھے اور گردن و ہاتھوں پر بھی اسی طرح کے داغ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک سیاہ فراک میں لپٹی، بیڈ کے کونے میں بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔

اس کے جسم پر عجیب و غریب نقوش ابھرے تھے، ناخنوں کے نیچے چھالے اور تلووں پر سختی تھی، لیکن وہ ان علامات کو نظر انداز کرتی رہی۔

اس کے سامنے مونیٹر کی چوری شدہ فائلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایمان نے ان فائلوں کی تصاویر لی تھیں اور ان تصویروں کا پرنٹ نکالنے کے بعد وہ فائلیں اب اس کے سامنے کھلی تھیں جن کا وہ جائزہ لے رہی تھی

- ”یہ تمام کارروائیاں دراصل مونیٹر کی ہیں، جنہیں نہایت چالاکی سے معارج کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔“

وہ زیر لب بڑبڑائی۔ لیکن جب اس نے مزید گہرائی میں جا کر پڑھاتو مونیٹر نے لکھا ہوا تھا

- ”گوناوار سے وابستگی کے بعد میں نے خود کو ان تمام گھناؤنے افعال سے باز رکھا تھا، گوناوار نے کبھی کسی عورت کو گزند نہیں پہنچایا اور نہ ہی مجھے اس کی اجازت دی۔ اس سے قبل میں بچوں کے استحصال اور عورتوں کی سمگلنگ جیسے سنگین جرائم میں ملوث تھا۔“

ایمان نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکایا اور آہستگی سے بولی، ”یہ فائل معارج کو بچا سکتی ہے۔ اس کی بے گناہی کو ثابت کر سکتی ہے۔ یہ معارج کو آزاد کر سکتی ہے۔“

اسی لمحے، فون کی گھنٹی نے اس کی سوچوں کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ ہی نمبر تھا، جس نے اس کے دل کو ہلا دیا۔ یہ معارج تھا، اس کا شوہر، جو سویڈن کی جیل میں قید تھا۔ ایمان نے تیزی سے فون اٹھایا، دل کی دھڑکن تیز تھی، ”اسلام علیکم، معارج۔“ اس کی آواز میں انتظار کی تلخی تھی۔ دوسری طرف معارج کی گرم اور نرم آواز گونجی، گویا وہ ایک عرصے بعد اپنے دل کی گہرائی سے نکلی ہو۔

وہ اسے ان کی سا لگرہ کے موقع پر لکھی گئی نظم سنانے والا تھا، لیکن ایمان کی دبی دبی پریشانی کو محسوس کرتے ہی رک گیا۔ وعلیکم السلام ایمان، خیریت تو ہے؟ تمہاری آواز سے لگ رہا ہے کہ کچھ پریشانی ہے، کیا تم ٹھیک ہو؟” معارج کی آواز میں فکر اور تشویش صاف جھلک رہی تھی۔

ایمان نے فوراً اپنی اور معارج کی خفیہ زبان کا سہارا لیا، وہ زبان جو وہ دونوں سالوں سے استعمال کرتے آ رہے تھے اور جسے کوئی اور سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اردو کے حروف کو ایک نئے مفہوم کے ساتھ جوڑ کر گفتگو کرنے کا ہنر صرف وہ دونوں جانتے تھے، جیسے ”ف“، ”ک“، ”اور“ی کے حروف کا استعمال ایک راز کی زبان میں۔

۔ ”معارج، تمہاری جان بچ سکتی ہے۔ میرے پاس ٹھوس شواہد موجود ہیں، مونیز کے تمام گھناؤنے جرائم کی تفصیلات، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ مونیز کا کیا دھرا ہے اور تمہیں ان سب میں جان بوجھ کر ملوث کیا گیا ہے۔ ہر بات واضح ہے کہ تم بے قصور ہو، تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔“

وہ بولتی گئی، دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، ”بس اپنے کسی آدمی کو بھیجو، میں فائل اُس کے حوالے کر دوں گی۔“

معارج کی دوسری طرف سے ایک پرسکون مسکراہٹ نے ایمان کے دل کو تھام لیا۔ ”جانِ معارج، مجھے اس فائل کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس ایک اور منصوبہ ہے۔ میں اگلے ہفتے واپس آ رہا ہوں۔“

ایمان کے ہوش اُٹ گئے۔ ”کیا؟ تم کیسے؟“ اس کی آواز میں بے یقینی جھلکنے لگی۔

۔ ”بس دعا کرو اور مجھ پر بھروسہ رکھو۔ سب کچھ میرے کنٹرول میں ہے۔“ معارج کی آواز میں سکون تھا، گویا وہ تمام مشکلات کو پہلے ہی حل کر چکا ہو۔

۔ ”اب مجھے فون بند کرنا ہوگا، لیکن یاد رکھنا، اپنا بے حد خیال رکھنا۔ میری محبت ہمیشہ تمہارے ساتھ ہے اور یہ فاصلہ محض چند لمحوں کی بات ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جلد ملائے گا۔ تم میری زندگی کا حاصل ہو، اور ہر لمحہ تمہاری یاد دل میں موجزن رہتی ہے۔“

ایمان نے فون نیچے رکھا اور آئینے کے سامنے جا کر اپنی صورت دیکھی۔ اس کا چہرہ بے نور تھا، جسم پر چھالے اور نشانات نمایاں تھے۔ وہ آئینے کے عکس میں کھو گئی اور زیر لب خود سے کہا ”۔

”مجھے کل ہی اسپتال جانا ہوگا، اب مزید برداشت نہیں ہو رہا۔ میرا چہرہ بگڑتا جا رہا ہے، اور میں ان تمام فکروں میں خود کو بالکل بھول چکی ہوں۔“ ایمان کی آواز میں بے بسی اور شدید گھبراہٹ نمایاں تھی۔

وہ گہرا سانس لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور معارج کی سلامتی کے لیے دعا کی۔ اس کی رہائی، اس کی خوشی، اور ان دونوں کے دوبارہ ملنے کے لیے دعا کی۔ اس نے معجزے کے لیے دعا کی، دل میں امید کے چراغ جلانے، جیسے کسی تاریک رات میں دور ایک چھوٹا سا دیا جل رہا ہو، اور اس کا انتظار طویل لیکن ناگزیر ہو۔

اگلے دن ایمان ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھی اضطراب کے عالم میں اپنے ٹیسٹوں کے نتائج کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا دل کسی انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا اور ماتھے پر ہلکا سا پسینہ چمکنے لگا تھا۔ پچھلے چند ہفتوں سے اس کی جلد پر بے ترتیب نشانات، خارش اور ہلکا سا درد اسے بے چین کر رہا تھا، لیکن اس نے اپنی توجہ معارج کی مشکلات پر مرکوز رکھی تھی۔ اس نے اپنی صحت کو نظر انداز کر دیا تھا، کیونکہ اس کے شوہر کا معاملہ اس کی زندگی کا مرکز بن چکا تھا۔

ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی سنجیدگی تھی۔ وہ ایمان کے سامنے بیٹھتے ہوئے کچھ پل خاموش رہی، جیسے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر ہچکچاہٹ کے آثار تھے، پھر اس نے آہستہ سے کہا، ”ایمان... مجھے آپ سے ایک سنگین بات کرنا ہے۔“

ایمان نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں دیکھا اور ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ”کیا مسئلہ ہے، ڈاکٹر؟“ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

ڈاکٹر نے گہری سانس لی، جیسے کوئی بوجھ اٹھا رہی ہو۔ ”آپ کے ٹیسٹ کے نتائج آئے ہیں... اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کو جلد کا کینسر ہے، ایمان۔ یہ ایک بہت ہی جارحانہ قسم ہے جسے میلا نوما کہا جاتا ہے۔“

ایمان کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے وجود کو جکڑ لیا ہو۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا،۔

۔“کینسر؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ تو بس خارش اور دباؤ کی وجہ سے تھا، مجھے تو لگا تھا یہ کوئی عام سامسلہ ہے۔”۔

ڈاکٹر نے کچھ پل خاموشی اختیار کی، پھر نرمی سے سر جھکا لیا۔ “یہ عام مسئلہ نہیں ہے، ایمان۔ آپ کے جسم پر جو نشانات ہیں، وہ میلانوما کی واضح علامات ہیں۔ یہ کینسر کی انتہائی خطرناک قسم ہے اور بد قسمتی سے یہ آپ کے جسم میں کافی عرصے سے پھیل رہا ہے۔ آپ کی پیٹھ پر موجود دھبے اور ناخنوں کے نیچے موجود چھالے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ کینسر بہت آگے بڑھ چکا ہے۔”۔

ایمان کی آنکھوں میں نمی سی ابھر آئی۔ “نہیں، ڈاکٹر، یہ نیا ہے، یہ حالیہ پریشانیوں کی وجہ سے ہے۔ یہ محض ایک وقتی اثر ہے۔ معارج جیل میں ہے، اور میں اس کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے لڑ رہی ہوں۔ میں نے اپنے لیے کبھی وقت ہی نہیں نکالا، میرے پاس اس کی فکر میں رہنے کے سوا کوئی اور کام نہیں ہے۔”۔

ڈاکٹر نے ہلکا سا افسوس بھرے لہجے میں کہا، “ایمان، میں جانتی ہوں کہ آپ کی زندگی میں بہت سی مشکلات ہیں، لیکن یہ حقیقت کو بدل نہیں سکتی۔ یہ کینسر طویل عرصے سے آپ کے جسم میں موجود ہے اور اب یہ آپ کے لف نوڈس اور دیگر اعضاء میں پھیل چکا ہے۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ حالت ہے۔”۔

ایمان کا جسم لرز نے لگا۔ ”کیا آپ کا مطلب ہے کہ یہ لاعلاج ہے؟“ اس کی آواز میں خوف اور بے یقینی نمایاں تھی۔

ڈاکٹر نے گہری نظر سے ایمان کی طرف دیکھا، پھر ہلکے سے سر جھکا کر کہا، ”بد قسمتی سے، ہاں۔ ہم اس کینسر کو روکنے کے قابل نہیں رہے۔ یہ آخری مرحلے میں ہے اور علاج سے بھی زیادہ بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔“

ایمان کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی دنیا اچانک ہی ختم ہو گئی ہو۔ ”تو... کیا میں مرنے والی ہوں؟“ اس نے کانپتی آواز میں کہا، جیسے اسے اپنے الفاظ پر بھی یقین نہ ہو۔

ڈاکٹر نے بے چارگی سے سر ہلایا۔ ”ایمان، ہم صرف آپ کے درد کو کم کر سکتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہی ہے کہ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ شاید چند مہینے، یا اس سے بھی کم۔“

ایمان نے اپنا ہاتھ اپنے چہرے پر رکھا اور ایک لمبی خاموشی کے بعد ہلکی سی ہنسی نکلی۔ یہ ہنسی غم اور بے بسی سے لبریز تھی، جیسے وہ اپنی حالت کی سنگینی کا سامنا کرنے سے انکاری ہو۔

ڈاکٹر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ایمان، یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ یہ آپ کی زندگی کی بات ہے۔“

ایمان نے کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے کہا، ”ڈاکٹر، یہ سب تو میرے لیے پہلے سے طے تھا۔ میری زندگی میں جو کچھ بھی ہوا ہے، اس نے مجھے دکھوں کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ شاید یہ دنیا ہی میرے لیے نہیں تھی۔“

ایک بار پھر ایمان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، مگر آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ جیسے دکھ اور مسرت کا ایک ساتھ امتزاج ہو۔

”پہلے مجھے زندگی سے نفرت تھی، ہر لمحہ مرنے کی خواہش دل میں لے کر جیتی تھی۔ لیکن جب زندگی سے محبت ہوئی، جب معارج آیا... تب میرے پاس وقت ہی نہیں رہا۔“

یہ کہہ کر اس کی آواز لرز گئی۔ تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا مگر لرزتے لبوں کو روک نہ سکی۔ جیسے ہر لفظ کے ساتھ اس کا درد بھی نکلا ہو۔

ڈاکٹر ایک پل کو ٹھٹک گئی۔ وہ پہلے ہی جانتی تھی کہ یہ خبر ایمان کو دینا آسان نہ ہوگا، مگر پھر بھی یہ سب اس کے لبوں سے کیسے نکل گیا، یہ بات اسے خود سمجھ نہ آئی۔ ایک عجیب سی بے بسی اس کے چہرے پر ابھری اور وہ دل میں بولی۔ ”ایمان، میں یہ بات آپ سے کہنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اصول بھی نہیں کہ ہم مریض کو اس کی زندگی کے باقی ماندہ وقت کے بارے میں آگاہ کریں... لیکن نہ جانے کیسے... یہ الفاظ میرے منہ سے نکل گئے۔ جیسے کوئی پوشیدہ طاقت ہو جس نے مجھے مجبور کیا ہو۔“

ڈاکٹر کے چہرے پر حیرانی اور افسوس کی آمیزش واضح تھی۔ جیسے وہ سمجھنے سے قاصر ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے، اور کیوں زبان پر ایسی بات آگئی جو وہ کبھی نہیں کہنا چاہتی تھی۔

ایمان کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی، لیکن آنکھوں کی نمی اور نمایاں ہو گئی۔ وہ گویا زندگی کی اس ناپائیداری کو قبول کر چکی تھی۔ ”ڈاکٹر، کوئی بات نہیں۔ جو وقت میرے پاس تھا، اس میں میری موت نے میری حفاظت کی۔ اب جب وقت مکمل ہو گا، موت بھی آ جائے گی۔ مجھے فکر نہیں کہ کیا ہو گا۔ جو ہونا ہے، ہو جائے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی، جیسے دل کے بوجھ کو ہلکا کر رہی ہو۔

”اب آپ صرف وہ دوائیں بتادیں جو لینا ضروری ہیں، میں خرید لوں گی۔“

ڈاکٹر نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا اور نسخہ لکھ دیا۔ ایمان نے نسخہ لے کر بیگ کندھے پر ڈالا اور چہرے پر نقاب درست کیا۔ پھر اسپتال کے دروازے کی طرف بڑھ گئی، جیسے ہر قدم کے ساتھ وہ زندگی کے ایک نئے باب کی طرف قدم رکھ رہی ہو، جس میں خوف یا اندیشے کی گنجائش نہیں۔

ڈاکٹر دیر تک دروازے کو دیکھتی رہی جہاں سے ایمان جا چکی تھی۔ وہ اب بھی حیرت زدہ تھی کہ کس طرح اس کی زبان سے ایسی بات نکل گئی جو تقدیر سے وابستہ تھی۔ جیسے یہ ساری بات اللہ کے فیصلے کا حصہ ہو، جو ایمان کو بتانا ضروری تھا۔

جیسے ہی ایمان گھر کے دروازے پر پہنچی، نور، حاشر اور بہزاد وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان کے چہروں پر افسوس کے آثار نمایاں تھے۔

وہ بار بار ایمان کو کالز کرتے رہی تھے، مگر ایمان اپنے غم کی گہرائیوں میں یوں غرق تھی کہ اُسے ہوش ہی نہ رہا۔ موبائل سائلینٹ پر تھا، اور وقت جیسے اس کے ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا تھا۔

جب اُس کی نظر اچانک فون کی اسکرین پر پڑی، تو وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ کالز کی بھرمار تھی۔ متعدد مس کالز جو اُس کی غفلت کا نوحہ پڑھ رہی تھیں۔ ایک لمحے کو دل میں ہوک سی اٹھی کہ وہ کب سے اسے پکار رہے تھے اور وہ جواب تک نہ دے پائی۔

پھر اس کی نظر ایک پیغام پر جا رکی، اور جیسے دل پر بوجھ اور بڑھ گیا

”ہم تمہارے گھر کے باہر موجود ہیں۔“

افسوس کی شدت سے اس کا دل مزید بوجھل ہو گیا۔ وہ پل بھر کے لیے جیسے ساکت ہو گئی۔ یہ سب لوگ عمرے سے لوٹتے ہی سیدھے اُس کے گھر آئے تھے، بغیر کہیں رُکے، بغیر کسی اور جگہ جانے کی حاجت محسوس کیے۔ ایئر پورٹ سے سیدھا یہاں، اُس کے دروازے تک... اور وہ؟

وہ شش و پنج میں تھی، بے اختیار خود کو ملامت کرنے لگی۔ اُس کے دل میں بار بار یہ احساس جاگزیں ہونے لگا کہ کس قدر نادانی ہوئی اُس سے۔ جو لوگ اُس کے لیے سفر کی تھکن بھی فراموش کر کے سب سے پہلے اُس کے گھر چلے آئے، وہ اُن کی آوازیں بھی نہ سن پائی، نہ اُن کا انتظار محسوس کر سکی۔

وہ اپنے وجود کی ساری تھکن، سارا بوجھ سمیٹتے ہوئے فوراً گھر کی طرف لپکی۔ دل میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔ کہ وہ کیسے اتنے خلوص سے بھرے لوگ تھے، اور وہ کیوں اُن کا خیر مقدم نہ کر سکی؟

اب ہر قدم پر وہ اپنے آپ کو ملامت کا طوق پہناتی جا رہی تھی۔

اب آخر کار وہ فوراً گھر لوٹ آئی۔

وہ سب معارج کے بارے میں سن کر آئے تھے، دلوں میں افسوس اور زبان پر تسلیاں لیے، مگر ایمان نے بڑی مہارت سے اپنی بیماری کا کوئی اندازہ ہونے نہ دیا۔

نور جلدی سمجھ گئی کہ ایمان تنہائی میں سکون پانا چاہتی ہے۔ لہذا وہ زیادہ اصرار نہیں کر پائی کہ ایمان ان کے ساتھ چلے۔ وہ لوگ بھی بس ایک گھنٹہ بیٹھ کر حال احوال پوچھتے رہے اور پھر رخصت ہونے لگے۔

دروازے کے باہر، نور، حاشر اور بہزاد ایمان کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایمان نے نقاب چہرے پر جمایا ہوا تھا، جس کے نیچے اس کی پریشانیاں اور نشان چھپے ہوئے تھے۔ عبایا کا کھلا ڈلا دامن اور بڑے بازو شاہانہ پوشاک کی مانند اس کے ہاتھوں کو چھپائے ہوئے تھے، جو زمین کو چھوتے جاتے تھے۔

نور نے محبت بھری نظروں سے ایمان کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولی، ”ایمان، اگر تمہیں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، تو ہم سب، حاضر ہیں۔ تم تنہا نہیں ہو۔“

ایمان نے نور کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی، مگر فوراً رک گئی۔ ایک ان دیکھا خوف اس کے دل میں سرسرا نے لگا۔ کہیں بیماری کسی اور کو نہ لگ جائے، کہیں کسی کا بھی نقصان نہ ہو جائے۔ وہ بس ہلکی سی مسکان سے نور کی بات کا جواب دیا۔

۔ ”آپ سب کا ساتھ میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور معارج بھی جلد لوٹ آئے گا۔“

حاشر نے سر اثبات میں ہلایا، ”ان شاء اللہ، بچی۔ اللہ پر یقین رکھو، سب بہتر ہو گا۔“

ایمان نے بھی خاموشی سے سر جھکایا۔ بہزاد آگے بڑھا اور محبت سے بولا، ”ہمیں وہ ہی ایمان پسند ہے جو دلیر تھی، جو ہنستی تھی۔ یہ جو ایمان ہمارے سامنے کھڑی ہے، ہمیں انجان سی لگ رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہ ہی پرانی ایمان بن جاؤ۔“

ایمان کی نظریں دھندلا گئیں، لیکن لبوں پر زبردستی مسکان سجاتے ہوئے بولی، ”بس معارج آجائے، پھر میں بھی ویسی ہی ہو جاؤں گی جیسے پہلے تھی۔“

وہ لوگ کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے، پھر رخصت ہو گئے۔

ایمان دروازے سے لگ کر کھڑی رہی، یہاں تک کہ ان کی گاڑی کے جانے کی آواز دور ہوتی گئی۔ جیسے ہی گاڑی کی گڑ گڑاہٹ ختم ہوئی، ایمان کے صبر کا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ وہ وہیں دروازے کے ساتھ نیچے بیٹھ گئی۔ کچھ لمحے آنسو رکنے کی کوشش کرتے رہے، مگر پھر درد نے اپنی راہ بنالی۔

وہ سسکیاں لیتے ہوئے روتی چلی گئی، ہر آنسو جیسے دل کے بوجھ کو تھوڑا تھوڑا کم کرتا رہا، لیکن سکون پھر بھی کہیں دور تھا۔

”یا اللہ... میری مدد فرما! میں یہ دھبوں سے بھرا چہرہ معارج کے سامنے کیسے لے جاؤں گی؟ میں بد صورت ہو گئی ہوں... اور وہ کہاں، اور اب میں کہاں!“

وہ اپنی ہتھیلیوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میری ساری خوبصورتی ختم ہو گئی... اب میں کیا کروں؟“

آنسو بے اختیار بہتے گئے، اور ہر سسکی کے ساتھ ایمان خود میں مزید سمٹتی چلی گئی، جیسے درد کا بوجھ اس کے وجود کو گھیر رہا ہو۔

...°...

کمرے کی وسعت میں ایک عجیب سا سکوت رچا ہوا تھا، جیسے ہر شے کسی غیر مرئی ہیبت کے زیر اثر تھی ہوئی ہو۔ سیاہ اور گہری لکڑی کے نفیس پینل دیواروں اور چھت کو آراستہ کیے ہوئے تھے، جن کی سطحوں پر چراغوں کی دھیمی روشنی ایک سنہری دھند کی صورت میں تیر رہی تھی۔

کمرے کے وسط میں ایک دیو قامت سنو کر ٹیبل سبز مخملی کپڑے میں لپیٹی ہوئی تھی، اور رنگ برنگی گیندیں اپنی ترتیب میں کسی چھپی ہوئی سازش کا پتہ دے رہی تھیں۔

قالین کا پیچیدہ نقش و نگار اور چمڑے کے صوفوں کے گہرے شید زما حول کو ایسا گھمبیر بناتے تھے کہ جیسے یہ جگہ صرف رازوں اور منصوبوں کے لیے مخصوص ہو۔

دیواروں پر لٹکے فن پارے اس دولت مند ذوق کی عکاسی کر رہے تھے جو فطرت اور حیوانیت کی طاقت کو سراہتا تھا۔ گھوڑوں، شیروں اور عقابوں کے مجسمے ہر کونے میں جیسے ایک غیر مرئی نگرانی کر رہے تھے، اور سب سے نمایاں وہ پورٹریٹ تھا جس میں ایک نوجوان کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایک پراسرار ملاپ تھا—محبت، دکھ اور انتقام کا عجیب امتزاج۔

یہ تصویر وہی تھی جس پر نظریں جماتے ہی کمرے میں موجود لوگ خاموش ہو جاتے، جیسے یہ شخص ان کے ہر قدم کا شاہد ہو۔

صوفوں پر بیٹھے دو آدمی دھیمے لہجے میں گفتگو کر رہے تھے، مگر ان کے الفاظ میں زہر کی تاثیر تھی۔ ایک شخص سنو کر ٹیبل پر جھکا ہوا تھا، کیونکہ ہاتھ میں گھماتے ہوئے گیندوں کو گھورتا، جیسے وہ گیندیں نہیں بلکہ دشمن کے سر ہوں۔

۔ ”ایک کمرہ نہیں ڈھونڈ سکے؟“ پہلا شخص، جس کا چہرہ سر دپتھر کی مانند تھا، نوکر کے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ اس کی آواز میں ایسی حقارت تھی جیسے کسی بیکار شخص کو ٹھکرا رہا ہو۔ ”تم جیسے لوگ ایلومیناتی کا نام بدنام کرتے ہو۔ ایک شخص تم سب کو تنگی کا ناچ نچا رہا ہے؟ یہ کس قدر شرمناک ہے!“۔

نوکر نے شرمندگی سے نظریں جھکا لیں، اس کا وجود خوف کی دبیز تہوں میں چھپا ہوا تھا۔ ہاتھ بے چینی سے مسلتے ہوئے وہ دروازے کے قریب کھڑا رہا، جیسے امید کر رہا ہو کہ کوئی معافی کا موقع مل جائے۔

دوسرے آدمی نے صوفے سے نیم دراز ہوتے ہوئے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ”معارض یا وہ گونار... اس نے ہم جیسے لوگوں کو انگلیوں پر نچایا؟ ہنسا دیا... رلا دیا... اور ہم بے بسی سے تماشہ دیکھتے رہے۔“۔

اس نے سنو کر ٹیبل کے پیچھے دیوار پر آویزاں نوجوان کے پورٹریٹ کی طرف اشارہ کیا، ”یہ ہمارا دشمن ہے... پہلا ہدف، جونچ گیا، اور شاید آخری بھی!“۔

صوفے پر بیٹھا شخص، جو لگ رہا تھا جیسے چند مہینوں میں برسوں کا بوجھ اٹھا چکا ہو، اپنی کنپٹی کو رگڑتے ہوئے تھکے ہوئے لہجے میں بولا، ”ہمارے خاندان کی حالت بگڑ رہی ہے... جیسے کوئی اندر سے تباہ کر رہا ہو۔ جیسے ہمارا جسم ہی ہمارا دشمن بن گیا ہو۔“

دوسرے آدمی نے کھڑکی کی طرف دیکھا، جہاں رات کا آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا، مگر وہ ستارے سرد اور بے جان محسوس ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہری سوچ ابھری، جیسے وہ اپنے گناہوں کا وزن تول رہا ہو۔ ”کبھی کبھی سوچتا ہوں، جو کچھ ہم نے کیا... کیا وہ درست تھا؟“۔

سنو کر کے کھلاڑی نے قہقہہ لگایا، کیونکہ میز پر زور سے پٹخا اور بولا، ”ایک ہی حل ہے... اسے چھوڑ دو۔ زندہ رہنے دو۔ جیل میں رہے یا آزاد۔ ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم دنیا کے مالک ہیں، دنیا کے ہر پہلو پر ہمارا اختیار ہے۔ اگر کوئی ہمارے خلاف بھی ہو، تو کیا؟ ہم ہمیشہ فاتح رہتے ہیں!“۔

اس نے ایک گیند کو نشانہ بنایا اور اسے عین سوراخ میں پھینک دیا۔ تالیاں بجاتے ہوئے بولا، ”یہ ہی تو ہمارا کھیل ہے!“۔

۔ ”جج کو پیغام بھیجو۔ گونار کا کیس فوراً ختم کر دے۔“ اس کی آنکھوں میں ایک خبیث چمک تھی۔۔“ کہو کہ گونار پر مونیز کے کیس اس کے دشمنوں نے ڈالے تھے تاکہ اس کی شہرت کو بگاڑا جاسکے۔ جج کو یہ ہی کہانی سناؤ۔ یاد رکھو، ہم جو کہیں گے، وہ ہی حقیقت بنے گا۔۔“

ایک اور آدمی نے دبے دبے لہجے میں کہا، ”اگر... وہ حادثے میں مر جائے تو؟“

سنو کر کے کھلاڑی نے بے نیازی سے شانے جھٹکے

۔ ”وہ مرے گا، مگر قدرتی طور پر، نہ کہ ہماری سازش کا نتیجہ بن کر۔ حادثہ اور قدرتی موت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔“

اس نے کیو کو میز پر گرا دیا اور مسکراتے ہوئے کہا، ”ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ اسے جینے دیں۔ جو کرے، اسے کرنے دیں۔ کیونکہ دنیا کا نظام ہمارے ہاتھ میں ہے... اور بوس ہمیشہ اوپر رہتا ہے۔“

کھڑکی کے باہر ستارے بدستور جھلملا رہے تھے، مگر کمرے کے اندر ایک خاموش سازش پنپ رہی تھی۔ ایسی سازش جس میں زندگی اور موت دونوں بے وقعت تھیں۔ گیندیں سوراخوں میں غائب ہو رہی تھیں، اور صوفوں پر بیٹھے لوگ اپنی جیت کا جشن منا رہے تھے، جیسے وہ پہلے ہی وقت کو شکست دے چکے ہوں۔

سنو کر کے کھلاڑی نے آخری گیند کو نشانہ بنا کر کہا، ”ہم دنیا کو ایسے ہی کھیلتے ہیں جیسے یہ سنو کر کا کھیل ہو... اور ہارنا کبھی ہمارا اصول نہیں رہا۔“

پھر ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا، ”شیطان جہنم کا راجہ ہے... اور ہم؟ ہم زمین کے تاجدار ہیں!“

ایک اور آدمی ہونٹوں پر ایک کڑی مسکراہٹ لیے دھیمے مگر زہر بھرے لہجے میں بولا، ”بے شک، ایسے لوگوں کے لیے موت ہی اصل نجات ہے، جیسے ہمیں زندگی سے عشق ہے، انہیں موت سے الفت ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ شیطان دوزخ کا شہنشاہ ہے؛ اگر ہم اس کے فرمانبردار بن جائیں، تو وہ ہماری خاطر جہنم کو بھی ٹھنڈا کر دے گا۔ اسی لیے دنیا ہمارے لیے سب کچھ ہے، یہی ہماری جنت ہے، اور ہم اپنی جنت پر کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے۔ جو کچھ ہمیں حاصل ہے، وہی ہمارا حق ہے، اور اس پر قابض رہنے کے لیے ہم ہر حد سے گزر جائیں گے۔“

...°...

دو مہینے بعد

ایمان آئینے کے سامنے بیٹھی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا سفید فراق اس کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا، دوپٹہ بے ترتیبی سے زمین پر پڑا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں بے پناہ درد تھا۔ وہ اپنے چہرے پر

انگلیاں پھیرتے ہوئے آئینے میں خود کو تک رہی تھی، جیسے اپنے وجود کی ٹوٹ پھوٹ کا جائزہ لے رہی ہو۔
ہونٹوں کے اوپر بد نما نشانات نمایاں تھے، اور ہر لمس اس کے اندر کی اذیت کو اور گہرا کر رہا تھا۔
وہ زمین پر جمی ہوئی تھی، اپنی خوبصورتی کے بکھرتے ہوئے نقوش کو دیکھ کر جیسے خود سے بیزار ہو چکی
تھی۔

ایمان کی دھیمی، لرزتی ہوئی آواز فضا میں گونجی:-

-“میں معارج کا سامنا کیسے کروں؟ میں اب خوبصورت نہیں رہی... میری خوبصورتی میری آزمائش بن گئی
ہے۔”-

ایمان کی آواز پھر ابھری، سسکیوں میں ڈوبی ہوئی

-“میں نے اپنے حسن کو محبت اور عقیدت کے ساتھ سنبھالا، مگر آج یہ ہی حسن میرے لیے دوبارہ سزا بن
گیا ہے۔”-

ایمان نے اپنے آنسو پونچھنے کی کوشش کی، مگر سسکیاں رکنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔

-“میں اسے کیا کہوں؟ اسے کیسے بتاؤں کہ مجھے جلد کا کینسر ہے... کہ میرا وقت کم رہ گیا ہے؟ میں مٹ رہی
ہوں، اندر ہی اندر ختم ہو رہی ہوں۔”-

ایمان کی آواز ایک بار پھر فضا کو چیر گئی۔

- ”پہلے میرا حسن میری آزمائش تھا... میں محبت کے ساتھ سنبھلی، لیکن آج پھر یہی حسن میرا عذاب بن گیا ہے۔“

ایمان کی سسکیوں کے درمیان ایک اور جملہ تیر کی طرح فضا میں پیوست ہوا

”معارض، میں مر رہی ہوں... اور تم میرے ساتھ نہیں ہو۔ اللہ کے سوا میرے پاس کوئی نہیں۔“

ایمان تھکے قدموں کے ساتھ بیڈ پر جا بیٹھی، سر ہاتھوں میں تھام لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ گہرے غم کی تصویر بنی ہوئی تھی، جیسے دنیا کا ہر دکھ اس کے کندھوں پر آن پڑا ہو۔ اس نے قریب رکھی معارج کی شرٹ اٹھا کر سینے سے لگالی، اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔

- ”میری دنیا تمہاری بانہوں میں تھی،“ ایمان نے سرگوشی کی، اور اس کے آنسو تکیے پر گرنے لگے۔

ایمان کی سرگوشی ایک بار پھر گونجی۔

”اور میری کائنات تمہاری بانہوں میں تھی... تم میری کہکشاں تھے، میرا سب کچھ تھے۔“

--

ایمان گہری نیند میں تھی کہ اچانک موبائل کی گھنٹی نے خاموشی کو چیر ڈالا۔ آنکھیں بمشکل کھولتے ہوئے اس نے دھندلی نظر سے اسکرین پر دیکھا۔ بہرام کی کال۔ دل جیسے کسی انجانی پیشین گوئی سے دہل گیا۔ ایک پل میں وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، گہری بے چینی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ ”یا اللہ، اس وقت کال؟ سب خیریت ہو،“ اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

کانوں سے فون لگاتے ہی اس کی آواز لرز گئی۔

”السلام علیکم، بہرام بھائی... سب ٹھیک تو ہے؟“

دوسری طرف سے آنے والی آواز نے اس کے وجود کو لرزادیا۔ اس نے ہاتھ بے ساختہ اپنے منہ پر رکھ لیا اور آنکھوں میں حیرت کی شدت چھلک پڑی۔

۔ ”معارض... سویڈن سے کب واپس آیا؟“ اس کا دل گویا حلق میں آگیا تھا۔ ”ایکسیڈنٹ... کب ہوا؟“۔

یہ سننا تھا کہ وہ جھٹکے سے بستر سے اٹھی، کمبل بے ترتیبی سے ایک طرف پھینکا، اور ماتھے پر پسینہ محسوس ہوا جیسے اس کی سب سے بڑی خوفناک سوچ حقیقت میں بدل گئی ہو۔

”گاڑی باہر کھڑی ہے؟ اچھا... میں ابھی آرہی ہوں!“

کال ختم کرتے ہی اس نے جلدی سے الماری کی طرف دوڑ لگائی، پہلا عبا یا جو ہاتھ لگا، جھٹ سے لپیٹ لیا۔
جیسے ہی عبا یا پہنا، اس نے آئینے میں ایک پل کو اپنے چہرے پر نظریں جمائیں۔ وہی اضطراب، وہی خوف
کا سایہ جو اندرونی ہلچل کا گواہ تھا

باہر نکلتے ہی سیاہ گاڑی کی جھلک نظر آئی، جس کے قریب ڈرائیور منتظر کھڑا تھا۔ دروازہ اس کے لیے کھولتے
ہی ایمان تیز قدموں سے اندر جا بیٹھی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز نے فضا کی خاموشی میں مزید گہرا سکوت
طاری کر دیا۔

گاڑی چلنے لگی تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھا، جیسے دل کو تھامنا چاہتی ہو۔ سر جھکا کر تسبیح کے دانے انگلیوں میں
گھمانے لگی، ہونٹوں سے مدھم سرگوشیاں جاری تھیں۔

۔ ”یا اللہ... معارج کو کچھ نہ ہو، یارب العالمین... اسے زندگی عطا کر، میری عمر بھی اسے دے دے، بس...
سلامت رکھ اسے۔“

گاڑی تیز رفتاری سے رات کے سناٹے کو چیرتی جا رہی تھی اور ایمان کی دعاؤں میں ایک عجیب سی بے بسی
رچی ہوئی تھی۔

”یا اللہ... رحم فرما... وہ ٹھیک ہو جائے، یارب... اس کے لیے آسانی فرما۔“

آنکھیں بند کر کے وہ گہری سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی، مگر دل کی دھڑکنوں میں کسی انہونی کا سایہ
لرزاں تھا۔ امیدوں کا دامن مضبوطی سے تھامتے ہوئے اس نے سرگوشی کی، ”بس وہ ٹھیک ہو جائے...
اللہ... کچھ برا نہ ہو، رحم فرما!“۔

رات کے اندھیروں میں گاڑی جیسے ایک مقصد کی طرف بے تابی سے بڑھ رہی تھی، اور ایمان کی دعائیں
راستے بھر فضا میں تحلیل ہو رہی تھیں، جیسے وہ ہر لمحہ دعا اور خوف کے درمیان جھول رہی ہو۔

...°...

رات کے سنائے میں وقت تھا ہوا محسوس ہو رہا تھا جب ایمان ہنزہ کے آغا خان سول ہسپتال کے دروازے
پر پہنچی۔ گھنے اندھیروں میں ہسپتال کی سفید روشنیوں نے ایک عجیب وحشت پیدا کر رکھی تھی۔
راہداریوں میں قدم رکھتے ہوئے ہر گزرتا لمحہ اس کے لیے مزید بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دھڑکتے دل اور
لرزتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی جب اس کی نظر اچانک بہرام پر پڑی۔

”بہرام بھائی... معارج؟“

ایمان کی آواز جیسے اپنے ہی بوجھ سے شکستہ ہو چکی تھی، لبوں سے بمشکل نکلی۔

بہرام نے کچھ کہا، مگر اس کے الفاظ غم اور بے بسی کے پردے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر دروازہ کھول کر باہر آیا اور ایمان کے قریب آیا۔ وہ بے قراری سے آگے بڑھی، آنکھوں میں امید اور لبوں پر التجا کی لرزش۔

”ڈاکٹر... معارج کیسا ہے؟ وہ... میرا شوہر ہے۔ پلیز... مجھے سچ بتائیں۔“

ایمان کی آواز ٹوٹتی ہوئی، جیسے ہر حرف میں جان بہ رہی ہو۔

ڈاکٹر نے گہری سانس بھری، گویا کوئی سنگین فیصلہ سنانے والا ہو۔

”الحمد للہ، جان کا خطرہ ٹل چکا ہے۔ مگر...“

ڈاکٹر کے لفظوں میں ایک ایسی خاموش اذیت تھی جو کمرے کی ہوا میں بکھرتی جا رہی تھی۔

۔ ”مجھے افسوس ہے، ان کے سر کے پچھلے حصے پر گہری چوٹ آئی ہے، جس کے نتیجے میں ان کی بینائی چلی گئی ہے۔“

ایمان کا بدن جیسے ایک جھٹکے سے سن ہو گیا۔ پلکیں بے یقینی سے پھڑپھڑائیں، اور سینے میں عجیب سی گھٹن نے گھر کر لیا۔ قدم خود بخود پیچھے کی طرف ڈمگائے اور وہ قریب کی بینچ پر گر گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے، جیسے حقیقت کا بوجھ اس کی برداشت سے باہر ہو۔

”یا اللہ! یہ کیا کیا ٹونے؟ میں نے تو کبھی یہ نہیں چاہا تھا...“

الفاظ اس کے دل سے نکلے، مگر آنسوؤں میں ڈوب گئے۔

وہ دیر تک سر جھکائے، بے آواز روتی رہی، جیسے صدمہ اس کے وجود میں رچ بس گیا ہو۔ پھر، اپنے آنسو پونچھتے ہوئے، وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ڈاکٹر... کیا میں... کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟“

اس کے لب لرز رہے تھے، اور آواز میں اضطراب کی گونج واضح تھی۔

ڈاکٹر نے نرمی سے کہا، ”فی الحال ان کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ چند گھنٹوں بعد آپ ملاقات کر سکتی ہیں۔“

ایمان نے دھیرے سے سر ہلایا، مگر اس کی روح جیسے تھک چکی تھی۔ وہ قریب ہی ایک کرسی پر ڈھے گئی، چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا اور دھیمے لہجے میں خود سے مخاطب ہوئی:

”یہ کیسا امتحان ہے، یا اللہ؟“

لفظ اس کے لبوں سے ایسے نکلے جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئے ہوں، اور اس کی سانسوں میں الجھن اور کرب کا گہرا سایہ چھپ گیا ہو۔

بہرام ایک کونے سے اسے دیکھ رہا تھا، مگر خاموشی کا بوجھ اس کے الفاظ پر حاوی تھا۔ اسے ایمان کے غم کا شدت سے احساس تھا، مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ اس زخم پر کس طرح مرہم رکھے۔

کچھ ساعتوں بعد ایمان کمرے میں داخل ہوئی۔ ہوا میں دواؤں کی بورچی ہوئی تھی، اور مشینوں کی ہلکی آوازیں کمرے کے سکوت کو چیر رہی تھیں۔ معارج بستر پر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا، طبی آلات سے جکڑا، مگر اس کے چہرے پر ایک پرسرار سکون طاری تھا، جیسے اپنی حالت سے بے نیاز ہو۔

ایمان کے قدم لڑکھڑاتے ہوئے اس کے قریب پہنچے۔ اس کی آنکھوں میں الجھن اور اضطراب کی لہریں تھیں، مگر دل میں معارج کے زندہ ہونے کی شکر گزاری۔

وہ آہستگی سے بیٹھ گئی، اور معارج کا سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس پر لب رکھ دیے۔ معارج کے لبوں پر مدہم مسکراہٹ ابھری، جیسے وہ اپنے خوابیدہ وجود میں بھی اس کے لمس کو پہچان گیا ہو۔

”بٹر فلائے۔۔۔“

اس نے دھیمی، گمبھیر آواز میں پکارا، جیسے صدیوں کی تشنگی زبان سے نکل کر محبت کے ایک لفظ میں سمٹ آئی ہو۔ ”تمہارا لمس جیسے زندگی لوٹ آیا ہو۔ یہ دو مہینے جیسے صدیوں پر محیط تھے۔“

ایمان کے دل پر ایک بوجھ سا اتر گیا۔ وہ جانتی تھی کہ معارج مسکرا رہا ہے، مگر یہ مسکراہٹ اس اذیت کو چھپانے کا بہروپ تھی جو اس کے دل میں پوشیدہ تھی۔ وہ یوں ظاہر کر رہا تھا گویا کچھ بھی نہیں ہوا؛ جیسے کوئی معمولی حادثہ ہو، اور وہ صرف سیڑھیوں سے پھسل گیا ہو۔

ایمان نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، مگر اس کی مسکان میں دکھ کا سایہ چھپا تھا، ”اور میں نے تمہیں سب سے زیادہ یاد کیا، معارج۔“ اس کی آواز ہلکی اور کامل تھی، جیسے کوئی بھولی ہوئی دعالیوں پر لوٹ آئی ہو۔

وہ آہستہ سے جھک کر معارج کے ماتھے پر بندھی پٹی کو چوما۔ اس کے بالوں کی خوشبو، اس کی سانسوں کی خفیف گرمی۔ سب کچھ محسوس کرنے کی کوشش کی، جیسے ہر تفصیل کو ذہن میں قید کر لینا چاہتی ہو، مبادا یہ لمحہ آخری ہو۔

معارج کی مدھم سی آواز سنائی دی،

۔ مجھے معاف کر دو۔ میں اپنی آنکھوں کی حفاظت نہیں کر پایا۔ جانتا تھا، تمہیں میری آنکھوں سے کتنی محبت تھی۔ لیکن دیکھو، میں انہیں بچا نہیں سکا۔“ اس کی آواز شکست خوردہ تھی، جیسے ہر لفظ میں پچھتاوا گونج رہا ہو۔ ”تمہاری پسندیدہ آنکھیں۔ جن میں تم اپنی دنیا دیکھتی تھیں، آج ان سے روشنی چھن گئی ہے۔“ وہ بے بسی کی شدت سے ٹوٹے ہوئے بولا، گویا اپنی ناکامی کا بوجھ اٹھائے وہ خود بھی اندر سے بکھر رہا تھا۔

ایمان کے آنسو بے اختیار بہہ نکلے، اور چند قطرے معارج کے ماتھے پر ٹپک پڑے۔ وہ جھک کر اس کے آنسوؤں کو محسوس کرتے ہوئے بولا، ”ایمان، تم جانتی ہونا، مجھے تمہارے آنسو برداشت نہیں ہوتے۔“

ایمان کی آنکھوں میں شکر کا عکس جھلکا، اور ہلکی سی مسکان اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔ ”یہ آنسو شکرانے کے ہیں، معارج۔ اللہ نے تمہیں مجھے واپس دے دیا۔“

ایمان نے دھیرے سے معارج کے ہاتھ تھامے، جیسے اس کی ساری دنیا انہی انگلیوں میں سمٹ آئی ہو۔ آنسو پلکوں پر لرزتے ہوئے بولی، ”مجھے تمہاری صرف آنکھیں نہیں، تمہارا ہر احساس، تمہارا ہر لمحہ عزیز ہے، معارج۔ تمہارا ہونا میرے لیے سب کچھ ہے۔ آنکھوں کا کیا ہے؟ میں نے تم میں ہمیشہ وہ دیکھا جو آنکھوں سے نہیں دکھتا۔“

معارج نے اس کی بات سن کر دھیمی سی مسکراہٹ بکھیر دی، جس میں شکر گزاری کی چمک تھی۔ ”پتہ ہے؟ مجھے کبھی اپنے آپ سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب تم نے مجھے چاہنا شروع کیا، تب جا کے میں نے خود کو قبول کرنا سیکھا۔ تمہاری محبت نے میرے وجود کو معنی دیا ہے۔“

ایمان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل تو گئی، مگر اس کے ساتھ ہی لب لرز بھی گئے، جیسے دل کے بوجھ نے سانسوں پر گرفت مضبوط کر دی ہو۔ ”اور تمہیں پتہ ہے۔ مجھے اپنے بالوں سے کبھی لگاؤ نہیں تھا۔ ہمیشہ

لگتا تھا کہ یہ بیکار ہیں، بوجھ ہیں... لیکن جب تم نے انہیں پسند کیا، تب مجھے ان سے بھی محبت محسوس ہونے لگی، جیسے وہ تمہاری پسند کا حصہ بن کر قیمتی ہو گئے ہوں۔”

معارج نے آہستہ سے اس کے بالوں کو چھوا، گویا اس کی ہر بات کو اپنی خاموشی سے تسلیم کر رہا ہو۔
”تمہاری محبت نے مجھے جینا سکھایا ہے، ایمان... اور تمہارے لمس نے میرے ہر زخم کو مرہم بخشا ہے۔”

-

ایمان کی آنکھوں میں نمی تھی، مگر اس کے دل میں ایک عجیب سی تسکین بھی، جیسے دکھ کے ساتھ محبت کا احساس بھی سر اٹھا رہا ہو۔ وہ قریب ہو کر اس کے کندھے سے لگی اور دھیرے سے کہا، ”تم میرے لیے ہمیشہ مکمل تھے، معارج... اور تمہارے بغیر میں کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔”

ایمان نے اپنا ماتھا معارج کے چوڑے، مضبوط سینے سے لگا دیا، گویا وہ اسی میں پناہ تلاش کر رہی ہو۔ اس کے دل کی دھڑکنیں جیسے ایمان کے وجود میں زندگی کا رس گھول رہی تھیں—ہر دھڑکن میں عقیدت اور بے پایاں محبت کا سرگم تھا، جو کسی بے زبان دعا کی صورت ایمان کے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔

معارج نے ایک طویل، گہری سانس لی، جیسے کسی نئی روح نے اس کے جسم میں انگڑائی لی ہو۔ اس نے دھیرے سے سر جھکایا اور ایمان کے بالوں کو چھوتے ہوئے سرگوشی کی، ”قید تو وہاں بھی سکون دے سکتی

تھی... مگر میری اصل آزادی تمہاری قربت میں ہے۔ سوڈن کی جیل جنت ہوگی، لیکن میری جنت تمہاری بانہوں میں سمٹی ہے، ایمان...۔“

اس کی آواز میں ایسی مٹھاس اور گہرائی تھی جیسے کسی ٹوٹے ہوئے مسافر کو اپنی منزل کی جھلک مل گئی ہو۔ ایمان نے آنکھیں موند کر اس کے سینے پر سر رکھا، جیسے ہر دھڑکن میں اپنا نام سننے کے لیے بے چین ہو۔ وہ جانتی تھی، معارج کی دنیا صرف اس کی ذات میں سمٹ آئی ہے، اور اس دنیا کا ہر لمحہ ان دونوں کی محبت سے مزین تھا۔

اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اٹھایا، اور ایمان کے چہرے کو چھو کر اس کی ہر خصوصیت کو محسوس کیا۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا، مگر ہر لمس کے ساتھ ایمان کا وجود اس کے دل پر نقش ہو رہا تھا—جیسے وہ اس کی روشنی، زندگی، اور کائنات ہو۔

ایمان نے اشک بھری آنکھوں سے سرگوشی کی، “میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی، معارج۔ تمہاری آنکھیں بن کر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تمہارے ہر قدم کی رہنمائی کروں گی، اور اپنی آخری سانس تک تمہارا ساتھ نبھاؤں گی۔“

معارض نے مسکراتے ہوئے ایمان کے گرد اپنے بازو لپیٹ لیے، جیسے وہ اسے اپنی موجودگی کا یقین دلا رہا ہو۔ ”ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے، بٹر فلائے... ہمیشہ۔ اگر تم نہ رہیں تو میں کیسے زندہ رہوں گا؟“ اس کی آواز میں وہی دھڑکن تھی جو اس کے دل میں بستی تھی۔ ”دل کی دھڑکن کے بغیر کوئی کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟“ وہ دھیرے سے بولا، جیسے یہ حقیقت کو قبول کر رہا ہو، مگر اس بات کو دہرا کر سکون پارہا ہو۔ اس نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا، اور لمحہ بھر کے لیے اس کی مہک میں کھو گیا۔ ایک ایسی خوشبو جس میں راحت اور محبت کا عکس پوشیدہ تھا۔

ایمان نے اپنے لب بھینچ لیے، آنسو پلکوں پر لرزنے لگے مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ جانتی تھی، وہی معارج کا سب کچھ تھی، اور وہ دونوں ایک دوسرے کے بنانا مکمل تھے۔ جیسے جسم سے روح نکال دی جائے۔ وہ اس کے رخسار پر ہلکا سا بوسہ دیتے ہوئے بولی، ”مجھے تمہارے لیے ہر جنگ لڑنی ہے، تمہارے ہر خواب کو حقیقت بنانا ہے۔“

معارض نے نرمی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ”تم میری زندگی ہو، میری خوشی ہو، ایمان۔“ اس کے لہجے میں خالص محبت اور شکر گزاری کا رنگ جھلکتا تھا۔ اس نے ایمان کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لیا اور دھیرے سے دبایا، جیسے اپنے ہونے کا یقین دلا رہا ہو۔ ”میں تمہیں وہ سب کچھ دینا چاہتا ہوں جو تمہیں خوشی دے۔“

ایمان نے اپنی انگلی کی پور سے آنسو پونچھتے ہوئے دھیرے سے کہا، ”معارج... تم نے مجھ سے اتنی محبت کر کے غلطی کی ہے۔ یہ محبت اللہ کے لیے ہونی چاہیے، کیونکہ اللہ ازلی اور ابدی ہے۔ انسان تو فنا کے لیے پیدا ہوا ہے۔“ اس کے لہجے میں دانشمندی اور شفقت کی آمیزش تھی، جیسے وہ اسے کسی گہری حقیقت سے آشنا کر رہی ہو۔

معارج نے ایک شانت مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”اللہ سے عشق کرتا ہوں... اور تم سے محبت۔“ اس کی آنکھوں میں زندہ دلی اور بے ساختہ پن تھا، اور اس نے ہلکے سے آنکھ مار کر اسے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ وہ عاشق تھا، دوست تھا، اور کبھی کبھی مسخرہ بھی۔ مگر ہمیشہ ایمان کا۔

ایمان کے لبوں پر ہنسی بکھر گئی، ایک ایسی ہنسی جو لمحہ بھر کے لیے ہر دکھ بھلا دے۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے، جینے کی خوشی محسوس کر رہے تھے، جیسے زندگی کی اذیتوں کے باوجود ایک دوسرے کا ساتھ ہی ان کا سب سے بڑا سکون ہو۔

۔ ”اب آرام کرو، معارج۔“ ایمان نے سرگوشی کی، اس کی آواز میں نرمی اور محبت کی گونج تھی۔ معارج نے تھکی ہوئی جمائی لی، آنکھوں میں نیند کا خمار اترنے لگا۔ ”مجھے سکون کی ضرورت ہے... تمہارے ساتھ۔“

پھر معارج کی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی گونجی، ”تم نہیں پوچھو گی کہ میں دو ہفتوں میں باہر آنے کا کہہ کر دو مہینے کیوں لگا بیٹھا؟“ اس کے لہجے میں چھیڑ چھاڑ کی ہلکی جھلک تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس ایک کہانی ہے، ایک راز ہے، شاید ایک تحفہ بھی۔

ایمان نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا، ”کوئی بات ہو گی، معارج... مجھے کچھ نہیں چاہیے، بس میرے ساتھ گھر چلو۔ تمہارے بغیر گھر ادھورا لگتا ہے۔“

معارج نے مسکراتے ہوئے ایمان کی ناک کو ہلکے سے چوما، اور ہنسی میں اس کی آنکھوں کے گرد جھریاں پھیل گئیں۔ ”اور میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں... تم ہو تو میں مکمل ہوں۔“

اس کے لہجے میں امید تھی، ایک خواب تھا، اور زندگی کی طرف لوٹنے کا حوصلہ۔ جیسے وہ اس لمحے سے ایک نئی شروعات کرنا چاہتا ہو۔

...°...

دو ہفتوں کے بعد، وہ اُسے اپنے نازک ہاتھوں سے تھام کر گھر لے آئی۔ دھیمی لمس کے ساتھ، اُس نے اُس کے ہاتھ میں اپنائیت کا احساس جگاتے ہوئے مانوس راہوں پر چلایا۔ کمرے میں پہنچ کر، اُس نے اُسے بستر پر بٹھایا، جیسے کسی پچھڑے ہمسفر کو سکون بخشنے کے لیے جگہ دی ہو۔ ایک دھیمی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھلی، اور محبت سے لبریز لہجے میں بولی،

”تمہاری کمی اس گھر کو اور مجھے بہت محسوس ہوتی تھی۔“

معارض نے گردن ذرا سی جھکائی، جیسے الفاظ میں چھپے جذبات کو محسوس کر رہا ہو۔ اُس کی آنکھوں کے نہ ہونے کے باوجود، وہ کمرے کے ہر گوشے میں بکھری پرانی یادوں کی خوشبو کو محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر نرم سی مسکان نمودار ہوئی اور اُس نے مخلصی سے کہا

”یہی تو میرا اصل ٹھکانہ ہے... تم میرا گھر ہو۔“

ایمان نے اُس کی بات پر دھیرے سے مسکرا کر سر ہلایا اور محبت بھرے جذبے سے اُس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔

۔ ”میں تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔“ اُس نے یہ کہتے ہوئے اُس کے ہاتھ پر نرمی سے بوسہ دیا اور کچن کی جانب بڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد، ایمان واپس لوٹی، ہاتھ میں کھانے سے بھری ٹرے لیے ہوئے۔ وہ اُس کے قریب بیٹھ گئی اور ایک چمچ بھر کر معارج کی جانب بڑھاتے ہوئے شوخی سے بولی

”چلو، منہ کھولو۔“

معارض ہلکی مسکان کے ساتھ سر جھٹکتے ہوئے بولا

”واہ، اندھا ہونے کا تو یہ فائدہ ہوا کہ اب تمہارے ہاتھوں سے کھانے کا مزہ بھی لے سکوں گا۔“ اُس کے لہجے میں شرارت اور ہنسی کا رنگ گھلا ہوا تھا۔

ایمان نے شریکیں نظروں سے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا

۔ ”ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ جلد ہی تمہارے لیے آئی میچ مل جائے گا، اور ٹرانسپلانٹ بھی ہو جائے گا۔“ اُس کے لہجے میں امید اور محبت کے سائے تھے، جیسے وہ اُس کے لیے ایک نئی روشنی کا خواب سجائے بیٹھی ہو۔

معارض نے چیخ سے نوالہ لیتے ہوئے اچانک قہقہہ لگایا

۔ ”سوچو، اگر انہوں نے مجھے بکری کی آنکھ دے دی، تو تم کیسی لگو گی؟“ اُس نے ہنستے ہوئے بکری کا چہرہ بنانے کی کوشش کی، اور اُس کی یہ بچکانہ ادا ایمان کے دل کو چھو گئی۔ یہ بے ساختہ شرارتیں اُس کی خاص عنایت تھیں، جو معارج صرف ایمان کے لیے کرتا تھا۔

ایمان کے چہرے پر محبت بھری مسکراہٹ پھیل گئی، اور وہ دھیرے سے بولی

۔ ”تمہاری ہر حالت میں، میں تمہیں خوبصورت ہی لگوں گی۔“ اُس نے نرم انگلیوں سے معارج کے بالوں میں ہاتھ پھیرا، جیسے اُس کے وجود کو تسکین بخشی ہو۔

چند لمحوں کے سکون کے بعد، ایمان کی آنکھوں میں ایک خوابیدہ چمک پیدا ہوئی۔ اُس نے اچانک پر جوش اور متجسس لہجے میں کہا

”معارض، میں سوچ رہی ہوں، چلو عمرے پر چلتے ہیں۔“

یہ جملہ جیسے اُس کے دل کی گہرائیوں سے اچانک پھوٹا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ ایک روحانی سفر پر جانا چاہتی تھی، اللہ کی رحمت اور بخشش کا درکھٹھانا چاہتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ دونوں مل کر اس سفر کو نہ صرف ظاہری بلکہ باطنی سکون کا ذریعہ بنا سکتے ہیں، جہاں اُن کے دلوں کے بوجھ ہلکے ہوں اور محبت کو ایک نئی روشنی ملے۔

معارض نے ہولے سے پانی مانگا تو ایمان نے نرمی سے گلاس اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ معارض نے گلاس کو اپنے ہونٹوں سے لگایا، پانی کا گھونٹ بھر کر حلق سے اتارتے ہوئے، جیسے اُس لمحے میں بھی سکون تلاش کر رہا ہو۔ گلاس رکھتے ہوئے، اُس نے نرم لیکن پُر عزم لہجے میں کہا

”ٹھیک ہے، ہم عمرہ ضرور کریں گے... بتاؤ، کب نکلنا ہے؟“

اُس کے لہجے میں نہ صرف رضا تھی بلکہ اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی خواہش بھی کہ وہ ایمان کی مراد پوری کرے اور ساتھ میں اپنے رب کی رضا بھی حاصل کرے۔ ایمان نے مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا

”جب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے تب چلیں گے۔“

معارج نے گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے ایمان کا ہاتھ تھاما، جیسے اُس کے عزم کو محسوس کرنا چاہتا ہو۔ اُس کی انگلیاں ایمان کی ہتھیلیوں پر ایسے ٹھہریں جیسے وعدہ دے رہی ہوں کہ وہ اُس کے ہر خواب میں شریک ہو گا۔ اُس کی آنکھوں سے نابینا ہونے کے باوجود، اُس کے لبوں پر مسکان تھی۔

”میں ٹھیک ہوں... ٹکٹ کل ہی بک کرواتا ہوں۔“

اُس کی آواز میں ایک فیصلہ کن جوش تھا، جیسے کوئی مسافر جو لمبے انتظار کے بعد سفر پر روانہ ہونے کو تیار ہو۔ ایمان کی آنکھوں میں نرمی اتر آئی، پلکوں پر نرمی لرزنے لگی، اُس کی محبت اور سخاوت نے دل کو چھو لیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ وہ شخص، جو دنیا کو دیکھنے سے قاصر ہے، اُس کے دل کے جذبات کو یوں سمجھ لیتا ہے جیسے اُس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند نہیں ہوئیں۔

معارج نے اُس کے آنسوؤں کو محسوس کرتے ہوئے، اپنے انگوٹھے سے انہیں نرمی سے پونچھا اور شوخ لہجے میں بولا

”اچھا، اب یہ بارش بند کرو... ورنہ پانی میں بہہ جاؤں گا!“

ایمان حیران ہو کر مسکرا دی۔ اُس نے دلنشین حیرت سے پوچھا

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں رو رہی ہوں؟“

معارض نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ جواب دیا، جیسے کوئی بھید کھول رہا ہو

۔ ”آنکھوں سے نہ دیکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ دل کے دریچے بھی بند ہو گئے ہوں۔ میرے دل میں تمہیں دیکھنے کے لیے ہزار آنکھیں ہیں... اور ان سے تمہارے آنسو چھپائے نہیں جاسکتے۔“

اُس کی بات سن کر ایمان کی ہنسی اور آنسو ایک ساتھ بہہ نکلے۔ معارض نے اُس کے قریب ہو کر اُسے اپنی بانہوں میں لے لیا، جیسے دنیا کے تمام دکھ اور خوشیاں اُس لمحے میں سمٹ آئے ہوں۔

ایمان نے دھیرے سے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور رومال سے اُس کے لبوں کو صاف کیا۔ اُس کی انگلیوں کی نرمی، محبت بھرالمس، اور دیکھ بھال کا انداز معارض کے دل میں سکون بھر گیا۔

”چلو، باہر بیٹھتے ہیں... اور چائے پیتے ہیں۔“

معارض نے ہلکے سے چونکتے ہوئے شرارت سے کہا

”کب سے تم چائے پینے لگی ہو؟ یہ تو نئی بات ہے!“

ایمان نے محبت بھری مسکان کے ساتھ جواب دیا

۔ ”تمہاری جدائی میں، میں نے ہر وہ عادت اپنالی جو تمہاری یاد کو زندہ رکھے۔ تم نے سکھایا تھا کہ خیالات، کہانیاں اور خواب انسان کے اپنے تخیل کا عکس ہوتے ہیں۔ تم کہا کرتے تھے کہ اگر انسان ایسی خوبصورت کہانیاں لکھ سکتا ہے، تو ہمارا رب ہماری تقدیر میں اچھے لوگ کیوں نہیں لکھ سکتا؟۔“

اُس نے نرمی سے معارج کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے کہا

۔ ”جب بھی میں تمہیں دیکھتی ہوں، دل کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں اچھے لوگ واقعی موجود ہیں۔“ ایمان نے دھیرے سے کہا، اُس کی آواز میں ایک گہرا سکون اور محبت تھی۔ ”بس انہیں ڈھونڈنے کے لیے وقت لگتا ہے، جیسے مٹی میں دبے ہوئے ہیروں کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔“

معارج نے اُس کی بات سن کر نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ”ہیروں کو کھوجنا تو مشکل ہوتا ہے، لیکن جب مل جائیں تو اُن کی قدر بھی دل سے کی جاتی ہے... جیسے تمہیں پانے کے بعد میں نے کی۔“ اُس نے محبت بھرے لہجے میں کہا، جیسے اُس کے دل کی تمام کیفیت زبان پر آگئی ہو۔

ایمان نے شرماتے ہوئے سر جھکا لیا، اور پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم سی مسکان کے ساتھ بولی، ”تم ہمیشہ اتنے ہی اچھے رہو گے؟۔“

- ”اگر تم میرے ساتھ ہو، تو ہمیشہ۔“ معارج نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا، اور کمرے میں ایک لمحے کے لیے جیسے وقت تھم سا گیا۔

پھر وہ مزید بولا۔

- ”تم نے میری کہانی کو اتنا خوبصورت بنا دیا ہے کہ اب اس کا کوئی انجام نہیں چاہیے۔ ہمیں بس چلتے رہنا ہے، اور مل کر ہر خواب کو جینا ہے۔“

ایمان نے پیار سے مسکراتے ہوئے اُسے دیکھا، اور اُس کے ہاتھ تھامے، جیسے وہ لمحہ کبھی ختم نہ ہو۔ پھر وہ ٹرے اٹھا کر دروازے کی طرف چل دی، اُس کی چال میں سکون اور دل میں ایک نئی روشنی لیے۔

...°...

معارج اپنے بستر پر نیم دراز تھا، سر کو ہیڈ بورڈ سے ٹکائے، پیر لمبے کئیے جیسے دنیا کی تھکن کو پل بھر کے لیے فراموش کرنا چاہتا ہو۔ ایمان اس کے پاس بیٹھی، اپنی نرم اور دلنشین آواز میں اسے افسانہ سنار ہی تھی۔ معارج کی نظریں بند تھیں مگر اس کے دل و دماغ میں الفاظ کی نغمگی بکھرتی جا رہی تھی۔ وہ ایمان کی آواز کے ہر اتار چڑھاؤ کو محسوس کر رہا تھا، جیسے الفاظ کا بہاؤ اس کے اندرونی سکون میں اضافہ کر رہا ہو۔

لمحہ بہ لمحہ، اس کی پریشانیاں، جو روزمرہ کی مانند بوجھل تھیں، ہولے ہولے مٹی جا رہی تھیں۔ ایک عجیب سی مسرت نے اس کے دل کو آہستہ آہستہ اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ایمان نے کچھ توقف کے بعد اپنے جسم کو سیدھا کیا، جیسے وہ خود بھی اس پل میں مکمل طور پر ڈوب چکی ہو۔ معارج نے جیسے ہی بستر سے اٹھنے کی کوشش کی، ایمان کے لبوں سے بے ساختہ نکلا ”کہاں جا رہے ہو؟“۔

معارج نے کچھ بے نیازی سے جواب دیا، ”فریش ہونے جا رہا ہوں، ابھی آتا ہوں۔“۔

اس نے جان بوجھ کر ایک معمولی انداز اپنانے کی کوشش کی، جیسے اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اس نے اپنے پاؤں بستر سے نیچے لٹکائے اور فرش کی سردی کو محسوس کرتے ہوئے، اپنی ٹانگوں کو دھیرے سے حرکت دی۔ ایمان نے نرمی سے پیشکش کی، ”ٹھیک ہے، میں تمہاری مدد کر دیتی ہوں۔“ اس کی آواز میں ایک عجیب سی محبت اور خیال شامل تھا، جیسے وہ معارج کو کسی نازک شے کی طرح سنبھالنا چاہتی ہو۔

ایمان نے محبت سے اس کا بازو تھامنا چاہا تاکہ وہ اسے آرام سے اٹھا سکے۔ وہ جانتی تھی کہ معارج ناپید ہے، مگر اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ خود کو لاچار سمجھے۔ معارج نے اپنے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ لاتے ہوئے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور تھوڑے سے مزاح کے انداز میں کہا، ”میری مولا جٹ، پریشان نہ ہو، میں جانتا ہوں کہاں جانا ہے۔ میں اپنے راستے کو اپنے انداز میں محسوس کر لیتا ہوں۔“۔

اس کی آواز میں خود داری کا عنصر نمایاں تھا، جیسے وہ اپنی ذات کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے ہلکی سی خفگی اور شرمندگی کے ساتھ ایمان کا ہاتھ جھٹک دیا، جیسے اس مدد کی ضرورت اسے اپنی کمزوری کا احساس دلارہی ہو۔ وہ خود کفیل بننا چاہتا تھا، یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ کسی کا محتاج نہیں۔

ایمان نے ہنستے ہوئے، محبت بھری شرارت سے کہا، ”ظاہر ہے، تم تو شاؤلن مونک جو ہو۔“۔

معارج نے فخر سے گردن ہلائی، جیسے وہ ایمان کے الفاظ کی تصدیق کر رہا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں سے دیواروں اور فرنیچر کو چھوتا ہوا آگے بڑھنے لگا، ہر چیز کو محسوس کرتے ہوئے۔ ایمان کی نگاہیں مسلسل اس کے پیچھے لگی رہیں، وہ اس کی حفاظت کے خیال سے بھرپور تھی، کہ کہیں وہ لڑکھڑانہ جائے۔

چاہے کچھ بھی ہو، اس کا دل معارج کے لیے فکر مند تھا، محبت سے معمور۔ وہ اس کی خود مختاری کا احترام کرتی تھی، مگر اس کی دل کی گہرائیوں میں اسے محفوظ رکھنے کی خواہش ہمیشہ بیدار رہتی تھی۔ اس کی محبت صرف دیکھ بھال نہیں تھی، بلکہ اس نے معارج کو اس کے تمام چیلنجز کے باوجود ایک مضبوط انسان کے طور پر قبول کیا تھا۔

ایمان نے مسکراتے ہوئے اس کی پشت پر نگاہ ڈالی، جیسے اس کی مضبوطی اور خودداری پر اسے فخر ہو۔ پھر وہ آہستگی سے واپس بیڈ پر آئی اور اپنے پیر لبے کر کے سکون سے بیٹھ گئی، دل میں معارج کے لیے محبت کا ایک نیا جذبہ محسوس کرتے ہوئے۔

...°... _ _ _

کچھ وقت کے بعد، رات کی خاموشی میں ایمان اور معارج بستر پر ساتھ ساتھ لیٹے تھے۔ ایمان نے اپنی کروٹ معارج کی جانب کی ہوئی تھی، اور وہ اس کے سکون بھری نیند کے سائے تلے مدھم سانس لیتے ہوئے گہری نیند میں تھا۔ ایمان نے آنکھوں میں آنسو بھرے اس کے چہرے کو دیکھا، جیسے وہ وقت کو روکنا چاہ رہی ہو، اس لمحے کی ہر جزئیات کو اپنے دل میں محفوظ کر لینا چاہتی ہو۔ وہ اس کی موجودگی کے

احساس میں گھلتے ہوئے، اس کی گرمی اور دل کی دھڑکن کو محسوس کر رہی تھی، جیسے یہ آخری لمحہ ہو جو وہ اس کے ساتھ گزار رہی ہو۔

ایمان کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی، یہ سوچ کر کہ شاید یہ ساتھ زیادہ دیر کا نہیں۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو بے آواز تھے، لیکن اندر سے وہ چیخ رہی تھی۔ وہ اپنی قسمت سے خوفزدہ تھی، اس خیال سے کہ یہ رشتہ، یہ محبت، یہ لمحے سب عارضی ہیں۔ ”کیا بس اتنا ہی وقت ملا ہے؟ کیا میں مر جاؤں گی؟“ اس نے دل ہی دل میں سوچا، جیسے یہ سوال زندگی سے کرنے کا ہو۔

وہ اپنی سانسوں میں معارج کے لمس اور وجود کو بھر رہی تھی، جیسے آخری دفعہ اسے محسوس کر رہی ہو۔ اس نے معارج کے گزرے دنوں کو یاد کیا۔ وہ سختیاں، وہ دکھ جو اس نے جھیلے، وہ محبتیں جو اسے چھین لی گئیں۔ ایمان ہی تھی جو اس سب کے بعد اس کے دل کی روشنی بنی اور اب اسے بھی جانے کا خوف اسے جکڑ رہا تھا۔

۔ ”یا اللہ، مجھے تھوڑا اور وقت دے دے، میری زندگی کی باقی گھڑیاں معارج کے ساتھ گزریں۔ تو تو ہر چیز پر قادر ہے، اے میرے مالک، میری بیماری کو رفع کر دے، میرے لیے کوئی معجزہ دکھا دے، پلیز اللہ، میری دعائیں سن لے!“ ایمان نے خاموشی سے دعائیں کیں، آنسو اس کے گالوں پر بہتے رہے۔۔

اس نے ایک بار پھر معارج کو دیکھا، وہ بھی اپنی کروٹ بدلے، چہرہ ایمان کی جانب کیے، نیند میں غرق تھا۔ اس کے چہرے پر ایک پرسکون مسکراہٹ تھی، جیسے وہ دنیا سے بے نیاز ہو کر سکون کی نیند لے رہا ہو۔ ایمان نے دل میں ایک عجیب سی کشش محسوس کی، جیسے وہ اس کے لمس میں سرایت کر رہی ہو۔ معارج اپنے گال کے نیچے ہاتھ رکھے، نیند میں بھی نہایت دلکش دکھ رہا تھا۔ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی، جیسے اس کی ہر خصوصیت کو اپنے دل میں نقش کر لینا چاہتی ہو۔

معارج کی پلکیں ہلکی سی جنبش میں آئیں، اور اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔ ”تم سوئی نہیں؟“ اس کی نیند میں بھری مدھم آواز سنائی دی، جس میں ایک ہلکی سی فکر تھی۔ وہ ایمان کے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں پر محسوس کر چکا تھا، اور دل میں فکر کے سائے لہرا گئے تھے۔ ”کیسے پتہ چلا؟“ ایمان نے دھیرے سے پوچھا، حیرت سے لبریز۔

۔ ”تمہاری خاموشی چیخ رہی تھی...“ معارج نے نرمی سے جواب دیا اور اپنا ہاتھ اس کے چہرے تک پہنچایا۔ اس نے ایمان کے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے پونچھتے ہوئے کہا، ”پہلے میں نے کہا تھا تم روتی ہوئی اچھی لگتی ہو، شاید اسی لیے تم بار بار روتی ہو... لیکن اب میں نے ایک نیا فارمولا بنا لیا ہے تاکہ تمہیں پھر رونانہ پڑے۔“

معارض کی آواز میں شرارت بھری مٹھاس تھی، اور وہ ایمان کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی نازک جلد کو اپنے لمس سے تسکین دینا چاہتا تھا۔ ”کیسا فارمولا؟“ ایمان نے اشتیاق سے پوچھا، اس کی آواز میں نرمی اور حیرانی تھی۔

۔ ”تم جب روتی ہو، تو بالکل چڑیل لگتی ہو!“ معارج نے ہنستے ہوئے کہا، اور اس کے چہرے پر شرارت سے بھرپور مسکراہٹ آگئی۔

ایمان نے بظاہر بیزاری سے چہرہ بنایا اور کہا، ”اور تم؟ جن لگتے ہو!“ اس نے معارج کی طرف طنزیہ لہجے میں کہا اور پھر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

معارج نے ہنستے ہوئے ایمان کی ناک کی چٹکی لی، اور اس کے گالوں پر شرارت سے ہاتھ پھیرا۔ ”ظاہر ہے پری کے ساتھ جن ہی اچھا لگتا ہے۔“

ایمان نے مسکرا کر نظریں نیچے کر دیں۔۔

معارج کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے سنجیدگی اور گہرائی اتر آئی، جیسے کوئی بوجھل خیال اچانک اُس کے دل پر اتر آیا ہو۔ اُس نے اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے ایمان کی طرف دیکھا، اور دھیماسا کہا، ”میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔“ اُس کی آواز میں ایک عجب سا خلوص اور وقار جھلک رہا تھا، جیسے وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے کچھ ظاہر کرنا چاہتا ہو۔

ایمان نے اُس کے لہجے کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے اپنی نظر اس پر مرکوز کی اور نرم مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی، ”لاکھ سوال پوچھو، میری عمر تمہارے سوالوں کے جواب دینے میں بسر ہو سکتی ہے۔ بولو، کیا پوچھنا ہے؟“ اُس کی آواز میں حوصلہ افزائی اور دلکشی تھی، جیسے اُس کا دل ہر راز اور ہر سوال کا جواب دینے کو تیار ہو۔

معارج نے اُس کی طرف نظریں اٹھا کر نرمی سے کہا، ”تم نے مجھے کیوں نہیں چھوڑا؟ تمہارے پاس ہزار بہانے تھے، پھر بھی تم نے میرا ساتھ کیوں دیا؟“ اُس کی آواز میں ایک خاموش شکر گزاری اور حیرت بھری محبت جھلک رہی تھی۔ اُس نے ایمان کے بالوں کو اپنی انگلیوں کے گرد لپیٹتے ہوئے محسوس کیا، جیسے اُس کے دل میں اٹھتے جذبات کو وہ نرمی سے چھونے کی کوشش کر رہا ہو۔

ایمان نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا، جیسے اُس کی باتوں نے اُسے چپ کر دیا ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے دکھ اور بے یقینی کی جھلک تھی، پھر اُس نے اپنی نظریں جھکا کر بھاری دل کے ساتھ کہا، ”کیا تمہیں واقعی یہ گمان ہے کہ میں تمہیں ترک کر سکتی ہوں؟ تمہیں چھوڑنا تو گویا اپنے وجود سے دستبردار ہونے کے مترادف ہے۔ تمہاری محبت میرے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو بدن کے لیے سانس کی ہوتی ہے، اور سانس کو ترک کرنا ممکن نہیں،“ ایمان نے گہرے، پُر خلوص لہجے میں کہا، جیسے ہر لفظ میں اُس کی محبت کا ایک نیارنگ جھلک رہا ہو۔

۔ ”رشتہ چاہے محبت کا ہو یا نفرت کا، میں اُسے آخری سانس تک نبھاتی ہوں۔ مگر تم سے جو رشتہ ہے، وہ تو میری روح کا حصہ ہے۔ تم سے جدائی تو شاید میری موت بھی نہ کر پائے، ”اُس کی آواز میں نرمی کے ساتھ ایک لطیف سی شرارت جھلکنے لگی۔“ شاید مرنے کے بعد بھی، میں تمہاری روح کے ساتھ ہی چپکی رہوں گی، قیامت تک۔ صبر کرو، اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑنے والی!“ اُس نے مسکراتے ہوئے ہلکی شرارت سے کہا، جیسے محبت میں بھی ایک لطیف ہنسی بکھیرنا چاہ رہی ہو۔

معارج نے اُس کی اس بات پر مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور نرمی سے کہا، ”کبھی کبھی میں خود پر رشک کرتا ہوں کہ تم میری زندگی میں ہو۔ موم بھی تمہاری طرح تھیں، اُن کا دل بھی ایسا ہی تھا، جیسے تمہارا ہے۔“ اُس کی آواز میں بے پناہ محبت اور اُنسیت تھی، جیسے وہ ہر لمحہ اُس کی موجودگی پر شکر گزار ہو۔

ایمان نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا اور محبت سے کہا، ”تم خود اچھے ہو اچھوں کے ساتھ اچھا ہی ہوتا ہے۔“ اُس کی آواز میں ایک مٹھاس اور محبت کی لطافت تھی، جیسے وہ اپنے جذبات کا اظہار بہت نرمی اور پیار سے کر رہی ہو۔

ایمان نے ایک پل کے لیے خاموش ہو کر کچھ سوچنا شروع کیا۔ اُس کے دل میں ایک اضطراب کی لہر دوڑ گئی، ”کیا میں اُسے بتا دوں کہ میں ماں نہیں بن سکتی؟ کیا میں اُسے بتا دوں کہ میرے پاس وقت محدود ہے؟“

تاکہ وہ حقیقت کو قبول کر سکے؟ ”اُس کے دل میں ہزار و سو سے تھے، اور وہ اندر ہی اندر پریشان ہو رہی تھی۔

معارض نے ایمان کی آنکھوں میں جھلکتی بے چینی اور لبوں پر ٹھہرے ہلکے سے تذبذب کو فوراً بھانپ لیا۔ اُس کی خاموشی میں بھی ایک کہانی چھپی تھی، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر لفظوں کا انتخاب نہ کر پار ہی ہو۔ معارج نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے دل میں محسوس کیا کہ اُن کے درمیان کوئی غیر مرئی تعلق ہے، کوئی ایسا رشتہ جو صرف دلوں کی زبان سمجھتا ہے۔

اُسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، معارج اُس کی خاموشی سے بھی وہ باتیں سمجھ سکتا تھا جو وہ بیان نہیں کر پار ہی تھی۔ جیسے اُن دونوں کا رشتہ لفظوں سے ماورا ہو، دلوں کی دھڑکنوں کا کوئی پوشیدہ مکالمہ ہو۔ معارج اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، ”تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟ بولو، میری توجہ تمہاری طرف ہے۔“ اُس نے ایمان کے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیرا، جیسے وہ اُس کے جذبات کو سمجھنا چاہتا ہو، اور اُس کی بات سننے کے لیے دل سے تیار ہو۔

ایمان نے اپنی ہچکچاہٹ اور اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ہاتھ آپس میں ملانا شروع کیے، اُس کی انگلیاں بے چینی سے حرکت کر رہی تھیں۔ وہ معارج کو سچ بتانا چاہتی تھی، لیکن اُس کے رد عمل کا خوف

اُسے روکے ہوئے تھا۔ اُس کے دل میں کشمکش جاری تھی، ”کیا میں اُسے بتا دوں؟“ لیکن پھر اُس نے اپنا ارادہ بدل لیا۔

۔ ”سو جاؤ، معارج۔ میں بھی سونے جا رہی ہوں۔ بس یہ نہ سوچنا کہ میں تمہیں کبھی چھوڑ سکتی ہوں۔ تم میری دنیا ہو، اور دنیا کو چھوڑنا انسان کے لیے موت کے سوا ممکن نہیں۔“ اُس کی آواز میں ایک نرم اداسی تھی، جیسے وہ خود کو کسی بڑی حقیقت سے دور کر رہی ہو۔ اُس نے معارج سے جھوٹ بولا، اُس کی تسلی کے لیے، اور شاید اپنے دل کو بھی تسلی دینے کے لیے۔

ایمان نے تھکے ہوئے دل کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں، اور وہ خاموشی کی گہرائی میں غرق ہونے لگی، جیسے خوابوں کے اندھیرے میں چھپنا چاہتی ہو۔

رات کا دوسرا پہر چھا گیا تھا۔ سناٹے میں معارج کا ہیولہ بے قدموں سے بستر سے اٹھا، اُس نے خاموشی سے دروازہ کھولا اور باہر نکل کر اپنے پیچھے بے آواز دروازہ بند کر دیا۔۔۔

...°...

صبح کی پہلی کرنیں ہنزہ کی وادی کو چھو رہی تھیں، پرندوں کی دلکش چھہاہٹ فضا میں گونج رہی تھی، مگر ان آوازوں کے درمیان ایمان کے جانوروں کی عدم موجودگی ایک خاموش یاد کی طرح چھ رہی تھی، جو اپنی موت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

دور ایک بوڑھے درخت کے سائے تلے، معارج ایک قدیم لکڑی کی بنچ پر خاموشی سے بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں اس وسیع و عریض گھاس کے میدان پر مرکوز تھیں، جس کے گرد سرسبز درخت اور بلند قامت پہاڑوں کی قطار تھی۔

لیکن اس کی توجہ دراصل ایمان پر تھی، جو ایک درمیانی عمر کی خاتون کے ساتھ محو گفتگو تھی۔ ایمان نے سر پر ہلکے زرد رنگ کا شفاف دوپٹہ اور بدن پر لیمن رنگ کا کافراک زیب تن کر رکھا تھا، جس کی لہریں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلکی ہلکی جنبش کھا رہی تھیں۔ اس نے خاتون کو مودب انداز میں سلام کیا اور معارج کی جانب پلٹ آئی۔

ایمان نے دھیرے سے بنچ پر بیٹھتے ہوئے معارج کی طرف دیکھا۔ معارج کے چہرے پر سنجیدگی کی لہر ابھری، اور اس نے نرم لہجے میں سوال کیا

”یہ خاتون کیا کہہ رہی تھیں؟“

ایمان نے کچھ لمحے توقف کیا، پھر گہری سانس لی

۔ ”گزشتہ رات کسی نے گاؤں کے سردار کے بیٹے اور اس کے ساتھیوں کا ایک ہاتھ اور پیر کی انگلیاں کاٹ دیں۔“

معارج کے چہرے پر حیرت کے آثار نمایاں ہوئے، اور اس کی آنکھوں میں گہری سوچ کی چھائیاں لرز نے لگیں۔

- ”یہ کیسا وحشیانہ سلوک ہے؟ ایسے لوگوں سے تو خدا کی پناہ!“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر خوف سے سرگوشی کی۔

ایمان نے سکون سے ہاتھ ہلایا اور سنجیدگی سے کہا۔

- ”ظالم؟ آخر کیوں؟ یقیناً انہوں نے کوئی ایسی حرکت کی ہوگی جس کا یہ نتیجہ نکلا ہی تھا۔ میرا قوی گمان ہے کہ یہی لوگ ہمارے جانوروں کی ہلاکت کے ذمہ دار ہیں۔ سردار کے بیٹے کی گھوڑی ہمارے کھیت میں آگئی تھی، اور جب میں نے اس کے آدمی سے کہا کہ وہ اسے واپس لے جائے، تو شاید اسی بات کا بدلہ لینے کے لیے سردار کے بیٹے نے ہمارے مویشی مرود دیے۔ کہ ہم نے آخر اس کی گھوڑی کو باہر نکالنے کی جرأت کیوں کی!“۔

معارض نے بے نیازی سے کندھے اچکائے، مگر اس کی خاموشی میں ایک معصومیت جھلک رہی تھی۔

ایمان نے اچانک موضوع بدلا اور معارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی

”چائے پیو گے؟“

معارض نے آنکھیں تنگ کر کے ہلکی سی ہنسی میں اس کی بات دہرائی

۔ ”کیا تم چاہتی ہو کہ میں چائے پی پی کر پھٹ جاؤں؟ تم مجھے ہمیشہ چائے پلاتی ہو، آج میرا دل ہے کہ کچھ اور پیوں، شاید ملک شیک؟“۔

ایمان نے ہنستے ہوئے سر جھکا لیا

”اچھا جی، استادوں کے ساتھ استادی“

پھر وہ بیچ سے اٹھتے ہوئے بولی

”تم بیٹھو، میں ابھی آتی ہوں۔“

ایمان گھر کی طرف چل پڑی، لیکن اس کے قدموں کی رفتار میں ایک عجیب سی بے چینی تھی، جیسے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔

معارض کی آنکھیں اس کے پیچھے تھیں۔

کچھ ہی لمحوں بعد جب ایمان آنکھوں سے اوجھل ہوئی تو معارج نے آہستگی سے اپنی پشت کو بیچ کی ٹیک سے ہٹایا، گردن کو دائیں بائیں خم دیا، اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اس کے لبوں پر ایک عجیب سی طنزیہ مسکراہٹ ابھری، گویا کسی اندرونی کشمکش پر غالب آچکا ہو۔

۔ ”ان کو شکر ادا کرنا چاہیے کہ میں معارج ہوں، ورنہ اگر گونا گونا ہوتا تو صرف ہاتھ اور انگلیاں کاٹنے پر بات ختم نہ ہوتی۔ بلکہ میں منہ کے اندر ہاتھ گھسا کر انتڑیاں کھینچ کے باہر پھینکتا، اور ان کی آخری چیخ بھی سننے کی نوبت نہ آتی۔“

وہ انگڑائی لیتے ہوئے اپنے بازو پھیلائے اور اپنے ہاتھوں کو ہوا میں گول گھمانے لگا، جیسے تھکن دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔

اتنے میں موبائل کی رنگ ٹون نے خاموشی کے اس عالم کو توڑ دیا۔ معارج نے بیزارى سے موبائل نکالا اور کال وصول کی۔

۔ ”اولیویا، تم نے ڈاکٹر سے بات کی تھی؟“ اس کی آواز میں سوالیہ لہجے کے ساتھ اطمینان کا ایک عجیب سا تاثر جھلک رہا تھا۔

۔ ”ٹھیک ہے۔ میں اپنی بیوی کو سعودی عرب سے امریکہ لے آؤں گا، اور تم کہہ رہی ہو کہ چانس ہے؟“ اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی، جیسے کوئی بوجھ اس کے دل سے ہٹ گیا ہو۔

کال کاٹتے ہی وہ مطمئن نظر آیا، مگر اس کی آنکھوں میں چھپی فکر اور اداسی واضح تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایمان کو جلد کا سرطان ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت تھی جس کا سامنا اسے کرنا تھا، مگر اس نے خود کو اندھا ظاہر کرنے کا ڈرامہ اس لیے رچایا تاکہ ایمان کو اپنی بیماری کا احساس کم سے کم ہو اور وہ شرمندگی یا پریشانی

محسوس نہ کرے۔ معارج نے اس جھوٹ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اس لیے اٹھایا تھا کہ ایمان کو مکمل اطمینان اور خوشی کا احساس دلایا جاسکے۔

وہ جانتا تھا کہ اس کے دل میں ایمان کے لیے بے انتہا محبت ہے، ایسی محبت جو ہر حد سے گزرنے کو تیار تھی۔ اگر وہ چاہتا، تو وہ حقیقت میں نابینا بن سکتا تھا، اپنی بیوی کو بہتر محسوس کروانے کے لیے ایمان کا درد اس کے دل میں ایسا سرایت کر چکا تھا کہ اسے اپنی تکلیف کبھی محسوس ہی نہیں ہوئی۔ لیکن جب ایمان کسی مشکل یا درد میں مبتلا ہوتی، تو اس کے دل میں بھی تڑپ پیدا ہوتی تھی۔

معارج کی نظریں گھر کی طرف اٹھیں، جیسے وہ ایمان کو اپنی نظروں سے ڈھونڈ رہا ہو، اور دھیرے سے اس نے زیر لب کہا ”تم میری زندگی کے اس باغ کی وہ خوبصورت تتلی ہو جسے میں کبھی اتنی آسانی سے پرواز کرنے نہیں دوں گا۔“ اس کے الفاظ میں محبت اور عزم کی گہری شدت تھی، مگر اس کے پیچھے چھپی حقیقت ایک راز تھا جو صرف معارج جانتا تھا۔

ایمان کے چہرے پر بیماری کے اثرات عیاں تھے، لیکن وہ اسے بتانے سے ہمیشہ گریزاں رہی۔ معارج نے کبھی اس پر دباؤ نہیں ڈالا کہ وہ اپنی حالت کے بارے میں بات کرے، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایمان کا دل دکھانا اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گا۔

وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ ایمان اس کی موجودگی میں خوش رہے، اور اس کی ہر خواہش کی تکمیل ہو۔ وہ ایمان کے ہر انداز کو سمجھ چکا تھا اور جیسے ایمان چاہتی تھی، وہ ویسا ہی کر رہا تھا۔

ایمان کا کیس امریکہ کے ایک اعلیٰ ہسپتال میں ریفر کیا جا چکا تھا۔ یہ بیماری نایاب ضرور تھی، مگر معالجین نے زندہ رہنے کی امیدیں دلائی تھیں، اور یہی امید معارج کے لیے روشنی کی کرن تھی۔ اس کے دل میں ایک سکون سا اثر آیا تھا کہ شاید ابھی کچھ وقت اور باقی ہے۔

معارج کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوبارہ ابھری، مگر اس بار یہ مسکراہٹ امید اور یقین سے لبریز تھی، جیسے اس نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا ہو کہ ایمان کو کبھی مایوسی کا شکار ہونے نہیں دے گا، چاہے دنیا کتنی ہی سنگدل کیوں نہ ہو۔

معارج کے پاس اپنے اقدام کی ایک گہری اور وزنی وجہ موجود تھی۔ سردار کا بیٹا اپنی خود پسندی اور سرکشی کے زعم میں مبتلا تھا، جس کی نگاہ ہمیشہ گاؤں والوں کو حقارت سے جھکی رہتی تھی۔ اُس کے غرور کا عالم یہ تھا کہ وہ خود کو ہر اصول اور ضابطے سے بالاتر سمجھتا تھا۔

معارج کی شخصیت کی مضبوطی اور دلیری نے اُس کے دل میں خوف پیدا کر دیا تھا، کیونکہ معارج نہ صرف بہادر تھا بلکہ گاؤں میں اس کا اثر و رسوخ بھی نمایاں تھا۔

سردار کا بیٹا، اپنی بزدلانہ فطرت کے باعث، معارج سے براہِ راست ٹکرائے کی ہمت نہیں رکھتا تھا، لہذا اُس نے ایک پست ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے معارج کو نقصان پہنچانے کا ایک غلیظ طریقہ اپنایا۔

یہ اُس دن کی بات ہے جب سردار کے بیٹے کی سفید گھوڑی معارج کے کھیتوں میں بے دھڑک آگھسی تھی، اور ایمان نے نہایت مہذب انداز میں گھوڑی کو واپس بھجوا دیا تھا۔ اس سادہ سے اقدام نے سردار کے بیٹے کے غرور کو خاک میں ملادیا، اور اُس نے اپنی بے عزتی کے بدلے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ اُس کے نزدیک پورا گاؤں اس کی جاگیر تھا اور اُس کی مرضی کے بغیر کوئی اُس کے حکم کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔

انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے، سردار کے بیٹے نے معارج اور ایمان کے محبوب جانوروں کو زہر دے دیا۔ اُنہوں نے معصوم بکریوں، مرغیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا، یہاں تک کہ ایمان کی پیاری بلیاں اور گلہریاں بھی اُس کے ظلم سے بچ نہ سکیں۔ سلطان بادل اور ایڈنا، جو معارج اور ایمان کے دل کے قریب تھے اور جنہیں انہوں نے برسوں محبت اور توجہ سے پالا تھا، اُنہیں بھی دردناک انداز میں زہر دے کر مار دیا گیا۔ یہ سب کچھ محض اس لیے کیا گیا کہ ایمان نے اُن کی سفید گھوڑی کو کھیت سے بھجوا دیا تھا۔

سردار کے بیٹے کے لیے یہ برداشت کرنا مشکل تھا کہ کوئی اس کی مرضی کے خلاف عمل کرے، مگر معارج کا دل ایمان کی محبت سے لبریز تھا۔ اُس کی زندگی کا مقصد ایمان کی خوشی تھا، اور وہ اُس کے تحفظ کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

اُس رات جب سب سوئے ہوئے تھے، معارج نے بے خوفی سے سردار کے گھر میں داخل ہو کر اُس کے بیٹے اور اُس کے ساتھیوں کو سبق سکھا دیا۔ اُس نے اُن کے ایک ہاتھ اور پیروں کی انگلیاں کاٹ دیں، اور یہ سب اپنے جانوروں کی موت کا بدلہ لینے اور اپنی بیوی کی عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے کیا۔

اگر معارج چاہتا تو وہ اُنہیں اور بھی زیادہ دردناک انجام سے دوچار کر سکتا تھا، مگر اُس نے جان بوجھ کر اپنی کارروائی کو محدود رکھا۔ اُس کے دل میں مزید شورش پیدا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا؛ وہ بس اتنا چاہتا تھا کہ اپنی زندگی کے باغ میں اپنی تتلی ایمان کے ساتھ سکون سے رہے۔

معارج کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایمان کی ہر مسکراہٹ، ہر خوشی کو اپنی زندگی کا محور سمجھتا تھا۔ اُس کے دل میں یہ خوف بھی تھا کہ کہیں ایمان کو اُس کے اس خفیہ اقدام کا علم نہ ہو جائے۔ معارج نہیں چاہتا تھا کہ ایمان پر کوئی بھاری بوجھ یا فکر مسلط ہو۔ اُس نے اپنی نابینائی کا ڈرامہ اس لیے کیا تا کہ ایمان کو یہ یقین دلا یا جاسکے کہ اُس کے ساتھ ہر حال میں انصاف ہو رہا ہے اور وہ اُس کی موجودگی میں محفوظ ہے۔

معارج کے دل میں یہ پختہ ارادہ تھا کہ وہ کبھی بھی اپنی تتلی کو کھو کر اپنے باغ کو ویران ہونے نہیں دے گا۔ وہ ایمان کی زندگی بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا، اور اُس کے لیے وہ ہر قربانی دینے کو تیار تھا۔

۔ اسے وہ لمحہ یاد آیا جب سویڈن کی جیل کی دیواریں اس کے گرد سمٹ آئی تھیں، جہاں وہ دو ہفتے گزار کر نکلا تھا۔ ایک سازش کا شکار ہوا تھا، اپنے حریفوں کے بچھائے ہوئے جال میں۔ جیل میں جب وہ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھا، اس کی چوڑی، مضبوط جسم پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے، اور بال ماتھے سے چمک گئے تھے۔ وہ پنچنگ بیگ کے سامنے کھڑا تھا، جہاں اس کے زوردار مکے اسے ہلا رہے تھے۔ اس دوران پس منظر میں ایک نشید مدھم آواز میں چل رہی تھی، جس کا سکون اس کے اندرونی اضطراب سے ٹکرا رہا تھا۔

معارض کے بدن کی ہر عضلہ مضبوط اور چمکدار تھا، جیسے چمکتی ہوئی چٹانوں پر ہتھوڑے برس رہے ہوں۔ اس کے جسم کی گرمی اور طاقت کا احساس ہر مکے کے ساتھ واضح ہوتا جا رہا تھا، وہ ایک بہادر اور وجیہہ مرد کی مثال تھا، جس کے سامنے جیل کی دیواریں بھی جھک جاتی تھیں۔

اچانک دروازہ کھلا اور ایک پولیس والا اندر داخل ہوا۔ ”آپ کی ضمانت منظور ہو گئی ہے، عدالت نے آپ کو رہا کر دیا ہے،“ پولیس والے نے رسمی لہجے میں کہا۔ معارج نے ایک لمحے کے لیے پنچنگ بیگ کو روکا، پھر ایک نیم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اس کی نظریں پولیس والے پر گئیں، اور اس نے ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی سے بالوں کو ہٹایا، اپنے سر کے دائیں جانب اپنی گردن کو آرام دہ انداز میں کھجاتے ہوئے کہا، ”ٹھیک ہے، میں نہا لیتا ہوں۔“

انسپکٹر نے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھایا، ”کال آپ کے لیے ہے۔“

معارج نے بے نیازی سے موبائل لیا اور کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے ایک سرد اور پراسرار آواز سنائی دی، ”ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، اب تمہاری باری ہے۔“

معارج نے دھیرے سے ہنسی چھوڑی، لیکن اس کی آنکھوں میں سرد مہری کی چمک تھی،

۔ ”وعدہ؟ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے کسی احسان کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں؟ اگر یہ سودا تمہارے فائدے کا نہ ہوتا، تو کیا تم مجھے آزاد کرواتے؟ کبھی نہیں۔ تم جیسے لوگ وعدے توڑنے کو ہنر سمجھتے ہیں۔ مگر میں مرد ہوں، اور مرد اپنے الفاظ سے مکرنا نہیں جانتے۔

میری رگوں میں حلال خون دوڑتا ہے، اور میں ایک ہی باپ کی سچی اولاد ہوں — تمہاری طرح مصلحتوں کا غلام نہیں۔

تمہارے لوگ ابھی چند لمحوں میں سدھر جائیں گے، مگر یہ بات یاد رکھو — دوبارہ میرے قریب آنے کی غلطی مت کرنا۔ اگر کی، تو میں وہ بن جاؤں گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

جب تک میری نسل قائم ہے، تم بچتے رہو گے۔ اور اگر میری نسل کو مٹایا گیا... تو تمہاری سانسیں بھی اس دنیا میں آخری ہوں گی۔“

اس نے بے فکری سے موبائل پولیس والے کی طرف واپس پھینکا اور اپنی شرٹ اتارتے ہوئے پولیس والے کی طرف ایک آخری نگاہ ڈالی، اس کی بدن کی ساخت اور پٹھوں کی بناوٹ اتنی شاندار تھی کہ وہ کوئی بھی دیکھتا، حیران رہ جاتا۔ پولیس والا خاموشی سے باہر نکل گیا، اور معارج اپنی جیل کے آخری لمحات کو پیچھے چھوڑتے ہوئے تیار ہونے لگا۔

معارج اب جیل کے سنگین ماضی کو پیچھے چھوڑ کر آزاد فضا میں تھا۔ سیاہ ڈریس شرٹ اور پینٹ میں ملبوس، اس کی قامت اور وجاہت نمایاں تھی۔ اس کے کندھوں پر سیاہ کوٹ ایسے بیٹھا ہوا تھا جیسے وہ اس کے جسم کا حصہ ہو۔ چمکتے چیلسی شوز اور سنہرے رنگ کی گھڑی جو اس کی کلائی پر چمک رہی تھی، اس کی شخصیت میں اضافی دلکشی پیدا کر رہی تھیں۔ بال سلیقے سے پیچھے کی جانب سجے ہوئے تھے اور اس کے آنکھوں پر چڑھے سن گلاسز نے اسے ایک پراسرار مگر دلکش انداز دیا ہوا تھا۔

لیمبورگینی کی اسٹیئرنگ وہیل کو اس نے اپنے ایک مضبوط ہاتھ سے تھاما ہوا تھا، جب کہ اس کی انگلیاں نرمی سے اسٹیئرنگ کے گرد لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ آرام دہ مگر پر اعتماد انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا، جیسے سڑک پر ہر چیز اس کے قابو میں ہو۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر اولیویا بیٹھی تھی، اس کی وفادار سیکرٹری، جو اس کے ہر حکم پر تیار رہتی تھی۔

معارج کی نظریں سامنے سڑک پر تھیں، لیکن اس کا ذہن کسی اور ہی خیال میں محو تھا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تمام کاروباری معاملات جلد از جلد نمٹ جائیں۔ بہت سا کام جمع ہو گیا ہے، اور اب مجھے پاکستان ہنزہ واپس جانا ہے، اپنی بیوی کے پاس۔“ اس کی گہری، پراسرار آواز میں ایک دبنگ وقار تھا، جیسے وہ جو کہہ رہا تھا وہی ہو کر رہے گا۔

اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ ابھری جب اس نے ایمان کے بارے میں سوچا، جو دو ماہ سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس سے دور تھا، لیکن اس کی یاد ہر لمحے اس کے دل کے قریب تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایمان اپنے گھر کے اندر، ہنزہ کی خوبصورت وادی میں اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ وہ اسے حیران کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، جیسے کہ وہ ہر لمحے اسے اپنی زندگی میں نئے سر پرانز دیتا تھا۔

اولیویا نے نرمی سے کہا، ”سر، انہیں بتادیں کہ آپ واپس آرہے ہیں۔“

معارج نے ایک سرد مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلایا، ”نہیں، میں اسے حیران کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں نے میڈیا کو بھی خاموش رکھا ہوا ہے۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلنا چاہیے۔“ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی، جیسے وہ دنیا کے تمام راز جانتا ہو اور ہر پل کو اپنے طریقے سے ترتیب دے رہا ہو۔

اس کی گاڑی سڑک پر تیزی سے پھسل رہی تھی، اور وہ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ پر قابو پائے ہوئے تھا، جیسے گاڑی کی رفتار اور دنیا کا ہر کام اس کے حکم کا منتظر ہو۔ اس نے کاروباری ملاقاتیں طے کر لی تھیں،

سب کچھ ٹھیک کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کی تتلی، ایمان، اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی، اور معارج کا دل بے تاب تھا کہ وہ اسے دوبارہ دیکھ سکے۔

...°...

جب معارج دو ماہ کی طویل غیر موجودگی کے بعد واپس آیا، تو دل میں سر پر اتر دینے کا خیال تھا۔ ہنزہ ایئرپورٹ سے سیدھا اپنے گھر پہنچا، جہاں وہ ایمان سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ گھر کے باہر مکمل خاموشی اور اندھیرا تھا۔ اس نے کالی شرٹ اور بھورے رنگ کی پینٹ پہنی ہوئی تھی، اور چہرے پر ایک مطمئن مسکراہٹ لیے وہ دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا، اس نیت سے کہ صبح ایمان کو حیران کرے گا۔

لیکن جیسے ہی وہ بیڈ روم کے دروازے تک پہنچا، اندر سے ایک آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ ایمان کی سسکیاں۔ وہ وہیں رک گیا، دل جیسے ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔

پہلو سے جھانک کر دیکھا تو ایمان آئینے کے سامنے بیٹھی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا سفید فراق اس کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا، دوپٹے بے ترتیبی سے زمین پر پڑا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں بے پناہ درد تھا۔

وہ اپنے چہرے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے آئینے میں خود کو تک رہی تھی، جیسے اپنے وجود کی ٹوٹ پھوٹ کا جائزہ لے رہی ہو۔ ہونٹوں کے اوپر بد نما نشانات نمایاں تھے، اور ہر لمس اس کے اندر کی اذیت کو اور گہرا کر رہا تھا۔

معارض کے لیے یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ یہ وہ چہرہ نہ تھا جسے اس نے اپنی یادوں میں سجایا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ وہ زمین پر جمی ہوئی تھی، اپنی خوبصورتی کے بکھرتے ہوئے نقوش کو دیکھ کر جیسے خود سے بیزار ہو چکی تھی۔

ایمان کی دھیمی، لرزتی ہوئی آواز معارج کے کانوں میں گونجی

۔ ”میں معارج کا سامنا کیسے کروں؟ میں اب خوبصورت نہیں رہی... میری خوبصورتی میری آزمائش بن گئی ہے۔“

یہ جملہ معارج کے دل کو چیر گیا۔ اس نے اپنی مٹھی بھینچ لی، آنکھوں میں آنے والے آنسو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے۔ وہ چاہتا تھا کہ فوراً اس کے پاس جائے، اسے گلے لگا کر یقین دلائے کہ وہ اب بھی اس کے لیے اتنی ہی حسین ہے جتنی پہلے تھی۔ لیکن وہ ساکت کھڑا رہا، جیسے الفاظ نے اس کا دامن چھوڑ دیا ہو۔

ایمان کی آواز پھر ابھری، سسکیوں میں ڈوبی ہوئی

۔“میں نے اپنے حسن کو محبت اور عقیدت کے ساتھ سنبھالا، مگر آج یہی حسن میرے لیے سزا بن گیا ہے۔”

معارض کا دل جیسے کسی ناقابلِ برداشت بوجھ تلے دب گیا۔ اسے یاد آنے لگا کہ وہ ایمان سے پہلی بار کس قدر دیوانگی سے محبت کر بیٹھا تھا۔ اس کی مسکراہٹ، اس کی آواز—سب کچھ جیسے ایک خواب کی طرح اس کی زندگی میں آیا تھا۔ شادی بھی جیسے تقدیر کا کھیل تھی، اور ان دونوں نے ساتھ مل کر مستقبل کے خواب دیکھے تھے۔

بچے پیدا کرنے کا خواب، ایک ساتھ بوڑھے ہونے کا خواب—اور پھر وہ سب کچھ چھوڑ کر چلا گیا، یہ سوچ کر کہ وہ یہ قربانی ایمان اور ان کے کل کے لیے دے رہا ہے۔

لیکن آج وہ سامنے تھی—ٹوٹے ہوئے خوابوں اور بکھری ہوئی امیدوں کے ساتھ۔

ایمان نے اپنے آنسو پونچھنے کی کوشش کی، مگر سسکیاں رکنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔

۔“میں اسے کیا کہوں؟ اسے کیسے بتاؤں کہ مجھے جلد کا کینسر ہے... کہ میرا وقت کم رہ گیا ہے؟ میں مٹ رہی ہوں، اندر ہی اندر ختم ہو رہی ہوں۔”

جب معارج نے یہ الفاظ سنے۔ ”جلد کا کینسر... میرا وقت کم ہے... میں مٹ رہی ہوں“۔ تو یہ جملے جیسے انگاروں کی صورت اس کے دل پر گرے۔ وہ ساکت کھڑا رہ گیا، جیسے وقت رک گیا ہو۔ کچھ لمحے تو یوں ہی بے حس و حرکت اسے دیکھتا رہا، لیکن اس کے اندر آوازوں کا طوفان برپا تھا۔ ہر جملہ اس کے دماغ میں گونج رہا تھا، اور آنکھوں کے سامنے منظر دھندلا پڑنے لگا۔ آنکھوں میں نمی بھر آئی اور دنیا جیسے دھند کے پیچھے چھپ گئی ہو۔

ایک شدید پچھتاوے اور جرم کے احساس نے اس کے سینے کو جکڑ لیا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایمان اس حالت سے گزر رہی ہوگی۔ وہ خود کو کونسنے لگا۔ یہ کیسا شوہر تھا جو اپنی بیوی کے درد سے غافل رہا؟ وہ کیوں نہ سمجھ سکا کہ جو مسکراہٹ وہ ہمیشہ اس کے چہرے پر دیکھنے کا خواہاں تھا، اس کے پیچھے کتنی تکلیف چھپی ہوئی تھی؟

اسے لگا جیسے وہ اپنی بیوی کی حفاظت میں ناکام رہا تھا، جیسے وہ اس کا سب سے بڑا سہارا بننے میں بھی ناکام رہا ہو۔ وہ دل سے ایمان کو چاہتا تھا، دنیا کی ہر چیز سے زیادہ، لیکن آج اس محبت کی آزمائش میں وہ خود کو کمزور اور ناتواں محسوس کر رہا تھا۔

ایمان کی آواز نے ایک بار پھر اس کے زخموں کو گہرا کر دیا۔

- ”پہلے میرا حسن میری آزمائش تھا... میں محبت کے ساتھ سنبھلی، لیکن آج پھر یہی حسن میرا عذاب بن گیا ہے۔“

یہ جملے معارج کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی مانند لگے۔ اس کے حلق میں ایک گانٹھ سی بن گئی، اور اس نے اپنی مٹھی سختی سے بھینچ لی تاکہ بہتے ہوئے آنسو کسی طرح روکے جاسکیں۔ لیکن ضبط کے باوجود آنسو گالوں پر بہنے لگے۔

وہ جانتا تھا کہ وہ ایمان کو تسلی دینا چاہتا ہے، اسے یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ حسن سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ اس کے لیے محض ایک خوبصورت چہرہ نہیں، بلکہ اس کی رفیق حیات، اس کا سہارا، اس کی ہمسفر تھی۔

لیکن وہ الفاظ اس کے لبوں پر آکر تھم گئے۔ وہ خوفزدہ تھا۔ اس بات سے نہیں کہ ایمان کو کیا ہوگا، بلکہ اس سے کہ کہیں وہ مزید دکھ نہ دے بیٹھے، کہیں اس کی کوئی بات اس کا دل نہ توڑ دے۔

ایمان کی سسکیوں کے درمیان ایک اور جملہ تیر کی طرح اس کے دل میں پیوست ہوا

”معارج، میں مر رہی ہوں... اور تم میرے ساتھ نہیں ہو۔ اللہ کے سوا میرے پاس کوئی نہیں۔“

یہ جملہ معارج کے وجود کو جھنجھوڑ گیا۔ اسے لگا جیسے وہ دیوار سے ٹیک لگائے اپنی ہی بزدلی کا بوجھ اٹھائے کھڑا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ایمان کے پاس جائے، اسے سینے سے لگا لے، اور کہے کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔

کہ وہ اس کا ساتھی ہے، اس کا محافظ ہے۔ کہ اللہ بھی ان کے ساتھ ہے اور وہ دونوں مل کر اس کڑی آزمائش کا سامنا کریں گے۔ لیکن وہ ہل نہیں سکا۔ الفاظ جیسے گلے میں پھنس گئے ہوں، اور قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے ہوں۔

ایمان تھکے قدموں کے ساتھ بیڈ پر جا بیٹھی، سر ہاتھوں میں تھام لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ گہرے غم کی تصویر بنی ہوئی تھی، جیسے دنیا کا ہر دکھ اس کے کندھوں پر آن پڑا ہو۔ اس نے قریب رکھی معارج کی شرٹ اٹھا کر سینے سے لگالی، اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔

۔ ”میری دنیا تمہاری بانہوں میں تھی،“ ایمان نے سرگوشی کی، اور اس کے آنسو تکیے پر گرنے لگے۔

یہ منظر معارج کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں، لیکن آنسو پھر بھی اس کے چہرے پر بہتے رہے۔ وہ شرمندگی اور پچھتاوے کے سمندر میں غرق ہو چکا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ وقت کا پہیہ پیچھے گھمالے۔ ہر لمحہ جو اس نے ایمان کے بغیر گزارا، اسے واپس لاسکے۔

وہ خود سے سوال کرنے لگا: کیوں اس نے ایمان کو چھوڑا؟ کیوں وہ اس کے سب سے مشکل وقت میں اس کے پاس نہیں تھا؟

وہ چاہتا تھا کہ ایمان کو تھامے، اس کے گرد اپنی بانہیں ڈالے، اسے اپنی محبت اور موجودگی کا احساس دلائے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا ہر لمحہ، اس کی ہر سانس ایمان کے نام ہو۔ لیکن وہ ساکت تھا—خوف، بے بسی، اور غم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا۔

ایمان کی سرگوشی ایک بار پھر اس کے دل میں پیوست ہو گئی

”اور میری کائنات تمہاری بانہوں میں تھی... تم میری کہکشاں تھے، میرا سب کچھ تھے۔“

معارض کے اندر کچھ ٹوٹ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایمان کو یقین دلائے کہ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہے، کہ وہ اس کا سہارا ہے، کہ وہ کبھی اسے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ الفاظ اب کافی نہیں تھے۔ ایمان نے جو دکھ جھیلا تھا، اس کا مداوا آسان نہیں تھا۔

معارض نے بے بسی کے عالم میں دیوار سے ٹیک لگا کر سر جھکا لیا۔ آنسو اس کے گالوں پر مسلسل بہتے رہے، اور اس کے دل میں صرف ایک ہی خواہش تھی—کہ کاش وہ ایک بہتر شوہر ہوتا، ایک بہتر انسان ہوتا۔ کہ کاش وہ ایمان کے لائق ہوتا، اس کی محبت کے قابل ہوتا۔

وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ بھی کر لے، ایمان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے واپس نہیں لاسکتا۔ لیکن ایک بات طے تھی—وہ اب ایمان کے لیے اپنی زندگی کا ہر لمحہ جینا چاہتا تھا۔

کچھ گھنٹے گزرنے کے بعد معارج نے خاموشی اور بے نیازی

کے ساتھ گھر میں قدم رکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا جسے وہ بے حد احتیاط سے تھامے ہوئے تھا، جیسے اس میں کوئی راز چھپا ہو۔ اس کی چال میں ایک مہارت اور چپکاپن تھا، جیسے وہ سایے کی طرح حرکت کر رہا ہو، ہر قدم گہری منصوبہ بندی کا حصہ لگتا تھا۔

وہ ایمان کے بستر کے قریب پہنچا، جہاں وہ پرسکون نیند کے عالم میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں درد کی ایک لہر دوڑ گئی، مگر وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے بستر کے پاس رکا۔

چند لمحوں تک اسے یوں ہی دیکھتا رہا، جیسے وقت تھم گیا ہو، لیکن پھر اپنے اندر کی بے بسی کو دباتے ہوئے وہ پلٹ گیا اور الماری کی طرف بڑھا۔ الماری کھولی، اور اندر سے رپورٹس نکالیں۔ جب اس نے ان پر ایک نظر ڈالی، اس کی آنکھوں میں غصے اور دکھ کی لکیریں ابھر آئیں۔ یہ وہی رپورٹس تھیں جن سے وہ ہمیشہ بچنا چاہتا تھا، لیکن اب حقیقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ایمان جلد کے کینسر میں مبتلا تھی، اور یہ تیزی سے پھیل رہا تھا۔

معارج نے اپنی سانس تھوڑی دیر کے لیے روکی اور پھر رپورٹس کو واپس رکھ دیا۔ وہ آہستہ قدموں سے ایمان کے پاس آیا، اس کی طرف دیکھا تو اسے سکون کی ایک جھلک دکھائی دی۔ اس نے جھک کر محبت

بھری نظر سے اس کے چہرے پر بکھرے بالوں کو ہٹایا، اور جیسے ہی اس کے چہرے پر کینسر کے نشانات نظر آئے، اس کے دل میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

اس نے نرمی سے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور دھیرے سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں، جیسے اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا ہو۔

مگر معارج جانتا تھا کہ یہ تسلی وقتی ہے، حقیقت کہیں زیادہ تلخ ہے۔ اس نے خاموشی سے بیگ کھولا اور سرنج نکالی جسے اس نے پہلے ہی ایک خاص مائع سے بھر رکھا تھا۔ یہ سیرم ایمان کو بے ہوشی کی نیند میں لے جائے گا۔

معارج نے نہایت چابکدستی سے سرنج کو ایمان کی رگ میں داخل کیا، اس کا ہاتھ مضبوط اور غیر متزلزل تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی جھجک یا تذبذب کا نشان نہ تھا۔ خون کا سرخ مائع سرنج میں آنے لگا، جیسے معارج کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی ہوں، لیکن اس کے چہرے پر صرف ایک سرد مسکراہٹ تھی۔

اس نے سرنج کو احتیاط سے نکالا اور اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ پھر اس نے ایمان کو دیکھا جو اب گہری نیند میں چلی گئی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک دعا نما سرگوشی آئی، جیسے وہ معافی مانگ رہا ہو، مگر اس کی آواز میں وہی عزم تھا جو ہمیشہ سے اس کی پہچان رہا تھا۔

وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اولیو یا کو کال کی۔

۔“ اولیویا، میں تمہیں چند اہم رپورٹس اور خون کا نمونہ روانہ کر رہا ہوں۔

یہ تم تک جلدی پہنچ جائیں گے، اور کل تک انہیں ہر صورت امریکہ پہنچ جانا چاہیے۔

میرا پرائیویٹ جیٹ اسٹاک ہوم ایئرپورٹ پر تیار کھڑا ہے۔ فوراً وہاں سے روانہ ہو جاؤ۔

تاخیر کی کوئی گنجائش نہیں۔”۔

اس کی آواز میں وہی سرد عزم تھا جو ہر رکاوٹ کو ہٹا دینے کے لیے کافی تھا۔

معارض نے کال ختم کی اور فوراً دوسری کال وصول کی۔ یہ بہرام تھا، اس کا دیرینہ دوست اور رازدار۔“ ہیلو

بہرام، فوراً اسپتال پہنچو، تمہاری ضرورت ہے۔ فکر نہ کرو، میں بالکل ٹھیک ہوں، وہاں پہنچ کر سب کچھ

سمجھا دوں گا۔ آغا خان سول ہسپتال پہنچو۔”۔

معارض نے فون بند کیا اور گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ جب وہ اسپتال پہنچا، بہرام پہلے ہی وہاں اس کا منتظر تھا۔

انہوں نے ایک دوسرے کو گر محوشی سے گلے لگایا اور رسمی سلام دعا کے بعد فوراً اہم معاملات پر بات

شروع کر دی۔ ان کے درمیان خاموشی کی ایک عجیب سی فضا تھی، جیسے وہ دونوں ایک بڑے راز کے بوجھ

تले دبے ہوئے ہوں۔

- ”ہمیں ایک منصوبہ بنانا ہو گا، ” معارج کی آنکھوں میں وہی سرد اور بے لچک عزم تھا۔ بہرام نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، لیکن جانتا تھا کہ معارج جو بھی قدم اٹھانے جارہا ہے، وہ سوچا سمجھا ہو گا۔ دونوں نے آپس میں سرگوشیوں میں ایک ایسا منصوبہ بنایا جو سب کچھ بدل سکتا تھا۔ ایک ایسا حادثہ جو معارج کی زندگی کو جڑ سے ہلا دے گا۔ ان کا منصوبہ تھا کہ وہ ایک مصنوعی حادثے کی تخلیق کریں جس میں معارج کی بینائی ختم ہو جائے۔

یہ منصوبہ اس لیے تھا کہ ایمان، جس کا چہرہ جلد کے کینسر کے بھیانک نشانات سے بگڑ چکا تھا، اپنی بدنما شکل سے شرمسار تھی۔ وہ معارج کا سامنا کرنے سے خوفزدہ تھی، اسے ڈرتا تھا کہ اس کی خوبصورتی ماند پڑ جانے سے معارج کی محبت کمزور ہو جائے گی۔ لیکن معارج نے اس کا یہ خوف ہمیشہ کے لیے مٹا دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

معارج نے جان بوجھ کر اپنی بینائی کھونے کا نائٹک رچانے کا فیصلہ کیا تاکہ ایمان کو یہ یقین دلایا جاسکے کہ اس کی صورت اور شکل اب اس کے لیے غیر متعلق ہیں۔ وہ اندھا ہونے کا ڈرامہ کرے گا، تاکہ ایمان کے دل میں کوئی شرمندگی یا خود سے نفرت نہ رہے۔

اس نے اپنے دل میں یہ قسم کھائی کہ ایمان کو وہی محبت اور احترام دے گا جو اس نے ہمیشہ دیا تھا۔

جب وہ منصوبہ طے کر رہے تھے، معارج کے دل میں عجیب سی سکون کی لہر دوڑ گئی۔ یہ سب کچھ ایمان کے لیے تھا، اس کی خوشی اور تسلی کے لیے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ حقیقت کبھی ایمان پر ظاہر نہیں ہوگی، اور اگر ہوئی بھی، تو وہ یہ جان لے گی کہ معارج کی محبت صرف جسمانی حسن سے وابستہ نہیں تھی، بلکہ اس کی روح سے تھی۔

معارج نے ایک گہری سانس لی اور بہرام کی طرف دیکھا۔ ”بس، اب یہ راز ہمیشہ کے لیے دفن رہے گا۔“ بہرام نے مسکراتے اس کو کہا ”ایمان واقعی میں خوش قسمت ہے معارج۔“

یہ محبت کا ایک انوکھا رنگ تھا، جو قربانی اور وفا سے بھرا ہوا تھا۔ معارج کی محبت نے اسے اندھا ہونے پر مجبور نہیں کیا، بلکہ یہ اس کی عظمت اور جذبے کی گواہی تھی، جو صرف ایمان کی روح اور اس کی خوشی کے لیے تھا۔

...°...

امروز

وہ مقدس زیارتِ عمرہ کے لیے تیار ہو رہے تھے، کپڑوں کی گٹھری باندھتے ہوئے ان کے دل میں شکر کا احساس موجزن تھا۔ ایمان خاموشی سے معارج کے کپڑے سوٹ کیس میں سلیقے سے رکھ رہی تھی۔ اس نے تھوڑی سی مسکراہٹ کے ساتھ معارج کی جانب دیکھا اور نرمی سے کہا، "میں نے تمہارا سامان مکمل طور پر پیک کر دیا ہے، حاشر بابا بھی کچھ دیر میں پہنچ جائیں گے لینے۔ اللہ کا شکر ہے، ہم جلد ہی عمرہ کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔"

معارج نے محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے گلے لگایا، اور نرمی سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ "یہ اللہ کا کرم ہے کہ ہم پھر سے اس مقدس سفر پر جا رہے ہیں۔ یہ اُس کی جانب سے بے حد نعمت ہے۔"

ایمان نے شکر گزاری کے احساس کے ساتھ سر ہلایا، "ہاں، ماشاء اللہ۔ یہ ہمیں اپنے گناہوں کی معافی اور اُس کی رحمت مانگنے کا بہترین موقع مل رہا ہے۔"

انہوں نے اپنے سامان کی پیکنگ مکمل کی اور آخر کار روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ ہر چیز کا احتیاط سے جائزہ لیا: پاسپورٹ، ٹکٹ، رقم۔ سب کچھ ترتیب سے رکھا گیا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنے گھر سے باہر نکلے، حاشر اور نور گاڑی میں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ حاشر نے جلدی سے باہر آکر ان کا سامان گاڑی میں رکھا، اور وہ سب خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

گاڑی پہاڑی راستے پر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ ہنزہ کی سرسبز وادیاں، بلند و بالا پہاڑ، پر شکوہ دریا اور دور تک پھیلے ہوئے جنگلات پیچھے رہ گئے تھے۔ فضاء میں پرندے آزادانہ اڑتے دکھائی دیتے تھے، جیسے ان مناظر کی خاموش گواہی دے رہے ہوں۔

ہنزہ کا وہ گھر جس میں کبھی ان کی خوشیوں اور یادوں کا مسکن تھا، دور سے چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ان کے جانور پھرتے، دن ڈھلتا اور راتیں ہوا کے سنگ سرگوشیاں کرتی تھیں۔ اس لمحے میں، یہ جگہ جیسے دھیرے دھیرے ان سے دور ہوتی جا رہی تھی، مگر دل میں یادوں کی کشتی ہمیشہ موجود تھی۔

وہ پہاڑ جو ان کے کمرے کی کھڑکی سے دکھائی دیتا تھا، ویسے ہی شان و شوکت سے ایستادہ تھا، جیسے صدیوں سے فطرت کی گود میں محفوظ ہو۔ سورج کی سنہری کرنیں اس کی چٹانوں پر پڑتے ہی اسے سونے کی مانند جگمگانے لگتی تھیں، اور اس کی بلندیاں برف کی سفید چادر اوڑھے خاموشی سے زمین کے حسن کی گواہی دے رہی تھیں۔

نیچے بہتا دریا، جو شفاف پانیوں کی جھلمل میں ڈوبا ہوا تھا، اپنی روانی میں ایک خوابناک حسن سموئے ہوئے، ارد گرد کے مناظر کو اور بھی دلکش بنا رہا تھا۔

فضا میں گاڑی اب ایک چھوٹی سی لکیر کی مانند دکھائی دے رہی تھی جو پتھر یلے راستے پر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی، اور پہاڑوں کی بلندیاں اور نیلگوں آسمان ان کا گواہ تھے۔

ایئرپورٹ کے ہال میں ان کے قدم بو جھل اور دل جذبات کی شدت سے لبریز تھے۔ فلائٹ کا اعلان ہوا تو جیسے ہر چیز ایک لمحے کے لیے رک گئی ہو۔ ایمان نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی، نور، شانزہ، حاشر بہرام سب اس کے قریب موجود تھے، جیسے یہ آخری لمحات میں ان کے دلوں کی دھڑکنوں کا حصہ بنے ہوں۔

ایمان نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نور کو گلے لگایا، جیسے وہ اپنی ماں سے آخری بار مل رہی ہو۔ نور نے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور محبت سے کہا، "بیٹی، اللہ تمہیں ہمیشہ اپنی پناہ میں رکھے۔ تم نے اپنی زندگی میں جو تکالیف اٹھائیں ہیں، وہ تمہاری مضبوطی کی گواہی ہیں۔ تمہاری ہمت ہمیں فخر دیتی ہے۔"

ایمان کی آنکھیں نمی سے بھر آئیں لیکن وہ انہیں چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ اپنی بیماری، اپنے اندر پنپتے کینسر کا راز نور کو نہیں بتانا چاہتی تھی۔ وہ اس دکھ کو اپنے اندر دبا کر، مضبوط نظر آنا چاہتی تھی۔ "شکریہ نور امی، آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں، میری رہنمائی کی۔ اللہ آپ کو خوشیوں اور راحتوں سے نوازے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کو زبردستی روکا اور معصوم مسکراہٹ کے ساتھ نور کو چھوڑ دیا۔

شانزہ بھی قریب آئی، وہ ایمان کی دوست سے زیادہ بہن کی مانند تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خاموشی سے گلے لگایا، جیسے ہزاروں باتیں بغیر الفاظ کے ہی کہہ دی ہوں۔ معارج کچھ فاصلے پر کھڑا تھا، حاشر اور بہرام کے ساتھ باتوں میں مگن، مگر اس کی نگاہیں مسلسل ایمان پر تھیں۔

جب بورڈنگ کا وقت قریب آیا، ایمان نے ایک آخری بار پیچھے مڑ کر سب کو دیکھا، اور دل کی گہرائیوں سے ہاتھ ہلایا۔ وہ سب اسے دیکھ رہے تھے، جیسے ہر پل کا منظر دل میں قید کر لینا چاہتے ہوں۔ معارج نے ایمان کا ہاتھ تھام لیا، مگر اس کے دل میں عجیب سی کسک تھی، جیسے کوئی راز اسے اندر سے کھا رہا ہو۔

معارج کے دل میں جذبات کا ایک طوفان اٹھا، وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے، کہ اس نے اس کے لیے اپنی دنیا کی ہر خوشی قربان کر دی، کہ اس کا ہر قدم ایمان کی خوشیوں کے لیے اٹھا ہے۔ لیکن زبان پر الفاظ آکر دم توڑ گئے۔

ایمان نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما، وہ جانتی تھی کہ معارج کیا محسوس کر رہا ہے، لیکن وہ اسے مزید تکلیف میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا، جیسے یہ لمحہ ان دونوں کے دلوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا۔

جب وہ دونوں اپنی منزل کی جانب جانے لگے، ان کے قدم جیسے بو جھل ہو گئے۔ پیچھے ایک دنیا تھی جو انہوں نے اپنے پیاروں کے ساتھ گزاری تھی، لیکن سامنے ایک نامعلوم سفر تھا، جس کا اختتام کوئی نہیں

جانتا تھا۔ معارج نے آخری بار پیچھے دیکھا، وہ سب ان کے لیے ہاتھ ہلا رہے تھے، اور ہنزہ کی وادیاں، پہاڑ اور دریادل میں نقش ہو چکے تھے، جیسے وہ منظر کبھی مٹ نہ پائے گا۔

ایمان نے معارج کا ہاتھ اور زور سے تھام لیا، جیسے وہ اس کا آخری سہارا ہو۔

معارج نے ایک عہد باندھا تھا، ایک ایسا عہد جسے ہر حال میں پورا کرنا تھا۔ اس نے اپنی جان پر کھیل کر ایمان کو بچانے کا وعدہ کیا تھا، اس کے دکھوں کو مٹانے، اسے زندگی کی روشنیوں میں واپس لانے کا عہد کیا تھا۔

وہ اس کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار تھا، چاہے اس کی اپنی زندگی ہی کیوں نہ داؤ پر لگ جائے۔ وہ بس یہ چاہتا تھا کہ وہ اسے اپنے خوابوں کے باغ میں تتلی کی طرح آزاد اور خوش دیکھ سکے۔

مگر اسے کیا معلوم تھا کہ بعض سفر ایسے بھی ہوتے ہیں جو آخری ثابت ہوتے ہیں؟ بعض وعدے وہ ہوتے ہیں جو کبھی پورے نہیں ہو پاتے، اور بعض محبتیں وہ ہوتی ہیں جو ہمیشہ کے لیے دل میں دفن رہ جاتی ہیں۔

اسے کیا خبر تھی کہ کبھی کبھی انسان کا آخری ساتھ ہی اُس کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ بن جاتا ہے؟

اور پھر، بعض اوقات ایک ساتھ... آخری ساتھ بن جاتا ہے۔

موت کی حقیقت اس قدر خاموشی سے قریب آتی ہے کہ انسان اپنی آخری سانسوں میں بھی یہ نہیں جان پاتا کہ وہ کب سے اس کے گرد اپنا جال بُن رہی تھی۔ وہ وعدے، وہ خواب، وہ محبتیں... سب اچانک ایک سرد ہوا کے جھونکے میں بکھر جاتے ہیں، جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

.....°.....

دولتِ ایمان: آخری لمحات، آخری جھٹکا، آخری راز

کعبہ کے صحن میں ہزاروں زائرین سفید احرام میں لپٹے ہوئے اللہ کی بارگاہ میں جھکے ہوئے تھے۔ ہر چہرہ خشوع و خضوع سے لبریز تھا، اور دلوں کی دھڑکنیں اپنے رب کی رضا کے حصول میں تیز ہو رہی تھیں۔

وہ لمحہ اپنی گہرائی میں عظیم تھا، جب دنیا بھر سے آنے والے مسلمان طوافِ کعبہ کی مقدس رسم میں مصروف تھے۔ آسمان پر سیاہ بادل چھا چکے تھے، اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، طوفان کی آمد کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

دور افق پر بادلوں کا گھمبیر شور سنائی دے رہا تھا۔ فضا میں خفیف سی سردی پھیلنے لگی، اور بجلی کی ہلکی ہلکی چمک بادلوں میں پوشیدہ رازوں کی طرح کڑک رہی تھی۔

ہر چمک کے ساتھ آسمان ایک لمحے کے لیے روشن ہو جاتا، مگر پھر گھنے بادلوں میں ڈوب جاتا۔ اس منظر میں ایک عجیب سی سنسنی تھی، لیکن زائرین کے چہروں پر خوف کے بجائے سکون اور یقین تھا۔

ایمان اور معارج نے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر عاجزی اور محبت کے جذبات واضح تھے۔ وہ اللہ کے گھر کے گرد طواف میں مگن تھے، دلوں میں لاکھوں دعائیں اور زبان پر شکر کے کلمات۔

ہر قدم کے ساتھ وہ اللہ کے قریب ہوتے جا رہے تھے، اور ہر چکر کے ساتھ ان کے دل میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کا جذبہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اچانک، بارش کی پہلی بوند زمین پر گری۔ یہ بوند جیسے آسمان سے کوئی پیغام لے کر آئی ہو، اور زمین پر پڑتے ہی ہوا کی ٹھنڈک میں اضافہ کر گئی۔ لیکن یہ بارش ایک معمولی بارش نہیں تھی۔ جلد ہی بوندیں تیز ہو کر بارش میں تبدیل ہو گئیں، اور کعبہ کے صحن میں موجود ہر شخص بھگنے لگا۔ طوفان کی شدت بڑھنے لگی، اور ہوا کے جھونکے بادلوں کے ساتھ مل کر تیز ہو گئے۔

معارج نے ایمان کا ہاتھ مزید مضبوطی سے تھام لیا، جیسے وہ کسی بھی حال میں اسے کھونا نہ چاہتا ہو۔ بارش کی تیزی میں وہ دونوں طواف کرتے رہے، ان کے احرام بھینکنے لگے، مگر ان کے دل میں ایک سکون تھا، ایک اطمینان تھا کہ وہ اللہ کے گھر میں ہیں، اور یہاں ان کی حفاظت ہوگی۔

لیکن اچانک، بھیڑ میں ایک زائر نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے معارج کے کندھے سے ٹکرماری۔
معارج کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے ایمان کی گرفت سے چھوٹ گیا۔

یہ ایک لمحہ تھا، لیکن اس لمحے نے ایمان کے دل میں خوف کی لہر دوڑادی۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ آگے بڑھایا،
لیکن معارج کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ بارش کی بوندیں اب طوفان کی شکل اختیار کر چکی تھیں، اور بجلی کی
کڑک فضا میں گونجنے لگی تھی۔

ایمان نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف لوگ بھاگ دوڑ میں تھے، طوفان کی شدت میں پناہ
ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر وہ معارج کو کہیں نہ دیکھ سکی۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، اور خوف نے اس کے پورے وجود کو گھیر لیا۔ اس نے معارج کا نام
پکارنے کی کوشش کی، مگر اس کی آواز طوفان کی گونج میں دب گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، اور وہ
اللہ سے مدد مانگ رہی تھی کہ وہ انہیں دوبارہ ملا دے۔

ایمان کی آنکھوں کے سامنے روشنی دھندلی ہونے لگی تھی، اور بھیڑ کی دھکم پیل میں وہ خود بھی گم ہونے
لگی تھی۔ وہ قدم قدم آگے بڑھتے ہوئے معارج کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی، مگر ہر قدم کے ساتھ
اس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ اللہ سے دعا کر رہی تھی، "یارب، ہمیں دوبارہ ملا دے، ہمیں اس آزمائش سے بچالے۔" مگر طوفان کی شدت میں اس کی دعائیں بھی کہیں گم ہوتی جا رہی تھیں۔

اچانک، بھیڑ میں ایک لمحے کے لیے اسے معارج کی ایک جھلک نظر آئی، مگر وہ اتنی تیزی سے گزر گیا کہ وہ اس تک پہنچ نہ سکی۔ ایمان نے اپنے دل کی دھڑکن کو سنبھالنے کی کوشش کی، اور ایک بار پھر معارج کو پکارا، مگر اس کی آواز طوفان کے شور میں کھو گئی تھی۔

یہ لمحہ بہت بھاری تھا۔ ایمان کو ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا، جیسے یہ سفر ان کا آخری سفر ہو۔ جیسے اس طوفان میں کچھ ایسا چھپا ہو جو ان دونوں کی تقدیر بدل دے گا۔

ایمان کی نگاہیں بے اختیار ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں، کہ معارج کہیں مل جائے۔ یکلخت اس کی نظریں سامنے ٹک گئیں، اس کی سانس جیسے تھم سی گئی۔ ایک پہچانا ہوا چہرہ سامنے آکھڑا ہوا تھا، جو اسے کسی خواب کی مانند لگ رہا تھا۔ وہی بزرگ جنہوں نے اسے روشنی کا راستہ دکھایا تھا، جن کے ہر لفظ نے اسے اسلام کے حقیقی مفہوم سے آشنا کیا تھا۔ سفید لمبی داڑھی، متین اور دل نشین مسکراہٹ، جیسے ان کی شخصیت میں ہر درد کا مداوا چھپا ہو۔

ایمان حیرت زدہ تھی، گمان میں تھی کہ یہ شخصیت تو سالوں پہلے گم ہو چکی تھی، کیا وہ واقعی زندہ تھے؟ اور یہاں مکہ مکرمہ میں؟ اس نے لرزتی مسکراہٹ کے ساتھ سلام پیش کیا، دل میں کئی سوالات لیے۔

"بابا! آپ... میں ہوں، ایمان۔ وہی لڑکی جسے آپ نے ہدایت کی روشنی دکھائی تھی۔ کیا آپ کو یاد ہے؟"

بزرگ نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا، پھر شفقت بھری مسکان کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
"ماشاء اللہ، عبد اللہ! میں تمہیں دیکھ کر خوش ہوں۔ تم نے اپنے نام کو سچا معنی دیا ہے۔ تم ایک باوقار، ایمان دار، اور اطاعت گزار خاتون بن گئی ہو۔"

ایمان کا دل گداز ہو گیا۔ آنکھوں میں نمی کا سمندر بھر آیا۔ "بابا، یقین نہیں آتا کہ ہم دوبارہ ملے ہیں۔ آپ میرے لیے ہمیشہ ایک روشنی کی مانند رہے ہیں۔"

اس کے اندر خوشی اور حیرت کی ملی جلی کیفیات پیدا ہو رہی تھیں۔ وہ بزرگ کے لیے شکر گزار تھی، لیکن معارج کے لیے بھی پریشان تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ معارج بھی ان سے ملے تاکہ وہ جان سکے کہ وہ کس قدر خوش قسمت ہے۔

"بابا، میں شادی شدہ ہوں،" اس نے نرم انداز میں کہا۔ "میں آپ کو اپنے شوہر سے ملوانا چاہتی ہوں۔ وہ ایک عظیم شخص ہے، مجھ سے محبت کرتا ہے، میری عزت کرتا ہے۔" ایمان نے معارج کو نظروں سے تلاش کیا، اور وہ کچھ فاصلے پر ادھر ادھر دیکھتا نظر آیا۔

"وہ وہاں ہیں،" اس نے بزرگ کی توجہ معارج کی طرف مبذول کرائی۔ "یہ معارج ہیں، میرے شوہر۔"

بزرگ نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔ "وہ ایک سچا رفیق ہے، عبد اللہ۔ تمہارے لیے خدا کا انعام ہے، وہ تمہاری حفاظت، تمہاری زندگی کا نور ہے۔"

ایمان نے آنکھوں میں چمک لیے سر ہلایا، "ہاں، وہ سب کچھ ہے۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔" بزرگ نے سر ہلایا، لیکن ان کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ "میں جانتا ہوں، عبد اللہ۔ تمہیں اس کے ہر عمل کا علم ہو گا۔"

ایمان حیران ہوئی۔ "آپ کا مطلب کیا ہے، بابا؟ اس نے میرے لیے کیا کیا ہے؟"

بزرگ کے چہرے پر پراسرار سکون چھا گیا۔ "تم جان جاؤ گی، عبد اللہ۔ وقت کے ساتھ سب کچھ عیاں ہو گا۔ اب تم اپنے شوہر کے پاس جاؤ۔ میری اور تمہاری ملاقات مقدر تھی، اور وہ بھی اپنی حقیقت کو پالے گا۔"

ایمان کے دل میں مزید سوالات نے جنم لیا، لیکن بزرگ کا انداز ایسا تھا کہ وہ مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ "بابا، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

وہ مسکرا دیے، ان کی آنکھوں میں درد اور حکمت کی آمیزش تھی۔ "بس خدا پر یقین رکھو، عبد اللہ۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارے لیے کیا بھلا ہے، تمہارے لیے کیا خیر ہے۔"

یہ کہہ کر بزرگ مڑ کر چل دیے۔ ایمان نے ان کی پشت کو حیرت اور تجسس بھری نظروں سے دیکھا، جیسے ان کے ہر قدم کے ساتھ کوئی راز پردے سے ہٹنے والا ہو۔ وہ ان کے پیچھے جانا چاہتی تھی، لیکن معارج بھی اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اچانک، فضا میں بجلی کی چمک اور گرج نے ماحول کو خوفناک بنا دیا۔ ہوا کے تیز جھونکے میں ایمان کا عبایا پھڑپھڑا رہا تھا، کپڑے اور چیزیں فضا میں اڑنے لگیں۔ ایمان نے جلدی سے معارج کی طرف دوڑ لگائی اور اسے مضبوطی سے تھام لیا۔

"تم کہاں تھیں؟" معارج نے اس کے گلے لگتے ہوئے پوچھا۔ "میں بہت پریشان تھا۔ کیا تم ٹھیک ہو؟" "ہاں، معارج۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس، بزرگ سے مل رہی تھی،" ایمان نے بے یقینی کے عالم میں کہا۔ "وہ وہی تھے جنہوں نے مجھے اسلام کا راستہ دکھایا تھا۔ لیکن ان کا انداز بہت پر اسرار تھا، جیسے وہ کچھ چھپا رہے ہوں۔"

"بزرگ؟ وہ کہاں ہیں؟ انہوں نے کیا کہا؟" معارج کی پیشانی پر تشویش کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

"انہوں نے بس اتنا کہا کہ میں سمجھ جاؤں گی، لیکن یہ سب بہت عجیب تھا۔ وہ جیسے کوئی راز چھپا رہے تھے، کوئی منصوبہ بنا رہے تھے، اور اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھتی، وہ چلے گئے۔" ایمان کی آواز میں حیرانی اور بے چینی تھی۔

معارض نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ "یہ سب کچھ بہت عجیب ہے، ایمان۔"

ایمان نے شدت سے کہا، "نہیں، معارج۔ وہ ایک ولی ہیں، ایک خدا کے ولی۔ ان کی باتوں میں حکمت ہے۔ وہ ہمارے لیے کوئی پیغام لے کر آئے ہیں۔ وہ ایک فرشتہ صفت انسان ہیں"

فضا میں سنسنی خیز سناٹا چھا گیا۔ ایمان کے دل میں سوالات ہلچل مچا رہے تھے۔

مگر ایمان کو علم نہ تھا کہ اس کے لبوں سے نکلی بات حقیقت کا کتنا عمیق راز لیے ہوئے تھی۔ عقب میں وہ بزرگ، جن کی شخصیت ایک معمہ تھی، خاموشی سے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا وجود منظر عام پر تھا، مگر ان کی موجودگی سے بے خبر ہر کوئی ان کے جسم کے اندر سے گزرتا جا رہا تھا، جیسے وہ کسی غیبی پردے میں پوشیدہ ہوں، یا جیسے وہ ہوا کا کوئی سایہ ہوں، کسی غیر مرئی شے کی مانند۔ ان کا وجود تھا، مگر ان کی حقیقت کسی پر آشکار نہ تھی۔

بزرگ نے اپنی پلکیں دھیرے سے موند لیں اور جب آنکھیں دوبارہ کھولیں تو ان کی آنکھوں میں نیلگوں چمک کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

وہ چمک ایک نورانی کرن کی مانند تھی جو ان کے چہرے سے پھوٹ کر ہر طرف پھیل گئی، لیکن یہ نور دنیا کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ کوئی انسان اس نور کو دیکھنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا، وہ محض ایک غیبی روشنی تھی جو ان پر عیاں ہوتی، جنہیں قدرت نے اسرار کے اس دروازے کے پار دیکھنے کی صلاحیت بخشی تھی۔

یہ ایک وہ بزرگ فضا میں نمودار ہوئے، آسمان کی جانب ان کا وجود بلند ہو گیا۔ اور ان کے عقب سے تین نورانی شخصیات ظاہر ہوئیں، جن کے چہرے روشنی سے منور تھے، اور وہ ایمان کے سر پر منڈلا رہی تھیں۔ وہ نورانی وجود ایک ایسے لطیف نور کا سایہ تھے جسے دنیا کی فانی آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں۔

ایمان کا سر اچانک بھاری ہو گیا، گویا اس کے گرد کوئی ان دیکھا بوجھ آسمان سے نازل ہو رہا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، جیسے دنیا کی ہر روشنی اس کے وجود سے چھین لی گئی ہو۔ وہ جو ابھی کچھ لمحے قبل معارج کے ساتھ تھی، یکدم نڈھال ہو کر زمین کی طرف جھکنے لگی۔ معارج، جو اُس وقت کسی خیال میں غرق چل رہا تھا، اچانک چونک اٹھا۔

وہ جس کی آنکھوں میں بظاہر کچھ نہ تھا، وہ جس کا اندھا پن ایک دکھاوا تھا، اُس کی حقیقت اچانک عیاں ہوئی۔ معارج کا نائٹک، جسے اس نے بڑی ہوشیاری سے چھپایا ہوا تھا، ایک لمحے میں ٹوٹ گیا۔ وہ زور سے چیخ اٹھا، گویا اُس کی دنیا یکدم تہ و بالا ہو گئی ہو۔

فضا میں ایک ہولناک سناٹا چھا گیا، اور اسی لمحے آسمان پر وہ تین نورانی ہستیاں ایمان کے سر کے اوپر منڈلانے کے بعد ایک روح کو اپنے ہمراہ لے کر فضا میں بلند ہو گئیں۔ ایمان کی بے جان ہوتی ہوئی جسمانی حالت اور ان نورانی شخصیات کا رقص ایک پراسرار منظر پیش کر رہا تھا، جو دنیاوی آنکھوں کے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

معارض کی دل دہلا دینے والی آواز فضا میں گونجی۔ وہ اپنے وجود کے ہر حصے سے لرز رہا تھا، گویا اس نے ایک خوابناک حقیقت کو چھوتے ہی سب کچھ کھو دیا ہو۔ اس کی چیخیں ہوا کے دوش پر بکھرتی جا رہی تھیں، اور معراج کی بے بسی آسمان تک جا پہنچی۔

عین اس لمحے عمرہ کی مقدس فضا میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ طواف کرنے والے لوگ حیرت اور خوف کے عالم میں اُس مقام پر جمع ہونے لگے جہاں ایمان نڈھال پڑی تھی۔ ہجوم نے جگہ گھیر لی، ہر شخص شش و پنج میں مبتلا تھا، جیسے کوئی ان دیکھا خطرہ ان پر منڈلا رہا ہو، مگر حقیقت کسی پر بھی واضح نہ تھی۔

وہ نہ جانتے تھے کہ آسمان پر کیا وقوع پذیر ہو چکا تھا، نہ وہ ان نورانی ہستیوں کو دیکھ سکتے تھے جو اس ساری کیفیت کا حصہ تھیں۔

اور اس لمحے، جب ایمان کا وجود زمین سے آگے، فضا کی شگافوں میں سے ایک راز چھپتے چھپتے معارج کی نگاہوں میں چھلکنے لگا، گویا اُس کی دنیا میں کوئی ناقابلِ بیان حقیقت کا پردہ ہٹ چکا ہو۔

معارض اب تک احرام کی گرہیں مضبوطی سے باندھے ہوئے تھا، آنکھوں میں بے یقینی اور دل میں ایک گہرا اضطراب لیے، ہسپتال کے سرد اور بے جان ماحول میں بے چینی سے خبر کا انتظار کر رہا تھا۔

تنگ راہداری، جس کے سفید رنگ میں فلور سنٹ لائنٹس کی ٹھنڈی روشنی پھیلی ہوئی تھی، ایک قید خانے کی مانند لگ رہی تھی۔ وہ بیچ پر بیٹھا، تسبیح کے دانوں پر انگلیاں پھیر رہا تھا اور زیر لب اللہ کا ذکر کر رہا تھا، جیسے کوئی معجزہ اس کی بیوی، اس کی دنیا کو موت کے پیچھے سے کھینچ لائے گا۔

وہ دونوں عمر کے مقدس سفر میں اللہ کی رضا کے لیے نکلے تھے، اپنے رشتے کی تجدید اور گناہوں کی معافی کے طلبگار بن کر۔ لیکن کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ سفر ان کے لیے آخری ثابت ہو گا۔ ایمان کے اچانک گرنے کے بعد، وہ اسے ہسپتال لے آیا تھا، دل میں امید، آنکھوں میں خوف لیے۔

ایک نرس، کلپ بورڈ ہاتھ میں لیے، سست قدموں سے اس کی طرف آئی، چہرے پر ایسی اداسی تھی جو الفاظ سے زیادہ چیخ رہی تھی۔ "معارض صاحب، آپ کی بیوی کا نام ایمان ہے؟" اس نے انگریزی، میں سوال کیا۔

معارض نے بے حس و حرکت چہرے سے نرس کی طرف دیکھا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا، لیکن ابھی تک یقین کی حالت میں نہیں تھا۔ ہر سوال میں جیسے ایک انکار چھپا ہوا تھا۔ "ہاں... ایمان... وہ میری بیوی ہے... وہ کیسی ہے؟ کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

نرس نے ایک لمحہ توقف کیا، اور پھر سنجیدہ لہجے میں کہا، "ہم نے ہر ممکن کوشش کی، لیکن انہیں بچا نہیں سکے۔ ان کے خون میں کسی نامعلوم مادے کے رد عمل نے شدید دل کا دورہ پیدا کیا۔"

معارض کے اندر جیسے وقت تھم گیا۔ یادیں، باتیں، قسمیں، وعدے—سب کچھ بکھر گیا۔ اس کے دل نے دھڑکنابند کر دیا، جیسے ایمان کی زندگی کے ساتھ اس کی زندگی بھی ختم ہو چکی ہو۔ وہ اس کی دنیا تھی، اور اب وہ دنیا زمین بوس ہو چکی تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے ایمان کی مسکراہٹ ابھری، جیسے ستاروں کی چمک—جواب اندھیرے میں کہیں گم ہو چکی تھی۔ وہ اس کا ستارہ تھی، اس کی روشنی، لیکن اب وہ روشنی ماند پڑ چکی تھی۔

معارض کو وہ باغ یاد آیا جہاں ایمان تتلیوں کے پیچھے بھاگتی تھی۔ وہ اس کی تتلی تھی، جو اس کے دل کے پھولوں پر بیٹھتی تھی۔ لیکن اب وہ تتلی ہمیشہ کے لیے اڑ چکی تھی، اور معارج کے ہاتھ میں صرف کانٹے رہ گئے تھے۔

نرس کی آواز جیسے کہیں دور سے آرہی تھی، لیکن معارج اس میں کچھ سن نہیں پا رہا تھا۔ دل کے اندر کہیں ایک خاموش چیخ تھی جو کسی کو سنائی نہ دے رہی تھی۔ اس نے کہا، "نہیں... یہ ممکن نہیں... وہ زندہ ہے، وہ یہاں ہے... یہ غلط ہے... وہ ایمان ہے، وہ میری زندگی ہے۔"

وہ نرس کو دھکیل کر آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن نرس نے اسے روک لیا۔ "مجھے افسوس ہے، معارج صاحب، لیکن آپ کو وہاں نہیں جانے دیا جاسکتا۔" نرس کی آواز میں ایک عجیب سی خاموشی تھی، جیسے وہ بھی کسی ناگہانی حقیقت سے دوچار ہو۔

معارج نے احرام کو اپنے سینے کے قریب کیا اور فرش پر گر گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے قابو آنسو بہنے لگے۔ زندگی میں پہلی بار، اسے لگنے لگا تھا کہ اس کے پاس اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ جیسے اس کی روح بھی ایمان کے ساتھ ہی رخصت ہو چکی ہو۔

یہ لمحہ نہ صرف جدائی کا تھا بلکہ کچھ ایسا تھا جو دل کے پردے میں شبہات اور اندیشوں کا بیج بورہا تھا۔

معارج کرسی پر بے حرکت اور گم سم بیٹھا تھا، جیسے اس کے حواس جواب دے گئے ہوں۔ ابھی کچھ لمحے قبل اس نے اپنی زندگی کی سب سے روح فرسا خبر سنی تھی کہ اس کی بیوی، ایمان، اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔

دل کے اندر ایک عجیب سی سنسنی تھی، جیسے دنیا اچانک سکڑ کر ایک نقطہ بن چکی ہو، اور وہ نقطہ معارج کے دل میں کھلنے والی گہری خالی جگہ تھی۔ وہ اس نرس کو گھورتے ہوئے دیکھ رہا تھا جس نے یہ قیامت اس کے گوش گزار کی تھی۔

وہ دوسری جانب بڑھ رہی تھی، جہاں ایک اور خاندان اپنی مریضہ کی صحت یابی کی خوشی منا رہا تھا۔ نرس نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا، "آپ کی مریضہ وہاں ہے، آپ انہیں جا کر دیکھ سکتے ہیں، وہ بالکل ٹھیک ہیں۔"

اس منظر نے معارج کے دل میں غصے اور حسد کا عجیب سا طوفان برپا کر دیا۔ وہ کیوں اپنے پیارے کو زندہ دیکھ رہے ہیں جبکہ اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا نقصان سہنا پڑا؟ اس کے دل میں ایک بے چینی کی لہر دوڑ گئی، اور اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

مگر اس کے غور و فکر میں خلل اس وقت آیا جب اچانک کمرے سے چیخوں کی آواز بلند ہوئی۔ وہ چونک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ چیخنے والے وہی لوگ تھے جو ابھی خوشی سے چہک رہے تھے۔ نرس ان کے پیچھے بھاگی، اس کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا، اور اس کے لبوں پر ہلکی سی لرزش تھی۔

نرس نے معارج کی طرف رخ کرتے ہوئے تذبذب سے پوچھا، "آپ کی بیوی کا نام ایمان معارج ہے یا ایمان بن معارج؟" یہ سوال غیر متوقع تھا، اور معارج کو الجھن میں ڈال گیا۔

وہ آنکھوں میں حیرت لیے بولا، "ایمان معارج... کیوں؟" نرس نے ایک گہری سانس لی اور گھبراہٹ کے ساتھ ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا، "اوہ، مجھے بے حد افسوس ہے، ناموں میں غلطی ہو گئی ہے۔ دونوں مریضوں کے نام ملتے جلتے ہیں۔ ایک کا نام ایمان معارج تھا اور دوسری کا ایمان بن معارج۔ میں نے چارٹ پر نام دیکھ کر غلطی کر دی۔"

نرس کے ہونٹوں سے نکلی یہ بات معارج کے کانوں میں امید کی سنسنی بن کر گونجی، جیسے کسی مردہ دل میں زندگی کی چنگاری بھڑک اٹھی ہو۔ "کیا مطلب؟" اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

نرس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا، "آپ کے پیچھے جو لوگ تھے، ان کی دادی کا نام ایمان بن معارج تھا، اور وہ عمرے کے دوران بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اسی لیے میں کنفیوژن میں پڑ گئی۔ آپ کی بیوی زندہ ہے، وہ بالکل ٹھیک ہے، اور وہ اس کمرے میں ہیں۔"

یہ سننا تھا کہ معارج کے جسم میں خون کی تیز گردش نے اس کے دل کو نئی زندگی بخشی۔ "میری بیوی زندہ ہے؟" اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دہرایا۔ نرس نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا، "جی، وہ وہاں ہیں۔ ڈاکٹر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ جا کر ان سے مل سکتے ہیں، وہ خیریت سے ہیں۔"

معارج کی خوشی کی لہر نے اسے اپنی جگہ سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے تیزی سے کمرے کی طرف دوڑ لگائی، اس کے دل میں ایک عجیب سی مسرت تھی، جیسے وہ کسی قید سے آزاد ہو رہا ہو۔ دروازے تک پہنچ کر اس نے اسے کھولا، اور سامنے بیڈ پر ایمان کو بیٹھے مسکراتے دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں زندگی کی روشنی چمک رہی تھی۔

معارض تیزی سے اس کی طرف بڑھا، اور اس کے قریب پہنچ کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اس کی پیشانی پر لب رکھے، اس نے آنسوؤں کی لرزش کے ساتھ کہا، "ایمان، میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں... میں تمہیں کھو نہیں سکتا تھا، خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ ہو۔"

ایمان نے بھی اس کے گرد اپنی بانہیں ڈالیں اور دھیرے سے کہا، "میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں، معارج، اور میں بہت خوش ہوں کہ تم میرے ساتھ ہو۔" دونوں کی نظریں ایک دوسرے میں گم ہو گئیں، اور انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے انہیں زندگی میں دوسرا موقع مل گیا ہو۔ جیسے وہ دوبارہ پیدا ہوئے ہوں۔

معارض نے اپنے دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس کی دنیا، اس کی کائنات، اس کا باغ، اور اس کی تتلی، سب کچھ بچا لیا گیا تھا۔

.....

معارض اور ایمان ایک دوسرے کے حصار میں جکڑے ہوئے تھے، دل کی دھڑکنیں سانسوں میں مدغم ہو رہی تھیں، جب ڈاکٹر خاموشی سے ان کے قریب آئی۔ اس کے ہاتھ میں کلپ بورڈ تھا، اور چہرے پر ہلکی مسکراہٹ، جیسے کوئی خوشخبری لانے والی ہو۔ ڈاکٹر نے ایک لمحے کے توقف کے بعد، نرم لہجے میں کہا، "آپ نے بتایا تھا کہ آپ کی اہلیہ کو جلد کا سرطان، میلا نوما، لاحق ہے؟" معارج نے گہری سانس لیتے

ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور ایمان کے ہاتھ کو مزید مضبوطی سے تھام لیا۔ "جی، تصدیق کے لیے خون کا نمونہ امریکہ بھیجا تھا، وہاں سے بھی یہی تشخیص آئی تھی۔"

ڈاکٹر کی مسکراہٹ مزید پھیل گئی، جیسے کوئی راز فاش کرنے جا رہی ہو۔ "اللہ کا شکر ہے کہ یہ تشخیص غلط تھی۔ آپ کی اہلیہ کو جلد کا سرطان نہیں ہے۔ ان کی جلد کی بیماری میلانوما سے ملتی جلتی ہے، لیکن یہ سنگین نہیں ہے۔ یہ ایک عمومی مرض ہے جس کا علاج ممکن ہے۔ دوائیوں اور علاج کے ذریعے وہ جلد صحت یاب ہو جائیں گی، ان شاء اللہ۔"

یہ الفاظ معارج کے کانوں میں کسی خوشخبری کی طرح گونجے، جیسے کسی قیدی کو رہائی کی نوید سنائی جا رہی ہو۔ دل میں بے یقینی اور حیرت کا طوفان اٹھا، اور اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ "کیا... کیا یہ واقعی سچ ہے؟ کیا آپ یقین سے کہہ رہی ہیں؟" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا، "ہاں، یہ سچ ہے۔ ہم نے کئی ٹیسٹ اور اسکین کیے ہیں، اور ان سب کا نتیجہ یہی ہے۔ آپ کی بیوی کو کوئی جان لیوا بیماری نہیں ہے۔"

معارج کے دل پر جیسے امید اور راحت کی ایک نئی روشنی چھا گئی۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر، جیسے قدرت کی طرف سے ایک اور انعام ہو، ڈاکٹر کی آواز دوبارہ سنائی دی، "اور ایک اور بات

ہے۔ آپ کی اہلیہ کو جو چکر آرہے تھے، وہ کسی بیماری کی وجہ سے نہیں تھے۔ وہ حاملہ ہیں، اور ان کے پیٹ میں ایک نہیں، چار بچے ہیں۔"

یہ سن کر معارج کا جسم جھنجھٹا اٹھا، اور اس نے بے یقینی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ "چار... بچے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" اس نے حیرانگی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر نے نرمی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا،

"یہ ایک معجزہ ہے، یقیناً۔ برسوں پہلے آپ کی بیوی کا رحم اور بیضہ دانی نکال دیے گئے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کے پیٹ کے اندرونی حصے میں حمل کا ٹھہرنا کسی عام صورتحال سے قطعاً مختلف اور نہایت غیر معمولی واقعہ ہے۔ یہ ایک بے حد نایاب اور پیچیدہ معاملہ ہے، بلکہ یوں کہنا بہتر ہو گا کہ انتہائی خطرناک بھی ہے، مگر ہم اپنی پوری توانائیاں ماں اور بچے دونوں کی حفاظت کے لیے صرف کریں گے۔ آپ واقعی بہت خوش نصیب ہیں کہ اللہ نے آپ پر یہ کرشمہ ظاہر کیا ہے۔ اس قسم کے واقعات قدرت کی قدرت کا ادراک کرواتے ہیں۔"

معارج نے حیرت اور شکرگزاری کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ایمان کو دوبارہ اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اس کے دل میں اللہ کی بے پایاں رحمت کا احساس شدت سے جاگا۔ ایمان کی آنکھوں میں آنسو تھے، اور اس نے ہلکی سی لرزش کے ساتھ کہا، "یا اللہ..."

معارض نے بے اختیار سرگوشی کی، "اللہ تیرا شکر ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا، اور انہیں ایسا لگا جیسے انہیں آزمائشوں کے بعد انعام مل گیا ہو۔ انہیں ایسا لگا جیسے اللہ نے ان کے صبر کا بدلہ دے دیا ہو۔ ان کی زندگیاں ہمیشہ کے لیے بدل گئی تھیں۔ وہ اس معجزے کے احساس میں ڈوبے، اللہ کی قدرت اور فضل کا شکر ادا کرتے رہے۔

ڈاکٹر نے ان کی طرف مسکراتے ہوئے کہا، "میں کچھ وقت لوں گی تاکہ مزید تفصیلات پر بات کر سکوں۔ آپ کو اللہ کی طرف سے ایک عظیم نعمت ملی ہے مبارک ہو"

ڈاکٹر کے جاتے ہی، معارج نے ایمان کی پیشانی پر لب رکھتے ہوئے شکر گزاری کے آنسوؤں کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھام لیا، جیسے اللہ کی رحمت نے ان کے دلوں کو ایک نئے سرے سے زندہ کر دیا ہو۔

کچھ وقت بعد ایمان کو یاد آیا تو اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے معارج کو مصنوعی غصے سے گھورا اور کڑوی مسکان کے ساتھ بولی، "تم واقعی چالباز ہو چالبازی کے ماہر استاد ہاں ڈرامے باز انسان!"

معارج، جو اسے پیار سے لپٹا ہوا تھا، اچانک اس کی پشت پر ایمان کے نرم مگر مضبوط ہاتھوں کا دباؤ محسوس کرتے ہوئے پیچھے ہٹا اور ہنستے ہوئے بولا، "ارے، یہ کیا غضب ڈھا رہی ہو، مولا جٹنی! میری ہڈیاں توڑنے کا ارادہ ہے کیا؟؟؟"

ایمان نے آنکھوں میں شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اپنا نازک سا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور نرمی سے کہا، "تم ناپیدنا ہونے کا نالک کر رہے تھے معارج واقعی میں سب میرے لیے کہ مجھے برا محسوس نہ ہو؟" معارج نے مسکرا کر ایمان کے گالوں پر اپنی انگلیوں کی ہلکی سی چوٹ کی اور محبت سے بولا، "اگر تم چاہو، تو میں تمہاری خوشی کے لیے واقعی اندھا بننے کو تیار ہوں۔" اس کی آنکھوں میں محبت کی گہرائی تھی، اور اس کے الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے۔

پھر معارج نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کے نرم ہاتھ پر بوسہ دیا۔ "ایمان، مجھے تمہاری ظاہری صورت سے زیادہ تمہاری روح سے محبت ہے۔ تمہاری سیرت میری نظر میں سب سے قیمتی ہے، میری بڑی فلاح تم ایک بے حد خوبصورت اور سچی انسان ہو۔ تم میری وارث ہو۔"

ایمان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرائی، اور اس نے مسکرا کر کہا، "تمہیں معلوم ہے، تم جیسے شوہر کے لیے لڑکیاں دعائیں مانگتی ہیں، حاجتیں اٹھاتی ہیں کہ اللہ انہیں ایسا شریکِ حیات عطا کرے۔ مگر میری خوش نصیبی دیکھو، اللہ نے مجھے بنانا لگے ہی تمہیں عطا کر دیا۔ کبھی کبھار تو مجھے اپنی قسمت پر رشک آتا

ہے۔ میری دعا ہے کہ ہر لڑکی کو تم جیسے شوہر کی نعمت ملے، اگر وہ چاہے تو اللہ اسے ایسے شوہر کا کردار بھی عطا کرے جو دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والا ہو۔"

ایمان نے ہلکی سی کمزور ہنسی اور معارج بھی اس کے ساتھ مسکرا دیا۔ پھر معارج نے نرمی سے اس کے ہاتھ کی پشت چومتے ہوئے کہا، "ایمان، تمہیں معلوم ہے؟ اللہ ہمیشہ میرا ساتھ دیتا ہے۔" معارج کی مسکراہٹ میں چھپی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے ایمان کی آنکھوں میں سوال جاگ اٹھا۔

"مونیز... ایمان کی آواز لرز گئی،" وہ مجھے نشہ آور چیزیں فروخت کرنا چاہتا تھا۔ مگر مجھے ایک نامعلوم نمبر سے اس کی ویڈیو ملی۔" ایمان کی آواز میں درد اور شکر گزاری کی آمیزش تھی، اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے دھیرے سے سانس کھینچا اور آنسو روکتے ہوئے بولی، "اس نمبر میں جو کوڈ تھا، وہ عجیب تھا: ۱۲۴۰۰۰۶۷۶۲۳۶۱۱۴۷۲"

معارج کا دل اس نمبر کو سنتے ہی بے چین ہو گیا۔ وہ ایمان کی طرف متوجہ ہوا اور بولا، "میں تمہاری بات پر پورا یقین رکھتا ہوں، ایمان۔ کیونکہ جو شخص اللہ کے حکم سے ۲۰۲۳ سے ۲۰۲۵ کے زمانے میں لے جایا جائے، وہ ایسی چیزیں خوب سمجھ سکتا ہے۔"

ایمان کی آنکھوں میں حیرت کی چمک پیدا ہوئی، اور اس نے سوالیہ نظروں سے معارج کی طرف دیکھا، "کیا مطلب؟"

معارج نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنی کہانی سنائی شروع کی، اور ایمان حیرانی اور خاموشی سے اسے سنتی رہی۔ وقت جیسے رک گیا ہو، اور دونوں کی دنیا ایک دوسرے میں سمٹ آئی ہو۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے، ان کی آنکھوں کے گوشے آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے، اور دونوں کی سسکیاں فضاء میں گونجنے لگیں۔

وہ اللہ کی بے پایاں رحمت اور بے حساب نعمتوں کو یاد کرتے ہوئے ایک دوسرے کے وجود کا سہارا لیے رونے لگے۔

یہ رقت انگیز لمحے جیسے زمان و مکان سے ماوراء ہو گئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں غرق ہو کر اللہ کے احسانات کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے رہے، اور ان کے آنسو رب کی محبت کے نشانی بن کر گالوں پر بہنے لگے۔

...°...

سویڈن کے سرد صبح کے نیلگوں افق پر ہلکی سی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ سرد ہواؤں میں ہلکی خنکی تھی جو دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتی ہوئی چل رہی تھی۔ بادل جیسے آسمان پر کسی مہین پر دے کی صورت تیر رہے تھے، ان کی اوٹ سے جھلکتی سنہری دھوپ ماحول کو ایک لطیف اور خواب ناک رنگت بخش رہی تھی۔

درختوں کی شاخیں ہلکی ہلکی ہوا میں سرسراتی تھیں، اور ان پر بیٹھے پرندے خوابیدہ انداز میں اپنے پروں کو ہلکا سا جنبش دے رہے تھے، جیسے قدرت کی موسیقی میں اپنی ایک دھیمہ حصہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

اچانک، اس پرسکون ماحول کی خاموشی کو ایک تیز چیخ نے چیر ڈالا، جو اسپتال کی عمارت سے بلند ہوئی۔ وہ چیخ جیسے پورے ماحول پر لرزہ طاری کر گئی، اور درختوں پر بیٹھے پرندے یکدم اپنے پروں کو تیز تیز پھڑپھڑاتے ہوئے آسمان کی طرف پرواز کر گئے۔ وہ منظر جیسے کائنات کے سکوت کو توڑ کر کسی نئے سفر کی نوید سنارہا ہو۔

معارض، اپنے لانگ کوٹ میں ملبوس، تھانچے ٹرٹل نیک شرٹ اور سیاہ ڈریس پینٹ پہن رکھی تھی۔ گلے میں نرم، مگر خاص مفکر لپٹا ہوا تھا، جس کی گرمی شاید اس کے دل کی ٹھنڈک کو کچھ حد تک مٹا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں فکر اور خاموش اضطراب تھا، جب کہ اس کے قدموں میں ایک غیر محسوس سی تیزی تھی، جیسے وہ جلدی میں ہوتے ہوئے بھی پرسکون رہنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ایمان، جس کا پیٹ اب بھاری ہو چکا تھا، ویل چیئر پر بے بسی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ پرانے زخموں کے نشان دھندلے پڑ چکے تھے، مگر اس کی آنکھوں میں درد کی شدت واضح تھی، اور وہ درد جیسے ہر سانس کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی، اور لبوں پر دبے دبے سسکیاں تھیں، جو معارج کے دل میں خنجر کی طرح چبھ رہی تھیں۔

"معارض... دردنا قابل برداشت ہو رہا ہے... انہیں کہو جلدی کریں یہ بچہ تمہاری طرح بے صبر ہے!" ایمان کی آواز میں بے پناہ اضطراب تھا، اور اس کے ہاتھ نے معارج کا ہاتھ جیسے زندگی کی ڈور کی طرح پکڑ رکھا تھا۔

معارض نے اس کے لرزتے ہاتھ پر اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت مضبوط کی، اور انتہائی شفقت سے بولا، "بس میری جان، ابھی پہنچنے والے ہیں، اللہ بہتر کرے گا، تھوڑا اور صبر..."

ایمان کی آنکھوں میں نمی بڑھ گئی، اس نے بے اختیار معارج کا ہاتھ مزید زور سے تھام لیا، جیسے وہ اپنی تکلیف میں اسے مزید قریب کھینچ رہی ہو۔ ویل چیئر آہستگی سے آگے بڑھنے لگی، ایمان نے اپنا ایک ہاتھ پیٹ پر رکھا اور آہستگی سے زیر لب دعا مانگی، "میرے بچے، صبر کرو... اپنی ماں کو تھوڑا آرام دو..."

اسپتال کا عملہ نرمی اور تیزی کے امتزاج کے ساتھ ایمان کو کمرے کی جانب لے جا رہا تھا، معارج ہر لمحہ اس کے ساتھ قدم بہ قدم چل رہا تھا، جیسے اس کی ہر سانس میں ایمان کے درد کی گونج تھی۔

چند لمحے بعد، کمرے کی بھاری فضا کو ایک ننھی سی کلکاری نے ہلکا کر دیا، پھر دوسری، اور پھر تیسری، اور چوتھی۔ چار معصوم بچوں کی آوازیں فضا میں گونجیں، جیسے ایک نئی زندگی کے آغاز کا اعلان کر رہی ہوں۔ معارج کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمکنے لگے، اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی، اور دل میں شکر گزاری کا سمندر موجزن ہو گیا۔

کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا، اور معارج قدم بہ قدم اندر آیا۔ کمرے کی ہوا میں خوشبوؤں اور خوابوں کا احساس رچ بس گیا تھا۔ دیواروں پر نیلے اور گلابی رنگ کے غبارے سجے ہوئے تھے، جیسے کائنات نے اپنی سب سے خوبصورت رنگتوں میں ان معصوم جانوں کا استقبال کیا ہو۔

کمرہ کھلا اور شاندار تھا، ہر گوشہ خوشی اور سکون کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ دائیں طرف ایک بڑی کھڑکی کھلی تھی، جس کے پار سے سٹاک ہوم کا حسین منظر دکھائی دے رہا تھا۔ شہر کی سڑکیں اور عمارتیں، دور دور تک پھیلی ہوئی برف کی طرح، معصومیت کی علامت بنے دکھائی دے رہی تھیں۔

ایمان کے پہلو میں دائیں جانب دو ننھے پھول جیسے بچے آرام سے سوئے تھے، اور بائیں طرف دو اور معصوم جانیں تھیں۔ ایمان ان کے درمیان خاموشی سے لیٹی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر ایک عجیب سا سکون اور شکر گزاری تھی، جیسے وہ ہر لمحہ اپنی تقدیر کا شکر ادا کر رہی ہو۔

معارج، جواب صرف سیاہ ٹرٹل نیک شرٹ اور پینٹ میں تھا، شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک لپیٹی ہوئی تھیں۔ اس کی داڑھی کچھ اور بڑی ہو چکی تھی، اور آنکھیں پہلے سے بھی زیادہ گہری، جیسے انہوں نے ہزاروں کہانیاں اپنے اندر سمیٹ رکھی ہوں۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا ایمان کے پاس آیا، اور خاموشی سے جھک کر اس کی پیشانی پر اپنے لبوں کا نرم بوسہ دیا۔

اچانک، ایمان کے آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے، اور اس نے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ معارج ایک لمحے کے لیے حیران ہوا، "کیا ہوا؟ اب کیوں رو رہی ہو؟" اس کے لہجے میں محبت اور فکر کی ملی جلی کیفیت تھی، مگر اس کے چہرے پر اطمینان کا عکس واضح تھا۔

ایمان نے نم آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا، "معارج... میں نے ہمیشہ یہ خواب دیکھا تھا کہ تمہارا خاندان ہو، میں تمہارے بچوں کی ماں بنوں، اور آج... آج اللہ نے ہمیں دو بیٹیاں اور دو بیٹے عطا کر دیے ہیں۔" اس کے لہجے میں بے پناہ خوشی اور شکر گزاری چھپی ہوئی تھی۔

معارج دھیرے سے کرسی پر بیٹھا، اس کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگایا اور محبت سے کہا، "آج واقعی ہمارا خاندان مکمل ہو گیا ہے، ایمان۔ تم نے مجھے دنیا کی ہر خوشی دے دی ہے، میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ تم جیسی رفیق حیات عطا کی۔"

ایمان نے نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ آنسو پونچھنے کی کوشش کی، مگر معارج نے اس کے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا اور ہنستے ہوئے کہا، "تمہیں پتہ ہے، تم روتے ہوئے بھی بے حد خوبصورت لگتی ہو۔" ایمان ہنس دی، "اور تم، میرے آنسو صاف کرتے ہوئے!"

معارج نے قہقہہ لگایا، پھر اٹھا اور گھوم کر دائیں جانب جا کر دونوں بچوں کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی، دونوں معصوم چہرے لیے ہوئے، اپنے والد کی آغوش میں سمٹے ہوئے تھے۔

"تو تم نے کیا سوچا ہے؟" معارج نے ایمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ایمان نے تھوڑی حیرت سے پوچھا، "کس بارے میں؟"

معارج مسکراتے ہوئے بولا، "ان کے ناموں کے بارے میں۔"

ایمان نے شرارتی انداز میں آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا، "اوف معارج! جو تم نے اٹھارکھے ہیں، نمبر ون اور نمبر ٹو۔" پھر ہنستے ہوئے بولی، "بیٹے کا نام نیبر اس اور بیٹی کا نام مینسا ہو گا۔"

معارج نے محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا، "اور جو تمہارے پہلو میں ہیں، نمبر تھری اور فور ان کا؟"

ایمان نے مسکراتے ہوئے کہا، "انساء اور معراج۔ مجھے معراج نام بہت پسند ہے، یہ تمہارے نام سے بہت ملتا جلتا ہے۔"

معارج نے دونوں بچوں کو نرمی سے ایمان کے پاس رکھا اور کرسی پر دوبارہ بیٹھ گیا۔ وہ کچھ لمحے خاموش رہا، پھر دھیرے سے بولا، "تو کیا یہ ہماری کہانی کا اختتام ہے؟"

ایمان نے نرمی سے نفی میں سر ہلایا، "نہیں، یہ تو ہماری کہانی کا آغاز ہے... ایمان اور معارج کی کہانی کا حقیقی آغاز۔ جو گزر گئی، وہ تو ایمان اور گونار کی کہانی تھی، لیکن یہ کہانی... یہ ہماری ہے، ہماری اور ہماری اولادوں کی۔"

معارض نے مسکراتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور آہستگی سے کہا، "فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ... تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟"

ایمان نے دھیرے سے جواب دیا، "بے شک، ہر مشکل کے بعد آسانی ہے..."

کھڑکی کے شیشے کے پار دنیا پیچھے چھوٹی جا رہی تھی، معارج اور ایمان جیسے دھیرے دھیرے اس منظر میں گھلتے جا رہے تھے، ان کے عکس چھوٹے ہوتے جا رہے تھے، جیسے وقت اور فاصلہ انہیں آہستہ آہستہ مٹاتا جا رہا ہو۔ کمرے کے اندر کا سکون، نرم روشنیوں کا لمس اور بچوں کی مدھم سانسوں کی آواز، سب خاموشی سے ایک عجب روحانی منظر کا حصہ بن گئے تھے۔

ہماری نظر جیسے آسمانوں کی وسعتوں میں بڑھتی جا رہی تھی، خلا کی بے پایاں تاریکیوں میں جہاں زمین ایک نیلا سیارہ بن کر اپنے مدار میں گھومتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ نیلے ہالے کے اندر یہ دنیا ایک نازک نقطے کی مانند تھی، جہاں زندگیاں، کہانیاں، دعائیں اور امیدیں بس ایک لمحے کی مانند سمٹ جاتی ہیں۔

یہ دنیا، جہاں آزمائشوں اور امتحانات کا سلسلہ کبھی تھمتا نہیں وہاں ہی آصف خالدہ آمنہ میکائیل جیسے لوگوں کے لیے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَ نَارٍ وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا بِالْبَهَائِزِ الَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ، أُولَٰئِكَ مَاؤُا هُمُ النَّارِ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ" (سورۃ یونس: 7-8)

"جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اسی پر مطمئن ہو بیٹھے اور ہماری نشانیوں سے غافل ہو رہے ہیں، ان کا ٹھکانہ ان کے اعمال کے سبب جہنم ہو گا۔"

زمین اپنی گردش میں تھی، مگر خلا کی وسعتوں میں یہ ایک لمحہ ٹھہرے ہوئے سا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کائنات کی عظمتوں کے سامنے دنیا کی حقیقت کھل کر سامنے آرہی ہو۔

اور وہ لوگ جو ایمان لائے، جنہوں نے اس دنیا کی آزمائشوں میں صبر کیا، قرآن ان کی نجات کی بشارت دیتا ہے:

"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ" (سورۃ یونس: 9-10)

"اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، پروردگار انہیں ان کے ایمان کے سبب جنتوں کی طرف راہ دکھائے گا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔"

یہ کائنات کے راز، جن میں دنیا کی حقیقت اور آخرت کی کامیابی پوشیدہ ہے، خلا میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ زمین اب بہت دور پیچھے رہ گئی تھی، اور ہم آسمانوں کی وسعتوں میں داخل ہو چکے تھے، جہاں دعاؤں کی گونج اور اللہ کی عظمت کا شعور ہر ذی روح کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔

"سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ..."

اور اس کے بندوں کی دعا ہمیشہ رہے گی: سلامٌ علیکم... اور ان کا آخری قول یہ ہوگا: الحمد للہ رب العالمین۔"

... ..

یہ دنیا دار العمل ہے، اور یہاں ہر شخص کو اپنے اعمال کا بوجھ اٹھانا ہے۔ بعض اوقات لوگوں کو یہ شکوہ ہوتا ہے کہ ظالم اور بدکار جیسے آصف، خالدہ، یا میکائیل جتنی جیسے افراد کیوں انجام کار برائی سے دوچار نہیں ہوتے، اور انہیں کیوں دنیا میں کوئی سزا نظر نہیں آتی۔

لیکن یہ حقیقت ہمیں نہیں بھولنی چاہیے کہ یہ دنیا عارضی اور فانی ہے، اور یہاں کی آسائشوں میں مبتلا افراد اپنے انجام سے بے خبر ہوتے ہیں۔

ایک طرف موت کے بعد کا وہ منظر ہے جہاں کسی کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملتی ہے۔ سرور اور سکون نصیب والوں کا انجام جنت کی نعمتیں اور رضوان کی لذتیں ہیں، اور دوسری جانب وہ بدکار اور مغرور لوگ ہیں جو دنیا کی لذتوں میں محو رہتے ہیں، بھول جاتے ہیں کہ موت کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا ہے۔

اور بالآخر وہ بد بخت جہنم کی دکھتی ہوئی آگ میں نڈھال اور درماندہ ہو کر بے بسی کے عالم میں تڑپتے ہیں، جیسے سرور اور مومنین، جن کی روحیں عذاب کی شدت میں گھلتی رہتی ہیں، اور ان کی فریادیں آگ کی لپیٹ میں دب کر گرم ہو جاتی ہیں۔

ہر آہ اور ہر چیخ آسمانوں میں گونجتی ہے، مگر انہیں کوئی نجات دہندہ نہیں ملتا۔ وہ قہر الہی کے شکار، اپنے ہی اعمال کی بھٹی میں جلتے ہوئے، ہمیشہ کے لیے عذاب کے گہرے گڑھے میں دفن ہو جاتے ہیں، جہاں رحم کا کوئی سایہ نہیں، اور صرف درد و عذاب کی تپش ان کے نصیب میں رہتی ہے۔

جتنی، خالدہ، آصف اور آمنہ جیسے لوگ دنیا میں ظاہری عیش و عشرت سے بہرہ ور ہیں، مگر حقیقت میں وہ ابدی سزا کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ ان کے لیے دنیا میں بظاہر کوئی عذاب نہیں، لیکن آخرت میں ان کے لیے آگ کا عذاب مقرر ہے۔

اس دنیا میں براہِ راست سزا نہ ملنے کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ ان کے اعمال بے حساب رہیں گے۔ انسان خالی ہاتھ دنیا میں آتا ہے، مگر اپنے گناہوں اور نیکیوں کا پلندہ ساتھ لے کر آخرت کی طرف جاتا ہے۔ جس نے نیک اعمال کیے، اس کا انجام جنت اور جس نے گناہ کیے، اس کا ٹھکانہ جہنم ہو گا۔ اللہ کی عدالت میں دیر ہو سکتی ہے، لیکن اندھیر نہیں۔

خاتمہ بالخیر